PSYCHOLOGY

HEALTH · HAPPINESS · SUCCESS

MARCH 194



ANNAS

EIGH

تان کا مشہو

نامہ



مضمون "سکون انسانی" اندر ملاحظہ فرمائیں



جوشِ شباب

Photo : Pakistan Art Studio.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ



مارچ ۱۹۴۹ء

انگلستان کے مشہور ماہنامہ سائیکولوجی کا اردو ایڈیشن

مارچ ۱۹۴۹ء

سائیکولوجی کراچی

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم　　جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبال

ایڈیٹر:- ایم۔ ایچ۔ فیضی

مضامین

خودی میں ڈوب جا غافل کہ سرِ زندگانی ہے

قوتِ خیال کی تفصیل

روزمرہ سائیکولوجی

شکریہ

سوال و جواب

شادی اور آجکل کا نوجوان

روپیہ اور سیرت

جنسی تعلیم

سکونِ انسانی

جو موج ڈبو دے ساحل ہے!

خانہ داری اور نا اتفاقی

پردہ سیمین کا ردِ عمل

سرخیاں

بچے کا سچ اور جھوٹ

زرِ سالانہ پانچ روپے
متواتر دو سال کیلئے آٹھ روپے
متواتر تین سال کیلئے دس روپے

خط و کتابت کا پتہ:- 15/575 الہ بخت آفندی منزل۔ فریئر روڈ۔ کراچی نمبر ۱

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ

خودی میں ڈوب جا غافل کہ سرِ زندگانی ہے

- **زندگی۔** زندگی کا سراغ لگانا انسانی فطرت ہے۔
- **راستہ۔** عمر اچھی گذارنا ہر ذی روح کی ابدی خواہش ہے۔
- **انسان۔** یہ اللہ کا ارضی خلیفہ ہے۔

اور ان تینوں کی رہبر عقل ہے۔

پھر ہم بغیر سائیکولوجی کے مطالعہ کے کیسے رہ سکتے ہیں جو ذہن کی گہرائیوں اور وسعتوں سے واقف کراتی ہے!

جب تک انسان اپنے ذہن کے معجزے نہ دیکھ لے خودی کے مزے نہیں لے سکتا ——— خودی میں ڈوبنے کا راز سائیکولوجی میں پنہاں ہے، لیکن ہمیں اس بات کے اظہار کرنے میں مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ آج کل کا عام مزدور بھی اپنی ذہنی کشمکش اور الجھنوں کو سمجھنے کے لئے ذہن کی سائنس سائیکولوجی سے تھوڑی بہت واقفیت رکھے بغیر نہیں رہتا اسی لئے جو مقبولیت پہلے شمارہ پر سائیکولوجی کو ہوئی وہ توقع سے کہیں زیادہ تھی تمام سیکرٹریٹ۔ آفسوں اور سفارت خانوں میں سائیکولوجی پر بحث مباحثہ اس کی دلیل تھے کہ جوبات سائیکولوجی نے اپنے وجود میں آنے سے دی اس کا ہمارے وزراء سے لیکر مزدور تک کو انتظار تھا۔ لیکن پوشیدہ۔ ذہن میں ——— سائیکولوجی کے پرستاروں کی فہرست لاحاصل ہے لیکن ہم ان اصحاب کے نام پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے ایک سال نہیں دو سال نہیں مستقل تین سال کی خریداری قبول فرمائی علاوہ ان بےشمار معاونین کے جنہوں نے ایک سال کے لئے زرِ سالانہ مرحمت فرمایا ہے۔ ان ہی میں سے بعض نے ہم سے دریافت کیا کہ اگر زندگی بھر کے لئے بھی سائیکولوجی سے کوئی پیشکش ہو وہ اس کیلئے بھی تیار ہیں۔ کسی ماہنامہ کی مقبولیت کی اس سے بہتر مثال ملنا مشکل نظر آتی ہے۔

محمد خلیل اللہ صاحب۔ ابراہیم بھائی۔ منیر برادرس۔ محمد امین احمد صاحب۔ حاجی اے عزیز محمد صاحب۔ اے کریم حاجی لطیف صاحب دار الاشیاء۔ محمد ابراہیم غلام محمد صاحب۔ عبدالحمید عبدالماجد صاحب۔ منظور احمد صاحب۔ منظور الہیٰ صاحب۔ علاؤالدین صاحب۔ غلام حسین مصطفےٰ صاحب۔ مقبول صادق صاحب۔ محمد عبدالمجید صاحب۔ صفی رضی صاحب۔ چوہدری عبدالحمید صاحب۔ چوہدری محمد لطیف صاحب۔

افواہ:۔ ہمارے جریدہ کے متعلق یہ افواہ بڑی گرم ہے کہ انگلستان کے ہائی کمشنر نے اس رسالہ کا اجراء کیا ہے۔ ہم اس بات کی تردید کرتے ہیں۔ انگلستان کے ہائی کمشنر صاحب کا اس ماہنامہ میں کسی قسم کا ہاتھ نہیں۔ ہاں ادارہ کو فخر ہے کہ اس سائیکولوجی کی روحِ رواں وہ ہستیاں ہیں جو اپنی بے لوث خدمات سے انسان میں انسانیت دیکھنے کے لئے بےچین ہیں۔

خوش بختی نمبر:۔ جن صاحب کے پاس ماہ فروری کا شمارہ ۲۳ آیا ہو وہ ہمارے آفس میں تیس روپیہ نقد انعام لے جائیں یا اپنی کاپی کو ارسال فرمائیں تاکہ ان کا انعام بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دیا جائے۔

تصویریں:۔ ٹائیٹل کی تصویر جوشِ حیات اور جوشِ شباب کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ اس ماہ یا گذشتہ ماہ کے ان تصاویر کا بلاک جن کے حقوق بحق اس ماہنامہ محفوظ ہیں اپنے رسائل میں استعمال کرنے کے لئے ہم عصرین طلب فرما سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سی۔ ایف۔ لیوٹ

قوتِ خیال کی تصنیع

آپ کی قوتِ خیال بے کار اور بلا مقصد سوچ بچار میں بہت زیادہ ضائع ہو جاتی ہے اگر اس ضائع شدہ کا دسواں حصہ بھی صحیح طریقہ پر استعمال کیا جائے تو تھوڑے ہی دنوں میں آپ کچھ سے کچھ بن جائیں حقیقت میں یہ نقصان بڑا شدید نقصان ہے۔ یوں تو خیر کوئی شخص بھی اپنی قوتِ متخلیہ سے پورا پورا فائدہ حاصل نہیں کر سکا۔ ایڈیسن جیسے موجد کے متعلق جو ہر وقت سوچتا ہی رہتا تھا۔ سائنس دانوں کا یہ فیصلہ ہے وہ بھی اپنے خلایائے دماغی سے صرف پچیس فیصدی استعمال کر سکتا تھا۔ اصل میں انسان کو ابھی تک اپنی اس قوت کی برتری کا پورا پورا احساس ہی نہیں ہوا ہے۔

دماغ میں خیالات کے بلا روک ٹوک مسلسل آنے جانے کا تانتا کچھ اسطرح بندھا رہتا ہے کہ ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ کہاں سے چلی آ رہی ہے اور جب یہ معمہ حل نہیں ہوتا تو پھر ہم اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس راز کو سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا اور انسان کی قوت سے باہر ہے کہ وہ اس چیستان کو حل کر سکے

زندگی نام ہے عمل کا۔ اور خیال بھی زندگی کا ایک جزو ہے آپ جانتے ہیں کہ زندگی کبھی ایک جگہ قرار نہیں ہے۔ یہی حال خیالات کا ہے۔ خیالات کی رو بھی کسی کے روکے نہیں رک سکتی یہ تو سدِ سکندری کو بھی توڑ کر نکل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر حضرات خیالات کی بھول بھلیاں میں پھنس جاتے ہیں اور اگر چاہیں بھی کہ اس سے چھٹکارا مل جائے۔ تو بھی اس چکر سے نہیں نکل سکتے۔ سوچنا تو ہماری فطرت میں داخل ہے اور اس لئے لازمی و لابدی ہے

جو لوگ اپنے خیالات کو تعمیری کاموں کی طرف نہیں لگاتے تو پھر ان کی یہ قوت تخریبی کاموں میں صرف ہونے لگتی ہے۔

غیر معمولی دماغ رکھنے والے لوگ ہر عہد میں ملتے ہیں۔ ان کا طرزِ تخیل عامی خیالات سے بالکل جدا ہوتا ہے وہ سوچ بچار کر زندگی میں نئی نئی راہیں پیدا کرتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ عوام ان کی طرف کھچے جاتے ہیں اور انہیں اپنا لیڈر بنا لیتے ہیں۔ اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ یہ "خیال" ہے کیا چیز۔ ہمارے دماغ کی حیرت انگیز مشین ہر وقت چلتی رہتی ہے۔ اس کا کام ہے کہ تمام معلومات کی جانچ پڑتال کرے موازنہ و مقابلہ کرے ہمارا شعور ہمیں بتلاتا ہے کہ خیال ایک نہایت موثر قوت ہے جس کی قدر و قیمت کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے۔ خارجی اثرات کی بنا پر دماغی مشین میں چند تحریکیں برانگیختہ ہوتی ہیں ان سے جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ خیال ہے۔

فطرت کی لامحدود قوتوں سے فائدہ اٹھانے میں انسان ہمیشہ سے کاہل واقع ہوا ہے لیکن جب وہ اس طرف توجہ کرتا ہے تو پھر سوچنے لگتا ہے کہ کس طرح ان قوتوں کے خزانے کو اپنے کام میں لائے جب سوچتا ہے تو طریقہ استعمال بھی معلوم ہو ہی جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں جب کسان اناج کی گون گدھے پر لاد کر لے جایا کرتا تھا تو توازن قائم رکھنے کے لئے ایک طرف اناج اور دوسری طرف بورے میں پتھر بھر لیا کرتا تھا۔ کچھ دن بعد کسی

روزمرہ سائیکولوجی

(اگر آپ اپنی زندگی خوشگوار، صحت قابلِ رشک اور شخصیت ہردل عزیز بنانا چاہتے ہیں تو "روزمرہ سائیکولوجی" کے یہ دس سنہرے اُصول عملی زندگی میں ایک لمحہ کے لئے فراموش نہ کیجئے)

(۱) آپ کے پھیپھڑوں کو تازہ ہوا کی ضرورت ہے

یہ تو ہو سکتا ہے کہ آپ بغیر کھائے ہفتوں زندہ رہ سکتے ہیں اور بغیر پانی پئے بھی دنوں جی سکتے ہیں لیکن بغیر ہوا کے چند لمحات بھی زندہ رہنا مشکل ہے آپ کے پھیپھڑوں کو ہوا سے پُر رہنا چاہئے جس کے لئے پُورا سانس لینا ازبس ضروری ہے۔ اگر آپ اُدھورا سانس لیتے ہیں تو آپ سمجھ لیجئے کہ آپ کی جسمانی صحت بھی اَدھوری ہے۔ صبح سویرے باغ یا کسی پارک میں ٹہلنا اور گہرے سانس لینا صحت قائم رکھنے کے لئے مفید ہے۔

(۲) بہت زیادہ شکر اور نشاستہ آپکو بجائے نفع کے نقصان پہنچاتا ہے

ایک بہت بڑے ڈاکٹر جیولی لاسالے نے اِس بات پر زور دیا ہے کہ نصف سیر شکر ایک کنبہ کے لئے ہفتہ بھر کے لئے کافی ہے اِسی طرح آلو اور آٹا کی کثرت کے بجائے سبزیاں اور اُبلی ہوئی ترکاریاں استعمال کرنا انتہائی مفید ہے۔ غذا کو جس قدر ممکن ہو چبائیے۔ کھانے کے دَوران میں رنج اور پریشانی کو پاس نہ پھٹکنے دیجئے۔ غم، غصّہ یا خوف کی حالت میں ہرگز نہ کھائیے۔ اِس لئے کہ خودکشی سے فاقہ بہتر ہے۔

(۳) روزانہ بہت سا پانی پینا مفید ہے

جسم کا بیرونی حِصّہ صاف ہونے سے زیادہ اہم اندرونی حِصّہ کی صفائی ہے۔ اِس لئے پیٹ میں پانی بھرا رہنا ضروری ہے۔ آپ کے جسم کا ۴/۵ حِصّہ پانی ہی ہے اور جسمانی نشو و نما کی حرکت کے لئے پانی ہی درکار ہے فضلہ اور مُضر مواد نکال پھینکنے کے لئے ضروری ہے کہ پانی کثیر مقدار میں موجود ہو۔ روزانہ کم سے کم نصف گیلن پانی پیتے رہیئے تاکہ جسم کا اندرونی میونسپل بورڈ مناسب صفائی کرتا رہے۔

(۴) تھوڑی بہت وَرزش سے کبھی غافل نہ رہیں

بے حِس و حرکت جسم تو مُردہ ہی ہو سکتا ہے۔ زندگی کی بقا اور جسم کی قوت کا بڑھنا خون کے دَوران پر منحصر ہے اور مناسب دَورانِ خُون کے لئے ورزش لازمی ہے۔ دوڑنا یا پیدل چلنا بڑا مُفید ہے۔ روزانہ کم ازکم تین میل ٹہلنا مناسب ہے۔ صبح کا باغ میں ٹہلنا دل و دماغ کو اُجاگر رکھتا ہے، قوت و فرحت بخشتا ہے۔ دوسرے مناسب ورزشی کھیل بھی فائدہ مند ہیں۔

(۵) آپ کو آرام بھی خوب کرنا چاہئے

کام کی کثرت سے آج تک دُنیا میں کوئی نہیں مرا۔ بے شک نامناسب قسم کی جسمانی تکان نے لاکھوں انسانوں کو زندہ درگور کر دیا۔ اعضا کو سکون پہنچانا لازمی ہے۔ سخت سے سخت محنت کے کام کو کرنے کے باوجود آپ کی صحت بہتر رہے گی بشرطیکہ آپ اعضا کو مناسب سکون (Relax – Tension) دیتے رہیں۔ کام کرتے کرتے جب آپ کو جسمانی طور پر تکان محسوس ہونے لگے تو دو تین منٹ آرام کیجئے یہ آرام صرف جسمانی ہی نہ ہو بلکہ دماغی بھی ہو۔ مثلاً سکون سے دراز ہونے کے بعد اپنی توجہ کسی ایسی خوشگوار یاد کی طرف مبذول کر دیجئے جو آپ کے چہرے پر مسرّت کی ایک لہر دوڑا سکے۔ تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس لیکر پھیپھڑوں کو بھی صاف کر لیجئے۔ صاف اور تازہ پانی ایک گلاس میں بھر کے پی لینا نہایت مناسب ہے۔ اِن شرائط پر عمل کرنے سے آپ تین ہی منٹ کے اندر پھر جم کر کام کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں رات کے وقت آپ کو بلاناغہ آٹھ گھنٹے گہری نیند سے ہم آغوش ہونا چاہئے اور وہ نیند آپ کے لئے بیکار ہے جو صدہا دماغی اُلجھنوں کے بعد آئی ہو۔ اِس لئے خالی الذہن ہو کر سونا چاہئے بلکہ سوتے وقت

آپ کے خیالات خوش آئند واقعات کامیابیوں کی توقعات اور مستقبل کی تعمیر کی اُمیدوں سے پُر ہونے چاہئیں - اسی طرح جس رات آپ سوئیں گے آپ کو تجربہ ہوگا کہ صبح آپ کا جسم چاق و چوبند ہوگا طبیعت جولانی پر ہوگی اور سستی یا کاہلی کا نام بھی نہ ہوگا -

(۶) قوتِ متخیلہ پر قابو پالینا ہی کامیابی ہے -

دماغ ہر کامیابی کی کنجی ہے - اپنی قوتِ متخیلہ ہی سے آپ خود کو بنا یا بگاڑ سکتے ہیں - تخیلات ہی آپ کی وہ دنیا بناتے ہیں جس میں آیندہ زندگی گذارنا ہے - کامیابیاں و کامرانیاں نامرادیاں اور ناکامیاں غرض سب آپ ہی کی قوتِ متخیلہ کے کرشمے ہیں یقین جانئے اگر آپ اپنی قوتِ متخیلہ سے ٹھیک ٹھیک کام لینے پر قادر ہیں تو آپ سب سے زیادہ کامیاب انسانوں کی سی زندگی بسر کر سکتے ہیں - ہمیشہ مناسب، تعمیری اور خوشی کے خیالات کو دماغ میں جگہ دیجئے - ایک انگریزی کہاوت ہے "انسان اپنے تخیل ہی پر اپنا مستقبل تعمیر کیا کرتا ہے" - آپ کی زبان بھی ایک ایسی ضرب المثل کو اہمیت دیتی ہے - "جیسی رُوح ویسے فرشتے" - اگر آپ ہمیشہ یہ باور کئے رہیں کہ آپ تندرست ہیں تو یقین جانئے کہ آپ کی لاتعداد بیماریاں خود ہی فنا ہو جائیگیں اپنی خوشحالی کا تخیل قائم کیجئے اور دیکھئے فارغ البالی آپ ہی کا حصہ ہوگی - مسرت اور شادمانی کو خیالات میں بسا لیجئے آپ دیکھیں گے کہ 'قناعت' آپ کی مایوسیوں کو کس طرح مٹا کر رکھدیتی ہے -

(۷) جذبات پر آپ کو قابو پانا چاہئے -

ہمدردی - خوشی - محبت   یہ وہ جذباتی عناصر ہیں جن کا مجموعہ ہی زندگی کا سرمایہ ہے اِن کا عدم انسانیت کا خاتمہ ہو جانا ہے - آپ کو اُن کی قدر کرنا چاہئے اور اُن سے کام لیکر دُنیائے اِنسانیت میں آفتاب بن کر چمکنا چاہئے لیکن اِس طرح کہ آپ کو جذبات پر قابو ہو اور اگر جذبات نے آپ پر سکہ جما لیا تو آپ کا دماغ آپ کی صحت حتیٰ کہ آپ کا کردار فنا ہو جائیگا - بغض، کینہ، نفرت، یاس اور ہراس یہ جذبات **انتہائی مہلک** ہیں دُنیا بھر کے امراض کر آپ کی صحت کو اِس قدر تباہ نہیں کر سکتے جس قدر یہ جذبات مُضر ہیں - جذبات فطری حسیات ہیں لیکن آپ کو قدرت نے صلاحیت دی ہے کہ آپ ان کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیں ایسے ضرر رساں جذبات کے قابو میں لانے کے لئے انہی کے مقابل بہتر جذبات کو ابھاریئے - نفرت کی جگہ محبت، بغض کی جگہ ہمدردی کو دیجئے اور پھر دیکھئے جس طرح آپ کی جسمانی صحت قابلِ رشک ہوگی اُسی طرح کردار بھی -

(۸) زندگی کا مستقر محبت میں پنہاں ہے -

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

محبت وہ ملکوتی صفت ہے جو انسانوں کو عطا ہونے کے بعد اُسے دُنیا کی تمام مخلوقات سے اشرف تر بنا چکی ہے - تمام کامیاب راہوں کے دروازے محبت ہی کے ہاتھوں کھلا کرتے ہیں نا اُمیدی کو اُمید - یاس کو آس اور ناکامی کو کامرانی میں بدل دینا محبت کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے - تہذیب و اخلاق کا جزوِ اعظم محبت ہے - زندگی کی پُر پیچ اور پُر تکلیف دہ منزلوں کو سیدھا اور دل خوش کن بنا دینا محبت ہی کے سورج کی شعاعوں کا کرشمہ ہے - مایوسی کے بنجر میدانوں میں محبت ہی کھلے ہوئے گلابوں سے معمور باغ لگا دیتی ہے - آپ محبت ہی کو اپنا شعار بنایئے رشتہ داروں سے محبت کیجئے - احباب سے محبت کیجئے حتیٰ کہ بدخواہوں سے بھی محبت کیجئے - محبت کائنات کے وجود کا سنگِ بُنیاد ہے - محبت ہی خوشی ہے - محبت ہی کامیابی ہے - حق تو یہ ہے کہ سرتاپا کائنات میں محبت ہی محبت ہے - اور کائنات کے پرے بھی محبت کا ہی پرچم لہرا رہا ہے -

(۹) لامذہبیت کا دوسرا نام "لعنت" ہے

مذہب رُوح کی غذا ہے، روحانی طاقتیں اِنسان کو اس قدر بلند کر دیتی ہیں کہ فرشتے بھی اُس کی تعظیم کرنے کو سر بسجود ہو جاتے ہیں - روحانی طاقت ہر ناکامی کو کامیابی سے بدل دیتی ہے ناممکنات کو "مذہب کے شیدائیوں نے ہمیشہ ممکن کر کے دکھایا ہے - ہم اِس لئے اشرف المخلوقات ہیں کہ خدا کا نُور ہمارے دلوں میں ہے خدا نے ہمیں اپنا نائب بنایا ہے اور فتح و کامرانی کے میدان کا نام دُنیا رکھا ہے - ہمیں حق دیا ہے کہ دنیا کے ہر حصہ پر ہم اپنا اقتدار قائم کر سکیں - لاشعوریت میں ہم سب ایک ہی اِنسان ہیں عرب کے اُمّی ڈاکٹر نے اِس کی یوں تشریح کی ہے کہ "تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی کے بنے ہوئے تھے - اِسی مساوات کے عقیدے میں ابدی راحتیں پنہاں ہیں - اِس لاشعوری حیثیت کو شعوری میں بدل دیجئے - مذہبی جواہر پاروں کو ضبط پاشی کا



جن خطوط کا اقتباس ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں وہ کسی وقت دفتر میں آکر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اِن ہمت افزا خطوط لکھنے والوں کا ادارہ شکر گذار ہے۔ اُمید ہے ہماری آئندہ خدمات بھی "ملّتِ پاک" اور "ملّتِ بیضا" اسی طرح سراہیں گی۔ پاکستان اور ہندوستان کے لئے "سائیکولوجی" اپنی نوعیّت کا واحد جریدہ ہے جس کا پہلا شمارہ دلوں پر اتنا مؤثر ہوا اُس کے خاص نمبر کیا ہوں گے آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ ادارہ کوشش میں ہے کہ بہت جلد "عورت نمبر" جو اعلیٰ مضامین اور خوبصورت تصاویر سے مُزیّن ہو آپ کی خدمت میں پیش کرے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ بھی ہماری اس سعیِ احسن میں ہاتھ بٹائیں گے اور اپنے احباب سے اُس کی سرپرستی کی سفارش فرمائیں گے صرف دس روپے میں تین سال تک کے لئے آپ ہماری خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔

اسلامیہ کالج پشاور۔ ۱۵-۲-۴۹

محترمی! تسلیم۔ سائیکولوجی کا اُردو ایڈیشن نظر سے گذرا مجھے اور میرے احباب کو بہت پسند آیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے۔ اِس رسالے کے اجرا سے ایک کمی پُوری ہو گئی ہے۔ اور ہمیں توقع ہے کہ انگریزی کے ایڈیشن کی طرح اُردو میں بھی یہ پرچہ بے حد مقبولیت حاصل کرے گا۔

آپکا، مرزا خورشید انور بیگ۔

۱۶۔ گیان اسٹریٹ۔ اسلام آباد مغلپورہ، لاہور
مورخہ ۱۲ر فروری ۱۹۴۹ء

مکرمی ایڈیٹر صاحب۔ سلام علیک۔ مجھے نفسیات سے بہت دلچسپی ہے۔ میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ کے اِس حسنِ اقدام سے اُردو ادب میں ایک ایسے رسالہ کا اضافہ کیا ہے کہ جسکی حقیقتاً پاک قوم کو ضرورت تھی۔

خاک نشیں، جانِ عالم بارہوی

۱۴۳/۲ مارٹن روڈ۔ کراچی نمبر ۵۔ ۴ر فروری ۴۹ء

مکرمی ایڈیٹر صاحب "سائیکولوجی"۔ آپ کے رسالہ کے شائع ہونے کا بے چینی سے منتظر تھا۔ پہلی ہی تاریخ کو خریدا پہلی اشاعت ہونے کے لحاظ سے آپ کا رسالہ بہت کامیاب ہے۔ اور آپ نے نفسیاتی اصولوں کو ہر مضمون اور ہر بات میں سپ نظر رکھا ہے۔

میں آپ کو اس رسالہ کی کامیابی پر مکرر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ فقط

نیازمند۔ ودود احمد جیلانی

کراچی۔ ۱۱ر فروری

محترمی: السلام علیکم۔ آپ کا رسالہ سائیکولوجی پڑھا۔ بے حد مسرّت ہوئی۔ ہمارے ملک میں جس چیز کی کمی مدّت سے محسوس کی جا رہی تھی کسی حد تک پُوری ہو گئی۔

عبدالحمید، مکان ۱۵-۲/۲۴ جیبت ... روڈ، کوئٹہ

محترمی! تسلیم۔ آپ کا رسالہ سائیکولوجی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اردو ادب میں اس کی بہت ہی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

محمد احسن عثمانیہ ہوسٹل اسلامیہ کالج پشاور

(ایک انگریزی خط کا ترجمہ)

محترمی!
آپ کے ماہنامہ "سائیکولوجی" کو پڑھ کر بے حد مسرّت ہوئی۔ خدائے عزوجل سے میری دعا ہے کہ اُس کی اشاعت دن دوگنی اور رات چوگنی ہو

نور محمد خان، مال روڈ، لاہور۔ (باقی صفحہ ۴۲ پر)

سَوال و جَواب

س ۔ مجھے کیا طریقے اِستعمال کرلے چاہئیں کہ میں ہر دلعزیز بن جاؤں؟

ج ۔ آپ رسالہ سائیکولوجی میں انسان کے "کردار" خلقی جبلتوں کی کارفرمائی اور اُن کے رَدِعمل کا بغور مطالعہ کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اس پر عمل بھی کیجئے ۔

س ۔ یہ تو بتایئے اِنسان کو غصّہ کیوں آتا ہے ؟

ج ۔ "غصّہ" انسان کی جبلیت ہے اور اُس کی کارفرمائی اُس وقت شروع ہوتی ہے جب کوئی جبلی یا اُصولی خواہش پُوری نہ ہو یا دو متضاد جبلتوں میں تصادم ہو جائے ۔ آپ کو کافی بھوک ہو لیکن آپ کو کھانے سے باز رکھا جائے ۔ آپ کو غصّہ آئے گا ۔ آپ اپنے کمرہ میں انتہائی صفائی کو ملحوظ رکھتے ہیں اگر کوئی اِس میں گندگی پھیلا دے تو آپ آپے سے باہر ہو جائیں گے ۔

جبلتوں میں "بھوک اور جنسی بھُوک" کا تصادم اُصولوں میں مذہبی نظریات کی ٹکر سَب سے زیادہ خطرناک غُصّہ کا سبب ہُوا کرتی ہیں ۔

س ۔ میرا بیٹا بہت محنتی ہے لیکن باوجود اُس کے اِسکول کے ہم جماعتوں میں سب سے پیچھے ہے ۔ میں اُس کی کند ذہنی سے عاجز آگیا ہوں مشورہ دیجئے کیا کروں ۔

ج ۔ آپ کے سَوال کے دو جز ہیں (۱) تعلیم میں سب سے پیچھے ہے (۲) "کند ذہنی" نے عاجز کر دیا ہے ۔ شائد آپ کو معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ سائیکولوجی نے "کند ذہنی" "یادداشت" کی خرابی جیسے "بے بنیاد" عقائد کو مٹا دیا ہے ۔

ذی ہوش معمولی اِنسان جو کچھ دلچسپی کے ساتھ دیکھتا یا سُنتا ہے اُسے کسی حالت میں بھلا ہی نہیں سکتا ۔ "یاد" ایک قِسم کی ہوتی ہی نہیں یہ کئی قسموں پر مشتمل ہے ۔ اور وہ ہر انسان کو معمولاً ضرور ملا کرتی ہے اِس لئے آپ کا عاجز آنا ظلم ہے ۔

باوجود محنتی ہونے کے اُسے سبق وغیرہ کیوں یاد نہیں رہتے ۔ تو اِس کی ذمہ داری نوے فیصدی اسکی خود کی نہیں ہے ۔ بلکہ آپ ، استاد ، ماحول وغیرہ ہیں ۔ ہوسکتا ہے کہ بالکل ابتدائی تعلیم آپ نے کسی ایسے اُستاد سے دلائی جو ظالم تھا اور بچہ کی طبیعت میں تعلیم کی طرف سے وہ خوف بیٹھ گیا ہو جو اُس کی دلچسپی اور توجہ کو مرکوز نہ ہونے دیتا ہو ۔ اِس کا اِمتحان یوں کیجئے کہ آپ اُسے کوئی دلچسپ ناول پڑھنے کو دیجئے یا سنیما دکھایئے اور مُدّت کے بعد اُس کے متعلق سوالات کیجئے ۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ بغیر کسی محنت یا بار بار یاد کرنے کے وہ اِس واقعہ کو من وعن دُہرا دے گا ۔ اب بھی آپ بچہ کو ایسے اُستاد کے حوالہ کیجئے جو طریقے سے سبق میں وہی ناول یا سنیما والی دلچسپی پیدا کر دے ۔ پھر یہ شکایت رفع ہو جائیگی ۔

س ۔ بعض صاحبان دوکان پہ کپڑوں کے تھان پہ تھان دیکھتے ہیں چہرہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خریداری کرنا چاہتے ہیں لیکن بغیر خریداری کئے ہی چلے جاتے ہیں ۔ ایسے موقعوں پر دوکان دار کو کیا کرنا چاہیئے ؟

ج ۔ اِنسان میں "مشورہ طلبی" اور "ریس" کے خلقی مادے ہوتے ہیں ۔ اُنہی کی بنا پر وہ دوسروں کی رائے مانتا ہے اور اُن کی تقلید کیا کرتا ہے ۔ بعض حضرات کو اِن کا حصّہ زیادہ مل جاتا ہے اس طرح وہ "مشورہ" کے محتاج ہو جاتے ہیں اور اُن کی قوتِ فیصلہ چند اشارات کی طالب ہوتی ہے ۔ مثلاً جس کپڑے کو وہ دیکھ رہے ہیں ۔ اُس کے متعلق اگر دوسری رائے ملے کہ یہ کپڑا ٹھیک ہے تو اب وہ یہ فیصلہ کر سکیں گے ۔ آپ کو اسی "ہاں میں ہاں" قسم کے حضرات سے شکایت ہے ۔

آپ کو چاہیئے کہ اُن کی "مشورہ طلبی" اور "ریس" سے فائدہ اُٹھائیں جب وہ ایک کپڑا دیکھ رہے ہوں تو اُن کے حسبِ حال موقع موقع سے آپ اِس قسم کے فقرے کہیں جو اُن کی قوتِ فیصلہ کو مدد دے سکے ۔ مثلاً یہ کپڑا اِس قدر بہت ہی باوضع معلوم ہوتا ہے ، کم قیمت اور بالانشیں ہے ◆

سید حمید الدین احمد رضا

شادی اور آج کل کا نوجوان

پاکستان اور ہندوستان میں عام طور پر شادیاں کی نہیں جاتیں بلکہ ہوتی ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ لڑکی اگر والدین کے پسند آگئی تو ہوگئی.... پسند کے معیار مختلف ہیں مثلاً "بھائی کی بیٹی ہے" یہ شادی دراصل والدین رشتے سے کیا کرتے ہیں اس لڑکی کے حالات کو اہمیت بہت ہی کم دی جاتی ہے۔ دوسرا مروج طریقہ یہ ہے کہ "صورت تو دیکھو جیسے چودھویں کا چاند" رگوں میں دوڑتا ہوا خون نظر آتا ہے" اس شادی کا معیار لڑکی کا ظاہری عارضی حسن ہوتا ہے۔ یہ طریقے بالعموم رجعت پسند حضرات کا معمول ہیں ایک معیار ترقی پسندانہ کا معیار" کا بھی ہے اس میں حسنِ صورت، رشتہ یا حسنِ سیرت کو دخل نہیں ہوتا بلکہ "باپ تو گورنر کے گہرے دوست ہیں" جاگیر کی آمدنی کی حد نہیں اور پھر لطف یہ کہ بیٹی بھی اکلوتی ہے" یہ شادی "دولت" سے کی جاتی ہے اور بیٹے کی خودداری کو اس کے آستانہ پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ اور وہ ساس گھر جنوائی کتا بن کر رہ جاتا ہے۔

معیار کوئی سا بھی کیوں نہ ہو ایک خصوصیت تقریباً ہر شادی کی یہ ضرور ہوتی ہے کہ لڑکی کا انتخاب والدین کرتے ہیں اور شادی کی جاتی ہے لڑکے سے! عملی زندگی میں لڑکے کو ہر ہر قدم پر عادات، نظریات اور پسندوں کی ٹکر کو جھیلنا ہوتا ہے۔ انہیں ہم آہنگ بنانا پڑتا ہے کامیابی ہوگئی تو قسمت اچھی تھی ورنہ ناکام ہونے کے باوجود میاں اور بیوی بن کر ہی رہتا ہے اس لئے کہ.... اور کریں بھی کیا۔ درحقیقت ان کی زندگی کا خاموش سانحہ اس وقت جبکہ حقیقت کی ضرب سے ٹکراتا ہے تو بول اٹھتا ہے

کوہ کن نے پہاڑ کاٹا تھا ❊ ہم نے کاٹے ہیں دن مصیبت کے

طرفہ یہ کہ معاشی نے مرد کو تفریح، تبادلۂ خیال اور تعیش کے غیر محدود اختیارات دے رکھے ہیں وہ گھر کی چار دیواری کے باہر زیادہ سے زیادہ وقت گزار کے اس بدمزگی کو بھلا سکتا ہے اس لئے ناکام شادی عورت کے حق میں ایسی دہکتی ہوئی آگ ہوتی ہے کہ جس میں شب و روز جلنے کے باوجود

شکوہ کرنے کی اجازت نہ فریاد کی ہے

اس غریب عورت کو جل جل کر ایسا کشتہ بننا پڑتا ہے جو خاوند اور والدین دونوں کے حق میں اکسیر ثابت ہو ورنہ خیر نہیں۔

یوں تو ناکام شادی زوجین کی زندگی کا سب سے زیادہ ناخوشگوار پہلو ہے اور خصوصاً صنفِ نازک جو نازکش والطاف کی مستحق ہے مورد عتاب ٹھیرتی ہے لیکن اس کے برے نتائج قومی تخریب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ عورت جو قوم کی تعمیر کا سنگِ بنیاد ہے جس کی آغوش طارقؓ، خالدؓ اور عمرؓ جیسے مجاہدینِ اسلام کا گہوارہ بن سکتی ہے جب سکونِ قلب کھو بیٹھے تو اولاد کی تربیت کے فرائض کیا ادا کرے گی اسے کب اطمینان ہوگا کہ وہ ننھے سے دل میں سکندرِ اعظم بن جانے کے عزائم پیدا کرا سکے۔ بس تمہید سے یہ مدعا نہیں ہے کہ چونکہ شادی دو نوجوانوں کی ہوتی ہے اس لئے والدین میدان خالی چھوڑ دیں اس میں تو اور بھی زیادہ خطرات ہیں مغربی ممالک کے شادی اور طلاق کے تناسب کے مطالعہ سے اس کے نقائص کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے طریقہ تو مشرقی ہی مناسب ہے ضرورت نظریات کی تبدیلی اور حقیقی فرائض کے احساس کی ہے۔

جوانی میں جنسی بھوک کا غلبہ اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ اگر نوجوانوں کو مطلق العنان چھوڑ دیا جائے تو ان کی نظرِ انتخاب کردار، ماحول اور زمانہ کے نشیب و فراز سے ہٹ کر صرف حسن کے نشیب و فراز میں گم ہو جائے گی۔ عقل مندی اسی میں ہے کہ نوجوان اپنی ناتجربہ کاری کے نقص کو والدین کی تجربہ کاری سے بدل لیں۔ والدین یہ طے کرلیں کہ شادی نوجوان کے ساتھ ہوگی اس کی عادات، پسند دل اور نظریات کی زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی کس دوشیزہ کی سیرت سے ہو سکے گی اس تلاش میں پورا فرض ادا کرنے کے بعد آخری فیصلہ کا حق نوجوان ہی کو دیں تاکہ اُسے اپنے انتخاب کی لاج رکھنے کا احساس ہو۔ شادی کی گرہ میں منسلک ہو کر یہ دونوں ایک جان اور دو قالب ہو سکیں۔ اگر اس کا لحاظ نہ کیا گیا تو پھر یہ ایسی دو تلواریں ہوں گی جو نیام میں رکھ دی گئی ہوں۔

اسلام نے شادی کے ان تمام پہلوؤں پر بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے

ایک طرف والدین کو ذمہ دار قرار دیا ہے اور مجاز کیا ہے کہ وہ اپنے دیرینہ تجربہ اور پدرانہ ہمدردی کے جذبات کے ماتحت نوجوان کی عملی زندگی کو کامیاب بنانے میں صحیح ترین راہبری کریں۔ ادھر نوجوان مرد اور عورت کو ایجاب و قبول کے اختیارات دینے کا صاف منشاء یہ ہے کہ والدین شادی کے مسئلہ کو صرف اپنے اقتدار اعلیٰ کا میدان ہی تصور نہ کریں بلکہ یہ محسوس کئے رہیں کہ مالک نے فیصلہ کا حق نوجوانوں کو دیا ہے ایسا نہ ہو کہ ان کے غلط انتخاب کرنے سے یا جانب داری کی بنا پر نامناسب رائے قائم کرنے سے نوجوانوں کی زندگیاں تباہ ہو جائیں اور زیادہ ان کے مشورے کو ٹھکرا کر سمجھدار لوگوں کی نظروں سے گرا دیں۔ والدین نے اس نازک اشارہ کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور شادی کے معاملہ کو اس درجہ محدود کر دیا ہے کہ اولاد کی آواز میں وزن ہونا تو درکنار۔ اگر کبھی سننے میں آبھی جائے تو "بے غیرتی گستاخی حتیٰ کہ بے دینی" کے خطابات تجویز کر دیئے جاتے ہیں۔ اولاد ناخلف ٹھیرائی جاتی ہے اور ماں تاکی ماری ماں اگر اولاد کی جانبداری بھی کرے تو والد صاحب قبلہ گھر بار ہی سے قطع تعلق گوارہ کر لیتے ہیں لیکن اس جائز حق کے استعمال کو برداشت نہیں فرماتے۔

والدین پر اولاد کے جہاں پرورش، تربیت، تعلیم وغیرہ کے اہم فرائض ہیں وہاں شریکۂ حیات کے مناسب اور صحیح انتخاب میں راہبری کرنا بھی ایک فرض ہے جہاں اس فرض کو خود غرضی اور خود رائی کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے وہاں آخر میں ایک طرف عورت کو یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ خاوند مجازی خدا ہے اس لئے اس کے ہر بے جا حکم کی تعمیل بھی عبادت ہے۔ دوسری طرف پریشان اولاد کو خاندان کی عزت، خاندانی روایات کے برقرار رکھنے کی خاطر محسوس کرایا جاتا ہے کہ سر گلے کان ہیں اب جدا نہیں ہو سکتے۔ درحقیقت نوجوان کی سیرت کے لحاظ کو نظر انداز کر دینا اور اس کے فیصلہ کے حق کی اہمیت کو بھلا دینا اسلامی روایات کو ٹھکرا دینا ہے۔ اور اسی لئے بجائے قدرتی ہم آہنگی اور سکون حاصل کرنے کے مختلف دباؤ ڈال کر زوجین کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ سکون کی زندگی بسر کریں ا۔

مذہب اسلام نے اختیارات کی تقسیم کے وقت سائیکالوجی کے ایک نازک پہلو کو اور بھی ملحوظ رکھا ہے۔ والدین جو آج اپنی اولاد کی شادی کرنے کے بعد ان کی زندگی کے اہم ترین باب کا افتتاح کر رہے ہیں وہ کل ساس اور سسر کا درجہ حاصل کر لینگے۔ اس وقت ایک طرف تو اولاد کی طبعی محبت کے اثر کے ماتحت اسے اپنی طرف اسی طرح رجوع اور راغب دیکھنا چاہیں گے جس طرح کہ شادی سے پہلے اور دوسرا ایک دوسری حیثیت کے زیر اثر اپنی زوجہ سے جنسی بھوک رفع کر لیں نہ صرف والدین کی طرف سے بڑی حد تک غافل ہو جائے گا بلکہ اس کی تمام تر توجہات قدرتی طور پر جنسی رغبت کے ماتحت بیوی ہی کے حق میں ہوں گی اس لئے ایسا نہ ہو کہ زندگی کے اس باب کے افتتاح کرنے کے بعد آپ اپنے بیٹے کی کم توجہی کا ذمہ دار بہو کو قرار دیں اور یہ یقین کر کے کہ وہ بیٹا چھینے لیتی ہے اس سے مستقلاً بیر باندھ لیں۔ درحقیقت اس بے توجہی کے اسباب فراہم کرنے کا تو آپ کو برسوں سے ارمان تھا آپ کی تمنا تھی کہ آپ اپنے بیٹے کے لئے ایک حسین دلہن لائینگے۔ کیوں؟ اسی لئے کہ وہ خوش ہو کر اس کی طرف راغب ہو۔ پھر اگر ایسا ہی ہوا تو شکوہ یعنی چہ اور اگر فی الواقع آپ کی بہو کی سیرت آپ کے صاحبزادہ کی سیرت سے ہم آہنگ نہیں ہے اور اس میں ایسے عیوب ہیں جنہیں آپ برداشت نہیں کر سکتے تو اس وقت جب آپ اسکا انتخاب کر رہے تھے۔ اس کا لحاظ کیوں نہ رکھا۔ ان عیوب کو واضح کیوں نہ کیا آپ کو انتخاب کرنے کا حق تھا۔ آپ کو سیرت کے زیادہ سے زیادہ قریب ہو کر مطالعہ کرنے کا موقعہ تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ نفسیاتی تجربہ کے ماتحت والدین اور نوجوان دونوں کو اپنی حدود کا اگر پورا احساس ہے تو شادی کامیاب ہو سکتی ہے۔ نوجوان جنسی بھوک بجھانے کی خاطر شادی کی تمنا کرتا ہے والدین کو اپنے دیرینہ تجربہ کے ماتحت اس نازک موقع پر سیرت کی ہم آہنگی کی تلاش کرتے ہیں پوری دیانت داری سے کام لینا چاہئے۔ جائداد، تعلقات، خاندانی روایات، بات کی پچ وغیرہ جہالت کے علامات ہیں۔

استقلال اور شہرت

حقیقۃً اگر آپ کے اندر استقلال ہے تو آپ اس کی مدد سے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ دشمنوں کو اپنا دوست بنا سکتے ہیں۔ ان میں اعتماد اور یقین پیدا کر سکتے ہیں شہرت اور دولت میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ آپ اپنے ہی لئے نہیں اپنے احباب اور عزیزوں کے لئے ایک فخر کا باعث بن سکتے ہیں۔ لوگ آپ کی کامیابی پر جو آپ کی استقلال کا نتیجہ ہوگی آپ کو مبارک باد دینے کے لئے کھنچے چلے آئینگے۔ آپ کے نام پر اداروں کے نام رکھے جائینگے۔ اسکولوں کے نام رکھے جائینگے سڑکوں کے نام رکھے جائینگے اور آپ ہر دلعزیز لیڈر فخر قوم و ملک کے نام سے روزناموں اور ماہ ناموں میں یاد کئے جائیں گے۔ یہ صرف آپ کے استقلال کا ثمرہ ہوگا۔ اور استقلال و تحمل سے اپنے کام میں دلچسپی لیجئے کچھوا اپنی مستقل مزاجی سے خرگوش سے بازی لے گیا تھا۔

روپیہ اور سیرت

کیا آپ نے کبھی اِس بات پر غور کیا ہے کہ مفلسی سے مُصیبت پَیدا ہوتی ہے ۔ اور روپیہ کا صحیح مصرف دنیا کی ہر پریشانی کو دُور کر دیتا ہے۔ روپیہ پیدا کرنے کے لئے سیرت کی ضرورت ہے اور سیرت روپیہ سے بنتی ہے

وہ لکھپتی جس نے بے حساب دولت پَیدا کی ہے جانتا ہے کہ کس طرح دولت پَیدا کی جاتی ہے لیکن اُس نے اور ہزاروں انسانوں کے لئے راستہ کھول دیا ہے وہ اُس کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں کہ کس طرح سلیقہ سے روپیہ صرف کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ بچایا جائے ۔ روپیہ میں وہ قوت ہے کہ لوگوں کی سخت سے سخت مشکلات کو بالواسطہ یا بلا واسطہ حل کر دیتا ہے ۔ شرط یہ ہے کہ اِس کا مصرف صحیح ہو۔

جو رسی سے خوشحالی پَیدا ہوتی ہے ۔ یہ عادت نہ صرف خوشحالی پَیدا کرتی ہے بلکہ آدمی میں عقل و دانش، ہمّت و اِستقلال آزادی و قوتِ ایمان بھی پیدا کر دیتی ہے ۔ غرض روپیہ بچانے اور اُسے بنک میں رکھنے کی عادت سب عادتوں سے زیادہ مفید و کار آمد ہے

یہ عادت آپ کے دل و دماغ کو قوی رکھتی ہے اور اُن کی صحیح رہنمائی کرتی ہے ۔

یہ عادت آپ کی خودداری میں اضافہ کرتی ہے ۔

یہ عادت آپ کے لئے میٹھی نیند خوش خوراک اور خوش کامی کا باعث ہوتی ہے ۔

یہ عادت آپ کو مفلس و قلّاش سے سرمایہ دار اور دولتمند بنا دیتی ہے ۔

یہ عادت آپ کو نقدہٗ و حرمتہٗ کی قوت سے آگاہ کر دیتی ہے۔

یہ عادت آپ کو لوگوں کی نظروں میں اونچا کر دیتی ہے اور سب آپ کی عزّت و توقیر کرتے ہیں ۔

یہ عادت بنک میں آپ کی ساکھ قائم رکھتی ہے ۔

یہ عادت آپ کو نوکری چھوٹ جانے کے خوف سے آزاد کر دیتی ہے ۔

یہ عادت آپکو اِس قابل بنا دیتی ہے کہ آپ اپنے بال بچوں کی مُسرّتوں میں روز بروز اضافہ کر سکتے ہیں ۔

یہ عادت بڑھاپے میں آپ کے آرام و آسائش اور بے فکری کی ضامن ہوتی ہے ۔

یہ عادت آپ کی اچانک بیماری میں کسی آفتِ ناگہانی میں یا اور کسی فوری ضرورت کے وقت آپ کے آڑے آتی ہے ۔

یہ عادت آپ کے لئے ایسے ذرائع مُہیا کر دیتی ہے کہ آپ جب چاہیں اور جس قسم کا چاہیں سودا کر سکتے ہیں ۔

یہ عادت آپ کے لئے ایسا سرمایہ پیدا کر دیتی ہے کہ آپ آسانی سے اپنے کاروبار کو وسعت دے سکتے ہیں ۔

یہ عادت آپ کے پیسے کو کام میں لگائے رکھتی ہے ۔ اور دولت کا یہی راز ہے ۔

یہ عادت آپ کو ہر وقت مستعد رکھتی ہے کہ آپ کسی منافع بخش کاروبار میں روپیہ لگا سکتے ہیں ۔

یہ عادت آپ کے لئے اس مُسرّت کا باعث ہوتی ہے جو دولت کو بڑھتا ہوا دیکھکر حاصل ہوتی ہے ۔

یہ عادت آپ کو روپیہ ضائع کرنے سے بچاتی ہے اور فضول خرچی سے محفوظ رکھتی ہے اور آپ کو محتاط بنا دیتی ہے ۔

یہ عادت آپ کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ آپ کی اُمیدیں حقائق میں بدل جاتی ھیں اور آپ کے خواب سچے ہو جاتے ہیں۔

آپ کہیں گے ہر سمجھدار انسان چاہتا ہے کہ روپیہ بچے لیکن آخر یہ ہو تو کیسے ہو۔ آپ کے غور کرنے کے لئے چند اشارے ہیں ان پر توجہ دیجئے شائد یہ آپ کو صحیح راستے پر ڈال سکیں اور پھر آپ اپنی جگہ مضبوط ہوتے چلے جائیں:۔

(۱) اِس سلسلے میں کسی اچھے بنک کے کارکنان سے مشورہ کیجئے وہاں سے بہت مفید معلومات حاصل ہوں گی اور بہت سی نئی نئی تجاویز آپ کو ملیں گی۔

(۲) کم از کم صرف ایک ہی ماہ کے لئے اپنے تمام اخراجات کو قلمبند کرتے جائیے اور پھر اُن پر نظر ڈالئے آپ کو پتہ چلے گا بہت سے اخراجات فضول ہی ہوئے۔ کفایت شعاری سے متعلق کتابیں مطالعہ کیجئے اور اُن سے رہنمائی حاصل کیجئے۔

(۳) کفایت شعاری سے متعلق رسائل کا مطالعہ بھی مفید ہے۔ کسی بچت سوسائٹی کے ممبر ضرور بن جائیے۔ گھر میں یا دفتر میں کفایت شعاری کی کمیٹی ضرور بنائیے اور جو شخص سب سے زیادہ بچائے اُس کے لئے انعام مقرر کیجئے۔

(۴) اپنے ذاتی اخراجات اور کاروباری اخراجات کا بجٹ ضرور بنا لیجئے اور اس کے مطابق آمد و خرچ رکھئے

(۵) اخبارات کا مطالعہ ضروری ہے اگر کوئی نفع کا سودا نظر پڑے تو دیر نہ کیجئے تاکہ بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔

(۶) ایسی دوکان سے سودا خریدیئے جس کا اشتہار بہت زیادہ ہوتا ہو کیونکہ یہ سودا اچھا اور سستا ہی رہتا ہے۔

(۷) صبح کو گھر سے نکلو، تو اپنی جیب میں اتنا ہی رکھئے جو دن بھر کے لئے کفایت کرے۔ پیسہ پیسہ جمع کرنا سیکھئے روپیہ آپ جمع ہو جائیں گے۔

(۸) جب آپ کا دل بے حد مجبور کرے تو کسی خاص مقصد ہی کے لئے روپیہ نکالئے اگر یہ اصول آپ نے سامنے رکھا تو آپ فائدہ میں رہیں گے کیونکہ بعض اوقات معمولی معمولی خواہشات پر آپ پھسلیں گے اور خرچ کرنے پر آمادہ ہوں گے لیکن یہ عادت آپ کے روپیہ کو بچا لے گی۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ معمولی ضروریات میں روپیہ خرچ کر دیا جاتا ہے اور جب کوئی اہم ضرورت پیش آتی ہے تو بغلیں جھانکتے ہیں۔

(۹) جونہی آپ کو تنخواہ وغیرہ ملے اسی وقت آمدنی کا دس فی صدی فوراً الگ نکال لیا کیجئے اور جلد اسے بنک میں جمع کرا دیجئے۔ اِس کے بعد خرچ کا خیال کیجئے۔ اس دس فی صدی کو اپنا نہ تصور کیجئے بلکہ مستقبل کا سرمایہ سمجھئے۔ خواہ آپ کو کچھ ہی خریدنا ہو اور آپ کی کیسی ہی ضرورت ہو لیکن یہ دس فی صدی ضرور بچا لیجئے۔

"جی چاہتا ھے"

(جناب شیوا بریلوی)

غمِ دل سُنانے کو جی چاہتا ہے — نصیب آزمانے کو جی چاہتا ہے
محبّت جتانے کو جی چاہتا ہے — قیامت اٹھانے کو جی چاہتا ہے
تلی کا مآلِ تبسّم مُسَلَّم — مگر مسکرانے کو جی چاہتا ہے
کچھ ایسا ہے دلچسپ لفظِ محبّت — فسانہ بنانے کو جی چاہتا ہے
ہے تعبیر مبہم مجاز و حقیقت — یہ پردہ اٹھانے کو جی چاہتا ہے
خود آرائیوں کی تمنّا میں سمجھا — تماشا بنانے کو جی چاہتا ہے
جو اُن حشر سامانیوں سے نہ جھپکے — وہ فتنہ اُٹھانے کو جی چاہتا ہے
وہی ذکر واعظ کے لب تک آیا — جو سُننے سُنانے کو جی چاہتا ہے
نگاہوں کے ہر چند ہیں وارے چرچے — مگر دل بڑھانے کو جی چاہتا ہے
نہیں محرمِ ظرف معیارِ جلوہ — نگاہیں چرانے کو جی چاہتا ہے

زمانہ نہیں صاف گوئی کا شیوا
حقیقت چھُپانے کو جی چاہتا ہے

اصغر انصاری

جنسی تعلیم

موجودہ دور میں کون ہے جو اس حقیقت سے انکار کر سکے کہ جنسی تعلیم بچّوں کے لئے اشد ضروری نہیں۔ ہمارے "بزرگ" خود ہی جنسی جہالت کا شکار ہیں اور بچّوں کی جنسی بے راہ روی کی تمام ذمہ داری اُنہیں کے سر آتی ہے۔ یہ امر آپ سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ بچّوں میں جنسی بدنظمی کے بیج خود ہمارے والدین کے بوئے ہوئے ہوتے ہیں، جہالت کے گہوارے میں بچّوں کی پرورش ہوتی ہے۔ اور زندگی کے وہ واقعات جن سے اُن کی آئندہ تمام زندگی وابستہ ہوتی ہے اُن سے پوشیدہ رکھے جاتے ہیں۔ اِس غلط تربیت کا بدترین ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ بچّے اپنے بزرگوں کے جنسی اندازِ نظر کی جو پہلے ہی غلط اور گمراہ کن ہوتا ہے نقل کرنی شروع کر دیتے ہیں۔

گذشتہ سالوں میں جنسیات پر کافی مواد جمع ہو گیا ہے۔ اور اب تعلیم یافتہ والدین محسوس کرنے لگے ہیں کہ انہیں اِس مجرمانہ خموشی کا طلسم توڑنا ہی پڑے گا اور کچھ نہ کچھ جنسی معلومات نوجوانوں کو پہنچانا ہی ہوگی اب اِس پر عمل اِس طرح ہوتا ہے کہ بچّے جب سنِ بلوغ کو پہنچ جاتے ہیں تو اُن کے والدین جنہوں نے اِدھر اُدھر سے کچھ جنسیات پر کتابیں پڑھ لیں ہیں اپنے آپ کو اپنی اولاد سے جنسی مباحثے کے لئے تیار کرتے ہیں۔ اِس گفتگو کے دوران میں ماحول اِس قدر کشیدہ اور پریشان کن ہوتا ہے کہ یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اولاد زیادہ گھبرائی ہوئی ہے یا والدین زیادہ مضطرب ہیں بہرحال اِس مہم کو کچھ اِس طرح سر کیا جاتا ہے کہ گویا ایک فرضِ ناگوار اور بارِ گراں کسی طرح سر سے اتار پھینک دینا ہے بس سمجھئے یہ دماغی کشمکش ختم ہوگئی اور صاحبزادے صاحب گویا جنسیات کے ماہر ہو گئے اِس حادثے کے بعد پھر وہی دیرینہ خوردی اور بزرگی کے تعلقات اولاد اور والدین کے درمیان قائم ہو جاتے ہیں۔

یہی ایک طریقہ ہے جس طریقے پر یہ کام ہرگز نہیں ہونا چاہیئے اِس طرح کی بے جان ڈرامائی گفتگو کا سب سے زیادہ خطرناک اور زہریلا اثر نوجوانوں کے دلوں میں یہ قائم ہوتا ہے کہ جنس کوئی ایسی بعید الفہم عجیب اور پر اسرار ہے کہ جس کو تالے اور کنجی میں بند کر کے رکھنا بہت ضروری ہے ورنہ کیوں اِس مخفی اور گھبرائے ہوئے انداز میں گفتگو کی جاتی۔ برخلاف اِس کے حقیقت یہ ہے کہ جنس اور اُس کے متعلق جتنی چیزیں ہیں اُن کا حیاتِ انسانی سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ اور درحقیقت ہم زندگی اور جنس کو علیحدہ علیحدہ نہیں کر سکتے اس لئے کہ جنسیات ہی اصل زندگی ہے۔ اور وہ اِس کے تانے بانے سے بنی ہے۔ جب ہمارا جنسی اندازِ فکر ہی غلط ہو تو سمجھ لیجئے کہ ہمارا پُورا نظریۂ حیات ہی غلط ہے۔ ہماری تمدنی اور معاشرتی زندگی میں جنس اِس طرح مدغم ہے کہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جنس زندگی اور زندگی جنس ہے۔ اگر ہم اِس بات کو مانتے ہیں تو پھر ہم کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ احساسِ جنسی ماں کی گود سے شروع ہوتا ہے اور گوشہ قبر میں ختم ہوتا ہے، پھر اگر یہ بات ہے تو جنسی گفتگو کے آغاز کے لئے کسی خاص عمر کا تعین یا انتظار بالکل غلط سی چیز ہے۔ کیا اِس خاص عمر تک پہنچنے سے پہلے جنس کا وجُود نہیں ہوتا؟

اگر ہم فرائیڈ کے اُن نظریات کو غلط بھی تصوّر کر لیں جن کا تعلق شہوانی مظاہرات سے ہے تب بھی یہ بات ظاہر ہے کہ بچّے میں اپنی عمر کے دوسرے سال کے اختتام تک اپنے عضوِ تناسل کا شعوری اِحساس پیدا ہو جاتا ہے اور تیسرے سال میں بالعموم وہ پوچھنے لگتا ہے کہ وہ اپنی بہن یا بھائی سے مختلف کیوں ہے۔؟ بعد کے سالوں

میں پھر وہ معمل کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ "یہ مرغی کے بچے کہاں سے آتے ہیں"؟ "یہ کیسے بنا تھا"؟ "اور میں آیا کہاں سے"؟ یہ سوالات بچہ اُسی انہماک اور حیرت سے پوچھتا ہے جس طرح وہ دوسرے بے ضرر سوالات اپنے ماں باپ سے کیا کرتا ہے، ظاہر ہے ان سوالات کے جوابات بھی اُتنی ہی صفائی اور سچائی سے دینا چاہئیے جس طرح اُس کے دوسرے سوالوں کے جواب دیئے جاتے ہیں۔ تمام ماہرینِ جنسیات کی متفقہ رائے ہے کہ بچوں کی جنسی تعلیم، جہاں تک کم از کم مفردات یا عناصر کا تعلق ہے، جتنی جلدی شروع ہو سکے اتنا ہی بہتر ہے اور اس کام کے لئے ایک سمجھدار ماں سے بہتر اتالیق ملنا ناممکن ہے

یہاں یہ بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ بچوں کا پیدائش کے متعلق استفسار کوئی جنسیاتی علامت نہیں ہوتا ہے بلکہ اُس کا تعلق تجسسِ فطرت انکشافِ حقیقت اور تفحصِ راز ہوتا ہے۔ اِس لئے یہ سوالات اُتنے ہی فطری ہوتے ہیں جتنے یہ سوال کہ سورج شام کو افق کے پار کہاں چلا جاتا ہے۔ اُن کے سوالات کے جوابات اُتنے ہی صاف اور واضح دینا چاہئیے جتنے اُن سوالوں کے جواب دیئے جاتے ہیں۔ ہاں یہ ضروری نہیں کہ بچے کی رازجو فطرت کی تسکین کے لئے آپ اِسے سورج کے غروب ہونے کے متعلق علم الافلاک کے نکات سمجھانے لگیں۔ تولیدِ نسل کے متعلق آپ کو اُسے سادہ مگر نہایت واضح اور سلیس جواب دینا چاہئیے۔ ایک دفعہ اگر آپ اُسے تسلی بخش جواب دے دینگے۔ تو اُس کی توجہ پھر فوراً دوسرے سوالات کی طرف منعطف ہو جائے گی۔ اور اُن دوسرے سوالات کے جوابات نسبتاً آسانی سے دیئے جا سکیں گے مثلاً "آگ گرم کیوں ہے"؟ "آسمان کا رنگ نیلا کیوں ہے"؟ "بارش کہاں سے ہوتی ہے"؟ "بادل کیا ہوتے ہیں"؟ یہ ایک سمجھدار ماں ہی کا کام ہے کہ وہ بچوں کے مضطرب اور متجسس دل و دماغ کو تسکین پہنچائے اور اِس دنیا کے متعلق تسلی بخش جواب دے جو اُن کے لئے بالکل نئی ہے۔

اِس فطری اسلوب اور طریقہ کار پر عمل کرنے سے بچے بلوغت کی عمر تک پہنچنے سے پہلے وہ سب کچھ سیکھ لیتے ہیں جس کا سمجھ لینا اور جان لینا اُن کے لئے ضروری ہوتا ہے اور وہ ان باتوں کو صرف سمجھ کر قبول ہی نہیں کر لیتے بلکہ ان معلومات اور انکشافات کی اُن کے دل میں ایک خاص اور صحیح جگہ پیدا ہو جاتی ہے۔ جب اُن کے جذبۂ تجسس کی تسکین ہو جاتی ہے تو پھر وہ اِس موضوع کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں، کم از کم اس وقت تک کے لئے تو ضرور جب تک کہ اُن کے دل کے افق پر نئی تبدیلیاں نئی گتھیاں، نئے معمے اور نئے سوالات ہویدا نہیں ہوتے۔

بچہ جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے، وہ ابتدائی جنسی تربیت جو اُس نے ایک سمجھدار ماں اور ایک مشفق باپ سے حاصل کی ہوتی ہے، اسکول اور کالج کی اعلیٰ تعلیم میں بہت ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ اکثر والدین جنسی تعلیم کی تمام تر ذمہ داری اسکول کے ماسٹروں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ انگلستان کی سوشل ہائی جین کونسل بھی ایک دفعہ کچھ تجرباتی تحقیقات کے بعد اسی نتیجے پر پہنچی تھی۔ لیکن اس کے برخلاف انگلستان کی انجمن اساتذہ کی مجلسِ منتظمہ نے بچوں کے نصابِ تعلیم میں علم الحیات کی اہمیت مانتے ہوئے ایک تجویز منظور کی تھی کہ بچوں کو اسکولوں میں جنسی تعلیم دینا نامناسب ہے اور بچوں کے عام مفاد کے خلاف ہے لیکن حالیہ صورت یہ ہے کہ اکثر والدین یہ ذمہ داری اساتذہ کے سر تھوپتے ہیں۔ اور اساتذہ والدین کے سر منڈھتے ہیں مگر میرے خیال میں دونوں طریقۂ تعلیم ضروری ہیں۔ وہ اِس طرح کہ والدین بچوں کا ابتدائی استعجاب مٹائیں اور اساتذہ ابتدائی علم الحیات کے اسباق کے ذریعے اُن کی پیاس بجھائیں یہ دونوں طریقۂ تعلیم ایک دوسرے کے بدل نہیں ہیں بلکہ متمم ہیں۔

یہ تو صحیح ہے کہ علم الحیات کی تعلیم کا طریقۂ کار بالکل اساتذہ پر چھوڑ دیا جائے۔ لیکن علم الحیات کے نصاب کو جنسی تعلیم کا ذریعہ بنانا بالکل غلط ہوگا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اکثر دودھ پلانے والے جانوروں کا طریقۂ تولید سمجھانے کے لئے اساتذہ درختوں اور پودوں کی افزائشِ نسل کے مسئلے کو ذریعہ بناتے ہیں۔ یہ بات غلط ہے۔ بلکہ پودوں اور درختوں کے مسئلہ تولید کو اس قدر غیر شخصی انداز میں بیان کرنا چاہئیے کہ بچے

چاندنی رات

(عبدالعزیز فطرت)

کو کسی قسم کا شعوری یا غیر شعوری احساس ہی نہ ہو کہ اِس مسئلہ کا جبلت انسانی یا افزائشِ نسلِ انسانی سے کوئی تعلق ہے

ٹکر (TUCKER) اور پراؤٹ (PROUT) نے اپنی کتاب "مدارس میں جنسی تعلیم" میں تحریر کیا ہے کہ ایک جماعت میں جہاں مندرجہ بالا طریقہ کار استعمال کیا گیا وہاں جیسے ہی دُودھ پلانے والے جانوروں کی تولیدِ نسل کا ذکر آیا ویسے ہی جماعت کے طلبا میں ایک ہیجانی کیفیت ایک خاص قسم کی بے چینی نمایاں معلوم ہوئی جس سے اساتذہ اور طلباء دونوں ہی یکساں متاثر معلوم ہوتے تھے۔

میں نے اِس مضمون کے شروع میں ہیں اس بے جان اور ڈرامائی گفتگو کا جو والدین (یہ) بالغ اَولاد سے کرتے ہیں ذکر کیا اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بلوغت اپنے ساتھ پیچیدہ مسائل کی گتھیاں نہیں لاتی یا گتھیوں کو سلجھانے میں اولاد کو اپنے والدین کی مدد کی ضرورت نہیں پڑتی ہر عمر کے چند مخصوص مسائل اور چند مخصوص میلانات ہوتے ہیں۔ بلوغت ایک لڑکے یا لڑکی کی زندگی میں ایک نہایت ہی نازک دور ہوتا ہے اور بد قسمتی سے بعضوں کے لئے یہ دَور اپنے ساتھ جنسی بدنظمی اور پیچیدہ اُلجھنیں بھی لاتا ہے۔ بلوغت گویا پہلا تجربہ ہے جوانی کے بے پایاں سمندر کا جس میں تیر کر اُنہیں گذرنا ہے۔ اِس نازک دَور میں نوجوانوں کو خود محسوس کرنا چاہیئے کہ اگر واقعی کسی جنسی مسئلہ میں اُنہیں کسی کی مدد کی ضرورت ہے تو وہ صرف اُن کے والدین ہیں جن سے اُنہیں رجُوع کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر بد قسمتی سے والدین نے اُن کے سوالات کے جوابات بچپن میں تسلی بخش نہیں دیئے ہیں یا اُن سوالات پر پریشانی کا اظہار کیا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسے نوجوان ہرگز اُن سے رُجوع نہیں کریں گے۔

یہاں بلوغت کے متعلق یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ نسل اور موسم کا اثر بلوغت کے اظہار پر بہت پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ سرد ممالک میں بچے نسبتاً دیر سے بالغ ہوتے ہیں اور گرم ممالک میں جن میں ہندوستان بھی شامل ہے نسبتاً جلدی بالغ ہوتے ہیں۔ یہ بھی خیال ایک حد تک صحیح ہے کہ شہری زندگی میں بچے زیادہ جلدی بالغ ہوتے ہیں اور وہ بچے بھی جو عیش و عشرت کی زندگی میں پروان چڑھتے ہیں بہ نسبت اُن بچوں کے جو غربت کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں جلدی بالغ ہو جاتے ہیں۔

بلوغت کی عمر پر پہنچنے کے بعد جن مسائل سے بچے دوچار ہوتے ہیں اُن میں سب سے اوّل احتلامِ شب ہے، جس کو بالعموم "خواب" کہتے ہیں۔ یہ ایک بالکل جسمانی چیز ہے بلکہ دراصل ذریعہ جنسی غدود کی رطوبت کے اخراج کا، اِسی لئے احتلام کے بعد کچھ جسمانی سکون سا مل جاتا ہے۔ رگوں کا کھچنا، بدن کا ٹوٹنا ختم ہو جاتا ہے۔ اور ایک طرح کی جنسی ہم آہنگی کا دَور شروع ہو جاتا ہے لیکن بعض دفعہ اس تناؤ اور اِس اُلجھن سے چھٹکارا پانے کے لئے بچے جلق شروع کر دیتے ہیں اور اگر نہ کریں تو قدرت خود اِس کا انتظام احتلام کی صُورت میں کر دیتی ہے احتلام کے لئے یہ ضروری نہیں کہ کوئی ملذذ خواب دکھائی دے۔ چونکہ لوگوں کے جسم کی ساخت اور اُٹھان مختلف ہوتی ہے اِس لئے بعض بچوں کو جنسی سکون جلد ہو جاتا ہے اور بعض کو دیر میں، لیکن پھر بھی اوسطاً مہینے میں تین چار دفعہ سے زیادہ خواب نہیں ہونا چاہیئے۔

اب یہ سمجھ لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کہ ایک حساس لڑکے کیلئے یہ "خرابی" مسئلہ کتنا پریشان کن ہوتا ہے اور بالخصوص اُس صورت میں جبکہ ابتدائی جنسی تعلیم و تربیت سے محروم رکھا گیا ہو۔ اِس مشکل کی نوعیت اور کتنی زیادہ پریشان کن ہو جاتی ہوگی جب وہ یہ دیکھتا ہوگا کہ وہ "بزرگ" جو اُس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ ہر قسم کے جنسی مظاہرات کو صرف معیوب ہی نہیں سمجھتے بلکہ گناہ بھی سمجھتے ہیں۔ اِس صُورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دن رات اُنہی خیالات میں الجھا رہتا ہے اور جتنا وہ ان خیالات سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اتنا ہی وہ گویا لاشعوری طور پر اور اُلجھ جاتا ہے، تا آنکہ اُس کی تمام تر توجہات کا مرکز صرف جنس ہو کر رہ جاتا ہے، اِس طرح ایک ایسا فاسد چکر قائم ہو جاتا ہے جس سے اس کا نکلنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ اِس سے صرف اس کی صحت ہی پر اثر نہیں پڑتا بلکہ اُس کے اندر کچھ نفسیاتی گتھیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور گویا جسم و دماغ دونوں ہی حیثیت سے وہ بیمار ہو جاتا ہے۔

اگر اس کی ابتدائی جنسی تربیت صحیح اسلوب پر ہوئی ہوتی، اگر اُسے یہ معلوم ہوتا کہ جنس اور گندگی ایک دوسرے کے مترادف نہیں ہیں بلکہ جنس زندگی کا ایک مُقدّس چشمہ ہے، اِس کے اندر کوئی گناہ پوشیدہ نہیں ہے، یہ کہ اب وہ جوانی کے حُدود میں قدم رکھ رہا ہے اور یہ بھی کہ بیش از ضرورت رطوبت کے اخراج کا یہی ایک صحیح راستہ تو تو اِس طرف توجہ کرنے کے بجائے وہ اپنا وقت کھیل و تفریح دوست احباب کی محفل اور دیگر دل پسند مشغولیتوں میں صرف کرتا۔

بچے کے سنِ بلوغت کو پہنچنے کے بعد والدین کا فرض ہوجاتا ہے کہ وہ باقاعدہ طبی معائنہ کرانے کے بعد یہ یقین کرلیں کہ بچے کے تناسلی اعضاء میں کسی قسم کی بیماری یا اُن کے نشوونما میں کوئی رکاوٹ تو نہیں ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا (اور نہیں کیا جاتا ہے) تو اکثر و بیشتر وہ بچے جنھیں کسی قسم کا عارضہ ہوتا ہے اُن کا تمام وقت اِن ہی الجھنوں میں صرف ہوجاتا ہے اور چونکہ وہ اپنا حالِ دل کسی سے کہتے نہیں اور اسی کے متعلق سوچتے رہتے ہیں۔ اِس لئے اُن میں ایک قسم کا اعصابی ہیجان پیدا ہوجاتا ہے۔ اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اور پھر اُس کے اثرات اُن کی تمام زندگی پر چھا جاتے ہیں۔ والدین کا کام صرف پند و نصائح پر ہی ختم نہیں ہوتا۔ والدین کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ نوجوان اولاد کے دماغ میں یہ بات کبھی آتی ہی نہیں کہ اُسے اپنے جنسی پریشانیوں کا ذکر اپنے والدین سے کرکے اُن کی مدد مانگنی چاہیئے جس طرح دیگر مسائل میں وہ ہمیشہ اُن سے رجوع کرتے رہے ہیں۔ والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کے دلوں میں یہ راسخ کرادیں کہ وہ اُن کے بہترین مددگار اور ہمدرد دوست ہیں اور اگر وہ اپنے مسائل اُن کے سامنے رکھیں گے تو وہ صرف ہمدردی سے سنیں گے ہی نہیں بلکہ اُن کو حل کرنے میں پورا اشتراک کریں گے۔ والدین کو اِس گفتگو میں رسمی رعب و داب کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیئے اور ایسا ماحول پیدا کرنا چاہیئے کہ بچے بغیر کسی رسمی لحاظ اور جھجک کے خود ہی کھلے اور واضح الفاظ میں اپنی تکالیف اُن کے سامنے رکھ سکیں۔

جلق کے حوالے کے بغیر جنسی تعلیم کی بحث تشنہ رہ جاتی ہے۔ اِس ضمن میں اس قدر فضول، بکمی اور لغو اور پوچ باتیں لکھی گئیں ہیں کہ اُن کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ یہ پوچ باتیں، یہ فاسد اور مہلک خیالات دراصل ہم تک دو وسیلوں سے پہنچتے ہیں ایک تو اِن نیم حکیموں کے ذریعہ جو نوجوانوں کے دلوں میں خوف و ہراس پیدا کرکے اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں اور دوسرے اُن اخلاق کے ٹھیکیداروں کے ذریعہ جو اپنی مطلب براری کے لئے یہی بہتر اور منفعت بخش سمجھتے ہیں کہ لوگوں کو ڈرا کر نیکی کی راہ پر لگائیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اِس موضوع پر اُس قدر مہلک لٹریچر جمع کردیا گیا ہے کہ الاماں، الحفیظ! یہاں تک کہ نامردی سے لیکر جنون تک تمام بیماریاں اسی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔

جب ہم اِس سوال کی چھان بین بے لوث طریقہ سے کرتے ہیں، یعنی تمام ذاتی جذبات اور اثرات سے ہٹ کر صرف "تلاشِ حق" کے لئے، تو ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں اور حیوانوں میں اِس کا اِس قدر رواج ہے کہ اِس کا تعلق براہِ راست فزیالوجی سے ہے۔ اِس سلسلہ میں یورپ اور امریکہ میں کافی تحقیقی کام ہوچکا ہے۔ ڈاکٹر ڈیوکس (DUKES) کا بیان ہے کہ رگبی (RUGBY) کے مشہور اسکول میں اِس علّت میں مبتلا ہونے والے لڑکوں کی تعداد نوّے (۹۰) سے پچانوے (۹۵) فی صدی تک تھی۔ روبی ROBIE نے بھی امریکہ میں اِس سلسلہ میں کچھ کام کیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ شائد ہی مشکل سے کوئی ایسا شخص نکلے، (لڑکے، اور لڑکیاں دونوں میں) جو اِس لذت سے بیگانہ ہو۔ ڈاکٹر کیتھرائن ڈیویس (DR. KTHARINE DAVIES) نے اپنی توجہ صرف لڑکیوں کی طرف کرتے ہوئے حساب لگایا ہے کہ امریکہ کے کالجوں میں پڑھنے والی لڑکیوں میں سے ۶۰ فی صدی اِس علّت کا شکار تھیں۔ اُن کے اعداد سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لڑکیاں لڑکوں کے مقابلہ میں کم عمری میں اِس علّت کا شکار ہوجاتی ہیں۔ اِس صورتِ حال کے تحت بہتر یہی ہے کہ ہم شروع ہی سے اِس بات کو مان لیں یہ جلق مستثنیات میں سے نہیں ہے بلکہ قاعدہ عام ہے اِس علّت کو ہم جنسی گمراہی سے تعبیر نہیں کرسکتے بلکہ ہم کو اِسے ایک بالکل فطری جنسی مظاہرہ سمجھنا چاہیئے — بقول (KRETSCHNER) جلق کسی قسم

پروازِ فکر

اللہ اللہ عشق کی رعنائیاں
حُسن بھی لینے لگا انگڑائیاں

دوست کا احساں نہ دشمن کا گلہ
بے تعلق ہیں مری تنہائیاں،

موت کی حسرتیں مدغم ہوگئیں
زندگی کی زمزمہ پیرائیاں

پھر فریبِ آرزو کھانے لگا
کان میں بجنے لگیں شہنائیاں

مستقل اِک خواب ہو کر رہ گئیں،
اُن کی باہوں کی سکوں آرائیاں

اُن کی بزمِ ناز تک پہنچا دیا
لے اُڑیں مجھکو مری رُسوائیاں

زندگی عقدہ بنا کر چھوڑ دی
یاد ہیں اُن کی کرم فرمائیاں

(صادق نیازی جہلم)

کی جنسی گمراہی نہیں ہے بلکہ یہ (کثرتِ کار سے قطع نظر) ایک بے ضرر عبوری دور ہے اور ایک تندرست اور توانا جنسی جذبہ کی مظہر ہے۔ ہم اس کو جنسی گمراہی سے جب ہی تعبیر کر سکتے ہیں جب اِس کا دورِ صرف اِسی کی خاطر کیا جائے یعنی اُس وقت جب کہ اس کی قدر و قیمت فطری فعلِ مباشرت سے بڑھ جائے اور یہ اُس کی جگہ لے لے یعنی فطری مباشرت کے مواقع حاصل ہوتے ہوئے بھی ایک شخص اس سے کنارہ کش نہ ہو"۔ اِن چند الفاظ میں KRETSCHMER نے بڑی جامع اور صحیح تنقید کر دی اور بڑا اچھا صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ حاصلِ بحث یہ کہ عمر کے ارتقائی دور میں جلق بالکل فطری ہے لیکن اگر یہ مستقلاً عادی ہو جائے تو جنسی گمراہی ہے۔

یہاں یہ غور کرنا بھی ضروری ہے کہ طبّی سائنس کے ارتقائی دور میں ڈاکٹری کے نظریات بھی اپنے عہد کے اخلاقی نظریات سے متاثر تھے یہاں تک کہ اُس زمانے میں عام خیال تھا کہ ناجائز جنسی تعلقات اپنے آغوش میں بیماریوں کے جراثیم چھپائے رکھتے ہیں۔ تپدق، جسمانی اور نفسیاتی بیماریاں اور اِسی قبیل کے دیگر امراض گویا اسی سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق رکھتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میڈیکل سائنس نے اِن اوہام سے چھٹکارا پا لیا ہے، لیکن پھر بھی کہیں کہیں ابھی تک پرانی لکیر کے فقیر ملتے ہیں۔

اصل میں جلق سے سب سے بڑا خطرہ وہ ذہنی اُلجھنیں ہیں جن میں بچے مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ کثرتِ کار جو بڑھتی ہی جاتی ہے وہ جو اس علت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ وہ کسی ایسی قوت کے زیرِ اثر ہیں جو اُن سے زیادہ طاقتور ہے۔ احساسِ کمتری شرم، خوف اور ہراس کے بوجھ کے نیچے اِس کا عامل دبتا چلا جاتا ہے بالآخر اِسے خود سے نفرت ہونے لگتی ہے اور پھر اس خیال سے کہ لوگ اس کی حالت سے واقف ہو گئے ہونگے وہ ان سے دُور بھاگنے لگتا ہے اور بالکل ہی گوشہ نشیں ہو جاتا ہے۔

اگر کوئی بچہ ذرا اوائلِ عمری میں اس عمل کو شروع کر دے تو والدین کو چاہیئے کہ وہ یہ کوشش کریں کہ بچہ اس کو غیر معمولی اہمیت نہ دینے لگے۔ مار پیٹ یا ڈرا کر تو اس سے روکنا تقریباً ناممکن ہے اگر یہ صورت اختیار کی گئی تو بچے زیادہ محتاط ہو جائیں گے اور زیادہ پوشیدہ طریقے پر کرینگے۔ زیادہ بہتر طریقہ تو یہ ہوگا کہ اُس کی مدد کی جائے کہ وہ اپنی دیگر دلچسپیوں میں زیادہ تنوع پیدا کرے اور زیادہ سے زیادہ مشغول رہے تاکہ اُسے اس کا موقع ہی نہ ملے بالعموم وہی بچے جو زیادہ تنہا رہتے ہیں اس کا شکار ہوتے ہیں اگر بچے ذرا عمر میں بڑے ہوں تو اس مسئلہ کا حل اور اس مشکل کا مقابلہ نسبتاً آسان ہو جاتا ہے ہم اِس سے صاف صاف کہہ سکتے ہیں کہ اب جب کہ وہ جوانی کے دروازے پر کھڑا ہے بچپن کی تمام عادتیں چھوڑنا ہی اُس کے لئے زیادہ بہتر ہے، بالکل اُسی طرح جس طرح اور بچپن کی عادتیں اُس نے چھوڑ دیں یا وہ خود بخود چھوٹ گئیں۔

لڑکیوں کے مسائلِ بلوغیت بالکل لڑکوں سے ملتے جلتے ہیں جہاں تک بدخوابی کا تعلق ہے اُس کی جگہ لڑکیوں کی "ماہ واری" لے لیتی ہے۔ وہ لڑکیاں جو اپنی والدہ سے اِس "حادثہ" کے متعلق پہلے سے کچھ معلومات حاصل کر لیتی ہیں —

— وہ سینکڑوں ذہنی مصائب کا شکار ہونے سے بچ جاتی ہیں۔ دیگر جنسی مسائل اور مظاہرات کی طرح اِس "حادثہ" سے بھی سینکڑوں توہمات وابستہ ہیں، بالخصوص غیر متمدن اقوام اور قبائلی اقوام میں تو بعض نہایت ہی عجیب و پُراسرار باتیں اِس سے منسوب ہیں۔ چونکہ ان توہمات کا نفسِ مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہے اِس لئے اسے نظر انداز کرتے ہیں۔

آخر میں اتنا عرض کر دوں اگرچہ پھر اِس کا نفسِ مضمون سے بالواسطہ تعلق نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی یہ مسئلہ جنسی تعلیم و تربیت کے

سازِ تغزّل

زندگی اک حسرتِ ناکام ہو کر رہ گئی — ہر سحر اک اونگھتی سی شام ہو کر رہ گئی
نوجوانی اپنی نذرِ جام ہو کر رہ گئی — گل بدامن گردشِ ایام ہو کر رہ گئی
سانولی راتوں میں اشکوں نے چراغاں کر دیا — حسرتِ دل آرزوئے خام ہو کر رہ گئی
دوستی کے بھیس میں اُنکی جفائیں الاماں — دشمنی بھی لرزہ براندام ہو کر رہ گئی
جھلملا اُٹھے ستارے رات کی آغوش میں — کہکشاں اک مسکراتا جام ہو کر رہ گئی
جب گھٹائیں کارواں در کارواں انور اُٹھیں — ایک مبہم سی خلش انجام ہو کر رہ گئی

(منظور انور قریشی)

ملیح فاروقی

سکونِ انسانی

عورت دنیا کی وہ ناقابلِ تردید حقیقت و ہستی ہے جس کا صرف تصور ہی عدم وجود دنیا کو بے معنی، غیر مکمل اور لاحاصل ثابت کرسکتا ہے۔ روپے دو روپے دن کی مزدوری کرنے والے طبقہ سے لیکر بڑے بڑے سائنس داں طبقہ تک تمام کے تمام صرف حصولِ عورت ہی کے لئے بڑے سے بڑا درد سر مول لیتے رہتے ہیں۔ اور اس امر اس کے ساتھ کہ کرۂ ارض کی تمام ترعیش و عشرت کی تنہا اور واحد کنجی بس یہی ایک ہے دنیا کا ہر شعبہ ہر شعبے کے تمام دستور العمل کے ہر ہر لمحہ میں الف سے یٰ تک دماغ میں صرف عورت ہی عورت پر مسلط رہتی ہے۔ موٹر۔ ریل اور طیارے غرض دنیا کی ہر ایجادات میں، عورت کا خاموش اور پُرسکون وجود کارِ سند عمل ہے۔

اساتذہ نے شاعروں اور ادیبوں نے انشاء پردازوں نے اس نادر الوجود ہستی کو صنفِ نازک، جنسِ لطیف اور اسی طرح کے بہت سے چھوٹے چھوٹے اور خوبصورت الفاظ سے مخاطب کیا ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان تمام اختراعاتِ نو ایجادات میں کوئی بھی ایسا جامع لفظ نہیں ہے جو اس بلند و بالا تر ہستی خود رو، ابتدا و انتہا کے صحیح مفہوم کو دل و دماغ کی حسِ مکمل کے اصلی مفہوم کے ہم آہنگ کرسکے۔ عورت فطرتِ انسانی کا وہ گہوارۂ لطیف ہے جس کے ہر ہر انداز میں خود فطرت کے تمام تر رموز پوشیدہ ہیں۔ وہ لطف و کرم کا سرچشمۂ لامنتہائی بھی ہے اور کائنات کے سینکڑوں اور ہزاروں طلسمات کا مجسمۂ خاموش بھی۔ ہر عورت کی نسوانی حوصلہ مندیاں اپنے اندر جذبۂ معشوقیت بدرجۂ اتم رکھتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ان کی حمد و تسبیح میں منہمک و مشغول رہے۔ وہ یوسف منش انسان جو اپنے زعمِ تقدس میں عورت سے بے نیاز ہو، حتی الامکان عورت اس سے بے نیاز تر رہتی ہے مبادا بے نیازی کہیں بے اعتنائی سے ٹکرا نہ جائے لیکن اتفاقاً یا سہواً اگر ٹکرا جاتی ہے تو پھر کوئی عورت اپنی ۔۔۔ خودداری کی بربادی کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اور پھر اس وقت وہ یوسف منش کے لئے ہزاروں زلیخاؤں کی ایک زلیخا بنکر اس کے مقابلہ کے لئے کھڑی ہوجاتی ہے۔ اس کی علتِ غائی صرف اس وقت مطمئن ہوتی ہے جب اس یوسف منش کا سر اسکے قدموں پر لوٹتا ہوا دکھائی دے۔ اس کے بعد وہ فاتحانہ انداز سے ہنستی ۔۔۔ انداز سے پیار کرتی ہے۔

تخلیق کائنات میں عورت ۔۔۔ گوہر نایاب تھی کہ خود قدرت بھی اس دنیا میں آدم کے دو پہیوں کی گاڑی بغیر اس کی امداد کے نہ چلا سکی۔ اسی لئے کائنات کی وہ ایک مستقل حقیقت ہے جسے کوئی انسان جھٹلا نہیں سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ دنیا میں آنے کے بعد وہ خود مفتوح بنکر اس بات کی آرزو مند رہی کہ اس کا محبوب اس کو شکست ابدی دیتا ہے لیکن حقیقتاً اگر ذرا عمیق نگاہوں سے دیکھا جائے تو عورت ہمیشہ فاتح اور مرد ہی ہمیشہ مفتوح رہا ہے۔ کیونکہ عورت اور مرد کے درمیانی کشمکش کی ہار جیت کا انحصار ہرگز مرد کی قوتِ بازو پر نہیں ہے۔ بلکہ عورت کی ایک نگاہِ غلط انداز مرد کو ہمیشہ کے لئے جیت لیتی ہے۔ فطرتِ انسانی کا یہ عجیب ترین معمہ ہے کہ خود مرد کو اپنی شکست میں لطف آتا ہے ——— عورت جب مرد کو منانا چاہتی ہے تو خود خفا ہوجاتی ہے اور جب خفا ہونا چاہتی ہے تو مرد کی خوشامد کرتی ہے۔ غرض اس کے ظاہر اور باطن کا وجود اسقدر نازک ہے کہ وہ خود اس پر قابو نہیں رکھ سکتی اکثر وہ جو کچھ پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے ظاہر کردیتی ہے، اور جو کچھ اسے ظاہر کردینا چاہیئے وہ اس قدر پوشیدہ رکھتی ہے کہ بعض مواقع پر اُسے خود نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عورت فطرت کا ایک ایسا راز ہے جس کا افشا ہوجانا مہلک اور اس کا مخفی رہنا ہی بقائے حیات ہے!

قطع نظر چند مستثنیات کے عورت دامِ فریب میں بہت جلد آجاتی ہے لیکن وعدۂ وفا بہت دیر میں کرتی ہے مگر وعدہ کر لینے کے بعد اپنی زندگی کی آخری سانس تک نبھانے کی سعی کرتی ہے۔ برعکس اس کے مرد جلد پھسلتا بھی ہے اور بہت جلد وعدہ بھی کر لیتا ہے لیکن اس کے اکثر وعدے دیرپا نہیں ہوتے۔ عورت اپنے شباب سے لیکر جوانی کے آخری لمحہ تک نیرنگیٔ عشق میں

گھوٹی رہنا چاہتی ہے۔ اور مرد مین عالمِ شباب و جوانی میں بھی چوبیس گھنٹے کے عشق سے بھاگتا ہے یہی وجہ ہے۔ کہ عورت کا عشق زوال پذیر ہے اور مرد کا عشق اس کی آخری سانس تک قائم رہتا ہے۔

عقلمند عورت وہ ہے جو اپنے موقع اور ماحول کے لحاظ سے اپنے اوپر کیفیت طاری کرتی رہتی ہے۔ کائنات کی وہی عورت کامیاب ہے۔ جو ماحول کا پورا پورا فائدہ اٹھائے اور مرد کی طبیعت کا راز معلوم کرے۔ وہ بدنصیب عورتیں جو نسوانیت کا راز افشا کر دیتی ہیں اور مرد کی طبیعت کا راز نہیں حاصل کرتیں، مرد کی نظر سے جلد گر جاتی ہیں۔ ایک عورت کا مرد کی نظر سے گر کر دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں۔ اور جس عورت نے اپنی ناعاقبت اندیشیوں کی بنا پر اپنی دنیا برباد کر دی۔ اسکی عقبیٰ بھی اس کے لئے تسلی بخش نہیں ہو سکتی۔ دنیا و عقبیٰ کی تفریق صرف جاہل اور احمقوں کے لئے سکون پذیر ہو سکتی ہے ۔۔۔۔۔۔!

ایک انگریزی شاعر یا نثار کا قول یاد آگیا۔

"WOMAN LAUGHS WHEN SHE CAN AND WEEPS WHEN SHE WISHES"

اگر اس شاعر یا نثار کا مشاہدہ عمل توضیح کا طلبگار نہ ہو۔ اور واقعی قدرتِ ازلی نے عورت کی نسوانیت کو یہ قوت ودیعت کی ہو تو فطرتِ نسوانی اپنی دنیا کو رنگینیوں میں تبدیل کرنے سے کبھی گریز نہیں کر سکتی ہے خیال ہے کہ ظالم ترین مرد بھی عورت کے آنسو نہیں برداشت کر سکتا۔ ایک حساس انسان کے لئے عورت کے آنسو کی قیمت اس کے دین و دنیا کے تمام کائنات سے بالاتر ہے۔!

ماہرِ نفسیات ملک محمد نے اپنی تصنیف "پدماوتی" میں عورت کی چار قسمیں بنائی ہیں۔ اول پدمنی : دوم چترنی ۔ سوم سنکھنی ۔ چہارم ہستنی ان چاروں کی خصوصیات بھی ہلکی چاشنی کے لئے درج ذیل ہیں۔

۱۔ عورتوں کی قسم اول؛ جسم ہری دمنبری۔ ملنک بو و شنجرف رو، شہد کی مکھیوں کی رانی کی طرح مطمئن تر۔ اس کا قد زیادہ دراز ہے نہ زیادہ پست۔ نہ بہت لاغر نہ بہت فربہ گویا پیکرِ اعتدال کا سر چشمہ لاتقنا ہیں۔ اس کی چار چیزیں لمبی ہوتی ہیں زلف انگلیاں آنکھیں اور گردن چار چیزیں روشن ہوتی ہیں۔ دانت۔ مقیاس الشباب پیشانی اور ناف۔ چار پتلی ہوتی ہیں ناک پٹھا، کمر اور لب۔ اور چار چیزیں خوشگوار اور چکنی ہوتی ہیں۔ گال۔ سرین۔ کلائی اور جانگھ۔ اس کا چہرہ مانند قمر، اس کے قدم کی رفتار بط کی چال کی طرح سکون پرور اس کی مرغوب غذا دودھ ہے اور وہ پان اور پھولوں کی فریفتہ۔ وہ اپنی سولہ کی سولہوں جاذبیت اور کشش جسمانی پر قدرت رکھتی ہے۔

۲۔ یہ دوسری بہتر قسم۔ انتہائی ذکی و چالاک اور عاشق مزاج۔ پری جیسی خوبصورتی اور طلسماتی حسن کی مالک۔ رنج و غصہ کسے کہتے ہیں۔ یہ اس کی بلا جانے۔ ہر لمحہ و ہر لحظ اس کے لبوں پر تبسم ہی تبسم۔ اس کا شوہر اس سے انتہائی خوش و خرم اور وہ اپنے شوہر کی بے انتہا وفادار۔ اس کا چہرہ چودویں کے چاند کی طرح شگفتہ اور اس کا رنگ سوسن کے پھول کے مانند صاف و سفید اور طرزِ خرام بط کی چال کے مانند سکون پرور۔ اس کی مرغوب غذا دودھ اور شکر ہے لیکن ہلدی کی مخالف بھی ہے۔ پان اور پھولوں کی فریفتہ۔ اپنی سولہ کی چند خصوصیات اور فریب نظر پر قادر ہے

۳۔ کھاتی تو کم ہے لیکن توانا و تندرست بہت ہے۔ اس کا مقیاس الشباب خوشگوار اور چکنا۔ اس کا پٹھا پتلا ہوتا ہے۔ مسعل غرور و تمکنت کا ایک بوجھ جس وقت وہ عالمِ غیض و غضب میں ہو تو بلا امتیاز نیک و بد نتیجہ سے ناآشنا اپنے محبوب تک کو ہلاک کر دینے سے دریغ نہیں کرتی۔ خود تو زیورات پہننے کی انتہائی شائق لیکن کسی دوسری عورت کو پہنے ہوئے دیکھنا بھی اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ اس کی چہل قدمی غیر واضح اور طرزِ خرام ڈھیلا ڈھیلا سا بے اصول۔ اس کے جسم پر بالوں کی زیادتی، چربی دار اور مرغن غذا اسے بہت مرغوب ہے۔ اس کے سانس کی بھاپ تعدے بدبودار اور اس کی مجامعت اور ہم آغوشی انتہائی شہوت انگیز۔

۴۔ ہاتھی کی بدمزاق اور غیر لطیف نطلت جیسی مشابہت جس عورت میں دیکھئے تو سمجھ لیجئے کہ وہ تقسیم عورت کی چوتھی قسم کی حد میں ہے۔ اس کا سر اور پیر چکنا اور گردن چھوٹی ہوگی۔ اس کا سینہ ایک لعنت و ملامت لئے یافت و غیر مقوی، جھکا ہوا اور لٹکا ہوا۔ اس کا پٹھا بڑا اور چوڑا۔ اس کی چال میں ہاتھی کی خرامِ ناز سے کم جاذبیت نہ ہوگی۔ اسے نہ اپنے شوہر پر لگاؤ اور نہ اس کی بالکل پروا۔ بلکہ ہمیشہ دوسری عورتوں کے شوہروں کی گھات و فکر میں رہے گی۔ اس کی لالچ میں وحشی پن اور اس کی شوخی بدذوقی کی حد تک بڑھی ہوئی پاکیزگی و نزہت۔ لطافتِ عفت و عصمت اور پاکدامنی سے بے نیاز

وسلے بہرہ۔ اُسے بے انتہا پسینہ آتا ہے اور اس کے پسینے میں شہد کے مانند لزوجت اور چپچپاہٹ ہوتی ہے۔ جس کا دل انکساری و اتقا سے پاک اپنے مطمحِ نظر اور منزلِ مقصود کی طرف بے رکاوٹ بھاگتا ہو اس کو کہتے ہیں ہستی ————— !

ایک نہایت بدہیولہ اور بدصورت آدمی اور ایک انتہائی حسین و جمیل عورت ساتھ ساتھ دیکھے گئے۔ انکشافِ حقیقت نے حیرت کا پیمانہ صبر لبریز کر دیا یعنی دونوں ایک دوسرے کے پسندیدگیٔ طبع کا نتیجہ تھے معلوم یہ ہوا کہ ۹۵ فی صدی عورتوں کے لئے نہ مرد کے حسن میں کوئی کشش ہے اور نہ مرد کا قبیح صورت ہونا ان کے لئے باعثِ تنفر۔ نسوانی پسندیدگیٔ طبع حسن و قبیح کی لطافت و کثافت سے بے نیاز تر ہے۔ نسوانیت چونکہ جذبۂ معبودیت کا پرتو ہے اس لئے مرد میں ان کے لئے ایک ہی دلکشی ہے۔ یعنی صرف مرد کی نیازمندانہ اظہارِ پرستش۔ عورت کے حضور میں کششِ جسمانی و روحانی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ قبیح ترین مرد، جذبۂ پرستش و اظہارِ محبت ہی کے باعث سبقت حاصل کر لیتا ہے۔ مجھے بحث نہیں کہ عورت مرد سے محبت کرتی ہے یا مرد کے اظہارِ محبت و جذبۂ پرستش سے محبت کرتی ہے۔ کیونکہ فنی اعتبار سے تنقید کی عمل جراحی کو میں بدذوقی سمجھتا ہوں۔ میں تو عورت کو صرف اس لئے چاہتا ہوں کہ وہ "سکونِ انسانی" ہے۔

دنیا کی سب سے پہلی عورت جسے ہم پہچانتے ہیں وہ ہماری ماں ہے۔ آغوشِ مادری کا سکون و راحت محتاجِ بیان نہیں۔ دوسری عورت جس سے ہم متعارف ہوتے ہیں ہماری بہن ہے۔ بہن عمر میں ہم سے بڑی ہو یا چھوٹی، اس کا صرف وجود ہمارے لئے اطمینان پذیر ہے تیسری عورت ہماری محبوب ہے جو باوجود غیر ہونے کے ایک عجیب و غریب کیف آور سکون کا منبع ہے۔ چوتھی ہماری بیوی ہے جو ہماری راحت و نشاط کا سرچشمۂ لامتناہی ہے۔ پانچویں ہماری بیٹی ہے جسے دیکھ کر ہم جیتے ہیں اور چھٹی بہو ہے جو ہمارے مستقبل کا ایک امید افزا پھول۔ مختصر یہ کہ ہماری آغازِ زندگی سے لیکر ہماری زندگی کے آخری لمحوں تک وجودِ نسوانی ہمارے لئے سکون و اطمینان، نشاط و انبساط اور کیف و رنگینی کی پیامبر بنی رہتی ہے۔ ہم اُسے "سکونِ انسانی" نہ کہیں تو کیا کہیں؟

مجتبیٰ احمد

جو موج ڈبو دے ساحل ہے!

جیلانی اپنے بستر پر بیٹھا سیلاب زدہ علاقوں کی حالت اور رپورٹ لکھ رہا تھا گھنٹوں بیٹھے رہنے کے بعد بھی وہ بمشکل چند سطریں لکھ سکا تھا۔ اس کا ذہن بار بار سندھ کے ان دیہاتوں کی طرف جا رہا تھا جہاں دس روز تک وہ اپنے اخبار کی طرف سے طوفان کی تباہیوں کے مظاہرات کا مطالعہ کرنے گیا تھا۔ کھنڈرات جن سے بستیوں کے نشانات ملتے تھے۔ اس کثرت سے تھے جیسے وہ ہیروشیما کا علاقہ ہو۔ کسانوں کے بجھے ہوئے چولھے اُن کی جھکی ہوئی کمریں۔ ان کے اندھیرے دن اور بے خواب راتیں اس کے اعصاب پر اس شدت سے حاوی تھے کہ صحافت کے بے جان الفاظ میں ان کا اظہار اس کے لئے ناممکن تھا۔ گزشتہ دس دنوں میں اس نے زندگی کو زندہ ہو کر دیکھا تھا اور زندگی میں موت کو بھی بائبل کے وہ کلمات جنکو ایم۔ اے کے دوران تعلیم میں وہ ادبی شہ پاروں سے زیادہ نہیں سمجھتا تھا آج زندگی سے بھرپور معلوم ہوتے تھے ـــــ زندگی کی تمام جلوہ سامانیوں میں بھی انسان ایک ابدی موت میں مبتلا ہے۔" سکھر میں اس نے اپنی آنکھوں سے غلّوں کے چند دانوں کے عوض انسانی زندگی کو سستے داموں بکتے دیکھا تھا۔ ناموس عصمت آبرو اور انسانیت کا خون کتنی ارزانی سے یہ ہاتھا بہتی گنگا سے ہاتھ دھونے والے عفریت کی بھی کمی نہیں تھی۔ وہ رات جیلانی کو یاد آ رہی تھی جب وہ شہر سے بیس میل دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں جہاں افسروں، رضاکاروں اور انجینیروں کا کیمپ تھا ایک خیمہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک کونے میں رکھی موم بتی کی لَو ہوا کے جھونکوں میں بہک رہی تھی جیسے شباب کی آمد سے جذبات کی لہر اس کی دھندلی روشنی میں اس نے دروازے پر چند سائے پھرتے ہوئے دیکھے۔ نزدیک گیا تو دیکھا کہ ایک بوڑھا کسان اپنی چھوٹی بچی اور ایک جوان لڑکی کے ساتھ کھڑا ہے۔ جیلانی ٹھٹھک کر رہ گیا چند لمحوں کے بعد اس نے ان کی طرف دیکھا اور جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دس دس روپے کے چند نوٹوں کو اس نے ٹٹولا اور پھر ہاتھ نکال لیا۔ وہ تینوں چند منٹ کھڑے رہے اور پھر رات کی بھیانک تاریکی میں غائب ہو گئے۔ جیلانی نے اپنے بستر پر بیٹھے بیٹھے اپنے جسم میں ایک جھرجھری محسوس کی۔ وہ کانپ اٹھا۔ اتنے دنوں کے بعد بھی اس وقت اس کا ضمیر اس کو ملامت کر رہا تھا۔ اس کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی جیلانی نے ایسا محسوس کیا کہ اس بوڑھے انسان کے جھریوں والے ہاتھ پوری قوت سے اس کی گردن کو دبا رہے ہیں۔ احساس کی شدت سے وہ پسینہ پسینہ ہو گیا اور بے چینی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ کر ہی کیا سکتا تھا اس نے سوچا۔ وہ تو خود غریب نامہ نگار ہے۔ اس نے اپنے کمرے کے ساز و سامان پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔

جیلانی کے ایک کمرہ کے فلیٹ میں ایک چارپائی، کرسیاں اور ایک میز تھیں یہ سامان اس نے کراچی پہنچنے کے بعد ایک نیلام میں خریدا تھا۔ کونے میں رکھی ہوئی الماری مالک مکان کی تھی۔ ایک بکس جس میں سے بے ترتیبی سے سوکھے کپڑے جھانک رہے تھے چارپائی کے نیچے پڑا تھا۔ ایک لمبی رسی سے کھونٹی کا کام لیا گیا تھا جس پر کوٹ، شیروانی اور کچھ گرم کپڑے لٹکے جھول رہے تھے۔ تکیے کے نیچے بکس کے اوپر کاغذ اور کتابوں کا ڈھیر تھا۔ پرانے اخبار کچھ عجیب ہیئت سے سارے کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔ ایک کونے میں ایک انگیٹھی، کیتلی اور چائے کی دو پیالیاں پڑی تھیں پاس ہی کوئلے کے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے کمرے کی ہر چیز پر ایک سکوت کی کیفیت طاری تھی۔ آندھی کے بعد سناٹے والی کیفیت۔ کراچی آنے کے بعد دو مہینوں تک دروازوں پر پردے، پلنگ پر چادر اور میز پوش سبھی کچھ تھے لیکن جب گھر کے لائے ہوئے پیسے ختم ہونے لگے اور ملازمت کی تلاش ہوئی تو احساس نفاست بھی مفقود ہو گیا اور اب جیلانی کا کمرہ پاکستان کے صحافت نگار کی رہائش کا صحیح نمونہ تھا۔

دن بھر اخبار کے لئے عدالتوں، جلسوں، حکومت کے دفاتر میں رپورٹ کے لئے چکر کاٹنے کے بعد اکثر آٹھ بجے رات کو اپنے کمرے میں واپس آتا۔ جب وہ اس میں داخل ہوتا تو اس احساس سے کہ وہ ایک کمرہ اور اس کے سامنے ساز و سامان کا مالک تھا اس کی گردن بلند ہو جاتی۔ اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو ایڈیٹر اور اکبر، اسسٹنٹ ایڈیٹروں سے برتر سمجھتا تھا ان میں سے اکثر یا تو ہوٹل کے کمروں میں تھے یا رشتہ داروں کے ناخواندہ مہمان۔ لیکن ایڈیٹر پھر بھی ایڈیٹر ہے وہ

وبے بہرہ۔ اُسے بے انتہا پسینہ آتا ہے اور اس کے پسینے میں شہد کے مانند لزوجت اور چپچپاہٹ ہوتی ہے۔ جس کا دل انکساری و اتقا سے پاک، اپنے مطمحِ نظر اور منزلِ مقصود کی طرف بے رکاوٹ بھاگتا ہو اس کو کہتے ہیں ہستی ——— !

ایک نہایت بدہیولا اور بدصورت آدمی اور ایک انتہائی حسین و جمیل عورت ساتھ ساتھ دیکھے گئے۔ انکشافِ حقیقت نے حیرت کا پیمانۂ صبر لبریز کر دیا یعنی دونوں ایک دوسرے کے پسندیدگیِ طبع کا نتیجہ تھے معلوم یہ ہوا کہ ایسے فی صدی عورتوں کے لئے نہ مرد کے حسن میں کوئی کشش ہے اور نہ مرد کا قبیح صورت ہونا ان کے لئے باعثِ تنفر۔ نسوانی پسندیدگیِ طبع حسن و قبح کی لطافت و کثافت سے بے نیاز تر ہے۔ نسوانیت چونکہ جذبۂ معبودیت کا پرتو ہے اس لئے مرد میں ان کے لئے ایک ہی دلکشی ہے۔ یعنی صرف مرد کی نیازمندانہ اظہارِ پرستش۔ عورت کے حضور میں کششِ جسمانی و روحانی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ قبیح ترین مرد، جذبۂ پرستش و اظہارِ محبت ہی کے باعث سبقت حاصل کر لیتا ہے۔ مجھے بحث نہیں کہ عورت مرد سے محبت کرتی ہے یا مرد کے اظہارِ محبت و جذبۂ پرستش سے محبت کرتی ہے۔ کیونکہ فنی اعتبار سے تنقید کی عمل جراحی کو میں بدذوقی سمجھتا ہوں۔ میں تو عورت کو صرف اس لئے چاہتا ہوں کہ وہ "سکونِ انسانی" ہے۔

دنیا کی سب سے پہلی عورت جسے ہم پہچانتے ہیں وہ ہماری ماں ہے۔ آغوشِ مادری کا سکون و راحت محتاجِ بیان نہیں۔ دوسری عورت جس سے ہم متعارف ہوتے ہیں ہماری بہن ہے۔ بہن عمر میں ہم سے بڑی ہو یا چھوٹی، اس کا صرف وجود ہمارے لئے اطمینان پذیر ہے تیسری عورت ہماری محبوب ہے جو باوجود غیر ہونے کے ایک عجیب و غریب کیف آور سکون کا منبع ہے۔ چوتھی ہماری بیوی ہے جو ہماری راحت و نشاط کا سرچشمۂ لامتناہی ہے۔ پانچویں ہماری بیٹی ہے جسے دیکھ کر ہم جیتے ہیں اور چھٹی بہو ہے جو ہمارے مستقبل کا ایک امید افزا پھول۔ مختصر یہ کہ ہماری آغازِ زندگی سے لیکر ہماری زندگی کے آخری لمحوں تک وجودِ نسوانی ہمارے لئے سکون و اطمینان، نشاط و انبساط اور کیف و رنگینی کی پیامبر بنی رہتی ہے۔ ہم اُسے "سکونِ انسانی" نہ کہیں تو کیا کہیں ؟

مجتبیٰ احمد

جو موج ڈبو دے ساحل ہے!

جیلانی اپنے بستر پر بیٹھا سیلاب زدہ علاقوں کی حالت اور رپورٹ لکھ رہا تھا گھنٹوں بیٹھے رہنے کے بعد بھی وہ بمشکل چند سطریں لکھ سکا تھا۔ اس کا ذہن بار بار سندھ کے ان دیہاتوں کی طرف جا رہا تھا جہاں دس روز تک وہ اپنے اخبار کی طرف سے طوفان کی تباہیوں کے مظاہرات کا مطالعہ کرنے گیا تھا۔ کھنڈرات جن سے بستیوں کے نشانات ملتے تھے۔ اس کثرت سے تھے جیسے وہ ہیروشیما کا علاقہ ہو۔ کسانوں کے بجھے ہوئے چولھے اُن کی جھکی ہوئی کمریں۔ ان کے اندھیرے دن اور بے خواب راتیں اسکے اعصاب پر اس شدت سے حاوی تھے کہ صحافت کے بے جان الفاظ میں ان کا اظہار اس کے لئے ناممکن تھا۔ گزشتہ دس دنوں میں اس نے زندگی کو زندہ ہو کر دیکھا تھا اور زندگی میں موت کو بھی۔ بائبل کے وہ کلمات جنکو ایم۔ اے کے دوران تعلیم میں وہ ادبی شہ پاروں سے زیادہ نہیں سمجھتا تھا آج زندگی سے بھرپور معلوم ہوتے تھے ـــ "زندگی کی تمام جلوہ سامانیوں میں بھی انسان ایک ابدی موت میں مبتلا ہے" سکھر میں اس نے اپنی آنکھوں سے غلوں کے چند دانوں کے عوض انسانی زندگی کو سستے داموں بکتے دیکھا تھا۔ ناموس عصمت آبرو اور انسانیت کا خون کتنی ارزانی سے بہ رہا تھا بہتی گنگا سے ہاتھ دھونے والے عفریت کی بھی کمی نہیں تھی۔ وہ رات جیلانی کو یاد آ رہی تھی جب وہ شہر سے بیس میل دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں جہاں افسروں، رضاکاروں اور انجینیروں کا کیمپ تھا ایک خیمہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک کونے میں رکھی موم بتی کی لو ہوا کے جھونکوں میں بہک رہی تھی جیسے شباب کی آمد سے جذبات کی لہر اس کی دھندلی روشنی میں اس نے دروازے پر چند سائے پھرتے ہوئے دیکھے۔ نزدیک گیا تو دیکھا کہ ایک بوڑھا کسان اپنی چھوٹی بچی اور ایک جوان لڑکی کے ساتھ کھڑا ہے۔ جیلانی ٹھٹھک کر رہ گیا چند لمحوں کے بعد اس نے ان کی طرف دیکھا اور جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دس دس روپے کے چند نوٹوں کو اس نے ٹٹولا اور پھر ہاتھ نکال لیا۔ وہ تینوں چند منٹ کھڑے رہے اور پھر رات کی بھیانک تاریکی میں غائب ہو گئے۔ جیلانی نے اپنے بستر پر بیٹھے بیٹھے اپنے جسم میں ایک جھرجھری محسوس کی۔ وہ کانپ اٹھا۔ اتنے دنوں کے بعد بھی اسوقت اس کا ضمیر اس کو ملامت کر رہا تھا۔ اس کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی جیلانی نے ایسا محسوس کیا کہ اس بوڑھے انسان کے جھریوں والے ہاتھ پوری قوت سے اس کی گردن کو دبا رہے ہیں۔ احساس کی شدت سے وہ پسینہ پسینہ ہو گیا اور پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ کر ہی کیا سکتا تھا اس نے سوچا۔ وہ تو خود غریب نامہ نگار ہے۔ اس نے اپنے کمرے کے ساز و سامان پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔

جیلانی کے ایک کمرہ کے فلیٹ میں ایک چارپائی، کرسیاں اور ایک میز تھیں یہ سامان اس نے کراچی پہنچنے کے بعد ایک نیلام میں خریدا تھا۔ کونے میں رکھی ہوئی الماری مالک مکان کی تھی۔ ایک بکس جس میں سے بے ترتیبی سے کپڑے جھانک رہے تھے چارپائی کے نیچے پڑا تھا۔ ایک لمبی رسی سے کھونٹی کا کام لیا گیا تھا جس پر کوٹ، شیروانی اور کچھ گرم کپڑے لٹکے جھول رہے تھے۔ تکیئے کے نیچے بکس کے اوپر کاغذ اور کتابوں کا ڈھیر تھا۔ پرانے اخبار کچھ عجیب ہیئت سے سارے کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔ ایک کونے میں ایک انگیٹھی، کیتلی اور چائے کی دو پیالیاں پڑی تھیں پاس ہی کوئلے کے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے کمرے کی ہر چیز پر ایک سکوت کی کیفیت طاری تھی۔ آندھی کے بعد سناٹے والی کیفیت۔ کراچی آنے کے بعد دو مہینوں تک دروازوں پر پردے، پلنگ پر چادر اور میز پوش سبھی کچھ تھے لیکن جب گھر کے لائے ہوئے پیسے ختم ہونے لگے اور ملازمت کی تلاش ہوئی تو احساس نفاست بھی مفقود ہو گیا اور اب جیلانی کا کمرہ پاکستان کے صحافت نگار کی رہائش کا صحیح نمونہ تھا۔

دن بھر اخبار کے لئے عدالتوں، جلسوں، حکومت کے دفاتر میں رپورٹ کے لئے چکر کاٹنے کے بعد اکثر آٹھ بجے رات کو اپنے کمرے میں واپس آتا۔ جب وہ اس میں داخل ہوتا تو اس احساس سے کہ وہ ایک کمرہ اور اس کے سامنے ساز و سامان کا مالک تھا اس کی گردن بلند ہو جاتی۔ اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو ایڈیٹر اور اکثر اسسٹنٹ ایڈیٹروں سے برتر سمجھتا تھا ان میں سے اکثر یا تو ہوٹل کے کمروں میں تھے یا رشتہ داروں کے ناخواندہ مہمان۔ لیکن ایڈیٹر پھر بھی ایڈیٹر ہے وہ

سوچتا۔ سولہ سو روپے ماہانہ تنخواہ اور دو چپراسی۔ دفتر میں داخل ہوتے ہی تمام لوگ تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جب جیلانی دفتر پہنچتا تو باہر اسٹول پر بیٹھا ہوا گھونگریالے بال والا مکرانی چپراسی بیڑی کے لمبے لمبے کش لگاتا رہتا۔ اس خیال سے جیلانی کے پندار کو ٹھیس لگی اور وہ غیر شعوری طور پر سامنے عمارتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ پانچ منزلہ عمارتوں کی کھڑکیوں سے روشنی ایسے جگمگ کر رہی تھی جیسے اندھیری رات میں کسی جنگل میں بے شمار جگنو۔ یہ فلیٹ والی عمارتیں بھی اپنی جگہ ایک ایک دنیا ہیں وہ سوچ رہا تھا ہر روپ اور ہر رنگ میں زندگی فروزاں ہوتی ہے۔ ایک رات نکری مینشن کے سب سے اوپر کے فلیٹ میں کسی نے تین بجے رات کو پستول سے ایک پارسی نوجوان کو مار دیا۔ جیلانی کی آنکھ گولیوں کی متواتر آواز سے کھلی تھی۔ آج پھر پاکستان کے خلاف اس کے دل میں نفرت کا غبار اٹھا۔ پاکستان جہاں انسانی زندگی اتنی سستی ہے اس پارسی نوجوان کی بیوی اور ان کا دو سال کا ایک بچہ۔ جیلانی کا بس چلتا تو شخصی آزادی کے دشمنوں کا گلا گھونٹ دیتا۔ لیکن اسمیں پاکستان کا کیا قصور ہے اس کا خیال پلٹا۔ قانون تو کسی کو معاف نہیں کرتا۔ آخر اسکے فلیٹ کے متصل وہ سیاہ فام شرابی انسان بھی تو رہتا تھا جو تقریباً ہر رات دو بجے لوٹتا اور اپنی بیوی کو خوب مارتا تھا اسمیں پاکستان کا کیا قصور تھا ــــ اور سب سے نیچے کے فلیٹ میں مرزا جی بھی تو رہتے تھے جن کی تین لڑکیوں کی وجہ سے عمارت کا وہ حصہ انار کلی بن گیا تھا۔ وہ جنوں جوالوں کا وہاں جمگھٹ رہتا اور ساری رات قہقہوں کی آوازیں آتیں۔ جیلانی کو مرزا، ان کی بھاری بھرکم بیوی سے سخت نفرت تھی اور ان کی دعوتوں اور زہرہ جبینوں کے اشاروں کے باوجود وہ کبھی ان کے یہاں نہیں گیا۔ ہوٹل والے خان صاحب کہتے تھے کہ مشرقی پنجاب کے ہنگامہ کے بعد مرزا ان لڑکیوں کو پناہ گزینوں کے کیمپ سے بھگا لے آیا تھا اور وہ ان کی لڑکیاں نہیں تھیں، شام کو فلیٹ کی بالکنیاں بڑی رنگین ہو جاتی تھیں۔ اشارے پیغامات بس یہی سلسلہ رہتا۔ جیلانی کا اکثر سوچتا کہ بازار حسن میں بھی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔

آج جیلانی سویرے ہی گھر لوٹ آیا تھا۔ شام ہی سے اسکی طبیعت اداس تھی اور اس کا ذہن خواہ مخواہ ماضی کے مٹتے ہوئے نقوش کو ابھار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسمیں اسے کچھ لطف مل رہا تھا۔ اسی کی وجہ سے وہ چائے کی دو تین پیالیاں چڑھا گیا کھانے کے لئے کوئی دوسری چیز تھی نہیں اور جیب میں پیسے بھی مختصر اور پھر یہ خیال کہ تنخواہ ملنے میں چودہ روز باقی ہیں اسے اور بھی کفایت شعاری کی طرف مائل کر رہا تھا جیلانی نے اپنی اخباری زندگی میں کئی مرتبہ باقاعدہ اور منظم رہائش کی کوشش کی روزانہ کے آمد و خرچ کے اندراج کے لئے ڈائری بھی خریدی گئی۔ اور اس پر دو تین روز تک پابندی سے عمل بھی ہوتا رہا لیکن ہمیشہ یہ کوششیں شرابی کی قسم ہی ثابت ہوئیں اور بہت جلد وہ اپنی فطرت کے صحیح محور پر لوٹ آتا۔ اپنی جذباتیت کے تحت آج وہ پھر اپنی اقتصادی حالت کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے ایسی زندگی سے نفرت ہو رہی تھی جسمیں کشاکش کے علاوہ کچھ نہ ہو۔ اکثر وہ اقبال کی شاعری کے اس تبلیغی پہلو پر بہت بپھر جاتا۔ اس کا خیال تھا کہ اقبال اس مسلک میں اس ضعیف کی طرح تھا جو اپنی بزرگی کے جواز میں بچوں کو جھوٹ بولنے سے منع کرتا ہے حالانکہ وہ ضعیف اپنی زندگی میں بارہا خود اس طریقہ کار کو استعمال کر چکا ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ فرسودہ نظریے صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلے آ رہے ہیں ــــ ورنہ دن بھر مشین کی طرح چکر کاٹ کر دفتر جانا اور وہاں چیف رپورٹر کی نصیحتیں سننا، یہ بھی کوئی زندگی تھی۔ اس زندگی میں تو اتنی مہلت بھی نہیں کہ وہ افسانے یا نظمیں لکھ سکتا جو ہمیشہ سے اس کا محبوب شغل تھا۔ کراچی سے اچھا تو وہ دہلی میں تھا وہاں پیسے بھی زیادہ ملتے تھے اور کچھ فرصت بھی۔ اور سب سے بڑھ کر ایک مانوس ماحول۔ جیلانی نے اکثر ہندوستان واپس جانے کا ارادہ کیا تھا کیونکہ سیاسیات کے جھگڑوں سے اسکو سخت نفرت تھی اور کراچی سے وہ گھبرا گیا تھا۔ یہ تو محض ایک کاروباری شہر ہے جس کی تاریخ ابھی وجود میں نہیں آئی ہے۔ پاکستان ملنے سے کیا فائدہ تھا جب کہ تہذیب و تمدن کے وہ نشانات جن کو ہمارے بزرگوں نے اپنی ہڈیوں سے سینچا تھا ہم سے چھین لئے گئے۔ دنیا اپنی تاریخ اور اپنے تمدن کو زندہ رکھنے کے لئے جان دیتی ہے اور ہم نے ان ہی سے زمین کے ایک حصے کا سودا کیا۔ لال قلعہ اور تاج محل کے متعلق وہ بڑی شدید جذباتیت کے ساتھ سوچتا تھا۔ ایک مرتبہ ظفر نے اس سے کہا تھا کہ "تم تو ان بے جان عمارتوں کے لئے اتنا پریشان رہتے تھے کہ شاہ جہاں کا کوئی جانشیں زندہ ہوتا تو اس کو بھی اتنا غم شاید نہ ہوتا" ــــ جیلانی کا سیلانی تصور پہاڑی ندی کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا کوئی راہ وہ متعین نہیں کر سکتا تھا۔ کہاں تو پاکستان سے بیزاری تھی اور کہاں جب اسے دلی کی ایک شام یاد آئی تو کچھ اور کیفیت ہو گئی۔ قتل عام کے بعد بھی وہ دہلی میں ٹھہرا ہوا تھا کیونکہ شدت غم سے احساس غم ہی زائل ہو گیا تھا۔ لیکن ایک شام جب وہ چاندنی چوک کے مانسٹرو میں چائے پینے کے لئے گیا تو ایک چھوٹے سے بورڈ پر نظر پڑی جس پر لکھا تھا "صرف ہندوؤں کے لئے" اس خیال سے اس وقت بھی وہ چونک گیا جیسے اس کے پندار کو زبردست ٹھیس لگی ہو۔ لال قلعہ مٹی کا ڈھیر معلوم ہونے لگا وہ سوچنے لگا تاریخ تو کہاوتوں کا مجموعہ ہے اور ہندوستان جیسے ملک

میں کیسے ہماری تاریخ لکھی جا سکتی تھی۔

تصورات کی اس جاں سوز قنوطیت سے جیلانی گھبرا سا گیا تھا محض گریز کے طور پر وہ بالکونی میں چلا گیا تاکہ خیالات کی رو کو دوسری طرف موڑ سکے۔ سامنے مصطفیٰ مینشن کے ایک فلیٹ میں ایک حسن مجسم نماز میں مشغول تھی۔ فطرت کے اس شاعرانہ پہلو اور حسن کو معبود کی بارگاہ میں سرنگوں دیکھ کر اس پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوگئی اور تصور اور بھی تیزی سے بحال ہو گیا۔ مسافر کو گزری ہوئی منزل یاد آ رہی تھی۔

اپنی بے پناہ روحانیت کے باوجود جیلانی کو حسن و عشق کی داستانیں عجیب سی معلوم ہوتی تھیں۔ جب وہ کالج میں ایم اے میں پڑھ رہا تھا تو کئی لڑکیاں بھی اس کے ساتھ تھیں۔ زیادہ تعداد طلسمات بنگال کے ان مہوشوں کی تھی جن کی چھلکتی جوانیاں ہر ہر قدم پر ملکین و مہوش کو بے ہوش کرتی گزر جاتی تھیں۔ ان میں کچھ ایسی بھی تھیں جو اپنی نئی جوانی سے رسم و رواج کی پرواہ کئے بغیر بے دردی سے انتقام لے چکی تھیں، کچھ ایسی بھی جو کالج کے چھوکروں کو منہ لگانا ذلت سمجھتی تھیں اور چند ایسی جنکی دنیا کتابوں تک محدود تھی۔ کالج کے گھنٹوں کے بعد لڑکیوں کا پیچھا کرنا بیشتر نوجوانوں کا معمول تھا اور وہ پیکر حسن و ناز بھی اسمیں دلچسپی محسوس کرتی تھیں۔ جیلانی کو یہ عشق واقعی دماغی خلل کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ لڑکیوں سے ہمیشہ کتراتا تھا۔ ٹیوٹوریل کے کلاسوں میں جہاں وہ دو لڑکیوں سہرا اور زبیدہ کے ساتھ ہوتا تھا اس کی طبیعت گھبراتی تھی۔ پروفیسر کی عدم موجودگی میں ان کی عشوہ طرازیوں سے اسکو نفرت ہوتی تھی۔ زبیدہ بڑی شوخ اور چنچل لڑکی تھی۔ وہ جیلانی کو چھیڑنے کے لئے شیلے اور کیٹس کی نظموں پر بیجا تنقید کرتی ایک دو مرتبہ اس نے جھنجلا کر زبیدہ کو کچھ برا بھلا بھی کہہ دیا تھا جس کا خود بعد میں اسے افسوس ہوا تھا۔

ایک مرتبہ جب وہ دونوں تنہا تھے تو زبیدہ نے بڑے ڈرامائی انداز میں اظہار محبت بھی کیا تھا جیسے وہ سچ مچ جولیٹ کا پارٹ ادا کر رہی ہو۔ جیلانی کے چہرے پر ایک رنگ آیا لیکن وہ پتھر کی مورت بنا بیٹھا رہا جیسے اس کے سینہ میں دل ہی نہیں۔ زبیدہ جیسی کالج کی مقبول ترین شخصیت کو اس سے ٹھیس لگی۔ پھر کر وہ انتقامی جذبہ میں بولی۔۔۔ ہاں تو آپ کے تصورات اور آئیڈیل کی نورجہاں اس دنیا میں تو نہیں مل سکتی ہے ـــــــ لیکن پاکستان پہنچنے کے بعد جیلانی کو جب زبیدہ کی شادی کی خبر معلوم ہوئی تو اس نے اسکو مبارکباد کا ایک خط لکھا تھا۔ زبیدہ کے جواب سے جیلانی کو اس سے بے پناہ ہمدردی ہو گئی تھی اور اسے حیرت تھی کہ زندگی کی حقیقتوں سے دو چار ہونے کے بعد وہ کیسے اتنی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ جیلانی اس کی ٹریجیڈی سے بہت متاثر ہوا تھا اور اس وقت بھی زبیدہ کے خط کا ایک جملہ اس کے ذہن کی گہرائیوں میں گونج رہا تھا۔ "میں نے آپ کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ آپ واقعی قابل پرستش انسان ہیں۔"

اس نے سگرٹ سلگایا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دھوئیں کے چھلوں کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں ماضی کے نقوش ابھر رہے ہوں۔ وہ اپنی محبت کے ناتمام افسانے میں آج پھر رنگ بھر رہا تھا۔ اسے اس تلخی میں بھی ایک کیف مل رہا تھا کتنا سہانا تھا وہ دن جب اس نے ریحانہ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ اس کے دفتر میں سب ڈویژنل آفیسر مقرر ہوئی تھی اور جیلانی اسی کے شعبہ کا رپورٹر تھا جیلانی نے بڑی دلچسپی اور انہماک سے اس کو کام سکھانا شروع کیا لیکن ریحانہ کی متین اور سادہ لوح فطرت کا اخباری ماحول میں دم گھٹنے لگا۔ وہ تو اپنے رشتہ داروں کے انگریزی تخیلات کے ماتحت یہاں آ گئی تھی لیکن اپنی فطرت سے اس کے لئے جنگ کرنا مشکل ہو گیا اور وہ ایک مہینہ کے اندر ہی اندر روانہ ہو گئی۔ جیلانی نے ایسا محسوس کیا کہ اس کی دنیا کی گھٹاٹوپ تاریکی میں ایک بجلی چمکی تھی جس کے بعد پہلے سے بھی زیادہ اندھیرا چھا گیا۔

ریحانہ کی روانگی نے جیلانی کی جذباتیت کو اور اجاگر کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ یہ محسوس کرنے لگا تھا جیسے اس کی بے مقصد زندگی کو کوئی محور مل گیا ہو اس مرکزیت کی تعمیر میں اسے ایک کیف ملنے لگا تھا لیکن تقریباً ایک مہینہ کے بعد کچھ ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے اس کی زندگی کے دھارے کا رخ بدل دیا تھا۔ ایک شام دفتر سے واپسی کے بعد وہ بالکونی میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ نظریں اوپر کیں تو متصل بالکونی میں ریحانہ کو دیکھا۔ پہلے تو آنکھوں پر اعتبار نہ آیا لیکن دل کی نظروں نے فوراً پہچان لیا ریحانہ کا لاہوتی تبسم بھی چھپنے کی چیز تھی۔ سلام و نیاز کے پیامات کچھ آنکھوں اور کچھ دل کی زبانی سنائے گئے۔ جیلانی کے متصل چار کمروں والا فلیٹ ریحانہ کے گھر والوں کو بڑی مشکلوں سے ملا تھا۔ جیلانی کو خوشی اس کی بھی ہوئی کہ وہ نیا خصلت میمن جو پہلے اس فلیٹ کا مالک تھا دفع ہوا لیکن سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ شاید اب اسکو اپنی ادھوری داستان پوری کرنے کا موقع مل سکے۔ جیلانی کی شرافت اور اس کی سنجیدگی سے ریحانہ کے گھر والے بہت متاثر ہوئے تھے اور راہ و رسم بڑھتے بڑھتے وہ گھر بھی جیلانی کا اپنا ہی ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود جیلانی بے تکلف نہ ہو سکا۔ وہ ریحانہ کے بھائی سے بہت گھبراتا تھا جو نہ جانے کیوں اس سے بغض رکھتا تھا۔ جیلانی نہیں چاہتا تھا۔ کہ اس کی وجہ سے ریحانہ کی اس محبت پر حرف آئے جس کی اتنے عرصہ تک اس نے پرستش کی تھی۔

جیلانی کو ریحانہ سے بے پناہ محبت تھی لیکن وہ اس کے اظہار کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ شروع شروع میں اسے جو محبت کی ماورائیت میں سکون

ملتا تھا۔ کیونکہ ریحانہ کے دل کی گہرائیاں مونالیزا کی مسکراہٹ تھیں جس کو صرف آرٹ کا خالق سمجھ سکتا تھا۔ جیلانی کا عشق پرستش کا قائل تھا اور اس کو اب سامان بھی مل گیا تھا۔

لیکن جب جیلانی ملیریا میں ہفتوں بیمار رہا تو عشق نے دوسری کروٹ بدلی شروع شروع میں تو اس کا تصور اسے فریب رنگ و بو میں لے جاتا اور وہ اکثر محسوس کرتا کہ کسی کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ اس کے کانوں میں لس رہی ہے اور گیسوئے پریشاں اس کے سینے پر لوٹ رہے ہیں اور وہ اس تصور کی لذت سے چونک اٹھتا۔ بیماری کے دنوں میں ریحانہ گھنٹوں اس کے پاس رہتی مختلف عنوانات پر باتیں ہوتیں آرٹ اور شاعری عام موضوع تھے گفتگو کی سرحد اکثر حسن و عشق کے تذکروں کے قریب پہنچ جاتی اور پھر دونوں کی آنکھیں جھک جاتیں۔ جیلانی نے ریحانہ کو اپنی زندگی کی کہانی بھی سنائی۔ وہ زندگی جس میں تاریکی تھی وہ المیہ جس نے اس کی ہڈیوں تک کو سلگا دیا تھا۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ اس تھوڑی سی زندگی میں وہ جن کشاکش سے گزرا ہے شاید دو چار انسانوں کی زندگیوں کو ملا کر بھی پیش نہ آئے ہوں اسے اپنے گھر کے لوگوں سے سخت نفرت تھی اور وہ کراچی اسی لئے آیا تھا تاکہ ان سے دور ہو جائے ـــــ جیلانی نے ریحانہ کو سب کچھ سنا دیا۔ صرف ایک واقعہ دانستہ طور پر اس نے اس سے پوشیدہ رکھا نہ جانے کیوں۔ غالباً اس لئے کہ اسکو ٹریجیڈی کے اختتام کے لئے آخری سین کا انتظار تھا۔

بیماری کے بعد ریحانہ کچھ اور اس سے قریب ہو گئی تھی جیلانی دفتر چلا جاتا تو وہ اس کے کمرے میں بیٹھی اس کی ڈائری، کتابوں، مضامین اور دو چار نامکمل افسانوں کا مطالعہ کرتی رہتی۔ اُن بے جان افسانوں کے ذریعے وہ جیلانی کو اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھ سکتی تھی جس کے ذریعے وہ اور قربت محسوس کر رہی تھی لیکن محبت کے کلمات آنکھوں سے اتر کر کبھی اس کی زبان پر نہ آئے۔ اس کے دل کی وادی کی موسیقی میں کبھی گونج اور بازگشت نہ ہوئی۔

جیلانی آج اتنے دنوں کے بعد بھی بیتی ہوئی گھڑیوں کے تصور سے لطف اندوز ہو رہا تھا وہ بالکونی میں آرام کرسی پر دراز ہو گیا تاکہ دل کی لہروں کو آزادی سے بہنے دے۔ اسے کلفٹن کی وہ نشاط انگیز شام یاد آ رہی تھی۔ جب وہ ریحانہ اور اس کے گھر کے سب لوگوں کے ساتھ چودھویں شب میں سمندر کے جوار کا منظر دیکھنے گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ ریحانہ کے ساتھ اور لوگوں سے دور جا نکلا تھا۔ آگے چل کر دونوں ریت کے ایک ٹیلے پر بیٹھ گئے تھے۔ سمندری ہوا کے جھونکوں نے لہروں کے نقوش بنا دیئے تھے بالکل ایسے جیسے وقت کی گھڑیاں اپنی تلخ یادگاروں کو انسانی جسم پر جھریوں کی شکل میں چھوڑ جاتی ہیں۔ بس خاموش صحرائی پس منظر میں دونوں کے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ ماحول کی سحر آفرینی اور محبت کا ناقابل بیان کیف جیلانی کی جذباتیت کو جنون میں تبدیل کر لینے کے لئے کافی تھے لیکن انتہائی کوششوں کے باوجود وہ کچھ نہ کر سکا دونوں سوائے موسم اور شاعری کے تذکرے سے آگے نہ بڑھے۔ نگاہیں کبھی کبھی مل جاتی تھیں لیکن پھر سمندر کی لہروں کی طرف لوٹ جاتی تھیں۔ بالکونی میں بیٹھے بیٹھے جیلانی نے اپنے تحت الشعور میں سمندر کی اتھاہ گہرائی سے ایک بھنور اُٹھتی ہوئی دیکھی جو اس کے قریب آ گئی۔ اس کی دلکشی ایسی تھی جیسے موت کا راگ۔ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ دانستگی میں وہ خود کو گرداب کے حوالے کر چکا ہے جس کے بعد ایک سکوت چھا گیا اور سمندر کی لہریں خاموش پڑ گئیں۔ جیلانی چونک گیا۔ اسکا تصور بہک گیا تھا۔ وہ دراصل جوار کے وقت کی کیفیات کو تازہ کر رہا تھا۔ چاندنی رات میں دور سے آتے ہوئے پانی کی اونچی دیوار کتنی خوفناک معلوم ہوتی تھی۔ جیسے جیسے وہ دیوار قریب آتی جاتی تھی ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں اور ریحانہ تو سہم کر اس کے شانہ سے لگ گئی تھی اور بے خودی کے عالم میں کافی دیر تک یوں ہی رہی جب تک ریحانہ کے بڑے بھائی کی آواز نے انہیں چونکا نہیں دیا جو دور سے پکار رہے تھے۔ دونوں کی نظریں اوپر کو اٹھیں آپس میں ملیں اور پھر جھک گئیں اور پھر دونوں ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے موٹر تک پہنچے۔

جیلانی کا سلسلہ خیال اس منزل پر پہنچ کر شاید دم لینے لگا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور اپنی عمارت کی بالائی منزل سے سامنے کی طرف عمارتوں کے جنگل میں نیرو فیڈ کو دیکھ رہا تھا وہ حسرت بھری نظروں سے اس عمارت کو تلاش کر رہا تھا جس کو اپنے دماغ کی ہیجانی کیفیت کے باعث وہ دو مہینہ پہلے چھوڑ چکا تھا اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔ لیکن وہ ہیجانی کیفیت کیسے کہی جا سکتی تھی وہ تو اس کی ٹریجیڈی کا ایک لازمی سین تھا۔ جیلانی نے آنکھیں بند کر لیں جیسے انتہائی کرب کا عالم اس پر طاری ہو یا وہ اس گزرے ہوئے دور کی لذت سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہو۔ قدرت نے بہت بلندی پر پہنچا کر اس کو گرایا تھا جس کے چوٹ کی کسک وہ ابتک دل کی گہرائیوں میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کے خیالات کا سلسلہ پھر ریحانہ سے جا ملا۔

کتنی خوشگوار تھی وہ شام جب ریحانہ ایک شگفتہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی اور اس نے کہا تھا "کل میری سالگرہ ہے" اور پھر اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ جیلانی کے دل میں ایک ہوک اٹھی۔ اور دوسری صبح جب جیلانی نے دفتر جا کر منیجر سے پیشگی تنخواہ کی درخواست دی اور وہ رد کر دی گئی تو جیسے اس کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی ـــ آج ریحانہ کی سالگرہ ہے مجھے کچھ تحفہ ضرور دینا چاہئے۔ بہت منت و سماجت کے بعد بھی منیجر رضامند نہ ہوا۔ اس کے بعد وہ مختلف رسالوں اور اخباروں کے دفتروں میں گیا جہاں مضمون لکھنے

(بقیہ صفحہ ۹۶)

ریاض الدین

خانہ داری اور نااتفاقی

یہ کون نہیں جانتا کہ حدود دنیا میں سکھ اور چین کی گھڑیاں گزارنے کے لئے عزت اور وقار کے لمحات بسر کرنے کے لئے اتفاق کی ضرورت ہوتی ہے یہ رنگین دنیا جب اپنے طلسم زار رقص سے اہل دنیا کو مسحور کرتی ہے۔ تو اس کے ہر قدم پر نااتفاقی، ہر کروٹ پر بدظنی، بدباطنی، ہر پہلو پر کدورت، اور بغض و عناد کی رنگین تصویریں سطح زمین پر نمودار ہوتی ہیں۔ پہلے پہل ان رنگین تصویروں کا دلکش نظارہ اپنی دلفریبی اور دلکشی کے باعث انسانوں کو لبھاتا اور گرویدہ بناتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہی پُرفریب گہوارہ ایک دل شکن وادی ہوتی ہے۔ زندگی کا یہ سہانا دور خواہ وہ امیری میں بسر ہو خواہ غربت میں گزرے، ہر ایک کے چند سال جو خانہ داری میں بسر ہوتے ہیں، خود اپنے بچپن کے حاصل کردہ علم، تعلیم و تربیت کا امتحان اور آئندہ آنیوالی نسل کے لئے ایک بہترین درسِ عبرت اور تجربے کا ذخیرہ ہوتے ہیں۔ جب یہ بات ناقابل فراموش ہے تو پھر ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی گھریلو زندگی میں نہ صرف سطحی طور پر اتفاق پیدا کرلیں، بلکہ دائمی اور باہمی اتحاد بھی اشد ضروری ہے۔

ہر ایک جانتا ہے۔ کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اتفاق جیسی برکت اور کسی شے میں نہیں ہے۔ پھر کیوں نہ ہم اس چھوٹی سی گھریلو حکومت خانہ داری پارلیمنٹ میں اتفاق اور یکجہتی پیدا کریں۔ جو نہ صرف ہماری خوش آئند زندگی کا باعث ہو۔ بلکہ آئندہ آنیوالی نسل کے لئے خاندان میں خوشگوار فضا پیدا کرکے عبرت کی وجہ بن سکے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پہلے ہمیں نااتفاقی کی خرابیوں کو ذہن نشین کرلینا چاہیئے گھریلو زندگی میں زن و شوہر کی نااتفاقی یا ساس بہو کا طرز مخالفت نہ صرف گھر کی پُر امن اور دلکش فضا کو پریشانیوں میں جھونک دیتی ہے۔ بلکہ بھائی بھائی، سہیلی سہیلی دوست دوست ایک دوسرے کے جانی دشمن بن جاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے متمنی ہوتے ہیں۔ آپ ہی خیال کیجیئے۔ بنی نوع انسان جبکہ ایک ہی مقدس ہستی کی نسل سے چلے آرہے ہیں۔ تو پھر اپنے ہی بھائی کے نقصان میں اپنا ہی نقصان نہ ہوگا تو اور کیا ہو۔ نااتفاقی سے طبیعتوں میں ایک قسم کا تفرقہ اور خواہشات میں ایک قسم کی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ اور جب ایک ہی خاندان کی متضاد ہستیاں گھر میں بے دلی اور نااتفاقی رونما کرتی ہیں تو پھر گھر میں امن سکون کہاں؟

یہ کیوں ہوا کرتا ہے۔ محض اس لئے کہ ہم میں جہالت ہے۔ ہم وسیع النظری کو کام میں نہیں لاتے، بلکہ کم علمی کی وجہ سے غلط راہ پر چل دیتے ہیں۔ جو خود ہماری خانہ جنگی کا باعث ہوتی ہے۔ ہم میں جہالت اور تنگ نظری کیوں ہے، محض تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اور ہم پرانی لکیر کے فقیر اور رسم و رواج کے پابند چلے آتے ہیں۔ تعلیم سے میرا مقصد مغربی تعلیم یا وہ تعلیم نہیں جو محض نام نہاد آزادی اور فیشن پرستی غرور و نخوت کا بندہ بنائے۔ بلکہ وہ تعلیم جو انسان کو مکمل انسان بناتی ہے، وہ وصف اور خوبیاں پیدا کرتی ہے۔ جس سے عوام مقناطیسی اثر کی طرح اس کی جانب کھنچے چلے آتے ہیں جو نہ محض بغض و عناد اور کدورت کو مٹاتی ہے۔ بلکہ جس کی جھلکتی ہوئی ضیا اتحاد و مروت کا ولولہ پیدا کرتی ہے جو اخلاقی حیثیت سے انسان کو اکمل ترین مخلوق بناتی ہے۔ اور چونکہ اسی تعلیم کی ہم میں کمی ہے۔ اسوجہ سے ہم میں وہ شادابی اور سکھ چین کی لہر نہیں۔

پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے وہ نونہال جو آئندہ قوم یا خاندان کے سالار کار بننے ہیں اپنی بے ترتیبی اور اطفال نشو و نما کی وجہ سے اپنے ناکمل شیوہ انسانیت اور اخلاق کی عدم حضوری کی بنا پر اپنی کمتری کی جھینپ کو مٹانے کے لئے اپنی ضدی سرشت پر اتر آتے ہیں یہی خاندان کی نااتفاقی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ آپکو معلوم ہے ایک جرم سے دوسرے جرم کی ابتدا ہوتی ہے، پہلے ہی جرم کے وقت آپ نے روک نہ دیا تو آپ کی یہ کمزوری آئندہ جرائم کا انسداد مشکل سے کریگی۔ جھگڑا فساد، گالی گلوچ اور ذلیل باتوں پر اتر آنا یہ بھی تو ایک اخلاقی جرم ہے اگر اس کی روک تمام بچپن میں اولاد کی نشو و نما اور تربیت کے وقت نہ کی گئی۔ تو یقیناً آئندہ بچوں کا حوصلہ بڑھا کر ایک فسادی اور جھگڑالو انسان بنادے گی۔ بسا اوقات جرائم سے بے باکی انسان کو غنڈے کینگی کی عادتوں میں بدل دیتی ہے۔ جس سے انسان اپنی شرافت اور وقار کھو دیتا ہے۔ اور جب عیش پرست انسانوں کے دلوں میں عیش پرستی اور کاہل نمدزری

بیت المقدس — مسلمانانِ عالم کا قبلۂ اوّل

جو ۳۳ صدیوں میں اٹھارہ مرتبہ تعمیر ہوا

برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا نے بیت المقدس کی تاریخ مختصر الفاظ میں یوں درج کی ہے۔ انسان بارہا اس خطۂ پاک کو پیوندِ زمین کر چکا ہے۔ بیس مرتبہ اس کا محاصرہ کیا گیا۔ اور اٹھارہ مرتبہ اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ بخت نصر اور شاہ ہیڈرین کے عہدِ حکومت میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی یہ وہ زمانہ تھا جبکہ تاریخ کی تدوین باقاعدہ نہ تھی۔ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ اس پر چھ دور مذاہب کی تبدیلی کے گزرے ہیں یعنی اس کے باشندوں کو چھ مرتبہ اپنا آبائی مذہب ترک کر کے نیا مذہب اختیار کرنا پڑا ہے!

آج بھی دُنیا کی نگاہیں اسی پاک و مقدس سرزمین کی طرف لگی ہوئی ہیں جو تاریخ انسانی کے قدیم ترین شہروں میں تصور کیا جاتا ہے۔ عرب میں اس وقت کوئی ایسا مقام نہیں جس نے گردشِ لیل و نہار کے اتنے مختلف پہلو دیکھے ہوں۔ جو اس کے نصیب میں آچکے ہیں۔ آج بھی اس سرزمین کی آغوش میں ہزاروں انقلاب پرورش پا رہے ہیں۔ اور نہ جانے زمانہ کی ایک ہلکی سی کروٹ سے یہ فتنے بیدار ہو جائیں۔ اور آگ اور خون کا ایسا کوہ آتش فشاں پھٹ پڑے جو سارے عالم کو اپنے شعلوں کی لپیٹ میں لے لے۔

اس پر ایسا بھی زمانہ گزرا ہے۔ جب اس کی سرسبز وادیاں پاٹ دی گئی ہیں۔ اور اس کے گلی کوچوں اور عمارتوں کو تہ خاک کر دیا گیا ہے اس کے باشندوں کو بارہا تلوار کا پانی پلا کے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی بیت المقدس اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اس کی روح غیر فانی ہے۔ اس لئے وہ سطحِ ارض پر ہمیشہ باقی رہے گا۔ دُنیا میں کوئی ایسا مقام نہیں جس نے ۴۰ صدی سے اس کثرت کے ساتھ آلام و انقلاب دیکھے اور پرورش کئے ہوں۔

بیت المقدس کا محلِ وقوع

بیت المقدس ایک پہاڑ صیہون پر واقع ہے۔ جو بحیرۂ روم کی سطح سے ۲۴۰۰ فٹ اور جھیل مردار کی سطح آب سے ۳۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے۔ نام نہاد اسرائیل حکومت کے دار الحکومت تل ابیب سے اس کا فاصلہ ۳۴ میل ہے اور فلسطین کی عرب حکومت جو حال ہی میں قائم ہوئی ہے کے دار السلطنت غزہ سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ فلسطین کی مشہور بندرگاہ جہاں تیل صاف کرنے کے بڑے بڑے کارخانے ہیں اس سے ۱۰ میل دور ہے۔

اس کا ابتدائی نام قدیم اَبے لبن ہے۔ انگریز اسے یروشلم کہتے ہیں جس کا تلفظ جوزلم ہے۔ جو اصل میں عبرانی لفظ ہے

بیت المقدس کی مختصر تاریخ

یوں تو اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اور برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا نے تو بیت المقدس کو ۳۳ صدی کا پرانا شہر بتایا ہے۔ تاریخ کے ان اندھیروں یعنی واقعات کی اہم کڑیوں کو ڈھونڈنا ہماری دسترس سے باہر ہے۔ اس لئے ان واقعات کا ذکر قیاس آرائیوں سے زیادہ نہیں۔ البتہ ۳۳ء سے اس شہر کے واقعات مربوط اور منضبط حیثیت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ اس سنہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھایا گیا۔ ۴۳ء میں سینٹ پال نے عیسائیت قبول کرنے کے بعد اس شہر کی زیارت کی شہنشاہ طیطوس نے ۷۰ء میں یہودیوں سے یہ شہر فتح کر کے اس کے معبد کو نذرِ آتش کر دیا۔ ہیکل کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا۔ اور اس مقام پر ہل چلوا دیئے۔ تاکہ اس کا نام و نشان تک بھی نہ باقی رہے اس کے بعد شہنشاہ ہیڈرین کا زمانہ آیا اور اس نے ۱۳۶ء میں اس کا نام ہی بدل دیا پہلے اسکا نام ایلیا رکھا۔ مگر بعد میں کیپی ٹولینا قرار دیا۔ قریب دو سو سال تک پھر اس مقدس مقام کی تاریخ گمنامی کے پردوں میں چھپ جاتی ہے۔ لیکن ۳۳۶ء میں پھر عیسائی حکومت قائم ہوئی مسجد اور کلیسا از سر نو تعمیر کرائے

گئے۔ اس کے بعد مورخین پھر خاموش ہو گئے۔ اور سرزمین پر بھی کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا جس کا ذکر ہماری تاریخ کے لئے ضروری ہوتا۔ وقت گزرتا گیا اور بڑی تیز رفتاری کے ساتھ حتیٰ کہ ۶۱۴ء آ گیا۔ اب کے بار اس کی فتح کا سہرا شاہ ایران خسرو ثانی کے سر لکھا تھا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ طویل محاصرہ کے بعد شاہ ایران نے اسے فتح کر لیا۔ اس جنگ میں تقریباً انیس ہزار عیسائی قتل ہوئے۔ لیکن ابھی پورے چودہ سال گزرنے نہیں پائے تھے کہ شاہ ہرقل نے شاہ ایران کو شکست دے کر قبضہ کر لیا۔ ۶۳۶ء میں حضرت عمرؓ نے شہروں کے محاصرہ کے بعد اس مقدس شہر کو فتح کر لیا اس فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے عیسائیوں کو آزادی سے گرجاؤں میں عبادت کرنے کی اجازت دی۔ جو وہاں جنگ عظیم یعنی برطانیہ کے قبضہ سے پیشتر تک جاری رہی۔ اس موقع پر مسلمانوں اور عیسائیوں میں ایک معاہدہ ہوا تھا جس کی رو سے طے پایا تھا کہ بیت المقدس میں آئندہ کوئی گرجا تعمیر نہیں کیا جائے گا۔ اور عیسائی لباس پٹکے اور سر کی مانگ میں مسلمانوں کی مشابہت نہیں کریں گے۔ اس فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے بیت المقدس میں دس روز قیام فرمایا تھا۔ اور مسجد عمرؓ کی سنگِ بنیاد رکھا تھا۔ اب اسی کو مسجد اقصیٰ کہتے ہیں۔ ۶۹۱ء میں مسجد عمرؓ کی تعمیر ختم ہوئی اس پر ملک مصر کی سات سالہ گذری صرف ہوئی۔ یوں ۱۰۹۵ء بہت ہی اہم ہے ۱۰۹۵ء سے عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگیں شروع کیں اور دو صدی تک جاری رکھیں۔ عیسائیوں نے ان جنگوں کے دو مقاصد بتلائے تھے۔ ایک تو یہ کہ عیسائی حاجیوں کی مسجد مقدس کی زیارت میں جانیں محفوظ ہوں دوسرے فلسطین پر عیسائی حکومت قائم ہو۔ بعد میں قسطنطنیہ اور مصر بھی ان کی حرص و آز سے نہ بچ سکے اور بہت سے سخت معرکوں کے وہ جولانگاہ رہے۔ آخر چودھویں صدی میں ترکوں نے صلیبی جنگوں کو دفاعی جنگوں میں تبدیل کر دیا۔

صلیبی جنگوں کے آغاز کا سبب عیسائی مورخوں نے یہ بتایا ہے کہ جب سلجوقیوں نے فلسطین پر قبضہ کیا تو عیسائیوں کے لئے حج مشکل اور خطرناک ہو گیا۔

اس بنا پر پوپ اربن ثانی اور پیٹر دی ہرمٹ نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ ان کی اس پکار کو شاہوں اور عوام نے یکساں اہمیت دی چنانچہ والٹر پینی لیس اور پیٹر ۱۰۹۶ء میں ایک صلیب لے کر ایک غیر منظم انبوہ کے ساتھ فلسطین کی جانب روانہ ہوئے۔ اس انبوہ میں بہت سے شاہزادے اور رئیس بھی شریک تھے یہ انبوہ لڑتا بھڑتا انطاکیہ پہنچا۔ اسے فتح کیا۔ پھر چالیس ہزار صلیبی جوانوں کے ساتھ بیت المقدس کی فصیل تک پہنچا۔ سخت جنگ کے بعد بیت المقدس کو مسلمانوں سے فتح کر لیا۔ ان نوجوانوں نے دس ہزار مسلمانوں کو شہید کیا۔ اور عیسائی حکومت قائم کر لی۔ بوئلی ربلجیم کے گاڈفرے کو صلیبیوں نے یہاں کا بادشاہ بنا لیا۔ اس کے بھائی بالڈون کو بلاد عراق کا۔ بوہمنڈ کو انطاکیہ کا بادشاہ تسلیم کیا۔ گاڈفر نے ۱۱۰۰ء میں مر گیا۔ تو اس کی جگہ بالڈون ہوا۔ یہ پہلی صلیبی جنگ تھی اس دور میں عیسائیوں نے مسلمانوں اور یہود کا صفایا بھی کیا۔ اس کے بعد ۱۱۴۷ء میں دوسری صلیبی جنگ لوئی ہفتم اور کونراڈ ثالث سے ہوئی اور وہ ناکام و نامراد رہے۔ یورپ نے اس شکست کا اعلان ۱۱۴۹ء میں کیا۔

اس جنگ میں عیسائیوں کا بے اندازہ نقصان ہوا۔

۱۱۷۴ء میں سلطان صلاح الدین بن یوسف بن ایوب سلطان مصر نے دمشق فتح کیا۔ اور ۱۱۸۳ء میں حلب پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد بلاد گیلیلی میں دو بڑے معرکے عیسائیوں کے ساتھ طبریہ اور حطین پر ہوئے۔ اور اکتوبر ۱۱۸۷ء میں بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ صخرہ پر جو سونے کی صلیب تھی سلطان نے اسے اپنے ہاتھ سے اتار پھینکا۔ اور اس کی جگہ اپنا ہلالی جھنڈا نصب کیا۔ مسجد کو اسی حال پر دوبارہ بنوایا۔ یورپ میں عیسائیوں نے اس فتح کو تعجب اور غصہ سے سنا۔ اس کے بعد رچرڈ دل شیر، شاہ انگلستان فلپ آگسٹس ثانی والیٔ فرانس اور فریڈرک والیٔ جرمنی کثیر فوج کے ساتھ تیار ہوئے۔ جرمنی والے ایشیائی کوچک کی راہ سے روانہ ہوئے شہنشاہ فریڈرک راستے میں ہی ڈوب کر مر گیا۔ باقی دونوں سمندر کے راستے سے

منزل ہے کہاں

اے مسافر تو کہاں ہے تیری منزل ہے کہاں

رخصتِ کہسار ہو یا سیلِ بحرِ بیکراں ❖ تیری پابوسی کو ملتی ہیں ہزار انتظار
تیری منزل کی طرف جاتی ہے راہِ کہکشاں ❖ ہے تری پرواز کی خاطر ہواؤں میں تشنگی
تیرے قدموں کے لئے مٹی کے انمول نشاں ❖ پاؤں دھونے کے لئے آب جو ہے بے قرار
دشت میں ذروں کو ملتا ہی نہیں تیرا نشاں ❖ سر اٹھا کر دور سے تکتے ہیں تجھ کو کہسار
دیکھتا جاتا ہے تجھ کو چاند کا تختِ رواں ❖ تیری خاطر آسماں پر ہیں ستارے بے قرار
دامنِ عالم میں پوشیدہ ہیں اسرارِ نہاں ❖ سیکڑوں سوتی ہیں اور تیری نظر ایک تار
تیرے احساسات پر طاری ہے کیوں غم کا گماں ❖ پھولوں کی آگ سے کر دے کلی کو بے قرار
اپنے دامن میں چھپائے رات کی تاریکیاں ❖ اپنی ہمتِ عزم سے نورِ سحر کر آشکار
جلتے ہیں منزل بہ منزل کارواں کا کارواں ❖ کس لئے سنسان ہے تیری وسیع دہلیز دہاں

اے مسافر تو کہاں ہے تیری منزل ہے کہاں

تک پہنچے۔ جہاں صلاح الدین ایوبی نے ایسی شکست فاش دی کہ کسی کو بیت المقدس تک پہنچنے کی ہمت اور توفیق نہ ہوئی۔

۱۱۹۰ء سے ۱۲۰۴ء تک ہنری ششم نے چوتھی بار حملہ کیا۔ مگر شکست فاش کھائی۔ اس جنگ میں ۱۲۱۲ء میں ایک فرانسیسی لڑکے آسٹین کی سرکردگی میں جوانوں کے علاوہ بارہ بارہ اور چودہ سال کے تیس ہزار لڑکے بھی صلیبی جنگ کیلئے یورپ کے تمام ملکوں سے اکٹھے ہوئے اور نعرے مارتے ہوئے مارسیلز سے جہازوں پر روانہ ہوئے۔ اس طرح وینس سے بھی بجائے بیت المقدس پہنچنے کے یہ لوگ قسطنطنیہ پہنچ گئے۔ اس کے بعد ۱۲۱۷ء میں ہنگری سے پانچویں صلیبی جنگ ہوئی اور کیا ۱۲۲۸ء میں چھٹی صلیبی جنگ فریڈرک ثانی کی قیادت میں ہوئی ۱۲۲۹ء میں ایک معاہدہ کے ذریعہ سلطان کامل نے بیت المقدس عیسائیوں کے حوالہ کر دیا ۱۲۳۹ء میں مسلمانوں نے عیسائیوں سے واپس لے لیا۔ یہ ساتویں صلیبی جنگ تھی۔ جو فرانس کے بادشاہ لوئی سے ہوئی۔ اس میں لوئی گرفتار ہوا۔ اور چار لاکھ طلائی سکے دے کر ۱۲۵۰ء میں قید سے رہا ہوا۔ اور واپس وطن چلا گیا۔

اس کے بعد آٹھویں صلیبی جنگ شاہ فرانس اور ایڈورڈ اول شاہ انگلستان سے ہوئی۔ اس میں ساٹھ ہزار عیسائی قتل ہوئے۔ بالآخر عیسائیوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی پھر ۱۲۷۱ء میں نویں صلیبی جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ اور بیت المقدس پر عیسائیوں کا پھر قبضہ ہو گیا ۱۲۴۴ء میں عیسائیوں کو غزہ کے مقام پر سخت شکست ہوئی اور بیت المقدس پر مسلمانوں کا بغیر جنگ قبضہ ہو گیا۔ ۱۲۴۸ء میں دسویں صلیبی جنگ ہوئی صلیبی افواج لوئی نہم کے زیر کمان تھیں۔ یہاں تک کئی جنگوں کا جولانگاہ مصر رہا۔ یہ جنگ بھی عیسائیوں کے لئے تباہ کن رہی۔ کیونکہ اس میں لوئی بے شمار فوج کے ساتھ گرفتار ہو گیا تھا۔ بعد میں لوئی کو ۸۰ ہزار اشرفی بطور زر فدیہ ادا کرنا پڑا۔ آخر میں ۱۲۹۱ء میں یہ جنگ مکمل طور پر یہ جنگ مکمل طور پر بند ہو گئی۔ اور اس سے عیسائیوں کو کوئی بڑا فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ یورپ کا اقتدار اور گھٹ گیا۔

اس کے بعد ترکی کے شاہ سلیم اول نے ۱۵۱۷ء میں بیت المقدس پر قبضہ کر لیا اور چار سو سال بیت المقدس ترکی کے قبضہ میں رہا۔ اس کے بعد ۱۹۱۷ء میں ۸ اور ۹ دسمبر کی درمیانی شب کو بغیر جنگ کئے ترکوں کے آخری سپاہی نے بیت المقدس خالی کر دیا۔ ۹ دسمبر ۱۹۱۷ء کو جنرل ہشیا کمان افسر ۶۰ ڈیژن بیت المقدس میں داخل ہوا۔ دوسرے وقت وہاں کے حاکم نے جنرل مذکور کو چابیاں حوالہ کر دیں۔ جب سے اب تک فلسطین اور بیت المقدس پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ انگریزوں نے ایک طرف یہودیوں کو یقین دلایا تھا کہ وہ فلسطین ہی میں ان کی آزاد حکومت قائم کر دیں گے اور دوسری طرف عربوں کو یقین دلایا کہ متحدہ فلسطین آزاد کر دیا جائے گا۔ بعد کو ان واقعات نے بہت طول پکڑا۔ یہ مسئلہ اتحادی قوموں کی انجمن میں پیش ہوا۔ اور وہاں سے مراحل طے کرتا ہوا کاؤنٹ برناڈوٹ کے پاس پہنچا تھا۔ کاؤنٹ برناڈوٹ نے فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر کے عرب اور یہودی حکومت کے قیام کی تجویز کی تھی۔ لیکن بیت المقدس کو بین الاقوامی حیثیت دینے کی سفارش کی تھی۔ مگر اب کاؤنٹ برناڈوٹ موجود نہیں۔ البتہ ان کی رپورٹ اتحادی قوموں کی سیکورٹی کونسل میں پیش ہے۔ دیکھئے وہ کیا فیصلہ صادر کرتی ہے۔ اور اس کا فیصلہ عربوں اور یہودیوں کو قبول بھی ہوگا۔ غرضیکہ بیت المقدس کا مستقبل پھر غیر واضح سا ہو گیا۔ ذوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ یہ شہر جو نہ صرف مسلمانوں کا ایک مقدس شہر ہے بلکہ عیسائیوں اور یہودیوں کی نگاہوں میں بھی قابل احترام ہے۔ بین الاقوامی اقتدار کے ماتحت آئیگا۔ یا عربوں کے تسلط میں رہے گا۔ یا یہودی اس پر قابض رہیں گے۔

بقیہ خانہ داری اور نا اتفاقی

کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ تو انسانی شرافت کچل دی جاتی ہے۔ اس کی روحانی طاقت پژمردہ ہو جاتی ہے۔ پھر نہ وہ اپنے فرائض عبودیت کو خاطر میں لاتا ہے اور نہ حقوق العباد کی پروا کرتا ہے۔ نہ خلق اللہ کی طنز و ملامت کا برا مانتا ہے۔ نہ طعنہ زنی کی بوچھار کو گراں گردانتا ہے یہ کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ جرائم کا ارتکاب اس کی روح اور جذبات لطیف کو کچل دیتا ہے۔ اس کے دماغ پر پردے پڑے ہوتے ہیں۔ وہ بھلائی برائی حق اور باطل میں فرق و امتیاز پیدا نہیں کر سکتا ہے غفلت و تاریکی کے پردے اور حرص و آز کا عفریت احساس خودداری کے شیشہ کو چکنا چور کر دیتا ہے۔ جب مجرم کو اپنے جرائم کی مساعی پر بزرگوں کی جانب سے خوب داد ملتی ہے تو اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور یہی حوصلہ افزائی خانہ داری کی سکون بخش فضا کو خانہ جنگی کی فضا میں تبدیل کر دیتی ہے۔ یہ ہے نوعیت موجودہ دور کی گھریلو زندگی کی۔

اگر انسانی دل میں کوئی امید و آرزو ہوتی ہے۔ تو وہ یہی کہ اس کی زندگی خوشحالی کا مرقع اور سکون و راحت کا گہوارہ ہو۔ اس کے نخل تمنا میں کوئی ایسی سختی اور رکاوٹ پیدا نہ ہو جو اس کے لائحہ عمل اور شیفتگی کو پژمردہ بنا دے۔ اور کیا جب خانہ جنگی زندگی کی فضا میں مسلط ہو تو انسانی ارمان پورے ہو سکتے ہیں ہرگز نہیں۔ اس کی یہ امیدیں تشنۂ تکمیل ہی رہتی ہیں۔ اور حیات انسانی کا یہ شجر وقت سے پہلے پژمردہ ہو جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ خاندان کی فضا کو ہمیشہ پر سکون بنانے کے لئے اپنی عادتوں کی اصلاح کی جائے۔

سید میثاق یوضر

پردۂ سیمیں کا ردِ عمل

سینما کی صنعت سامری پر تنقید ایک بے حد فرسودہ بحث ہے ۔ اب تک جدید ترقی یافتہ نکتۂ نظر اور قدیم دقیانوسی اعتراضات کے درمیان مصالحت تو ایک طرف غیر جانبداری سے یہ بھی فیصل نہ ہو سکا کہ سینما کا کس قدر حصّہ سماج کے لئے مفید لہٰذا جائز ہے۔ اور کتنا حصّہ مضرت رساں لہٰذا قابلِ اعتراض ہے ۔ خود ماہرینِ نفسیات ابھی تک سینما کی قدر قائم کرنے یا فلم پرکھنے کی کسوٹی مقرر کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ کچھ افراد کا خیال ہے کہ سینما میں عشق و محبّت کے مناظر اور محبوب و حبیب کا اختلاط اُس جنسی بھوک کی تسکین کا موجب بن جاتا ہے جسے ہم اظہار کئے نا قابل ہونے کے باعث شعوری طور پر دبائے رہتے ہیں ۔ بالفاظ دیگر زیرِ شعور پردۂ فلم پر اداکاروں کے ارمان پورے ہوتے دیکھکر اُنہیں اپنی خواہشات سے منطبق کر لیتا ہے اور اس طرح شعور کی دبائی ہوئی تحریکِ جنس، لاشعور میں سلگتی رہنے کے بجائے دوسروں میں اپنا مسکن پاکر اطمینان پذیر ہو جاتی ہے۔ کچھ دوسرے ماہر اس نظریہ کی قطعی مخالفت میں یہ بیان کرتے ہیں کہ پردہ فلم کے محرکات تسکینِ خواہشات کے بجائے تحریصِ نفسی کا اثر رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں لاشعور ناظر کی ہستی کو خواہش کی حد تک تو کردار (ایکٹر) سے نسبت دے سکتا ہے مگر تسکین کے وقت اُس کی انفرادیت اور بھی اُجاگر ہو جاتی ہے اور اُس کا نتیجہ مزید ہیجان ہوتا ہے۔

دونوں نکتہ ہائے نظر تشنۂ غور ہیں ۔ بدقسمتی سے طبائع کا اختلاف رُحجان، ماحول اور تقاضائے عمر اس مضمون کو فرد کی شخصیت اور ذاتی ردِ عمل سے خلط کر دیتا ہے ۔ اور اِسی وجہ سے ہمارے ہاں (پاکستان میں) سینما کے متعلق غیر جانبدارانہ اور صحت مند رویہ قائم نہ ہو سکا۔

اِس مختصر جائزے میں سینما کے جواز یا اُس کی حُدودِ افادہ کے تعیّن سے بحث نہیں صرف یہ کوشش مقصود ہے کہ چند ایسے مشاہدے قلم بند کر دیئے جائیں جن کے ذریعہ مختلف افراد سے مختلف اوقات میں متعلقہ تاثرات یا حرکات ظاہر ہو سکیں اِس مضمون کے پڑھنے والوں کو دعوتِ فکر ہے کہ وہ اپنے ذاتی یا اپنے حلقۂ احباب کے مشاہدات اور ردِ عمل جو موضوع زیرِ بحث سے متعلق ہوں مدیر سائیکولوجی کو ارسال کریں مناسب واقعات کی اشاعت سے ممکن ہے کہ اس رسالے کے صفحات میں ایک ایسا مواد جمع ہو سکے جس کے مطالعے سے آنے والے محققین کو کسی ایسے قابلِ قبول نظریے کی تدوین میں امداد ملے جو ہمارے سماج کی ضروریات کی صحیح ترجمانی کر سکے ۔

یہ امر واقعہ ہے کہ عمر ماحول، تعلیم یا ایک اضطراری افتادِ طبع کے مُطابق مختلف افراد مختلف قسم کی فلمیں پسند کرتے ہیں۔ (ادب، شاعری اور دیگر دماغی یا جسمانی تفریحات سے متعلق بھی اُسی قدر وثوق سے یہ تخصیص عائد کی جا سکتی ہے) مثال کے طور بچوں کو مار پیٹ، لڑائی بہادری یا جانوروں سے متعلق فلمیں خصوصیّت سے مرغوب ہوتی ہیں ۔ لڑکپن کے بعد اور جوانی سے پہلے آغاز بلوغت کے اس غیر متعین دورانِ عمر میں محبت کے کامیاب قصّے دیکھنے والوں کی کشش کا مرکز ہوتے ہیں ۔ جوانی میں چونکہ ذوق کسی حد تک تکمیل پا جاتا ہے لہٰذا اس کے متعلق ایک قطعی بات نہیں کہی جا سکتی ہے ۔ بہر حال حسین چہروں سے بھرپور فلمیں عمر کے اِس دور میں اکثر زیادہ توجہ سے دیکھی جا سکتی ہیں رفتہ رفتہ رومانِ محبّت، مزاح اور خدوخال کی جاذبیت سے

نکل کر المیہ، واقعاتی یا تاریخی فلموں سے ہوتا ہوا آدمی اس درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ جب فلم دیکھنا موجبِ تفریح ہونے کی بجائے محض ایک عادت بن جاتا ہے۔

یہاں یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس سرسری حد بندی میں ایک عام اور معمولی سینما دیکھنے والے کو چنا گیا ہے۔ اِس حقیقت سے انکار مقصود نہیں کہ بہت سے افراد قطعی دوسری وجوہ کی بنا پر مذکورہ طرزِ عمل سے متضاد یا مستثنیٰ ہو سکتے ہیں۔

دماغی پسِ منظر یا اضطراری کیفیت کا سینما سے متاثر ہونے میں بہت دخل ہے ایک ناکامِ محبت المیہ میں اپنی نامرادیوں کا عکس دیکھتا ہے یا تضاداً ایک کم رو فرد ہیرو یا ہیروئن کو اپنی شخصیت سے منطبق کرتے ہوئے عالمِ خیال میں اس کی فتوحات کو اپنی کامرانیوں سے مترادف سمجھتا ہے۔

افسانے، قصے۔ کہانیاں زندگی کے تسلسل یا بے کیف دَوران سے گریز کا سامان ہیں۔ یا یہ کہیئے کہ وقتی طور پر متبادل زندگی کے چند گھنٹے گذارنے کی خواہش ہمیں ان تفریحات سے روشناس کرتی ہے۔ مگر اس لذّت سے ہمکناری کے دَوران ہر تحت الشعور ان سے قطعاً مختلف اور ہمارے ارادے سے خارج اثرات لینے سے نہیں بچتا۔

ایک صاحب اپنے دس سالہ بیٹے کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جس سے یہ لامعلوم مگر گہرا لاشعوری اثر واضح ہو جاتا ہے

ایک رات پڑوس میں غیر معمولی شورش سُن کر اُن کا تمام گھر جاگ اُٹھا۔ باہر آنے پر معلوم کر کے اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اُن کا دس سالہ لڑکا مجرم کی حیثیت سے گرفتار ہے اور اُس پر یہ الزام ہے کہ وہ پڑوس کی عمارت میں دوسری منزل کی کھڑکی سے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا! یہ صاحب عام والدین کی نسبت ذرا زیادہ سمجھدار تھے۔ لہٰذا اُنہوں نے اُس واقعہ کو نسبتاً سہولت سے رفع کر دیا۔ بیٹے کے اِس رویہ کی بابت ہمدردانہ سوالات، غور اور واقعات کے صحیح تسلسل سے ایک بہت دلچسپ سلسلۂ وجوہ دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا برخوردار سینما دیکھ دیکھ کر یہ محسوس کرنے لگا کہ "ہیرو" بننے کے لئے کسی سے عشق کرنا ضروری ہے۔ اِس لئے اپنی شخصیت کی تکمیل اور اچھا بننے کے لئے (بہادر۔ خوبصورت، مقبول یا جو کچھ بھی اُس کے نزدیک ہیرو کے تخیل کی تعبیر ہو) محبوب کی تلاش ہوئی۔ پڑوس کی سولہ سترہ سالہ خوبصورت لڑکی پر نظرِ انتخاب پڑنا اِس تلاش کا سہل ترین حل تھا۔ عمر کے تفاوت یا کامیابی کے امکان پر دس سال کی عمر میں غور مشکل ہے۔ بہرحال یہ لڑکی اس کے لئے ان تمام خوبیوں اور خصوصیات کا مظہر بن گئی جو اس کے تخیلی ہیرو کی مطلوبہ کے لئے لازم تھیں۔ بچے کے لئے محبت کا دلچسپ مشغلہ ایک کھیل سے زیادہ نہ تھا۔ لڑکی کو بھی اُس کی توجہات سے نہ کوئی اطلاع تھی نہ دلچسپی۔ اسی دوران میں صاحبزادے نے ایک ایسی فلم دیکھی جس میں والدین کے ظلم کا شکار ایک دوشیزہ کسی سے محبت کے جرم کی پاداش میں ایک کمرے میں قید کر دی جاتی ہے۔ اور جسے جانباز عاشق نے جان پر کھیل کر رسی کے ذریعے کھڑکی تک چڑھ کر قید سے نجات دلاتا ہے اتفاقاً پڑوس کی لڑکی اِس دوران میں ناساز ہو گئی۔ اسکول آتے جاتے نہ دیکھ کر لڑکے کے دماغ نے اس کی وجہ صرف والدین کی قید ہی تصوّر کی اور اُسی شب اپنی محبوبہ کو ظلم سے نجات دلانے اور اُس کی نظروں میں اپنی بہادری کا سِکّہ جمانے کے لئے یہ ننھا عاشق نقب لگا کر کھڑکی تک جا پہنچا وہاں انجان لڑکی کا خوفزدہ ہونا اور صاحب کا گرفتار ہو جانا واقعات کا منطقی نتیجہ تھا۔ یہ کہ لڑکی بچا کر (یا اغوا کر کے) کہاں لے جایا جاتا اور اسی طرح کی دوسری تفاصیل نہ سوچنا ہی بچے کی معصومیت کے جواز ہیں۔ بچے کا ذہن جو ابھی نشوونما پا رہا ہے اور اس کی شخصیت جو ابھی زیرِ ساخت ہے بیرونی اثر بہت جلد جذب کر لیتی ہے۔ اُس کے مقاصد کا خلوص اور خواہشات کی شدت اس کی حرکات۔ فکر و عمل پر اِس طرح حاوی ہو جاتے ہیں کہ وہ حصولِ مدعا کے لئے وہ کچھ کر گذرتا ہے جو ایک بالغ تک نہ کر سکے۔

ایک ایسی فلم دیکھنے کے بعد جس کے کسی اداکار نے آپ پر غیر معمولی اثر ڈالا ہو آپ بغیر سوچے (لا علمی میں) لاشعور کے زیرِ ہدایت اُسی اداکار کی سی حرکتیں کرنے لگتے ہیں مثلاً خاص طرز پر بال بنانا مخصوص انداز میں سگریٹ جلانا یا کش لگانا۔ کسی طرز پر گفتگو کرنا۔ ماخذ اکثر کسی فلم تک تحقیق کیا جا سکتا ہے۔

فلموں کا اثر کس حد تک اِنسان کا محرک رہتا ہے کس قسم کے اشارات

فلموں سے حذف کرنا ضروری ہے نفسیاتی تسکین کے مناظر تفریح (تسکین) کا باعث ہیں یا ترغیب (تحریص) کا۔ یہ ایسے سوال ہیں جن کا قطعی فیصلہ ذاتی رجحانات اور تعصب سے علیحدہ ہو کر ابھی تک کیا نہیں جا سکے گا۔

ایک نوجوان جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی جب ایک خاص ایکٹرس کی کوئی فلم دیکھ لیتا تھا تو اُسے کچھ دن تک اپنی حسین بیوی سے کوئی رغبت نہ ہوتی کیا اُسکی جنسی خواہشات پردہ فلم کی ایک ناقابلِ حصول دوشیزہ کے تصور سے ہمکنارِ لذت نہ ہونے کے باعث اپنی مایوسی کا لاشعوری انتقام اُس بیوی سے لیتی تھیں؟

ایک پروفیسر صاحب اگر امتحانات کے دَوران میں کوئی المیہ تصویر دیکھ لیتے تو پرچوں پر بہت فراخدلی سے نمبر دیتے تھے اُن کی یہ عادت اِس قدر شہرت پا چکی تھی کہ امتحان دے چکنے کے بعد امتحان دینے والوں کا پُورا زور اس کوشش میں صرف ہوتا تھا کہ اُنہیں اُن کے دوستوں کے ذریعے کوئی حزنیہ تصویر دکھوا دیں۔ کیا پروفیسر صاحب کا دل حزن وملال سے اس قدر پگھل جاتا تھا کہ وہ رنج سے بغاوت کرنے لگیں اور دوسروں کو اِس سے بچائیں۔ یا غم کا تکلف اُن کو اس قدر خود غرض بنا دیتا تھا کہ وہ دوسروں کو رنج سے روشناس نہ ہونے دیں اور بلاشرکتِ غیرے اس سے لذّت اُٹھاتے رہیں؟

ایسے ہی بہت سے بظاہر معمولی مگر درحقیقت بہت ہی اہم تاثرات ہم سب کے روزمرہ مشاہدات میں آتے ہیں۔ اِن سب کی تحلیل نفسی سے ایسے قانون وضع کئے جا سکتے ہیں جو ہر فلم کے ردِ عمل کی بابت ابتدائی اصول بتا سکیں۔ ایسے اُصول وضع کر چکنے کے بعد ہی ہم صحت مند اور انتشار برپا نہ کرنے والی صنعتِ فلم سازی کی توقع کر سکتے ہیں۔ نفسیات کے اداروں صحیح تعلیم اور پیشہ کے فقدان کے باعث ہمارے ہاں سائنٹفک طریق پر یہ تحقیق سرانجام نہیں پا سکتی۔ بہرحال سائیکولوجی کے ناظرین سے تعاون کی استدعا ہے۔ اگر وہ مختصراً اپنے حلقہ اثر سے صحیح واقعات (بلا تنقید) ارسال کر سکیں تو ہمارے ماہر اُن پر تنقید کر سکیں گے اور سائیکولوجی کے صفحات کے ذریعے اُنہیں آپ کے غور کے لئے پیش کیا جا سکے گا۔

تحت آتا ہے وہ یہ کہ ایک بالغ اور سمجھدار نوجوان کی بہبودی اور ذہنی تندرستی کے لئے والدین کو گوشہ نشینی اور خلوت گزینی اختیار کر لینا از بس ضروری ہے گو کہ اس نصیحت پر عمل کرنا والدین کے لئے ذرا مشکل کام ہے مگر یہ امرِ واقعہ ہے کہ اس زندگی کی تگ ودو میں بالعموم وہی والدین زیادہ کامیاب اور بامراد ثابت ہوتے ہیں جو اس امر کی کوشش نہیں کرتے کہ وہ جا و بے جا اپنی اولاد کو اپنے خود ساختہ اصول اور حق کے نیچے دبا کر رکھیں۔ ایسے ہی والدین اپنی اولاد کے دلوں میں اپنے لئے ایک ایسی جگہ پیدا کر لیتے ہیں جو لازوال محبت اور عقیدت کی حامل ہوتی ہے۔ ایک آدمی دوسرے کے بنائے ہوئے اُصولوں پر بالعموم نہیں چلا کرتے اِس لئے ہمیں خود اپنی اولاد کی نئے اصول وضع کرنے میں، نئے تجربات کرنے میں زیادہ سے زیادہ مدد کرنا چاہیئے چہ جائیکہ ہم اپنے جذبات میں اندھے ہو کر اور اپنی روائتی پندار کی آڑ لے کر خود ہی اُن کے تجربے اور عمل میں رکاوٹیں ڈالیں۔ ہر نئی نسل اپنے لئے ایک خاص لائحہ عمل تیار کرتی ہے، ایک خاص نعرہ وضع کرتی ہے اور اِسی طرح اپنے جنسی مسائل کا حل بھی تلاش کرتی ہے۔ دوسروں کے بنائے ہوئے اصولوں کا پابند ہونے اور اپنی زندگی کو دوسروں کے بنائے ہوئے ڈھانچوں میں ڈھالنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں اپنی زندگی گذاریں۔

ضرورت صرف اِس بات کی ہے کہ اُن کی اس نئی زندگی کے تجربے میں صرف ایک جذبہ کارفرما ہونا چاہئے اور وہ ہے جبکی، سچائی اور حسن کی لافانی قدروں کی جستجو!!

(بقیہ: موج موج ڈبوئے ساحل ہے)

کے وعدے پر اکثر اسے پیشگی پیسے مل جایا کرتے تھے لیکن ہر جگہ اسے ناکامی ہوئی شام کو گھر جانے کی بجائے وہ برنس گارڈن چلا گیا۔ مختلف خیالات میں مستغرق وہ پارک کے ایک کونے میں بیٹھا رہا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ سالگرہ کا جشن ختم ہو گیا ہوگا تو اپنے فلیٹ لوٹا دبے پاؤں وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا اور روشنی جلا کر بیٹھا ہی تھا کہ ریحانہ آن پہنچی آرائش اور شباب کے سنگم سے اس کا حسن نکھر گیا تھا۔ وہ آکر خاموش کھڑی ہو گئی اس کی آنکھوں میں مایوسی جھلک رہی تھی جیلانی نے ان ملکوتی آنکھوں کو اس پر ملامت کرتے دیکھا۔ وہ ایک مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ بڑی مشکلوں سے وہ صرف یہ کہہ سکا تھا: "میں نہ آسکا مجھے بہت افسوس ہے۔ دفتر سے چھٹی نہ مل سکی"۔

جیلانی جلتے ہوئے سگریٹ کو پھینک کر رومال کو آنکھوں پر پھیرا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ باتیں کل کی ہوں۔ اسے سالگرہ کی دوسری صبح یاد آئی جب دفتر پہنچتے ہی منیجر نے نہ جانے کیوں اسکو بلا کر اس کی تنخواہ میں سے پچاس روپے پیشگی کے طور پر اس کو دیدئے تھے کاغذ کے ان ٹکڑوں میں اسی کو اس روز مسرت کا خزانہ پوشیدہ معلوم ہو رہا تھا۔ جلدی جلدی اخبار کے ضروری کام کرنے کے بعد وہ چار بجے وہاں سے نکل کھڑا ہوا اور انفنسٹن اسٹریٹ کی مختلف دکانوں کا چکر کاٹتا رہا لیکن اسکے سرمایہ کی مناسبت اور اسکے عشق کی بلندی کی حیثیت کا کوئی تحفہ ریحانہ کو پیش کئے جانے کے قابل نہ مل سکا۔ انگوٹھی، سنگار کا سامان، کتابیں، کپڑے اور تصویر یہ سب اس کے نزدیک محبت کے تقدس کی توہین تھے وہ تو کوئی زندہ تحفہ دینا چاہتا تھا جس میں محبت کی گرمی ہو۔ ایک دوکان میں اس کی نظر ایک سنگ مرمر کے تاج محل پر پڑی جسکے میناروں کے کلس پر سونے کا پانی پھیرا ہوا تھا۔ اس کی نظریں اس پر جم گئیں۔ بس اس سے بہتر اور کیا ہے یہ وہ محبت کی خدمت میں پیش کر سکتا تھا ——— عشق کا لازوال استعارہ۔ تحفہ کو خرید کر وہ تیزی سے گھر کی طرف چل دیا۔ مسرت اس کی رگ رگ سے پھوٹی پڑتی تھی جیسے ساری زندگی کی خوشیاں اس نے اسی دن کے لئے جمع کر رکھی تھیں۔ وہ کمرے میں داخل ہوا لیکن ریحانہ وہاں موجود نہ تھی وہ تحفہ لئے ہوئے اس کے فلیٹ کی طرف چلا تاکہ ریحانہ کو بلا کر ڈرامائی انداز سے نذرانہ پیش کرے۔ دروازہ بند تھا لیکن چند عورتوں کو بولنے کی آوازیں آرہی تھیں دراز سے جھانک کر جیلانی نے دیکھا کہ ریحانہ کی والدہ اپنی دو بہنوں کے ساتھ بیٹھی ہیں۔ ایک کونے میں ریحانہ کھوئی ہوئی بیٹھی تھی۔ گفتگو جاری تھی۔ ریحانہ کی والدہ کہہ رہی تھیں: "دعا کیجئے کہ یہ کام بھی بحسن و خوبی انجام پا جائے۔ لڑکے تو کئی نظر میں ہیں لیکن فیصلہ نہیں کیا ہے" ریحانہ کی خالہ نے کہا "جیلانی کے متعلق کیا خیال ہے۔ لڑکا تو بڑا اچھا ہے" "ہاں بہن" ریحانہ کی والدہ بولیں "مجھے بھی بہت پسند ہے بڑا شریف لڑکا ہے۔ اور شائد ریحانہ کو بھی" اتنے میں ریحانہ کا بڑا بھائی دوسرے دروازے سے داخل ہوا اور آتے ہی بولنے لگا جیسے وہ

گفتگو کے موضوع کو اچھی طرح سمجھ گیا ہو۔ "بالکل غلط ہے۔ ریحانہ سے اس کا کیا رشتہ ہو سکتا ہے۔ وہ اخبار کا ایک ملازم ہے اور پھر شکل صورت اور عادت بھی پاگلوں جیسی مجھے تو اس کے دماغ میں کچھ خلل معلوم ہوتا ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ ریحانہ کو بھی وہ پسند نہیں ہے۔ کیوں ریحانہ؟" "جی نہیں" وہ کچھ اور آگے کہنا چاہتی تھی کہ اس کے بڑے بھائی کی تقریر نے اسے موقع نہ دیا۔

"دیکھا آپ نے۔ آپ عورت ہوتے ہوئے بھی عورت کے جذبات نہیں سمجھ سکتی ہیں" جیلانی کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور بڑی مشکلوں سے دیوار کے سہارے تاج محل کو وہ اپنی متاع زیست کی طرح سینے سے لگائے آہستہ آہستہ زینہ سے اترا تھا۔ جیسے وہ کوئی لاش دفن کر کے واپس آ رہا ہو۔

وہ رات اس نے اپنے دفتر میں گزاری اس مسافر کی طرح جو منزل کے قریب پہنچ کر راستے سے بھٹک گیا ہو۔ دوسری صبح وہ دفتر کے نوکر سے اپنا سامان منگا کر اس فلیٹ میں منتقل ہو گیا تھا جہاں وہ بیٹھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ فلیٹ چھوڑنے کا فیصلہ اس نے کیوں کیا تھا۔ منطق نے اس کی سمجھ کی بیوفائی کے بعد اس کے لئے اس کے سوا اور کیا چارہ کار تھا۔ ریحانہ بھی دنیا کی دوسری ہزاروں عورتوں کی طرح فریبی ثابت ہوئی۔ وہ ریحانہ جس کے تصور میں اس نے ارمانوں کے کتنے محل تعمیر کئے تھے۔ ریحانہ شائد اب اپنی فتح پر نازاں ہو گی۔ اس خیال سے وہ کراہ اٹھا۔ اس نے دوسرا سگریٹ سلگایا اور پھر مستغرق ہو گیا۔ لیکن ——— وہ سوچنے لگا ——— ریحانہ کا اصلی کیا تصور تھا۔ اس نے اپنی زبان سے کبھی بھی کوئی بات ایسی نہیں کہی تھی۔ اس روز بھی اس کے چہرہ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اسے اپنے بھائی کی رائے سے اختلاف ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اسے روک دیا گیا۔ ریحانہ تو وفا کا مجسمہ تھی۔ ایسی ہستی جس کی پرستش کی جا سکتی ہے۔ جیلانی کو اپنے آپ سے نفرت ہو رہی تھی اس نے اپنی جذباتیت سے ریحانہ پر ظلم اور محبت کی توہین کی تھی ریحانہ اس کے متعلق کیا خیال کرتی ہو گی۔ اس خیال سے وہ بے چین ہو گیا۔ پسینے کے قطرے اس کی پیشانی پر چمکنے لگے۔ رومال کو منہ پر پھیرتے ہوئے اس نے فریب خوردہ نظر سے کمرے کی طرف دیکھا جہاں آتشدان پر تاج محل رکھا ہوا تھا ——— محبت کا نقل استعارہ ——— اسکے عشق کا مدفن۔ اسے زبیدہ کے خط کا ایک جملہ یاد آ رہا تھا: "آپکے خوابوں کی نورجہاں اس دنیا میں نہیں مل سکتی ہے۔" نورجہاں ممتاز محل یا تاج محل ——— وہ پریشانی کے عالم میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بالکنی پر ٹیک کر کھڑا ہو گیا تاکہ اپنے تخیلات کو بہلا سکے شاہ صاحب کے ریڈیو سے ہندوستان کی خبروں کی آواز آرہی تھی ——— گنگا کی سطح بڑھتی جا رہی ہے۔ کل سے جمنا کی سطح بھی گزشتہ سیلاب کے نشان سے اونچی ہو گئی ہے ——— جیلانی کو ایسا محسوس ہوا جیسے جمنا کا پانی بڑھتے بڑھتے تاج محل سے بھی اونچا ہو گیا ہے اور سیلاب کی لہریں خود اسکے کمرہ سے ٹکرا رہی ہیں۔

بقیہ۔ قوتِ خیال کی تصنیع

بوجھ بجھکڑ نے ذرا غور کر کے بتایا کہ بھلا ان پتھروں کی کیا ضرورت ہے گدھے کے دونوں جانب ہموزن اناج ہی بھر دیا جائے اس جدتِ خیال پر بڑی تحسین، و آفریں ہوئی۔ ہنسنے کی بات نہیں حقیقت یہ ہے کہ ترقی کی طرف یہ ایک قدم آگے ہی کو اٹھا تھا۔ ترقی درجہ بدرجہ ہی ہوتی ہے بام پر پہنچنے کے لئے ایک ایک سیڑھی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ پس اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ روا داری اپنا شیوہ رکھیں اور اپنی کمیوں اور نقائص کا احساس برقرار رکھیں اور اپنا قصور ماننے کے لئے تیار رہیں۔

ذرا آبشار پر نظر ڈالئے مدت ہائے دراز تک اس کی پوشیدہ قوتیں ضائع ہوتی رہیں انسان کو ان قوتوں کا پتہ ہی نہ تھا لیکن جب اسے ہوش آیا تو یہی پوشیدہ قوتیں انسان کے آرام و آسایش اور دولت کی فراوانی کا موجب بن گئیں۔ ان گنت گھروں میں اور خدا ہی جانے کب سے پتیلیوں کے ڈھکنے بھاپ کے زور سے کھڑ بڑ کرتے رہے اور گر بھی پڑے لیکن کسی کو اس کی سُدھ نہ ہوئی کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ لیکن ایک غیر معمولی دماغ کے انسان نے جب یہی معمولی واقعہ دیکھا تو اس کے دماغ میں خیالات کا ایک تانتا بندھ گیا اور اس نے سوچتے سوچتے اس ضائع ہونے والی قوت سے فائدہ حاصل کرنے کے ذرائع ڈھونڈھ نکالے وہ قوت جو صرف پتیلی کا ڈھکنا پھینک دینے تک محدود تھی انسان نے اپنے قابو میں کر لی اور اب وہ ہمارا دست راست ہے اور ہم اس سے وہ وہ کام لیتے ہیں جو واٹ کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوں گے۔ پانی کی بے پناہ قوت نے خواہ مخواہ ہنگامہ برپا کر کے انسان کے سکون میں دخل دیا اور اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور انسان نے اسے قابو میں کر لیا۔ اس سے بڑھ کر بھاپ کی قوت نکلی اور اس سے حیرت انگیز کارہائے نمایاں وجود میں آئے۔ اور آگے بڑھئے تو بجلی چھپا ہوا رستم تیز و پھرتی میں سب سے بڑھ کر غرض یہ بھی انسان کی لونڈی بن کر رہ گئی۔

موجودہ دور میں انسان کی توجہ ایک اور تیز تر قوت کی طرف منعطف رہی ہے یہ قوت بھی دیگر مندرجہ بالا قوتوں کی طرح مدت ہائے دراز سے ضائع ہو رہی تھی اب اس کا استعمال بھی انسان کو آگیا ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ آخر اب اور کونسی ایسی قوت باقی رہ گئی ہے۔ لیجئے وہ قوت ہے انسان کی قوتِ خیال یہ فطری قوت عجیب و غریب چیز ہے کبھی تو ہم اس سے اکتا جاتے ہیں کبھی ہمیں یہ قوت اذیت پہنچاتی ہے کبھی ہم اس کے باعث خطرات و مشکلات میں پھنس جاتے ہیں لیکن اسی کی بدولت ہم خوابوں کی اس دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ہماری امیدیں بر آتی ہیں اور سارے خواب سچے ہو جاتے ہیں کبھی یہ قوتِ خیال ہمارے لئے بدترین لعنت بن جاتی ہے کبھی نعمت عظمیٰ — خداوند تعالیٰ نے بہت سی قوتیں انسان کو عطا کی ہیں یہ قوتیں ان تھک ہیں [illegible] رب ہیں اور اطمینان سے خاموش بیٹھنے والی نہیں ہیں قوتِ خیال بھی ان ہی میں سے ہے یہ بھی ان تمام قوتوں کے ساتھ انسان کے دماغ پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ اور صرف بے خبری اور بے ہوشی ہی انسان کو اس بار سے چھٹکارا دلا سکتی ہے۔ جہاں ہوش آیا اعصاب میں پھر خیالات و عمل کی جد و جہد جاری ہو جاتی ہے۔

جس طرح بجلی و پانی وغیرہ کی قوتوں کو ضائع ہوتا دیکھ کر انسان کو پریشانی ہوئی تھی کہ آخر اسے کس طرح کام میں لایا جائے یہی حالت اب قوتِ خیال کے ضائع ہونے سے پیدا ہو گئی ہے۔ اس قوت کا علم تو سب کو تھا لیکن اسے پورے طور پر سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ اب رفتہ رفتہ خیال کے استعمال کا علم ہو گیا ہے۔ کچھ علما اس کا گہرا مطالعہ کر رہے ہیں اور اب یہ چیز عوام تک پہنچائی جا رہی ہے۔ یہی حضرات آپکو بتلاتے ہیں کہ جو کچھ سرمایۂ تخیل ضائع ہو گیا دراصل وہ خیال بے مقصد تھا۔

آپ ذرا کسی سے سوال کر کے دیکھئے "کیوں صاحب کس سوچ میں پڑے ہو؟" جواب ملیگا "ارے بھئی کیا سوچ رہا ہوں . . . . بھئی کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا بس ایک معجون مرکب ہے دماغ میں ایک عجب ہنڈیا سی پک رہی ہے۔ طرح طرح کے خیالات۔ میں تو صاحب اس کاروبار سے تنگ آگیا ہوں خوش نصیب دن ہوگا جس روز یہ مصیبت ختم ہوگی۔ جیسے دیکھو احمق۔ زندگی کیا ہے ایک وبال ہے۔ کسی صورت چین نہیں۔ اس سے تو موت بھلی"۔

ایک اور صاحب اسی سوال کے جواب میں یوں گلفشاں ہوں گے۔ "اے صاحب کیا پوچھتے ہیں۔ بس کچھ نہ پوچھئے میں تو یہی سوچتا رہتا ہوں کہ یہ زندگی بھی کیسی پُر لطف ہے۔ یہ دنیا بس دنیا کیا ہے جنت ہے جنت — یہ خوش گوار فضا۔ یہ حسین جذبات۔ یہ زریں خیالات۔ بس یہی سوچتا رہتا ہوں کہ اسی فضا میں رہوں ان ہی نفیس جذبات سے کھیلتا رہوں اور کاش میں اس زندگی کے لئے اہل ثابت ہوں یہ ایک بیش بہا تحفہ ہے جو خدا نے مجھے عطا کیا ہے"۔

ایک تیسرے صاحب جواب دیں گے "میں تو جناب ایک منصوبہ پر غور کر رہا ہوں ایسا منصوبہ جو دنیا کے لئے غیر محدود نفع کا باعث ہوگا۔ ذرا ساری اسکیم بنا لوں تو پھر اس پر عملدرآمد شروع ہوگا پھر آپ دیکھینگے کہ یہ کیا معجزہ ہو گیا"

غرض ہرکس بخیال خویش خبطے دارد لیکن عام طور پر حالت یہ ہے کہ دماغ کو تو سوچنے کا کام بہرحال ہی رہتا ہے لیکن ہمارے سامنے کوئی مقصد نہیں آپ کسی اوسط درجہ کے انسان کو لے لیجئے۔ ذرا تحقیق کریں گے تو آپ کو پتہ چلیگا کہ زندگی کا کوئی پروگرام ہی نہیں سامنے کوئی مقصد ہی نہیں۔ اس غریب کو معلوم ہی نہیں کہ وہ دنیا میں جیتا کیوں ہے۔ اس حالت کا نتیجہ کیا ہوتا ہے بس ایک دماغی انتشار۔ انتشار کے بعد تخریبی خیالات کے لامتناہی سلسلے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ سکون و اطمینان مفقود صحت خراب۔ اور ناکامی ہی ناکامی۔ ہم اس تمنا میں مرے جاتے ہیں کہ دنیا کی بہترین نعمتیں بس ہمیں مل جائیں۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ اس کے لئے جد وجہد کی ضرورت ہے وہ فطرت نے ہماری ذات میں ودیعت کی ہیں ہمیں کسی دوسرے کا منہ تکنے کی ضرورت نہیں۔ جس شخص کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد نہیں وہ عمداً ان فطری قوتوں کا دروازہ بند کر دیتا ہے اور بلا وجہ ان نعمتوں سے محروم رہ جاتا ہے جو زندگی اس کے سامنے مفت پیش کرتی ہے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی ایسے مقصد کے سوچ بچار میں قوت خیال کو ضائع کیا جاتا ہے جو غیر مفید ہو یا ایسے منصوبے سوچے جاتے ہیں جن سے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک صاحب اسی فکر میں غلطاں پیچاں رہتے ہیں کہ کسی طرح گھوڑ دوڑ میں جیتنے والے گھوڑے کا پتہ پہلے سے چل جائے۔ ان حضرت کو بے روزگاری کی شکایت ہے اور یہ کہ اگر کبھی نوکری مل بھی جاتی ہے تو زیادہ دن نہیں رہتی۔ یہ ایک عام بات ہے کہ بعض لوگوں کو ایک خاص ڈھنگ سے سوچنے کی عادت پڑ جاتی ہے اور پھر وہ لکیر کے فقیر بن کر رہ جاتے ہیں اور اس طرح اس بیش بہا قوت کو ضائع کرتے رہتے ہیں حاصل وصول کچھ ہوتا نہیں۔ کسی منصوبے کے متعلق غور و فکر کرنے سے قبل یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ آیا اس سلسلے میں جو کچھ ذہنی و جسمانی تکالیف اٹھائی جائیں گی ان کا پورا معاوضہ بھی ملیگا یا نہیں۔

بعض عورتوں پر یہ خبط مسلط رہتا ہے کہ گھر میں ہر چیز ٹھیک ٹھاک اور باقاعدہ رہنی چاہیئے۔ یہ بھی ایک حد تک ٹھیک ہے لیکن اس وہم کا کیا علاج کہ کوئی گڑبڑ نہ کردے چیزوں کو ادھر سے ادھر نہ رکھ دے غرض اس وہم کی بدولت وہ گھر بھر کو پریشان رکھتی ہیں۔ اور ذرا سی بھی بے ترتیبی ان کے مزاج کے خلاف کمرے میں ہو جائے تو ان پر وہی مجنونانہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو لال کپڑا دیکھ کر ایک سانڈ کی کیفیت ہوتی ہے۔ ایک خرابی یہ بھی ہے کہ ہم تقلید بے جا کا شکار بنے رہتے ہیں اور یہی سوچتے رہتے ہیں کہ فلاں شخص نے یہ کام یوں کیا لہٰذا ہمیں بھی یوں ہی کرنا چاہیئے۔ اس طرح ہمارے افعال پر ہمارے خیالات کی حکومت رہتی ہے۔ لیکن کبھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ ہم کتنی زیادہ ذہنی و جسمانی قوت ضائع کر دیتے ہیں اور اسے کس طرح بہتر طریقہ پر استعمال کرنا چاہیئے۔

بعض لوگوں نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا ہے کہ وہ یہی سوچا کرتے ہیں کہ مفلسی و بدنصیبی ہمارے مقسوم میں ہے ہمیں تو ہمیشہ مصیبت ہی میں پھنسا رہنا ہے ہم تو ہمیشہ سے ایسے ہی بدقسمت ہیں حالانکہ وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے گرد و پیش دوسرے لوگ زندگی کی جد وجہد میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنی گذشتہ زندگی سے نہ تو یہ لوگ سبق حاصل کرتے ہیں نہ پچھلی زندگی سے آئندہ کیلئے رہنمائی حاصل کرتے ہیں بلکہ اپنی سابقہ زندگی کو ایک سانحۂ عظیم بنا کر اس کا رونا رویا کرتے ہیں۔ کچھ حضرات ایسے ہیں جو غور و فکر ہی نہیں کرتے بلکہ رسم و رواج کی غلامی میں پھنسے رہتے ہیں۔ "باپ دادا سے یہی ہوتا آیا ہے"۔ "ہماری برادری میں یوں ہی ہوتا ہے"۔ "ہمارے ساتھی اسی طرح اس کام کو کرتے ہیں"۔ ایسے حضرات کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ ایسی اکثریت میں کیوں شامل ہوتے ہیں جو ناکاموں کی اکثریت ہے اور بڑی حد تک بدنصیب۔ ان سے الگ انہیں اپنا راستہ غور و فکر کے بعد نکالنا چاہیئے۔

ہمارے خیال کی حیرت انگیز قوت نہ صرف ہمارے سامنے منصوبہ پیش کرتی ہے بلکہ اس کے اہتمام کی پوری اسکیم بھی تیار کر سکتی ہے۔ ہمارا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ ایسا ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے لیکن ہم بیکار باتوں کے سوچنے میں پڑے رہتے ہیں اور جانتے بوجھتے ان امور پر قوت خیال کو صرف کرتے ہیں جنہیں نہ تو ہم خود پسند ہی کرتے اور نہ چاہتے ہی ہیں کہ یہ کام مکمل ہو۔ محض خوابوں کی دنیا میں رہنے سے بھی کام نہیں بنتا۔ خیالات نہایت شدت کے ساتھ ہر ایک مرکز پر جمع ہوں اور پھر ان کے ساتھ عمل بھی ہو اسی وقت وہ چیز حاصل ہو سکتی ہے جسے ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں عمل کے بغیر سوچ بچار بالکل بیکار ہے۔ ہم ایک نہایت بلند معیار اپنے سامنے رکھیں اور اس خیال میں مگن رہیں کہ ہم ایک معیاری و مثالی دنیا میں ہیں تو اس طرح شیخ چلی کی دنیا میں رہنے سے فائدہ — ہاں اس بلند معیار کو حاصل کرنے کے لئے عملی جد وجہد کی اشد ضرورت ہے۔

خیال کی رفتار بہت تیز ہے اس کے مقابلے میں ہم سست ہیں اگرچہ اس کا ساتھ دینے میں ہمیں مشکلات پیش آتی ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں ہمیں ابتدا ضرور کرنی چاہیئے اور اپنے مقدور بھر جو ہم سے ہو سکتا ہے کر ڈالیں اور روز بروز اس میں اضافہ کرتے رہیں اگر ہم نے ایسا کیا تو رفتہ رفتہ ہم ان تمام قوتوں کو مکمل کر لیں گے جو اب تک بیکار

پڑی تھیں اور ضائع ہو رہی تھیں قطرہ قطرہ دریا می شود پہلے قدم اٹھائیں گے تو دوسرا قدم اٹھانے کی قوت خودبخود پیدا ہو جائے گی اگر ہمارے سامنے کوئی مقصد ہے اور صاف صاف ہمیں معلوم ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے تو پھر ہمارے خیالات خودبخود ایک مرکز پر جمع ہو کر ہمارے قوائے جسمانی کو اتنا مجبور کر دیں گے کہ ہمیں کچھ کرنا ہی پڑیگا اور ہم اپنا مقصد حاصل کر کے رہیں گے ۔

اگر ہمارے گردوپیش ایسے لوگ ہوں جو ہمت شکن باتیں کرتے ہوں اور ان کی تجاویز و آراء کی بدولت ہمارا خیال اپنے مقصد سے ہٹ جائے تو سمجھو یہ تمام قوت رائگاں گئی ایسے آدمی کی مثال اس شخص کی طرح ہے کہ جو دو سیڑھیاں اوپر چڑھے اور پھر تین سیڑھیاں نیچے اتر آئے جس شخص کے خیالات میں انتشار ہو وہ ترقی نہیں کر سکتا ۔ جب خیالات منتشر ہوں غیر مسلسل اور نامربوط ہوں اور عمل میں بھی ایک کیفیت اضطراب پیدا ہو جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے ۔ کہ اعصاب میں ایک گھبراہٹ کی سی حالت پیدا ہونے کے بعد بعض مختلف قسم کی جسمانی خرابیاں ظہور میں آتی ہیں ۔ آپ نے کبھی خیال بھی نہ کیا ہوگا کہ کتنی قوت بیکار بات چیت میں یا کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتے رہنے میں ضائع ہو جاتی ہے یہ نتیجہ ہوتا ہے آپ کی قوت خیال کے ضائع ہونے کا ۔

اپنے شیریں خواب وہی شخص سچے کر سکتا ہے جو اپنے خیالات کو کسی ایک مقصد کی طرف مرتکز کر لیتا ہے اور اس وقت تک اپنے راستے سے نہیں ہٹتا جب تک مقصد حاصل نہ کرے اس کی مثال نشانچی کی سی ہے جو اپنے خیالات کو ہدف کی طرف مرتکز کر کے گولی چلا دیتا ہے اور گولی ٹھیک نشانہ پر جا لگتی ہے یہ شخص اپنا مقصد جب تک حاصل نہ کرے چین سے نہیں بیٹھتا وہ یہ تو ضرور کرتا ہے کہ مختلف النوع خیالات سے اپنے دماغ کو آرام پہنچا دیتا ہے لیکن اپنے راستے میں کوئی ایسی چیز حائل نہیں ہونے دیتا جو اس کے سلسلے خیالات کے برخلاف ہو خیالات کی مسلسل رو جاری رہتی ہے جس میں اس کا اصل مقصد پنہاں ہوتا ہے ۔ خدانخواستہ ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ضرورت سے زیادہ متین اور سنجیدہ بن کر رہ جائیں اور ایک مقصد حیات قائم کر لیں اور بس اسی کے لئے جئیں اور اسی کے لئے مریں اگر یہ حال ہو تو پھر زندگی اجیرن ہو جائے زندگی میں یہ ضروری ہے کہ کچھ اسباب تفریح و تفنن طبع بھی مہیا ہونے چاہئیں تاکہ دماغی مشین کو آرام مل سکے اور زندگی کا توازن قائم رہ سکے اور ضرورت کے وقت ترو تازہ دماغ حاضر رہے ۔ یہ نہ ہو کہ جب دماغی کام کی ضرورت ہے تو دماغ تھکا ماندہ بیکار پڑا ہوا وہ کام ہی نہ کر سکے ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ آپ راہبانہ زندگی بسر کریں اور دنیا کا عیش و آرام ختم کر دیں

ہم تو صرف چاہتے ہیں کہ آپ کی زندگی غیر مربوط نہ ہو آپ کی زندگی میں ایک تنظیم ہو اور کوئی آپ کے قابو سے باہر نہ ہو۔

علم نفسیات کا بغور مطالعہ آپ کے لئے نہایت ضروری ہے تاکہ آپکو اپنے دماغ کی اہمیت کا اندازہ ہو اور اس کے افعال و اعمال کا پتہ چل سکے ۔ ایک بیکار اور ناخوشگوار زندگی سے کیا حاصل ہمیں توقع ہے کہ یہ چند سطریں آپکو آگاہ کر دیں گی کہ آپ کے اندر کیا کیا قوتیں پنہاں ہیں اور کیا کیا امکانات پوشیدہ ہیں اور جب آپکو اس کا پتہ چل جائے گا تو آپ ضرور عملی جدوجہد کی طرف رجوع کریں گے ۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
اقبال

نفسیاتی سوالات ارسال کرتے وقت
خیال رکھیئے کہ وہ صاف اور خوشخط
لکھے ہوئے ہوں

ہائے وہ بات جو دانستہ مجھے یاد نہیں

اب بھی کیا وقتِ کرم اے ستم ایجاد نہیں ❖ حالتِ ضبط نہیں طاقتِ فریاد نہیں!

گو یہ تیری ہی محبت کا ہے اظہارِ فکر ❖ کیا کروں اس کا کہ اب خوگرِ فریاد نہیں!

ہائے یہ شکوۂ تجدیدِ ملاقات کا وقت ❖ ہائے وہ بات جو دانستہ مجھے یاد نہیں!

تیری مسرور نگاہوں کی قسم کھاتا ہوں ❖ تیری بے مہر نگاہوں سے میں ناشاد نہیں!

حسن کو چاہیئے ہر رنگ میں ملحوظ رکھے ❖ عشق جس حال میں ہو لائقِ بیداد نہیں!

اس کی مایوسی پہ تکمیلِ محبت ہو نثار ❖ ہو کے برباد جو کہتا ہے میں برباد نہیں!

بدرؔ ہر ایک مصیبت میں یہ آتا ہے خیال
کون ایسا ہے زمانہ میں جو ناشاد نہیں

محمد شریف اللہ ڈکی

PSYCHOLOGY

HEALTH · HAPPINESS · SUCCESS



آٹھ آنے

سرخیاں

سرورق تصویر پر جو ہمارے ماہ فروری کے شمارہ میں شائع ہوئی اور جو اس شمارہ میں بھی شامل کی جا رہی ہے ناظرین سے سرخیاں طلب کی گئی تھیں۔

جوابًا بے شمار خطوط موصول ہوئے اور بھیجنے والوں کا انفرادی حیثیت سے ہم شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہے۔ ادارہ ان سطور کے ذریعہ لکھنے والوں کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ اور اعلان کرتا ہے کہ ماہ اگست تک کے لئے ان کے نام سائیکولوجی کی اعزازی فہرست میں شامل کر لئے گئے ہیں۔ اور چھ ماہ تک کے لئے سائیکولوجی اردو بغیر کسی معاوضہ ڈاک کے ذریعہ روانہ کیا جائے گا حسب ذیل سرخیاں گنجائش کو ملحوظ رکھتے ہوئے شامل کی جا رہی ہیں

- خیالات پیہم میں کھوئی ہوئی سی!
  نہ جاگی ہوئی سی نہ سوئی ہوئی سی!
- وائے آتش ہجراں کہ پگھلے پتھر
  آنکھ پتھرا گئی اور اشک ٹپکتے ہی رہے
- کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
  ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

لمحۂ فکر۔ لمحۂ استغراق۔ لمحۂ تخیل۔ لمحۂ خیال۔ لمحۂ تصور
غرقِ فکر۔ غرقِ تصور۔ غرقِ تخیل۔ غرقِ خیال۔ یا۔ غریقِ فکر۔
غریقِ تخیل۔ غریقِ خیال۔
محوِ فکر۔ محوِ تخیل۔ محوِ خیال۔ محوِ تصور۔ یورشِ فکر۔ یورشِ تخیل۔
یورشِ خیال۔ یورشِ تصور۔
غور۔ تصور۔ ذہنی الجھاؤ۔ سعیٔ حل۔ مطالعہ باطن۔ ذہنی مشورہ
"سیج ہے"۔ نفسیات ذہنی رہبر ہے۔
تفکر۔ "محاسبۂ نفس"۔ "یاد" تصویرِ خیال۔ تجسس۔ تصور۔
افسونِ خیال۔ افسونِ محویت۔ یادِ ماضی۔ بیگانۂ ماحول
جمالِ محوِ تخیل۔ جمالِ محوِ تصور جمالِ وارفتۂ تخیل۔

"لب ساکت و سامت ہیں نظر بول رہی ہے"
"جیسے ذہن پاکِ شاعر میں تخیل کی پری"
"آج یاد آ گئے بھولے ہوئے افسانے چند"
"افکار کی آغوش میں دوشیزہ جوانی"

ان کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی
جس طرف دیکھا کیا دیکھا کیا

بقیہ "شکریہ"

اسلامیہ کالج پشاور

محترمی!

سلام مسنون۔ آپ کا سائیکولوجی کا پرچہ نظر سے گزرا۔ بہت مسرت ہوئی۔ اردو ادب کو ایسی چیزوں کی بہت ضرورت ہے امید ہے کہ آپ کا یہ پرچہ ہماری روزمرہ کی مشکلات دور کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔

مسعود اکرم خاں۔ معرفت پروفیسر افضل بیگ

مکرمی ایڈیٹر صاحب:

رسالہ سائیکولوجی۔ کراچی

سلام مسنون۔ مجھے آپ کا رسالہ بے حد پسند ہے۔ اس لئے کہ اس میں زندگی کے ہر پہلو، ہر شعبہ اور مسئلہ پر روشنی ڈال کر حقیقت، اصلیت سہولت سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس سے روزمرہ کے معاملات میں کافی حد تک تعاون و مدد ملتی ہے۔ واقعی انسانیت کو اس کی بڑی ضرورت ہے۔

آپکا مخلص۔ قیصر

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

مقبول بیگ بدخشانی

بچّے کا سچ اور جھوٹ

بچہ اس وقت جھوٹ بولتا ہے۔ جب اسے معلوم ہو کہ غلطی تو ہو گئی۔ اب اگر جھوٹ نہ بولا تو سزا ملے گی۔ جھوٹ سزا کے خوف سے پیدا ہوتا ہے خوف ہو گا تو بچاؤ کے لئے پناہ ڈھونڈنا پڑے گی۔ اور بہترین پناہ جھوٹ ہی کی ہوتی ہے چونکہ جھوٹ بہت دفعہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور اکثر سزا سے چھٹکارا ہو جاتا ہے۔ ڈر نہیں ہو گا۔ تو بچنے کے لئے کسی پناہ کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہو گی۔ وہ بچہ جس کی پرورش ایسے حالات میں ہوئی ہو۔ جہاں خوف اور ہراس نہ ہو۔ تو ضروری بات ہے کہ بچہ سچ بولے۔ اس کی سچائی کسی کوشش یا برکت کا نتیجہ نہیں ہو گی۔ بلکہ اس لئے کہ سچ بولنے کے سوا اسے کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ جس بچے کی تربیت محبت اور شعور والوں نے کی ہو اس کی آنکھیں سچائی کی چمک اور آزادی کی روشنی سے ہمیشہ منور ہوں گی۔ اسے اگر ناواقف لوگوں سے بھی واسطہ پڑے گا۔ تو وہ آزاد اور نڈر لوگوں کی طرح کھڑا ہو گا لیکن وہ بدنصیب بچہ جس کی تربیت سختیوں اور نظر بندیوں میں ہوئی ہے۔ اسے ہر وقت سزا نفس تنبیہ دھمکی یا مار پیٹ کا خوف لگا رہے گا۔ آزادی کے ساتھ وہ کوئی بات کر بیٹھے تو اسے گمان ہو گا۔ کہ اس نے اخلاق کے قانون کی کوئی حد ضرور توڑ دی ہے۔ اس پر خوف کا ایک عبا ڈسا رہتا ہے۔ جو اس کی شخصیت کی آزادانہ طور سے نشوونما نہیں ہونے دیتا۔ بہت دفعہ آپ نے یہ دیکھا ہو گا۔ کہ بچے کو پہلے پہل تو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ جھوٹ بھی بولا جا سکتا ہے جھوٹ تو ایجاد ہے۔ ان بچوں کے دماغوں کی جنہوں نے خوف اور دہشت کے ماحول میں پرورش پائی ہے۔ جن کا بچپن سزا اور دھمکی کے سوا کسی دوسری چیز سے واقف نہیں جنہوں نے بزرگوں کے ماتھے پر تیوریوں اور جھڑکیوں کے علاوہ کوئی دوسری علامت نہیں دیکھی۔ اس قسم کے ناموافق حالات آپ پیدا نہ ہونے دیں تو بچہ جھوٹ نہیں بولے گا۔

اگر بچہ جھوٹ بولے تو یہ نہیں چاہیے کہ اس بچے کو سزا دیں۔ بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ اسباب کون سے ہیں۔ جو بچے کو جھوٹ بولنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس قسم کے اسباب اگر روک دیئے جائیں۔ تو جھوٹ خود بخود ناپید ہو جائے گا۔ سزا دینے سے بچہ جھوٹ سے باز نہیں آئے گا۔ اسے سزا ملے تو وہ کوشش کرے گا کہ آئندہ اس کا جھوٹ کسی پر ظاہر نہ ہو۔ اور اس کے لئے وہ زیادہ سوچے والے اور منظم طریقے اختیار کرے گا۔ والدین کو چاہئے کہ بچوں کو پیار سے بتائیں اور دلیل کی روشنی میں سمجھائیں کہ سچ بولنا اچھا کیوں ہے۔ اور جھوٹ بولنا بُرا کیوں؟ سزا کو جھوٹ سے باز رکھنے کی تدبیر سمجھ لینا بہت بڑی غلطی ہے۔ سزا دینے سے بچوں کا خوف بڑھے گا۔ اور خوف سے جھوٹ بولنے کی وجہ کو اور زیادہ قوت حاصل ہو گی۔

ہم نے اکثر بزرگواروں کو جھوٹ کی روک تھام کے لئے یہ کہتے بھی سنا ہے۔ کہ جھوٹ بولنا بہت بڑا گناہ ہے۔ جھوٹ بولنے والوں کو لوہے کی تپتی ہوئی سلاخوں سے سزا ملے گی، اور گنہگاروں کی صف میں اٹھایا جائے گا۔ بہت ممکن ہے۔ کہ یہ بات صحیح ہو لیکن جھوٹ کو روکنے کے لئے تپتی ہوئی سلاخوں کا یا گنہگاروں کی صف میں اٹھائے جانے کا احساس دلانا کچھ مناسب نہیں جو غلطی زندگی کے واقعات میں اپنا نتیجہ آپ دکھا سکتی ہے۔ اس کو موت کے بعد کے اوقات پر اٹھا دینا ٹھیک نہیں ہو سکتا ہے۔ کہ اس قسم کی دور اندیشی بے اثر ثابت ہو اور عقبیٰ کی سزا کا زیادہ سے زیادہ خوف انہیں جھوٹ سے باز نہ رکھ سکے۔ ذیل میں روزمرہ کا ایک معمولی سا واقعہ لکھا جاتا ہے جس سے معلوم ہو جائے گا۔ کہ غلطی کا اسی زندگی میں کیونکر نتیجہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ ایک تقریب پر ہم نے اپنے بچے کو بہت سی مٹھائی لا کر دی اور اس سے یہ کہہ دیا۔ زیادہ مت کھانا زیادہ کھالی تو بیمار ہو جاؤ گے۔ اس نے بہت زیادہ مٹھائی کھالی۔ اور بیمار ہو گیا ہمیں تشویش ہوئی اور دوڑ دھوپ بھی کرنا پڑی وہ تندرست ہوا تو میرے پاس آیا اس کا چہرہ میری بات کے صحیح ثابت ہونے کے سبب تمتما رہا تھا کہنے لگا میں بیمار ہو گیا آپ نے کہا تھا تم بیمار ہو جاؤ گے۔ صحت کی ایک اصولی بات تھی جو اس سے کہہ دی گئی تھی اور اس بات کا اس نے تجربہ کر لیا۔ مٹھائی خرید نے کے موقعے کچھ زیادہ نہیں آتے لیکن اس کے باوجود ہم جب چاہیں اور جتنی مٹھائی چاہیں اس کی حفاظت میں رکھ سکتے ہیں۔ اب اگر ہم اس سے کہدیں فلاں چیز تمہاری صحت کے لئے اچھی نہیں

تو وہ اسے چھپاتا بھی نہیں بلکہ نئے کے متعلق ہماری ہدایات کو وہ درست سمجھ لیتا ہے۔ بچے کو اس نتیجے تک پہونچانے میں ہمیں کسی ہوشیاری کی نہیں جینا پڑے گی کوئی چیز نہیں استعمال کرنا پڑتی اسے خوف و ہراس کے کسی لمحے سے نہیں گزرنا پڑا۔ علیحٰی کی کسی سزا کا ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ایسے موقعوں پر ایک چیز کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اور وہ ہے استقلال۔

بعض اوقات بچوں کو گھروں میں بھی جھوٹ بولنے کا سبق ملتا ہے۔ یہ سبق خاص قسم کا ہوتا ہے۔ اور کچھ مختلف سا بھی ہوتا ہے۔ کہ سبق دینے والے کو معلوم نہیں ہوتا لیکن سبق حاصل کرنے والا اس سے متاثر ہوتا رہتا ہے بزرگ اپنے بچوں پر ظاہر کرتے ہیں۔ کہ ہم عام انسانوں سے بہت اونچے انسان ہیں ہم سے غلطی نہیں ہو سکتی ہم فرشتوں کی طرح ارفع و اعلیٰ ہیں لیکن اصل میں یہ بات ہے نہیں یہ بزرگ بھی بالکل عام انسانوں کی طرح ہیں کبھی کبھی جھوٹ بھی ان کی زبان سے نکل جاتا ہے۔ بچے بڑے غور سے مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ اور دل ہی دل میں سمجھتے ہیں کہ بزرگ جو کچھ ظاہر کرتے تھے۔ درست نہ تھا۔ جب ایسے اونچے مرتبے والے لوگ اپنے متعلق جھوٹ کہہ سکتے ہیں۔ تو جھوٹ انسانی زندگی کے لئے واقعی ضروری چیز ہے اور اگر کوئی موقع پیدا ہو جائے۔ تو جھوٹ بولنے سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔

جھوٹ کی ایک اور قسم بھی ہے۔ جو بچوں کے لئے حد سے زیادہ بُری ہے۔ اور اس کی تعلیم بھی گھروں ہی میں دی جاتی ہے بچے سے ایک غلطی ہو جاتی ہے۔ آپ اسے تنبیہ کر دیتے ہیں۔ اور آئندہ کے لئے کسی بڑی سزا کی دھمکی دے دیتے ہیں۔ لیکن یہ سزا ایسی ہوتی ہے۔ جو آپ باپ ہونے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے دے نہیں سکتے اور آپ کی دھمکی پوری نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر سلیڈ اپنی ایک کتاب ترقی کرنے والا مدرسہ میں لکھتے ہیں بچے کو دھمکی نہ دو اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے دھمکی دیتے ہو تو اس پر عمل بھی کرو۔ اس سے ہرگز باز نہیں رہو چاہے تم پر کچھ ہی گزر جائے۔ تم بچے سے کہہ دیتے ہو۔ فلاں بات نہ کرنا اور اگر کرو گے تو میں جان سے مار دوں گا۔ بچہ وہی بات کر دیتا ہے۔ جس سے اس کو منع کیا گیا تھا۔ لیکن اس کو وہ سزا نہیں مل سکتی جس کی دھمکی دی گئی تھی۔ اس قسم کی باتوں پر تمہارا احترام بچے کے دل سے اُٹھ جائے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ جھوٹ بھی نالک سی شکل اختیار کر کے بچے کے دل میں پھلتا پھولتا رہے گا کسی خاص بات پر اڑیئے نہیں۔ اور اگر اڑ جائیں تو ایسی بات کے لئے اڑیئے جو معقول ہو آپ کسی بات پر اڑ جاتے ہیں۔ تو اس سے ٹلئے نہیں خواہ بعد میں آپ کو پچھتانا پڑے اگر آپ کسی سزا کی دھمکی دیتے ہیں تو یہ سزا ایسی ہونا چاہیئے جو آپ دے سکیں۔ اس بات کی اُمید ہرگز نہ رکھیں کہ آپ کی گیدڑ بھبکی کا بھرم نکلنے نہ پائے گا بعض دفعہ ماں باپ بچے کو یہ دھمکی دیتے ہیں۔ کہ تمہیں پولیس کے سپاہی کے سپرد کر دیں گے۔ تمہیں بھیڑیئے کے پنجوں کو دے دیں گے۔ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کون ہے جو اپنے بیٹے کو بھیڑیئے کی غذا بنانے کے لئے آپ پیش کرے گا ہے۔ جب بچے کو کسی بھیڑیئے کی نذر کر دے۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے بچے سمجھنے لگتے ہیں۔ ماں باپ ڈرانے کے لئے یوں بھی کر لیا کرتے ہیں۔ اس قسم کی دھمکی کی ایک برائی تو یہ ہے۔ کہ اگر بچہ اس دھمکی کو کچھ اہمیت دے تو اس کے دل و دماغ پر چند کا فوری دھکا سا ہوتا ہے۔ اس کے بعد کا اثر یہ کہ بچہ سمجھنے لگتا ہے کہ سب دھمکیاں ہی دھمکیاں تھیں: اصلیت کچھ نہ تھی۔ یہ بزرگ یوں ہی فریب دے لیتے ہیں۔

جھوٹ کے جنم لینے کی ایک اور بھی صورت ہے کہ ہم بچوں کے سامنے بے جان چیزوں کے ساتھ جانداروں کا سا سلوک کرنے لگتے ہیں بچے کو پیڑھی کے پائے سے ٹھوکر لگتی ہے۔ بچہ گر پڑتا ہے۔ ضرب کو بہت زیادہ محسوس کرتا ہے رونے لگتا ہے۔ ماں کہتی ہے۔ یہ پیڑھی بڑی شریر ہے میں اسے سمجھ لیتی ہوں بعض دفعہ پیڑھی سے انتقام لینے کے لئے اسے دو ایک چپت لگا دیئے جاتے ہیں۔ اور یوں گویا بچے کو خوش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور اس جھوٹے عمل سے ننھے کو راضی کر لیا جاتا ہے۔ وہ اس وقت چپ ہو جاتا ہے لیکن اس سے قدرتی تعلیم کا ایک نہایت ہی مفید ذریعہ فنا ہو جاتا ہے۔ بچہ کچھ عرصے بعد آپ ہی آپ سمجھ لیتا ہے۔ کہ اس پیڑھی میں تو جان ہی نہ تھی۔ بچے کو یہ بتانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ کہ پیڑھی اگر راستے میں پڑی ہو تو اس سے یوں تکلیف ہو جاتی ہے۔ پیڑھی کا تکلیف دہ ہونا بچے کو حرکت کرنے پر اکسائے گا۔ اگر وہ اپنے ہاتھ سے زور سے پیڑھی کو راستے سے ہٹائے تو وہ اپنی طاقت کا اندازہ کر کے خوش ہوگا ہم فرضی جھوٹے عمل سے بچے کے آنسو کو تو پونچھ دیتے ہیں۔ لیکن تعلیم کے اس قدرتی پہلو کو فنا کر دیتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ جھوٹ کا بیج بھی بو دیتے ہیں۔ جو نہ جانے کس طرح سے نشو و نما پائے۔ اور کب پھوٹ نکلے۔

سائیکولوجی اردو کیلئے حیدرآباد کے سول ایجنٹ
میسرز نجم الحسین اینڈ کمپنی پبلیشرس
اینڈ نیوز ایجنٹ
چاندنی رامانی لین حیدرآباد سندھ

...اپنے حقوق اور حقوق العباد کی اہمیت کو سمجھئے دنیا کے پیدائش کے مقصد پر غور کیجئے اور کیجئے پیدا کرنے والے کی صنعت گری اسکی خلاقی پر ایمان لائیے۔

یقین جانیئے کہ "مردان باخدا" کو دنیا کا کوئی طوفان بہا کر نہیں لیجا سکتا۔ مذہب تمام برائیوں۔ تمام جسمانی۔ دماغی اور روحانی امراض کا واحد بے خطا علاج ہے اسے ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔

۱۰۔ انسانیت کا جوہر کام ہے

تندرستی۔ کامیابی اور مسرت یہ سب اسی انسان کا حصہ ہیں جو کام کرنے سے جی نہیں چراتا بلکہ دوسروں کی توقعات سے بھی زیادہ کام کرتا ہے۔ یقین جانیئے کام کسی طرح آپ کیلئے مضر نہیں۔ کام سے آدمی نہیں مرتا بلکہ مشہید ہو جاتا ہے۔ کام کرنے والا انسان نہ صرف کامیاب زندگی ہے بلکہ در اصل انسانیت کا حق ادا کرنے والا ہے۔ کام کرنے والے کے پاس مایوسی، ناکامی ہراس جیسے تباہ کن جذبات کا کوئی گذر نہیں آپ کے نیک اعمال کے صلہ میں تو آپ کو آخرت میں جنت ملیگی لیکن مستعدی سے کام کرکے آپ اس دنیا کو بھی جنت بنا سکتے ہیں۔

بقیہ "شکریہ"

محترم ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم!

ابھی چند دن ہوئے سائیکولوجی نظر سے گذرا۔ یہ واقعی بہت عمدہ ہے۔ اردو ادب میں بہت دنوں سے کمی محسوس کی جا رہی تھی کہ اس میں انسانی زندگی کی صحیح تصویرکشی نہیں بلکہ اس میں تضیع کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لیکن آپ نے اس پرچہ کو نکال کر یہ دکھا دیا کہ اردو ادب میں ہر قسم کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ ہر قسم کی آواز پنہاں ہے۔ صرف تار چھیڑنے کی ضرورت ہے۔ اب ہم فخریہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے یہاں بھی انسان کے صحیح جذبات کی خواہ وہ ذہنی ہوں یا جنسی ترجمانی ہوتی ہے۔ خدا آپ کو پائیداری عنایت فرمائے۔ آمین۔

آپ کا مخلص

ثاقب الہ آبادی

PSYCHOLOGY

HEALTH · HAPPINESS · SUCCESS

اپریل ۱۹۴۹ء

عورت نمبر

ماہ

جون میں

ملاحظہ فرمائیں

یہ ایک سال

یا سال سے

زیادہ کے

مستقل خریداروں

کیلئے

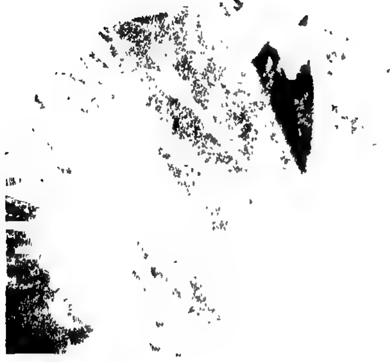
مفت ہوگا

Courtesy Mehboob Pictures

سائیکولوجی (اردو)

انگلستان

ماہنامہ





Mr A. H Khan





Mr M Iqbal Bhatti





Sex instinct leads Crowds to gaze at the Silver Screen for hours.



Beauty and the...............
in GIRLS SCHOOL

Pictures that attract masses.



......off his way but......
in "ANJANGARH"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ



اپریل ۱۹۴۹ء

انگلستان کے مشہور ماہنامہ "سائیکولوجی" کا اردو ایڈیشن

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
اقبال

ایڈیٹر:- ایم - ایچ - فیضی

مضامین

اشارات
شخصیت اور زندگی
روزمرہ سائیکولوجی ۱
روزمرہ سائیکولوجی ۲
اپنی منزل کی طرف
بہار اور مجسم بہار کیا کہنا
ایک نا تمام افسانہ
ہم کو غصہ پہ پیار آتا ہے
ہمارے فلم
ہر چیز سے اُس کو نفرت ہے
اور انسان مرگیا
انسداد جرائم میں نفسیات کی اہمیت
نمکدان صحافت
سراپاء مہاجر

زر سالانہ پانچ روپے
متواتر دو سال کے لئے آٹھ روپے
متواتر تین سال کے لئے دس روپے

خط و کتابت کا پتہ: 15/565 الہجت آفندی منزل - فریئر روڈ - کراچی نمبر ۱

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ

اشارات

زندگی کی تنگنائے جب بیکراں کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو کنارے پر پڑے ہوئے خس و خاشاک بھی تازہ اُمنگوں سے لرزنے لگتے ہیں۔ ایک وقت وہ تھا جب ادب کسی خاص طبقہ یا گروپ کی ملکیت ہی نہیں تھی بلکہ جب موضوعات میں بھی ایک سامراجی ذہنیت نمایاں تھی فطرت، مافوق الفطرت، موجود اور ماورائیت میں اتنا سخت تضاد تھا کہ ادب ایک خاص رجحان کا ترجمان ہو کر رہ گیا تھا۔

موجودہ نراجی حالات نے جہاں دوسری پابندیوں اور قید و بند سے آزادی حاصل کی وہاں ادیبوں کو یہ راہ بتلائی کہ شعوری دُنیا سے پرے اور بھی جہاں ہیں جو اپنی رنگا رنگی اور شدتِ اثرات میں کسی طرح موجودات کی دنیا سے کم نہیں۔ عہدِ قدیم نے یہ سکھلایا تھا کہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی۔ دَورِ جدید یہ بتلاتا ہے کہ سونا بھی مختلف وقتوں میں مختلف کیفیات کے ماتحت ماہیت بدلتا رہتا ہے۔ شعور اور غیر شعور کے مسائل اِن ہی بنیادوں پر قائم ہیں۔

سائیکولوجی یا نفسیات کا موضوع ایک عرصہ تک کتابوں ہی کی زینت بنا رہا تھا۔ اِنسانی زندگی سے اُن کا کوئی ایسا لگاؤ نہ تھا اور ظاہر ہے کہ جب زندگی سے اتنا بے ربط ہو تو ادب میں جو عرصہ تک ایک خاص شعوری اثرات کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا تو اِس کا احساس کیسے ہوتا۔ موجودہ رُجحانات اور کوششوں نے یہ بتلایا کہ ہمارے تمام تر حرکات و سکنات، ہمارے تصوّرات، کردہ اور ناکردہ گناہ کا محرک خارجی نہیں بلکہ وہ داخلی اثرات ہوتے ہیں جو انسانی پیدائش کے بعد اندر ہی اندر مختلف رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن واقعہ یہی ہے کہ انسانی نفسیات اُس معدنیات کی سی ہوتی ہے جو مختلف درجۂ حرارت سے علیحدہ علیحدہ شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔ ایک ہی کان مختلف دباؤ اور درجۂ حرارت کی وجہ سے کوئلہ اور ہیرا دونوں کو جنم دیتی ہے۔ نفسیات کے مطالعہ نے ہمیں بتایا ہے کہ اِنسانی اُپج اور نشو و نما میں مذہب۔ اخلاقیات اور ماورائیت کے اُصول سے زیادہ وہ داخلی کیفیات اثرانداز ہوتی ہیں جن کا خود ہمیں علم نہیں ہوتا ہے۔ سائیکولوجی کا مقصد اُن ہی کیفیات کو اجاگر کرنا ہے جو اپنے اندر بڑے خوفناک اثرات پوشیدہ رکھتی ہیں۔

سائیکولوجی کا تیسرا پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ مقاصد کہاں تک اِس کے پیشِ نظر رہے ہیں اُس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ اُس کی وسعتیں کہاں تک ہیں۔ اُس کی وضاحت ضروری نظر آتی ہے۔ سائیکولوجی کے صفحے صرف نفسیات کے علمی

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

مسٹر
رابرٹ ہیپ
ایڈیٹر۔ انگلش ایڈیشن سائیکولوجی

حضرت
مترجمہ۔ نسیم ناظری

شخصیت اور زندگی

انسان کے پیکر میں ایک ایسا غیر مرئی نور ہے جو جسم کے پردوں سے چھن چھن کر اُس کی ساری ہستی کو ایک ناقابلِ بیان درخشانی بخشتا ہے ایک ایسی چمک جو اُسے اپنے اُن احباب سے بھی مختلف بنا دیتی ہے جو دوسری باتوں میں اُس سے مشابہت رکھتے ہوں۔ یہ چمک اُسے ایک بے نظیر انفرادیت عطا کرتی ہے۔ اور شخصیت اِسی ناقابلِ بیان درخشانی کا دوسرا نام ہے

عہد سے لحد تک اِنسان اپنی اس انفرادیت کو شکل و صُورت کی تمام تبدیلیوں کے ساتھ برقرار رکھتا ہے کیونکہ شخصیت ایک غیر فانی شے ہے اور اگرچہ حالات اور ماحول بہت حد تک شخصیت پر اثرانداز ہوتے ہیں پھر بھی یہ کبھی فنا نہیں ہوتی بلکہ ایک پُراسرار طور پر یکساں قائم رہتی ہے —— شخصیت کا روح سے گہرا لگاؤ ہے اور اِسی لئے وہ جسم کے فنا ہو جانے کے بعد بھی ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

شخصیت اِنسان کے تمام جسمانی، دماغی اور روحانی اوصاف کا مجموعہ ہے اور اس کی سب سے قیمتی ملکیت ۔ یہ اُسے فرشتوں سے بھی اونچے مقام پر پہنچا دیتی ہے۔ زندگی کی اندھیاری پُرپیچ راہوں سے گذرنے کے لئے مشعلِ راہ بن جاتی ہے، جب کبھی امید کی نبض ڈوبنے لگتی ہے تو یہ ہمت بندھاتی ہے، انسان کا عزم جوان تر ہو جاتا ہے اور وہ اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شخصیت انسان کے جملہ اوصاف کے مجموعے سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ ہم اسے انسان کی زندگی کا چراغ کہہ سکتے ہیں —— اور یہ چراغ مدھم ہو یا روشن اِس کا انحصار تمام تر ہم پر ہے۔

شخصیت روح کی گہرائی میں ہوتی ہے۔ یہ صرف کسی انسان کی افتادِ طبع، عادات اور اطوار پر مشتمل نہیں بلکہ اُس کی امیدوں آرزوؤں خیالات اور عزائم کا بھی عکس ہوتی ہے یہ تمام مادی اشیاء سے بلند و بالا ہے۔ نہ تو اُس کا تعلق صرف جسم سے ہے اور نہ صرف دماغ سے بلکہ جسم و دماغ اور روح سے یکساں منسلک ہے۔

شخصیت اُس ذات نور السماوات کا وہ پَرتو ہے جو انسان کے آئینۂ ہستی میں جھلکتا ہے۔ اگر آئینہ دُھندلا ہو تو عکس بھی دھندلا ہوگا لیکن درحقیقت شخصیت حُسنِ مطلق اور حق کی ایک جھلک ہے —— اس حیاتِ سرمدی اور ابدی سکون کی ایک جھلک جو ہماری اور آپ کی منزل ہے !! ——

شخصیت کا تجزیہ

پچھلے زمانہ میں علمِ نفسیات کی صرف ایک تعلیمی حیثیت تھی۔ اِس علم کے ماہرین نے شخصیت کی تعریف کرنے کی کوشش تو کی مگر شخصیت کے سرچشمہ —— اُس ذاتِ واحد کو پہچاننے کی کوشش نہ کی اور ہمیں صرف یہ بتایا کہ شخصیت کا روح سے ایک لگاؤ ہے۔ اُنہوں نے رموزِ حیات کو سمجھنے کے لئے عملِ جراحی تو کیا مگر وہ تجربہ ناکام رہا کیونکہ شخصیت کی خصوصیات کو پرکھتے ہوئے انہوں نے نہ تو زندگی کی گہرائیوں میں جھانکنے کی کوشش کی اور نہ نفسیاتی اُصولوں سے زندگی کو سنوارنے کی کاوش کی —— آج "عملی یا تجرباتی سائیکولوجی" نے اس کمی کو پُورا کر دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے زندگی کے خدوخال کو بہت قریب سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ عملی سائیکولوجی نے اپنی ساری توجہ اِس بات پر مرکوز کر دی ہے کہ کس طرح انسان، مرد ہو یا عورت اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے کا راز سمجھ سکتا ہے؟ —— اور نفسیاتی تجربات نے یہی بتایا ہے کہ اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ انسان اس غیر فانی ہستی سے لو لگائے جو کائنات کا خالق ہے۔ کامیاب زندگی کی یہی ایک راہ ہے، ورنہ سائنس کا تجزیۂ حیات تو صدہا بار صحرا میں کر ہمیں حقائق سے دور لے جا سکتا ہے۔

آج ہم دولت اور طاقت کی اندھی محبت اور مادیات کے شور و غل میں انفرادی شخصیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں حالانکہ انفرادی شخصیت بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ دنیا کی تمام عظیم ہستیوں نے اپنے عہد پر اپنی انفرادی شخصیتوں کا سکہ جمایا ہے۔ اگر وہ شخصیتیں پیدا نہ ہوتیں تو آج تہذیب و تمدن نے اتنی ترقی نہ کی ہوتی۔ ہر فرد کی زندگی میں اُس کی شخصیت ایک ایسے طاقتور مقناطیس کی حیثیت رکھتی ہے جو اپنی کشش سے اپنی مرضی کے مطابق ہر چیز کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یہی مقناطیسی کشش انفرادی زندگی کی کامیابی کا راز ہے۔ ایک شخص اپنے تصورات میں خوابوں کی جنت بنا سکتا ہے لیکن اس کا یہ خواب کبھی حقیقت نہیں بن سکتا اگر اُس میں شخصیت کی وہ مقناطیسی کشش نہ ہو جو گوہرِ مقصود کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے

ہمت اور اُمید شخصیت کی سہیلیاں ہیں۔ شخصیت کی زرخیز زمین سے خود اعتمادی کا درخت نکلتا ہے اور جب یہی درخت ہمت اور اُمید سے سیراب ہو کر جوان ہوتا ہے تو اُس میں زندگی کی شادمانی کے پھول کھل اُٹھتے ہیں۔ اپنی شخصیت کو نمایاں کر کے انسان اپنے ایوانِ حیات کی بنیادوں کو اتنا مستحکم بنا دیتا ہے کہ نہ تو طوفانِ حوادث انہیں ہلا سکتا ہے اور نہ زندگی کی تلخ کامیاں اُس کی آہنی فصیل کو متزلزل کر سکتی ہیں۔ شخصیت اُس مضبوط قلعہ کی مانند ہے جس کے اندر انسان کی انا زندگی کی آفات اور تقدیر کی جراحتوں سے محفوظ رہتی ہے۔ جس زندگی کی بنیاد ایسے ٹھوس چٹان پر ہو جس میں کبھی زلزلہ نہ آئے اس بنیاد پر ایک ایسی عمارت کھڑی ہو سکتی ہے جسے کارواں اپنی سمجھ لے — اور آپ خود سوچئے وہ زندگی ہی کیا جس میں زندگی کے تمام محاسن کے باہمی ربط سے انسانیت کا "تاج محل" نہ بن سکا ہو؟ — یہی تاج محل تو شخصیت کا سُندر روپ ہے۔ !!

شخصیت کے دو اہم پہلو ہیں — تمام نوعِ انسان کے لئے ایک مشترک حیثیت رکھتے ہوئے شخصیت انسان کا سوسائٹی سے رشتہ جوڑ دیتی ہے مگر ساتھ ساتھ اپنے اندر وہ امتیازی شان رکھتی ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے مختلف بنا دیتی ہے ایک مؤثر شخصیت انسانوں کے ہجوم میں بھی بے نظیر ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جو انفرادی بھی ہے مگر انسانوں کی جماعت، جیسے ایک قوم، بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے سوسائٹی، قوم اور ملک کی شخصیت بن جاتی ہے۔ شخصیت کی یہ انفرادی اور اجتماعی قدریں کتنی اہم ہیں اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔

موجودہ زمانے نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ کسی قوم کی شخصیت کا انحصار سوسائٹی کی خارجی تعمیر پر نہیں بلکہ لاکھوں افراد کی شخصیتوں کے باہمی اتحاد پر مبنی ہے۔ قوم کی شخصیت کا یہ بنیادی تصور بہت اہم ہے (خصوصاً ہمارے لئے کیونکہ آج ہم ایک نئی آزاد قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہمیں خود ہی اپنی قوم کو سنوارنا ہے) — وہ "جہانِ نو" جس کا ہم خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ "جدید نظام" جس کی امیدیں ہم جی رہے ہیں اُسی وقت ممکن ہے جب سوسائٹی کے تمام افراد کی شخصیتیں اجاگر ہو کر اُن سرد چراغوں کو بھی روشن کر دیں جو شعلہ [illegible] ہیں — وہ "سکونِ زار" جہاں انسانوں کی ایک بہتر سوسائٹی ہوگی اور جہاں ہر زندگی مسکرانے کا حق رکھتی ہوگی، ایک زندہ حقیقت بن جائیگا۔ اگر دنیا کے تمام انسان یہ بخوبی سمجھ لیں کہ اُن کی شخصیتیں قوم اور جماعت پر کس حد تک اثر انداز ہوتی ہیں! — یہی وہ حقیقت ہے کہ جس نے "سائیکولوجی" کو مستقبل کا رازداں، ترقی کی راہنما، اور کامیاب زندگی کا فنکار بنا دیا ہے — آج تمام دنیا کی امیدیں اس سے وابستہ ہیں !! —

وراثت کی زنجیر؟

شخصیت کیا ہے — اس کا ایک عام فہم جواب ہونا چاہئے کیونکہ اس کی صحیح تعریف اُس کی صحیح تحلیل پر منحصر ہے اور شخصیت کا صحیح تجزیہ دشوار ہے ہم آپکو پہلے یہ بتا چکے ہیں کہ شخصیت انسان کی جسمانی، دماغی اور روحانی خصوصیات کا مجموعہ ہے۔ اِس کی تشکیل اگرچہ وراثت اور ماحول پر مشروط ہے لیکن یہ اُن سے فائق ہے اور حالات، زمان اور مکان کی تمام قیود سے بلند و بالا۔ شخصیت کے محاسن کو سمجھنے کے لئے اِس کے متذکرہ بالا اجزائے ترکیبی پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

زمانہ ماضی اور حال دونوں ہی زمانہ میں شخصیت پر موروثی اثرات کو سمجھنے میں غیر ضروری زورِ احساس اور کم نگاہی سے کام لیا گیا ہے۔ بعض لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ہماری شخصیت کے اجزائے ترکیبی ہمارے خدوخال یا ہمارے آبا و اجداد۔ ہم صرف ان خدوخال سے مجبور ہو کر اندھیرے میں اُجالے کی تمنا نہیں کر سکتے بلکہ اپنے نادیدہ اسلاف پر لعنت بھیج کر قسمت کی بدنصیبی کو زندگی کے عجیب فلسفہ"

میں دقیق کر سکتے ہیں ——— لیکن دنیا کی تمام عظیم ہستیاں اس فلسفہ کی تردید کرتی ہیں کہ انسان تقدیر کا غلام ہے ———

یہ تو ایک امر مُسلّم ہے کہ جس طرح لاغر اور کمزور والدین کی اولاد عموماً کمزور ہوتی ہے اسی طرح طبعی رجحانات بھی موروثی ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مرد اور عورت کے یہ جیتے جاگتے پیکر موروثی رجحانات کے کھلونے نہیں ہیں۔ تاریخ نے بار بار ایسے ناقابلِ تردید ثبوت پیش کئے ہیں کہ نہ والدین کی میراث اور نہ موروثی رجحانات کا انسان کی زندگی میں نمایاں حصّہ ہے ——— اگرچہ بساطِ حیات کے ابتدائی مہروں پر انسان کا کوئی اختیار نہیں لیکن اب ان مہروں کی چال کیا ہوگی اُس کا سارا دارومدار اُس کی ذہانت پر ہے۔ اور ایک اچھا کھلاڑی ہاری ہوئی بازی بھی جیت سکتا ہے ——— زندگی کے کھیل میں یہی نہیں کہ انسان صرف چند مہروں کے سہارے رہ سکتا ہے بلکہ وہ اپنی اندرونی طاقت سے پٹے ہوئے مہروں کو بھی زندہ کر سکتا ہے۔ انسان اگر چاہے تو شرارے کو شعلہ بنا سکتا ہے، تقدیر کی فرسودگی پر مسکرا سکتا ہے اور مشیت کی آنکھوں سے آنکھیں ملا سکتا ہے ——— وہ اپنے گردوپیش کو بدل کر زندگی کو اپنا محکوم بنا سکتا ہے۔ کیونکہ انسان اُس ذات نور السماوات کا پرتو ہے۔ اجداد کی میراث شخصیت کا ایک جزو ہے مگر کُل نہیں۔

قسمت نے تو یہی کہا تھا کہ ڈیموستھینز لکنت کا شکار رہے مگر وہ دنیا کا سب سے بڑا مقرر بن کے چمکا، بیتھوون سماعت سے محروم ہوگیا مگر اُس نے دنیا کو اپنے اُن شیریں اور روح پرور نغموں سے مسحور کر دیا جنہیں وہ خود سننے سے مجبور تھا۔ تقدیر نے تو رابرٹ برنس کے اجداد کو دہقانی زندگی کی کلفتیں دی تھیں جس کی وجہ سے برنس بہت کم تعلیمی اور معاشرتی مفاد حاصل کر سکا۔ مگر برنس نے اپنے لافانی اشعار سُنا کر ایک حیاتِ جاوید پالیا ——— (اور دور کیوں جائیے — دنیا کی عظیم ترین ہستی فردوس نشیں قائدِ اعظم کا غیر فانی کارنامہ پاکستان تو آپ کی نظروں کے سامنے موجود ہے) ——— کیا آپ اب بھی شخصیت پر وراثت کے اثر کو تسلیم کرتے ہیں؟ ———

غور سے دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ اجداد کی میراث وہ لباس ہے جو ہم پیدائش کے وقت پہن لیتے ہیں کیونکہ ہماری انسانیت زندگی کی اس دوڑ میں ہمیں برہنہ شریک ہونے سے مانع رکھتی ہے۔ جب ہم زندگی بسر کرنے کا فن جان لیتے ہیں تو اپنی مرضی کے مطابق ہم وہ لباس اتار کر ایک نیا لباس زیبِ تن کر لیتے ہیں ——— ہم آج جو کچھ بھی ہیں اس کی ایک وجہ موروثی رجحان ہو سکتا ہے مگر یاد رکھئے کہ ہم کل کیا ہوں گے اس کا سارا دارومدار ہم پر ہے۔ زندگی کی رزم گاہ میں آپ فاتح ہوں گے یا مٹ جائیں گے اس کا انحصار ان ہتھیاروں پر نہیں جنہیں پیدائش کے دن آپ کو دیا گیا تھا بلکہ اُن ہتھیاروں پر ہے جنہیں آپ اپنی ضرورت کے مطابق کائنات میں قدرت کے مُہیا کئے ہوئے سامان سے خود بنائیں گے ——— آپ کی ابتدا کیا تھی اور کہاں سے ہوئی تھی اُس کی کوئی خاص اہمیت نہیں — آغاز اور انجام کی درمیانی منزل تک آپ کس طرح پہنچے یہ بھی سوچنے کی ضرورت نہیں۔ مگر آپ کا انجام کیا ہوگا؟ ——— یہی ایک قابلِ غور مسئلہ ہے: ———

انسان کا سب سے بڑا دُشمن نادیدہ اسلاف کا شجر نہیں بلکہ وہ جو "آج" کے بطن سے ایک "روشن فردا" نہیں پیدا کر سکتا!!! —

ماحول کا چیلنج

موجودہ زمانہ میں معاشرت کی اِصلاح میں عام رجحان آذر کے اس نظریئے کی طرف ہے کہ ماحول ہی تمام اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کردار کی تشکیل میں ماحول کا بڑا ہاتھ ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ شخصیت کردار سے فائق ہے۔ ماحول کی تخلیقی طاقت سے انکار کئے بغیر یہ ماننا پڑے گا کہ ماحول مہمیز بھی ہو سکتا ہے اور لگام بھی —

یہ خیال بالکل غلط ہے کہ انسان گویا اُس اسپنج جیسی ہے جو ماحول کا رس نچوڑ تا ہے مگر یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ اس "بادہ کشی" میں کوئی انتخاب کر سکے۔ زندگی کے کھیل میں انسان کا پارٹ جامد نہیں ہوتا بلکہ متحرک ہوتا ہے اور اس دورانِ عمل میں وہ اپنے ماحول پر بھروسہ نہیں کرتا بلکہ اپنے اس ردِ عمل پر اعتماد کرتا ہے جو اس ماحول میں اُس کے عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ وہ مورت نہیں جو قسمت کے تاروں پر ناچتی ہو بلکہ وہ فسوں گر ہے جو تارِ نفس کو اپنے ہاتھ میں لے کر زیست کے افسانے میں اپنی خواہش کے مُطابق سُرخی بھر دیتا ہے! ———

اِس کا مطلب ماحول کے اثر کو کم کرنا نہیں بلکہ شخصیت پر ماحول کس حد تک اثر انداز ہوتا ہے اِس کا صحیح جائزہ لینا ہے ——— یہ سچ ہے کہ ماحول اِنسان کی ارتقا میں بہت کافی مدد دیتا ہے لیکن انسان خارجی اثرات سے بہت زیادہ مرعوب نہیں ہوتا۔ دوسرے ایک

داخلی حیثیت رکھتی ہے اور تمام خارجی اثرات پر قادر ہے انسان اپنے آپ کو بدل کر اپنا ماحول بھی بدل سکتا ہے۔ یقین کیجئے آپ اپنے ماضی اور حال کے دھندلکوں کو مستقبل کے اُجالے میں گم کر سکتے ہیں آپ چاہیں تو آپ کے ماحول کی تنہیاں بھی مسکرا سکتی ہیں۔!!

عام طور پر آج بہتیرے ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے گرد و پیش کی گرانباری سے اپنی ذاتی صلاحیتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ سماجی اور معاشرتی مشکلات کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتے ہیں اور ایسے معاملات جن پر بظاہر اُن کا کوئی اختیار نہیں اُن کی شخصی ترقی کی راہیں مسدود کر دیتے ہیں ـــــ لیکن حقیقت تو یہ کہ اُن کے سینوں میں بھی ایسی طاقتِ پرواز ہے جس کی مدد سے وہ اپنے ماحول سے بلند ہو کر "ستاروں کی گذرگاہوں" تک پہنچ سکتے ہیں ـــــ ماحول کی گھٹن کی ہمارا خود کردہ گناہ ہے۔ اگر ہم اپنی خودی کو پہچان لیں تو ہمارا یہی المناک ماحول گنگنا سکتا ہے، مسکرا سکتا ہے۔

شخصیّت کی پنہاں طاقتیں

شخصیت کی تشکیل میں ماحول اور وراثت کے اثرات کو ہم دیکھ چکے ہیں۔ آیئے اب ہم شخصیت کے سب سے اہم پہلو پر نظر ڈالیں جسے بہت کم سمجھا گیا ہے۔ یہ اہم پہلو ہمارا تحت الشعور ہے۔ ماحول اور وراثت پر غور کرتے ہوئے ہم یہ بتا چکے ہیں کہ اُن کے اثرات کو ہم ذاتی کوششوں سے کم کر سکتے ہیں یا مٹا سکتے ہیں ـــــ تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اپنی کوششوں کا رُخ کس سمت کریں تاکہ ہم تحت شعوری قوتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں؟۔ ہمارا سب سے پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اس بات پر کامل یقین رکھیں کہ "ہم اپنی تقدیر کے آپ مالک ہیں!" ـــــ اور یہ بھی سمجھ لیں کہ جس طرح ہم اپنی موجودہ زندگی کے کچھ حد تک ذمہ دار ہیں اُسی طرح مستقبل کے تا منذا ـــــ ہم حقیقی طور پر اپنے گرد و پیش کو ایک نئے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں ـــــ یہ خود اعتمادی اور خودی کی راہ ہے۔ اِس راہ پر بہتوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں آپ نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہوگا جو اِس کا اعتراف کرتے ہیں کہ جس کام کو وہ خود کرنا چاہتے ہیں اُسے دوسرے پورا کر لیتے ہیں مگر پھر بھی اُن کے دلوں میں حوصلوں کی تحریک نہیں ہوتی اور نہ اُنہیں اس کا یقین ہوتا ہے کہ جس کام کو دوسرے پورا کرتے ہیں اُسے وہ خود بھی کر سکتے ہیں۔ آپ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر سوچیئے ممکن ہے کہ آپ بھی خود کو ایسے ہی لوگوں کی جماعت میں پائیں ـــــ لیکن آپ مایوس نہ ہوں (کیونکہ مایوسی کفر ہے) ۔ آپ چاہیں تو دوسروں کی طرح آپ بھی "معجزے" دکھا سکتے ہیں یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے ممکن ہے کہ آپ کو یقین نہ آئے لیکن تھوڑی دیر کے لئے اِس بیان کو سچ سمجھ کر اس پر عمل کیجئے۔ یقین اور اعتماد کی یہ شاہراہ آپ کے سامنے ہے قدم بڑھایئے، منزل خود بخود آپ سے قریب تر ہوتی جائے گی !!۔

ڈرتے اور لرزتے ہوئے ہی سہی مگر اِس "راہِ یقین" پر جب اپنا پہلا قدم آپ بڑھا دینگے تو دوسرا قدم خود ہی بڑھ جائے گا اور پھر آپ کے قدم کبھی نہ رکیں گے یہاں تک کہ آپ اپنی منزل پر پہنچ جائینگے ـــــ مگر یہ بھی سن لیجئے کہ راہ کی صعوبتوں کا یہیں خاتمہ نہیں ہو جاتا ـــــ راہِ یقین پر کچھ دور نکل جانے کے بعد شائد آپ کو اپنی کامیابی کا یقین ہو جاتے مگر آپ کے امتحان کے لئے کچھ اور دشواریاں بھی حائل ہیں۔ چلتے چلتے بعض مشکلیں ایسی اچانک آپڑتی ہیں کہ جن سے سہم کر آپ کے قدم رک جاتے ہیں ـــــ یہی وہ مقام ہے جہاں ہمّت ڈھال کا کام کرتی ہے۔

ہمّت اور استقلال کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اِس کا مفہوم صرف یہ نہیں کہ یہ انسان کے دماغ کی ایسی صفت ہے جو اِسے ناکامیوں میں ہنساتی ہے۔ ہمّت نہ تو خطرہ اور تباہی کی طرف سے اندھی ہوتی ہے اور نہ مصائب سے دامن چراتی ہے۔ یہ ایک ایسی طاقت ہے جو انسان کو طوفان حوادث سے آخری دم تک لڑنے کے قابل بنا دیتی ہے۔ ہمّت ور سپاہی میدانِ جنگ میں مر جاتا ہے مگر اُس کی غیرت شکست تسلیم نہیں کرتی ـــــ انسانی تجربہ تو یہی ہے کہ کارزارِ حیات میں ہمّت لوہے کے تیز اسلحوں سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے۔ یہ وہ عزمِ راسخ ہے جو خوف و ہراس کو کبھی اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا ـــــ یہ وہ صلاحیت ہے جس سے انسان حال کے دُکھ درد کو بھول کر مستقبل کی زلفیں سنوارتا ہے !! ـــــ

ہمّت اور اعتماد کی ڈھال اور تلوار لے کر انسان راستے کی تمام رکاوٹوں کو روندتا ہوا قسمت کی پُر پیچ گذرگاہوں کو طے کر سکتا ہے۔ یہ راستہ اُسے کہاں لے جائیگا یہ کوئی بھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ کامیاب زندگی کی یہی راہ ہے

مقاصد کے لئے جینے اور شخصیت کو جگانے کی شاہراہ یہی ہے۔
—— !! زندگی ایک فن ہے اور اس راہ پر چلنے والا مسافر فنکار!
—— یہ وہ جام ہے جو زندگی کی کامیابی اور مسرت کی شراب سے لبریز ہے۔ ہاتھ بڑھایئے اور اس حیات بخش جام کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیجئے ——

اگر دل میں زندگی کی کامیابی کی تمنا ہو تو اپنی شخصیت کو اجاگر کیجئے۔ "راہ یقین" پر ہمت کے ساتھ قدم بڑھایئے اور اُن خزانوں کا سراغ لگایئے جو آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں —— یہ نہ سوچئے کہ آپ موڑ پر پہنچ کر بھٹک جائیں گے کیونکہ آپ کی ذات میں ایک ایسی قوتِ فیصلہ ہے جو آپ کو ہمیشہ صراطِ مستقیم پر لے جائے گی —— اندھیری رات کی بے پناہ تنہائی ہو یا دہکتا خیزوں کی تپتی ہوئی دھوپ، آپ کے دل میں ہر وقت منزل تک پہنچنے کا جذبہ موجزن ہوگا —— اور اگر اس کے بعد بھی چلتے چلتے کبھی آپ لڑکھڑا جائیں گے، جس کا امکان ہے، تو یاد رکھیئے مشیت خود آپ کو سہارا دے گی۔ فطرت کی دیوی اپنے رُخ سے نقاب ہٹا کر آپ کو اشارے دے گی اور آپ اپنا گوہرِ مقصود پا لیں گے —— وہ حیاتِ سرمدی اور سکونِ لم یزل جس کی تلاش میں آپ ازل سے چلے تھے !! ——

(بقیہ اشارات)

مباحث کے لئے وقف نہیں بلکہ اس کا دامن دوسرے موضوعات علم و ادب۔ شاعری۔ ڈرامہ۔ افسانہ اور تنقید سے بھی کشادہ رہے گا۔ کیونکہ تمام تر اصنافِ ادب کی محرک خود ہماری وہ کیفیات ہوتی ہیں جنہیں ہم غیر شعوری کہتے ہیں۔ ایک [illegible] کا مطالعہ صرف ایک شعری کیفیت ہم پر طاری نہیں کرتا بلکہ ان تجربات کا رد عمل جن سے خود شاعر متاثر ہوا ہے۔ ہمارے شعور کی وادیوں میں بھی ایک بازگشت پیدا کر سکتے ہیں موجودہ سائنس نے جہاں موضوعات کی وسعت بڑھا دی ہے وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح سے [illegible] کی اس [illegible] میں ہم آہنگی کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔ سائیکولوجی [illegible] کی [illegible] ایک [illegible] کا اشارہ [illegible] کی [illegible] نہیں بلکہ نفسیات کا ایک اہم نکتہ بھی ہے

ماہنامہ

سائیکولوجی

آپ کیونکر مفت حاصل کر سکتے ہیں

۱۔ اگر آپ سائیکولوجی کے دس سالانہ خریدار حضرات کے چندے وصول کر کے دفتر سائیکولوجی میں بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دیں تو پرچہ آپ کو سال بھر پابندی کے ساتھ مفت ارسال کر دیا جایا کرے گا۔

۲۔ اگر آپ سائیکولوجی کے ۵ سالانہ خریدار حضرات کے چندے وصول کر کے دفتر سائیکولوجی میں منی آرڈر کر دیں تو پرچہ آپ کو چھ ماہ تک پابندی کے ساتھ مفت روانہ کیا جاتا رہے گا۔

۳۔ اگر آپ کسی شہر یا قصبہ میں سائیکولوجی کی کم از کم دس پرچوں کی ایجنسی قائم کر دیں (جہاں سائیکولوجی کی ایجنسی نہ ہو) تو آپ کو چھ ماہ کے لئے پرچہ پابندی کے ساتھ مفت ارسال کر دیا جایا کرے گا۔

۴۔ اگر آپ اپنے شہر میں سائیکولوجی کی سول ایجنسی (اگر نہ ہو) جو کہ کم از کم تیس پرچوں پر قائم ہو جاتی ہے۔ قائم کرا دیں گے تو پرچہ ایک سال تک آپ کو مفت پابندی کے ساتھ جاری کرا دیا جائے گا۔"

مقتبس سید حمید الدین احمد رعنا صاحب

روزمرہ سائیکولوجی ۔۱

(جس کی لاٹھی اسکی بھینس آپنے ہزار بار سنا ہوگا اگر آپ خود اس لاٹھی کے مالک بننا چاہتے ہیں تو آیئے روزمرہ سائیکولوجی آپ کی مدد کو تیار ہے)

طاقت دنیا میں کامیابی، شہرت، فتح مندی اور سکون حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ہر زمانہ میں انسان کا سر طاقت کے سامنے جھکتا ہی رہا ہے۔ اور طاقت ہمیشہ ہر کام کو پورا کراہی دیتی ہے۔ غور کیجئے وہ بھاپ جو آپکی چائے کے لئے پانی کے گرم ہوتے وقت نکلتی ہے کیا طاقت رکھتی ہے۔ ہزاروں من وزنی سامان سے اور فولاد کے بنے ہوئے ریل کے ڈبوں کو دوڑاتی ہے۔ بھاری سے بھاری چیز کو ہوا میں اڑا دینے کو تیار ہے۔ بڑے بڑے انجنوں اور انجنوں سے کارخانوں کو بھاپ کی طاقت اس طرح چلا دیتی ہے جس طرح آپ کی پھونک ایک تنکے کو ہوا میں اڑا دے۔

بڑا بھاری سمندر جب ہوا اور پانی کے طوفان آنے سے مچل جائے تو اس طاقت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ جہازوں کو چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش کر دیتا اور کنارے پر ایسا غضبناک ہو کر چڑھ بیٹھتا ہے کہ بڑی بڑی چٹانیں آپس میں ٹکرا کر آٹا ہو جاتی ہیں۔ انسان کی پیش نہیں چلتی وہ بھی سہم کر رہ جاتا ہے۔

ہوا کی طاقت اپنی جگہ خود مسلم ہے۔ جب یہ غضبناک ہو کر آندھی کی شکل اختیار کرلے تو پناہ بخدا مکانوں پر سے اینٹیں اس طرح اڑ جاتی ہیں جیسے گھاس پھوس۔ پوری پوری عمارتیں سرنگوں ہو جاتی ہیں بڑے بڑے درخت اس طرح ہوا میں بلند ہو کر گرتے ہیں کہ جڑیں اوپر اور سر نیچے پھر لطف یہ کہ ہوا کی طاقت کا مقابلہ تو درکنار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاغذ کی چند پتیاں ہیں جو ادھر ادھر اڑتی پھرتی ہیں۔ کائنات کے ذرہ ذرہ میں بھی طاقت پوشیدہ ہے۔ کچھ عرصہ ہوا سر آرچی بالڈ نے کہا تھا کہ اگر ایٹم کی طاقت کو نظر انداز نہیں کر دیا جائے تو خاک کی ایک مٹھی سے اتنی طاقت پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ برطانوی بحری بیڑے کو غرق کر دینے کے لئے کافی سے زیادہ ثابت ہوگی۔

یہ تمام طاقتیں آپ کے سامنے ہیں ان پر آپ نے غور بھی کیا؟ اب ان تمام طاقتوں سے بڑی طاقت کو بھی سوچئے جو خود آپ میں موجود ہے آپ حیران کیوں ہو گئے یقین جانئے آپ کائنات کے سب سے اشرف ہیں اس لئے طاقت بھی آپ ہی میں سب سے زیادہ ہے آپ اس ننھے سے نرم و نازک بچہ کا تصور کیجئے جو اپنی ماں کی آغوش میں لیٹا ہوا مسکرا رہا ہے یقین جانئے اس ننھے سے انسان میں وہ طاقت چھپی ہوئی ہے جو پوری کی پوری قوم کو گمراہی، ذلت اور رسوائی کے غار سے نکال کر کامیابی، عزت اور شہرت کی بلندیوں تک لیجا کر بھی دم نہ لے۔ حضرت آمنہ کی گود کا وہ ننھا سا لال یاد کرو جس نے اپنے اخلاق اور روحانی طاقتوں سے بڑی سے بڑی طاقت کو زیر کر دیا تھا گری ہوئی انسانیت کو انتہائی بلند کر دیا اور کیوں جاؤ کھارادر کراچی میں پیدا ہونے والے نازک بچے کو دیکھو قائد اعظم بن کر اپنی قوم کو اوج رفعت پر پہنچا دیا یہی بچہ دنیا کی تاریخ بدل سکتا ہے۔ فوجی سپاہی بن کر خالد کہلا سکتا ہے یہی بچہ مقرر بن کر پوری قوم کو مصطفےٰ کمال بنکر ترقی کی رو میں بہا سکتا ہے یہی بچہ خداداد قابلیتوں کو کام میں لا کر وہ ڈارون بن سکتا ہے جو اپنے سر کے نغموں سے بہتے پانی اور اڑتے پرندوں کو تھام دے یہی بچہ ایجادات کا ایسا سرچشمہ بن سکتا ہے جہاں سے بجلی، ریڈیو، ہوائی جہاز غرض وہ تمام اسباب مہیا ہوتے ہیں جو انسانیت کو عیش آرام اور سکون کی دولت سے مالا مال کر دیں آپ کو حیرت ہو رہی ہوگی کیا عام طور پر بچوں میں یہ طاقت ہوتی ہے؟ کیا آپ کے بچے میں بھی یہی طاقت موجود ہے؟ کیا خود آپ اس طاقت کے مالک ہیں؟۔ آپ نے ان سوالات پر غور ہی نہیں کیا۔ آیئے

روزمرہ مسائل کو بھی آپ کو نہ صرف اس کا صحیح جواب دے گی بلکہ ان طاقتوں سے کام لینا اور کامیاب ہونے کا بھی یقین دلائے گی۔

ان تمام طاقتوں کا مرکز دماغ ہے اور اس سے ٹھیک طور پر کام لینے والا انسان کامیاب اور نیک ہی نہیں ہو جاتا بلکہ ساری انسانیت کا محسن بن جاتا ہے۔ غور کرنے والا دماغ ان جواہر پاروں کو جمع کر لیتا ہے جو کائنات میں انسانیت کا سچا زیور بننے کے لئے موجود ہیں۔ کس قدر رنج اور افسوس کی بات ہے کہ ہماری قوم کے تقریباً ہر فرد میں اسی قسم کی طاقتیں موجود ہیں اور وہ اس سے یا ناواقف ہی ہے اور یا واقف ہونا نہیں چاہتا۔ ہماری قوم میں سے ایک فیصدی دماغ خیال کی اس طاقت سے کام لیتے ہیں جو انہیں آزاد اور باعزت قوم بنا دیتی ہے۔ اگر یورپی قوم کے دماغ اپنی طاقتوں سے کام لیں تو بتائیے ہماری قوم کیا کچھ نہیں کر سکتی۔

محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ زندہ قوموں میں دس فیصدی انسان اپنی دماغی طاقتوں سے کام لیتے ہیں اور باقی نوے فیصدی انسان ان کے نقش قدم پر بے سوچے چلتے ہیں، جس طرح وہ کام لینا چاہیں یہ ان کے ماتحت ہو جاتے ہیں غور تو کیجئے باوجود اس طریق عمل کے انسان نے دنیا کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اگر ہماری قوم میں سو فیصدی انسان اپنی دماغی قابلیتوں سے جائز اور مناسب کام لینے لگ گیا ہو۔ دنیا کا تمام جال جاتے۔ پریشان حالی، ظلم، جنگ، جبر، مرض، غرض ہر مصیبت کی لعنت ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ مگر ہماری ملکیت کو دنیا کی سب سے بڑی طاقتور اور کامیاب ملکیت بنانا ہے۔ اگر ہماری قوم کو دنیا کی رہبر قوم بنانا ہے حقیقی مسرت، سکون اور چین کو رواج دینا ہے تو اس کا واحد حل یہ ہے کہ ہم اپنی دماغی طاقتوں کو کام میں لائیں۔ خود ہنسے جئیں اور دوسروں کو خوشیاں بہم پہنچائیں۔

آپ کا پختہ ارادہ آپ کو سب کچھ بنا سکتا ہے۔ آپ کا یقین آپ کو وہ سب کچھ دلا سکتا ہے جس کی آپ کو تمنا ہے۔ آپ کو مالک نے دماغ دیا ہے اور دماغ کو طاقت پھر لطف یہ کہ آپ ہی کو اختیار بھی دیا ہے کہ آپ اس سے کام لیں۔ اب کوتاہی کا مجرم کون ہے؟

تمام طاقتوں کا مرکز دماغ ہے اور ایسی وہ دماغ کو سمجھ لینے سے اس کی تمام طاقتوں سے کام لے سکتے ہیں۔ دماغ تین مختلف درجوں میں کام کرتا ہے اور ان کو شعور، تحت الشعور اور فوق الشعور کے لفظوں سے [illegible] علیحدہ علیحدہ نام سے رکھے ہیں۔

شعور، تحت الشعور اور فوق الشعور۔ آئیے ہم ان تینوں حیثیات کو مختصراً علیحدہ علیحدہ سمجھنے کی کوشش کریں۔

متوجہ ہو سکنا

شعور دماغی طاقت کا وہ رُخ ہے جو استدلال کیا کرتا ہے۔ سوچ بچار اور وجوہات کے معلوم کرنے کا اسی سے تعلق ہے۔ ایک چیز کو دیکھنا، اسے سمجھنا اور سمجھ کر کام میں لینا اسی کے تحت میں ہے۔ یہی مشاہدات، تجربات اور ایجادات کا ذمہ دار ہے۔ اسی کے ذریعہ موجودہ حالات سے ہم واقف ہوتے ہیں۔ اس کے پانچ کارندے ہیں، ایجنٹ ہیں جو اس کے دربار میں سب کچھ حاضر کرتے رہتے ہیں وہ کارندے آپ کی ناک، آنکھ، کان، زبان اور ہاتھ پاؤں ہیں۔ ان ایجنٹوں کے ذریعہ دماغ ہر چیز کی اصلیت کو سمجھتا اور سمجھ کر کام لے سکتا ہے۔ لیکن یہ سب کام آپ کے اختیار میں ہیں آپ ان سے کام لیں۔ اور وہ اسی طرح کہ جس حد تک آپ ایک معاملہ کو سمجھنا چاہتے ہیں اسی قدر اس طرف توجہ کیجئے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ دماغ کے پانچوں کارندے اپنا کام کرتے رہیں۔ وہ سونگھیں، دیکھیں اور سنیں، چکھیں یا چھوئیں لیکن اگر آپ کی مناسب توجہ اس میں شامل نہیں ہے تو ان کا یہ تمام کام ایک حد تک بے کار ہوتا ہے۔ اصل توجہ دینے کا راز یہ ہے کہ آپ جس معاملہ کو سمجھنا چاہتے ہیں اس میں اپنے مذاق کے مطابق کوئی دل چسپی پیدا کر لیجئے۔ پاگل اور عقلمند میں یہی فرق ہے کہ ایک معاملہ کو سمجھنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور دوسرا دلچسپی کے ساتھ توجہ دے لیتا ہے۔ پہلا ناسمجھ ہو جاتا ہے اور دوسرے کا دماغ اپنی طاقتوں کو کام میں لے آتا ہے۔

آپ اپنے دماغ کی دنیا کو اس طرح غریب یا دولتمند بنا سکتے ہیں کہ حالات اور واقعات کو سمجھنے کی طرف متوجہ رہئے اور آپ ہی اپنی دنیا کو دولت مند اور آباد بنا سکتے ہیں۔ ایک مصور اس لئے بہترین تصویر بنا لیتا ہے کہ اس نے پہلے تو پھول اور منظر کو توجہ سے دیکھا پھر دماغ نے اس کے تمام نقوش محفوظ کر لئے ہیں اور اب جس وقت وہ اپنے دماغ سے کام لینا چاہتا ہے وہ بالکل ویسا ہی ایک پتی [illegible] وضع قطع اور رنگ روپ حاضر کر دیتا ہے۔ ایک [illegible] آواز کے اتار چڑھاؤ کو سنتا ہے [illegible] اس کا دماغ اس کو محفوظ کر لیتا ہے اور جب وہ [illegible] دماغ اس [illegible]

سکے گا جو شعور میں نہیں آتیں وہ انہیں حافظہ میں محفوظ رکھتا ہے۔ اور پھر
ایک نہ ایک دن ایک چیز پیش کرتا ہے جو انسان کو حیرت میں ڈال دیتی ہے

دماغ لڑا کر دیکھئے

بجائے اس کے کہ ہر بات کو جیسا کیا جائے ویسا ہی سمجھ لیا جائے اس کی بڑی ضرورت ہے
کہ آپ خود بھی اپنی طرف سے اس پر کیوں اور کیسے کے جوابات اخذ کیجئے
شعور کی سب سے بڑی طاقت یہی سوچ بچار کا مادہ ہے یہی وہ طاقت
ہے جس کے بل پر آپ دیکھی بھالی چیزوں سے آگے بڑھ کر ان حالات کو
سمجھ سکتے ہیں جو وجود میں نہ آئے ہوں۔ ایسی طاقت کے ذریعہ آپ مخلوق
کو دیکھ کر خالق کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ یہی وہ طاقت ہے جو حاصل ہو جائے تو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ننھا سا ساغر مجھ کو جام جہاں نما ہو

یہی طاقت آپ کو بہت بڑی نعمت بنائے گی۔ یہ آپ کے قبضہ
میں ہے اس سے کام لیجئے اور تماشہ دیکھئے مثلاً یوں سمجھئے کہ دو شخص
ایک ہی کام شروع کرتے ہیں اور دونوں کو اس میں نقصان ہوتا ہے
ایک شخص مایوس ہو بیٹھ جاتا ہے یا یہ سمجھ کر کہ ناکامی قسمت میں لکھی ہوئی ہے
کہ خودکشی کر لیتا ہے دوسرا ناکامی کے اسباب پر غور کرتا ہے۔ یا اس کمزوری
کو تلاش کر کے دور کر دیتا ہے یا اس سے بہتر دوسرا کام تجویز کر لیتا ہے۔ یہ
انسان کامیاب ہو گا۔ ناکام۔ مثلاً دو شخصوں کی بیویاں ان کے حق میں
ناکام ثابت ہوتی ہیں۔ ایک شخص جذبات کی نا سمجھ رو میں اس قدر بہہ جاتا ہے
کہ وہ طے کر لیتا ہے کہ ایسی بیوی کا وجود ہی خطرناک ہے۔ وہ خود اسے
ہلاک کر دیتا ہے اس کے دوست کبھی مار ڈالتا ہے۔ نتیجہ میں خود بھی یا
سولی پر چڑھایا جاتا ہے یا خود ہی ہلاک ہو جاتا ہے۔ دوسرا شخص غور کرتا
ہے کہ آخر اس نامرادی کی وجہ کیا ہے۔ سوچنے کے بعد اس وجہ کو دور کر
دیتا ہے۔ یا اگر وجہ دور نہ بھی ہو تو طلاق دے کر بیوی کو اس کی مرضی پوری
کرنے کا موقع دیتا ہے اور خود اس سے بہتر بیوی تلاش کر لیتا ہے۔ بتلائیے
آپ کس کو پسند کریں گے۔ نفرت اور قتل کو یا غور و فکر کے بعد ایک مناسب
حل کو۔ یہی حال زندگی کے ہر پہلو میں ہر معاملہ میں اختیار کر لینا ہی کامیابی
ہے اور مایوسی کے بل پر نا امیدی کا قلعہ توڑ کر فنا کر دیا جاتا ہے۔

تحت الشعور۔ وہ ذخیرہ ہے جہاں جاتے ہیں فطری جذبات جبلی
خواہشات کے ساتھ محفوظ ہوتے ہیں۔ یہ یادداشت کا مال گودام ہے
[illegible] بھی یہاں طاقت

کھول سکتے ہیں مدد دیتی ہیں بے فکر بیٹھے ہوئے انسان پر اچانک تقاضا
کا جب حملہ ہوتا ہے تو تحت الشعور اچانک آپ کا ہاتھ بڑھا کر اس کو تھام لیتا
ہے۔ بعض اوقات ایک خطرہ سے اچانک آپ باخبر ہو جاتے ہیں اور
پھر سوچتے ہیں کہ میں کیسے بچ گیا۔ میں نے دیکھا بھی نہ تھا کہ آگے خطرہ ہے
یہ ایک دم پاؤں اسی طرف کیوں مڑ گیا کہ گر نہ سکا۔ یہ دراصل آپ کے
تحت الشعور کا کام ہے۔

فطری جذبات کو کچل نہ ڈالئے

جذبات زندگی کی کامیابی کے سب سے بڑے ذمہ دار
ہیں۔ انہیں نہ کچلئے۔ یہ فطری ہیں۔ دبائیے نہیں جھکئے البتہ آپ اگر انہیں
دبا دیں گے تو یہ شعور سے تحت الشعور میں جا کر پناہ لیں گے اور پھر بے خبری
میں اپنا عمل اس طرح کریں گے کہ آپ کو نقصان ہو گا۔ ایک بچہ کا دل چاہتا
ہے کہ وہ مزیدار حلوہ جو آپ نے تیار کیا ہے کھائے آپ اسے نہ دیں۔
ڈرا دیں دھمکا دیں۔ اس کی خواہش پوری نہ کریں لیکن اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ یا
وہ چرا کر کھائے گا یا موقع در طریقہ اس سے بھی زیادہ خطرناک اختیار کرے
گا محض اس لئے کہ آپ نے فطری جذبہ کو کچل ڈالا۔ صحیح جذبات ہی وہ طاقتیں
ہیں جو انسان میں کامیابی کی روح دوڑا کر رکھ دیتے ہیں۔ ایسا انسان جس کے
جذبات بچپن ہی میں کچل دیئے گئے ہوں ایک مٹی کا ڈھیر ہے وہ قالب بے جان ہے
وہ جذبات جن کو پروان چڑھنا چاہئے محبت، ہمدردی، زندہ دلی، جمالیاتی ذوق
خود اعتمادی ہیں ان کی زیادہ سے زیادہ ہمت افزائی اور مقصد کے ساتھ
ہی کار فرمائی کا موقع دینا چاہئے۔

تخریبی جذبات کو سدھائیے

جذبات لاتعداد قسم کے ہیں اور ان کا روکو رکھنا پڑا
ہے لیکن بعض ایسے بھی ہیں جن کے رخ کو بدل ڈالنے کی انتھک کوشش
کرنا چاہئے یہ جذبات خوف، مایوسی، پریشانی ہیں لیکن سب سے
زیادہ مضر غصہ اور حسد ہیں۔ اگر ان کے باگ ڈور نہ لگا دی جائے تو انسان
انسانیت کے درجہ سے گر کر جانور سے بدتر ہو جاتا ہے۔ یہ جذبات دوسروں
کے لئے تو نقصان دہ ہوتے ہی ہیں لیکن سب سے زیادہ نقصان اس
میں خود کو ہوتا ہے حسد اور غصہ کی آگ خود اس کی صحت، سکون اور اطمینان
کو جلا کر رکھ دیتی ہے۔ وہ انسان دوسروں کی نظروں میں ذلیل اور خوار
ہو جاتا ہے۔ لوگ اس سے ملنا جلنا ترک کر دیتے ہیں اس سے ملنے میں
اس لئے ڈرتے ہیں کہ ان کی عزت کو محفوظ رکھنا ہے۔ ان جذبات سے

انسانی خون میں ایسے زہریلے جراثیم پیدا کرتے جاتے ہیں جن سے اس کا
معدہ خراب اور صحت مکمل ہو جاتی ہے۔ ایسے انسان کی عمر گھٹ جاتی ہے
اور پھر اس کا اثر اس سے ہٹ کر اس کی اولاد اور عزیزوں پر پڑتا ہے وہ
بچے جو اس کی گود میں اور جو کے بڑھے ہیں ہر بات اس کی سیکھنا چاہتے
ہیں انہی امراض کا شکار ہو کر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ان تباہ کن جذبات پر
سختی سے قابو پانے کا آلہ آپ کے پاس موجود ہے یعنی کہ "معاملہ کو سمجھئے
خود غور کرنے اور وجہ تلاش کرنے کی عادت ڈالیئے سوچ کر اس کا اچھا حل
تلاش کیجئے "غصہ کو محبت سے بدل ڈالئے حسد کی جگہ ہمدردی کو دیدیجئے
در اصل آپ کا تجربہ آپ کو حیرت میں ڈالدے گا کہ کل تک جو آپ
کو یقین تھا کہ غصہ آپ کے قبضہ سے باہر ہے غلط ہے۔ اس لئے کہ آپ
کے تحت الشعور کو ہر وقت مشورہ کی ضرورت ہے
اگر آپ کا دماغ ایسا خیال پیش کرے جس سے نفرت کا اظہار ہو آپ اسے
نہ سوچئے خیال کو دوسری طرف بدل دیجئے۔ تجربہ کیجئے آپ ایک ایسے واقعہ
کو سوچنا شروع کریں جس کو سوچ کر آپ کو غصہ آئے جب غصہ کافی آچکا ہو
اب ایک دم اس واقعہ کا خیال دماغ سے نکال دیجئے دوسری ایسی بات
سوچئے ایسے کی یاد کیجئے جس سے آپ کو محبت ہے ایسے بچہ کو کھلائیے
جس پہ پیار آتا ہے آپ دیکھیں گے کہ غصہ کافور ہو گیا بس یہی طریقہ ہے برے
جذبہ کو اچھے جذبہ سے بدل لینے کا ہے۔ ایک عرصہ تک اگر آپ سوچتے رہے
کہ آپ غصے اور کمزور ہیں تو یقین جانئے کہ پھر بغیر آپ کے سوچے ہوئے
تحت الشعور ایسا اہتمام کر دے گا آپ کے لئے ہر وقت بیدار ہو کے
خیالات جمع رہ جائیں۔ آپ کی دماغی طاقتوں کا بڑا حصہ لاشعور میں ہے
لیکن اس کی رہبری کی باگ ڈور شعور ہی کے ہاتھوں میں ہے جس خیال پر
آپ توجہ نہ دیں جسے آپ سوچنا نہ چاہیں وہ جبراً آپ کے دماغ میں داخل
ہو کے ہیں زیادہ دن کامیاب نہیں ہو سکتا۔

خوبصورت نقوش قائم کیجئے — اب آپ نے سمجھ لیا ہے کہ آپ
جو چاہتے ہیں وہ سوچتے ہیں جو
ایک بار توجہ اور دلچسپی سے سوچ لیتے ہیں اس کے وہی نقوش آپ کے
تحت الشعور میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ آئندہ آپ کو اسی بات پر پھر غور کرنے
کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک بار آپ نے جاگتے ایک پھل کاٹ
کر سمجھ لیا ہے کہ چاقو کیا کام دیتا ہے یہ تجربہ آپ کے دماغ کے تحت الشعور
میں محفوظ ہو گیا اب آپ جب چاقو دیکھیں گے تحت الشعور آپ کو فوراً اس

کا مصرف بتادیگا۔ اس کے سمجھنے کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھئے کہ آپ
تحت الشعور پر ایسے نقوش قائم نہ کیجئے جو نفرت، حسد، غصہ وغیرہ یا ...
اگر کسی مسئلہ میں ایسے خیالات نقش ہو بھی چکے ہیں تو آپ انہیں بدل ڈالئے
یہ واضح ہے کہ ہر خیال اپنا نقش نہیں چھوڑتا بلکہ جس خیال کو آپ بار بار
اور توجہ سے موقع دیں وہ محفوظ ہو جاتا ہے اس لئے اگر آپ سوچ کر تعمیری
قسم کے خیال کو بار بار دہرائیں گے محبت، ہستی اور ہمدردی کے جذبات
سے دلچسپی رکھیں گے۔ کامیابی کی تدابیر پر غور کریں گے تو آپ کی دماغی طاقتیں
آپ کی مطیع ہو جائیں گی اور آپ اپنی آئندہ زندگی کو اسی سانچے میں ڈھال
لیں گے اسی طریقہ سے کمزوری طاقت سے، غربت دولت سے بیماری صحت
سے اور ناکامی کامیابی سے بدل جائے گی۔

سب سے زیادہ اہم — فوق الشعور۔ ہمارے وجود کے اہم ترین فریضہ
کو انجام دینے کا ذمہ دار ہے۔ مالک اور بندہ
کا تعلق۔ خدا اور اس کی خدائی طاقتوں سے ملا دینے کے اسباب اسی فوق الشعور
کا حصہ ہیں۔ یقین جانئے کہ انسان محض کھانے پینے کی مشین نہیں ہے اس
کے قالب میں روح بھی ہے روح کی موجودگی میں روحانی دنیا اور روحانی رشتہ
سے انکار کرنا اپنے قالب کو بے روح سمجھ لینا ہے بغیر اس روحانیت کے احساس
کے نہ آج تک دنیا میں بڑے کام ہوئے ہیں اور نہ آئندہ ہو سکتے ہیں
بھلائی کرنے کا جذبہ جرم سے بچنے اور گناہ کا تخیل مٹا دینے کے بعد انسانیت
خود بخود مٹ جاتی ہے۔ اسی جذبہ کے ماتحت پل، سڑکیں، یتیم خانے، تعلیمی
ادارے۔ غرض دنیا کے تمام کام سچائی اور دیانتداری ہی کے بل پر چلتے
ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ایک طرف مٹی کا ایک پتلا ہے اور دوسری طرف اللہ
کے انوار کا مظہر۔ کسی مظلوم کی امداد کرنا ہم ایسی مرکز پر سوچتے ہیں ایسی روحانی
تخیل کے احساس ہی پر تمام طاقتیں ہمارے زیر نگیں ہو سکتی ہیں۔

در فیض ست منشین از کشائش ناامید ایں جا
برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید ایں جا

آپ اپنے دوست و احباب
سے سائیکولوجی کی سفارش کیجئے

جناب عبدالحفیظ خاں صاحب

روزمرہ سائیکولوجی

تربیتِ جسم

مرحبا اے نازک اندامانِ کالج مرحبا * چھین لی تم نے نسائی شیریں ادا!

جینا بھی ایک فن ہے۔ کچھ اس فن کو جانتے ہیں' بہت سے نہیں جانتے' بعض تو ایسے ہیں جو جینے ہی سے بیزار ہیں' ان کا تو ذکر ہی کیا۔ ریشیوں کے لئے جینا وبالِ جان ہے۔ ان کا تو یہی نعرہ ہے!

"الٰہی موت دے مجھ کو میں اس جینے سے باز آیا"

ایسے جان سے بیزار لوگوں سے ہمیں کیا سروکار ہمیں تو ان سے کچھ کہنا ہے جو جینا تو چاہتے ہیں مگر اس کا ڈھنگ نہیں جانتے

خوشگوار زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ دماغ' روح اور جسم کے ساتھ ساتھ متوازن نشوونما ہو۔ بیمار روگی جسم ذہنی اور روحانی ترقی [illegible] کے راستے میں روڑا ہے دیکھا تو نہیں بڑے بوڑھوں کو کہتے سنا ہے۔ کہ تہذیبِ قدیم کے گھروں میں جہاں باورچی خانہ اور غسل خانہ ہونا ضروری تھا وہاں ایک چھوٹا سا کمرہ ہونا بھی ہر گھر میں لازم تھا جہاں چھوٹے بڑے سب روزانہ ورزش کرکے اپنا جسم بناتے تھے۔ تو معلوم ہوا کہ جسم بھی بنایا جاتا ہے۔ یہ آپ ہی آپ نہیں بن جایا کرتا۔ بننے کو بن جائے گا مگر جیسا اس کو چاہیے گا ویسا نہ نکلے بے ڈھنگا ہی نہ؟ مگر یہ بھدا سا جسم آپ کے کس کام کا؟ آپ کا جسم چاہیئے سڈول گٹھا ہوا۔ یوں کہلانے کو تو گینڈے کا جسم بھی جسم ہی کہلائے گا۔ مگر شیر کے جسم کی شان ہی اور ہے۔ پھر آپ کو کون روکتا ہے کہ آپ کا جسم شیر کی مانند متناسب اور آہنی ہو۔ وہ بھی انسان ہی تھے جن کے میدانِ جنگ میں آنے کی تصویر شاعر نے یوں کھینچی ہے۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے

ہر شخص کے اختیار میں ہے جس طرح کا چاہے اپنا جسم بنالے۔ کوئی نہیں کہتا کہ آپ ضرور گاما یا زبسکو ہی بنیں۔ ہاں اتنا ضرور کہیں گے کہ خدا کے لئے موٹے پیٹ اور میاں مگر نہ بنیئے صاحب یہ کالج اور اسکول کے نوجوانوں کے [illegible] جسم بھی بھلا کیا [illegible] زیب دیتے ہیں! چڑھتی جوانی اور ماتھا ڈھیلا۔ لاحول ولا قوۃ [illegible] ڈھیلے۔ زرا ماشاءاللہ [illegible] مرد کو لازم ہے [illegible] رنگ پیلے رکھے۔ [illegible] آنکھیں۔ [illegible] ہاتھ پاؤں۔ [illegible] [illegible] جیسے [illegible] کمان کا تیر اور [illegible] جسم بنانا [illegible] بات بھی تو نہیں۔ ضرورت روزانہ باقاعدہ صحیح اصول پر جسمانی ورزش کی ہے۔

زرا اندازہ تو کیجئے کہ تنومند توانا جسم کیسی نعمت ہے۔ زندگی کا سرور چھلکتی ہوئی صحت رکھنے والے جسم کے ساتھ ہی ہے۔ پھر اس کے حاصل کرنے میں آپ کیوں کاہلی کرتے ہیں؟ ایسی نعمت پانے کے لئے کیا تھوڑی سی بھی زحمت روزانہ گوارا نہ کیجئے گا؟ اس کاہلی [illegible] کا خانہ خراب آج ہی سے پختہ ارادہ کیجئے کہ مردانہ سا [illegible] جسم بنائے بغیر اب چین سے نہ بیٹھیں گے۔ آفریں ہمتِ مرداں مددِ خدا۔

اے خدا جنہیں [illegible] بخشی ہے تو نے انہیں [illegible] عاقبت [illegible] تو کل سے نہیں آج ہی سے ورزش شروع کر دیجئے۔ آپ کے محلہ میں ہی ضرور کوئی ورزش کے اصول جانتا ہوگا۔ نہیں تو کسی اچھے مدرسہ میں ورزش کے [illegible] اُستاد سے [illegible] ورزش کے اصول سیکھ لیجئے۔ اور اگر [illegible] کوئی کتاب جسمانی صحت اور ورزش پر خرید کر [illegible] استفادہ [illegible] کر لیجئے [illegible] جب تک یہ اصول سیکھیں تب تک روزانہ (باقی صفحہ ۳۴ پر)

ابن مجتبیٰ احمد صاحب

ایک نفسیاتی افسانہ

اپنی منزل کی طرف

دفتر جاتے ہوئے روزانہ ہی مجھے اس کے مکان کے سامنے سے گزرنا پڑتا تھا جس کے دروازہ پر بیٹھی وہ بند بند دو کو [illegible] نگاہوں سے گھورتی رہتی تھی۔ کیوں؟ یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ گھر سے دفتر تک کا راستہ کثرت استعمال سے میری زندگی کا جزو سا ہو گیا تھا۔ شناسا سا ـــــ سڑک کے دونوں طرف کی عالیشان عمارتیں، درمیان کی خالی جگہوں میں پناہ گزینوں کی جھونپڑیاں [illegible] پتھر پر جابجا اور ٹھیلوں والوں کی ریل پیل ـــــ دائیں [illegible] کے احاطہ میں [illegible] کا ذوق نمائش یا [illegible] گرلز اسکول کے دروازے پر چند ساختہ عشاق کا ذوق نظارہ ـــــ اس کے سوا کے بعد ہی شاید کمپنی کا وسیع احاطہ تھا جس کے صدر دروازے پر سینکڑوں مزدور گرد آلود [illegible] پہنے بیڑی کے لمبے لمبے کش لگاتے رہتے۔ درمیانی [illegible] کا زمانہ کا [illegible] استغناء سے تکا کرتے میں [illegible] دیکھتا رہتا جیسے [illegible] ـــــ یکسانیت کے باوجود ان مناظر میں کوئی نہ کوئی انوکھی بات ضرور [illegible] جس کی طرف چند لمحوں کے لئے دماغ متوجہ ہو جاتا۔

[illegible] کمپنی کے احاطے کے متصل ہی ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے احاطے کی دیوار [illegible] پانچ فٹ تک اونچی تھی۔ سڑک کی جانب بھی اس کا ایک دروازہ تھا جس کی [illegible] پر کرسی بچھائے ایک عورت بیٹھی [illegible] کرتی تھی۔ یہ ایک ایسا سین تھا جو موسم اور ماحول کی تبدیلی کا اثر قبول کئے بغیر ہر جگہ [illegible] تھا [illegible] سے بے خبر [illegible] حیات [illegible] [illegible]

کا نظارہ ہوتا جیسے ریلوے یارڈ میں مال گاڑی کے ڈبے۔ بڑے سے بڑے جلوس بھی بارہا گزرے۔ ۱۵ اگست کا تاریخی جلوس اور اس سے بھی زیادہ یوم فلسطین کے موقع پر ٹراموے کمپنی کے سامنے عوام کا احتجاجی مظاہرہ لوگوں کے جوش و خروش کو دیکھ کر کتنی [illegible] میں ابال آ گیا تھا۔ لیکن میں نے ان موقعوں پر بھی اس کو تصویر جیسی اچٹتی ہوئی نگاہ سے سڑک کو گھورتے ہوئے دیکھا۔ اس کی پیشانی پر تو جیسے تیوریاں تھی ہی نہیں اور ہونٹوں سے وہ لوچ بھی جاتا رہا تھا جس سے کیف و مسرت اور رنج و غصہ کی کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔

انتہائی دلچسپی کے باوجود بھی مجھے اس کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہو سکا اور نہ میں نے اس میں کوئی تبدیلی دیکھی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ مکان کے دروازے کے بورڈ پر نیا رنگ پھیر دیا گیا تھا جس سے اس کے مدھم حروف اجاگر ہو گئے تھے۔ "ڈاکٹر مسز [illegible] ولی"۔ یہ تو میرا پہلے ہی سے خیال تھا کہ وہ کسی لیڈی ڈاکٹر کا مکان تھا کیونکہ روزانہ صبح کو دفتر جاتے ہوئے عورتوں کی کافی تعداد احاطے میں ہاتھوں میں شیشیاں لئے آتی جاتی نظر آتی۔ شروع میں میں اسی بت نما عورت کو ڈاکٹر سمجھنے لگا تھا لیکن ایک دن وہ غلط فہمی بھی دور ہو گئی۔ میں دفتر جانے کے لئے گھر سے نکلا ہی تھا کہ بارش ہونے لگی اور [illegible] ولی کے گھر کے پاس پہنچ کر ناقابل برداشت [illegible] پڑنے لگیں۔ مجبوراً مجھے اس کے گھر کا رخ کرنا پڑا اور میں دروازے پر کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت سے معافی مانگتے ہوئے [illegible] ہو گیا۔ [illegible] کر وہ مسکرا دی اور ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"چائے پیجئے گا؟" اس نے سوال کیا جیسے وہ مجھے برسوں سے جانتی ہو۔ میں خاموش رہا۔ اس نے ایک نوجوان [illegible] ہوئے کہا۔ "[illegible] آتے ہیں چائے لے آؤ"۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

[illegible] کی کوئی خبر نہیں ملی۔ میں نے اکثر اس سے اس کی گزشتہ زندگی
کے متعلق [illegible] کی کوشش کی لیکن وہ ایسی ٹال مٹول کرتی تھی جیسے کسی نے
اس کی دکھتی ہوئی رگ کو دبا دیا ہو۔ اکثر راتوں کی خاموشی میں وہ ایک [illegible]
سے بڑے اہتمام سے چند کاغذات نکال کر ایک مقدس استغراق سے
پڑھتی ہے۔ غالباً شوہر کے خطوط ہوں گے۔ پہلے تو اس کو اس بات کا یقین
تھا کہ اس کا شوہر ضرور واپس آئے گا لیکن نہ جانے اب کیا سمجھتی ہے۔
"بیچاری بڑی قابلِ رحم ہے" میں نے کہا۔
"نہیں اختر صاحب اب تو ان واقعات کا ردِ عمل کچھ منفیانہ ہو گیا ہے
مانا کہ ستر سال کی عمر میں ذہن سے لطیف کیفیات کی یاد ختم ہو جاتی ہے"۔
مینا غالباً طبی سائنس کا سہارا لے رہی تھی۔ "آپ نے اسکو پاگلوں
کی طرح سڑکوں کو تکتے ہوئے تو دیکھا ہوگا۔ اس ضعیف العمری میں اس
قسم کا جنون اعصاب پر ہیجانی ردِ عمل کی وجہ سے ہی ہو سکتا ہے اور
صرف یہی نہیں میں تو اس کا بہت قریب سے مطالعہ کرتی ہوں۔ اسے
جوان لڑکیوں کے ساتھ بیٹھنے اور باتیں کرنے میں بہت لطف ملتا ہے
وہ انہیں بڑے ڈرامائی انداز سے عشق کی فرسودہ داستانیں سنایا کرتی
ہے۔ ان کے ساتھ مل کر بلاؤز کے نئے نئے ڈیزائن تیار کرتی ہے حالانکہ
آپ نے اسکے جسم پر بھی اٹھارہویں صدی کا لباس دیکھا ہوگا اپنے
پیسوں سے وہ ان کے لئے حالیہ فیشن کی چیزیں لاتی ہے۔"
"تو آپ کا کیا خیال ہے"؟ میں نے پوچھا مجھے اس منطقی بحث سے الجھن
ہو رہی تھی۔
"میرا تو خیال ہے کہ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ آپ نے غور نہیں کیا
ہے اس کی بچوں کی سی حرکتیں، سڑک کو بے معنی انداز میں گھورنا اور پھر اس
ضعیف العمری میں نوجوان مردوں سے جھینپنا۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا ہمارے
گھر پر چند ڈاکٹروں کی دعوت تھی ان کے آتے ہی خالہ بے تحاشا دوڑ کر
اپنے کمرے میں چھپ گئی اور پھر جب تک وہ سب نہ چلے گئے نہ آئی۔ آخر
[illegible] مرد آتے جاتے تھے۔"
دن ہاتھ ہوا تو میرا ذہن گل جانی کی طلسماتی زندگی، سحر آفریں ماضی
اور رومانی حیات کی گتھیاں سلجھا رہا تھا۔ مجھے ان جھریوں کے نشیب و فراز
میں گراموفون ریکارڈ کی طرح مختلف داستانیں جادو بھرے افسانے سنائی
دیتے نظر آتے [illegible] ان کے پس منظر میں گل جانی کا شباب ابھرتا ہوا
نظر آتا [illegible] آج سے چالیس برس پہلے — اس لئے بھی فراواں تخیل

اور شعور جذبات میں تصورات کے محل تعمیر کیے ہوں گے۔ [illegible]
میں خیالات [illegible] کتنے سنگ ریزے، حقائق کی کتنی تلخیوں سے ٹکرائے
ہوں گے۔ وہ ایسی سہاگن تھی جس کی آس کی تھالی ہمیشہ ٹھکرائی گئی جسکی
مالا پہلی بار کی آہٹ میں مسل دی گئی تھی آج وہ سسکتے جذبات گلے میں اٹک
اٹک کر اُسے ابوالہول بننے پر مجبور کر رہے تھے۔ اپنی محبت سے تمنا
کی خلش مٹانے کی کوشش کتنی خطرناک تھی۔ ماضی لوٹ آنے کی مبہم
امید تھی۔ یہ وحشی ہرنی کے خیالات تھے جو چشموں کی روانی میں اپنا ہلکا پن
انڈیل کر اپنے غم میں تسکین محسوس کرے۔ اور اگر وہ واپس آ بھی گیا تو کیا
ہوا کاروانِ حیات تو اپنی متاعِ زیست لٹا کر اپنی منزل کے قریب
پہنچ رہا تھا —— معاً مجھے مینا دتی کی ایک بات یاد آئی "گل جانی
کے دماغ میں خلل ہے"۔ میں نے اپنے ذہن میں اس کی ایک دھندلی تصویر
سڑک کو ایک بے معنی انداز سے گھورتے ہوئے دیکھی۔ اس کی [illegible]
آنکھیں۔ اس کی طلسماتی پھیکی ہنسی مجھے وہ ایک بھوت سی محسوس ہونے لگی
تھی۔ واقعی مینا دتی صحیح کہتی تھی چالیس برس کے دھندلکے سے زندگی کے
اِس گھٹاٹوپ اندھیرے میں کونسی روشنی پہنچتی ہوگی۔ اُس کی
مخبوط الحواسی کا جواز عقلی دوروں میں [illegible] ذہنی توازن کی کمی ہے۔
چند دنوں کے بعد گل جانی اپنی جگہ واپس آگئی تھی۔ کرسی پہ بیٹھی پھر
دو مبہوت آنکھیں فضا کو گھورنے لگی تھیں۔ آتے جاتے مجھ سے ملنے
میں اُس کا وہی اخلاق تھا۔ لیکن میں کچھ محتاط سا ہو گیا تھا۔
اکتوبر کا مہینہ تھا۔ اور غالباً بیس بائیس تاریخ کو میں شام کو ادھر
سے گذرنے لگا تو گل جانی نے مجھے اطلاع دی "نومبر کی بارہ تاریخ کو
روبیلا کی شادی ہے آپ آئیگا نا؟"
"کوشش کروں گا" میں نے کہا "لیکن شادی ہو کہاں رہی ہے"؟
"لڑکا بمبئی میں ایک بیمہ کمپنی کا ایجنٹ ہے۔ بڑا اچھا ہے لیکن آپ جیسا
آپ کو ضرور آنا ہوگا۔"
شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور گل جانی بڑی جانفشانی سے
تمام انتظامات میں مشغول تھی۔ اپنے سامنے [illegible] سے گھر کی صفائی
اُس نے خود ہی کروائی۔ کاغذ کے پھول پتے اُسی کی ہدایت سے آویزاں
کئے گئے۔ دیواروں پر تصویروں کی جو زینت کا انتخاب اُس نے
خود کیا۔ مسرت اُس کی رگ رگ سے پھوٹی پڑتی تھی جیسے اس نے
اپنے خوشی کے سرمایہ کو اسی دن کے لئے محفوظ رکھا تھا۔ اِس

"آپ کس کالج میں پڑھتے ہیں؟ میں روزانہ آپ کو ادھر سے گذرتے ہوئے دیکھتی ہوں۔"

"میں دفتر میں کام کرتا ہوں۔ امریکن دفتر میں" میں نے جواب دیا۔

"امریکن دفتر۔ امریکن بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ میری بہن کی لڑکی گذشتہ جنگ میں امریکن کیمپ میں ڈاکٹر تھی۔ بہت تعریف کرتی ہے اُن کی۔ اب اُس نے اپنی ڈسپنسری کھول لی ہے اور عورتوں اور بچوں کا علاج کرتی ہے" اُس نے سامنے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں چالیس برس کی گندمی رنگت کی لیڈی ڈاکٹر مریض عورتوں کے مجمع میں بیٹھی ہوئی تھی۔ چائے رکھکر رومیلا بھی ہمارے پاس آ بیٹھی۔ میں اب تک زیادہ تر خاموش ہی رہا تھا اس لئے محض کلام جاری رکھنے کی غرض سے کہا۔ "رومیلا آپ کی لڑکی ہے؟ یہ کہاں پڑھتی ہیں" اِس پر ایک دوشیزہ کی طرح سُرخ ہو گیا اور جھریوں کے نشیب میں پسینوں کی ننھی ننھی ندیاں بہنے لگیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اُس کا رنگ زرد پڑنے لگا اور چند لمحوں میں وہ یرقان کے مریض کی طرح بالکل پیلی پڑ گئی۔ مجھے اپنے سوال پر افسوس ہونے لگا۔ اُس نے غالباً میری اس کیفیت کو محسوس کیا۔ "چائے پیجئے ٹھنڈی ہو رہی ہے"۔ چائے پیتے ہوئے میں نے موضوع گفتگو بدلنے کی کوشش کی۔ "ڈسپنسری تو اچھی چل رہی ہوگی۔ مریض تو کافی ہیں"

"اچھی ہی سمجھئے" اُس نے جواب دیا "اور ہاں رومیلا میری نہیں مسز میناولی کی لڑکی ہے۔ سینئر کیمبرج پاس کر چکی ہے اور اب اُس کی شادی ہونے والی ہے"۔ ہلکا سا رنگ اُس کے چہرے پر نمودار ہوا۔ "بڑی چنچل ہے۔ ماں سے ہمیشہ ضد اور جھگڑے کیا کرتی ہے اور میں خود بھی تو میناولی اُس سے تنگ تنگ رہتی ہے"۔ "آپ بنگالی نہیں ہیں؟ کس صوبے سے آئے ہیں" اور جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ میں کلکتہ میں بہت عرصہ تک رہ چکا ہوں تو وہ ایسی خوش ہوئی جیسے اُس کو کوئی ہم وطن مل گیا ہو۔ پہلی مرتبہ میں نے اُس کو ایک انسانی روپ میں دیکھا۔ کہنے لگی "بہت اچھا شہر ہے کلکتہ۔ میں بھی وہاں رہ چکی ہوں۔ آج سے کوئی چھتیس چالیس برس پہلے" ماضی کی یاد سے اُس کی آواز اور نرم ہو گئی تھی۔ "اور اب تو سنتی ہوں وہ شہر اور بھی بڑا ہو گیا ہے"۔ شاید خیالات کی [illegible] سے اُس کی پلکیں جھپک رہی تھیں۔ مجھے غور سے اُس کا چہرہ دیکھنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی عمر سے زیادہ نظر آتی ہے۔ وہ خاموش ہو گئی تو میں بھی [illegible] کے رخصت ہو گیا۔

اب تو یہ معمول ہو گیا تھا کہ دفتر جاتے ہوئے وہ چار منٹ اُس کی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر اُس سے باتیں کر لیتا تھا۔ وہ بڑی محبت سے باتیں کرتی اور کراچی کے متعلق عجیب و غریب قصے سُنایا کرتی۔ وہ کراچی جو اُس وقت بھی تھی جب شہر میں کچی سڑکیں تھیں اور جب شہر اِس وقت کے وقوع سے تقریباً ایک میل اور شمال مغرب کی طرف ہٹا ہوا تھا۔ کہتی تھی زیادہ تر معمولی مکانات تھے لوگ سرِشام ہی سے اپنے گھروں میں بند ہو جایا کرتے تھے کیونکہ زبردست انگریزی راج کے باوجود بھی لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ اسے پینتالیس سال پہلے کا زلزلہ یاد تھا جس کی وجہ سے کیماڑی اور منوڑہ کے درمیانی سمندر کی وسعت بہت کم ہو گئی تھی۔ بہت بڑا زلزلہ تھا اور اُس کے ساتھ ساتھ ایک خوفناک طوفان جس نے شہر کی آبادی کا نصف حصّہ برباد کر دیا۔ ان قصوں کے بعد وہ مجھ سے کلکتہ کے حالات سُنانے کی فرمائش کرتی اور حالانکہ اس عظیم الشان شہر کی وسعتیں اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ اُس کے ذہن کے چوکھٹے میں سمانے سے مجبور تھیں وہ پھر بھی اُن سے بہت مانوس معلوم ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ میں دفتر سے پانچ بجے لوٹا تو دروازے پر اُس کی کرسی خالی نظر آئی۔ مجھے کچھ استعجاب سا ہوا۔ دریافت کرنے پر مسز میناولی نے بتایا کہ وہ بیمار تھی۔ تھوڑی دیر عیادت کی غرض سے میں اُس کے پاس بیٹھا اور پھر اُٹھ کر میناولی کے پاس چلا آیا۔ میناولی نے اُس روز مجھے اُسکے متعلق بہت سی باتیں بتائیں۔ اُس کا نام گل جانی تھا اور وہ میناولی کی خالہ تھی۔ لیکن میں اس سے زیادہ جاننا چاہتا تھا۔ وہ کون سی الم آمیز کیفیات اِس نحیف و نزار ڈھانچہ کے پس منظر میں تھیں جس نے اُس کو ابوالہول بننے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ ملک کی ہجوم نما ویرانی کو گھورتی رہتی تھی۔ "یہ ایک بہت سنگین داستان ہے اختر صاحب" میناولی آہ بھرتے ہوئے بولی "میری خالہ گل جانی کی شادی اب سے چالیس سال پہلے یہیں ہوئی تھی۔ میری پیدائش سے ایک سال قبل۔ میں نے سنا ہے وہ شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ یہاں سے کلکتہ چلی گئی تھی۔ اُسے اپنے شوہر کے ساتھ بے انتہا محبت تھی" میناولی نے فریم کی ہوئی ایک بڑی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کے چاروں طرف تازہ پھولوں کا ہار لٹکا تھا۔ "شادی کے تیسرے ہی مہینہ اُس کا شوہر جنوبی افریقہ چند تاجروں کے ساتھ چلا گیا تھا۔ چند مہینوں تک اُس کے خطوط وہاں سے آتے رہے لیکن اس کے بعد یکایک اُس نے خاموشی اختیار کر لی۔ میری ماں کو افریقہ سے آنے والے چند مسافروں سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ کسی سے ایک انگریزی جہاز کے ساتھ [illegible] چلا گیا تھا۔

بے پناہ مسرت نے اُس کی خاموشی اور افسردہ فطرت کو استغنائی کے بجائے ایک دلیرانہ آمریت میں تبدیل کر دیا تھا وہ ہر کام میں دخل دے رہی تھی اور ہر موقعہ پر اپنی پسند اور تجویز کو حرفِ آخر کی طرح منوانا چاہتی تھی۔ گملوں کی سجاوٹ سے لیکر شادی کے کپڑوں کے انتخاب، ہر چیز میں اُس کو اپنی بات رکھنے کی ضد تھی۔ دعوت کے لئے کھانوں کا انتخاب ہو تو اُسی کی پسند سے اور مہمانوں کی فہرست تیار ہو تو اُسی کی مرضی سے شروع شروع میں تو مینا ولی نے مختلف باتوں میں اختلافِ رائے کا اظہار کیا۔ لیکن جب گل جانی کی خود ساختہ آمریت کے آگے ایک نہ چلی تو وہ بھی احتجاجاً خاموش ہو گئی۔ اور آخر میں تو اُس نے اپنی رائے کا اظہار بھی چھوڑ دیا۔

شادی کا دن آ پہنچا۔ مہمانوں سے سارا گھر بھر گیا۔ عورتوں کے زرق برق کپڑے صحن میں جب جنبش کرتے نظر آتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ قوسِ قزح بکھر گئی ہے۔ صبح کو شادی کی رسومات انجام پائیں رات کو مہمانوں کی دعوت تھی۔ میں وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گیا۔ لیکن گل جانی وہاں موجود نہ تھی۔ مینا ولی سے میں نے اُس کے متعلق پوچھا تو جھنجھلا کر بولی۔ "وہ تو پاگل ہے کہاں تو ہر کام میں آگے آگے تھی اور کہاں حال یہ ہے کہ کمرہ میں اکیلی چپ چاپ بیٹھی ہے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ میں نے گلوکوز کا انجکشن دینا چاہا تاکہ اُس کی اعصابی تکان جاتی رہے تو اس کے لئے بھی تیار نہیں ہوئی۔ وہ کونے والے کمرے میں ہے۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مجھے مینا ولی کی باتوں کا کچھ ایسا یقین نہ آیا۔ میں نے خیال کیا کہ یہ عین فطری ردِعمل ہے کہ ردمیلا کی شادی سے گل جانی کو بھولی ہوئی منزل یاد آ رہی ہو۔ مسرت سینے میں پیوست ہو کر اکثر کسک بن جاتی ہے۔ اس کی جوانی کی تشنہ لبی کی انتہا نہیں۔ محبت کے دریا اوس کے مانند اسکے ہونٹوں تک آتے آتے خشک ہوتے گئے۔ اس یاس کی بھی کوئی حد ہے لیکن جب میں اُس کمرہ میں گیا اس کی صورت دیکھکر تمام جمالیاتی نظریے منتشر ہوتے ہوئے نظر آئے۔ وہ کرسی پر اپنے روزمرہ کے لباس میں بیٹھی فضا کو طلسماتی نظروں سے گھور رہی تھی اُس کا چہرہ مردہ کی طرح سفید ہو رہا تھا اس کے تاثرات اندر کیسے ہو گئے تھے جیسے اعصاب کے تمام رگ سے گئے تھے۔ اُس کی شخصیت کا مجموعی اثر مافوق الفطری معلوم ہو رہا تھا۔ بھوت جیسا ڈراؤنا — میں اُس کے قریب بھی گیا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اس کا چہرہ بالکل جذبات سے بے بہرہ اور سپاٹ تھا۔ میں نے دو چار باتیں کیں اور اُن سب کے جواب میں آخیر میں وہ صرف ایک بار مسکرا دی — ایسی مسکراہٹ جو کہ حسن کے لبوں پر زندگی کے آخری لمحہ میں کھیلی تھی۔ میرے جسم میں ایک کپکپی سی سما گئی۔ جیسے سحر زدہ کھنڈر رات سے گذرتے وقت ہوتی ہے۔ میں گھبرا کر کمرہ سے باہر آ گیا۔ وقتِ مقررہ پر مہمان آئے اور دعوت کے بعد گھروں کو چلے گئے۔

ردمیلا کی شادی کی صبح کو جب میں دفتر جانے لگا تو گل جانی کی کرسی خالی نظر آئی۔ طرح طرح کے شبہات دل میں پیدا ہونے لگے کیونکہ بغیر کسی حادثہ کے اس کی اپنی زندگی کے معمول میں خلاف ہونا ناممکن تھا۔ شام کو دفتر سے لوٹا تو اُسی کرسی پر ایک [illegible] بنارسی ساڑھی میں ملبوس عورت صحن میں کھیلتے ہوئے بچوں کو بڑے اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ یہ غالباً ردمیلا ہی میں نے دور سے خیال کیا۔ قریب پہنچا تو میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ تھی کیونکہ وہ تو گل جانی تھی۔ مجھے دیکھکر وہ ایک شرمیلی ادا سے اٹھی اور گھر کے اندر چلی گئی۔

غزل

محمد شریف اللہ ٹونکی

اپنے دل کو وہ دل بناتا ہے / جو مصیبت میں مسکراتا ہے

راز یہ کھل گیا مصیبت میں / کون؟ کس وقت کام آتا ہے

اشک آنکھوں میں مسکراتے ہیں / جب خیالِ مسرت آتا ہے

پردۂ غم میں خوش نصیبوں کو / درحقیقت وہ آزماتا ہے

رازِ الفت وہ راز ہے کہ جسے / فطرتاً آدمی چھپاتا ہے

آخری سانس جب ہوں لب پہ / پھول اُس وقت مسکراتا ہے

اُن کا عہدِ کرم جدائی میں / دفعتاً یاد آ ہی جاتا ہے

آدمی وہ ہے جو کہ دنیا میں / وقت سے فائدہ اٹھاتا ہے

اُف یہ تابانیٔ جمالِ دوست

دیکھکر بدر منہ چھپاتا ہے

سید حمید الدین احمد رعنا

بہار اور مجسم بہار کیا کہنا!

بہار کے موسم میں نازک کلیاں چٹک کر پھول بنتی ہیں ... سے لدی ہوئی بادِ بہاری دماغوں کو معطر کرتی ہے، بھنورا ... رس چوسنے کے لئے "بے چین ہو جاتا ہے۔ پپیہے کی ... کی کوک ہر طرف بہار ہی بہار کا اعلان کر دیتی ہیں۔ ... جب بحرِ زندگی میں جوانی کی موج اُبھر اُبھر کر شباب ... کا اعلان کرتی ہے۔ عارضی گلگوں مئے محبت کے جام ... ۔ حسین جذبات کی بجلیاں نوجوانوں کے خرمنِ ہوش پر گرنے لگتی ہیں۔ ہر طرف سے نوشی کے دعوت نامے نوجوان کو مست بھنورے کی طرح کسی کلی کا رس چوسنے کے لئے بے چین کر دیتے ہیں۔ اس بے چینی کو رفع کرنے کے لئے معاشرہ نے شادی کی رسم کو رائج کیا ہے۔ شادی کا ابتدائی مقصد اس بے چینی کو صحیح طور پر پورا کر دیتا ہے لیکن انتہائی مقصد کنبہ داری کی مرکزیت اور قوم کا بہترین اخلاقی کردار مرتب کرتا ہے اسی شادی کے پردہ میں اقوام کی قسمتیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اس لئے شادی کے مسئلہ کو شباب اور اس کی رنگینی کی حد تک محدود کر دینا سخت کوتاہ اندیشی ہے۔

نوجوان کچھ ناتجربہ کاری کے باعث اور زیادہ جنسی بھوک کے تقاضوں کی بنا پر اگر حسنِ جوانی کے گلدستہ کو حسنِ کامل تصور کرے تو والدین اور جہاندیدہ تجربہ کار اعزہ اس کی جائز اور صحیح رہبری کریں۔ شباب دراصل "سرابِ حسن ہے" خود حسن نہیں۔ جس طرح سورج کی کرنیں اپنے شباب کے ساتھ ریگستانی علاقہ کو پیاسے انسان کی نظروں میں ایک سمندر بنا کر دکھا دیتی ہیں اسی طرح مست جوانی کے متوالے کو شباب کی رنگینی حسن نظر آتی ہے وہ بجائے اس حسن پر فریفتہ ہونے کے جو شادی کے انتہائی مقاصد کی تکمیل ... جوانی کی عارضی بہار کا فریفتہ ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جوانی کی عارضی بہار کے گھٹنے کے ساتھ ہی ساتھ نوجوانوں کی فریفتگی گھٹنے لگتی ہے۔ اور باقی زندگی میں جہاں کنبہ داری کے فرائض اولاد کی پرورش کسبِ معاش کی کشاکش اعزہ کے حقوق کی ادائیگی وغیرہ کا مظاہرہ ہوتی ہیں رواداری یا جبر کے سہارے "میاں اور بیوی" کا رشتہ قائم رکھا جاتا ہے۔ غلطیاں، رنجشیں اور ناخوش گواریاں خزاں بن کر اس سرابِ حسن کی بہار لوٹ لیتے ہیں۔ بعض اوقات ناچاقی کی بجلی سرے سے اس رشتہ کو جلا کر ہی رکھ دیتی ہے۔

چونکہ ہماری مشرقی تہذیب کنبہ داری کی مرکزیت اب بھی تسلیم کرتی ہے اور تسلیم ہی نہیں بلکہ انتہائی اہمیت بھی دیتی ہے اس لئے مشرقی نوجوان کی "شادی" کو جس قدر اہم مسئلہ سمجھ کر حل کیا جائے کم ہے۔ اگر شروع ہی سے "شباب" اور "حسن" کے فرق کو محسوس کر لیا جائے تو سائیکولوجی کے ماہرین کا یہ عقیدہ ہے کہ اس اہم فریضہ کی بہت سی گتھیاں خود بخود سلجھ کر رہ جاتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ حسن اور شباب میں چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن دراصل دونوں اپنی حیثیت میں علیحدہ علیحدہ حقیقتیں ہیں۔ شباب جوانی کی عارضی بہار ہے اور حسن ایک مستقل برکت ہے۔ خمار آلود نرگسی آنکھوں کی مستی، نازک ہونٹوں کی دیدہ زیب سرخی غرض جوشِ جوانی کا ہر ابھار وقتی ہوا کرتا ہے۔ حسن تو ان غزالی آنکھوں اور گلابی رخساروں کا صرف یہ تعلق ہے کہ یہ حسن کا قالب ہیں۔ حسن شباب کا روحِ رواں ہے اور شباب حسن کا قالب۔ حسن بلا لحاظ عمر اور وضع قطع کے ہر متنفس میں پایا جا سکتا ہے۔ حسن واقعی کا اظہار چہرہ سے کم ہوتا ہے اور عمل سے زیادہ۔ اس حسن کی عدم موجودگی میں ایک حسین عورت عیاشی کا ایک "کھلونا" ہوتی ہے اور مرد اوباشی کا ایک نمونہ۔ حسنِ صورت لاکھ دل پسند سہی حسنِ سیرت و اخلاق کے عدم میں ہیچ ہے۔ "کیا بری چیز اچھی صورت ہے"

"حسن" درحقیقت انسان کی شکل میں نہیں بلکہ عمل میں ہوتا ہے

بجا طور پر عورت کہا جاتا ہے۔ اس حسن کے نوک و پلک اچھے اخلاق نیک نیتی اور سچائی میں مضمر ہیں۔ استقلال، سادگی و خوش طبعی اس کا زیور ہیں اور پاکدامنی اس کی روحِ رواں۔ جس شباب میں یہ حسن نہیں وہ بازاری حسن ہو تو ہو حسن واقعی نہیں ہوتا۔ البتہ اگر اس حسن کے ساتھ ہی قدرت حسین صورت بھی بنا دے۔ تو اب ضرور "حسن مکمل" کا نمونہ ہے۔

حسن کردار کے لئے کوئی ایک جنس مخصوص نہیں، عورت اور مرد دونوں اس حسن کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں البتہ "عورت" جس سکون و اطمینان کا منبع ہے، جن لطافتوں کا مرجع ہے اور جن نزاکتوں کا مرکز ہے وہ یہاں سے باہر نہیں محسوس کی جا سکتی ہیں اسی لئے جب اس کے ظاہری حسن اور شباب میں یہ حسین کردار جلوہ فرما ہوتا ہے اس کے استانہ پر صدہا فرہاد اور ہزارہا قیس بجا طور پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا کرتے ہیں جوانی کے امنڈتے ہوئے جوش کو تھام کر نوجوان کا فریضہ اس "حسن مکمل" کی تلاش ہے۔ اس لئے اس حسن کا حصول اس دولت کا پا لینا ہے جو دل و دماغ کو ابدی راحت دے سکتی ہے جو زندگی میں "سکون" پیدا کر سکتی ہے اور جو دنیا کو رشک [illegible] بنا سکتی ہے۔

جس طرح نوجوان مرد کی نظرِ انتخاب حسن کردار کے بجائے حسن ظاہری پر جم کر رہ جاتی ہے اور بعد میں جوانی کے جوش کے گھٹنے پر اپنے انتخاب کی خامی پر پچھتانا پڑتا ہے۔ اسی طرح نوجوان دوشیزہ کو بھی دھوکہ ہوتا ہے۔ اور یہ دھوکہ مرد کے مقابلہ میں زیادہ تکلیف دہ اور رنج کا سبب ہوتا ہے خصوصاً اس لئے کہ اُسے ایک ہی کا ہو کر رہنا ہوتا ہے اس کی توقعات ایک ہی مرد سے متعلق ہوتی ہیں اس کی خصوصی تمناؤں کو وہ اس ایک ذات سے ہٹا کر دوسری طرف ہرگز رجوع نہیں کرتی اس لئے کہ یہ وہ جرم جس کا بدل نہیں اگرچہ یہی عصمت مرد کی بھی ہے لیکن جیسا کہ میں اس سے پہلے کہیں بیان کر چکا ہوں مرد کو سوسائٹی نے عیش کی بے جا لیکن ذہنی رعایات دے رکھی ہیں۔

دوشیزہ کی تمناؤں کا خون ہونے سے بچانے کے لئے قدرت نے پورا پورا لحاظ رکھا ہے مذہب اسلام نے خصوصاً اس معاملہ میں اُسے حق دیا ہے کہ باوجود اس کے کہ شادی اپنے تمام ابتدائی منازل کر لے کر چکی ہے۔ دوشیزہ کو اختیار ہے کہ وہ اپنے نفس کا اختیار چاہے تو دے اور چاہے نہ دے۔ "اُسے اپنی قسمت کا [illegible] کرنے کا حق حاصل ہے ان حقوق پر والدین کا بے جا فیصلہ صریح ظلم ہے جس کا احساس بھی تکلیف دہ ہے۔ جو والدین دوشیزہ کو آزادانہ اپنی رائے پیش کرنے کا موقع نہیں دیتے یا ایسے مواقع کو عیب سمجھتے ہیں وہ ایک ایسے بیوپاری کے مانند ہیں۔ جو اپنی ضرورت کے رفع کرنے کی خاطر اپنی پالی ہوئی گائے کو ایک قصائی کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے

دوشیزہ کے انتخاب کا نظریہ نوجوان مرد کے معیار سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے حسین دربار میں حسن کی کمی نہیں اُسے حسن کا پرستار درکار ہوگا ہے۔ عورت قدرت کے الطاف اور فیاضی کا وہ سربستہ راز ہے جس کو سمجھنا نہایت مشکل ہے۔ اور نہ ہی یہاں اس سے متعلق کوئی تفصیل دینا مقصود بلکہ "عورت نمبر" میں کوشش کی جائے گی اس وقت اس کے نظریہ سے بحث ہے۔ اُس نظریہ سے جس کے ماتحت وہ کسی نوجوان کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دے لیتی ہے اور بعض میں جبکہ بن کر اس کی توقعات کے برعکس اُسے ایک اجیرن زندگی گزارنا پڑتی ہے۔

دوشیزہ کو آئندہ زندگی میں ماں "بن کر" رہنا ہے اور سادہ [illegible] گوارا کرنا ہے حسن کا عشق [illegible] ہی مرد کو ایک امر محال نظر آتا ہے۔ اس [illegible] اُسے قدرتاً وہ شفیق طینت، ہمدرد طبیعت اور بے نیاز عادت مرحمت ہوتی ہے جو اپنی آپ نظیر ہے۔ اُسے حسن کی تلاش نہیں ہوتی بہت کم ایسے واقعات ہو سکتے ہیں۔ جہاں عورت نے مرد کا انتخاب اس کی اچھی صورت کی بنا پر کیا ہو بلکہ عمومی مثالیں اس قسم کی ملتی ہیں کہ حسین دوشیزہ [illegible] اللہ کے بندے" مرد کی بیوی بن کر خوش ہوتی ہے۔ خوبرو نوجوان اگر اپنے حسن کے زعم میں دوشیزہ کی شان بے نیازی کو ٹھیس دے دیں تو ان کی ناکامی یقینی ہے۔ چونکہ عورت بے نیازی اور محبت کا سرچشمہ ہے اس لئے وہ ایسے شخص کی متلاشی رہتی ہے جو اس کا نیاز مند ہو۔ جو اس کی محبت کا قدردان ہو اور اس کے "زعم" کا خواہاں۔

اس تفصیل کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ایک دوشیزہ کی نظرِ انتخاب ایسے نوجوان پر پڑتی ہے جس میں مردانہ خصائل کے ساتھ ہی ساتھ وہ نیازمندی بھی ہو جو دوشیزہ کی ناز برداری کی ضامن ہو گی اور یہی وہ مقام ہے جہاں دوشیزہ کو دھوکہ ہوا کرتا ہے۔ اس لئے کہ نوجوان جنسی بھوک کی سیرابی کا واحد ذریعہ اُسے سمجھتا ہے اس لئے بالعموم اس بھوک کو کم کرنے کی تمنائیں اس کو رجھانا چاہتا ہے۔ اپنی اس جنسی بے چینی کو وہ ایسی لاچاری اور مجبوری کا جامہ پہنا دیا کرتا ہے کہ دوشیزہ کی ناتجربہ کار نظریں ظاہری لباس کی نیازمندانہ وضع پر مرکوز ہو جاتی

ہیں۔ وہ اُسے قابلِ رحم تصور کر لیتی ہے اور جب ایک اُسے ہمدردی پیدا ہو جائے بہت مشکل سے جایا کرتی ہے عورت کی محبت بہت دیر میں شروع ہوتی ہے لیکن نہایت تیزی سے تمام منازل کو طے کر جاتی ہے دوسرے بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ عورت کا وہ قدم جو محبت کی راہ میں آگے بڑھ جائے واپس ہٹے۔ اس لئے بڑی ضرورت ہے کہ دوشیزہ اظہار نیاز مندی کو جانچے اور فیصلہ کرے کہ کہاں تک اس کی ہمدردیاں اس نوجوان کو واقعی درکار ہیں اور آیا وہ صرف جنسی کھیل" تو نہیں کھیلنا چاہتا اس کی جانچ کے لئے پیمو ہی ایک معیار ہے۔ یعنی حسین کردار کی تلاش اور اس تلاش میں والدین کی بے غرض مدد جس قدر ضروری ہے اور کہیں درکار نہیں۔ انہیں چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ صحیح کردار معلوم کرکے بغیر حاشیہ چڑھائے ہوئے دوشیزہ کی سہیلیوں یا ماں کے ذریعہ اس تک پہنچا دیں اور خود کی رائے صرف اس حد تک شریک رکھیں جو اُسے نوجوان کے کردار کا صحیح تصور قائم کرنے میں مددگار ثابت ہو۔

دنیا کا عجیب دستور ہے معشوق کو عاشق اور عاشق کو معشوق بنا کر دکھایا کرتی ہے۔ اس لئے کہ بظاہر ہر نوجوان مرد دوشیزہ کو "محبوبہ" قرار دے کر حاصل کرنا چاہتا ہے ناز برداری کے وعدے کیا کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ "محبوب" کے تمام حقوق اپنے لئے محفوظ کئے رہتا ہے۔ مری دوشیزہ بیوی بن کر اس کے ہر قسم کے آرام و آسائش کو فراہم کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے، غذا، لباس حتیٰ کہ سونے اور تفریح کرنے کے اسباب وہ فراہم کرتی ہے اور شوہر صاحب اس غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں کہ بیوی کے نازبردار ہیں اب تو وہ زمانہ نہیں کہ نوجوان اس خود فریبی کو دور نہ کریں۔ اور اگر واقعی یہ خود فریبی دور کرنا ہے اور ایسی شریکۂ حیات کی تلاش کرنا ہے جو ان کی راحتوں کا سامان فراہم کرے تو انہیں یہ چاہئے کہ وہ شروع ہی اس کو دھوکہ میں نہ ڈالے وہ اُسے شادی سے پہلے "تاروں کی دنیا" میں رکھنے کا وعدہ نہ کریں بلکہ اپنے واقعی حالات اور عادات سے واقف کرا دیں تاکہ پہلے ہی سے دوشیزہ یہ سمجھ لے کہ اُسے کیا فرائض انجام دینا ہیں۔ یہ یاد رہے کہ عورت کا عزم اور استقلال ایسا نہیں جو آسانی ڈگمگا جائے اس کا فیصلہ اگر آپ کے حق میں ہو جاتا ہے تو وہ اٹل ہے۔ عورت کا مرد کے ساتھ (Satti) "ستی" ہونا ایک ہم جیسی دلیل خود کی جس کی رُو سے عورت اپنے مردہ خاوند کے ساتھ زندہ جل جایا کرتی تھی) ہو جاتا اس کی کھلی ہوئی مثال ہے اس لئے کیا

چاہو کہ جوانی کی بہاریں حسن کی جادوگری ... ہم آغوش ہو جائیں ...

اچھی مملکت کیلئے طبیب اور قانون دان کی ضرورت نہیں افلاطون

قانون کے پابند توانا جسم اور اچھے دل و دماغ والے شہریوں کے بنانے کے لئے ضروری ہے کہ حکومت سب سے پہلے ان کو انسان کے ذہن کے سمجھنے کا سبق دے اور یہ سائیکولوجی کے بغیر ناممکن ہے!

حضرت
[illegible]

"ایک نا تمام افسانہ"

خیال ہے کہ اگر قید و بند، زندگی کے لئے مضر رساں ہے ۔ تفکرات اگر باعثِ اذیتِ حیات ہیں۔ اگر زیست میں ترددات کے نہ ہونے سے اوقات مسرّت و انبساط کے ساتھ گذریں تو ایسی جنّت آئندہ کی امیدِ موہوم فردوس سے کہیں زیادہ بہتر ہے اور یہ صرف عورت کی دنیا سے الگ رہنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے ...... میں اسی پر کاربند عمل ہوا اور اپنے ہر روز کے چوبیس گھنٹوں کو مختلف مشاغل میں اس طرح تقسیم کر دیا کہ کسی لمحہ، کسی ثانیہ دماغ کو تنہائی کی کوفت محسوس کرنے کا موقع نہ ملنے پائے ۔ اِس طرح دراصل میرے مستقبل کا ہر دن زیادہ مسرّت، انتہائی کیف و سرور کے ساتھ گذر جاتا تھا ۔ تمام کام اپنے دستور العمل کے مشاغل کے علاوہ کسی دوسری باتوں پر غور و فکر کا موقع حاصل نہ تھا ۔ میری زندگی اور اس کے تمام لمحات انتہائی اطمینان بخش اور بے حد سکون پرور تھے ـــــ نہ میں کبھی گھبراتا تھا اور نہ بے چینیاں و بے قراریاں میری خوشیوں کی راہ میں حائل ہوتی تھیں چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک گھنٹہ میں نے لوگوں سے ملاقات کے لئے مقرر کیا تھا جو یقیناً میرے ملنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے بہت کم وقت تھا لیکن میں اس نظریہ کا قائل تھا کہ مشاغل کی زیادتی اور وقت کا کم ہونا ہی کسی دوسرے مسئلہ پر نہ سوچنے کا واحد ذریعہ ہے ۔ ہر روز اس مقرر کردہ ایک گھنٹہ میں مختلف احباب اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر جایا کرتے تھے بعض لوگ اپنے دُکھ درد کو رو جاتے اور بعض اپنی مسرتوں اور شادمانیوں کا ترانہ گا جاتے ۔ اِس پر میرے اظہاراتِ افسوس و ہمدردی یا اظہاراتِ مسرّت و شادمانی بھی محدود ہی طور پر ہوا کرتے اور بعد کو میرے دماغ میں لوگوں کے قصّہ درد یا قصّۂ شادمانی کا کوئی نقش قائم نہ رہتا کیونکہ دستور العمل کے [illegible] مشاغل میں ماضی کی ہر یاد گم ہو کر رہ جاتی تھی ـــــ لیکن

قدرت مسکرا کر دیکھتی رہی اور کہتی رہی ـــــ

ـــــ "کہ مٹی کے پتلے ۔ تو کیا ؟ تیری ہستی کیا اور تیرا عزم و ارادہ کیا ؟ " ـــــ فطرت کی مسکراہٹ میں نمایاں تھی اور یہ مخفی اپنا رنگ دکھا کر رہی تھی جس کا پہلے کبھی احساس نہ ہوسکا ۔

سچ ہے اگر انسان اتنا بالغ نظر و دُور رس ہو جائے کہ اس کے مستقبل کے صعود و ہبوط، اس کے تخمینہ یا پیشین گوئی کے ہم آہنگ ہو جایا کریں تو انسان حادثاتِ زمانہ کو کبھی پہچان ہی نہ سکے اور جان ہی نہ سکے کہ دنیا میں انسان، انسان بنتا ہی ہے صرف دُکھ درد سے دوچار ہونے کے بعد، اس کے قبل انسان کی حیثیت "آدمی" سے زیادہ نہیں ہوتی ہے ۔

میں اپنے دستور العمل کے مطابق شام کو ایک گھنٹہ اپنے ایک ساتھی انور کے ساتھ ٹہلنے بھی جایا کرتا تھا اور اس ٹہلنے کے دوران، ہم دونوں کسی نہ کسی مسئلہ پر دماغ سوزی کی حد تک بحث کرتے اور کچھ اس قسم کے مباحث ہوا کرتے کہ واپسی تک متفقہ طور پر، ہم لوگ اِس مسئلہ کا نکال لیتے، اِس سے ہم لوگ دماغی سکون بھی حاصل کرتے اور اپنے اپنے معلومات میں اضافہ بھی مقصود تھا ۔ یہ سلسلہ عرصہ سے جاری تھا اور نہ معلوم کب تک جاری رہتا ـــــ لیکن اربابِ حل و عقد کی مسکراہٹ کی مخفی اپنا رنگ لائی ۔ خوشی نے غم کا روپ بدلا، مسرت و انبساط نے حسرت و یاس کی شکل اختیار کی، ہر محل گر گیا، دن بدل گئے، قسمت بدل گئی اور ہر وہ چیز بدل گئی جس کے بدلنے کا امکان تھا نہ کوئی وہم و گمان ـــــ حادثہ کی وہ مخصوص شام میں کبھی نہ بھول سکوں گا ۔ تا زیست اور حیات بعد الموت (اگر حیات بعد الموت کی کوئی حقیقت ہے جیسا کہ [illegible] اور

گیتی نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے) جبکہ ایک جھٹکے نے زلزلہ کی طرح میری زندگی کی دیواروں کو شق کر دیا۔ بنیاد تک ہلا ڈالی۔ وہ شام جب کہ ہم دونوں ٹہلنے جا رہے تھے اور اس دن کا موضوعِ بحث "عورت اور محبت" تھا دلیلیں ہم دونوں بہت ٹھوس اور مدلل پیش کر رہے تھے، نصف سے زیادہ راستہ طے ہو چکا تھا لیکن بحث کا وہ ساحل جہاں ہم دونوں اکثر مل جایا کرتے تھے ہنوز دور تھا . . . یکایک ہماری نظریں ایک صاحبہ پر جا پڑیں جو ہماری ہی طرف آ رہی تھیں۔ انور نے بلا امتیاز نیک و بد اُسے بڑھ کر روک لیا اور اپنا موضوعِ بحث ان سے بتا کر جواب طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ میں کچھ عجیب شش و پنج اور کشمکش کے عالم میں، نتیجے سے بے خبر کھڑا تھا۔ پہلے تو محترمہ نے انور کو غور اوپر سے نیچے تک دیکھا بعد ازاں ذرہ سخت لہجہ میں ہمکلام ہو کر نفرت آمیز نگاہیں ڈالتی ہوئی چلی گئیں۔ میں نے انور کو اُس کی اس حماقت پر جھلانے لگا کہ تمہیں ہرگز یہ مناسب نہ تھا۔ تا وقتیکہ تمہاری شناسائی پہلے سے نہ ہوتی . . . لیکن انور بالکل بے حس و حرکت ایک ... کے عالم میں کھڑا سنتا رہا۔ اور خود ہی کچھ برافروختہ ہو کر بولا "اس توہین کا انتقام لے کر رہوں گا۔"

دوسرے دن انور کا میں نے حسبِ معمول انتظار کیا اور جب وہ نہ آیا تو میں تنہا ہی ٹہلنے نکل پڑا۔ شام کا ٹہلنا میری زندگی میں ایک لطیف تفریح کا باعث تھا۔ لیکن اس دن کا ٹہلنا ایک بار سا محسوس ہوا۔ مختلف قسم کے خیالات کا الجھاؤ یکے بعد دیگرے دل و دماغ کے لئے سوہانِ روح بن کر آنے لگے۔ مجھے اوّل اوّل پپیہے کی دلدوز و پُرسوز صدا نے اُسی دن اپنی طرف متوجہ کیا۔ کوئل کی کوک سے میں اُسی دن آشنا ہوا۔ میری جوانی کسی کے شباب کے لئے اُسی دن تڑپی، تنہائی کی کوفت اور اس کے تاریک ... غار میں خود کو میں نے پہلے پہل اُسی شام محسوس کیا۔ بالآخر میں گھر لوٹ آیا اُس کے بعد میں دوبارہ ٹہلنے نہ گیا۔ لیکن اب وہ وقت چونکہ خالی گذرتا تھا۔ اس لئے دماغی توانائی نے رگوں میں اینٹھن اور تشنج پیدا کرنا شروع کر دیا۔ اس دن سے میں اپنی ہستی میں کسی کی کمی محسوس کرنے لگا۔

کچھ عرصہ بعد یکایک ایک دن انور کی شادی کا رقعہ شادی آیا بڑی حیرت ہوئی مگر اس سے زیادہ تعجب اُس وقت ہوا جب

سالک ہاشمی

"یہ زندگی"

کیا یہ حیات مضحکۂ زندگی نہیں؟ | جس کا نظام درخورِ تابندگی نہیں
جس میں ازل سے تا بہ ابد غم کی زحمتیں | جس میں نہ راحتیں نہ تسلّی نہ رحمتیں
جس میں غذا کے مول میں بکتی ہیں عصمتیں | قرباں گہِ حیات پہ چڑھتی ہیں عفّتیں
جس میں لباسِ ہر مہ و کہتر ہے تار تار | جس میں نفس نفس نظر آتا ہے سوگوار
جس میں نظر نظر میں شررِ شکِ الم کا نم | جس میں کرم کی آڑ میں ہوتے رہے ستم
جس میں نہیں ہے مذہبِ انسانیت ہنوز | جس کے ہر ایک ساز میں غلطاں ہے دل کا سوز
جس کی زمیں پہ فصلِ فسادات کی بہار | جس میں تمیزِ طبقہ و ملّت ہے بے شمار
جس میں ہر اک حسین ہے مجبورِ معصیت | جس میں قدم قدم پہ ہے دستورِ معصیت
جس میں وفا کے نام کی اُڑتی ہیں دھجیاں | جس میں ہم خودی پہ زمانے کی پھبتیاں!
آسودۂ اُمید و یقیں زندگی نہیں | یعنی مسرتوں کی امیں زندگی نہیں
اے دوست یہ حیات کی رفتارِ اضطراب | لا کر رہے گی دہر میں اک روز انقلاب

محوِ تلاشِ شورشِ طوفاں ہے زندگی
یعنی حریفِ گردشِ دوراں ہے زندگی

انور سے شادی کے بعد مسز انور اور اُن کی چند سہیلیوں سے میرا تعارف کرایا۔ کیونکہ مسز انور وہی تھیں جو اس مخصوص شام کو نظرِ تحقیر ڈالتی ہوئی چلی گئی تھیں اور در اصل جو میرے دستور العمل میں داخل ہو کر میری زندگی کو سوگوار بنانے کی باعث ہوئیں ——— ' مسز انور "مسیح کے سایۂ ابرِ رحمت" میں پرورش پانے والوں میں سے تھیں شائد اسی بنا پر اُنہیں انور کے لئے مسیحا بننے میں اعتراض نہ ہوا وہ ایک مقامی اسکول کی معلّمہ تھیں۔ اُن کی ایک ہم پیشہ مس منور ما بھی شادی میں شریک ہوئی تھیں۔ اُن کی سیماب صفتی مجھے بار بار اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اُن کی گفتگو کا طرز، رہ رہ کر سر کو خم کر دینا گاہے گاہے کرسی پر اچک پڑنا غرض اُن کی ہر جنبش تیر بن کر میرے دل میں پیوست ہو رہی تھی ——— ' میں فطرتاً سخت سے سخت اور دشوار ترین مسئلہ کا حل منٹوں میں نکال لیا کرتا تھا لیکن اپنے اس خط کا حل آج تک نہ نکال سکا جو میں نے انور کی شادی کے چند ماہ بعد منور ما کو لکھا تھا۔ خط لکھکر ملازم کو میں نے ہدایت کی کہ مس منور ما کو جا کر دے آئے۔ ملازم کے چلے جانے کے بعد میں اس غور و فکر میں کھو گیا کہ "میں نے اچھا کیا یا بُرا، مجھے ایسا کرنا چاہیئے تھا یا نہیں" کئی بار دماغ میں یہی خیال آیا۔ اور پھر کسی فوری جذبہ کے ماتحت ایک دوسرے آدمی کو بھیج کر ملازم کو معہ خط کے واپس بُلا لیا خط کو دوبارہ پڑھا اور پھر چاک کر کے پھینک دیا اور سوچنے لگا "میں نے اچھا کیا یا بُرا، مجھے ایسا کرنا چاہیئے تھا یا نہیں" . . . یہی سوچتے ہوئے کئی سال گذر گئے لیکن اب تک کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ خط یہ تھا ـــ

محترمہ۔ "فرض شناس" کا دوسرا نام دوست ہے لیکن بعض ادیبوں نے اس کی سخت مخالفت کی ہے اور دوستی کا دوسرا نام "مکر و فریب" رکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح راستے پر ہیں۔ کیونکہ نتیجۂ افکار کی ذمہ داریاں، ذاتی مشاہداتِ زندگی پر عائد ہوتی ہیں۔ یہی دُنیا جنّتِ ارضی بن کر کسی کے قدم چومتی ہے اور کسی کے لئے دوزخ کی خزاں سے بھی بدتر ہو رہی ہوتی ہے۔ ایک ہی تصویر کے دو متضاد رُخ کی اہم ذمہ داریاں انسان کے ماحولِ زندگی اور واقعات و فضا پر منحصر ہیں۔ مجھے ایک شعر یاد آگیا ـــ

"پھولوں کی ذرا روش تو دیکھو
کانٹوں سے نباہ کر لیا ہے"

محترمہ۔ جرأت کر کے اگر یہ کہوں تو کوئی مضائقہ تو نہ ہوگا، کہ "آپ ایک پھول ہیں" اور "میں ایک کانٹا" ؟ ـــ !!

اے یادِ وطن اَب تنگ نہ کر جب ہمنے وطن کو چھوڑ دیا

جب بیخودی و بے ہوشی میں مجنوں نے وطن کو چھوڑ دیا
تھا رازِ نہاں عریانی میں، پنہائی تن کو چھوڑ دیا

کہتی گئی وہ چلتے چلتے جب رُوح نے تن کو چھوڑ دیا
ہر قید سے ہم آزاد ہوئے جب دارِ محن کو چھوڑ دیا

بے تاب و تواں بے بس پاکے صیاد نے اور ستم توڑے
بے بال و پری میں ظالم نے مرغانِ چمن کو چھوڑ دیا

کس چین سے اب جیتی ہے بسر غربت ہی وطن سے بہتر
اے یادِ وطن اب تنگ نہ کر جب ہمنے وطن کو چھوڑ دیا

جب موسمِ گل نے کوچ کیا، گلشن کو خزاں نے لوٹ لیا
ہر نخل ہوئے بے برگ و نوا، بلبل نے چمن کو چھوڑ دیا

کیوں تیشہ سے سر اپنا پھوڑا، کیوں کوہ کنی سے منہ موڑا
فرہاد نے عہد اپنا توڑا، عاشق نے چلن کو چھوڑ دیا

ہے وقت کا یار جسے دیکھو، منہ دیکھی الفت ہے سب کو
اب اور بھروسہ کس پر ہو، جب روح نے تن کو چھوڑ دیا

ہر سبز دہاں تھے جو پودے، سب کاٹ دیئے اک اک کر کے
اے دشمنِ گلشن کیوں تو نے اک نخلِ کہن کو چھوڑ دیا

جب میرے خوں کو چوس لیا اشک آنکھوں سے ٹپکا سیل ہوا
یاقوت بدخشاں میں نہ رہا موتی نے عدن کو چھوڑ دیا

دل مٹھی میں لیکر مجنوں کا، آوارہ وطن لیلےٰ نے کہا
جب مشک کا نافہ کاٹ لیا صحرا میں ہرن کو چھوڑ دیا

گتھی جو نہ سلجھی گیسو کی، تو الجھن فکرِ رسا کو ہوئی
مہلت جو تخیل کو نہ ملی، اثباتِ دہن کو چھوڑ دیا

جب اُس نے کہا اے میرے عطاؔ، اُس وقت کا ماتھا ٹھنکا
کس وجہ سے طرزِ سخن بدلا، کیوں حیلہ و فن کو چھوڑ دیا

(از حضرت عطاؔ بہاری مرحوم)

حسن

ہم کو غصہ پہ پیار آتا ہے

غصہ کی برائی عام طور سے اس وجہ سے کی جاتی ہے کہ غصہ کرنے والا پاگل پن کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اس جنونی کیفیت میں وہ برباد اور بہت کچھ کر گزرتا ہے لیکن بہت کم ہیں جن کو یہ معلوم ہے کہ دنیا کے بے شمار تعمیری کام ان لوگوں نے سر انجام دیئے ہیں جن کی طبیعت میں انتہائی غصہ تھا اور اکثر وہ غصہ میں جنون کی حد تک اتر آتے تھے بکس کو نہیں معلوم کہ بمبئی میں ہندوستان کے ایک بڑے رہنما نے ایک پریس رپورٹر کو اپنی کوٹھی کی حدود میں دیکھ کر انتہائی دیوانہ پن کا اظہار کیا تھا اور غریب رپورٹر کا جب گھونسوں سے مرمت کی گئی اخبار دیکھنے والوں میں کس نے یہ خبر نہیں پڑھی کہ دہلی کے لال قلعہ میں بین الاقوامی جلسہ میں ایک بیرونی لیڈر نے اپنے انتہائی غصہ کا اظہار اس طرح کیا کہ کسی شرارت کرنے والے کی ٹانگ کھینچی اور کسی کے تھپڑ رسید کیا۔

لیکن ان ہی ہر دو لیڈروں کے نام ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھے جائیں گے

گاندھی جی نے اپنی سوانح عمری "تلاش حق" میں کئی جگہ جوانی کے حالات قلمبند کرتے وقت صاف صاف اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کی طبیعت میں حد درجہ غصہ تھا اس غصہ کا اظہار انہوں نے کئی بار اپنی بیوی پر بھی کیا۔ جدید سائیکولوجی کی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ کسی بڑی مہم کو سر کرنے کے لئے یا کسی بڑے ادارہ کے چلانے کے لئے ٹھنڈا مزاج رکھنے والا آدمی بے کار ہے۔ اس میں اپنے ماتحتوں سے کام لینے کے لئے کچھ جرات ہونا ضروری ہے اگر یہ جرأت ماتحتوں کی لاپرواہی اور کاہلی کے وقت اظہار ہوتی ہے تو ادارہ ایک اچھی مشین کی طرح بغیر کسی رکاوٹ کے کام کرتا رہے گا!

تربیت کے لئے ضروری ہے کہ ماں بچے پر غصہ کا اظہار کرتی ہے۔ استاد شاگرد کو ڈانٹتا ہے۔ انہیں تو غصہ کا عدم منایاں بے کیفی پیدا کرے گا۔ انفرادی اور قومی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ ہم کسی کے غصہ کے ڈر سے ہی اپنے فرائض انجام دیتے رہیں۔

انسان کے جذبات کو اجاگر کرنے والا یہ غصہ ہی ہے! غصہ کرنے والا جنون میں جب کوئی غیر معمولی حرکت کر گزرتا ہے اور غصہ زائل ہونے کے بعد جب وہ سوچتا ہے۔ اور ضمیر اس کا ملامت کرتا ہے تو یہ وہ وقت ہوتا ہے جب انسان خدا کے قریب ہوتا ہے!

جلال کے بعد جمال نصیب ہوتا ہے

"خوشی سے لبریز دل ہوگا"

کامیابی قدم چومے گی"

مسرت اور شادمانی ہر طرف ہوگی

یہ صرف ان اصولوں پر عمل کرنے کے بعد جو اس کے ہر مضمون میں آپ دیکھتے ہیں سائیکولوجی پڑھئے اور دوستوں کو اپنے مشوروں سے مستفید فرمائیے۔

یقینِ محکم

کے ساتھ مُلکی و مِلّی ہر جہتی ترقی اور فلاح کیلئے

عملِ پیہم

سائیکولوجی کا واحد نصب العین ہے

اور

یہی جذبہ اِس کی حقیر خدمات کی رُوح ہے

جناب عبدالحفیظ خاں صاحب

”ہمارے فلم“

عصرِ رواں کے فلم ساز۔ ہدایت کار، شاعر اور افسانہ نگار خدا ان پر اپنا رحم کرے بیچارعل کے پاس لے دے کے ایک ہی موضوع فنی رہ گیا ہے۔ ”عورت اور عشق“ حسن بھی جنسی مقناطیسی رنگ و تم اور لہو والا حسن۔ اتصال جسم جس کی معراج ہو وہ عشق ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے پہلے کی بات ہے کہ پاکستان کا خواب دیکھنے والے اقبال وا ملئے راز لیے اپنے ہم عصر فن کاروں پر ایک حکیمانہ تنقید کی تھی کہ

”ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار“

عام فلموں میں سے کسی ایک کو لے لیجئے۔ اس کی کل کائنات کا لتر تیع ایک مصرعہ میں کہہ جاتا ہے۔

”ایک عورت سامنے ہوتی ہے اک شخص محبت کرتا ہے“

پچھلے دس پندرہ دن سے جن فلموں کی نمائش دارالسلطنتِ پاکستان میں ہو رہی ہے ان کے انتخاب پر فرداً فرداً اظہار رائے سے پہلے مجھے اجازت دیجئے کہ اپنے خیالات اجمالاً چند ایسے پہلوؤں پر پیش کروں جو بطور قدر مشترک کم و بیش زیر تبصرہ ہر فلم میں شامل ہیں۔

شاید یہ کہنا کچھ ایسا بہت حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ اکثر و بیشتر فلموں میں لوٹ پھیر کر ایک ہی رام کہانی دوہرائی جاتی ہے۔ ایسی ایک کہانی کا ہیولہ سنئے۔ ایک حسین صاحبزادی۔ نگار سے۔ نوبہار سے گلعذار سے۔ ایک تھے صاحبزادے۔ نوخیز۔ نوجوان جمیل و شکیل دیکھائے عشق کا کرنا ایسا ہوا کہ اچانک آنکھیں دوچار ہو گئیں۔ رسیلی نشیلی آنکھیں مست کی مستی کا پیمانہ بھی۔ بس ایک جلوہ میں وہ ہو گئے شیدائی نادون میں [illegible] چھپے ملاقاتیں۔ عشق خیز اور افسانے۔ تھیں۔ آمل آمل چند [illegible] پیش آئیں اور آخر سب آسانی سے ہو گئیں ملے اور جدا ہو گئے۔ جدا ہوئے اور ملے ختم افسانہ۔ جوش ملیح آبادی۔

کسی عقل کے اندھے نے یہ کہا کہ حسن و عشق افضل و اعلیٰ موضوع فن نہیں عرض اتنی ہے کہ اس تماشے کا نہیں اور تنہا یہی نہیں حسن و عشق میرے سر آنکھوں پر۔

لیکن نہ جناب اتنا لیکن نہ جناب ایسا

ایک جوالہ حسن کو رفیق حیات بنا کر شادی خانہ آبادی کوئی گناہ نہیں مگر حضور یہ انسانی زیست کا کوئی کارِ نمایاں بھی نہیں۔ بکتوں کو بنانا گرتوں کو تھامنا۔ سوتوں کو جگانا۔ قوموں کی تقدیر بدلنا یہ بھی تو کارِ جوان مرداں ہیں۔

انہی کے کام میں یہ جن کے حوصلے ہیں زیادہ

عنفوان شباب اور سودائے خط و خال کوئی غیر فطرتی ماجرا نہیں مگر صاحب جو نقشہ حیات پردۂ سیمیں پر نظر آتا ہے اس میں تو سوائے اس کے کوئی کاروبار ہی نہیں دکھائی دیتا کہ

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

آنکھیں بچھ گئیں اس کی جستجو سے بے نیاز ہو۔ مگر قبلہ عالم فلم کی دنیا کے باہر حسن کی اتنی ارزانی کہاں کہ ہر انسان کو ایک پری چہرہ جیون ساتھی مل جائے اور نہ ملے تو ہائے اس بیچارے یا بیچاری فلم زدہ کی ویرانی اور زندانی جس کے دل کے آئینہ خانہ میں پڑتی شعاعوں کی شوخی تحریر نے ایک سے ایک نوکیلے اور البیلے پیکر تو رفیق حیات کے نقش کر رکھے ہوں۔

معاف فرمایئے۔ دل والوں کی دہائی ہے۔ کیا اس دنیا والوں میں کاروبارِ شوق اور نظارۂ جمال کی ایسی ہی فرصتیں اور مہلتیں میسر آتی ہیں اور کیا محبت کرنے کے یہی انداز و اسلوب ہوتے ہیں جو سینما گھروں میں دکھائی [illegible] ہندوستانی [illegible] ہیں۔ [illegible]

میں [illegible] عورتوں اور [illegible] کی عجیب [illegible] کی
یاد [illegible] ہے [illegible]
بھی [illegible] ہے [illegible] تاریخ کی بہو [illegible] داستان [illegible]
زلالہ [illegible] ہیں [illegible] ہیں [illegible] کے
شرگانے [illegible] ہیں کبھی [illegible] ڈالی [illegible] ہیں کبھی
کبوتر کر دو پہے جاتی ہیں کبھی پلنگ پر سو [illegible] بادیاں [illegible] رہی ہیں
اسان [illegible] مشاغل کے دوران ان کی [illegible] آنکھیں [illegible] کر اس
طرح [illegible] باندھے [illegible] کر رہی ہیں جیسے ان کی تمام
والہانہ کیفیتوں اور [illegible] کے مرکز وہی ہیں

کچھ اس طرح سے [illegible] شوخیاں ان کی
ہر ایک نے یہی سمجھا ادھر کو دیکھتے ہیں

ان لواحقیوں کا اثر مجھ بدذوق پر تو یہ ہوتا ہے کہ بیچارے صبیحا
[illegible] محسوس ہونے لگتا ہے کہ ایک قد آدم تصویر [illegible] کی دیوار پر [illegible]
ہے اور اس کے گانے کی گراموفون ریکارڈ جو ہر [illegible] کی دکان پر بھی سنائی
دیتی ہے بجے جا رہی ہے۔ کچھ دیر بعد یہ عمل لیلیٰ کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے
اور یہ سلسلہ ادلتا بدلتا دیر قائم رہتا ہے یہاں تک کہ جی اکتا جاتا ہے۔
پاکستان کے عروس البلاد کراچی میں جو فلم گذشتہ [illegible] نظر سے
گذرے ہیں ان میں سے چار آج کی بحث میں اظہار رائے کے لئے
منتخب کئے ہیں۔ کٹاری۔ ایک روز۔ انجمن اور انوکھی ادا۔
کٹاری کھلی۔ دیکھتا کیا ہوں۔ ایک نوجوان کہ اللہ رکھے حسین بھی ہے
خوشحال بھی [illegible] کے [illegible] گزر جان دینے پر تلے ہیں ابھی آواز ہے

بچے [illegible] میں [illegible] آنکھ میں [illegible] آنسو
اس پہ [illegible] ہیں کہ ہم زخم جگر دیکھئے

وہاں [illegible] اور [illegible] سپاہی بھی آ دھمکا۔
سپاہی: نام کیا ہے؟ جان کیوں دیتے ہو؟
نوجوان: جناب [illegible] جس لڑکی سے میرا دامن باندھنا
چاہتے ہیں میں نے اسکو دیکھا تک نہیں۔
شاباش بہادر! بھلا خودکشی کا اس سے بڑا سبب کوئی اور بھی
ممکن ہے [illegible] کے بعد بات آئی گئی ہوئی۔ صاحب کا [illegible]
[illegible] ایک [illegible] ہے [illegible] معلوم سے
جا پہنچے [illegible] دیکھے گیا ہیں کہ ایک حسن [illegible]

۴ ابلیس کا سی رانی تمام [illegible] سے چھپا کے [illegible] کر رہی ہیں مجھے
پولیس سے بچائیے۔ میں نے اپنی پاک دامنی کے ڈاکو [illegible] کر دیا ہے
بی کے [illegible] جواہر نے رانی کو چھپا دیا۔ پولیس آئی [illegible]
کا اقرار کر لیا۔ پکڑے گئے۔ قید ہو گئی۔ نہ جانے کس قانون سے؟
فلمی قانون سے [illegible] کیسے بھی چھوٹے تو سیدھے ناک کی سیدھ [illegible]
گنج پہنچے۔ اس کے سوا جیل کا راستہ اور جاتا بھی کہاں تھا یہاں [illegible]
میں خوفی رانی جو پہنچ چکی تھیں۔ کیا [illegible] کے ذریعہ ایک [illegible] بھی موجود
تھا جواہر یہاں بس گئے۔ خو [illegible] سے [illegible] بھی کہاں تھی
جیل سے چھوٹے الجھے زلفوں میں۔ اب تو [illegible] گیا گنج کی
کٹاری میں رانی چمک رہی ہیں۔ سامنے [illegible] کے برآمدے میں جواہر [illegible]
رہے ہیں۔ کالی کالی آنکھیں ہیں مست [illegible] ہیں [illegible]
ہی محبت کے ترانے [illegible] میں گانے شروع ہو گئے۔

[illegible] تو سے دلدار یم
[illegible] دو دیں کمی آ [illegible]

خیر یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ طرفہ تماشہ یہ دیکھنے کو ملا کہ کٹاری میں
رانی کے دو [illegible] بدن [illegible] الیلیاں چمک مٹک رہی ہیں اور
مقابل جواہر کے [illegible] دائیں اور [illegible] بائیں [illegible] کھڑے ہیں۔ یہ
کہئے کہ عشق کی کبڈی ہو رہی ہے۔ آج کی بات اور کی
جشن عروسی کی رات [illegible] دھما چوکڑی مچتی رہی۔ [illegible] رنگ
بدلتی ہیں کٹاری اور برآمدے سے گذریں تو فٹ بال کے میدان میں یہ [illegible]
جا نکلے کس کس کے [illegible] کبھی ناٹک کے تختوں پر جا چمکیں تو کبھی [illegible]
کا [illegible] ایک دوسرے سے [illegible] وصت مگر یہاں [illegible] اب ان [illegible]
یا ابلیس نادانوں کو کوئی کیسے سمجھائے کہ

[illegible] وہ لڑکی [illegible] میں کھیلے
[illegible] میں [illegible] کے [illegible] پیلے

جسمانی حسن کے پجاری بیچاریوں کی رنگ رلیوں کا ایک طوفان
دیکھا اور اس کی رو میں جو جو عریانیاں اور بے حجابیاں سرزد ہوئیں انہیں
دیکھ کر شرم نے اپنا سر پیٹا اور حیا نے پینے [illegible] میں منہ چھپا لیا۔ پھر
جو [illegible] کوئی کسر [illegible] تھیں [illegible] کو بھی [illegible] آیا اور [illegible]
کی لاج رکھ لی۔ سامنے فلم میں اگر کوئی روشن پہلو تلاش کیجئے تو وہ [illegible] کے
[illegible] سوال کے بھی تک نے اور [illegible] عالم [illegible] دباؤ سے عالم بالا کی

طرف بڑھ جانا چاہتے ہیں مگر ان کے ننگے غلیظ ابلیل پھر دھڑام سے نیچے پٹک دیتے تھے۔

ایک روز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا دیکھتا ہوں جواں سال ناصر ولایت سے اپنے وطن دہلی واپس آتے ہیں۔ گھر میں ابھی قدم بھی نہیں رکھا کہ ایک دشمن رقیب نے گولی مار دی۔ زخمی ہو گئے۔ چچیری بہن نسرین سے شادی ملتوی ہو گئی۔ رو بصحت ہونے پر کشمیر پہنچے۔ اس بہانے ہم نے بھی دنیا میں جنت کی سیر کر لی۔ بڑے ہی دلکش اور فردوس نظر مناظر ہیں۔ کیا کہنا۔ بس

"تا تم آمدہ دیدہ و گوش"

ایک چاندنی رات کا ذکر کہ قدرتی کیف و سرور میں سرشار ناصر جنگل کی سیر کرتے پھرتے تھے۔ کرناٹا دشیریں اور افسوں بار لطیف دھڑکنیں لئے فضا میں کانپنے لگے جیسے۔

"شاخِ طوبیٰ پہ نغمہ ریز طیور"

دیکھا کہ ایک دوشیزہ اللہ رخ سمن برسے لب جو بیٹھی مطرب بہ نظر رہزنِ تمکین و ہوش ہے، آنکھوں کے آگے بجلی سی کوند گئی۔ اس جلوہ کی تلاش میں راتیں بادیہ پیمائی میں بسر ہونے لگیں۔ یہ صاحبزادی ایک غریب درویش رحمٰن بابا کی لڑکی پردیں تھی۔ ناصر کے عہد و پیمان پر بھولی بھالی پردین کو جلد اعتماد ہو گیا۔ مگر رحمٰن بابا نے جو دنیا کی صعوبتیں جھیلے ہوئے تھا کہا "بیٹا پردیں۔ کیا پردیسی کی پریت اور کیا پھوس کا تاپنا۔ متمدن اور مہذب صاحب دولت و ثروت لوگ سیدھی سادھی معصوم لڑکیوں کو پچھی دہستگی کا کھلونا تصور کرتے ہیں۔ کھیلے کھیلے جی بھر گیا کسی کونہ میں ڈال دیا۔ پھر بھولے سے بھی اس طرف نہیں دیکھتے۔ یہ نادان نہ سمجھی۔ دلہن بنی اور بنتے ہی [illegible] گئی۔ جگ میں کوئی نہ تک ہنسا ہوگا۔ جو نہ ہنستے ہی کا رو دیا ہوگا"

نصیر کے باپ کی بیماری کا تار آیا۔ پردیں نے لاکھ سر پٹکا "مجھے ان وحشی کوہستانیوں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑو۔" ناصر نے ایک نہ سنی۔ اکیلا دہلی واپس آگیا۔ ساحل کے محفوظ اور پُرسکون مقام سے تماشہ دیکھنے والے کیا جانیں کہ بھنور میں گھرے ہوئے طوفانی موجوں کے تھپیڑے کھانے والوں پر کیا گذرتی ہے۔

شب تاریک و بیم موج و گرداب چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکساران ساحل ہا

ایک برس بیت گیا۔ پردیں کی گود میں شیر خوار بچہ ہے باپ کا نشان نہیں۔ پہاڑی کنیز اور روتی ہیں۔ جلا وطن ہوتے رہتی ہیں اور در کی ٹھوکریں کھاتی۔ ناصر کو دیکھا کہ قبرستان پہنچے کہ [illegible] عصمت فروشی کے ہیٹھے ہیں آس پہ ناصر کر گیا ہے پاتے شہید ہو لی۔ ناصر کا کھوتا اس کے قدموں میں لوٹا ہے۔ پردیں کی قبر پہ اقبال پشیمان کی انسان کشی کی خونچکاں یادگار ہو رہی ہے یہ لکھا دیکھا "کلی کھلنے نہ پائی تھی کہ بے رحم گلچیں نے مسل کر خاک میں ملا دیا"

فلمی ہدایت کار دلسے کوئی پوچھے کہ ولایت کے تعلیم یافتہ کیا ایسے ہی تن آسانی اور بے عملی زندگی بسر کرتے ہیں جیسے ایک روز کے بیان نصیر کشمیر فردوس ہند ہے اور جلد ہی فردوس پاکستان بن جائے۔ آنکھوں مگر ایک روز کے دیکھنے والے نوجوان کہیں اس مغالطہ میں نہ پڑ جائیں کہ جنت نشان سرزمین کشمیر میں ہر کوثر و تسنیم کے کنارہ حوریان کہسار بے حجابانہ جلوہ فروش ہیں۔ یہ ان سے کھیل سکتے ہیں۔

نسرین ایک عالی نسب تہذیبی شریفانہ رسم و روایات کے پابند خاندان کی چراغِ خانہ ہے۔ اس کا پیا کی یاد میں جھوم جھوم کے گیت گا نا کتنا بے ہنگام و بے محل ہے۔

پردیں کی اداکاری اور موسیقی قابلِ داد ہے۔ کہساری دوشیزہ کی بے باکی اور رہبرلاپن کامیابی سے ادا کیا ہے۔ کوہ قافی دلربائی اور نسوانی خوب نبائی ہے۔ سنجیدہ سوز و غم کی فضا میں اس نے بیحد گداز پیدا کی ہے۔ اس کی درد بھری آپ بیتی سے کتنی ہم آہنگ ہے!

"انجمن" میں دیکھا نصیر دلہے کی ولایت سے واپسی کی تقریب میں محفل سیرت النبی آراستہ ہے ماشاء اللہ سبحان اللہ۔ نواب زادے بچے و خلا نے کتنا اثر کیا یہ تو معلوم محفل برخاست ہوتے ہی جوں ہی خالہ زاد بہن انجمن پر نظر پڑی یہ بھری بزم میں اس کو مانگ بیٹھے۔ ہنوز پاکیزگی اور جلب کی تقلیں ابھی فضا میں گونج رہی تھی کہ طوفانِ شباب و مستی کے بند کھل گئے۔ اچھل کود۔ ناچ گانے۔ آنکھوں کے تیر نے لا پھینکنے لگے۔ تیلیاں انجمن کے گرد حلقہ باندھے مستانہ وار گا رہی ہیں۔ پتنگ کہاں جاؤ گی پکڑے کہیں نماز و اعمال سیرت و قرآن متبرک اور مقدس کا مذاق ہیں۔ موجودہ سینما کی مسموم فضا سے وہ بھی پچھتانا ہے پھر پہلے کہا تمہیں قرآن مسلمان کی

ہر چند انجمن کا گھرانہ بزرگان سلف کی بھی یادگار ہے۔ مگر یہاں تہذیب نو کے جیتے جاگتے نمونے اعزہ کا [illegible] نہیں دکھا دیا بیٹی کی خالہ زاد بھائی کے ساتھ مخلوط ہی مادر و بیاز کی چیلیں۔ انجمن کے

دل میں پیار کے تصور سے کیف انگیز اور ہیجان خیز ولولوں کی پیدائش اور ان کا مظاہرہ نغمہ و رقص سے کرنا کس قدر مہمل اور اوٹ پٹانگ باتیں ہیں۔

انجمن اور اس کی اماں جان بیگم منصور کی وظیفہ خوار ہیں۔ مگر بیٹے پھلنے پھولنے اینڈنے فرض گھر کے کسی کام کاج سے انہیں کیا سروکار۔ جب دیکھو انجمن آرائش حسن میں مصروف ہیں۔ یا نواب زادے سے پیار و محبت کی باتیں ہیں یا سہیلیوں سے چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق۔ اللہ اللہ یہ کس دیس اور کونسی بستی کے قصے ہیں یہ کونسی زندگی کے نقشے ہیں "سکھ کے دن ہیں۔ ایک سپنا ہے"

کہانی بہت ہی مختصر۔ نواب زادے انجمن سے شادی کرنے پہ تلے ہیں نہیں تو جان دے دیں گے۔ بیگم منصور مصر کہ شادی ہو تو کسی نواب زادی شہزادی ہی سے ہو۔ انجمن لاکھ خوبصورت سہی لیکن ہے تو میرے گھر کی ٹکڑ گدی۔ کیا خوب چوٹی کہے کہ مجھے گھی سے کھاؤ۔ محل میں اور ٹاٹ کا پیوند۔ ادھر تریا اور راج ہٹ اور ادھر بال ہٹ یا بولا ہٹ۔ بال ہٹ کے آگے آخر تریا ہٹ کی شکست۔ انجمن اور نواب زادے کی شادی، ابھی تم دو مبارک باد۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔

ارے صاحب یہ فلمی افسانہ نویس حقیقت اور فطرت کے پابند نہیں قدرت ان کی پابند ہے۔ توبہ استغفار۔ عالم کن فکاں پہ راج ہے ان کا؟ بیگم منصور جیسی نیک بخت بیبیاں اپنی ہٹ ایسے ہی چھوڑ دیا کریں تو پہلے ہی دن پھر آجائیں۔ کتے کی دم ۱۲ برس باندھے رکھیے بھی سیدھی نہیں ہوتی۔ رسی جل جائے پر بل نہ جائے۔

انجمن کی اداکاری اور انجمن سے بڑھ چڑھ کر بیگم منصور کی فنکاری کا کیا کہنا۔ انجمن کی اداؤں میں کمسنی اور سحرکاری اور بیگم منصور کے تیوروں میں بردباری اور پختہ کاری کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

اب ایک انوکھی ادا دیکھئے۔ کہانی کا معیار عام فلمی کہانیوں سے بلند تر ہے۔ مصنف کی ندرت تخیل نے عشق کی راہ میں ایک نرالی دشواری کی تخلیق کی ہے۔ خود فراموشی۔ ذہنی اور نفسیاتی کشمکش۔ اس فلم کی سیر میں ایک علمی اور فلسفیانہ تجربہ کے مشاہدہ کا لطف آتا ہے۔ پروفیسر اور لاج دونوں کے کردار قابل احترام ہیں۔ سنجیدہ اور معقول عنصر بہت کم ہے۔ لاج اور پروفیسر دونوں کی اداکاری کی داد نہیں دی جا سکتی کہ دونوں فن کار ہیں یہ سبب

کچھ ہے۔ مگر فلمی نقائص بھی کم نہیں وہی زندگی کے حقائق سے بے زاری۔ خلاف فطرت اور بے تکے گانے، ان ہونے اتفاقات کی بھرمار۔

لاج صاحب کا تعرف انوکھے انداز سے کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بغدادی چور قسم کے انسان ہیں۔ آئیں بیٹھے مار۔ قانون اور پولیس سے بے پرواہ حسینا کشتی آنکھ مچولی۔ اس سیرت اور بعد کے کردار میں کوئی ہم آہنگی نہیں۔ یا تو لاج صاحب خود دل اور غریبوں کے پیچھے باپ سے لڑ مر سیا ساری دنیا سے منہ موڑ کر کامنی کے ہو رہے۔ ہم نے تو کوئی مزدوروں کی خدمت نہیں کرتے دیکھا نہیں۔

اچھا ذرا اتنا سوچئے کہ انوکھی ادا کا پیغام یا سبق کیا ہے؟ یہ سن کر شاید افسانہ نویس صاحب مجھ پہ پھبتی کسیں "اندھے کو اندھیرے میں دور کی سوجھی"

اجی قبلہ فلم اور پیغام۔ ہا۔ ہا۔ "ہرن پہ لادی جاتی ہے کہیں؟" اور ایسا ہی پیغام کا آپ کو سودا ہے تو یہ سنئے انوکھی ادا کا پیغام

"صرف حسن ہی لائق پرستش ہے"

میں کہتا ہوں اے صاحب ذرا اس حسن کا حلیہ تو بیان فرما دیجئے۔ وہ یہی نا "سرو سے اونچا قد، ستواں ناک، گورا گورا رنگ، چودھویں کے چاند جیسی پیشانی"

لاحول ولا قوۃ! یہ حسن تو دو روزہ ہے۔ چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ہے۔ اور اس حسن کا کیش عقل و ہوش کی غارت گری۔

"ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی"

ہاں ایک حسن اور بھی ہے اور وہ واقعی حقیقت ہے۔ اور بر حقیقت وہ حسن، مگر وہ حسن کسی انسانی یا نسوانی جسم فانی میں محدود نہیں۔

وہ شے کچھ اور ہے کہتے ہیں جان پاک جسے
یہ رنگ یہ نم یہ لہو آب و ناں کی ہے بیشی

سوالات و مضامین صاف لکھ کر بھیجے جائیں تاکہ ان کی اشاعت پر فوری توجہ دی جا سکے

ایم اقبال مجتبیٰ صاحب

ہر چیز سے اُس کو نفرت ہے!

افسانہ کیا ہے ؟ زندگی کی اُن تلخ حقائق کا بیان جن میں دبے پسے قہقہوں کے پیچھے آلام و آلام کے مہیب چہرے مسکراتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن بھیانک مناظر کی تصویر کشی جن میں طوفانِ بداماں آنسوؤں کے آنچلوں میں زندگی تڑپتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ افسانہ فطرت پرستوں کے لئے سامانِ دل بستگی بہم پہنچاتا ہے اور منزل طلب نگاہوں کے واسطے مشعلِ راہ کا بھی کام دے سکتا ہے ——

"میں اُس شاخِ نہال کی طرح تھی جو بہار کا موسم شروع ہوتے ہی کسی حادثے سے ٹوٹ جائے۔ میں اس بلبلِ بے نوا کی طرح تھی جو موسم بہار میں اپنے گھونسلے کے پاس بیٹھا اپنے رفیقِ حیات کی راہ دیکھ رہا ہو اور پھر بھی انتظار کرتے کرتے صبح سے شام اور شام سے سحر کر دے۔ یادش انتظار میں میری زندگی کیا تھی —— ایک لق و دق صحرا تھی۔ جہاں ہر آرزو اور ہر اُمید، ہر شوق اور ولولہ کی قسمت ہمیشہ تشنگی رہتا ہو۔ میں اُس ساز کی طرح تھی جو تشنۂ مضراب ہو۔ میں اُس بہار کی طرح تھی جس کی مسرت سامانیاں، جس کی طرب انگیزیاں دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔ میں اس چراغ کی طرح تھی جو اپنے سوز سے جل جل کر بجھ جائے" رضیہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

میں ایک مجسمۂ حیرت بنا اس کی دردبھری داستان سننے کا اشتیاق ظاہر کر رہا تھا۔ اس نے ایک لمحہ بعد پھر کہنا شروع کیا۔

"کالج کی وہ [illegible] اور لطیف ماحول جس میں اعجاز اور میں ایک ساتھ تعلیم پا رہے تھے۔ ایم۔ اے کا آخری سال تھا اور امتحان کے تقریباً [illegible] دن ایک دوسرے کے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ آہ! کس قدر حسین تھا وہ!"

[illegible] ایک نہایت عمدہ دوست پرویز نامی بھی رضیہ ہی کی طرف ہونے لگا اور رفتہ رفتہ یہ جذبہ کچھ ایسی شدت اختیار کر گیا جسے رقابت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اعجاز اور پرویز بہترین دوست ہونے کے باوجود کشیدگی اختیار کر گئے۔ پرویز ایک [illegible] قسم کا نوجوان تھا اور جو بات منہ سے نکالتا اس کو پورا کرنے میں کوئی بھی طریقہ فروگذاشت نہ کرتا۔ یہی وجہ تھی جو رضیہ کو خوف زدہ کر دیتی۔ وہ آہستہ صاف صاف کہہ دینا چاہتی تھی —— مگر ایسا کرنے سے قاصر رہتی۔

امتحان میں کامیابی نے تینوں کے قدم چومے۔ ایک نیا دور نیا زمانہ آیا۔ بلبل چہکی —— قمری بولی —— پپیہے نے پی کہاں کی رٹ لگائی —— آم پکے —— بھونرے اُڑنے لگے —— کوئل کوکی —— طاؤس رقصاں ہوئے —— دریا بہہ نکلے چشمے اُبل پڑے —— نئے سبزے کا آغاز ہوا —— تمام دنیا پر نیا جوبن، نئی بہار چھا گئی —— سب کے دل نئی اُمنگوں سے بھر گئے۔

اعجاز اور پرویز کو امتیازی درجات حاصل کرنے کے باعث یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی پیش کش رہی۔ پرویز غیر ممالک کی سیر و سیاحت کا بچپن سے ہی دلدادہ تھا اور پھر تو قدرت نے اُسے زرّیں موقع دیا تھا —— وہ کیسے انکار کر سکتا تھا۔

اعجاز کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس پیش کش کو ٹھکرا دے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رضیہ کا ہو جائے۔ مگر جب وہ دیکھتا کہ پرویز تعلیم میں اس سے سبقت لے جائیگا اور یورپ سے واپس آتے ہی اعلیٰ عہدے اس کا خیر مقدم کریں گے تو وہ تڑپ اٹھتا۔ مگر اس کی یہ حالت عارضی تھی ——

آخر جانا تو تھا ہی، سو عازم یورپ ہو جانا پڑا۔

روانگی کے روز رضیہ اعجاز کو الوداع کہنے ہوائی مستقر پر آئی۔ ایک دوسرے سے حقیقی محبت کے عہد و پیمان لئے جاتے رہے اور بندھے گئے۔ ایک لافانی میلانِ طبع اور رانگس و رغبت کی پھر سے تخلیق ہوئی۔

پرویز کے نزدیک انسانی زندگی کے عیش و سرور کا انتہائی تصور یہ تھا کہ چاندنی رات ہو۔ کسی خاموش ندی سے شفاف پانی پر ایک نازک سا سنہرا ابھرا نسیم کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے ہلکورے لے رہا ہو۔ اس بجرے میں ایک نازنین اپنے محبوب کے زانو پہ سر رکھے ستار کے تاروں کو نہایت نزاکت سے مضراب دے رہی ہو۔ اس کا محبوب ہلکے سروں میں گا رہا ہو اور بجرا ندی کے رُخ بہتا ہوا اُفق کی طرف چلا جا رہا ہو —— اور بہا بہتا چلا جا رہا ہو ——

یہ تصور کتنا دلفریب اور دلکش ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ مقصودِ حیات اس قدر معمولی ہے جو ذرا سے اہتمام کے بعد حاصل ہو سکے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی صرف گانے، بجانے، چومنے اور پیار کرنے ہی کا نام ہے۔ زندگی حقیقت میں اس سے بہت مختلف ہے اور اس سے بہت زیادہ شدید چیز ہے ——

ہوائی جہاز مائلِ پرواز ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو حسرت بھری نم آلود نگاہوں سے دیکھا۔ اور رضیہ کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی لڑی بن کر عارضوں پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

رضیہ کو اپنے ارمانوں کی دنیا کچھ عرصہ کے لئے اُجڑی ہوئی دکھائی دی اور اُس نے ایک تنگ و تاریک گھروندے میں خود کو محبوس پایا —— دل ہی دل میں کہنے لگی "سوچتی ہوں کہ کوئی جگہ تاریک ہے کیا؟

یہ گرانبار تسلسل۔

یہ حیاتِ جاوید۔

جسکی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال
کوئی روزن بھی نہیں، کوئی دریچہ بھی نہیں
ایک دنیا ہے کہ ہے تیرہ و محدود و اُداس
نور و نکہت سے گریزاں، مہ و انجم سے نفور
جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال
کاش پڑ جاتے کہیں ایک خراش، ایک شگاف

غم کے ہاتھوں جو کہیں اور بھی ہوجائے کہیں
کوئی آوارہ سی دھندلی سی کرن آ نکلے، ایک لمحے کے لئے
"میرے تاریک گھروندے میں اُجالا کر دے"

رضیہ کو وقت کے ساتھ ساتھ حرکتِ قلب بھی ساکت سی محسوس ہونے لگی۔ پریشانی و اُداسی اور غم و اندوہ نے آ سے اپنی آغوش میں لے لیا۔

والدین نے اس کی اضطرابی کیفیات کا یہ حال دیکھتے ہوئے اس کے دل کی گہرائیوں کو جھانکا۔ نہ انہیں تاسف تھا نہ عمرِ شباب کی موجوں کے تھپیڑے انہوں نے بھی کھائے تھے —— تو تہذیب و تمدن کے حامی ہوتے ہوئے رضیہ کو اپنے رفیقِ حیات کے انتخاب کی دعوت ملی۔

اعجاز کے آخری امتحان میں ابھی کامل ایک سال باقی تھا۔ مگر رضیہ کو کب چین تھا۔ اُس نے اعجاز کے ساتھ ساتھ پرویز کو بھی اپنے حسنِ انتخاب سے متعلق لکھا کہ اگر وہ چاہے تو فوراً واپس چلا آئے۔ اس کو اس لئے دعوت نہیں دی گئی کہ وہ پرویز کو چاہتی تھی۔ بلکہ اس لئے کہ وہ کہیں اعجاز کی جان کا خطرہ نہ بن جائے۔ مگر وہ بھی اپنی تعلیم کی تکمیل چاہتا تھا جس پر اُس کی آئندہ زندگی کا انحصار تھا ——

اعجاز اس مژدہ کے سنتے ہی عازمِ وطن ہو چلا اس کو تعلیم سے زیادہ اپنی رضیہ عزیز تھی —— حسن و سیرت کا مرقع، اس کا سرو ایسا قد، شیلی، مخمور آنکھیں، بیضوی چہرہ، سرخ سپید رنگ، صدف جیسے چمکتے ہوئے دانت اور دراز زلفیں اُسے کس قدر لبھاتی تھیں . . . . . .

ہوائی جہاز کی ایک ہی اُڑان اُسے یورپ سے لاہور لے آئی۔ وہ کس قدر مسرت و انبساط محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے رضیہ کی خاطر کسقدر بڑی قربانی کی تھی — اُس کا چوڑا چکلا سینہ اور ورزشی جسم ہمالیہ تک کو فرطِ جوش سے مسمار کر دینا چاہتا تھا۔

تاریخ مقررہ پر رضیہ اور اعجاز رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیئے گئے۔ رضیہ کی رگ رگ سے مسرت کی تنویریں پھوٹی پڑتی تھیں کہ اُسے مقصدِ حیات حاصل ہو گیا۔ اور اس کی دیرینہ اُمیدیں شرمندۂ تعبیر ہوئیں۔

اعجاز کو جلدی ایک کالج میں پروفیسر کی جگہ مل گئی علم و ادب کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اس کے دل و دماغ میں موجزن تھا اور وہ ہندوستان کے کونے کونے سے اعلیٰ مقرر ہونے کا خراجِ تحسین حاصل کر چکا تھا۔

ریحانہ، [illegible]، فیروزہ اور نسیم کالج کی خاص طالبات تھیں۔

نسیم زندگی کی ستر ہویں بہار میں قدم رکھ چکی تھی حسن و جمال، ناز و ادا اور عشوہ و غمزہ میں لاثانی ——— اس کی نرگسی آنکھوں کا تمام کالج گرویدہ تھا۔ وہ ہر گام پر دیکھنے والوں کے دلوں کو، رعب حسن سے مسخر کرتی چلی جاتی۔ . . . . .

پروفیسر کی ذہانت اور علم و ادب کی شہرت نے نسیم کے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ وہ انتہائی گرویدہ ہو گئی۔ اس کا عالم شباب اعجاز کے اختتام جوانی میں حائل نہ ہو سکا۔ بلکہ وہ ایک گونہ کشش اور جاذبیت محسوس کرتی۔

حسن کی تسخیر نے ایک نئے کیوپڈ کو دام فریب میں پھانسا پروفیسر کا رجحان بھی کچھ عرصہ بعد نسیم کے شعلہ حسن کی تاب نہ لا سکا اور شکست کھائی نسیم پہلے ہی اپنا تن، من اور دھن اعجاز پر نثار کر چکی تھی ———

کالج کے بعد ہوٹل، سینما اور متعدد پارکوں میں وقت کو دھوکا دیا جانے لگا ——— مختلف موضوعات پر بحث ہوتی ——— نسیم فرط مسرت سے جھوم جھوم جاتی۔

رضیہ نے اپنے جذبات کا یوں خون ہوتے دیکھ کر سر پیٹ لیا۔ اس کی امیدیں اسکے ارمان سینہ میں دب کر آتش فشاں بننے لگے ——— اسکے جذبات ایک عرصہ تک دل میں قید ہو جانیوالے جیسے زخموں کی طرح کلبلاتے رہتے وہ ایک شدید انتقام لینا چاہتی تھی ———

نسیم نے رضیہ کو اپنی راہ میں حائل ہوتے دیکھ کر اعجاز کو بمبئی چلے جانے کی ترغیب دی ———

جہاں وہ اپنی تمنائیں، اپنی آرزوئیں، اپنی امنگیں اور اپنی خواہشیں پوری کر سکے ———

اعجاز، رضیہ سے چند دنوں کے لئے باہر جانے کا بہانہ کر کے چلا گیا۔ کئی دنوں کے گذرنے تک بھی جب وہ واپس نہ لوٹا تو اسے تشویش ہوئی ——— خلش اس کے دل میں پہلے ہی سے موجود تھی بات یقین بن گئی

چند ماہ بعد اس نے سنا کر نسیم کی گود میں ایک ننھا کھیل رہا ہے۔ اور وہ ہر کس و ناکس کو اچھال اچھال کر دکھا رہی ہے۔ کہ "یہ میرا بچہ ہے بالکل ویسا ہی جیسا، بالکل اسی طرح [illegible] ———

[illegible] ——— بالکل اسی طرح [illegible]

[illegible]

[illegible] ——— [illegible] ——— [illegible] ———

[illegible] ——— [illegible]

جناب مجتبیٰ احمد صاحب

ریویو

"اور انسان مرگیا"

سورج کی روشنی سے کوئی کتنا ہی منہ چھپائے لیکن وہ سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ ریت کے تودوں میں اپنا منہ چھپا کر یہ سمجھنا بھی زندگی کے حقائق سے گریز ہے کہ ساری دنیا راستی اور امن کی نیند سو رہی ہے اور اپنی شامتِ اعمال کی ذمہ داری دوسروں کے سر تھوپنا اور ناکردہ گناہوں کی سزا دوسروں کیلئے تجویز کرنا بھی گریز ہے۔ شعوری اور تحت الشعوری خارجی اور داخلی دونوں طریقوں سے گریز کی کیفیات ہم پر اکثر و بیشتر طاری ہو کر ہمیں نہ صرف یہ کہ تقدیر کے سہارے چھوڑ دیتی ہیں بلکہ وہ آہنی طاقت بھی سلب کر لیتی ہیں جو طوفانوں سے لڑ کر جہاد کی نئی منزلیں طے کراتی ہے۔

رامانند کے ناول "اور انسان مر گیا" پر احمد عباس کا دیباچہ توجہ کا محتاج ہے۔ اس دیباچہ پر ترقی پسند مصنفین کی بحثیں اور بھی زیادہ توجہ کے لائق ہیں کیونکہ وہ صرف ادبی نقطۂ نظر سے ناول یا اس کے دیباچہ کا تجزیہ نہیں کرتی ہیں بلکہ ان کی کوشش یہ ہے کہ فسادات کے پس منظر میں جو حقیقی جذبہ محرک تھا اس کی بازیافت کریں۔

احمد عباس کو خود فریبی کی شکایت ہے جس نے برصغیر ہندوستان میں قتل و خون کے وہ خوفناک مناظر دکھلائے جن سے انگریزیت ہمیشہ دبتی رہے گی۔ احمد عباس کو اس بات کا اعتراف ہے کہ فسادات کی ذمہ داری اس تعصب اور منافرت پر ہے جس کو انگریزی سامراج نے صدیوں کی مسلسل کاوش سے ہندوستان میں پروان چڑھایا تھا۔ صرف یہی نہیں عباس کو ان مغل شہنشاہوں کا بھی شکوہ ہے جنہوں نے کم عقلی کی بنا پر سیاست اور اقتصادیات کے مسائل سے بے خبر ہو کر غیر مسلم اقوام کو کچلنے کی کوشش کی تھی۔ جاگیردارانہ نظام و سامراجی ذہنیت کی یہ جھلک عباس کو مسلم لیگ کی تنظیم و اس کی جدوجہد میں بھی نظر آتی ہے۔ اور ان کا خیال ہے کہ لیگی لیڈروں اور انگریزی اقتدار کی سازش سے پاکستان قائم کیا گیا اور اس سلسلہ میں فسادات کی ہولناکیوں کا ظہور بالکل ایک فطری عمل تھا۔

یہ سب فسادات میں ابھرے تھے انگریزوں کے علاوہ کچھ اور بھی عناصر [illegible] احمد عباس کے خیال میں [illegible]

ہر تربیت اور ایذا پرستی کا مواد موجود ہے۔ شاید اسی سے عوام کی جنسی تشنگی کی بھی کیفیات قتل و غارت اور جنسی ایذا پرستی کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ عباس اپنے دیباچہ کو اس امید پر ختم کرتے ہیں کہ اس قتل و خون کے ڈرامے میں بھی انسانیت زندہ تھی اور ہمیشہ اس کا علم سربلند رہے گا۔

خواجہ احمد عباس نے فسادات کی ذمہ داری کو ایک مبہم شکل میں مختلف جماعتوں اور مختلف تحریکوں پر عائد کیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ تنہائی کے لمحات میں خود خواجہ صاحب کے دل میں جو تذبذب پیدا ہوتا ہوگا وہ ان کی تحریر کے منافی ہے۔ یہ محض خود فریبی اور شکست خوردہ ذہنیت کا مظہر ہے جس نے [illegible] زندگی کے حقائق کو پس پشت ڈالنا چاہا ہے۔ اگر فسادات کی ذمہ داری مسلم لیگ، مغل شہنشاہیت کی پیدا کردہ جاگیردارانہ ذہنیت اور مذہبی تعصب پر ہے تو احمد عباس کیوں کانگریس کا نام لیتے ہوئے شرماتے ہیں، ان کے قلم میں کانگریس کے خلاف کیوں بغاوت کا جذبہ موجود نہیں ہے جس نے نہ صرف فسادات کی تحریک پیدا کی بلکہ اس کی شعلہ فشانیوں میں بھی اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ عباس کے بیان میں خود تضاد موجود ہے۔ ایک طرف وہ اس وحشت اور بربریت کی ذمہ داری عوام کے دقیانوسی جذبات پر ڈالتے ہیں اور دوسری طرف سیاست کی شاطرانہ چالوں پر۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عباس نے بقول ممتاز حسین منطق اور انسانی حمایت کا سہارا لے کر اصلی مجرموں کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ یہ [illegible] ادبی نقطۂ نظر کہہ کر نہیں ٹالی جا سکتی کیونکہ یہ ایک مجرمانہ فعل ہے۔ مجھے نیاز حیدر کے خیال سے اتفاق ہے کہ رامانند ساگر نے اپنے ناول میں فسادات کا تجزیہ منطقی طور سے نہیں کیا ہے، اور عباس نے جذباتی طور پر اس کی اہمیت کو بدلنے کی کوشش کی ہے اور ہندو کے زیر اثر فسادات کی تعریف اور [illegible] ہندوستان کے [illegible] کو مسخ کرنے کی کوشش کامیاب ہے۔

فسادات کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے یہ ایک اہم سوال ہے [illegible] کامیابی کی شکست خوردہ فرسودہ اور آمادہ ذہنیتوں کو ملک کی آزادی کے اختتام سے ایک ابھار کا موقع مل گیا تھا جس نے [illegible] شکل اختیار کر لی۔ کوئی نئی بات

نہیں۔ تاریخ میں ایسے واقعات دہرائے جاتے رہے ہیں۔ انقلاب فرانس، انگلستان کا صنعتی انقلاب اور روس کی انقلابی داستان لرزہ خیز واقعات سے خالی نہیں۔ یہ انسانی جبلت ہے جو اکثر بڑے خوفناک روپ میں جلوہ نما ہوتی ہے لیکن محض نفسیات کا سہارا لے کر اتنی بڑی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے۔ داخلی ردعمل بھی تو بہرحال خارجی واقعات ہی کے پیدا ہوتے ہیں۔ خارجی واقعات میں برطانوی سامراج اور اس کے تمام لوازمات کو فسادات کی ذمہ داری کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ انگریز نہ ہندوستان کی آزادی چاہتا تھا اور نہ پاکستان کا قیام۔ وطن میں کسی ایک یا دونوں کی تحلیل اس کی سرمایہ دارانہ اور فسطائی ذہنیت کے منافی تھی جس کو اس نے صدیوں کی انتھک کوششوں کے بعد برصغیر ہندوستان میں منجمد کیا تھا۔ لیکن جب یہ نظر آنے لگا کہ یہ کانٹے کی نوک مزید نہیں بڑھ سکے گی تو انگریزی استبداد نے بھی وقت کے دھارے کا ساتھ دینا شروع کیا۔ پاکستان اور ہندوستان کی آزاد سلطنتوں کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن چلتے چلتے برطانوی شاطرانہ ہتھکنڈوں نے ریڈکلف کمیشن اور فوجوں کی تقسیم کے ذریعہ ایک ایسا ناسور پیدا کر دیا جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں رستا رہا اور وہ ایک تاریخی دن کے بعد اس نے ایک جوالا مکھی کی شکل اختیار کر لی جس سے نہ صرف یہ کہ دونوں سلطنتوں کی پوشیدہ بنیادیں ہل گئیں بلکہ برادری اور رواداری کے وہ نشانات بھی مٹ گئے جن کو دونوں قوموں نے صدیوں تک خون جگر سے سینچا تھا۔

معاشی بے چینی اور اقتصادی بدحالی کا کام فسادات کے پرچار میں تھوڑا تھا لیکن اس کی حیثیت محض ثانوی تھی۔ انقلاب فرانس اور صنعتی انقلاب کے علاوہ کسی بڑے معاشی بحران میں معاشی بے چینی کی وجہ سے فسادات برپا نہیں ہوئے۔ خارجی طور پر ہم معاشی بحران کو فسادات کا ذمہ دار قرار دے سکتے ہیں لیکن دراصل ان کی وجہ وہ غیر شعوری کیفیات ہوتی ہیں جو دلوں کے اندر ہی اندر نفرت کی آگ میں سلگتی رہتی ہیں۔ خود روس کے انقلاب کو لیجئے اس کی ابتدا میں معاشی سوال کو کوئی دخل نہیں تھا مگر اس کا لازمی نتیجہ معاشی نظام کی تبدیلی کے شکل میں نمودار ہوا۔ اس کے آگے بڑھنے میں مذہب، سیاست، طرز عمل اور ثقافتی نظام سبھی کو دخل تھا۔ زار نے جتنا زیادہ شدت سے کام لیا اتنا ہی عوام کی بے چینی بغاوت کی شکل اختیار کرتی گئی۔ حکومت کو بالآخر عوام کے آگے ہتھیار رکھ دینا پڑا۔ ترکی میں جب بھی اتاترک نے حالات نے شکلیں اور صورت اختیار کر لی تھی لیکن چونکہ حکومت خود فرسودہ ہو چکی تھی اس لئے عوام کی مخالفت کی تاب نہ لا سکی۔ صرف جرمنی کا نازی انقلاب ایک ایسا تاریخی واقعہ ہے جس میں فسطائی طاقت کے آگے جمہور کی آواز دب گئی۔

برصغیر ہندوستان میں فسادات کا ایک دوسرا ڈھنگ تھا یہاں حکومت اور آبادی کے ایک بڑے طبقے نے اقلیت کے خلاف ہتھیار اٹھایا تھا۔ اقلیت کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ زندہ رہنا چاہتی تھی۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے اکثریت کے غیر منطقی و غیر جمہوری اور جابرانہ فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ اس میں کسی عنادیت کو دخل نہیں تھا بلکہ اقلیت بے چاری تو صرف اپنے حقوق کا تحفظ چاہتی تھی، جس کو شاید کمیون فارم اور دوسری اشتراکی تنظیموں نے بہت قبل تسلیم کر لیا تھا۔

نازی جرمنی کے بعد یہ پہلی مثال ہے جہاں جمہوریت لوگوں کی آواز کو اتنی خوفناک شکست ہوئی۔ عباس کا دیباچہ جان بوجھ کر ایک فریب کا جال بُننا چاہتا ہے جس میں اصلی مجرموں کو چھپا کر فسادات کی ساری ذمہ داری برطانوی سامراج اور مسلم اقلیت، جو عباس کے خیال میں جاگیردارانہ نظام کا مظہر تھی، پر رکھی گئی ہے۔ ارادی فریب کی اس سے بڑی مثال موجودہ ادب میں ملنی مشکل ہے۔ عباس کی تصنیف جان بوجھ کر طلسماتی بن گئی ہے اور کسی حالت میں بھی موجودہ صالح ترقی پسندی کا نمونہ نہیں کہی جا سکتی، یہ محض پروپگنڈہ کی آواز ہے۔ دوسری طرف وہ اشتراکی مبلغ ہیں جو جدید کو موجودہ ادب کا پیش رو سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے اکثر نے جان بوجھ کر اور کچھ بے سوچے سمجھے فسادات کی ذمہ داری، اقتصادیات اور معاشیات کے ان پیچیدہ اصولوں اور نظام میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو ابھی اس برصغیر میں رونما نہیں ہوئے ہیں اور جن کی فی الحال کوئی امید بھی نظر نہیں آتی ہے۔ معاشیاتی نظام یا اقتصادی مسائل اس وقت انتشار اور طوائف الملوکی پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں جبکہ ملک میں متضاد نظریے عملی طور پر جدوجہد کر رہے ہیں۔ برصغیر ہند و پاکستان میں ابھی تک کوئی نمایاں اقتصادی کشمکش خطرناک حد تک نہیں پہنچی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ملک میں ایک طرف کروڑپتی اور سرمایہ دار بستے ہیں اور دوسری طرف مفلس اور بھوکے مزدور لیکن ابھی تک ان کے اختلافات نے کوئی جماعتی شکست اختیار نہیں کی ہے بلکہ ان کی حیثیت کم و بیش انفرادی اور مقامی ہے اور اگر کسی حد تک فسادات میں واقعی اقتصادیات نے کوئی پارٹ ادا کیا ہے تو وہ ہندو سرمایہ داری ہے جو انقلاب کی روک تھام کی خاطر مسلم کشی پر بے پناہ سرمایہ صرف کر رہی تھی اور جس کی پالیسی کو عملی شکل دینے کے لئے حکومت ہند آلۂ کار تھی۔

فسادات ختم ہو گئے اور اس کی ہولناکیاں کے بعد دونوں سلطنتیں خوشحال ہو گئیں لیکن تحریک رہ گئیں۔ وہ لوگ جو شکست خوردہ ذہنیت کی ہوس میں دوسروں کی آزادی چھیننا چاہتے تھے ناکام ہو گئے

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

انسدادِ جرائم میں نفسیات کی اہمیت

نفسیات اس دور میں صرف ایک علمی مضمون ہی نہیں۔ بلکہ بہت سے ایسی پیچیدگیوں کا مداوا بھی ہے۔ جس کے لئے پہلے قانون کی مدد لینی پڑتی تھی۔ امریکہ میں اس سلسلہ میں جو تجربات ہوئے ہیں وہ کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ اُس ملک کے محکمۂ انسدادِ جرائم میں ایک ایسا شعبہ بھی ہے۔ جو ہر مجرم کا نفسیاتی پس منظر معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے مثلاً دو شخصوں کو کسی کے جرم میں عدالت میں پیش کیا جاتا ہے۔ عدالت مناسب تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ جرم کی وجہ مجرم کی بہیمانہ فطرت نہیں۔ بلکہ وہ واقعات ہیں جو آئے دن لوگوں کی زندگیوں میں پیش آتے رہتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نفسیاتی پس منظر میں واقعہ کی شدت بڑی گہری ہو جاتی ہے اور مجرم خطرناک افعال کا مرتکب ہوتا ہے۔ عدالت ایسے لوگوں کو آزمائشی سزائیں دیتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مجرم کو اپنے نظری ماحول میں بحالی کا ایک اور موقعہ دیا جاتا ہے۔ اس دوران میں اس کی حرکات کا بہت قریب سے جائزہ لیا جاتا ہے۔ اور اگر سُدھرنے کی کوئی مناسب صورت نظر نہیں آتی ہے تو پھر جیل خانہ کی سزا دی جاتی ہے۔

امریکہ میں جرائم کی نوعیت پر اتنا غور نہیں کیا جاتا ہے جتنا کہ فرد اور سماج کی مستقبل [illegible] گی کا۔ جیل خانوں میں بھی ہر قسم کے مجرموں کے لئے علیحدہ علیحدہ شعبے ہیں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کو مجرم کی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو بطور قیدی۔ پھانسی اور دوسری سنگین سزاؤں کے کوئی فیصلہ صادر نہیں ہو سکتا ہے۔ انسان کی حیثیت دیکھنے کا مقصد یہ ہے کہ سماج اس بات کی فکر مند ہے کہ صرف جرم ہی کو نہیں دور کیا جائے۔ بلکہ ایسے انسانوں کو دوبارہ سماجی زندگی کا ایک ذمہ دار رکن بنایا جائے جو اپنے راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ جیل خانوں میں ہر مجرم کا نفسیاتی جائزہ لیا جاتا ہے۔ کیونکہ زیادہ تر ایسے ہی لوگ جرم کے مرتکب ہوتے ہیں جو کسی خاص حالت کی بنا پر اس کے لئے مجبور کئے گئے ہوں۔ کوشش کی جاتی ہے کہ ان مجرموں کے ذہن سے ہیجان دور کیا جائے تاکہ وہ پھر کسی جرم کے مرتکب نہ ہوں۔ اُن کے ساتھ بڑی نرمی اور خلوص کا برتاؤ کیا جاتا ہے جو ان کی مجرمانہ فطرت کے بالکل متضاد ہوتا ہے اور جب مجرم خود اپنی نظر سے اس تضاد کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ اپنے کئے پر شرمندگی محسوس کرنے لگتا ہے۔

اکثر مجرموں کو سخت اور بھاری کاموں کا عادی بنایا جاتا ہے کیونکہ ماہرین نفسیات کے اندازہ کے مطابق یہ لوگ اپنی بیکاری اور تساہلانہ زندگی کی وجہ سے جرائم کے مرتکب ہوئے تھے۔ یہ طریقہ بھی بڑا مفید ثابت ہوتا ہے۔

کچھ لوگوں کو جلاوطنی کی سزا دی جاتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے ماحول کے فوری اثر سے کنارہ کش ہونے کی وجہ سے بہت جلد راہ راست پر آجاتے ہیں اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ مجرموں کو بطور منصف اور جج بنا دیئے گئے ہیں اور جب انہیں خود دوسرے مجرموں کے متعلق سوچنے اور فیصلہ کرنے کا موقعہ ملا تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔

بقیہ:- "اور انسان مر گیا"

ان مبلغ اور پرمغز گفتار ادیبوں کو بھی شرمندگی ہوتی جن کو ہے ہوئے سانحہ کی وجہ کریدنے میں ایذارسانی اور خود آزادی کی لذت محسوس ہوتی تھی۔ بیمار آدمیوں کے ہاتھ سے زندگی ذہنیت کا سرمایہ بچا جاتا رہا۔ زندگی کی توانائی، صحت مندی کی طرف مائل ہے۔ انسانیت کا چراغ آج بھی اسی تابانی سے فروزاں ہے جتنا فساد کے پہلے تھا اور ہمیشہ آدمیوں کے ذہن میں جلتا رہے گا۔

مہربانی فرما کر سائیکولوجی کو غور سے پڑھیئے

پیش کردہ
ایم اقبال بھٹی

نمکدانِ صحافت

حدود اربعہ

فنِ صحافت دنیائے خیال کا ایک ایسا جزیرہ نما ہے۔ جسے ایک طرف سے دنیائے خریداران اور ایک طرف ایجنسیوں کے سمندر نے گھیر رکھا ہے اس کی موجیں ساحل کو کٹا پھٹا رکھتی ہیں۔ چوتھی طرف حکومت کا کوہ گراں کھڑا ہے جو جزیرہ نما کی حدود کو باہر کی طرف سرک جانے سے روکتا ہے۔

قدرتی تقسیم

جزیرہ نما چار قدرتی حصوں میں بٹا ہوا ہے

۱۔ حکومت پرست سرمایہ دار اخبارات
۲۔ حکومت پرست غریب اخبارات
۳۔ آزاد خیال سرمایہ دار اخبارات
۴۔ آزاد خیال غریب اخبارات

پہلے خطے میں سب سے مشہور مقام ڈان (انگلش) کا ہے دوسرے خطے میں انجام، جنگ اخبارات کو شرف حاصل ہے تیسرے خطے میں سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ پاکستان ٹائمز وغیرہ معروف ہیں اور چوتھے خطے میں قدرت نے مینہ، زمزم، انقلاب اور زمیندار جیسے اخباروں کو جگہ عطا فرمائی ہے

آب و ہوا

پہلے خطے کی آب و ہوا سرد مرطوب ہے۔ دوسرے کی سرد خشک تیسرے کی گرم مرطوب اور چوتھے کی گرم خشک

مشہور دریا

دنیائے پریس ایکٹ بہت مشہور ہے جس کی بے شمار شاخیں کوہ حکومت کی چھوٹی چھوٹی بہت سے نکلتی ہیں۔ یہ معاونوں کو اکٹھا کرتا ہوا "پریس ایکٹ" بن جاتا ہے یہ دریا کبھی کبھی تو بتدریج چڑھنے لگتا ہے اور کبھی اچانک طوفانی طغیانی لاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں آزاد خیال اخبارات کی زرخیزی کو بہا لے جاتا ہے اور حکومت پرست خطوں میں لے جا کر بچھا دیتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی طغیانی "ضبطی ضمانت" کے نام سے مشہور ہے۔

دوسرا دریا "پبلشر" ہے اس کی رفتار بھی بہت تیز ہے اور یہ اپنی رو گاہ بھی بدلتا رہتا ہے لہٰذا اس کی وجہ سے بستیاں کئی کئی بار اجڑتی ہیں اور نئے سرے سے بستی رہتی ہیں۔

بارش

بحیرۂ خریداران اور بحرِ ایجنسی سے جو مون سون ہوائیں اٹھتی ہیں وہ پہلے تو مرطوب علاقوں میں بارش برساتی ہیں اس کے بعد خشک علاقوں میں کچھ چھڑکاؤ کر دیتی ہیں بحرِ ایجنسی سے کبھی کبھی کھیتوں کو جلا دینے والی بادِ سموم بھی چلتی ہے۔ خدا اس سے بچائے۔

پیداوار

اِن بارشوں کے طفیل صحافت کی سرزمین میں طاقت پیدا ہوتی ہے اور یہ لیڈر نام کی فصل پیدا کرتی ہے۔ جس سے مشہور پھل تقریریں کانفرنسیں، جلوس، نعرے، ریزولیوشن اور بیانات ہیں یہ پھل ملکی منڈیوں میں تو بہت قیمت پاتے ہیں البتہ ان کی مانگ بیرونی ممالک میں کم ہے

دوسری فصل غیر شاعر شعراء" اور اسلم نگاروں کی جھاڑیاں ہیں جو پھل دار جنس ہونے کی وجہ سے زمین کو زرخیز بناتی ہے۔ دنیائے صحافت کی آبادی کو اس کے ثمرات سے کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، یہ خودرو ہونے کی وجہ سے بکثرت اگتی اور گہری جڑیں چھوڑ دیتی ہے۔ لہٰذا ایڈیٹر اس کا استعمال کرنے میں بالکل بے بس ہوتا ہے۔

آبادی

اس دنیا میں حسب ذیل باشندے بستے ہیں۔

۱۔ کاتب۔ عام قسم کی دو مسری مخلوق سے اتنا ممتاز ہے کہ دور سے پہچانا جاتا ہے۔ دیکھنے میں بہت غریب اور طلیح لیکن [illegible]

بقیہ۔ ہنگامۂ صحافت

جیسی زبردست مخلوق اس سے کانپتی ہے۔ البتہ مرطوب علاقوں میں جہاں "باران" نازل ہوتی رہتی ہے وہاں یہ خوب گھل مل کر رہتا ہے۔

۲۔ **منیجر** ۔ بظاہر تو یہ دفتر نامی غار میں مسکینی کے ساتھ بیٹھا نظر آتا ہے لیکن درحقیقت صحافت کا پورا کرہ اس کے سینگ پر ٹکا ہے۔ جب کبھی یہ سینگ کو ہلا دیتا ہے تو زلزلہ آجاتا ہے۔ ضرورت پڑے تو اس کے ہاتھ پاؤں "سہان" کالعدم ہاتھ پاؤں کا کام دے جاتی ہے۔

۳۔ **ورکنگ جرنلسٹ** ۔ خشک علاقوں اور ریگستانوں کا جہاز ہے۔ کئی کئی دن بے کھائے پیئے گزر کر سکتا ہے۔ باربرداری کے کام آتا ہے۔ جس رُخ کوئی چاہے چلا لے۔ اس کی ایک قسم ایسی ہے جو ایک خاص پسندیدہ منزل کے سوا کسی جانب ایک قدم بھی نہیں رکھ سکتی۔ لیکن بہت معدود اور نایاب! کیونکہ اس خاص قسم پر افلاس نے تباہی لا رکھی ہے۔

۴۔ **چیف ایڈیٹر** ۔ یہ ورکنگ جرنلسٹ اور مالک اخبار کی درمیانی کڑی ہونے کی وجہ سے دونوں کے اہم خواص کا جامع ہوتا ہے

۵۔ **مالک اخبار** ۔ اس کے جسم کا اہم قابل ذکر حصہ تھیلی ہے۔ اس کا مشغلہ آنکھیں دکھانا ہے۔

۶۔ **مالک پریس** ۔ مرطوب علاقوں میں اس کے بدن کا ہر ہر عضو ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اتنا ڈھیلا کہ اسے روندتے ہوئے گزر جاؤ تو بھی جنبش نہ کرے گا۔ لیکن خشک علاقوں میں اس کی اکڑ فوں اور اس کی چنگاریں مالکان جرائد کا خون خشک کر دیتی ہیں۔ عموماً "باؤ" کی خوفناک آواز نکال کر ڈراتا ہے۔

۷۔ **آر۔ ایم۔ ایس** ۔ یہ صحافتی دنیا کا "جن" ہے جو عوام کے لئے غیر مرئی ہے۔ لیکن مالک، ایڈیٹر اور منیجر اس کے تصور سے خواب میں بھی چونک اُٹھتے ہیں۔ ہر اخباری ادارے کو لازماً اس سے واسطہ پڑتا ہے۔ لہٰذا اسے اخبار خوری کی عادت سی ہو گئی ہے۔ اس کے بے شمار منہ ہوتے ہیں اور ہر منہ میں سیکڑوں زبانیں۔ ایک ایک پرچہ پر منہ ٹھونس دے تو سب اچھا ہے۔ ورنہ سیکڑوں زبانوں کا ایک لشکر جرار ادھر ہو جاتا ہے۔ بعض اخبار تو اس کی زد پر آکر ڈیکلیریشن یعنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ جو لوگ اخبار نہ ملنے کی شکایات بھیجتے رہتے ہیں انہیں اس "شہزادہ جن" کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔

معاشرت

یہاں کے لوگ عموماً عالم خیال میں اُڑتے رہتے ہیں۔ بیچارے تو کاغذ کی کشتیوں پر سفر کرتے ہیں۔ کاغذ ہی ان کی مشہور غذا ہے اور کاغذ ہی زیبائش ہے یہی وجہ ہے کہ کاغذ فروشوں کے ہاتھوں میں یہاں آبادی کی جان ہے یہ لوگ مشین گنوں کا مقابلہ سوئیوں سے کرتے ہیں۔ قلم ان کا مشہور نیزہ ہے۔ شریف راہ گیروں پر عموماً رنگ برنگ کی سیاہیاں انڈیل دینا ان کا عام مشغلہ ہے۔ یہ سیاہیاں اس خون کی آمیزش سے بنتی ہیں، جو لوگوں کو ڈرا کر بہایا جاتا ہے۔

——— ماخوذ

مزدور

اس روز ریل میں دیکھا۔ ایک قلی کو بابو صاحب نے دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔

یہ دیکھ کر دل بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کیا دنیا میں غریب ہمیشہ یوں ہی ذلیل ہوتے رہیں گے؟ جو مزدور اپنے گوشت اور پوست کا ایندھن دے ریل چلاتا ہے وہ تو خود پٹڑیوں پر پڑا ہوا ہے ریل پر تو بے ٹکٹ بیٹھے ہیں کیا کہا "خواہ دیتے ہو" مناظروں کہتے شرم نہیں آتی۔ مزدور کو چند پیسے دے کر تم نے دولت کے انبار لگا لئے ہیں۔

سڑکوں پر موٹر۔ سمندر پر جہاز۔ فضا میں طیارے۔ شہروں میں مشین یہ سب کس کے بنائے ہوئے ہیں اور کون انہیں چلاتا ہے تمہارے قصر و ایوان کس کے خون سے رنگے ہوئے ہیں ان کی ایک ایک اینٹ پر کس کا افسانہ درد کندہ ہے۔ خاک کے ایک ایک ذرے کو اس جاہ و جلال کا اصلی راز معلوم ہے۔

——— (قاضی عبدالاسلام)

جناب غلام فرید بھٹی

سراپاءِ مہاجر

[illegible] محبت کا مجسمہ لمبا قد مگر رعنائی
مفقود۔ [illegible] دل کی راحتوں سے بے خبر
[illegible] کی رسائیوں۔ رو [illegible] آنکھوں کی چمک غائب دانتوں
[illegible] مدارد۔ چہرہ اُداس [illegible] ہاتھوں میں لرزہ۔ خون کی روانی
[illegible] آگاہ۔ پیشانی پر غموں اور [illegible] مصیبتوں کے بوجھ اٹھا کر تلواروں کی
جھنکار اور گولیوں کی بوچھاڑ میں [illegible] کانپتا بیوی بچوں کی عزت
و ناموس اور زندگی بچانے کے لئے بھاگ دوڑ کر اپنے آبائی وطن کو
حسرت بھری نظروں سے تکتا ہوا سرزمین پاکستان میں پہنچا۔

جنگجو قوم کا جواں مرد سپاہی۔ ارادے کا اٹل، خیال کا پکا ایمان
کا سچا جذبۂ استعمار کو صبر و ضبط کی لاتعداد تہوں میں سمیٹتے ہوئے نیلے آسمان
کو دل میں کبھی بار تک کر سرد آہیں بھرتا ہے اور خاموشی کے ساتھ اُف
کہہ کر پھر چپ سادھ لیتا ہے۔

وہ بھوکا ہے مگر دستِ سوال دراز نہیں کرتا۔ کپڑا پاس نہیں مگر وہ
اس سے بے پرواہ ہے۔ سردی اُسے ستاتی ہے گرمی اُسے پریشان
کرتی ہے مگر وہ شاکی نہیں۔ دنیا اُس پر ہنستی ہے مگر اُسے شکایت نہیں
گھر بار لٹا آیا۔ خویش و اقارب کی عزیز جانیں اُس کی آنکھوں کے
سامنے خاکِ وطن میں تڑپ تڑپ کر ہمیشہ کے لئے اُسے داغِ جدائی دے
گئیں اگر اُس کی آنکھیں پُرنم ہیں تو دل صبر و شکیبائی سے مالامال ہے۔

تمام مصیبتوں اور دکھوں کو اُس نے اپنے خون سے سینچے
ہوئے پاکستان کی خاطر برداشت کیا اور آج پاکستان کی محبت و
شفقت سے لبریز بانہیں اُسے اپنی آغوش میں لینے کے لئے
سراپا مصروف ہیں۔

مگر وہ اپنی عارضی تکلیفوں کے لئے اپنے ننھے پاکستان کے
لئے کیوں بوجھ بنے وہ اپنے قوتِ بازو سے اپنے بیوی بچوں کی
پرورش اور اپنی زندگی کے کل نظام کو چلانے پر تُلا ہوا ہے۔ کاشتکار
ہے تو زمین پر کام کر رہا ہے فن کار ہے تو اپنی محنت سے اپنا گذارا
کرتا ہے۔ پڑھا لکھا ہے تو ملازمت کر رہا ہے۔ غرض کہ وہ جانتا
ہے کہ اس کی دنیا تو لُٹ گئی مگر جو پاک درس اسلام اور پیغمبرِ اسلام نے
اُسے دیا ہے وہ کٹھن سے کٹھن راہوں میں بھی اُس کے لئے مشعلِ راہ
ہے۔

عورت نمبر کیلئے انعامی مضمون

مبلغ سو روپے نقد انعام

آخری تاریخ داخلہ ۲۸ اپریل سنہ ۱۹۴۹ء

اس مقابلہ میں ہمارے صرف تین سال والے مستقل خریدار شریک ہو سکتے ہیں۔ اس لئے اگر آپ ابھی تک تین سال کیلئے ہمارے رسالہ کے خریدار نہیں بنے ہیں تو آج ہی دس روپے بھیج دیجئے۔ علاوہ رسالہ کے آپ ایک کاپی "ذہنی عکس ریڈ کورس" کے بھی مستحق ہوں گے

۱۔ مقابلہ کا مضمون جو زندگی کے کسی نفسیاتی پہلو پر ہو ۲۸ اپریل ۱۹۴۹ء تک دفتر میں پہنچ جانا چاہیئے۔ خط یا افسانہ بھی بھیجا جا سکتا ہے۔

۲۔ فیس داخلہ کچھ نہیں۔

۳۔ اگر آپ ابھی تک، ہمارے خریدار نہیں ہیں تو مضمون کے ساتھ منی آرڈر رسید اور مندرجہ ذیل کوپن کا آنا ضروری ہے۔

۴۔ مشکوک مضمون شریک مقابلہ نہ ہوگا۔

۵۔ مضمون صاف اور خوش خط اور کاغذ کے ایک طرف لکھا ہونا چاہیئے۔ انعام یافتہ مضمون کے جملہ حقوق بحق رسالہ سائیکولوجی محفوظ ہوں گے۔

۶۔ مضمون کی نقل کا مصنف کے پاس ہونا ضروری ہے تمام مضمون بذریعہ رجسٹری آنا ضروری ہیں۔ ورنہ گم ہو جانے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

۷۔ ادارہ کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوگا۔

۸۔ ہر مضمون کے نیچے اپنا نام اور پتہ صاف اور خوشخط لکھیئے۔

۹۔ مقابلے کے مضمون مندرجہ ذیل پتہ پر آنا چاہیئے:۔

ایڈیٹر سائیکولوجی ۱۵/۵ الہ بخت آفندی منزل
فیرر روڈ کراچی نمبر ۱

انعامی مضمون

عنوانِ مضمون ____________________

نامِ مصنف ____________________

مُفصّل پتہ ____________________

تاریخ

بقیہ۔ روزمرہ سائنس کراچی سے

آدھ گھنٹہ ہواخوری یا دوڑنا آج ہی شروع کر دیجئے۔ ہواخوری یا دوڑ کے لئے صبح صبح کا وقت بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس وقت کا کیا پوچھنا۔ نور ظہور کا وقت ہے۔ سحر خیزی کی عادت بھی ہو جائے گی۔ بس اب لیت و لعل نہ کیجئے گا۔ اسی وقت سے بیڑا اٹھائیے کہ اپنے جسم کی تعمیر نشو و نما میں کچھ وقت روز ضرور صرف کریں گے۔ دیکھئے یہ سبق پھر بھول نہ جانا کہیں گستی ان سنی نہ ہو جائے۔

Regd. No. AS. 1247

سائیکالوجی

انگلستان کے مشہور نفسیاتی ماہنامہ کا اُردو ایڈیشن

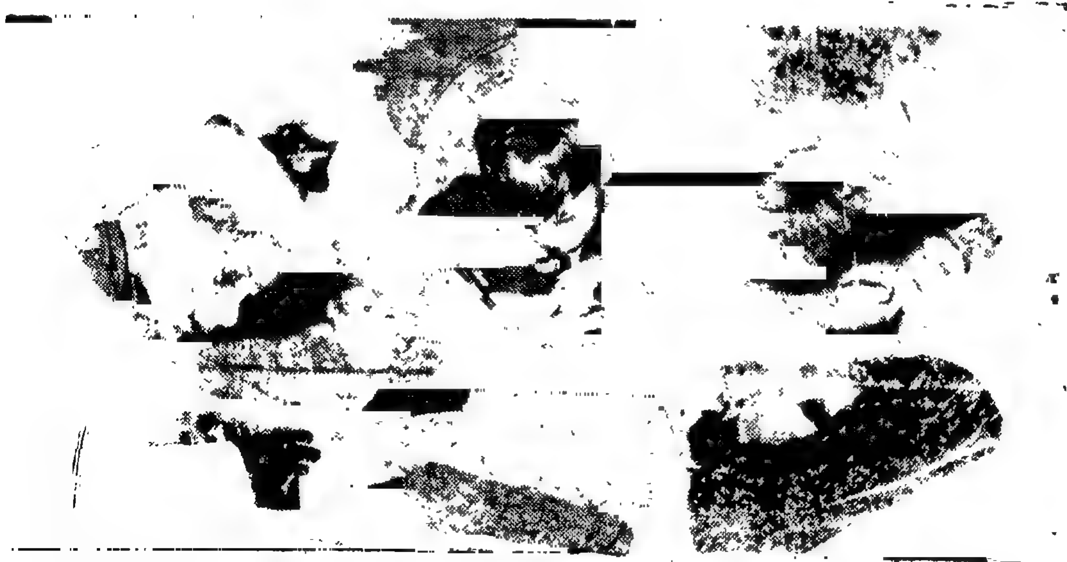


گھونگھٹ کے پیچھے——!



ملاحظہ ہو صفحہ ۲۱

یہ آج کے بچے



ملاحظہ ہو صفحہ ۱۹

[illegible] ئیکولوجی کا اردو ایڈیشن

ماہنامہ

سائیکولوجی اردو

ادارۂ تحریر

حسن محمود عروج —— سعیدہ عروج ایم اے

مدیر عمومی

انعام اللہ خان بی، اے، بی، ایل

[illegible] آنے (۸؍) —— اگست ۱۹۴۹ء —— چندہ سالانہ چھ روپے

[illegible] سائیکولوجی ۲۱۴/۲ میریٹ روڈ - (پوسٹ بکس ۵۰۹) کراچی ۲

[illegible]

مندرجات

پہلی نظر	عروج	۳
بات چیت	ادارہ	۶
عرفان محبت	معین الدین	۸
سوچ بچار	عروج	۱۱
سلام و پیام	ادارہ	۱۴
آپ بھی سوچئے	حسن محمود عروج	۱۷
یہ آج کے بچے	مترجمہ سعیدہ عروج	۱۹
گھونگھٹ کے پیچھے	جان وائی استاپلیٹن	۲۱
اندھیرے سے اجالے کی طرف	ترجمہ از سائیکولوجی	۲۵
سوچنا	ماخوذ	۲۷
جی ہاں یہ دروازہ ہے اسے ذرا کھول کر دیکھئے	سعیدہ عروج	۲۸
اٹھو اور جیو	ایل۔ایس۔ایلیٹ ام اے	۳۰
حیات و حقائق	آنسہ رئیس جہاں بیگم	۳۳
اپنی مدد آپ کیجئے	بشیر صدیقی	۳۵
فرار	حسن محمود عروج	۳۷

[illegible]

پہلی نظر

نظیری قصۂ فرہاد و خسرو داستانے شد
کنوں من ہم کتابی میکنم افسانۂ خود را

یہ اگست کا شمارہ ——— منزل کی سمت ہمارا دوسرا قدم ——— اور اس یقین کے ساتھ کہ ہم آگے بڑھے ہیں، پرچہ آپ کے ہاتھوں میں دے رہے ہیں ——— فیصلہ آپ کے چشم و دل پر منحصر ہے۔

بس اک نگاہ پہ ٹھیرا ہے فیصلہ دل کا
ہم خوب و ناخوب میں کیوں الجھیں ——— جو کچھ ہو سکا حاضر ہے ؎

لخت دل پر خونے از دیدہ فرو ریزم
لعلے ز بدخشانم بردار و بہ خاتم زن

پھر اگر کچھ کمی ہو تو فرمائیے کہ پوری کی جاسکے ——— لیکن ہمیں یہ عرض کرنے دیجئے کہ یہ جو کچھ ہے وہ ہمارے عزم و حوصلہ کی تصویر نہیں بلکہ عزم حوصلہ اور ہماری تمناؤں کا کہ ایک خاکہ اور ان کی سمت ایک اشارہ ہے۔

دنیا کی ہر شے درجہ بدرجہ اپنے ارتقاء کی طرف بڑھتی ہے ——— گامے بہ گامے زینہ بہ زینہ ——— پھر سائیکولوجی اس قانون قدرت کو سے اور دامن کش ہو کر کیسے گزر سکتا ہے ——— یہ جو کچھ بھی آپ دیکھ رہے ہیں نظارۂ منزل ہے منزل نہیں ——— اور یہ ایک صداقت ہے کہ منزل کی جانب "دوڑنے اور تھکنے" میں جو لذت و کیفیت ہے وہ منزل پر پہنچکر "دم لینے اور سستانے" میں نہیں!

انشاء اللہ سائیکولوجی جہاں بھی پہنچے گا اس مقام کو ایک مرحلہ سمجھ کر اور آگے بڑھ جائے گا ؎

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اضافے:-

اس شمارے میں تین نئے اور مستقل عنوانات کا اضافہ ہے:-

آپ بھی سوچئے — بات چیت — سلام و پیام۔

سلام و پیام ——— دراصل جوابات ہیں ان خطوط میں سے بعض کے ——— جو مدیر کو قارئین کی جانب سے وصول ہوئے ہیں - یا پھر مدیر نے کسی کو مخاطب کیا ہے ——— دیکھئے مخاطبین میں کہیں آپ بھی تو نہیں ہیں؟

بات چیت ——— کے ضمن میں یہ عرض کرنا غالباً ضروری ہو کہ "نفسیاتی الجھاؤ" اور "ذہنی کشمکش" فلمی چٹکلے نہیں کہ جن سے متعلق فوراً ہی کوئی جائز و ناجائز - بات لکھ دی جائے ——— اس میں اکثر و بیشتر "گرہیں" ایسی نکل آتی ہیں کہ جن کا کھولنا تحلیل نفسی کے بغیر ناممکن سا ہو جاتا ہے ——— آپ خود بھی نہیں جانتے کہ آپ کا ذہن لاشعور اپنے دامن میں کیا کچھ چھپائے ہوئے ہے ——— کسی کی صرف مختصر و مجمل سی تحریر کی بنا پر اس کے لاشعور کی تھا لینا ——— شاید صرف عالم الغیب کا کام ہے اور بیچارے مدیر سائیکولوجی کو ابھی تک یہ مقام حاصل نہیں ہو سکا۔

اس منزل پر اگر کبھی مدیر سائیکولوجی کچھ سمجھ نہ پائے تو گردن زدنی نہیں قابل رحم ہے !!

تصویر :—

سرورق پر حسب وعدہ تصویر حاضر کی جارہی ہے :———— یہ اقبال صاحب حیدرآبادی کی کاوش ہے۔
شاید اس سے متعلق اتنا لکھنا ضروری ہے کہ کتاب " علم " ہے جو حمائل ہے تلوار " طاقت " ہے جو کمر سے بندھی ہے ———— آدمی زمین پر چھا گیا ہے اور کونین پر حاوی ہورہا ہے " ———— آیندہ انشاءاللہ دوسری تصویر حاضر کی جائے گی ۔

قصور :—

" قوت ارادی " اور " مجھے بھی سوچنے دو " اس مرتبہ نہ دئے جاسکے، نظم کا صفحہ بھی اڑا دینا پڑا ———— " پہلی نظر " پہلے سے بھی زیادہ مختصر ہوگئی ———— کہ بعض زیادہ ضروری مضامین کا دینا ناگزیر تھا ———— بعض مشکلات طباعت و کتابت کے باعث اس مرتبہ بھی وہ ترتیب قایم نہ ہوئی جو ہمارے سامنے ہے ———— !

یہ تو ہیں ہماری وہ خامیاں جو ہم کو نظر آئیں، اب آپ فرمائیں ———— اور کیا ؟

لاریب کہ آپ کی چشم و نظر ہی وہ آئینہ ہے جس میں ہم اپنے خط و خال دیکھتے ہیں ———— ہمیں اس سے محروم نہ کیجئے

تہنیت :—

جس وقت یہ پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ عید گزر چکی ہوگی ———— لیکن پھر بھی ہماری جانب سے عید کی مبارکباد قبول فرمائیے۔ ———— کہ ہم عید بعد پہلی مرتبہ مل رہے ہیں یہ بھی تو ایک عید ہی ہے۔ یہ اگست کا مہینہ ہے ———— ۱۵ اگست جشن آزادی ہے ———— ہندوستان و پاکستان کو آزادی مبارک! ہر چند کہ آزادی کے بعد سے یہ دونوں ملکتیں جن مصائب و مشکلات سے گزر رہی ہیں وہ بہت بڑی اور روح فرسا ہیں لیکن آزادی اپنے دامن میں ہزاروں جنتیں لئے ہوئے ہے ———— ہمارا مستقبل بہرحال امید افزا ہے ————

ہم عموماً ہر باشندۂ پاکستان و ہندوستان سے اور خصوصاً اپنے قارئین سے اس کے متمنی ہیں کہ وہ اپنے اندر ایک آزاد ملک کے آزاد فرد کی طرح احساس ذمہ داری بیدار کریں اور اپنی آزادی کی زیادہ سے زیادہ قدر و حفاظت فرمائیں ۔

آیندہ شمارہ کی ایک جھلک

۱ ۔ قوت ارادی ۔ انسان کی وہ طلسمی طاقت ۔ " سمٹ کر پہاڑ اس کی ہیبت سے رائی " ۔

۲ ۔ عمر کے ابتدائی پانچ سال ۔ محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بی اے ۔ ڈپ ایڈ (عثمانیہ) ٹیچر جامعہ مصر ایف ۔ ٹی ۔ سی (لندن) کا نہایت ہی مفید اور معلومات افزا مضمون

۳ ۔ چند دماغی کیفیات ۔ پروفیسر ناصر علی زیدی کا بڑا دلچسپ نفسیاتی مضمون ۔

مستقل عنوانات :— (۱) بات چیت ۔ (۲) سلام و پیام

(۳) آپ بھی سوچئے ۔ (۴) مجھے بھی سوچنے دو ۔

اور دوسرے بہت سے مضامین ۔

پہلی تاریخ کو پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا ۔

آزادی مبارک ! آزادی زندہ باد !!

اب پرچہ آپ کے ذوق و نظر کے سامنے ہے ؎

بگیر ایں ہمہ سرمایہ بہار از من
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

عروج

دو دو باتیں

اشتہارات اس مرتبہ کچھ اشتہارات دیر سے ملے اور ان کے لئے جگہ نکالنا ناممکن ہوگیا ——— آیندہ بھی جو اشتہار ۱۰ تاریخ کے بعد وصول ہوں گے ان کو شریک اشاعت کرنا ہمارے لئے مشکل ہوگا، مشتہرین سے گذارش ہے کہ وہ اپنے اشتہارات مہینے کے پہلے عشرے میں روانہ کر دیا کریں۔

خریداروں سے: ——— اس مرتبہ ہمیں کئی ایسی شکایتیں موصول ہوئی ہیں کہ خریداروں کو پرچہ نہیں ملا ——— ہم اس سلسلہ میں کئی مرتبہ ڈاکخانہ والوں کو متوجہ کر چکے ہیں ——— بعض ایسی شکایتیں بھی آئی ہیں کہ قطعاً "اہل ڈاک" کی لاپروائی کا شرمناک مظاہرہ ہیں ——— مثلاً ہماری ایک خریدار کو صرف "ریپر" (وہ کاغذ جس میں رسالہ لپٹا تھا) وصول ہوا اور رسالہ "خداوندان ڈاک خانہ" "کھا" گئے ——— دفتر سے نہایت احتیاط سے ہر خریدار کا رسالہ پوسٹ کر دیا جاتا ہے اگر رسالہ آپ کو نہ ملے تو نہ صرف ہم کو مطلع فرمائیے بلکہ اپنے حلقہ کے پوسٹ ماسٹر اور جنرل پوسٹ ماسٹر کو لکھئے ہم نے اس مرتبہ پھر کافی شدت اور سختی سے ڈائرکٹر پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف کو لکھا ہے اور نتائج کے منتظر ہیں ———

ماہ جون کے پرچے میں "یہ کلام کس شاعر کا ہے" کے عنوان سے جو غزل شائع ہوئی ہے وہ حضرت غالب دہلوی کی تھی۔ حسب ذیل حضرات نے صحیح طور پر جواب روانہ کیا ہے۔ ان حضرات کے نام رسالہ ایک سال کے لئے جاری کر دیا گیا ہے۔

۱۔ اشرف صاحب نعمانی کراچی ۲۔ غلام عبد کانٹیبل سی۔ آئی۔ ڈی۔ کراچی ۳۔ وسیم صاحب جوہر کراچی ۴۔ محمد زکریا صاحب مائل کراچی۔ ۵۔ مقبول الٰہی صاحب درویش کراچی۔ ۶۔ عبدالوحید صاحب سحر کراچی۔ ۷۔ مولوی غلام حسین صاحب زاہد۔ تلہار۔ ۸۔ مشتاق احمد صاحب ادیب۔ کراچی۔ ۹۔ عبدالحیٔ صاحب الیکٹریشن کراچی۔ ۱۰۔ حکیم سید محمد امین صاحب دہلوی کراچی۔ ۱۱۔ سید محمد مددعلی شاہ صاحب کراچی۔ ۱۲۔ زاہدہ خاتون صاحبہ کراچی ۱۳۔ محمد صادق صاحب کراچی ۱۴۔ سید سعیدالدین صاحب کراچی ۱۵۔ عبدالرؤف خاں صاحب کراچی۔ ۱۶۔ روح افزا انصاری صاحبہ کراچی۔ ۱۷۔ انیس احمد خاں صاحب کراچی۔ ۱۸۔ دختر بدرالدین احمد صاحب کراچی۔ ۱۹۔ محمد اکرم بھلوی۔ کراچی۔ ۲۰۔ شیخ عبدالحلیم، عبداللہ کراچی۔ ۲۱۔ جی ایچ۔ عباس صاحب کراچی۔ ۲۲۔ ظہور شاہ ہاشمی بلوچی۔ کراچی۔ (منیجر سائیکولوجی)

بات چیت

فرد ــــ فرد کی بات چیت سے لاشعوری طور پر متاثر ہوتا ہے ــ کچھ کہیئے کچھ سنیئے ــ ــ کہنے سننے سے جی کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے ہم ذہنی طور پر ایک دوسرے کے لیئے مفید ہوں گے ــــــ "بات چیت" کا یہی مقصد ہے اور بس ــ ــــ !

دیکھئے کیا ہم آپ کے لیئے مفید ہیں ؟ ــــــ ہے آپ کی خاطر ہمیں منظور بہر طور ــــــــ !!

خواجہ محمد یعقوب منوڑا ۔ کراچی

" ہاں صاحب ! میرے ایک دوست ہیں وہ ہر وقت متفکر رہتے ہیں جب بھی پوچھتا ہوں کہہ دیتے ہیں : " گھر کی سوچ ہے " ــــــــ ہر وقت معمولی سی بات پر غمگین ہو جاتے ہیں ــــ فرمایئے ان کا کیا علاج کیا جائے کہ اس خیال سے کچھ بچیں ــــ یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ وہ غیر شادی شدہ ہیں تجھ صلاح و مشورہ سے فیض یاب فرمایئے ۔ شکریہ !

یعقوب صاحب ! جنسیت کا انسان کی زندگی میں بڑا مقام ہے جنسی دباؤ بھی آدمی کو مغموم رکھتا ہے ــــــ لیکن اس کے مثبت منفی دونوں پہلو آدمی کو متاثر کرتے ہیں ــــــ اگر آپ کے دوست اپنی خواہش و رغبت سے شادی کرتے ہیں تو یہ ان کا بہترین علاج ہو سکتا ہے ــــــ بیوی آدمی کا دکھ ہرتی ہے اسی لیئے تو نصف بہتر کہلاتی ہے ــــــ اور اگر ان کی خواہش نہیں ہے شادی کی تو پھر سوچنا پڑے گا کہ "گھر کی سوچ" کا کیا مطلب ہے ــ ؟ کوئی صحیح رائے تو اسی وقت دی جا سکتی ہے جب ان کے " غم کا بھید " معلوم ہو ۔ کون جانے آپ کے دوست بھی اس " راز " سے ناواقف ہوں ــــــ غالب کا وہ شعر یاد ہے آپ کو ؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ ۔ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

اس " بازی گر " کو پکڑنے کی کوشش کیجیے جو انہیں غمگین رکھتا ہے ــــ ممکن ہے وہ ان کے بچپن کے کسی حادثے کا اثر ہو اور شادی کے بعد بھی باقی رہے ۔

.... پیلتھبر ا ۔ م ۔ ٹریٹ کراچی ۔

آپ کا ... کیا جا رہا ہے ۔ آپ کا مسئلہ کافی الجھاؤ لئے ہوئے ہے

ث کا اثر آپ پر بہت زیادہ ہے ۔ غالباً ث کی جانب سے مایوسی ہوئی اور ث کی ہر جائز و ناجائز بات آپ کو عزیز ہو گئی ــــــ ث نے کہا " آپ کے ہاتھ میں ، گل پن کی لکیریں ہیں " اور آپ نے قلب و دماغ کی پوری توانائیوں سے اس جملہ سے " محبت " کرنا شروع کر دی ــــــ مجھے یقین ہے کہ آپ کے " پاگل " عزیز آپ کو اپنی تمام وحشتوں کے ساتھ اسی لئے یاد آتے ہیں ۔

ث نے غلط کہا ہے ۔ ہاتھ کی لکیریں ہمیشہ بنتی بگڑتی رہتی ہیں تمام ماہرین علم الید کا یہی اعتقاد ہے ہاتھ کی لکیروں پر اعتماد و یقین رکھنا دانائی نہیں آپ کی بھابی جان درست کہتی ہیں ۔ آپ عبادت کیا کیجیے اور ہو سکے تو روزے بھی رکھیئے اگر آپ کو مذہب پر اعتقاد ہے تو یہ آپ کے لیئے بہت مفید ہو گا ۔ آپ تنہا رہنا چھوڑ دیجئے اور ہر وقت اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں رہنے کی کوشش کیجئے آپ اپنے متعلق کوئی ایک قطعی فیصلہ کر لیجئے ــ " یہ یا وہ " ــــ " وہ یا یہ " آدمی کی سب سے بڑی کمزوری ہے ۔ تذبذب ایک دلدل ہے جس میں پھنسنا اپنی تباہی کو دعوت دینا ہے ــــــــ غالباً آپ کی اداسی غمگینی اور قنوطیت اسی تذبذب کی وجہ سے ہے ــــــــ قوت ارادی ایک بے پناہ انسانی طاقت ہے ۔ سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ کیجیے اور پوری مضبوطی سے اس پر قائم رہیئے خدا آپ کی مدد کریگا اور مسرت آپ کے پاؤں چومے گی ممکن ہو تو اپنے خیالات اور کچھ خواب (جو آپ کو یاد ہوں) پھر لکھ بھیجیئے ۔ ٭

ایل۔ عتیقہ ...... ازکراچی فرماتی ہیں:۔

"... میں درسی کتابیں پڑھنے بیٹھتی ہوں تو عجیب پریشان کن خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جس سرگرمی سے اپنا مطالعہ جاری نہیں رکھ سکتی اور جو کچھ پڑھتی ہوں اس کو صحیح طریقہ پر سمجھنے سے قاصر رہتی ہوں ــ نظر صفحہ کتاب پر ہوتی ہے ــ اور فکر آوارہ و پریشان دنیا جہان کی سیر میں معروف ہوتا ہے۔ پھر سر میں درد ہونے لگتا ہے ــ اور مجبوراً مطالعہ چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ میں نے کئی مقوی دماغ دوائیں بھی کھائیں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ (۔ کیا واقعی میرا دماغ کمزور ہے ــ یا کوئی اور بات ہے؟ ب۔ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ کیا کوئی نفسیاتی علاج ممکن ہے؟"

تکلف برطرف ــ آپ اس "بیابان" میں تنہا نہیں۔ ہمارے اکثر طلباء و طالبات اس دشت میں آوارہ اور "اس گناہ" کے مرتکب ہیں۔ دیکھیے میں نے آپ کی اس "پریشان خیالی" کو "گناہ" کہا ہے۔ یہ واقعی آدمی کا ایک "جرم و گناہ" ہے ــ کوئی بیماری نہیں نہ "دماغی کمزوری" سے اس کا کوئی علاقہ ہے ــ ــ ہمارے نوجوانوں کی اکثریت ایسی "غیر دلچسپی" کی شکار ہے آپ نے تحریر نہیں فرمایا کہ ہر مضمون سے آپ کی طبیعت اچاٹ رہتی ہے یا کسی خاص مضمون میں جی نہیں لگتا ــ پھر درسی کتابوں سے ہٹکر بھی کوئی کتاب آپ پڑھتی ہیں تو یہی صورت حال پیدا ہوتی ہے یا نہیں ــ ؟

غالباً آپ نے سوچ سوچ کر خود کو "دماغی کمزوری" کا "فریب" دے لیا ہے ــ اور شاید یہ صورت اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ آپ کو کچھ ایسے مضامین پڑھنے پڑتے ہیں یا پڑھنے پڑتے ہیں جن سے آپ کو دلچسپی نہیں تھی۔ (کسی مضمون سے دلچسپی نہ ہونا ایک الگ بحث ہے) ــ اگر آپ کے "سوچنے" کی رفتار یہی رہی ہے تو ڈر ہے کہ آئندہ چل کر آپ کو پڑھنے ہی سے نفرت ہو جائے گی۔ سب سے پہلے آپ یہ سوچنا شروع کر دیجئے کہ آپ کا دماغ صحت مند ہے۔ کمزور نہیں اور اپنی پوری توانائیوں سے یقین کیجئے کہ آپ ایک تندرست دماغ کی مالکہ ہیں ــ روزانہ غور فرمائیے کہ آپ نے آج کون کون سے ایسے کام کئے جو انتہائی طور پر عقلمندانہ ہیں ــ آپ کا دماغ روزانہ زندگی کے مختلف مسائل حل کرتا ہے انہیں اپنے سامنے لائیے ــ یہ سوچنا آپ کے "ایقان توانائی" میں معاون ہوگا ــ (بہتر ہے کسی دیانتدار اور صائب الرائے حکیم سے بھی مشورہ لے لیجئے ــ اس سے بھی آپ کے یقین کو ایک سہارا ملے گا)

پریشان فکری یا نزاعی خیالات (CONFLICTING IDEAS) کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں ــ جن کو تحلیل نفسی کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے ــ ! جب آپ کوئی ایسا مضمون پڑھ رہی ہوں جس میں آپ کو دلچسپی نہیں ہے ــ تو آپ اس مضمون کے دلچسپ پہلو کی تلاش کیجئے ــ اس میں کوئی نہ کوئی جز ضرور ایسا ہے جس سے آپ کو دلچسپی ہوگی ــ "مستقل مزاجی" سے دیکھئے کہ دلچسپ "نکات" آپ کے "سبق" میں کون سے ہیں۔ منفی طریقوں پر سوچنا چھوڑ دیجئے ہمیشہ اثباتی طریقوں پر سوچئے ــ "کیا دلچسپ نہیں ہے" سوچنے میں وقت ضائع نہ کیجئے یہ سوچئے کہ "کیا دلچسپ ہے" ابتداً آپ کو ذرا وقت ہوگی ــ لیکن تھوڑی سی مشق کے بعد آپ دیکھیں گی کہ وہ غیر دلچسپ مضمون دلچسپ اور آپ کا درد سر کم ہو رہا ہے اور اس طرح آپ کی "قوت ارادی" بھی پرورش پائے گی۔ جب آپ دیکھیں کہ پڑھتے پڑھتے اکتا رہی ہیں تو طبیعت پر جبر نہ کیجئے بلکہ کام کی نوعیت میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کر لیجئے۔ کتاب ہٹا دیجئے۔ دونوں ہاتھ لمبے چھوڑ کر سر کرسی کے تکیے سے لگا لیجئے پاؤں لمبائی میں پھیلا دیجئے آنکھیں بند کر لیجئے اور چند ثانیوں کے لئے مکمل آرام کی حالت میں آ جائیے اور پھر جو کچھ آپ پڑھ چکی ہیں اس کو دہرانے کی کوشش کیجئے آپ کو کچھ زیادہ دشواری نہ ہوگی تھوڑی سی توجہ سے ذہن خود بخود یہ کام سر انجام دیگا۔ اس کے بعد قلم اٹھائیے اور ان "نکات" کو نوٹ فرمائیے جو آپ کے ذہن میں شعوری طور پر قید رہ گئے ہیں ــ رفتہ رفتہ آپ اپنے سبق میں دلچسپی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی اور آپ کے زیر مطالعہ مضمون کا ایک اشارتی نوٹ بھی محفوظ ہو جائیگا جو ضرورت پر آپ کی "یادوں" کو تازہ کرنے اور دہرانے میں مدد دے گا

منصور احمد ریڈیو الیکٹرک ہاؤس فورٹ منشن ــ

آپ کے سوالات تمام تر طب سے متعلق ہیں ــ پھر بھی چونکہ انسان کی صحت و حیات سے متعلق ہیں لہٰذا ان کا جواب انشاء اللہ آئندہ شمارہ میں ضرور ملاحظہ فرمائیں

ش، ا۔ کراچی

آپ کسی فلمی رسالہ کو لکھئے ــ سائیکولوجی اس قابل کہاں کہ ممثلات کے حدود اربعہ اور ان کے جغرافیہ کو سمجھ سکے ــــــ شرمندہ ہیں کہ آپ سے اس موضوع پر کوئی "بات چیت" نہ ہو سکی ۔

عرفانِ محبت

معین الدین

نا امیدی! ——— بیشک اُن ہستیوں کا گلا گھونٹ دیتی ہے جو جذبۂ وصل کے تابع ہوتے ہیں اور اسی کو محبت کی آخری منزل سمجھتے ہیں ——— آہ ——— وہ کتنی فاش غلطی کرتے ہیں! وہ محبت کی کتنی سخت توہین کرتے ہیں!

محبت! کتنا پیارا لفظ، لیکن کتنا مسخ شدہ! ——— اسکے خیال سے احساسات متحرک ہوجاتے ہیں، تمنائیں جاگ اٹھتی ہیں، نفسِ عشرت بھڑک اُٹھتی ہے، آخر یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ کیا یہ اسلئے نہیں ہوتا کہ محبت کے تصور سے ایک حسین چہرہ سامنے آجاتا ہے، ایک جوانی ناچنے لگتی ہے، اور پھر اس پر قبضہ و تصرف کا خیال ہم میں ایک ہیجان پیدا کردیتا ہے، ہماری رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگتا ہے، بدن پر چونٹیاں سی رینگنے لگتی ہیں، ہماری ہوسناک آنکھیں چمک اٹھتی ہیں، مگر یہ جذبات دیرپا نہیں ہوتے ——— ایک آندھی ہوتے ہیں۔ ایک طوفان ہوتے ہیں جو تیزی سے آتا اور چلا جاتا ہے، اسکے پاس پامالی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اکھڑے ہوئے درخت، ٹوٹی ہوئی ٹہنیاں، جھڑی ہوئی کلیاں ——— مسلے ہوئے پھول ——— صرف یہی کائنات ہوتی ہے، بس یہی کائنات ہوتی ہے جو اسکے بعد بچ رہتی ہے ——— پھر کوئی جذبہ نہیں ہوتا، کوئی تمنا نہیں ہوتی، ایک سناٹا ہوتا ہے، اف! کس قدر بھیانک سناٹا! بالکل موت کی طرح۔

کیا محبت اسی آندھی کا نام ہے؟ اسی طوفان کا نام ہے، نہیں نہیں ——— یہ محبت نہیں ہوسکتی ——— یہ ہرگز محبت نہیں ہوسکتی۔ اس شیطانی تباہی کا نام محبت ہرگز نہیں ہوسکتا۔

"محبت قدرت کا ایک بہترین عطیہ ہے" ایک قابلِ قدر جذبہ ہے، محبت ایک شمشیر ہے ——— جی ہاں ——— شمشیرِ خارا شگاف، خیبر شکن فاتح عالم، محبت ایک شراب ہے ——— جی ہاں ——— شراب، ایک ایسی شراب جسکو خود غرض ڈھونڈنے پر بھی نہیں پاتا اور بے غرض کو آپ ہی آپ ملجاتی ہے۔ لیکن یہ شراب بے خود و بے حس کرنے والی شراب نہیں، تلخیوں کو مٹانیکا دھوکہ دیکر اور تلخیاں پیدا کرنے والی شراب نہیں، بے وجہ ہنسانے اور جگ ہنسائی کرانے والی شراب نہیں، یہ ایک مقدس شراب ہے، اس کا ہر ہر قطرہ اعلیٰ مذاق، ملبند مقاصد، فولادی عزائم اور جوشِ عمل کے جواہر سے بھرپور ہے۔

"محبت حصولِ مقاصدِ حیات میں بہت بڑی معاون ہوتی ہے"

تمنائے وصل ہرگز محبت نہیں، یہ محبت کی توہین ہے، محبت کا مضحکہ ہے، فضائے بسیط میں کسی چمکتے دمکتے ستارے کو دیکھکر اگر کوئی یہ سوچ کر فضا میں ہاتھ بڑھادے کہ کیوں نہ وہ اس کرۂ آب و تاب کو فضائے بسیط سے توڑ کر اپنے دامن میں چھپالے اور اس پر خود قابض و متصرف ہوجائے تو یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہوگی ——— نہیں نہیں یہ کوئی مضحکہ خیز نہیں، یہ اس سے بڑھ کر مضحکہ خیز ہے کہ ایک سادہ لوح انسان کسی اور کی روح کو اپنانے کی فکر میں ہو۔

تمنائے وصل محبت سے بالکل متضاد ہے، اور عام طور پر لفظ "میرا" یا "میری" جسکے پیچھے قبضہ و تصرف کی دبی ہوئی خواہش چھپی ہوتی ہے اس تمنا کی ترجمانی کرتے ہیں، تمنائے وصل خواہ کسی روپ میں ہو صرف قبضے و تصرف کی متمنی ہوتی ہے اور یہ خیال بہرصورت ناقابلِ تعظیم ہے" محبت تمنائے وصل کا نام نہیں" تمنائے وصل عین خود غرضی ہے اور خود غرضی ہی کسی محبوب شے کو اپنانے کی متقاضی ہوتی ہے اور اپنی شرارت اور حسد کے ہاتھوں معصوم محبت کا منہ نوچ لیتی ہے۔ گلا گھونٹ دیتی ہے، علامہ اقبال کا یہ شعر ؎

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق   وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب

اس حقیقت کی بہترین توضیح ہے اور بقول شاعرِ مشرق کے "یہی لذتِ طلب محبت ہے"۔
تمنائے وصل بڑے بڑے وعدے وعید کرتی ہے، کبھی چاند تک پہنچ جانیکے کبھی تاروں کو سمیٹ لانیکے کس قدر خوش کن! ——— کس قدر دلفریب!
لیکن ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، کوئی حقیقت نہیں ہوتی، وہ سراسر دھوکا ہوتے ہیں ——— ایک نظر فریب دھوکا ——— وہ سراب ہوتے ہیں جو پیاسے کو اپنی طرف کھینچتے اور پھر پتھروں کے ذرات میں تبدیل ہو جاتے ہیں، انھیں پیاسے کی تکلیف اور دل شکنی کا کوئی احساس نہیں ہوتا ——— پھر جو بچ رہے ——— وہ چور ہوتے ہیں جو آتے ——— کام نکالتے ——— اور چپکے سے چلے جاتے ہیں: "وہ جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ رنج و غم اور افسوس کے سوا کچھ نہیں ہوتا"۔

بعض والدین اپنی ایسی اولاد کو بھی اپنے قبضے میں رکھنے کے متمنی ہوتے ہیں جو سنِ شعور کو پہنچ جاتی ہے اور اس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ دنیا میں اپنا مقام آپ پیدا کر سکے، کیا یہ محبت ہے؟ ہرگز نہیں، یہ محبت نہیں ہوسکتی، یہ خود غرضی ہے۔

"سچی محبت خود آزاد رہتی ہے اور دوسروں کو بھی آزادی بخشتی ہے" یہ ہماری آزادی و حریت کی محرک ہوتی ہے اور ہم میں فولادی عزائم پیدا کرتی ہے، دنیا کے بڑے بڑے انقلاب اور انقلابی اس کے مرہونِ منت ہیں۔ دنیا کی کسی ممتاز شخصیت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں محبت کا عنصر اپنی کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود تھا، کہیں یہ اللہ کی خوشنودی کی طلبگار رہتی ہے کہیں ملک اور قوم کی معمار ہوتی ہے، کہیں سچائی اور حقیقت کی طرفدار ہوتی ہے، کہیں عورت یا مرد کی دلدادہ ہوتی ہے، بہر کیف ان کا مسلسل عمل اور فولادی عزائم صرف اس کے مرہونِ منت ہیں۔

"محبت انسان کی تکمیل کے لئے ایک اہم جزو ہے اور اس کے بغیر انسان ایک نامکمل مخلوق ہے"۔ محبت جب تکمیل کے درجے کو پہنچ جاتی ہے تو وہ انسان کو تمنائے وصل اور دیگر خود غرضیوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ محبت کا یہ درجہ انسان کو وصال و فراق سے بالاتر کر دیتا ہے، فانی کا یہ شعر:

منزلِ عشق پر تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
اس راہ میں آخر تھک تھک کر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

غالباً محبت کی اسی منزل کے لئے موزوں ہے اور اسی پر صادق آتا ہے۔
سچی محبت آزادی کی علمبردار ہوتی ہے، وہ ہمیں روحانی آزادی بخشتی ہے، وہ محبت کبھی سرسبز نہیں ہوتی جس میں تمنائے وصل کا عنصر شامل ہو۔ اس کی ناکامی عبرتناک اور کامیابی محدود و مختصر ہوتی ہے، یہ کامیابی کامیابی نہیں ہوتی۔ ——— ایک نظر فریب دھوکہ۔ اس کو قدم قدم پر ناکامی کا منہ دیکھنا ہے اور آخر کار اسکو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ "محبت کی تعمیر تمنائے وصل کی بنیادوں پر نہیں کی جا سکتی"۔

"دنیا میں سیکڑوں لوگ محبت کی بدولت نیک نامی و شہرت پیدا کر چکے ہیں" یہ کچھ ضروری نہیں کہ ہم کسی بڑی شخصیت ہی کو تمثیلاً پیش کریں۔ دنیا کے ہر کامیاب و کامران انسان کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے یا اس کے دل کو ٹٹولا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ صرف محبت ہی اسکے فولادی عزائم اور مسلسل عمل کو جاری رکھنے میں ممد و معاون رہی ہے ———

محبت پہ کوئی زور نہیں "تشدد نہ محبت پیدا کر سکتا ہے اور نہ اسکو فنا کر سکتا ہے" یہ ایک بے بہا تحفہ ہے جو آتی ہے، محبت قرضہ نہیں کہ مقروض کو لوٹانے پر مجبور کیا جائے۔ محبت مزدوری نہیں کہ معاوضہ طلب کیا جائے۔ یہ خدمت کرنا جانتی ہے۔ خدمت لینا نہیں جانتی محبت کرکے دوسروں سے محبت کا طلبگار رہنا اپنے استحقاقِ داد سے انکار کر دینے کے مترادف ہے۔
ہم کبھی یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ہمارا لڑکا بھی ہم سے ضرور محبت کرے گا کیونکہ وہ ہمارا لڑکا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں، یا وہ ضرور ہماری تعظیم کریگا کہ اس کو ماں باپ کی تعظیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہم لڑکے کے احساسات میں محبت و تعظیم کا جذبہ اسوقت موجزن پا سکتے ہیں جبکہ ہم میں وہ ایسے اخلاق دیکھے جو محبت کے ہوتے ہیں اور ہمارا ہی کردار ہماری اولاد میں محبت اور تعظیم کا جذبہ پیدا کرکے دوطرفہ محبت کو ممکن بنا دیتا ہے۔
"محبت اعصابی تحریک نہیں بلکہ ایک روحانی تحریک ہے" یہ ہمیشہ اعلیٰ مذاق اور حقائق سے پیدا ہوتی ہے اور وجود میں آنیکے بعد کبھی فنا نہیں ہوتی بلکہ ایک خوشگوار حقیقت کی شکل میں ہمیشہ ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

آہ —— یہ کتنا عبرتناک منظر ہوتا ہے جبکہ حسن اور جوانی کسی خود غرضی کا شکار ہوتے ہیں۔ چمن ہستی میں ایک پھول کھلتا ہے، چمن اس کی خوشبو سے مہک اٹھتا ہے، فضا معطر ہو جاتی ہے —— بھونرے طواف کرنے لگتے ہیں —— شہد کی مکھیاں بھنبھنانے لگتی ہیں —— لیکن یہ سب اسکی تر و تازگی تک ہوتا ہے، پھر کوئی بھونرا طواف نہیں کرتا —— کوئی مکھی نہیں بھنبھناتی —— لیکن محبت بھونرا نہیں جو رس چوس کر اڑ جائے۔ وہ ایک دوامی پرستار ہے، اس کی پرستش میں کبھی کمی واقع نہیں ہوتی۔ وہ وصل کے بعد نفرت میں نہیں بدلتی۔

بیشک —— حسن و جوانی محبوب کو دغا دے سکتے ہیں —— عالم بے خبری میں چھوڑ کر چلے جا سکتے ہیں لیکن محبت کبھی دغا نہیں دیتی۔ وہ حسن جوانی کی بجائے اعلیٰ کردار کی پرستار ہوتی ہے اور حسن و جوانی کے زوال کے بعد بھی اس کی گرمجوشی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

بے غرض محبت ہماری خودی کو بیدار کرتی اور اسکو حقائق کے جمالیاتی پہلو کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ وہ ہمارے دل کو وسیع سے وسیع تر کر دیتی ہے اور ایک ایسی وسعت بخشی ہے جس میں ساری دنیا سما جائے۔ وہ ہمیں شخص کی بجائے اشخاص اور اشخاص کی بجائے قوم اور قوم کی بجائے مخلوق —— محبت کرنا سکھاتی ہے۔ ایک ایسی محبت جیسی کہ ہم اپنی ذات سے کرتے ہیں۔ انسان محبت کے اس درجۂ کمال پر پہنچ کر مخلوق و خالق کی نظر میں بھی قابلِ تعظیم قرار دیتا ہے۔ اور اس کو "خیر النّاس" کا خطاب عطا ہوتا ہے۔

لیکن مجھے اسکا احساس ہے کہ میں ایک ایسا نظریہ پیش کر رہا ہوں جو محض ایک نظریہ ہے۔ اگرچہ کہ اس کی عملی مثالیں معدوم نہیں لیکن اسقدر شاذ و نادر ہیں کہ ان کا وجود عدم کے برابر ہے۔ لیکن کسی نظریے پر عمل نہ کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ نظریہ غلط ہے۔ ہماری کور ذوقی اسکے جمالیاتی پہلو کو سمجھنے سے باز رکھتی ہے اور ہم کو روحانی مسرت کی بجائے جسمانی مسرت کا مزہ چکھا دیتی ہے اور محبت کا یہ پہلو بہت عام ہے۔

جگر نے اس حقیقت کو کس قدر خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے ؎

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں

فیضانِ محبت عام تو ہے عرفانِ محبت عام نہیں

سائیکلوجی کراچی

پیش ... اُمیدؔ
جامعہ ... (...)

سوچ بچار

حسن محمود عزتہ

ندرت فکر و عمل کیا شئے ؟ ذوقِ انقلاب
ندرت فکر و عمل کیا شئے ہے ؟ ملت کا شباب
ندرت فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرت فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب

سوچ بچار سے کون سا آدمی خالی ہے ——— ؟ ——— کون ہے جو اس راہ کا رہرو نہیں ——— ؟؟ سب ہی اس تیر کے شکار ہیں ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

تخت حکومت پر بیٹھنے والے پرشکوہ انسان سے لے کر سرِ راہ بیٹھنے والا وہ فقیرِ بے نوا تک ——— جو ابھی آپ سے صرف ایک پیسہ کا طلب گار تھا سب ہی سوچ بچار کے قلزمِ عمیق میں غوطہ زن ہیں ! ——— کوئی درِ شہوار ہاتھوں میں لئے باہر آتا ہے کچھ لوگ صرف سیپیاں اکٹھی کر پاتے ہیں اور بعض سے خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں ——— !!

بہت سے لوگ صرف اپنے متعلق سوچتے اور بعض اللہ کے بندے " عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے " پر نظر رکھتے ہیں ——— !!!

" سوچ " خواہ اپنے متعلق ہو یا دوسروں سے متعلق ——— اور سوچنے کی نوعیت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ، اس وقت تک کوئی قطعی اور مفید " برآمد " نہیں کر سکتی جب تک کہ قوتِ فکر پوری توجہ کے ساتھ اس ایک نقطہ پر مرتکز نہ کر دی جائے جو سوچنے کا مرکز ہے

سوچنے سے پہلے ہم کو یہ طے کرنا پڑے گا کہ " ہم کیوں سوچ رہے ہیں اور کیا ؟ " جب تک مقصد سامنے نہ ہو اور اس کی افادیت پیشِ نظر نہ ہو کسی طریقہ پر سوچا نہیں جا سکتا کہ یہ انسانی جبلت و فطرت کے منافی ہے اور ہم اپنی فطرت کے تقاضوں کو کبھی بھی بھول نہیں سکتے ——— کبھی کسی ایسے مسئلہ پر ہم دماغ کام نہیں کر سکتا جس کا کوئی مقصد و فائدہ سامنے نہ ہو ہمیشہ ایک بلند مقصد اور اس کا کھلا ہوا فائدہ سامنے رکھئے ——— جب تک ایک واضح نہ ہو کوئی مقصد ، مقصد نہیں قرار دیا سکتا ——— مقصد ایک مشعل ہے جس کی روشنی میں سوچ بچار کا مسافر آگے بڑھتا ہے اور " افادیت " ایک منزل اس کو جانا ہے ——— کسی مقصد اور اس کی افادیت کو سامنے رکھ کر ہی ہم پوری توجہ سے غور و فکر کر سکتے ہیں

انسان ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہے ——— سوچنا اور سوچتے رہنا اس کی فطرت ہے ، سوچ بچار کی طاقت ہی اس کو اشرف المخلوقات بناتی اور خلافتِ الٰہیہ کا سزاوار گردانتی ہے ——— دیکھنا ، سوچنا اور عمل کرنا ——— یہی انسان کی سب سے بڑی دولت ہے۔ مشاہدہ اور فکر ہی آدمی کو بلندی سے ذرا آدن تک پہنچاتا ہے ، اس عطیۂ ربانی سے فائدہ نہ اٹھانا کفرانِ نعمت ہے سب سے بڑی گمراہی ہے اور خود کو انسانی سے نکال کر نباتات و جمادات کے گروہ میں شامل کرنا ہے !

لیکن ہم ایک ہی وقت میں بہت سے مسائل پر غور نہیں کر سکتے ——— ایک ہی وقت میں " مختلف نزاعی " مسائل پر سوچنا ذہنی ضیاع فکر کا اتلاف ہے ——— فکر کی اس نوع کی پریشانی ذہن کو تھکا ڈالتی ہے اور ہم " سوچ " کا کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے ——— ہر راہ والا مسافر اپنی منزل پر کبھی نہیں پہنچتا ——— غالباً وہ مشہور مقولہ آپ کے ذہن میں ہوگا " یک در گیر و محکم گیر " ——— ایک وقت

ایک ہی مسئلہ دماغ کے سامنے لائیے اور اپنے تفکر کی پوری توانائیوں سے سوچئے پھر جو نتائج بھی آپ کی سوچ نکالے گی وہ اہم ہوں گے ——— زندگی میں ایک جذباتی موقتی تماشہ گر نہ بنئے کہ "یہ کم ظرفی" ہے - زندگی پر ازل سے ابد تک محیط ہو جائیے کہ یہی انسانیت ہے ——— اور آپ کا صحیح طریق فکر ہی آپ کو اس رتبۂ بلند تک پہنچا سکتا ہے ——— یقیناً یہ ایک صحیح اور مفید طریق فکر نہیں کہ ہم اپنے ذہن کو ایک ہی وقت میں مختلف نزاعی خیالات کی آماجگاہ بنا کر غیر مفید بے نتیجہ اور آوارہ سوچوں میں گم ہو جائیں ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی   کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اور جہاں سے ہم کو بھی ہماری خبر نہ مل سکے وہ یقیناً انسانیت کا کوئی مقام نہیں بلکہ ایک جماداتی مرحلہ ہے بے بصر، بے حس، بے بس اور کور ذوق آدمی پتھر ہی تو ہے ؎

میر سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف   آہ! وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

"ہدف" کے تعین کے بعد ہی "تیر تفکر" کارآمد ہو سکتا ——— ایک ہی وقت میں بہت سے تیر نہیں چلائے جا سکتے اور ایک ہی تیر سے بہت سے مرغ "ذبح" نہیں ہو سکتے - کسی حکیم یا فیلسوف کی مثال سامنے رکھیے جس نے اپنی پوری زندگی اپنی ساری فکری توجہ سے کسی ایک ہی مسئلہ پر سوچنے میں صرف کر دی ہو - - - - اور کیا اس کے نتائج بکھر ہی نہیں ہیں جو ارتقائی منازل میں آدمی کے آج بھی رہنما ہیں - - - - - ایک فلسفی زندگی کا معمار ہوتا ہے صرف اپنے صحیح طریق فکر سے !! سوچئے ——— صحیح طریقوں سے سوچئے اور بے تکان عمل کیجئے یہی کامیابی کا راز ہے !!! اگر آپ مشکلات میں گھر گئے ہیں مصائب کا شکار ہیں - - - ——— توڑنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں دل و دماغ پر قابو رکھئے - مقصد کا تعین کیجئے اور حالات کی روشنی میں سوچئے ——— خود بخود راہیں پیدا ہوں گی -

ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے   خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر

دنیا کسی کو سرفراز نہیں فرماتی مگر وہ جو خود سرفرازی چاہتا ہے ——— قرآن حکیم کے تابندہ و پائندہ الفاظ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ آج بھی موجود و معروف ہیں - آپ اپنے تصورات میں انقلاب سمو لیجئے انقلاب آ جائیگا

پھر یہ ہماری کتنی بڑی بدقسمتی ہے کہ ہماری اکثریت آوارہ سوچوں کی شکار رہے اور کسی ایک مسئلہ پر کبھی سنجیدگی انہماک اور دلچسپی سے نہیں سوچتی ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ جس وقت ہم کسی مسئلہ پر سوچنا چاہتے ہیں تو ہمارا دماغ مختلف افکار کی آماجگاہ بن جاتا ہے، ہماری فکر میں انتشار شروع ہو جاتا ہے اور بہت سے دوسرے غیر متعلق مسائل ذہن میں انگڑائیاں لینے لگتے ہیں - لاشعور میں دبے ہوئے [illegible] جذبات اور مدتوں کی بھولی بسری باتیں ایکدم ذہن کی سطح پر ابھر آتی ہیں اور ہماری سوچ ان الجھیڑوں میں اس طرح الجھ کر [illegible] اٹھا پاتی مثلاً ہم کسی نہایت ضروری مسئلہ حیات پر سوچ رہے ہیں کہ ایک نہایت ہی نادر "مضمون شعر" ذہن [illegible] ہوتا ہے [illegible] ہی نہیں چکتے کہ ہمیں یاد آ جاتا ہے کہ "فلاں دوست کی شادی پر کوئی تحفہ خریدنے بازار جانا ہے" ——— ہم پھر ذہن [illegible] ہوتے ہیں لیکن ہماری زبان ثریا کے کسی گانے کا ایک بول دہرا رہی ہوتی ہے -

"ترے نینوں نے چوری کیا مورا چھوٹا سا جیا ——— پردیسیا !!"

اور ہم اصل مسئلہ سے ہٹ کر ثریا کی ترنم ریزیوں پر سوچنا شروع کر دیتے ہیں پھر یہ "سلسلۂ عشق" اتنا دراز ہوتا ہے کہ سلسلۂ زلف دراز المختصر بن کر رہ جاتا ہے

"ہماری سوچ پریشان اور فکر اس طرح آوارہ کیوں ہو گئی ؟" ایک سوال ہوتا ہے -

"ہماری سوچ میں "خلوص" نہیں ہے !" اس کا نہایت مختصر سا جواب ہے !!

(یہاں "خلوص" لغت سے بھی ذرا وسیع معنوں میں لیجئے اور "ارتکاز فکر" کو بھی اس کے دامن میں لپیٹ لیجئے ۔۔۔ ۔۔۔ نفسیاتی اصطلاح سے گھبرائیے نہیں ۔۔۔۔۔۔ ارتکاز ۔۔۔۔۔ کوئی عجیب المخلوق جانور نہیں بلکہ فکر و خیال کو کسی ایک نقطہ پر سمیٹ لینا ہی ارتکاز کہلاتا ہے)

فکر و خیال کی آوارگی اور انتشار ذہنی کو جو میں بے خلوصی کا الزام دے رہا ہوں یہ کوئی "مقطع" کی سخن گسترانہ بات نہیں بلکہ علمائے نفسیات کے "مشاہدات و تجربات ہی کچھ ایسے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ ہم بظاہر جس مسئلہ پر بہت زیادہ فکر مند ہیں حقیقتاً ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں"

اگر ہم "پرخلوص" طریقہ پر کسی مسئلہ پر غور کریں تو ہمارا ذہن کبھی آوارگی نہیں اختیار کر سکتا ۔۔۔۔۔۔۔ غور و فکر میں خلوص و دلچسپی نہ ہونے کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں ۔ یہ ایک الگ بحث ہے فی الحال دو ایک باتیں عرض کئے دیتا ہوں ۔

ہم لاشعوری طور پر اس مسئلہ سے نفرت کرتے ہیں اور ہم کو کبھی معلوم نہیں کہ ہم اس مسئلہ سے نفرت کر رہے ہیں ۔ تحلیل نفسی کے بعد ہی کچھ پتہ چل سکتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ اور ہم بہانا اپنے ذہن کو اس طرف رجوع کرتے ہیں ۔ ہم ایسے مسائل پر کبھی سنجیدگی سے نہیں سوچ سکتے تاآنکہ ہم اپنی اس لاشعوری نفرت پر قابو نہ حاصل کر لیں ۔ جب بھی ہم سوچنا چاہیں گے لاشعور دوسرے مسائل و معاملات ہمارے سامنے پیش کر دے گا یہاں تک کہ ہم سوچنا چھوڑ دیں گے یا تھک جائیں گے

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہماری دلچسپی کسی دوسری طرف مصروف ہوتی ہے مثلاً کسی دوسرے مسئلہ پر سوچنا چاہتے ہیں اور ذہن ایک کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے ۔ اگر ہم کو خود پر قابو ہو تو ہم جب چاہیں اپنی توجہ کو ایک طرف سے ہٹا کر دوسری طرف مرکوز کر لیں لیکن یہ "اقتدار" ہم کو بغیر مشق کے نہیں حاصل ہو سکتا (اس ضمن میں مختلف وہ جذبات بھی شامل ہیں جن سے ہمارا ذہن اثر پذیر ہوتا ہے ۔ بالکل لاشعوری طور پر)

ورنہ ایک پورے سر میں ایک "مکمل بھیجا" رکھنے والے کی سوچ میں "کمی و انتشار" کے کوئی معنے نہیں ۔ جب ہم کسی طرف توجہ نہیں دے سکتے تو ہم ضرور کسی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔ !

ایک ننھا طالب علم جو "جمع تفریق" سے اچھی طرح واقف ہے ۔۔۔۔۔۔۔ اپنے استاد کے سامنے ۳ اور ۲ کی حاصل جمع ۷ پیش کرتا ہے ! بچے نے غلطی کی ۔۔۔۔۔ یقیناً ۳ اور ۲ کا مجموعہ سات نہیں ہے ۔ کل یا پرسوں اس نے ۴ اور ۳ کی جمع بالکل صحیح کی تھی ۔۔۔ پھر اب کیا ہوا ؟

آج جس وقت بچہ ۳، ۲ کی جمع نکال رہا تھا ٹھیک اسی وقت وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اب سے پہلے کبھی کبڈی کھیل رہا تھا ۔۔۔ اس کے پاس پہلے کے ایک جوڑ کے نتائج موجود تھے ۔۔! پھر یہ جوڑ ۔۔۔۔۔ کبڈی ۔۔۔۔۔ زید اور اس کے ساتھی ۔۔۔۔ ۷، میں نے زید کو پکڑا ۴ + ۳ میں جیت گیا، ۳ + ۲ اف یہ ۳ + ۲ = ۔ ۔ ۔ ؟ وہاں ایک بکری بھی چر رہی تھی ۔۔۔۔۔ ایک آدمی اونٹ پر سوار گزر رہا تھا ۔۔۔۔۔ ۳ + ۲ اونٹ ۳ + ۲ ۔۔۔۔۔۔ ۴ + ۳

بکری، اونٹ، زید ۳ + ۲ ۔۔۔۔ کبڈی ۴ + ۳ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳ + ۲ = ۷

۳ + ۲ یقیناً ۷ نہیں ہوتے لیکن بچہ بیوقوف نہیں ہے ۔ وہ جوڑ باقی اس وقت بھی جانتا ہے بالکل اسی طرح جیسے کل جانتا تھا لیکن اس ۳ + ۲ کے نتائج ۷ نکالے ۔۔۔۔۔۔۔ !

آپ غلط کہہ رہے ہیں بچے نے غلط نہیں جوڑا بچے نے ۳ اور ۲ کو جمع نہیں ۴ اور ۳ جمع کئے ہیں ۔ وہ اس وقت آپ کے مدرسہ میں نہیں تھا اس نے آپ کے مدرسہ میں ۴ اور ۳ جمع کئے تھے اور وہ ۷ ہی ہوتے ہیں ۔۔!

آپ بچہ کو کبڈی کے میدان سے نکال لائیے وہ ۳، ۲ کی جمع غلط نہیں کرے گا ۔ یہ چھڑی ہاتھ سے پھینک دیجئے ۔۔۔۔۔۔۔ یہ اس کو کبڈی گراؤنڈ سے واپس نہیں لا سکتی اور دور کر دے گی پھر وہ کہیں دور کسی گھنے جنگل میں کسی بیری کی شاخوں میں چھپا ہوا بیر کھا رہا ہوگا ۔۔۔۔۔۔۔ اور اس کی سلیٹ پر ۳، ۲ کا مجموعہ ہمیشہ کے لئے ۷ مقدر ہو جائیگا ۔

میں نہیں کہتا کہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے مگر ایسا بھی ہوتا ہے !

اکثر لوگ خود کو اتنا منجمد بنا لیتے ہیں کہ کسی چیز پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں کرنا چاہتے ــــــــ وہ رسم قدیم اور مدتوں کے پڑے ہوئے نقشان راہ سے ایک قدم بھی اِدھر اُدھر ہونا گوارا نہیں کرتے ان کو اس کا یقین ہو چکا ہے کہ پچھلوں نے جو کچھ کہہ دیا ہے وہ حرفِ آخر ہے ــــ اور بزرگ جس راہ کو ڈھونڈ چکے ہیں اس سے ہٹ کر کوئی راہ بھی پیدا نہیں ہو سکتی اور اس طرح وہ اپنے دماغ کو کاہل بنا لیتے ہیں ــــــــ پھر جب کوئی ایسی گتھی ان کی زندگی میں آپڑتی ہے جو ان کے بزرگوں پر نہیں گذری یا گذر چکی ہے مگر ان کے علم میں نہیں آئی تو پھر وہ اپنی عقل کو ماؤف پاتے ہیں ــــ اس وقت ایسے لوگ قسمت پر ٹیکا دیکھ بیٹھ جاتے ہیں اور اللہ میاں سے شکایتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں ؎

پڑتی ہے اپنے خونِ تمنا پہ جب نظر   ہوتا ہے دل میں شک کہ خدا ہے بھی یا نہیں

وہ اپنے پچھلوں کی طرح اپنے اگلوں کے لئے کوئی "سہولت و راہ عمل" نہیں پیدا کرتے بلکہ خود تباہ ہوتے ہیں اور آنے والوں کے لئے قنوطیت کے سوا کچھ نہیں چھوڑتے ــ۔

شعلوں سے کھیلنا ہے تمنا کی پرورش   میں جل چکا ہوں تم کو ابھی تجربہ نہیں

ایسے لوگ شعلوں میں گھس کر مردانہ وار گذر جاتے نہیں بلکہ دامن بچاتے ہیں اور جل مرتے ہیں ۔ ان کے مسلک میں ہر عقدہ گرہ کشائی سے ماورا ہر معمہ لاینحل ہوتا ہے ۔ ہر گام پر تھک کر بیٹھ جاتے ہیں اور پریشان پڑتے ہیں ؛ عقل کام نہیں کرتی ! دماغ ماؤف ہو گیا !! ــــــ حالانکہ عقل کام کرنے کے لئے ہے اور دماغ ماؤف ہونے کے لئے نہیں !! عقل کا کام نہ کرنا اور دماغ کا ماؤف ہو جانا انسانیت کی توہین و تذلیل ہے جس کی سزا ناکامی نامرادی ہے ــــ ! سوچنا ہی انسانیت کی معراج ہے ــــ جو سوچ نہیں پاتا وہ گویا خود کو انسانیت کی بلندیوں سے نیچے گرا رہا ہے

شیر دوسروں کا شکار نہیں کھاتا ۔ چبائی ہوئی ہڈیاں بے مغز ہوتی ہیں ۔ دوسروں کے سوچے ہوئے راستوں پر چلنا بہادری نہیں اپنے ذہن کو بھی فکر دیجیے ۔ خود راہیں نکالنا اور ناکام رہنا اس سے بہتر ہے کہ دوسروں کے بتائے ہوئے راستوں پر آنکھ بند کر کے چلئے ۔ دنیا کی ارتقا کا اس دن آخری نقطہ ہوگا "خوابیے" (Dreamers خواب دیکھنے والے) نہ ہوں گے ۔ اور حیات انسانی کی وہ آخری ساعت ہوگی جب انسان سوچنا چھوڑ دیگا ــــــ ناکامی سے نہ گھبرایئے ہر ناکامی ایک تجربہ ہے اور ہر تجربہ ایک مشعل جس سے آپ کا مستقبل روشن ہوگا !!!

زندگی کسی مشین کی حرکت نہیں بلکہ صحیح سوچ بچار اور عمل سے زندگی ، زندگی بنتی ہے ۔ زندگی اور زندگی کی مسرتیں حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ سوچنے زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے ؎ جاگنا ہے جاگ لے افلاک کے سائے تلے ٭ عمر بھر سوتا رہے گا خاک کے سائے تلے

قوت فکر کا صحیح استعمال اور پھر اپنے سوچے ہوئے نتائج پر یقین محکم اور مسلسل عمل ہی کامیابی و سرفرازی کا ذریعہ ہے مشکوک نتائج فکر پر دھوبی کا کتا گھاٹ کا ۔ کی مثل صادق آتی ہے ۔

مشاھدات و تجربات قوت فکر و فیصلہ کی رہنمائی کرتے ہیں مشاہدات و تجربات پر جتنی دقیق نظر رکھی جائے گی سوچ بچار کے نتائج اتنے ہی شاندار ہوں گے قوت فکری مشاہدات و تجربات کی لاٹھی کا سہارا لئے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتی ــــــ وسیع مشاہدات اور پختہ تجربات کی بنا پر ہی سوچ بچار سے صحیح نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں ــــــ آدم سے لے کر آج تک کے مشاہدات و تجربات کا معلوم کرنا ہی سب سے بڑا علم ہے اور ان سے فائدہ اٹھانا انسانی کمال ــــ ماضی و مستقبل کے درمیان خط فاصل نہیں بلکہ دونوں کا نقطہ اتصال ہے ــــــ ماضی کی طرف دیکھنا ، سوچنا اور مستقبل کی طرف بڑھنا ہی میں کامیابی کا راز مضمر ہے ۔ نسل انسانی پر گذرتے ہوئے حادثات و سانحات ہی ہمارے مستقبل کی شمع ہیں ہم اس روشنی کے بغیر اندھیرے میں کھو جائیں گے ۔ بہترین انسان وہی ہے جس کے ہاتھ میں ماضی کی شمع ہو اور اس کے پاؤں مستقبل کی طرف دوڑ رہے ہوں ٭

گذارشیں :ــ ۱ ۔ جن حضرات کی خدمت میں رسالہ سائیکولوجی روانہ کیا جا رہا ہے وہ حضرات یا تو مبلغ پانچ روپے بذریعہ منی آرڈر روانہ کریں یا دفتر کو ممانعت کا خط لکھ دیں ۔ ۲ ۔ کیا آپ کا پتہ درست ہے ؟ اگر نہیں تو براہِ مہربانی اپنے صحیح پتہ سے مطلع فرمائیں کیونکہ نظام کی تبدیلی سے اکثر لوگوں کے پتے میں غلطی

صوبہ سرحد کے ساٹھ لاکھ دلاور افاغنہ

کی سرفروشانہ زندگی آج تک بیرونی دنیا کے لئے معمہ بنی ہوئی ہے

اس حریت پرور ملک کی تاریخ

دنیا کی عظیم ترین آزاد قوم کے فولادی عزائم۔ خارا شگاف ہمت اور بے مثال مجاہدانہ کردار کی

لازوال تاریخ ہے

یہ غیرت وحمیت کے پیکر انسان جو اٹک سے قندھار اور غزنی تک پھیلے ہوئے ہیں تمام عالم کی تحریک آزادی کے صحیح معنوں میں علمبردار ہیں

سنگ میل

نے اٹک کے اس پار میں مستقل طور پر اس سرزمین کی معاشرت تمدن، کلچر اور ادب کے متعلق معلومات بہم پہنچانے

کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے

اور اب

سنگ میل کا سرحد نمبر

اس صوبے کی ایک مکمل سیاسی، معاشی، عمرانی اور ادبی تاریخ ہوگا

اس نمبر کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں

سرحد کے قدرتی وسائل سرحدی معاشرت، سرحدی زبانیں،
سرحد میں اردو، سرحد میں موسیقی سرحد میں صحافت، سرحد کے جدید ادبی رجحانات،
سرحدی ریاستیں، سرحدی قبائل، سرحد کی سیاسی و انقلابی رفتار، ادبیات سرحد اور ان کے علاوہ .. ٣٠٠ صفحات پر پھیلے ہوئے نظمیں افسانے ڈرامے ترجمے فنکاروں
اور تاریخی مقامات کی بیشمار انمول تصاویر سرحد نمبر میں بلند پایہ ادیب صحافی سیاستدان، ماہر تعلیم، ماہر لسانیات، اور مورخ حصہ لے رہے ہیں۔ سرحد نمبر مفت حاصل
کرنے کے لئے اس کے سالانہ خریدار بن جائیے سرحد نمبر بہت بھاری تعداد میں چھپے گا۔ مشتہرین حضرات سے فائدہ اٹھانے کا نادر موقع ہے۔

سنگ میل کا ساتواں نمبر سرحد نمبر ہوگا

نیا مکتبہ محلہ خداداد پشاور

سلام و پیام

گدائے رسم محبت عروج ہے مت بھول
نوازشات سلام و پیام پیدا کر

۱ "خون" ـــ "جنسی بھوک" بنکر رہ گیا ـــ انقلابات ہیں زمانے کے ـــ ! زبان خنجر چپ بھی رہتی تو "آستین کا لہو" "خاموش" نہ رہتا ـــ "اہل دل" کی نگاہیں زیر نقاب "بھی جا پہنچتی ہیں!! "بر خود غلط" انسانوں کو معاف کر دینا چاہیئے ـــ وہ عتاب سے زیادہ ہمدردی کے مستحق ہیں ـــ "سمندر" کی تیز و تند "لہروں" کی قسم (کہ جو آپ کا کھلونا ہیں) اس "گندی تبدیلی" کا جس حد تک آپ کو شکوہ ہے ـــ اس سے کہیں سوا مجھ کو افسوس ـــ لیکن ماضی گزر چکا ـــ اور حال بدل گیا !! گذشتہ پرچہ گذرانا گیا تھا موجود حاضر ہے ـــ یہ انقلابات بھی دیکھئے ـــ اک شعلۂ منور کا متمنی ہوں ـ بھلا ہو میری "تردامنی" کا ـــ "سمندریوں" سے ایک رشتہ اخوت تو ہے ـــ اور حقوق اخوت کا حقدار ہوں ـــ کچھ تو کہئے کہ لوگ کہتے ہیں کیا ۔ آج غالب غزل سرا نہ ہوا ـ غالب کے بجائے یہاں آپ کا اسم گرامی مناسب اور موزوں ہوگا

۲ آپ کا مکتوب گرامی؟ ـــ اک "تنویر" عتاب و برہمی اک مظاہرۂ بیزاری و ناگواری ـــ ! یہ تجلیٔ جلال و جبروت ـــ "یوم الدین" کی تفسیر جیسے سامنے تھی ـــ قیامت اور آفتاب قیامت!! الحذر والحفیظ ـــ "وایاک نستعین" ورد زبان ہے ـ "عورت نمبر" میں میرا ہاتھ نہ تھا ـــ "باور فرمائیے میری ماں بھی ایک عورت ہے اور میں اپنی ماں سے "پناہ" نہیں مانگتا" ـــ ! گذشتہ پرچہ آپ نے دیکھا ہوگا ـــ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ه ذرا مسکرائیے تو ـــ یہ "تنویر تبسم" ـــ ہنستے پھول ہی اچھے لگتے ہیں!! کہئے اب خفا تو نہیں آپ ـــ ؟ پرچہ کچھ پسند آیا؟؟ آپ کی تنقید اور مشورے کا مستمند ہوں ـ اور متمنی بھی!! آپ ہی کا تو ہے سائیکولوجی ـــ !!!

۳ آپ کی "اداسی کا راز" ـــ سب کہاں کچھ "لالہ و گل" میں نمایاں ہو گئیں! ـــ خدا شاہد ہے مجھے آپ سے ہمدردی ہے آپ کی تحریر کا شکر گذار ہوں؟ ـ کچھ سمجھا بہت کچھ نہ سمجھ سکا!! اگر کچھ عرض کروں تو اندھیرے میں "تکے کا تیر" تکا بن جائے گا؟ حاصل؟ "تحلیل نفسی" ـــ "صبر طلب" ہے...

آپ بھی سوچئے

حسن محمود عروج

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ!
کچھ "تو" سمجھے خدا کرے کوئی!!

پچھلے دنوں کی بات ہے ——— میں سائیکولوجی کے لئے رات کو دیر تک کام کرتا رہا۔ صبح نو بجے نکل کر بس پر کراچی آنے کے لئے بیٹھا — ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور پنسل ——— کتاب میں ختم کر لینی چاہتا تھا۔ چنانچہ پڑھتا رہا اور پنسل سے نشان لگاتا گیا — خمار آنکھوں میں بھرا ہوا تھا لیکن . . . . سونے کی فرصت نہ تھی مجھے یہ کتاب جلد سے جلد ختم کر لینی چاہیئے!

مجھے نیند کی ضرورت ہے میں سونا چاہتا ہوں!!

عروج کی عروج سے کشمکش ہو رہی تھی۔ عروج کتاب پڑھتا رہا ——— اور پنسل سے نشان لگاتا گیا۔ اب دماغ نے جیسے سمجھنے سے انکار کر دیا ——— لیکن جبر عروج سے مجبور تھا۔

بس ایر پورٹ پہونچ گئی ——— میں نے اس مجادلہ و کشمکش سے گھبرا کر سگرٹ کی پیکٹ اور ماچس نکالی ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

ہر چند کہ پاکستان میں "مے" "حرام" نہیں لیکن اپنی "کور ذوقی" کو کیا کروں کہ آج تک کبھی نہ پی سکا ——— چائے اور سگرٹ کو مے و گزک کا نعم البدل سمجھ لیا ہے ——— گویا اس طرح اپنی مفلسی اور باپ دادا کی لاج رکھ رہا ہوں۔ "مے نوشی" اس وقت ممکن نہ تھی گزک میں قباحت نہ تھی ——— اس عالم مجادلہ و کشمکش میں سگرٹ بھی خوب ہے۔ ؎

آلام روزگار کو آسان بنا دیا
جو غم پڑا اسے غم جاناں بنا دیا

مگر اے وائے قسمت! پیکٹ میں صرف آخری سگرٹ تھی ——— اف رے وہ "اکلوتی سگرٹ"! کراچی پہنچنے میں ابھی پچیس منٹ تھے ——— "کاش! دو ایک سگرٹیں اور ہوتیں!"

میں نے سگرٹ سلگالی — کتاب پر نظریں جمالیں اور خالی پیکٹ کھڑکی سے باہر پھینک دیا ——— اف! یہ کیا؟ خالی پیکٹ میرے ہاتھ میں تھا اور پنسل باہر جا چکی تھی!! پنسل ایک دو آنے کی حقیر سی شے ہے ——— لیکن یہ غلطی ——— کیوں؟؟

میں نے کتاب بند کر دی اور سوچنے لگا ——— ! آپ بھی سوچئے!! صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے!!!

دہی ٹیرکینٹ سے کراچی ———— مجھے اپنا ایک شعر یاد آرہا ہے ؎

میرا فریب شوق ہے یا التفات دوست
میں خود کو پا رہا ہوں کسی کی نگاہ میں

دوپہر کا وقت —— دھوپ کی شدت، آفتاب کی حدت ———— جو شے کہ جس جگہ ہے ———— وہیں "آفتاب" ہے!!

آنکھوں کا نور ———؟ ———— نور جل جائے ابھی چشم تماشائی کا ———— میں نے دھوپ کی رنگین عینک آنکھوں پر چڑھالی!!!

ساون کا اندھا ہر چیز کو ہرا دیکھ رہا ہے ———! ———— فکر نے انگڑائی لی ————!!

مگر یہ کیا ———؟ ہر منظر نگاہ ———— زمین آسمان، جھاڑیاں ٹیلے ———— ہر شے نے اپنا رنگ بدل دیا ———— !! آنکھیں ٹھنڈک محسوس کر رہی ہیں ———— سورج کی تپ و تاب ———— دھوپ کی شدت جیسے کم ہوگئی مجھے یقین ہے کہ ہر شے اسی طرح ہے جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے تھی ———— کسی چیز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی صرف میں نے عینک لگالی ہے ———— عینک ———— رنگین کانچ کا ایک حقیر سا ٹکڑا ————!

میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہی حقیقت ہونی چاہئیے ————؟ حقیقت وہی ہے جو ہمیں نظر آتی ہو ————؟؟ حقیقت کا ادراک ہم اپنے محسوسات ہی سے تو کرتے ہیں ————!!!

پھر یہ کیا ————؟ کانچ کا بے حقیقت ٹکڑا ———— جس کو میں نے ہی بنایا ہے ———— کیا میرے ہی چشم و نظر کو فریب دے سکتا ہے؟

شاید نہیں ————!

لیکن آہ ———— یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر شے کا رنگ بدل رہا ہے ———— بدلا ہوا نظر آرہا ہے ———— میں ٹھنڈک محسوس کر رہا ہوں حالانکہ آفتاب اس طرح چمک رہا ہے اور زمین اسی طرح جل رہی ہے!!

پھر کسی طبیعیاتی کا یہ کہنا کہ رنگ کا کوئی وجود نہیں ———— مگر ———— "شے" اور ہماری آنکھ کا تصادم ———— سورج کی شعاعیں۔ اور سالمات میں انکا جذب و انعکاس ————! "بو" کچھ بھی نہیں ———— مگر چند ذرات کا شامہ سے ٹکراؤ ————!

کیا یہ جو کچھ ہے ———— سب ہمارے ہی محسوسات کی شعبدہ کاریاں ہیں ———— اور ہماری ہی اپنی اضافتیں ————؟ جن کو ہم شے کی "حقیقت" سمجھ رہے ہیں ————؟

پھر حقیقت کیا ہو؟

یہ جو کچھ آنکھیں دیکھتی ہیں ———— یہ جو کچھ دماغ سوچتا ہے ———— کیسے کہوں کہ یہی حقیقت ہے ————!

ہر شے حقیقت ہے اور کچھ بھی نہیں!!

کون جانے ———— حواس کی آنکھوں پر کوئی عینک چڑھی ہوئی ہے یا محسوسات کے چہرے زیر نقاب ہیں ————!!

سوچئے اگر فرصت میسر آئے ———— سوچنا خوب ہے ———— کہ "شے" کو "برتنے" سے زیادہ "شے" کے "سمجھنے" میں لذت و لطف ہے ———— ؎

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن!
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے تو نظر کیا؟

مترجمہ: سعیدہ عروج

یہ آج کے بچے؟ ہم سے کہیں زیادہ آزاد ہیں

(ایک اُستاد کے قلم سے)

میں ایک جگہ کیو سسٹم میں کھڑا تھا۔ میرے سامنے جو شخص کھڑا تھا وہ ایک قوی تنومند آدمی تھا۔ اسی اعتبار سے اس کی آواز اونچی تھی اور انداز گفتگو سے اس کی رائے بھی بھاری بھرکم محسوس ہو رہی تھی!

اس کے ساتھ جو آدمی کھڑا تھا بظاہر اس کا دوست معلوم ہو رہا تھا ——— اس لئے کہ اس کا طرزِ تکلم کچھ اس انداز کا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس آدمی کو یہ شخص ہمیشہ چند سنہری نصیحتیں کیا کرتا ہے

"اف آج کل کے بچے!" وہ سگرٹ کے دھوئیں کے گھنے بادل اٹھاتے ہوئے بڑے زور سے بولا "اُن کے سروں میں فقط ڈاکوؤں کی کہانیاں بھری ہوتی ہیں ——— ؟ یہ کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے ——— ان کا کام بس سگریٹ پینا اور سینما دیکھنا رہ گیا ہے ——— !"

"لیکن" اس کا دوست کہہ رہا تھا "میرا خیال ہے خود والدین ان کو بگاڑتے ہیں۔ انہیں بہت زیادہ آزادی دے رکھی ہے ——— اسی حساب سے انہیں ماہانہ جیب خرچ دیتے ہیں اور اس پر طرفہ ماجرا یہ کہ ان پر کڑی نگرانی نہیں کرتے ——— !"

اور پھر یہ اسکولوں میں جھک مارتے ہیں؟" وہ غرایا "کچھ بھی نہیں۔ جنگ کا زمانہ تھا تو وہ ہر چیز کے پیچھے پڑے رہتے تھے اور فضولیات میں وقت ضائع کرتے رہے ——— اور اب جنگ ختم ہو چکی ہے تو انہیں کوئی موزوں طریقہ نظر نہیں آتا جس سے یہ دنیا میں کسی کام کے ہو سکیں اور نیک بن سکیں!"

اس گفتگو نے میرے لئے ایک بڑا عجیب سا سوال پیدا کر دیا تھا۔ میرا دماغ یونہی سوالات جوابات کے طومار کی آماجگاہ بنا رہتا ہے اور اس وقت یہ ایک نیا مسئلہ تھا ———

کیا واقعی آج کے بچے ایسے ہی ہیں ——— کیا یہ سب سچ ہے؟ ——— کیا ایسی ہی تباہی آئی ہے ہمارے نوجوان نسل پر؟ سوالات کا ایک تانتا بندھ گیا ——— !

امر واقعہ ہے کہ آج کے بچوں کے متعلق بہت سے حالات ایسے ہیں جو اس قسم کے اندیشوں کو پیدا کرتے ہیں چند بچوں میں ایک سخت قسم کی "خطاکار ذہنیت" اور عام طور پر ہر بچے میں بے ادبی، بے ڈھنگے اور بے تکے پن کا برتاؤ ان کے لئے جن کے سر اُن کی ذمہ داریاں آن پڑی ہیں ایک نیا مسئلہ بن کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے ——— جیسے بھوت سامنے آکھڑے ہوں!

لیکن یہ سب جنگ کی کرامات ہیں ——— اور یہ ساری برکات اسی زمانہ کی پیداوار ہیں۔ اسی لئے ہر شخص بہ آسانی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مسائل بہ آسانی اور جلد حل ہو سکتے ہیں ——— اس لئے کہ جنگ کا زمانہ نہ اتنا چھوٹا تھا نہ اس قدر آسانیوں اور آسائشوں سے بھرپور! ———

چھ سال ——— پورے چھ سال کی بے لگام آزادی اور تعلیم نما بے تعلیمی - صرف چند مہینوں میں ان خلاؤں اور رخنوں کو پر نہیں کیا جا سکتا جو اس ظالم جنگ نے ہماری آیندہ نسل کے نصب العین کی سنہری دنیا میں ڈالے ہیں !

کیو سسٹم میں گرفتار ہمارے دوست کے خیالات ایک حد تک تو درست تھے لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہمارا دوست دو چار باتیں ضرور بھول رہا ہے ———!

کسی چیز پر اعتراض کرنے سے پہلے میں سمجھتا ہوں ہمیں یہ بھی ضرور دیکھ لینا چاہیئے کہ آخر ان کے وجوہات کیا ہیں ؟ اس طرح کیوں ہوا اور اس کے اسباب کیا تھے ؟ ——— بچوں کی پرورش، تربیت اور دیکھ بھال آسان کام نہیں اور بالکلیہ خاندان اور خاندانی ماحول پر مبنی ہوتی ہے ——— اور یہ جو آج کل کے بچوں کے متعلق ایک شور سا مچا ہوا ہے کہ بہت ہی غیر محفوظ طریقہ پر ان کی اٹھان ہو رہی ہے تو یقین مانیئے میں ان اعتراضات کو مانتا ضرور ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی فراموش نہیں کر سکتا کہ اس کے اسباب و علل کیا تھے اور ایسا کیوں ہوا تھا جس کے ضمن میں آج کل ایسا ہو رہا ہے اور پتہ نہیں آیندہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

"ایسا کیوں ہوا کی" پہلی کڑی تو یہ ہے کہ جب ہماری قوم نے ایک دست اعانت پسند کی ضرورت محسوس کی تو اس وقت کس ذوق و شوق اور وفادارانہ جذبہ کے ساتھ ہماری عورتیں آگے آئیں ہیں خدا کی پناہ ——— اس جذبہ کو ——— اس کی صداقتوں اور خلوص کو بھول جانا سراسر بے ایمانی ہوگی چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں بچے نرسری گھروں کی نذر ہو گئے اور یہ طے ہے کہ ایک عورت ہزار بچوں کی ماں نہیں بن سکتی وہ بیک وقت صرف ایک ہی بچے کی ماں بن سکتی ہے -

اب غور کرنے کی بات ہے کہ صبح سے شام تک فیکٹریوں، آفسوں اور اسکولوں میں جتا رہنے کے بعد کوئی اس قابل رہ جاتا ہے کہ گھر لوٹے تو تھکا ماندا ہو پھر بچوں کی خاطر خواہ دیکھ بھال بھی کر سکے ؟ کیا مرد دن دن بھر کام کرنے کے بعد اس قابل رہ جاتے ہیں کہ گھر پہنچ کر دوسرا کوئی کام کریں ؟

ایسے والدین پر اعتراضات تو بے شمار ہوتے ہیں لیکن کوئی اگر واقعی حقیقت بیں ہے تو اس کو ان حقائق کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے -

یہ سوال کہ آج کے بچے اپنے والدین کے مقابلہ میں بہت ہی بدتمیز قسم کے بچے ہیں ——— یعنی جب ان کے والدین بچے تھے تو انہوں نے ایسی بدتمیزیاں نہیں کی تھیں ——— اس کی وجہ یہی جنگ کی لعنت نظر آتی ہے جس نے نہ معلوم کتنے مستقبل تباہ کئے اور کتنے گھر اور برباد !

مجھے معلوم ہے کہ آج کی بارہ سالہ لڑکی کھانا پکانے کی بجائے سارا سارا دن کپڑوں کی صفائی اور نئے ملبوسات کی تیاری میں گذار دیتی ہے - یا پھر اپنے سے قدرے چھوٹے بچوں کی تربیت پر لکچر دیا کرتی ہے - اور میں ایسے لڑکوں سے بھی واقف ہوں جو اپنی تیرہ سالہ عمر میں ہل والی مشین کو بہ آسانی چلا کر اچھی طرح کھیتی کر سکتے ہیں یا کسی باغ کی دیکھ بھال کر سکتے ہیں لیکن ان کے لئے ترکاری کی ہلکی پھلکی کاشت کر لینا اور سینما دیکھنا بہت اہم کام بن جاتے ہیں -

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے دن بھر فیکٹریوں اور آفسوں میں ماں باپ پھنسے رہتے ہیں تو گھر میں مرد عورت کے فرائض پورا کرنے والے ان کی بڑی اولاد ہوتی ہے - ایسی حالت میں کسی تیرہ سالہ لڑکی سے زندگی کا کونسا راز چھپا رہ سکتا ہے اور لڑکا ؟ ——— شاید گھر میں ایک مرد ہوتا ہے !

یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آج کل کے بچے اپنی تیز فہمی اور چالاکی کی بنا پر زندگی کے نئے مسائل کو اپنے بڑوں سے زیادہ تیزی اور عمدگی سے سمجھ جاتے ہیں اور بڑی ہمت سے ہر آنے والے حادثہ کا مسکرا کر استقبال کرتے ہیں - اور یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اول تو وہ راشننگ اور پابندیوں کی دنیا میں پل کر جوان ہوئے ہیں لہذا ان کے ماضی میں ایسا کونسا اٹرکشن ATTRACTION ہے جس کو مڑ کر پیچھے دیکھیں - وہ جو ایک مثل ہے کھانے والا جانتا ہے کہ حلوے کا مزا کیسا ہے ؟ کے مصداق بچارے جتنی ان کی چادر ہے اتنے ہی پیر پھیلاتے ہیں !

(باقی ملاحظہ ہو صفحہ پر)

گھونگھٹ کے پیچھے

(جون وائی سٹیاپلیٹن)

جب دُلہنیں گھونگھٹ کے پیچھے اپنے حسین چہرے چھپالیتی ہیں تو کیا اپنی شرمائی ہوئی دوشیزیت کو چھپانے کی کوشش کرتی ہیں؟ یا اپنی شخصیت کی پراسراریت کو دوبالا کرنا مقصود ہوتا ہے؟ کیا اس رسم میں کوئی گہرے معنے پنہاں ہیں؟ یا یہ ایک مظاہرۂ شرم وحیا ہے یا اظہارِ فیشن؟

اس دلچسپ مضمون کے مصنف سے سنئیے ——— جس نے بڑی محنت سے مختلف نسلوں کے طریق و رسوم شادی پر روشنی ڈالتے ہوئے گھونگھٹ کے پیچھے ——— جو راز پنہاں ہیں اس پر نفسیاتی نقطہ نظر سے بحث کی ہے ——————— ۔

آج جب کہ جنگ کو ختم ہوئے تین سال گزر چکے ہیں لیکن کپڑے کی گرانی اور غذا کی قلت ویسی ہی ہے ——— اب تو خیر، حیرت تو اس وقت ہوتی تھی کہ جب کپڑے پر بڑی سخت قسم کی راشننگ تھی لیکن اس کے باوجود عورتیں شادی کی بھڑکدار پوشاک کے لئے مری جاتی تھیں۔ خوش قسمتی یہ تھی کہ لیسوں جالیوں اور ڈوریوں پر کنٹرول نہ تھا اور گھونگھٹ کا ارمان اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ پورا ہو سکتا تھا ——— اور ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ گو واقعات وحالات نے اجازت نہ دی اور شادی کا میلوں لمبا لباس تیار نہ ہو سکا تو دلہنوں نے اپنی ٹوپیوں میں گھونگھٹ ضرور لگوایا ——— اس شوق کا نتیجہ وہ بڑی بڑی انجمن اور سلائی گھر ہیں جہاں آج بھی بڑی آسانی سے شادی کے ملبوسات اپنی ساری خوشنمائیوں اور خوش اندازیوں کے ساتھ دستیاب ہوتے تھے اور ایک ایسا ہی لباس مسز روز ویلٹ، سابق صدر یونائیٹڈ اسٹیٹس امریکہ کے لئے تیار کروایا گیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر گھونگھٹ کے پیچھے وہ کونسی جادوگری ہے کہ دلوں کو بے اختیار کھینچ لیتی ہے۔

اتنا ماننا پڑیگا کہ کوئی کشش ہے ضرور ——— کیونکہ یہ ایک بین الاقوامی رسم ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جو گھونگھٹ آج کاڑھا جاتا ہے وہ اس رسم کی یادگار ہے جو کبھی انتہائی سختی کے ساتھ رائج تھا لیکن آخر کیوں ایک لڑکی کا منہ چھپالینا ضروری ہوتا تھا جب اس کی شادی ہونے لگتی؟

بھیس یا شرم وحیا؟ کئی نظریے اس بارے میں ہمیں ملتے ہیں۔ کبھی یہ ایک بھیس مانا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک زمانہ میں اس کو اس لئے اختیار کیا گیا تھا سمجھا جاتا تھا کہ جس لڑکی کی شادی ہونے والی ہے وہ بھوتوں پریتوں کا من بھاتا کھاجا ہوتی تھی اور وہ ہمیشہ ان کی بدنیتی کا نشانہ بنا کرتی ——— اور اگر اس کا چہرہ ڈھنکا رہتا اور دوسری لڑکیوں کو اس کا ہم لباس بنا کر اس کے ساتھ کیا جاتا تو ان بھوتوں پریتوں کے لئے پہچاننا مشکل ہو جاتا تھا کہ اصل دُلہن کون ہے ——— ہے

زمانۂ قدیم میں دلہن کو اس کے شوہر کے پاس پہنچانے کے لئے بند پینس استعمال کی جاتی تھی۔ آگے آگے آدمی ننگی ننگی تلواروں سے ہوائیں کاٹتے رہتے اور اطراف مشعلیں جلا کرتی تھیں تاکہ بدارواح بھاگ جائیں۔ مراقش میں اسی لئے بارات کے ساتھ بندوقیں سر کی جاتی ہیں۔

ایک طبقہ کا خیال ہے کہ گھونگھٹ اصل میں دلہن کی انکساری کا مظہر ہے اور مردوں کی جانب سے زبردستی عائد کیا گیا ہے!

قبل اس کے کہ ہم کہیں "فضولیت ہے !" ـــــــ ہمیں ذرا شادی کی انگوٹھی کو یاد کرنا چاہیئے ـــــــ ہمیں معلوم ہو کہ تاریخ کی ابتدائی منزلوں میں یہ انگوٹھی ایک زنجیر ہوا کرتی تھی یا ہتھکڑی ـــــــ اور یہ ان دنوں کی یادگار رہے جب رسومائیت کا زعم یہ تھا کہ دلہن کو زبردستی چھین کر شادی کرنی چاہیئے ـــــــ اور اس زمانے میں گھونگھٹ رقیبوں سے منہ چھپانے کا بہترین ذریعہ تھا۔ ہو سکتا ہو کہ یہ سچ ہو لیکن جب اس سے خود دولہا کے سامنے منہ چھپ جاتا ہے تو پھر اس کے کوئی معنے نہ رہے کہ رقیبوں کے ڈر سے اسے ایجاد کیا ہے۔

اس نظریہ کے مخالفین کہتے ہیں مردوں نے نہیں عورتوں نے بلکہ دلہنوں نے اپنی شرم و حیا کے مظاہرے کے لیئے اس کو اختیار کیا۔ نقاب ہمیشہ غمزدہ عورتوں کے جذبات کو چھپانے کے کام آتا رہا ہے۔ تو پھر ہم کیا سمجھیں کہ یہ گھونگھٹ شرمائی ہوئی دوشیزگیت کا مظہر ہے ؟ ؟

مشرقی عورتیں چہرے کو شرم کا مرکز قرار دیتی ہیں آج کے ترقی پسند اور روشن خیال رسم و رواج سے پہلے ایرانی عورتیں شاید غیروں کے سامنے برہنہ ہو جاتیں لیکن منہ پر سے نقاب کسی صورت ہٹانا انھیں گوارا نہ ہوتا ـــــــ

مسلمان عورتیں برقعہ اوڑھتی ہیں ـــ اور خود کو ایک کپڑے میں لپیٹ لیتی ہیں ـــ لیکن ان کے اس برقعے اور گھونگھٹ میں فرق ہوتا ہے برقعہ میں آنکھیں عام طور پر کھلی رہتی ہیں اور گھونگھٹ میں تن بدن چھپا دیا جاتا ہے۔!

اور اس قسم کا گھونگھٹ ایک تعجب خیز قسم کے نظریہ کو جنم دیتا ہے کہ اس کا مقصد دوسروں سے دلہن کا چہرہ چھپانا ہوتا ہے؟

ممکن ہے آپ چلا اٹھیں

نامعقولیت ہے ـــــــ

مگر مزید مثالیں آپ کے سامنے ہیں ـــ

کوریا میں گھونگھٹ نہیں ڈالا جاتا بلکہ باقاعدہ آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے ـــ اور اس عالم میں بے چاری کو دو دیا چار دن رہنا پڑتا ہے۔

جزائر شرق الہند میں دلہن کی پلکوں پر موم چڑھا کر آنکھیں بند کر دی جاتی ہیں ـــــــ اور جب تک دلہن دولہا کے پاس سے لوٹتی نہیں اس کی پلکوں سے موم نکالا نہیں جاتا۔

آنکھوں پر پٹی باندھنے کی رسم قدیم روس پولینڈ اور فنستان میں بھی پائی جاتی ہے۔ مراقش، ایران، مصر اور چین میں موٹے موٹے کپڑوں کے گھونگھٹ بچاری دلہن کی آنکھوں میں ساری دنیا اندھیر کئے دیتے ہیں

اسی طرح بعض جنگلی قوموں میں لڑکی کے سن بلوغ کے پہنچنے پر کیا جاتا ہے ـــــــ وہ دلہن کی طرح اکیلے کمرے میں گھونگھٹ ڈال کر بٹھا دی جاتی ہے۔ اور ایسے موقعوں پر ستم ظریفی یہ کی جاتی ہے کہ اس کا زمین کو چھونا اور سورج کو دیکھنا بہت ہی برا سمجھا جاتا ہے۔ "سنہری ڈال" ـــــــ میں سر جیمس فریزر ـــــــ نے کئی ایسی لڑکیوں کا حال لکھا ہے جن کو دنوں بلکہ بعض اوقات ہفتوں اس قسم سے "اندھا بادشاہ" بنا رہنا پڑتا ہے۔ مزید بر آں ہمیں قرون وسطیٰ کی راہبات کا حال معلوم ہے کہ یہ یسوع مسیح کی کنیزیں آنکھوں پر مضبوط پٹی باندھے ساری ساری عمر کاٹ دیتی تھیں۔

ان تمام مثالوں کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قدیم منطق کی رو سے عورت کی اس آنکھوں پر پٹی باندھنے والی رسم اور حقیقت میں کوئی تعلق ضرور تھا۔

جدید نفسیات کی روشنی میں یہ بحث کہ جنسی کشاکش کے عالم میں عورت نظر بد کی حامل ہوتی ہے۔ حالانکہ مشرق میں آج بھی نظر بد کو مانا جاتا ہے ـــ" نفسیات داں اس کی توجیہہ کچھ اور کرتے ہیں۔

شکستِ شیریں : علم التولید کے طالب علم نفسیاتی نظریوں کی رو سے انزال قبل کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے انزال قبل کے اسباب و علل کی نشوونما کو

کہتے ہیں کہ عورت ایک مکمل و مجسم شکست اس وقت ہوجاتی ہے جب وہ اراد‌تاً خود کو اندھا بنا لیتی ہے وہ بلی کے ایک پچھلے غدود کی طرف اشارہ کر کے لکھتے ہیں کہ مادہ ہمیشہ "اندھی، مجہول اور تاثر پذیر" ہوتی ہے ــــــــــ اور یہی اصول عورت کی "شکست شیریں" پر صادق آتا ہے!

مزید برآں عورتوں کی کئی مثالیں ایسی ملتی ہیں جنہوں نے رسوم کی پابندی کی برابر مخالفت کی ہے پھر اگر یہ گھونگھٹ اور نقاب مردوں کی جانب سے ہوتا اور ان کی مرضی کے خلاف تو وہ کیسے قبول لیتیں؟ بہر حال کچھ بھی آخر اس سے مردوں کو ملا کیا؟ شاید بہت ہی حقیر سی چیز ــــــــــ اس سے ان کی "ایگو" (EGO) کی ہلکی سی تشفی ہو جاتی ہے۔

اگر عورتوں کی نسلیں اسی طرح ملبوس ہوتی آئی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اس کو پسند کرتی ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی گہری جبلت کی تشفی ضرور کرتا ہے ــــــــــ اور اس کی جڑیں اتنی مضبوط پکڑ لی گئی ہیں کہ عورتیں اس رسم سے غلامانہ ذہنیت لئے ہوئے چمٹی ہوئی ہیں۔

گھونگھٹ ــــــــــ!

ایک تصور ــــ ایک حسین و جمیل تصور ــــ آنکھیں چندھیائے دیتا ہے ــــــــــ

ایک روح پرور ــــ نغمہ آگیں سی کیفیت جسم و دماغ پر طاری ہونے لگتی ہے ــــ

کتنا خوبصورت خیال ہے؟

اور میرے خیال میں جدید نیشنل عورتوں کو قطعاً شرمندہ ہونا چاہیئے کہ وہ ایک ایسی رسم کی پابندی کرتی آئی ہیں جو صدیوں کا پرانا ہے ــــ لیکن پرانا ہوا تو کیا ہوا خوبصورت اور حسین تو ہے اور پھر ان کی آزادی میں قطعاً مخل نہیں ــــ

جون لینگڈن ڈیویس نے اپنی "مختصر تاریخ خواتین" Short Historyof Women میں لکھا ہے کہ کس طرح زمانۂ قدیم سے مرد نے عورت کو دبانے کی کوشش کی ہے ــــ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس احساس برتری کا راز یہ ہے کہ وہ اس پردے میں اپنا خوف کو چھپانا چاہتا ہے تاریخ کا سلسلہ وار مطالعہ نسلی قانون امتناع یہ ثابت کرتا ہے کہ جدید سائنس کے ارتقا تک مرد ہمیشہ عورت سے ڈرتا رہا ہے، بالخصوص زندگی میں اس وقت جب وہ اپنے فطری تقاضوں کے بموجب اس سے بہت مختلف نظر آتی ہے ــ پیدائش طفل کا راز ایک ایسا راز رہا ہے کہ اس سے ہمیشہ خوف پیدا ہوتا رہا۔ اس لئے کہ زمانۂ قدیم کا مرد اس راز کو نہیں جانتا تھا اور بالکل لڑکیوں کی طرح ناواقف تھا۔ اور شاید یہی وجہ رہی ہو کہ گذشتہ نسلوں نے ہمیشہ جنسی قوت تخلیق کو بڑی بری طرح مارا ہے، اور لفظ محبت کے نام کو بے رنگ اور زنگ آلود کر دیا تھا!

جس لمحہ سائنس اور نفسیات نو کا طلوع ہوا ہے بالکل ساتھ ہی ایک دوسرا تحرک پیدا کیا ہے ۔ آج عورتوں کی آزادی ایک ایسا آتشیں سوال ہو کر سارے موضوعات میں تپش سی پیدا ہوگئی ہے ــــــــــ اس میں کوئی شک نہیں کہ فتح حاصل ہو گئی ہے لیکن سارے انقلابوں کی طرح گھڑیال کا لاٹ انتہائیوں پر رقصاں ہے ــــــــــ عورتوں کی آزادی کے ابتدائی زمانہ ہی میں ETON CROP ایٹن کرڈپ "مرد نما عورت" جیسے واقعات بڑے خوفناک طریقے پر ظہور پذیر ہوئے ہیں جو بالکل مردانہ فیشنوں کی نقل ہوتی ہے۔

نفسیات کے طالب علم کہتے ہیں عورت لاشعوری طور پر اس وقت بھی ڈری ہوئی ہے ــــــــــ وہ اپنی اس آزادئ نو کی اچھی طرح عادی نہیں ہوئی ہے نہ اسے اس پر اطمینان ہے وہ ڈرتی ہے کہ کہیں "یہ تحفۂ رحمت" پھر چھن نہ جائے!

لیکن توقع یہی ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا اب کی بار عورتوں نے جس قدر ترقی کی ہے وہ ان کی اس موا جی ترقیوں کا زینہ ہے جو ارتقاء انسانی کا کلمۂ آخر ہے۔

توقع تو یہی ہے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائیگا ویسے ویسے عورتیں اپنی آزادی اور اس آزادی کے مقام کو مضبوط سے مضبوط تر کرتی چلی جائیں گی۔

آج کل عورتوں نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ واقعی مردوں کے برابر ہیں اور ان کا دعوئ مساوات بالکل بجا ہے ۔ جنگ عظیم میں عورتوں نے جو خدمات انجام دی تھیں نہیں تاریخ فراموش کر سکتی ہے نہ مرد۔

فطرت سے شیشہ بازی امر فضول بلکہ جنون ہے ———— عورت اور مرد اس لئے نہیں پیدا کئے گئے ہیں کہ ایک دوسرے کی تحقیر و مخالفت کریں اور پارٹیاں بنا کر لڑا کریں اور ایک دوسرے پر فوقیت جتایا کریں! وہ ایک کل کے دو جزو ہیں اور ایک دوسرے کے لئے لابدی ————! اور ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے بغیر کاملیت کا درجہ اختیار نہیں کر سکتا۔

زندگی کے سمندر میں جب تہہ سے پاؤں لگ جائیں تو عورت کا انتظار ———— لازمی ہے ———— وہ انتظار کرے گی ———— اپنی تمام سپردگیاں کو آغوش محبت میں سمیٹے ——— کسی کی ہستی میں ضم ہونے اور من و تو کے فرق کو مٹانے کے لئے آمادہ ————! کسی کی نگاہ محبت کو پا جانے اور اپنانے کے لئے بیقرار!!

آج کی لڑکی نفسیاتی نزاکتوں سے واقف ہے اور جانتی ہے کہ جنسیت کا زندگی اور قوتِ حیات کے لئے کیا مقام ہے؟ ———— لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کا اپنی ذات پر قابو ہے! وہ آزاد ضرور ہے لیکن وہ جانتی ہے کہ ایک مقام ایسا ہے جہاں وہ اس کا آزادانہ مظاہرہ کر سکتی ہے آزادی کی مسرتیں اور انکساری کی خوبصورت اشاریت ایک دوسرے کی ضد بھی ہیں اور ایک دوسرے کے لئے بہت بڑی قوت بھی ———— ورنہ آزاد اور منکسر المزاج؟ ———— کیا یہ اجتماع ضدین نہیں؟ لیکن قدرت نے فطرت، کائنات اور انسان ہر شے میں ضدوں کا اجتماع کیا ہے اسی لئے خوبصورتی اور حسن کا احساس ہر شے میں پایا جاتا ہے! ٹکراؤ کے بغیر نہ تلذذ نہ تلطف نہ تقابل نہ تکامل کوئی چیز پیدا نہیں ہو سکتی!!

انجیل مقدس میں ہے

"خدمت میں آزادی کامل کا راز پنہاں ہے!"

اور دلہن کا گھونگھٹ اسی کی بغیر ———— جبلتوں سے انکار نا ممکن ہے ———

کیا آپ نے اکثر نوٹ نہیں کیا کہ اکثر جب محبوبہ کو بوس کا پیغام پہنچایا جاتا ہے تو وہ آنکھیں موند لیتی ہے؟؟

(مترجمہ سعیدہ عروج)

(بقیہ مضمون صفحہ ۲ کا)

دوسرے یہ کہ بچارے نے ہوش سنبھالا ہے تو اسے دنیا کے جھگڑوں میں پھنس جانا پڑا ہے کھانا کپڑا سب ساری ضروریات زندگی اُسے خود مہیا کرنی پڑی ہیں اور لپٹنے لئے آگ تک اُسے جلانی پڑتی ہے!

لوگ آج کے بچوں کے بڑھے پن پر تو بڑی آسانی سے اعتراض کرتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ بیچاروں کی زندگی میں کس غضب کا تغیر پیدا ہوا ہے ———— وہی تھے کہ جھیل گئے دوسرا دم نہ مار سکتا!

سب سے آخر میں یہ حقیقت کہ آج کے برق رفتار ذرائع آمد و رفت زماں و مکاں کے سوال کو جس تیزی سے ختم کر رہے ہیں اسی رفتار سے بچوں کے ذہنی افق اُن کے بزرگوں سے ہزاروں حصے کشادہ اور وسیع ہو رہے ہیں اب دلچسپیاں کھیل کے میدانوں تک ہی محدود نہیں رہ گئیں۔ سینما، پریس، ریڈیو ان نوجوان اذہان کے سامنے صداقتوں اور کذب و افترا کو کھول کر رکھ رہے ہیں! — کم از کم میں تو یہ ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں کہ آج کا بچہ محض بیوقوف اور ناقص العقل ہے! — اس کا دماغ تیز، روشن اور طرار قسم کا ہے اور ہر وقت کچھ نہ کچھ اپنانے کے لئے تیار رہتا ہے — اس نے اپنی اس کم سنی کے باوجود کچھ مصیبتیں اٹھائی ہیں اور جانتا ہے کہ مصیبت کیا ہے اور کس طرح سہی جا سکتی ہے — ہاں البتہ مدرسہ کی کتابوں کی تعلیم کا نقص اس میں موجود ہے اور وہ اس کمی کو اپنی قوت عمل سے پورا کرتا ہے!

میں اس کا قائل نہیں کہ اچھی تربیت صرف ماں باپ کا فرض ہے — میں تو ہر اس شخص کو اس کا ذمہ دار سمجھتا ہوں جو اس راستہ میں آتا ہے۔ مثلاً استاد پادری، رہبر نوجوانان وغیرہ ———— جو بھی ان کی زندگی میں بڑا بن کر شامل ہو جاتا ہے اور یہ بالکلیہ انہی کا فرض ہے کہ اس نوجوان نسل کی ذہنی ترقیوں کے راز معلوم کرے اور ان کے آزادانہ خیال کو اس طرح ڈھالے کہ وہ واقعی معزز قسم کے شہری بن جائیں ———— اور اگر سارا بوجھ گھر کے سر رکھ کر اساتذہ خاموش ہاتھ پر ہاتھ دھر لیں تو پھر سعدی کا یہ شعر پڑھنا پڑیگا ؎

گر ہمیں مکتب است و ایں ملا　　کار طفلاں تمام خواہد شد!!

اندھیرے سے اُجالے کی طرف!

(ایک اعصابی کمزوری کے شکار کی سرگزشت کہ کس طرح وہ پست ہمتیوں اور ناکامیوں کے دلدل میں پھنس گیا تھا اور کس طرح اس نے اس ایک مسرت انگیز اور زندگی سے ہمکنار لائحہ حیات حاصل کیا!!)

یہ طے ہے کہ اعصابی کمزوری کا جو بھی شکار ہوگا زندگی کی حقیقت اور واقفیت کے لئے اس میں بہت بڑی کمزوریاں پائی جائینگی۔ یہ ممکن ہے کہ وہ کافی کمائے اور رکھا سکے لیکن کوئی نہ کوئی خامی اسے زندگی میں نظر آئے گی اور وہ کسی نہ کسی بات سے بےچین بےچین سا ضرور رہے گا۔

واقعیت کا تقاضا تو یہی ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح حقیقتوں پر حقیقتوں کی طرح نظر ڈالی جائے، اور ان ہی کو رہبر بنا کر ہی کوئی تخلیقی نظم وضبط پیدا کر لینا چاہیے لیکن اعصابی کمزوری کا مریض ہمیشہ واقعات کی پرواہ کئے بغیر صرف اپنے جذبات سے کھیلتا رہیگا۔ خواہ کوئی واقعہ ہو اگر اس نے اس کے جذبات کی ترجمانی نہیں کی تو اس کے لئے مصیبت کا باعث بن گیا ــــ اور اس چھوٹی سی بات پر وہ آپ ہی آپ گھومتا رہے گا۔ وقفتاً اس کی شکایتوں بےچینیوں اور بےکیفیوں کی نذر ہو جائے گا۔

اور میں ایسا ہی ایک آدمی تھا جانور تھا!

میرے لئے خدا کی بنائی ہوئی اتنی بڑی کائنات تاریک تھی۔ مجھے ہر لمحہ ایسا محسوس ہوا کرتا تھا جیسے بیماری، کمزوری، افلاس اور موت میری قسمت کے مختلف نام ہیں ــ اگر میں کبھی بھول کر ہنس لیتا تو مجھے اس سے ہزار گنی آہوں، آنسو اور تکلیفوں کا کفارہ دینا پڑتا تھا۔ ہر شخص مجھے اپنا مخالف نظر آتا۔ میں اس میں پڑ گیا کہ کہیں کوئی سہارا مل جائے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں مقابلہ نہ کر پاؤں گا۔ اور میرے لئے سوائے اس کے کوئی اور چارہ نہیں کہ میں دن بھر قبرستان میں پھول چنتا رہوں۔ بالآخر میرے جذبات کو ایسی نیند آئی کہ مجھے ہر چیز سے کنارہ کش ہونا پڑا حتیٰ کہ میرے اپنے کام سے بھی۔

میں چرچ پابندی سے جانے والوں میں سے ہوں اور جب وہاں مقدس راگ گائے جاتے تو بعض وقت ایسا محسوس ہوتا کہ اس شعر میں میرے تمام رشتہ داروں اور دوستوں کی زندگی رقصاں نظر آتی ہے۔

"مسرور روحیں، ان کی دعائیں"

"اس وادیٔ غم میں بھی عرش بریں کی طرف پرواز کرتی ہیں"

لیکن میری زندگی اس قسم کے اشعار میں میری . . . پنہاں ہوتی ہے

"وہ شیطانی گروہ ــــ وہ مکار وسیہ کار شیطانی گروہ"

"تمام دن میری مخالفت میں بسر کرتا ہے"

کئی ایسے کام تھے جو میرے لئے پیدا ہوتے اور میں ان سے دامن چرا جاتا ــــ مجھے بڑے بڑے مواقع ملتے کہ میں اونچی جگہیں حاصل کر دوں لیکن میں حاصل نہ کر پاتا۔ مجھے ہر قدم پر یہ ڈر آگھیرتا کہ کہیں ایسا نہ ہو میں ایک نئی قسم کی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں! اور میں ایسا کیوں ہو گیا تھا، آخر اس کا کیا مقصد تھا؟ یہ میرے لئے ایک ایسا راز تھا جس سے میں قطعی بے خبر تھا۔

میں نے خود کو ڈاکٹروں کے پاس پیش کیا ــ لیکن ان کا کہنا بھی یہی تھا کہ جسمانی نظام بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے یہ سنا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں کوشش کرنے لگا کہ اس کا یقین کر لوں اگرچہ اکثر میری جسمانی تکالیف مجھے برابر ستاتی رہتی تھیں مثلاً یہ کہ بدہضمی، تنفس اور نقاہت اور حلق میں جلن سی محسوس ہوتی سخت انقباضی کیفیت الگ پریشان کرتی۔ جس کا نتیجہ اعصابی کمزوری دائمی شکل میں نمودار ہو رہا تھا ــ لیکن اس پر بھی میں نے یقین کرنے کی کوشش کی ــــــ اور اس یقین کو پختہ کرنے کے لئے میں نے اپنے آپ کو نفسیات والوں کے سامنے پیش کیا۔ یہ بورڈ بہت ہی قابل اور لائق آدمیوں پر مشتمل تھا اور سب سے بڑی

بات تو یہ تھی کہ یہ لوگ جانتے تھے کہ میرے جیسے مریض کا کس طرح علاج کرنا چاہیئے لہٰذا نفسیاتی طریقۂ علاج کا مجھ پر آغاز کیا گیا۔ یوں تو میں خوش تھا کہ جن نفسیات دانوں کے ہاتھ میں تھا اور جو طریقۂ علاج میرے لئے تجویز کیا گیا ہے وہ بیحد عمدہ ہے لیکن پھر بھی میرے دل میں یہ الجھن ہمیشہ رہا کرتی کہ یہ دماغی سائنس کے ماہر میری جسمانی گڑبڑ کا کیا کریں گے؟۔ سوائے اس کے کہ ایک ایسے نفسیاتی ادارے میں میں جانا چاہتا تھا اور کوئی ایسی خواہش نہ تھی۔

علاج کے دوران ہی مجھ سے پھر ایک غلطی ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ عام طور پر مجھے کچھ کرنا نہیں پڑے گا ڈاکٹر کا کام مصیبت اٹھانا ہوتا ہے اور تمام کام وہی انجام دے گا۔ لیکن ——— ایسا نہ ہوا۔ یہاں کی دنیا کا نظام الٹا تھا ——— یہاں مریض کو صرف ہدایت دی جاتی تھی اور سارے کام خود انجام دینے پڑتے تھے۔

اعصابی کمزوری کے شکار کی یہ فطرت ثانی بن جاتی ہے کہ اس کی پسند اور ناپسند کا معیار غضب کا انتہا پسندانہ ہوتا ہے ——— بالخصوص ناپسندیدگیاں تو خدا کی پناہ!!! اس کی فطرت کی بندرگاہ پر ناراضگی، آزردگی، خوف اور نفرتیں اس طرح لنگر انداز ہو جاتی ہیں کہ جیسے عمر بھر ہلنے کی قسم کھا رکھی ہو ——— اور نفسیاتی طریقۂ علاج میں مجھے اس امر کا احساس دلایا گیا ہے کہ یہ خوبیاں نہیں ہیں بلکہ خطرہ کی سرخ روشنیاں ہیں! پہلے پہل تو میں نے خیال کیا کہ یہ حسین دھوکہ ہے یہ لوگ نہ جانے مجھے کس راستہ پر ڈال دیں لیکن ——— بعد میں وہ عینک میری آنکھوں پر سے اتر گئی اور میرے سامنے ایک راستہ ابھر آیا ——— اکھڑ و دا اور سیدھا! علاج سے پہلے میرا خیال تھا کہ غور و فکر کوئی چیز نہیں اسلئے میں نے کبھی زندگی کی حقیقتوں اور واقعیت پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی لیکن علاج کے بعد سب سے پہلے اس چیز کا احساس ہوا کہ غور و فکر عضویاتی نشو و نما کا اہم بلکہ جزو لاینفک ہے! جیسا کہ ایمرسن (EMERSON) کہتا ہے "غور و فکر زندگی کی دلیل ہے"! سچ ہے کہ عقیدہ بغیر کام کے مر جاتا ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ جسم گرمی، سردی اور غذا کا محتاج اور طالب گار ہوتا ہے لیکن ذہنی تسکین ان چیزوں سے بلند ہے۔ بقول شخصے

"دو آدمی جیل کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہیں"

"ایک مٹی کی طرف دیکھتا ہے دوسرا ستاروں کی جانب"!

یہی وجہ ہے کہ کسی کو جسم عزیز ہوا تو اس کی لٹیا ڈوب گئی جس نے ستاروں پر نظریں جمائیں اس کا کیا کہنا!

جس وقت میرے اوپر یہ اعصابی کمزوری کا جذبہ سوار تھا میں اس قدر خود غرض اور ناشکرا آدمی تھا کہ بیان سے باہر ہے کیونکہ ہوا یہ تھا کہ دوسروں سے دلی اجنبیت لئے میں کسی محفل میں جا نہ سکتا تھا، جاتا تو لوگوں کی نظریں تیر و تلوار بن کر برس جاتیں اور میری شخصیت مجروح! لہٰذا میں نے اپنے آپ کو پس منظر میں ڈبونا شروع کیا ——— اور اس قدر پیچھے ہٹ گیا کہ ——— افق پر میرا وجود ایک ہلکا سیاہ دھبا بن کر رہ گیا تھا!

لیکن جیسے ہی علاج شروع ہوا میں پھر افق سے ابھرا اور محفلوں کی طرف بڑھنے لگا!

نفسیاتی طریقۂ علاج میں مجھے بتایا گیا کہ میں زندگی کے ہر اونچ نیچ پر غور کروں ——— یہاں تک کہ غور و فکر ایک عمدہ عادت بن کر مجھ میں سما جائے ——— اور جس کام میں فتح مند اور صادق عقیدہ لیکر انسان کام کرے گا وہ ہو کر رہے گا۔

میں نے اکثر دعائیں مانگی تھیں ——— یا تو زندگی سنور جائے یا میں نہ رہوں ——— لیکن دعائیں میری کمزوریوں کے اندھیرے میں گم ہو جایا کرتی تھیں جیسے جیسے میں آگے بڑھا ہوں ویسے ویسے میں نے غور کیا کہ یہ گہرے اندھیرے چمکتی ہوئی روشنیوں میں تبدیل ہونے گئے۔

میں اکثر بلا سوچے سمجھے کہا کرتا تھا کہ "چیزیں اصل میں وہی نہیں ہوتیں جیسی وہ نظر آتی ہیں ———" لیکن مجھے بہت جلد وہ اپنی کمزوریوں والی عینک نکالنا پڑی ——— شاید ہر اعصابی مریض اس عینک سے بے خبر رہتا ہے جو اس کی ناک پر چپکی رہتی ہے ——— اب مجھے اپنے بے چین خیالوں، غصہ ور افکار اور بے وقت کے خوفوں اور شکایتوں کو دور کرنے کی عادت ڈالنی چاہیئے تھی ——— یہ بڑا صبر آزما دور تھا۔ اور مجھے دل پر اس وقت تک جبر کرنا پڑا جب تک کہ میں اس پر قابو پا لینا اور یہ میری فطرت ثانی بن کر رہ جاتی ——— اور یہ عادت اس وقت پختہ ہوئی جب حقائق کی روشنی مجھ پر طلوع ہونے لگی۔

اعصابی مریض رجائیت کا دشمن اور اعصابی الجھنوں میں گرفتار ایک عجیب سیمابی ہستی ہوتا ہے۔ اپنی پوری کرنے کی دھن اتنی زبردست ہوتی ہے کہ وہ شاید اسی ہٹ میں خدا سے لڑ جاتے اور ٹکرا جانے سے بھی نہیں چوکتا۔ "جھکنا" اس کی توہین اور "عجز و انکسار" اس کی بے عزتی کے مترادف ہوتے ہیں!

اگر ہم غور کریں تو یہ قانون فطرت ہے کہ ہر ہستی کو اپنے سے زبردست اور بلند کے آگے خم ہونا پڑتا ہے۔ اسی خمیدگی میں اس کی زندگی کا سب سے اہم راز چھپا ہوا ہے وہ جسکو ہار سمجھتا ہے وہ اصل میں اس کی جیت ہوتی ہے! ذرا درختوں پر نظر ڈالئے ——— طوفان اٹھا ——— بلا کا طوفان اور وہ میں کہ

سر جھکائے کھڑے ہیں اور جب اتر گیا طوفان تو پھر سر بلند و سرفراز!

پھر ہم تو انسان ہیں ــــ مصائب سے ڈر کر موت کی تمنا کرنا موت کے دامن میں منہ چھپانا ہوا؟ ــــ اور چار دن کی زندگی میں بھی اگر ہم نے زندگی نہیں پیدا کی تو پھر ایسی زندگی پر لعنت نہیں تو اور کیا ہوا۔

بہت ہی قلیل عرصہ میں میں نے زندگی کے حقائق کا پورا پورا اندازہ لگا لیا، اور یہ سیکھ گیا کہ تلخیاں کس طرح پی جاتی ہیں اور یہ نمک کس طرح ہضم کی جاتی ہیں!

اور پھر ــــ

میری زندگی کی افق پر ایک نیا ستارا طلوع ہوا ــــ مجھ میں "کچھ کر دکھانے" کی صلاحیت جاگ اٹھی ــــ مردہ دلی نے کفن منہ سے لپیٹ لیا اور زندگی جانِ زندگی ہو کر رہ گئی ــــ

یعنی ــــ

مجھے جینا آ گیا ــــ !!

میری روح بالیدہ اور میرا دل و دماغ چست و چالاک تھے ــــ سچ کہا ہے کسی نے ؎

"اے میری روح! اپنے لئے نہایت شاندار محلات بنا"

"اور جب سارے موسم بدلنے لگیں ــــ"

"تو تیرا محل اس موسم کی تبدیلی کا ساتھ دے ــــ

"اپنے ماضی کی فرسودہ حویلی کو چھوڑ دے

"اور ہر نئی عبادت گاہ کو پہلے والے سے بھی شاندار ہونے دے!

"آسمانوں سے وسیع اپنے لئے ایک گنبد تعمیر کرے

"جبتک تو آزاد ہے ــــ

"اور اس خول کو پھینک کر باہر آ جا جس میں تو پیدا ہوتی ہے!

(مترجمہ سعیدہ عروج)

سوچنا

ہم میں بہت تھوڑے لوگ ہیں جو صحیح طریقہ پر سوچ سکتے ہیں۔ صحیح طور پر سوچنے کا یہ مطلب ہے کہ صرف حقیقت اور واقفیت کو سامنے رکھ کر سوچا جائے۔ دھندلے تصورات اور غیر واضح خیالات دماغی کاہلی کی نشانی ہیں ایک سوچنے والا انسان ایسے خیالات کا ہر وقت تجزیہ کرتا رہتا ہے اور ان کی صحیح شکل اپنے دماغ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ایک صحیح طور پر سوچنے والا انسان نہایت ٹھنڈے طریقہ سے سوچتا ہے جذبات کو دماغ پر غالب نہیں ہونے دیتا۔ اگر آپ یہ نہیں کر سکتے تو آپ در اصل سوچ ہی نہیں سکتے۔ آپ کو ٹھنڈے دماغ سے معاملات کا تجزیہ کرنے کی مشق کرنی چاہئے۔

کوئی آدمی بھی سوچ نہیں سکتا جبتک کہ اس کے دماغ میں کافی قوت اور معلومات نہ ہوں ــ یہ بات آپ کو ضرور یاد رکھنی چاہئے۔ اور آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ علم بڑی طاقت ـ

جی ہاں یہ دروازہ ہے ذرا اسے کھول کر دیکھئے

(مترجمہ سعید عروج ایم۔ اے۔ بی ایڈ عثمانیہ)

کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ آج ہم ہر اس پوزیشن سے اپنے آپ کو بالا سمجھ لیتے ہیں جس میں ہم ہوتے ہیں؟ اور یہ یقیناً ایک وارضی تدبیر ہے جسے دل کے بہلانے کے لئے ہم نے پسند کر لیا ہے۔ یعنی یہ کہ ہم یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ہماری قابلیت ہماری موجودہ پوزیشن سے کہیں بلند و بالا ہے، اور یہ کہ اگر ہم دوسری جگہ جائیں تو ہمیں یقیناً اس سے زیادہ معاوضہ ملیگا جتنا اب مل رہا ہے۔

فرض کیجئے کہ (بحث کے لئے ہم اس خیال کو مانے لیتے ہیں) آپ اپنے کام سے جو آج آپ کے سامنے ہے یقیناً بہت بلند ہیں اور یقیناً آپ کو اس سے الگ کر دیا جائے تو آپ اس سے بڑھیا فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہے تو پھر موجودہ کام کے لئے آپ نااہل کیوں ہیں؟ جب بڑے بڑے کام آپ کے آگے حقیر ہیں تو پھر اس کی کیا حیثیت ہے؟

اور میرا خیال یہ ہے کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، ماحول سب سے عقلمند حکیم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر آپ اپنے لئے دروازہ نہیں کھول سکتے تو پھر آپ یقیناً وہ زینہ ہرگز طے نہیں کر سکتے جو دروازے کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ اور پھر جب آپ یہ زینہ طے نہیں کر سکتے تو پھر یہ بھی طے رہا کہ آپ وہ دروازے بھی ہرگز نہیں کھول سکتے جو اس زینے کو طے کرنے کے بعد ملتے ہیں۔ اور جب وہ آپ کی اس نااہلی کا راز پا جاتا ہے تو وہ آپ کی کرسی کے پاس سے کھسک جاتا ہے —— اور آپ کو آپ کے حال پر چھوڑ دیتا ہے —— تاآنکہ آپ خود اس قابل نہ ہو جائیں کہ اپنے لئے کامیابی کے دروازے خود کھولا کریں۔

اور عقلمندی کا تقاضہ یہی ہے کہ فرائض کا پورا بار آپ کے شانوں پر رکھ دیا جائے تاکہ آپ اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس کر سکیں۔ اور یقیناً کسی دروازہ کو کھولنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ دروازہ کھولیں۔ اگر بفرض محال پہلا دروازہ آپ کے لئے کھولا بھی گیا تو اس کے بعد یہی ہوگا کہ آپ جیسے ہی اندر داخل ہوں گے ایک اور دروازہ اس کا منتظر ہوگا کہ کھولا جائے!

حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کے پوزیشن کی برتری کا راز آپ کے مستحکم ارادوں اور مضبوط نکات میں ہی نہیں بلکہ کمزور نکات میں بھی پنہاں ہے بالکل اسی طرح کہ کسی زنجیر کی کڑیاں مضبوط بھی ہوتی ہیں اور کمزور بھی، لیکن یہی کڑیاں زنجیر کو زنجیر بناتی ہیں۔

کمزور نکات آپ کو یقیناً نیچے کی طرف کھینچتے ہیں، لیکن آپ ان کے ممنون کیوں نہیں ہوتے؟ ابھرنا اور ابھر کر آگے نکلنے کی ترغیب انہی کی بدولت آپ میں پیدا ہوتی ہے۔ دنیا کا کوئی بڑا آدمی ایسا نہیں جس میں کمزوریاں نہ رہی ہوں۔ اور اس کی کامیابی کا اصلی راز ان ہی کمزوریوں میں مضمر ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں پر نہ شرمندہ ہوتے ہیں نہ پشیمان۔ وہ ان کو زندگی کے راستہ کا لازمی نشیب و فراز سمجھتے ہیں اور ان کانٹوں کو جھک کر دامن سے نکال پھینکتے ہیں مگر اس طرح دامن نہیں چھڑا سکتے کہ دامن چھوٹ تو جائے مگر تار تار ہو جائے!

کیا یہ آپ کی زندگی کا ایک مانوس تجربہ نہیں کہ وہی وجوہات جنہوں نے آپ کو ترقی کا منہ نہ دیکھنے دیا وہی دوسرے کو ترقی کے بام عروج پر پہنچا رہے ہیں؟ ایک آدمی کے ایک بیوی اور ایک بچہ ہے۔ دوسرے کے بھی ہے --- لیکن ایک زیادہ سے زیادہ کوشش اس بات کی کرتا ہے کہ ساری دولت اپنے گھر میں بھر لے دوسرا نہیں کرتا۔ مگر ایسا کرنے میں دونوں حق بجانب ہیں کہ نہیں؟ یہ تو اپنی اپنی فرائض شناسی ہے!

ہمیں ہمیشہ اپنی کمزوریوں سے پیار کرنا چاہیئے۔ ان سے لاپرواہی خطرناک ہوتی ہے۔ ان کا مقابلہ ہماری زندگی کے تعمیری پروگرام کا جزو اوّل ہونا چاہیئے۔

خودی اور خودداری اچھی چیز ہے بلکہ بہت اچھی ——— لیکن دنیا کو ایک پہلو قرار نہیں، اس سیماب پا کے لئے ہر اس شخص کو سیماب بن جانا پڑتا ہے، جو اس میں رہتا ہے، خودی کو بلند کرو، اور اگر جذب خاطر ہو تو اس قدر بھی کہ خدا رضا پوچھنے آئے ——— لیکن خدا کے لئے یہ مت سمجھ بیٹھو کہ جب اور جس وقت تم جو چاہو گے وہ کن فیکون کے ساتھ ہو جائیگا ——— صبغۃ اللہ ہو جانا، خدا کے رنگ میں رنگ جانا بہترین، لیکن کیا واقعی تمہارا ظرف اتنا بلند ہے؟ تم جو کچھ نہیں کر سکے ——— کوشش کرو ——— کہ اس کو کر سکو ——— تمہیں اپنا جائزہ آپ لینا چاہیئے ——— سوچو کہ تم ایسا کیوں نہ کر سکے!! اور اگر صداقت ہے تم میں تو یہ دریا ایسا تو نہیں کہ تم پار نہ کر سکو ———

اگر تم کچھ کرنا چاہو تو دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو تمہارے آڑے آ سکے۔ وہی کمزوری جو تمہارے لئے قدم قدم پر آڑے آتی ہے وہی کسی دوسرے کے لئے اُبھرنے اور بلند ہونے کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے ——— اگر ایسا ہے تو تم اسی طرح کیوں نہیں کھلتے؟؟

جہاں صدق دلی اور جذب خالص ہو ناکامی ناممکن ہوتی ہے۔ اپنے لئے ترقی کا دروازہ کھولنا بہت ہی آسان ہے، صرف اس باریک بینی کی ضرورت ہے کہ دیکھیں وہ کونسی موانعات ہیں جو راستے میں حائل ہو رہی ہیں؟ بہت ممکن ہے وہ ایک چھوٹی سی کمزوری رکاوٹ ہو ——— لیکن غور کر لیجئے کہیں اس کا طور آپ کی پہنچ سے باہر تو نہیں ——— یقیناً نہیں ہو سکتا ——— اس لئے کہ نپولین کا قول صادق ہے کہ کوئی چیز دنیا میں ناممکن نہیں!"

البتہ ایک بات ضرور ہے کہ تمام چیزیں آن واحد میں میسر نہیں آ سکتیں۔ اس کے لئے تمہیں رُک رُک کر، ٹھہر ٹھہر کر، وقفے وقفے سے انتظار کرنا پڑے گا ——— ہم چاہیں کہ ایک کتاب ایک منٹ میں پڑھ ڈالیں تو ناممکن ہے ——— یا کسی برِ اعظم کو ایک قدم سے ناپ لیں تو فضول ——— ایک ایک ورق اور ایک ایک قدم کے بعد کتاب ختم ہوگی اور ہم دوسرے کنارے پر پہنچیں گے۔

اسی طرح آپ کا مخیلہ جو زندگی کی ساری رعنائیاں اپنے میں لئے ہوئے ہے آپ کو پوری پوری شکل میں اسی وقت میسر آئے گا جس وقت آپ یکے بعد دیگرے وہ سارے دروازے کھول چکے ہونگے جو آپ کے اس تخیل میں اور آپ کی ذات میں حائل ہیں۔

یقین اور خود اعتمادی دنیا میں سب سے اہم خصوصیات ہیں ... ان کے بغیر آپ کی ترقی صفر ہو جائیگی، سب سے پہلے تو آپ کو اس کا یقین ہو کہ آپ چاہتے کیا ہیں ——— ؟ اور جب اس کا آپ یقین کر لیں تو ذرا بازوؤں پر ہاتھ بھی پھیر لیں کہ ان میں کتنا دم خم ہے ——— جب ان پر اعتماد ہو گیا تو پھر ——— اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ بالکل "تیار" ہیں!! اور جب آپ تیار ہیں تو پھر قدم اُٹھاتے نہ جھجکیئے ———!

اور جب قدم اُٹھا چکیں تو پھر پلٹ جانا تو بڑی بات پلٹ کر دیکھنا آدمیت کی توہین ہوگی ——— یہی معیار کامیابی ہی وہ آسمان ہے جس پر بلند اقبال ہستیوں کی عظمت کا ستارہ جگمگاتا رہتا ہے!!

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ کی "تیاری" کا اقتضا یہ ہے کہ آپ اس کے لئے بیوی بچے چھوڑ دیں کہ یونیورسٹی جانا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ جو آپ کے چھوٹے سے سر میں آئے وہی بہتر ہے!

یہ یقیناً خوش قسمتی کی دلیل ہے کہ کوئی یونیورسٹی کا گریجویٹ ہو۔ لیکن کسی کا گریجویٹ ہونا اس کی کامیاب زندگی کی دلیل نہیں: یقیناً اسکی

اُٹھو اور جیو!

از ایل - ایس - الیئیٹ، ایم - اے

دراصل واقعہ یہ ہے کہ آپ کی اور میری شخصیتیں ہر اس تخیل سے بہت بلند و بالا ہیں جس کا نام ترقی ہے ——— لیکن اب سوال یہ ہے کہ ہم اب اسکے متعلق کیا کریںگے؟ کیا ہم صرف اس زندگی پر اکتفا کر جائیں گے جو گذر رہی ہے یا ہم اس زندگی کی بھی تمنا کریںگے جو ہمارے آگے نئی نئی جدید تہذیب بکھیر رہی ہے! اور اس شان دار پیمانے پر کہ اللہ غنی! تجزیہ ناممکن اور تصفیہ ناقابل عمل ہو کے رہ جاتا ہے۔

سب سے بڑھ کر آجکل جس بات سے مجھے سخت تکلیف ہونے لگی ہے وہ نوجوان زندگیوں کی تقریباً خودکشی ہے ——— جی ہاں تقریباً خودکشی ——— یہ خودکشی ہی تو ہے کہ میں دیکھتا ہوں اُبھرتی ہوئی نوجوانیاں عمر کے پندرہ اور سولہ سال میں شخصیت اور کردار کے عنصر کو کھو رہی ہیں ——— دوسری خطرناک عمریں نصف بیس اور نصف تیس سال ہیں ——— کیا یہ اتنی ہی خطرناک بات نہیں ہے جتنی شیکسپیئر کہتا ہے کہ

"What a fall my countary man[1]

یہ یقیناً ہماری بدقسمتی کی دلیل ہے کہ قوم کا نوجوان سرمایہ اپنے آپ سے زندگی کا وہ تعمیری عنصر کھو بیٹھے جو ہر زندہ قوم کے لئے باعث صد افتخار ہے۔

بچپن البتہ ایسا نہیں۔ آج کے بچے ہیں ہم سے زیادہ ہوشیار، تازہ خیال اور زندہ افکار کے حامل نظر آتے ہیں۔ آج کے بچے چاہتے ہیں کہ کسی طرح بڑوں کی برابری کرلیں۔ وہ ڈارون کے قول کہ آدمی بندر ہے ——— کی حدوں تک نقال واقع ہوئے ہیں اور یہ جذبہ ان میں اس قدر شدید ہے کہ اس کا روکنا محال نظر آتا ہے۔

سوالات کا وہ تانتا جس سے جی گھبرا جاتا ہے ان کی فطرت کا جزو لازمی بن کر رہ گیا ہے۔ وہ اتنے تازہ خیال ہیں کہ ماحول کی ہر چیز سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ چاہتے ہیں کہ ماحول کو بھی متاثر کریں۔ انہیں، جانوروں، چڑیوں، تپش، بارش، برف، جہاز، ریل، کہانیوں اور سورماؤں، بہادروں سے شغف ہے اور خدا کا شکر ہے کہ وہ صرف ان میں دلچسپی نہیں لیتے بلکہ چاہتے ہیں کہ خود بھی کچھ کریں! اور کچھ کر کے دکھائیں اور یہ جذبات اس وقت تک بدستور زندہ رہتے ہیں جب تک "بچپن" رہتا ہے۔ جہاں سے "لڑکپن" کا آغاز ہوتا ہے بچہ "مفکر" نہیں ہو جاتا مگر "افکار" کا شکار ضرور ہو جاتا ہے لیکن زندگی کا اقتضا برابر اکساتا رہتا ہے کہ ——— جیو ——— جیو!!

اور پھر لڑکپن کے آخری دور میں زندگی کا وہ خارزار راستہ شروع ہوتا ہے جہاں ماحول، غلط فہمیاں، پست ہمتیاں جمع ہو جاتی ہیں اور راستے کا طے کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

اور اس کے برخلاف جس زندگی کی تمنا ہمیں ہوتی ہے وہ اس سے کہیں عظیم تر، بھرپور اور مسرتوں کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ ہمیں ہر اس شے کی تمنا ہو جاتی ہے جس سے ہم بے خبر رہتے ہیں۔

انسانی شخصیت کی ارتقاء کی کوئی حد نہیں ہوتی، سوائے اس کے کہ کچھ ان جانے ان دیکھے خوف ہوتے ہیں اور پست خیالات!

---

[1] اف کیسا زوال ہو میرے ہم وطنوں کا۔

ڈاکٹر ولیم براؤن مشہور ماہر نفسیات اور سائنس داں ہے۔ زمانہ جدید کی بہت بڑی ہستی۔ اپنی جدید تصنیف "شخصیت اور مذہب" میں اس حقیقت پر زور دیتے ہوئے عجیب انداز سے لکھتا ہے کہ "ابھی تو تہذیب کی ابتدا ہو رہی ہے!" ڈاکٹر براؤن کا عقیدہ ہے کہ انسان صرف "خیر" کا وارث ہے۔ اور اس کی طاقت اور مردانگی ایک "گم نام زندگی" کے ارتقار کی مظہر! انسان کو مایوس ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں۔ نہ ہی انسان سے مایوس ہوجانے کی کوئی وجہ ہے! ——— لاتقنطوا من رحمۃ اللہ۔

دنیا میں ایسے بہت سے انسان ملیں گے جو "جیو اور جینے دو" کے اصول پر پابندی سے قائم ہیں۔ ان کی برکتیں بہت ہی پیاری ہیں۔ وہ مسرت حسن، آرٹ اور ادب کے دل دادہ ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ زندگی زندگی کی طرح ہو اور جس قدر محنت مشقت کرتے ہیں اسی قدر اپنے اوقات فرصت میں مسرتوں کے گہوارے میں جھول جھول کر لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن آپ پوچھیں گے
"میں کیسے اس طرح جی سکتا ہوں؟؟"
عرض یہ ہے کہ سب سے پہلے انسان یہ معلوم کرے کہ آخر ان انسانوں کی مسرت بھری زندگی کے راز کیا ہیں؟
بظاہر تو ہمیں تین وجوہات نظر آتے ہیں۔

(۱) وہ عادتیں جو آخر لڑکپن میں پختہ ہوتی ہیں اور جن پر خیالات اور جذبات بری طرح چسپاں ہو جاتے ہیں۔ جیسے عمدہ غذا لباس، روپیہ پیسہ، گھر اور اعلیٰ سوشل پوزیشن کی خواہش ——— محض اسلئے کہ نام و نمود کے ساتھ ساتھ آرام و آسائش بھی میسر آجائے ——— یہ اس زمانہ کا خاصہ ہیں۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اپنی طاقتوں سے باخبر ہیں۔ حالانکہ اگر ان کو کام میں لایا جائے تو زندگی کا نقشہ بدل کر رہ جائے۔

(۳) جمود اور کاہلی ——— عادت پڑ جاتی ہے کہ اپنی نااہلی، کاہلی اور سستی و جمود کا الزام مجبوریوں کے سر تھوپیں!
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان کا ازالہ کیسے کیا جائے؟ آخر ان کمزوریوں پر کس طرح قابو پایا جائے؟؟
یہ کوئی جرم نہیں کہ انسان اچھی زندگی کا خواہاں رہے لیکن جب اس میں خود غرضی اور یہی "مقصد زندگی" بن جائے تو اس سے بڑھ کر اور کوئی لعنت نہیں۔

نئی دلچسپیوں کا حصول!

یہ کمزوری اگر عورت میں ہے تو وہ بے حد خطرناک ہے۔ عورت نہ صرف گھر کی ذمہ دار ہے بلکہ آئندہ نسل کی صحت و سلامتی کی ذمہ داری بھی اسی کے سر ہے۔ زندگی کے متعلق ہمیشہ اسے بہت بلند ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ سب تو ایسی چیزیں ہیں جو ضمنیات زندگی سمجھی جاسکتی ہیں
آئینسٹائین لکھتا ہے کہ بہتر خون کا راز اور شخصیت کی صحیح ترقی کسی ایسی دلچسپی میں مضمر ہے جو پائندہ اور زندہ ہو! جہاں یہ جذبہ ہے وہاں رکاوٹوں کے پر جلتے ہیں!

ادب، موسیقی، سائنس، آرٹ، حسن اور فطرت انسانی، جانوروں، بچوں، کام، کھیل اور جو بھی مقصد حیات ہو۔ ایسا ہو کہ مردہ تخیل اور بے دلی، سرد مہری کی ہوا بھی اس کو نہ لگے ؎

زندگی زندہ دلی کا نام ہو!

زندگی کا راز یہ ہے کہ "جینے کی تمنا" لے کر انسان زندگی کے اسٹیج پر آئے۔ دوسرے "آزاد" رہنے کا جذبہ اس کا نور ایمان ہو۔ زندگی کے ہر نئے موڑ پر دم لے کر وہ اتنا ضرور دیکھ لے کہ کون سی راہ منزل مقصود کی ہے ——— نہ ہر نئی چیز سے بدکے نہ ہر چمکدار چیز کو سونا سمجھے

بلکہ اپنے اندر وہ جذبہ پیدا کرے جس کا نام ہے "جینے کی تمنا!"

مسائل سے گریز

مسائل زندگی کا جزو لاینفک ہیں۔ یہ ہر قسم کے ہوتے ہیں اور ہر لمحہ زندگی میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ انسان کو سب کچھ ہونا چاہیئے سوائے اس کے کہ وہ ایک "گریزی" ———— قسم کا انسان ہو۔ یہ لفظ اگر کسی پر صادق آئے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ گیا ————

زندگی کے میدان میں مردانہ وار درآنے کی ضرورت ہے اور سخت کوشی جانِ راحت ہے ———— اسی میں زندگی دھڑک رہی ہے اور زندگی کی یہی دھڑکن انسان کے زندہ ہونے کی روشن دلیل!

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی!

(بقیہ مضمون:- جی ہاں یہ دروازہ ہے ذرا کھول کر دیکھیئے از صفحہ ۲۹)

یونیورسٹی کا صداقت نامہ آپ کے ایک یا دو دروازے کھولنے کا پاس دے سکتا ہے لیکن اس کے آگے ———— سارے دروازے اسی کو کھولنے پڑینگے اب وہ کھولے نہ کھولے یہ اس کا فرض ہے کالج کا نہیں۔

کامیابی کوئی ایسا جانور تو نہیں ہے کہ آپ جال پھینکیں اور پکڑ لیں یا رات کے اندھیرے میں ہاتھ ماریں اور مل جائے۔ نہ آپ کو اس کی تلاش میں سرگرداں و پریشان ہونے کی حاجت ہے، نہ ہی وہ کوئی ایسی اجنبی اور ان دیکھی چیز ہے کہ آپ اسے نامانوس پائیں۔ یہ تو دراصل بالکل وہاں ہوتی ہے جہاں آپ ہوتے ہیں ———— کامیابی ہمیشہ صداقت پسند جذبات اور کردار کا مظہر ہوتی ہے اور اس کے ہاں کالے گورے کی تمیز نہیں۔ جو جاگا سو پایا جو سویا سو کھویا ———— جس نے محنت کی بالا مار لیا۔

صدق دلی سے جو نیت باندھی جائے اور صداقت کی اتنی ہی بلندی سے جو کام کیا جائے وہ ہمیشہ پورا ہو کر رہتا ہے۔ انسان میں ایک لگن ہو، ایک تڑپ ہو، ایک پکار ہو ———— جواب آنا لازمی ہے!

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

(بقیہ صفحہ ۳۹ - یہ سے)

چمپئی رنگ کی دوشیزہ شاید اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی جب وہ کچھ نہ بولا تو اسے سمجھانے کے انداز میں بولی

"میں اسے منع کیسے کر سکتی ہوں آخر وہ میرا بھائی ہے"

"شاید کرما صحیح کہہ رہی ہے!" اس نے اپنے دل میں سوچا لیکن دل اسی طرح تڑپتا رہا کرب آنکھوں میں ناچتا رہا اور وہ خاموشی سے کرما کو دیکھتا رہا ————

"تمہیں نہیں معلوم مجھے اس سے کتنی تکلیف ہوتی ہے" اور واقعی اسے تکلیف ہو رہی تھی وہ سوچتا تھا تعلیمات کا کلرک اس کے اور کرما کے درمیان ایک دیوار بنتا جا رہا ہے وہ اس دیوار کو توڑ دینا چاہتا تھا لیکن اس کی ساری توانائیاں مل کر بھی ناکام تھیں وہ اپنی مجبوری پر تڑپ رہا تھا

(باقی آئندہ)

حیات و حقائق

(آنسہ - رئیس جہاں بیگم)

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اچھے خاصے تعلیمیافتہ گھروں میں بھی معمولی معمولی باتوں پر کشمکش شروع ہو کر فساد اور مسلسل رنجش کی شکل اختیار کر لیتی ہے اگر ان باتوں پر ٹھنڈے دل اور سوجھ بوجھ سے غور کیا جائے تو بجز پشیمانی کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وجہ دراصل کچھ بھی نہیں ہوتی صرف عقل کے پھیر ناک کی لمبان اور صرف بے توجہی نے بار ہا بے معنی باتوں پر قابل نفرت جھگڑے کھڑے کر دکھائے ہیں۔ سائیکولوجی کے چند موٹے موٹے اصول اگر صحیح طور سے سمجھ لئے جائیں اور اُن پر عمل کیا جائے ہر گھر جنت کا نمونہ بن سکتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ لفظ "نہیں" "مت" "خبردار" کی تعمیل ناگواری سے کرتا ہے خصوصاً بچوں کی تو یہ فطرت ہے کہ وہ ہر اُس بات کی عزیز رکھتے ہیں جن سے انہیں "خبردار" کیا جائے ہر وہ فعل ضرور کریں گے جس سے اُن کو روکا جائے وہ کوئی ایسا کام کبھی نہیں کریں گے جو اُن کی "مرضی کے خلاف" معلوم ہو۔ تمام مذہبی مراعات کے باوجود مشرقی سوسائٹی میں عورت ایک چوں چوں کا مربہ ہو کر رہ گئی ہے۔ مرد تو خیر مرضی کے موافق یا مرضی کے خلاف کے پھیر میں آکر ذرا کم نقصان اٹھاتے ہیں لیکن بیچاری عورت کے لئے ہر قدم پر کنویں کھائیاں نہ معلوم کیا کیا بلائیں موجود ہیں اور ایمان کی بات یہ ہے کہ عورت اپنی لاعلمی یا جہالت کی وجہ سے بھی اپنی موجودہ حالت کی بہت حد تک ذمہ دار ہے اگر وہ اپنے "کل پرزوں کا" صحیح استعمال جان لے تو بہت کچھ سُدھر سکتی ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ کچھ مائیں بچوں کو ڈانٹتی ڈپٹتی مارتی پیٹتی رہتی ہیں یہ غلط اصول ہے اس سے بچے کی ذہنی نشو و نما بند ہو جاتی ہے حرکت انسانی فطرت ہے اور بچے میں اتنی سمجھ نہیں کہ وہ ہر حرکت اس کا نتیجہ سمجھ کر کرے اگر آپ کا بچہ پانی پیتے ہوئے شیشے کا گلاس توڑ دے تو اس کو سزا نہ دیجئے بلکہ زیادہ محتاط ہونے کی تلقین اپنے عمل اور تجویز سے کیجئے سزا راہ راست پر لانے کے لئے ایک بالکل غلط ذریعہ ہے دراصل یہ ایک انتقامی جذبہ ہے جس میں تخریب بدرجہ اتم کارفرما ہے اور تعمیر نام کو نہیں بچے میں حرکت کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے بغیر انجام کا اندازہ کئے حرکت کر دینا شرارت کہلاتا ہے لہذا شرارت ایک فطری جذبہ ہوا اس کا روکنا فطری جذبات کو کچلنا ذہنی نشو و نما پر ٹیکس عائد کرنا ہوا۔ جو غلط ہے۔ ہمارے ابتدائی مدرسوں میں مُلاجی الف خالی ب کے نیچے ایک نقطہ اور ج کے پیٹ میں ایک نقطہ سکھانے کے لئے قمچی کا استعمال ضروری سمجھتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ الف ب ج تو پڑھ لیتا ہے لیکن کند ذہن اور نکما انسان بن جاتا ہے جو بس بار برداری کا کام کر سکتا ہے۔ بچے کو راہ راست پر لانا سب سے مشکل کام ہے اور یہی ہر ماں کا فرض بھی ہے یوں تو جانوروں کے بچے بھی پل جاتے ہیں لیکن وہ بڑے ہو کر اشرف المخلوقات کا لقب نہیں پاتے اشرف المخلوقات آپ کو آپ کی صرف ذہنی نشو و نما بنا سکتی ہے اور ذہنی نشو و نما کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کو روکا نہ جائے۔ بچے کی ذہنی نشو و نما بالکل قدرتی طور پر ہونی چاہیئے اس کو راہ راست پر ڈالنا ماں کا کام ہے اور راہ راست بھانا بھوت پریت اور چھلاوہ پیری سے ڈرانا نہیں چاہیئے بچے کی ہر حرکت کا پس منظر سمجھنا زیادہ ضروری ہے وقتی شرارت یا وقتی کسی بھی حرکت کو صحیح طور پیش کرنا مارپیٹ کر اپنی بات منوانے سے بالکل مختلف ہے۔ انسان کی تمام خوبیاں بچے میں موجود ہیں ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان خوبیوں کو صحیح طور سے پروان چڑھایا جائے —

اگر آپ کے گھر میں کچھ ایسی چیزیں بھی استعمال ہوتی ہیں جو استعمال کرنے والوں کے خیال کے مطابق صحیح ہیں لیکن آپ ان کو باعث ضرر سمجھتی ہیں تو ان چیزوں کو دور کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ آپ ان کو استعمال کرنے والوں پر یکلخت لفظ "نہیں" کا اطلاق کر دیں اس سے نہ تو وہ آپ کی بات مانیں گے

اور نہ آپ کی موجودہ وقعت قایم رہے گی بلکہ ہوگا یہ کہ آپ ان کی نظروں سے گرتی چلی جائیں گی جس کا انجام وہی کشمکش فساد اور مسلسل رنجش ہوگی ان چیزوں کو ہٹانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ ان سے بہتر چیزوں کا تعارف کرادیں مقابلہ میں آکر وہ یقیناً گر جائیں گی آپ کا مطلب حل ہوجائے گا اور آپ کی ذاتی اہمیت بڑھ جائے گی۔ لیکن تعارف اس طرح ہونا چاہیئے کہ لوگوں پر آپ کا ارادہ ظاہر نہ ہو نعم البدل بڑی چیز ہے اور قبول بھی کر لیا جاتا ہے کسی آدمی کو اس کے ایک خیال سے ہٹانے کے لئے بحث کبھی کارآمد نہ ہوگی، اگر آپ کسی کے عقیدہ کو بدلنا چاہتی ہیں تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ بظاہر اس کی ہم خیال ہوجایئے۔ اگر اس کو یہ یقین ہوجائے کہ آپ اسی کی ڈگر پر گامزن ہیں تو وہ اپنی احتیاطی تدابیر آپ پر استعمال نہ کرے گا اس سے آپ کو اس کی کمزوریاں معلوم ہوجائیں گی اور اسکی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ اسے اپنی رائے کے مطابق ڈھال سکتی ہیں رازدار انسان سب کچھ کرسکتا ہے۔

گھریلو زندگی میں سلیقہ مند عورتیں بلا امتیاز دولت و غربت، صورت و شکل اور رنگ و روپ ہمیشہ کامیاب رہتی ہیں سلیقہ سے رکھ رکھاؤ کے گھر میں ظاہراً ٹیپ ٹاپ کے علاوہ نفسیاتی دولت کی ریل پیل رہتی ہے۔ ہر چیز کا قرینہ سے اپنی جگہ پر ہونا صرف آنکھوں ہی کو بھلا معلوم نہیں ہوتا بلکہ دل و دماغ پر گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ دراصل کامیاب زندگی وہی ہے جو نفسیاتی اعتبار سے کامیاب ہو اور نفسیاتی طور سے کامیاب زندگی کا ثبوت یہ ہے کہ ہر شخص آپ کا لوہا مانے۔

بدشکل سے بدشکل عورت اپنی عقلمندی اور سلیقہ شناسی کی بدولت گھر بھر پر حکومت کرتی ہے اور پھوہڑ بدسلیقہ عورتیں چاہے وہ کتنی ہی حسین ہوں ناکام رہتی ہیں۔ ریاضت سے سخت سے سخت اور جابر سے جابر انسان کو رام کیا جاسکتا ہے اردو کی ایک پرانی کہاوت "کام پیارا ہے چام پیارا نہیں" تو آپ نے سنی ہوگی اگر آپ خدانخواستہ کچھ زیادہ خوبصورت واقع نہیں ہوئیں تو اس خیال سے نڈھال نہ ہوجایئے کہ آپ کے شوہر آپ کی ہر وقت آؤ بھگت نہیں کرتے دراصل رنگ روپ آپ کو عزیز نہیں بنا سکتا حسن فانی چیز ہے حسین انسان بھی زندگی میں ناکام رہتے ہیں آپ اپنے اندر حسین کردار پیدا کیجئے جو آپ کی زندگی کی حقیقی مشعل راہ ہے۔ ہماری جسمانی محنت معاشیات میں محنت جبھی کہلاتی ہے جب اس کا معاوضہ زر کی شکل میں ملے علم معاشیات ہماری روز مرہ کی آمدنی اور خرچ اور صحیح اقتصادی زندگی میں راہبری کرتا ہے لیکن سائیکولوجی زندگی کو کامیابی کی شاہراہ پر گامزن کرنا چاہتی ہے آپ کی محنت کا معاوضہ زر کی شکل میں نہیں ملتا تو عقیدت کی شکل میں ملتا ہے اور یہ عقیدت آپ کی مقبولیت کا باعث ہوگی ذرا سوچئے گھر بھر کا جتنا کام آپ کرتی ہیں اگر اسی کام کے لئے علیحدہ علیحدہ ملازم رکھے جائیں تو کیا آپ ان سب کی کفیل ہوسکیں گی؟ اور پھر یہ کہ کیا ملازم وہ تمام کام اس کی خوش اسلوبی سے سرانجام دیں گے جس طرح آپ دے سکتی ہیں وہ ملازم ہے زر کی شکل میں معاوضہ چاہتا ہے۔ جیسا چاہے گا الٹا سیدھا کرکے رکھدے گا آپ گھر کی مالک ہیں اور آپ کے کاموں کا معاوضہ آپ کے شوہر کی اور آپ کے بچوں کی عقیدت ہونا چاہیئے جو دراصل آپ کی زندگی کا سکون اور کامیابی کی کلید ہے۔

اگر آپ اپنے بچوں کو صاف ستھرا رکھیں تو نہ صرف یہی کہ وہ پیارے معلوم ہوں گے بلکہ دیکھنے والوں کو آپ سے غائبانہ عقیدت ہوجائے گی اور ہر وقت دیکھنے والے آپ کے شوہر اور آپ کے قریب ترین عزیز ہی ہیں - جن سے آپ کی زندگی میں ہر وقت کا ساتھ ہے بالکل غیر دانستہ طور سے وہ آپ کے مدح خواں ہوں گے جس سے آپ کو بھی سکون ملے گا اور گھر بھی ہر طرح سے "خوش حال" رہے گا۔ خوش حال صرف وہی نہیں ہوتا جس کے گھر میں ریڈیو ایرانی قالین اور افرنگی صوفے ہوں وہ بھی خوش حال کہلایا جاسکتا ہے جس کی زندگی پُر اطمینان ہو گھر میں خوشی اور محبت کا دور دورہ ہو اور اختلاف رائے مفقود ہو۔

کچھ حضرات کا خیال ہے کہ ترقی کے لئے اختلاف رائے ضروری ہے لیکن خانگی زندگی میں ترقی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہر بات کا فیصلہ اختلاف کا وزن دیکھ کر کیا جائے۔ یہاں اتفاق زیادہ ضروری ہے اگر آپ کو کسی چیز سے اتفاق نہیں ہے تو یہ ظاہر نہ کیجئے کہ دوسرا صریح غلطی پر ہے بلکہ اپنے اختلاف کو تجویز کی شکل میں پیش کیجئے اس طرح کہ دوسرے آدمی کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے اس سے متفق ہوکر اپنی رائے منوالینا زیادہ آسان ہے بہ نسبت اختلاف کی بحث سے مرعوب کرنے کے۔ میٹھی زبان اور معقول بات جو کر سکتی وہ خانگی اختلاف ہرگز نہیں کرسکتا۔

اپنی مدد آپ کیجئے

بشیر صدیقی

مندرجہ ذیل مضمون ڈاکٹر سموئیل اسمائیل کی Self Help سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ ب

خدا نے آجتک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا (حالی ترجمہ از قرآن حکیم)

نسل انسانی کا یہ ایک بہت بڑا تجربہ ہے ــــــــ خدا ان کی مدد کرتا ہے جو خود اپنی مدد کرتے ہیں۔ ہمت مرداں مدد خدا ـــ! مرد وہی ہے جو بیرونی اور خارجی امداد کا محتاج نہ رہے اور اپنی دنیا آپ تعمیر کرے ؎

بچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں ٭ جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں

ہماری زندگی کا بننا بگڑنا ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہے ــــــــ جو افراد اس زندہ حقیقت سے واقف ہیں وہی کامیابیوں کی جنت میں پہنچتے ہیں۔ انسان زمانے کا مرکب نہیں، راکب ہے۔ مکان وزماں کی باگ آپ کے ہاتھوں میں ہے ــ ایک ہوشیار وچست چالاک سوار ــــ شریر سے شریر گھوڑے کو اپنے حسب منشا تربیت دے لیتا اور چلاتا ہے لیکن ایک سست اور کاہل آدمی کبھی گھوڑے پر بیٹھنے کی جرأت نہیں کرتا اور اگر کبھی بیٹھتا بھی ہے تو بھدے سے زمین پر گر پڑتا ہے ــــ دنیا کسی کے سامنے جھکتی نہیں مگر جھکائی جاتی ہے۔

اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ جب کسی قوم کی اکثریت میں موجود ہوتا ہے تو وہ دنیا کی ایک طاقتور، مہذب اور مضبوط قوم بن جاتی ہے۔ قرآن حکیم کے سنہری الفاظ ہمیشہ کے لئے صفحہ حیات وہستی پر نقش۔

اللہ کسی قوم میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا تا آنکہ وہ خود کوئی تبدیلی پیدا کرے۔

کسی قوم یا آدمی کو خارجی امداد سست اور کاہل بنا دیتی ہے ــــــــ اس لئے کہ وہ ضرورت رفع ہو جاتی ہے جو اسے کام کرنے پر اکساتی ہو اور اس لئے کمزوری اس کا خاصہ ہے ــــــــ یہ ایک تجربہ ہے کہ جب آدمیوں کی نگرانی حد سے زیادہ کی گئی اور بات بات پر ان کی روک ٹوک کرنے والے دوسرے رہے ــــــــ اور وہ ایک مشین بن کر رہ گئے جسے دوسرا چلاتا ہو۔ تو وہ ہمیشہ کے لئے مفلوج اور سست ہو کر رہ گئے۔ دنیا کی ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ حکومت اپنے افراد کی کوئی عملی مدد نہیں کر سکتی۔ وہ صرف اتنا ہی کر سکتی ہے کہ آدمی کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ اپنے حسب منشا جائز طریقوں پر جس طرح چاہے ترقی کر سکے اور خود کو آگے بڑھائے یہ خیال غلط ہے کہ "انسان کی ترقی عمدہ قوانین پر منحصر ہے"۔ ڈاکٹر سموئیل اسمائیل فرماتے ہیں۔

"حکومت مانع ہے آمر نہیں ـــــ حکومت کا کام ہمارے جان ومال اور آزادی کی حفاظت سے زیادہ کیا ہے؟
کسی حکومت کا کوئی قانون چاہے وہ کیسا ہی زبردست کیوں نہ ہو کاہلوں کو محنتی اور مسرفوں کو کفایت شعار نہیں

بنا سکتا۔ یہ اوصاف ان کی اپنی ذاتی کوشش کا حاصل ہیں۔ نہ کہ قوانین کی رہین منت"

ایک حکومت اپنے افراد و عوام کے خیال و اعمال کی ایک پرچھائیں ہے ——— حکومت کی خرابی و اچھائی محکومین کی اچھائی و برائی کا نتیجہ ہے۔

قوم کے افراد کی محنت، دلیری اور ایمانداری کو قوم کی ترقی اور افراد کی کاہلی، بدچلنی، اور خودغرضی کو قوم کی تنزلی کہتے ہیں —! سماج کی وہ خرابیاں جن پر ہم نوحہ و ماتم کرتے ہیں حقیقتاً دیکھا جائے تو ہماری اپنی خرابیاں ہیں ——— جو سماج کو متاثر کر رہی ہیں ——— اگر ان خرابیوں کو قانون کی طاقت سے روک بھی دیا جائے تو وہ اپنا منہ دوسری جانب موڑ لیں گی اور ایک دوسرا پیکر اختیار کر لیں گی ——— اپنی اصلاح حکومت جماعتوں یا کسی غیر کے سہارے پر نہ چھوڑیئے ——— آپ اپنی حالت سُدھار لیجئے ——— یقین رکھئے کہ سماج، قوم، حکومت سیدھی سدھر جائیں گے۔ قانونوں کو بدلنے سے بہتر ہے کہ خود کو بدل لیجئے ——— آپ کے اعمال کا اثر لامحدود ہے نامحسوس طریقہ پر وہ ان سب کو متاثر کر رہا ہے جو آپ سے متعلق ہیں یا جن سے آپ متعلق ہیں۔

جب تک فرداً فرداً رعایا کے دلوں میں انسانیت کی بو اپنے اپنے حقوق اور عزت نفس کا خیال باقی ہے ——— کوئی ظالم حکومت بھی حد درجہ پر مظالم نہیں کر سکتی۔

عمدہ حاکم اور بہترین قوانین کی آرزو و تلاش ایک بت پرستی ہے ——— ملوکیت کی عبادت ہے۔ جس طرح دولت کی پوجا آدمی کو ذلیل کر دیتی ہے اسی طرح ملوکیت پرستی بھی انسان کو ناکارہ و ذلیل بنا دیتی ہے اور اسی سے ظالمانہ طرز حکمرانی کی بنیادیں پڑتی اور پختہ ہوتی ہیں۔

یہی ایک ایسا "آدرش" ہے جو قوم کے تمام افراد کے دل و دماغ میں جاری و ساری ہونا چاہیئے۔

اپنی مدد آپ کرو

ہر قوم ہر زمانے میں اپنی اگلی اور پچھلی نسلوں کے اعتبار سے ایک درمیانی نسل ہے ——— قلب گاہ کے لشکر کو زیادہ سے زیادہ مضبوط ہونا چاہیئے کہ اسی کو سب سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے ——— اس لئے ہم کو آپ کو (کہ اپنے اسلاف و اخلاف کے درمیان ایک رابطہ ہیں) بہت زیادہ سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ "اپنی مدد آپ کرو" کے اصول پر عمل کرنا چاہیئے۔

اگر کم بساط اور نا معروف آدمی بھی اپنی عزت کا خیال رکھے اپنے اوپر بھروسہ کرے ——— تو پھر کیا ہے جو وہ نہیں کر سکتا غریبی جرم نہیں اکثر بڑے بڑے آدمی غریبوں ہی میں پیدا ہوئے ہیں ——— نانِ جوئیں ہی سے بازوئے حیدرؓ کی توانائیاں قایم ہیں

اکثر غریبوں ہی نے اعلیٰ مراتب حاصل کئے ہیں اور اس راہ میں جو مصائب بھی آئے ہیں وہ ان کے سدراہ نہیں ہوئے بلکہ سمندناز پہ ایک تازیانہ بن گئے۔ ان کے دل تکالیف سے سہمے نہیں بلکہ جوش ہمت سے لبریز ہو گئے ——— رکاوٹوں نے ان کے قوا میں اور زیادہ تیز حرکت پیدا کر دی ان کے سینے میں دھڑکنے والے دل "لا تقنطوا" کے نور سے معمور ہو گئے۔

"ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا" یقیناً یہ مقولہ بہت صحیح ہے ——— یقیناً انسان جو چاہے کر سکتا ہے۔ صرف عزم و حوصلہ خود اعتمادی ——— اور اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ ہونا چاہیئے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمان خوش آہنگ
دنیا نہیں مَردانِ جفاکش کے لئے تنگ
(دانائے راز)

ایک طویل مسلسل افسانہ

فرار

حسن محمود عروج

(گذشتہ سے پیوستہ)

وہ چھپا اور مسلسل چھپنے لگا اخبار کے صفحہ اول پر اس کا مضمون چھپ رہا تھا۔ وہ عوام میں مقبول ہوتا گیا روزنامے کے مدیر سے اس کے تعلقات مستحکم اور استوار ہوتے گئے ———

——— اخبار سے اُسے تھوڑا سا معاوضہ ملنے لگا اور اس نے محسوس کیا کہ شاید اب تا نبوے کی بھوکی قبریں اس کو جلدی سے نہ ہضم کر سکیں گی

اخبار کا ایڈیٹر اس کی ملازمت کے لئے اپنے رسوخ سے کام لے رہا تھا اور شاید اس کی قسمت بھی کچھ مہربان تھی کہ اُسکو ایک امدادی مدرسہ میں جگہ مل گئی اور وہ شہر کے اس مدرسہ میں متعین کیا گیا۔ جہاں عام طور پر وینو بھائی چنو بھائی اینڈ پارٹی کے صاحبزادگان بلند اقبال پڑھنے آیا کرتے تھے جن کی جیبوں میں سونا اور سر میں گوبر بھرا رہتا تھا وہ اس سونے اور گوبر کے درمیان آگیا سونا اس کی جیب تک نہ پہنچ سکا لیکن معدے تک پہنچنے والا سابق چاول اب اعزا کی عنایت و مہربانی کی بجائے اس کے دن بھر اس دماغی گوبر میں لتھڑتے رہنے کا معاوضہ تھا۔

اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ چہرے پر شادابی آنے لگی خون جو شاید خشک ہوتا جا رہا تھا۔ پگھل کر پھر رگوں میں دوڑنے پھرنے لگا۔

۳

اس اسکول میں اس کی ملاقات ایک چمپئی رنگ کی برمی مسلم دوشیزہ سے ہوئی جو پہلے سے یہاں معلمہ تھی وہ اخبار میں اس کی نظمیں اور افسانے پڑھتی رہتی تھی اور غائبانہ اس سے متعارف تھی۔

حسن، حسن کار سے آشنا تھا حسن کار کی فطرت میں پرستاریٔ حسن ودیعت ہوئی تھی ——— دونوں قریب ہونے لگے ایک نے دوسرے کو دل میں جگہ دی جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کو ازل سے جانتے تھے اس کا دل سینے میں دھڑکنے لگا اور آنکھیں حالِ دل کہنے لگیں۔

دونوں فرصت کا وقت باتوں میں گزار دیتے ان کی گفتگو کے مختلف موضوع ہوتے تھے لیکن دونوں محبت کے مسائل پر بڑی دلچسپی سے گفتگو کرتے تھے۔

" ——— لیکن آپ نے کسی سے محبت کی ہے؟"

ایک دن جب ان کی گفتگو محبت کا موضوع اختیار کر چکی تھی اس نے چمپئی رنگ کی برمی مسلم دوشیزہ سے پوچھا ——— چمپئی رنگ کی دوشیزہ عجیب انداز سے مسکراتی ہوئی مگر شرمائی شرمائی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی وہ کچھ سہما ہوا سا دوشیزہ کو دیکھتا رہا ——— پھر دونوں مسکرا پڑے "آپ بھی عجیب ہیں" چمپئی رنگ کی دوشیزہ نے شوخی سے کہا" اور اسے گھورنے لگی وہ دوشیزہ کے دل میں چھپے ہوئے جذبات اور آنکھوں میں چمکتے ہوئے پیام کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا اُسے ایسا محسوس ہوا کہ دوشیزہ کہہ رہی ہے " ہاں میں نے محبت کی ہے ——— اور تم میرے محبوب ہو" اس کا جی چاہا کہ وہ دوشیزہ سے کہہ دے " میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم ہی میری معبودۂ عشق ہو جس کو میں اپنی نظموں اور افسانوں

میں پکارتا رہتا ہوں" لیکن دل سینے میں ٹھٹک کر رہ گیا وہ لفظوں میں اظہارِ محبت کی جرأت نہ کر سکا سرخوشی وحسرت میں ڈوبی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا ۔

اُسے اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس ہونے لگا تھا اور اس کو یقین تھا کہ زندگی کا یہ خلا صرف چمپئی رنگ کی بری مسلم دوشیزہ ہی پر کر سکتی ہے اس نے کئی مرتبہ سوچا تھا کہ دوشیزہ سے اپنے جذبات بیان کر دے آنکھیں ہمیشہ عرض والتجا نبی رہیں لیکن زبان ہر مرتبہ ناکام ہوگئی آج بھی کوشش کے باوجود زبان اس کے جذبات کی ترجمانی نہ کر سکی اور اس سے پہلے کہ جذبات الفاظ کی صورت اختیار کریں اسے اپنے جسم میں ایک سردی سی تیرتی ہوئی محسوس ہوئی جس نے لفظوں کو ہونٹوں پر منجمد کر دیا اور ——— دل کی گرمی جیسے آنکھوں سے ابل پڑی ——— آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے لہرانے لگے اور وہ دوشیزہ کو مستی بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا ——— پھر اس نے محسوس کیا کہ چمپئی رنگ کی دوشیزہ کی مستی فروش آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے ابھر آئے ہیں اور پپوٹے جیسے کسی نشہ سے جھکے جا رہے ہیں سانسوں کی شدت نے سینے پر ہلکا سا تموج پیدا کر دیا ہے جیسے کسی تالاب کے خاموش پانی میں نامحسوس سی ہلکی ہلکی لہریں ناچ رہی ہوں اور اس وقت اسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہر طرف مستی برسنے لگی ہے اور کائنات پر نیند طاری ہوتی چلی جا رہی ہے ——— وہ بے خود و مدہوش ہوتا چلا جا رہا تھا اور پھر اس مدہوشی کے عالم میں نہ جانے کیسے اس کا دل اچھل کر زبان پر آ گیا ۔

——— ایک تھرتھرائی ہوئی آواز فضا میں گونجی ۔

——— ایک لجایا ہوا سا خواب آور نغمہ بلند ہوا ۔

دونوں کی آنکھیں بند ہو گئیں ——— عرض و پذیرائی کی تکمیل ہو چکی تھی ایک بے خودی و مدہوشی کے عالم ——— دونوں کے لبوں نے محبت کے مقدس دستاویز پر مہریں ثبت کر دیں ۔

اس کا دل اُسے آسمان کی لامحدود فضاؤں میں لے اڑا ۔

——— دوشیزہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا ——— پھر اس نے دوشیزہ کے ہاتھ کھینچ کر ہٹا دئے اور سارا چمپئی رنگ اپنے آغوش میں سمیٹ لیا ۔

——— آسمان سے شراب برستی رہی وہ نشہ میں سرشار ہوتا گیا

——— دل سینے میں رقص کرتا رہا ۔ اور روح جھومتی رہی ۔

اس کی زندگی اب ایک عجیب نہج سے گزر رہی تھی ، ملازمت کی تلخیوں سے بے مزہ ہو جاتا تو محبت کی شراب پینے لگتا اور آنکھوں میں چمپئی رنگ کی دوشیزہ رقص کرنے لگتی ۔ اور جب شام کو گھر آتا تو اپنی تمام مسکراہٹیں اور سارے آنسو اشعار اور افسانوں میں منتقل کر دیتا ۔

اس نے اپنے اشعار اور افسانوں کو اپنی محبت کی زبان بنا دیا تھا اشعار ۔ میں اس کے اپنے جذبات انگڑائیاں لیتے رہتے تھے اور افسانوں میں اس کی اپنی زندگی تڑپتی رہتی تھی ——— اس کا مخاطب صرف چمپئی رنگ کی بری مسلم دوشیزہ تھی جس کو اب وہ کرما کہا کرتا تھا اور یہ نام چمپئی رنگ کی بری مسلم دوشیزہ کو اتنا پسند آ گیا تھا کہ وہ خود بھی اپنا نام کرما سمجھنے لگی تھی اور اپنے خطوں میں ہمیشہ لکھا کرتی تھی ۔

"صرف تمہاری کرما"

اور جب اس کی کرما نے ایک دن اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا "میرے ساجن!" اسے ایسا معلوم ہوا کہ زمین و آسمان کے درمیان جو کچھ ہے سمٹ کر "کرما" بن گیا ہے اور "کرما" [illegible] اس نے کرما کو [illegible] اس کا دل سینے میں رقص کرنے لگا اور آنکھوں "

مستی ناچنے لگی اور اس نے محسوس کیا کہ وہی سب کچھ ہے اور باقی کچھ نہیں

اب وہ سوچتا تھا دنیا کس قدر دلچسپ، رنگین اور پر کیف ہے۔ جب اس کا کوئی دوست اس کے سامنے اپنا دکھڑا رونے لگتا اور دنیا کو برا بھلا کہتا تو دل ہی دل میں سوچتا "کتنا عجیب شخص ہے یہ ——— کاش کوئی "کرما" اس کی ہو جاتی تو سمجھ سکتا کہ دنیا کیا ہے"؟ لیکن کرما تو بس کی تھی صرف اس کی اور شاید اسی لئے اس کے علاوہ دنیا کا ہر آدمی دکھی تھا وہ سوچتا واقعی جسے کرما نہ ملے وہ خوش بھی کیسے رہ سکتا ہے ———
اس کی آمدنی کم تھی لیکن پھر بھی وہ مطمئن تھا اور کئی ٹیوشن مسترد کر دئے تھے ——— زندگی کے تین زاویوں نے مل کر ایک مثلث بنایا تھا جس میں کسی چوتھے زاویئے کی گنجائش نہ تھی

۱۔ معدے کے لئے سابونی چاول

۲۔ روح کے لئے چمپئی رنگ کی دوشیزہ کرما

۳۔ عزت و وقار کے لئے ادبی شہرت و عظمت۔

۴

جب انھوں نے اہل مدرسہ کی آنکھوں میں وہم کی چمک دیکھی اور محسوس کیا کہ شک نے دلوں میں دھڑکن پیدا کر دی ہے تو دونوں نے غیر نگاہوں سے بچنا شروع کر دیا ——— ان کی آنکھیں اسی طرح ملتی رہیں لیکن زبانیں خاموش ہو گئیں دل نزدیک آگئے تھے مگر وہ دور دور رہنے لگے سب کچھ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا جاتا اور ہر چیز آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھی جاتی ——— اب دونوں چھٹیوں میں مدرسہ سے کہیں دور رہتے ——— چڑیا خانے میں ساحل پر، رائل لیک پر "اگری کلچر گارڈن" میں ساری دنیا کی نگاہوں سے چھپ کر مل رہے تھے ——— لیکن دنیا پھر دنیا ہے نگاہوں کا شک ہونٹوں کی مسکراہٹ بن گیا اور دلوں کا وہم لفظ بن کر ہونٹوں سے برسنے لگا اس تشہیر میں نمایاں حصہ محکمہ تعلیمات کا وہ کلرک لے رہا تھا جو چمپئی رنگ کی بی مسلم دوشیزہ کا خاص چاٹگامی چچیرا بھائی تھا

بیویوں سے بیزار ——— شادیوں کا رسیا، چاٹگام میں دو بیویاں نام کو رو رہی تھیں اور یہ رنگون میں تیسری کے شوق میں گھل رہا تھا دُبلا پتلا بے ہنگم سا آدمی آنکھوں پر سنہری کمانی کی عینک اور اس میں سے جھانکتی ہوئی نیلی نیلی سی آنکھیں جیسے خلیج بنگال کی ساری نیلاہٹ ان آنکھوں میں سما گئی تھی اور اس کو ان آنکھوں سے نجانے کیوں نفرت تھی کلرک اپنی بنت عم سے ملنے اسکول آیا کرتا تھا اور پھر اس کثرت سے آنے لگا کہ غریب مدرس کے دل میں ہزاروں دسوسے پیدا ہو گئے اس نے اسی زمانے میں ایک اڑتی ہوئی سی خبر سنی کہ چمپئی رنگ کی دوشیزہ تعلیمات کے کلرک سے بیاہی جا رہی ہے اس کا دل دماغ کھو کر رہ گیا اور جب تعلیمات کے کلرک کو اپنی کرما سے باتیں کرتا ہوا دیکھتا یا اس کے پاس کھڑا دیکھتا تو اس طرح جھنجھلا کر رہ جاتا جیسے کوئی زخمی سانپ جس کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی ہو اسے ایسا معلوم ہوتا کہ تعلیمات کا کلرک اس کی کرما کو چھینے لے رہا ہے اور وہ مجبور کھڑا ہے ——— آخر ضبط نہ کر سکا۔

چھٹی کے دن ایک شام کو ——— آسمان پر گہرا ابر چھا رہا تھا اور وہ اپنی کرما کے ساتھ "اگری کلچر گارڈن" کی شاداب و رنگین روش پر ٹہل رہا تھا کہ اس نے اپنے دل کے زخم نمایاں کر دئے چمپئی رنگ کی دوشیزہ مسکرانے لگی۔

"تم کو مجھ پر بھروسہ نہیں کیا؟"

کرما نے پوچھا اور اس کا دل دھڑکنے لگا اس نے اپنے دل کا جائزہ لیا۔

"کیا وہ اپنی کرما پر بھروسہ نہیں کرتا؟" وہ ایک نئی الجھن میں مبتلا ہو گیا۔

شاید وہ کرما پر بھروسہ نہیں کرتا! ——— لیکن یہ کس طرح ممکن ہے؟ ——— وہ کرما پر اپنے آپ سے زیادہ بھروسہ کرتا ہے!

وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا، نہیں جانتا تھا کہ کیا جواب دے اور خاموش ہو گیا مغموم! پژمردہ!! (باقی صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ فرمائیے)

اگست ۱۹۴۹ء

سائیکولوجی کراچی

عمل، امید اور روشنی کا پیامبر

جاوید

نمبر ۶ کے لکھنے والے

فراق گورکھپوری

اثر لکھنوی

سلام مچھلی شہری

منیب الرحمٰن

خلیل الرحمٰن اعظمی

کمال احمد صدیقی

کوشلیا اشک

خاطر غزنوی

سالانہ دس روپے

نمبر ۷ کے لکھنے والے

کرشن چندر

سہیل عظیم آبادی

مہندر ناتھ

کشمیری لال ذاکر

ابو سعید قریشی

کرتار سنگھ دگل

وحید قریشی

جاوید منظر

فی پرچہ ایک روپیہ

عدیم النظیر خاص نمبر اور شمارہ نمبر ۶ کے بعد شمارہ نمبر ۷

پیش کرتا ہے

جاوید :- ترقی پسند رجحانات کا علم بردار

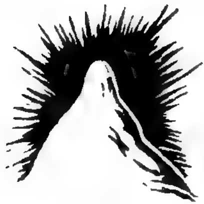
جاوید :- عوامی فنکاروں کا ترجمان

مدیران

کشور یاسین

نصیر انور

گہوارۂ ادب لاہور ۲



فاران

Reg. No. L 5 1 9 1 , 1 9 4 7 .

PSYCHOLOGY

HEALTH · HAPPINESS · SUCCESS

سائیکولوجی کا بے نظیر تحفہ
"ذہنی عکس ریز" کورس ۱۹۴۹ء

اگر آپ دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو یہ ضرور پڑھیں مستقل خریداروں کی فہرست میں نام لکھائیں۔ یہ پیشکش پاکستان اور ہندوستان میں آج تک کسی نے نہیں کی ✦



سائکولوجی کے مستقل خریداروں کو ستمبر ۱۹۴۹ میں پیش کیا جائیگا

Title printed at the Jubilee Printing Works, & Published from the office of the Monthly Psychology (Urdu) at Marriot Rd. Karachi

سائیکولوجی

انگلستان کے مشہور نفسیاتی ماہنامہ کا اردو ایڈیشن



سائیکولوجی کا بے نظیر تحفہ

"ذہنی عکس ریز" کورس ۱۹۴۹ء

اگر آپ دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو یہ ضرور پڑھیں — مستقل خریداروں کی فہرست میں نام لکھائیں یہ پیشکش پاکستان اور ہندوستان میں آج تک کسی نے نہیں کی •



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انگلستان کے مشہور ماہنامہ "سائیکولوجی" کے جملہ حقوق ترجمہ و اشاعت

برائے پاکستان و ہندستان محفوظ ہیں

سائیکولوجی (اردو)

ستمبر سنہ ۱۹۴۹ء

ادارۂ تحریر { سعیدہ عروج، ایم اے، بی ایڈ
حسن محمود عروج

مدیر عمومی :- انعام اللہ خان، بی اے، بی ایل

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

چندہ سالانہ :- چھ روپے

دفتر :- "سائیکولوجی اردو" ۴۱ میریٹ روڈ (پوسٹ بکس ۵۰۲۲) کراچی

مندرجات

پہلی نظر
کیا زندگی سے فرار ممکن ہے ؟
چند دماغی کیفیات
جی ---! وہ کہتی ہے میں مردوں سے کم نہیں ---!
آپ بھی سوچئے ---!
زندگی کے ابتدائی پانچ سال
ہمارا معاشی خطرہ
بات چیت
خود اعتمادی سیکھئے
سلام و پیام
غزلیات
فن خود تراشی
جنسی زندگی
قوت ارادی
فرار

پہلی نظر

تاریکیاں :-

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے

آج کی دنیا معائب و مشکلات سے دوچار ہے !

آدمیت سر برہنہ چیخ رہی ہے ! ——————

"معائب سے بچاؤ ———— مشکلات سے نجات دلاؤ"

معائب سے بچاؤ نہیں ———— مشکلات سے پناہ نہیں ———— !!

معائب و مشکلات جیسے انسانیت کے راستے میں کھڑے ہو گئے ہیں جن کو پار کرنا جیسے انسان کی طاقت سے ماوراء ہے !!!

کیوں ———— ؟

صرف ایک جواب :-

"شاید آدمی بزدل ہو گیا ہے ———— غالباً انسانیت کمزور ہو گئی ہے"

جب ہم کمزور ہو جاتے ہیں تو ہماری حریف طاقتیں خود بخود طاقتور ہو جاتی ہیں ———— یہ ایک کلیہ ہے !

آدمی میں طاقتوں کا فقدان مشکلات و معائب کی توانائیوں کا سبب ہے !!

نپولین کی فوج آگے بڑھ رہی ہے ———— سامنے کوہ الپس راہ روکے کھڑا ہے ———— فلک شکوہ ! آسماں گیر !!

لوگوں نے کہا :—

"الپس حائل ہے فوج آگے نہیں جا سکتی"

نپولین کی غیرتِ مردانہ سن نہ سکی جرأت تڑپی :-

"فوج آگے بڑھے گی ———— الپس نہ رہے گا"

پھر کتنی عجیب بات ہے ———— اسی پہاڑ میں وار پار راہ بنی اور فوج آگے بڑھی

مشکلات کا کوئی مقام نہیں مگر ہمارے اپنے دل و دماغ کی کمزوریاں ———— ان کی کوئی توانائی نہیں مگر ہماری اپنی بزدلی و ناہمتی ———— ان کا کوئی سہارا نہیں مگر ہمارا اپنا ریب و شک"

ریب و تشکیک کو قتل کر دیجئے بزدلی و ناہمتی کو خدا حافظ کہئے کمزوریوں کو رخصت کر دیجئے ———— مشکلات کا وجود ختم ہو جائیگا ———— یہ سب ہمارے خوف کی پیداوار ہیں ———— اور یاد رکھئے خوف کا کوئی وجود نہیں ———— صرف ہمارا ایک وہم ہے ———— خوف کا گلا جس وقت آپ گھونٹ دیں گے کامیابی آپ کے پاؤں چومے گی، مشکلات آپ سے دُور بھاگیں گی۔

زندگی میں اتار چڑھاؤ لگا ہی رہتا ہے ——— اگر ہم اس اتار چڑھاؤ سے گھبرا جائیں تو زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے ——— یہ زندگی کا اتار چڑھاؤ ——— مشکلات و مصائب نہیں ——— بلکہ انسانیت کی ایک کسوٹی ہے ——— !

اس کسوٹی پر وہی کھوٹے ثابت ہوتے ہیں ——— جو اس راز سے ناآشنا ہیں ——— لوہے کو آگ میں نہ تپائیے ——— برابر کے لوہے سے برابر کی چوٹ نہ لگائیے ——— لوہا کبھی فولاد نہ بنے گا۔ آدمی اس وقت تک انسانیت کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ زندگی کے اتار چڑھاؤ سے نہ گذرے ——— !

بیج جب تک مٹی میں مل کر کھاد کی "تیزابیت" سے دوچار نہ ہو جائے شگوفہ نہیں بنتا ——— !!

یہ "عالم شہادت" ایک تجربہ گاہ ہے یہاں ہر شے کو تجربات سے گذرنا لازمی ہے ——— !!!

زندگی صرف پیدا ہونے اور مر جانے کا نام نہیں ——— بلکہ مہد سے لے کر لحد تک بکھری ہوئی لذتوں اور کیفیات کے حاصل کر لینے کا نام ہے ——— پھر یہ لذتیں صرف کامیابیوں ہی میں پنہاں نہیں ——— ناکامیوں میں بھی مستتر ہیں

متاعِ بندگی ہے درد و سوز و آرزومندی

مشکلات و مصائب ۔ تجربات ہیں ——— تجربات علم ہیں ——— علم لذت ہے جو روحِ انسانی کو بلند سے بلند تر کرتی رہتی ہے ———

جس وقت آپ ناکامیوں، مشکلات اور مصائب کی آزمائشوں سے پناہ مانگتے ہیں تو گویا اپنی روح کے تقاضوں کو ٹھکرا دیتے ہیں روح کو پستیوں میں گرا دیتے ہیں ——— کاش مقدس قرآن حکیم کے مقدس الفاظ اپنے پورے مفاہیم کے ساتھ آپ کے ذہن میں ہوں :-

"انا للہ وانا الیہ راجعون"

یہ تصوف کی کوئی باریکی نہیں ——— کہ جس سے پناہ طلبی ہی تہذیب سمجھی جا رہی ہے ——— بلکہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے ——— کہ جس کو اپنانا ہی عظمت و تہذیب ہے ——— !!!

معاف فرمائیے یہ جملہ ——— جملہ معترضہ بن کر درمیان میں آپڑا ——— ورنہ کہہ یہ رہا تھا کہ "مہد سے لحد تک پھیلی ہوئی اور بکھری ہوئی لذتوں کا حاصل کر لینا ہی زندگی ہے" ——— سوچنا یہ ہے کہ وہ لذتیں کون سی ہیں جو مہد تا لحد بکھری پڑی ہیں ——— ؟

یقیناً لذت و کیفیت ——— کوئی مادی اور ٹھوس شے تو نہیں ہے کہ مٹھی میں دبا لی جائے بلکہ وہ ہمارے احساسات ہی کے مختلف ارتقائی نتائج ہیں ——— اور حاصل کیے جا سکتے ہیں مشکلات و مصائب کی دیواروں اور چٹانوں سے ٹکرا کر ——— !!

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشۂ و سنگ گراں ہے زندگی

اگر آپ کو رات کی تاریکیاں اپنے دامن میں لپیٹے لے رہی ہیں ——— تو بیٹھ کر ماتم نہ کیجیے بلکہ چراغ کی لو سے تاریکیوں پر حملہ کیجیے ہر طرف نور ہی نور ہے ——— زندگی گریز و فرار نہیں حملہ و تاخت ہے ——— !

ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر

مشکلات سے پناہ نہ مانگیے، مشکلات پر حملہ کیجیے اور ان کو ختم کر دیجیے ——— اگر کسی خارجی طاقت نے آپ کو کسی مشکل سے "پناہ" دلوا دی ——— تو پھر آگے کئی مشکلات آپ کی راہ روکے کھڑی ہوں گی۔ جب ہم کسی مشکل پر قابو نہیں پاتے اور ناکام ہو جاتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے ضرور کوئی غلطی کی ہے ——— ناکامی کے اسباب آسمان سے نازل نہیں ہوتے بلکہ ہمارے اپنے اندر چھپے ہوئے ہوتے ہیں ——— ان کی تلاش کیجیے اور ختم کر دیجیے

جن لوگوں نے اس راز کو سمجھ لیا اور اپنی کمزوریوں پر قابو حاصل کر لیا ——— ناکامی کبھی ان کے قریب نہیں آتی۔

آدمی کو موت پر اختیار نہ سہی لیکن کامیابی و ناکامی تو بالکل اس کے اپنے ہاتھ میں ہے صرف بے تکان محنت، صحیح غور و فکر عزم صمیم اور ایک جرأت بے باک کی ضرورت ہے اور یہ سب کچھ ہر انسان کے اندر موجود ہے ؎

یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

نپولین کا ایک قول ہمیشہ تاریخ میں چمکتا رہے گا۔

"دنیا میں کچھ ناممکن نہیں ——— اس لفظ کو لغت سے نکال دو"

منطقیین ——— اہل منطق ——— "جبر و قدر" پر جیسی بھی موشگافیاں کرتے ہوں اس سے بحث نہیں لیکن یہ ایک صداقت ہے کہ آدمی جو چاہتا ہے کر لیتا ہے۔

کسی ناکامی کے بعد ——— قسمت کا شکوہ ———؟

آدمی کی قسمت تو اس کی اپنی مٹھی میں بند ہوتی ہے ——— "جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں" یا زیادہ صاف الفاظ میں "دانائے راز" ہی سے سنیئے۔

عبث ہے شکوہ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

اگر ہم خدا کی دی ہوئی طاقتوں کو ——— جو ہم میں مستور ہیں ——— پوری توجہ کے ساتھ کسی کام پر لگا دیں تو ناکامی ممکن ہی نہیں ہے ——— کیونکہ یہ ساری طاقتیں خدا کی دی ہوئی ہیں اور خدائی ہیں ——— "اللہ نے آدمی کو اپنی شکل پر پیدا کیا ہے" ——— اور اللہ کبھی ناکام نہیں ہوتا

جب کوئی آدمی یہ کہتا ہے کہ فلاں کام دشوار ہے ——— "ممکن نہیں" تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنی ان طاقتوں سے منکر ہو جاتا ہے جو خدا نے اس کو دے رکھی ہیں ——— یہ آدمی کا ایک کفر ہے جس کی سزا ناکامی و نامرادی ہے۔ ہم سائیکولوجی کے قارئین سے متمنی ہیں کہ وہ اس کا یقین کر لیں کہ: ——— کامیابی ان کے لئے ہے اور وہ صرف اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ اپنے ہر کام میں کامیاب ہو کر رہیں ؎

مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

آیندہ شمارہ کی ایک جھلک

سائیکولوجی کیا ہے؟ مولانا عبدالماجد دریا بادی کے گہر ریز قلم سے

تحت شعور ——— ایک مشہور مصنف کا مختصر مگر تفصیلات پر حاوی مضمون

فلسفہ اور فلسفی ——— مشہور فلسفی مسٹر جوڈ کے افکار پر ایک مضمون ہے

کیا ترقی آپ کی ازدواجی زندگی میں حائل ہے ——— سائیکولوجی کے ایک دلچسپ انگریزی مضمون کا ترجمہ

امید کے چراغ ——— ایک مختصر افسانہ

قیادت ——— قیادت پر ایک دلچسپ مضمون

مستقل عنوانات:۔

آپ بھی سوچئے، سلام و پیام، بات چیت؛ اور دوسرے دلچسپ معلوماتی مضامین ٭

کیا زندگی سے فرار ممکن ہے؟

(سائیکولوجی انگریزی کے معزز مدیر مسٹر رابرٹ ہیپ کے قلم سے)

یہ ایک عجیب بات نہیں، کوئی انوکھا حادثہ نہیں بلکہ امر واقعہ ہے کہ جب کوئی عظیم ہستی یا دنیا کی کوئی مشہور شخصیت خواہ وہ کسی فرقہ یا معاشرہ سے تعلق رکھتی ہو جب کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتی ہے جس کی اس سے مطلق توقع نہیں ہوتی تو ہر طرف عجیب سنسنی سی پھیل جاتی ہے اور خیال آرائیوں کا ہجوم ہو جاتا ہے ! لوگ سوچتے ہیں ایسا کیوں ہوا؟ اور اگر ہوا تو وہ کونسی بات تھی جس نے اس کو "ہونے" پر مجبور کیا !

یہ اس وقت کی بات ہے جب "جنگ عظیم" کا دنیا پر تسلط تھا اور دھرتی ماتا کے جسم پر جا بجا آگ و خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی ——— اچانک روڈالف ہس Rudolf Hess نے چند ہفتوں کے لئے جرمنی سے اسکاٹلینڈ کو پرواز کی تھی ——— ہر آنکھ حیران اور ہر لب پریشان تھا ——— کیوں؟ ——— یہ ہس یہاں کیوں؟ ——— ایک طبقہ بزعم خود سوچ رہا تھا کہ وہ اس راز سے واقف ہو گیا ہے جو دغا بازی اور غداری کی پیشانی پر چمک رہا تھا ——— لیکن کیا یہ امر واقعہ تھا کیا ہس ایسا آدمی تھا؟ ——— کیا ہس ایسا آدمی تھا؟ ——— کیا ایسا ہو سکتا تھا؟ یہ تو خود شاید ہس کا راز تھا ——— !

ان ساری خیال آرائیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ماہرین اس نکتہ پر پہنچے ہیں "ہس" "فراریت" کا شکار ہے ——— جس کو نفسیاتی اصطلاح میں Schizophrenia کہتے ہیں یہ دماغی الجھاؤ ہے جس سے صاحب ہوش بھی تکلیف اٹھاتے ہیں ——— یہ دراصل ماحول کے ناقابل برداشت دباؤ سے فرار ہو جانے کی ایک زبردست خواہش ہوتی ہے ——— اور یہ گویا صبر کی انتہا کا اختتامیہ ہوتا ہے ——— جب روح ایک دفعہ بوجھ اٹھانے کی تاب نہ لا کر چیخ اٹھتی ہو اور گر کر چکنا چور ہو جاتی ہو ! ایسی صورت میں صورت حال کا بالکلیہ پلٹ جانا ضروری ہوتا ہے ——— ایک آرام اور بالکلیہ آرام کی ضرورت ہوتی ——— تاکہ زخمی و لاچار روح کو سکونِ کامل نصیب ہو سکے !

جس وقت انسان ایسے حالات سے دوچار ہوتا ہے وہ اپنی ساری توانائیوں کو گھسیٹ کر ایک جگہ لے آتا ہے اور پورے خلوص قلب سے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے ——— اس میں ایک برقی قوت سی پیدا ہو جاتی ہے ——— لیکن جب بات حد سے گذر جاتی ہے تو پھر انسان نہ صرف فرار و گریز چاہتا ہے بلکہ وہ حقیقتوں سے بھی بھاگ کھڑا ہوتا ہے ——— اور یہ بیماری خصوصاً ان افراد کی قسمت بن جاتی ہے جو تنہائی پسند [illegible] اور انتہا پسند ہوتے ہیں ——— ان کی فطرت ہر وقت ان کو دنیا کی مخالفت کا ایک ایک پہلو دکھاتی رہتی ہے ——— حالانکہ [illegible] طاقتوں کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے ؟ ایسے افراد صرف زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے زندگی کی حقیقتوں اور تلخیوں سے گریز کرنا شروع کرتے ہیں۔ اور اپنی روح کی جراحتوں کو چھپانے کے لئے زندگی کے خارزاروں سے دامن بچا بچا کر چلنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں ——— لہذا اس کے لئے انھیں ایک جنت بنانی پڑتی ہے ——— وہ اس جنت میں دنیا بھر کی رعنائیاں، رنگینیاں اور دلکشیاں لا کر بھرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں ۔ وہ اس جنت میں بس جانا چاہتے ہیں ——— وہ اس جنت میں اس طرح خود کو چھپا لینا چاہتے ہیں جیسے وہ ڈرتے ہوئے مرغی کے بچے ہیں اور یہ جنت مرغی کے پاؤں میں پناہ و سکون اور چین لیتے ہیں ——— !

لیکن یہ ایسا کیوں کرتے ہیں ؟ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس راز کو نہ ہی ان کے اعزہ اور احباب جانتے ہیں اور نہ وہ خود واقف ہوتے ہیں ——— وہ بھاگتے ہیں ——— اس طرح جذبۂ فراریت شدید سے شدید تر ہوتا جاتا ہے ——— !!

یہ راز دراصل ان کے لاشعور میں مخفی رہتا ہے ——— یہ جذبہ کبھی کبھی بیس سال کی عمر سے ورنہ عموماً نصف عمر سے شروع ہوتا ہے ——— :

اور ہٹس بھی ان ہی مریضوں میں سے ایک تھا ———— جس نے مریحاً فراریت اختیار کی تھی ! اب یہ سوال کہ اس کا یہ فرار کس حد تک عقلمندیوں اور دانشمندیوں کا حامل تھا یہ تو شاید وہ خود یا تاریخ جواب دے سکے ! نہیں معلوم یہ اس کی متشکی طبیعت تھی کہ واقعی ان مصائبِ افکار کی شدت کہ اس کا ذہنی توازن برداشت نہ کر پایا ———— کیونکہ وہ خود تو بہت ہی عقلمند، باعمل اور قابل آدمی تھا یہ بات نہیں تھی کہ بڑے آدمی کی کوئی چیز اس میں کم تھی !

پتہ نہیں کہ اس میں وہ کونسا جذبۂ ایثار و قربانی پیدا ہوا تھا کہ ہٹلر جیسے ڈکٹیٹر کا دست راست ہونے کے باوجود اس نے اس قسم کی حرکت کی! ——
اب نہیں معلوم کہ اس کے جذبۂ امن پسندی کے سامنے جنگ کی ناگزیر مہیب شکل اس طرح آکھڑی ہوئی تھی کہ اس کو برداشت کرنا اس کے بس کا کام نہ تھا —— یا شاید جنگ کی تباہ کاریاں اور انسانیت کی تباہیوں نے اس کے ہوش و حواس کے پرخچے اڑا دیئے تھے ؟ یا اُسے یہ گمان ہو گیا تھا کہ دوسرے اس کی زندگی اور آزادی کو ڈھونڈھ رہے ہیں ؟ ————

ہماری فراریت کا راز !

شاید اس صداقت تک ہماری کبھی رسائی ممکن نہیں ! اس راز تک پہنچنے کے لئے بہت ہی بہترین اور آسان ذریعہ یہ ہے کہ ہم اپنی ذات کی طرف متوجہ ہو جائیں ———— چند سوالات ؟ ————

کیا آپ نے کبھی زندگی سے فرار چاہا ہے ؟

کیا کبھی آپ کے دل نے آپ کو مجبور کیا کہ آپ بھاگ کھڑے ہوں ؟

اور اگر ایسا ہوا ہے تو اس خواہش فرار کا بنیادی سبب کیا ہے ؟

———— !

———— !!

سوالات کا جواب دیکھئے ———— کتنا مختصر ہے ————

خوف !

اور ہر فرار کی جڑ یہی خوف ہے !!

اب یہ یا تو حقیقی ہوتا ہے یا تصوری ———— ہٹس ان ہی دو میں سے ایک کا نشانہ ہوا تھا !

زندگی میں نہ جانے کتنی بار کتنے موقعوں پر، کتنے وقت ایسا وقت اور ایسا تجربہ بھی آیا ہو گا کہ ہم نے اسی لمحہ سوچا ہو گا کہ "کاش بھاگ چلیں ——!"

اے عشق کہیں لے چل ———— !

یا —— اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں ؟

جیسے سوالات سامنے آ دھمکے ہوں اور ہم نے ان سے دامن چھڑا کر روپوش ہونا چاہا ہو ——

———— !

فرار کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں ———— اور یہ اس وقت تک بالکلیہ ممکن نہیں ہو جاتا جب تک کہ قوت مدافعت کی آخری سانس ٹوٹ نہیں جاتی —— انسان پناہ لینا چاہتا ہے ———— اور پناہ لینے کے لئے ایسا ماحول ڈھونڈتا ہے جو اس کے اپنے ماحول کا بالکل جواب ہوتا ہے —— ! ورنہ بارہا دیکھا گیا ہے کہ فرار کی کوشش کرنے اور اس کوشش میں ناکامی کی وجہ سے کئی آدمی اپنے بہترین جوہر ذاتی سے محروم ہو گئے ہیں —— اعلیٰ درجہ کی یادداشت ایسے صدمے بہت کم برداشت کرتی ہے —— ! دنیا بھر کی کمزوریاں اس میں پیدا ہو جاتی ہیں ———— وہ اس کشتی کی طرح ہو جاتا ہے جس کا مستول ہی ٹوٹ کر گر پڑا ہو ——

وہ بھاگنا چاہتا ہے اسے راستہ نہیں ملتا ———— خوف کا بھوت اپنی ساری وحشتوں کے ساتھ اس کے اطراف ناچنے لگتا ہے —— وہ اس سے دامن بچانا چاہتا ہے لیکن لاشعور ہر وقت وہ بھیانک تصویر اسے دکھا دیتا ہے ————

یہاں تک کہ اس پر قنوطیت کا دورہ پڑ جاتا ہے ——— وہ خود کو پابند تقدیر سمجھنے لگتا ہے اور اس کا تصور اسے خوف کی خطرناک گہری گھاٹیوں میں گھسیٹے لئے جاتا ہے !!

دق کی طرح اس کے تین درجے ہوتے ہیں ——— پہلے کا مندرجہ بالا عالم ہوتا ہے، دوسرے میں جسمانی طاقتیں مٹی کی طرح گھلنے لگتی ہیں اور تیسرے میں ذہنی توازن پاگل پن کی حد تک بگڑ جاتا ہے ——— !

لیکن یہ خوف کیوں ؟

جس قسم کا ہمارا ماحول، تربیت اور طبیعت ہو گی اسی قسم کا ہمارا جذبۂ خوف ہوگا۔ صرف اس لئے کہ ہم ڈرتے ہیں، خوف کھاتے ہیں کوئی ہمیں بزدل اور نامرد نہیں کہہ سکتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عورت ہو کہ مرد بہادر وہی ہے جس نے اپنے خوف زندگی کو اپنی مٹھی میں رکھا ——— ایسی مثالیں موجود ہیں کہ لوگ بڑی سے بڑی مصیبت، آگ، ہوائی حملہ، بیماری، دہشت اور طوفان سے گزرے ہیں اور ماتھے پر شکن نہیں پڑی ہے ویسے اگر کسی سپاہی نے مصنوعی لڑائی میں گولہ باری سے آنکھیں جھپکا لیں یا اس کا دل دھڑک اٹھا تو یہ نہ بزدلی ہے نہ نامردی ——— فطرت ہے !

لیکن ایسے تجربات سے انسانی سینے میں خوف نہیں پیدا ہوتا ——— وہ تو اصل میں نفسیاتی زخموں، غلط تربیت، جہالت، توہم پرستی اور دبائو سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ جسمانی جراحتوں یا حادثوں سے اس قسم کے خوف بہت مضبوط اور قوی ہوتے ہیں ——— ان سے چھٹکارا جوئے شیر لانے کے برابر ہو جاتا ہے اس لئے کہ ان کی بنیادیں شعور اور لاشعور دونوں میں اپنی جڑیں پھیلا دیتی ہیں ——— ؟

اس کا تجزیہ یوں ہوتا ہے :—

کیا آپ پر ایک نامعلوم خوف طاری ہے ؟ جس نے آپ کے دماغ کا سکون اور آپ کی کامیابیوں کی قوت کو مجروح کر کے سلب کر لیا ہے ؟

کیا آپ قرضدار ہیں اور آپ کے اخراجات کے پاؤں آپ کی آمدنی کی چادر سے باہر نکلے پڑ رہے ہیں ؟

کیا کچھ ایسے فرائض ہیں جن سے آپ غفلت برت رہے ہیں ؟

یا آپ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے ؟

یا ایسا بار ہے کام کا کہ آپ کے حیطۂ امکان سے باہر ہے ؟

یا وہ جس کے لئے آپ کی روح اور آپ کا قلب سب کچھ بک چکا ہے ڈر ہے کہ وہ آپ کے قبضۂ محبت سے نکل جائے گا ؟

کیا یہ نئی تہذیب ——— اور یہ نئی روشنی آپ کی آنکھیں چندھیائے دیتی ہیں ؟

کیا آپکی معروفیت آپکے مذاق سے بہت ہی گری ہوئی اور جداگانہ ہے؟ کیا آپ اس کو بالکل برداشت نہیں کر سکتے ؟

یہ سارے عوامل ———

اگر ہیں آپ کی زندگی میں تو پھر یہ امر یقینی ہے کہ کبھی نہ کبھی آپ کا دل ان سے فرار کے لئے چیخ اٹھا ہوگا ———

لیکن ؟ ——— ؟ ؟

——— [illegible] ؟

[illegible]

[illegible] ہو جاتی ہے ——————

ساری انسانیت اس طرح ایک عذابِ مسلسل کی شکار ہے !!

خواہ عورت ہو کہ مرد دونوں کبھی ایسے مقام پر بھی پہنچ جاتے ہیں جہاں اخلاق، مذہب، دل، دماغ، غیرت، عزت ہر چیز ساتھ چھوڑ دیتی ہے —— وہ صرف زندگی کی اس جنسیت کی تاب نہیں لا سکتے جو ان کے وجود کو لاوے کی طرح پگھلا رہی ہوتی ہے —————— ! یہ سرخ خطرہ انھیں فرار پر مجبور کرتا ہے

لیکن اب تو زمانہ نے ترقی کر لی ہے —— ——

اس دور میں عقل کا ایک مقام ہے ——————

سوچئے آخر انسان اس بری طرح جذبات کے دھارے پر کیوں بہے ؟

ہم تو یہی کہیں گے کہ بجائے منہ اٹھائے سرپٹ دوڑنے کے ذرا رک جائیے ——— پلٹیے ——— پلٹ کر دیکھئے ——— ؟

کونی خامی ہے ——— ——

کوئی غلط فہمی ہے ——— ———

کوئی گناہ ہے —— ——

غرض کچھ نہ کچھ —— یہ تمہاری فطرت، شخصیت اور ذات میں پوشیدہ ہے !

یہ آپ کا سب سے کمزور اور جاہل پہلو ہے جو آپ کو فراریت پر مجبور کرتا ہے ———

آئیے —— میرے ساتھ آئیے —— گھبرائیے نہیں !!

ذرا اس نہاں خانۂ دل میں بھی جھانک کر دیکھئے ——————

وہ جو ایک روشنی نظر آ رہی ہے ——— وہاں کوئی دیا ضرور جلتا ہوگا —— —— ضرور جلتا ہوگا !!

جی ہاں ! ———— یہی وہ " سراجِ ہدایت " ہے جس کو ہم " روح ! " کہتے ہیں ——— ! جان تقدیس روحانیت !!

اس کی قوتیں بے پناہ ——— اس کی طاقتیں لاجواب ——— اس کی عظمت لامحدود !!

یہ کیا ہے ؟

ایک ایسا سوال ہے کہ اس کو انسان نے اپنی ساری ترقیوں اور تعمیروں کے باوجود صرف " روح " کا نام دیا ہے

یہ وہ قوتِ ربانی ہے جو اپنی تجلیوں سے دل و دماغ کے ہر تاریک گوشہ کو بقعۂ نور بنا دیتی ہے ——— اس کا علم تقدس حاصل کیجئے —— اس کی رہنمائی میں سفرِ حیات طے کرنے کے لئے کمر باندھ لیجئے —— —— ——

توانائیاں یقیناً آپ میں پیدا ہو جائینگی !!

خوف کو دور کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آپ کسی " مفید کام " پر لگ جائیں ——— جو آپ کو اس قدر تنگ کرے کہ آپ خود کو بھول جائیں ——

عقائد کی کمزوری خوف کا گھر ہے ——— دن بدن عقائد کو مضبوط کرتے جائیے ——— ہر روز ایک نیا روز ہو ——— ہر روز طلوع [illegible] ایک نئی زندگی کا پیغام سنائے اور ہر شام ایک اختتامِ حیات کی خبر دے !

[illegible] وں کے کام آئیے ——— اپنے تجربے بڑھائیے ——— !

[illegible] سفرِ حیات پر خطر ہے !!

[illegible] سے بڑا شیطان جو ہوش و حواس کی دھجیاں بکھیر دیتا ہے وہ خوف ہے ! زندگی کے ہر قدم پر قدم اٹھئے جو طاقت آپ کو روک [illegible] ہے جو آپ کے خون کی گردش کے ساتھ آپ کے سارے جسم میں دوڑ رہا ہے ——— !!

اس سے بچئے ——— !

یہ انسانوں کو پاگل بناتا ہے ——— اور زندگی کی ہر لذت سے محروم کر دیتا ہے

پرانے زمانے میں خیر و شر کا مسئلہ ہمیشہ انسانوں کے پیش نظر رہتا تھا ——— اور خوف برائی کا نام تھا ——— آج بھی ہزار ہا سال کے بعد شیطان سے ڈرا جاتا ہے ——— اور خوف شیطان کے سوا کوئی نہیں

حضرت عیسیٰ سے کسی نے آکر کہا کہ فلاں قبرستان میں ایک دیوانہ ہے ——— ہر وقت موٹی زنجیر اس کے لئے محض لرز رہا ہے ——— خطرہ ہے کہ وہ کہیں لوگوں کی جان کا خطرہ نہ ہو جائے ——— آپ تشریف لے گئے ——— پوچھا ———

کیا بات ہے بھائی ——— کس لئے پریشان ہو ؟ دیوانے نے غور سے دیکھا اور کہا ۔

"نہیں معلوم میرا دل ہر وقت کیوں دھڑکتا رہتا ہے !" آپ نے تسلی دی

"تو کیا تمہیں خدا پر بھروسہ نہیں ؟ ——— خوف تو شیطان کا دوسرا نام ہے ! ——— اس کو نکال پھینکو !"

"میں کوشش کروں گا ———!" اس نے جواب دیا ——— !

اور جب اس کو اس نے واقعی دل سے دور کیا تو وہ پھر سے تندرست اور بے خطر آدمی تھا ۔

اور اس راز کی حقیقت انسان کی اپنی "جرأت قلبی" میں پوشیدہ ہے ! اور اس کے بغیر آپ دنیا میں قطعاً کچھ نہیں کر سکتے ——— لہذا اس کارگر جذبہ کی فراوانی پر پرورش کیجئے ——— !

جرأت ہر شے پر فتحیاب ہوتی ہے اور اس سے اخلاقی، جسمانی، روحانی ہر قسم کی قوتیں نشو و نما پاکر مضبوط ہوتی ہیں ——— !!

اصل میں انسان کے اندر ایک "جرأت رندانہ" کی سخت ضرورت ہوتی ہے ——— !!!

بے خطر کود پڑنا خطرناک ضرور ہے لیکن ——— بڑے آدمی ہمیشہ یہی کیا کرتے ہیں !

نہیں معلوم کتنی ہستیاں ہوں گی جو ایک ذرا سی جرأت کی کمی نے ان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گمنام کر کے زمین کے کسی نامعلوم گوشے میں دفن کر دیا ہوگا ——— بقول غالب ——— ع

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اور اب یہ کسے مقدور کہ خاک سے ان گنج ہائے گرانمایہ کے متعلق پوچھتا پھرے !

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک ذرا سے سہارے کی ضرورت ہے ——— اور پھر جو اٹھ جاتا ہے اور وہ پرواز ہی پرواز کرنے لگتا ہے ——— !

اور یوں زندگی ایک جوا ہے اس میں خطرات کا دھڑکا ہر وقت لگا رہتا ہے ان سے ڈرنا دنیا کی بدترین لعنت ہے !

اس پار یا اس پار ——— ——— کوشش و تدبیر لازمہ ہے اس کو انسان کی پہلی اور آخری کاوش ہونا چاہیئے ——— ——— !

یقین پیدا کر اے ناداں !

اس کا یقین رکھیئے کہ زندگی میں نشیب و فراز، سختیاں اور نرمیاں، بدبختیاں اور خوش قسمتیاں، غم و مسرت، ناکامیاں اور کامیابیاں، زندگی اور موت ——— جزو لاینفک ہیں ! یعنی ؎

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی !

ہمارا فرض ہے کہ ہم زندگی کے نفی و اثبات دونوں کے لئے تیار رہیں ——— گھبراہٹیں، پریشانیاں، بدحواسیاں، آنسو، آہیں نالے ——— سب بیکار ہیں

ہم پیدا ہوئے ہیں کہ جئیں ——— اور جئیں گے تو زندگی کا ہر ناز اٹھانا ہمارا مقصد لہذا ———

ہماری زندگی اس شعر کی ایک کمل تفسیر ہونا چاہیئے ؎

یقین محکم عمل پیہم، محبت فاتح عالم — جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

خداوند کریم کی ذات پر بھروسہ رکھئے ——— ایک لازوال بھروسہ !

زندگی میں ہر تاریکی کا خندہ پیشانی سے استقبال کیجئے ——— !

ہر غلط قدم پر سنبھل جائیے ——— !!

صرف خدا کو یاد کیجئے ——— پکاریئے

خدا کے بغیر خودی نہیں ملتی ؎

ہم زخدا خودی طلب — ہم زخودی خدا طلب !!

——— !

زندگی کو پریوں کا قصہ سمجھ کر نہیں حقیقتوں کی داستان سمجھ کر مقابلہ کیجئے ——— !

جو ناگزیر ہے اس سے انکار نہ کیجئے ——— مشکلات کا مقابلہ کیجئے ——— اور جرأت و عقیدۂ صالح کی پرورش کیجئے ——— اس کے ساتھ ساتھ "جذبۂ عمل" اور "قوت عمل" پیدا کیجئے ——— یہ آپ کی زندگی کا سب سے ضروری زادِ سفر ہے !!

اگر جی گھبراتا ہے ——— طبیعت پریشان ہوتی ہے ——— کشمکش حیات سے ہمتیں پست ہو رہی ہوں تو ایک کام کیجئے ———

خاموش کسی گوشہ میں بیٹھ جائیے ——— ذہن ہر خیال سے خالی ہو ——— !

یہ خاموشی بولنے لگے گی ——— !!

یہ آواز خدائی آواز ہوگی ——— !

آپ اپنے قابو میں ہوں گے ——— !!

آپ تباہی کے راستہ پر سے پلٹ پڑیں گے !!

——— !!!

پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ موت آپ کے بس میں ہے یا آپ موت کے بس میں !

آپ پر آپ کی اپنی عظمتوں کے راز کھل جائیں گے ——— !

آپ اپنے مقام کو پہچانیں گے ——— !!

آپ وہی ہیں جس کو فرشتوں نے سجدہ کیا تھا ——— !!

جس کے حضور سجدہ ریز نہ ہونے والا ازل سے ابد تک مردود قرار دیا گیا !

سوچئے ——— !

اپنی عظمت اور اپنے مقام کو سوچئے ——— !!

جب خدا آپ کے ساتھ ہے ——— تو کیا کسی اور کی بھی حاجت ہے ؟ ؟

آنکھیں کھولئے ——— ؎

ہر ورقے دفترایست معرفت کردگار !!

عزیز قارئین ——— !

آپ کوئی بھی ہوں ——— !!

(باقی صـ۲۲ـ پر ملاحظہ ہو)

خاص سائیکولوجی اردو کے لئے

چند دماغی کیفیات

پروفیسر علی ناصر زیدی

۱۔ جذبات کی یورش نگاہ کو نقصان پہنچاتی ہے :-

جدید تحقیقات کے مطابق یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ جذبات کی یورش عام طور سے نگاہ کو نقصان پہنچاتی ہے۔ یہ نقصان مستقل طور سے بھی ہو سکتا ہے۔ مستقل طور پر نفسیاتی پریشانیوں میں مبتلا رہنا ایک دن یہ روز بد دکھاتا ہے۔ بڑی عمر کے آدمیوں پر ہی موقوف نہیں ہے اس قسم کی تکالیف ان بچوں کو بھی پیش آتی ہیں جن کے والدین اس قسم کی پریشانیوں کا شکار رہتے ہیں۔ گذشتہ جنگ کے دوران میں جو مشاہدات عمل میں لائے گئے وہ ان حقائق پر دلالت کرتے ہیں۔ اس تکلیف کی وجہ یہ ہے کہ جذباتی زیروبم کی وجہ سے جسم کے مختلف حصوں میں خون کے خلیے سکڑ جاتے ہیں۔ جن لوگوں کا نظام اعصاب کمزور ہوتا ہے ان کی آنکھوں کی عصبی رگوں پر اس چیز کا فوری اور برا اثر پڑتا ہے۔ اگر نفسیاتی کیفیت صرف عارضی ہے تو اس کے بانتیجہ جو تکلیف بیان کی گئی ہے، وہ بھی عارضی طور پر لاحق رہتی ہے

اسی قسم کا فوری نقصان ان لوگوں کو بھی پہنچ جاتا ہے جن کا نظام اعصاب ضرورت سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ شدید درجۂ حرارت، زیادتی کے ساتھ سگریٹ نوشی، چھوت چھات، شدید درد، سخت قسم کی جسمانی مشقت اور حد سے تجاوز کی ہوئی تکان، یہ اور اسی قسم کی بہت سی چیزیں یہ تکلیف پیدا کرنے کے لئے بہانہ بن جاتی ہیں۔ معمولی دردِ سر، عارضی چکر، آنکھوں کے سامنے ترمرے جو بعض اوقات چند سیکنڈ سے لے کر کئی کئی منٹ تک قایم رہتے ہیں، اس قسم کی تکالیف عارضی پریشانی کا باعث ہوتی ہیں

اس قسم کی عارضی کیفیات اُن بچوں میں دیکھی جاتی ہیں جن کا مزاج کچھ غیر مستقل رہتا ہے اور جن کو غیض وغضب، یاد وطن، پریشانی یا دیگر عوارض لاحق رہتے ہیں آغاز جوانی میں بھی یہ کیفیات نمودار ہوتی ہیں۔ ریکارڈ شاید ہیں کہ فوجی ڈاکٹروں نے گذشتہ جنگ کے دوران میں بہت سے سپاہیوں کو اس آفت میں مبتلا دیکھا ہے۔ ایسے آدمی جو مستقل طور سے جذباتی کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں، ان کے لئے یہ خطرہ موجود رہتا ہے کہ ایک یا دونوں آنکھوں میں مستقل طور سے دھند پیدا ہو جائے۔ ساتھ ساتھ آنکھ میں یا اس کے پیچھے درد کی شکایت بھی ہو جاتی ہے۔ چیزیں ٹیڑھی میڑھی نظر آنے لگتی ہیں۔ آنکھ کی جھلی میں واقعی ایک چھوٹا سوراخ ہو جاتا ہے جس کو ماہر چشم آسانی سے دیکھ لیتا ہے۔ یہ سوراخ مستقل طور سے موجود رہتا ہے۔

۲۔ رنگ کا انتخاب کیرکٹر پر روشنی ڈالتا ہے :-

پینٹنگ میں رنگوں کے انتخاب سے آرٹسٹ کے کیرکٹر پر وافر روشنی پڑتی ہے۔ انگلیوں پر رنگ چڑھانا بھی کافی اہمیت کا مالک ہے۔ رنگوں کی آمیزش چھوٹے بچوں کو آرٹ کی طرف راغب کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ ایسے مریض جو دماغی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں رنگوں کے ذریعے رو بصحت ہوئے ہیں۔

پیٹرسے۔ نیپولی، ایک ماہر نفسیات نے تقریباً نو سو آدمیوں کی پینٹنگ کا مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ دماغی اعتبار سے تندرست و غیر تندرست آدمیوں کی پینٹنگ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ان ہی ماہر نفسیات کی رائے ہے کہ انگلیوں کو رنگنا دماغی امراض کو دور کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے اس معمولی تفریح کے ذریعے بعض حالات میں جو تشخیص کی گئی ہے وہ بعد میں ان امراض کا علاج کرنے والوں کی رائے کے بالکل مطابق رہی ہے۔

مسٹر نیپولی کے نظریہ کے مطابق مرد نیلے رنگ کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص دیگر رنگوں کے مقابلے میں اس رنگ پر خاص طور سے زور دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مردانہ قوتیں معمولی سے زیادہ موجود ہیں۔ ہرے رنگ کے انتخاب کا بھی یہی مفہوم ہے اگرچہ اس حد تک نہیں جس حد تک نیلے رنگ کے انتخاب کا تعلق ہے۔ اس کے انتخاب سے دماغی قوت، ذہانت، اور آرٹ سے متعلقہ احساس کے زبردست ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ سرخ اور زنانہ رنگ سمجھے

جاتے ہیں - ان کا مرکب یعنی نارنجی رنگ کم مقبول ہے -

نیلگوں رنگ زیادہ تر بچوں کو پسند ہوتا ہے یا ایسے آدمیوں کو مرغوب ہوتا ہے جن کا تجربہ وسیع ہے لیکن سیاہ رنگ ایسا ہے جس کو بچے اور بڑے آدمی برابر پسند کرتے ہیں انگلیوں کو رنگنے کے لئے رنگوں کا انتخاب بھی انسان کی فطرت پر روشنی ڈالتا ہے - نیلا رنگ، وحشت و بربریت کو ظاہر کرتا ہے اور سرخ رنگ سے جنگجو ہونے کا پتہ ملتا ہے - زرد رنگ بلوغت کے نامکمل ہونے پر دلالت کرتا ہے

۳ - قوتِ خیال :-

بعض آدمی جب کسی چیز کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں اس کا ایک خاکہ یا تصویر بھی موجود رہتا ہے - ایک ماہر نفسیات سر سیرل برٹ کے قول کے مطابق اس قسم کے انسانوں میں تین قسمیں خاص طور سے ممتاز ہیں - بچے، عورتیں اور وہ لوگ جن کی تعلیم صفر ہوتی ہے - یہ سب کے سب ہر چیز کی تصویر اپنے تصور میں قائم کر لیتے ہیں قبل اس کے کہ اس کے متعلق کچھ بولیں ان کا تحت الشعور ایک سینما گھر ہوتا ہے جس میں خاموش تصویریں چلتی پھرتی رہتی ہیں

ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہر آواز سننے پر کسی بھولے بسرے واقعہ کو یاد کرتے ہیں اور اس واقعہ سے متعلقہ اشیاء کی تصویر فوراً ان کی دنیائے تصور کو منور کر دیتی ہے - بعض آدمی بھولی ہوئی چیزوں کو آواز سے یاد نہیں کرتے بلکہ چھونے پر ان کو کچھ خیال آتا ہے اور بعض اوقات ان کے لئے ماضی حال بن جاتا ہے مثلاً شیر خوار بچے اشیاء کی ماہیت کو سمجھے بغیر ان کو چھونے کی کوشش کرتے ہیں - چیز ان کے ہاتھ سے چھین لیجئے تو چلا اٹھتے ہیں اور اس وقت تک خاموش نہیں ہوتے جب تک کہ وہ چیز ان کو واپس نہ دیدی جائے - نازک سے چیز وہ پہلے تو توڑ پھوڑ کر ختم کر دیتے ہیں - بعض آدمی الفاظ پر نگاہ پھینکنے میں تو مشتاق ہوتے ہیں کہ جونہی آپ ان سے کوئی مشکل سوال کیجیئے وہ چھت یا دیوار کی طرف دیکھنے لگتے ہیں گویا وہ الفاظ اور ان کا مفہوم چھت پر لکھا ہوا ہے بعض آدمیوں کے دماغ میں گھنٹیاں سی بجنے لگتی ہیں مثلاً اگر ان کو کسی دوست کا خط ملے تو خط پڑھتے ہوئے ان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ان کا دوست خود ہی بلند آواز سے وہ سب کچھ کہہ رہا ہے جو خط میں لکھا ہوا ہے - مثلاً اس نظریہ کے مالک مسٹر برٹ خود اس عادت کے بھی مالک ہیں کہ جب کبھی وہ کوئی ایسی کتاب دیکھتے ہیں جو ان کے آکسفورڈ کے قدیم معلم نے لکھی ہے تو ان کو ہر ایک صفحہ پڑھنے میں دس منٹ لگ جاتے ہیں - پروفیسر موصوف کی زبان لکنت کرتی تھی - جیسے ہی مسٹر برٹ تاریخ زبان کے لفظ "پی" یا "ڈی" پر پہنچتے ہیں تو ان کو فوراً اپنے استاد کا خیال آجاتا ہے، ان کی آواز کانوں میں گونج جاتی ہے کیونکہ ان حروف پر آکر اٹک جاتے ہیں

آدمیوں کی ایک تیسری جماعت ایسی ہے جو الفاظ کا مفہوم ان حرکات کے حوالہ کے ساتھ سمجھتے ہیں جو وہ ان کو بولتے ہوئے بے اختیارانہ طور پر انجام دیتے ہیں انسانوں کی یہ جماعت سب سے زیادہ عام ہے - ان میں سے بعض آدمی تو ایسی عجیب و غریب حرکتیں کرتے ہیں کہ ان کے لبوں کی جنبش کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے اور بعض آدمی ایسے ہیں جو ان جنبشوں کو صرف اپنے تصور ہی میں محسوس کرتے ہیں -

۴ - بچوں کو سزا دینا :-

کچھ عرصہ ہوا چوہوں پر چند نفسیاتی تجربات کئے گئے ہیں - معلوم ہوا ہے کہ اگر کسی چوہے کو اس خطا پر سزا دی جائے کہ وہ بھاگ پڑتا ہے تو وہ اور زیادہ دوڑتا ہے - تجرباتی طور پر چوہوں کو ایک حلقہ کے چاروں طرف دوڑایا گیا - اندر سے حلقے پر روشنی کا انتظام تھا لیکن تھوڑا سا حصہ تاریک چھوڑ دیا گیا - جب چوہے حلقہ کے چاروں طرف دوڑنا سیکھ گئے تو ان میں سے چند ایک کو معمولی برقی جھٹکا دیا گیا جب کہ وہ حلقہ کے تاریک حصہ سے گذرتے تھے - باقی چوہوں کو یہ سزا نہیں دی گئی - یہ چیز مشاہدہ میں آئی کہ جن چوہوں کو جھٹکا لگا وہ اور بھی زیادہ تیز دوڑے - تاریکی میں ان کی رفتار غیر معمولی رہی

والدین کو چاہیئے کہ اس قسم کی مثالوں کا اطلاق اپنے بچوں پر کریں جتنی زیادہ ان کو سزا دیجئے وہ اور زیادہ شریر ہو جاتے ہیں

۵ - پاگل کیا دیکھتے ہیں :-

حال ہی میں ایک دوا ایجاد ہوئی ہے جس کا نام میکالین ہے - یہ دوا دماغی امراض میں مبتلا آدمیوں کے لئے مفید بتائی جاتی ہے پاگلوں کی دنیا بھی عجیب ہوتی ہے - خاص طور سے ایسے پاگل جو ہر وقت خاموش رہتے ہیں اور غور و فکر میں مبتلا رہتے ہیں - یہ لوگ ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جس تک پہنچنا کسی کے لئے ممکن نہیں ہے - ایسا آدمی اپنے سامنے ایسی چیزیں دیکھتا ہے جو دراصل وہاں موجود نہیں ہوتیں - اس جنون کی ماہیت کا صحیح اندازہ ابھی تک نہیں لگایا جا سکا ہے ایسے آدمیوں پر کافی تجربات کئے جا چکے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ آخر ان لوگوں کی آنکھوں میں کون سا نقص

پیدا ہوجاتا ہے جو غیر موجود چیزوں کو دائرہ نگاہ میں لے آتا ہے مذکورہ بالا دوا میکالین ایسے ہی مواقع پر مفید سمجھی گئی ہے۔ اس کو استعمال کرانے والوں کا خیال ہے کہ یہ دوا براہ راست آنکھوں پر اثر کرتی ہے اور ان کی اس قوت کو کم کر دیتی ہے جو رنگوں کو دیکھنے ان کے درمیان امتیاز کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اس کا اثر دماغ پر بھی ہوتا ہے اور وہ عکس جو دماغ پر خواہ مخواہ پڑتے رہتے ہیں، ان کو کم کر دیتی ہے۔

۲۔ دماغی امراض کے لئے برقی علاج:۔

بعض ایسے مرد اور عورتیں جو قنوطیت پسند ہوتے ہیں اور غور و فکر کے عادی ہوتے ہیں، چند دماغی مشکلات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی آدمیوں کے لئے ایک برقی طریق علاج حال ہی میں ایجاد ہوا ہے ان کے دماغ کو ایک برقی جھٹکا دیا جاتا ہے اور اکثر تجربات میں یہ دیکھا گیا ہے کہ ان کے نقائص دور ہو جاتے ہیں

اس قسم کے تجربات اور یہ طریق علاج ایک عرصہ سے عام ہیں لیکن حال ہی میں اس سلسلہ میں جو نئی ترقی ہوئی ہے وہ قابل ذکر ہے۔ اے۔ سی۔ بجلی کی دو قسموں میں سے ایک ہے۔ یہ بجلی لہروں کی شکل میں زیر و بم پیدا کرتی ہوئی اپنا کام کرتی ہے۔ اس جدید طریق علاج کی کامیابی کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اے۔ سی کو اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ اس کا ہر زیر و بم یا ہر جھٹکا نہایت خفیف مدت تک قایم رہے۔ تقریباً ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصہ کا بھی نصف وقفہ۔ اب تک علاج الامراض میں بجلی سے جو مدد لی گئی ہے۔ یہ طریقہ اس میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ چونکہ بجلی بہت ہی کم وقفہ تک اپنا کام کرتی ہے اس لئے مریض پر اس علاج کا سلسلہ کافی وقت تک جاری رکھا جاسکتا ہے اور ایسا کرنے سے مریض کے دماغ کے خلیوں کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ جن میں سے یہ برقی لہریں گذاری جاتی ہیں۔ اس علاج کا اتنا اچھا اثر ہوتا ہے کہ اس کے فوراً بعد ہی مریض اٹھ بیٹھتے ہیں اور بغیر کسی دماغی کشمکش کے آرام کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں۔ چھیالیس مریضوں پر یہ علاج آزمایا گیا۔ ان میں سے پچیس صحت یاب ہو گئے اور چار مریضوں کی حالت بہتر ہو گئی

ڈاکٹر لبرسن کی رپورٹ کے مطابق اس طریق علاج میں خاص سہولت یہ ہے کہ اس سے مریض کی یادداشت میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے دماغ کو کوئی دوسرا نقصان پہنچتا ہے۔ نتائج کو زیادہ خوشگوار بنانے کے لئے علاج سے قبل بعض ادویات کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔

یہ نیا علاج بوڑھے آدمیوں کے لئے خاص طور سے مفید ہے جن کے لئے ایک طریق علاج اکثر اوقات ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر گولڈمین نے اس طریقہ کو ۱۲۵ مریضوں پر آزمایا اور نہایت عمدہ نتائج حاصل ہوئے۔

ان برقی جھٹکوں کو ایک دوسرے پیمانہ پر استعمال کرنے سے قطعی مختلف نتائج ظہور میں آئے۔ انگریزی میں اس کو الیکٹرک سلیپ Electric Sleep یا برقی خواب کہتے ہیں

برقی خواب کے زیر تحت مریض کو تھوڑی دیر کے لئے بالکل بے خبر یا بے ہوش رکھا جاتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے بھی برقی رو سے مدد لی جاتی ہے۔ شدید درد سر، دمہ، خفیہ درد، بھوک کی کمی، بے خوابی وغیرہ برقی رو سے دور ہو جاتے ہیں۔ لاس انجیلز کی ایک ڈاکٹر نے دماغی امراض کے لئے اس طریق علاج کی مدد لی۔ جو لوگ شدید امراض میں مبتلا تھے ۳۲ میں سے اٹھارہ مکمل طور سے صحت یاب ہو گئے، نو کی حالت اتنی بہتر ہو گئی کہ وہ اپنے گھروں پر آرام کے ساتھ زندگی بسر کریں، دو نے بھی کچھ ترقی کی لیکن دو پر کچھ اثر نہ ہو سکا

سان فرانسسکو کے ڈاکٹر بوتمین اور الیگزینڈر سائمن نے جب "برقی خواب" کے تجربات کئے تو قطعی مختلف نتائج سے دوچار ہوئے۔ انہوں نے ۵۳ مریضوں کا علاج کیا۔ ان میں سے صرف چھ مریض صحت یاب ہو سکے ان کے علاوہ کسی کی بھی حالت میں کوئی نمایاں فرق نہ دیکھا گیا

آپ خط کسے لکھ رہے ہیں:۔

سائیکولوجی کے منیجر کو یا مدیر کو پتہ پر وضاحت کیجئے اور براہ کرم مدیر سے متعلق امور منیجر کو یا منیجر سے متعلق معاملات مدیر کو نہ لکھئے ایک ہی خط میں دونوں کو مخاطب نہ فرمائیے

مدیر بات چیت سے متعلق مسائل مدیر بات چیت ہی کو لکھئے ——— !!۔ (جنرل منیجر)

وہ کہتی ہے ـــــ "جی! میں مردوں سے کم نہیں!"

ڈاکٹر ڈینیل اے سیمنز ـــــ کے ـــــ مریضوں کی ڈائری سے

جتنی دیر وہ باتیں کرتی رہی میں اس کی حرکات پہ نظر رکھتا گیا۔ "یا اللہ یہ عورت ہے یا سیماب ـــــ" یہ ایک سوال تھا جو میرے دماغ میں اس پہ پہلی نظر پڑتے ہی پیدا ہوا تھا۔ صورت شکل بڑی خاصی تھی اور انداز اتنے دلکش تھے کہ میرے سارے مریض اس کی "موجودگی" تک اسی کی شخصیت کے احساس میں گم رہے۔ لیکن بات چیت میں انداز ایسے تھے جیسے وہ مردوں جیسی ہو ـــــ بیباک، نڈر، ماحول سے بے پرواہ، نسائیت کا نام نہیں!

پہلے پہل تو وہ بہت ہی کھنچی کھنچی سی رہی لیکن بعد میں جب اس نے اس نے اپنے بچپن کی داستان دہرانی شروع کی اس وقت اصل معاملہ کھلنے لگا اور حسب معمول اس کی المناک داستان پر میرا دل بھر آیا ـــــ در اصل نفسیاتی ڈاکٹر کا پیشہ کچھ اس قدر عجیب و غریب ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ ـــــ اس کا دل ہر لمحہ کا ایک تجزیہ ہوتا ہے، اور جب اسے اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ محض ماحول اور سماج کے بدترین ہونے نے انسانیت کا سارا بیڑہ غرق کیا ہے تو اس کا دل اور بھی دکھ جاتا ہے!

اس نے اپنے ماں باپ کی جو تصویر میرے سامنے کھینچی اس سے پتہ چلا کہ گھر کے دل آزار اور دل شکن ماحول نے اسے کس طرح تباہ کیا ہے ـــــ اور کس طرح اس سے ساری نسوانی رعنائیاں چھین لی گئی ہیں

اس کی ماں بلا کی لڑاکا زبان دراز اور منہ پھٹ عورت تھی اور ـــــ ستم ظریفی قسمت کی یہ تھی کہ اسی رہبر کے نقش قدم پر سے چلنا تھا اسی نمونے کو پیش نظر رکھنا تھا۔ طرفہ ماجرا یہ تھا کہ گھر میں دن رات چخ چخ رہتی۔ اس کی ماں اس کے باپ سے قدم قدم پر الجھتی رہتی اور چھوٹے چھوٹے اعتراضات بات کا بتنگڑ بنا تے۔ گھر جہنم کا نمونہ بنکر رہ جاتا جس میں سکھ شانتی اور امن کا نام و نشان نہ ہوتا۔ ماں غصہ میں بپھرتی تو اس نے باپ اور اس کے تمام خاندان کو جی بھر کر سناتی اور اس تقریر کا اختتامیہ اکثر اس جملہ پر ہوتا۔

"تو تو بالکل اپنے باپ پر گئی ہے ـــــ اور تم دونوں دنیا میں کسی کام کے نہیں!"

اور جس طرح دانت پیس کر اس کی ماں جھنجھلاتی اور جس قدر نفرت کا اظہار کرتی اسی قدر وہ اپنی ماں سے نفرت کرنے لگتی ـــــ یہاں تک نوبت پہنچی کہ وہ اس کی صورت دیکھتی تو اس کا خون کھولنے لگتا ـــــ اور جس قدر وہ ماں سے دور ہوتی گئی اسی قدر باپ سے قریب ہوگئی ـــــ باپ قدرتاً اس کی طرف جھکتا گیا اور چونکہ وہ فطرتاً نیک تھی اور بیوی اس کے لئے سوہان روح ہوکر رہ گئی تھی اس نے اپنے روحانی سکون کی دنیا بیٹی کی محبت میں تلاش کر لی ـــــ اور باپ بیٹی میں ایک سمجھوتہ ہوگیا! دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے

ایسے حالات میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس نے لڑکی بننے کی بجائے لڑکا بننا شروع کیا۔ اور بعد کو یہ لڑکا مرد میں تبدیل ہوگیا ـــــ یہی بات ہے کہ آج وہ اپنے رکھ رکھاؤ اور انداز سے بالکل مرد معلوم ہوتی ہے۔ اس بری طرح کہ جیسے پکار پکار کر کہہ رہی ہے "جی! میں عورت ہوں مگر مردوں سے کم نہیں!"

چنانچہ جو خامیاں اسے ماں کے کردار میں نظر آئیں اور جس کو اس کا ضمیر قبول نہ کرسکا وہ ان کے بدل اس نے بالکلیہ اپنے باپ کے کردار سے چن لئے اور باپ مرد تھا لہذا مردانیت سی اس میں سمو کر رہ گئی۔ اور یہ خواہش پختہ ہوئی کہ اس نے ہر ہر قدم پر عورت اور عورتیت سے انکار اور مرد اور مردانیت سے پیار کیا اور رفتہ رفتہ خود ایک مرد نما عورت ہوکر رہ گئی!!

اور پھر رفتہ رفتہ جنس مردانہ پر اس کی یہ وارفتگی اور اپنی جنس سے نفرت نے اسے مردوں کی آزادی کے ساتھ ساتھ مردوں جیسے کام کرنے کی دھن اس میں سمو دی ـــــ لیکن عورت خواہ کتنی ہی مرد کیوں نہ بنے آخر عورت ہے ـــــ اور دنیا کی کوئی سوسائٹی کتنی ہی روشن خیال کیوں نہ ہو "شادی" اس

کے لئے ایک امر ضروری اور لابدی بن کر رہ جاتی ہے ! اور — — میری مریضہ باوجود اپنی ساری "مردانیت" اور "مردانہ پن" کے آخر عورت تھی ——— اور اسے شادی کرنی پڑی !

جب اس آزاد اور نڈر اور بے باک عورت کو شادی کا خیال آیا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔ کیونکہ مرد تو اولتا ہی جھکے مردی رہتا ہے اور شوہریت کا جذبہ اس سے کسی لمحہ بھی جدا نہیں ہوتا ۔ شوہر اپنی ساری فراخ دلیوں کے باوجود یہ چاہتا ہی ہے کہ بیوی بیوی رہے شوہر نہ بن جائے ——— ! لہٰذا شادی اس کے لئے ایک مسئلہ بن کر رہ گئی ۔ وہ شادی اسے اس طرح قربانی لگی جیسے مرد قربانی کرتے ہیں ۔ ازدواج اور اس کی ذمہ داریاں اس کے لئے ہوا بن گئے ہیں ——— لہٰذا اس نے ایسے مرد سے شادی کی جو تقریباً اس کی ضد اور "عورت نما" تھا — وہ شوہر تو تھا اور شوہریت کا بندہ بھی اس کے دل میں تھا کہ جب شوہریت دکھانے کا وقت آیا تو نہ معلوم کیوں وہ ایک دم سے پسپا سا ہو کر رہ جاتا !

اس کے بعد وہ آئی تو اس نے بتایا کہ اس شادی کے بعد اس میں اور اس کے ضمیر کے درمیان کیسی زبردست جنگ ہوتی اور اب بھی ہوتی رہتی ہے ۔ بدقسمتی سے اس ساری مردانہ بیپتی کے باوجود اس کے ضمیر میں یہ کانٹا بھی تھا کہ عورت اور ازدواجی زندگی ... — اس کی نزاکتیں اور ناز برداریاں کتنی عجیب ہوتی ہیں ! جب تک اس کی نظر جاتی وہ بغور دیکھا کرتی کہ جو کچھ اس کی زندگی ہے وہ اصل میں عورت کی زندگی نہیں ——— عورت کو دنیا میں مضبوط نفس اور مددگار قسم کا ہونا چاہیئے — اور پھر اندھیری راتوں میں بستر پر لیٹ کر اس کی راتیں کھڑکی سے باہر ا... گنتے بس گذرتیں — .. شادروں کی مہک اس کے احساسات پر اپنا ... کی دکانی رتی ——— مان ممتا ، مادریت ——— !!

یہ اس کے خوابوں کی تعبیر یا ان تصور کی سہانی تصویریں نہیں ——— "بچہ" عورت کی نسائیت کا عظیم ترجوہر ہوتا ہے اور وہ سوچ رہی تھی کہ یہی "جوہر" مجھ سے غائب ہو گیا ہے !

اور یقین مانئے جب زندگی سدھرنے والی ہوتی ہے تو ذرا سا بہانہ اسے سدھارنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے ——— اور جہاں یہ احساس خواہ مرد میں ہو کہ عورت میں ——— پیدا ہو جائے کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے ؟ زندگی کے لیے سفر میں کس کا کیا مقام ہونا چاہیئے ——— اگر یہ متعین ہو گیا تو زندگی زندگی ہو جائے گی ——— اسی لمحہ سے سر میں اور صحیح دماغی سکون افق زندگی پر طلوع ہوتے ہیں !

لیکن یہی زندگی کی سب سے کڑی منزل ہوتی ہے ——— اس کی راہ اتنی دشوار اور پرخطر ہوتی ہے کہ اکثر ہمت اور صبر و استقلال جواب دیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں لیکن جس نے اس کو طے کر لیا نہ جانے دیا وہی مرد میدان !

چنانچہ میری مریضہ میں یہ جذبہ تھا شاید اس کی مردانہ ہمت کام آگئی ——— اور اس نے بہت ہی بلند ہمتی کا ثبوت دیا ——— اتنی بڑی ہمت کہ شاید مرد بھی ہار جائے ——— اور یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہمت عورت کی جاگیر اور استقلال اس کی میراث ہوتی ہے ۔

اگرچہ اس عورت کے مسائل جلد حل نہ ہو سکے ۔ وجہ ظاہر تھی ——— برسوں کی پرانی عادتیں ایک دن میں تو نہیں چھوٹا کرتیں ——— اس انفرادیت اور شخصیت میں جو خامیاں تھیں اور جن کی وجہ سے وہ واقعی عورت نہیں بن پا رہی تھی ——— وہ رفتہ رفتہ اس میں سے دور ہوئے ——— اس کے لئے خود اس کو بہت کچھ تبدیلی کرنا پڑا ——— اور یہاں تک کہ ان "عورت نما" میاں کو خدا حافظ کہنا پڑا ——— اور کچھ ہی دنوں میں اس کی خوش قسمتی سے ایک اور آدمی اسے مل گیا جو بہت ہی مضبوط کیرکٹر کا ہمدرد اور خوش اخلاق کا مجسمہ تھا ۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس عورت کی کمزوری کیا اور کہاں ہے ؟ ——— اور پھر اس کی زندگی میں نسائیت کے اتنے جوہر اس نے بھر دئیے کہ وہ واقعتاً ایک خوبصورت عورت بن گئی ——— صورت میں نہیں کردار میں !

گذارش :-

آپ بھی سوچئے

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ "نہ" سمجھے خدا کرے کوئی

"بچہ املا میں ایک لفظ غلط لکھتا ہے"! —————— آپ کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ جاتی ہیں !!

"بیرا پانی لا رہا ہے گلاس ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے! —————— آپ کی آنکھیں شعلہ و التہاب کی ترجمان بن جاتی ہیں !!

"سالن میں نمک تیز ہو گیا ——— ! ——— آپ نے قاب فرش پر پٹک دی !!

یہ کیا ——— ؟

کسی لفظ کا غلط لکھنا ——— کسی گلاس کا ٹوٹ جانا ——— نمک کا زیادہ ہو جانا ——— بذاتہ کوئی اتنا بڑا نقصان تو نہیں جس پر یوں برہمی کی ضرورت ہو!

پھر یہ عتاب کیا معنی ؟؟

ہر چند کہ کوئی نقصان خواہ وہ کتنا ہی کمتر کیوں نہ ہو معاشی نظریوں پر بہر حال ایک نقصان ہے!

لیکن کتنے ہی اس سے بہت زیادہ بڑے نقصان آپ نے ہنستے ہنساتے برداشت کر لئے ہیں ——— شاید آپ کو یاد نہیں ——— ؟

آپ نے اپنا مزاحیہ مضمون لکھتے ہوئے "عام خاص" کو "آم گھاس" لکھا تھا اور تبسم فرمانے لگے تھے:

آپ کی سالی نے کھوری میں پسے ہوئے نمک کی ایک پوری چٹکی چھڑک دی تھی اور آپ مسکراتے ہوئے کھا گئے!

کچھ زیادہ دن تو نہیں ہوئے ——— آپ کے دوست نے لمپ کی چمنی کو ناقابل شکست کہا تھا آپ نے چمنی فرش پر پٹک دی چمنی کھیل کھیل ہو گئی اور آپ ہنسنے لگے !!!

ان واقعات کو ایک دوسرے سے ملائیے اور سوچئے آپ کو غصہ کیوں آیا ——— ؟

اچھا یوں نہ سہی دوسرے انداز میں اس مسئلہ کو سامنے لائیے :-

اگر بچہ لفظ کے "ہجے" سے ناواقف ہوتا ؟

گلاس کسی ایسے بچے کے ہاتھوں سے گرتا جو سنگی فرش اور گلاس کے ٹکراؤ کے نتائج [illegible] ؟؟

یا [illegible] کوئی تنہا ہوتا جو آپ کے ذائقہ کام و دہن کے اندازے سے واقف ہوتا ؟؟؟

تو [illegible] برہم ہو جاتے یا صرف مسکرا کر گذر جاتے ؟؟؟

بات [illegible] ——— لیکن سوچئے تو بہت بڑے نتائج کی حامل ہے۔

اور یہیں ٹھہر کیوں جائیے ـــــــــ کہ فکر کے بال و پر
کمزور نہیں ـــــــ تخیل کی پرواز کوتاہ نہیں ـــــــ وسعتیں
تنگ نہیں ـــــــ ! ممکنات پر نظر دوڑائیے ـــــ امکانات
کو سامنے لائیے !

اگر بچہ ہی غلط لکھتا ـــــــ اور قصداً
میرا گلاس گرا دیتا ـــــــ اور ارادتاً !
نمک تیز کیا جاتا ـــــــ اور دانستہ !!!

پھر اس قصد ارادے اور دانستگی میں جذبہ ہوتا ضد یا انتقام
کا ـــــــ !

تو ـــــــ ؟

ـــــــ !!!

اب نسل انسانی کے مسلسل تجربات سے حاصل کئے
ہوئے صرف تین لفظ سامنے لائیے۔

لاعلمی ـــــــ غلطی ـــــــ
ـــــــ گناہ

پھر بات یہیں رک نہیں جاتی

ـــــ

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

پہلو اور بھی ہیں ـــــ ـــــ فکر و خیال پر کسی کی
اجارہ داری نہیں !!
ظرف و دماغ کی بات ہے !!
عرفان و بصیرت عام ہیں ـــــــ اگر آپ
چاہیں

بات چیت

فرد۔ فرد کی بات چیت سے شعوری طور پر متاثر ہوتا ہے ۔۔۔ کچھ کہیے کچھ سنیے ۔۔۔ کہنے سننے سے جی کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے ہم ذہنی طور پر ایک دوسرے کے لئے مفید ہوں گے ۔۔۔ بات چیت کا یہی مقصد ہے اور بس ۔۔۔! دیکھئے کیا ہم آپ کیلئے مفید ہیں ۔۔۔ یہ آپکی خاطر ہمیں منظور ہوگا!

محمد یسین خان غوری ۔ اسٹیٹ آفس کراچی

محبت کرنے کے بعد انسان پچھتاتا کیوں ہے؟

کیا یہ آپ کا کوئی تجربہ ہے یا مشاہدہ ۔۔۔؟

ہر چند کہ محبت کبھی نہ کسی شکل میں جنسیت ہی کا مظاہرہ سہی، لیکن انسانی تہذیب و تمدن آدمی کے فکر و خیال اور بلند انسانیت کے ۔۔۔ بلند تقاضوں نے محبت کو اتنی بلندی اور وسعت دے دی ہے کہ وہ لامحدود ہوگئی ہے محبت کرکے پچھتانا محبت کی توہین ہے ۔۔۔ پچھتاوا ہوس کار کو ہوتا ہے ۔۔۔ ہوس ساون کی کسی تاریک رات کے ایک طوفان کے مانند ہے کہ حد نظر تک پانی ہی پانی ۔۔۔ صبح ہوئی تو کچھ بھی نہیں ۔۔۔!! ابتدا میں "ہوس" اور "محبت" میں امتیاز کرنا شائد انسان کے بس کا کام نہیں !!!

ہوس تمام تر ذاتی مفاد ہے اور محبت صرف خلوص و قربانی ۔۔۔ یوں سمجھئے کہ محبت کم از کم "شاہجہاں" و "تاج محل" ہے اور ہوس زیادہ سے زیادہ اک "مرد فریب کار" و "زن قحبہ" !!

من کی دنیا من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق۔
تن کی دنیا تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

تسنیم فخر دین، خراسی محلہ اندرون اکبری دروازہ لاہور

"۱۔ یقین محکم کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟

۲۔ کیا عزم صمیم پیدا کیا جا سکتا ہے اور کیسے؟

۳۔ ایک شادی شدہ نوجوان گھر کے خوشگوار تعلقات اور مالی حالت اچھی نہ ہونے کے باوجود کیوں اداس رہتا ہے؟

یقین محکم اور عزم صمیم کے لئے مشق کیجئے ۔ اسی شمارے میں توجہ کا ملاحظہ فرمائیے ۔

آپ کے سوالات دلچسپ ہیں اگر ہم قدیم و جدید "فلسفہ یقین" کو سامنے لائیں تو ایک لمبی بحث کھڑی ہو جائے گی ۔

قدما نے یقین کے تین مدارج رکھے ہیں ۔۔۔ علم، عین اور حق لیکن چھوڑیئے اس لمبی بحث کو آپ یوں سمجھئے کہ "یقین کامل" کے تین ستون ہیں خبر، مشاہدہ، اور عقل کا اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں کسی نتیجہ پر پہنچ کر مطمئن ہو جانا ۔۔۔ جب فرد کی عقل کسی مشاہدے اپنے سوچ بچار کے بعد کسی قطعی نتیجہ پر پہنچ جاتی ہے تو فرد کو اس مشاہدہ پر یقین کامل ہو جاتا ہے

ہم کوئی خبر اخبار میں پڑھتے یا کسی سے سنتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کوئی واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں ۔۔۔ لیکن پھر کسی خبر یا مشاہدے کے بعد اپنی عقل کی پوری توانائیوں کے ساتھ تجربات کی روشنی میں اس پر غور کرتے ہیں اور کسی ایک نتیجہ پر پہنچ کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور "یہی یقین محکم" ہے کسی خبر کو صرف سن کر یا دیکھ کر نہ گذر جایئے بلکہ اس کو اپنی عقل کی کسوٹی پر لائیے اور اپنے تجربات کی روشنی ڈالئے ۔۔۔ یہ ہوگی یقین کی مشق ۔۔۔!

خوف یقین کا سب سے بڑا دشمن ہے اپنے دل سے خوف کو نکال ڈالئے ـــــ ـــ ـــــ اگر آپ میں کچھ "کمزوریاں" ہیں تو ان کو توانائیوں میں تبدیل کرنے کی کوشش کیجئے ـــــــ یہاں آپ کو ایک مستقل و پختہ ارادے کی ضرورت ہوگی ۔ ـــــ آپ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنائیے ـــ ـــــ ـــ ۔ یہی عزم صمیم ہے اور یہی اس کی مشق ـــــــ ـــ کوئی ارادہ کرنے کے بعد اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائیے ـــ یقین محکم اور عزم صمیم دونوں ایک دوسرے کے معاون ثابت ہوں گے ـــــــ یاد رکھئے فرد کی کوئی ناکامی اس کی زندگی کا کوئی نقصان نہیں بلکہ زندگی کا ایک تجربہ ہے ـــ ـــ ـــ تجربات علم میں اضافہ کرتے ہیں علم خود ایک یقین ہے، علم زندگی کی سب سے بڑی طاقت ہے اور علم ان ناکامیوں سے حاصل ہوتا ہے جن سے ہم دوچار ہوتے ہیں ـــــ ـــ ـــ تاریک راتیں کچھ نہیں مگر صبح روشن تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ۔ ـــ ـــ تاریکیوں سے نہ گھبرائیے کہ ان کے پیچھے نور ہی نور ہے ـــ ـــــ !

آپ کا تیسرا سوال "اپنے پیچھے نہ جانے کیا" اور "کیا کچھ" رکھتا ہے ؟

اداسی پست ہمتی، ناامیدی اور قنوطیت کا نتیجہ ہوتی ہے ـــــ آدمی کچھ ایسی "مشکلات" میں خود کو پھنسا ہوا محسوس کرتا ہے کہ جن سے گذر جانا (اس کی سمجھ میں) ناممکن ہوتا ـــــ اس کی "مشکلات" کبھی محسوس ہوتی ہیں ـــــ ـــ اور کبھی نامحسوس ـــــ اور نامحسوس "مشکلات" و "مصائب" ہرچند کہ اس کے علم میں نہیں ہوتیں لیکن اس کے ذہن لاشعور میں ہلچل سی مچائے رہتی ہیں ـــــ ـــ ـــ ۔ آپ تفصیلات لکھئے ـــــ ممکن ہے یہ اداسی کسی بچپن کا راز ہو یا کوئی نامحسوس خوف ؟ ـــ ـــ کون جانے ؟ ؟

منصور احمد ریڈیو الیکٹرک ہاؤس، فورٹ منشن

۱ ۔ کیا شیو کرنے سے کوئی فائدہ ہے ۔ یا نقصان ہوتا ہے ؟

۲ ۔ کنگھی کرنے سے کہتے ہیں بجلی پیدا ہوتی ہے اور اس طرح مفید ہے

۳ ۔ ورزش کرنے کیلئے کونسا وقت مفید ہوتا ہے ؟ ۔

آپ نے حجام کے لڑکے اور وزیر کے فرزند کی جو داستان تحریر فرمائی ہے وہ تمام تر غلط ہے البتہ آپ کے سوالات ـــــ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے میں کچھ نہیں کہتا ہاں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ شیو کرنا مفید ہے ۔ اس لئے کہ ڈاڑھی کی پرورش میں جو توانائی صرف ہوتی ہے وہ محفوظ ہو جاتی ہے ـــــ مگر حکیم صاحب نے مضر بتایا ـــــ ان کے پاس بھی کافی دلیلیں ہیں ـــــ مجھے اس مختلف فیہ مسئلہ سے معاف فرمائیے ۔

بالوں میں کنگھی کرنا مفید ہے ـــــ ایک قسم کی برقی کرن بھی پیدا ہوتی ہے ـــ !

ورزش کے لئے صبح کا وقت بہت مفید ہوتا ہے ـــــ ایسے وقت ورزش نہ کرنا چاہیئے جب کہ پیٹ کافی بھرا ہوا ہو یا بالکل خالی ہو ـــ ! ورزش ہمیشہ کرتے رہنا چاہیئے ـــ عموماً صبح اور شام کا وقت ورزش کے لئے بہترین وقت ہے ـــ !

کچھ اور ـــ ؟

رفیق احمد انصاری ـ ایس ایم ـ کالج

بھائی ! آپ کسی دن دفتر تشریف لائیے ـ بوجھ وہ سر پر گرا ہے کہ اٹھائے نہ بنے

طاہر چک ۱۱/۱۲ ڈاکخانہ ۱۲/۲۲ ضلع منٹگمری

آپ اپنا جواب آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے

جواب طلب امور کیلئے

جوابی کارڈ یا ٹکٹ

شدہ لفافہ

ضرور روانہ

فرمائیے

خود اعتمادی سیکھئے

هنری نائٹ ملر ایم۔ اے۔ ڈی ایس سی

کامیابی کے حصول کا سب سے اہم حصہ قوت تخیل پر مبنی ہوتا ہے۔ اسی لئے اپنی قوت متخیلہ کو مستقل عادت کی شکل میں منتقل کر دیجئے۔ اس کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیجے ——— اور پھر اطمینان سے ذہنی تصویریں کھینچنا شروع کیجئے اور پھر ہر چیز کو اسی روشنی میں دیکھیں گے۔ قوت متخیلہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان اور حیوان میں تمیز سکھاتا ہے، اور یہ سست، کاہل، منجمد طرز زندگی سے ایک روشن، خلاق اور بلند حوصلہ لائحۂ حیات تک رسائی نصیب کرتی ہے یہ قوت وصل ہمدردی اور خدمت کی جان ہے اور یہ ایسے کہ کچھ دیر کے لئے کسی دکھی آدمی کو دیکھ کر یہ تصور کر لیجے کہ ہم ان ہی حالوں میں ہیں ——— اور آپ کو صحیح صورت حال کا پتہ چل جائے گا ——— جو جذبہ ؎

دیکھا کرو بھگوان غریبوں کا تماشہ

یا ؎

خاموش نگاہیں یہ سناتی ہیں کہانی !

منہ سے نکلوا تا ہے، اس کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب جسم پر چیتھڑے ہوں اور پیٹ کو تین وقت سے روٹی نہ ملی ہو !

قوت تخیل کی سب سے پہلی شکل تیز قوت مشاہدہ ہے۔ ادراک وہ خام مصالحہ ہے جس سے ہم اپنی قوت تخیل کی تعمیر کرتے ہیں' ہماری دنیا ——— یہ دنیا نہیں جس میں ہم آپ رہ رہے ہیں ——— وہ دنیا جو صرف ہماری اپنی ہوتی ہے وہ ہمیشہ اتنی بڑی ہوگی جتنی ہماری قوت مشاہدہ ——— لہذا سب سے پہلے آپ ایک زبردست شاہد بن جائیے! اور پھر غور کرتے رہیئے کہ عام لوگوں میں اور آپ میں کیا فرق نظر آتا ہے رنگ آواز اور ساخت کے ادراک کو اکٹھا کرتے رہیئے اور دنیا کی دولت اور حسن اپنی یادداشت کے خزانہ میں جمع کرتے جائیے پھر قوت تخیل کے لئے رنگا رنگ خیالوں کی دنیا آپ کے حضور ہوگی۔ تخلیق آپ کے ظرف کی بات ہوگی۔

یہ قوت تخیل ہی کا ثبوت ہے کہ آج ہماری یہ تمدنی ترقیاں، جنہوں نے اتنے بڑے شہر بسائے ——— لاثانی ادبی شہکار لکھوائے ——— یہ سریلی موسیقی مرتب کروائی ——— جس نے دور حاضر کی عظیم صنعت کو جنم دیا، اور زندگی کے خارزاروں کو اتنی بہاریں بخشیں کہ گلاب کی طرح کھل گئے !

یہی قوت تخیل ہے جو جان ذہانت ہے، بنیاد ترقی ہے، خالق کردار ہے، رحم و ہمدردی کی روح ہے اور اس لامحدود فطرت کی سب سے بڑی شاہد، خلوص اس کی بنیاد ہے۔ اس بنیادی جزو کے سوا سب کچھ بیکار ہو کے رہ جاتا ہے ——— ادیب ایمرسن Emerson نے کہا تھا "وہ جس کے متعلق آپ اس قدر زور سے گفتگو کر سکتے ہیں میں اتنے زور سے سُن نہیں سکتا؟" ایک مشہور ادیب کہتا ہے "وہ اپنے چہرے کی چھب سے مشہور ہوئے ہیں!" ——— بننے والے آدمی کی اصلی شخصیت اس کی آواز سے گونجتی ہے، آنکھوں سے جھانکتی ہے، صورت شکل، انداز و ادا سے ٹپکی پڑتی ہے۔ جہاں خلوص ملے اسے سینہ سے لگا لیجئے یہ ضروری نہیں کہ جو دوسروں سے سنیں اس پر عمل کریں۔ لیکن جہاں خوبی نظر آئے اس سے پرہیز نہ کیجے ——— اس کو بھی سمیٹ لیجے ——— لیکن سب سے بہتر تو یہ ہے کہ آپ خود چند اصول اپنی زندگی کے بنا لیجے اور ان پر پابندی اور مستقل مزاجی سے عمل کیجے !

اور یہیں سے وہ اصول مرتب ہوتے ہیں جہاں "بلند کرداریت" طلوع ہوتی ہے اپنے آپ کو جس قدر عظیم اور اونچا آپ دیکھ سکتے ہیں دیکھنے کی کوشش کیجے اپنے آپ کو ایک نمونہ تصور کیجے ——— اس وقت جو اور جس قسم کا تصور آپ باندھیں گے وہ آپ کے لاشعور میں در آئے گا ——— یہ گویا آپ کے تخیلی کردار

کا منفی عکس Blue print ہوگا اس مادہ سے آپ کا وہ کردار پرورش پائے گا جس کو آپ نے خاص طور پر اپنے لئے تخلیق کیا ہے۔

چنانچہ ہوتا یہی آیا ہے کہ کسی کو کسی چیز کی ضرورت ہوئی، عامی ہوا تو بازار چلا گیا اور لے آیا ——— اور جو کہیں خاص سوچ بچار کا مالک ہوا تو وہ سب سے پہلے دوکان کا نقشہ اپنے ذہن میں لائے گا، پھر اسے ایک نیا ڈیزائن سوجھے گا اور پھر اس کے ذہن میں اس ڈیزائن کی ایک لمبی سی قطار آئے گی۔ اور ایسے ہی دماغ ہوتے ہیں۔ جو صنعتی دنیا کے باوا آدم بن جاتے ہیں، اور ایک دنیا ان کی رہنمائی میں آنکھ بند کئے بھیڑ چال چلتی رہتی ہے ——— یہ سب کیونکر ہوتا ہے ——— صرف عظیم تخیل اور شاندار مشاہدات ہیں جن کے سر اس کامیابی کا سہرا بندھ جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا راز یہ ہے کہ آپ خود اعتمادی سیکھیے!

مصیبتوں کی بھٹی میں پڑنے سے نہ گھبرایئے۔ دنیا میں کوئی ایسا آدمی نہیں جو آگ سے گذرے اور بال بیکا نہ کر پائے۔ لیکن شعلوں میں صرف جلانے ہی کی قوت نہیں ہوتی۔ ان میں کثافت دور کرنے کی قوت بھی ہوتی ہے۔ جن لمحوں میں صرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر پڑے، جب گھنیرے بادل چھا جائیں جب پھولوں کی خوشبو کم ہو جائے اور زندگی کی ہمدردیاں ناامیدیوں کے اداس ماتم میں تبدیل ہو جائیں یہ کبھی مت بھولو کہ سونا ہمیشہ تپ کر کسوٹی پر اترتا ہے۔ مضبوط لوہا تب ہی مضبوط مانا جاتا ہے جب برابر کے لوہے سے برابر کی طاقت سے ٹکراتا ہے۔ جن کڑی ساعتوں میں آپ مصیبتوں اور آفتوں کا مقابلہ کر رہے ہوں گے یقین مانیے یہی وہ لمحات ہوتے ہیں جس میں حقیقی مسرتوں کی بنیاد پڑتی ہے۔

اگر آپ نے مفلسی کے پاؤں تلے کچل جانے سے انکار کیا یا اپنے آپ کو اس دماغ پاشی سے نجات دینے کا راستہ ڈھونڈ لیا جو آپ کے سکون کی بربادی پر تلی ہو تو یقین مانئے آپ نے اصلی مسرتوں کے محل کی بنیاد رکھدی!

حقیقت تو یہ ہے کہ کسی چیز کے نہ ملنے پر بچوں کی طرح رو دینا واقعی بچپن ہے اور اگر بڑی عمر میں یہ حرکت سرزد ہو تو باعث عبرت ——— آج کل تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم سب "رونے بچے" ہو گئے ہیں کہ ذرا ہماری منشاء کے خلاف ہوا اور ہم ہونٹ نکال کر بسورنے لگے! ——— وجہ یہ ہے کہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ ہمیں نہیں ملتا لہٰذا ہم واویلا مچاتے ہیں۔ ہم اس گھر کی تمنا کرتے ہیں، اس بنک اکاؤنٹ کے لئے ترستے ہیں، اور اس مرتبہ کے لئے مرے جاتے ہیں ——— بہرحال چاہتے ہمیشہ وہ ہیں جو ہماری پہنچ سے باہر اور اپنے بس کا روگ نہیں۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ہم اپنا سر لاحاصل خواہشات کی دیواروں سے ٹکراتے ہیں اور یہ سر کی چوٹ ہمیشہ ہمیں ناخوش اور بے کل رکھے گی!!

رجائیت کی پرورش کیجیے ——— ہر چیز کے روشن پہلو پر نظر رکھیے اور ——— مستقلاً مسکراتے رہیئے ——— مسکراہٹ میں جادوگری ہوتی ہے! جب آپ کے ہونٹوں کے گوشے مسکراہٹوں کے حسین بارسے تھرتھراتے رہتے ہیں غم و اندوہ آپ کے پاس پھٹک نہیں سکتا۔ عام خیال ہے کہ جب ہمیں رنج ہوتا ہے تو ہم روتے ہیں۔ ولیم جیمس مشہور نفسیات داں کہتا ہے ہم جس وقت روتے ہیں اس وقت ہمیں رنج ہوتا ہے۔ اور جب ہمارے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹوں کے پھول کھلتے رہیں گے پھر ہماری آنکھیں آنسو بہا سکتی ہیں؟ ذہنی کاروبار سراسر جسمانی اظہار کے ماتحت ہوتا ہے۔

ماہرین حیاتیات اور عمرانیات میں ایک عرصہ سے یہ جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ ایک کہتا ہے ورثہ زندگی کا اہم جزو ہے اور دوسرا ماحول کو بنیاد قرار دیتا ہے اور جدید نفسیات اس بحث میں ایک نیا نکتہ نکالتی ہے۔ وہ کہتی ہے نہ ورثہ نہ ماحول ——— بلکہ یہ دماغی کارفرمائی ہے جس پر ہماری زندگی کا انحصار ہے۔ ہمارے خیالات، دلچسپیاں، تفریحیں اور تاثرات ہیں جو ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہیں۔ اور ان ہی کے سہارے ہم اپنی زندگی کی تعمیر کرتے ہیں!

کیا آپ لافانی ہستیوں سے شرف نسبت چاہتے ہیں؟ ——— تو پھر آپ کو ان کی دنیا میں قدم رکھنے کی زحمت گوارا کرنی پڑے گی۔ آپ کو ان کی جسمانی محنتوں کا وہ سخت کٹھن سا پہاڑ پر بلند چٹانوں اور خارزار وادیوں سے گذرنا پڑے گا اور پھر اس کے بعد آپ کو ان کی امن و شانتی کے گھر وہ نخلستان، وہ گلستان اور وہ لالہ زار ملیں گے جو ان کی محنتوں کا انعام ہوں گے!! یعنی اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ ان کے نقش قدم پہ چلنے کی کوشش کیجیے، ان کا اتنا مطالعہ کیجیے اور پھر اپنے آپ میں ان اصولوں کو اتنا اپنایئے کہ آپ ان کی مجسم تصویر بن جائیں!

ملٹن نے اپنی "فردوس گمشدہ" اپنے اندھے پن کے زمانے میں لکھی جسمانی طور پر اندھاپن کوڑھ سے بدتر ہے لیکن اس کی یہ رکاوٹ اس کی روح کی بلند پروازی میں آڑے نہ آسکی، وہ اڑتا رہا، اور اتنا بلند اڑا کہ لافانی ہستیوں میں اس کا نام شامل ہو گیا۔ بینن کو قید سخت میں یاد کیا گیا ——— اس نے زمانے میں قید سخت

ڈاکٹر لادرمیسن براؤن

جنسی زندگی ـــــ اس عہدِ نو میں

طلوعِ نوروز

آج کا ہر چھوٹا بڑا جانتا ہے کہ ساری دنیا میں ایک نئی تبدیلی، ایک نیا پن اور ایک انوکھی جدت پھیلی ہوئی ہے اور مسلسل پھیلتی جا رہی ہے مفکرین کا خیال ہے کہ ہم آج کل ارتقا کے ایک عبوری دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور ایک عہدِ نو کے قرب کے برقی احساس سے خیالوں، گفتگوؤں ذہنوں اور قلموں میں ایک عجیب زندگی سے معمور قوت تڑپنے لگی ہے!

ہم ایک عہدِ نو سے قریب ہوتے جا رہے ہیں ـــــ اور اگر اس کو نئے زمانے سے تعبیر کر رہے ہیں تو کسی طرح غلطی پر نہیں ـــــ اور یہی احساس کہ نیا زمانہ آیا ـــــ آ گیا ـــــ ہمارے قدم تیز سے تیز تر اٹھ رہے ہیں

ایسے عبوری دور کی ہیجانیوں کے کئی عظیم کائناتی اسباب ہیں ـــــ اور ان ہی سے آج کل ہم دوچار ہیں اور یہی انقلابات ہیں کہ ساری دنیا کے بسنے والے کے عادات اخلاق کردار اور اعتقادات کو بدلے جا رہے ہیں اعلیٰ قسم کے مفکرین نے ان حقائق کی چھان بین کر لی ہے جو اس عہد کے ان انقلابات کے بنیادی اسباب ہیں ـــــ انہوں نے ان کی تحلیل کر کے ان کی درجہ بندی بھی کر لی ہے اور بڑی احتیاط و اہتمام کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے جس کا "حیرت کامل" کا ایک نیا نظام" ہوگا!

اور یہ قطعی فطری بات ہے کہ اس عہدِ نو کی آمد کے بعد ذہین مرد و عورت ایک نئے قسم کی جنسی زندگی کی طرف مائل ہوں گے ـــ اور اب یہ ترقی یافتہ رہبرانِ قوم اس اہم مسئلہ حیات تک ایک حقیقی اور عملی انداز میں ایک نئے زاویہ نگاہ کے ساتھ پہنچ گئے ہیں ـــــ اور وہ نئے نئے جدت پسند اصولوں کے ساتھ عوام کو آگاہ کر رہے ہیں کہ اس خدائی عطیہ، یعنی اس جنسی قوت کو انفرادی روح ذہن اور دماغ کے لئے کس طرح کام میں لانا چاہیئے؟ نیز یہ کہ خالقِ حقیقی کا اس جذبہ کی تخلیق سے منشا کیا ہے؟

نئی نفسیات انتہائی انبساتی، تخلیقی اور قوی ہے ـــــ اس میں انفرادی طور پر ایسی ہدایات دی گئی ہیں جن کے استعمال سے تخلیقی قوت کے نئے جنم کے لئے خاطر خواہ صورتیں پیدا ہوتی ہیں!

اس میدان کے نئے نفسیات داں جانتے ہیں کہ جسم ایک زبردست اجتماعی نظام کا نام ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ذہن و دماغ کے نزدیک اس بڑے نظام کی حیثیت ایک خادم جیسی ہے۔ اور جو ایک صحت مند جسم، ایک تیز دماغ ایک عظیم روح اور حقیقی روحانی بیداری کا طلبگار ہوگا۔ اس کے ذہن میں لازمی طور پر نفسیات دانوں کے اس انکشاف کا اعتراف عقیدہ کی طرح جاگزیں ہو جانا چاہیئے۔

جب یہ عقیدہ ذہن نشین ہو جائے تو پھر ہمیں اس قوت کے تصرف اور تکامل کے مسئلہ میں منطقی طور پر ترقی پسند قدم اٹھانے چاہیں تاکہ ساری ہستی ایک نیا جنم لے سکے ـــ!

ذکرِ ماضی ـــــ جنسیت کے نئے جنم پر ماضی میں بھی زور دیا جاتا تھا۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یوں اس جذبہ کو انفرادی اور شخصی تلذذ کے لئے بھی استعمال

کیا گیا، اور کیا جاتا تھا ۔ اور یہ کہ اس کے استعمال پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا تھا ——— لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس کے باوجود اس کا اصل منشا و مقصد غلط فہمیوں، غلط اندازوں اور جہالت کی موٹی موٹی تہوں کے نیچے چھپ گیا ——— اور آج ان ہی کا نتیجہ ہے کہ سارا عالم جنسیت کے دلدل میں پھنسا کھڑا ہے ——— جس قدر ہاتھ پاؤں مارتا ہے کہ جھمیلے سے نکل آئے اسی قدر یہ دلدل اس کو تحت الثریٰ کی طرف لئے جا رہا ہے ۔

اگر بغور دیکھا جائے تو اس جذبہ کا مقصد ارتقائے نسل ہے ۔ لیکن خالق اکبر کا اس جذبہ کی تخلیق سے صرف اتنا ہی مقصد نہیں ہے ——— بلکہ وہ چاہتا ہے کہ انسان اس تحفۂ جنسیت کو اپنی مسرتوں، خوش حالیوں، روحانی اور جسمانی تلطف اور امتنان کے لئے استعمال کرے اور اس کے صحیح استعمال سے عمدہ صحت عمدہ ذہنیت اور اخلاق کا حامل ہو جائے !

کائنات کے ذرّے ذرّے پر نظر ڈالئے ——— ہر ورقے دفتر ——— اور خالق نے ہر چیز کو محض اس لئے پیدا کیا ہے کہ انسان اس سے فائدہ اور مسرت حاصل کرے اور اس کے نتیجہ میں خود اپنی قوت تخلیق کو ایک شاندار قوت بنالے ——— اور کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ محض جہالت اور اس عظیم قوت کی کرشمہ کاریوں سے لاعلمی کی بنا پر انسانیت کے اَنگنت غم اور رنج پیدا ہوتے ہیں ——— یہ لعنت نہیں تو اور کیا ہے ؟

تھوڑے سے غور کے بعد یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے یہ "جنسیت کی لعنت" خواہ عورت ہو کہ مرد اصل قوت حیات ان میں سے گم ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ کئی طرح ظاہر ہوتا ہے جیسے گھبراہٹیں، اختلاج، کمزوری صحت جسمانی اور دوسری طرح طرح کی جسمانی خرابیاں ——— اور جب جنسی قوت اس طرح فضول برباد ہوتی رہتی ہے تو اہم جنسی غدودوں میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس کمزوری کے باعث برابر کام نہیں کر سکتے اور ان کی عدم کارکردگی کے باعث سارا غدودی نظام درہم و برہم بہ ہم ہو جاتا ہے اور جسمانی کمزوری اور دماغی بے سکونی اس کا لازمی اور لابدی نتیجہ ہوتے ہیں ——— مرد ہو یا عورت جب ایک بار اس کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں تو سارا جسمانی نظام جیسے گھلنے لگتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ جسم کے ساتھ ساتھ دماغی قوتیں بھی قابو سے باہر ہو جاتی ہیں اور انسان ایک مہمل کیڑا بن کر رہ جاتا ہے ۔

اب جب کہ ایک مرتبہ ہم نے اس جہالت کا ازالہ کر دیا جس نے تعامل جنسی پہ ماضی میں اس قدر بھاری پردہ گرا رکھا تھا ——— تو اب ہم اس نقطہ پر پہنچے ہیں جہاں ہمارے شعور میں بیداریاں پیدا ہوتے لگتی ہیں ——— جیسے جیسے ہمیں جنسیت اور اس کی ساری حکمتوں کا علم ہونے لگتا ہے ہماری آنکھوں پر سے جہالت کی نقاب سرکنے لگتی ہے اور ہم اس سب سے زیادہ اہم تخلیقی قوت حیات کے تعمیری منصوبے کو پورا کرنے کے لئے تیار ہونے لگتے ہیں ۔

آج نفسیات دانوں نے وہ مقامات پیدا کر دئے ہیں جہاں پہنچ کر آج کہ مرد عورت اس تکنیک پر عمل پیرا ہیں جو اس قوت حیات کو انفرادی طور پر نیا جنم دینے کے قابل بنا رہا ہے ——— اور جس کے ذریعہ انسان کی ساری سوئی ہوئی قوتیں جاگ رہی ہیں اور ایک حیاتِ نو طلوع ہو رہی ہے

یہ ماہرین نفسیات تشریح کرتے ہیں کہ کوئی آدمی اپنی ساری قوتوں کو کس طرح اس زبردست قوت کی حیات نو کی طرف مجتمع کر سکتا ہے ؟

یہ ایک بالکلیہ شعوری عمل ہے ——— جو عام طور پر "قلب ماہیت" Transmutation کے نام سے مشہور ہے ——— اور اس سے زیادہ مانوس وہ پرانا نام ہے جو تقعید Sublimation کے نام سے مشہور تھا اور یہ ایک "لاشعوری عمل" ہوتا تھا ۔ جس شخص پر یہ ماہرین اپنا عمل "قلب ماہیت" کرتے ہیں وہ شعوری طور پر ایک ایسے عمل پر مجبور کیا جاتا ہے جو اس کے جسم کو دماغ کا تابع کر دیتا ہے ——— اور یہی وہ عمل ہے جس سے ترقی کا زینہ انسان کو مل جاتا ہے !

ایک خاندانی حیاتیاتی نئے جنم کے لئے قوت جنسیت تعجب خیز کام کرتی ہے اور بہت ہی قلیل عرصے میں کئی نمایاں تبدیلیاں عمل میں آجاتی ہیں ۔ اور جسمانی صحت دماغی صحت کی آئینہ دار ہونے لگتی ہے ——— اور اس سے ایک حیرت انگیز روحانی انداز سامان پیدا ہو جاتے ہیں ۔

عام طور پر اکثریت ایسے آدمیوں کی ہمیں ملتی ہیں جن میں ایک خاص انداز نہیں ہوتا ——— وہ خاص انداز جو کسی کی شخصیت کا ٹریڈ مارک ہوتا ہے اور جن میں یہ انداز نہیں پائے جاتے ان کی پہچان یہ ہے کہ وہ بیرونی مسرتوں کی تلاش میں گم رہتے ہیں جس کی نمایاں شکل مادیت پرستی میں ملتی ہے ——— کچھ لوگ ایسے

جھتے ہیں کہ سونے کا بچھڑا بناتے ہیں اور اس کے سامنے سر عبودیت خم کر دیتے ہیں ——— بعض اپنی ضیافت طبع کے لئے ایسی مسرتیں تلاش کرتے ہیں جو انھیں وفور مسرت سے تھکا تھکا مارے یہاں تک کہ ان کے حواس مختل ہو جائیں ——— بعضوں نے چند رسمیں اپنے لئے مختص کر لی ہیں ——— بس دن رات اس کے اہتمام میں لگے رہتے ہیں اور اس سے بالکل بے خبر رہتے ہیں کہ آخر وہ کیا ہے؟ اس کے معنے کیا ہیں؟ وہ ہمیشہ بے چینی سے اس کو تلاش کرتے رہتے ہیں جن کے متعلق خود انھیں خبر نہیں ہوتی ———!

اور مفکرین جانتے ہیں کہ یہ بھٹکے ہوئے مسافر صداقتوں اور عقلمندیوں کی راہوں سے گذرے ضرور ہیں لیکن پہچان نہ سکے ——— اور ان میں کوئی وضع داری، کوئی انداز کوئی طرحداری کیوں نہیں؟ ——— اس لئے کہ انھوں نے کبھی اس عظیم سرائے انکشاف کی زحمت گوارا نہ کی جو ان کے آگے بچھی پڑی ہے ——— اندھوں کی طرح دن کے اجالے میں ٹھوکریں کھاتے رہے!

عمل اور علم کے اس نظام العمل میں کہ اس تحقیقی قوت حیات کو کس طرح تعمیری طور پر استعمال کیا جائے کئی اشتراکی جزو شامل ہیں۔ ان تمام بنیادی ضروریات کا ماحصل یہ ہے کہ جسم، دماغ، روح اور تنفس جنسی قوت کے توسط سے ایک بلند تر ہم آہنگی اور توازن کے حامل ہو جائیں۔

اور یہ توازن اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کہ جنسی قوت کا تعمیری طور پر استعمال ہو اور اس کے ساتھ ساتھ سائنٹفک طریقہ پر انفرادی طور پر جسم کو بالکلیہ دماغ کا تابع بنا لیا جائے۔

ایک برتر اور اعلیٰ معیار کی ذاتی ترقی کے لئے "موزوں غذا" سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اور یہ صاف طور پر عیاں ہے کہ غذا جسمانی صحت مندی کی حقیقی ضامن ہے۔ لہذا ہمیں چاہیئے کہ اغذیہ کا ایک پروگرام بنالیں اور اس پر پابندی سے عمل پیرا ہوں

"صحیح تنفس" بھی جسمانی صحت مندی کا ایک اور ضامن ہے۔ لہذا صحیح قسم کی سانس کی ورزشیں کی جانی چاہئیں اور ہر قسم کی ورزشیں کے مقصد کو سمجھ بوجھ کر کی جائیں تاکہ فائدہ خاطر خواہ برآمد ہو سکے۔

اگر ہمارے اس مشورہ پر ہر متنفس عمل کرنے لگے تو آج ہی دنیا میں ایک عمدہ اور نفیس نظام حیات جنم لے ——— اور اس ارتقائے قدرتی کے ساتھ ساتھ نئی مسرتیں، نئی امنگیں نئی تمنائیں جلوہ گر ہو جائیں اور وہ امن و سکون پیدا ہو جائے جو اتفاق و اتحاد کی راہوں پر گامزن ہو!

گو شاید انسانیت برداشت نہ کر سکے اور اسے یہ حقیقت کھل جائے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی موجودہ صورت حال بالکلیہ اس جنسی لعنت کا نتیجہ ——— کیونکہ اس عظیم ترین قوت تخلیق کے غلط استعمال نے اذہان و اجسام کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ آئے دن ہمارے سامنے متعدد ایسے واقعات آتے رہتے ہیں جو بیک وقت تکلیف دہ اور انتہائی غمناک ہوتے ہیں ——— ہم دیکھتے ہیں سنتے ہیں ——— کیا ہم ——— المناک افسانے جو بہترین ناامیدیوں کے دامن میں سمٹے ہوئے ہیں ——— افسوس ناک واقعات نے شکوک، شبہات اور تخویف کو ہزاروں چہروں پر مرتسم کر رکھا ہے!

جنہوں نے جنسی بے راہروی اختیار کی ہے ان کی ساری نسلیں جسمانی بیماریوں، کمزوریوں اور نقائص سے بھری ہوئی ہیں ——— اس کا لازمی نتیجہ ایک پوری نسل کی تباہی ہے ——— یہ نسل خوف کے سمندر میں ڈوبی، اعصابی کمزوریوں کا شکار، روحانی آزاروں میں گرفتار اور اپاہج مجبور و لاچار قسم کی نسل ہے ——— اس کا وجود انسانیت کے ماتھے پر کلنک سے کم نہیں!

جس قدر حقیقت کا غلط استعمال ہوگا دنیا میں اسی قدر مادہ پرست نسلیں جنم لیں گی جو مادی تعیشات کی دیوانی ہوں گی۔ اس طرح ہمیں پوری پوری قوموں سے دوچار ہونا پڑے گا جو روپیہ اور روپیہ سے خریدی جانے والی چیزوں کے لئے ایک دوسرے کے گلے کاٹنے سے محترز نہ ہوں گی ——— ——— اور ساری قومی نفسیات میں مادیت پرستی تانے بانے کی طرح بنی جائے گی۔ کیا اس طرح قومیں خوش اور مسرور رہ سکتی ہیں؟ اور جب ماہرین نفسیات اس قوم کو نفسیاتی امتحان کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں تو قوموں کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ کیا یہ ایک دیوانگی نہیں ہے؟ ماہرین جانتے ہیں کہ ہے اور بہت مضرت رساں!

اور [illegible]!

اس [illegible] خدا کا شکر ہے کہ چند ایسی ہستیاں پیدا ہو چکی ہیں جنہیں ان کمزوریوں اور ان کی ہولناکیوں کا علم ہے وہ ہر ایثار اور قربانی کو کام میں لاتے ہوئے ظلمت میں تمہیتاروں کی طرح ساری انسانیت کی رہنمائی کر رہے ہیں ——— اور جہالت و توہم پرستی کے موٹے بھدے پردے اتار رہے ہیں! امید ہے

کہ یہ آج کے "چند"، کل کے "دوچند" اور پرسوں کے "ہزار چند" ہوجائیں گے!

ان رہبران قوم نے کئی باقاعدہ منظم ادارے کھول رکھے ہیں ——— مختلف شہروں کے دورے کرتے ہیں۔ اور عوام کو بتاتے ہیں کہ زندگی اصل میں کیا ہے؟؟ اسے کیسی ہونی چاہیئے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ ——— تاکہ ایک خود ترقی یافتہ نسل دنیا کے اسٹیج پر آئے اور وہ تماشہ دکھائے جس کو نہ ماضی نے دیکھا نہ حال نے ——— اور جس کا مستقبل میں بھی کوئی جواب نہ ہو!

اور اس عہد نو میں زندگی اور زندگی کے سارے اصول بدل جائیں گے ———

نئی قدریں پیدا ہوں گی اور ارتقاء حیات کا پہلا اصول ہوگا "ذاتی ترقی"۔ (Self Progress)

انسانی نگاہیں پھیل جائیں گی ———!

مادیت ——— کو فنا کرنا اس دور کا سب سے اہم کارنامہ ہوگا ———

اس عہد نو میں نئی تکنیک کے پیش نظر انسان ان نئے چار عناصر کا مرکب اور ان کی ترقی یافتہ شکل ہوگا جن کا نام ہے جسم، دماغ، روح اور نفس!

اور پھر ——— — ———؟

پھر اس مبارک دور میں شائد یونان کا وہ سنہرا زمانہ لوٹ آئے جب کہ اخلاق، روحانیت اور تہذیب کا عروج کامل ہوا تھا ———!

خودی کی تکمیل ——— اس دور کی ترقی کا راز ہوگا!

اگر ایسا ہے ——— تو سوچئے ———

کیا تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے؟

(بقیہ صفحہ ۳ سے آگے)

حصول علوم فنون کا ارتقاء، سائنس کی ترقی، سامان راحت، ذہنی خوشی کے لئے مہیا نہیں کر سکتیں یہ انسان خود کر سکتا ہے۔ اس کی اپنی جدوجہد ہو وہ اپنی شخصیت کو جاننے کے لیئے کر سکتا ہے۔ اس کی زندگی کو خوشی اور مسرت کا گہوارہ بنا سکتی ہے۔ دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ ہوا جب ارسطو نے کہا تھا۔

"یقیناً زندگی کی تمام ناامیدیوں اور ناکامیوں سے کنارہ کشی ہو سکتی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسی زندگی ہو جسے سرور و انبساط کی راہ پر نہ لگایا جا سکے وگرنہ خوشی تو ہر فرد کی ملکیت ہے لیکن یہ ملکیت وراثت سے نہیں "جدوجہد" سے ملتی ہے خوشی صفت ہے کامیاب زندگی کی اور کامیاب زندگی تخلیق ہے شعور تربیت صحیح کی۔"

فن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاہے موسیقی کی شکل میں ظاہر ہو چاہے سنگتراشی کی شکل میں مصوری ہو یا شاعری اور یا وہ فن خود تماشی کی شکل میں ہو چار حسب ذیل شعور کا ہونا لازمی ہے۔ پہلا شعور اپنے فن کے متعلق پورا علم ہوتا ہے۔ ایک مصور کو اگر رنگوں سے پوری واقفیت نہ ہوگی تو وہ ہرگز اپنے فن کا ماہر نہیں ہو سکتا۔ زندگی کے فنکار کے لیئے اسی طرح انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ لازمی ہے۔ دوسرا شعور کاریگری کا شعور ہے۔ کاریگری کا مطلب ناتراشیدہ مواد کو ایک بامعنی ساخت میں تبدیل کرنا ہے۔ ایک مصنف کے لیئے یہ ضروری ہے کہ وہ الفاظ کو اس طرح ترتیب دے کہ اس کا مطلب پڑھنے والے تک پہنچ جائے۔ زندگی کے فنکار میں انسانی فطرت کے تبدیل کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیئے لیکن اس طرح کہ دوسروں کی زندگیاں تبدیل کرنے سے پہلے وہ خود [illegible] ہو جائے۔ تیسرا شعور پھر مطلب یعنی اس بارے میں علم آرٹ کے اغراض و مقاصد کا علم ہے۔ اگر آپ انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ رکھتے ہوں اور یہ بھی جانتے ہوں کہ کس طرح [illegible] و سکنات پر حاوی ہو سکتے ہیں لیکن آپ کے پیش نظر کوئی مقصد نہ ہو تو آپ خوش نہ رہ سکیں گے۔ چوتھا اور آخری شعور ہمت اور اعلیٰ حوصلگی ہے۔ ہر [illegible] کے سامنے مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگ بڑی بڑی تصانیف کے خواب دیکھتے رہتے ہیں لیکن سفید کاغذ کے ایک درجن اوراق ان کے لیئے بھول بھلیاں بن کر رہ جاتے ہیں۔ بہت سے ہونے والے بت تراش تصور میں اپنی اولوالعزم ہستیوں کے بت دیکھتے رہتے ہیں لیکن سخت چٹانوں کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے فنکار اپنی کاریگری کے مقصد اور اپنے مدعائے زندگی سے باخبر ہوتے ہوئے تذبذب و تامل کے شکار ہو جاتے ہیں اور وقت، جغرافیائی حالات، آب و ہوا، مالی حالات، زمانہ کی رفتار اور دوسری مشکلات کے مقابلہ میں حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں۔

خاص سائیکولوجی اردو کے لئے

قوّتِ ارادی

ضیاء الدین احمد صاحب برنی

دنیا میں بالعموم چار قسم کے آدمی پائے جاتے ہیں جن کی تفصیل بلحاظ ان کی قوت ارادی کے اس طرح سے ہے:-

۱۔ وہ لوگ جو قوت ارادی سے بالکل معرٰی ہیں۔ ایسے اشخاص کی مثال بادل کے ان ٹکڑوں کی سی ہے۔ جن کو ہوا کے جھونکے کبھی مشرق کی طرف منتشر کر دیتے ہیں اور کبھی مغرب کی طرف۔ ایسے لوگوں کا وجود بہت ہی قابل رحم ہوتا ہے

۲۔ وہ لوگ جن کی قوت ارادی بہت کمزور ہے۔ ایسے لوگ اگرچہ قوت ارادی سے بالکل خالی نہیں ہوتے۔ تاہم وہ نازک موقعوں پر کمزوری کا اظہار کرتے ہیں۔ ان میں اتنی دلیری یا قوت نہیں ہوتی کہ وہ دو خیالوں میں سے ایک کو پسند کر لیں۔ مثلاً اگر ان کے سامنے دو خیال "اسلام اور کفر" یا خدا پرستی اور بت پرستی پیش کئے جائیں، تو اول وہ قدرتی طور پر ان دونوں میں سے ایک کو ہمیشہ کے لئے پسند کرنے میں بہت دیر لگائیں گے، اور جیسا کہ اکثر دیکھا گیا ہے، پھر بھی کسی قطعی نتیجہ پر پہنچنے سے قاصر رہیں گے

۳۔ وہ لوگ جن کی قوت ارادی نسبتاً طاقتور ہے۔ ایسے اشخاص دنیا میں عام طور پر کامیاب نظر آتے ہیں۔ سوسائٹی کے لئے ان لوگوں کا وجود بہت غنیمت ہے۔ سوسائٹی کی باگ ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے جو اپنی مرضی کے مالک ہوں

۴۔ سب سے اعلیٰ قسم کے اشخاص وہ ہیں جن کی مرضی یا ارادہ کامل ہوتا ہے۔ ایسے لوگ اپنے لئے ایک ایسا دستور العمل تیار کر لیا کرتے ہیں جس پر وہ زندگی بھر عمل پیرا رہتے ہیں۔ انہیں پھر دنیا کی کوئی چیز اپنے مقصد سے نہیں ہٹا سکتی بالفاظ دیگر وہ اپنے مقصد کو زندگی اور موت کے لئے اختیار کرتے ہیں۔ دنیا ایسے لوگوں کی مثالوں سے پر ہے۔ مثال کے طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو لیجئے۔ ان کی برگزیدہ زندگی ہر موقع پر ایک کامل و اکمل مرضی کا اظہار کرتی رہی ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ جب سرداران قریش نے جمع ہو کر اس "سچائی کی روح" کو اپنے مقصد (اشاعت توحید) سے باز رکھنے کے لئے دولت، جاہ، ملک، عورت وغیرہ جیسی لبھانے والی چیزوں کے وعدہ دئے، تو جو کچھ اس مقدس رسولؐ نے ان تمام باتوں کے جواب میں فرمایا، وہ صفحات تاریخ میں تاابد سنہرے حرفوں کی طرح چمکتا رہے گا آپ نے ارشاد فرمایا کہ "اگر تم سورج کو میرے دائیں ہاتھ پر رکھدو اور چاند کو بائیں ہاتھ پر، پھر بھی میں اپنے ارادہ سے باز نہیں آؤں گا۔" اس کے علاوہ حضرت بلالؓ کی زندگی بھی کامل مرضی کی ایک زندہ مثال ہے۔ آپ نے اسلام کی خاطر کفر کے ہاتھوں سخت تکلیفیں اٹھائیں لیکن جب آپ ایک دفعہ مذہب اسلام کی حقانیت سے واقف ہوگئے۔ تو آپ نے طرح طرح کی تکلیفیں اٹھائیں مگر سچائی سے ایک لمحہ کے لئے بھی دست بردار نہیں ہوئے۔ اسلام کی تاریخ اس قسم کے شہیدوں کی مثالوں سے لبریز ہے۔ سچ ہے بڑے آدمی ایک کامل مرضی رکھتے ہیں اور چھوٹے صرف خواہشات!

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ "کمزور مرضی" کے وجوہ اور اسباب کی تحقیق کی جائے (تاکہ موجودہ نسل ان اسباب کے رفع کرنے میں ساعی ہو اور اس طرح سے انسانوں میں ایسے لوگ بکثرت پیدا ہونے لگیں جو صاحب مرضی ہوں اور جنہیں کوئی لالچ خواہ کسی صورت میں ہو) خیالات کے اظہار سے نہ روک سکے

۱۔ نظام عصبی کی کمزوری۔ جسم ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا اثر براہ راست دماغ انسانی پر پڑتا ہے۔ مدت سے ایک مثل چلی آتی ہے۔ جو ہمارے دعوٰی کی تصدیق کرتی ہے وہ مثل یہ ہے کہ "ایک تندرست دماغ ایک تندرست جسم پر مبنی ہے"۔ "تخیل کی کمی" اور "کمزور مرضی" کمزور جسم کے ایسے نتیجے ہیں جن کو خود بخود کمزور آدمی اچھی طرح سے محسوس کر سکتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نظام عصبی پیدائشی کمزور ہوتا ہے، اور یا لڑکپن اور جوانی میں ورزش نہ کرنے سے یہ کمزوری عائد ہو جاتی ہے، بہرحال اس کمزوری کا علاج ورزش یا بڑے آدمیوں کے حالات زندگی کا مطالعہ جس سے ایک کمزور آدمی میں خاطر خواہ کمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور

جسم میں اس کے ذریعہ سے بہت کچھ اصلاح کی گنجائش ہے -

۲- بعض آدمیوں میں کمزور مرضی کا سبب فطرتی زود حسی دیکھا گیا ہے - ایسے لوگ ایک واقعہ سے اتنی جلدی اثر پذیر ہو جاتے ہیں کہ ان کے لئے اصلی فیصلہ کرنا قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہے - زود حسی ایک ایسا غلبہ ہے جس کے زیر اثر رہ کر انسان اپنی ٹھیک ٹھیک رائے نہیں دے سکتا - جس طرح سے شراب پیے ہوئے شخص کی باتیں قابل اعتماد نہیں سمجھی جاتیں، اسی طرح سے زود حس آدمی کی باتوں پر بھی چنداں اعتبار نہیں کرنا چاہیئے - کیونکہ ان دونوں حالتوں میں انسان کو سوچنے کا بہت کم موقع ملتا ہے اور وہ ایک دفعہ ہی فوری غلبہ سے متاثر ہو کر فی الفور اپنی رائے سے خبردار کر دیتا ہے - ایسی طبیعت کے لوگ جتنی جلدی بھڑک اٹھتے ہیں - اتنی ہی جلدی پھر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں - جس کا نتیجہ پھر انھیں غیر مستقل مزاجی کی صورت میں ملتا ہے - اس کا علاج سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ انسان غور و فکر کی عادت ڈالے اور قطعی فیصلہ دینے سے پیشتر متنازعہ فیہ مسئلہ کے ہر ممکن پہلو پر کافی غور کر لیا کرے

۳- بچے کی ابتدائی بری تربیت اور پرورش کا اثرات بعد میں مع سود کے کمزور مرضی کی شکل میں مل جاتا ہے - ورڈ ورزتھ کا مشہور معنی خیز مقولہ یہ ہے کہ "جیسا بچہ ہوتا ہے، ویسا ہی بڑا ہو کر باپ بنتا ہے" - لہذا والدین کا فرض ہے کہ وہ بچہ کی مرضی کو راہ راست پر چلانے کی کوشش کریں - بچہ کی بیجا ضد کا پورا کرنا خود اس کے لئے ایک خطرناک مستقبل کی بنیاد ڈالنا ہے

۴- عیش و عشرت بھی کمزور مرضی کا ایک زبردست سبب ہے - اس کا اثر عام طور پر نظام عصبی پر پڑتا ہے انسان کی صحت اور خوشی کا دارو مدار ہر ایک قویٰ کے جائز اور اعتدال کے ساتھ استعمال پر ہے - اس سے تجاوز کرنا خود اپنے ہاتھوں اپنی بربادی مول لینا ہے

۵- تخیل کی زیادتی بھی انسان کی قوت مرضیہ پر برا اثر ڈالتی ہے اور اس کے بعد وہ اس قابل نہیں رہتا کہ دو خیالات میں سے ایک کو پورے پورے یقین کے ساتھ اختیار کرے اور ہمیشہ زندگی بھر اس کی پیروی کرتا رہے وہ ہر دو خیالات کی نسبت شبہ کی حالت میں رہتا ہے اور اس لئے ناممکن ہے کہ وہ ایک خیال پر پورے یقین کے ساتھ بھروسا کرے - ایسے اشخاص جو تخیل کے دلدادہ ہوتے ہیں، دنیا سے بے واسطہ ہو جاتے ہیں - لہذا ان کے لئے اچھی اور آسان ترکیب یہ ہے کہ روزمرہ کے کاموں میں مشغولیت رکھیں اور دنیاداروں کے ساتھ اظہار نفرت نہ کیا کریں

۶- زندگی میں ہمارے مقاصد کی ناکامی دراصل ہماری مرضی کی ناکامی ہے - اس کا سہل علاج یہ ہے کہ ہمارے مقاصد شمار میں کم اور سہل الوقوع ہوں اس کا اثر یہ پڑے گا کہ ہم رفتہ رفتہ قوت مرضی کو ٹھیک راستے پر لے آئیں گے - اگرچہ اوپر ان تمام اسباب کا ذکر کر دیا گیا ہے جن کا اثر قوت مرضی پر پڑنا ممکن ہے تاہم ان کے علاوہ اور بہت سے اثباتیہ طریقے ایسے ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے ہم قوت ارادی کو بہت کچھ نشو و نما دے سکتے ہیں اور اس طرح سے ہم مرضی کی طاقت کو پہلے کی نسبت کئی گنا بڑھا سکتے ہیں

وہ اسباب یہ ہیں :-

۱- ورزش جسمانی نشو و نما کے متعلق پروفیسر سیٹھ فرماتے ہیں کہ "انسان کی اخلاقی صحت کا جو تعلق جسمانی صحت کے ساتھ ہے وہ ایسا بدیہی نہیں ہے کہ لوگ اسے ٹھیک طور پر سمجھ سکیں - جسمانی صحت ذریعہ اخلاقی صحت کا ہے جسمانی اخلاقی زندگی کی بنیاد ہے - اس لئے انسان کا فرض ہے کہ وہ جسم کی حفاظت کرے کیونکہ جسم کی حفاظت کرنا دراصل روح کے ایک حصہ کی حفاظت کرنا ہے" - کامل مرضی اخلاقی زندگی کا ایک ضروری پہلو ہے - بغیر اس کے اخلاقی زندگی ناممکن تصور نہیں کیجا سکتی لہذا یہ ضروری ہے کہ ہم جسمانی نشو و نما میں غفلت سے کام نہ لیں -

۲- ہمارا آئیڈیل (مطمح نظر) بڑا بلند ہونا چاہیئے - اس کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم بُرے خیال کے حملہ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں گے -

۳- اس کے ساتھ ہی اس آئیڈیل پر پورا پورا وثوق ہو جانا چاہیئے - کیونکہ اگر ذرا سا بھی اس کی سچائی میں شک ہوگا تو ساری بنیاد گر پڑے گی ہمارے سامنے رسول انور کی کامل زندگی موجود ہے - آپ کا ہر قول ہمیشہ آپ کے آئیڈیل کی سچائی کو ظاہر کرتا رہا - غار حرا کا واقعہ ملاحظہ ہو - حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں - یا رسول اللہ اگر دشمن یہاں آ گئے تو ہماری خیر نہیں - لیکن آپ کا تسلی آمیز جواب سن کر جس سے خدا تعالیٰ پر پورا پورا بھروسہ ظاہر ہوتا ہے - حضرت ابوبکرؓ خاموش ہو گئے - آپ نے فرمایا - "ابوبکر مت ڈرو کہ ہم دو ہیں - نہیں بلکہ خدا ہمارے درمیان تیسرا ہے" - [illegible] جس کی نسبت میرے محترم استاد پادری سی الف اینڈ ریوز لکھتے ہیں اگر رسول اکرم کا بھروسہ خدا تعالیٰ پر اتنا نہ ہوتا تو آپ کے [illegible] گر پڑتی " اس لئے ...

(بقایا صفحہ ۳۸ پر ملاحظہ فرمائیں)

ایک طویل مسلسل افسانہ

فرار

گذشتہ سے پیوستہ

اور شادی کی خبر سن کر تو اس کی حالت ہی غیر ہو گئی تھی باوجودیکہ خبر صرف ایک افواہ تھی لیکن اس کے دل کو تیر و نشتر کی طرح زخمی کر گئی ایک کمزوری اور سنسناہٹ سی اس کے جسم کی ہر ہر رگ میں دوڑ گئی تھی پھر رات کو وہ کتنی دیر تک اکیلے میں روتا رہا تھا ——— اس کا جی چاہا کہ اس افواہ کے متعلق بھی چمپئی رنگ کی دوشیزہ سے کچھ پوچھے لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ یہ سوال زبان تک لانے کی جرأت نہ کر سکا ——— اور اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ناچنے لگے

"پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے" چمپئی رنگ کی دوشیزہ نے اپنا ننھا سا رومال اس کی پیشانی پر پھیرتے ہوئے مسکرا کر کہا لیکن اس کو ہنسی نہ آئی۔ چپ چاپ کھڑا رہا۔ چمپئی رنگ کی دوشیزہ اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے چہرے کے نقوش پڑھتی رہی اور ان رنگوں کو شاید سمجھنے کی کوشش کرتی رہی جو مسلسل اس کے چہرے پر آ جا رہے تھے ——— اور جب وہ کچھ نہ بولا تو کہنے لگی:-

"میں جانتی ہوں تم اتنے برہم کیوں ہو رہے ہو ——— مجھ پر بھروسہ رکھو ——— عورت صرف ایک مرتبہ محبت کرتی ہے ——— عورت کا صرف ایک ہی شوہر ہوتا ہے ——— میری شادی ہو چکی ہے اور تم ہی میرے سب کچھ ہو"

اسے ایسا معلوم ہوا کہ زمین اسے لے کر اڑنے لگی ہے اور وہ اوپر اڑا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھ سے آنسو نکل پڑے اور اس نے "میری کرما میری روح" کہہ کر دوشیزہ کو اس زور سے بھینچا کہ دونوں کی ہڈیاں چیخ پڑیں ہونٹوں کی آگ بھڑک اٹھی اور ان میں خون جھلکنے لگا ——— پھر دوشیزہ نے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا اور وہ اس کے سیاہ لمبے بالوں سے کھیلنے لگا۔ ذولاجیکل گارڈن کا شیر اپنے راتب کے لئے دھاڑ رہا تھا۔

"تم آدم خور بھی ہو ——— جنگلی" چمپئی رنگ کی دوشیزہ نے اپنے ہونٹوں پر اپنی انگلی پھیرتے ہوئے کہا

اس نے پھر حملہ کیا لیکن دوشیزہ بجلی کی سی تیزی سے ذرا سا خم کھا کر اس کے آغوش سے نکل گئی ——— پھر دونوں ایک گھنیرے کنج میں جا بیٹھے جس کو چاروں طرف سے جھاڑیوں نے گھیر لیا تھا

"اس میں شاید محبت کا خون شامل ہے" اس نے گلاب کا ایک پھول دوشیزہ کے بالوں میں لگاتے ہوئے کہا۔

"اور اس میں میرے دل کا لہو شامل ہے" چمپئی رنگ کی دوشیزہ نے ایک دوسرا پھول توڑا اور اس کے کالر میں لگا دیا ——— دونوں کے لب پھر ایک مرتبہ مل گئے ———

کرما نے بتایا

اس کے ابن عم نے خود ہی مشہور کر دیا تھا کہ کرما کی شادی اس سے ہو رہی ہے جب کرما کی ماں کو معلوم ہوا تو اس نے بری طرح پھٹکارا اور گھر آنے سے منع کر دیا ——— شاید وہ انتقام لینے کی کوشش کرے

لیکن وہ مسرت کے سرور میں پھر ایک مرتبہ ہواؤں میں پرواز کرتے ہوئے بولا:-

"اوہ! کرما! میری جان!! تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا"

میرے ہونٹوں میں کچھ زیادہ خون جمع ہو گیا تھا ——— ! دوشیزہ نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا

"چڑیل ـــــــــ !"

"بھوت ـــــــــ !!"

۵

اخبار کا مدیر رنگون کے سیاسی حلقوں میں نمایاں تھا اور مدیر نے اسے بھی اسٹیج پر گھسیٹ لیا، وہ اخبار میں چھپنے کے ساتھ ساتھ عملی سیاست میں بھی حصہ لینے لگا ـــــــــ !!

یورپ جنگ کے شعلوں میں لپٹا ہوا تھا ـــــــــ شعلے بھڑکتے جا رہے تھے کوئی خود کو ان شعلوں سے محفوظ نہ سمجھ رہا تھا ہر شخص اپنی زندگی کو جلتا ہوا پا رہا تھا ـــــــــ ہر زندگی کے مستقبل پر ایک گہری کہر چھائی ہوئی تھی۔ امن کہیں بھی نہیں تھا اور جہاں کہیں تھا ان شعلوں اور کہر کے درمیان کانپ رہا تھا

برما اس وقت شدت سے سیاسی جماعتی اختلافات کا شکار ہو رہا تھا۔ مقننہ ـــــــــ فرانس کی کیبنٹ کی طرح ـــــــــ ہر ہفتہ بن بگڑ رہی تھی برمیوں کو ہندوستانیوں (ہندیاں مقیم برما) سے شکایتیں تھیں ہندوستانی برمیوں سے خائف تھے ۱۹۳۸ء کے فسادات نے دلوں میں فاصلہ ڈال دیا تھا ہندو مسلم آویزش تھی غرض برما کا دامنِ اتحاد پارہ پارہ ہو کر دامنِ مجنوں بنا ہوا تھا اہلِ خرد ان گتھیوں کو اس طرح سلجھا رہے تھے کہ اور الجھتی جا رہی تھیں۔ ہندیاں مقیم برما چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم ہو کر مختلف راہوں پر دوڑ رہے تھے ـــــــــ تھوڑی دور ہر ایک راہرو کے ساتھ ـــــــــ

اور ایسے میں حکومت ہند نے سر گرجا شنکر باجپائی کو بھیج کر حکومت برما سے جو معاہدات کئے انہوں نے ہندوستانیوں کا ستیاناس مار کر رکھ دیا ـــــــــ حکومت ہند نے رنگون میں اپنا ایک نمائندہ مقرر کر دیا

مسٹر جینگ رنگون پہنچ گئے ـــــــــ غالباً

برج کھیلنے کے لئے

ڈنوبیو سگار پینے کے لئے

یا شاید کوئی اور مقصد رہا ہو جس کو کم سمجھ ہندوستانی کبھی نہ سمجھ سکا

وہ اسٹیج پر گرج رہا تھا ـــــــــ اخباروں میں چھپ رہا تھا ـــــــــ شعلہ بار تقریریں! زہر آلود تحریریں !!

سی آئی ڈی نوٹس لے رہی تھی

محکمہ تعلیمات اس کے افسانے اور نظمیں برداشت کرتا آ رہا تھا لیکن جب کریلے کی بیل نیم پر چڑھنے لگی تو تلخی ناقابلِ برداشت ہو گئی اور یہ تلخی جب محکمہ تعلیم کے ایک ذمہ دار افسر نے اسے بلا کر متنبہ کر دیا

اگر تم نے اپنا "چال چلن" درست نہ کیا تو محکمہ سختی پر مجبور ہو گا" اسے ایسا معلوم ہوا کہ ساہو نی چاول اس کے معدے سے نکلا جا رہا ہے اور تانبوے کی بھوکی تحریروں نے منہ پھاڑ پھاڑ کر اُسے گھورنا شروع کر دیا ہے

"حضور ـــــــــ !" اس نے حضور سے کچھ کہنا چاہا لیکن حضور کوئی طالبِ علم نہیں تھے کہ اس سے درس لیتے حضور حکم صادر فرما چکے تھے اور صرف تعمیل کی ضرورت تھی ـــــــــ احکام تعمیل کے لئے دئے جاتے ہیں جوابات سننے کے لئے نہیں

"تم جا سکتے ہو" حضور نے اپنی پیشانی پر لاکھوں بل ڈال کر فرمایا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا حضور کے کمرے سے باہر آ گیا اس کی خود دار طبیعت مجروح ہو کر مشتعل ہو رہی تھی اور آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے تھے لیکن محکمہ تعلیمات کی عمارت "فائر پروف" تھی اور یہ "شعلے" دیواروں سے سر ٹکرا کر گر پڑے ـــــــــ دماغ نے کہا

"اپنا "چال چلن" درست کر لو" لیکن دل کا جنون دماغ پر حاوی ہو چکا تھا اور وہ "چال چلن" درست کرنے کے متعلق کچھ سوچ بھی نہ سکا ابھی وہ دماغ سے الجھ رہا تھا کہ چمپئی رنگ کی زیر بادی دوشیزہ کا خالص چاٹگامی چچیرا بھائی مل گیا ـــــــــ اس کا جی چاہا کہ ان آنکھوں کو پھوڑ دے

لیکن "مشیدی خاں" کا زمانہ گذر چکا تھا اور رنگون میں مسٹر پرن کاٹ کی حکمرانی تھی

"صاحب کے پاس سے آرہے ہو ——— کیا کہا صاحب نے"؟ تعلیمات کے کلرک نے اپنی نیلی آنکھوں کو چشمے کے نیچے عجیب انداز سے پھرا کر پوچھا

"کوئی خاص بات نہیں" اس نے اپنی آنکھوں کے شعلے سمیٹتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا

"مجھے معلوم ہے آپ کے خلاف بہت سی شکایتیں آئی ہیں ——— میں آپ کو پہلے بتا دیتا لیکن ادھر آنے کا موقع نہیں ملا"

"خوب —— یوں انتقام لینا چاہتے ہو —— بیٹے!" اس نے دل ہی دل میں کہا اور تعلیمات کے کلرک کا شکریہ ادا کرکے وہاں سے رخصت ہو گیا ——— دل کی جراحت زہر بن گئی اور اس نے دوسرے دن کے اداریئے میں یہ سارا زہر اگل دیا ——— حضور سانپ کی طرح بل کھانے لگے لیکن مدرسہ ایک امدادی اسکول تھا۔ سارا اختیار ٹرسٹیوں کے ہاتھ میں تھا اور ٹرسٹیوں پر اخبار کا ایڈیٹر مسلط تھا ——— زرد زرد سونا دے کر خریدی ہوئی شہرت فونٹن پن کی سیاہی سے ہمیشہ ڈرتی رہتی ہے ——— تانبوے کی بھو کی قبریں منہ پھاڑے گھورتی رہ گئیں اور باوجود حلق میں انگلی ڈالنے کے سابونی چاول معدے سے باہر نہ نکل سکا حضور کی انگلی زخمی ہو گئی اور تیسرے درجے کے مدرس کی ترقی ہمیشہ کے لئے مر گئی ——— ——— ———

(۶)

برمی اپنی آزادی کی راہ میں ہندیانِ مقیم برما کو ایک سنگ گراں سمجھ رہے تھے اور ہر ممکن ذریعہ سے اس پتھر کو اپنے راستے سے ہٹا دینے کی کوشش کر رہے تھے وہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے اس کشمکش میں خاصہ حصہ لے رہا تھا اس وقت اس کی محبت اور ہندوستانیت میں کسی قدر "ٹکراؤ" پیدا ہونے لگا تھا اس کی کرما نے ہمیشہ برما میں رہنے کا اقرار لینا چاہا اگر ہندوستانیوں کا داخلہ برما میں ممنوع قرار دیا جائے جس کا بہت زیادہ امکان تھا اور وہ ایک عجیب چپقلش میں گرفتار ہو گیا

"محبت یا وطن؟" ——— "وطن یا محبت"

وہ وطنیت کا قائل نہیں تھا بلکہ ان لوگوں میں تھا جو جبیں رکھ کر کعبہ تعمیر کر لیتے ہیں اور جہاں چاہا جبیں رکھ دی ——— کوئی دشوار بات نہ تھی کہ وہ برما ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ لیتا اور اپنی پوری عمر چمپئی رنگ کی دوشیزہ کے آغوش میں گذار دیتا لیکن اسے اپنے ماں باپ یاد آ گئے جو ہر سال اپریل کی پہلی تاریخ سے اس کے منتظر رہتے تھے۔ اسے اپنی ان ننھی ننھی بہنوں کا خیال آ گیا جو ہمیشہ اس خیال میں مسرور رہا کرتی تھیں کہ "اب بھیا آئے گا" وہ محبت پر سب کچھ قربان کر سکتا تھا لیکن ان مقدس آنسوؤں کو ضائع نہیں کر سکتا تھا جو اس کی ماں نے اسے سینہ سے لگا کر بہائے تھے وہ ان معصوم اشکوں کو نہیں بھول سکتا تھا جو دمِ رخصت اس کی ننھی ننھی بہنوں کی آنکھوں میں مچلنے لگے تھے اور جنہیں انہوں نے [illegible] کے عالم میں اپنے ننھے ننھے پلوؤں میں جذب کر لیا تھا اس وقت اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے نہ وہ اپنی کرما سے دست بردار ہونا چاہتا تھا جس کی محبت اس کے دل کے گوشے گوشے میں پھیل چکی تھی نہ اپنی ماں سے منہ موڑ سکتا تھا جو اس کے لہو کی ہر ہر بوند میں سمائی [illegible] گردش کر رہی تھی ——— [illegible]

اس کی آنکھوں سے اس طرح آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی جیسے اب اس کے پاس ان آنسوؤں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا ۔ کرما کی آنکھیں [illegible] جانے وہ کیا سوچ رہی تھی ——— وہ حسرت بھری بھیگی بھیگی نگاہوں سے اپنی متاعِ حیات کو دیکھتا رہا اور [illegible] ——— کرما ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکی اس کی آنکھوں سے ایک سیل اشک بہہ نکلا جس میں اس کے سوال کا ہر ہر [illegible] رہ گیا!

ان الفاظ نے اس کے دل میں جو کھٹک پیدا کر دی تھی وہ بڑھ کر کسک بن گئی محبت کی ناکامیاں اس کے سامنے پیکر محسوس بن کر رقص کرنے لگیں۔ ———

(باقی آئندہ)

یوں دی جاتی تھی کہ مجرم تہ خانے میں بند کر دیا جاتا تھا —— لیکن اس کی روح کو کوئی آہنی بیڑی نہ پہنا سکا اور اس نے اپنی انمٹ لکھ ڈالی۔ اسی طرح ایک ایسا انبوہ آپ کو ملے گا جو جسمانی زحمتوں کے دشوار گذار خم و پیچ سے گذر کر فتح مندی کی اقلیم میں داخل ہوتا ہے۔ ان بلند مرتبہ اور سوماؤں کو نہ تو افلاس، نہ بیماری، نہ غلط فہمی، نہ جبر و اذیت کوئی روڑا اس کی راہ میں نہیں اٹک سکا —— اور یہ کہ جب انہوں نے چاہا تو اعلیٰ خیالات، سنہرے سپنوں اور بلند تصورات پیدا کئے اور پیدا کر کے رہے!

ہمیں آج کل ایسے اشخاص سے اکثر ملنا ہوتا ہے جو ایک قسم کی بیماری میں مبتلا ہیں، ہم تو اسے بیماری ہی کہیں گے —— یہ آج کل کی نوجوان نسل ہے، یہ سوچتی ہے اور ہر پہلو پر سوچتی رہتی ہے کسی ایک پہلو پر اسے قرار نہیں ملتا —— اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی معین لائحہ حیات تک نہیں پہنچتے اور ایک بےچینی، ہیجان اور بے کلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا علاج عمل میں زیادہ ہے نظریہ میں بہت کم۔ ہمیں چاہیئے کہ فوراً کسی نتیجے پر پہنچنے کی عادت ڈالیں اور ہمیشہ اپنے ماحول کا مطالعہ کرتے رہیں اور زندگی کو اس طرح ڈھالیں کہ وقت کی رفتار اور اس کی رفتار میں فرق نہ پڑے!

ہوقتی حادثوں پر جھنجھلا جانا اور نہ صرف جھنجھلانا اپنی آپ بوٹیاں کاٹنے پر اتر آنا بہت ہی مضر اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ صبر و ضبط کو شعار بنائیں وقت کی نزاکت کا احساس کرنا ہی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ ہے:

فرض کیجئے آپ ایک برق رفتار موٹر میں اڑے چلے جا رہے ہیں۔ آپ اطمینان سے سفر میں مصروف ہیں اور راستہ کے روح افزا مناظر لطف دے رہے ہیں کہ —— اچانک موٹر فیل ہو جاتا ہے —— اور ایسا کہ مجبور محض ہو کے رہ جاتے ہیں —— لمحہ بھر میں بیکار اور مجہول! —— مقام مقصود دور اور آپ مجبور —— !

یہی وقت آپ کی آزمائش کا ہے —— اس وقت بجائے جھنجھلانے اور چلانے کے سوچیئے کہ آپ کیسے گھر پہنچیں گے —— !

ہمیں ایسے ہی اشخاص سے مخاطب ہونا ہے ہم ان ہی سے کہتے ہیں کہ صبر و ضبط و تحمل پیدا کر لیجئے اور خلوص قلب سے وہ بات پیدا کیجئے جو واقعی بات ہے! —— یعنی راز زندگی کے لئے جئیں گے؟ اور جب جینا ہی ٹھہرا تو اچھی طرح کیوں نہ جئیں —— یعنی بقول شخصے انسانوں کی طرح کیوں نہ جئیں!!

(بقیہ صفحہ ۳۶ یہ ہے)

ضروری ہو کہ جتنا زیادہ ہمارا آئیڈیل بلند ہو اتنا ہی زیادہ اس کی سچائی کا یقین بھی ہمارے دل نشین ہونا چاہیئے۔

شہیدان قوم و ملک جن کا دماغ حب الوطن اور حب القوم کے پاک جذبات سے سرشار رہتا ہے اپنی کامل مرضی کے ذریعہ سے ایک ایسا بلند آئیڈیل پیش نظر رکھتے ہیں۔ اور پھر اپنے افعال سے اس آئیڈیل کی سچائی کو اس طرح سے ظاہر کرتے ہیں جس طرح سے کہ طرابلس و حبش اور روس کے لوگوں نے اپنے ملک کو بچانے میں ظاہر کیا۔ یہ تمام باتیں اعلیٰ آئیڈیل کی سچائی میں مضمر ہے۔

۴ —— کامل مرضی بہت کچھ عادت پر بھی منحصر ہے۔ مثلاً ایک شرابی نے عہد کیا ہے کہ وہ آیندہ کبھی شراب کو منہ لگائے گا اور اگر وہ اپنے اس عہد پر قائم رہا تو اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ ایک کامل مرضی کا مالک ہے۔ لیکن برخلاف اس کے اگر اس نے شراب کی خواہش میں آکر اپنا عہد توڑ ڈالا، تو اس کا یہ فعل خود اپنی ذات پر بھروسہ کی کمی ظاہر کرنے کے علاوہ اس کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ آیندہ بھی پینے کی عادت کے حکم کو مان لیا کرے۔ جس کا عملی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس میں بہائی کے مقابلہ کرنے کی قوت کم ہوتی جائے گی اس لئے ضروری ہے کہ انسان جب کوئی عہد کرے تو اس پر صدق دل سے عمل پیرا رہے۔ اور اگر ایک دفعہ بھی اس کی خلاف ورزی کی تو اس فعل کا نتیجہ خود اس کے لئے مضر ہوگا۔

۵ —— دعا۔ اس کے لئے ضروری یہ ہے کہ انسان خدا تعالیٰ پر پورا پورا یقین رکھے اور اس سے ہمیشہ توفیق چاہے کہ وہ اس کے عہدوں میں برکت دے ممکن ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوں، جو دعا کی قوت کے قایل نہ ہوں لیکن ایک مسلمان کو ایسا نہ ہونا چاہیئے۔ میں نے خود دعا کی وسیع طاقت کو محسوس کیا ہے اور میں کبھی اس کے اثر سے انکاری نہ ہوں گا۔ مسلمان کے معنی خدا تعالیٰ مرضی پر چلنے والے کے ہیں۔ لہذا ہر مسلمان کی یہ دعا ہونی چاہیے کہ خدا اسے رضاء الٰہی کے مطابق چلنے کی توفیق عطا کرے۔ اور حقیقت میں اس سے اعلیٰ اور کوئی بات نہیں معلوم ہوتی کہ انسان اپنی مرضی کو اس بلند مرضی کے ماتحت کر دے جس کی متابعت کائنات کی ہر چیز کرتی ہے۔

سلام و پیام

گدائے رسم محبت عروج ہے مت بھول
نوازشات "سلام و پیام" پیدا کر

بانو! تلوار پھینک دیجئے ـــ اور آنکھوں سے بجلیاں نہ گرائیے، شراب برسائیے! کتنا بڑا المیہ ہے یہ عصر حاضر کا ـــــ کہ بیٹا "ماں" کو "ننگا" کئے دے رہا ہے اور بیٹی "باپ" کو "بے آبرو"!! پھر یہ دونوں "بچہ رہے" پر کمر بستہ ہو کر مظاہرہ کرتے ہیں اپنے "رقص عریاں" کا ـــ اور سمجھتے ہیں کہ ایک دوسرے سے انتقام لے رہے ہیں ـــ ـــ ؟

مرد و عورت کی چپقلش ـــــ نہ باہر سکھ نہ گھر میں چین!!

عہدا انتقام سے گذر جائیے اور "پیمان محبت" باندھئے ـــــ!

زندگی عتاب و انتقام نہیں ـــــ محبت و مسرت ہے!!!

اے آپ کے نثار ـــــ! کیا بات کہی ہے آپ نے کہ ۱۴ یوم پہلے کو جی چاہتا ہے!! ۱۴ اگست اگر لاشعوری طور پر ۱۵ ار میں تبدیل ہو سکتی ہے تو دعا کیجئے کبھی ۱۵ ار اگست شعوری طور پر ۱۴ ار میں تبدیل ہو جائے ـــــ شرمندہ ہوں اور سائل بھی دور نہیں ـــ لیکن اس کو کیا کروں کہ "مزار" و "رسوائی" دونوں ہی محبوب ہیں!!

پردہ ـــــــ؟

مجھ سے نہ پوچھئے ـــــ میرے جواب سے حاصل ؟

زمانہ ایک تیز و تند دریا کے مانند بہہ رہا ہے ـــــ بہنے دیجئے ـــ ایک تجربہ ہی ہے! "تجربات" سے نہ گھبرائیے کہ یہی زندگی ہے ـــ اور زندگی ـــ نقصان نہیں!!

آپ کو حیرت ہیں اور مجھے آپ کی "محویت" پہ حیرت ہے ـــ:

غالباً رفیع اجمیری مرحوم نے اپنے کسی افسانے میں ایک جملہ لکھا تھا:ـ

"ان کے یہاں پردہ تھا مگر خاص نہیں بے پردگی تھی مگر عام نہیں"

"خاتون خانہ" اور "سبھا کی پری" میں آج بھی بہرحال ایک فرق تو موجود ہے۔ خوشگوار یا ناگوار؟ کون جانے؟؟ ـــــ آدمی افادیت پسند ہے ـــ غیر مفید راہوں پر زیادہ دور تک نہیں دوڑ سکتا ـــ اگر واقعی کچھ غیر مفید ہے تو انتظار فرمائیے +

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ

نفسیات پر ادارۂ اشاعت اردو کی مایۂ ناز کتابیں

تعمیر حیات

زندگی ایک فن ہے۔ مشہور امریکی ماہر نفسیات ڈیل کارنیگی اپنی مشہور کتاب "ہاؤ ٹو ون فرینڈز اینڈ انفلوئنس پیپل" میں اس فن پر بحث کرتا ہے ـــ تعمیر حیات اس کا اردو ترجمہ ہے ـــ!!! آپ ایک برتر انسان بن سکتے ہیں اگر آپ اس کو پڑھیں اور اس کی ہدایات پر عمل کریں۔ قیمت (للعہ)

شخصیت و کردار

آپ ایک نمایاں مؤثر شخصیت اور مضبوط کردار کس طرح پیدا کر سکتے ہیں؟ شیر محمد اختر کی یہ کتاب آپ کو تمام راہیں بتاتی ہے۔

قیمت:ـ (عـ۲)

نفسیات زندگی

فیض فطرت نے آپ کو وہ سب کچھ دیا ہے جو ایک کامیاب ترین انسان کو ـــ وہی دنیا وہی زندگی وہی توانائی وہی دل و دماغ ضرورت صرف ان سے کام لینے کی ہے یہ کتاب اس کشمکش حیات میں آپ کو پوری پوری مدد کرے گی ـــ قیمت:ـ ایک روپیہ بارہ آنہ عـ۱۲ر

بچوں کی نفسیات بچے ملک اور قوم کی مقدس امانت ہیں۔ یہ مستقبل کے معمار ہیں۔ ان کو سمجھئے اور ان کی صحیح تدریس کیجئے۔ قیمت:ـ (عـ۱۲ر)

تقدیر میں تقدیر آپ کے اعمال کا نتیجہ ہے اس راز کو سمجھئے اور اپنی تقدیر کے آپ معمار بنئے۔ قیمت:ـ صرف ایک روپیہ

ملنے کا پتہ

مکتبہ رزاقی نمبر روڈ ـــ کراچی ۲

غزلیات

ایک مشاہدہ

مسعود جاوید، بی ایس سی عثمانیہ

یہ جھجک یہ ہچکچاہٹ اس سے پہلے تو نہ تھی　　گفتگو میں یہ لگاوٹ اس سے پہلے تو نہ تھی
اس سے پہلے یہ کشش یہ جاذبیت تو نہ تھی　　اتنی پیاری اتنی سندر رخ کی رنگت تو نہ تھی
مسکراہٹ میں کبھی پہلے شرر دیکھا نہ تھا　　چشم میگوں میں کبھی ایسا اثر دیکھا نہ تھا
ان کو دیکھا تھا مگر اتنا حسیں دیکھا نہ تھا　　ماہ دیکھا تھا مگر ماہِ زمیں دیکھا نہ تھا
ہو گئے رخسار نازک مثلِ تو نازک از گلاب　　انکھڑیوں میں آ گئی ہو کھنچ کے انگوری شراب
اف یہ تخلیقِ جمال و رنگ تصویرِ شباب!　　کس قدر رنگیں تغیر، کتنا دلکش انقلاب!
دیکھتے ہی دیکھتے رنگین قبا گل ہو گئے　　مرکزِ جذب و کشش، جانِ تغزل ہو گئے

دو ہی دن میں وہ قیامت کا نمونہ ہو گئے
فتنہ نوخیز تھے کل، آج فتنہ ہو گئے

غزل

ظہیر فتحپوری

سکوں سا آج طبیعت میں پا رہا ہوں میں　　کہیں انہیں تو نہیں یاد آ رہا ہوں میں!
جلا رہا ہوں میں شمعِ امید و دیدِ حبیب　　کسی کو بزمِ تصور میں لا رہا ہوں میں
جنابِ عشق میں گستاخیاں معاذ اللہ!　　کسی کے حسن کا قصہ سنا رہا ہوں میں
نہ پوچھ، اشک ہیں وجہ سکونِ دل کیا نہیں　　لگا رہا ہوں کہ آتش بجھا رہا ہوں میں
رہِ طلب میں یہ صبر آزمائیاں توبہ!　　قدم قدم پہ ستارے بچھا رہا ہوں میں
کسی کی یاد بھی اب بار ہوتی جاتی ہے　　نہ جانے کون سی منزل پہ آ رہا ہوں میں
وہ اک لطیف تصور جو روئے دوست کا ہے　　اسی کو زیست کا حاصل بنا رہا ہوں میں

ظہیر ہجر میں ان کو بھلا رہا تھا، مگر
وہ آ گئے ہیں تو خود کو بھلا رہا ہوں میں

بیجا

حالِ دل قصہ، غمِ شکوہ، شکایت بیجا
ہے غلامی کی زباں جس کی حکایت بیجا
پہلے آپ اپنا تو بن، غیر پھر اپنا ہو گا
"افتراق" اپنا مٹا ہے یہ عداوت بیجا
تجھ کو "اقرارِ بلیٰ" کا نہ رہا پاس کبھی
پھر بھی تقدیر پہ رونے کی حماقت بیجا
اپنی کھوئی ہوئی "منزل" کی طرف ایک نگاہ!
راہرو غیر ہے، رہبر کی شکایت بیجا
نائبِ حق ہے مسلماں تو، مسلماں کے لئے
ہو جو مرہون کسی کی وہ سیاست بیجا
تو تصنع میں عبث کس لئے پڑتا ہے نہالؔ
وقتِ کردار یہ گفتار کی دعوت بیجا

نہالؔ مخدومی

غزل ——— مقبول جلیس

کیوں جدائی کے یہ گلے ہوتے
کاش مجھ سے نہ تم ملے ہوتے
تم نہ ہوتے اگر وفا دشمن
کیا وفا کے یہی صلے ہوتے
کاش چھڑتا فسانۂ خمِ زلف
گفتگوؤں کے سلسلے ہوتے
خیر آپ آ گئے گلستاں میں
ورنہ کیا کیا نہ گل کھلے ہوتے
خامشی پر یہ تہمتیں ہیں جلیسؔ
حشر اٹھتا جو لب ہلے ہوتے

خاص سائیکولوجی اردو کے لیے

فنِ خود تراشی

پروفیسر۔ کے۔ ایل۔ بھٹی ایم۔ اے۔

کسی زوال یا قیاس کو عموماً حقیقت واقعہ کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک دیرینہ عقیدہ جو ایک مدت سے ذہن نشین تھا تبدیل ہو جاتا ہے۔ آج تک زندگی اور خوشی کم از کم میرے نزدیک انتہائی مشکل تھے جو دو متوازی خطوط کا آپس میں ملنا نہ جانے کس تلخ تجربے نے مجھے یہ سبق پڑھایا تھا کہ انسان کا انسان ہونا اسے ہر خوشی سے محروم کر دیتا ہے۔

قید حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

چند دن ہوئے میرے ایک دوست نے نفسیاتی علم کے متعلق رائے زنی کرتے ہوئے کہا تھا "اگر ہم صحیح طور پر اپنے آپ کو سمجھنے لگیں اور اپنے خیالات اور افعال کے خود ہی نقاد بن جائیں تو یقیناً ہم اپنے "ذہنی توازن" کو قائم رکھ سکیں گے۔ ذہنی توازن دماغی صحت کا باعث ہوگا اور دماغی صحت باعث خوشی"۔ اس وقت تو میں نے اپنے اس عزیز کو اپنے اسی پرانے عقیدہ کے مطابق جواب دے دیا لیکن کچھ عرصہ بعد مجھے خود اپنے ہی عقیدے کے متعلق شکوک پیدا ہوتے ہوئے معلوم ہوئے۔ یہ بظاہر مہمل سا عنوان میرے ان ہی شکوک کا آئینہ دار ہے لیکن اس کے تحت خیال آرائی کرتے ہوئے میں وہ نظریہ پیش کرتا ہوں جس نے میرے پرانے عقیدے کی جگہ لے لی ہے۔

انسان ہونے کی حیثیت سے ہر شخص کو اختیار ہے کہ زندگی کے تین مختلف اقسام کے نقطۂ نظر میں سے کسی ایک کو اپنا لائحہ عمل بنا لے۔ سب سے پہلا نظریہ زندگی کے متعلق تسلیم و رضا کے فلسفہ کا حامل ہے۔ اس نظریہ کے ماننے والے زندگی کو بے نیازانہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ جینا ان کے نزدیک پیدا ہونے، کھانے، پینے اور مرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ اپنے اس فلسفہ کو 'قناعت' سے منسوب کرتے ہیں لیکن یہ سراسر غلط بیانی اور خود فریبی ہے۔ ان کی قناعت لاپرواہی کے مترادف ہے۔ وسیع کائنات، ماحول، اور دوسری مادی چیزیں ان کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ نہ انہیں تعلیم سے کوئی ربط ہے اور نہ کتابوں سے واسطہ۔ شلغم کی طرح اگنا اور بڑھنا ان کی زندگی کا واحد مدعا ہے۔

دوسرا نظریہ جو عوام زندگی کے متعلق رکھتے ہیں کاروباری حیثیت رکھتا ہے۔ بہت سے ایسے لوگ جو خود کو کاروباری سانچہ میں ڈھال چکے ہیں زندگی کے ہر ورق کو الٹنے سے پہلے اپنے آپ سے یہ سوال کیا کرتے ہیں "مجھے اس کام سے کیا حاصل ہوگا؟" ایسے ماحول میں خوشی محض "حریفانہ مقابلہ" بن کر رہ جاتی ہے اور صرف اس کی ملکیت بن سکتی ہے جو برسر اقتدار اور قوی ہو۔

زندگی کا تیسرا نظریہ "فنکارانہ" نظریہ ہے جہاں فنکار خود سے سوال کرتا ہے "میں زندگی کو کیا دے سکتا ہوں؟" اس نقطۂ نظر کے مطابق فرد بنی نوع انسان کے ساتھ اپنے رشتہ اور تعاون کو اور زیادہ مضبوط بنا لیتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا ان ہی لوگوں کو یاد رکھ سکی ہے جنہوں نے اپنی زندگی کو بنی نوع انسان کے ساتھ منسلک کر کے خود اس کی بہبودی کے لئے وقف کر دیا ہو۔ اس نقطۂ نظر سے ہم زندگی کے پہلوؤں کو جتنی زیادہ گہرائی سے دیکھتے ہیں ہمارا یہ یقین اتنا ہی زیادہ مستحکم ہوتا جاتا ہے کہ محض فنکارانہ نظریہ ہی زندگی کو صحیح مسرت دے سکتا ہے

زندگی کے اس فنکارانہ پہلو کو میں نے "خود تراشی" Self - Sculpture کا نام دیا ہے۔ ایک شخص کی موروثی جبلتیں، رجحانات اور جذبات خود تراشی کے لئے ناتراشیدہ اور خام مواد کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر شخص کو چاہیئے کہ اپنی وجدانیت کی اس چٹان کو جوڑ توڑ کر نقش و نگار کا ایسا نمونہ تیار کرے جو نہ صرف اس کے لئے خوشی کا باعث بنے بلکہ دوسرے لوگوں کے لئے باعث حیرت بھی ہو۔ اس طرح خوشی اور انبساط سے کوئی بھی محروم نہیں رہ سکتا

آزاد مصر

مؤلفہ حسن الاعظمی (من علماء الازہر)
(سابق پروفیسر مصری یونیورسٹی قاہرہ)

اس کتاب کی ابتدا فراعنہ سے کی گئی ہے جو تاریخ قدیم کے متمدن و ترقی یافتہ ملک کے حکمراں تھے۔ ان کے کارناموں کے بعد بتایا گیا ہے کہ کس طرح مصر مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تو بھی وہ بہترین تہذیب تمدن کی ترقی کی۔ کس طرح صلاح الدین یوبی نے یورپ کی تمام عیسائی حکومتوں کو جنگ صلیبی میں شکست دی۔ ترکوں نے مصر پر کیسے قبضہ کیا۔ نپولین مصر فتح کرنے کے بعد مصر سے کیوں متاثر ہوا۔ کس طرح محمد علی پاشا نے سلطنت عثمانیہ کو ختم کر کے مصر جدید کی بنیاد ڈالی۔ جمال الدین افغانی نے کیوں یہاں اسلامی تحریک شروع کی؟ وغیرہ۔ غرض اس کتاب میں مصر کی مکمل تاریخ مفصل پیش کی گئی ہے۔ آخر میں شاہ فاروق کی سیرت، نئے سیاسی، مصری ممتاز شخصیتوں اور وہاں کی موجودہ تحریکوں پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے

صفحات ۴۰۰ مجلد مع گردپوش۔ قیمت آٹھ روپے [illegible]

فاران لمیٹیڈ ناشران کتب، کراچی



اسلام کے مشہور سپہ سالار

حصہ اوّل

مُصنفہ

عبدالواحد سندھی

مسلمان گھر کے اندر، گھر کے باہر، دورانِ جنگ میں، امن کی حالت میں، اپنے ساتھ دوسروں کے ساتھ، شاہی تخت پر اور خاک کے بستر پر، غرض ہر جگہ اور ہر حالت میں سپاہی ہے۔ اس سپاہی کو اسلام میں "مجاہد" کہتے ہیں۔ اسلام کی پہلی فوج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکردگی میں "بدر" کے میدان میں لڑی تھی۔

اس حصہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علیؓ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاصؓ، حضرت خالدؓ بن ولید، حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح، حضرت زیدؓ بن حارثہ، حضرت عمروؓ بن العاص اور حضرت اسامہؓ بن زید کے جنگی کارنامے اس انداز سے ترتیب دیئے گئے ہیں، کہ ان واقعات کو پڑھ کر عزم راسخ، دلیری اور یقین محکم کا سبق حاصل ہو اور قوم کا ہر فرد اسلام کا بہترین سپاہی بنے، یہ کتاب سادہ اور عام فہم زبان میں لکھی گئی ہے۔ بچوں، بچیوں اور بڑوں سب کے لئے اس کا پڑھنا ضروری ہے۔ کاغذ ولایتی، لکھائی چھپائی عمدہ، گردپوش سے مزین۔ قیمت ۲/۸

فاران لمٹیڈ ناشران کتب کراچی

PSYCHOLOGY

EALTH · HAPPINESS · SUCCES



هنگامه حیات

انگلستان کے مشہور نفسیاتی ماہنامہ کا اُردو ایڈیشن







بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ

سائیکولوجی

اردو

جلد ۱   اکتوبر ۱۹۴۹ء   نمبر ۹

ادارۂ تحریر

* سعیدہ عروج ایم۔ اے، بی۔ ایڈ
* حسن محمود عروج

[illegible] حامد [illegible]

مدیر عمومی

* انعام اللہ خاں بی۔ اے، بی۔ ایل

معتمد عمومی

علاء الدین خالد

قیمت فی پرچہ { پاکستانی سکہ آٹھ آنے / ہندوستانی سکہ گیارہ آنے چھ پائی

سالانہ چندہ: سکۂ پاکستان چھ ر[illegible]

دفتر

"سائیکولوجی اردو" پوسٹ بکس نمبر ۵۶۶ کراچی نمبر ۲

مندرجات

پہلی نظر
سائیکولوجی کیا ہے
فلسفہ اور فلسفی
زندگی کا راز زندہ دلی میں مضمر ہے
ماحول کا اثر بچوں پر
غزلیات
قیادت
رجائی اور قنوطی
آپ کا بچہ
امید کے چراغ
تحت شعور
اہتمام حیات
سلام و پیام
فرار

پہلی نظر

حادثہ

سائیکولوجی کا یہ شمارہ ایک ایسے عالم میں نکل رہا ہے کہ جب زندگی بہ ظاہر عنوان درد بنی نظر آرہی ہے زندگی میں حادثات کی کمی نہیں ہر قدم پر ایسے ایسے سانحات سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ "دم نکلنے" کی نوبت ہوتی ہے ——— ہرچند کہ مُشکلات کی زیادتی مشکلات کو آسان بنادیتی ہے آدمی مشکلات کا عادی بن جاتا ہے، "چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا بحر حوادث میں" لیکن۔ ٹھیک اسی وقت جب آدمی بحر حوادث سے ہنستا کھیلتا گذرنا چاہتا ہے تو اسی بحر حوادث سے کوئی ایک آدھ موج ایسی بھی اُٹھتی ہے کہ آدمی تھوڑی دیر کے لئے مفلوج ہوکر رہ جاتا ہے، دل پر ایک چوٹ پڑتی ہے۔ آنکھوں میں باوجود ضبط و تحمل کے آنسو آجاتے ہیں! اور اس وقت ذہن و دماغ کی ساری توانائیاں جیسے کچھ سمجھنے سے انکار کردیتی ہیں۔ جدوجہد آخری ہچکی لیکر سانس توڑ دیتی ہے۔ آدمی بے رحم "تقدیر" کے ہاتھوں بے بس ہوکر رہ جاتا ہے جیسے کوئی مفلوج و مجبور ہستی ——— حالانکہ ایسا نہیں ہوتا، جو کچھ ہوتا ہے انسان کا کوئی نیا تجربہ نہیں ہوتا۔ نسل انسانی کافی پرانی ہے اور ہر تجربہ سے گذر چکی ہے، آدمی کو یہ جو حادثات پیش آرہے ہیں ان میں کوئی نئی بات نہیں، ہمارے اپنے دل و دماغ کی کمزوری ہے کہ ہم اُن کو شدید سمجھ رہے ہیں۔ اگر ہم حادثات کو ان کی صحیح روشنی میں دیکھنے کے عادی ہوجائیں تو ہمیں یقیناً سکون حاصل ہوجائے گا کوئی مشکل اتنی شدید نہیں ہوتی جتنی ہم محسوس کرتے ہیں کوئی حادثہ ایسا نہیں ہوسکتا جو ہم کو مفلوج کردے تاآنکہ ہم غلط امید کے چراغ نہ روشن کرلیں۔

آدمی کو ہمیشہ پُرامید رہنا چاہیئے لیکن غلط امید ایک "جرم" ہے جس کی سزا فطرت بڑی سختی سے دیتی ہے، قانون فطرت میں معافی کی کوئی دفعہ موجود نہیں وہ اپنے مجرموں کو انتہائی بے دردی سے سزا دیتی ہے، اگر ہم غلط امیدیں نہ باندھیں تو ہماری بہت سی مشکلات اور ہمارے غم خود بخود کم ہوجائینگے ——— ورنہ

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

ایک بچہ اگر آسمان کا چاند اپنی مٹھی میں بند کر لینا چاہتا ہے تو یہ صرف اس کا بچپنا اور علم و تجربہ کی کمی ہے ——— اس کے نالہ و نوحہ کے باوجود بھی چاند اس کی مٹھی میں نہیں آسکتا۔ غلط امیدوں کے چراغ بجھا دیجئے۔ زندگی خود بخود روشن ہو جائے گی۔ اگر آپ نے غلط امیدوں کے دیئے جلانے شروع کر دیئے اور انسانی "علم و عرفان" پر حذبات کی چادر لپیٹ دی تو کبھی سکون نہیں مل سکتا۔

اعتذار

اس مرتبہ بعض غم انگیز وجوہات کے باعث "آپ بھی سوچئے" اور "بات چیت" کے مستقل عنوانات حذف کرنے پڑے ہیں۔ قارئین کرام سے معافی خواہ ہیں کہ یہ ضروری عنوانات شائع نہیں ہو رہے ہیں۔

انشاءاللہ ہم آئندہ اشاعت میں اس کی تلافی کر سکیں، اگلے شمارے میں "عیار نظر" کے عنوان سے ہم سائیکولوجی سے متعلق اپنے قارئین کی رائیں اور نقد و تبصرہ بھی پیش کر رہے ہیں ——— تاکہ آپ محسوس کر سکیں کہ آپ کا سائیکولوجی کس حد تک مقبول ہو رہا ہے ———

خدا کا شکر ہے کہ اب تک قارئین کرام نے سائیکولوجی پسندیدگی اور عنایت کی نظروں سے دیکھا ہے آپ بھی اپنے مشوروں اور آراء سے سرفراز فرمائیے، صرف ہماری خوبیاں نہ سامنے لائیے بلکہ سختی سے تنقید فرمائیے کہ ہم آپ کے رسالے کا معیار زیادہ سے زیادہ بلند کر سکیں +

محبت اور سلطنت دو جداگانہ چیزیں ہیں۔
آج پہ قانع نہ رہو اور کل کو تلاش کرو۔
پھولوں کی طرح ہنسو اور کلیوں کی طرح مسکراؤ۔
سکون اطمینان بازار عالم میں ایک جنس نایاب ہے۔
آنسو کا نکل آنا محبت والی آنکھوں کے اختیار سے باہر ہے

سائیکولوجی کیا ہے؟

(مولانا عبدالماجد دریابادی)

آپ اگر کسی محکمے کے افسر ہیں، تو یہی چاہتے ہیں کہ آپ کے ماتحت کام خوشی اور خوش دلی سے، زیادہ سے زیادہ مقدار میں کریں، اور ہمیشہ آپ ہی کا دم بھرتے رہیں — اس کے برعکس اگر آپ ماتحت ہیں، تو آپ کی عین آرزو یہی رہتی ہے کہ آپ کے افسر آپ سے زیادہ سے زیادہ خوش رہیں — اور آپ کے کام کی اور اہلیت کی تعریف کرتے رہیں — استاد یہ چاہتا ہے کہ لڑکوں کی مزاج شناسی زیادہ سے زیادہ حاصل کرے — اور لڑکے اس فکر میں رہتے ہیں کہ استاد کے رنگ طبیعت سے ناواقفیت ذرا سی بھی نہ رہ جائے — قوم کے لیڈر یہ چاہتے ہیں کہ عوام کی بڑی سے بڑی تعداد کو اپنے قابو میں لائیں، اور عوام کی بھی خواہش یہی رہتی ہے کہ اپنے محبوب لیڈروں کی ایک ایک مرضی پہچانتے رہیں ——— میاں بیوی، باپ بیٹے، دکاندار اور گاہک، استاد و شاگرد، غرض ہر انسانی رشتے اور تعلق میں، زندگی کے ہر شعبے اور گوشے میں سب سے بڑی اور پہلی ضرورت انسان کو انسان کے سمجھنے کی پیش آتی رہتی ہے اور یہی انسان شناسی یا فطرت بشری کی فہم جب ایک باقاعدہ و منظم شکل میں آگئی، جب فنی ضابطوں اور علمی قاعدوں کے اندر یہ مرتب ہوگئی تو اسی کا نام سائیکولوجی یا نفسیات یا علم النفس ہے

اپنی صحت جسمانی سے متعلق گنوار سے گنوار دیہاتی بھی کچھ نہ کچھ ضرور جانتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو پڑھے لکھے شہریوں سے زیادہ اور بہتر ہی جانتے ہیں — لیکن انہیں متفرق معلومات کو جب اضافے کے بعد ایک ضابطے کے ساتھ مرتب کر دیا جاتا ہے، تو اس کا نام "فن طب" پڑ جاتا ہے — گفتگو میں دلیل و استدلال سے کام عامی و عالم سب ہی لیتے ہیں، اور مقدمات سے صحیح نتائج تک اکثر عوام بھی پہنچ جاتے ہیں — اسی چیز کو جب علمی اصطلاحات کے ساتھ قاعدوں اور ضابطوں میں لے آیا جاتا ہے تو اسی کا نام "منطق" پڑ جاتا ہے — یہی حال نفسیات یا سائیکولوجی کا ہے — دنیا میں علمی نفسیات سے کام کم و بیش ہر شخص لیتا ہے، اور جو جس پیشے میں جتنا زیادہ کامیاب و مشہور ہے کہنا چاہیئے کہ اسی قدر نفسیات بشری سے زیادہ واقف ہے — یہ اور بات ہے کہ وہ فن کی اصطلاحوں سے ناواقف ہو اور عالموں کی زبان نہ بول سکے — انسان کا اپنی باتوں میں بڑا جی لگتا ہے — قصے کہانیوں کے سننے میں وہ محو ہو جاتا ہے، اس لئے کہ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی اپنے ہی سے دل و دماغ، ہو بہو ویسی طبیعت و مزاج رکھنے والوں کے کارنامے اور سرگزشتیں ہوتی ہیں — بڑے ہو کر اپنے بچپن کی باتیں سننا بہت ہی بھلی لگتی ہیں — اور اپنی آپ بیتی سنانے میں خاص مزہ آتا ہے ——— یہی فطری اور طبعی شوق نفسیات کی کتابوں میں ایک علمی رنگ میں پورا ہوتا ہے اور اپنے ہر خواب کی، ہر خیال کی، ہر شوق کی، ہر عادت کی، ہر ریاضت کی، ہر غم کی، ہر مسرت کی، ہر سعی عمل کی، تعبیر و توجیہ ملنے لگتی ہے

آج جس علم کا نام نفسیات ہے، اس کے شروع میں بحثیں احساس اور ادراک کی آتی ہیں — اور محسوسات و مدرکات سے مراد وہ معلومات ہیں جو حواس ظاہری آنکھ، ناک، کان وغیرہ کے ذریعے سے حاصل ہوتے ہیں — اگلوں کے نزدیک انسان کے حواس ظاہری پانچ تھے — باصرہ، سامعہ، لامسہ، شامہ — ذائقہ — اب پچھلوں نے تجربہ کا [illegible] کے بتایا ہے کہ حواس انسانی کی تعداد ان سے بہت زیادہ ہے اور گرمی سردی، سختی نرمی، بھوک پیاس، درد وغیرہ سب کے احساسات کا تعلق حواس ہی سے ہے — اور ان سب حواس کی تعداد ابھی تک غیر متعین ہے۔

نفسیاتی زندگی میں ایک بڑا [illegible] — نفس کا ایک طبعی خاصہ یہ ہے کہ ایک خیال دوسرے خیال سے، ایک تصور دوسرے تصور سے کوئی علاقہ یا ربط رکھتا ہے — کبھی ایک خیال دوسرے خیال کے ساتھ چلتا پھرتا، ان سے پیوست ہو جاتا ہے اور کبھی اس سے بھاگتا، گریز کرتا ہے — بہرحال کسی نہ کسی طرح کا علاقہ ضرور رکھتا ہے اسی کو قانون ائتلاف کہتے ہیں — اس کی رنگا رنگیوں کو بیان کرنا بھی نفسیات کا ایک اہم عنوان ہے — چیزوں کی

دماغ میں وابستگی یہیں سے پیدا ہوتی ہے ۔ اور حافظے کی جڑیں یہیں جگہ پکڑتی ہیں اور حفظ ہی کے ساتھ لزوماً بحث استحضار کی بھی چھڑ جاتی ہے ۔ سہو و نسیان کی شاخیں بھی اسی اصل سے پھوٹتی ہیں ۔

احساس، ادراک، ائتلاف، حافظے کی منزلوں سے گذرنے کے بعد قدرتاً ذہن کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ نئے نئے مسائل کے حل کرنے اور جزئیات سے کلیات تک پہنچنے یا کلیات سے جزئیات تک واپس آنے کی کیا کیا صورتیں ہوتی ہیں یا ان کے کیا کیا قاعدے ضابطے ہیں یا اس کے جواب میں نفسیات کی کتابوں میں تعقل تخیل استدلال وغیرہ کے ابواب سامنے آتے ہیں ——————— "ذہن" محض کا لفظ ہم میں سے ہر شخص بولتا ہے اسی سلسلے میں اس کے مفہوم اور "ذہانت" پر بھی مستقل باب فن کی کتابوں میں ملتا ہے ۔

یہ بھی ہر ایک کا تجربہ ہے کہ احساس و ادراک، تعقل و استدلال کے علاوہ ہم غم و مسرت، خوف اور غصہ وغیرہ سے بھی برابر متأثر ہوتے رہتے ہیں اور یہیں سے یہ ہے کہ نفسیات کی کتابوں میں جذبات سے بحث مزید ہوتی ہے ۔

لیکن نفس بشری میں وقوفی اور جذبی دونوں کیفیات سے بڑھ چڑھ کر ایک چیز عمل اور سعی عمل کی موجود رہتی ہے یعنی زندگی میں بہت سے اعمال ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں بغیر ہم کسی اہتمام و قصد کے گویا از خود کسی اندرونی تقاضے سے مجبور ہو کر کر گذرتے ہیں ۔ ان اندرونی تقاضوں کے لئے ایک عام نام جبلت ہے ۔ یہ تقاضے وراثت کی راہ سے آتے ہیں اور ان میں کسب و اکتساب کو دخل نہیں ہوتا البتہ سیکھنے سے جبلتوں میں ترمیم ہوتی رہتی ہے، اس لئے قدرتاً نفسیات میں بحث، عادت اور اعمال اکتسابی کی بھی آجاتی ہے اور پھر ان اعمال کی جو تمام تر ارادے کے محکوم ہوتے ہیں ۔

نفسیات کا تعلق کچھ دیکھو تو ہر ایسے علم کے ساتھ ہے جس کا موضوع انسان ہے لیکن بعض فنون کے ساتھ اس کا تعلق خاص طور پر گہرا اور قوی ہے ۔ نمبر اول پر طب ہے ۔ ہسٹیریا، خفقان، مالیخولیا، جنون کے مختلف اقسام ضعفِ حافظہ وغیرہ دماغی، خیالی، عصبی امراض کثرت سے ایسے ہیں، جن کی تشخیص اور علاج دونوں میں نفسیین ہی کا مشورہ کارگر ہو سکتا ہے

قانون سے بھی نفسیات کا تعلق کچھ کم گہرا نہیں ۔ ارتکاب جرم میں نیت کا دخل کہاں تک ہوتا ہے ؟ احمق اور بے عقل پر ذمہ داری کس حد تک اپنے قول و عمل کی عائد ہوتی ہے ؟ گواہ اگر اختلال حواس میں مبتلا ہے تو اس کی گواہی کس حد تک قابل اعتبار ہو سکتی ہے ؟ مجرم کی ذہنیت کیا ہوتی ہے ؟ مدعی کی نفسیت اور مدعا علیہ کی نفسیت میں فرق کیا کیا ہوتا ہے اور اشتراک کہاں تک ملتا ہے ؟ جذبات کا اثر گواہوں اور فریقین مقدمہ کے بیانات پر کیا پڑتا ہے اس قسم کے بیسیوں قانونی اور عدالتی سوالوں کا جواب نفسیات ہی سے مل سکتا ہے

تیسرا قریبی تعلق رکھنے والا فن تعلیم ہے ۔ تعلیم و تربیت کا دار و مدار ہی طالب علم کی فطرت شناسی پر ہے ۔ اس لئے نفسیات کی ماہیت معلم یا استاد کے لئے بالکل ظاہر ہے ۔ توجہ انضباط، حافظہ، استحضار تعقل، ادراک، استدلال عادت، مشاہدہ، جذبات، ارادہ کہنا چاہیے کہ ساری ہی نفسیاتی بحثوں کا تعلق تعلیمات سے ہے اور ایک معنی میں کہا جا سکتا ہے کہ نفسیات ساری کی ساری تعلیمی ہی نفسیات ہے +

فلسفہ اور فلسفی

پروفیسر جوڈ سے "معانقہ" کے بعد!

فلسفہ کے متعلق آج تک بہت سے نظریے رہے ہیں ——— کوئی اس میں ٹھوس پن اور خشکی پاتا ہے کسی کو اس کے انداز نہیں بھاتے

اور کوئی لانگ فیلو جیسے مشہور شاعر کے اشعار کو یوں الٹ کر لطف لیتا ہے :-

بڑے آدمیوں کی زندگی ہمیں اس حقیقت کا احساس دلاتی ہے

کہ ہم بھی اپنی زندگی میں عظمتیں اور بزرگیاں پیدا کر سکتے ہیں!

لیکن ان کے اختلافاتی الفاظ ———

ان میں حقیقت کم اور فاعلاتن فاعلاتن زیادہ ہے!

مجھے فلسفہ بیحد پسند ہے اور اسی سلسلہ میں سوچ کے اکثر دورے مجھ پر پڑتے رہتے ہیں ——— میں نفسِ فلسفہ کی چھان بین میں آدھ گھنٹہ سر کھپاتا رہا

موزوں تشریح مجھ سے باہر ہو کر رہ گئی تھی لہذا طے کر لیا کہ کسی فلسفی سے ملنا چاہیئے ———

! ———

اور میں جا رہا تھا ——— !

میرے ہاتھ میں ٹوپی تھی، قدم اُٹھ رہے تھے "شوق میرے سینے میں ہے" کی دھن میں ———

میں جا رہا تھا موجودہ زمانہ کے بہت بڑے فلسفی سے ملنے ——— شرفِ ملاقات حاصل کرنے ———

میرا دماغ منتشر خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا ———

میں اپنا سارا فلسفہ علم اس کے آگے کھول کر رکھ دوں گا ——— اور اس کی آنکھوں میں اس روشنی کی تلاش کروں گا جو اس کی فلسفیانہ

ذہنیت اور بصیرت کی جان ہے ——— !

میں دیکھوں گا وہ کس طرح رہتا بستا ہے ؟

میں دیکھوں گا کیا اس میں اور عام آدمیوں میں کوئی فرق ہے ؟

ہیمپسٹیڈ ہیتھ کے پھیلتے دامنوں پر ایک اعلیٰ درجہ کے اسٹڈی روم میں کتابوں سے گھرا ہوا وہ بیٹھا تھا — معروف — سرسبز و شاداب

درختوں کی ایک مسلسل قطار سے گذرتا ہوا، اُن کی گھنی گھنی چوٹیوں کے حسن کی بہار دیکھتا ہوا میں بقول الگزینڈر سلکرک Alexander Selkirk

"اس شہنشاہ کے حضور پہنچ گیا تھا جو اپنی پُر سکون تنہائیوں کا بادشاہ ہے! اور مجھ پر چند حقیقتوں کے دروازے کھل گئے ——— علم و یقین کی روشنیاں

ان میں پھوٹ پڑیں ———

"اس سکون و شانتی میں کوئی ہستی مخلِ انداز نہیں ہو سکتی ——— !"

"کوئی نہیں ——— !"

یہ ہیں پروفیسر سیرل جوڈ Professor Cyril Joad :

ریڈیو کی لہروں اور گراموفون ریکارڈوں کی تختیوں نے اس ہستی کی عظیم الشان یادگاریں ——— ان کی تقریریں محفوظ کر لی ہیں ——— ! مائکروفون سے ٹکرا کر جب یہ دبنگ اور پُر رعب آواز جس کو علمیت کے ٹھوس تجربات نے کافی وزن دار بنا دیا ہے سامعین کے کانوں تک پہنچتی ہے تو ان پر روح کو تابندہ و تابناک کر دینے والا جذبہ طاری ہو جاتا ہے ———

خدا کی قسم اس حقیقت کا ایقان ہو جاتا ہے کہ علم کتنی عظیم نعمت ہے ——— !

——— !

——— !

اونچے قد، بھرے بھرے جسم اور مضبوط سینہ گٹھل بازو والا یہ فلسفی جب عین مقابل میں کھڑا ہوتا ہے تو شخصیت کے رعب و داب کی لا شعاعیں انسان کو مرعوب کر دیتی ہیں ——— یہ حسن شخصیت اس وقت اور دوبالا ہو جاتا ہے جب وزنی قدموں سے ہمارا فلسفی قدم انداز ہوتا ہے ——— ایسا محسوس ہوتا ہے جو قدم پڑ رہا ہے وہ ایمان و ایقان کی ساری توانائیوں کو سمیٹ کر اٹھ رہا ہے !

پروفیسر جوڈ کی شخصیت کے اہم عناصر ان کی روشن پیشانی ——— جو ایک منور علمی تجر کی کھلی دلیل ہے ——— اور وہ جاندار ہیرے کی کینوں کی طرح چمکتی آنکھیں ہیں جنکی جوانی اور زندہ دلی لائق صد رشک و ہزار حسد ہے ! غرض مجملہ پروفیسر جوڈ کی پوری ہستی ہیں اکاون سالگی کا کوئی احساس سوائے سفید بالوں کے نہیں البتہ ایک زندگی ہے جس کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے ——— ایسی زندگی کا جس میں زندگی اور زندگی کی تمام رعنائیاں موسم بہار کے خوش رنگ اور بصیرت نواز پھولوں کی طرح کھلی پڑتی ہوں ——— !

"جیسے مجھ میں روح ہی نہیں تھی !"

پروفیسر جوڈ کوئی "فطری تجربہ" نہیں ہے ——— اپنے بچپن ہی سے اس میں کوئی ایسی خاص بات نہ تھی کہ لوگ اس میں "جوہر" کی جگمگاہٹیں دیکھ پاتے ——— بلکہ ایک دفعہ تو "ذہنی امتحان" Brains Trust میں اس بُری طرح صفر رہا ——— البتہ شیکسپیئر پر تبصرے ضرور لکھتا رہا ——— !

"میں ؟" اس کی شخصیت اس کی نورانی مسکراہٹوں سے منور ہو جاتی ہے جب وہ کہتا ہے "مجھ میں ذرا بھی تعلیم پذیریت نہ تھی ——— جیسے مجھ میں روح ہی نہیں تھی !" بہرحال کچھ ہو اس "بے روحیت" کے باوجود اُسے نمایاں کامیابی ہوتی رہی !

وہ اب بھی تعلیم کے بارے میں بہت عجیب و غریب خیالات کا حامی ہے ——— وہ کہتا ہے ——— اس "امتحان مخالف" زمانے میں بھی کہ "امتحان بہت ہی مفید چیز ہیں" اور وہ چاہتا ہے کوئی ایسا نظام تعلیم وجود میں آئے جو جانبداری اور اقربا نوازی" کے جراثیم کو طلبہ سے نکال سکے تاکہ ایک پاکیزہ اور انصاف پسند ماحول وجود میں آئے رہ گیا "کردار" ——— تو وہ کہتا ہے "جماعتی احساس" سب سے ضروری عنصر ہے ——— اور یہ روشن خیالی اور وسیع الذہنی کا شاہکار ہوتا ہے ! ——— وہ معاشرہ کی اصلاح کے لئے لڑکوں کی جسمانی تربیت کا بہت حامی ہے "کھیل" کے بارے میں اس کا کتنا عمدہ خیال ہے اس سے اندازہ لگائیے ——— کہتا ہے "وہ اس کی شخصیت کو (کھلاڑی بچہ کو) اس سے علیحدہ کر کے ایک نفسیات دان کو دروازہ پر لا کھڑا کرتے ہیں !"

"They have the merit of taking him out of himself and keeping the psychoanalyst from the door!"

اور واقعہ یہ ہے کہ اچھے اور صحت مند کھیل اصلاح نفس کا بہترین ذریعہ ہیں !!

افلاطون سے اپنے وقت کے افلاطون کو بڑی عقیدت ہے —— اس کی جھلک اس کی ہر کتاب ہر تحریر میں پائی جاتی ہے ——

"اگر آپ افلاطون ہوتا" میں نے سوال کیا" تو میں اس سے پوچھتا کہ کیا اس کا فلسفہ صحیح اور قابلِ عمل ہے ؟"

"بالکل ——" وہ پائپ سے راکھ جھاڑ کر صوفے پر سیدھا ہو بیٹھا" واقعہ یہ ہے کہ افلاطون حرف بحرف صحیح ہے ——" قبل اس کے کہ میں اس سے پوچھتا کیوں اس نے اطمینان سے کہنا شروع کیا اور وہ ایسے کہ وہ کہتا ہے کہ بادشاہوں کو فلسفی اور حکیم ہونا چاہیئے ؟ —— یہی کہتا ہے نا ؟" میں نے آنکھوں کے سمجھتے ہوئے سر ہلا دیا "بالکل"

میں اس لئے ہاں میں ہاں نہیں ملا رہا ہوں کہ میں بھی فلسفی ہوں —— اس کا مطلب یہ تھا کہ بادشاہوں میں انتہائی بالغ نظری سے کام لینے کی صلاحیت ہو، وہ قوم کی بھلائیوں اور برائیوں پر نظر رکھتے ہوئے ہر قدم سوچ کر اٹھائیں حتیٰ کہ ذاتی اور شخصی جاہ و جلال کے سمندر میں ڈوب جائیں —— یہ آج بھی ایک حقیقت ہے !"

مسرت !!

پروفیسر جوڈ کا خیال ہے انسانی مسرتوں کے راستہ میں دو بڑی مصیبتیں حائل ہیں ——

ایک "مشین" —— دوسرے فطرت انسانی" !

مشینوں کے خداوند انسان کے ہاتھوں کی خلاقی و ایجادی کے منکر ہیں —— اور بحیثیت انسان کے ان کے ہوس بھرے دلوں کا ارمان ہے کہ وہ ان لوہے کے ٹکڑوں میں گوشت کی کتنی ایسی مقدار ڈال دیں کہ سونے کے ڈھیر لگ جائیں ——[1] !

اور ادھر گوشت کے انسان یہ نہیں چاہتے کہ اپنی" خلاقیت" کو کسی لمحہ ضائع کریں —— انہیں فاقہ قبول ہے لیکن اپنی صلاحیتیں کھونا ہرگز گوارا نہیں —— اور جھگڑا طے نہیں ہوتا۔ —— سماج میں بہتر معاشرہ کی داغ بیل پڑ نہیں سکتی ——

"اور دراصل مسرت کا راز" —— وہ کہتا ہے " اس میں نہیں ہے کہ کوئی غمگین ہے کہ نہیں ہے —— بلکہ انسان میں اگر قوت عمل باقی ہے تو پھر مسرت بھی باقی ہے ورنہ از کار رفتہ ہو جانا انسان کی موت کا پیغام ہے —— !"

"ترقی !" میں نے پوچھا

"ہاں —— ترقی ——" وہ سمجھ گیا کہ میں کیا پوچھنا چاہ رہا ہوں " شاذ ہی میں نے سنا ہے کہ کسی کو ترقی ملی اور وہ مسرور نہیں ہے —— لیکن ترقی میں بھی اعتدال لازمی ہے ورنہ ہمارا سر اور پیر اتنا بھاری ہو جاتا ہے کہ نہ ٹوپی سر پر آتی ہے نہ پیر جوتوں میں سما سکتے ہیں —— اور ان حالات میں کوئی ایسا" ناکام" نہیں ہوتا جیسے ترقی !!"

حکومتی نظم وضبط

پروفیسر جوڈ سے جس زمانہ میں میری ملاقات ہوئی ہے وہ جنگ عظیم کا زمانہ تھا —— اور ان ہی دنوں لیبر پارٹی کی طرف سے وہ وسٹمنسٹر westminster میں داخل ہو رہا تھا —— میرے پیش نظر اس کی زندگی کا یہ پہلو بھی تھا ——

"کیا آپ کو پسند ہے کہ تعلیم، آرٹ، تھیئٹر سب حکومت کے انتظام اور قبضۂ اختیار میں رہے !"

"ہاں بشرطیکہ جمہوریت پسند حکومت ہو !" جاندار آنکھیں بجلیاں بکھیر رہی تھیں —— اس لئے کہ عوام پر بار پڑتا ہے تو وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے لگتے ہیں —— اگر میرا اختیار ہوتا تو میں ایک ریڈیائی اعلان کرتا کہ جنگ اسی وقت ختم ہو جائے۔ جیسے ایک

---

[1] اقبال کے ایک ایسے ہی مقام کو یاد کیجیے —— لیکن پُر لطف انداز میں نقشے کے متعلق کہتا ہے ؎

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں — تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے ؟

[2] علامہ اقبال کے اس شعر کا لطف اٹھایئے ؎

اک شور ہے مغرب میں اُجالا نہیں ممکن — افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش !

ریڈیائی اعلان سے شروع ہوئی تھی ——— اور اس طرح میں اس کو ایک کھلی حقیقت بتا دیتا کہ یہ تصور کر لیا جائے چھ مہینے اور جنگ ہو رہی ہے ——— آج جو تیرہ کروڑ روزانہ کا خرچ ہے وہ ان چھ مہینوں میں تعمیرات، زراعت، طباعت، آرٹ اور سائنس کی ترقیوں پر اسی حساب سے خرچ کیا جائے ——— اور ساری دنیا حسن کارانہ عمارتوں، صاف ستھرے شہروں اور فکر و عمل کی ایک جیتی جاگتی بستی بن کر رہ جائے ——— ! اس معاشرہ میں خیر و شر کے مسائل صرف اس حد تک ہوں کہ تزکیۂ نفس کا سوال حل ہو جائے ——— باقی کچھ نہیں ——— خلوص، محبت اور ایک پرجوش جذبۂ عمل اس دنیا کی روح رواں ہو ——— !"

میں یہ سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا ———

ایک نظام نو ——— عہد نو ——— ایک نیا زمانہ ——— جنم لے رہا ہے ——— لیکن کس سادگی کے ساتھ چند الفاظ میں مقید ہو گیا ہے ——— گویا جادوگر کی مٹھی ہے کہ کھلی اور ایک حسن آباد ہتھیلی پر آباد ہو گیا !!

آخر اس دماغ پر کس کا اثر ہے ؟ ——— کیا کسی یونانی ذہنی دیوتا کا ——— یا ہمارے زمانہ کی وہ کونسی ہستی ہو جس نے اس ذہنیت کو جنم دیا ——— اور ایک لمحہ کے تذبذب کے بغیر پروفیسر جوڈ نے جواب دیا ——— شا !"

شا ——— انسان عظیم"

"جارج برنارڈ شا" پروفیسر جوڈ کہہ رہا ہے " میرے وقت کا بڑا ——— بلکہ میرے نزدیک سب سے بڑا آدمی ہے ——— میں جب اس سے ملا ہوں تو خدا کا شکر ہے کہ وہ ایک بھیانک وہم ثابت نہیں ہوا ——— وہ میرے لئے میرے تصوری شا سے دس گنا شادماں، دس گنا قوت حیات سے بھرپور، دس گنا مسرور کن ہستی ثابت ہوا میرے نزدیک وہ اس انداز سے اثر انداز ہوتا ہے جیسے اس میں ایک سخت قسم کی ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہو اس کے ساتھ ساتھ وہ بے تکلف اور رحیم المزاج بھی ہے۔

"ڈرامے میرے لئے ایک بہت بڑا سرچشمۂ مسرت ہیں ——— وہ میرے عہد کا بہترین نثار، بہترین مقالہ نگار، بہترین مقرر، بہترین موسیقی کے نقاد اور سب سے بڑھ کر بہترین گفتگو کرنے والا ہے ——— اور انگریزی زبان کے سارے زمانوں کا بہترین مزاح نگار ہے!

بڑے آدمی جب کسی کو اس طرح پسند کرتے ہیں تو اس کی تصویر بن جاتے ہیں ——— اور پروفیسر جوڈ شا کی ایسی ہی تصویر ہے! تنک مزاج ——— بیوقوفوں کا پکا دشمن ——— خود بین و خود پسند !! اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر بڑے آدمی کے ذرہ بھر میں خود پسندیت کی کھنک ضرور رہتی ہے ——— شاید ان کی بڑائی کا کوئی راز اس میں مضمر ہوتا ہے ——— !

وہ الفاظ کا بادشاہ ہے ——— لیکن کہتا ہے کہ حقیقی معنوں میں مجھے الفاظ نہیں ملتے کہ میں شا کی قرار واقعی تعریف کر سکوں ———

اور میں سوچنے لگا ———

غذا اور عورتیں ——— !

شاید کسی دن وہ وقت بھی آئے جب کوئی سرل جوڈ کے متعلق الفاظ نہ پا سکے !!

پروفیسر جوڈ کے پاس ایک باورچی ہے ——— اور وہ اُسے ہر قیمت پر عزیز ہے ——— اس لئے کہ وہ کہتا ہے " اس کے رہنے میں خوش خوراکی کی ہر منزل سے گذرتا ہوا اطمینان سے قبر تک پہنچ سکتا ہوں !"

اور اس طرح پروفیسر جوڈ کی زندگی میں عورت کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا !

فلسفے نے لکھا ہے " عورت پر کبھی بھروسہ نہ کرنا خواہ اس کی لاش ہی کیوں نہ پڑی ہوئی ہو !"

اور ستم ظریفی یہ ہے کہ آج کا یہ فلسفی بھی کچھ ایسے ہی خیالات دل میں لئے دماغ میں بسائے بیٹھا ہے ——— !

" اور واقعہ یہ ہے کہ نوجوانی میں میں نے ہمیشہ عورت کو اپنا مساوی حصہ دار سمجھا، میں کچھ اس کی نفاست پسند ذہنیت، نازک تخیل اور پیاری اداؤں سے رہا تھا ——— اور ایک سڈول نیلے نیلے موزوں والی پنڈلیوں کے تصور میں گم رہتا ——— میں چاہتا تھا کہ وہ نیلے نیلے موزوں والی پنڈلیاں

میری روحانی ساتھی، میرے بستر کی شریک، میرے خیالات کے سمندر کی تہہ سے موتی لانے والی میری پریشانیوں کو دور کرنے والی، میری ذہنیت کی ترقی اور معقول بحث و تحقیق کا آلہ ہو ——— جیسے میں ایک فلسفی بن کر نہیں ——— ایک انسان بن کر پسند آؤں ——— اسے مجھ سے محبت ہو ——— میری ذات سے وابستہ

———————— !"

لیکن ستم ظریف دنیا اس معیار پر پوری نہ اتری ————

" اور اب تو میں اس ذکر کو چھیڑنا نہیں چاہتا ——— میں نے اس قصہ کو ختم کر دیا ہے ——— اب اس قصہ سے مجھے اپنی انتہا احساس ہوتا ہے اور ساتھ ہی بے حد رنج و افسوس !

" ایک دفعہ شا نے لکھا تھا میں اپنے کرداروں کی زبان سے وہی کچھ کہلواتا ہوں جس کا میں مرتکب ہوا ہوں خواہ عملی دنیا میں ہو کہ تصور میں ——— اور اس کا خیال ہے کہ عورتیں بالکل ایسی جیسی ہوتی ہیں ————

" حالانکہ میں نے کوئی عورت اپنی جیسی نہیں پائی ——— باوجود اس کے کہ میں ایک زبردست نسوانیت پرست ہوں —— ——

" اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا میں کئی خوبصورت اور ذہین و روشن خیال عورتیں ہیں ——— لیکن ——— ان کے مقابلہ میں ——— مجھے معاف کرو میں تبصرہ نہیں کر سکتا !!"

" اچھا تو چھوڑیئے اس قصے کو ——— " میں اس روشن اور زندہ دلی سے معمور چہرے پر ایک نامعلوم غم کی ہلکی سی سیاہی بھی برداشت نہیں کر سکا ——— آنکھوں کی چمک ——— نے لگی تھی ——— !

" نہیں ایک عجیب بات اور سن لو ——— " اسے پھر کچھ یاد آیا " پرسوں ایک عجیب و غریب سوال سے دوچار ہونا پڑا ——— سوال تھا "کثرت ازدواج" Polygamy کے متعلق ! ——— اور میرا اپنا نظریہ ہے ——— اس نے عجیب سرگوشی کے عالم میں کہا " کہ مجھے ذاتی طور پر ایک عورت ایسی چاہیئے جو میرا ہنس ہنس کر استقبال کرے اور کھانے کی میز کو مسرتوں کا گلدستہ بنا دے ——— ایک عورت ایسی ہو جو ملبوس بنا کر میرے ساتھ چرچ جا سکے ——— ایک ایسی ہو کہ شام کی شاپنگ shopping خوشگوار اور پر لطف ہو جائے ——— دوسری میرے ساتھ ٹینس، پنگ پانگ ping pong اور ہو سکے تو ہاکی اور کرکٹ تک کھیل سکے ——— اور ایک ؟ ——— ایک جو مجھ سے اتنی محبت کرے کہ میری راتیں دن کی طرح روشن اور مسرتوں کا گہوارہ بن جائیں جن میں چاشنی حیات سے دوچار ہو کر آنکھیں موند کر سو جاؤں !!)

" لیکن یہ ساری صفات صرف ایک عورت میں کیونکر جمع ہو جائیں ؟

" کیوں نہیں بھئی آخر !!" ——— اور میرے دیکھتے دیکھتے وہ صباحتیں پھر لوٹ آئی تھیں جو پرفیسر جوڈ کی جاگیر ہیں ——— خدا معلوم کیوں اور کیسے ؟؟

بس چڑھ جاؤ اللہ کا نام لیکر !!

کئی سوالات و جوابات کے بعد میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا

" اچھا پروفیسر یہ بتاؤ کسی عورت یا مرد کے متعلق جو کسی زینہ پر کھڑا ہو ——— خواہ تعلیمی ترقی یا تدبیری یا تجرباتی ——— کسی قسم کے زینہ پر ——— اُسے تم کیسی رائے دو گے ؟"

مسکرا کر کہا

" بس چڑھ جاؤ اللہ کا نام لے کر !"

خاص سائیکولوجی اردو کے لئے

زندگی کا راز زندہ دلی میں مضمر ہے

النساء۔ رئیس جہاں بیگم

حکومت کی بدعنوانیاں اور سوسائٹی کے مظالم دیکھتے دیکھتے آپ کا دل پک اٹھا ہوگا اور آپ نے دانت پیس پیس کر اور منہ بھر بھر کر ارکان حکومت اور علمبرداران سوسائٹی کو بارہا کوسا بھی ہوگا طرح طرح کے علاج آپ کے ذہن میں آئے ہوں گے لیکن آپ نے دیکھا کہ آپ کی ایک نہ چلی وقت اور حالات دونوں اپنی بے ڈھنگی چال پر چل رہے ہیں نفسیات کے ایک ماہر کا قول ہے کہ دوسروں کی غلط روی پر کڑھنا اپنی صحت کو برباد کرنا ہے آپ کے کڑھنے سے نہ حکومت تبدیل ہو سکتی ہے اور نہ سوسائٹی راہِ راست پر آسکتی ہے اور پھر یہ کیا ضروری ہے آنے والی حکومت آپ کی مرضی کے مطابق ہو یا سوسائٹی کے نئے راہبر جو کچھ کریں وہ آپ کی رائے کے عین مطابق ہو آپ کے ملک کو مدنظر رکھتے ہوئے یہاں کا ہر باشندہ کسی نہ کسی رائے کا مالک ہے اور اس رائے کے مطابق تجاویز بھی رکھتا ہے اور کم و بیش اپنی تجاویز کے مطابق حالات کو ڈھالنا چاہتا ہے لیکن مایوس ہوتا ہے ۔ یہ تو مسلمہ امر ہے کہ آپ دنیا کو اپنی خواہش کے مطابق نہیں چلا سکتے پھر کیوں نہ ان مراعات سے جو آپ کو حاصل ہیں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا کر اپنی زندگی کو خوشگوار بنانے کی کوشش کریں یہ تو ظاہر ہے کہ اگر آپ ان خوش قسمت لوگوں سے بہتر نہیں جن کو دیکھ کر آپ کو رشک ہوتا ہے تو یقیناً ان ہزاروں سے بہتر ہیں جو آپ کی زندگی پر رشک کرتے ہیں ۔

ایک اور فلسفی کا قول ہے کہ " زندگی بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتی اہمیت دراصل اس جرأت رندانہ کی ہے جس سے زندگی گذاری جائے "
آپ کی زندگی اس قدر مختصر ہے اور اس پر طرہ یہ کہ آپ کے سر ذمہ داریاں اتنی اہم لاتعداد اور وسیع ہیں کہ آپ ان ہی کو بجا طور پر پورا نہیں کر سکتے سوسائٹی اور حکومت کے نقائص دور کرنا کم از کم فرد واحد کے لئے ناممکن ہے خصوصاً ایک فرد واحد کی زندگی میں حکومت اور سوسائٹی کو نمونہ کی حکومت یا سوسائٹی بنا دینا اور بھی ناممکن ہے ۔ اس زندگی میں ہم پر لاتعداد مشکلیں آن پڑتی ہیں بسا اوقات ان مشکلوں سے ہم ان ذرائع کی معرفت بھی چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اخلاقاً قانوناً اور عملاً ناجائز اور قابل مذمت ہیں اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب ہمیں زندگی کے مشکلوں سے دوچار ہونے کے لئے جرأت رندانہ کی ضرورت پڑتی ہے ہماری زندگی صرف اسی حالت میں کامیاب کہی جا سکتی ہے جبکہ ہم ان مشکلوں کو سہہ کر آسان کر دیں ان سے زندگی کو بہتر بنانے کے لئے سبق حاصل کریں نہ کہ اس عالم میں جب کہ ذرا سی بپتا پڑنے پر زندگی سے مایوس ہو کر خودکشی کی ٹھان لیں اور دراصل خودکشی بھی نہ کر سکیں ۔ زندگی کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لینا بہت مشکل کام ہے اتنا مشکل ہے کہ زندگی کی مصیبتوں کو دور کر کے خوشگوار حالات پیدا کرنا نسبتاً بہت آسان ہے پھر کیوں نہ زندگی ہی کو بہتر بنانے کی کوشش کریں ۔ خواہشات سے مرعوب ہو کر زندگی کا لائحہ عمل بنانا زندگی کو اجیرن کرنا ہے اس لئے کہ خواہشات لاتعداد اور اکثر ناقابل تکمیل ہوتی ہیں اگر ہم ایک خواہش کو پورا ہی کرنے کے عالم میں زندگی کی مصروفیات کو معطل کر کے رکھ دیں تو زندگی میں تعطل پیدا ہو جائے گا اور یہ تعطل ہی ہمارے لئے ناکامی کا باعث ہوگا انسانی زندگی مقابلہ کے اصول پر چلتی ہے جذبات اور ضروریات کا پیمانہ اس میں کامیاب نہیں ہوتا مرضی کے مطابق زندگی کے پھل بہت کم خوش قسمت لوگ ہی کھایا کرتے ہیں اور اس میدان میں غوطہ خوروں کی تعداد لاتعداد ہے ۔ اس لئے چارۂ کار صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ہم صرف ان مراعات سے بہترین فائدہ اٹھالیں جو ہم کو حاصل ہیں اور مزید مراعات حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں یہ بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ ہاتھ پیر توڑ کر جو ہے اسی پر تکیہ کر کے بیٹھ رہیں ہماری قابلیت اور جفاکشی ایک نہ ایک دن ضرور پھل دیگی جلدی یا دیر سے ، یہ نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں ہم کو اس کا صلہ نہ ملے یہ ہو سکتا ہے کہ وہ صلہ ہماری امیدوں کے مطابق نہ ہو لیکن صلہ کی قیمت یا اس کا معاوضہ چکانے والے ہم کون ؟ زندگی کے بازار میں ہماری خدمات کم از کم قیمت پر خریدی جاتی ہیں اور اسی پیمانہ سے ہمیں اپنی قابلیت اور جفاکشی کے معاوضے کا اندازہ لگانا چاہیئے ۔

انسانی زندگی میں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب انسان کو دانستہ یا نادانستہ طور سے اپنی موجودہ مراعات زندگی پر ہی قانع ہونا پڑتا ہے یہ قدرت کا اصول ہے اور اسے کوئی تبدیل نہیں کرسکتا اس قناعت سے پہلے انسان پر ہزاروں "مصیبتیں" پڑ چکی ہوتی ہیں لیکن وہ "مصیبتیں" اس کی خود ساختہ ہوتی ہیں ناخوشگوار حالات انسانی زندگی کا جزو لاینفک ہیں اور اسی جزو کا نام حضرت انسان نے مصیبت رکھ چھوڑا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہم اپنی ہر ناکامی پر صرف آنسو ہی بہاتے رہیں تو کیا ہماری زندگی کچھ بہتر ہو سکتی ہے ۔ جی نہیں یہ تو اور بدتر ہو جائے گی ہم ان آنسوؤں میں اپنی ان مراعات کو بھی بہا دیں گے جو ہم کو ایک وقتی ناخوشگوار حادثہ کے علاوہ حاصل ہیں اور ان مراعات کو بہا دینے سے زندگی کی مشکلات میں اور اضافہ ہو جائے گا اور ان اضافوں سے زندگی مصیبتوں کا پہاڑ بن کر رہ جائے گی مشکلوں کا ہنستے کھیلتے مقابلہ کرنا ہی کامیاب زندگی کی دلیل ہے یوں تو ہر جاندار زندہ رہتا ہے کسی نہ کسی طرح رو کر یا ہنس کر لیکن انسان کو قادر مطلق نے اشرف المخلوقات کہا ہے اور وہ اس بنا پر کہ اس میں فہم اور ادراک کا مادہ ہے جو دیگر جانداروں میں نہیں اور فہم اور ادراک کا صحیح استعمال ہی کامیاب زندگی تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے ۔ زندہ دل وہی لوگ ہیں جو غیر موافق حالات کو بھی خوش آمدید کہہ کر ہموار کر لیتے ہیں اور زندہ دلی دراصل زندگی ہے زندگی کی ناہمواریوں پر مرثیہ خوانی کرتے رہنا مردہ دلی ہے اور مردہ دل آدمی زندہ نہیں ہوتے بلکہ دنیا کے ساتھ گھسٹتے ہیں اگر آپ دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں چلا سکتے تو دنیا کے حالات کے مطابق چل تو لیجئے ۔ یہ بھی آپ کے لئے کچھ زیادہ نقصان دہ نہ ہوگا اس لئے کہ دنیا والوں کو آپ سے کوئی مخاصمت نہیں دنیا آپ کی ناکامیوں پر ہنستی بھی نہیں ہاں کامیاب لوگوں کو دنیا ضرور جان لیتی ہے آپ نے دیکھا ہوگا یونیورسٹی امتحانات میں ناکام ہونے والوں کے نام شائع نہیں ہوا کرتے ہماری زندگی بھی ایک قسم کا امتحان ہے یہاں سرخرو ہونے والے نامور ہوتے ہیں۔ ناکام لوگوں سے دنیا ہمدردی کرتی ہے اور کامیابی کے لئے مزید کوششوں میں ان کی ہمنوا بھی ہو جاتی ہے جو چیز آپ کو آج واقعی حاصل ہو جانی چاہئے تھی۔ اور نہیں ہو سکی وہ کل ضرور ہو جائے گی ۔

خواتین کے لئے صبر و شکر اور موجودہ مراعات زندگی کو بہترین طریقے سے استعمال کرنا ازبس ضروری ہے آج کی بچیاں کل ذمہ دار ہستیاں ہو جائیں گی کھانا اور پہن لینا ہی زندگی نہیں نہ ہنسی اور رو لینا ہی زندگی ہے عورتوں کے لئے زندگی میں کامیابی حاصل کرنا مرد کی بہ نسبت مشکل ہے مرد موجودہ مراعات کو آج استعمال کرکے آج ہی پھل پانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن عورتوں کو یہ پھل بہت مدت کے بعد ملتا ہے ۔ عورت قوم کی امین ہے اگر زندگی کے ناخوشگوار حادثوں پر آنسو بہاتے بہاتے وہ اپنے فرائض زندگی کو بھول جائے تو اس کا نقصان اسی کو نہیں بلکہ قوم اور ملک کو بھی ہوتا ہے اور اس امانت میں خیانت کے لئے وہ یقیناً جواب دہ ہے اس کی لاپرواہی قابل معافی بھی نہیں ۔ قوم کی پرورش ایک ایسا نازک اور مشکل عمل ہے جس میں مستقل مزاجی، تدبر، دیانت اور عقلمندی اجزائے اعظم ہیں اور اگر زندگی کے حادثات پر روتے رہنے میں وہ اسی نسخہ کو ہاتھ سے دے بیٹھے تو نقصان کی ذمہ دار یقیناً وہی ہے قدرت نے شاید عورت کا امتحان اس کی کمزور نسوں کی معرفت بھی لیا ہے عورت عام طور سے جذبات کی رو کے ساتھ چلنے کی عادی ہوتی ہے اور یہی اس کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ ہے ۔ یہ وجہ اکثر قابل فراموش واقعات سے شروع ہو کر اچھا خاصا طوفان اپنے ارد گرد جمع کر لیتی ہے اور وہ طوفان آتش فشانی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت میں فہم و ادراک کا مادہ مرد سے کسی طرح کم نہیں لیکن صدیوں بیکار رہنے کے باعث زنگ آلود ہو گیا ہے اگر مرد کو بھی ان ہی حالت میں رکھا جائے جن میں عورت صدیوں سے ہے تو کچھ ہی عرصہ بعد مرد بھی "ناقص العقل" ہو جائے گا بہرحال سوال فہم و ادراک کے صحیح استعمال کا ہے اور فہم و ادراک کے صحیح استعمال ہی کو نفسیات کی سوجھ بوجھ کہتے ہیں اور اس سوجھ بوجھ کی واقفیت کا فرق جو عورت اور مرد میں ہے وہ عورت کے مادۂ فہم و ادراک کے بیکار رہنے کے باعث ہے چنانچہ عورت پر نفسیات کو سمجھنے اور اس سمجھ کے مطابق عمل کرنے میں دُہری مشکل ہے اول تو خود فہم و ادراک کا استعمال دوسرے زنگ کو ہٹانا ۔ اس کے ساتھ ساتھ نفسیاتی اصول کو سمجھنے سے عورت کو فائدہ بھی دوہرا ہے ایک تو فوری فائدہ جو اس کی کامیاب گھریلو زندگی سے ہوگا دوسرا وہ فائدہ جو اس کو ایک کامیاب بیوی اور ایک کامیاب ماں بننے کے بعد ہوگا جب کہ وہ قوم کو قابل تعریف سپوت دے سکے گی اور یہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے ۔

یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک عورت اپنی ازدواجی زندگی کو اپنی ان امیدوں کے مطابق نہ پائے جن کو وہ عرصہ دراز سے سینہ میں پالتی رہی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو کچھ اس کو حاصل ہوا ہے وہ اس سے بھی مایوس ہو کر اپنے کو سامان خانہ داری کا ایک جزو (خود ساختہ اصطلاح Piece of furniture) سمجھ کر آزادی کے لئے قرار دادیں پاس کرنی شروع کردے موجودہ عورت کا زیادہ تر رجحان کچھ اسی طرف ہے زندگی کی معمولی معمولی مایوسیوں سے وہ "سیاست داں"

Pieces of Furniture بنی جا رہی ہے اپنی زندگی کو بہتر بنانے کا یہ طریقہ ہرگز نہیں کہ چور اسے پر کھڑے ہو کر سماج کے خلاف قرار دادیں پاس کی جا سکیں یا اپنے کو کہہ کر راہگیروں کی ہمدردی حاصل کی جائے تجربہ شاہد ہے کہ ہم اپنی موجودہ مراعات زندگی کو فہم و ادراک کی چاشنی دے کر اپنے کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔ جو کام ہمارے حصہ کا نہیں ہے اس پر ہاتھ ڈال کر ناکامی کا منہ دیکھنے سے بہتر یہی ہے کہ اس سے دُور رہیں۔ ہم اپنی مصیبتوں میں بعض اوقات دیدہ و دانستہ اضافہ کرتے ہیں اور پھر نتیجہ قسمت کے سر رکھ دیتے ہیں ایک محترمہ کے دماغ میں کسی طرح یہ بیٹھ گئی کہ ان کی شادی آئی سی ایس سے کم آدمی سے نہیں ہونی چاہیئے اتفاق کی بات کہ کوئی آئی سی ایس گھرانہ جا سکا اور اس درجہ سے کم کی تجاویز کو وہ مسترد کرتی رہیں اور پھر جب انھیں یہ اندازہ ہوا کہ اب وہ اس زمانہ میں نہیں رہیں جس میں جلد ہی آئی سی ایس مہیا ہو سکے تو وہ پی سی ایس پر اتر آئیں بدقسمتی سے یہ بھاؤ بھی جلد ہی گر گیا اور وہ آج تک یہی شکایت کر رہی ہیں کہ ان کی قسمت ہی ایسی تھی یہ محترمہ تعلیمیافتہ ہیں اچھے خاندان سے ہیں پیسہ والی بھی ہیں لیکن اس ستم ظریفی کا کیا کیا جائے کہ وہ ذریعہ نجات آئی سی ایس ہی کو سمجھ بیٹھیں اور اپنی زندگی تباہ کر ڈالی۔

حقیقی مسرت اطمینانِ قلب میں ہے اور اطمینانِ قلب اسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جو زندگی کے سرد و گرم کو یکساں برداشت کر سکے زندگی نشیب و فراز سے پر ہے اور اس نشیب و فراز سے مرعوب ہونے والا ہی مردہ دل کہلاتا ہے اگر ہماری محنت کا پھل آج نہیں مل سکا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کبھی نہ ملے گا آج ہم ایک کام میں ناکام ہو گئے تو یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمیشہ ناکام رہیں گے اس لئے کوشش ہی بیکار ہے آج کی ناکامی کل کی کامیابی کا پیش خیمہ ہے جو آج ناکام ہوا ہے وہ کل ضرور کامیاب ہوگا ناکامی وقتی مایوسی لاتی ہے لیکن درحقیقت ہماری فہم و ادراک کی دولت میں اضافہ کرتی ہے اس سے ہمیں سبق لے کر اپنی آئندہ کوششوں میں ناکامی کے اسباب کو دور کرنا چاہیئے اور یہی کامیاب زندگی ہے اسی کا نام زندہ دلی ہے مصیبتوں اور مشکلوں گھبرانے والا ہمیشہ پریشان رہتا ہے رفتہ رفتہ ذرا ذرا سے کام کو مصیبت سمجھ کر ٹالنے کی کوشش میں مزید مصیبتوں میں گرفتار ہو جاتا ہے اور زندگی بھر ناکام رہتا ہے مصیبت کو سینہ سپر ہو کر خوش آمدید کہنے والا کامیاب ترین انسان ہے وہ چاہے عورت ہو یا مرد اس میں کوئی فرق نہیں اگر عورت آج ہمت کر کے اپنی مشکلوں کو حل کرنے کی کوشش کرے تو مرد سے جلد کامیاب ہو سکتی ہو قدرت نے اس کو کچھ اسی طرح تخلیق کیا ہے۔

خاص سائیکولوجی اردو کے لئے

ماحول کا اثر بچوں پر

محترمہ ماہ مبین صاحبہ

قدرت ہی ہر جاندار کی اتالیق ہے - جو مچھلی کے بچوں کو تیرنا سکھلاتی ہے وہ کیا انسان کے بچوں کو چلنا نہ سکھلائے گی قدرت آپ کے بچوں کو بھی چلنا بولنا زندہ رہنا اور زندہ رہنے دینا - یہ سب کچھ سکھلاتی ہے - پھر آپ قدرت کے مزاحم کیوں ہوتے ہیں ہر جاندار کی فطرت نقالی سے خمیر ہے - چڑیا کے بچے جب آنکھ کھول کر اپنا ماحول سمجھتے ہیں اور اپنے ہم جنسوں کو اڑتے دیکھتے ہیں تو تھوڑی سی مشق میں خود بھی اڑنے لگتے ہیں - دوسرے جانوروں کے بچے بھی اپنے ہم جنسوں کو —— دیکھ کر ان ہی کی طرح چلنا بولنا سیکھ لیتے ہیں - اسی طرح انسانی بچے بھی دوسرے آدمیوں کو دیکھ ہی کر چلنا اور بولنا سیکھتے ہیں جس میں قطعی آپ کی امداد شامل نہیں ہوتی - انگلستان کے بچے بغیر پڑھائے ہوئے انگریزی بولنے لگتے ہیں - حجاز کے عربی - چین کے چینی اور ہندوستان کے اردو بولنے لگتے ہیں - اگر قدرت ان بالکل ناسمجھ بچوں کی معلم ہے تو آپ کو فضا اندازے بڑی بچوں کے متعلق کیوں فکر ہے - آپ اگر یہ یاد رکھیں تو آپ کے واسطے بہتر ہے کہ یہ بچے بھی آپ کی مدد کے بغیر اپنا ماحول قبول کریں گے - بچہ فطرت کی طرف سے کچھ نہ کچھ سمجھ لے کر پیدا ہوتا ہے - پھر اپنے اردگرد کی اشیاء کو دیکھ کر اپنے تجربہ اور سمجھ میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے —— فطرتاً بچہ یہ نہیں چاہتا کہ آپ اس کے معاملات میں مداخلت کریں - پھر جب آپ اس کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ کام میں مزاحمت کرتے ہیں تو وہ فوراً احتجاج کرتا ہے - روتا ہے - اور چلاتا ہے - آپ ذرا غور تو کیجئے - کیا یہ فطرت اس کی خود ساختہ ہے ؟ اگر یہ قدرت کی عطیہ ہے تو کیا یہ قدرت کا فعل غلط ہے ؟ قدرت غلطی پر نہیں بلکہ ہم غلطی پر ہیں - ہم عرصے سے اپنے بچوں کی پرورش غلط طریقے سے کر رہے ہیں - بچوں کے ہر معاملہ میں ہم دخیل ہوتے ہیں - قدم قدم پر ان کی مزاحمت کرتے ہیں روکنے اور ٹوکنے ہی میں ہم ان کی بہبودی خیال کرتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم نے ان کے ہر فعل پر کڑی نظر نہ رکھی اور ان کو من مانا کرنے دیا تو وہ آوارہ ہو جائیں گے - بدمعاش ہو جائیں گے - لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے - ہماری یہ مداخلت - ہماری یہ بندشیں اور ہماری یہ روک ٹوک ہی دراصل اولاد کی خرابی کا باعث ہوتی ہے - جو بچے اس مداخلت کے بغیر آزادی کی فضا میں پرورش پاتے ہیں - وہ گو بچپنے میں شریر ہوتے ہیں ان سے ہم کو ایک گونہ تکلیف پہونچتی ہے - وہ ہمارا اکثر نقصان کرتے رہتے ہیں - مگر یہی بچے جب اپنی دنیا الگ بنانے پر تیار ہوتے ہیں تو ان کی ہمتیں بلند ، ان کے ارادے مضبوط اور ان کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں - یہی بچے دنیا کے نقشے بدلتے ہیں - اور ان ہی کے دلوں میں چاند اور تاروں میں گھس جانے کا جذبہ ہوتا ہے - مصیبتوں کو پامال کرنا اور ناکامیوں کو شکست دینا ان کے نزدیک ہنسی کھیل ہوتا ہے - بچپنے میں وہ جس طرح جو کچھ چاہتے ہیں کر گذرتے ہیں - ان کی لغت میں ناممکن اور دشوار کے لفظ باقی نہیں رہتے - لیکن ہمارے وہ پیارے بچے —— جن کے ہم خود اتالیق بنے ہیں - جن کی ہم نے ہر قدم پر روک ٹوک کی ہے —— " یہ کرو " وہ " مت کرو " کا سبق جن کو ہم نے دن رات پڑھایا ہے اور اپنے زندگی بھر کے تجربے ان کے نازک ننھے دماغوں میں چند سال کے اندر ہم نے سمو دینے کی ہر ممکن کوشش کی ہے بید کی ضربوں سے جن کو ہم نے شرارت سے باز رکھا ہے - بچپنے ہی سے جن کو ہم نے معصوم - شریف اور سیدھا بچہ بنایا ہے - ہاں تو جب یہ بچے زندگی کی اہل شاہراہ پر قدم رکھتے ہیں اس وقت ان کی آنکھیں آپ کو ڈھونڈھتی ہیں - وہ زندگی کا ہر مسئلہ جو ان کے سامنے پیش آتا ہے - آپ کے تجربوں اور آپ کی نصیحتوں کی روشنی میں حل کرنا چاہتے ہیں - وہ خود کچھ نہیں سوچ سکتے - وہ اپنے ماحول سے فیض حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ان کے اندر خود اعتمادی باقی نہیں ہوتی - اور زندگی ان کے واسطے ایک ایسا پہاڑ ہوتی ہے جس سے گذرنا ان کے لئے ناممکن ہوتا ہے کیا آپ نے کبھی اس کا تجزیہ کیا ہے - اکثر یتیم بچے فاقہ کش بچے - معمولی اور غریب آدمیوں کے بچے ہی دنیا کے بڑے انسان گذرے ہیں - کیوں ؟ —— صرف اس لئے کہ زندگی کی پہلی منزلوں میں ان کو بتلانے والا کوئی نہیں تھا - باپ کی شفقتیں اور ماں کی محبتیں ان کے حصے میں نہیں آئی تھیں - ان قدرت اور صرف قدرت ہی ان کی اتالیق تھی وہ گرتے تھے اور خود ہی اٹھتے تھے - ناکامیوں سے دوچار ہوتے تھے اور خود ہی ان کا مقابلہ کرتے تھے —— آخر اپنی

ناکامیوں اور دشواریوں کا مقابلہ کرتے کرتے ان کو مقابلہ کرنا آگیا۔ اور جس طرح انہوں نے اپنا بچپن بغیر کسی سہارے کے گذارا تھا وہ زندگی کا اہل دور بھی بغیر کسی سہارے کے گذارنے کے قابل بن گئے۔ آپ اپنے بچے سے اگر محبت کرتے ہیں تو اس کو بھی خود اعتمادی سیکھنے دیجئے۔ اس کو بھی ماحول کے دیکھنے سمجھنے اور اس پر غالب آنے کا عادی بنائیے۔ اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ آپ اپنی گرفت ڈھیلی کر دیں اور اس کو آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع دیں آپ اپنے بچے کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دیجئے۔ اس کے کھیلنے کے واسطے سامان مہیا کیجئے۔ اس کو اپنے کام کرنے کا عادی بنائیے۔ جب وہ کوئی نیا کام کرے آپ اس کی ہمت افزائی کیجئے اس کی شرارتوں کو برداشت کیجئے۔ نقصانوں کو سہہ لیجئے۔ آپ "یہ کرو" اور "وہ مت کرو" کا سبق دہرانا بند کیجئے۔

شاید آپ یہ پوچھیں — اگر ہمارا بچہ ایک گڑھے کی طرف بڑھ رہا ہے اس کے گر جانے کا خوف ہے — کیا ہم اس کو منع نہ کریں ؟ جی میرے بزرگوار آپ اس کو ہرگز منع نہ فرما دیں۔ آپ اپنی آنکھوں کو کام میں لائیں — آپ پہلے یہ اندازہ کریں کہ اس گڑھے میں گرانے کا انجام کیا ہوگا اگر وہ ایک چھوٹا سا گڑھا ہے اس میں گرنے سے آپ کے لعل کو چوٹ تو آئیگی۔ لیکن معمولی۔ تو آپ بلاشبہ اس کو گرنے دیجئے آخر یہ بھی تو زندگی کا ایک تجربہ ہے۔ آج وہ اگر اس چھوٹے سے گڑھے میں گرتا ہے تو کل کنوئیں میں ہرگز نہیں گرے گا۔ لیکن اگر آپ نے اس کو آج منع کر دیا۔ روک دیا۔ ہاں وہ رک تو جائے گا۔ مگر اس کی یہ خواہش فنا نہیں ہوگی۔ اس کی فطرت آپ کے حکم سے بغاوت کرے گی۔ وہ آپ کی آنکھ بچا کر پھر اس گڑھے کی طرف بڑھے گا۔ یا شاید دوسرے گڑھے کی طرف جو اس سے زیادہ گہرا اور خطرناک ہو۔ مگر ہاں — اگر آپ کا معصوم آپ کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسے گڑھے کی طرف بڑھ رہا ہے جو گہرا ہے اور خطرناک بھی۔ جس میں گرنا اس کے لئے ہلاکت کا سبب بن سکتا ہے — تو بھی آپ اپنی زبان بند رکھیں۔ آپ اس کو منع نہ کریں بلکہ اٹھیں بڑھیں اور اس کو گود میں لے لیں اور دوسرے کاموں میں لگا دیں۔ یا آپ اس کے درمیان پہنچ جائیں۔ اس کے ساتھ کھیلنے لگیں اور اس کا رخ دوسری طرف کر دیں اس کے شعور پر یہ اثر نہ رہنا چاہیئے کہ وہ ایک کام کرنا چاہتا تھا اور نہ کر سکا۔

بچہ اس دنیا میں ہر چیز خود سیکھتا ہے۔ سیکھنا چاہتا ہے اور اس کو خود ہی سیکھنا چاہیئے — وہ آپ کے تجربوں سے کوئی فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا۔ آپ نے کتنے دنوں میں بولنا سیکھا تھا ؟ کیا آپ بچے کو ایک ہفتہ میں بولنا سکھلا سکتے ہیں ؟ آپ نے کتنے دنوں میں چلنا سیکھا تھا ؟ کیا آپ اپنے بیٹے کو اس سے کم عرصہ میں چلنا سکھلا سکتے ہیں ! آپ نے تو ایم اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔ آپ انجینیئر ہیں۔ ڈاکٹر ہیں۔ وکیل ہیں۔ مگر کیا آپ کا بچہ آپ کے علم سے کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے کیا اس کی اپنی تعلیم پھر الف بے سے ہی نہیں شروع ہوگی کیا ایم اے کرنے میں اس کو اتنا ہی عرصہ درکار نہیں ہوگا جتنا آپ کو — پھر آپ یہ کیسے امید کر سکتے ہیں کہ وہ خود جان جائے کہ آگ کی خاصیت جلانے کی ہے پانی میں انسان ڈوب جاتا ہے اور کوٹھے یا درخت پر سے گرنے میں انسان کی ہلاکت مضمر ہے۔ وہ خود ان چیزوں کا تجربہ کریگا۔ اور آپ کی محبت اور عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اس کو یہ تجربے اپنی موجودگی میں کرنے دیں۔ بچہ آگ چھونا چاہتا ہے۔ آپ اس کو چھونے دیں۔ یہی ہوگا کہ اس کا ہاتھ ذرا سا جل جائے گا۔ مگر یہ تو قابل علاج ہے — مگر سوچئے تو سہی کہ اگر یہی تجربہ اس نے آپ کی عدم موجودگی میں کیا۔ تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تجربہ کرتے کرتے اپنا پورا جسم جلا ڈالے

یاد رکھئے کہ دنیا میں آزادی سے زیادہ قیمتی کوئی شے نہیں۔ اور آزادی سے زیادہ ضروری کوئی شے نہیں۔ اور یہی آزادی ہے کہ جس کی ہر جاندار کو ضرورت ہے اور پھر آپ کے بچے کو آپ سے کہیں زیادہ ضرورت ہے !

کیا آپ نے اپنے بچے کو آزادی دی ہے ؟

شوہر کے مرنے سے عورت کا آفتاب زندگی غروب ہو جاتا ہے۔

شوہر نام ہے عورت کی زندگی کے اس تاجدار کا جس کے ہاتھ میں اس کی عنانِ حیات ہوتی ہے۔

[illegible] آج نے بھی تمہاری شمع دل میں گداز پیدا نہیں کیا تو جان لو کہ تمہارے [illegible] —

[illegible] بھی تو شاکر ہو کہ تھا اس کی آرزو کے پھول کو رس سے بھر دے —

اپنی تکلیف میں مسکرانے کا موقع نکال کر جرأت و دلیری کی بہترین مثال پیش کرو ✦

غزلیات

جوشِ کردار

علامہ اقبالؒ

رازہے رازہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز
ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس
عوضِ یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز

عزمِ محکم

مختار مالیگانوی

آج بھی قیدِ تعین سے نکل سکتے ہو تم
اپنی قسمت اپنے ہاتھوں سے بدل سکتے ہو تم
عزمِ محکم چاہیئے جوشِ فراواں چاہیئے
پاؤں سے اپنے پہاڑوں کو مسل سکتے ہو تم
ڈوبنے والے سفینوں کا اتنا ہی خیال
بس کناروں سے کفِ افسوس مل سکتے ہو تم
وقت چونکا رہا ہے یہ کہہ کہہ کے اے اہلِ وطن
اب بھی کچھ بگڑا نہیں اب بھی سنبھل سکتے ہو تم
کاروانِ زندگی میں آج بھی بڑھتے ہوئے
آنے والی آفتوں کا سر کچل سکتے ہو تم
پہلے طاقت بازوؤں میں اپنے تم پیدا کرو
پھر زمانہ کی فضاؤں کو بدل سکتے ہو تم

میرے پسندیدہ اشعار

حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

حسرت

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

[illegible]

جنس سے پیدا ہوا ہے زندگی میں [illegible]
عشق سے [illegible]
آدمی کے ریشے ریشے [illegible]
[illegible]

مجھے فریب نہ دے او نشاطِ میخانہ
میں سن رہا ہوں صدائے شکستِ پیمانہ

ساحر

[illegible]
گزر گیا ہے زمانہ تجھے بھلائے ہوئے [illegible]

فراق

[illegible]
[illegible]

قیادت

مسعود جاوید - بی ایس سی (عثمانیہ)

یوں تو ہر انسان میں، دوسروں پر اپنی برتری جتانے کا جذبہ فطرتاً پایا جاتا ہے مگر قیادت جسے کہا جاتا ہے وہ کچھ اور چیز ہے شاعر کے متعلق یہ صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں ہے مگر قائد کے متعلق تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ پیدا نہیں ہوتا ہے بلکہ بنتا ہے - قیادت خلقی نہیں بلکہ کسی خصوصیات کا ایک حسین امتزاج ہے - ہر انسان جو معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے، اگر چاہے تو بڑے سے بڑا قائد بن سکتا ہے - مشرق کے شفق زاروں سے لے کر، مغرب کے عشرت کدوں تک دلوں پر حکومت کی جا سکتی ہے - اس قدر عظیم قائد بننے کی تمنا کون نہیں کرے گا مگر صرف تمنا کرنے سے تو کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی اس کے لئے تو خاص تربیت کی ضرورت ہے قیادت کا منصب اسی شخص کو نصیب ہوتا ہے جو بچپن ہی سے چند خاص اصولوں کا پابند رہا ہے -

مجلسی زندگی قیادت کی خشت اول ہے - تعاون عمل کی صلاحیت اور بحیثیت جماعت کام کرنے کی عادت، علمی محفلوں ادبی بزموں اور اصلاحی انجمنوں میں زمانہ طالب علمی ہی سے سرگرم حصہ لینے سے نشو و نما پاتی ہے - ایسے ہی ماحول میں قیادت پروان چڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے - وہ لوگ جو عوامی زندگی سے الگ تھلگ رہتے ہیں اور ہنگاموں سے گھبراتے ہیں کبھی قیادت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے - اگر انھیں اتفاق سے جماعت یا قوم کی قیادت بھی مل جائے تو دوسرے ہوشیار ساتھیوں کے ہاتھ میں آلۂ کار بن جاتے ہیں -

"سید القوم خادمہم" قائد کی صحیح تعریف ہے - اپنے پسینے میں دوسروں کے لئے مسکراہٹ تلاش کرنا، اپنی محنت سے دوسروں کے لئے مسرت آگیں لمحات مہیا کرنا اصلی قیادت ہے تا وقتیکہ کوئی شخص اپنے میں ایثار کا مادہ نہ پیدا کرے اوروں کی قیادت نہیں کر سکتا ——— ——— اگر سید قاسم رضوی دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں انسانوں کے دلوں کے تاجدار بن گئے اور ٹیپو کے بعد جنوبی ہند کی دوسری عظیم شخصیت کہلانے کے مستحق قرار پائے تو اس کی یہی وجہ ہے کہ ان میں خلوص و سادگی کے تابناک جوہروں کے ساتھ ساتھ، ایثار و قربانی کا مثالی جذبہ پایا جاتا ہے - عمر بھر کی ساری کمائی ساری جائداد، گھر، گھر کا سازو سامان ——— سوائے کتابوں ——— کے قوم کے حوالے کر دینا گو ناقابل تصور ایثار ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے اور یہی ان کی قیادت کی تمہید بھی -

قیادت کے آرزو مند کو یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ زندگی ایک متحرک اور ترقی پذیر حقیقت ہے - تغیر و انقلاب اس کے لازمی عناصر ہیں - ذہنی اور جسمانی توانائیوں کو دل کھول کر استعمال کرنا چاہیئے - قیادت کا لفظ ہی حرکت کے مترادف ہے ——— مجسم حرکت !

زشرر ستارہ جویم، زستارہ آفتابے
سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

اس کا نعرہ ہونا چاہیئے ——— فلسفۂ حرکت و انقلاب پر ایمان ہی نے جناح کو قائد اعظم بنایا - کوئی چیز ان کے پاس ناممکن نہ تھی - جہد مسلسل سے خوابوں کو مجسم کیا جا سکتا ہے اور قائد اعظم نے کر دکھایا ——— ایشیا کی اس عظیم ترین شخصیت کی عظمت کا راز اس کی وہ انتھک مساعی ہیں جن کا سلسلہ، رشتۂ جسم و جاں کے ساتھ ٹوٹا ——— ناتوانی انتہا کو پہنچ چکی ہے - صرف پوست و استخواں باقی رہ گئے ہیں ڈاکٹر کلام کرنے سے روک رہے ہیں مگر وہ کئے جا رہے ہیں کیونکہ فرد کی زندگی کوئی زندگی نہیں، زندگی تو قوم کی ہوتی ہے - قوم زندہ ہے تو وہ بھی زندہ ہیں ابد الآباد تک !

گل میر سید بننے کے لئے کسی ایسے فن میں، جس سے عوام مستفید ہو سکتے ہوں، مہارت تامہ حاصل کرنا ہمیشہ فائدہ مند ثابت ہوتا ہے — یہ ایک عام مشاہدہ کر

کہ وہ شخص جو موسیقی، مصوری، شاعری، تحریر یا تقریر میں کمال رکھتا ہے، عوام کی نگاہوں میں خود بخود محترم ہو جاتا ہے اور لوگ ایسے فنکار کو آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ خصوصاً
تقریر کا فن تو ایسا ہے کہ اس کے بغیر قیادت کچھ پھیکی نظر آتی ہے۔ دیگر تمام ضروری صلاحیتوں سے لیس ہونے کے باوصف اگر قائد اپنے مافی الضمیر کو اچھے اسلوب
میں نہیں ادا کر سکتا تو وہ اپنے اثر کو دیرپا اور ہمہ گیر نہیں بنا سکتا۔ دنیا کے تمام عظیم قائدین پرجوش مقرر واقع ہوئے ہیں عوامی جذبات کو جس سانچے میں چاہا
ڈھال لینا ان کی خطابت کا ادنیٰ کرشمہ ہوتا ہے۔ تقریر کا فن دیگر فنون کی طرح مسلسل مشق سے حاصل کیا جا سکتا ہے ——— دنیا کے اردو
کے سب سے بڑے خطیب بہادر یار جنگ نے اس فن کو مسلسل مشق ہی سے حاصل کیا تھا اور اس طرح حاصل کیا تھا کہ دنیا کے چند گنے چنے مقرروں میں شمار
ہونے لگے۔ جن اصحاب نے بہادر خاں کی تقاریر سنی ہیں، خطابت کی سحرکاری کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ خطابت کی وجہ سے انہیں عوام پر ناقابل تصور حد تک
قابو حاصل تھا اور وہ اپنے زمانہ کے واحد قائد تھے کہ ان کے آگے کسی اور کی قیادت کے چراغ نہ جل سکے اگر کچھ دن اور جیتے ہوتے تو نہیں معلوم، اپنی خطابت
کی بدولت، قیادت کی کس منزل پر ہوتے!؟

ایک عالم قائد، دیگر قائدین سے بہرحال بازی لے جائے گا، مگر یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ایک قائد کو علوم میں تبحر حاصل کرنے کا شاذ ہی موقع ملتا ہے۔ دونوں
چیزوں کا ایک شخص میں ارتکاز کسی قدر مشکل ہے۔ اگر قائد، عالم بھی ہو تو کیا کہنے۔ علمیت سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے

مخالفین کی آراء کا احترام کرنے کا جذبہ خاص اہمیت رکھتا ہے، وہ لوگ قیادت میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے جو مخالفین کی الزام تراشیوں اور شور و غوغا
سے مشتعل ہو جاتے ہیں اور ذاتی توہین کو خندہ پیشانی سے برداشت نہیں کر سکتے۔ قیادت کے لئے تو ٹھنڈے خون اور فولادی ارادے کی ضرورت ہے اور یہ
چیز سابقتی معروضیات میں مسلسل حصہ لینے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ مختلف کھیلوں کے مقابلے ان خصوصیات کو اعلیٰ پیمانہ پر پیدا کر سکتے ہیں ——— گاندھی جی
اسی صفت کے باعث، مہاتما کہلائے۔ ان کی جنوبی افریقہ والی جدوجہد کا تصور کیجئے۔ کس قدر صبرآزما تھے وہ ایام ان کی زندگی کے! جس المیہ انداز میں ان کی
زندگی کا اختتام ہوا، وہ انہیں لافانی بنا گیا اور یہ موت انہوں نے مخالفین کا احترام کر کے ہی حاصل کی:

ایک اور چیز قیادت کی نشوونما میں نمایاں حصہ ادا کرتی ہے اور وہ ہے شان قلندری! قیادت کے متمنی انسان کو ہر لحاظ سے خودکفیل ہونا چاہیے۔
معاشی حیثیت سے مکمل آزادی نہایت ضروری ہے۔ وہ رزق جس سے پرواز میں کوتاہی آتی ہو قیادت کے لئے سم قاتل ہے۔ اس کے قطعاً یہ معنی نہیں ہے کہ
قیادت صرف سرمایہ داروں کو زیب دیتی ہے۔ دولت مندی، استغنا کسی طرح بھی ہم معنی نہیں اصلی تونگری تو حاجات کی کمی، کفایت شعاری، قناعت اور
سادہ زندگی میں پنہاں ہے۔ یہ صفات قیادت کے لازمی اجزاء ہیں۔ کر و فر اور طمطراق سے قیادت بھاگتی ہے

قیادت، قوم کو اپنے میں مجسم کر لینے کا نام ہے۔ عوام کی نفسیات کا گہرا مطالعہ اس کے لئے ناگزیر ہے اور اس سے واقفیت صرف عوام میں گھل مل کر
عوام کی بہبودی کے لئے کام کر کے حاصل کی جا سکتی ہے۔ بعض بڑے بڑے قائدین، اپنی قیادت کے نقطۂ کمال پر پہنچ کر، عوامی نفسیات سے ناواقفیت کی
بناپر، عوامی احساسات و جذبات سے معمولی بے اعتنائی برتنے کے باعث گوشۂ گمنامی میں پھینک دئے گئے۔
ایک شخص کے ابھر کر ڈوبنے اور دوسرے کے ڈوب کر ابھرنے کا راز، عوامی نفسیات سے واقفیت ہے اور بس!

وہی ملت ترقی کر سکتی ہے جس کے ہر فرد میں قیادت کے کچھ نہ کچھ جوہر ہوں۔ یہ غلط ہے کہ اگر تمام افراد قیادت کرنے لگیں تو انتشار پیدا ہو جائے گا کیونکہ
سچا قائد، سچا پیرو بھی ہوتا ہے ——— مولانا محمد علی کی قیادت سے کون انکار کر سکتا ہے اپنے دور کے چوٹی کے قائد ہونے کے باوجود جب
انہوں نے سمجھا کہ گاندھی جی کا راستہ صحیح ہے تو ان کی قیادت قبول کر لی

تعاون عمل اور بحیثیت جماعت کام کرنے کا جذبہ، ایثار، بلند اجتماعی نصب العین کا تعاقب اور خلوص، قیادت کے اجزاء میں سے چند ہیں۔ ہر فرد کا اولین [illegible] قوم کی عظمت
فرض ہے کہ وہ اپنی انفرادی شخصیت کی تہذیب و تکمیل میں اپنی ساری قوت صرف کر دے کیونکہ آگے چل کر انسانیہ
کا تصور کیجئے جس کا ہر فرد ———

"نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز"

رکھتا ہو۔

رجائی اور قنوطی

دنیا میں دو قسم کے آدمی پائے جاتے ہیں ——— یہ نہ سمجھئے کہ امیر اور غریب ——— فرض کیجئے دو آدمی ایک ہی رتبہ و مرتبہ یکساں دولت یکساں علم یکساں حیثیت والے لیکن جو چیز آپ کو دریا بہترت میں فرق کردے گی وہ ہے ان کے "نقطۂ نظر" کی دنیا — کہ ایک مسرور ہوگا اور ایک مغموم اور یہ محض ان کے ذہنی الجھاؤ اور اختلاف نظر کا جو ان کے دل میں مختلف اشیاء انسانوں اور واقعات سے پیدا ہوتے ہیں ——— خواہ کیسے ہی حالات میں انھیں رکھا جائے وہ اپنی آرام اور بے آرامی کو ضرور محسوس کریں گے — خواہ کیسی ہی صحبتیں ان کو میسر آئیں اگر ان کا دل بجھ گیا ہے ان کی روح سو گئی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت ان کے لبوں پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی کرن بھی پیدا نہیں کر سکتی — اور جو روح زندہ ہو اور دل جوان تو پھر سر پر آسمان ٹوٹ رہا ہوگا اور وہ مسکرا رہے ہوں گے — یہی "وہ چیز" ہے جو خلوت کو انجمن اور انجمن کو خلوت بنا دیتی ہے — "زندگی چار دنوں کی" اور زندگی کی بہاریں اس سے بھی کم — بقول غالب

اب یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے چاہے ہنس کے گذار دیں چاہے رو کے

ایسے آدمیوں کو چاہے کتنی ہی مسرور صحبتوں میں لے جایئے، کتنے ہی عمدہ کھانوں اور کتنے ہی عمدہ ملبوسات کی دنیا میں لے جایئے انھیں ہمیشہ شکایت رہے گی وہ کبھی مسرور نہیں ہوں گے، نہ انھیں کھانوں میں لطف آئے گا اور نہ ہی انھیں رنگ و بو کی یہ حسین دنیا اپنا بنا سکے گی!

جس حکومت میں آدمی رہیں گے وہ اچھی ہو یا بری ان کے لئے اس کے قانون میں کوتاہیاں اور اس کے نظام میں خامیاں نظر آئیں گی — خواہ کتنی ہی اچھی نظم ہو اور کیسا ہی عمدہ افسانہ اور کتنا ہی اعلیٰ مضمون ان کو کوئی نہ کوئی فی ایسی ملے گی جو اس کی ساری اہمیت ختم کرکے رکھ دے گی —

یہ دو قسمیں رجائیوں اور قنوطیوں کی سمجھی جاتی ہیں ——— ——— رجائیوں کی دنیا میں روشنی، زندگی اور جوش عمل پایا جاتا ہے اور برخلاف اس کے قنوطی ؎

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

کی تفسیر ہوتے ہیں — انھیں صرف ایسی مثالیں، ایسے نتائج اور ایسی خصوصیات رکھتی ہیں کہ ہر ارادہ مفلوج، ہر عمل بے عمل اور ہر تدبیر الٹی ہو کے رہ جاتی ہے — جس محفل میں جائیں گے وہاں کوئی نہ کوئی بات ایسی کریں گے کہ سارے مہمانوں کی مسرتوں پر اوس پڑ کے رہ جائے گی — زندگی کا ہمیشہ تاریک رُخ دیکھتے ہیں اور اپنے مستقبل کو اپنے ہاتھوں سے قبر کھود کر گمنامیوں کے اندھیروں میں دفن کر دیتے ہیں —

ایسے آدمیوں کے ساتھ تو چاہیئے کہ جتنی ممکن ہے ہمدردی برتی جائے اور کوشش اس بات کی کی جائے کہ کسی طرح ان مردہ قالبوں میں جان پڑے ——— وہ بھی انسان ہیں تو حق انسانیت ادا کریں اس سلسلے میں امریکہ اور لندن میں بہت بڑے بڑے اسکول کالج بھی قائم ہیں — تاکہ کسی طرح انسانی سوسائٹی کا کوئی فرد مفلوجیت کے مرض سے نجات ملے —

(اور جو زندہ دل ہوں ان کو ایسی تعلیم دی جائے کہ ان کی یہ عادت مستحکم ہو جائے ؎

(ماخوذ)

خاص سائیکولوجی اردو کے لئے

آپ کا بچّہ

نسیم ناظری

آپ اگر چاہیں تو قوم و ملک میں ایک نئی روح پھونک سکتی ہیں اگر آپ واقعی پرخلوص طور پر کوشش کریں تو قومیت کا ایک اعلیٰ معیار قائم ہو سکتا ہے۔ صرف آپ کو اپنے اندر دل بیدار پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ کبھی آپ نے سوچا ہے کہ آپ کی گود میں وہ بچے پل رہے ہیں جو آگے چل کر قوم و ملک بنانے یا بگاڑنے کے ذمہ دار ہوں گے اگر اس وقت بچوں کی تعلیم و تربیت ایک اعلیٰ معیار پر ہو (جو ذرا بھی مشکل نہیں) تو آئندہ قوم ایک معیاری قوم اور مثالی ملت بن سکتی ہے۔ اب آئیے میں آپ کو بتاؤں کہ آپ بچوں کی صحیح پرورش و پرداخت میں کن باتوں کا کس طرح خیال رکھیں کہ یہ بچے آگے چل کر اقبال کے شاہین زادے جناح کی امید وں کے تارے اور ملک کی بہترین ہستیاں بن سکیں۔

بچوں کی تعلیم کا خیال تو والدین کو ہوا کرتا ہے اور وہ اسے بقدر ظرف و جرات پورا بھی کرتے ہیں لیکن جو باتیں تعلیم سے زیادہ ضروری ہیں ان کا کچھ بھی خیال نہیں کرتے۔ اچھی تربیت بہت ہی کم والدین اپنی اولاد کو دیتے ہیں اور یہی وہ ضروری چیز ہے جس پر انسانیت اور شخصیت کی بنیاد پڑتی ہے۔ ایک بچہ آئندہ زندگی میں کس قسم کا انسان ہوگا اور کیسی شخصیت کا مالک ہوگا اس کا انحصار بڑی حد تک بچے کے اس ماحول پر ہے جو اسے تین سال سے لے کر بارہ سال کی عمر تک ملتا ہے۔ تین سال سے قبل کی عمر کے بچے تمام ایک جیسے ہوتے ہیں۔ (بعض ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ کچھ باتیں بچوں میں بطور وراثت کے ہوتی ہیں۔ لیکن اکثر اس کی تردید میں ہیں) بچے اوائل عمری (تین سال سے لیکر تقریباً بارہ سال تک) جس طرح کی باتیں یا حرکات سیکھتے ہیں آگے چل کر وہ بہت حد تک ان کے اور ان کی شخصیت کے بنانے اور بگاڑنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں اسی عمر میں بچے بہت سی اچھی باتیں سیکھتے ہیں جیسے ایمانداری۔ فرمانبرداری۔ نفاست۔ تحمل۔ رحمدلی۔ وقت کی پابندی وغیرہ اور بہت سی خراب عادتیں بھی اسی دور میں جڑ پکڑتی ہیں۔ یسوعیوں نے شاید اسی اصول کو مدنظر رکھکر تعلیم کا ایک اچھا قاعدہ نکالا کہ ہمیں بچہ درکار ہے اور آپ کو آدمی کی ضرورت ہے۔

ورڈ سورتھ کا خیال ہے بچہ آدمی کا باپ ہے۔ ایک انسان کے مزاج اور اس کے حرکات و صفات کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کا لگاؤ بڑی حد تک اس انسان کے اوائل عمری کے ماحول سے ہے۔ اوائل عمری کے دوران میں ہر ایک بچہ انہیں سب باتوں اور عادتوں کو اختیار کرتا ہے جس سے اس کو کسی قسم کا بھی "نفع یا فائدہ" ہو (صرف ذرا ایک وقتی فائدہ بھی ایک "نفع" ہو سکتا ہے) بچہ ہمیشہ وہ کرتا ہے جس میں اسے نفع کی توقع ہوتی ہے لیکن "نفع" کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ مادی یا جنسی شکل میں اور ہمیشہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ "نفع" صرف شروع ہی میں ہو جب کہ ایک بچہ کسی عادت کو سیکھ رہا ہے (بہت سی باتیں ایک بچہ غیر شعوری طور پر بھی سیکھتا اور نقل کرتا ہے جیسے مختلف چیزوں کے مختلف ناموں سے ان کا آپس کا فرق اور امتیاز) اب آپ ایمانداری اور راست گوئی کو لیں اگر ایک بچہ کو "نفع" اس میں ہے کہ وہ مناسب موقعوں پر جھوٹ بولے تو پھر وہ آگے چل کر اور بے ایمان ہو جائے گا عادتیں فطرت ثانیہ جب بن جاتی ہیں تو آسانی سے نہیں چھوٹتیں) اس کے برخلاف اگر ایک بچہ کو سچ بولنے پر کسی قسم کا "فائدہ یا نفع" پہنچتا ہے تو بڑھ کر فطرتاً صادق ہوگا۔ اور جب ایک عادت خواہ اچھی ہو یا بری فطرت کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو پھر اس کا سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اس سے کسی قسم کا "فائدہ" ہو رہا ہے یا نہیں۔ ایک دفعہ جب ایک اچھی بات یا عادت فطرت میں تبدیل ہو گئی تو بہت ممکن ہے وہ کسی قیمت یا حالت پر بھی نہ چھوٹے۔ ایک مرتبہ پھر میں دہراتا ہوں کہ ایک بچہ ان باتوں یا حرکتوں کو اختیار کر سکتا ہے جس سے اسے کسی قسم کا "فائدہ یا نفع" پہنچے یا اس کا امکان ہو۔ آپ اس کا ضرور خیال رکھیں کہ وہ اچھی باتیں جو آپ اپنے بچے کو سکھانا چاہتی ہیں اس کا کچھ بھی "فائدہ یا نفع" اس بچہ کو کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملے۔ ورنہ یہ سمجھ لیں کہ ڈر یا خوف کی بنا پر آپ اس بچہ کو سدھار تو ضرور لیں گی لیکن یہ چیز بہت ممکن ہے صرف وقتی ہو۔ اس کے علاوہ آئندہ زندگی میں

اس کا بڑا گہرا اور خراب اثر پڑے گا آپ نے یہ دیکھا ہوگا کہ اگر ایک بچہ بستر پر سوتے ہوئے پیشاب کر دینے کا عادی ہے تو پھر آپ اس کو ہزار مرتبہ ڈانٹیں، ماریں یا یہ کہیں کہ "میں اس کو پسند نہیں کرتی" لیکن اس کی یہ عادت نہیں چھوٹتی برخلاف اگر آپ اس بچہ سے اس کی عادت سے باز رکھنے کے لئے اس طرح کی کوئی بات کریں جس سے اس کے لئے کچھ "فائدہ یا نفع" کی صورت ہو تو پھر بچہ اس عادت کو ضرور ترک کر دے گا - ایک گود کے بچہ تک کو بھی کچھ حاجتیں ہوتی ہیں - جیسے جسمانی آرام - غذا وغیرہ - آپ نے دیکھا ہوگا بچہ آپ کو متوجہ کرنے کے لئے خواہ مخواہ بھی بھوک کی خواہش (رو کر) ظاہر کرتا ہے - رفتہ رفتہ بچہ اس شخص سے مانوس ہو جاتا ہے جو اس کی فطری ضرورتیں پورا کرتا ہو اور وہ ان فطری ضرورتوں کو اس وقت محسوس کرتا ہے جب کہ اس سے کچھ "فائدہ" پہنچتا ہو کہنے کا یہ مطلب ہے کہ عام طور پر ایک بچہ یہ جان لیتا ہے کہ فلاں فلاں حرکات یا چیزیں بہت ہی خوش گوار "فائدہ" دیتی ہیں (اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شعوری طور پر پہچانتا ہے) - اس لئے وہ بچہ آگے چل کر جیسے جیسے بڑا اور سمجھدار ہوتا جاتا ہے ان حرکات وعادات کو اختیار کرتا جاتا ہے جس سے اسے پچھلی زندگی میں "فائدہ یا نفع" ہوا تھا اوائل عمری کے ماحول کا خیال آپ کو لازمی ہے - فرض کر لیجئے ایک بچہ جب روتا ہے آپ اسے گود میں اٹھا لیتی ہیں - اسے چمکارتی یا پھر کسی اور طور سے بہلانے کی کوشش کرتی ہیں - ایک دوسرا بچہ روتا ہے اور اسے کوئی بھی گود میں نہیں اٹھاتا نہ ہی بہلاتا ہے تو پہلی صورت میں آپ دیکھیں گی کہ وہ بچہ وقتاً فوقتاً روتا رہے گا - اور بغیر کسی ضرورت کے بھی روئے یا چلائے گا - کیونکہ وہ غیر شعوری طور پر محسوس کرتا ہے کہ اس کے رونے یا چلانے کا ایک فائدہ اس شکل میں ہوتا ہے کہ کوئی اسے گود میں اٹھا کر ٹہلاتا بہلاتا ہے - دوسری صورت میں وہ بچہ دیکھتا ہے کہ رونے اور چلانے سے کوئی فائدہ نہیں - اس طرح یہ بچے آیندہ بڑے ہو کر دو مختلف طبیعت اور مزاج کے ہو جاتے ہیں - دوسرا بچہ رونے کو جب نفع بخش نہیں سمجھتا (غیر شعوری طور پر) تو وہ کسی دوسرے اچھے طریقے سے والدین کو متوجہ یا ان کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے - بڑھ کر ایسے دونوں بچے زندگی میں جدوجہد کے لئے دو مختلف قسم کی راہیں اختیار کر لیں گے - ایک ہمیشہ قنوطی طبیعت کا مالک ہوگا - اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے میں رو اٹھے گا - خواہ مخواہ کی شکایتیں اور معذرت کرتا رہیگا ہمدردی کا طالب ہر فرد وبشر سے ہوگا - ممکن ہے جسمانی طور پر بھی نحیف اور لاغر ہوتا جائے - ہر چیز اور بات کے لئے خود کو نا اہل سمجھ کر مورد الزام ٹھہرائیگا۔ ایسے انسان ہمیں روزانہ بہتیرے ملتے ہیں جنہیں دنیا کی ہر چیز سے شکایت ہوتی ہے - خود اعتمادی کے ذرا بھی مالک نہیں ہوتے ان کی خوشی میں بھی رونے کا شائبہ ہوتا ہے - ایسے لوگ Neurosis کے شکار ہو جاتے ہیں ان کا علاج ایسی حالتوں میں صرف ایک psycho-therapist ہی کر سکتا ہے برخلاف اس کے دوسرا بچہ جیسے جیسے عمر کے زینہ پر چڑھتا جائے گا اپنی ضروریات کو خوش خوش حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور اس طرح زندگی کے حوادث سے ہنستا کھیلتا گذرے گا -

ایک تیسرا بچہ جب دیکھتا ہے کہ رونا اس کے حق میں مفید نہیں بلکہ فرمانبرداری اور والدین جو بھی چاہیں ان کے پورا کرنے ہی میں اس کی فلاح وبہبودی ہے تو پھر ایسے بچے بڑھ کر خوشامدی اور "سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے" کے اصول پر کاربند ہوں گے -

ایک چوتھا بچہ جب دیکھتا ہے کہ اس کے والدین صرف یہ چاہتے ہیں کہ انھیں کسی حالت میں بھی تنگ نہ کیا جائے اور خاموشی اور امن انھیں ہر قیمت پر عزیز ہے تو ایسے بچہ کی فطرت آیندہ ایک مختلف ہی راستہ پر ہوگی - طبیعت میں ازادی ہٹ دھرمی اور زود رنجی ہوگی

آپ ہمیشہ کوشش کریں کہ بچے میں خود اعتمادی پیدا ہو - اس کی ذات سے متعلق جتنے بھی کام اور چیزیں ہوں اس پر ہی چھوڑ دیں - وہ خود جب بھوک لگے کھائے ضرورت پر لباس تبدیل کرے - اپنی چیزوں کی نگہبانی کرے اور خود ہی جس طرح چاہے کھیلے - ایسے بچے زندگی کی مصیبتوں کو خندہ پیشانی سے جھیل لیں گے - کبھی کسی حالت میں نہیں گھبرائیں گے - انھیں خود پر بھروسہ ہوگا - اپنی ذمہ داری اور فرض خود کریں گے - اگر آپ ایسا نہیں کرتیں بلکہ خود ہی بچہ کا سارا کام انجام دیتی ہیں - یہاں تک کہ خود اس کی تفریح کے لئے اس کے ساتھ کھیلتی بھی ہیں تو ممکن ہے وہ بچہ زندگی کی پریشانیوں کا تنہا کبھی نہ مقابلہ کر سکے - ہمیشہ دوسروں کے سہارے کا محتاج ہوگا -

آپ کبھی بچہ کا مذاق نہ اڑائیں - کبھی کسی بات کو جبریہ طور پر نہ منوائیں - بلکہ اسے خود سوچنے سمجھنے اور کرنے کا موقعہ دیا کریں کسی بھی فعل یا بات سے بچہ کو ہرگز یہ نہ معلوم ہونے دیں کہ آپ اس سے نفرت کرتی ہیں یا اسے کسی حرکت کی بنا پر پسند نہیں کرتیں - اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ بچہ سے عاجز آ کر اسے بری طرح جھڑک دیتی ہیں اور یہ کہتی ہیں کہ "میرے سامنے سے دور ہو جا" ایسی حالت میں بچہ کی ہمیشہ کوشش ہوگی کہ ماں باپ کی نظروں سے دور اور اوجھل رہنے ہی میں اس کی بہتری ہے

وہ ایسی حرکتوں سے گریز کرے گا جس کی وجہ سے آپ اس کی طرف متوجہ ہوسکیں ۔ رفتہ رفتہ وہ بہت زیادہ فرمیلا بنتا جائے گا ۔ ہمیشہ لوگوں کے سامنے آتے ہوئے یا ان سے گفتگو کرتے ہوئے گھبرائے گا ۔ ہر کام کے کرنے میں جھجک محسوس کرے گا ۔

مجھے اس سے انکار نہیں کہ بعض حالتوں میں Spare the rod, spoil the child کے اصول پر کاربند ہونے سے بچہ سدھر سکتا ہے لیکن ہمیشہ نہیں ۔ بچہ کی کسی بھی بری حرکت یا عادت کو روکنے کے لئے آپ صرف اسے متعدد بار یہ دکھا دیں کہ اس کی ایسی حرکت سے اس کا خود کیا نقصان ہوتا ہے اور یہ کہ اس عادت کے بجائے اگر وہ دوسری اچھی عادت سیکھتا ہے تو اس سے اس کا کیا فائدہ ہوتا ہے ۔ اور پھر اس میں ذرا خود اعتمادی پیدا کر دیں جیسے "بھئی یہ تمہاری چیز ہے تم چاہو تو اسے رکھو یا بگاڑ دو" وغیرہ وغیرہ

بعض دفعہ بچہ یکایک کھیلتے کھیلتے گھبرا اٹھتا ہے اور پھر سست پڑ جاتا ہے ۔۔ آپ اس کے تفریح کے سامان میں تبدیلی کر دیں ۔ ذرا اس کا کپڑا گندہ ہو گیا ہو تو بدل دیں پھر آپ دیکھیں گی اس بچہ میں ان معمولی تبدیلیوں کی بنا پر سرگرمی آگئی ہے ۔ ایک دفعہ میرے محترم دوست میاں مُنّی (عمر پانچ سال) منہ لٹکائے میرے پاس آئے ۔ شاید انھیں ماں یا بھائیوں میں سے کسی نے ڈانٹ بتائی تھی ۔ میں نے صرف ان کے لباس میں تبدیلی اس طور پر کر دی کہ آستینوں کو اوپر چڑھا دیا کالر کے بٹن کھول دیے ۔ دوسرے بٹن لگا دئے ۔ ان کے جوتوں پر پالش کر دی اور ذرا منتشر بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر دی ۔ آپ جانئے اس کا بڑا اچھا اثر ہوا اور وہ نہایت خوش خوش مجھ سے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے ۔ اس کے بعد میرے ہی کمرہ میں کھیلنے لگے ۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بچوں پر لباس کا بڑا اچھا اثر پڑتا ہے لوگوں کو شاید یہ کہتے سنا ہوگا کہ "بھئی عید تو بچوں کی ہوتی ہے" عید کے موقعہ پر بچے بہت خوش خوش نظر آتے ہیں ۔ اکڑ اکڑ کر چلتے ہیں ۔ باتیں بڑے سلیقے سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کی وجہ صرف ان کے رنگین بھڑکیلے اور نئے لباس ہوتے ہیں ۔ بچوں کی روزانہ زندگی میں صرف لباس کے ذرا تبدیل کر دینے پر کافی سرگرمی اور رعنائی آجاتی ہے ۔ ان کا موڈ بہت حد تک درست اور قابل تعریف بن جاتا ہے ۔ لباس کی تبدیلی سے نہ صرف ان کے موڈ (مزاج) پر اثر ہوتا ہے بلکہ طبیعت میں نفاست بھی آجاتی ہے

بچہ جب تک ایسی عمر کو نہ پہنچ جائے جب کہ وہ خود اہم ذمہ داریوں کو محسوس کرے اس وقت تک آپ اس پر کسی بڑی ذمہ داری کا بوجھ نہ ڈالیں ۔ آپ اس کے سامنے کسی بات کا ایک ایسا اعلیٰ معیار نہ رکھیں جسے وہ کسی طرح حاصل نہ کر سکتا ہو ۔ جو اس کی بساط سے باہر ہو میں ایک لڑکے کو جانتا ہوں جو کہ نہایت ہی ذہین اور تیز قسم کا ہے ۔ اس کے والد ہمیشہ اس سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ ان کی طرح اول درجہ کا طالب علم ہو ۔ وہ اس کے اسکول کے رپورٹ کو دیکھ کر اس کی صلاحیتوں اور ترقیوں کی کبھی تعریف نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ "میاں ! یہ تو کچھ بھی نہیں ۔ میں اپنے زمانہ میں اتنے نمبر (فرض کیجئے ۹۰) اس نصاب میں لایا کرتا تھا" وغیرہ یا پھر "میں اسکول کا بہترین طالب علم تھا (صرف لکھنے پڑھنے کی حیثیت سے)" انھوں نے اس لڑکے کے سامنے ایک ایسا مقصد حیات قایم کر رکھا ہے کہ وہ اسے حاصل نہیں کر سکتا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اب اسکول جانے سے کتراتا اور گھبراتا ہے اور اس طرح اسکول کو بچنے کے لئے غیر شعوری طور پر خود میں بیماریاں پیدا کر لی ہیں (اکثر ہم غیر شعوری طور پر خود میں بیماری پیدا کر لیتے ہیں ۔ اس کی وجہ ڈر اور خوف ہوا کرتا ہے) بچہ اگر ذرا بھی کوئی اچھا کام کرے یا ان میں ترقی دکھلائے تو آپ اسے اس کا اجر ۔ فائدہ ۔ کی شکل میں ضرور دیں خواہ آپ اس کی پیٹھ ہی کیوں نہ ٹھونکیں لیکن کسی نہ کسی طور پر اس کی حوصلہ افزائی ضرور کریں ۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ والدین صرف ایک اولاد (یا پہلی اولاد) ہونے کی وجہ سے اسے حد سے زیادہ پیار کرتے ہیں اور اس طرح اسے ایک حد تک بگاڑ دیتے ہیں ۔ اس کے ہر جائز و ناجائز خواہشوں کو ہر قیمت پر پورا کرتے ہیں ۔ اس کے ہر آرام و آسایش کا انتہائی خیال رکھتے ہیں کافی بڑی عمر کو پہنچ جانے تک بھی اسے "بالکل بچہ" ہی سمجھتے ہیں ۔ ایسے بچے آیندہ زندگی میں naurases مرض کے شکار ہو جاتے ہیں ۔ ان میں کسی بھی کام کے کرنے یا سوچنے کا ایک سرے سے فقدان ہو جاتا ہے ۔ ذرا بھی خود اعتمادی نہیں ہوتی ۔ ہمیشہ دوسروں کے سہارے کے محتاج ہوتے ہیں ۔ زندگی میں قدم قدم پر انھیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے ۔ بعض والدین بہت بیجا قسم کی پابندیاں اپنی اولاد پر قایم کر دیتے ہیں ۔ ایسے بچے کو جب بھی زندگی میں آزادی نصیب ہوتی ہے وہ ان افعال کو ضرور کرتا ہے جس سے اس کے والدین نے اسے خوامخواہ روکنے کی کوشش اس کی پچھلی زندگی میں کی تھیں ۔ ممکن ہے وہ آوارہ اور بدچلن بھی بن جائے ۔ آپ کی یہ کوشش ضرور ہونی چاہیئے کہ بچہ بُری صحبتوں سے بچے یا بری عادتیں نہ اختیار کرے ۔ لیکن اس سے باز رکھنے کے لئے بیجا قسم

کی پابندیاں اور بندشیں نہ ڈالیں۔ بلکہ آپ یہ ظاہر کریں کہ " ہمیں تم پر اعتماد اور بھروسہ ہے کہ تم بری عادتوں کو نہ پکڑو گے" وغیرہ۔ اسے وہ فائدہ ہوگا
یا سمجھائیں جو اس بری صحبت یا عادت سے پرہیز کرنے پر ملے گا۔ آپ ہمیشہ بچے کو سوچنے سمجھنے کا موقعہ خود اس کے اپنے طور پر ضرور دیں Naill کہتا
Fascim begins on the nursey with the "first interference of child nature کہ فا
اسی وقت بیدار ہو جاتی ہے جب کہ بچے کے ابتدائی سالوں میں ہی اس کی فطری اپج اور نشوونما کو چھیڑا جاتا ہے۔
بچہ جس طرح بھی کسی کام کو کر رہا ہو آپ اسے ویسا ہی کرنے پر چھوڑ دیں۔ ہاں۔ اگر کبھی بچے کے اس فعل میں بری حد تک غلطی ہو تو آپ اسے بتائیں
کہ ایسے نہیں بلکہ اس طرح کرنے پر زیادہ "نفع بخش" ہوگا۔ آپ دیکھیں گی کہ بچہ فوراً آپ کی رائے کو اگر پہلے سے زیادہ "فائدہ بخش" ہے تو اس کو فوراً
تسلیم کرے گا۔

بہتیرے بچوں میں معمولی چیزوں بلکہ چوری کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اس کی وجہ زیادہ تر والدین کے ظاہری محبت کی کمی ہے۔ ایسے بچہ پر زیادہ سے زیادہ
محبت جتائیں۔ اسے ڈانٹیں یا ماریں نہیں بلکہ آپ جہاں تک ممکن ہو اس کی ضروریات کی چیزیں مہیا کر دیں۔ Wilfred کا کہنا ہے کہ وہ ایسے ننھے
چوروں کو کچھ پنس چوری کے جرم میں دیا کرتا ہے۔ وہ آگے چل کر اس عادت کو خود چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ان کے اس عادت
کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ بالکل نہیں۔ بلکہ وہ انہیں ایسی معقول رقم دیدیتا ہے جس سے اگر وہ چاہیں تو اس چیز کو خرید سکتے ہیں اور جب بچے یہ
سمجھ لیتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو وہ چاہیں خرید سکتے ہیں یا انہیں مل سکتی ہے تو پھر ان کی عادت ختم ہو جاتی ہے۔
چونکہ بچے ایک اچھی عمر تک والدین کے ماحول میں رہتے ہیں۔ اور اس دوران میں خصوصاً وہ ماں سے زیادہ مانوس ہو جاتے ہیں۔ اس لئے بچے
غیر شعوری طور پر ان سب عادتوں برائیوں یا خوبیوں کو سیکھ لیتے ہیں۔ جو ان کے والدین میں ہوتی ہیں۔ اگر ماں کسی چیز سے خوف کھاتی ہے تو بچہ بھی غیر
شعوری طور پر اس چیز سے ڈرنا "سیکھ" جاتا ہے۔ میں خود مکڑوں سے بہت زیادہ ڈرتا ہوں۔ یہاں تک کہ اگر جس کمرہ میں ایک بڑا مکڑا ہو میں
اس کمرہ میں کسی قسم کا کوئی کام سکون و اطمینان سے نہیں کر سکتا۔ اس قسم کا غیر معمولی خوف مکڑوں سے میں نے ماں سے غیر شعوری طور سے لیا ہے۔
میری ماں بھی مکڑوں سے بے پناہ ڈرا کرتی تھیں۔ ایسے غیر معمولی قسم کے ڈر یا خوف دور کئے جا سکتے ہیں۔
تو آپ کی یہ کوشش بلیغ ہونی چاہیئے کہ کم از کم آپ اپنی بُری عادتوں کا اظہار کبھی بھولے سے بھی بچہ کے سامنے نہ کریں آپ اپنی
فطری کمزوریوں کو بچہ کے سامنے نمایاں نہ کریں ورنہ ان کا بڑا گہرا اثر بچہ کے دل و دماغ پر ہوگا۔ بہتیری ناسمجھ مائیں بچوں کو رونے سے باز رکھنے کے لئے انہیں
ڈراتی دھمکاتی ہیں جیسے "وہ دیکھو بوڑھا آرہا ہے تمہیں پکڑ کر جھولی میں رکھ لے گا" وغیرہ۔ یا اسی طرح کے کچھ فرضی قسم کے ڈر یا خوف بچہ کے دل میں پیدا
کر دیتی ہیں لیکن اس کا خراب اثر آئندہ بچہ کی زندگی میں اس کی شخصیت پر پڑتا ہے۔ آپ بچہ کی بیجا تعریف بھی نہ کریں۔ بچہ کبھی "خود نمائی" بھی کرتا ہے آپ
اس کی بڑی تعریفیں کرتی ہیں۔ یا دوسرے لوگ کہتے ہیں "بھئی یہ بچہ بڑا ہی تیز اور چالاک ہے" وغیرہ ایسے بچے آگے بڑھ کر سرکش اور نافرمان بن سکتے
ہیں۔ کبھی بچہ اگر کوئی معقول بات کہہ رہا ہو یا کوئی مناسب رائے دے رہا ہو تو آپ اسے ضرور مان لیں اور اس کو سراہیں۔ اس قسم کی حوصلہ افزائی
بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ آپ اُسے ایسے موقعوں پر یہ دکھائیں کہ " تمہاری جائز باتیں میں تسلیم کرتی ہوں اور انہیں پورا بھی کر دیتی ہوں۔ تم بھی میری جائز
باتیں مانو اور پورا کرو" ایک دفعہ میں نے ایک بچہ کو اپنی ماں سے یہ کہتے سنا کہ " میرا کپڑا بدل دیجئے۔ گندہ ہو گیا ہے" ماں نے جھڑک کر کہا " ہٹو جاؤ۔ تم
کپڑے بہت گندے کرتے ہو۔ میں نہیں بدلوں گی" اور وہ بچہ پہلے تو روٹھ گیا پھر کوئی دوسرا بہانہ کر کے رونے اور چلانے لگا۔ اس میں کوئی غیر شعوری طور
پر ماں کے خلاف ضد پیدا ہو گئی کیونکہ اس کی جائز بات نہیں مانی گئی۔ وہ اپنی ضد کو کسی دوسری شکل میں منوانا چاہتا تھا لیکن شائد ماں اس سے بہت زیادہ
ضدی تھی۔ کبھی کبھی آپ بچے کو کسی مناسب موقعہ پر اس کی حرکت سے باز رکھنے کے لئے "خوش اعتقادی" سے کام لیں۔ جیسے مہمانوں کے سامنے بچہ کسی
بات پر مچل رہا ہے اور آپ کو اس کی کسی حرکت ناگوار گذر رہی ہے۔ آپ کہیں "بھئی تم کو تو میں بہت سمجھدار اور عقلمند سمجھتی ہوں اور تم بیوقوفوں جیسی
حرکت کرتے ہو" آپ اس پر ظاہر کریں کہ تم کو میں کتنا بلند کردار کا بچہ سمجھتی ہوں اور آپ جانئے "خوش اعتقادی" کا بڑا ہی اچھا اثر بچہ پر پڑتا ہے۔ کبھی آپ اسے
کسی حرکت سے باز رکھنے کے لئے یہ ظاہر کریں جیسے آپ اس سے روٹھ گئی ہوں اور یہ کہ آپ کو اس کا اپنے مفاد کے لئے منانا ضروری ہے اور آپ اس وقت اس بچہ سے

مَن جائیں گی جب کہ وہ فلاں حرکت کو چھوڑ دے گا۔ میرے محترم دوست میاں ہیّ (بعض شریر بچوں کی دوستی ہی اچھی ہوتی ہے ورنہ آپ جانیئے آپ کے غائبانہ آپ کی چیزوں کا وہ جائز استعمال شروع کر دیں گے کہ توبہ بھلی) ایک دفعہ جب کہ میں مطالعہ میں مصروف تھا آ دھمکے اور لگے کتابوں کو "درست" کرنے۔ قلم یہاں پھینکا۔ دوات وہاں ڈالی۔ میں نے کچھ اس طرح کا ان پر ظاہر کیا جیسے اب میں ان سے قطعی نہیں بولوں گا اور تھوڑی دیر کے لئے جیسے سچ مچ ان سے روٹھ گیا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ وہ تھوڑی دیر میرا چہرہ دیکھتے رہے (شاید منانے کی کوئی معقول تدبیر سوچ رہے تھے) پھر میرے گلے میں اپنے ننھے ہاتھوں کو ڈال کر گویا ہوئے۔ "آپ مجھے چاکلٹ لا دیں گے نا بھیا" اس پر بھی جب میں خاموش رہا تو وہ صلح کے موڈ میں آ گئے۔ پھر مجھے تنگ کرنا چھوڑ کر خاموشی سے میری ایک کتاب کی تصاویر دیکھنے میں محو ہو گئے۔ بچہ ہر اس شخص کا غیر شعوری طور پر لحاظ یا خیال کرتا ہے جو اس کو کچھ بھی 'فائدہ' پہنچائے۔ میں شام کو جب بھی سیر کرنے کے لئے نکلتا ہوں تو پوچھتا ہوں "ہیّ میاں: میں ٹہلنے جا رہا ہوں۔ کیا تم نہیں چلتے" اس طرح وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بھی گویا ایسی ہستی ہیں جن کا میرے ساتھ ٹہلنے جانا ضروری ہے اور پھر وہ فوراً جواب دیتے ہیں "آ رہا ہوں بھیا"

بعض مائیں شوہر سے یا کسی دوسری وجہ سے رنجش پہنچنے پہ اپنا سارا غصہ اولاد پر اتارتی ہیں اور بیچارے کی مفت میں شامت آ جاتی ہے۔ آپ تو کبھی ایسا نہیں کرتیں؟ کبھی آپ اگر بچہ کے سامنے یہ وعدہ کر لیں کہ "بھئی اگر اس حرکت کو چھوڑ دو گے یا تم ایسا کرو گے تو میں تمہیں فلاں چیز دوں گی" اگر بچہ اس حرکت کو چھوڑ دے یا اس بات کو پورا کر دے تو آپ اپنے وعدہ کو ضرور پورا کریں۔

ایک دفعہ میاں ہیّ میرے ساتھ مینا بازار دیکھنے گئے۔ وہاں یہ میری گود میں بیٹھے ہوئے پریڈ وغیرہ دیکھ رہے تھے۔ لگے اونگھنے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ سو جائیں کیونکہ مستقل گود میں اٹھائے اٹھائے پھرنا ایک زبردست مصیبت تھی (خصوصاً ایسے موقعوں پر جیسے مینا بازار)۔ میں نے کہا "اگر تم پریڈ دیکھتے رہو گے اور نہ سوؤ گے تو تمہیں بہت سا چاکلٹ دوں گا" یہ جاگتے رہے اور پھر جب میں کوئی دو تین گھنٹہ بعد واپس چلنے لگا تو گویا ہوئے "آپ نے کہا تھا چاکلٹ دیں گے" اور مجھے وعدہ پورا کرنا پڑا کیونکہ اگر نہ کرتا تو پھر وہ شاید میری کسی بات کو کبھی ماننے کے لئے تیار نہ ہوتے۔ اپنے فائدہ کی باتیں بچے خوب یاد رکھتے ہیں۔ آپ جیسا بھی وعدہ کریں اسے ضرور پورا کریں۔ اگر آپ اس کے سامنے یہ عہد کرتی ہیں "اگر تم فلاں فلاں حرکتیں پھر کرو گے تو تمہیں فلاں سزا دوں گی" اگر وہ ویسی حرکت پھر کرتا ہے تو آپ اُسے ضرور وہی سزا دیں جس کا آپ نے بچہ کے سامنے عہد کیا تھا۔ ورنہ شاید آئندہ وہ آپ کی باتوں کا ذرہ برابر بھی پروا نہ کرے گا۔ "بس یہ یوں ہی ڈراتی ہیں" دیکھئے کبھی اس قسم کا عہد نہ کریں جیسے "میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گی"۔ انسان میں غصہ اور نفرت کا مادہ محبت اور ہمدردی سے زائد ہوتا ہے۔ اگر آپ کبھی غصہ میں کسی قسم کی سزا کا عہد بھی کریں تو کم از کم یہ ضرور دیکھ لیں کہ سزا بظاہر سخت ہے اور آپ اسے موقعہ پڑ جانے پر دے سکتی ہیں، جس گھر میں بچے کے لئے ڈر اور خوف ہو وہاں بچے جھوٹ بولنا ضرور تا اور بہت حد تک مجبوراً سیکھ لیتے ہیں۔ جیسے کبھی کسی نقصان کے ہو جانے پر آپ بچہ کو مارتی ہیں اور پھر اگر اس سے محض اتفاقاً کسی دوسری چیز کا نقصان ہو جائے تو وہ مار کے خوف سے مجبوراً (غیر شعوری طور پر) جھوٹ بولنا سیکھے گا۔

(بقیہ از صفحہ ۲۷)

یہ تھا اس کا لائحہ عمل جو اس نے مرتب کر لیا تھا اور اب اس کی روشنی میں آگے بڑھنے پر آمادہ ہو چکا تھا ———— اور اسکول کے ماحول میں وہ خدمت خلق اور تعمیر اخلاق کے ایسے بلند مقاصد کے حاصل کرنے کے سلسلہ میں وہ اپنی تمام تعمیری صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے گا۔ وہی خود اب دوسروں سے ملازمت کی بھیک مانگنے والا محمود آج خود اپنے اندر ایک طرح کی خود اعتمادی محسوس کر رہا تھا

شام ہو رہی تھی۔ ایک یاس و حرماں کی کیفیت آسمانوں پر طاری تھی۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور محمود کی زبان پر اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا یہ شعر بے ساختہ جاری تھا۔

تو اے مسافرِ شب: خود چراغ بن اپنا!
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

شائد اس نے امید کے چراغ کو بجھا کر اپنی زندگی کی تاریکیوں کو یقین کی روشنی سے منور کر لیا تھا!!

تحتِ شعور!

کیا ہے؟ اُس تک انسان کیسے پہنچے؟؟

(ڈاکٹر ھنری نائٹ ملر)

حال ہی میں اخبارات میں ایک بڑی دلچسپ خبر شائع ہوئی ہے کہ کس طرح حلق کے غدود (TONSILITIS) کے آپریشن کے بعد ایک آسٹریلیائی نرس یارک شائر کا صحیح تلفظ ادا کرنے لگی۔ بات یہ تھی کہ اس لڑکی کے آباؤ اجداد یارک شائر کے رہنے والے تھے ——— نفسیات دان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس کے تحت شعور نے، جس نے ان تفصیلات کو ذہن نشین کر لیا تھا، آپریشن کے صدمے سے دفعتاً وہ سب کچھ اُگل دیا اور یارک شائری صحیح تلفظ کی شکل اختیار کر لی۔

تحت شعور کے ایسے مظاہر ہمہ دن رات ہوا کرتے ہیں ان کے مختلف مظاہر ہیں۔ یہ مظاہر بذات خود عجیب معمائی شکلیں اختیار کرتے رہتے ہیں۔ ان معموں کو حل کرنا ان مظاہرات پر قابو پانا ——— کیسے؟ اور کیونکر ممکن ہے۔ یہ ڈاکٹر ملر سے سنیئے!

مشہور نفسیات داں مسٹر ولیم جیمس نے شعور اور تحت شعور کو برف کی اس چٹان سے تشبیہ دی ہے جو سمندر میں تیرتی پھرتی ہے ——— ہوتا یہ ہے برف کی اس چٹان کا صرف ایک حصہ سطح سمندر پر نظر آتا ہے اور باقی نو حصے پانی میں ڈوبے رہتے ہیں ——— قابل دید اور لائق غور یہ مسئلہ ہے کہ چٹان کے یہ دو الگ الگ حصے نہیں ہوتے ——— ایک سطح سمندر سے اوپر اور ایک نیچے ——— بلکہ ایک ہی ٹکڑا ہوتا ہے جس کے نو حصے پانی میں ڈوبے رہتے ہیں!

پروفیسر جیمس اسی چٹان سے ذہن انسانی کو تشبیہ دیتے ہیں دماغ کا دسواں حصہ "شعور" ہے ——— شعور کی خصوصیات ہیں استدلال خیال آرائی، غور و فکر ——— یعنی ایک ہوشیار جاگتا ہوا ذہن و دماغ ——— جو قطعی فیصلوں پر پہنچتا ہے ———

۹/۱۰ حصہ ہے "تحت شعور" جو شعور کے زیر نگین ہے! یہ دو علیحدہ علیحدہ اذہان نہیں ہیں نہ ہی دو الگ الگ دماغ ——— بلکہ ذہن و دماغ کی دو علیحدہ علیحدہ صورتیں!!

تحت شعور کو یوں سمجھئے گویا دوائیوں کا مال گودام ہے۔ یہ گویا ہمارا "جذباتستان" اور "جبلتستان" یہاں ہمارے اضطراری عادتی اور دوسرے لاشعوری افعال پر نگاہ رکھنے والے افسر تشریف فرما رہتے ہیں۔ یہاں ایک محکمہ کے سپرد نئے خلیوں کی [illegible]

البتہ ایک بات یہاں ضرور ہوا کرتی ہے کہ لاشعوری ذہن استعمال کے قابل نہیں ہوا کرتا - اس کا تو ایک قانون ہے ——— استعلام بھی ہے ——— یعنی ترغیب !! اس کا کام فقط یہ ہوتا ہے - وہ شعور کی ہدایت کردہ ترغیب کو قبول کر کے ایسی صورت حال پیدا کرتا رہا کہ ان ترغیبات کو استحکام حاصل ہوتا جائے ذہنی نظم و ضبط کا انتہائی بلند راز ہے ! خواہ مرد ہو کہ عورت جس نے اس حقیقت کو پسند کیا اور اس طریقے سے یہ سیکھ لیا کہ کس ——— اور یہ طرح تحت شعور تک پہنچا جا سکتا ہے اور پھر وہاں پہنچ کر کس طرح صحت، مسرت، ہمت اور قوت کے ترغیبات کی داغ بیل ڈالی جا سکتی ہے ایسی ہستیاں آپ اپنی قسمت کی معمار ہوتی ہیں ——— یہ اپنی قسمت کو بدل دیتی ہیں ——— تقدیر پر تدبیر کی کامیابیاں ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو جاتا ہے ——— اور ان کی زندگی دوسرے معنوں میں ایک بھرپور تر ——— وسیع تر ——— بلند تر اور کامیاب تر نصب العین کی حامل ہو کر رہ جاتی !!

تحت الشعور تک پہنچنے کے لئے عام طور پر نفسیات دانوں نے جن ضروری اور آسان طریقوں کی ہدایت دی ہے وہ خاموشی سکون، قاعدہ جان توڑ محنت و کوشش اور زندگی سے دُور کرنے کا نام ہو کر رہ گئے ہیں

سرفہرست نفسیات کے ماہرین بہت سے اساتذہ نئے خیالات کے حاملین اور دوسرے مدارس خیال سے انسانی کردار کی استقامت کے لئے مصر ہیں کہ انسان کو "سکون وخاموشی اختیار کر لینی چاہیئے !! انضمام حیات کے لئے خاموشی کی شرط بہت کڑی ہوتی ہے بالخصوص اس وجہ سے کہ خاموشی انتہائی غیر فطری شے ہے - یہ تحت شعور تک رسائی کے لئے رہبری تو کر سکتی ہے لیکن تکالیف اور مصیبتوں کے راستے سے امداد اور سہولت کے راستے سے نہیں ! بالکل ایسے جیسے بعض مقاصد تک پہنچ ہو تو سکتی ہے لیکن راستے کے کانٹے مارے ڈالتے ہیں !!

جو طریقہ مندرجہ ذیل کیا جاتا ہے اس کی مشق سے آپ کے ہر دائرہ عمل میں کام آ سکتا ہے خواہ گھر یلو تجارت میں ہو، نوکری میں ہو، صنعت و حرفت میں ہو کسی خاص پیشے میں ہو ——— دن کے چوبیس گھنٹوں میں آپ تحت شعور تک پہنچ سکتے ہیں اور ترغیبات کے ذریعہ اپنی زندگی کو اپنا قوت ارادی کی مٹھی میں مقید کر سکتے ہیں ! ملاحظہ فرمائیے :-

عادات

۱- ہمیں اس کا علم تو ہو گیا ہے کہ تحت شعور ہمارے اضطراری اور دائمی افعال کا آئینہ دار ہوتا ہے ظاہر ہے آپ کی ہر عادت آپ کے تحت شعور پر اثر انداز ہوتی ہے اور عادت نام ہے افعال مکررہ کا ——— ہر عادت شعور پر اثر انداز ہوتی ہے اور سچ پوچھئے تو یہ تحت شعور ہی کی ہر چیز ہوتی ہے - جب تک عادات کا ایک ڈھیر تحت شعور میں نہ لگ جائے آپ کی کوئی عادت عادت نہیں بنتی - اور یہی عادات ہمارے اضطراری افعال ہوتے ہیں - آپ کوئی خاص کام کرتے ہیں بلا کسی شعوری احساس اور قوت ارادی کے ——— اور یہی عادات بڑی حد تک آپ کے کردار پر اثر انداز ہوتی ہیں اور تحت شعور تک پہنچنے کا مؤثر اور مفید طریقہ ہے شعوری طور پر عمدہ عادتوں کا اختیار کرنا ——— اپنی جتنی بری عادتیں ہیں ان کو حتی الامکان اچھی عادتوں میں بدلنے کی عادت ڈالئے ——— اور اس واحد "طریقۂ انضباط تحت شعور" METHODOF SUBCONCIOUS CONTROL سے آپ کی زندگی اپنا چولا بدل ڈالے گی !

میں آپ کو ایک دلچسپ قصہ سناتا ہوں اس مثال پر غور فرمائیے —
میں ایک پچھتر سالہ بڈھے سے واقف ہوں جس کو سگریٹ نوشی کی بہت ہی بُری لت تھی دن میں ایک سو، ایک سو میں سے کم وہ سگریٹ نہ چھونک کے رکھ دیتا تو یقین سمجھئے آفت آجاتی ——— !

اب غور کیجیے کہ سگریٹ نوشی کی عادت کیا ہے ؟ ——— یہی نا کہ بار بار، مار بار سگریٹ پینا یہاں تک کہ وہ عادت کی شکل اختیار کر جائے اور سیدھے ہے کہ ایک عادت کو ترک کرنے کے لئے آپ کو ایک دوسری ——— ذرا بڑھیا قسم کی یعنی میرا مطلب ہے ایک اور اس سے اعلیٰ عادت کو اس پر مسلط کرنا پڑتا ہے ! اس آدمی نے " ترک مسکرات " کی عادت کو اس پر مسلط کرنا شروع کر دیا ——— جب اسکو اس "عہد" کے بعد پہلی بار سگریٹ کی خواہش ہوئی تو اس نے کہا "نہیں !" ——— یہ گویا اس تحریک سگریٹ نوشی کو اس کا جواب تھا - اور باوجود اس کے کہ اس کے روئیں روئیں سے خواہشات اور تقاضوں کی لہریں اٹھ رہی تھیں اس نے نفی کو اثبات بنا دیا ——— ! دوسرے تیسرے تقاضے

پر وہ ایک عادت کا حامل ہونے لگا تھا ——— اور اب کی بار اس کا جواب تھا ——— "نہیں! ——— میں نہیں پیوں گا!! اور پھر ایک ہفتہ گذرا ہے تو اچھے سے اچھا سگریٹ بھی اگر کوئی اس کے سامنے پی لیتا تو اس کو طبیعت پر اتنا اختیار ہو گیا تھا کہ اس کا دھیان اس طرف نہ پلٹتا ——— نہ ہی کبھی توجہ اس طرف بٹتی ——— ایک عادت ٹوٹ چکی تھی ——— دوسری عادت اپنا مقام پیدا کر چکی تھی۔

یہ گویا میں نے آپکے ہاتھ میں ایک "کنجی" دیدی ہے۔ اب اگر "بدمزاجی" جیسی بری عادت بھی ہو تو اس پر قابو پانا آسان ہے ——— "بدمزاجی" ہے کیا؟ ——— یہی ناکہ ہمارے جذبات کا ایک ناہموار حرکت ہے ——— ہم کسی بات پر اس قدر برافروختہ ہو جاتے ہیں کہ بقول شخصے آگا پیچھا کچھ نہیں سوجھتا ——— اور یہ اکثر اس وقت ہوتا ہے جب یا تو آپ کی مرضی کے خلاف کچھ ہوتا ہے، یا کوئی آپ کا مذاق اڑاتا ہے ——— آپ کو بیوقوف بناتا ہے اور آپ کو اس کی اس چالاکی کا احساس ہو جاتا ہے ——— کوئی آپ کی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور آپ کو یہ راز معلوم ہو جاتا ہے ——— یا کوئی آپ پر اعتراض کرتا ہے، طعن کرتا ہے، چوٹ کرتا ہے احسان فراموشی کرتا ہے!! ——— اور آپ کا دل غم و غصہ کی آماجگاہ بن کر ایک زندہ جہنم بن جاتا ہے جس میں آپ کی روح اور جسم دونوں جھلسے جاتے ہیں ——— یقین مانئے یہ آپ کی صحت، کردار، نصب العین اور مستقبل کے لئے بہت ہی خطرناک طریقہ ہے ——— ایسے وقت ذرا دل بڑا کرنا سیکھئے ——— شان سے مسکرائیے ——— ایک تبسم زیر لب ہے!! ——— دانت دکھائی دیں گے تو آپ پر بے غیرتی مسلط ہو جائے گی ——— اور بہت ہی تحمل اور ٹھنڈے دل سے "جوابِ جاہلاں باشد خموشی" کی منہ بولتی تصویر بن جائیے ——— ! اس وقت آپ کا "پرسکون دل" ——— "مطمئن روح" اور "ہوشمند دماغ" آپ کے پاس بدمزاجی کی ہوا بھی نہ آنے دیں گے!!

۲- عقیدہ

تحت شعور تک پہنچنے کا ایک اور بالواسطہ راستہ ہے! جس بات میں آپ کا عقیدہ خلوص و راستی کے ساتھ کار فرما ہوگا وہ آپ کے تحت شعور میں گہرا نقش چھوڑے گی اور اس طرح بار بار کی تاثر پذیری ایک انمٹ نقش پیدا کرے گی ——— اسی لئے ایک "عقیدۂ راسخ" بہت زیادہ ضروری ہے تاکہ آپ کے افعال کسی خاص نظم و ضبط کے حامل ہو جائیں!

عقیدہ اور تحت شعور

عقیدہ کی دو قسمیں ہیں ——— ایک وہ جس میں توہمات، جہالت، خوف اور مہیب جھوٹ کذب و افترا ہوتا ہے۔ اس کا تو سنجیدگی سے تجزیہ بھی نہیں کرنا چاہئے ——— تب تو پھر سمجھئے آپ کی زندگی فضولیات، تاریک الذہنی، غیر صحت بخش اور پست ہو کر رہ جائے گی ———
دوسری قسم وہ ہے جو اذعانی اصول DOGMA کی زنجیروں سے آزاد، ہر خوف کی تباہیوں اور تباہ کاریوں سے محفوظ، زندگی کی الوہیت میں ڈوبی ہوئی ذات موجود معبود کی خوبیوں سے خبردار، حقائق حیات سے بہرہ مند اور ہر چیز کی تہہ تک پہنچی ہوئی، ہر انصاف اور ہر راست گوئی سے واقف ——— اس عقیدہ سے ہمکنار ہو کر آپ کی زندگی حادثات کی مار سے پارہ پارہ ہو کر بکھری نہیں بلکہ سکون قلب و دماغ کی برکتوں میں پروئی ہوئی مالا کی طرح ایک ہم آہنگ نغمہ بن کر رہ جائے گی!! ایک محمود و مسعود عقیدہ کی فطرت ہے شیرینی و پاکیزگی ——— اور ان دو خصوصیات سے آپکے تحت شعور کا کام دو چند لذتوں، مسرتوں اور سکون بخشیوں سے فیضیاب ہو سکتا ہے ——— حقیقت یوں اختصار کا رنگ اختیار کرتی ہے کہ

"عقیدہ تحت شعور کا باب الداخلہ ہے" — "FAITH IS THE DOORWAY TO THE SUBCONCIOUS"

۳- یادداشت

جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں تحت شعور یادداشتوں کا مال گودام ہوتا ہے ——— جو بھی بات آپ یاد رکھیں گے وہ براہ راست

آپ کے تحت شعور تک جاتی ہے ——— تحت الشعور تک پہنچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آپ کوئی چیز یاد کرنا شروع کر دیں۔ مثال کے طور پر بڑے آدمیوں کے عمدہ اقوال یاد کرنا شروع کیجیے تاکہ وہ اپنا ایک بہترین نقش چھوڑ دیں ——— اور اس طرح آپ کی ذہنی تصویروں میں رنگ بھرتا جائے ——— ان کی دھندلاہٹیں اور پھیکا پن رخصت ہونے لگے ——— اور جب کسی تعطیل میں آپ فطرت کی کسی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں تو ماحول کی تاثر پذیری آپ کے ان خیالات اور ان ذہنی تصاویر کی ترجمان ہو کر آپ کی ذہانت، قوت تخیل اور قوت مشاہدہ و قوت حافظہ کو دس گنا قوی کر دیتی ہے ——— ! اس کے لئے اگر تعطیل وافر نہیں تو رخصت لے لیجے اور اس سے فائدہ اٹھائیے ——— بلند پایہ اقوال، اشعار اور افکار کو روزمرہ ایک مقررہ تعداد سے یاد کیجیے ——— کسی رسالہ سے اچھا سا جملہ ذہن میں محفوظ کر لیجیے ——— غرض ہر وقت ہر لمحہ کچھ نہ کچھ سوچا کیجیے ——— عمدہ اور بہترین ! آپ کا تحت شعور ایک خوبصورت البم ——— ایک عظیم الشان کتب خانہ ——— ایک بلند پایہ عجائب گھر بن جائے گا !!

۴۔ تحکم

مشہور مقولہ ہے "خدا غلام بنائے پر غلام کی صورت نہ بنائے !" ——— میں آج کل کی نفسیاتی اصطلاح میں کہوں گا خدا "غلام بنائے پر غلامانہ ذہنیت نہ بنائے !" ——— غلامانہ ذہنیت رکھنے والا کبھی تحت شعور تک نہیں پہنچ سکتا ——— جو تصویریں آپ کا تحت شعور کھینچے ان پر آپ کی "ناقدانہ نظروں" کے علاوہ آپ کے فیصلہ کو "حرفِ آخر" کا حکم رکھنا چاہیے ——— آپ کو "حاکم" ہونا چاہیے اور تحت شعور ——— آپ کا "خادم" ہو!

تحتِ شعور پہ حکم صادر فرمائیے ——— اس میں جہاں "درخواستوں" کے قبول کرنے کی طاقت ہوتی ہے وہیں "اطاعت گذاری" کا ملکہ بھی ہوتا ہے ——— اگر آپ نے رک رک کر، لجا کر، میا کر، جھینپ کر، پیچ کر کوئی بات کہی تو ——— یاد رکھیے آپ کو کوئی "نتیجہ خیز" جواب ملتے رہا ——— !

ذرا سوچیے ——— !

ایک کرنل کھڑا ہے ——— ؟ کہتا ہے :۔

"ہاں تو ——— میں سمجھتا ہوں، اگر آپ برا نہ مانیں تو ——— اگر آپ اس وقت کچھ اور نہیں کر رہے ہیں اور یوں ہی کھڑے ہیں تو ——— آئیے باقاعدہ کھڑے ہو جائیں !"

اور جو کہیں وہ کہے ———

"اچھا اب میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ پیچھے پلٹ ABOT TURN جائیں ——— بیشک مجھے یقین تو نہیں ہے کہ آپ ایسا کریں گے ——— بلکہ مجھے تو خوف ہے کہ آپ میں سے بعض تو بالکل نہیں کریں گے ——— بہرحال مہربانی فرما کر ذرا "پیچھے پلٹ" جائیے !"

مجھے یقین ہے سارے سپاہی اُسے "بیت المعذورین" میں ڈال آئیں گے ———

اب سوچیے کیوں کر ایک کرنل ایک پوری رجمنٹ پر حکم چلاتا ہے ؟

——— !

اس لیے کہ وہ اُس کے سامنے کھڑا ہو کر چلاتا ہے

اٹینشن ATTENTION

"شولڈر آرمز !" SHOULDER ARMS

"پریزینٹ آرمز" PRESENT ARMS

اور ساری رجمنٹ اس طرح حکم بجالاتی ہے جیسے وہ ساری کی ساری رجمنٹ "ایک آدمی" ہو !

لہذا یاد رکھئے تحت شعور کے سامنے کبھی گھبرا کر، شرما کر، خوشامدی انداز میں کچھ نہ کہیے ——————
اپنے مطالبات پیش کر دیجئے ——————
آپ اپنے وقت کے کرنل ہیں —————— لاکھوں آپ کے فرمانبردار حکم کے منتظر کھڑے ہیں ! جسم کا ہر خلیہ آپ کے حکم کا منتظر ہوتا ہے —— !
لہذا —————— !
پورے اطمینان، ایقان اور بھروسے کے ساتھ حکم دیجئے —————— لیکن "مغرور" کا شائبہ نہ ہو اس میں —————— صبر و تحمل، رعب و دبدبہ و تمکنت بازی کا مجسمہ ہوں آپ !

۵- ضبط و تحمل

اگر آپ اپنی کسی خامی پر برانگیختہ ہوں تو اس کے لئے انتہائی ضبط و تحمل سے مشق کی عادت ڈالئے —————— مثلاً آپ کا خیال ہو کہ آپ کی نظر کمزور ہو گئی ہے —————— اب آپ ایک اصول بنا لیجئے "عمدہ نظر —— کامل نظر" —————— سوچئے، کہئے، لکھیے —————— "عمدہ نظر —— کامل نظر —————— !" "عمدہ نظر —————— کامل نظر !" آئینہ میں شکل دیکھئے اور تصور کیجئے کہ آپ کی نظر پہلے سے بہت بہتر ہے —————— پھر بہتر سے بہترین پر آئیے —————— اس طرح پچاس دفعہ سوچئے، سو دفعہ کہئے اور ڈیڑھ سو دفعہ لکھیے۔
"عمدہ نظر —————— کامل نظر !" —————— آپ کی نظریں خود بخود اچھی ہو جائیں گی !"

۶- مرئی شکلیں

تحت شعوری تصاویر کو مرئی صورتیں بخش دیجئے —————— "تخیل کاری" کا اثر "ٹھوس حقائق" کے مقابلہ میں تحت شعور پر زیادہ پڑتا ہے۔ آنکھیں بند کر لیجئے —————— خیالات کی رو کا فلم لینا شروع کیجئے —————— تصور آپ کو صاف واضح اور روشن تصویریں دکھاتا چلا جائے اپنے آپ کو ایک کامل تصور حیات میں رہتا بستا اور وہ سارے بڑے بڑے اور اہم کام کرتا ہوا دیکھئے جن کی آپ کے روئیں روئیں میں آرزوئیں بھری ہوئی ہیں وہ زمانہ عہد رفتہ کی تاریک جہالتوں کا تھا جب کہا جاتا تھا کہ "جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھتے ہو ؟"
—————— !

اب زمانہ ہے حقیقت شناسی کی روشن تابناکیوں کا —————— اب جو آپ سوچیں گے وہی کر گزریں گے —————— تخیل کردار کے سانچوں میں انسان ڈھل رہا ہے —————— ! اس حقیقت کو نہ بھولئے کہ نپولین، مصطفےٰ کمال، ہنری فورڈ —————— ایسی کئی ہستیوں نے لکڑی کے پنگورے میں آنکھیں کھولیں اور سونے کی مسہریوں پر آرام کیا ہے !! وہ بھی انسان تھے —————— اور آپ بھی یقیناً انسان ہیں !!

۷- نفسیاتی لمحے

نفسیاتی لمحے سے فائدہ اٹھائیے —————— !
گھبرائیے نہیں —————— چوکئے نہیں —————— !
"نفسیاتی لمحہ" سے میری مراد ہے تجسس کی انتہا، جذبات کی شدت !
کسی مقرر کی تقریر نے آپ کو سر سے پاؤں تک سنسنا دیا ہو ——————
کسی واقعہ کے دھچکے نے آپ کے دل کے گوشہ گوشہ میں تھرتھراہٹیں پیدا کر دی ہوں ——————
کوئی آپ کا عزیز —————— "عزیز از جان !" —————— جا رہا ہو — آپ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو کر جا رہا ہو ——————
آپ کو جنوں کی وادی میں دھکیلا گیا ہو —————— ماتموں کے دھندلکوں میں لپیٹا گیا ہو ——————
——————
یہی وہ لمحے ہوتے ہیں —————— جن کی کسوٹی پر آپ کی نفسیاتی قابلیتوں کا "سونا" پرکھا جاتا ہے ! بجائے اس کے کہ آپ

دامن وگریبان ایک کردیں اپنے پانچوں حواس قایم رکھ کر اپنی نفسانی قوتوں کو سنبھالا دیجئے ــــــــــ اور حقیقتوں کا مشاہدہ کیجئے ــــــــــ حادثات ہی کا عنوان " زندگی " ہے !!

چند سال پہلے ایک زلزلہ ہوا ــــــــــ

اور یہ رپورٹیں ایسی بھی تھیں کہ تین مفلوج بستر سے کود کر بھاگے اور شیلٹر میں پناہ گزین ہوئے ــــــــــ ہوا یہ کہ زمین زیر و زبر ہوئی تو اُن کے تحت شعور میں جو " بھاگ " کا لفظ چھپا ہوا تھا جاگ اٹھا اور اس شدت سے کہ وہ یہ بھول گئے وہ مفلوج ہیں اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے !

دو بڑے لمحے

جب صبح آپ بیدار ہوں ــــــــــ !

رات جب آپ بستر پر نیند سے آنکھیں موندھ لیں ــــــــــ !

یہ دونوں بہت بڑے نفسیاتی لمحے ہیں ۔

اس وقت شعور بہت ہی کم کام کرتا ہے اور تحت شعور کے تو " چوپٹ کھلے ! "

صبح جیسے ہی آنکھ کھلے ــــــــــ آپ کا پہلا خیال مسرت انگیز، مسرت بخش اور مسرت خیز ہو ! یہ سوچ لیجئے کہ " نئی صبح بخیر " ہو رہی ہے ــــــــــ اس حقیقت کا احساس تشکر ہو کہ " رات بخیر و خوبی " گذر گئی ــــــــــ اور ایک " نئی صبح آئی " ہے ــــــــــ

اور ــــــــــ

ایک پرسکون خاموشی میں ذہن کو متوجہ کیجئے ! ــــــــــ

بہتر یہ ہے میری زندگی کہ میں اس " خیر عظیم " کی آغوش میں ہوں ! میں عظیم روح زندگی، محبت، عقل، دولت اور قوت کے ساتھ ہوں !

" I am in the arms of infinite Good. I am one with the infinite Spirit of life and Love and Wisdom and Abundance and Power."

یہی وہ خوبصورت خیالات ہیں جو آپ کو ہر روز ــــــــــ مضطرب کن اور غم انگیز خیالات سے بچائیں گے اور امن، سکون، مسرت حسن اور قوت کے احول میں لے جائیں گے ــــــــــ !

نفسیاتی لمحات کا بکثرت استعمال کیجئے ــــــــــ

یہ تحت شعور کا ہر دروازہ کھول دیتے ہیں !!

(باقی ص ۳۵ پہ ہے)

جس تور اک کا تخیل حیات بلند اور نفیس ہوگا ان ہی سانچوں میں آپ کی زندگی ڈھلے گی ۔ ہمیں اپنی مسرتوں کے حصول کے لئے اپنے خیالات کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا پڑے گا ۔ تاریخ ایسے نمونوں سے خالی نہیں جو ہمارے لئے شمع ھدایت نہ بن سکیں ۔ انہوں نے یہ بھی نہ دیکھا تھا کہ راہ کتنی دشوار گذار ہے ــــــــــ وہ تو یہ دیکھتے تھے ــــــــــ وہ تو یہی سوچتے تھے ــــــــــ اور اسی کے لئے لڑتے تھے کہ " فتح و فیروزی " ان کے قدم چومے ! اور بس !!

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے !
کہ خاک زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں !

اہتمامِ حیات

ایڈگر جی بنیان

اس مختصر سے مقالے میں مصنف نے وہ راز بتائے ہیں جو آپ کی زندگی کے افسانے میں بڑے خوبصورت اور انوکھے رنگ بھر سکتے ہیں ـــــ زندگی ـــــ اور اس کا اہتمام! ـــــ یہ کس طرح ہو؟ کیسا ہو؟ اور کتنا ہو؟ ـــــ آپ اس کیلئے مقالہ پڑھ لیجئے۔

کیا آپ چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی کا اہتمام کریں؟ ـــــ اور بالکل نئے رنگ سے؟ اس کے لئے میں آپ کو بتا دوں صرف دو سہاروں کی ضرورت پڑتی ہے ـــــ

۱۔ عقیدۂ مستحکم

۲۔ خود اعتمادی

یاد رکھئے یہی "دو تار" ہیں جن کے تانے بانے سے آپ اپنی فتح مند اور مسرور زندگی بے داغ دامن بن سکتے ہیں ـــــ!

زندگی میں ہمیشہ یہ دیکھا گیا ہے کہ "بے اصولی" کا بھی ایک "اصول" ہوتا ہے ـــــ یعنی یہ "بے اصولی" خود ایک اصول" کا حکم رکھتی ہے ـــــ لہٰذا سب سے پہلے انسان کا فرض ہے کہ اپنی "ہمت"، "خود اعتمادی"، ایمان اور عقیدہ" کی پونجی پر نظر ڈالے اور اپنی پوری زندگی کا ایک نقشہ کھینچ لے ـــــ ہو سکتا ہے یہ نقشہ ادھورا ہو یا ایسا کہ اس کے پورا ہونے کا خواب خواب ہی رہ جائے ـــــ لیکن بقول شخصے دنیا امید پر قائم ہے، آپ اپنے لئے ایک نقشہ ضرور تیار کر لیجئے ـــــ اور اس میں رنگ بھرنے شروع کیجئے حتی المقدور و حتی الوسع اس کی کوشش کیجئے کہ رنگ بہتر سے بہتر، خوبصورت سے خوبصورت اور نفیس سے نفیس ہوں ـــــ لیجئے آپ کی زندگی کا ایک اصول مقرر ہو گیا ـــــ!

حقیقت یہ ہے کہ فنکار ہوں کہ ادیب، سائنسداں ہوں کہ حکیم ہر شخص نے زندگی کے لئے "ایک اصول" کو ضرور تسلیم کیا ہے ـــــ تاریخ شاہد ہے کہ انسان ہمیشہ اپنی قسمت کا معمار رہا ہے ـــــ پھر کیا آپ انسان نہیں؟ ـــــ آپ بھی انسان ہیں آپ بھی وہ سب کچھ کر سکتے ہیں جو کوئی دوسرا کر سکا ہے یا کر سکتا ہے ـــــ اپنی ذاتی راستے کو بہتر سے بہتر اور پختہ سے پختہ بنانے کی ہمیشہ کوشش کیجئے ـــــ اسی سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے ـــــ اعلیٰ مقاصد کی تکمیل ہو سکتی ہے ـــــ اس لئے کہ خود اعتمادی ہی وہ واحد کلید ترقی ہے جس کو انسان آزما سکتا ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے؟ ـــــ دوسروں کے کہنے پر کہ "تم میں اتنی خوبیاں ہیں یا اتنی برائیاں ہیں" ـــــ انسان کو مسرور اور رنجیدہ ہرگز نہیں ہونا چاہیئے۔ خدا نے ضمیر اسی لئے ودیعت کیا ہے ـــــ اور اسی کسوٹی پر اپنے اعمال کس کس کر اندازہ لگا لیجئے کہ حقیقت کیا ہے؟

شیشہ کی طرح صاف شفاف عمل تفکر ہر انسانی کوتاہی اور خاموشی کو دیکھ لیتا ہے۔ جب ہم ایک صاف اور حقیقت پسند نقطۂ نظر سے اپنی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو گویا ہم ایک "خلاق زندگی" CREATIVE LIVING کی ابتدا کرتے ہیں ـــــ اس سے جو "روحانی استحکام" پیدا ہوتا ہے

ہمارے ہر مؤثر اور قوی عمل پر صادر ہوتا ہے ـــــــــ اس کے بعد پھر راستہ کا ہر روڑا ہمارے حق میں نکالا بن جاتا ہے ـــــــــ اور پھر ہم وہ دم خم لے کے چلتے ہیں جو زندگی کے ہر غیر متزلزل ارادے کے لئے ضروری اور لابدی ہے ! پھر ہمیں ہمارے مقصد کی تصویریں باوجود اس کے کہ وہ بھی اپنی پہلی نامکمل حالت میں ہوتی ہے ـ ہمارے سامنے واضح ہوتی جاتی ہیں ! قوت تفکر دراصل خدائی دین ہے اس کی قدر کیجئے کسی اصول کا بیان کرنا آسان ہے اس پر عمل بہت مشکل ہے ـ یوں سمجھ لیجئے فٹ بال کے گول کو دیکھ کر خوش ہونا بہت آسان ہے لیکن اس کو گول تک پہنچانا آسان نہیں ـ ہر کامیابی ایک یقین محکم اور ایک مکمل اعتماد خودی" کے بغیر ناممکن ہے ـــــــــ اور یقین واعتماد بالکلیہ "افکار صالح" کی پیداوار ہیں !!

فکری ذخیرہ اندوزی

یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ ہم سے ہر ایک اس لئے نہیں پیدا ہوا ہے کہ "عظیم الشان کارنامے" انجام دے ـــــــــ لیکن البتہ ضرور ہے کہ ہم سے ہر ایک اپنی قوم کی فلاح وبہبود کے لئے بہت کچھ کر سکتا ہے ـ ہو سکتا ہے کہ یہ بہت ہی چھوٹی سی خدمت ہو لیکن قطرہ قطرہ دریا شود کے اصول کے تحت انفرادی خدمات ہی ملت کی ترقی کی امین ہوتی ہیں ـــــــــ مجھے یقین ہے، احساس ہے کہ ہم میں کتنے نوجوان ایسے ہیں جن کے دل دماغ اور احساسات ان جذبات سے تڑپ اٹھتے ہیں کہ ہمیں اپنی قوم" کے لئے "یہ" کرنا چاہیے ـــــــــ لیکن محض اس خیال سے کہ ہم کیا اور ہماری بساط کیا رک گئے ـــــــــ آپ رک گئے لیکن نہ وقت رکا نہ زمانہ ـــــــــ اور بازی اس نے جیت لی جس کی طرف سے وہم خیال بھی نہ تھا کہ یہ ـــــــــ اور ایسا کارنامہ دکھائے گا؟ ـــــــــ حالانکہ آپ میں اس سے زیادہ صلاحیتیں موجود تھیں !! نہ معلوم کتنی ایسی ہستیاں ہوں گی ـــــــــ وقت کی "بے آواز" یار فتار انھیں کچھ احساس نہیں اور اپنی ساری قوتوں کو بیزاری اور بے عملی کی زہریلی ہواؤں سے رنگ آلود کر دیتی ہوں گی !!

یاد رکھیئے ! وقت نہ آپ کا انتظار کرتا ہے نہ میرا، نہ زید کا نہ بکر کا ـــــــــ اس کے پاس نہ "سفارشیں" چلتی ہیں نہ وہ "رشوت" لیتا ہے نہ اس کے خویش واقربا کہ "اقربا نوازیاں" کرے ـــــــــ نہ وہ "غدار" کہ وقت کی نزاکتوں اور صورت حال سے فائدہ اٹھائے !! ـــــــــ یہ آپ کے قدموں کے دم خم پر منحصر ہے ـــــــــ چاہے قدم ملا لیجے یا تھک کر سر راہ بیٹھ جائیے ـــــــــ بہرحال اس کو پکڑنا آپ کا کام ہے !!

اس کے لئے "فکری ذخیرہ اندوزی" کی سخت ضرورت ہوتی ہے ـ اپنے آپ سے اس قسم کے سوالات کیجئے: ـ

(۱) ہم میں سے زیادہ تعداد کیوں اپنی صلاحیتوں کو تباہ کر دیتی ہے ؟

(۲) ہم کس لئے "جمود" پیدا کر لیتے ہیں جب کہ ہمیں بخوبی احساس ہوتا ہے کہ ہماری رگ وپے میں برف کی سلیاں بچھا دے گا ؟

(۳) کیا یہ اس لئے تو نہیں کہ ہم "ماحول" سے ڈرتے ہیں اور "معاشرہ" سے گھبراتے ہیں ؟

(۴) کہیں یہ ہمارے "احساس کمتری" کا شاخسانہ تو نہیں ؟

(۵) یا یہ کہ ہماری جرأتیں ختم ہو رہی ہیں ؟ ؟

ایسے سوالات کا بہت ہی سکون اور ٹھنڈے دل سے تجزیہ کیجئے ـ یہ ایک حقیقت ہے کہ ذہانت روحانی تاثیر یا الہامی فیضان سے متاثر ضرور رہتی ہے اسی طرح غربت وافلاس انسان کو بداخلاقی اور لاتہذیبی کی طرف مائل کرتے ہیں ـــــــــ لہٰذا اگر ہمیں ہمارے دن رات کے "غمہائے روزگار" ستے ہیں تو ہمیں حق ہے کہ ان پر کڑی نظریں ڈالیں غم وغصے کا اظہار کریں ـ الزام واقعتاً اس جماعت پر آکر پڑتا ہے جس کے قبضے میں سرمایہ کی فراوانی ہے ـــــــــ جو ملوں فیکٹریوں، کمپنیوں، اور ٹھیکوں کی مالک ہے ـــــــــ اور ان کو اگر کچھ یاد نہیں رہتا تو وہ ہماری "ذات" ہے ـــــــــ وہ اسی کو بھول جاتے ہیں ! ـــــــــ

لیکن ذرا ان کی طرف دیکھیئے جو افلاس وغربت کے چیتھڑوں میں سے نکل کر اپنے سر پر لافانیت کا تاج پہن لیتے ہیں ـ مجھے اس وقت مثال جو یاد آئی سیموئل جانسن Samuel Johnson کی ہے ـــــــــ اُسے اپنی ماں کے مرنے کی اطلاع ملی ـــــــــ اس وقت

گھر میں کفن کے پیسے نہ تھے ————— مردہ گھر میں چار آٹھ دن رکھنے کی چیز نہ تھا ————— اس نے بیزارخرابی وصد ہزار مشکلات پیسے جمع کئے اور ماں کو اس کی آخری آرام گاہ پر پہنچا دیا ————— پھر غور کیجئے کہ میٹھا ہے تو آٹھویں دن کے ختم ہونے میں ساڑھے پانچ گھنٹے باقی تھے ————— اور وہ ایک ناول کا مصنف تھا جس کو بیچ کر اس نے قرض سے نجات حاصل کی ————— اور مثالیں یاد آرہی ہیں ————— سنیئے :

جان بنین John Bunyan دی ہے آپ جانتے ہیں اس شہکار نے The Pilgrim's Progress جس نے ہیں کلاسکی شہکار قیدخانہ کی اندھی کوٹھڑیوں میں جنم لیا ہے جب کہ اس پر اپنی نابینا لڑکی کی دیکھ بھال بھی فطرت نے عائد کر رکھی تھی ۔ اسی طرح یوجین اونیل کا شہکار سینٹو ٹوریم کی پیداوار ہے جب کہ اس کا مصنف کھانسی اور بخار کے جھکولوں میں گھنٹوں اوندھے منہ لیٹ جایا کرتے تھے —

ٹاور آف لنڈن TOWER OF London انگلستان کا بہت ہی مہیب قسم کا قیدخانہ ہے ————— اسی کی چہار دیواریوں میں سر والٹر رالے Sir Walter Raleigh نے تاریخ دنیا لکھی ————— فرینز ہال Frans Hals مغربی دنیا کا مشہور مصور، اس نے جس وقت اپنا شہکار " البیلا گبرو " The Laughing Cavalier بنایا تو وہ مفلسی کے شاندار محل میں براج رہا تھا اور ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب رنگنے کے لئے رنگ نہ تھے ————— !

اور یہی وہ حقایق ہیں ————— گو تلخ ضرور ہیں ————— کہ ہمیں انہی کی شاندار قوت الہام میں سے ایک طلسم سا نظر آتا ہے ————— ایک طلسم کہ جس میں افلاس کی دھجیاں اور غربت کے چیتھڑے کامیابی سے جگمگاتے ہوئے مرصع وجواہر نگار تاج تک پہنچنے میں کسی طرح حائل نہیں ہوتے ————— صرف ایمان ، ایقان اور اطمینان کامل چاہیئے ! نیت میں خلوص ہو تو راہوں میں خود بخود برکت ہو جاتی ہے !

یاد رکھئے !

آپ ناامید ہو جائیں گے آپ کا ذہنی توازن بگڑ جائے گا ————— !

آپ شک وریب میں مبتلا ہو جائیں گے اس کا مطلب ہو گا آپ ماحول کی چکی میں پس گئے اور سر نہ ابھار اکر نکل آئیں !

آپ کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہوں ایک دفعہ آپ پورے خلوص ، پورے ایقان اور پورے اعتماد کے ساتھ کشمکش حیات سے دوچار ہو جائیے پھر آپ کا حق آپ سے کوئی نہیں چھین سکتا —————

یہی قوت ارادی آپ کے مستقبل میں قطب تارے کی طرح چمک چمک کر رہنمائی کرے گی

جس وقت شکسپیر کے جانواز قلم سے نکلا تھا

" نہ وہ رنگ ہے نہ وہ خون نہ وہ نسل ہے

وہ کوئی اور ہی باطنی شئے ہے جو آدمی کو انسان بناتی ہے ! "

" It is neither Kith nor Kin nor Colour

Of the Skin, but it is that within that makes the man"

اس وقت یقیناً شیکسپیر کا اشارہ دماغ انسانی کی طرف تھا ————— جو کردار ی کا گھر ہے ! اور کردار ہی کی بلندیوں میں انسان کی ترقیوں اور سرفرازیوں کا راز مضمر ہے !

تعمیری غور وفکر

یہ ایک فطری جذبہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ ہمیں نمایاں مقام حاصل رہے ، ہمیں دوسروں کا اعتبار اور ہمدردی محبت اور عزت ملے بلکہ بعض وقت یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ ہمیں بڑا سمجھیں اور کبھی کبھی خوشامد بھی کریں ۔ بعض وقت جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہم [illegible] ہم [illegible] تو ہمارا دل رنج وغم سے بیٹھنے لگتا ہے ، حالانکہ ہم کوشش کرتے ہیں کہ [illegible] ————— رنگ باد [illegible] مقام حاصل [illegible] !

آپ یقین جانئے ہم بھی اس مقام کو حاصل کر سکتے ہیں ـــــ اگر ہم واقعی ایک مقصد بنا لیں اور پوری توانائیوں سے اس پر جُٹ جائیں! ایک موڑ چلانے والا جب یہ سوچتا ہے کہ میں ایک دشوار گزار راستہ پر ضرور چلوں گا تو پھر اس کو اپنے ہاتھوں، آنکھوں اور شانوں سب کو اس مقصد پر زندہ انسانوں کی طرح با ہوش رکھنا پڑتا ہے ـــــ پھر اُسے اپنے مقصد کی دھن ہوتی ہے اپنی بات کا خیال ہوتا ہے ـــــ راستے کے نشیب و فراز اس کی ہمتوں کے آگے گرد راہ ہو جاتے ہیں !

ہمیں بھی بالکل ایسا ہی بن جانا چاہیے ـــــ اور اس کے لئے درکار ہو ایک **کردار** !! ـــــ جو ہماری امیدوں اور امنگوں کا ساتھ دے سکے !! جس کردار میں تحمل، صبر و استقلال نہیں ہو گا سمجھئے اس کی بنیاد میں اینٹیں ٹیڑھی رکھی گئی ہیں ـــــ اب دیوار کا حشر آپ کے سامنے ہو گا ! اس لئے انتہائی کوشش کیجئے کہ آپ حاسدانہ احساسات کو ذرا دھکا دے کر پیچھے دھکیل دیں اور اپنی قوت ارادی کی لامحدود فضا میں گم ہو جائیں ـــــ اسی کے سہارے ہمیں کردار بنانا ہے ! لہٰذا اس کو مضبوط، قوی، مردانہ بنائیے ـــــ اپنی خواہشات آرزوؤں امنگوں اور استقلال بردباری اور تحمل کے ساتھ چپکا دیجئے ـــــ پھر اندازہ لگائیے کہ آپ پہلے کہاں تھے اور اب کہاں ہیں !!

یاد رکھئے جب کوئی انسان اپنے "صحیح مقصد کی خاطر ساری مخالفتوں، بدنصیبیوں، تکلیفوں کو برداشت کرتا ہے ـــــ اس کی پروا نہیں کرتا کہ کوئی اس کی طرف طعن و تشنیع کے تیر چلا رہا ہے کہ اس کے صبر کا سینہ چھلنی ہو جائے ـــــ کوئی تمسخر کی تلوار سے اس کے استقلال کو ذبح کرنے پر آمادہ ہے ـــــ لیکن وہ ہے کہ یہ سوچے ہوئے ہے یہ جو آج تم جل رہے ہو حسد کی آگ میں کل تمہیں میری عزت افزائی کے لئے پھولوں کی مالا بنانی پڑے گی ـــــ یہ جو آج تم مجھ سے یوں اڑ رہے ہو کل میری ہی طرف ملتجی نظروں سے دیکھو گے ـــــ !

یقین رکھئے یہ بہت بڑے جیوڑے کی بات ہے ـــــ یہ نمونہ ہے انسانی فطرت کی اس بلندی کا جس کو بہت جلد ایک کائناتی قدر و منزلت اور پسندیدگی حاصل ہو گی ـــــ اور آپ دیکھیں گے کہ ایک "جہاں امید" اس بلند کردار ہستی کا انتظار کر رہا ہے ـــــ خواہ اب آپ اس کے متعلق کتنے ہی متشکی کیوں نہ ہوں ـــــ اس کی قسمت کے ستارے کو جگمگانا ہے اور دنیا کی آنکھوں کو اس کی خیرگی سے چندھیا جانا !

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم اپنے لئے صداقتوں کے دامن میں زندگی بنا رہے ہیں تو یقین مانئے ہم دوسروں کی خدمات بھی اسی وسعت قلب اور صداقتوں کے ساتھ کریں گے !!

کامیابی اور مسرت

طرفہ ماجرا ہی ہے قسمت کی ستم ظریفیوں کا کہ حالات کچھ اس تیزی سے بدل رہے ہیں اور اس طرح صورت حال ہوتی جا رہی ہے زمانے کی کہ ہمارے معاشرہ نے اپنی پچھلی صدیوں کی زندگی میں کبھی "انفرادی ہدایت" (Individual initiative کا حق قانون سازی) پر اتنا تکیہ نہیں کیا تھا جیسا آج ہو رہا ہے ۔ ہمیں زندگی میں مسرت کی تلاش ایک بڑے نفسیاتی امتحان میں مبتلا کر رہی ہے ۔ ہمیں حقائق حیات سے دامن بچانے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا ـــــ ہمارے لئے کوئی ایسا ٹاپو نہیں جہاں اپنے اطمینان خاطر کے لنگر ڈال دیں ۔ ہمارے لئے یہی رہ گیا ہے کہ امیدوں آرزوؤں کو سہارا اس لئے لئے جائیں ـــــ اس لئے کہ ہمیں زندگی کو خوش گوار بنانا ہے ۔ ہمارا مقصد حیات جس رنگ کا بھی ہو ـــــ اس کے لئے خود اعتمادی لازم و ملزوم ہے ۔ اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے دکھوں کے بوجھ بانٹ لئے جائیں تو ہمیں ایسا چاہنا چاہئے اس لئے کہ ہم انسان ہیں ـــــ لیکن بجائے اس کے کہ ہم رنج و غم سے پاگل ہو جائیں ہمیں ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہئے کہ وہ کونسی خامی ہے جو ہمارے دکھوں کا باعث ہے ـــــ اس عیبت کا حل تلاش کیجئے ۔ اپنی کامیابی کے تصور پر نظریں جمائے رہیئے ـــــ ـــــ مسرت خود بخود حاصل ہو گی !

یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ حصول کامیابی کے ہر قدم پر مشکوک رہیں ہمیں اپنے ذہن کو تعمیری غور و فکر کا عادی بنا لینا چاہیئے ۔ آنے والے شکوک کو شبے جھٹک کر دور پھینک دیجئے اور ایک عزم صمیم کے ساتھ اسی راہ عمل پر چل پڑیئے جہاں سے آپ کی روحانی بلندیوں کے سہارے آپ کے ہاتھ تھام لیں ـــــ جب آپ کو یقین دلاتا ہو لی یونانیوں کے ڈیڈالس Daedalus کی طرح آپ بھی عزم کے پر پرواز ایجاد کر کے ناامیدیوں اور مایوسیوں کی بھول بھلیوں سے پرواز کرتے ہوئے امید و کامیابی کی چٹان پر سنگ انداز ہو سکتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۲۳۵ پر ملاحظہ فرمائیے)

سلام و پیام

گدائے رسم و محبت عروج ہے مت بھول
نوازشات سلام و پیام پیدا کر

آپ کا گرامی نامہ —— وقت کی رفتار جیسے پلٹ گئی —— زماں
ومکاں کا بعد جیسے مٹ گیا —— کراچی اور رنگون کا فاصلہ —— ؟
لیکن میں رنگون تھا —— وہی رنگین راتیں وہی چلے کے دور وہی
محافل !!! " بادۂ احمر کی قسم —— سرور وکیف کا وہ عالم —— کہ بتانا چاہوں
تو بتا بھی نہ سکوں ! فیض آباد کے اس بے فیض کا ذکر کیا کہوں ——
گریباں دور ہے اور ہاتھ آتا نہیں —— !!
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے !!!
"ممنون ہوں آپ کا —— "شراب" نا حل ہے۔ "سلامتی" نہ سہی

تم "آسمانوں کی مخلوق" —— میں زمین پر اللہ کا نائب !
"مریخ" سے زمین پر آنے کی تمنا —— اور زمین سے "مریخ" تک پہنچنے
کی آرزو —— دونوں میں بڑا فرق ہے عزیزم ! !
ایک صرف ٹوٹا ہوا تارا —— دوسرا تمام تر عروج —— !!!
"فرار" کو سمجھنے کی کوشش نہ کرو —— بس پڑھے جاؤ
ایک افسانہ بہر حال افسانہ ہے —— !
زندگی اسی کا نام ہے ہر ناکامی ایک کامیابی ہے !!
دلیل صبح روشن ہے ستاروں تنک تابی ! ! !
صبح ہونے دو —— تم کیوں تنک تاب بنو ؟
کچھ سمجھے بھی —— ؟ ؟

آپنے تو اس طرح "بھلایا" ہے کہ —— اللہ اللہ —— باعث عتاب —— ؟
"سوسن" کی "بات چیت" —— "لالہ" کے دل کا "داغ" اور "نرگس" کی
آنکھوں کی بیماری ہے —— تو معافی خواہ ہوں
آپ خیریت سے تو ہیں —— آپ کا سکوت —— ؟
یا صرف تاثی یا یہ بے نیازی —— !
اپنی ہم پر انجیبت —— ؟

ایک طویل مسلسل افسانہ

فرار

گزشتہ سے پیوستہ

کرما شاید اپنے سوال سے دست بردار ہوگئی لیکن اس کی محبت مسلسل ماں کی عظمت کو چیلنج دیتی رہی ۔ اس کا دل کبھی ماں کی طرف کھنچ جاتا اور کبھی اپنے مرکز نظر و شباب کی جانب سرک آتا ——— اس کے دل و دماغ میں ایک ایسا طوفان برپا ہوگیا تھا جو اسے کسی لمحہ چین نہ لینے دیتا تھا

وہ اپنے اندر یہ جرأت بھی نہ پاتا تھا کہ اپنے پورے خاندان کو یہاں بلالے اور اس خیال سے تھرا اٹھتا تھا کہ اگر وہ ہندوستان گیا تو اپنی کرما سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ جائے گا۔ تنہائی میں گھنٹوں اس مسئلہ پر غور کرتا رہتا۔ لیکن کبھی کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکا۔ دماغ جب اس نقطہ پر پہنچتا تو سر چکرا جاتا اور دو چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ایک بوڑھا چہرہ حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھتا ہوا کہتا "میرے لال میں تیری ماں ہوں۔

پھر چمپئی رنگ کی دوشیزہ کرما کی صورت آنکھوں کے سامنے آجاتی ——— میرے ساجن ——— چلے جاؤ گے کیا ؟"

وہ کسی کو کوئی جواب نہ دیتا اور خلاؤں میں نگاہیں جمائے دیکھتا رہتا ۔

ایک دن آل برما مسلم لیگ کے اسٹیج پر ایک زیرباد ی مقرر کو ہندیان ۔ مقیم برما کا مذاق اڑاتے دیکھ کر اس کی غیرت جاگ اٹھی اس کا جی چاہا کہ مقرر کے منہ پر زور سے ایک گھونسہ مار کر کہہ دے :۔

"خاموش اے مفتری ! ہم یقیناً موسمی پرندے نہیں ہیں"

لیکن مقرر مفتری نہیں تھا وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا ——— وہ جانتا تھا کہ ہر سال لاکھوں ہندوستانی برما آتے ہیں منوں پیلا پیلا دھان "جلاکر" سونا بناتے ہیں یہاں کی دوشیزاؤں کو بیویاں بناتے ہیں اور پھر اپنی جیبوں میں سونا بھر کر اس طرح واپس ہوجاتے ہیں کہ ان کی بیویاں ان کی امانتوں کو لئے ہوئے پنگی چاؤں کی سیڑھیوں پر دن گذارتی ہیں یا ایک نئے قحبہ خانہ کا اضافہ کرتی ہیں اور پگوڈاؤں کی مقدس دیواروں پر سے کھرچا ہوا سارا زرد زرد سونا ——— سونا گاچیوں، چوکوں، چکلوں، محبوب کی مہندیوں، انارکلیوں اور سفید گلیوں میں پتلی بیگموں کیسر بائیوں اور طمنچہ جانوں کے پاؤں پر چڑھ جاتا ہے

اس وقت اس کی نگاہ کرما پر پڑی جو کونے کی ایک سیٹ پر اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اس نے محسوس کیا ——— جیسے اس نے کرما سے شادی کرلی ہے پھر اسے چھوڑ کر واپس چلا گیا ہے ——— اس کے بچے عیسائی مشنریوں میں داخل ہو چکے ہیں اور کرما کسی سہ منزلہ کی کھڑکی میں بیٹھی ہوئی ہر راہرو کو پُرامید نظروں سے دیکھ رہی ہے اس کا چمپئی چہرہ زرد ہوچکا ہے ۔

"اف میرے خدا" اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی

مقرر جو اسٹیج پہ بیٹھے ہوئے نامعروف مدرس اور معروف صحیفہ نگار سے ناواقف نہ تھا اپنی تقریر کی یہ اثر پذیری دیکھ کر اور پرجوش ہوگیا ——— وہ بیٹھا ہوا سوچتا رہا ۔

وہ کرما کا سارا چمپئی رنگ اپنے آغوش میں چھپا لینا چاہتا تھا اور اس کے ہونٹوں کا سارا شہد چوس لینے کا آرزومند تھا لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اپنی کرما کو اس طرح تباہ ہونے دیگا اور اگر وہ ہندوستان نہیں چھوڑ سکتا کرما سے دست بردار ہو جائے گا ——— پھر وہ بالکل پہلی مرتبہ یہ فیصلہ کر سکا کہ "یقیناً وہ ہندوستان چلا جائے گا اور اپنی محبت کو دل سے نکال پھینکے گا"

اور جب تقریر کرنے کھڑا ہوا تو اپنی تقریر میں اپنی پوری قوت ارادی سے کام لے کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا :-

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور حکومت جس دن بیرونی اصحاب کو یا آپ کی زبان میں موسمی پرندوں کو راہِ آزادی کا روڑا بنانا چاہے گی ——— اس دن ——— ؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس دن اسپارک اسٹریٹ جٹی سے جو سب سے پہلا جہاز روانہ ہوگا اس پر جانے والوں میں سب سے پہلا آدمی جو ہوگا وہ میں ہوں گا اس لئے کہ میں ہندوستانی ہوں اور آپ کی ترقیوں کا سب سے زیادہ آرزومند ! اور اگر آپ کے ملک پر کوئی مصیبت آئی جس کے اس وقت بہت زیادہ امکانات ہیں تو اپنا آخری قطرۂ خون بھی آپ کے لئے اور آپ کے ملک کے لئے قربان کر دوں گا اور اپنی زندگی کی آخری ہچکی بھی اسی سرزمین پر لوں گا جس کا چاول کھا کر جی رہا ہوں ——— اور یقیناً تانبوے کے قبرستان میں چند گز زمین آپ سے لے لوں گا ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس وقت کرما نے پرجوش چیرز دیا اور سارا ہال تحسینی صداؤں سے گونج اٹھا ۔ چمپئی رنگ اسے محبوب تھا ہر چمپئی رنگ اس وقت اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور چمپئی ہتھیلیاں اس کے اعزاز پر مسلسل ٹکرانے لگیں

اور ہال سے جب وہ باہر نکل کر بس اسٹیج پر پہنچا تو کرما اس کا انتظار کر رہی تھی دونوں نے ایک دوسرے کو محبت بھری نظروں سے دیکھا ——— آج اسے کرما کی نگاہوں میں ایک نشہ آور چمک دکھائی دے رہی تھی وہ اپنی چھوٹی بہن کی انگلی تھامے پیاری پیاری نظروں سے اسے دیکھتی رہی اور اس کے جسم میں سنسنی سی تیرتی چلی گئی ۔

"تم اسپارک اسٹریٹ کے سب سے آخری جہاز کے سب سے آخری آدمی ہو گئے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !" کرما نے کہا اور مسکرانے لگی ۔

اس کا دل سینے میں سنسنانے لگا اور روح مسرت سے جھوم گئی

"اور کیا ؟" اس نے بیتابی سے پوچھا

"کچھ نہیں ——— میں ایک مرتبہ ہندوستان دیکھنا چاہتی ہوں ——— بہر حال وہ میرے والد کا ملک ہے"

کرما نے جواب دیا اور کھل کھلا کر ہنس پڑی اسے ایسا معلوم ہوا کہ ساری دنیا مسکرانے لگی ہے اور فضا میں بہت سے چمپئی رنگ کے پھول کھل اٹھے ہیں اور ہر طرف گیندے کے پھول برسنے لگے ہیں میخانے جھومتے نظر آئے اس کی ساری گویائی جواب دے گئی اور جذبات دل سے امنڈ کر حلق میں پھنس گئے اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا اس کا جی چاہا کہ اپنی متاعِ زندگی کو اپنی آغوش میں کھینچ لے اور اپنے سلگتے ہوئے ہونٹ اس کے بھیگے ہوئے ہونٹوں سے پیوست کر دے اس کے ہاتھ بڑھے لیکن پھر ہوش آ گیا وہ بس اسٹیج پر کھڑا تھا ایک بڑی شاہراہ ڈلہوزی اسٹریٹ کے چوراہے پر ———

اس نے سوچا چمپئی رنگ کی دوشیزہ اس کی متاعِ حیات کرما اس کے ساتھ ہندوستان جانے کے لئے تیار ہے اور وہ ابھی اس مسرت سے پوری طرح لطف اندوز بھی نہ ہوا تھا کہ محکمۂ تعلیمات کا اخضری آنکھوں والا کلرک آتا ہوا دکھائی دیا ، کرما کی صاف پیشانی پر سینکڑوں بل پڑ گئے اور اس کے دل میں نفرت کی ایک ایسی لہر دوڑ گئی جس نے اس کی مسرتوں کی سانس روک دی وہ کلرک کو آتا ہوا دیکھتا رہا +

حسن محمود عروج

باقی آئندہ

منشی عبدالغفار نے عشاق پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر سائیکولوجی اردو ۱۳۱ میریٹ روڈ سے شائع کیا

سائیکولوجی کا بے نظیر تحفہ
"ذہنی عکس ریز" کورس ۱۹۴۹ء

اگر آپ دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو یہ ضرور پڑھیں مستقل خریداروں کی فہرست میں نام لکھائیں۔ یہ پیشکش پاکستان اور ہندوستان میں آج تک کسی نے نہیں کی +



آپ کا کردار کس درجہ مکمل ہے اس کا حل سوائے آپ کے کوئی نہیں جان سکتا - ادارہ سائیکولوجی نے "شخصیت" کے معائب اور محاسن کا آئینہ دار ایک کورس مرتب کیا ہے جو زندگی کے تمام اہم پہلوؤں پر روشنی ڈال کر ہر شخص کو بتادیتا ہے کہ اس میں کیا خامیاں ہیں اور ان خامیوں کو دور کرنے کے لئے اسے کیا کرنا چاہئے۔

ذہنی عکس ریز چھپ گیا ہے جن مستقل خریداروں نے اب تک آٹھ آنے بھیجدئے ہیں ان کی خدمت میں جلد ارسال کیا جائیگا اور جن احباب نے اب تک نہ بھیجے ہوں وہ بھیج کر منگا لیں -

PSYCHOLOGY

HEALTH · HAPPINESS · SUCCESS

انگلستان کے مشہور نفسیاتی ماہنامہ کا اُردو ایڈیشن





ډيم ډيره پارکر

حکومت آئرلينډ کي شمالي

د نون وزير





"ډبليو بزن"

سائیکولوجی (اُردو)

جلد-۱ نومبر ۱۹۴۹ء نمبر ۱

ادارۂ تحریر

سعیدہ عروج ایم-اے-بی-ایڈ

حسن محمود عروج

مدیر عمومی

انعام اللہ خان بی، اے، بی، ایل

معتمد عمومی

علاء الدین خالد

قیمت فی پرچہ
پاکستانی سکہ ۸ آنے
ہندوستانی سکہ دس آنے

سالانہ چندہ سکہ پاکستانی
پانچ روپے (۵/-)

دفتر
سائیکولوجی اردو، پوسٹ بکس نمبر ۵۶۶ کراچی ۲

مندرجات

پہلی نظر

عیار نظر

خواب

جب محبت زندگی کی جو کشمکش پر قدم انداز ہوتی ہے

بات چیت

کیسے بھولوں

بچوں میں احساس حسن

غزلیات

کیا آپ کی ترقی آپ کی قسمت کی مسرتوں میں حائل ہے

ظلم اور جنسیت اور بربریت کا عنصر

پہلی کہانی

سلام و پیام

فرار

پہلی نظر

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

جذب و حال

ہرچند کہ ماضی گذر گیا اور "بیتی باتوں" کا ذکر ہی کیا ؟ لیکن اس کو کیا کہیے کہ "بیتے دن" آنے والے دنوں سے اتنا مضبوط رشتہ وتعلق رکھتے ہیں کہاں کو توڑ دینا ——————— انسان کے بس کا کام نہیں !

"ماضی" اپنے گذر جانے کے باوجود ہم کو آپ کو اس انداز میں متاثر کرتا رہتا ہے کہ شاید اپنے "حال و موجود" میں اتنا اثر بخش نہیں ہوتا۔ یہ بھلا آپ کا "لاشعور" کیا ہے ؟

بیتے دن ! بیتی باتیں بیتے تجربات اور بیتے لمحات ——————— ان ہی کا خزانہ تو ہے لاشعور !

یہ ماضی ہی تو ہوتا ہے ، فرد کا ماضی جماعت کا ماضی اور نسل کا ماضی ——————— یہی تو ہے جو "لاشعور" میں کروٹیں لیتا رہتا ہے اور پتہ رہتا ہے اور تڑپاتا رہتا ہے - !!

جانے اہل نظر کیا سمجھیں اور ممکن ہے یہ میری دیوانگی ہی ہو لیکن اس کو کیا کروں کہ اکثر محسوس کرتا ہوں (صرف سوچتا نہیں) کہ اگر ماضی نہ ہو تو شاید لاشعور کا وجود بھی نہ ہوتا - یا سب کچھ "شعور" ہوتا یا پھر کچھ بھی نہ ہوتا -

یہ جو بڑے بڑے نفسیین "دیو مالاؤں اور علوم الاصنام" کی چھان بین میں پڑے ہوئے ہیں انسان کے خوابی اشاروں کا کھوج اور حل نکال لیں یہ سب ماضی کی تلاش نہیں تو اور کیا ہے ؟

پھر کتنے "بھولے" ہیں وہ لوگ جو ماضی سامنے سے کہہ کر گذر جانا چاہتے ہیں حالانکہ ماضی کے "ہلکورے" تو مستقبل کے سمندر کو "طوفان در آغوش" کئے ہوئے ہیں -

اس کے باوجود اگر ماضی کی طرف پلٹنا اور ایک نظر "گذشتہ" پر ڈالنا رجعت ہے تو پھر مجھے اقرار ہے کہ میں کٹر قسم کا رجعتی ہوں -
"جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا" صرف لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ ہی نہیں بلکہ عین حیات و زندگی ہے ، پھر اس حیات و زندگی سے گذر جانا مجھ سے ممکن نہیں !

اس لئے آئیے سائیکولوجی کے ماضی کا ایک جائزہ لیں اور آگے بڑھیں -

جولائی میں سائیکولوجی ان نئے ہاتھوں میں آیا عورت نمبر چھپ چکا تھا - اور جولائی کا شمارہ نئے ہاتھوں میں تھا - ترتیب و مضامین کے لئے ایک مختصر سا وقفہ یقیناً ناکافی لیکن اسی وقفہ میں وہ پورا کام کر لیا گیا جو ایک مہینہ میں پورا ہونا چاہیئے تھا اور یہ خودستائی نہیں بلکہ صرف اظہار حقیقت [illegible] ہو گئی -

[illegible] "معیار نظر" کے تحت وہ آپ کے سامنے ہیں - اگست کا شمارہ کچھ اور نکھر آیا [illegible] - یہ کیونکر عنوانات کافی دشوار تھے لیکن [illegible]
[illegible]

ان کو سنبھالنے اور نبھانے کی کوشش کی گئی اور خدا کا شکر ہے کہ یہ سعی و کاوش نہ تو ناکام رہی نہ رائیگاں گئی۔ قارئین نے پڑھا پسند کیا اور سراہا۔ اور ان کے مفید و قبول ہونے کا یہی معیار تھا۔

اگست بیتا اور ستمبر کا پرچہ سامنے تھا۔ مضامین پہلے سے اچھے تھے۔ ترتیب میں بھی کوئی خاص خرابی نہ تھی اور خدا کا شکر ہے کہ پرچہ پہلے سے زیادہ مقبول ہوا۔ اشاعت میں جو آہستہ آہستہ اضافہ ہو رہا تھا اس کی رفتار تیز ہو گئی ——— خریداری کی مسلسل فرمائشیں موصول ہوئیں۔ کسی پرچہ کی بڑی کامیابی یہی ہے ——— !! ابھی اپنی کاوش پر مسرور ہی ہو رہا تھا کہ قضا و قدر کی جانب سے تیر پھینکا گیا ——— دلدوز جان لیوا

پنجشنبہ ۱۵ ستمبر کی شام کو ۹ بجے گھر پہنچا تو نقشہ بدلا ہوا تھا۔ میرا بیٹا نو مہینے کی ننھی سی جان اپنے بستر پر تڑپ رہا تھا۔ بولنا کیا جانے زبان کی حرکت اور بے قراری سے پیاس کا اظہار دم بدم ہو رہا تھا۔

سیب کا عرق چمچے سے پلایا جا رہا تھا لیکن تقاضا تھا کہ اسی طرح قائم ——— سب کے دل سینے میں کانپ رہے تھے "اللہ خیر کرے" ——— لیکن اگر موت خیر نہیں ہے تو اللہ نے خیر نہ کی۔ اور ۱۶ ستمبر کی صبح کو ساڑھے آٹھ بجے "حسن مسعود سہیل" اپنے باپ وقار اور اپنی ماں سعیدہ سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا انا للہ وانا الیہ راجعون!

اور اب محسوس ہوا کہ سہیل کی موت کتنا بڑا حادثہ تھی جب دیکھا کہ سعیدہ کی گردن بھی "ملک الموت" کے پنجوں میں ہے ———

بہر حال پورا ستمبر سہیل کے ماتم اور سعیدہ کی زندگی کی دعاؤں میں صرف ہو گیا ——— خدا کا شکر ہے کہ سعیدہ خطرے سے نکل آئیں

سہیل دفن ہو چکا ہے سعیدہ اچھی ہو گئیں لیکن دل پر جو ایک زخم لگ گیا تھا وہ ہنوز تازہ ہے! اور نہیں جانتا کہ کیوں؟؟

گو یہ تمام تر ایک "انفرادی مسئلہ" تھا لیکن اس کا اثر سائیکولوجی پر پڑا نہ صرف یہ کہ پرچہ لیٹ ہوا بلکہ ترتیب مضامین میں بھی کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو ہی گئی اس عالم میں اکتوبر کا پرچہ بس نکال دیا گیا ——— اور خود مجھے بھی پسند نہ آیا۔

ہر چند کہ وہ جو "ایک بگاڑ" اکتوبر کے شمارے میں پیدا ہو گیا اس کا سنبھالنا میرے اختیار میں نہ تھا لیکن قارئین کرام سے شرمندہ ہوں اور [illegible] !!

اب نومبر کا شمارہ آپ کے سامنے ہے۔ اس میں پھر وہ سب کچھ موجود ہے جو ہونا چاہیے لیکن اگر کچھ کمی ہے تو انشاء اللہ آئندہ شمارے میں پوری ہو سکے گی [illegible] آپ کا تعاون شرط ہے!

پرچہ کو سب سے بڑا دھچکا ہند و پاکستان کے سکوں کے غیر متوازن ہو جانے سے پہنچا۔ اور نہ جانے ابھی اس کے کیسے کیسے اثرات پڑیں۔ ہندوستان میں جو پرچے ایجنٹ منگاتے تھے ان کی رقوم یک لخت رک گئیں، خریداری کی جو فرمائشات آئی ہوئی پڑی ہیں ان کا دیکھا نہیں کیا جا سکتا اور اس نقصان کی تلافی کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اگر قارئین کرام اپنے اپنے حلقہ میں سائیکولوجی کی توسیع اشاعت کی کوشش کریں تو یقیناً یہ ایک مناسب حل ہوگا۔

امید ہے کہ قارئین کرام اس طرف ضرور متوجہ ہوں گے !!!

وما توفیقی الا باللہ

ذہنی عکس ریز

چھپ گیا ہے۔ یہ صرف سائیکولوجی کے مستقل سالانہ خریداروں ہی کو دیا جائیگا۔ اس لئے جو صاحب مستقل سالانہ خریدار نہیں ہیں وہ ذہنی عکس ریز منگانے کے لئے مبلغ چھ روپے آٹھ آنے کا منی آرڈر روانہ کریں یعنی پہلے انہیں سالانہ خریدار بنائیں اور پھر ذہنی عکس ریز کورس روانہ کریں۔ (مدیر)

معیارِ نظر

سائیکولوجی کو دیکھ کر اربابِ ذوق اور اہلِ نظر نے جو رائیں ارسال فرمائی ہیں۔ انہیں ہم اپنے ہزار جذبہ ہائے تشکر و امتنان کے شائع کرنے کی عزت حاصل کر رہے ہیں۔ ادارہ

مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی۔ مدیر صدق، لکھنؤ۔

"سائیکولوجی اردو" ــــــ انگلستانی ماہنامہ کا اردو ایڈیشن۔ متعدد مضامین، انگریزی سے ترجمہ کئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں نظمیں اور بعض مضامین اردو کے بھی ہیں۔ بعض مضامین مثلاً روز مرہ سائیکولوجی کار آمد ہیں ــــــ ریویو یہیں تک پہنچا تھا کہ رسالہ کا جولائی نمبر دہلی [illegible] عبارت، معنی، مضمون، املا انشا، غرض بجز سرورق کی لوح کی مشابہت کے ہر چیز پہلے سے مختلف۔ اس نمبر کا کوئی ایک آدھ مضمون نہیں بلکہ کہنا چاہیئے کہ سارے ہی مضامین کار آمد اور انشار کے لحاظ سے اتنے دلآویز کہ جو ترجمہ ہیں، ان پر ترجمہ کا دھوکہ نہیں ہوتا! مضمون نگاروں کی فہرست میں متعدد انگلستانی اہلِ قلم کے ساتھ ساتھ ہمارے مولانا گیلانی اور مولانا عبد القدوس ہاشمی ندوی کے نام بھی شامل ہیں ایک دلکش مسلسل افسانہ بھی "فرار" کے عنوان سے شروع ہوا ہے۔

پرچہ کی خریداری اور سرپرستی کی سفارش اب پورے انشراحِ قلب کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر محمود حسین خان صاحب نائب وزیر خارجہ، حکومت پاکستان کراچی

"آپ کا رسالہ سائیکولوجی دیکھنے میں آیا۔ جولائی سے لے کر اکتوبر تک کے پرچے پڑھے۔ بہت پسند آئے۔ مضامین کا معیار بلند ہے، مشکل مضامین اس طرح سے پیش کرنا کہ اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں بڑا کٹھن کام ہے، مگر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ اس میں غیر معمولی طور پر کامیاب ہوئے ہیں، میں آپ سے اس بات کو چھپانا نہیں چاہتا کہ جب میں نے آپ کے رسالہ کا ذکر سنا تھا تو خیال کیا تھا کہ کوئی کم معیار اور سستی قسم کی چیز ہوگی، رسالہ دیکھ کر نہ صرف یہ بدگمانی جاتی رہی بلکہ یقین ہو گیا کہ آپ نے اردو صحافت میں ایک نئی اور مفید راہ نکالی ہے"۔

ڈاکٹر اختر حسین صاحب رائے پوری، نائب مشیر تعلیم، حکومت پاکستان کراچی

[illegible] کا خارجی ماحول نہیں بلکہ اس کا باطنی تھا، لیکن پرانوں کو باطنی زندگی کے تجزیہ اور مطالعہ کا اندازہ آیا [illegible] کو معاشیات کے تحت مرتب کرنے کی کوشش شروع ہوئی، وہاں دوسری طرف [illegible] کے کام کا بھی آغاز ہوا۔ اب تو جدید علوم میں سائیکولوجی کو مستقل اور اہم مقام حاصل ہے اور اس [illegible] روز بروز وسیع ہوتے جاتے ہیں۔

اردو میں اس علم پر کم لکھا گیا ہے، کوئی رسالہ اب تک ایسا نہ نکلا تھا جو اسی علم کی اشاعت کے لئے وقف ہو اس لحاظ سے ماہنامہ

سائیکولوجی کے ناشر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس مہم میں ہیں کو اور نفسیات [illegible] کا بیڑا اٹھایا - یہ کام مشکل ہے لیکن کرنے کا ہے -

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ عام انسان ایسی چیزیں پڑھنے سے گریز کرتا ہے جو اسے زندگی کے حقائق سے آگاہ کرتی ہیں - اور محض ایسی تحریروں کو پسند کرتا ہے جنہیں پڑھ کر وہ زندگی کے حقائق کو بھول سکتا ہے - لیکن حقیقت سے مفر نہیں - خارج و باطن الگ نہیں اور دونوں کے باہمی تعلق کو سمجھے بغیر صحیح عمل ممکن نہیں -

مجھے امید ہے کہ اردو داں طبقہ میں رسالہ سائیکولوجی مقبول ہوگا -

---

وقار عظیم صاحب مدیر ماہنامہ ماہ نو - کراچی

"میں آپ کے رسالہ کا مطالعہ پابندی سے کر رہا ہوں - اور اس کے ہر مضمون کو دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہوں - پچھلے چند برسوں میں نفسیات نے فرد اور جماعت کی زندگی پر جو گہرے اثرات ڈالے ہیں ان کا تقاضا یہی تھا کہ عوام کو بھی اس مفید علم سے روشناس کرایا جائے - یہ کام اس لئے بہت مشکل ہے کہ علمی چیزوں کو عام فہم زبان میں لکھنا بڑی دشوار بات ہے - آپ کے رسالے نے یہ کام بوجوہ احسن انجام دیا ہے - نفسیات کے مطالب کو عام فہم زبان میں پیش کرنے کے علاوہ انسانوں میں آپ نے انسانی زندگی کو جس خوبی سے سلجھانے کی کوشش کی ہے وہ علم کی بھی خدمت ہے اور انسان کی بھی -

مجھے یقین ہے کہ آپ کا رسالہ ہر طرح کے لوگوں میں زیادہ سے زیادہ مقبول بھی ہوگا اور ان کی ذہنی الجھنوں کو دور کرنے میں معین و مددگار ثابت ہوگا"

(پروفیسر) سید احتشام حسین صاحب، لکھنؤ یونیورسٹی

ستمبر کا شمارہ ملا - شکریہ! نفسیات کو عام بنانا، اس کی ترویج، اس کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کرنا یہ عالم انسانیت کی بڑی ضرورت ہے - میں ذاتی طور پر نفسیات کو خارجی ماحول کا نتیجہ سمجھتا ہوں - موقعہ ملا تو ضرور کچھ حاضر خدمت کروں گا - ایسا اچھا رسالہ نکالنے پر مبارکباد قبول کیجئے "

ماہر القادری صاحب مدیر ماہنامہ فاران - کراچی

ماہنامہ جب سے ان نئے ہاتھوں میں آیا ہے اس کے زمین و آسمان ہی بدل گئے - اس کا "ادارہ" ادب و اخلاق کے حدود میں رہ کر "نفسیات" پیش کرتا ہے، مضامین متنوع اور دلچسپ ہیں، باتوں باتوں میں "علم النفس" کے نازک عقدے کہیں کہیں وا ہو گئے ہیں، اس ماہنامہ میں صرف ترجمے ہی نہیں اوریجنل مقالے بھی ہوتے ہیں -

"نفسیات" پر پچھلے ارباب فکر نے جو کتابیں لکھی ہیں، وہ کارآمد اور مفید ضرور ہیں مگر وہ "قول فیصل" کی حیثیت ہرگز نہیں رکھتیں ان میں [illegible] ترمیم بھی ہو سکتی ہے - ذہنی کش کش اور نفسی الجھنوں کو ریاضی کے مسلمات کی طرح کسی ایک قاعدے اور اصول کے تحت [illegible] "نفسیات" اتھاہ سمندر اور ایک [illegible] ہے جس کا اور چھور پانا مشکل ہے [illegible]

[illegible]

خواب

از حضرت مولانا عبدالقدوس ہاشمی مدظلہ

خوابوں کے بارے میں جدید علم نفسیات کے بعض علماء کی رائے ہے کہ یہ تمام تر نتیجہ ہے انسانی بدن کے طبیعاتی و کیمیاوی تغیرات کا، اور بعضوں کے نزدیک خواب ذہن میں قائم شدہ نقوش کی دوبارہ شکل پذیری سے زیادہ کچھ نہیں ہے، لیکن کیا خواب سارے کے سارے ایسے ہی ہوتے ہیں اور وہ سب کچھ جو ہم خوابوں میں دیکھتے ہیں وہ صرف ہمارے جسمانی و ذہنی تاثرات کے عکس ہی ہوتے ہیں اور کچھ نہیں؟

یہ ایک سوال ہے جس کے جواب میں بہت کچھ کہا گیا ہے، اور بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، انسان ایک ایسا طلسم ہے جس میں ہزاروں ہی در بند میں اور ہر در بند کے اندر ایک طلسم، ان سارے در بندوں سے اگر کوئی طلسم کشا کامیابی کے ساتھ گزر جائے تو شاید خود انسان کے گنبد بے در تک رسائی ہو، اور طالبان [illegible] عرفان حق کے بڑے ہی دشوار گزار مقامات میں سے کسی اسکنڈ فرائڈ اور کسی مسٹر جنس کے لئے کچھ کہہ دینا تو آسان ہوگا لیکن دوسرے انسانوں کے [illegible] کو قبول کر لینا، اور خصوصاً تجربات و مشاہدات کے برخلاف [illegible] کو قبول کر لینا، آسان کام نہیں،

ایک بار کا نہیں بلکہ بیسیوں مرتبہ کا تجربہ ہے کہ ہم برسوں کے بعد وقوع میں آنے والے ایسے واقعات کا پورا پورا نقشہ خوابوں میں دیکھ لیتے ہیں جن کے متعلق کوئی خیال ہمارے سامنے موجود نہیں ہوتا، اور ہزاروں میل پر ہونے والے واقعات کو ہم اس طرح خوابوں میں دیکھتے ہیں جیسے کہ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہے ہوں حالانکہ اس کا کوئی وہم و گمان بھی ہمارے نزدیک نہیں ہوتا۔

اب ذرا سوچئے کہ ہم ان خوابوں کو ذہنی کیفیت کا مظاہرہ کیونکر سمجھ لیں اور کیسے یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لیں کہ یہ معدہ کی خرابی یا سوء ہضمی کے نتائج ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہم جو کچھ سونے کی حالت میں دیکھتے ہیں، ان میں سے بہت سا حصہ ہمارے جسمانی و ذہنی کیفیات کا عکس ہی ہوتا ہے، ہوتا ہوگا لیکن اس سے یہ یقیناً صحیح نہیں ہے کہ خواب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا، یہ دوسری بات ہے کہ آپ نے اپنی زبان میں ایک ہی لفظ رکھ لیا ہے یا اور بہت سی زبانوں میں جو کچھ انسان حالت خواب میں دیکھتا ہے، ان سب کے لئے بغیر کسی امتیاز و تفریق کے ایک ایک ہی لفظ مستعمل ہے۔

عربی میں بعض علماء نے خواب کی مختلف قسموں کے لئے مختلف الفاظ مثلاً منام، رُویا، اور اَحلام وغیرہ استعمال کئے ہیں لیکن اردو اور انگریزی میں ایسے بہت سے الفاظ شاید نہیں مستعمل ہیں اس لئے اشتباہ کی گنجائش کافی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے کہ خواب کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں یا نہیں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ خود انسان کیا ہے، اور اس کے ذرائع علم کیا کیا ہیں، اس کے بعد شاید یہ آسانی سے سمجھ میں آ جائے کہ انسان جو کچھ خواب میں دیکھتا ہے وہ سب کچھ ایک ہی ذریعۂ علم سے حاصل شدہ نہیں ہے۔ پھر یہ مسئلہ کہ انسان کیا ہے، بے انتہا مشکل، معرکۃ الآراء اور انتہائی اختلافی مسئلہ ہے، اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ میں سقراط سے لے کر اب تک فلسفیوں نے جو کچھ کہا ہے، وہ آپ کے سامنے دہرا دوں، فلسفہ کوئی آسمان سے اتری ہوئی چیز نہیں، ہم جیسے ہی انسانوں کی مساعی سے پیدا شدہ کچھ معلومات کا ہے، ان افکار سے پیدا شدہ نتائج ہیں۔ اس لئے خود سوچئے، بار بار سوچئے، اور گھبرا نہ جائیے۔

کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کیا آپ کے [illegible] ہے کہ یہ گوشت و پوست کا مجموعہ جو نظر آتا ہے اور محسوس ہوتا ہے، بس یہی ہے، کیا [illegible] ایک [illegible] ہے وہ سب کچھ یہی ہے، کیا کوئی ماں اپنے کالے اور بدصورت لڑکے سے ایک گورا [illegible] کو راضی ہوتی ہے؟ آخر کیوں نہیں راضی ہوتی، اگر یہی جسم اور یہی صورت [illegible] نہیں ہوتی، حالانکہ وہ [illegible] برتن سے اچھے برتن اور دُبلی بکری سے موٹی بکری

بننے کو تیار ہو جاتی ہے۔

کبھی آپ نے سوچا ہے کہ پیرکٹ جانے سے جسم ناقص ہو جاتا ہے مگر انسان ناقص نہیں ہوتا۔ [illegible] سے کم ہو جاتا ہے، لیکن اس کی انسانیت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ پڑھنے لکھنے سے آدمی کی معلومات بہت [illegible] ہے مگر پھر بھی ایک ان پڑھ کے مقابلہ میں وہ انسان ہی رہتا ہے، اور بالکل ویسا ہی انسان جیسا کہ ان پڑھ ہوتا ہے۔ لیکن جب انسان مر جاتا ہے تو اسی دم جسم میں کوئی تغیر و تبدل سے پہلے ہی وہ انسان نہیں رہتا نہ جانے کیوں ؟

تاویلیں چاہے جتنی کر لیجئے، اور عقلی موشگافیاں جتنی ممکن ہوں، سب ہی آزما دیکھئے، لیکن ان مشاہدات کی موجودگی میں کوئی بھلا آدمی یہ نہیں مانے گا کہ انسان تمام تر ایک محض طبیعاتی کھیل ہے اور محسوس گوشت و پوست کے سوا کچھ اور نہیں۔

اگر انسان اس محسوس پیکر کے علاوہ بھی کچھ ہے تو کیا ہے، اس کا جواب دینے کا یہ موقع نہیں، آپ خود ڈھونڈ ھیئے، مل جائے گا۔

اسی طرح انسان کے ذرائع علم پر غور کیجئے، یہ پانچ حواس ظاہری تو سب ہی جانتے ہیں، اور پڑھے لکھے لوگ باطنی حواس، وہم، خیال، ادراک، تعقل اور وجدان سے بھی ناواقف نہیں۔ لیکن ان دس ذرائع علم کے علاوہ ایک گیارہواں ذریعہ علم بھی ہوتا ہے۔ ان دس ذرائع کو عربی میں حواس عشرہ اور سنسکرت میں "دشاندری" کہتے ہیں، اور اس گیارہویں ذریعہ علم کو آپ جو چاہیں نام دے لیں۔ بعضوں نے اسے الہام (دردل افگندن) سے تعبیر کیا ہے، آپ گھبرا جائیے یہ الہام، الہام نبوت نہیں، اور وحی رسالت ہے، یہ ایک عام ذریعہ علم ہے جس کی طرف قرآن حکیم میں فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا سے اور اَوْحٰى اِلَى النَّحْلِ سے اشارہ کیا گیا ہے اور یہ ہر ایک کے لئے ہوتا ہے، ہر شخص کو ملتا ہے۔ بعض جاہل اور نادان لوگوں نے اسے اپنے لئے خصوصی ذریعہ سمجھ کر دعویٰ نبوت کر دیا، حالانکہ یہ نادان نہ لفظ الہام کا مفہوم سمجھ سکے اور نہ منصب نبوت کی حقیقت۔

اب ذرا اس پر بھی غور فرما لیجئے کہ ہم جسے علم، دانش یا انگریزی لفظ "نولج" سے تعبیر کرتے ہیں یہ کہاں سے آتا ہے، چاہے وہ کہیں کسی ذریعہ سے حاصل ہوتا ہو لیکن اس کا سرچشمہ کہاں ہے، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے جسمانی انقلابات اور کیمیاوی تغیرات کے نتائج نہیں ہیں، بہت سے علوم ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا کوئی رشتہ ہمارے جسمانی تغیرات سے نہیں جوڑا جا سکتا، پھر کیا تعجب کی بات ہے کہ ہم جو کچھ نیند کی حالت میں دیکھتے ہیں، ان کی متعدد قسمیں ہوں، بعض وہ ہوں جنہیں آپ اپنے نفس سے منسوب کر سکیں، اور بہت سے وہ ہوں جنہیں نفس سے منسوب نہ کیا جا سکے۔

اسی لئے حضرت محمد بن سیرینؒ نے جو اپنے زمانہ میں خوابوں کے خصوصی ماہر تھے، خوابوں کی تین قسمیں بتائی ہیں (۱) تَحْدِيثُ النَّفْسِ (۲) تَخْوِيفٌ مِنَ الشَّيْطَانِ (۳) بُشْرٰى مِنَ الرَّحْمٰنِ یہ تو ان کی تقسیم ہے، بعض ارباب علم نے اور بھی قسمیں بتائی ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خواب میں آدمی کو ایسی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جن کا کوئی سان و گمان بھی نہ ہو، خود میرا ایک واقعہ سن لیجئے، ذاتی مشاہدہ ہے۔ میں ایک ایسا آدمی ہوں جسے بہت ہی کم خواب آتے ہیں، اپنی زندگی بھر میں میں نے شاید دو تین ہی بار خواب دیکھے ہیں۔

دس بارہ سال ہوئے کہ میں اپنے قدیم وطن مخدوم پور ضلع گیا (بہار) میں مقیم تھا، اور تقریباً ایک ماہ سے مسلسل وہیں تھا بھی کا مہینہ تھا، ابھی بارش نہیں ہوئی تھی، میری بستی ایک چھوٹی سی بستی تھی (جو اب اُجڑ گئی) سب لوگ ایک دوسرے سے باخبر تھے اور سب آپس میں رشتہ دار تھے۔

میں نے سفر کا ارادہ کیا۔ شام کو سامان سفر درست کیا گیا، اور علی الصباح سفر کا قصد تھا، رات کو پچھلے پہر میں نے خواب میں دیکھا کہ بعد مغرب کا وقت ہے اور قبرستان کے قریب ایک جنازے کی نماز پڑھ رہا ہوں، جنازے پر سرخ چادر پڑی ہے، اور مہین مہین بوندیاں پڑ رہی ہیں، لالٹین بائیں طرف ایک درخت کے قریب دھری ہے۔

صبح اٹھ کر میں نے یہ خواب والدہ ماجدہ مدظلہا سے بیان کیا، اور یہ بھی کہا کہ آج سفر ملتوی، میں کبھی خواب نہیں دیکھتا شاید یہ خواب سچا ہو، دیکھ لوں، انہوں نے فرمایا کہ بستی بھر میں کوئی بیمار نہیں جس کے مر جانے کا اندیشہ ہو، میں نے جواب دیا آج ہی جانا ضروری نہیں ہے، دو چار دن کے بعد چلا جاؤں گا۔

ہمارے ہاں سے ۱۵/۱۶ میل کے فاصلہ پر میری ایک چچازاد بہن رہتی تھیں وہ بغیر کسی سابق اطلاع کے آ گئیں، اور [illegible] ہو گیا، جب مغرب کے بعد جنازہ اٹھا اور ہم نماز کے لئے اکٹھے ہوئے تو مجھے خیال آیا کہ یہاں تک تو خواب [illegible]

[illegible] طرف دیکھ رہی ہے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایک صاحب نے لالٹین لے جاکر اسی جگہ رکھ دی جہاں میں نے خواب میں دیکھا تھا، اور بادل بھی بکھر آئے، پھر سارا نقشہ بالکل ویسا ہی عالم ہو گیا جیسا کہ میں نے خواب میں دیکھا تھا۔

یہ اور اس قسم کے سچے خواب ہوتے ہیں، اور ضروری نہیں کہ ایسے خواب کسی بزرگ، نیک سیرت اور ولی کامل ہی کے حصہ میں آئیں، ایسے خواب ہم جیسوں کو بھی آ سکتے ہیں اور آتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ انسان بس اسی قدر ہے جتنا دکھائی دیتا ہے اور نہ عالم بس یہی ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، انسان ایک پیکر محسوس میں پوشیدہ ہے مگر اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے، اور عالم بھی یہی اتنا نہیں بلکہ بہت کچھ ہے۔ اول تو خود اس عالم کے اندر بھی فاصلے مکانی و زمانی حقیقی نہیں بلکہ اعتباری اور محض اعتباری ہیں، اور دوسرے یہ کہ عالم بھی چار ہیں، عالم مثال، عالم شہادت، عالم برزخ اور عالم قیامت، انسان عالم مثال سے عالم شہادت، اور عالم برزخ سے گزرتا ہوا عالم قیامت کی طرف رواں ہے جہاں یہ لازوال مقام حاصل کرے گا، جب تک یہ عالم شہادت میں جلوہ گر رہتا ہے اس کا رشتہ عالم سابق یعنی عالم مثال سے اور عالم لاحق یعنی عالم برزخ سے قائم رہتا ہے، انسان پیدائش سے عالم شہادت میں داخل ہوتا ہے اور موت کے ذریعہ اس سے باہر چلا جاتا ہے۔

جسم انسانی پر جو طبیعاتی و کیمیاوی کیفیات اس عالم کی اقتضاء کے مطابق طاری رہتی ہیں ان کی وجہ سے آدمی پر ایک شدید قسم کی غفلت طاری ہو جاتی ہے، الا ما شاء اللہ بعض اوقات انسان حالت خواب میں اور کبھی حالت بیداری میں بھی اس غفلت سے چونک اٹھتا ہے، اس وقت آدمی کو کبھی عالم مثال، کبھی عالم برزخ اور کبھی کبھی عالم قیامت کی کیفیات نظر آنے لگتی ہیں۔ اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ یہ اعتباری فاصلہ زمانی و مکانی اس کے اور معلومات کے درمیان سے ہٹ جاتا ہے اور اسے ایسی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جو دوسروں کو معلوم نہیں ہوتی ہیں۔

اس لیے یہ خیال کر لینا صحیح نہیں کہ خواب سارے کے سارے "خیالات فاسدہ" ہی ہوتے ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ خواب کی قسموں میں امتیاز کرنا اتنا مشکل کام ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد اب شاید کوئی شخص یقین کے ساتھ یہ نہ کہہ سکے کہ یہ خواب سچا ہے، اسی لیے تمام ارباب علم اس پر متفق ہیں کہ خواب یا کشف و وجدان کو بطور حجت و برہان پیش کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں بہت سے احتمالات کی گنجائش موجود ہے۔

بہرحال آپ امتیاز کر سکیں یا نہ کر سکیں، یہ آپ کی کوتاہی ہے اس کی وجہ سے سارے خوابوں کو شعور کے کرشمے یا ذہنی انعکاس سے تعبیر کرنا صرف اس نادانی کا نتیجہ ہے جو انسان کو "عرفان نفس" کے فقدان کی وجہ سے لاحق ہوتی ہے،

(بقیہ صفحہ ۳۳ سے)

خدا کی یہ لاڈلی مخلوق بھی چلا اٹھی، او ہمارے پیدا کرنے والے ہم کیا جانیں یہ سب چیزیں کیا ہیں ہم تو صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہم کو بتلایا ہے!

یہ تھی ہماری پہلی فتح۔ جانتے ہیں آپ کس کے مقابلہ میں وہ کہ جس کو دنیا فرشتہ کہتی ہے۔

یہ ہے دنیا کی پہلی کہانی! لیکن یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ کیا اس کا بقیہ آپ دوسری فرصت میں سنیں گے!

آپ کے جواب کا انتظار رہے گا!

(بقیہ صفحہ ۳۱ پر سے)

[illegible] کے سینوں میں انسانی روحیں پھڑک رہی ہیں، یہ تڑپ اٹھتے ہیں کہ راہ راست سے بھٹک گئے ہیں ———— آپ [illegible]
[illegible] پسندی کی روح کو بیدار کیجئے ———— ان سا صادق اور نیک آپ کو ملیگا نہیں ———— یقین رکھئے ————

گناہ بھٹکی ہوئی نیکی ہے!

[illegible] آپ کا کام ہے۔

جب محبت زندگی کی چوکھٹ پر قدم انداز ہوتی ہے!

ایڈورڈ ارلی پیوریٹن

ہماری زندگی میں ہمارے بچپن کی "یادیں" ایسی بھی ہیں جو زندگی کی ٹھوس مٹیالی اور سخت چٹانوں پہ ہیرے کی کنیوں کی طرح جگمگاتی رہتی ہیں ——— اور ہم "روشنی" اور "نور" کی ان "کرنوں" کو سینہ سے لگائے لگائے پھرتے ہیں کہ ——— یہی تو ہمارے احساسات، تصورات تخیلات اور واردات کے خزانوں کے انمول جواہر ہیں ——— یہی تو وہ شاندار "یادگاریں" ہیں جو ہمارے "شجرۂ خاندانی" کی طرح ہمارے دل و دماغ میں محفوظ ہو کر رہ گئی ہیں!

بچپن کا جواہر نگار تاج "میری زندگی کا" زیر جدی لمحہ" بن جاتا ہے ——— اس کے اطراف چھوٹی چھوٹی "حسین یادیں" ہیرے زمرد نیلم، یاقوت اور پکھراج کی طرح جگمگاتی رہتی ہیں ——— اور میرا دعویٰ ہے کہ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب ایک "زیر جدی لمحہ" ان سنہری بوقلموں رنگتوں کو سمیٹ کر وہ سماں پیدا کرتا ہے جس پر انسانی تخیل کی ساری توانائیاں شل ہو جاتی ہیں ——— جہاں رنگوں، بو قلمونیوں اور انوار بے بہا کی ایک "نئی دنیا" وجود میں آتی ہے!

اس "قوت تاثر" اور اس "لمحۂ زیر جدی" کی قوت کا اندازہ لگانے کے لئے میں ایک سوال آپ سے کرتا ہوں ———

کیا آپ نے کبھی ایک بہت ہی بلند و بالا پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر دنیا پر نظر ڈالی ہے؟ ——— اگر آپ کو ایسا موقعہ ملا ہے تو آپ یقیناً میرے اس "زیر جدی لمحہ" کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں ——— آپ جانتے ہیں نا زبرجد کو؟ ——— وہ دودھیا، جھلملاتی پتھر جس میں ہر لمحہ ہفت رنگوں کی بہار اپنی بہار پر ہوتی ہے!

ور اس بلندی پر چڑھنے سے پہلے آپ کی زندگی کے طلوع تک جتنے لمحے گذر رہے ہیں شاید آپ میری طرح ان کو "تاریک لمحات" سے تعبیر کریں گے ——— اور ایسا کرنے کے بعد ہی آپ اپنی زندگی کے راستوں پر پیچھے مڑ کے دیکھ سکتے ہیں: ——— آج سے چوبیس برس پہلے ——— ! میرے ہمراہ چلئے آپ کو زندگی کا ایک "حقیقت افروز" پہلو دکھاؤں!

آج سے چوبیس برس پہلے ——— !

ہم امریکہ کی ایک گہری وادی میں خیمہ زن ہوئے تھے ——— جہاں اونچے اونچے درخت سرگوشیوں میں مصروف تھے ——— [illegible] رنگ چڑیوں اور [illegible] سے فضا گونج رہی تھی ——— ایک پہاڑی ندی [illegible] وادی [illegible] کی [illegible] کے سرے سے [illegible] روانی دواں تھی ——— رات آئی تو ان [illegible] محسوس ہوئی او [illegible] کے دامن میں تحلیل ہو گئے ——— !

لیکن جب پو پھٹی ——— تو صبح کا نظارہ عجیب ہیبتناک اور ڈراؤنا تھا ——— [illegible] ہزار فیٹ بلند پہاڑ ———

دامنوں میں ہمیں احساس کمتری کا مارے ڈال رہا تھا —— عظمت اور قوت کے اس عظیم الشان مظاہرے سے پیشانیوں پر قطرہ ہائے ندامت ابھر آئے تھے —— وہ وہاں —— تیس ہزار فٹ کی بلندیوں پر سرمئی رنگ کا پہاڑ برف کا سفید شال پہنے اپنا سنہرا تاج پہنے نیلے آسمان سے ٹکرا رہا تھا —— ہمارے تلووں سے کوئی سنسناہٹ اٹھ رہی تھی جو ہماری بانہوں اور کنپٹیوں میں تیرتی جا رہی تھی !!

ایک بہت ہی گہرا، تنگ اور دھندلا سا راستہ تھا جو اس پر عظمت چوٹی تک پہنچنے کی رہنمائی کر رہا تھا —— "رہبر" کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہم ایک دن اس راستے پر بڑھنے لگے —— راستہ جنگلی جھاڑیوں سے بری طرح مسدود ہوا جا رہا تھا —— اس پر ستم یہ تھا کہ اس قدر پر پیچ تھا کہ ہر نئے قدم پر رہبر کی ضرورت پیش آ رہی تھی —— اور ہمیں اس کی طرف "ہو ہو" کی پر زور آوازوں پر چلنا پڑ رہا تھا ——

راستہ دھندلی روشنی سے معمور تھا —— گھنی ایک دوسرے میں گتھی ہوئی ٹہنیاں تیز دھوپ کے راستہ پر سنگدل سپاہیوں کی طرح پہرہ لگائے بیٹھی تھیں —— بڑی مشکل سے کرنیں اندر آ رہی تھیں۔ عجیب عجیب رنگ اور وضع وضع کی چڑیا، اور جانور اندھیرے گوشوں میں گھسی جا رہی تھیں —— انسانی آوازیں نہیں معلوم ان کی قوت سامعہ پر کیسی ضربیں لگا رہی تھیں ایسے جانور —— جو ہماری نظروں سے قطعًا اوجھل تھے پتہ نہیں کس پیڑ کے تنے میں سے یا کس بل اور بھٹ سے ڈکارتے، پھنکارتے اور آوازیں لگاتے تھے کہ ہمارے ساتھیوں میں جن کا دل "کسی قدر نازک" واقع ہوا تھا مارے ڈر کے دھوبی کے دھلے کپڑے کی طرح سفید پڑا جاتا —— ہمارے قدموں میں نہ جانے کونسی بیسیائی طاقت گھس پڑی تھی کہ ایک بار اس کی برکتوں سے ایک اژدھے کا شکار ہوتے ہوتے بچے —— ایک گز قطر والے ایک موٹے تنے سے وہ چھ بار بل کھا کر ایک اونچے تنے پر سے اتنا لٹک رہا تھا کہ محسوس ہوتا تھا ایک ہی پھنکارے میں ہم سب کو کھینچ لے گا !!

کہیں ہمارے سامنے دیو پیکر چٹانیں دیوار بن کر حائل ہو گئی تھیں —— اور کہیں گہری گہری کھائیاں ہمارے سامنے اپنے بکھرے پھیلائے انگڑائیاں لے رہی تھیں —— ان کھائیوں کو پار کرنے کے لئے ہمیں ان کندوں کا سہارا لینا پڑا جن کو ہمارے پیشرو نہ معلوم کس طرح "پل" بنا کر رکھ گئے تھے —— ان پر کائی جم رہی تھی —— اور نیچے گہرے گہرے غاروں کی تہہ میں صرف اندھیرا اور دیواروں پر نمی نظر آ رہی تھی —— شائد ابھی زمین کے نچلے طبقوں میں سردی باقی ہے —— اور ان میں صدیوں کی دھندلاہٹیں جذب !!

بڑا سخت اور جان لیوا امتحان درپیش تھا —— نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن! —— کندے پر قدموں کے ساتھ ہاتھ بھی ٹیکنے پڑتے تھے اور "موت کے خوف" سے لتنے پسینے چھوٹ جاتے کہ محسوس ہوتا پہلے قدم پر غار کے پھیلائے ہوئے منہ کا "منتظر نوالہ" بن جائیں گے ہم میں مختلف گروہ بن گئے —— ایک نے منہ موڑ لیا —— ایک حیران کھڑا کا کھڑا رہ گیا ایک نے اللہ کا نام لے کر اس ایقان کے ساتھ کہ ایک دن مرنا برحق قدم ہمت بڑھا لئے —— !!

اور —— !!

قدرت کی نیرنگی کا تماشہ اس وقت نظر آیا جب ہم مٹی میں دم پکڑے نظر بر منزل اور قدم بر راہ عمل منزل پر پہنچے —— کھڑے ہو کر دم لیا تو ایسا محسوس ہوا کہ ہمیں پلک جھپکتے میں غیر مرئی طاقت نے اٹھا کر یہاں ڈال دیا ہے —— حالانکہ تلووں کی سنسناہٹیں ابھی احساسات کے گنبد میں گونج رہی تھیں —— !

[illegible] فطرت کی عظمتوں، نعمتوں اور بخششوں [illegible] سے چشم انتظار کی طرح کھلا پڑا تھا —— [illegible] ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ فطرت کے حسن اور خدا کی عظمت و جلال کا آسمان اور زمین کے درمیان اس خلا میں ایک دلکش اتصال ہو رہا ہے ——

اور علم و معلومات کا ایک لامحدود نظارہ ہے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے قطار دار درختوں کے درمیان ٹھنڈی، پرسکون اور فرحت بخش سڑک کی طرح دُور تک چلا گیا ہے !

اس بلند مقام سے ہم نے نیچے نظریں دوڑائیں

وہ عظیم الشان پہاڑی ندی ——— ایک روپہلی ڈورہ کی طرح مڑتی تڑپتی چلی جا رہی تھی ہمارے نیچے ——— وادی کے حسین مٹیالے دامن پر سفید خشخاش کے دانے سے نظر آ رہے تھے ! ہم ڈھائی ہزار فیٹ کی بلندی پر کھڑے تھے !

اب ہم ان خاموش اڑنے والے عقابوں شاہینوں کے "پڑوسی" تھے جن کا شعار چٹانوں پر بسیرا کر لینا ہے !

اب ہم کیا تھے ؟

وہ کمزور انسان نہ تھے جن کے تلووں میں سنسناہٹیں اور پیشانیوں پر عرق انفعال کے سوتے تھے ———

اب ہم آسمانی حکومت کے وارث تھے ———

اب ہم قوت لایزال کے حصہ دار تھے ——— جو صدیوں سے فطرت کے دامنوں میں پھیلا پڑا ہے

اب ہماری روحیں بہت ہی لطیف اور بلند ہو گئی تھیں ———

صدیوں کی کثافتیں، گرد و غبار دھل چکا تھا !

اور وہاں سے ہمیں ایک صاف سیدھا راستہ نظر آ گیا جو ہمیں پھر ہماری "منزل مقصود" تک پہنچا سکتا تھا ——— اب میں ان حضرات کو کیا کہوں جنہیں شاعری سے اللہ واسطے کا بیر تھا !!!

——— !

——— !!

——— !!!

معزز قارئین ——— یہ دن، اس کی کارگذاریوں کا سنسنی خیز افسانہ ——— ذرا غور کیجئے ہماری اپنی زندگی سے کس درجہ ملتا جلتا اور مشابہ ہے ؟؟

ایک ہے نام "چڑھائی" ہے، اس کے سارے اندھیرے پہلو، اس کی ساری سختیاں اور دشواریاں ایک لامحدود زنجیر کی طرح ہمارے دم کے ساتھ وابستہ ہیں ——— ہماری "چڑھائی" برحق اور اس کی ساری دشواریاں "برحق" ——— لیکن ایک سہارا ہے کہ دنیا بھر کی ناامیدیوں کو پرے ہٹاتا ہے ——— دنیا بھر کی کم حوصلگیوں کو پھینک دیتا ہے ——— اور وہ ہی پہاڑ کی اس اونچی چوٹی پر ایک "محبت کامل" کا روشن چراغ ——— اس کا حصول ہی ہماری زندگی کے اندھیروں کو دُور کر سکتا ہے !!

اور جب ہم اس "معراج محبت" تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر ہم ایک بار مڑ کر دیکھتے ہیں ——— ہمارے لبوں پر مسکراہٹیں ہوتی ہیں جو ——— مشکلات کی دیو پیکر چٹانوں، مشکوک و دشوار گذار راہوں، خوف کے پھنکارتے ہوئے اژدروں دشمنی کے جنگلی وحشی جانوروں، بھول چوک کی پیچیدہ پگڈنڈیوں اور تامل بیجا کے پھسلواں راستوں پر تلخیاں بکھیرتی رہتی ہیں !!

کیونکہ "محبت کے اس بام عرش" پر آسمان کے کاغذی دستہ پر وہ سارے "مقاصد" لکھ دیئے گئے ہیں جو جانِ زندگی ہیں !!

اور اسی بلندی کی طرف انسانیت کو فطرت کا اشارہ ہے !!

وہ جو غمگین ہیں بے صبر ہیں، اور اس ضمن میں غلطیوں کا شکار ہو جاتے ہیں ——— ان کو ہمارا مشورہ ہے کہ ایک قدم رک جائیں ——— ذرا سانس پیٹ میں تو سمالے ——— !

اچھا اب غور کیجئے وہ کونسی خامی ہے جو آپ کے راستے میں ایک خوفناک کھائی بن کر حائل ہے ؟ ——— یقین مانئے "محبت بھری

زندگی "حسین صبح صادق ہے ——— باقی گھور اندھیرا !

یہ جو ہمارا راستہ ہے دھندلا گیا ہے ——— مشکلات کے ابر اور محبت کے آسمانوں تک حائل آ رہے ہیں ——— ان کا مطلب ہے کہ ہم قرار واقعی محبت نہیں کر سکتے تھے۔

——— !

——— !!

سائنسی دنیا آج کل اس حقیقت کو ماننے لگی ہے کہ ہمارے احساسات روز مرہ زندگی میں کوئی "عملی قیمت" ضرور رکھتے ہیں ——— ترغیب اور خود طلبیت ——— جس کو آج کل کے ترقی یافتہ ڈاکٹروں، پیشوایان دین، معلمین اور تاجرین آزادانہ اظہار خیال کے لئے استعمال کر رہے ہیں، بہت مقبول اور مرغوب ہوتا جا رہا ہے ——— یہ صحیح ہے کہ آج تک کوئی "مقیاس عشق" نہیں پیدا ہوا لیکن ایسے نازک نازک آلات ایجاد ہو چکے ہیں خیالات اور جذبات کی تشریح جن کے بس کی بات ہے ——— آپ مبالغہ نہ سمجھیں ——— بعضوں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے "دعاؤں" کی تصویریں لی ہیں جب وہ آسمان کی طرف صعود کر رہی تھیں۔

یہ ساری باتیں مشرق کے فلاسفہ محدودیت کے نزدیک "پرانی باتیں" ہیں ——— مشرق کے مفکرین، صوفیئن، رشیوں منیوں اور یوگیوں نے نفس کی فطرت اور "روح انسانی" کی تشریحات اس حد تک کی ہے کہ انہوں نے "انسانی جذبات کی مختلف وضع، شکل اور رنگ کی تصویریں کھینچ کے رکھ دی ہیں !

لیکن ———

شاید ایک عظیم تر انکشاف کا وقت ابھی نہیں آیا !

مثلاً ——— اس حقیقت کا انکشاف ابھی باقی ہے کہ "محبت انسانی" کا دار و مدار اعمال انسانی پر ہے !! ——— ابھی یہ کام باقی ہے کہ انسانیت کو اس مثال سے سمجھایا جائے کہ نظام شمسی کے قیام کا راز کس اصول "کشش ثقل" پر منحصر ہے : !

حقیقت یہ ہے کہ جو بڑے کارنامے انجام دیتے ہیں وہ بالکلیہ اپنے احساسات کے پیش نظر کام کرتے ہیں !! اور احساسات کی اس کامرانی کا دوسرا نام محبت یا عشق ہے !!!

تاریخ کے دیو قامت پیکرنے ہمیشہ محبت اور عشق ہی کے ہاتھوں فتحمندیوں اور کامرانیوں کی معراج حاصل کی ہے۔ !

واقعہ یہ ہے کہ آج ہماری نسل انسانی کی سب سے اہم ضرورت جذبات احساسات اور خواہشات کو سمجھنا ہے ——— یہ یا تو انسان کو "انسان کامل" بنا دے گا یا پھر نسل انسانی تباہ ہو کر ختم ہو جائے گی ——— ادھر یا اُدھر اٹل فیصلہ ہو جائے گا — جان منیق سے تو چھوٹے گی ؟؟ عقل کی دماغ میں ذخیرہ اندوزی تو ممکن ہے لیکن تقدیر تو دل کے گوشوں میں ڈھلتی ہے !!!

اس کا یقین کیجئے کہ دنیا میں اس سے بنیادی، عملی اور سائنٹفک کوئی حقیقت نہیں ——— جس کا نام محبت یا عشق ہے !

ہم سے کہا گیا ہے کہ زندگی کا پہلا اصول ہے "خود حفاظتی" ——— اور دوسرا "بقائے خودی" ——— یہ تو سچ لیکن جیسا بلشر ولیر یہ دونوں اصول متوازن رہ سکتے ہیں، اس مقدار پر منحصر ہے۔ جو آپ کے دل میں اپنے آپ اور انسانی خاندان سے محبت کی شکل میں موجود ہے !! بیمار آدمی ہمیشہ اپنے آپ سے کم محبت کرنے والا ہوتا ہے ——— ——— بیوقوف اور چڑچڑی شکایتی ماں ——— اس حقیقت کی کھلی دلیل ہے کہ اسے اپنے بچوں سے محبت نہیں ! ہمیں جس سے محبت اور لگن ہوتی ہے اس کی بقاء اور ارتقاء کے لئے ہمیں پہاڑ رائی اور سمندر قطرہ نظر آتا ہے !! اور بہت سی انسانی کمزوریوں کا علاج ان کمزوریوں کو طاقتوں میں تبدیل کرنا ہے !! اور ہر نفسیاتی ڈاکٹر اسی نتیجے پر پہنچا ہے !

موجودہ طریقہائے علاج ملاحظہ کیجئے : ——— لاشعاعی، آبی، برقی، ورزشی اور خاص پرہیزی علاج ——— ان کے فوائد محدود ——— کہ یہ فطرت کی ایجنسیوں سے متعلق ہیں ——— دوران خون، عمل ہاضمہ، عمل صفائی، اعصاب، خلیوں اور

نسیجوں کے تعلقات اور ان کے کام ——— ان طریقہائے علاج بھی پوشیدہ ہیں!

لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ایسی قوت کی ضرورت ہوتی ہے جو دوران خون پر خوشگوار اثر ڈالے ——— اور یہ لاشعاؤں کا اثر ہو کہ آبی کہ برقی کہ ورزشی وغیرہ ——— "دوران خون" ہونا ضروری ہے ——— ہمارے تجربات شاہد ہیں کہ محبت ایک عظیم قوت ہے ——— اس کے اثرات لامحدود اور اتنے زود عمل کہ مرتوں کو موت کے منہ سے نکلتے اور ڈوبی ہوئی نبضوں کو ابھرتے دیکھا!!

یقین کیجئے ——— !

محبت کام کرتی ہے، کھیلتی ہے، غذا بنتی ہے، ورزش کراتی ہے، یہ ہوا ہے، سورج ہے اور پانی ہے، یہ کتابیں ہے، اعتقادات اور تصورات ہے ——— اور ان ساری برکتوں کے لئے محبت سے محبت کیجئے ——— آپ ایک "استوار صحت" ——— سے ہمکنار رہوں گے ——— یہی آپ کی "لافانی نوجوانی" کا راز ہے!!

———

"پرجوش دل" ——— یہ ایک اصطلاح سے بہت بڑھ کر ہے!

آپ کے دل کا عمل، آپ کے پھیپھڑوں کی قوت، آپ کی قوت ہاضمہ کی رفتار، اور آپ کے تولید خون کا انحصار اس قوت پر مضمر ہے جس سے آپ "فطرت" سے پیار کرتے ہیں ——— صدق دل سے پیار کرتے ہیں!! ہزاروں از دیاد محنت سے تھکے ہوئے سرد ——— لاکھوں اعصابی کمزوریوں کی شکار عورتیں ——— آپ یقین کیجئے تفریحات Recreations سے کہیں زیادہ محبت کامل کے دوبارہ جنم کے محتاج ہیں!! ڈاکٹر آپ کو "سمندر کے سفر" کا مشورہ دیتا ہے ——— آپ جانتے ہیں کیوں؟ ——— وہ آپ کو اس شے سے دور کرنا چاہتا ہے جس سے آپ کو محبت نہیں ——— وہ آپ سے یہ ہرگز نہ کہے گا ——— نہ اس میں اتنی ہمت ہے ——— لیکن اگر آپ نے میرے مشورہ پر عمل کیا اور نفرت کو محبت میں تبدیل کیا تو یقیناً آپ کے وہ سارے اخراجات بچ جائیں گے!!

——— !

——— !!

——— !!!

اچھا اب دوسری طرف تشریف لائیے ——— یعنی بالکل ایک منفی پہلو پر!!

ذرا اپنے آپ سے پوچھئے ——— یہ آپ کیوں مختلف چیزوں، مختلف لوگوں، مختلف اعمال اور مختلف مشاغل سے پیار کرتے ہیں ——— ؟؟

جواب ہے ———

ہم ہر اس شے سے محبت کرتے ہیں جو ہمیں جلد جلد کمال کی طرف لے جاتی ہے۔ لہذا ——— جو محبت کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ ایک مرکبیانہ انداز میں اپنی اپنی محبتوں کی وفاداریوں سے چمٹ جائیں!! ——— اور اس کا امتحان [illegible] میں نہیں "عذاب" میں، ہے "وصل" میں نہیں "ہجر" میں ہوتا ہے کہ ہم اپنے پیاروں کو اپنی رگ جاں سے کس درجہ قریب کر لیتے ہیں!!

خطرات میں احساس محبت شدید تر ہو جایا کرتا ہے۔ امن کے زمانے میں بیوی اپنے میاں کو اس قدر [illegible] ——— کیونکہ جب [illegible] کی فکر نہیں ہوتی تو نقصان کا غم نہیں ہوتا ——— لیکن [illegible] کی نگرانی کی [illegible] سے [illegible] کے رشتوں کو مضبوط کرے ——— [illegible]

ایک دوسرے کو جراحتوں اور زخموں سے صدمہ نہ پہنچائیے ——— اتنا خیال زندگی کی ہر الجھن کا حل ہے !!

یقین رکھئے ——— !

ہم ہر اس شے سے محبت کرتے ہیں جو ہمیں جلد از جلد کمال کی طرف لے جاتی ہو !!

——— !

ایک رومان فطرت دوشیزہ ایک ترنم ریز شاعر، ایک رسیلے موسیقار اور ایک پرجوش ایکٹر پر بری طرح مرنے لگتی ہے ———
جب اپنی عقیدتوں کا اظہار نہیں کر سکتی تو ان کو پوجنے لگتی ہے ! ——— لیکن اگر وہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ ازدواج کے رشتے میں منسلک
ہو جاتی ہے تو پھر؟ ——— غم کے ایک ناپید اکنار دریا سے ہمکنار ہو جاتی ہے !!
کیونکہ اس کا مقصد اپنی آواز میں جادو اور اپنی شخصیت میں وہ کمال پیدا کرنا ہوتا ہے جو ان کی میراث ہے ——— یا پھر وہ شخص
جس سے وہ شادی کرتے اتنا امیر ہو کہ اس کی ہر خواہش پوری کر سکے ——— یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کسی عورت کی اس وقت تک تشفی
نہیں کر سکتے جب تک کہ آپ کامل نہ ہوں ——— اور اگر آپ کامل ہوں گے تو پھر شاید آپ خود عورت سے بے نیاز ہو جائیں !!
محبت کی ناکامیوں کی داستانیں بہت پرانی ہیں ——— اور ان کا تار کبھی نہیں ٹوٹتا ——— وجہ یہ ہے کہ
محبت کرنے والے اگر سطح میں ہیں تو وہ ہوائی قلعوں میں اڑتے رہیں گے اور حقیقت کے پہاڑ پر پہنچ جائیں گے تو پھر ان کے حواس کانچ کے ٹکڑوں
کی طرح چور چور ہو جائیں گے ۔ محبت کے ساتھ دشواریاں ناگزیر ہوتی ہیں ——— ان پر مجبور رہنا محبت کی سب سے بڑی عقلمندی ہوگی !!
محبت کی زندگی سے ہم آہنگ ہونا لازمی ہے ——— ہماری بقا کا راز ہماری محبت کی قیمت میں پنہاں ہے ہم محبت سے محبت کریں گے
تو زندگی کی عظیم تر ارتقائی منزلیں قریب سے قریب تر ہوتی جائیں گی ۔ مشہور ہے کہ پرند جوڑے سے بچھڑ کر مر جاتے ہیں، کتا اپنے مالک اور اس کے گھر
کی حفاظت کرتے وقت اپنے ہر آرام کو تج دیتا ہے ——— غور کیجیے تو یہ خاموش بے زبان جانور اپنی صداقت محبت خلوص قلب اور
والہانہ وفاداری سے ہمیں شرم سے عرق عرق کئے دیتے ہیں !!
دنیا بڑے سے بڑا ذہنی مظہر محبت سے محبت کا مجسمہ ہوتا ہے ——— اس کی ہر کامیابی کامرانی، فتح و فیروزمندی، صرف
محبت کی رہین منت ہوتی ہے !! دنیا کے بڑے سے بڑے پیغمبر نے ہر مصیبت کو گوارا کر لیا کہ اس کے دل و دماغ کا سچا ظہور پذیر ہو ———
ہر عظیم پروگرام اور عورت زیادہ ہوتا ہے ! دنیا کی ہر سچی ماں کی بقا کا راز اس میں ہے کہ بچہ کو جنم دینے کے لئے اس کی جان تک کام آئے !
ہر مرد مجاہد، شہید، فلسفی، حکیم یا کوئی بھی بڑا آدمی کیوں نہ ہو ۔ ایک مقصد لے کر اٹھتا ہے ——— اس کے راستے میں تباہیاں،
بربادیاں، تکلیفیں، مصیبتیں، خطرات اور آفات کا تانتا بندھ جاتا ہے ——— لیکن اس کے اٹھتے ہوئے قدموں میں فرق نہیں پڑتا
——— وہ ہر ٹھوکر پر ایک آبلہ توڑتے اور ہر قدم پر ایک کانٹا کچل دیتے ہیں ——— ان کے سامنے صرف ایک مقصد ہوتا
ہے ——— صداقت ——— عظیم تر صداقت کا !!
موت ! ——— انھیں کسی مقام پر ڈرا نہیں سکتی ——— محبت کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہیں !!

محبت ایک دوسرے کے احترام کا نام ہے ——— !
اس کی دنیا اتنی عجیب ہے کہ بادشاہوں کے بھرپور خزانوں کو کبھی فقیر کے سوکھے ٹکڑوں سے شرما جانا پڑتا ہے ——— !
محبت کی ادائیں نرالی ہوتی ہیں ——— ایک عورت جب محسوس کرتی ہے کہ اس کی کسی خاص ضرورت کا مرد نے احترام کر لیا تو پھر ایک طرف
سونے کی کان بھی ہو تو اس کی نظروں میں بہت ہی حقیر مقام رکھتی ہے ۔ پھول کی ایک پتی ——— جس کو محبت کے آنسوؤں نے بھگو کر محبوب کے
[illegible] دنیا کے ٹھکرا لینے پر مجبور کر دیتی ہے ۔
محبت کا [illegible] ہوتا ہے جب وہ اپنے عقلی توازن کو برقرار رکھتا ۔

اور عورت ؟ ———— جب وہ ایثار و قربانی کا مجسمہ بن جاتی ہے !!

آپ کو خبر ہے ؟

جب محبت زندگی کی چوکھٹ پر قدم انداز ہوتی ہے ———— تو !

ہر وہ رویہ جو ہم آہنگی اور یکسوئی کی راہوں میں حائل ہو دور ہو جاتا ہے ———— ہو سکتا ہے کہ وہ بہت ہی دھیرے دھیرے ہٹے لیکن آپ اپنی زندگی، عمل اور کردار میں ایک گونہ تغیر دیکھیں گے۔

جب محبت زندگی کی چوکھٹ پر قدم انداز ہوتی ہے ———— تو !

شک و تشکیک کا دور گذر جاتا ہے ———— ایقان و ایمان کا طلوع ہوتا ہے ———— گلاب کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے کھلنا، خوشبو پھیلانا، زینت چمن ہونا اور کسی کی نظر انتخاب پر چڑھ جانا ———— محبت بھی گلاب کے پھول کی طرح کھلتی ہے۔ اپنی خوشبو سے دوسروں کو مست بناتی ہے، روح انسانی کی نس نس میں یہ خوشبو رچ جاتی ہے اور زندگی کے سارے مسائل حل ہو جاتے ہیں

جب محبت زندگی کی چوکھٹ پر قدم انداز ہوتی ہے ———— تو !

دھوکہ زندگی کی سرحدوں سے فرار ہو جاتا ہے ————

دو محبت کرنے والوں کے درمیان " رازداری " سب سے بڑا جرم ہے۔ بعض عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ شوہروں سے بہت سی باتیں چھپاتی ہیں ———— لیکن اسی مقام پر ایک مرد محسوس کرتا ہے کہ عورت اس سے دغابازی پر کمر باندھ رہی ہے ———— اور اچھے اچھے گھر اجڑتے دیکھے ہیں !!

دو محبت کرنے والے ایک دوسرے کے بغیر کسی لطف سے دوچار نہیں ہو سکتے ————

زندگی کو صاف شفاف شیشے کے ٹکڑے کی طرح چمکدار ہونا چاہیئے۔

جب محبت زندگی کی چوکھٹ پر قدم انداز ہوتی ہے ———— تو !

کوتاہیاں اور بے وفائیاں پر لگا کر اڑ جاتی ہیں ———— سوسائٹی کی زینت بننے کی تمنائیں مرنے والی لڑکی کو بھی ہم نے دیکھا ہے کہ " آخری آرام گاہ " گھر کی دنیا میں نظر آتی ہے ———— شوہر اور بچوں کی محبت " اپنے ذاتی گھر " کا احساس ———— اس کی زندگی کی ہر بے سکونی کو سکون سے بدل دیتا ہے ———— محبت کے معنی یہی ہیں کہ روح کی گہرائیوں سے محبت کو چاہا جائے ———— اس شدت میں ہلکی سی کمی بڑے بڑے " المیوں " کی علمبردار ہوتی ہے ———— محبت کی اس یکرنگی میں ہم آہنگی کا راز پوشیدہ ہے محبت غلطیوں کو نظر انداز کرنے اور کوتاہیوں کو فراموش کر جانے کا نام ہے !

جب محبت زندگی کی چوکھٹ پر قدم انداز ہوتی ہے ———— تو !

غزور بھاگ کھڑا ہوتا ہے ————

محبت بھری زندگی میں سب سے بڑا مقصد محبت ہوتا ہے۔ اس مقصد کے حصول میں دوسرا ہر کارنامہ سرد پڑ جاتا ہے ———— زندگی کی سب سے بڑی کامرانی محبت بھری زندگی ہے ———— لہذا کوئی کامیابی اس سے بڑھ نہیں سکتی !

جب محبت زندگی کی چوکھٹ پر قدم انداز ہوتی ہے ———— تو !

کمزوریاں دور ہو جاتی ہیں ————

محبت ایک جذب پیہم کا نام ہے ———— اس کی سوزش میں ایک جوش ہوتا ہے اور زندگی کے سارے نظام میں حرارت دوڑتی رہتی ہے ———— رگوں میں خون دوڑتا رہتا ہے تو دل میں ہمت دماغ میں طاقت بھی رہتی ہے اور زندگی میں خطرات کا خدشہ باقی نہیں رہتا ———— ناممکنات کا وجود باقی نہیں رہتا ———— !

بات چیت

فرد ــــــ فرد کی "بات چیت" سے لاشعوری طور پر متأثر ہوتا ہے ــــــ کچھ کہئے کچھ سُنئے ــــــ کہنے سُننے سے جی کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے، ہم ذہنی طور پر ایک دوسرے کے لئے مفید ہوں گے ــــــ "بات چیت" کا یہی مقصد اور بس ــــــ دیکھئے کیا ہم آپ کے لئے مفید ہیں؟ ــــــ یہ آپ کی خاطر ہمیں منظور بہر طور'

ڈاکٹر انور سعید قریشی۔ ایل آئی ایم ایس

ستمبر کے پرچہ میں ایک سوال شیو کے متعلق شائع ہوا تھا۔ جس کے متعلق مدیر بات چیت نے کچھ عرض کیا تھا۔ ہم ڈاکٹر انور سعید قریشی کے ممنون ہیں کہ آپ نے اس موضوع پر ــــ بالتفصیل ــــ اظہار خیال کیا ہے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں (ادارہ)

"ستمبر کے شمارہ میں بات چیت کے عنوان سے منصور احمد صاحب نے ایک سوال کیا ہے کیا شیو کرنے (ڈاڑھی منڈانے) سے کوئی فائدہ ہے یا نقصان؟

اس کے متعلق "طبی نقطۂ نظر" کا اظہار کرنا چاہتا ہوں ڈاڑھی آثار بلوغت میں سے ہے۔ بغلوں اور زیر ناف کے بال بھی اسی شمار میں ہیں ان بالوں کی پیدائش کی اصل وجہ TESTES خصیتین کا ترشح HARMONES ہوتی ہے اور یہی ہارمون جنسی تحریکات اور جنسی شعور کا باعث بنتی ہے۔ بغلوں اور زیر ناف کے بالوں کی صفائی مقامی اعصاب NERVES کے ذریعہ عصبی تحریکات اور انگیخت "EXCITEMENT" کا باعث بنتی ہے کیونکہ یہ اعضائے جنسیہ سے قریب اور براہ راست متعلق ہوتے ہیں۔ لیکن برخلاف اس کے ڈاڑھی کے بال جو اسی ہارمون سے نشوونما پاتے ہیں ــــ اور پیدا ہوتے ہیں چونکہ بہ تکرار ترشح HARMONE سے دور ہوتے ہیں اس لئے زیادہ صرفہ کا باعث بنتے ہیں اور پھر جس رفتار سے آج کل شیو کیا جاتا ہے (یعنی تقریباً روزانہ یا دوسرے روز) اس قیمتی ہارمون کا صرفہ زیادہ ہو جاتا ہے۔ اور ہارمون پیدا کرنے والے اور مقامی بالوں کی گلٹیوں کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے نتیجتاً بطور ردعمل کے تحریکات کمزور اور ہارمونز کم ہو جاتی ہیں جو مردانہ کمزوری کا باعث بنتی ہے۔

یہ ایک مصدقہ امر ہے کہ جس جگہ بالوں کو منڈوانے یا ترشوانے سے پرہیز کی جائے تو بالوں کی نشوونما اور بڑھنا اس سرعت اور تیزی سے نہیں ہوتا جتنا کہ منڈوانے کی صورت میں۔ جو نتیجتاً "ہارمون" کے بے مقصد ضائع ہونے کا باعث نہیں بنتا۔

۲۔ ڈاڑھی اپنی موجودگی کی وجہ سے نفسیاتی طور پر "نرینہ اولاد کی کثرت" کا باعث بنتی ہے۔

۳۔ ڈاڑھی قدرتی طور پر مقامی غدد غدۂ درقیہ اور لوزتین TONSILES کی محافظت کا باعث بنتی ہے اور ان نازک غدد کو فوری موسمی تغیرات گرمی سردی وغیرہ سے بچاتی ہے چنانچہ منڈوانے کی صورت میں ٹھنڈی ہوا یا لو کے براہ راست اثر انداز ہونے سے نزلہ زکام عصبی تکالیف۔ چھینکوں کی کثرت اور ورم لوزتین وغیرہ قسم کی تکالیف عام طور پر ہوتی رہتی ہیں برخلاف اس کے "ڈاڑھی بردار" حضرات کو نسبتاً کم ہوتی ہیں۔

ممکن ہے کہ میری یہ معروضات بعض "ڈاڑھی سے بے نیاز حضرات" کو ناگوار گزریں لیکن واضح ہو کہ میں خود بھی اس زمرہ میں ہوں"

ساہیوال - ضلع منٹگمری

"خواہ آدمی کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو مخالف جنس سے ہمکلام ہوتے ہوئے احساس کمتری کیوں محسوس کرتا ہے ؟"

احساس کمتری ؟ یا کچھ اور ؟؟ جنس مخالف کو "جیت" لینے کا جذبہ بڑی پرانی بیماری ہے۔ مرد کوشش کرتا ہے کہ عورت پر اپنی فوقیت اور شرافت کا سکہ بٹھا دے اور ہر ایسی حرکت کا مرتکب ہو جاتا ہے جو اس کے خیال میں عورت پسند کر سکتی ہے، اس طرح مرد تمام تر "تصنع" بن جاتا ہے اور یہ "مصنوعیت" ——— "فکر بہ قدر ہمت و ظرف" ہوتی ہے

اور پھر اگر "اناڑی" ہے تو اس میں ایک خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں "میں ناکام نہ رہ جاؤں"، اور یہ سب کچھ اس انداز میں ہوتا ہے کہ بیچارا "اداکار" بھی لاعلم رہتا ہے کہ "کیا ہو رہا ہے ؟" اس سے زیادہ وضاحت نہ طلب فرمائیے ورنہ بہت سے بہنوں بھائیوں کے دل دکھ جائیں گے "اور جدید تہذیب" ہم کو آپ کو رجعت پسند کہنے لگے گی

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ !

عبد الرحمٰن بلوچستانی بکھوڑو - سندھ

۱- "محبت کیوں نفرت میں بدل جاتی ہے جبکہ انسان کی فطرت میں محبت زیادہ اور نفرت کم ہے"

ستمبر کا شمارہ پڑھیے ——— اگر صرف "اخلاقیات" کو سامنے رکھئے تو اس پر یقین رکھنا پڑے گا کہ محبت کبھی نفرت سے تبدیل نہیں ہوتی - رہی ہوس وہ ناکامی کے بعد نفرت بن جاتی یا "کیسی آنکھیں پھیر لیں مطلب نکل جانے کے بعد" اس "عامیانہ انداز بیان" پر معافی خواہ ہوں لیکن ٹھیریئے کچھ "فیلسوفوں" کا کہنا ہے کہ "محبت و نفرت" دراصل ایک ہی شے کے دو نام ہیں اور یہ بات بہت بڑی بھی ہے اور شاید ہر ظرف میں سمانے والی نہیں پھر اس کو سوچیں ہی کیوں ؟

۲- ماہرین نفسیات خواب کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ کیا یہ خیالات کا نتیجہ ہے یا کچھ اور ؟

غالب کا ایک شعر ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ہزاروں ایسی خواہشیں کہ جن پر دم نکلتا ہے۔ جب کسی داخلی یا دباؤ سے دب کر رہ جاتی اور لاشعور میں دفن ہو جاتی ہیں تو خواب میں پا ہوتی ہیں۔ نفسیئین کا تو یہی فیصلہ ہے ——— لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ ابھی اس پر تجربات کی ضرورت باقی ہے ممکن ہے کہ آئندہ کوئی ماہر نفسیات کچھ ایسے تجربات کرنے میں کامیاب ہو جائے کہ جو حقیقت سے قریب ہو، اس لئے کہ پچھلی تاریخ تمام تر غلط نہیں ہے۔ ماہرین نفسیات کے حاصل شدہ تجربات "تجربات آخر" نہیں ——— ! فی الحال اس شمارہ میں مولانا عبد القدوس ہاشمی کا مضمون "خواب" پڑھیئے۔

پاشا فردوسی۔

۱- انسان کے پاس انسان ہونے کا کیا ثبوت (ثبوت پڑھئے۔ ع) ہے ؟

۲- محبت کو عورت سے کیا تعلق ہے ؟

۳- اشک غم اور مسرت کے آنسو میں کیا فرق ہے ؟

قبلہ آپ نے پتہ نہیں لکھا ——— پورا پتہ تحریر فرمائیے!

پہلا سوال "دردناک" ہے دوسرا "دلچسپ" اور تیسرا "نازک"

۱- آپ قرآن پاک پڑھتے ہیں کبھی ؟ سورۂ بقرہ کے چار لفظ ہیں:

"وعلم آدم الاسماء کلہا"

سورۂ رحمٰن مجھے بہت پسند ہے اور اگر صبح تڑکے کوئی خوش الحان قاری تلاوت کر رہا ہو تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے کوئی کانوں میں رس گھول رہا ہے اک ذرا آپ بھی سنئے !-

الرحمٰن ۞ علم القرآن ۞ خلق الانسان ۞ علمہ البیان ۞

آپ کے پاس مترجم قرآن پاک ہے ——— اک ذرا زحمت کیجئے گا۔ ممکن ہے آپ کے سوال کا جواب انھیں آیتوں میں مل جائے۔

۲ بھائی آپ نے زحمت ہی کی ہے تو ذرا اور سہی ——— سورۂ بقرہ ہی میں ذرا آگے بڑھ کر دیکھئے،

نساءکم حرث لکم ۲/۲۲۳

اب ذرا پیچھے آجائیے

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۞ ۲/۱۸۷

بھائی فردوسی صاحب معاف فرمائیے گا آپ کو بڑی زحمت ہوئی بات یہ ہے کہ مجھے آپ کے ان سوالات (باقی صفحہ ۲۴ پر ملاحظہ)

خاص سالگرہ اردو کے لئے

کیسے بھولوں

(قمر سلطانہ، بی اے، آنرز)

مسہری کے سرہانے والی میز پر رکھی ہوئی حسن بھائی کی تصویر اُسے مُسکرا مُسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو "……. میری بہن تم افسردہ کیوں ہو۔ دیکھو میں کتنا خوش ہوں۔ تم ہنستی کیوں نہیں۔ تم ہی تو میری وہ بہن ہو جو مجھے غمگین دیکھ کر اُداس ہو جایا کرتی تھیں، اور مجھے ہنستا دیکھ کر کھل پڑتی تھیں۔ اب میں ہر وقت تمہیں اپنی ہنستی ہوئی آنکھوں سے تکتا رہتا ہوں۔ لیکن تم ——— تم میری مُسکراہٹ کے جواب میں مجھے اداس نظروں سے دیکھتی رہتی ہو —— تمہارا چہرہ نہ جانے اب کیوں اُترا اُترا رہتا ہے۔ تمہاری چنچل اور شوخ تصویر مجھے اب کچھ دُھندلی دُھندلی سی نظر آتی ہے ……. ایک دفعہ تو مسکرا دو میری بہن! ———" تصویر نے التجا کی ——— اور وہ اپنے آنسوؤں کو جو اب چھلکنے ہی کو تھے، آنکھوں ہی میں روک کر نہ جانے کیوں مسکرا دی……. اور اسے ایک دم ایسا محسوس ہوا۔ جیسے اب وہاں تصویر نہیں ہے، خود حسن بھائی سامنے کھڑے کہہ رہے ہیں۔ کیسی اچھی ہے میری بہن ———

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے جن میں محبت، درد اور حیرت ملی جُلی تھی سامنے خلا میں گھورتی رہی……. حسن بھائی اپنے محبوب یونیفارم میں اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ اسی لباس میں جس میں اُس نے انہیں آخری بار دیکھا تھا — وہ منظر وہ کبھی نہیں بھول سکتی ——— امّاں نے انہیں سینے سے اس طرح لگالیا تھا۔ اور ان کے بازوؤں کو اپنے نحیف ہاتھوں سے اس طرح جکڑ لیا تھا۔ جیسے اب وہ انہیں کبھی اپنے سے علیحدہ نہ کریں گی…… ذکیہ آپا اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ جیسے اُن کے آنسوؤں کا یہ سیلاب اب کبھی نہ رُک سکیگا۔ اور جیسے کسی غیبی طاقت نے اُنکے کان میں کہہ دیا ہو کہ وہ حسن بھائی کی شکل اب کبھی نہ دیکھ سکینگی……. طارق بھائی باوجود اپنی سنجیدگی اور لا اُبالی پن کے اپنے اضطراب کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی ہلکی ہلکی زردی اور پیشانی پر جھلکتے ہوئے پسینے کے ننھے ننھے سرد قطرے ان کی حالت کی غمّازی کر رہے تھے…. ……. ابّا جان نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔ اور نظروں ہی نظروں میں کہا —— جاؤ بیٹا خدا حافظ۔ مگر شاید وہ وقت قبولیت دعا کا نہ تھا۔ کیونکہ خدا نے ان کی حفاظت کرنے سے بہتر یہ سمجھا کہ ان کو اپنے ہی دامن میں چھپالے ——— سب سے رخصت ہو کر حسن بھائی اسکی طرف بڑھے……. وہ بالکل خاموش اور ساکت کھڑے کے ایک سرے پر دروازے کے پاس کھڑی تھی، اُسکے چہرے سے کسی کیفیت کا اظہار نہ ہو رہا تھا۔ جیسے نہ اسے کوئی رنج ہے اور نہ خوشی —— بس ایک موہوم سی حیرت ہے اسے کسی بات کا احساس نہیں تھا۔ وہ اپنے سامنے انہیں سب سے رخصت ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ لیکن اسے کسی طرح یقین ہی نہ آتا تھا کہ حسن بھائی واقعی چلے جائیں گے……. امّاں کو چھوڑ کر……. جنکی گود میں سر رکھ کر وہ اکثر لیٹا کرتے تھے۔ اور امّاں انہیں پیار بھرے لہجے میں ڈانٹتے ہوئے کہتیں "۔ حسن تم کب تک بچّہ رہو گے" اور وہ امّاں کے اور زیادہ قریب ہوتے ہوئے کہتے "۔ امّاں مجھے اس طرح بڑا سکون معلوم ہوتا ہے" — اور امّاں ان کا سر اسی طرح اپنی گود میں رکھے رہتیں۔ اب میں سوچتی ہوں کہ حسن بھائی امّاں کی گود سے علیحدہ رہ کر کس طرح سکون محسوس کرتے ہونگے؟

——— وہ ابّا جان کو بھی چھوڑ کر چلے گئے۔ جنکے آرام کا وہ اتنا خیال رکھتے تھے ابّا جان کی طبیعت اگر کبھی ناساز ہوتی تو وہ اپنا آرام تج کر ان کی تیمارداری کرتے اور انہیں تکلیف نہ ہونے دیتے۔ وہ اس قدر تندہی اور دلسوزی سے ان کی خدمت کرتے اور اُن کے چہرے سے ایسے درد کا اظہار ہوتا۔ جیسے اگر ان کا بس چلے تو ان کی ساری تکلیف وہ اپنے اوپر لے لیں۔ جاڑوں کی سرد راتوں میں جب ہم سب بہن بھائی اور امّاں گرم گرم بچھونوں میں آرام سے سو رہے تھے اور یکایک رات کو باورچی خانے سے کچھ برتنوں کے کھڑ بڑ کرنیکی آواز آتی

تو اماں کی آنکھ کھل جاتی اور وہ وہیں سے پکارتیں "کون ہے؟" اور جواب میں حسن بھائی دبی آواز میں کہتے "میں ہوں اماں۔ ابا جان کی ٹانگوں میں درد ہے میں ذرا پانی گرم کر رہا ہوں" اور اماں بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف جاتیں "درد تھا تو مجھ سے کیوں نہ کہہ دیا۔ خود ہی نہ جانے کیا سٹر پٹر کرنے لگا ——
—— اب جبکہ حسن بھائی یہاں موجود نہیں ہیں۔ اور کبھی ابا جان کی طبیعت خراب ہوتی ہے۔ تو ہم سب اُن کی تیمارداری کرنے کیلئے اُن کی مسہری کے قریب جاتے ہیں۔ تو وہ ہمیں دُور ہی سے ہاتھ کے اشارے سے روک دیتے ہیں اور ہم میں سے کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے ...
...... شاید اُنہیں حسن بھائی یاد آتے ہیں۔ اور وہ تصور ہی تصور میں حسن بھائی سے پوچھنے لگتی "—— اب کیا ہو گیا ہے۔ آپ اتنے لاپرواہ کیوں ہو گئے؟ دیکھئے تو ذرا ابا جان اس وقت آپ کی کتنی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔ کیا واقعی حسن بھائی آپ کو ان کی حالت کا بالکل احساس نہیں ہوتا؟ — حسن بھائی کی خیالی تصویر اسی طرح بے حس و حرکت اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑی رہتی جیسے یا تو انہوں نے اس کی بات ہی نہیں سنی۔ یا اگر سنی بھی ہے تو اسے سمجھے نہیں —— اور وہ کافی دیر جواب کا انتظار کر کے مایوس ہو کر ٹھنڈا سانس بھرتی۔ اور آنکھیں بند کر کے سر ایک طرف کو ڈال دیتی۔

حسن بھائی کی مانوس آواز ابھی تک اسکے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے "ساجی! دیکھو نہ تو ہمارے کوئی بیوی ہے اور نہ بچے۔ اگر ہم مر گئے تو کسی کو بھی ہماری کمی محسوس نہ ہوگی۔ ابا جان اور اماں کی تسلی کے لئے طارق بھائی ہیں۔ ذکیہ آپا کی اب شادی ہو ہی جائیگی۔ اور یوں بھی اُن کی طبیعت میں ذرا محبت کا مادہ کم ہے بس ایک تم رہ گئیں ساجی! —— تم بھی ہمیں کیا بھول جاؤ گی؟ - - - - - اور اگر ساجی تم نے ہمیں بھلا دیا تو پھر ہمیں کون یاد رکھیگا — ؟ —" اور پھر وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر بولے "— مجھ سے وعدہ کرو کہ تم مجھے کبھی نہیں بھولو گی" —— اور وہ آنکھوں میں آنسو بھر کے بولی "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں حسن بھائی۔ آپ خدانخواستہ کیوں مرنے لگے"۔ لیکن جیسے انہیں اپنی موت کا یقین تھا۔ وہ اسی طرح اصرار کرتے رہے "نہیں ساجی! تم ابھی چھوٹی ہو۔ تمہیں نہیں معلوم —— میری اچھی بہن مجھ سے ایک بار وعدہ کر لو"— اور اُس نے بڑے خلوص سے وعدہ کر لیا، لیکن اس طرح کہ اسکے ہاتھ سرد تھے۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور سارا جسم کانپ رہا تھا —— لیکن اب حسن بھائی مطمئن نظر آ رہے تھے۔ اور وہ بھی اُن کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے سب کچھ بھول گئی۔ ——

اب جبکہ حسن بھائی کی عدم موجودگی میں اسے تنہائی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اور وہ سارے گھر میں یونہی بھٹکتی سی پھرتی ہے۔ اور کھوئی کھوئی سی رہتی ہے، اماں جب اسکی یہ حالت دیکھتی ہیں۔ تو آنکھوں میں آنسو بھر کے چپ ہو جاتی ہیں، ذکیہ آپا بے چین سی ہو کر کہتی ہیں "خدا کے لیئے ساجدہ ہوش میں آؤ۔ بس اب انہیں بھول جاؤ" —— تو جیسے اسکے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ ان کا منہ نوچ لے۔ اور وہ ایک دم بلا اٹھتی "میں حسن بھائی کو بھول جاؤں؟ —— کیا کہہ رہی ہو ذکیہ آپا —— اپنے پیارے بھائی کو —— میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ میں ان کو کبھی نہیں بھولوں گی ...... مرتے دم تک نہیں .. تم کہتی ہو میں انہیں بھلا دوں ... پھر میں حسن بھائی کو کیا جواب دُونگی؟ —— " ذکیہ آپا خاموش ساڑھی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی باہر چلی جاتیں —— اور وہ حسن بھائی کی تصویر کو اپنے ہاتھوں کے حلقے میں لیکر روتی ہوئی کہتی "بتایئے حسن بھائی میں کیا کروں —— یہ لوگ مجھے آپ کو یاد بھی نہیں کرنے دیتے۔ مجھ سے سب کہتے ہیں کہ میں آپ کو بھول جاؤں ...... لیکن میں آپ کو کسی طرح نہیں بھول سکتی ...... کبھی نہیں — آپ یقین رکھیے حسن بھائی —" اور حسن بھائی کی بڑی بڑی آنکھیں اس سے کہتیں "میں جانتا ہوں ساجی تم مجھے کتنا چاہتی ہو - - - پریشان نہ ہو میری بہن گڑیا —" اور تسلی کے یہ الفاظ سُنکر واقعی اسکی پریشانی دور ہو جاتی۔ اور پھر ایک دم سے اس میں بچپن لوٹ آتا۔ وہ دوڑی دوڑی جا کر الماری میں سے اُنکی وہی پائلٹ والی ٹوپی نکال کر اپنے سر پر رکھ لیتی۔ اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوتی کبھی اپنی صورت آئینے میں دیکھتی اور کبھی حسن بھائی کی تصویر کو —— اُسکی آنکھوں میں چمک آ جاتی اور لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ —۔ اور پھر وہ شوخی سے تصویر کو مخاطب کر کے کہتی "دیکھئے میں کتنی اچھی لگ رہی ہوں - - بالکل آپ کی طرح۔ اور حسن بھائی جب میں پائلٹ بن گئی آپ کی طرح تو ——" اور اس کا جملہ ادھورا رہ جاتا۔ بچوں کی سی شوخی چہرے پر سے دُور ہو جاتی۔ آنکھوں کی چمک مدھم پڑ جاتی اور ایک نیا عزم اُسکی آنکھوں میں پیدا ہو جاتا اور وہ مضبوطی سے مٹھیاں بھینچ کر کہتی "— ہاں میں ضرور پائلٹ بنوں گی۔ مجھے اِن ہواؤں سے اِن فضاؤں سے انتقام لینا ہے۔ ان ہی وسیع اور لامحدود فضاؤں نے تو میرے بھائی کو مجھ سے جدا کیا ہے۔ میں قدرت کی ان طاقتوں سے ٹکر لونگی۔ وہ مجھ کو کچل کر رکھ دیگی؟ — میری خواہش بھی یہی ہے میں

بالکل اسی طرح مرنا چاہتی ہوں جس طرح حسن بھائی مرے تھے۔ جب جہاز کے بھڑکتے ہوئے شعلے مجھے جھلسنے کے لئے لپکتے ہوئے آگے بڑھیں گے تو مجھے ایسا ہی سکون اور ٹھنڈک محسوس ہوگی۔ جیسے حسن بھائی کے پاس بیٹھنے سے محسوس ہوا کرتی تھی۔ اور وہ اپنی اس موت کا تصور کر کے بشاشت اور اطمینان محسوس کرتی۔ جیسے یہ اسکے لئے موت نہیں زندگی ہے۔ ———— پھر اسے وہ دن یاد آنے لگا۔ جب طارق بھائی ایک تار ہاتھ میں لئے بہت ہی افسردہ گھر میں داخل ہوئے ... ان کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑا ہوا تھا جیسے کسی نے تازگی اور روح نچوڑ لی ہو۔ وہ بھابی کو ایک طرف لے گئے اور اُن سے نہ جانے کیا کہا۔ بھابی کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ امّاں اتفاق سے ادھر سے گزریں۔ انہوں نے کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے گھبرا کر پوچھا "کیا بات ہے؟ کس کا تار ہے؟؟ ..." طارق بھائی نے نہ جانے اُنہیں کس طرح بتایا کہ پشاور کے قریب جہاز کا حادثہ ہوگیا ہے اور حسن اس کا شکار ہو گئے ...... امّاں کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ دُنیا ان کی نظروں میں تاریک تھی۔ ان کا چاند غروب ہوگیا تھا۔ ابّا جان نماز کے لئے وضو کرنے جا رہے تھے، پانی کا بھرا ہوا لوٹا ان کے ہاتھ سے گر گیا۔ ان کی ٹانگیں لڑکھڑائیں اور وہ پاس بچھے ہوئے پلنگ پر دھم سے بیٹھ گئے۔ اور اُسے ———— اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے وہ اس دُنیا میں ہی نہیں ہے۔ اس کی نظروں کے سامنے نہ ابّا جان تھے، نہ امّاں۔ نہ طارق بھائی اور نہ ذکیہ آپا ———— بس ایک حسن بھائی تھے۔ جو اپنے مخصوص انداز میں اسکی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔ وہ بیتاب ہو کر انکی طرف بڑھی ..... لیکن ...... وہاں کچھ نہ تھا۔ .... بس حسن بھائی کی بے جان ساکت و صامت تصویر تھی جو اس سے کہہ رہی تھی "افسردہ کیوں ہو میری بہن ———— تم ہنستی کیوں نہیں؟ ———— ایک دفعہ مسکرا دو" ———— اور باوجود اتنے روحانی دُکھوں کے وہ کوشش کر کے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مسکرا دی ———— !

(بقیہ ص۱۶ سے)

جب محبت زندگی کی چوکھٹ پر قدم انداز ہوتی ہے ———— تو!

خود غرضی کا جنازہ نکل جاتا ہے ———— !

سپردگی کا دوسرا نام محبت ہے۔ جب دو محبت کرنے والے ایک دوسرے کو اپنی ذات سونپتے ہیں تو پھر ان کا ہر عمل خلوص و پیار کی ایک روشن تصویر ہوتا ہے ———— اور جہاں خلوص ہو وہاں برائیوں کا کیا ذکر؟

جب محبت زندگی کی چوکھٹ پر قدم انداز ہوتی ہے ———— تو!

کمال حاصل ہو جاتا ہے ————

محبت کے تجربات انسان میں بالغ نظری پیدا کرتے ہیں ———— سچی محبت کرنے والا صداقت، صفائی قلب، ہمت، جوش، عمل اولوالعزمی، استقلال، ایثار، ایمان، ایقان، راسخ الاعتقادی خلوص جیسی قوتوں کا مجموعہ ہوتا ہے ————

جس ہستی میں یہ صفات ہوں اس کی برگزیدگی اور زندگی کا کیا پوچھنا ————!

———— !

یہ ہیں وہ برکات

جب محبت زندگی کی چوکھٹ پر قدم انداز ہوتی ہے ———— تو!

حاصل ہوتے ہیں!

بچوں میں احساسِ حسن

(از ڈاکٹر ٹینیسی اے، ھارٹ)

اکثر بہت کا خیال ہے کہ جب تک بچہ سن شعور کو نہ پہنچے، زندگی کے عملی پہلو سے واقف نہ ہو جائے اور "خود حفاظتی" مسائل اس کے ذہن و دماغ کو نہ گرمائیں اس میں احساسِ حُسن پیدا ہی نہیں ہوتا یا ضروری نہیں! یا پھر وہ سوچتے ہیں کہ فطرت انسانی نے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے اور اسی وقت وہ فطری طور پر نشو و نما پاتا ہے —— اس طرح اپنے وقت کی سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہوتی ہے کہ بچہ کی تربیت میں زندگی کے ایک بہت ہی اہم پہلو یعنی ثقافت و تہذیب ہی سے غفلت برتی جاتی ہے -!

لیکن ہونا یہ چاہیئے کہ جس طرح جسمانی نشو و نما اور ذہنی تربیت پر زور دیا جاتا ہے، بچہ کے جمالیاتی ذوق کی بھی پرورش کی جائے —— اور پوری توجہ اور احساس کے ساتھ!

اصل وجہ جو میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اپنے "مقاصد" اور اپنے "ارادوں" کی ایک مشین بنانا چاہتے ہیں —— ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا بچہ بڑے سے بڑے "عہدے" پر پہنچ جائے اور ہم اس وقت یہ قطعی بھول جاتے ہیں کہ اس غریب کا رجحان اور میلان طبیعت کس طرف ہے؟ لہٰذا "نفع خور" تاجروں کی طرح ہم "خود غرضی" کا شکار ہو کر زندگی کے جمالیاتی رُخ پر بالکل پردہ ڈال دیتے ہیں —— اس لئے کہ بظاہر ہمیں جمالیاتی نقطہ نگاہ میں کوئی "کھلا فائدہ" نظر نہیں آتا! حالانکہ "حُسن طبیعت" کے پیدا کرنے میں "حسن نظر" کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے!!

یہ میں تسلیم کرتی ہوں کہ عمر اور تجربہ "ذوق صحیح" کی پرورش کرتا ہے، لیکن یہ تو موقع اور نمونہ کی بات ہے —— ورنہ بچوں میں احساس حُسن پیدا کرنے کے معینہ اصول نہیں ہیں کہ اُن کے ذہنوں میں خاص نمونوں اور ڈیزائنوں کو ذہن نشین کروایا جائے —— یقین رکھیئے ثقافتی دلچسپیاں گھٹتی نہیں ہمیشہ بڑھا کرتی ہیں —— اور زندگی کے مابعد زمانہ میں راحت، مسرت، آرام اور دلچسپیوں کا سرچشمہ بن جاتی ہیں —— بالخصوص ایسے سمے جب جسمانی ساری "بھوک" مرنے لگ جاتی ہے!

اس حقیقت کو گرہ میں باندھ رکھیئے کہ جتنے اعلےٰ قسم کے ماحول میں بچے کی پرورش ہوگی اور جیسا ماں باپ کا جمالیاتی نقطہ نظر اور جتنی حسن پرست ذہنیت ہوگی بچہ بھی لازمی طور پر اسی قسم کی صفات سے متصف ہوتا جائے گا —— ویسی ہی چیزوں کو پسند کریگا —— وہ کیا موسیقی، کیا ادب اور کیا مصوری —— یا امی کا "حسن احساس" اپنے میں سمو لے گا یا آبا کا "حسن نظر"!!

لیکن اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ماں باپ کسی ایک ہی قسم کی موسیقی ادب اور مصوری کے پرستار ہوتے ہیں —— میرا مشورہ تو یہ ہے کہ بچے کو زیادہ سے زیادہ متنوع قسم کے نمونوں، مدارس خیال" (SCHOOL OF THOUGHT) سے روشناس کرایا جائے تاکہ جب وہ ننھے سے بابا "اور ابا" سے بچو! صاحب" بنے تو اس کی زندگی بہار کے حسین پھولوں کا ایک پُر بہار بوقلموں گلدستہ بن جائے —— اس کے افق حیات پر قوس قزح جیسی دلآویز، من موہنی اور دلکش ہفت رنگ رنگینیاں رچ جائیں -!!

جس طرح انسان بڑھاپے کی راحت و آرام کے لئے پیسوں کو جوڑ جوڑ کر رکھتا ہے اسی طرح روحانی، ثقافتی، اخلاقی، جمالیاتی "اشرفیوں" کو بھی ذہن کے خزانے میں محفوظ کر لینا چاہیئے تاکہ یہ پونجی بڑھاپے کی اجیرن کر دینے والی زندگی کو خوشگواریوں، مسرتوں اور دلکشیوں کے جھولے خرید سکیں۔

یہ ایک حقیقت ہے —— کہ ہم بچہ کو کسی شے کے پسند کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے —— اور بالخصوص ایسی شے کہ جس کے متعلق ہم خود بہت سطحی طور پر جانتے ہوں، اور ہماری معلومات بالکل سطحی اور اوپری سی ہوں۔

آئیے آپ کو چند طریقے بتاؤں ——

ترقی یافتہ قوم بہت بلند صفات سے متصف ہوتی ہے —— ترقی یافتہ قوم کے بچے بہت ہی اعلےٰ درجے کی صلاحیتوں اور اوصاف کے مالک ہوتے ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو نہ وہ ترقی یافتہ قوم کے افراد ہیں نہ اُن کا ملک ترقی کر سکتا ہے نہ ترقی یافتہ کہلا سکتا ہے!!

بچّہ کو ساتھ لیکر سرِ شام سیر کے لئے نکل جائیے ——

جس وقت آپ کسی تصویر محل (PICTURE SHOP) کے آگے سے گزریں تو چنداں توقف کی زحمت گوارا فرمائیے —— بچہ کو موقع دیجئے کہ وہ تصویریں دیکھے —— پھر اس سے پوچھئے

"مُنّے اچھی کونسی ہے؟" کسی پر اُنگلی رکھے تو پوچھئے

"کیوں؟ —— یہ کیوں اچھی ہے؟؟"

اور وہ بتا دے گا ——

اس مشق سے اُس کی "قوّتِ مشاہدہ" POWER OF OBSERVATION کی ٹریننگ ہوتی ہے!

بچّہ کو سو سال پُرانی کوئی کہانی سُنائیے —— !

دوسرے دن اُسے کسی "عجائب گھر" MUSEUM میں لیجائیے —— وہاں اس کہانی سے متعلقہ ملتی جُلتی تصویریں دکھائیے ——

یہ عمل "قوّتِ تلازم" کی تقویت کا باعث ہوتا ہے۔

بچّہ کو عمدہ راگ راگنی سُنائیے —— ہو سکتا ہے آپ کے لیئے عجیب ہوا ناوالہ ہو —— لیکن اپنے مُنّے کی خاطر آپ کو گوارا کرنا پڑیگا! —— انگیز کر جائیے!!

بچّہ کو شاموں "کا حُسن" اور صبح کی "بہار" سے ضرور لُطف اندوز کروائیے —— رات کو تارے بھرے آسمان پُر ستاروں کے "کھیل" دکھائیے اور اُن کے جھم جھم چمکنے اور آنکھ مچولی کھیلنے کے "ڈرامے" سے لے کر نظامِ شمسی کے اراکین سے آگاہ کرائیے —— زہرہ، مشتری، عطارد زحل، مرّیخ وغیرہ کے مطالعہ اور پہچان کی عادت کرائیے —— پھر کہیں "رصدگاہ" قریب ہو تو بچّوں کو وہ سارے حسن اور قریب سے دکھا ڈالیئے جو تاروں کی "دُنیا" میں فطرت نے بھر رکھے ہیں!

صرف بہار ہی نہیں بچّہ کو زندگی میں خزاؤں سے بھی گزرنا ہوگا —— خزاں "ہوّا" نہ بنائیے —— درخت کے پتّے بِکھر جاتے ہیں لیکن پاس کی اس تصویر کے رنگ بھی کم غضب کے نہیں ہوتے —— ایسے مناظر بھی بچہ دیکھ لے —— ! بلکہ ضرور دیکھ لے!!

حقیقت یہ ہے کہ احساسِ حُسن اور حُسن کی قدر شناسی بالکل دو الگ الگ چیزیں ہیں —— اگرچہ ایک دوسرے سے وابستہ بھی ہیں! —— لیکن —— یہ ایک جذباتی "تجربہ" ہے اور "محسوس احساسِ مسرّت" نہیں! —— اور اکثر صورتوں میں بچّہ کی عمر اور ذہنیت کے لیئے بہت بھاری پڑ جاتا ہے اور جن میں ہوتا ہے اُن کا "ذہنی خارج قسمت" —— INTELLIGENCE QUOTIENT بہت ہی عمدہ اور بلند ہوتا ہے! —— جوہر کے اعتبار سے حُسن بہت ہی عارضی اور سریع الزوال شے ہے اور شاید اس کی ماہیت ہی ایسی ہے[1] —— اس کو پالنے کی آرزو ہر قلب میں تڑپتی ہے —— مگر اسے مٹھی میں کرنا آسان نہیں —— شاید غالب سچ کہتا ہے ؎

ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے!!

[illegible] کی تلاش آسان ہے لیکن شاید جب یہ ہاتھ آجاتا ہے تو "حُسن" باقی نہیں رہتا —— گلاب کی ٹہنی پر جو حسن گلاب میں ہوتا ہے

[1] علامہ اقبال کی نظم "حقیقتِ حسن" ایک دفعہ ضرور پڑھئے اور اس شعر پر سر دُھنیئے ؎

چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا!!

وہ ٹوٹ کر کسی کے ہاتھوں میں آجانے سے نہیں رہتا گو شاعری ضرور ہوتی ہے کہ ؎

گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

"تازہ" رہنا اور شے ہے "حسن کی زندہ تصویر" رہنا اور !!

کیونکہ اس میں نہ صرف یہ خطرہ رہتا ہے کہ وہ "شے" ہی شاید ہاتھوں سے نکل جائے، بلکہ اس کا خوف بھی لگا رہتا ہے کہ ہمارے ذوق حسن شناسی ہی پر ضرب نہ پڑ جائے! یہ حقیقت کہ کہیں ہم اس کو "کھو نہ بیٹھیں" وہ ذہنی تلازمات پیدا کرتی ہے ـــــ جو فطرت انسانی کی دو انتہا پسندیوں کے عنوان ہیں ـــــ غم ـــــ اور ـــــ مسرّت!

اور یہی وجہ ہے کہ شدید قسم کی حسن پسندی کے مسلہ پر کسی کو مسرّت بھی ہوتی ہے اور تکلیف بھی لیکن ـــ اس کش مکش مسرت و غم میں سلامت روی کی چال اختیار کرنے اور ایک بھر پور حسن پسند سے روشناس کرنے میں ایک نفسیات داں سب سے بہتر ہے! اس لئے کہ حسن پسندی میں تجربات حسن پر اگر تھوڑا سا غور و فکر بھی شامل ہو جائے تو پھر ایک لامحدود تسکین حاصل ہوتی ہے ـــــــــ

اور آپ کی اوّلین کوشش یہی ہو کہ آپ بچوں میں اس نزاکت کا احساس ابتدا ہی سے پیدا کرتے چلے جائیں ـــــ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ الفاظ، قلم اور تختی لیکر "حسن"، "احساس حسن" اور "حسن پسندی" پر اسباق دینے بیٹھ جائیں ـــــ انہیں محسوس کرنے کی مشق کروائی جائے تاکہ ان کی زندگی کی رگ رگ میں ایک سچا اور صحیح ذوق رچ جائے!!

ال، ایم جانڈر، مشہور نفسیات داں کے یہ رس بھرے، پیارے الفاظ ذہن نشین کر لیجئے!

فطرت! خدائے کارساز کا سب سے بڑا پیغام رساں، ہمیں ہمیشہ زندگی کے مدھ بھرے سُروں میں تلقین کرتی ہے ـــ اور اپنے پیارے پیارے رنگوں میں، صداقت کے اسباق کو چاند تاروں اور حسین پھولوں کے اوراق پر لکھتی ہے!"

بچوں کو اس حقیقت سے روشناس کرائیے ـــــ کیا عجب ہماری یہ "ننھی نسل" جب "جواں" ہوگی تو اپنے حسین نقطہ ہائے نظر سے زندگی کی ایسی نفیس تشکیل کرے گی کہ دنیا گوشۂ فردوس کو شرمانے لگے!!

انسان کی سانسیں آنسوں ہی کے پل پر چل رہی ہیں!! ـــــ

(بقیہ ص ۲۸ سے)

اسلام میں زندگی کا فطری مطالعہ اور مطالبہ کس قدر "سائنٹیفک" ہے باوجودیکہ یہ اصطلاح اس وقت نہ تھی! ہے۔ اس کا اظہار قرآن پاک میں جس طرح کیا گیا ہے اسی حقیقت کا اظہار ہر شے سے بڑا عالم کرتا ہے اور بعض وقت انہی الفاظ میں ـــ اس نتیجہ کا لفظ لفظ بتلایئے ـــ فرماتا ہے پروردگار عالم!

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ

(بقیہ ص ۳۲ سے)

جینا بھی مرنے کی طرح ناگزیر ہی ہے دونوں سے دامن کش ہو کر گذرنا چاہتا ہوں لیکن دامن ہے کہ انھیں کانٹوں میں الجھا جاتا ہے "دامن بچانے [illegible] تو دل ہیں" ترک تعلق بھی بیٹھنے کی ٹھانی ہے۔ [illegible] اب "گداگری" پر مجبور ہوں!

(بقیہ ص ۱۸ سے)

کے متعلق کچھ زیادہ معلوم نہیں اس لئے آپ کو زحمت دی ہے ـــــ! خدا کرے آپ مطمئن ہو سکیں۔

۳ ـ اب میں کیا عرض کروں ایک شعر سنیئے غالباً آصف بنارسی کا ہے اور بہت دن ہوئے شائد نگار لکھنؤ میں پڑھا تھا ؎

نالہ و نغمہ برابر کا اثر رکھتے ہیں
فرق تھوڑا سا مگر دونوں کی آواز میں ہے

کچھ اور عرض کرنے کی ضرورت ہو تو فرمائیے ـ لیکن براہ کرم اپنا پورا پتہ تحریر فرمایا کیجئے ورنہ مدیر بات چیت بڑا "کالا چور" ہے!

غزلیات

عبدالعلیم صاحب شیرکوٹی کی ایک نظم اس شمارہ میں شائع ہو رہی ہے ۔علیم صاحب ایک ہونہار شاعر اور ادیب ہیں اور ان کے تنقیدی مضامین اکثر ہندوستان کے نامور رسالوں میں شائع ہوتے رہے اور پسند کئے جاتے رہے ہیں ۔کچھ عرصہ سے علیم صاحب بالکل خاموش ہیں مگر ہمیں امید ہے کہ سائیکولوجی انہیں اس خواب گراں سے بیدار کر سکے گا

ڈانٹے اور بیٹرس

دُوسری اور آخری ملاقات

(عبدالعلیم شیرکوٹی)

ڈانٹے:۔ تری نگاہ کی محشر طرازیاں افزوں
غموں کے توڑ بھی پائیگا صد ہزار ستوں

رہی نہ اب دل وحشی کو آرزوئے سکوں
ڈانٹے:۔ عجیب شے ہے میسر ہو گر جراحتِ غم

نظر کے سامنے آئی ہے آج بار دگر
ہزار لطف و حسرات ایک سوز دروں

ہزار بار تمناؤں کا بہلکے خوں
بغیر اس کے تہی۔ دامن علوم جہاں

کبھی خیال میں آیا بھی آج تک ظالم
یہ ہو نصیب تو ناچیز دولت قاروں

کہ زیر دام تڑپتا ہے کوئی صید زبوں
بقیدِ شوق نظر پر عیاں رموز حیات

بیٹرس۔ مرا نصیب کہ ہوں مرکز نگاہ تری
شعور و عقل کی معراج انتہائے جنوں

نظر میں ہیچ ہوئی آج رفعتِ گردوں
بیٹرس۔ رہین سلک رسوم و قیود بھی ہے مگر

ملے گا کیا تجھے لیکن صلہ محبت کا
ہے آج زینت آغوش جو در مکنوں

بجز [illegible] غم و رنجہائے گوناگوں
نہ آسکے گی کوئی اس سے ہٹکے ساعت آب

[illegible] عشق میں غافل
جو ٹوٹ جائے تو بہتر ہے زندگی کا فسوں

میرے پسندیدہ اشعار

پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا
جب ذکر بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی (فانی)

میں جو بولا کہا کہ "یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے" (میر)

جاں سراپا، کچھ ہے راحت کچھ خلش
دل مجسّم کچھ سکوں، کچھ اضطراب (جگر)

حسن بھی تھا اداس اداس شام بھی تھی دھواں دھواں
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

میں جیا بھی دنیا میں اور جان بھی دیدی
یہ نہ کھل سکا لیکن آپ کی خوشی کیا تھی (سیماب)

غیر فانی خوشی عطا کر دی
اے غم دوست تیری عمر دراز (آزاد انصاری)

وہیں تک ہمارے وفاؤں کی حد ہے
جہاں تک مٹا دیں مٹا دینے والے (آسی)

دوبارہ دل میں کوئی انقلاب ہو نہ سکا
تمہاری پہلی نظر کا جواب ہو نہ سکا (ناطق)

ارسال کردہ
اشرف نعمانی ۔ کراچی

کیا آپکی ترقّی آپکی ازدواجی مسرّتوں میں حائل ہے؟؟

(فرنیک فرنی ہاف)

شخصی ترقی کا سب سے خطرناک پہلو اُس کا اِزدواجی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے... خواہ یہ ترقی شوہر کی ہو کہ بیوی کی ..... یہ اسلئے بھی زیادہ مہلک ہوتا ہے کہ یہ خطرہ بہت ہی چُپکے چُپکے اثر کرتا ہے۔ یہ تاجر پر بھی وارد ہوتا ہے جسکی دلچسپیوں کی بوقلمونی کے کیا کہنے... لیکن میان پر بھی حاوی ہو جاتا ہے — یہ ایک کلرک یا ایک فنکار پر بھی مسلط ہو جاتا ہے باوجود اس لگن کے جو اسکو دن اور رات بیداریوں پر مجبور کرتی رہتی ہے.... یا پھر ہر پیشہ ور پر چھا جاتا ہے جس کا تن من دھن سے یہی دُھن ہوتی ہے کہ وہ اپنی نئی نئی انکشافات میں کامیاب و کامراں ہو جائے

قومی یا مذہبی عید اور سالگرہ اور تقاریب بنی "یادگاریت" اور تحائف کے سہارے کسی کے اوصاف اور خوبیوں کی جانچ کے لئے ایک بہت ہی عمدہ "عذر" اور کسی کی کوتاہیوں "کے ادار" کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

شائد دنیا کے عظیم ترین المیوں — (Tragidice) میں.... ایک بہت ہی عام.... یہ ہے کہ کوئی بہت ہی چھوٹے پیمانے اپنی زندگی — جی ہاں زندگی سے میرا مطلب ہے۔ کسی کی ذمہ داریوں کی حامل ہو گی.... ایسا شخص عام طور پر سخت محنت کرتا ہے اور اپنی ترقی میں ہر نشیب و فراز سے گزر جاتا ہے... یا اُسے گزرنا پڑتا ہے..... اسکی ایک بیوی ہوتی ہے اور بیوی اُسکے گھر کو چلا لیتی ہے۔ اسکی چھوٹی سی چھوٹی اور بڑی سے بڑی ضرورت کو بھی پُورا کر لیتی ہے۔ اس کے بچّوں کو ایک عمدہ تربیت اور گرہستی کا ہر وہ کام بھی کر لیتی ہے جو مرد کی زندگی کو کسی عنوان اجیرن بنا سکتا ہو۔

اسی طرح زندگی کی فضاؤں میں وہ وقت کے بازوؤں پر پرواز کئے چلے جاتے ہیں — کہ ایک "وقت" ایسا بھی آتا ہے — جب دونوں محسوس کرتے ہیں، کہ ایک خاص ہمدردی دوستی اور سمجھوتہ" کا وقت آگیا ہے بچے — اب اللہ رکھے گھر کی بیل کی طرح بڑھتے اور پھیل چکے ہیں، اور اَب وقت آگیا ہے کہ "ماں" کی مصروفیات نہ صرف بڑھ گئی ہیں بلکہ ضرورت ہے کہ اُن میں اِس دَور کے نئے رجحانات بھی جھلک اُٹھیں — اور شوہر اپنے دنیاوی تجربات اور وسیع معلومات کی روشنی میں شک کرہ جاتا ہے جب اُس پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسکے ایک "بیوی" تو ہے لیکن — اسکی ہم خیال ساتھی نہیں ہے!!

ترقی کے دوسرے معنی ہیں ایک بہت بڑا شخصی ایثار اور قربانی — اسکے سمجھنے میں سخت کوشی اور پوری پوری یکسوئی خاطر! یعنی نفسیاتی زبان میں ہوگا کامل ارتکاز فکر! فارسی زبان کا مشہور مقولہ ہے "یک رنگ ہو کر گیرو واقعہ ہے کہ انسان ایک کام میں اپنی پوری توانائیوں کو ایک جا کر کے کر سکتا ہے — چونکہ کام ایک ہی نہج پر کیا جاتا ہے۔ اسلئے عمل تفکر اور تخیل میں یکسانیت سے لئے ہوئے ایک لگن کا پیدا ہوتا ہے جو کہ پختگی پا کر بہت ہی شاندار اور ترقی یافتہ شکل اختیار کرتا ہے اگر ایک آدمی قدرے جاہ طلب ہے اور ترقی کے لئے تقریباً بوالہوس (یہاں معنویت مراد ہے لفظ پر نہ جایئے) — اور اپنی اس ترقی پسندی کی طرف ایک والہانہ اشتیاق سے کہہ سکتے کہ جھک جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ ہوگا کہ وہ اپنی ساری توانائیاں، سارے رجحانات اور ساری توجہات اس طرف پھیر دیگا — شائد بھول کر بھی اسے اتنا خیال نہ آیا کرے گا کہ اسکی کوئی بیوی بھی ہے۔ اور بچے بھی ہیں — گھر بھی ہے اور گھریلو زندگی بھی ہے — اُسے تو بس ایک دُھن ہوگی — بڑھے چلا جاؤں! بڑھے چلا جاؤں!! بڑھے چلا جاؤں!!!

ایسے عالم میں بیوی کو بہت ہی بڑی توجہ ایک خاص امر پر دینی پڑتی ہے۔ عقلمند بیوی تو ہمیشہ یہی کرتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے عزائم سے ہموار ہو جاتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ اسکے راستہ میں کوئی کانٹا ہو بھی تو وہ ہٹ جائے اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ خواہ مرد اس سے کتنا ہی انکار کر جائے وہ چاہتا، پھیر پھیر سے یہی ہے کہ بیوی اسکی ترقی کی چڑھائیوں میں مضبوط عصا بنی ہے — اپنی صد ہزار کمزوریوں کے باوجود وہ جب اپنا توازن کھونے لگے تو اسکے لئے سہارا بن جائے!! اور ایک ایسی دیوار۔ کہ تھک جائے تو پیٹھ کو ٹیک کر سہارا لیلے۔ جس میں کوئی شگاف نہ پڑے!!

عورت کی زندگی میں ایسے دو چار مقاموں کی طرح یہ مقام بہت ہی اہم ہوتا ہے کہ شوہر چاہتا ہے بیوی اسکی ترقی کو سوتیلی بہن سمجھ نہ بیٹھے — اور اظہار مسرت اس انداز میں ہو کہ شوہر کے جوش عمل میں تقویت ہزاروں پاور برقیت سمو جائے! اس کا مطلب ہوگا کہ وہ اسکی ترقی کو اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھتی ہے — بالکل اس طرح کہ [illegible]

کا شکار نہ کیا جائے ـــــ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح غم بانٹ لیا جاتا ہے تو آدھا رہ جاتا ہے۔ ترقی میں حصہ بٹانے سے دوگنی ہو جاتی ہے۔

As sorrow shared is a sorrow reduced so a success shared is a success doubled!

اور یہ لکھ لیجئے کہ اگر کسی نے اپنی بیوی کو زندگی کے سفر میں شریک سفر نہیں بنایا اور محض "زینت خانہ" بنا کر رکھا تو یقیناً وہ وقت آ جائے گا۔ جب وہ اپنی ترقی یافتہ زندگی کی نزاکتوں میں اسکو ان نزاکتوں کا حامل نہیں پائے گا۔ وہ صرف گھر کی فضاؤں میں محدود ہو جائے گی۔ دُنیا کی کوئی "ترقی" اُسے نہیں چھو سکی ـــــ اور نئی تہذیب کے ایوانوں میں وہ اتنی اجنبی ہو گی کہ اسکے دوست چیخ اُٹھیں گے کیسی دقیانوسی عورت سے شادی کی ہے اس شخص نے؟؟

لہٰذا وہ مجبور ہو جائیگا کہ اُسے گھر کی حد تک محدود کر دے!!

کامیابی اور انانیت

وہ آدمی جو چاہتا ہے کہ اپنا کام ایک خاص انداز سے ہو خواہ وہ کسی دکان کی بکری کا معاملہ ہو کہ مینیجری کا منشی گیری کا ہو کہ مصنف بننے کا عموماً ایسا شخص انانیت پسند کہلاتا ہے ـــ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اسکی اپنی خود اعتمادی اور خود اختیاری کا ہی کرشمہ ہوتا ہے کہ اُس مقام پر کھڑا مسکراتا ہے جہاں کہ دوسرے رو رو کر نہیں پہنچ پاتے ـــ! لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اگر اُس نے اپنی ترقی پسندانہ ذہنیت کو متوازن رکھا تو پھر زندگی میں اس جیسے کامیاب صرف چند ہی نکلیں گے!

ایسی ذہنیت کی انتہائی ارتقائی شکلیں ہمیں اس قسم کے آدمیوں میں ملتی ہیں جیسے فلم سٹار! اور یہ ایک بلا کی انانیت ہے جو کہ مُنہ توڑ مشکل ناکامیوں کے تھپیڑے کھا کر بھی گھاٹ کا پتھر بنا رہے اور ایک اصول "اصول حیات" معین کرے۔ دُنیا کے ہر حادثے پر مسکرائے اور ہر موج طوفان کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا جائے۔ کسی حالت میں ایک پختہ اصول حیات ـــ سب کچھ ہوتا ہے ایسی صورتوں میں یا اِدھر یا اُدھر کے اصول کا طرح یا اصول حیات کا کچھ نہیں ہو کر رہ جاتا ہے اور چونکہ تھا ہی نہیں بات متعین ہی نہیں ہے۔ ایسے اُصول حیات کو اور بھی پختہ اور مضبوط کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ـــ!

فلم سٹار کے لئے خواہ وہ عورت ہو (PROBLEM) کہ مرد ـــ انسان ہونے کا شرف بھی حاصل ہے ـــ اور چونکہ انسان ہے لہٰذا ہم جیسے معمولی آدمیوں کی طرح ان کے سینہ میں بھی دل ہے دل میں درد اور درد میں تڑپ ہوتی ہے ـــ!

محبت شادی کے الجھیڑے طور پذیر ہوتے ہیں بلکہ یوں کہیئے پیدا کئے جاتے ہیں، صرف اسلئے کہ فلم سٹار کے ٹکٹ گھروں کا ہجوم بے پناہ ہو جائے ـــ اسکے سوا کچھ بھی نہیں! شخصی ترقی کا سوال اُن کے نزدیک اس قدر اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ اگر زندگی کے دوسرے پہلو تشنہ رہ جاویں تو وہ پُرانے کوٹ کی طرح پُرانے کپڑوں کے صندوق میں ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔

لیکن سنیئے تو ـــ اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ محبت اور شادی کو اس طرح الگ کر سکیں۔ خواہ کوئی کچھ ہی کیوں نہ کہے ـــ کیسے ہی نظریئے کیوں نہ ہوں، یہ امر واقعہ ہے کہ زندگی کے لئے بالکل لباس کی شکل اختیار کر جاتے ہیں شادی انسانی زندگی کی ناگزیر بنیاد ہے۔ اور علم نفسیات اسی کی تلقین کرتا آیا ہے۔

لہٰذا اگر کوئی شادی کے مسئلے سے غفلت برتتا ہے ـــ خواہ وہ کسی ترقی ہی کے لئے کیوں نہ ہو تو وہ یقیناً اپنی زندگی کی بنیادی حقیقتوں کو ٹھکرا رہا ہے۔

اور اگر وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہا ہے تو پھر اسمیں ایک دماغی خلا پیدا ہو جائے گا ـــ اور اگر وہ اُس اُفق پر پھر آنے والی سُرخ بتی کو فضاؤں میں نہیں بھانپ رہا ہے تو یقین جانیئے وہ ایک مقام پر آ کر کھڑا ہو جائے گا۔ اور اپنی گھریلو "زندگی" پر ایک نظر ضرور ڈال لے گا . . . . یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا وہ واقعی ہر اس وعدہ کو ایک شرمندۂ تعبیر خواب بنا رہا ہے؟ ـــ محبت کے جوش میں اس نے جتنے وعدے جس قدر عہد و پیمان کئے تھے کیا انکو پُورا کر رہا ہے؟ یہ وہ وعدے ہیں جن پر اُس کے اُن دعوؤں کا انحصار ہے جو اسکے اپنے اور بالکل خاص "نصب العین" اور "اُصولِ حیات" کے حامل ہیں!!

خلیجیں!

کتنی عجیب بات ہے کہ چند دہائیاں گذریں ـــ خواہ مہینوں کی ہوں کہ برسوں کی۔ اور ایک میاں بیوی الگ الگ راہوں پر چل پڑیں ـــ ایک

عورت پہلے تو بچوں کی ہو جاتی پھر سوشل مصروفیتوں کی ــــ ایک مرد بنیادی ترقی کی دُھن میں دن بھر کی تگ و دو کے بعد لوٹے تو اُس کا کام صرف بستر پر دراز ہو جانا رہ جائے۔ ۔ ۔ اور اُنکی زندگی کے فلم کا انجام گویا یہ رہ گیا ہو کہ وہ صرف "دو پڑوسی" ہیں جو اکثر ایک دوسرے پر جھلا کر پڑتے ہیں ــــ اُن کے درمیان "ہمسائیگی" کی دیوار حائل ہے !!

لیکن ــــ یہ مرد کا قصور ہے۔! سراسر اسکی ذات مجرم ہے کیونکہ زندگی کی کشتی کا ناخدا وُہی ہوتا ہے ۔ یہ اُس کا کام ہے کہ وُہ اُمنڈ آتے ہوئے رخنہ کی سب سیڑھیاں محسوس کرے ۔ اور اس سے پہلے کہ کوئی حادثہ رونما ہونے والا ہو اسکی قرار واقعی روک تھام کرلے ۔ اور اگر رخنہ کو رخنہ بننے کا موقعہ دیا گیا۔ تو یاد رکھیئے۔ کہ بہت عرصہ نہ لگے گا کہ کوئی دوسرا مرد یا دوسری عورت الکھاڑے میں کود ہی پڑے گی ــــ اور پھر جو کچھ ہو گا ــــ وہ نہ کان سُن سکیں گے ۔ نہ آنکھیں دیکھ سکینگی ۔ــ نہ دل تاب لا سکے گا ۔ ــــ

اکثر مردوں کو شکایت رہتی ہے کہ ان کی بیویاں ان کے لئے "دلی سکون" کا باعث نہیں ہوتیں ، گھر ہی میں تو لہ گھڑی میں ماشہ معلوم ہوتا ہے یہ وہ سیماب ہے کہ نہ آنکھ کے سامنے ٹھیرے نہ ہاتھ لگائے بنے ۔ یعنی بقول غالب ؎

ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے !!

لیکن نادان ہیں جو اس "سیمابیت" کا لطف نہیں لیتے ! اس "برق پائی" میں جو لطافتیں ہیں ؎ اللہ یہ نصیب ۔ ۔ ۔ اللہ اکبر ۔ ۔ ۔

یہی وہ چند لمحے ہوتے ہیں جو زندگی میں "گھنٹوں" بلکہ "دنوں" پر کاری ہوتے ہیں!

اصل میں جس مرد نے اس حقیقت کا احساس کرلیا ہے کہ عورت ایسی شئے نہیں ہے کہ بالکلیہ سمجھ میں آ جائے ۔ ــ ایسا ہی آدمی جانتا ہے کہ کس وقت اپنی بیوی کے ساتھ سنجیدہ رہے ۔ کس وقت ہنسائے کس وقت "ہمیں" بات پیدا کرے کہ وہ کندھوں پر سر رکھ کر گوہر ہائے اشک کی تابانیوں سے دل جگر میں ٹھنڈک ڈال دے اور کسی وقت سختی برت جائے ۔ کب اسکو فلم دکھلائے کب اس کو تحفے تحائف دے ــــ

یہ ساری حقائق نہ اُس مرد کو بخوبی معلوم ہونی چاہئیں ۔ جس کو اپنی زندگی کی نزاکتوں اُنکی اہمیتوں اور ذمہ داریوں کا احساس ہو ، صرف احساس ہی نہیں سنجیدگی سے احساس ہو ۔ جو اپنی ذاتی ترقی کو محسوس بھی کرے ۔ اور اسکے ساتھ ساتھ زندگی کے طوفان میں ہر موج کے تھپیڑے سے جو منہ توڑ ہمت سے ختم کرے

زالہ !

ایسوں کے لئے جنھیں ازدواجی مسرتوں کا پاس ہی نہ ہو ۔ ہم چند اہم مواقع

فراہم کرتے ہیں ۔ یہ یادگار مواقع بظاہر تو معمولی ہیں لیکن ــــ انکا معمولی بات بڑی اہمیت بھی اختیار کرتا جاتا ہے ــــ اور ایسے مواقع ہیں سالگرہ ، عید بقر عید وغیرہ کے ــ عورت کی فطرت ــــ مانی ہوئی بات ہے کہ ــ

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا !!

بقول پھولوں کی مار سے مُرجھائے اور موسلوں کی چوٹ سے مُسکرائے ــــ وہ کبھی کیوں خفا ہوتی ہے ــــ اور کبھی کیوں خوش ــــ اور اکثر محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو موقع تھا خفا ہونے کا یہ ہنس ہی ہے ــــ جہاں نہیں تھا یہ آنسو کیوں نکل پڑے ــــ ؟ کبھی ہزاروں کے ہیرے اسکے نزدیک پتھر بن جاتے ہیں ، اور کبھی تیلی کا ایک ٹکڑا کوہ نور سے بڑھ جاتا ہے ۔

عورت کے لئے بس اتنا چاہیئے کہ وہ محسوس کرتی رہے کہ کوئی کچھ کرتا ہے ۔ تو اس کے لئے ۔! ــ بس ! ــــ یہ اسکے لئے ایسا احساس اسقدر دلکش اور دلپذیر ہوتا ہے کہ بپناہ بخدا ۔ پھر تو ــــ اسکی کوئی انتہا نہیں !!

بچوں میں ابھی سے وہ احساس پیدا کر دیجئے کہ وہ زندگی کی نزاکتوں کو محسوس کرنے لگیں ۔ وہ آنے والی زندگی کے لئے تیار ہونے لگیں ۔ وہ زندگی کی رنگینیوں کو واقعی اس طرح محسوس کریں کہ زندگی ایک رنگ نہ ہو جائے بلکہ "قوس قزح" کی سی رنگینیاں دیکھیں محسوس کریں ۔ تاکہ زندگی میں خشکی نہ پیدا ہو ــــ

اور جو بڑے ہیں ــــ عمر کی وادی میں کافی وہ پیمائی کی ہے اُن کا فرض ہے کہ وہ زندگی کے اس لمحے کو دوبارہ اسی شدت سے یاد کریں ۔ جب کسی "ایک بات" پر ــــ اُن کا دل زور زور سے دھڑک اٹھتا تھا ۔ نبض زور زور سے چلنے لگتی تھی اور جینے کی برقی رو سے جھٹکا کھا کر تن جایا کرتا تھا ۔!!

لہٰذا میرا روئے سخن اُنکی طرف ہے ــــ بالکل خاص طور پر انکی طرف ــــ جنکی "ترقی پسندی" کی خواہش نے اُنکو اسقدر خشک مزاج بنا دیا ہے کہ وہ زندگی کی لطافت سے بے بہرہ ہو گئے ہیں ــــ اُن کو ہمارا صرف ایک مشورہ ہے ــ

ذرا رک جاؤ ــــ

پلٹ کر دیکھو ــــ !!

کوتاہیوں کا احساس کرو ــــ !

اور ازالہ کرو اُن کا ۔ تاکہ تم اپنی زندگی کے بنجر میدان پر "سحاب نیساں" بن کر برسیں اور تمہاری زندگی کی کھیتیاں سرسبز اور شاداب ہو جائیں !! (باقی صفحہ ۲۴ پر ملاحظہ ہو)

فلموں میں جنسیت اور بربریت کا عنصر

فلموں میں موجودہ بہیمیت اور بربریت پسندی کا بڑھتا ہوا ذوق ممکن ہے چھپی ہوئی جارحانہ ذہنیتوں کے لئے
حفاظتی کھلنے بندن (SAFETY-VALVE) ثابت ہو!

چارلس ڈیکر

اَب تک سینما کے افسانوی ادب میں جنسیت اور بربریت کی روزافزوں ترقی پر اعتراضاً بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ موضوع کے انتخاب کا اطلاق عموماً عوام پر ہوتا ہے اور یہ دیکھ کر تعجب ہی ہوتا ہے کہ عوام کو فلموں میں مار دھاڑ اور بربریت کے مظاہرے بہت ہی بھلے لگتے ہیں۔ اگرچہ ایک عام خیال ہے کہ مہذب لوگ ظالمانہ جسمانی کے شدید اور بہیمانہ حملوں کو ناپسند کرتے ہیں لیکن نفسیات داں جارحانہ پن اور صحت کا چولی دامن کا ساتھ ہے!

اَب سوال یہ ہے کہ جنسیت اور بربریت کا یہ طوفان اپنے پس پشت کیا کچھ چھپائے ہوئے ہے —— اور اُس کا امتحان ہمیں کہاں لئے جاتا ہے؟ ——

اور میرا خیال ہے کہ وجوہات صاف ہیں اور اس کا مطالعہ ہمیں فطرت انسانی کے ایک بھید راستہ پر ڈال دیتا ہے۔

آئیے سب سے پہلے تفریح و تفنن طبع (ENTERTAINMENT) کو تاریخی پس منظر میں دیکھیں —— !

رُومن ایام تعطیل کی چوٹی کی تفریح - ورزش جسمانی کے مظاہرے ہوتے تھے!! —— اور کھیل گھر (AMPHI THEATRE) میں وہ بدقسمت اور بیلی قیدی عوام کے ذوقِ نظر اور شوقِ تفریح پر قربانی کا بکرا بنا دیئے جاتے تھے۔ جن کو سنگین جرم کی سزا ہو چکتی تھی!!

تاریخ کے مختلف زمانوں اور مختلف ممالک میں اس قسم کے مظاہروں کی روح جاری رہی ہے اب خواہ اُسے معاشرتی، سیاسی، سماجی، مذہبی یا معاشی کوئی لباس کیوں نہ پہنایا گیا۔ ہمیشہ عوام ظلم و جبر بہیمیت اور جانوریت مظاہروں کی رسیا رہی اور گذشتہ صدی بلکہ اس صدی میں بھی دو ایک جگہ پر ہمیشہ ظلم و وحشت کے مظاہرے نے عوام کو اپنی طرف بُری طرح کھینچا ہے!!

سماجی نظام کے ہاتھی کے دانت!

اگرچہ آج کل قتل، پھانسی، گردن مارنا۔ ایذا رسانی کے مختلف طریقے مثلاً شکنجہ میں کسنا، کیلوں پر لٹانا، کوڑوں بیتوں اور ڈنڈوں سے پیٹنا، چرکے دینا، ہاتھ پاؤں کو الٹا گھانس لپیٹ کر جلانا، جلتے تیل میں ڈال دینا، اعضا کاٹ دینا، چاقو اور بھالوں سے کچوکے دینا۔ زخم ڈالنا، شمع ناک۔ کان میں گھانس ٹھونس کر اُلٹا لٹکانا۔ اور اسکو آگ لگا دینا —— غرض جن کے ذکر سے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، ایسے مظالم اب موقوف ہیں۔ حالانکہ موجودہ تقسیم شدہ ہندوستان نے اس دعا کی پر زور نفی کر دی ہے —— اور کسی کھلے مقام پر عام طور پر ان کا مظاہرہ نہیں ہوتا۔ لیکن ایک عجیب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اگر ایسے مظاہرے اب بھی ہونے لگیں تو کیا ان میں دلچسپی پیدا ہوگی؟ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تہذیب جسکو ہم آجکل اتنا کچھ جان چکے ہیں نے کس حد تک ہیں جبلت کو نقاب پوش کیا ہے جو کہ انسان کا علم دوشہ ہے؟ —— اور مجھ سے پوچھئے تو —— بالکل تھوڑا سا کیا ہے!

رہی ہماری تاریخ ٹو اس کی کیا بساط؟ وہ تو ارتقاء کا نتیجہ کا ایک ننھا سا باب ہے —— میرا ایقان ہے کہ دُنیا گزشتہ کروڑوں برس میں اس عالم پہنچی ہے اور انسان کا موجودہ ترقی پسند مقام بہت ہی حقیر حیثیت کا مالک ہے! اور اب بھی کئی ایسی گہری اور قدیم باتیں ہم میں پوشیدہ ہیں جنکی صحیح صورت اور ماہیت سے علم سائنس باوجود اپنی ساری وسعتوں کے تہی داماں ہے —— اور یہ تہذیب کے ہاتھی دانت، جن کو ہم سب ایک قانون، ایک اصول ایک نظم۔ ایک ضبط کے ساتھ لئے چل رہے ہیں۔ اتنا لچکدار و نازک ہے کہ ذرا سی ٹھیس سے کانچ کے خوب صورت گلاس کی طرح گر کر چکنا چور ہو سکتا ہے! ——

ایک ہلکی سی لغزش ——— اور پھر جیسے بھوک، ترسی، منتقل، وحشی، بربری، اور کمینی قوتوں کو بہانہ مل گیا ——— ظلم، ستم، ناانصافی، بے ایمانی، جبر، تشدد، زبردستی، حیوانیت سارے عناصر اتنی شدت اور خوف سے ٹوٹ پڑتے ہیں کہ صرف دکھ اور درد کے سے دیکھتے ہی دیکھتے کھنڈر ہو جاتے ہیں ——— اور ہماری زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ خالی رہتا ہوگا ——— دنیا میں کسی نہ کسی جگہ یہ خونیں ڈرامہ "اپنی پوری طاقتوں سے شباب پر کھیلا جاتا ہے !———

اور آپ یقین رکھیئے "امن کا سوال اس کا تحفظ اسکی بقا بھی سیاستدانوں کے بس کا روگ نہیں۔ جارحانہ ذہنیت اور بربریت ہمیشہ موقع کی منتظر رہتی ہے خواہ امن کا زمانہ ہو کہ جنگ کا ———

جھگڑے، فساد، ہنگامے، لڑائیاں، ظلم و جور، زبردستی یہ اور اُنکی ساری قومیں خود انسان ہی میں چھپی بیٹھی رہتی ہیں !!

——— !

——— !!

تھوڑا سا غور ——— جو واقعی غور ہو ——— ہمیں ایک عجیب تصویر دکھاتا ہے۔

آپ بھی دیکھیئے ——— !

ہمارے ہر ٹھنڈے سلوک کے پہلو میں، ہماری ہر انسانی ہمدردی اور انسان دوستی اور اسکی تہ میں ایک جارحانہ روح رچی ہوئی رہتی ہے ——— ہاں ایک بات ضروری ہے کہ ہم میں سے بعض کو اُن پر بڑا کا قابو اور اختیار ہوتا ہے لیکن اس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب ہم میں سے کوئی بربریت کے بہت ہی دردناک مظاہرے کا باعث بن بیٹھتا ہے! اخبارات اس قسم کے واقعات سے پٹے ہوتے ہیں ——— اُنکی دہشت پھیلتی جاتی ہے ——— عوام کا ہراس بڑھتا جاتا ہے ——— لوگ کانپ کانپ کر ایسے واقعات پڑھتے ہیں ——— ایسے کہ بعض اوقات اخبار رکھتے ہی بنتی ہے۔ لیکن سینما میں اسی قسم کے واقعات کا علم ہونے کے باوجود بھی لوگ لپکے چلے جاتے ہیں ———

اسلئے کہ ——— اپنے تخیل کی کارگذاریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ تو لیں ——— !! نہ اسمیں ہمارا کوئی ذاتی تعلق ہے ——— نہ یہ کسی جھنڈے کے تلے دُہرائی ہوئی داستان ہوتی ہے ——— نہ ہی کوئی ایسا دشمن وہاں ہوتا ہے جس کا ڈر ہمارے لئے بلائے جان ہو ——— یہ صرف ایک حشتناک قسم کی تفریح ہوتی ہے۔ ——— اور ستم یہ کہ ہم اسکی قیمت بھی چکاتے ہیں !!

اُب ایک بڑا سوال ہماری آنکھوں کے سامنے آکر ذہن کے اسکرین پر پھیل جاتا ہے ——— یہ سب ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں ؟

اس عوامی مذاق کے محفل میں ہمیں کونسا فائدہ حاصل ہو رہا ہے ؟

فرائڈ سب سے پہلا سائینسدان ہے جس نے اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ انسان ہی نے سب سے پہلے جاندار چیزوں پر فوقیت، قابو اور استیلا حاصل کیا۔ اور قومیں اُٹھیں اور جو کمزور قوم نظر آئی اُس پر چھا گئیں۔ ساری تاریخ انسانی ظاہری جبلتوں کا نام ہے ——— اور ہم جیسے بلند پروازی ([illegible]) کا نام دیتے ہیں وہ یہ ہے۔ قوموں کے اس احساس در توجہ کا جواز زندگی کے نفیس سے نفیس پہلو پر دیتے تھے۔ اور اُن کے عنوانات ہماری دُنیا میں باطنی ستر ہیں اور "فرائض" قوانین اور فلسفہ، فنون لطیفہ اور ادب ہیں ——— یہ ہماری سماجی حکومت کی طرف ہمیں لئے چلی جا رہی ہیں ——— اور پتہ نہیں کتنی ایسی سماجی حکومتیں ہیں جو ایک دوسرے کے پہلو سے پہلو لگائے امن و امان کی آرزوؤں کو سینے سے چھپائے قدم بڑھائے چلی جا رہی ہیں ——— !! برطانیہ عظمیٰ نے اسی امن ہی کی دھن میں سے اپنے آپ کو گم کر لیا ہے ——— اور رہ گیا یورپ وہ بھی پیچھے نہیں

لیکن !

علم نفسیات کے انکشافات جداگانہ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کا دماغی ارتقا ایک تحیر آفریں انقلاب سے دوچار ہو رہا ہے ——— یہ حقیقت کو دیانہ سکیئے کہ جتنی سماجی اور معاشرتی پابندیاں بڑھینگی اتنا ہی انسان کی جارحانہ جبلت انسانی تحت شعور میں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جائے گی۔

The more orderly the society in which it lives.

The Stronger are the instinches of aggression in the Subconscious mind!

اس کے سوا وراثتی جذبہ جنگ و جہاد کا کوئی اور مظہر ہے اور نہ ہی کشمکش حیات کا کوئی اور پہلو!! ——— وہ جس قوم میں یہ تحت شعوری جبلت کافی ہوتی ہے۔ انہی میں سب سے زیادہ ارتقاء حیات کے عناصر نمایاں ہوتے ہیں! وہ مختلف عادت کے مرتکب بھی ہوتے ہیں اور اُن کے لئے انصاف کے قلم کو تادیبی کاروائی بھی کرنی پڑتی ہے۔

دوسرے طبقے میں وہ لوگ آتے ہیں جو کہ امن کے نئے خزدہ دستک رہتے ہیں ——— یہ یقیناً زندگی کے بڑے عمدہ اور نفیس پہلو دیکھتے ہیں، وہ اتنے مہذب ہوں گے ایذا رسانی کا خیال بھی انہیں نہیں چھو سکتا اور کسال امن سے انکی تو البتہ جنگ و جدل کی ایک دوسری شکل اختیار کرتی ہے اور جارحانہ جبلت ایک نیا ذہنی مختلف النوع لبادہ اوڑھ لیتی ہے اُن میں بھی جنگ و جہاد کا جذبہ انگڑائیاں لیتا ہے۔ لیکن وہ اس کا دھارا ہی بدل دیتے ہیں۔ اور ذہنی شفاخانوں ..... (Mental Hospital) اور صحت گاہوں؟ (Clinics) میں اس بربری، بہیمی، اور وحشی جذبات کے طوفانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا قرار واقعی تریاق ہمیشہ وقت کا منتظر رہتا ہے۔

اور ابھی کے منظر میں نہیں ہوتا کہ یہ بربری مظاہروں سے نہ سیر ہونے والا نوجوان نسل پر کچھ بہت ہی مضر اثرات بہم پہنچا سکے گا۔ البتہ بچوں کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کا تو ایک پورا مسئلہ ہے لہٰذا اس وقت یہ نہیں!! ——— ہاں یہ بات ضروری ہے کہ بچوں کے ناپختہ دماغوں پر ایسے تازیانے بار نہ ڈالے جاویں جو اُن کے عہد جوانی تک یقیناً ختم ہو جائینگے۔

ہم کا نقصان

اصل پوچھیے تو میں تو یہ چاہتا ہوں کہ بربری اور جنسی مظاہروں والی فلموں میں عام ہی کے "مذاق" کو حرف آخر سمجھا اور کہنا چاہیئے نوجوانوں کے جذبات کے لئے یہ ایک حفاظتی کھلنڈرا (Safety Valve) کا حکم رکھتے ہیں۔ بلکہ ان سے درس عبرت لینا چاہیئے! اور اگر اسکو عین انسانی کا ایک زبردست کارنامہ سمجھ کر اس سے سبق لیا جائے تو بہت مناسب ہو گا! ——— اور یقین رکھیے امن کے زمانے میں جنگ میں ضائع شدہ طاقتوں اور اُن اہم مسائل کو جو جنگ کے مہیب، اور مہلک اثرات کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں حل کر کے ہماری وحشی اور بہیمی قوتوں کو امن ساز مسائل پر خرچ کیا جائے تو یہ بے حد مفید اور نیک کام ہو گا۔ اس طرح ایک "تنظیم نو" اور ایک "نظام سعید" کی بنیاد پڑے گی!!

ہوتا یہ ہے کہ انسان اپنی ذہنی کوٹھریوں کے تنگ تاریک گوشوں میں بقول انگلیاں "ragged animal affinities" جانوریت نما فطرتی خصوصیات کو چھپائے سلائے رہتا ہے۔ اُن پر تہذیب، ثقافت، اور تمدن و اخلاق کے تلے پڑے رہتے ہیں لیکن تنبیہ کا یہ طوفانی ذریعے اشارہ پا اس زور و شور سے اُٹھتا ہے کہ سارے دروازے تالے سمیت اُڑے چلے جاتے ہیں تنکوں کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ اور انسان تہذیب و ثقافت کی لاش پر اسی وحشیت جبلت اور بربریت سے کھڑا قہقہہ لگاتا رہتا ہے۔ جیسا کہ اس نے آج سے کروڑوں سال پہلے قابیل کے روپ میں لگایا تھا!!

اور

اس کا بھی یقین رکھیئے کہ اس جبلت کو رفتہ رفتہ سکون پذیر کرنے اور ایک اعلیٰ روپ میں لانے کا واحد ذریعہ "علم نفسیات" ہے ——— یہ ذہنی مزاج کے بدلگام سے بدلگام گھوڑے کو سدھانے کا آخری حربہ ہے!

"پردہ سیمیں" پر جس وقت وحشت، بربریت اور جنسیت کے پُرجوش مظاہرے ہوتے رہتے ہیں ——— ایک مختصر عرصہ کے لئے ہی ذرا نفسیات کی عینک لگا کر ناظرین کی آنکھوں میں دل میں اور دماغ میں جھانک لیجئے ——— آپ حیران رہ جائینگے یہ دیکھ کر کہ جبلتیں کس بُری طرح تڑپ رہی ہیں مچل رہی ہیں آنکھوں میں اس تصویری حقیقت کے رنگ ابھرتے ہیں!!!

[illegible]

خاص اردو سائیکولوجی کے لئے

پہلی کہانی

(از معراج رسول)

یہ انسان کی فطرت ہے ـــــــ وہ آپ بیتی کہنا چاہتا ہے اور جگ بیتی سننا چاہتا ہے۔ پرانے زمانے سے یہی ہوتا آیا ہے اور شاید ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہیگا ـــــــ تو آیئے پھر آج کی صحبت میں ہم کیوں نہ اپنی تخلیق کی سرگذشت کہہ ڈالیں، یہی تو دُنیا کی پہلی کہانی ہے سچی کہانی۔ مذہب کی وہ کون مقدس کتاب ہے جس میں یہ مقدس کہانی مرقوم نہیں۔

ہاں تو یہ بہت پُرانے زمانے کی بات ہے ـــــــ اس زمانے کی بات جبکہ خداوند خدا ساری کائنات کی تخلیق کر چکا تھا چاند، سُورج اور دوسرے ستارے عالم وجود میں آ چکے تھے اور ہمارا کرۂ ارض بھی کائنات میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ فرشتے۔ ہاں نور کی یہ مخلوق بھی پیدا ہو چکی تھی۔ پھر بھی کائنات میں ایک خلا سا محسوس ہو رہا تھا۔ افلاک الافلاک سے اسفل السافلین تک جس قدر مخلوق تھی وہ مشین کے پُرزوں کی طرح اپنی گردش میں محو تھی۔ ہر چیز کے واسطے ایک کام تھا اور ہر کام کے واسطے ایک چیز۔ اس طرح یہ گردش جاری تھی ـــــــ مگر ـــــــ پھر بھی کائنات میں کچھ خلا سا محسوس ہو رہا تھا۔ اور پھر یہ خلا۔ قدرت نے بھی محسوس کیا اور اُس کو پُر ہونے کا حکم دیا۔ فرشتے جمع کئے گئے۔ اور اعلان کیا گیا

"اَب روئے ارض پر میرا ایک نائب تخلیق ہونے والا ہے"

یہ کوئی معمولی اعلان نہیں تھا۔ اَب تک جو کچھ خلق ہوا تھا وہ مخلوق تھی جس کا کام "ربوبیت" نہیں صرف "عبودیت" تھا جسکو چلنا تھا اس طرح جس طرح اس کو چلایا جا رہا تھا۔ یہ مخلوق تھی۔ مجبور تھی۔ اسکے وجود میں "اختیار" کی سرشت ہی نہیں تھی۔ لیکن اب جبکہ اعلان ہوا خلیفۃ الارض کی پیدائش کا۔ تو کارگاہ عالم میں ایک استعجاب کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ جاننے والے جانتے تھے کہ "وہ" اب پیدا ہونے والا ہے جو "مخلوق" ہے لیکن مجبور نہیں جو دُنیا میں قدرت کی نائبی کرنے کے واسطے ان تمام اختیارات اور طاقتوں کے ساتھ پیدا ہونے والا ہے جو خود قدرت کو حاصل ہیں۔ پھر کائنات کیونکر ایک اشرف المخلوقات کا خیر مقدم کرتی۔ آپس میں چرچے ہوتے۔ مشورے ہوئے۔ مقربین کا ایک گروہ آگے بڑھا۔ اور عرض کی گئی کہ اے خداوند خدا کیا تو دنیا میں ایک ایسی مخلوق پیدا کرنے والا ہے؟

جو اس کائنات کو توڑنے پھوڑنے کی ذہنیت بردار ہوگی!

جو دھرتی کا سینہ چیر کر اس میں سے ان چیزوں کو باہر نکال پھینکے گی جو تو نے وہاں امانت رکھی ہیں۔ جو اپنا راستہ سیدھا اور آسان بنانے کیلئے سر بفلک پہاڑوں کو اپنے راستہ سے ہٹائے گی۔ جو سمندر کے سینہ پر اور ہوا کے دوش پر بھی چلا کریگی گویا وہ خاک کا فرش ہے۔ جو اتھیر پر حکومت کریگی مادہ کو بجلی میں منتقل کرے گی اور بجلی کو اپنا زر خرید غلام بنائے گی۔ غرضکہ وہ کرۂ ارض کی ہر چیز کو تہ و بالا کرے گی۔ اور پھر اس فتنہ و فساد کے علاوہ وہ روئے ارض پر خون کی بھی فراوانی کرے گی۔ خون۔ صرف دوسری مخلوقات کا ہی نہیں بلکہ اپنے ہمجنسوں کا بھی۔ تو نے جن درندوں کو پیدا کیا ہے وہ ان سے بدتر ایک درندہ ثابت ہوگی۔ شیر شیر کو نہیں پھاڑتا۔ سانپ سانپ کو نہیں ڈستا مگر اپنے نوع کے ہر فرد کا خون بہانے میں پس و پیش نہیں کرے گی۔ بیٹے اپنی ماں کے خون سے ہاتھ رنگیں گے۔ باپ اپنی بیٹیوں کا گلا گھونٹیں گے بھائی بھائی کو قتل کریگا۔ اور پھر [illegible] پناہ تھا۔ یہ خاکی مخلوق اتنا خون بہائیگی کہ بہتی ہوئی ندیاں بھی اپنی طغیانی بھول جائینگی۔

[illegible] نفسیات کے بہترین عالم تھے۔ وہ صاف الفاظ میں یہ نہیں کہتے تھے کہ یہ کروفت کر [illegible] [illegible] ہونے والی مخلوق کے تمام تر تخریبی پہلو پیش کر [illegible]

ان سے بے خبر ہو اور پھر انہوں نے اپنی شان میں ایک قصیدہ پڑھا۔

اور ہم تیری مخلوق ہیں۔ ابن مسکین مرتبت ہمارا کام نہیں عجز و بیت ہمارا شیوہ ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہے ہم کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہمارا کام تو صرف تیری رضا جوئی ہے۔ جو کچھ تو نے حکم دیا بے چون و چرا ہم اس پر عامل ہیں۔ ہمکو اس سے مطلب نہیں کہ برا ہوتا ہے یا بھلا ہم کو اپنے کام سے کام ہے۔ زمین کی پیٹیوں میں سونا ہو یا چاندی۔ لوہا ہو یا کوئلہ۔ جو کچھ تو نے رکھا ہے ہم اس کے محافظ ہیں۔ پہاڑوں کی بلندیوں کے اوپر جو کچھ ہو ہم کو اس سے سروکار نہیں اور زمین کی وسعتوں کے درمیان جو کچھ بھی ہو ہمیں اس سے مطلب نہیں۔ سمندر کی تہوں میں خواہ موتی ہوں یا تیل کے ذخیرے۔ ہم ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ بارش کو جب حکم ہوتا ہے وہ جل تھل بھر دیتی ہے اس کو اس سے مطلب نہیں کہ کس کی کھیتی ہری ہوتی ہے اور کون خانماں برباد۔ جب تو ہوا کو چلنے کا حکم دیتا ہے وہ چلتی ہے۔ سرد یا گرم۔ جیسی تیری مرضی۔ پھر کتنی مخلوق کو اس سے آرام ملتا ہے اور کتنی مخلوق اس سے تکلیف اٹھاتی ہے۔ اس کو سروکار نہیں۔ غرضکہ ہم راضی ہیں تیری رضا پر یہی ہمارا نعرہ ہے۔ تقدیر ہمارا مسلک ہے قناعت ہمارا ایمان ہے۔ بس ہم ہیں یا تو ہے اور آگے کچھ نہیں۔

نفسیات کے ان ماہرین کا خیال تھا کہ ان کی اس تقریر سے پتھر بھی موم ہو جائیں گے۔ اور پھر مدعئے سخن تو اس کی طرف تھا جو خالق ہے کل کائنات کا۔ کیا وہ اپنی مخلوق کی تباہی کو خود دعوت دیگا۔ کیا روئے ارض پر وہ فتنہ و فساد کرنے والے انسان کی تخلیق کا جنم ہونے دے گا مگر شاید وہ یہ بھول گئے تھے کہ ان کی اپنی تقریر پر خود ان کا قابو نہیں اور ان کی دلائل ان کے دماغ کی پیداوار نہیں۔ بلکہ کوئی دوسرا معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔

قدرت نے یہ تقریر سنی۔ لیکن اس نے نہ تو ایک ٹھنڈا سانس مارا اور نہ ہی کسی غیض و غضب کا اظہار کیا۔ آپ کسی کا مضحکہ اڑائیں یا اس پر عتاب کی بجلیاں گرائیں یہ دونوں طریقے سمجھنے اور سمجھانے کے خلاف ہیں۔ ان میں سے کوئی طریقہ اطمینان بخش نہیں۔ اطمینان اور قلب کا اطمینان تو تب ہی ہوتا ہے جب معترض کو خود اس کی غلطی کا اعتراف کروایا جائے —— ہاں تو قدرت ۔ جو نفسیات کی پہلی استاد ہے۔ اس نے بھی ان کو ایک سبق دینا چاہا۔ بات تو اس وقت یہ کہہ کر ٹال دی گئی" جو کچھ ہم جانتے ہیں ابھی تم اس سے نابلد ہو" مگر مشیت نے اپنا کام شروع کر دیا۔ آدم کی تخلیق ہو گئی۔ روئے ارض کا پہلا انسان عالم وجود میں آگیا۔ نیابت خداوندی کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا گیا۔ دنیا کی تمام چیزیں نام بنام اس کے سپرد کر دی گئیں ایک آزاد دل اور ایک آزاد دماغ اس کو عطا کر دیا گیا تاکہ وہ ان تمام "تخلیق" سے نئی چیزوں کی "تعمیر" کرے۔ کیونکہ وہ خلیفہ تھا۔ قدرت کا نائب تھا۔ بجز "اصل" اگر خالق نہیں تو کیوں نہ "معمار" ہوتا۔

اب جواب دیئے جانے کا وقت آگیا تھا چنانچہ ان معترضین کو۔ جو ہمارے وجود میں آنے ہی کے مخالف تھے۔ مقابلہ کے لئے للکار دیا گیا۔ یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ ان کو اپنی تقدیس پر گھمنڈ نہ ہو جائے — اور ایک امتحانی مقابلہ کے واسطے وقت کا تعین کر دیا گیا۔ جہاں رات دن سات آسمان گردش میں ہوں وہاں پر آنے والا وقت آہی کر رہتا ہے۔ امتحان کی گھڑی سر پر آگئی۔ ایک طرف یہ نوزائیدہ "انسان" دوسری طرف قدرت کی دوسری تمام مخلوق۔ مقابلہ شروع ہو گیا۔ قدرت خود حکم تھی۔ پہلے ان معترضین کو بڑھنے کا حکم دیا گیا۔ کائنات کی بہت سی چیزیں ان کے سامنے بکھیر دی گئیں فضا میں ایک سوال ابھرا۔ مقدسو! اگر تم اپنی مقصد اور سفاک "انسان" پر اپنی برتری ثابت کرنا چاہتے ہو تو میری بنائی ہوئی ان چیزوں کے تم صرف نام [illegible] ۔ یہ کیا ہے ؟ ۔ یہ کیا ہے ؟ ۔ بتاؤ۔ جواب دو۔ نام بتاؤ ایک ایک چیز کا!

کوئی کیا بتاتا اور کیا جواب دیتا [illegible] کوئی منزل نہیں ہوتی [illegible]

جب کبھی کا [illegible]

اور اپنی شکست [illegible]

نے اس کو بتلایا [illegible]

ہوئی اور [illegible]

سلام و پیام

گدائے رسم محبت عروج ہے مت بھول
نوازشات سلام و پیام پیدا کر

پناہ خدا —— یہ نفسیاتی افسانے ؟
وہ کونسا افسانہ ہے جو نفسیاتی نہیں —— پھر نفسیاتی افسانے لکھنے کی زحمت ہی کیوں کیجئے "چاند" اور "چکور" کی دنیا نفسیات سے الگ نہیں لیکن نفسیات صرف "چاندوں" اور "چکوروں" کی دنیا نہیں —— افسانوں کی دنیا سے گذر جائیے اور دل کے ٹکڑے حقائق کی آگ پر رکھ دیجئے —— سائیکولوجی کا معیار کچھ ایسا ہی ہے -

---

"عتاب نامہ" کے قربان ! پھر خبر بھی نہ لی حضور نے !!
معذرت قبول بھی فرمائی آپ نے ؟ پسند آرہا ہے سائیکولوجی —— عتاب و عذاب کی بجلیاں گرانے والے فیض و کرم کی تنویروں سے کیوں محروم رکھیں ؟؟

شکر گذار ہوں ہمت افزائی کا —— کتابت کی غلطیاں اور سہو نظر کا بھی تو ایک مقام ہے !! پھر یوں بھی "لکھ لینا" اور بات ہے اور "ماہرانہ نظر" رکھنا بالکل دوسری شے !!!
بھائی ! نہ کسی "قول فیصل" کا قائل نہ کسی "حرف آخر" پر مطمئن —— گنا ہگار یقیناً ہوں کافر قطعاً نہیں —— نہ صرف مسلمان ہوں بلکہ اپنے مسلمان ہونے پر فخر کرتا ہوں !
ادیب ہونے کا مدعی نہیں "ترقی پسندی" خارج از بحث ہے —— اگر کسی کے "حسن نظر" نے "ادیب" بنا بھی دیا تو "مبلغ" کیسے بن سکتا ہوں —— "تبلیغ" و "تکفیر" کچھ بھی تو پسند نہیں !!

زندگی ہے شیشہ و تیشہ و سنگ گراں —— بہرحال [illegible]

ایک طویل مسلسل افسانہ

فرار

گذشتہ سے پیوستہ

بس تو آہی نہیں چکتی۔ چلو اگلے اسٹیج پر چلیں۔ کرما نے تعلیمات کے کلرک کو اسی طرف آتے ہوئے دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ اپنے بھائی جان سے نہیں ملو گی۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ کرما غصہ سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ دونوں آگے چل پڑے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تعلیمات کا اخضری آنکھوں والا کلرک بس اسٹیج پر کھڑا انہیں گھور رہا تھا۔

عرائی میں اس سے نفرت کرنے لگی ہوں۔ کرما نے اپنے ابن عم تعلیمات کے اخضری آنکھوں والے کلرک کے لئے کہا۔

"کمینے نے فرضی خطوط رکھ چھوڑے ہیں اور کہتا پھرتا ہے کہ میں نے اسے لکھے تھے۔"

تعلیمات کا کلرک واقعی اسی بری طرح بدنام کر رہا تھا اور تیسرے درجے کی مدرس کی محبت کی اطلاع کرما کے ماں باپ کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔

"تمھاری نسبت بھی امّاں کا خیال اچھا نہیں ہے۔ ذرا احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔" کرما نے اس سے کہا

"یعنی؟" اس نے پوچھا

"ماں تمہیں میرے لئے پسند نہیں کرتیں۔" کرما بولی

"کیوں؟"

لیکن کرما نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر لائی وہ کرما کو سمجھانے لگا لیکن خود اس کا دل سینے کے اندر دہلنے اور بیٹھنے لگا تھا اس نے سوچا "جانے کیا ہونے والا ہے؟" اس کی بائیں آنکھ پھڑکنے لگی تھی وہ بودا یا وہمی نہ تھا لیکن نہ جانے کیوں اس کا دل سینے کے اندر بیٹھنے لگا۔

(۷)

لڑائی میں شدت پیدا ہو گئی تھی طیاروں اور آبدوزوں کے حملوں کی خبروں نے رنگون کے ہر آدمی کو حواس باختہ بنا دیا تھا۔ جرمنی دور تھا لیکن جاپان حملہ میں ہر وقت چھری گھونپ سکتا تھا۔ سیاسی جماعتی سرگرمیاں سرد ہو گئیں اور ہر طرف شہری مدافعت کا سوال پیدا ہو گیا۔ ہر انجمن اور ہر ادارہ اپنی ہمت کے لوگوں کو خطرات سے محفوظ رکھنے کی سرگرمیوں میں منہمک تھا۔ حکومت کی طرف سے مختلف نئے مدافعتی محکموں کا قیام عمل میں آ رہا تھا۔ اسپیشل پولیس، ایر ریڈ پری کاشن، ایواکیویشن، والنیٹر ٹرانسپورٹ اور نجانے کیا کیا ——— وہ ہندوستانی مسلم انجمن کے شریک معتمد اور آل برما مسلم لیگ کے ایک رکن کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہا تھا لیکن اس نے ایک والنیٹر کی حیثیت سے والنیٹر ٹرانسپورٹ میں بھی حصہ لیا۔

رنگون مدافعتی مشق و تجربات کی رزم گاہ بن کر رہ گیا تھا اور ملازمت کے بعد کا پورا وقت انہیں بکھیڑوں میں گزر جاتا تھا۔

تخلیہ رنگون کے سلسلہ میں مختلف اداروں نے شہر سے دور جھونپڑوں اور کسی قدر سامان خورد و نوش کا بندوبست شروع کر دیا تھا کہ وقت پڑنے پر افراد کو وہاں منتقل کر لیا جائے۔

ہندوستانی مسلم انجمن میں جب شہر سے دور موبی میں رہائشی جھونپڑوں اور راشن اکٹھا کرنے کی تجویز پیش ہوئی [illegible] اور اس نے تجویز میں چند الفاظ بڑھوا کر منظور کرا لیے۔

"بشرطیکہ آپ انجمن پر اپنے برمی مسلم بھائیوں کی مداخلت بھی فرض ہو گی"

حکومت برما نے مدافعتی (حفاظتی) سلسلہ میں مختلف فٹ پاتھوں پر ایک ایک اینٹ کی پناہ گاہیں اور شہر میں مختلف جگہ پانی کے حوض ماہر انجینیروں کی نگرانی میں تعمیر کرواتے۔ لیکن اسپارکس اسٹریٹ پر سیکریٹریٹ کے قریب بنے ہوئے حوض میں پانی بھر گیا تو ایک دیوار گر پڑی اور سڑک پر چلتی ہوئی ایک غریب عورت مع اپنے بچے کے "غرقِ ساحل" ہو گئی شاید حیادار تھی کہ چلو بھر پانی میں ڈوب مری۔ حکومت نے خبر کی اشاعت روک دی لیکن لوگ ان پناہ گاہوں اور حوضوں سے خوف کھانے لگے جہاں زندگی کے نام پر موت بٹ رہی تھی۔ عوام میں ان کے متعلق عجیب عجیب افواہیں پھیل گئی تھیں اور پچھتر فیصدی آبادی کسی وقت بھی ان میں پناہ لینے کے لئے تیار نہ تھی پھر لوگوں نے ان پناہ گاہوں کو پیشاب خانے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ——

غالباً حکومت کو کوئی اعتراض نہ تھا اسی لئے پولس بھی کچھ نہ بول رہی تھی۔

برما روڈ ایک مہینے بند رہنے کے بعد پھر کھول دیا گیا تھا اور عام طور پر یہ خیال پھیل گیا تھا کہ اب جاپانی آتش فشاں پھٹ پڑے گا اور آتشیں لاوا سب کچھ خاکستر کر دے گا۔ اس وقت اس نے ایک مزاحیہ نظم لکھی جس کا ایک شعر تھا ؎

گنتی سے بڑھی جاتی ہے جاپان کی طاقت
برطانیہ عظمیٰ کو صفر دیکھ رہا ہوں

لیکن برما میں برطانیہ عظمیٰ اپنی مضبوط و مستحکم مدافعتی کارروائیوں کا ڈھنڈورہ پیٹ رہا تھا اور ہر طرح عوام کو یقین دلایا جا رہا تھا کہ وہ بہرحال بخیریت رہیں گے

موبی میں ہندوستانی مسلم انجمن کی رہائشی جھونپڑیاں بن چکی تھیں اور جب وہاں بھیجے جانے والوں کی فہرست ترتیب دی جانے لگی تو کرما اور اس کا خاندان نہ صرف شریکِ فہرست رہا بلکہ سرِ فہرست رہا۔

. . . . .

چھٹی آئی اور وہ بے تابی سے اگری کلچر گارڈن کی شاداب روشوں پر ٹہلتا رہا —— چمپئی رنگ کی دھوپ سمٹ کر سرخ ہو گئی سورج ڈوبنے لگا اور اس کی کرما نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔

"شائد بیمار ہو گئی" اس نے سوچا جی چاہا کہ اس کے گھر جا کر دیکھ آئے لیکن کرما بار ہا شدت سے منع کر چکی تھی تڑپ کر رہ گیا دل کا اضطراب ڈراونے خیالات سامنے لا رہا تھا اسے کرما کی ڈلہوزی اسٹریٹ کی گفتگو یاد آ گئی اور جی ڈوبنے سا لگا بڑی دیر تک شاداب روشوں کو کچلتا رہا اور رہ رہ کر پھول توڑ توڑ کر ان کی نرم و نازک پتیاں نوچتا رہا پھر اس کنج میں جا بیٹھا جہاں وہ دونوں ہمیشہ گھنٹوں بیٹھے نیلے آکاش کو خاموشی سے دیکھتے رہتے تھے ہر آہٹ پر گمان ہوتا تھا کہ کرما آ گئی اور ہر چاپ سن کر یقین کرنے لگتا کہ کرما خرام ناز ہے لیکن یہ دیکھ کر دل سینے میں بیٹھ جاتا کہ وہ کوئی اور ہے —— اندھیرا پھیلنے لگا اور اس کی ساری امیدیں اس اندھیرے میں گم ہو گئیں —— اسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس کی زندگی کا مستقبل اسی اندھیرے میں کھویا جا رہا ہے مایوس ہو کر وہاں سے چلا آیا —— اس رات وہ نہ کچھ کھا سکا نہ ٹھکانے سے سو سکا۔ آنکھ لگتی تو ڈراونے ڈراونے خواب دکھائی دینے لگتے اور وہ چونک پڑتا رات غریب کی زندگی کی طرح تاریک اور مظلوم کی زندگی کی طرح طویل ہو گئی تھی۔

صبح ہوئی تو معمول سے پہلے ہی ہو گا وہ پیل اسٹریٹ و مرچنٹ اسٹریٹ کے کراس پر پہنچ گیا، یہاں وہ دونوں روزانہ کھڑے ہو کر تھوڑی دیر تک باتیں کیا کرتے تھے اور پھر الگ الگ بسوں پر بیٹھ کر مدرسہ چلے جاتے اور یہ طریقِ احتیاط صرف اس لئے تھی کہ کوئی انہیں ساتھ ساتھ دیکھ کر مشکوک [illegible]

[illegible] —— [illegible] کہاں غائب تھی —— [illegible] ہوا تھا جو کلاس میں [illegible]

اس طرف آتی تو اس پر اپنی پُر امید نظریں جما دیتا اور پھر مایوس ہو کر دوسری گاڑی کا انتظار کرنے لگتا۔
اسکول کا وقت قریب آتا جا رہا تھا اس کی آنکھیں ٹرالیوں پر لگی ہوئی تھیں کہ ایک سیاہ رنگ کی چھوٹی سی کار اس کے سامنے سے گزر گئی اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی کرما اس کار میں بیٹھی ہوئی تھی ——— اسے یونہی سا ایک وہم ہو گیا تھا آپ ہی آپ اس نے اپنے اس وہم کی تردید کر دی ——— کرما کے پاس موٹر کہاں ؟ اس کے عزیزوں کے بھی کسی کے پاس موٹر نہیں ہے اُس نے سوچا
"اللہ رے نگاہ محبت ہر لڑکی کرما نظر آتی ہے ——— اور ہر رنگ چمپئی دکھائی دینے لگا ہے۔"
'یقیناً اس کی کرما بیمار ہو گئی ہے۔' اس کے دل و دماغ نے آخر کار فیصلہ کر لیا "کاش وہ دیکھنے جا سکتا" اس کا دل سینے میں تڑپ کر پکارا ——— دل میں کچھ بُرے بُرے خیالات پیدا ہوئے لیکن انہیں اس نے وہم خرد سے زیادہ وقعت نہ دی "ایسا کیسے ہو سکتا ہے ؟ اس کی کرما صرف اس کی ہے" وہ سوچتا رہا۔
دس بجنے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے تو بس پر بیٹھ کر اسکول آ گیا۔ چہرے پر رنج و غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور جی نہ چاہتا تھا کہ مدرسہ جاتے ——— جب کرما نہیں آئی تو مدرسہ میں کیا دھرا ہے لیکن ملازمت کا خوف مدرسہ تک کھینچ لایا وہ آج پورے پچیس منٹ لیٹ پہنچا تھا۔
کرما اپنے کلاس میں بلیک بورڈ پر کچھ لکھ رہی تھی اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا اس کی کرما بیمار نہیں ہے جی چاہا کہ دوڑ کر کرما سے لپٹ جائے۔ اور جب اس کے کلاس کے سامنے سے گزرا تو یوں ہی ایک لڑکے سے باتیں کرنے لگا تاکہ اپنی کرما کو اپنی موجودگی کی اطلاع دے سکے لیکن کرما اسی طرح بلیک بورڈ کی طرف منہ کیئے کھڑی رہی۔
آج بالکل پہلا موقع تھا کہ کرما اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی ——— اس نے سوچا شاید کچھ خفا ہے لیکن کیوں ؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا ——— پھر اُسے سیاہ رنگ کی چھوٹی سی کار یاد آ گئی اور اس کے ذہن نے کرما کے الفاظ دُہرائے۔
"اماں مجھے میرے لئے پسند نہیں کرتیں۔"
اسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ کہیں دُور سے کچھ غم کے بادل امنڈتے چلے آ رہے ہیں ——— اس کا دل سینے میں ہولنے اور سر چکرانے لگا پھر اپنا سر تھامے ہوئے اپنے کلاس میں چلنے لگا
اس سے کوئی کام نہ ہو رہا تھا رات کی بے خوابی سے آنکھیں سُرخ تھیں اور سر میں شدت سے درد ہو رہا تھا میز پر اپنی دونوں کہنیاں ٹکائے ہاتھوں سے سر تھامے رہا اور جب وہ ناقابل برداشت ہو گیا تو ہیڈ ماسٹر کو اطلاع دے کر رسٹ روم میں آ بیٹھا وہ اپنے جسم میں اتنی طاقت بھی نہ پا رہا تھا کہ گھر جا سکے معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے ہاتھ پاؤں کی رُوح کھینچ لی ہے۔ چائے منگوا کر پی اور ایزی چیئر پر لیٹ گیا۔
نجانے کتنی دیر لیٹا رہا کمرہ خالی تھا اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں کہ کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی آنکھیں کھولیں اس کی کرما آ رہی تھی لیکن اسے دیکھ کر پلٹ پڑی۔ اس کی رُوح درد سے چیخ پڑی۔ اُس نے جلدی سے پکارا:
"کرما!"
دوشیزہ رک گئی ——— کچھ کھوئی ہوئی سی خاموش چہرے سے پریشانی برس رہی تھی اور رنگ اُڑا اُڑا سا تھا۔
"بات کیا ہے ؟" اس نے پوچھا لیکن کرما کے منہ میں جیسے زبان ہی نہ تھی۔ مغموم سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور آنکھیں جھکا لیں وہ اپنا سر پکڑے ہوئے اُٹھ کر اس کی طرف بڑھا چمپئی رنگ کی دوشیزہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی وہ اپنی جگہ پر ٹھٹک گیا۔
"اوہ ——— سر پھٹا جا رہا ہے" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا پھر اس نے اپنا سر زور سے دبایا۔
"کیفی اب نہیں" دوشیزہ نے انتہائی آہستگی سے کہا اور واپس چلی گئی اس نے محسوس کیا کہ اسے چکر آ رہا ہے [illegible] نظر آئے اور وہ بے بسی کے عالم میں پھر ایزی چیئر پر گر پڑا انتہائی ضبط کے باوجود آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جنہیں اس نے رومال [illegible] یہ رومال کرما نے دیا تھا ——— اسے یاد آیا پھر جیسے بیہوش ہو گیا ——— اور نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا ہوا تھا کہ ایک [illegible]

" سیامانے کہا ہے اسے چائے کے ساتھ پی لیجئے " بوڑھے نے کیفی اسپرین کا پیکٹ اس کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا، اس کا جی چاہا کہ پیکٹ پھینکے منہ پر کھینچ مارے لیکن پڑیا اس کے ہاتھ سے لے کر خاموش پڑا رہا۔ دل اس شدت سے دھڑک رہا تھا جیسے وہ اختلاج قلب کا مریض ہو اور دورہ پڑ گیا ہو۔ پیکٹ کو ہاتھوں میں لئے دیکھتا رہا باریک حرفوں میں کچھ لکھا ہوا تھا:-

" میں بہت جلد مدرسہ سے الگ ہو رہی ہوں اور جب تک ہوں خدا کے لئے مجھ سے ملنے یا باتیں کرنے کی کوشش نہ کرو ——— تمھیں کچھ حاصل نہ ہوگا اور مجھے خودکشی کرنی پڑے گی — میری التجا ہے کہ ماضی کو ایک خواب سمجھو اور مجھے بھول جاؤ "

لیکن کرما کو بھول جانا ممکن بھی کیسے تھا اس نے سب کچھ بھول کر کرما کو یاد کیا تھا اور اب کرما " کہہ رہی تھی مجھے بھول جاؤ اسے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے بہت سے دہکتے ہوئے جہنموں میں وہ اکیلا جھونک دیا گیا ہے مدرسہ میں ٹھہر نہ کر سکا کیفی اسپرین کی پڑیا مسل کر ردی دان میں پھینک دی اور گھر آیا۔

ایک ہفتہ تک تیز بخار میں جھلستا رہا مدرسہ نہ جا سکا اور ایک ہفتہ کے بعد مدرسہ گیا تو اس کی کرما اسکول میں اپنا آخری دن گزار رہی تھی اس کی جگہ پر کرنے کے لئے ایک دوسرا معلم آگیا تھا اور وہ مدرسہ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہی تھی اسے یقین تھا کہ اگر کرما اسے ایک مرتبہ دیکھے گی تو اس کا عالم دیکھ کر رو دے گی لیکن اس کی کرما سارے مدرسہ والوں کو مسکرا مسکرا کر وداع اور اس کی طرف ایک نظر ڈالے بغیر رخصت ہو گئی۔

کرما اس سے چھٹ گئی ——— اور ایک دوسرے اسکول میں کام کرنے گی۔

(۸)

اخضری آنکھوں والے تعلیمات کے کلرک نے انہیں ہبوزی اسٹریٹ پر اکٹھا دیکھ لیا ——— اپنے ترکش کا دوسرا تیر پھینکا ——— دونوں رسوا ہوئے، کرما کی ماں زخمی شیرنی کی طرح تڑپی اور بیچارے غریب مدرس کے سینے سے اس کا دل نکال لیگئی

اخضری آنکھوں والا کلرک غالباً سوچ رہا تھا کہ تیسرے درجے کا مدرس اس کے راستے سے ہٹ جائے تو چمپئی رنگ کی دوشیزہ اس کی ہو جائیگی ——— لیکن کرما کی ماں اگر تیسرے درجے کے مدرس کو پسند نہیں کرتی تھی تو تھرڈ گریڈ کا کلرک بھی اس کی دامادی سے سرفراز نہیں ہو سکتا۔

بوڑھی عورت کی حریص نگاہیں چھوٹی سی سیاہ موٹر کے مالک شموجی پر پڑ رہی تھیں اور چمپئی رنگ کی دوشیزہ کی زندگی میں ایک تیسرا آدمی داخل ہوا تھا۔

——— شموجی سیٹھ پروپرائٹر فینسی گڈس اسٹور اور چھوٹی سی سیاہ موٹر کا مالک ———

شموجی سیٹھ بوتے ٹاؤنگ کی ایک دوکان کا مالک تھا دور کے چند عزیزوں کے علاوہ اس کا کوئی بھی نہ تھا اور اس بھری دنیا میں بالکل تنہا زندگی گزار رہا تھا۔

پستہ قد، گٹھیلا جسم، اونچی توند، گورا رنگ ——— ! اور جیب میں سونا ——— جس آدمی کی جیب میں سونا بھرا ہو، اس میں کوئی عیب ونقص باقی نہیں رہ جاتا شموجی سیٹھ ایک اچھے داماد کی ساری خصوصیات اپنے جیب میں بھرے ہوئے تھا ◆

(باقی آئندہ)　　　　حسن محمود عروج

جب ہم نے ۱۹۴۸ء میں

ماھنامہ نقوش لاہور

کا جشن آزادی نمبر پیش کیا تو حکومت نے چھ ماہ کے لئے نقوش کی اشاعت پر پابندی لگادی

یہ اس لئے ہوا

کہ نقوش میں چھپنے والے مضامین نظمیں، غزلیں اور افسانے کھوکھلے اور چھوٹے رومانوں اور اوٹ پٹانگ خیالات کو پیش

کرنے کی بجائے عوام کے دکھ درد کی عکاسی اور نقاشی کرتے ہیں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی مکروہ پالیسی کو سامنے لاکر تمام عوام

دشمن اور خودغرض قوتوں کا پردہ چاک کرتے ہیں اپنے کروڑوں ننگے بھوکے عوام کو بتاتے ہیں ان کی پستی کے ذمہ دار کون ہیں اور

عوام کے بنیادی مسائل کیا ہیں اور اپنے وطن کے موٹے موٹے ظالم جاگیرداروں اور بےحس سرمایہ داروں کی جنت بنائے رکھنے کے بجائے

عوام کی جنت

بنانے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ لیکن ہم برسراقتدار طبقے کے حملے سے بے خوف ہوکر ۱۹۴۹ء میں بھی

نقوش کا آزادی نمبر

پیش کررہے ہیں جو اپنی روایات کو نکھارتا ہوا ایسے ایسے علمی و ادبی شہ پارے پیش کرے گا جن کی عظمت ناقابلِ شکست ہوگی۔ اس نمبر میں آپ مصوری کے بہترین شاہکاروں کو بھی پائیں گے

زندگی ــــ ارتقاء ــــ عزم ــــ حسن

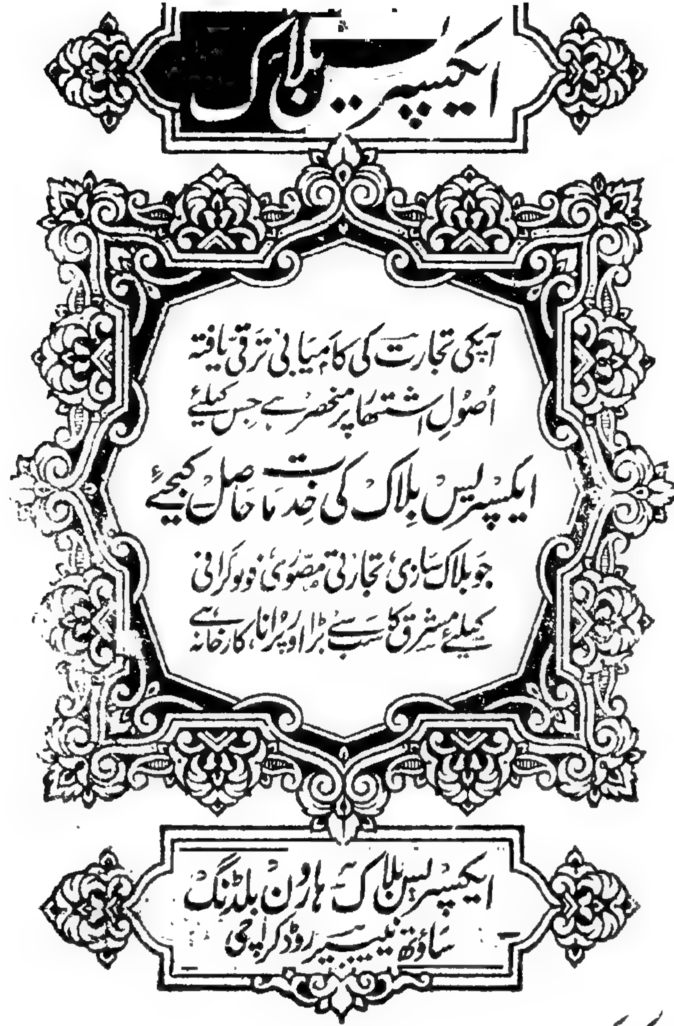
یہ ہیں نقوش کی روایات کے عناصر اربعہ

نقوش کو ملک کے مایہ ناز ادیب ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی مرتب کرتے ہیں

قیمت آزادی نمبر ڈھائی روپے ــــ سالانہ چندہ دس روپے

ادارہ فروغ اردو ـ لاہور

منشی عبدالغفار نے عثمانی پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر سائیکولوجی اردو ایم میریٹ روڈ سے شائع کیا


ایکسپریس بلاک
آپکی تجارت کی کامیابی ترقی یافتہ
اُصولِ اشتہار پر منحصر ہے جس کیلئے
ایکسپریس بلاک کی خدمات حاصل کیجئے
جو بلاک سازی تجارتی مصوری نوٹوگرافی
کیلئے مشرق کا سب سے بڑا اور پرانا کارخانہ ہے
ایکسپریس بلاک ہارون بلڈنگ
ساؤتھ نیپیئر روڈ کراچی

PSYCHOLOG
HE





۱۹۴۹ء

والے

عبدالماجد دریا بادی

زندگي





بسم اللہ الرحمن الرحیم

انگلستان کے مشہور ماہنامہ "سائیکولوجی" کے جملہ حقوق ترجمہ و اشاعت برائے
پاکستان و ہندوستان محفوظ ہیں

ماہنامہ اردو

سائیکولوجی

جلد ۱ دسمبر ۱۹۴۹ء نمبر ۱۱

ادارۂ تحریر
آنسہ شاہدہ سلطانہ ایم اے
عابدی جعفر ---- بی اے

مدیر عمومی
انعام اللہ خان بی اے بی ایل

معتمد عمومی
علاء الدین خالد

قیمت فی پرچہ
پاکستانی سکہ آٹھ آنے
ہندوستانی سکہ دس آنے

سالانہ چندہ
پاکستانی سکہ چھ روپے
ہندوستانی سکہ ساڑھے سات روپے

دفتر
"سائیکولوجی اردو" پوسٹ بکس ۵۶۶ کراچی ۲

مندرجات

پہلی نظر
پسند اپنی اپنی
زندگی زندہ دلی کا نام ہے
فن تشہیر
نیرنگیوں کا نام ہیں
آپ اور آپ کے بچے
بات چیت
بھوت
گھبرائیں کیا ؟
آپ بھی سوچئے
بازگشت ـ غزل ـ کہیں دور
چٹان اور چشمہ
پیام و سلام
میرے پسندیدہ اشعار
فرار

پہلی نظر

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو

ہم سال رواں کی بارہویں اور آخری منزل سے گذر رہے ہیں اور اب ایک ایسی موڑ پر آچکے ہیں جہاں سے "سال نو" کی بند آغوش، نظر آنے لگی ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ اس "محبوبہ" کے دامن میں ہمارے لئے کیا ہے۔ سب پھول ہی پھول ہیں۔ یا سب کانٹے ہی کانٹے۔ ہمارے ساتھ ایسے بھی ہمراہی ہیں جو بڑے غرور، بڑے ناز سے مسکرا رہے ہیں۔ وہ کتنی ہی دشوار گذار منزلوں سے سرخرو ہو کر آگے بڑھے ہیں۔ کتنی ہی آہنی دیواروں سے ٹکرا کر وہ یہاں تک پہنچے ہیں۔ ان کے دلوں میں کوئی اعلانیہ کہہ رہا ہے "کامیابی تمہاری ہے۔ کامیابی تمہاری ہے"۔ کیونکہ ہمارے یہ ساتھی اپنی فطرت کو سمجھ چکے ہیں۔ اپنی اندرونی طاقتوں کو پا چکے ہیں۔ وہ شکستہ دل نہیں ہوئے اور ہر مشکل سے بڑے اعتماد کے ساتھ سرگرم پیکار ہو گئے۔ ان کا یہ غرور ان کا یہ ناز بجا ہے۔

ہمارے ساتھ ایسے بھی ہمراہی ہیں۔ جو یہیں تک بڑی مشکل سے پہنچے ہیں۔ ان کی تمنائیں دم توڑ چکی ہیں۔ ان کی امنگیں اپنی تڑپ کھو چکی ہیں وہ حسرت سے گذرے ہوئے دنوں کی رنگینی کو یاد کر رہے ہیں۔ ان کو مستقبل میں کسی مسرت کی امید نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے یہ ساتھی اپنی "خودی" کو پہچان نہ سکے۔ اپنے اندر چھپی ہوئی طاقتوں کو کام میں نہ لا سکے۔

اور وقت ہے کہ گذرتا جا رہا ہے — ایک کے سامنے رقص کرتا ہوا، گنگناتا ہوا، قوس و قزح کی جھلکیاں دکھاتا ہوا۔ دوسرے کے سامنے آگ کے شعلوں کی طرح لپکتا ہوا۔ جلاتا ہوا۔ مٹاتا ہوا۔

مگر ٹھہریئے ——— ایک اور طاقت ہے۔ جو بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے دل کی دھڑکنیں سنا رہی ہے۔ ان دھڑکنوں میں ہمارے لئے ایک پیغام ہے۔ ہم سب کے لئے۔ جو مسکرا رہے ہیں۔ ان کے لئے بھی۔ جو رو رہے ہیں ان کے لئے بھی۔

کھٹ، کھٹ، کھٹ کھٹ ——— عمل، عمل، عمل، عمل ——— کوشش، کوشش ——— ایک بار اور

ایک بار اور۔

عمل کیجئے۔ کوشش کیجئے۔ یہ ہے سال نو کا پیغام۔ وہ "وقت" کی اہمیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ آپ زمانہ کی رفتار کو روک نہیں سکتے۔ ہر چیز متحرک ہے۔ ہر چیز ایک ایک لمحے بدل رہی ہے۔ اگر اس وقت ہماری زندگی میں کانٹے ہی کانٹے نظر آ رہے ہیں۔ تو یقین رکھیئے۔ یہ "امتحان" کا دور بھی گذر جائے گا۔ اور وہ لب جو ابتک قہقہوں سے محروم رہے ہیں وہ دوبارہ مسکرائیں گے۔ ہنسیں گے۔ اور نغمے الاپیں گے۔

"وقت" ہمارا "ہمدم" ہے۔ اس "ہمدم" کو دوست ہی بنائے رہیئے۔ "دشمن" سمجھ کر اس سے دور نہ بھاگئے۔ اگر آج وہ "برہم" ہے۔ تو کل پھر "مہربان" ہو جائے گا۔ اور آپ کے ہر زخم پر مرہم لگا دے گا۔ آپ نے دیکھا نہیں۔ خزاں آتی ہے۔ درخت درخت پتا پتی پر تباہی آجاتی ہے۔ مگر "وقت" پھر بہار کو لاتا ہے۔ فضا میں گھونگھرو سے بجنے لگتے ہیں۔ زندگی ناچنے لگتی ہے، گانے لگتی ہے۔ حسن ہر جگہ بہاراں بہاراں نظر آتا ہے۔ "زمانہ" لافانی ہے۔ اس کا دامن ازل سے ابد تک پھیلا ہوا ہے۔ اگر حالات آج ناسازگار ہیں۔ اور ہماری

جد و جہد بیکار ہوتی ہوئی معلوم ہو رہی ہے ۔ تو اپنے پہ اعتماد رکھیئے ۔ جانفشانی سے کوشش کئے جائیے ۔ اور اپنے اندر چھپی ہوئی ان قوتوں کو کام میں لائیے ۔ جو آپ کی تقدیروں کو بنا سکتی ہیں ۔ آخر ہمارے ساتھ ایسے بھی تو ہمراہی ہیں جو قوم کے لئے قابل صد فخر ہیں ۔ انسانیت کے فرزند ہیں ۔ وہ بھی بالکل آپ ہی جیسے ہیں ۔ وہ بھی بارہا ٹھوکریں کھا چکے ہیں ۔ کانٹوں سے الجھ چکے ہیں مگر ان کو بہار کیسے ملی ۔ انہوں نے سنگیت کی سرحدوں کو کیسے چھوا ۔ انہوں نے ہواؤں پر کیسے حکومت کی ۔ صرف اپنے کو پہچان کر، صرف اپنے اعتماد پر ۔ صرف اس یقین پر کہ انسان اشرف المخلوقات ہے ۔ وہ وقت کے دھاروں کو موڑ سکتا ہے ۔ ——— آپ میں بھی یہ صلاحیت ہے ۔ کہ آپ دریاؤں کے رخ موڑیں ۔ ہواؤں پر پل باندھیں ۔ اور اپنی توانائیوں سے ساری دنیا کو مسخر کریں ۔ آپ کا سائیکولوجی اسی طاقت سے آپ کو آگاہ کرنے کی سعی میں مشغول ہے ۔ آپ کے اندر جو جو قوتیں خوابیدہ پڑی ہیں ۔ ان کو بیدار کرنا اور آپ کو آپ کا صحیح مقام دکھانا اس کا مقصد اولین ہے ۔

ایک منفی، ایک مثبت

اب کے آپ ہمارے ساتھ سعیدہ اور عروج کو نہیں دیکھ رہے ہیں ——— سعیدہ عروج کالج میں لکچرار ہو کر پنجاب چلی گئی ہیں ۔ اور عروج ان کی "ہمدی" ہیں ہم ان کی مزید کامیابی اور "عروج" کے لئے دست بدعا ہیں ۔

اب کے ہمارے ساتھ شاہدہ سلطانہ اور عابدی جعفر ہیں ۔

شاہدہ کئی سال تک مختلف درسگاہوں میں پڑھا چکی ہیں ۔ اور جس کالج میں بھی گئیں سب ہی لڑکیاں ان کی شیدا ہو گئیں ——— کیوں شاید اس لئے کہ وہ دل کی گہرائیوں میں جھانک کر لڑکیوں کی "پسند" و "ناپسند" جان لیتی تھیں اور اسی اعتبار سے اپنے انداز پیدا کرتی تھیں وہ اب سائیکولوجی میں آگئی ہیں ۔ تاکہ آپ کے دماغ کی وسعتوں میں پھیل کر اور دل کی گہرائیوں میں اتر کر آپ کو آپ کی تصویر دکھا سکیں ۔

عابدی اس "خوش فہمی" کا شکار ہیں کہ وہ کچھ ایسے انوکھے انداز میں آپ کے سامنے بارہا آچکے ہیں کہ کسی مزید تعارف کی ضرورت نہیں رہ جاتی چونکہ وہ خوش فہمی کا "شکار" ہیں ۔ اس لئے تعارف ضروری سمجھا جا رہا ہے "بقول خود" ان کا نام عابدی جعفر ہے ۔ عابدی جعفری، عابد جعفری، جعفر عابدی نہیں ۔ اس نام کی چٹانیت اور کھردرے پن کو محسوس کر رہے ہیں آپ ۔ نام لیتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کی زبان کسی چٹان کی نکیلی سطح کو چاٹ رہی ہو ۔ اور چھلی جا رہی ہو ۔ یہی چٹانیت اور کھردرا پن آپ ان کی زندگی کے واقعات میں بھی پائیں گے ۔ وہ کئی ناولیں لکھ چکے ہیں ۔ کچھ شائع ہو چکے ہیں ۔ کچھ شائع ہو رہے ہیں ۔ اسی چٹانیت کی وجہ سے وہ ہمارے ساتھ آگئے ہیں ۔ تاکہ آپ کو آپ کی طاقتوں کی چٹان سے آگاہ کر سکیں ۔

سالگرہ نمبر

ہم بڑے خلوص اور بڑے اعتماد کے ساتھ فروری ۵۰ء میں اپنا سالگرہ نمبر پیش کر رہے ہیں ۔ بچہ جب ایک سال کا ہو جاتا ہے تو اس کی سالگرہ منائی جاتی ہے ۔ فروری ۵۰ء میں سائیکولوجی بھی اپنی عمر کا پہلا سال ختم کر رہا ہے ۔ اس کے قدم اب جمنے لگے ہیں وہ اب اپنی زندگی کے مقصد کو پہچاننے لگا ہے ۔ اس کی زندگی آپ کی "مسرتوں" کے لئے ہے ۔ آپ اس میں زندگی کے نئے نغمے سنیں گے ۔ اور ایک نئی آس، نئی امید دیکھیں گے ۔

یہ نمبر ہمارے مستقل خریداروں کے لئے "بے قیمت" ہے مگر "گراں قدر" اس لئے ہمارے وہ بھائی جو ابتک ہمارے مستقل خریدار نہیں بنے ہیں ۔ وہ چھ روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیج کر ۵۰ء کے تمام نکلنے والے شماروں کے ساتھ ہی ساتھ سالگرہ نمبر بھی حاصل کر لیں ۔ سالگرہ نمبر کے علاوہ جولائی ۵۰ء میں ایک اور خاص نمبر شائع ہوگا ۔ وہ بھی ان کی خدمت میں تحفۃً بھیجا جائے گا ۔

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ سالگرہ نمبر کے لئے نفسیاتی مضامین افسانے وغیرہ جلد سے جلد بھجوا دیں ۔ تاکہ

اچھے مضامین اپنی مناسب جگہ پر مرتب ہو سکیں۔

ایک نیا عنوان — "بھولوں کیسے؟"

سالگرہ نمبر ہی سے ہم ایک نیا عنوان "بھولوں کیسے؟" شروع کر رہے ہیں۔ اس کے لئے آپ اپنی زندگی کا کوئی "عجوبہ" واقعہ، حادثہ وغیرہ لکھ کر بھیجئے۔ ایسی "بات" لکھئے جس سے آپ بہت متأثر ہوئے ہوں۔ اور جو بہت کم دیکھنے میں یا سننے میں آتی ہو آپ اپنی سنائیں گے۔ دوسرے اپنی سنائیں گے۔ آپ ان کی سنیں گے وہ آپ کی سنیں گے۔ اس طرح ایک باہمی تعلق پیدا ہوگا۔

اچھا اب پھر — (ادارہ)

پسند اپنی اپنی ....

پچھلے مہینے ہم نے "عیار نظر" کے عنوان سے چند ارباب ذوق او ر اہل نظر کی رائیں
شائع کی تھیں۔ اب کچھ "اپنی پسند" کی جھلکیاں دیکھئے ع -
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

ادارہ

مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری۔ رنگون

مدیران محترم :-

بیا بیا کہ مرا با تو ماجرائے ہست　　　بگو اگر گنہے رفت وگر خطائے ہست

جولائی سے اکتوبر تک کے سارے پرچے نظر سے گذرے اور میں دیکھتا چلا گیا۔ نہ جانے کیا کیا دیکھا۔ عجیب وجدانی سی کیفیت رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ طلسم خانۂ حقائق کے پردے اٹھ گئے۔ حسینانِ معانی کے خد و خال نظر آئے

ضیائے حسن نے کی ہر طرف درخشانی　　　حقیقتیں ہوئیں بے تاب پیرہن کے لئے

عریاں حقیقتوں کا نظارہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ آنکھیں چندھیا کر بند ہو گئیں اور میں سائیکولوجی کی رنگین فضاؤں میں گم ہو گیا۔ یعنی عالم شعور اور مملکت لاشعور کے بین بین کسی برزخ ادراک و فہم کی وادی میں جا پہنچا۔ اور پھر وہی بھولی بسری باتیں دماغ میں عود کر آئیں :-

پھر کھلا باب جنت الفردوس
پھر وہی خوبرو ہے آنکھوں میں
برق وش۔ تیغ زن۔ قدر انداز
سنگ دل۔ بے وفا۔ بت کافر
جس کے ابرو پہ ماہ نو قربان
جس کی آنکھوں پہ شیفتہ تارے
جس کے رخ پر فریفتہ سورج

آنکھوں کا بند ہونا تھا کہ حقیقتیں اور برہنہ ہو کر سامنے آگئیں۔۔ دماغ کے ہر خلئے میں ہزاروں آنکھیں لگ گئیں اور ہر آنکھ میں وہی جلوہ رقص کرنے لگا۔ گریز ممکن نہ تھا اور فرار مشکل تھا۔

اب آپ پوچھتے ہیں کہ تم نے سائیکولوجی میں کیا کیا دیکھا۔ میں کیا بتاؤں۔ اور کیا جواب دوں۔

اُو می کند سوال و مرا در جواب اُو　　　از اضطراب دل نہ تواند سخن کند

اگر شاعر شیراز سے یہی سوال کیا جاتا تو شاید وہ معاً یہی کہدیتے :-

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

اور ممکن ہے کہ شاعر امرتسری بھی دم بخود ہو کر یہی جواب دیدے کہ

کیں لاکہ کاوشیں سحر و شام عمر بھر   امرتسری سے کھُل نہ سکے عقدہائے دل

مگر میرے لئے اس طرح کی کوئی بات کہنا مناسب نہ ہوگی۔ میرا طریقِ تخاطب اور ہے۔ طرزِ بیان اور ہے۔ اور عرفان حال بھی جو سچ پوچھئے تو شاعرِ شیراز سے کسی قدر جداگانہ ہے۔ وہ بادشاہ خیال و کلام ہیں اور میں گدائے عرفان ادب۔ میرا ان کا کیا جوڑ۔ مسلک دونوں کے ایک ہو سکتے ہیں۔ مگر منصب و مقام ایک نہیں۔ جدا جدا ہیں۔ وہ جزو میں کل کو دیکھتے ہیں اور میں کل میں جزو کو ڈھونڈھتا ہوں۔

او از ایقان می گوید و من ایقان می خواہم

ہاں تو سوال یہ تھا کہ سائیکولوجی کے متعلق "تمہاری کیا رائے ہے" اور یہ سوال ہنوز اپنی جگہ پر قایم ہے۔ جواب یہ ہے کہ سائیکولوجی کا اجرأ علم و ادب کی ایک گراں قدر خدمت ہے۔ سائیکولوجی جیسے پرچے کی اردو صحافت کو ازبس ضرورت تھی اور ضرورت ہے۔ مغربی زبانوں میں علوم نفسیات پر بڑے بڑے سحر پرور اور معجز نگار پرچے نکلتے ہیں جن سے مغربی اقوام میں زندگی کی لہریں پیدا ہوتی ہیں اور دماغی صلاحیتوں کے خانے بیدار ہوتے ہیں۔ مغربی علمائے نفسیات کے تبحر علمی سے فایدہ اٹھانا ملک کی اہم ترین ضرورت ہے اور اس ضرورت کو سائیکولوجی جس حسن و خوبی سے انجام دے رہا ہے وہ بے شک و شبہ لائق صد تحسین و آفرین ہے اور ہماری یہی رائے ہے کہ

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

علمی اور ادبی رسائل یوں تو ملک کے گوشہ گوشہ سے نکل رہے ہیں اور ہر صحیفہ نگار اپنی اپنی بضاعت کے بموجب علم و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے اور ستایش و تحسین کا مستحق ہے مگر سائیکولوجی کا مقام علم و ادب دوسرے پرچوں کے مقابلہ میں خصوصی امتیازات کا حامل ہے جن کی شرح اس سرسری جائزہ میں آسان نہ ہوگی۔ ہم مدیران و منتظمین سائیکولوجی کو اُن کے اس جرأت افزا اقدام پر مبارکباد دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

چمن میں آشیاں تو باندھتے کو باندھتے سب ہیں
مزہ جب ہے کہ اے بُلبل ہوا بندھ جائے گلشن میں

یہ سب تو صحیح ہے مگر ایسا نہ ہو کہ مدیران محترم اپنے پرچہ کو اس بام عروج پر دیکھ کر یک قلم مطمئن ہو جائیں اور یہ بھول جائیں کہ ابھی رفعت و عظمت کے مقامات اور بھی ہیں۔ لہذا ہم ان سے صاف صاف کہے دیتے ہیں کہ

اے سنگ بر تو دعویٰ ملاقت مسلم است
خود را ندیدۂ بکفِ شیشہ گر ہنوز

اسی سلسلہ میں ایک تنقیدی جملہ بھی بے محل نہ ہوگا اگر مدیران محترم کی خاطر عاطر پر گراں نہ گذرے اور اس تنقید کو ہم ایک مثال کے پردہ میں معرض بحث میں لاتے ہیں۔ ہمیں یہ طریق کلام پسند نہیں کہ جذبۂ خوف کی ماہیت پر بحث کرتے ہوئے کوئی یہ کہتا چلا جائے کہ "مت ڈر۔ مت رو۔ مت ڈر۔ مت رو" یہ ماہر علوم نفسیات کا طریق کلام ہو ہیں سکتا۔ ماہر علوم نفسیات جسے آپ سائیکولوجسٹ کہیں گے خوف کی ماہیت اور پس منظر کا تجزیہ کرتا ہے۔ وہ خوف کی حقیقت کو عریاں دیکھتا ہے اور عریاں پیش کر دیتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ خوف کا جذبہ ہر جاندار کے لئے طبعی اور فطری ہے۔ وہ خوف کی مختلف صورتوں کے خد و خال کو نمایاں کرتا ہے اور اس کے ہر پس منظر کو معرض بحث میں لاتا ہے۔ مگر اس کی بحث اپنے مخصوص دائرۂ علم نفسیات میں محدود رہتی ہے۔ اس سے باہر نہیں جاتی۔

مثلاً باغ میں لوگ بیٹھے ہیں اور ہنس بول رہے ہیں کہ یکایک زور کا دھماکا ہوا۔ بم پھٹا۔ پرندے چیختے چلاتے درختوں سے اڑ گئے۔ ہرن بے طرح طرارے بھرنے لگے اور انسان کا بچہ بھی دفعتاً اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ سب پر بیک وقت خوف طاری ہو گیا۔ انسان اور وحوش و طیور سب کے سب متاثر ہوئے۔ فلسفی بھی کانپ گیا اور سائیکولوجسٹ بھی چونک اٹھا۔ اور اسی حقیقت کے پیش نظر سائیکولوجسٹ یہ کلیہ قایم کرنے پر مجبور ہوا کہ خوف ہر جاندار کی فطرت جبلت میں ازل سے ودیعت ہے اور بس۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ خوف سے بچو یا نہ بچو۔ خوف سے بچنے نہ بچنے کی تعلیم و تبلیغ معلم اخلاق کا موضوع نگارش ہے۔ خوف اچھی چیز ہے یا بُری یہ بحث بھی سائیکولوجسٹ کی جولانگاہ فکر سے ماوریٰ و بے نیاز ہے یہ مبحث بھی معلم اخلاق کی کاوشوں کا مخصوص میدان ہے

مؤخر الذکر فرماتے ہیں کہ " اللہ سے ڈرو - اللہ کے عذاب سے ڈرو - قیامت کا خوف دل میں رکھو " وَاتقوا اللہ اِن اللہ شدید العقاب -
سائیکولوجسٹ اس باب میں صُمٌّ بُکمٌ رہ جاتا ہے اور حاصل کلام یہ ہے کہ سائیکولوجسٹ کا دائرہ بحث و نظر اور ہے اور علم اخلاق و الٰہیات کا حلقۂ ارشاد و دعوت اور ہے - ہم یہ نہیں چاہتے کہ سائیکولوجی کے اوراق پر یہ جداگانہ زاویہ ہائے فکر و تحقیق آپس میں ٹکرا جائیں اور قارئین کرام کے ذہن انتشار پیدا ہو - اگرچہ ہم اس کے بھی قائل ہیں کہ

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباش

مکتوب بے خیالی میں طولانی ہو گیا اور جائزہ نامکمل رہ گیا - مدیران محترم سے التماس ہے کہ حالات حاضرہ میں اسی رطب و یابس کو مغتنم جانیں کہ ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

ہمائے گو مفگن سایہ شرف زنہار
دراں دیار کہ طوطی کم از زغن باشد

غیور بدایونی - حیدرآباد سندھ

" سائیکولوجی میرے لئے چراغ راہ ثابت ہوا جب کہ میں تاریکی میں ہاتھ پیر مار رہا تھا - اور کوئی صورت تاریکی سے نکلنے کی نہیں تھی - اس لئے اس وقت اگر میں کسی کو اپنا سچا ہمدرد اور رہنما سمجھتا ہوں - تو وہ سائیکولوجی ہے
میں ایک اسٹوڈنٹ ہوں - میری یہ آرزو ہے کہ میں بڑا ہو کر سائیکولوجی کی خدمت کروں - کیونکہ اس نے مجھے زندگی کا راستہ دکھایا ہے "

محمد رفیع خاں - کراچی

" ایک ایسے نفسیاتی ماہنامے کا اجراجس کی اس ملک میں بے حد ضرورت ہو - بیشک ایک قابل ستائش امر ہے - جس پر میں آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں - "

این - ایم - احمد - لاہور

" میں دو مہینے سے آپ کا رسالہ سائیکولوجی پڑھ رہا ہوں - بہت اچھا رسالہ ہے - اس سے آپ بہت اچھے اچھے مضامین لوگوں تک پہنچاتے ہیں - خدا کرے کہ آپ کی یہ کوشش کامیاب ہو - آمین - "

رحمان منیب - لاہور

" مجھے سائیکولوجی کے بعض پرچے دیکھنے کا اتفاق ہوا - یہ بہت دلچسپ ہیں اور عام طالب علم کے لئے بہت مفید - "

ن - م - بانو - رنگون

میں بہت سے رسالوں کو پڑھتی ہوں - مگر جو تسکین سائیکولوجی کو پڑھنے سے ہوتی ہے - وہ کسی سے نہیں ہوتی - مجھے اب اپنے پر اعتماد ہونے لگا ہے - اور اندھیرے میں چراغ جلنے لگے ہیں - میری ایک بہن ہیں - وہ بھی آپ کے پرچہ کو بہت پسند کرتی ہیں ہم دونوں کی طرف سے ایسی نا قابل فراموش خدمت پر مبارکباد قبول کیجئے

آپ بھی اپنے گرانقدر مشورے بھیجئے - رسالہ کی خامیوں کو خصوصاً تحریر فرمائیے - تاکہ ہم آپ کے سائیکولوجی کو زیادہ سے زیادہ دل کش انداز میں پیش کر سکیں ——— (ادارہ)

زندگی زندہ دلی کا نام ہے

بیتھ وارکس

" میں تنگ آگئی ہوں، بالکل " ! " میرا جی زندگی سے بیزار ہوگیا ہے " " اوہو " میں نے کہا " اس قدر سڑی ! حد ہوگئی ! ایسی سنکی " ! اور پھر اپنی بات میں زیادہ زور پیدا کرنے کے لئے میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا " زندگی دوبھر ہوگئی ! یا یہ کہ تم جینے سے بیزار ہوگئیں ؟ غلط بالکل غلط !! مجھے اس کا یقین نہیں آتا ۔ یہ کیسے ہو ہی نہیں سکتا " ۔ " یا تمہارا مطلب ہے کہ تم جینے سے اس قدر بیزار نہیں ہوئیں جتنی اس ڈھب کی زندگی بسر کرنے سے جیسی کہ تم آج کل بسر کر رہی ہو ۔ "

" ہوں ! " اس نے کہا ۔ " جیسے جی چاہے کہہ لو ۔ بات ایک ہی ہے ۔ چاہے سر ہلانے لیٹو یا پائینتی اگر تو درمیان ہی میں آنے لگی " ۔

" اونہوں ——— ! ہرگز نہیں، ہرگز نہیں " میں نے اپنے چہرہ کو ذرا سنجیدہ بنا کر سر کی خفیف سی جنبش سے اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا ۔ " تمہارا یہ کہنا بالکل غلط ہے "

اور پھر قدرے سوچ کر میں نے کہا " اچھا بتاؤ تو تمہاری عمر اب کیا ہے ؟ "

" یہی کوئی ۳۷، ۳۸ برس اور کیا ! " اس نے جواب دیا ۔

" سبحان اللہ ! صرف اڑتیس برس ۔ یہ بھی کوئی بڑی عمر ہے " " اجی ۔ ابھی تو آپ کی آدھی عمر اور پڑی ہے ۔ آدھی عمر " ——— میں نے کہا " آپا خیال شریف میں "

میری بات کو سُنی ان سُنی کرتے ہوئے وہ بولی " یہی تو بات ہے اب میں اَدھیڑ ہوچکی ہوں اَدھیڑ ۔ میں خوب جانتی ہوں ۔ خوب ! ذرا آج سے پانچ سال پہلے کی طرف تو دیکھو ۔ ہائے کیا وقت تھا ۔ کیا چُلبلا پن تھا ۔ کیا جوش ۔ کیا وَلولہ ۔ اور اب تو نہ وہ چونچال پن ہے، نہ وہ سُرور ۔ ہائے ہائے وہ کیا کہا تھا ذوق نے ؎

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

اور اب جوں جوں میں مستقبل پر نظر ڈالتی ہوں مجھے ایک بھیانک منظر ہی دکھائی دیتا ہے ۔ جیسے کچھ دھندلے دھندلے ڈراؤنے سے سائے رینگتے ہوئے میری طرف بڑھے چلے آرہے ہوں ۔ میرا ماضی مجھ سے بچھڑ چکا اور آنے والے کل کی طرف جھانکتے ہوئے گھبراتی ہوں ——— اور دس سال گذرے تو بس ۔ خاتمہ ہے " اس نے روتی سی صورت بنا کر کہا " ذرا سوچو تو ! "

یہ سُن کر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی ۔ " ہاں ہاں میں نے سوچ لیا ہے "

وہ کھسیانی ہوکر بولی ۔ " اے ہے ! اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے ؟ " وہ میری اس ہنسی سے کچھ سٹ پٹا سی گئی ۔

میں نے اپنی ہنسی کو جاری رکھتے ہوئے کہا ۔ " تمہاری بات ہی کچھ ایسی ہے اڑتیس سال کی عمر تک پہونچ کر تم سمجھتی ہو تمہاری زندگی بیت چکی ۔ تم جینے سے بیزار ہوگئی ہو ۔ بھلا بتاؤ تو تمہاری امیدوں کو کیا ہوا تمہارے منصوبے کدھر گئے تمہارے وَلولے کیوں سرد پڑ گئے ! تمہاری تمنائیں ۔ تمہارے خواب، کہاں ہیں وہ سب ؟ کیا وہ سب پورے ہوگئے ۔ اور اب کچھ اور ہونا باقی نہیں ؟ "

" نہیں تو " اس نے کہا ۔ " میں اس نتیجہ پر پہنچ گئی ہوں کہ ان کا پورا ہونا اب محال ہے "

[illegible] میں نے کہا۔ "تو یہ بات ہے۔ تمہارا خیال اب یہ ہے ایک گیلی نہر جو ہماری رگ رگ اور نس نس میں موجزن ہے اور ہمارے قویٰ [illegible] حیات، ہماری حسیات بلکہ ہمارے تمام وجود کو سستی اور بے حسی کے ایک غیر تندرست خواب میں غرق کر دیتی ہے ـــ یہ بات تھی جس نے مجھے اپنی سہیلی کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے اور ایک بھوڑ لینے پر مجبور کر دیا۔ اور میں نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ـــ یہ سچ ہے ہماری امیدیں ہمارے خواب، ضرور پورے ہوتے ہیں۔ یہی تو ہیں جن کے دم سے یہ دنیا آباد ہے۔ خلاؤں کی غیر محدود پہنائیوں سے یہ خواب، وقت کی دھند میں کھوئے ہوئے۔ بھولے بسرے، تجلی ریز شوکت وجلال کی طرح اس پراسرار خیال کے پاروں کی طرح جس سے یہ دنیا کے ہست و بود کا طلسم رونما ہوا۔ اور یہ کل عالم۔ یہ تمام کائنات ظہور میں آئی۔ ہمارے دل کے افق پر طلوع ہوتے ہیں۔ انہیں پاروں سے عالم وجود کی تمام حیرت انگیز ندرت کا سماں آشکارا ہوتی ہیں۔ ان ہی کی بدولت ہم سمندروں کی وسیع پہنائیوں پر سوار اور ان کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتے ہیں۔ ان ہی کی بدولت ہم نے علوی فضاؤں کو مسخر کیا۔ آگ پر قدرت حاصل کی ہے اور ان ہی کی وساطت سے زمان و مکان کی حدود کو چیر کر پار نکل گئے ہیں۔

مانا کہ یہ سب خواب حقیقی نہیں ہوتے۔ ان میں سے اکثر مٹ جاتے ہیں۔ مر جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ سب پنپنے یا پورا ہونے کے قابل نہیں ہوتے لیکن اتنا سنا ہے کہ خیالی باتوں سے حقیقی باتیں بھی ابھر آتی ہیں۔

حل کر لیا مجاز و حقیقت کے راز کو
پائی ہے میں نے خواب میں تعبیر خواب کی

ہم جن چیزوں کو آج نمایاں پاتے ہیں وہ کسی زمانہ میں بالکل موہوم تھیں۔ آخر سوچئے تو کون کہہ سکتا ہے کہ خود حیات نے پہلے پہل کسی خیال ہی سے جنم نہیں لیا۔ ظاہر ہے پہلے پہل سوچ پیدا ہوئی ہوگی۔ عناصر کے دل میں ایک ذرا سی کسک، ایک ہلکی سی خلش اور پھر حیات کا تمتماتا ہوا پیکر ایک چمکتے ہوئے ستارے کی طرح ہنستا کھیلتا نمودار ہو گیا۔ یہ آدم کی بائیں پسلی میں تھوڑی سی لاابالیانہ تڑپ ہی تو تھی جس نے حوا کے حسین و جمیل پیکر کا روپ دھارا۔ جس کی وجہ سے آج ہم انسانوں کی دنیا میں اس قدر رونق اور چہل پہل دیکھتے ہیں۔ کسی نے کیا پتہ کی بات کہی ہے ـــ

خواب ہیں ہم اک رنگین خواب
زیست ہے اک خوابوں کا ہیولا
اپنی ہستی۔ اک ننھی جان
جھولے نت نئے سپنوں کا جھولا

تو گویا ان سپنوں ہی میں کھو جانا اپنے آپ کو پالینا ہے"

غرض یہ کہ میں نے اپنی سہیلی کو ایسی ہی منطق چھانٹ چھانٹ کر باتوں میں پھانسنے کی ٹھان لی۔ اور لگی مثالیں دے دے کر ایک اور ہی رخ پر لگانے۔ میں نے کہا "دیکھو تو! میرے چچا جان ہیں نا۔ پورے بیاسی سال کے بوڑھے ہیں۔ اور۔ ہائے اللہ! دیکھنا۔ ان کی آنکھیں کیسی چمکتی ہیں۔ جیسے دو تین سال کے ہنس مکھ بچے کی۔ ان میں ایک عجیب نور ہے۔ اور بینائی اس قدر تیز۔ وہ سارا دن اپنے لئے ایک شاندار گھر کا نقشہ بنانے میں لگے رہتے ہیں۔ اور لو۔ بیگم صبح خند کو تو تم جانتی ہو نا؟ کیسی چاق چوبند، زندہ دل۔ ہنس مکھ، چونچال، تیز طرار۔ ماشاءاللہ اٹھتر سال کی عمر میں۔ اچھا کھاتی ہیں۔ اچھا پہنتی ہیں۔ اور ہر بات میں بڑھ بڑھ کر حصہ لیتی ہیں جیسے ان کے دل میں ولولے ہی ولولے بھرے ہوں۔ کیا کہتے ہیں ان کے۔ جیسے چودہ برس کی لچکتی بجلی ہوں۔ اور ہاں وہ ہماری خالہ ستارہ کو ہی دیکھو۔ پچپن برس کے لگ بھگ ہوں گی۔ اور کس قدر انہماک اور شوق سے دھیلہ دھیلہ، پیسہ پیسہ جوڑ کر زنانہ دستکاری کا مدرسہ کھولنا چاہتی ہیں۔

دور کیوں جاؤ۔ یہ تمہارے پڑوس میں بیگم ثریا رہتی ہیں۔ اپنے گھر کے اردگرد کے قطعہ زمین میں کیسی خوش خوش پھرتی رہتی ہیں۔ ابھی کئے دن ہوئے انہوں نے ایک ٹیوب ویل لگوایا ہے۔ زمین لاکھ بنجر اور روکھی سہی مگر وہ دھن کی پکی اس میں جان [illegible] ہوئی ہے ـــ"

خشک اور شور زمین کو بھی دیکھ دیکھ کر ایسی خوش ہوتی ہے جیسے چمنستان نے اس کے رو برو ایک رنگین مرقع پیش کر دیا ہو۔ اس کی پھلواری تو کہیں زمین کی تہہ میں چھپی پڑی ہوگی لیکن اس کے چہرہ پر نظر ڈالو تو اس پر تبسم ہی تبسم کھلتا دکھائی دے گا۔ گویا اس کی نگاہوں کے سامنے اس کا ناپیدا اور نادیدہ باغ مکمل شگفتگی کے ساتھ لہلہا رہا ہو۔ اور معلوم ہے بیگم ثریا کی عمر کیا ہے، پورے ستر سال۔

"ہاں تو میری پیاری سہیلی۔ میں تمہارے سامنے کوئی خشک وعظ دینا نہیں چاہتی۔ اور واقعہ یہی ہے کہ وعظ و پند سے ایک بیزاری اور بھی بیزار ہو جاتا ہے۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ ہم انسان چاہتے تو یہ ہیں کہ ہماری آرزوئیں پوری ہوں ہماری امیدوں کا باغ سینچا جائے اس میں سبزہ اگے اور لہلہائے، اس میں رنگارنگ پھول کھلیں۔ اور ایک جنت کا سا سماں دکھائیں۔ لیکن دنیا کی نبض تسکین و تسلی سے نہیں بلکہ امید اور خوف امید سے متحرک رہتی ہے یہ شاعر ہمارے دلوں کے راز جانتے ہیں۔ جبھی تو یہ ایسے شعر کہتے ہیں جن میں شاعری اور حقیقت کا ایک دلچسپ امتزاج ہوتا ہے۔ تم نے اصغر گونڈوی کا یہ شعر سنا ہے ؎

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائگاں ہے وہی رائگاں نہیں

ایک اور بات سنو، کون ہے جسے ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، رومیو جولیٹ میں دلچسپی نہیں۔ ہم سب ان سے محبت کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان کا دل محبت کے حسین سپنوں سے معمور تھا۔ آخر بہت جھڑ اور جاڑوں میں لطف ہی کیا جب تک ان کے روکھے پھیکے سایوں ٹھٹھری ہوئی صبحوں اور بے رونق شاموں کے پیچھے بہار کا رنگین پیکر اسس کی اٹکھیلیاں اور رعنائیاں اور فردوس نگاہ تصور آنو نہ ہو؟

"باتوں کا سلسلہ کچھ طویل تو ضرور ہوتا جا رہا ہے پھر بھی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ بہن! اپنی سمجھ بوجھ کو کام میں لاؤ۔ سب جانتے ہیں کہ چھا بہت اول جلول ہیں۔ بیگم صبح خند اپنی چنیاں بلغموں میں بھی راج ہنس کی آن بان پاتی ہیں۔ اور بیگم ثریا کا خیالی باغ زمین کی تہوں سے ابھر بھی آئے تو وہ کئے دن اس کی بہار دیکھیں گی دن رات تو کھانس کھانس کر برا حال ہوتا ہے اور رہ رہ کر دمہ کے دورے پڑتے ہیں۔

"لیکن تم خود ہی انصاف سے کہو۔ یہ سب کتنی ہشاش بشاش۔ کتنی زندہ دل ہیں۔ ان کے تن من میں جوانی کی روح سمائی ہوئی ہے۔ ہم سب اتنے ہی جوان ہوتے ہیں جتنے ہمارے خواب، اب یہ پوچھنے سے کیا فائدہ کہ یہ خواب ہیں کیا؟ طاقت، جاہ و جلال، گھر بنانا۔ کتابیں جمع کرنا۔ سینا پرونا پیراکی، باغبانی، کھانا پکانا۔ انتظام خانہ داری اور ایسے ہی بے شمار کام دھندے، بات یہ نہیں کہ ہم کیا چاہیں۔ بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں اور تہ دل سے چاہتے ہیں۔ اگر ہمارے دل میں کسی چیز کی چاہ ہو تو ہم اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور اگر ہم اسے حاصل کرنے کا ارادہ کریں۔ تو ہم اس تک پہنچنے کی امید باندھیں گے پھر ہم اسے حاصل کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کریں گے۔

جوانی کے سپنے سہانے
جوانی کی سوچیں
بہت دور جاتی ہیں کوسوں
سماتے نہیں ہیں جو سپنوں کی حد میں
جوانی کے افکار کے تانے بانے

ذرا اس بات کو سیدھے سادے پیرائے میں ادا کریں تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ "جو لوگ سپنے بنتے ہیں وہ ہمیشہ جوان رہتے ہیں"
میں نے یہ کہتے کہتے اپنی سہیلی سے اچانک دریافت کیا "کیا تمہارے دل میں کوئی ارمان کوئی آرزو، کوئی تمنا نہیں؟"
وہ ہچکچاتے ہوئے بولی "ہاں ———— ں! میری ہمیشہ سے یہ آرزو ہے کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ اور بچوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنا سیکھوں۔ میں [illegible] سے کرنا چاہتی ہوں۔ مگر میرے پاس نہ اتنا وقت ہے نہ اتنا پیسہ۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی ہوں کہ میں

نرس بن جاؤں ۔ اور پھر ـــــــ اس کے علاوہ ـــــــ میں ـــــــ بوڑھی بھی تو ہو چلی ہوں ۔"

میں نے اُسے جھٹ ٹوکتے ہوئے کہا "چھی ۔ چھی ۔ بوڑھی ـــ !! دیکھو تو تمہاری آنکھوں میں اب بھی کیسی چمک ہے ۔ تم نے کتنا کچھ پڑھا ہے ۔ رہا پیسہ ۔ تم کچھ ایسی کنگال بھی نہیں ہو ۔ اللہ نے پیسہ بھی تھوڑا بہت دیا ہی ہو ۔ ڈاکٹری سیکھنے میں ایسی کونسی بڑی رکاوٹ ہے ۔ اچھے اچھے طبی کالج موجود ہیں کسی ایک میں داخلہ لے لو ۔ جتنی تمہاری عمر ہے اس میں تو لوگ یہ سوچنا شروع کرتے ہیں کہ وہ کیا کام سیکھیں ۔ کیا دھندا کریں سمجھیں ؟ ان میں سے بہت سے تو یہ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر وہ قائداعظم یا مسٹر جناح کیوں نہیں بن سکتے ـــ !! جاگو ۔ جاگو ۔ میری سہیلی ۔ ہوش میں آؤ ۔ آنکھیں کھولو ـــ تم کس ادھیڑ بن میں مبتلا ہو ۔ کس بھول بھلیاں میں کھوئی ہوئی ہو ؟ "

میری سہیلی نے چونک کر کہا ! " ہوں ! کچھ عجب نہیں ۔ ہاں ۔ کچھ عجب نہیں ۔ میرے مولیٰ کیا یہ ممکن ہے ؟ ـــــــ یہ بات کچھ ایسی اَن ہونی بھی نہیں معلوم ہوتی ـــــــ میں سوچوں گی ـــــــ میں اس کے امکانات پر غور کروں گی ۔ خیر ۔ کل ہی میں فلک ناز کو خط لکھوں گی ۔ اور بھائی روشن خیال کو بھی ـــــــ اور اُن سے بھی کل ضرور مشورہ کروں گی ۔ ضرور ۔ ضرور نہیں بلکہ آج ہی ۔ آج ہی رات کو !!"

میں اسے اس عالم میں چھوڑ کر چلی آئی ۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں ۔ ادھیڑ ہونے کا خیال اس کے دل سے نکل گیا تھا ۔ زندگی سے اس کی بیزاری ایک افسانۂ پارینہ بن چکی تھی ۔

اور جب میں اس کے گھر سے نکل کر گلی میں آئی تو یہ سوچ رہی تھی کہ میری سہیلی کس قدر خوش ہے اور اس خیال سے کہ اگر وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو ٹھیک نہج پر لگانے میں کامیاب ہو جائے تو وہ کیا کچھ کر سکتی ہے ۔ کس قدر مسرور ہو رہی تھی وہ ـــ میرے دل میں یکلخت خیال پیدا ہوا کہ میں تمام خواب دیکھنے والوں اور ہمیشہ جوان خیال اور زندہ دل رہنے والوں کے لئے چند الفاظ دیواروں پر کندہ کر دوں اور وہ الفاظ یہ ہوں ! ـــ

صرف خواب دیکھنے والوں کے لئے !

" خواب دیکھتے جاؤ ۔ ہمیشہ ہمیشہ ۔ کیونکہ تمھیں نے دنیا تعمیر کی ہے ۔ خواب تمام انسانوں کو میسر ہیں ۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہوا اور روشنی ۔ ان کا دروازہ کسی عمر ۔ کسی قوم، کسی جماعت، کسی فرد، کسی مذہب و ملت پر بند نہیں ۔

اور ان تمام لوگوں میں جو خواب دیکھتے ہیں ـــ کامرانی کے خواب ۔ ایک سنہری دنیا کے خواب، ایک مثالی حسن کے خواب، زمین و آسمان کو مسخر کرلے کے خواب ـــ کسی دن ایسی ہستیاں بھی بروئے کار آئیں گی جن کی عظمتیں اوج ثریا تک رساں ہوں گی اور جن کے لئے علم و فن کی خیرہ کن روشنی کامل عرفان و بصیرت کا طلسمی دروازہ وا کر دیتی ہے ۔

وہ اِن دروازوں میں سے گذر گذر کر پھر واپس آئیں گے ۔ اور اس عمل کو بار بار دہرائیں گے ۔ اور یہاں تک کہ تم جو اس وقت وہاں ہوگے ان کے خواب یاد کرو گے اور پھر کچھ عجب نہیں کہ آفتاب عالمتاب پہناۓ فلک پر گردش کرتا کرتا رک جائے گا اور ہم سب وہ انسان جو خواب دیکھتے چلے آئے ہیں ۔ انسان نہیں دیوتا بن جائیں گے ۔"

ترجمہ ۔ رفیق خاور ۔ وجمیل نقوی

آپ ھی کے فائدے کی چند باتیں

- وی پی کے بجائے منی آرڈر سے چندہ بھیجنے میں فائدہ بھی ہے اور آسانی بھی
- ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک پرچہ نہ بھیجنے کی شکایت آجانی چاہیئے ۔ پندرہ تاریخ کے بعد شکایت آنے سے پرچہ دوبارہ روانہ نہیں کیا جائے گا ۔
- خریداری نمبر کا حوالہ دینے سے آپ کی خدمت جلد تر کی جاسکتی ہے ۔
- پتہ کی تبدیلی کے لئے کم از کم دو ہفتہ پیشگی اطلاع آنی چاہیئے ۔

فنِ تشہیر

مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی

نان کو آپریشن (ترکِ موالات) اور خلافت کی تحریک اور زور شور کا زمانہ آپ کو یاد ہے؟ وہی کوئی ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء کا۔ ہزاروں دوکانوں پر دیکھتے کیا ہیں، کہ جاپان کی آئی ہوئی نئی نئی دیاسلائیوں کی ڈبیاں رکھی ہوئی ہیں۔ اور ان پر تصویر گاندھی جی کی بنی ہوئی! ——— گاندھی جی بیچارے کو آخر سگریٹ سے دیاسلائی سے کیا تعلق؟ واسطہ اس سے ہو یا نہ ہو ہندوستان کی پبلک سے تو واسطہ تھا۔ اور بہت زیادہ تھا ان کا نام بچہ بچہ جانتا تھا، ان کا نام بکتا تھا۔ ان کی صورت ایک قیمتی مال تجارت تھی۔ ان کی تصویر بجائے خود ایک مالیت تھی ——— جاپان کے تاجروں نے اس راز کو پالیا۔ اور گاندھی جی کی تصویر کو ایک ورشنی بنڈی بنالی، گاندھی دیاسلائیاں خوب بکیں۔

نفسیات کا فن اشتہارات کے کام کا ہے یا نہیں، اس پر تو سرے سے کسی بحث و گفتگو کی ضرورت ہی نہیں، اچھے اچھے اشتہار نویس ہر قوم کے اب اسے جو گئے ہیں اور اس کی اہمیت و ضرورت پر سب متفق ہو گئے ہیں۔ بحثیں صرف ان تفصیلات سے متعلق رہ گئی ہیں کہ زمین کس رنگ کی ہو اور حاشیہ کس رنگ کا؟ سائز پوسٹر کے لئے کونسا مناسب ہوگا؟ اور ہینڈ بل کے لئے کونسا، دلوں پر اثر کرنے والا ہوگا؟ خط عنوانات اور سرخیوں کا کیا رکھا جائے اور اصل عبارت کا کیا جو جاذب توجہ زیادہ سے زیادہ بن سکے ..؟ سادہ کاغذ زیادہ دل کش رہے گا یا رنگین کاغذ؟ تصویر اگر دی جائے تو اشتہار کے شروع میں یا آخر میں یا درمیان میں؟ اشتہار میں مال کے کس وصف پر سب سے زیادہ زور دیا جائے؟ آیا اس کے مفید ہونے پر یا اس کے ارزاں ہونے پر، یا اس کے دیرپا اور پائدار ہونے پر؟ ——— یہ اور اسی قسم کے بیسیوں دوسرے سوالات کا جواب کسی چھوٹی سی کتاب کا ایک چھوٹا سا باب کہاں تک دے سکتا ہے؟ یہاں تو صرف چند سوال طبیعت میں کرید پیدا کرنے کے لئے نمونے کے طور پر درج کر دئے گئے۔ جوابات کچھ تھوڑے بہت عرض کر دئے جائیں گے۔ اور جتنے بتائے جائیں گے؟ اس سے کہیں زیادہ صاحب فہم ناظرین خود اپنی فہم و ذہانت سے نکال لیں گے۔

پہلے دو ایک موٹے موٹے اصول اہل فن کی: ان سے سن لیجئے۔ شاخیں ان کی بہت سی از خود نکل آئیں گی۔

۱۔ ذہن ایک ہی وقت میں اور فوراً کئی کئی چیزوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

اس لئے کھلی ہوئی بات ہے کہ معمولی سائز کے اشتہار کی سرخی کسی لمبی چوڑی عبارت کو بنانا غلطی ہے۔ اشتہاری سرخی کی عبارت ہمیشہ مختصر، گٹھی ہوئی اور جاذب نظر ہونا چاہیئے۔ کوشش مشتہر کی یہ ہونی چاہیئے کہ جس کسی راہ گیر کی نظر سرسری اور اچٹتی ہوئی محض اتفاق سے بھی جس اشتہار پر پڑ جائے تو بس اس کی سرخی پر جم کر رہ جائے۔ ایک ہی نظر میں اس کے دل میں اتر جائے اور اس کا شوق اسے خود مجبور کر دے کہ وہ آگے کی عبارت پڑھنے لگے۔

اخبارات کی لمبی لمبی، کئی سطروں کی سرخیوں پر اشتہارات کی سرخی کو ہرگز قیاس نہ کیا جائے۔ اخبار تو انسان لیتا ہی اس ارادے اور خواہش سے ہے کہ وہ اسے پڑھے گا اور ممکن ہے کہ شروع سے آخر تک پڑھے اس لئے طولانی سرخیاں اس کے مطالعے میں حائل نہیں۔ برخلاف اس کے اشتہار تو راہگیر اپنے قصد اور خواہش سے نہیں دیکھنا چاہتا (سوا اس کے کہ کہیں وقت کاٹنا ہی اس مشغلے سے منظور ہو) یہ کام تو اشتہار نویس ہی کا ہے کہ عنوان میں ایسی دلچسپی اور کشش رکھ دے کہ نظر اگر محض اتفاق سے بھی اشتہار کی سرخی پر پڑ جائے تو اب دل کا اشتیاق بغیر آگے بڑھے اور پورا اشتہار

پڑھے نہ رہے۔

۲۔ ذہن، ادق، خشک و مغلق الفاظ کی طرف سے بھاگتا اور سلیس شگفتہ مانوس عبارت کی طرف دوڑتا ہے۔

اشتہار کی سرخی میں بڑے بڑے موٹے الفاظ نہ لیجئے، عنوان ہمیشہ سبک، سادے، سلیس، عام فہم دلکش الفاظ کو بنائیے ——— اشتہار یاد رکھئے کہ اپنے آپ کو پڑھواتا ہے، کوئی خود سے اُسے پڑھتا نہیں ہے۔

۳۔ ذہن انسانی تکرار محض سے اچاٹ ہو جاتا ہے، تکرار مع التنوع سے الفت محسوس کرتا ہے۔ ایک ہی اشتہار یعنی ایک ہی لفظ و عبارت کے ساتھ ایک ہی پرچے میں، ایک ہی جگہ، بلا ناغہ لگاتار چھاپتے جانا، ذہن کو اس کی طرف سے بے توجہ کر دیتا ہے۔ تکرار و اعادہ یقیناً ایک بڑی مفید و مؤثر چیز ہے۔ لیکن اسی وقت جب تک اس سے اکتاہٹ نہ پیدا ہو جائے۔ تکرار محض کے اسی اثر سے بچنے کے لئے تنوع کی آمیزش لازمی ہے اس لئے:-

(الف) وہی اشتہار یا تو کچھ کچھ وقفے کے بعد نکلے

(یہ زمان میں تنوع ہوا)

(ب) وہی اشتہار مختلف پرچوں میں نکلے

(یہ مکان میں تنوع ہوا)

(ج) وہی اشتہار کا مضمون ادل بدل کر نکلا کرے

(یہ اصل شے میں تنوع ہوا)

ضمناً ایک دوسری چیز بھی اسی قانون سے نکل آئی۔

مختصر، دو سطری، چار سطری عبارتوں میں تو خیر زیادہ نہیں، لیکن لمبے اشتہاروں میں عبارت کی طرح کتابت کی قلم کی یکسانی بھی مضر ہوگی۔ لمبے اشتہار کی تاثیر کا ایک بڑا گر یہ ہے کہ:-

(۱) خط، ضروری الفاظ کا جلی اور خوب روشن ہو اور بقیہ کم ضروری الفاظ کا خفی۔

(۲) سطریں سب یکساں لمبائی کی نہ ہوں بعض جگہ آدھی سطر پوری سطر سے بہتر رہے گی۔

۴۔ ہر رنگ بجائے خود اور دوسرے رنگ کے ساتھ ترکیب میں ایک خاص درجہ قوت اور تاثیر کا رکھتا ہے۔ اسٹیشنوں اور سڑکوں کے بورڈ کے بجائے اگر سفید یا ہلکے بادامی رنگ کے ہوں تو ان پر سیاہ رنگ کے حروف زیادہ نمایاں ہوں گے بمقابل اس کے کہ حروف سفید رنگ کے ہوں، اور بورڈ سیاہ رنگ کا۔ اسی طرح جو مشتہر کاغذ کی سیاہ زمین میں سفید حروف رکھتا ہے وہ غلطی کرتا ہے۔ نمایاں کرنا ہے تو اشتہار کے کاغذ کی زمین سفید ہی رکھنا چاہیئے اور حروف سیاہ۔

۵۔ جلب توجہ کا بڑا ذریعہ ندرت ہے، اور اس کا استعمال سب سے زیادہ عنوان ہی میں ہو سکتا ہے

ابھی طالب علمی کا زمانہ تھا کہ لکھنؤ میں ایک صاحب نے کھانے کا تمباکو (زردہ و قوام وغیرہ) کا کارخانہ کھولا۔ اشتہار کثرت سے دیا اور اس کا عنوان رکھا:-

شہنشاہ جہانگیر اور ہم

عنوان اتنا دلکش اور جاذب نظر تھا کہ ہر شخص کی نظر پڑتے ہی جم جاتی۔ اور اضطراراً آگے کا مضمون پڑھنے لگتی۔ آگے مضمون یہ تھا کہ اگر شہنشاہ جہانگیر کا احسان دنیا پر یہ ہے کہ اس نے تمباکو کی پتی کا رواج دیا، تو ہمارا احسان دنیا پر یہ ہے کہ ہم نے تمباکو کو خوش ذائقہ اور لطیف کر کے نفاست پسند طبقہ کے قابل کر دیا۔

ستمبر ۱۹۱۵ء میں ایک عظیم الشان سیلاب آیا، معاً لکھنؤ کی ایک گراموفون کمپنی نے اشتہار دیا۔

"بہیا آ گئی" ——— لوگ چلتے چلتے ٹھٹھک جاتے اور دیواروں پر اشتہاروں کو پڑھنے لگتے مضمون یہ

تھا کہ ہمارے پاس سالانہ گراموفون کی بہار آگئی - ایک دوسرے اشتہار کا عنوان تھا،

گورنر بگڑ گیا

یہ بھی اچھا خاصا جاذب نظر ثابت ہوا۔ لوگ قدرتاً گورنر سے صوبے کا اعلیٰ ترین حاکم مراد لیتے، حالانکہ مشتہر کی مراد، گراموفون مشین کے اس پرزے سے تھی، جسے گورنر کہتے ہیں -

۶ - لیکن جدت عنوان، اور "غرابت" میں بہت فرق ہے - غرابت دل کشی کی ضد ہے -

بعض مشتہر جدت وندرت کی تلاش میں غلطی سے اتنی دور چلے جاتے ہیں کہ دل کشی کے حدود سے بالکل باہر نکل کر اجنبیت وغرابت کی سرحد میں داخل ہو جاتے ہیں ——————— " نیا پن " اور " انوکھا پن " دو بالکل مختلف بالکل متضاد کیفیتوں کے نام ہیں -

حلوے، شربت، مربے، بسکٹ میں مینڈھک کی تصویر بنا دینا - اچھی اچھی کتابوں کے اشتہار پر، بچھو کی تصویر رکھ دینا - راہ گیر کا دل کھینچنے کے بجائے اور اسے ہٹا دیتا ہے اور مال کے ساتھ خوش گوار تلازم ذہنی پیدا کرنے کے بجائے الٹا اس کے ساتھ افتراق ذہنی اور تنافر طبعی پیدا کر دیتا ہے -

۷ - عنوان یا تصویر ایسی ہو جو مال کے لئے شوق و دلچسپی پیدا کر سکے - نہ کہ بجائے خود مقصود بن جائے -

ایک بار ایک موٹر فروش کارخانہ نے اپنے ہاں کے موٹروں کا اشتہار دیا - اور ایک نوجوان حسینہ کی تصویر بنائی جو بڑے ذوق وشوق سے کھڑی ہوئی موٹر کو دیکھ رہی اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس پر ہاتھ پھیر رہی تھی ——————— مشتہر کا کھلا ہوا مقصد یہ تھا کہ لوگ اس نوجوان حسینہ کی تصویر پر ضرور ہی نظر ڈالیں گے اور اس طرح کارخانہ کے مال کو بھی دیکھ لیں گے - ہوا اس کے برعکس - یعنی لوگوں کی نظریں ذوق وشوق سے پڑیں ضرور لیکن کارخانہ کے مال پر نہیں، بلکہ تمام تر حسینہ کے حسن وجمال پر - مشتہر کے پاس خطوط کی ڈاک بندھ گئی لیکن ذکر مال کا کسی میں نہیں، استفسار سب اسی حسینہ کے نام و پتے سے متعلق تھے :

۸ - عنوان یا تصویر ایسی ہو، جو مضمون اشتہار سے قریبی تعلق یا واسطہ رکھتی ہو تعلق بہت دور کا اور واسطہ افتراق پیدا کرنے والا نہ ہو -

ایک انگریزی پرچے میں لاٹھ پیسٹ یا منجن کا اشتہار پورے صفحے کا نظر آیا - صفحے کے بائیں رخ پر تصویر زنانی پنڈلیوں کی گھٹنیوں سے نیچے تک کی تھی - اور اوپر لمبے نازک موزے چڑھے ہوئے دکھائے گئے تھے، عبارت اشتہار کی طول طویل تھی - خلاصہ مضمون یہ تھا - کہ ہمارا منجن نہایت ارزاں ہے - اس سے جو روپیہ بچے گا - اسی سے دوسرے سامان خریدے جا سکتے ہیں اور ان سامانوں میں خاص طور پر خوش گوار زنانے پیر کے لئے یہ نرم و نازک، آرام دہ پاتا بے ہیں ——————— اب اتنا دماغ کسے کہ ان درمیانی مقدمات کو بھی ذہن میں رکھے - اور اتنا سوچ ساچ کر - اس نتیجے تک پہنچے - خریدار کے لئے اپیل بالکل براہ راست اور بلا واسطہ ہونا چاہیئے

اشتہار کا اصل کام یہ ہے کہ مال کی سوک ناظرین کے دل میں پیدا کر دے -

---

چند اچھے اشتہارات کے نمونے

۱ - ایک کھانسی کی انگریزی گولیوں کا اشتہار [illegible] - اوپر جلی سرخی کہ نزلہ وزکام کو ابھی رخصت کیجئے - داہنی طرف ایک جوان حسین عورت کی تصویر جو رومال ہاتھ میں لئے ہوئے [illegible] پھیلی ہوئی آنکھوں اور پیشانی پر شکنوں کے ساتھ کھانسی کی تکلیف میں مبتلا دکھائی گئی ہے بائیں طرف شستہ عبارت میں دوا کے مفید خوش ذائقہ اور زود اثر ہونے کا ذکر، اور نیچے دوا کا نام بہت جلی حظ میں، اور دوا کی شیشی اور کاغذی ڈبیا کی تصویر -

۲ - ایک [illegible] جہاز سازی کا اشتہار - اوپر کے حصے میں ایک ہوائی جہاز کی تصویر جو زمین سے عنقریب اڑنے کو ہے - سامنے ایک بڑا بکس جو کسی مسافر کا سامان [illegible] ایک سپاہی وردی میں ملبوس جہاز کے زینے کے آگے رستہ روک کر کھڑا ہوا ہے اور بکس کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا ہے

[illegible]

نیرنگیوں کا نام ـ ہیں

میرین میکملن

ذہن اور کردار پر

خیال اور عمل کا اثر

خیال کا نتیجہ عمل ــــــــ عمل کا نتیجہ عادت

عادت کا نتیجہ سیرت ــــــــ سیرت کا نتیجہ مقدر

آپ کہیں گے یہ خوب منطق چھانٹی ۔ گویا حضرت چھوٹے چھوٹے مقولے تراش رہے ہیں اور انھیں سچائی کے چھوٹے چھوٹے تاروں سے یوں باندھ رہے ہیں جیسے کمسن الھڑ لڑکیاں نازک رنگین فیتوں سے اپنے ریشمی بالوں کو ــــــ نہیں ــــــ یہ بات نہیں ہے ۔ اور نہ اس میں کسی شاعرانہ تخیل کو دخل ہے ۔ بلکہ ان سیدھی سادی باتوں کو بیان کرنا مقصود ہے جو ہم روز اپنے کانوں سے سنتے اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ۔

یقین جانئے ہر وہ فرد جو ہم سے پہلے دنیا میں ہوا ۔ یا آج ہے یا آئندہ ہوگا ۔ ان سچائیوں کا شاہد ہے ۔ یہ کلیے سب پر صادق آتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہماری زندگی کا لازمی جزو ہیں ۔

ذرا غور تو کیجئے کہ سیرت ، اور مقدر کتنے بڑے لفظ ہیں ۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اتنے ہی پُر معنی بھی ۔ ان میں ہمارے تمام مقاصد امیدیں اور تمنائیں پوشیدہ ہیں ۔ ایک باپ اپنے بچے کو کھیلتا دیکھ کر کتنا خوش ہوتا ہے مگر ساتھ ہی یہ سوچ کر چونک اٹھتا ہے کہ وہ بڑا ہو کر کیسا انسان ثابت ہوگا ۔ اس کی سیرت کیسی ہوگی ، اس کا مقدر کیسا ہوگا ۔

اگر یہ سچ ہے کہ انسانی زندگی کے ان دو اہم پہلوؤں یعنی سیرت اور مقدر پر کوئی قانون اثر انداز ہوتا ہے ۔ تو اس قانون ، اس کلیہ کا علم حکمت اور دانائی کا سرچشمہ ہوگا ۔ لہذا یہ ایک جچا تلا قانون ہے جو خیال کو عمل ، عمل کو عادت ، عادت کو سیرت اور سیرت کو مقدر سے وابستہ کرتا ہے اس کی بنیاد نفس پر نہیں ۔ دماغ پر ہے ، آپ کے عصبی نظام کے تار و پود اسی قانون کے ماتحت کام کرتے ہیں ۔ بعینہٖ اسی طرح جیسے دل خون کو رگوں میں دھکیلتا ہے اور ایک طبعی عمل کے مطابق کام کرتا ہے ، یہ محض ایک خیال ہی نہیں بلکہ ایک مسلّم حقیقت ہے ۔

علم النفس کوئی اٹکل پچّو چیز نہیں بلکہ یہ قسمت شناسی کا ایک بااصول طریقہ ہے ۔ اگر آپ اس کے اصولوں کی پیروی کریں تو آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں ۔ اور حسب خواہش ہر چیز حاصل کر سکتے ہیں ۔ اور علم النفس کے اصولوں پر عمل کرنا مقاصد کے حصول کا جب سے زیادہ کامیاب اور یقینی راستہ ایک تیر بہدف نسخہ ہے ۔ اس کو آزمانے سے پہلے ۔ واضح طور پر آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آپ چاہتے کیا ہیں ۔ نفسیاتی اصولوں کے مطابق چلنے سے چونکہ آپ کی کامیابی کا امکان قوی سے قوی تر ہو جاتا ہے اس لئے اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ آپ پہلے سے جان لیں کہ آپ کا مقصد کیا ہے ۔

اب ذرا آپ اس تیر بہدف نسخہ کی تفصیلات ملاحظہ کیجئے : ـ

خیال کا نتیجہ عمل ـــــــــــــــ کیونکہ آپ کی ہر ذہنی کیفیت سے کوئی نہ کوئی جسمانی فعل ظہور میں آتا ہے ۔ آپ کا عصبی نظام بیرونی اثرات کو قبول کرنے اور ان کی جانب ردعمل کرنے کا ایک آلہ ہے ۔ جن چیزوں کو آپ "احساس" یا "خیال" کہتے ہیں وہ درحقیقت عصبی رووں کے مسلسل آنے اور جانے کا نام ہے ۔ جب آپ کا شعور چوکنا ہو تو یہ رویں جاری ہوتی ہیں ۔ اگر یہ رویں جاری نہ ہوتیں تو آپ کبھی چوکنے نہ ہوتے۔ اسی حرکت کا نام "شعور" ہے ۔ آپ کی آتی ہوئی رویں وہ سب کچھ بتاتی ہیں جو آپ جانتے ہیں ۔ یعنی چکھنا، سونگھنا، دیکھنا، چھونا، سننا اور اگر دُکھ ہوا تو انہوں نے فوراً آپ کو خبر دی، اور سکھ یا راحت ہے تو اس کا احساس بھی آپ کو انہیں کی وساطت سے ہوتا ہے ۔

یہ آنے والی رویں طاقت سے بھری ہوتی ہیں ۔ اور انہیں باہر نکلنے کے لئے کسی مخرج کی ضرورت ہوتی ہے ۔ دماغ سے نکلنے کا واحد رستہ اس کے پردہ یا اعصاب ہیں ۔ دماغی قوت اس کے اعصاب کے ذریعہ عمل کی شکل میں رونما ہوتی ہے ۔ اس لئے جب کوئی خیال دماغ کے ذریعہ عروق کے ذریعہ داخل ہوتا ہے تو خلایائے دماغ میں ایک دھماکہ سا ہوتا ہے جو عمل کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ گویا خیال بذاتہ کوئی چیز نہیں ہے اور خیال اور عمل بھی الگ الگ نہیں ہیں ۔ بلکہ عمل خیال دو سرا سرا ہے ۔ اور کوئی انسان خیال کے ساتھ ہی عمل کئے بغیر نہیں رہ سکتا

عمل کی کئی صورتیں ہیں ۔ ایک آہ، ایک دبی دبی جنبش، یا ہاضمہ میں خلل ۔ ہوسکتا ہے کہ یہ عمل جلد ظاہر نہ ہو ۔ بلکہ دماغ اُسے کئی مہینے یا سال بزور روکے رکھے ۔ اور پھر وہ یکلخت ابھرے ۔ شاید اس زور سے کہ ایک پوری قوم کو سنوارنے یا بگاڑنے کا سبب بن جائے

دماغ کا گودا (بھیجہ) لئی کی طرح ملایم ہوتا ہے اور آپ کے خیالات سے پیدا ہو کر نکلنے والی قوت کے رَو اس نرم نرم مادہ سے عمل کی شکل میں ظاہر ہو کر ایک راستہ بناتی ہے ۔ جب یہ راستہ بن جاتا ہے تو قوت کی یہ رو اس نئے بنائے راستہ سے بآسانی گذر سکتی ہے ۔ بہ نسبت اس کے کہ وہ ایک نیا راستہ بنائے ۔ یہ رو ایک ایسی قوت ہوتی ہے جو عمل کی شکل میں ظاہر ہوئے بغیر دم نہیں لیتی ۔ اصولی طور پر یا تو یہ رو ایک نئی راہ بنا سکتی ہے یا پرانے راستہ ہی کو زیادہ گہرا کرتی ہے ۔ جتنی بار یہ رو بہتی ہے اس کی رہگذار اتنی ہی گہری ہوتی جاتی ہے ۔ اور اس سے گذرنا آسان تر ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ رو اتنی تیزی سے گذرنے لگتی ہے کہ آپ کو احساس تک نہیں ہوتا ۔

عمل کی دو قسمیں ہیں ۔ اضطراری اور فکری ۔ اضطراری عمل مثلاً چھینکنا، آنکھ جھپکانا وغیرہ عصبی نظام کے نچلے حصے میں انتشار کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جو کہ اگر چہ ناک میں مرچوں کی دھسک آئے تو آپ چھینکے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ لیکن فکری عمل آپ کے قابو میں ہوتا ہے ۔ اگر آپ کا ہاتھ جل جائے تو آپ اسے فوراً ہی آگ سے پرے ہٹا لیتے ہیں ۔ اور احساس درد اور ہاتھ کھینچنے کا عمل دماغ کے دونوں ابھاروں میں جو اس کے بالائی حصے ہیں ارتسام پیدا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ جب آپ دوبارہ شعلے کو دیکھتے ہیں تو دماغ کی سمت آنے والی رگیں اس ذخیرے کو چھیڑ دیتی ہیں جس میں جلن کی یاد داشت محفوظ ہے ۔ اس سے آپ مجبور ہو جاتے ہیں کہ آپ اپنے پرانے تجربہ کو یاد کریں ۔ اور اپنی انگلیاں شعلے سے پرے رکھیں جلن کا احساس شعلے کے دلکش ہونے کے احساس کو دبا دیتا ہے ۔ اور جلن کے خیال کے شعلے کی دلکشی پر حاوی ہو جانے کی وجہ سے آپ اپنی انگلیوں کو جلنے نہیں دیتے ۔

آپ کے دماغ کے جوف یادوں کا کھلیان ہیں ۔ آپ کی یادیں ہر اس عمل پر دھیان رکھتی ہیں ۔ جو آپ سے سرزد ہوتا ہے ۔ ہر ارادی فعل دماغ کے نرم نرم ابھاروں پر راستہ بناتا ہے اور اس پر ایک یادداشت رقم کر دیتا ہے ۔ آپ کے زندگی کی کل داستان آخری لمحہ تک ٹیڑھے ٹیڑھے راستوں کی شکل میں دماغ پر رقم ہوتی ہے ۔ اور آپ جو کچھ بھی کرتے ہیں ۔ دماغ پر ثبت ہوتا جاتا ہے ۔ آپ کے خلایائے دماغ ہمیشہ انہیں رقم کرنے میں مصروف رہتے ہیں ۔ اور اچھے یا برے، سمجھدارانہ یا احمقانہ فعل کا گہرا نقش ثبت کر دیتے ہیں ۔

چھینکنا ایک اضطراری فعل ہے ۔ اور اس پر آپ کا اختیار نہیں ۔ آپ کو طوعاً و کرہاً چھینکنا ہی پڑتا ہے ۔ لیکن فکری عمل میں آپ جو راستہ چاہیں اختیار کر سکتے ہیں ۔ حالانکہ اس صورت میں بھی آپ کو کوئی نہ کوئی عمل ضرور کرنا پڑے گا ۔ اگر آپ کے دماغ میں یادداشت کا ذخیرہ نہ ہوتا تو آپ کے لئے تجربہ بالکل بے سود ہوتا ۔ اور آپ بار بار شعلوں سے انگلیوں کو جلاتے

لہذا اگر آپ جانتے ہوں کہ کوئی کام آپ کے لئے مضر ثابت ہوگا تو آپ اس کا خیال ہی چھوڑ دیں ۔ اگر آپ اس کے متعلق سوچیں گے تو آپ اُسے لازماً کرتے ہی چلے جائیں گے ۔ کیونکہ جو خیال آپ کے ذہن میں سماجاتا ہے وہ آپ کا ہدایت کار بن جاتا ہے اور آپ کو بار بار ایک ہی انداز میں کام کرنے پر مجبور

کرتا ہے۔ اس سے جان چھڑانے کی ایک ہی ترکیب ہے کہ آپ اس خیال کے بجائے کوئی اور اچھی بات سوچنا شروع کر دیں چاہیئے۔ آپ بیک وقت بہت چیزوں کے متعلق یکساں شدت کے ساتھ نہیں سوچ سکتے۔ اس لئے آپ کو ایک ایسے خیال کو ہدایت کار کی حیثیت سے منتخب کرنا چاہیئے جس کے اشارے پر آپ چلنا پسند کریں۔ یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ آپ اپنے اندر جس احساس کو سرگرم کار اور ایک تیز دھارے کی طرح موج زن پاتے ہیں۔ وہ انہی عصبی تحریک ہی سے وجود پذیر ہوا ہے۔ جس سے آپ ہمیشہ اپنے دماغ کو نئے نئے سانچوں میں ڈھلتے رہتے ہیں۔ اور یہ ہے آپ کی شخصیت۔ جو ایسے راستے بناتی ہے کہ اگر آپ ان کا مطالعہ کریں تو ان سے آپ کی آئندہ کامیابی یا ناکامی کا راز آشکارا ہو جائے گا۔

آپ کا شعور ان چیزوں میں سے بعض کو پسند کرتا ہے جو آپ کے عصبی نظام باہر سے آنے والی لہروں کے تاثر سے آپ کے دماغ میں بنا ہیں آپ ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ آپ ان چیزوں کو پسند کرتے ہیں ان پر ہی توجہ دیں گے اور یہ ٹھیک بھی ہے۔ اس لئے آپ کا شعور جن چیزوں کو پسند کرتا ہے۔۔ دہراتا رہتا ہے۔ اور دوسری چیزوں سے پہلو تہی کرتا ہے۔ جن چیزوں کو آپ غور کرنے کے لئے چنتے ہیں یعنی آپ ان پر توجہ دیتے ہیں۔ وہ لازماً عمل کی صورت میں ظاہر ہوں گی۔ اگر آپ یہ فیصلہ کریں کہ آپ وزیر اعظم یا فلم اسٹار بنیں گے تو خواہ آپ کسی سے ذکر نہ کریں مگر کچھ دنوں کوئی نہ کوئی ضرور محسوس کرے گا کہ آپ کا مطمع نظر کیا ہے۔ کیونکہ جس طرح آپ کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہے اس طرح یہ بھی یقینی ہے کہ آپ کے عمل سے کسی نہ کسی طرح اس کا اظہار ہی ہو جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ صاف صاف دنیا کو اپنے ارادہ سے مطلع کریں۔ دنیا آپ کے حرکات و سکنات سے خود اس کا اندازہ لگالے گی۔

تو پھر آپ کی سیرت کیا ہے؟ آپ اور صرف آپ! یہ ان چیزوں کا مجموعہ ہے جو آپ نے دوران حیات میں چنی ہیں یا پسند کی ہیں اور جنہیں آپ کے اعصاب نے ذہن میں ذخیرہ کیا ہے وہ اس بات کی یادداشت نہیں کہ لانے والی رگیں کیا خبر لائی ہیں۔ انہیں اس امر سے دلچسپی نہیں معلوم ہوتی کہ آپ پر کیا گذری۔ وہ صرف اس چیز کی یادداشت رکھتی ہے جسے علم النفس میں "تاثر" کہتے ہیں۔ یعنی آپ نے اس کے بارے میں کیا کیا۔ یہ آپ کا عمل ہی ہے جو دماغ میں نقش بناتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ آپ کی شخصیت دماغ میں اعمال سے بنائے ہوئے راستوں ہی سے بنتی ہے بعینہ اسی طرح جیسے ایک مجسمہ چھینی کی تراش خراش سے شکل اختیار کرتا ہے۔ آپ اپنے آپ پر دو طرح غور کر سکتے ہیں۔ موضوعی طور پر یعنی "میں" آپ کا طبعی وجود۔ "آپ کا سما... یا روحانی وجود" یا آپ اپنے آپ کو فاعلانہ حیثیت سے جان سکتے ہیں یعنی "میں" جاننے والا۔ آپ کے نفس کا آخری شعور ہے۔ جو آپ کے تجربوں کا جامع ہے۔ اور یہی انتخاب کرتا ہے کہ آپ کا اگلا تجربہ کیا ہو گا۔

آپ کا "انا" یعنی نفس صحیح انتخاب پر قدرت رکھنے کا احساس رکھتا ہے۔ لیکن انتخاب سابقہ تجربوں پر موقوف ہے۔ اگر آپ نے کبھی فرانسیسی زبان سیکھنے کا تجربہ کیا۔ تو آپ اب فرانسیسی پڑھ سکتے اور اس طرح ایک ایسا دماغ پیدا کر سکتے ہیں جو فرانسیسی کتابیں پڑھ سکے۔ آپ کا "انا" ہمیشہ انتخاب کرتا ہے اور ہر انتخاب کی سیرت کو مرتب کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اور ہر انتخاب بڑی حد تک سابقہ انتخابات کا نتیجہ ہوگا۔ لہٰذا آپ کا ہر خیال۔ اور ہر عمل ایک معنی اور ایک اہمیت رکھتا ہے

وہ شخصیت جو آپ تعمیر کرتے ہیں۔ آپ کے مقدر میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اگر وہ محدود اور پست ہے تو آپ کا مقدر بھی ایسا ہی ہو گا۔ اگر آپ اسے نفیس پر شکوہ بنا سکتے ہیں تو آپ کا مقدر بھی آپ کی یاوری کرے گا ✣

(ترجمہ رفیق خاور و جمیل تقوی)

ٹائیٹل کور کے متعلق

ہم نے جولائی سے پرچہ اپنے ہاتھوں میں لیا ہے۔ اور ہر ماہ زیادہ سے زیادہ لطیف پیراؤں میں نفسیاتی کیفیات کو ڈرائنگ میں پیش کر رہے ہیں چونکہ سائیکولوجی آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ اس لئے اپنے زرّیں مشوروں سے ہماری راہبری کیجئے ✣

آپ اور آپ کے بچے

(پروفیسر علی ناصر زیدی)

موجودہ زمانہ کے ماہرین نفسیات کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہم بڑے ہونے کے باوجود بچہ سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ شاید اس سے بھی زیادہ جو وہ ہم سے سیکھتا ہے۔ بچہ فکرِ امروز و فردا سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کو چاروں طرف امید ہی امید نظر آتی ہے اور اس کے بشرے سے ہر وقت بہت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت نئی چیزوں کو جاننے کی خواہش کرتا ہے۔ جستجو اس کی فطرت میں داخل ہوتی ہے۔ ان تمام باتوں سے اس کے دماغ کی صحت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بچوں کا دماغ بالغ انسان کے دماغ سے کہیں زیادہ تازہ اور صحت مند ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں جو نفسیاتی تجربات ہوئے ہیں ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ بچہ کا توازن ——— دماغی اور جذباتی اعتبار سے ——— بڑے آدمیوں کے توازن سے بہتر ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت کی ترتیب بہتر ہوتی ہے۔ اس کے رجحان اور عمل کی پشت پناہی کے لئے بہتر قسم کی تحریکات موجود رہتی ہیں۔ غرض یہ کہ وہ اپنی زندگی اپنے بزرگوں کی بہ نسبت زیادہ اچھے طریقے پر بسر کرتا ہے خواہ آپ اس کو کسی بھی زاویہ نگاہ سے مشاہدہ کریں۔

دانشمند والدین اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں کہ بچوں میں سادگی اور صداقت بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہیں۔ آج اس ضرورت کو محسوس کیا جاتا ہے کہ اگرچہ بچوں کے لئے صحیح رہنمائی ضروری ہے تاہم ان کی تعلیم میں والدین کو باہمی پیار اور محبت کا خیال رکھنا چاہیئے۔ باہمی اتفاق سے ہی ان کو صحیح راستے پر ڈالا جا سکتا ہے۔ وہ جو کچھ جانتے ہیں اپنے بچہ کو سکھا سکتے ہیں اور ان کا بچہ بھی ان کو ایک بات سکھا سکتا ہے ——— وہ بات جس کو شاید وہ بھول چکے ہیں ——— "خوش کس طرح رہا جائے؟" ——— ظاہر ہے کہ والدین اور ان کے بچے کے درمیان لاثانی پیار اور محبت تو باہمی سمجھوتے سے ہی قایم رہ سکتا ہے۔ اگر آپ اپنے بچہ کو بہت طریق پر سمجھ سکتے ہیں تو وہ بھی آپ کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے یا کم از کم اس کی کوشش کر سکتا ہے۔ ماہرین نفسیات نفسیاتی طور سے تجزیہ کرنے والے ماہرین، یونیورسٹیاں اور محققین سب ہی اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ بچوں کو زیادہ سے زیادہ اچھے طور پر سمجھا جائے۔ آیئے اُن کے جدید ترین انکشافات پر ایک نظر ڈالیں:۔

سوال:۔ وہ اہم ترین شے کیا ہے جو آپ اپنے بچہ کو دے سکتے ہیں؟

جواب:۔ (نیویارک کے ادارۂ نفسیات کے ماہر ڈاکٹر رین کی زبانی) "انسانی شفقت کا کوئی چیز بھی نعم البدل ثابت نہیں ہو سکتی خواہ کھلونوں کی بڑی تعداد ہو یا مٹھائیوں کا ڈھیر، اگر کوئی چیز بچوں کے لئے موزوں ترین ہو سکتی ہے تو وہ ایک لفظ میں مضمر ہے ——— "محبت"

ماہرین اطفال اس امر پر متفق ہیں کہ والدین اور بچہ کے درمیان ایک بہت ہی قریبی تعلق قایم رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ بچہ کا دل مضبوط رہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ آیندہ زندگی میں بزدل نہ بنے تو اس کے ساتھ پیار محبت سے پیش آنے میں بخل نہ کیجئے اور یہ نہ سمجھئے کہ آپ کا پیار اس کو خراب کر دے گا۔

سوال:۔ کیا بچہ پر زیادہ توجہ صرف کرنے سے کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا؟

جواب:۔ کوئی خطرہ ایسا نہیں ہے جس کا ذکر کیا جا سکے بلکہ اگر اُن پر بالکل توجہ صرف نہ کی جائے تو کہیں زیادہ بڑا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ایک ماہر کا بیان ہے "ایک بچہ کو سوسائٹی کا ایک اچھا ممبر بنانے کے لئے وہ سب کچھ کرنا چاہیئے جو بچہ کو پسند ہے اور اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے

کہ جو کچھ بچے کو پسند ہے وہ سوسائٹی کو بھی پسند ہے یا نہیں "۔

بہ الفاظ دیگر بچہ کی خواہشات کی طرف پوری توجہ مبذول کیجئے اور اس کی بات کان دیکر سنیئے ۔ اس کے ساتھ اظہار ہمدردی کیجئے اس حد تک جہاں تک اس کی خواہشات قاعدہ پر ہیں، ان کو پورا کیجئے ۔ اس بات میں چوٹی کے ماہرین مثلاً ڈاکٹر مارگریٹ، ڈاکٹر ملٹن سین وغیرہ اس رائے سے متفق ہیں ۔ ان کا بیان ہے کہ قدم قدم پر اس خیال سے ڈرنا کہ کہیں بچہ بگڑ نہ جائے خود بچہ کی زندگی پر بہت برا اثر ڈالتا ہے ۔ اس کے جذبات پر بھی ایک خوف طاری ہو جاتا ہے جو اس کی دماغی صحت پر برا اثر ڈالتا ہے ۔

سوال:- کیا وقت آپ کے بچے کے لئے آپ کی بہ نسبت زیادہ تیزی سے گذرتا ہے ؟

جواب:- جی ہاں ۔ آپ کا بچہ ایک سال میں اس سے زیادہ زندگی گزار لیتا ہے جتنی آپ بیس سال میں بسر کرتے ہیں ۔ مشہور سائنسداں ۔۔ ڈاکٹر پی ۔ نوائے نے اس کا حیاتیاتی و ریاضیاتی ثبوت پیش کیا ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ چھوٹے بچے کے لئے ایک متوسط عمر کے آدمی کی بہ نسبت وقت دس گنا تیزی سے گذرتا ہے ڈاکٹر موصوف نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ بچہ دس سال اور سولہ سال کی عمر کے درمیانی حصہ میں زیادہ عمر بسر کر لیتا ہے ۔ بہ نسبت اس زندگی کے جو وہ مابعد کی پینتالیس سال کی مدت میں بسر کرتا ہے ۔ آپ اگر چند حقائق کو پیش نظر رکھیں تو آپ کو اپنے بچہ کے رجحان طبع کے سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے ۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ آپ کا بچہ مسرت و شادمانی، رنج و غم اور ناامیدی کو ایک دن میں اس سے بھی زیادہ محسوس کرتا ہے جتنا کہ آپ ان چیزوں کو ایک ہفتہ میں محسوس کرتے یعنی اگر آپ کو کسی تکلیف کا احساس ایک ہفتہ تک رہے تب بھی آپ کو اتنا رنج نہیں ہوگا جتنا ایک بچہ ایک دن میں محسوس کرتا ہے ۔ اگر بچہ کی حرکات و سکنات دیکھ کر آپ کو پیار آجاتا ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے ۔ اس کے سادہ افعال اس امر کے مقتضی ہیں کہ آپ اس کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئیں ۔ اگر آپ دس سال کے طویل عرصہ کے خیالات، جذبات اور احساسات کو ایک سال کی قلیل مدت میں محدود کر دیں اور ان سب کی آپ پر یکبارگی یورش ہو جائے تو آپ کیا محسوس کریں گے ؟ اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ بچہ پر کیا گذرتی ہے ذرا اپنے تئیں بچہ کی جگہ رکھ دیجئے ۔

سوال:- کیا ایک بچہ کی زندگی جسمانی اور حیاتیاتی طور پر زیادہ تیزی سے بسر ہوتی ہے ؟

جواب:- جی ہاں ۔ بچہ کے جسم میں ایک بالغ انسان کی بہ نسبت قوت کہیں زیادہ مقدار میں پیدا ہوتی ہے اور اسی طرح زیادہ مقدار میں صرف بھی ہوتی رہتی ہے ۔ اس کے عضوات کہیں زیادہ تیزی سے کام کرتے ہیں تجربات شاہد ہیں کہ جو زخم ایک لڑکے کے جسم میں تیس دن میں اچھا ہو جاتا ہے وہ ایک چالیس سالہ انسان کے جسم میں ۷۶ روز میں اچھا ہوتا ہے ۔

سوال:- کیا زیادہ نیند آپ کے بچہ کی صحت کے لئے مضر ہے ؟

جواب:- جی ۔ مشہور و معروف برٹش ماہر نفسیات جن کا خاص موضوع بچوں کی نفسیات ہے، جے ۔ اے ۔ کلسکی نے معلوم کیا ہے کہ اگر آپ کے بچے کی آنکھیں بہت زیادہ وقت تک بند رہتی ہیں تو آپ کے بچہ کی صحت کو نقصان پہنچنا عین ممکن ہے ۔ مثانہ کی کمزوری، نیند میں بڑبڑانا اور اسی قسم کے دیگر امراض کے لاحق ہونے کا خطرہ رہتا ہے ۔ ماہر مذکور کا بیان ہے کہ صبح جس وقت بچہ بیدار ہو جائے، اس کے بعد اس کو بستر میں پڑے رہنے کے لئے مجبور کرنا بہت برا ہے ۔ اگر وہ پھر نہیں سوتا ۔ تو بستر میں پڑے پڑے وہ پژمردہ اور سست ہو جاتا ہے ۔

ڈاکٹر کلسکی نے لکھا ہے کہ تین سال کا بچہ جس وقت بیدار ہوتا ہے اس کے جسم میں قوت اور بولنے چالنے کی خواہش بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے ۔ جب والدین اس کو بستر سے نکالنے میں تکلف کرتے ہیں اور اس کو خاموش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کا انجام ظاہر ہے ۔ بچہ ڈرپوک، کم گو اور سست ہو جاتا ہے ۔ اس کا جذبہ فنا ہو جاتا ہے اور دلیری رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے ۔

ڈاکٹر کلسکی نے اپنے مشاہدہ و مطالعہ سے یہ اخذ کیا ہے کہ ایک سال کے بچہ کے لئے بارہ گھنٹے کی نیند اور ڈھائی گھنٹے کی جھپکی ——— کافی ہوتی ہے ۔ تین سال کے بچہ کے لئے بارہ گھنٹے سو لینا کافی ہے ۔ دن کے وقت تھوڑی دیر کا آرام یا جھپکی اسی میں شامل ہے پانچ سالہ بچہ کے لئے گیارہ گھنٹے کافی ہیں اور گیارہ سال کے لڑکے کے لئے دس گھنٹے کی نیند کافی ہے ۔

سوال :۔ کیا یہ سچ ہے کہ چھوٹے بچے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو بولنا اپنے والدین سے سیکھتے ہیں ؟

جواب :۔ جی ہاں ۔ ماہرین کا بیان ہے کہ والدین ہی بچوں کے پہلے استاد ہوتے ہیں ۔ شروع میں پیار سے اُن کو ٹوٹے پھوٹے الفاظ سکھاتے ہیں ۔ پھر یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے ۔ اس موضوع کا مفصل طور سے مطالعہ کرنے کے بعد کولمبیا کے پروفیسر ایلن واکر (Prof. Allen Walker) نے چند اہم نتائج اخذ کئے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ بچے ٹوٹے پھوٹے الفاظ خود نہیں سیکھتے ہیں بلکہ ان کے والدین ان کو یہ سب کچھ سکھانے کے ذمہ دار ہیں ۔ پیار کی گفتگو ہمارے گھرانوں میں عام طور سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ہی ہوتی ہے ۔

ڈاکٹر واکر نے والدین کو نصیحت کی ہے " آپ اپنے بچے سے خواہ ایک لفظ بولیں ۔ اس کو نہایت احتیاط اور صاف طور سے بولئے اس کا تلفظ بالکل صحیح ادا کیجئے ۔ چھ سال کے بچے کو آپ اتنا اچھا تلفظ سکھا سکتے ہیں جیسا کسی اچھے مقرر کا "

سوال :۔ کیا بچوں کو فرمانبردار بنانے یا خاموش کرنے کے لئے کسی چیز سے ڈرانا خطرناک ہے ؟

جواب :۔ جی ہاں ۔ بچوں کے خوف کو تو ہر طرح سے کم کرنا چاہیئے کجا یہ کہ ان کو اور ڈرایا جائے ۔ جو والدین ایسا کرتے ہیں وہ اپنے بچوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے ہیں ۔ جسمانی طور سے بھی اور دماغی طور سے بھی ۔ عقلمند والدین وہ ہیں جو اپنے بچوں کو شروع ہی سے دلیری کا درس دیتے ہیں اور ان کے خوف کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اگر بچہ اپنے والدین یا دیگر بزرگوں کی موجودگی میں ہراساں رہتا ہے اور کھل کر اپنی حرکات و سکنات کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تو آیندہ زندگی میں بھی دلیر نہیں ثابت ہو سکتا ۔ اس کی تمام صلاحیتیں دب کر رہ جاتی ہیں ۔

طبی مشاہدات شاہد ہیں کہ بچہ کی جسمانی نشو و نما پر غیر معمولی خوف کا بہت برا اثر پڑتا ہے ۔ چھوٹے بچوں پر "کتے" "ہوا" اور اسی قسم کی خوفناک چیزوں کا بڑا نمایاں اثر پڑتا ہے ۔ اس کا جسمانی نظام ماؤف ہو جاتا ہے ۔ ایسا دیکھا گیا ہے کہ بچے خوف کی وجہ سے مر گئے ہیں ۔ مثلاً بعض بچے بلند آواز سے بڑا خوف کھاتے ہیں اور والدین اس کا کوئی علاج کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ الٹا ان کے کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں ۔ اس قسم کے ایک کیس کے متعلق ڈاکٹر جیمز ریوز نے رپورٹ کی ہے ۔ ایک سات سالہ بچی ایک موٹر کے ہارن سے اس قدر خوف زدہ ہوئی کہ تھوڑی دیر کے بعد مر گئی ۔ پہلے اس نے اپنے سر میں درد محسوس کیا ۔ اس کے بعد بیہوش ہو گئی ہسپتال بھیجا گیا اور وہاں پہنچ کر مر گئی ۔ اسی طرح ایک دو سالہ بچی کے مرنے کی رپورٹ آئی ہے ۔ جو ڈھول اور بگل کی صدا کی تاب نہ لا سکی ۔

خوف و ہراس سے مرنے کی وارداتیں اگرچہ بہت کم ہیں تاہم ان کو ڈرانا دھمکانا ان کے لئے مضر ثابت ہوتا ہے ۔ ان کی نشو و نما پر بہت برا اثر پڑتا ہے ۔ بعض بچے صرف اس وجہ سے دُبلے پتلے رہ جاتے ہیں کہ خوف کی وجہ سے ان کے اندرونی نظام میں ایک نقص پڑ جاتا ہے جو بعد میں ان کے نظام ہضم کو بھی متأثر کرتا ہے ۔ اسی کے ساتھ ساتھ بعض حالات میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ خوفزدہ بچہ بہت زیادہ فربہ ہو جاتا ہے ۔ صحت کے لحاظ سے یہ بھی کوئی قابل تعریف بات نہیں ہے ۔

ماہرین کا بیان ہے کہ بعض اوقات بچے ساتھ ساتھ کھیلتے وقت کسی ایک بچہ کو دق کرنا شروع کر دیتے ہیں ۔ بچہ کچھ دیر تک تو برداشت کرتا ہے لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کے ذہن میں احساس کمتری یا ایک قسم کی جھجک پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے ساتھیوں سے گریز کرنے لگتا ہے ۔ ہر وقت گھر میں گھسا رہنا پسند کرتا ہے اور کھیل کود سے حاصل ہونے والی خوشی کی اچھے اچھے کھانے کھا کر تلافی کرنا چاہتا ہے اس طرح وہ کھانے پینے میں افراط و تفریط سے کام لیتا ہے ۔ بدہضمی اس کا بدیہی نتیجہ ہے ۔ بعض اوقات ایسے بچے بہت زیادہ موٹے بھی ہو جاتے ہیں اور بعد میں اپنی اس فربہی میں کمی کرنا نہیں چاہتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی جسمانی قوت اور ظاہری حسن کا دارومدار اسی پر ہے ۔ مشہور ماہر ڈاکٹر برَوچ نے اپنے مشاہدہ کے بالنتیجہ یہ اخذ کیا ہے کہ بعض نوجوان فربہ لڑکیاں اپنی فربہی میں تھوڑی سی کمی بھی گوارا نہیں کرتی ہیں کیونکہ فربہی جنسی خواہشات کے خلاف ایک حفاظتی دیوار کا کام کرتی ہے ۔ جو لڑکیاں شادی شدہ گھریلو زندگی سے گھبراتی ہیں وہ فربہی میں ہی ایک لطف محسوس کرتی ہیں ۔

اگر آپ کی بچی اپنی ہم جماعت لڑکیوں کی طعن و تشنیع یا مذاق سے گھبراتی ہے اور آپ کے پاس آکر شکایت کرتی ہے ۔ تو معاملہ کو معمولی ڈانٹ ڈپٹ سے ہی ختم نہ کر دیجئے بلکہ اس کو ہمت دلایئے اور سمجھایئے کہ یہ تو معمولی باتیں ہیں ۔ اس طرح آپ خوف و ہراس کی بڑھتی ہوئی رَو کو شروع میں ہی

روک دیں گے ۔

سوال : ۔ کیا بچوں کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے کہ وہ اپنے خواب آپ سے بیان کریں ؟

جواب : ۔ جی ۔ ماہرین نفسیات کا بیان ہے کہ بچوں کے خواب بڑے آدمیوں کے خواب سے بالکل جدا ہوتے ہیں ۔ خواب اکثر اوقات انسان کی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں ۔ بچوں کا معاملہ مختلف ہے ۔ ان کے خواب سادہ، گویا اور قابل فہم و تجزیہ ہوتے ہیں ۔ اس سے ان کے اندرونی جذبات، امید، ناامیدی، خوف اور اسی قسم کے دیگر مسائل پر روشنی پڑتی ہے ۔ چنانچہ اگر آپ اپنے بچہ کو اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کی ہمت افزائی کیجیے تاکہ وہ اپنے خواب آپ سے بیان کرے ۔ اس طرح آپ کو اس کے دماغی اور جذباتی حالات کا علم اتنی اچھی طرح ہو سکے گا کہ کسی اور طرح ممکن نہ ہو سکے گا ۔

سوال : ۔ کیا زیادہ تر بچے پیدائشی طور پر ہی غیر معمولی ذہانت کے مالک ہوتے ہیں ؟

جواب : ۔ سائنسی مشاہدات سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سے بچے غیر معمولی طور پر ذہین پیدا ہوئے ہیں ۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سی ۔ جی ۔ سوٹس (DR. C G. Smits) معروف سائنسداں نے اپنے معمل میں اہم تجربات کئے ہیں ان کے بیان کے مطابق ایک بہت زیادہ ذہین اور معمولی انسان کے درمیان خاص فرق یہ ہے کہ اول الذکر اپنے تحت الشعور میں موجود رہنے والی چیزوں کو قبول کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے ۔ جبکہ ہم میں سے بہت سے افراد ایسے ہوتے ہیں جو ایسی چیزوں کی طرف بہت ہی کم توجہ مبذول کرتے ہیں ۔ ڈاکٹر سوٹس کے الفاظ ہیں "تخلیقی ذہانت رکھنے والا شخص اپنے اندرونی احساسات سے باخبر رہتا ہے ۔ بہت سے بچوں کو بھی یہ نعمت پیدائشی طور پر عطا ہوتی ہے لیکن ان کی ایک بڑی تعداد بڑا ہوتے ہوتے اس صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے " اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ ڈاکٹر سوٹس اور دیگر ماہرین کی متفقہ رائے ہے کہ اس نقصان کے لئے والدین اور ہمارا نظام تعلیم دونوں ہی ذمہ دار ہیں ۔ بچوں کو پڑھاتے وقت ہم ان کو آزادانہ طور پر سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں دیتے ہیں بلکہ وہ ہی مقرر کردہ حروف ان کے سامنے رکھ دیتے ہیں جو ان کے آباؤ اجداد کے زیر مطالعہ آئے تھے ۔ جو بچہ جتنی زیادہ تیزی سے اس فرسودہ راہ پر چل نکلتا ہے، اتنا ہی زیادہ ہوشیار اور ذہین کہلاتا ہے ۔ اگر بچہ اس راہ سے ہٹ کر اپنی ذہنی قوتوں کو بروئے کار لانا چاہتا ہے تو کوئی بھی اس کی ہمت افزائی نہیں کرتا بلکہ بعض اوقات وہ الٹا مطعون کیا جاتا ہے ۔ تجربات شاہد ہیں کہ ایسا بچہ جو چھ سال کی عمر میں غیر معمولی ذہانت اور تخلیقی قوتوں کا مالک ہوتا ہے، بارہ سال کی عمر کو پہنچ کر معمولی لڑکا رہ جاتا ہے اور آزادانہ طور پر سوچنے سمجھنے کی قوت سے محروم ! وہ بھی دوسرے بچوں کی طرح حساب اور سائنس کے پرانے فارمولے رٹنے کی کوشش کرتا ہے ۔

ہمیشہ یہ سمجھئے کہ آپ کا بچہ بے بہا ذہانت کا مالک ہے ۔ وہ آزادانہ طور پر سوچ سمجھ سکتا ہے اور اپنے لئے ایک لائحہ عمل تیار کر سکتا ہے ۔ اس کی ان صفات کو احتیاط کے ساتھ پرورش کیجیے جس طرح کسی قیمتی اور نازک پودے کو پروان چڑھایا جاتا ہے ۔ صرف اسی طرح آپ کا بچہ بڑا ہو کر ایک ممتاز انسان بن سکتا ہے ۔

(بقیہ صفحہ ۱۵ سے)

کہ اتنا بڑا لمبے ہنگم بکس لے جانے کی اجازت نہیں ۔ نیچے عبارت میں یہ مضمون کہ ہوائی سفر کے لئے موزوں و مناسب، ہلکے اور آرام دہ اور گنجائش اور خوشنما چمڑے کی بکس ہمارے کارخانے نے بنائے ہیں

۳ ۔ ایک بچوں کے لئے انگریزی مصنوعی دودھ کے اشتہار پر نظر پڑی، اوپر جلی عنوان "خوش نصیب ماں" مقابل میں ایک نوجوان خوبصورت عورت کی تصویر جو بہت ہی مطمئن اور بشاش چہرے کے ساتھ اپنے تندرست سوتے ہوئے بچے کے چہرے کو اپنے ہونٹوں سے لگائے ہوئے ہے [illegible] پہلا سال بہت ہی اہم ہوتا ہے ۔ اسے خوش، چاق، تندرست رکھنے کا بہترین نسخہ ہمارے [illegible]

بات چیت

فرد ——— فرد کی "بات چیت" سے لاشعوری طور پر متاثر ہوتا ہے
——— کچھ کہیئے، کچھ سنیئے ——— کہنے سننے سے
جی کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے ——— بات چیت کا یہی مقصد ہے
اور بس ——— دیکھئے - کیا ہم آپ کے لئے مفید ہیں؟ ———
ہے آپ کی خاطر ہمیں منظور بہر طور!

(ادارہ)

ایم - این - احمد - لاہور

"انسان کو محبت میں ناکامی کے بعد کیا کرنا چاہیئے"
(محبت سے میرا مطلب سچی محبت ہے ہوس کاری نہیں)

پہلے یہ دیکھئے کہ "عاشق نامراد" عموماً کیا کرتا ہے؟ وہ اپنے لئے اور دوسروں کے لئے "جینا" چھوڑ دیتا ہے صحرا نوردی کرنے لگتا ہے - پاگل ہو جاتا ہے - خودکشی کر لیتا ہے

پھر یہ دیکھئے کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ - محض زندگی کے لئے یا کسی دوسرے ایک فرد کے لئے جینا؟ ہرگز نہیں - اگر عشق میں ناکامی ہوئی - تو اپنی تخلیقی قوتوں کا گلا گھونٹ دینا اور زندگی سے فرار اختیار کرنا کسی طرح سے بھی "جائز" نہیں ہے - انسان کبھی اپنے لئے یا کسی ایک فرد کے لئے جی ہی نہیں سکتا - کیونکہ اس کی خوشیوں میں، اس کے غموں میں اور لوگ بھی شریک ہوتے ہیں - وہ صحرا نوردی اختیار کر کے، پاگل ہو کے، خودکشی کر کے دوسروں کی خوشیوں اور امیدوں کا خون کرتا ہے - کیا اسے یہ حق حاصل ہے؟

مگر آپ اس گنتی میں نہ پڑیئے - شادی کر لیجئے - آپ کی ہونے والی بیوی اس "ناکامی" کی تلخیوں کو بھلا دے گی - اور آپ کو حقیقی زندگی سے دوچار کر دے گی - یہ نہ کہیئے ———

مگر دنیا میں سستا کہاں ملتا ہوں
جو ٹھکانہ [illegible] کہاں

یہ "وبال" نہیں ہے - حقیقت ہے - آپ "حقیقت" سے فرار حاصل نہیں کر سکتے - اور یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ آپ کی سچی محبت "ہوس کاری" کہلانے لگے گی -

غیور بدایونی - حیدرآباد سندھ

(۱) جس ماحول میں اس کے لئے کوئی دلچسپی نہ ہو - تو وہ کیونکر خوش رہ سکتا ہے؟

اگر آپ کے بس میں ہو تو ماحول بدل دیجئے اور اگر کچھ ایسے ہی "فرائض" آپ کے "دامن" کو تھامے ہوئے ہیں - تو ماحول سے متاثر ہونے کے بجائے ماحول پر اثر انداز ہونے کی کوشش کیجئے - آپ میں اور ہر انسان میں ——— ایسی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں جو ان ہی کانٹوں کو پھولوں میں بدل سکتی ہیں - گھبرانے سے اور بھی طبیعت گھبرائے گی - اس سوال کو دل میں جگہ نہ دیجئے اور میرا تو خیال ہے کہ یہ سوال ہی آپ کی پریشانیوں کی وجہ ہے!

---

(۲) انسان کو کس حد تک زندہ دل رہنا چاہیئے اور کس حد تک سنجیدہ؟

"زندہ دلی" کا مفہوم غلط سمجھے ہیں آپ - زندہ دلی ہر حالت میں خوش رہنے کو کہتے ہیں - "لاابالی پن" کو نہیں کہتے - فی الحال آپ اسی شمارہ میں "زندگی زندہ دلی کا نام ہے" پڑھیئے -

(۳) زیادہ اور مہملات (مہمل باتیں) سوچنے والا انسان کیا کہلاتا ہے۔ اور کس طرح وہ اس مرض سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔

کہلاتا تو ہے "انسان" ہی۔ "مہمل باتیں" غیر مربوط خیالات کے ہجوم کو کہتے ہیں۔ جو اٹھتے، بیٹھتے، پڑھتے، لکھتے وقت "ایسے" انسانوں کے ذہن میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ ان میں کوئی تسلسل نہیں ہوتا اور جب ان ہی خیالات میں کوئی تسلسل پیدا ہوجاتا ہے تو کوئی سائنس کی ایجاد ہوتی ہے۔ کسی نغمے کی لَے بنتی ہے۔ کوئی شعر ہوتا ہے۔

آپ اپنے خیالات میں تسلسل پیدا کرنے کی کوشش کیجئے۔ اور یقین رکھئے کہ آپ ضرور کامیاب ہوجائیں گے۔ اور کسی دن قوم آپ پر فخر کرے گی۔ اور آپ ایسے ایسے کام کریں گے جو آج تک کوئی نہیں کر سکا شاید یہ "کام" آپ ہی کے منتظر ہیں۔

عبدالرحمٰن بلوچستانی۔ بکھوسرہ۔ سندھ

(۱) جب کسی شخص کا کوئی قریبی رشتہ دار مثلاً والدہ یا والد مر جائے۔ تو وہ رونے کیوں لگتا ہے۔ حالانکہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ ہر ایک چیز فانی ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کی آہ و فغاں سے مردہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ پھر اس رونے کا کیا مطلب؟

یہ سچ ہے کہ رونے سے مردہ واپس نہیں آتا۔ مگر ہر "پیاری چیز" کی جدائی سے جو دل پر ایک "بار" سا مسلط ہوجاتا ہے۔ وہ گریہ زاری سے کم ہوجاتا ہے۔ "رونا" اپنے "غموں" کا "اظہار" کرنا ہے۔ اور سننے والوں کو "راز دار" بنانا ہے۔ "رازداری" میں ایک تسکین سی محسوس ہوتی ہے یا نہیں؟

اگر کوئی سننے والا نہ بھی موجود ہو۔ تب بھی رونے سے یہ "بار" ہلکا ہوجاتا ہے۔

---

(۲) حیوانوں کو اپنی موت کا علم ہے یا نہیں؟

کیا انسانوں کو اپنی موت کا علم ہوتا ہے؟ انسان جو اشرف المخلوقات ہے! جب اسے علم نہیں ہوتا۔ تو حیوانوں کو کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہ خطرے کو "سونگھ" سکتے ہیں اور اپنے "بچاؤ" کے لئے بھاگ سکتے ہیں۔ مگر جب موت آتی ہے۔ تو فرار ممکن نہیں۔ جدھر بھاگ کر جاتے ہیں ادھر ہی موت آجاتی ہے۔

حیوانوں ہی کو کیا۔ انسان کو بھی اپنی موت کا علم نہیں ہونا چاہئے۔ جب ہی تو وہ زندگی کے آخری لمحے تک اور بھی زندہ رہنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

محمد یوسف کراچی

کیا وجہ ہے کہ میں اپنے ہر کام میں پوری کوشش کرتا ہوں مگر ناکام رہتا ہوں

کسی کام کی تکمیل کے لئے کوشش تو لازمی ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ کوشش صحیح قسم کی کوشش ہے یا نہیں۔

معلوم ہوتا ہے آپ صحیح قسم کی کوشش نہیں کرتے۔ ورنہ کامیاب ہونا لازمی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ "پوری" کوشش نہیں کرتے۔ اگر کرتے ہیں تو وہ اس کام کی تکمیل کے لئے ناکافی ہوتی ہے۔

اور کوشش کیجئے۔ کام کے ہر پہلو کو دیکھئے اور اپنی پوری قوتوں کے ساتھ اس کو انجام دینے میں لگ جائیے۔ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ مگر سب سے پہلے اپنے پر اعتماد کیجئے کہ آپ جو کام کرنا چاہیں گے ضرور کرلیں گے۔ اور اس یقین محکم کے ساتھ اس کو پورا کر ڈالئے۔ اور اس خیال کو دل سے نکال دیجئے کہ آپ کی کوششوں کے باوجود کام نہیں ہوگا۔

جی۔ ایم۔ پٹوا۔ سورت

اخباروں کے اول صفحے پر عریاں تصویر یا ایکٹرس کی تصویر سے بچوں کی نظر پڑنے پر ان کے دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے۔

اگر عریاں تصویر یا ایکٹریس کی تصویر بہت ہی "آرٹسٹک" ہو تو اس کو دیکھ کر بچوں کا "احساس حسن" بیدار ہوتا ہے۔ اور بہت شروع ہی سے ایک سچا اور صحیح ذوق ان کی رگ رگ میں رچ جاتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ الفاظ قلم اور تختی لے کر (بقیہ صفحہ ۳۷ پر ملاحظہ ہو)

بھوت

ڈی۔ پیرییٹ پرکنس

- ماضی
- مستقبل
- کامیابی
- ناکامی
- مایوسی ــــــــــ کے بھوت ۔ اور ان سے "جنگ"

اکثر سننے میں آتا رہتا ہے "جو کچھ گذرنا تھا گذر چکا" ـــــ "گذرے کا کیا غم" ـــــ "ماضی تو مردہ ہو چکا"۔ اور ہم خود بھی اپنے ایسے دوستوں کو جو اپنے کئے پر پچھتاتے ہیں۔ یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں "میاں ۔ ماضی کی قبریں کھودنے بیٹھے ہو۔ چھی چھی چھی ۔ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا ـــــ جانے دو"۔ مگر یہ کہہ کر ہم ان کو بھی دھوکہ دیتے ہیں۔ اور خود بھی فریب کھاتے ہیں ۔ ماضی گذرتا نہیں ۔ وہ ختم نہیں ہو جاتا ۔ وہ مجھ میں اور آپ میں موجود رہتا ہے۔ ہمارے ساتھ زندہ رہتا ہے ۔ ہمارا "حال" ہمارے ماضی ہی کی بنائی ہوئی شکل ہے ۔ اور ہمارا ماضی اسی حال کی کڑیوں سے ہمارے مستقبل تک پھیلا ہوا ہے ۔

فرض کیجئے کہ آپ کے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا۔ آپ کہیں چلے جا رہے ہیں کہ پیچھے سے موٹر آتی ہے اور آپ اس سے ٹکرا کر گر جاتے ہیں۔ آپ کو ہسپتال پہنچا دیا جاتا ہے۔ کئی ہفتہ کے بعد جب آپ دوبارہ ہسپتال سے نکلتے ہیں۔ تو آپ یقیناً بدلے ہوئے ہیں۔ آپ کی زندگی نئی راہوں پر گامزن ہو جاتی ہے ـــــــــ آپ حادثہ کی وجہ ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ یا ڈرائیور کی غلطی تھی یا خود آپ کی، غرضیکہ کوئی وجہ ضرور تھی۔ مگر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اس حادثہ کو بذات خود "وجہ" کیوں نہیں سمجھتے ۔ جس کی وجہ سے آپ کے بہت سے منصوبے ختم ہو گئے ۔ دوستوں سے ملنا رہ گیا اور بہت سے ضروری کاموں کو کرنے کا وقت گذر گیا ۔

تمام ماہرین نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ ہمارے تمام تجربے ہمارے شعور یا لاشعور میں محفوظ رہتے ہیں۔ ہر وہ خیال جو ہمارا ذہن قبول کرتا ہے۔ وہ ذہن کا ایک جزو اور اہم جزو بن کر محفوظ ہو جاتا ہے ۔ ہمارے بولے ہوئے الفاظ، پڑھی ہوئی کتابیں، سنے ہوئے گانے سب کے سب ہمارے ذہن میں محفوظ رہتے ہیں ۔ اور ہماری شخصیت کو ڈھالتے ہیں ۔ ایک ننھا سا تجربہ ــــــــــ محض ایک شخص سے ایک لمحہ کی ملاقات ـــــ ہم کو نیا بنا دیتا ہے ۔

تو جناب ۔ ماضی نہیں گذرتا۔ اس کو آپ نظر انداز کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے ۔ وہ ہمارے حال اور مستقبل دونوں پر اثر کرتا رہتا ہے اور سنئے ۔ بہت سے اشخاص اپنے مستقبل سے ڈرتے ہیں۔ اور بہت سے اپنے ماضی سے۔ مستقبل سے ڈرنے والے وہی لوگ ہیں جو اپنے ماضی سے خوفزدہ رہتے ہیں ۔ اور ایسے ہی لوگ ہیں جن کو ہمیں اکثر تسلی دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ بیچارے اپنی "دلی تمناؤں" کی زندگی اختیار نہ کر سکے اور اب زندگی کی حقیقتوں سے گریز کرتے ہیں ان کو دنیا میں کوئی زندگی، کوئی نغمہ، کوئی رقص نظر نہیں آتا ـــــ [illegible] ماضی کے یہ تاریک سائے، یہ خونخوار بھوت ۔

بہت سے لوگ اپنے مستقبل کے متعلق تو بڑے بڑے منصوبے باندھتے ہیں۔ مگر ماضی کی تاریکیوں کو دور کرنے اور ان سے جنگ کرنے

کے لئے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کی زندگی میں صرف مستقبل ہی نہیں ہے۔ حال بھی ہے۔ ماضی بھی۔ اور زندگی ان ہی تینوں سے مل کر عبارت ہاتی ہے۔ ماضی کی تاریکیوں کو دور کئے بغیر مستقبل کو درخشاں بنایا ہی کب جا سکتا ہے؟

آپ اپنے دوستوں کے ماضی میں خاص طور سے دلچسپی لیں۔ کیونکہ ان کی موجودہ پریشانیاں ان ہی "بیتے دنوں" سے شروع ہوتی ہیں۔ مجھ تو اپنے دوستوں کی چھوٹی چھوٹی یادوں، ان کے خوابوں، ان کے گناہوں اور ان سے وابستہ ان تمام لوگوں سے دلچسپی ہے۔ جو کبھی نہ کبھی ان پر اثر کرتے رہے ہیں۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ "بیتے دنوں" کی بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو دوبارہ یاد کرنے اور دہرانے سے شرمندگی سی محسوس ہوتی ہے۔ اپنے پر غصہ آتا ہے۔ اپنی بے بسی پر ترس آتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔ ان کو دہرانا ضروری ہے ———— ماضی بعید میں کسی وقت یا تو خود انہوں نے اپنے کو نقصان پہنچایا تھا یا دوسروں کو تکلیف دی تھی۔ بس اس وقت سے برابر یہ احساس رہتا ہے۔ کہ "میں نے غلطی کی" یا "میرے ساتھ ظلم ہوا" وہ اس بات کو بھلانا چاہتے ہیں۔ تحت شعور میں دبانا چاہتے ہیں۔ مگر صاحب! دن رات میں کسی نہ کسی وقت وہ خیال ایک مجسم سایہ بن کر ان کے پہلو میں کھڑا ہو جاتا ہے اور بڑے طنز سے پوچھتا ہے "آپ نے میرے متعلق کیا سوچا؟" —— وہ کبھی کبھی ایسا محسوس کرتے ہیں۔ کہ لوگ ہیچ ہیچ کر، انگلیاں اٹھا اٹھا کر انہیں "مجرم" قرار دے رہے ہیں۔ آخر پریشان ہو کر وہ اپنے کسی دوست کو "رازدار" بنا لیتے ہیں۔ اس سے بیان کرنے کے فوراً ہی بعد ایک تسکین سی محسوس ہوتی ہے۔ وہ دوست بڑے خلوص سے سنتا ہے اور اس "بھوت" سے مقابلہ کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ یہی مشورہ ان کا دل بھی کئی بار دے چکا ہوتا ہے۔ جہاں مقابلہ کرنے کی ہمت کی۔ وہاں وہ پریشان کن خیال ہواؤں میں تحلیل ہو گیا۔ غائب ہو گیا گم ہو گیا اور وہ اس سے آزاد ہو گئے۔

ماضی اور مستقبل کے بھوتوں کے علاوہ دو اور خطرناک قسم کے بھوت ہیں جو ہماری زندگی کو برباد کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہیں "کامیابی" اور "ناکامی" کے بھوت۔ ماضی بعید میں ایک کام آپ نے بہت خوبی سے انجام دیا۔ بہت کامیابی سے پورا کیا۔ بس۔ اب آپ ہیں اور اس کامیابی کا بھوت۔ جو بھلائے نہیں بھولتا۔ ہر وقت ذہن پر مسلط رہتا ہے۔ کسی اور کام میں اتنی "شاندار" کامیابی کی امید نہیں رہتی۔ نتیجہ میں آپ کوئی کام کرتے ہی نہیں کہ کیا فائدہ۔ اب وہ بات کہاں پیدا ہو سکے گی ———— اسی طرح ماضی بعید میں کوئی زبردست ناکامی ہوتی ہے۔ کسی نے بہت بری طرح شکست دی۔ امتحان میں، شادی میں، تجارت میں، انٹرویو میں۔ اور اب یہ ناکامی آپ کو ہر وقت کانٹوں کی طرح چبھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ زہر کی طرح رگ رگ میں سرایت کرتی جاتی ہے۔ سال پر سال گذرتے جاتے ہیں۔ آپ کوئی کام نہیں کرتے۔ ڈرتے ہیں کہ پھر ناکام نہ ہوں پھر کوئی "رقیب" نہ پیدا ہو جائے۔ رفتہ رفتہ ایک احساس کمتری کے ساتھ ساتھ آپ کی قوتیں زائل ہونے لگتی ہیں۔ امنگیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر وہ باقی بھی ہیں اور ان کو پورا کرنے کی صلاحیت بھی ہے اور اس صلاحیت کا احساس بھی ہے۔ پھر بھی ہر طرف یہی ناکامی کا بھوت چٹان کی طرح آپ کے راستہ میں حائل ہو جاتا ہے۔ آگے بڑھنے نہیں دیتا۔ ایک جگہ ٹھہرنے بھی نہیں دیتا۔ آپ پسپا ہوتے جاتے ہیں۔

ان ہی بھوتوں سے زندگی بہت المناک ہو جاتی ہے۔ **مگر یہ یاد رکھئے** کہ گذشتہ زندگی کی کامیابی کو تو مزید کامیاب بنانا چاہیئے اور ناکامی سے شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔ ہزاروں ناکامیوں کے بعد جو کامیابی ہوتی ہے وہ زیادہ درخشاں ہوتی ہے۔

بہت سے لوگ "مایوسی" کے بھوت کے شکار ہوتے ہیں۔ جیسے ایک سہانا خواب دیکھتے دیکھتے آنکھ کھلے اور خزاں نظر آئے —— وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ جتنی کامیاب زندگی ہوگی۔ اتنی ہی مایوسیاں بھی ہوں گی۔ غالب نے کہا نہیں ہے ؎

بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

یہ تمام کے تمام "بھوت" یا "سائے" یا "پریشان کن خیالات" ایسے ہیں۔ جن سے آپ اچھی طرح جم کر مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اور ان کے خونیں شکنجوں سے آزاد ہو سکتے ہیں۔

میں تو خاص کر یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ماضی گذرتا نہیں۔ وہ موجود رہتا ہے۔ وہ ہماری اور آپ کی ہستی کا ایک اہم جزو بن کر رہتا ہے اور یہ بالکل آپ کے ہاتھ میں ہے کہ آپ اُسے "بھوت" بنا کر اس سے ڈرتے رہیں اور زندگی برباد کر لیں۔ یا اس کو "خادم" بنا کر اپنی زندگی ....

(باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ ہو)

گھبرائیں کیا؟

ڈ جافرے اے۔ ڈی لی بی اے

"برینز ٹرسٹ" پر تقریر کرتے ہوئے حال ہی میں ایک مقرر نے کہا ہے: "مقصود یہ نہیں ہے کہ ہم مسائل کو حل کریں! مسائل کا مقصود یہ ہے کہ وہ ہمیں حل کریں" بالفاظ دیگر مسائل کا مقابلہ کرنے اور ان کے ساتھ گتھم گتھا ہونے ہی سے ہم اپنے بارے میں وہ علم حاصل کر لیتے ہیں جو صحیح طریقے سے ہمیں اپنی زندگیاں بسر کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ اگر ہم بظاہر ناقابل حل مسائل سے دوچار نہ ہوں گے تو پھر ہم یہ نہ سیکھ سکیں گے کہ مسائل کو کیسے حل کریں اور پھر ہم میں یہ صلاحیت پیدا نہ ہوگی کہ ہمارے تجربہ میں جو واقعات آئیں ہم ان کے متعلق کیا کارروائی کریں۔ اپنے مسائل کے بارے میں بار بار پریشان ہونے سے ہم دانشمندی میں ترقی کرتے ہیں اور اسے پختگی کی منزل تک پہنچاتے ہیں۔

کیا آپ کے دل میں کبھی یہ بات آئی ہے کہ پریشانی ایک اعتبار سے دوامی چیز ہے؟ باوجود نصیحتوں کے سیلاب کے جو ہمیں کتابوں، پمفلٹوں لیکچروں اور ذاتی ترقی کے نصاب سے حاصل ہوتی ہیں کہ ہم پریشانی پر کس کس طریقے سے قابو پا سکتے ہیں، اس امر کی تائید میں کوئی شہادت نہیں ملتی کہ پریشان ہونے والے لوگوں کی تعداد میں کمی آ رہی ہے۔

ایسے شخص کو نصیحت کرتے وقت جو پریشانی میں مبتلا ہو، یہ ضروری ہے کہ ناصح اپنے آپ کو اسی شخص کی جگہ پر رکھے اور پھر اپنے دل سے پوچھے کہ اگر خود اس پر وہ افتاد پڑتی تو وہ کیا کرتا۔ جب میں پریشانی میں مبتلا ہوتا ہوں تو کیا میں اس وقت اپنی ذہنی روش کو بدلنے کے لئے کوئی براہ راست اقدام کرتا ہوں؟ صحیح بات تو یہ ہے کہ میں اس سوال کا جواب ایماندارانہ اثبات میں نہیں دے سکتا۔ سادہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ اس لئے میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ کسی ایسے شخص کو جو پریشانی میں مبتلا ہے اپنی پریشانی پر قابو پانے کے بارے میں نصیحت کرنا حق بجانب نہیں ہے۔ اسے تو بالکل مختلف چیز کی ضرورت ہے۔

جب میں خود پریشان ہوتا ہوں تو اس وقت میں کیا کرتا ہوں؟ جواب بالکل سادہ ہے۔ میں پریشانی پیدا کرنے والی صورت حال کو اپنے پچھلے تجربات کی روشنی میں دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کوئی ایسی صورت حال نہیں ہے جس میں بنی نوع انسان ایک مرتبہ مبتلا ہونے کے بعد اپنے آپ کو اس مخمصہ سے نہ نکال سکیں بشرطیکہ وہ ایسا کرنا چاہیں۔

بدیہی طور پر لوگوں کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ انہیں اپنی پریشانی پر کس طرح سے قابو پانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ جب تک صورت حال غیر تغیر پذیر رہے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ زخم کو دھونے سے پہلے ہی اس پر دوا لگا دی جائے۔ مزید براں اگر وہ اپنی پریشانی پر قابو پانے کے قابل ہوتے تو وہ پریشان ہونا شروع نہ کر دیتے جب پریشانی پیدا کرنے والی صورت حال پہلی دفعہ وقوع میں آئی تھی۔ اگر وہ پریشانی پیدا کرنے والی صورت حال میں تبدیلی کرنے کی عقل سے محروم ہیں تو پھر پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ اپنی مشکلات میں خواہ مخواہ اضافہ کر لیں اس لئے کہ وہ اپنی ابتدائی پریشانی میں اس پر قابو پانے کی کوشش اور زحمت کا اور اضافہ کر لیں گے۔

یہ ہے وہ دانشمندانہ نہج جس سے "ہاؤ ٹو وِن فرینڈز اینڈ اِن فلوانس پیپل" کے مشہور عالم مصنف ڈیل کارنیگی نے اپنی نئی کتاب میں بحث کی ہے مصنف کا اعتقاد ہے کہ ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ پریشانی پیدا کرنے والی صورت حال کو حل کرے۔

لے "ہاؤ ٹو اسٹاپ وریئنگ اینڈ اسٹارٹ لونگ" مطبوعہ ورلڈز ورک، لمیٹڈ

ان قواعد کی پابندی کیجئے

ڈیل کارنیگی پریشانی پیدا کرنے والی مشکلات کو حل کرنے کے لئے دو دانشمندانہ قاعدے پیش کرتے ہیں:

(۱) "ماضی اور مستقبل پر لوہے کے دروازوں کا پردہ ڈال دو اور دن کی بھرپور روشنی والے کمروں میں زندگی بسر کرو۔" ایک فوجی ڈاکٹر نے ایک نوجوان سے جو جنگ سے اکتا جانے کی وجہ سے بے حد پریشان تھا، کہا: "اپنی زندگی کو ریت گھڑی سمجھو۔ ریت گھڑی کے بالائی حصہ میں جو ریت کے ہزارہا ذرات ہیں وہ سب کے سب آہستگی اور یکسانیت سے درمیانی تنگ گردن میں گذر جاتے ہیں مگر بیک وقت ریت کا ایک ذرہ گذرتا ہے۔ میں اور تم اور ہر ایک شخص سب اس ریت گھڑی کی طرح ہیں۔ جب ہم صبح کے وقت کام شروع کرتے ہیں، اس وقت ہزارہا کام ایسے نظر آتے ہیں جن کی نسبت ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں اسی دن انہیں پایۂ تکمیل کو پہنچا دینا چاہیئے، لیکن اگر ہم انھیں بیک وقت ایک چیز کے اصول کے مطابق انجام نہیں دیتے اور انھیں دن میں سے آہستگی اور یکسانیت سے گذرنے نہیں دیتے تو لازماً ہم اپنی جسمانی یا ذہنی عمارت کو ڈھالیں گے۔"

نوجوان نے لکھا کہ اس نصیحت نے نہ صرف مجھے جسمانی طور پر اور ذہنی طور پر دوران جنگ میں مدد دی بلکہ اس کے بعد سے کاروبار میں بھی اس نے مدد کی ہے ——— پریشان خاطر ہونے کی بجائے مجھے یاد ہے کہ ڈاکٹر نے مجھ سے کہا تھا: "بیک وقت ریت کا ایک ذرہ۔ بیک وقت ایک کام"۔ ان الفاظ کی ذہن میں بار بار تکرار کرنے سے میں اپنے کاموں کو اچھی طرح سے اور پریشانی اور بے ترتیبی کا احساس کئے بغیر جنہوں نے مجھے تقریباً تباہی و بربادی کے قریب لا ڈالا تھا، پایۂ تکمیل تک پہنچا لیتا ہوں"

ہم سب اس لمحہ ماضی اور مستقبل کی دو ابدیتوں کے سنگم پر کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم ان ابدیتوں میں سے کسی ایک میں لمحہ کے ایک ذرا سے حصہ کے لئے بھی زندہ نہیں رہ سکتے، لیکن ایسا کرنے کی کوشش کرنے سے ہم اپنے جسموں اور اپنے دماغوں دونوں کو شکستگی کے قریب لے آسکتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اسی لمحہ تک زندہ رہنے پر قناعت کرنی چاہیئے جس میں ہم امکانی طور پر زندہ رہ سکتے ہیں یعنی اب سے سو جانے کے وقت تک۔ رابرٹ لوئی اسٹیونسن نے لکھا تھا کہ "ہر ایک شخص اپنا بوجھ خواہ وہ کتنا ہی بھاری کیوں نہ، رات کے آنے تک برداشت کر سکتا ہے۔ ہر ایک شخص اپنا کام خواہ وہ کتنا ہی بھاری کیوں نہ ہو، دن کے دن میں انجام دے سکتا ہے۔ ہر ایک شخص خوش و خرمی سے، صبر سے، محبت آمیزی سے، خلوص دل سے سورج غروب ہونے تک زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اور یہی وہ سب کچھ ہے جس سے فی الحقیقت زندگی مراد لی جاتی ہے۔"

(۲) اپنے دل سے پوچھو: "وہ بدترین چیز کیا ہے جو امکانی طور پہ واقع ہو سکتی ہے؟" اسے قبول کرنے کے لئے تیار رہو اگر تمہارے پاس اور کوئی چارۂ کار نہ ہو۔ پھر اس کے بعد نہایت دلجمعی سے اس بدترین چیز کی اصلاح کرنے کی طرف راغب ہو جاؤ، واقعات کو لے کر انھیں تحلیل کر کے، فیصلہ پر پہنچ کر ـــ اور پھر اس پر عمل کر کے۔ گیلن لچ فیلڈ "ایشیا لائف انشورنس کمپنی" کا شنگھائی میں ملیجر تھا جب جاپانیوں نے ۱۹۴۲ میں شہر پر حملہ کیا۔ اسے حکم دیا گیا کہ کمپنی کا تمام زر نقد جاپانی امیر البحر کے حوالہ کر دیا جائے، لیکن مسٹر لچ فیلڈ نے ساڑھے سات لاکھ کی کفالتیں فہرست میں نہیں دکھائیں اس بنا پہ کہ وہ فرم کی ہانگ کانگ والی شاخ کی ملکیت تھیں۔ لیکن جاپانیوں نے یہ بات معلوم کر لی اور وہ طیش میں آگئے۔

مسٹر لچ فیلڈ نے مسٹر کارنیگی سے بیان کیا کہ "مجھے اتوار کی سہ پہر کو یہ خبر ملی۔ میں بیحد خوفزدہ ہو جاتا اگر میرے پاس اپنی مشکلات کو حل کرنے کا مخصوص طریقۂ کار نہ ہوتا۔ میں اپنے کمرہ میں گیا اور لکھا: مجھے یہ پریشانی کیوں لاحق ہو رہی ہے؟ مجھے خوف ہے کہ مجھے کل عذاب دینے والے کمرے میں نہ ڈال دیا جائے۔

"میں اس کے بارے میں کیا کر سکتا ہوں؟ (۱) میں جاپان امیر البحر کے سامنے اس کی تشریح پیش کر سکتا ہوں۔ ممکن ہے اس کا نتیجہ موت کی شکل میں نکلے۔ (۲) میں بچ نکلنے کی کوشش کر سکتا ہوں لیکن وہ اس ساری مدت میں میرا سراغ لگاتے رہیں گے۔ اغلباً مجھے گرفتار کر لیا جائے گا اور گولی سے اڑا دیا جائے گا۔ (۳) میں اپنے کمرہ میں ٹھہر سکتا ہوں اس طرح سے کہ دفتر کے نزدیک تک نہ

بھکٹوں۔ اگر میں ایسا کروں تو ممکن ہے کہ امیر البحر سپاہیوں کو میرے پاس بھیجے تاکہ وہ مجھے پکڑ لیں۔ (۴) میں حسب دستور پیر کو جا سکتا ہوں۔ ممکن ہے امیر البحر اس قدر مصروف ہو کہ اسے میرے کئے کی خبر تک نہ ہو۔ اگر وہ مجھے پریشان کرے گا تو پھر مجھے ساری حقیقت بیان کرنے کا موقع مل جائے گا۔

"جونہی میں نے تمام امکانات پر غور کر لیا اور فیصلہ کر لیا کہ میں چوتھے طریق کار پر عمل کروں گا، تو میرے دل کو ایک گونہ اطمینان ہو گیا۔ جب دوسرے دن میں دفتر گیا تو جاپانی امیر البحر نے صرف مجھے گھور کر دیکھا اور کچھ نہ کہا۔ چھ ہفتے بعد وہ لاکیو واپس چلا گیا اور میری پریشانیاں ختم ہو گئیں۔

"تجربہ نے مجھ پر بار بار یہ بات ثابت کر دی ہے کہ کسی نہ کسی فیصلہ پر پہنچ جانا اپنے اندر بیحد اہمیت رکھتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ میری پچاس فی صدی پریشانیاں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں جونہی میں ایک دفعہ کسی صاف واضح اور مخصوص فیصلہ پر پہنچ جاتا ہوں اور باقی چالیس فی صدی پریشانیاں بھی بالعموم غائب ہو جاتی ہیں جب میں اس فیصلہ پر عمل کرنا شروع کر دیتا ہوں۔ اس طرح سے میں اپنی پریشانیوں کا نوے فی صدی حصہ دماغ سے دور کر دیتا ہوں ہو بہو اس بات کو معرض تحریر میں لے آنے سے کہ مجھے کیا چیز پریشان کر رہی ہے اور میں اس کے بارے میں میں کیا کر سکتا ہوں، یہ فیصلہ کر لینے سے کہ مجھے کیا کرنا ہے اور پھر ساتھ ہی اس فیصلہ کو فی الفور عملی جامہ پہنا دینے سے۔"

پریشانی سے سبق

ہر شخص یہ امر تسلیم کرے گا کہ پریشانی ایک قیمتی سبق سکھاتی ہے جس کا سیکھ لینا ہر اس شخص کے لئے بہت اچھا ہے جو آئے دن پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک لحاظ سے پریشانی ایک شخص کے ارتقاء کے لئے ضروری چیز ہے۔ اگر ہم اسے دور کرنے کے قابل ہوتے تو ہم ایسا کر لیتے، لیکن چونکہ ہم ایسا نہیں کر سکے ہیں ہم لازماً اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہمیں اس کی ضرورت ہے تاکہ ہم زمانہ مستقبل میں ان غلطیوں کو دور کر نا سیکھ لیں جن کی وجہ سے وہ پریشانی ہم پر لاحق ہوئی ہے۔

بدقسمتی سے اشخاص ایسے ہیں جو اس سبق کو نہیں سیکھتے اور اسی لئے وہ ایک پریشانی سے نکل کر دوسری پریشان کن صورت حال سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ جو شخص تجربہ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے وہ پریشانی سے یہ سیکھتا ہے کہ کس طرح سے پریشانی پیدا کرنے والے مواقع سے اپنے آپ کو بچایا جائے۔

دنیا کی آج جو حالت ہے وہ ظاہر کرتی ہے کہ بدیہی طور پر یہ سبق وہ ہے جس کے سیکھنے کی بہت سے اشخاص کو ضرورت ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ جانتے ہوتے کہ پریشانی پیدا کرنے والی صورتوں سے کیسے بچیں تو وہ اب پریشانی میں مبتلا نہ ہوتے اور پھر "ہاؤ ٹو اسٹاپ وریئنگ اینڈ اسٹارٹ لونگ" جیسی کتابوں کی کوئی ضرورت نہ پڑتی۔ یہ سبق غالباً ایسا ہے جسے صرف پریشانی ہی سکھا سکتی ہے اور ہمیں چاہیئے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اسے سیکھ لیں اس اثنا میں ہماری پریشانی سے ہمیں ایک قیمتی سبق مل سکتا ہے جسے ہم غالباً کسی دوسرے طریقہ سے نہیں سیکھ سکتے سوائے پریشانی میں سے ہو کر گذرنے کے۔

اگر ڈیل کارنیگی کی بہترین کتاب اس سے زیادہ اور کچھ نہ کرے کہ وہ یہ یقین دلا دے کہ اس کے قارئین اپنی پریشانی سے یہ سبق سیکھے بغیر جو وہ نہیں سکھا سکتی ہے، پریشان نہ ہوا کریں تو اس صورت میں بھی وہ بہت بڑی خدمت انجام دے گی۔ اور زیر تبصرہ کتاب بہت سوں کے لئے اس سے زیادہ کام کرے گی۔

جو خطرہ بار بار پیش آتا ہے۔ انسان اس کا خوگر ہو جاتا ہے۔

بے نظیر چیز کی مثال اس کے وصف اور قیمت کو کم کر دیتی ہے۔

باکمال اسلاف کے اخلاف کو بھی ان کی امانت علم و فن کا حامل ہونا چاہیئے۔

٣

آپ بھی سوچئے

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ !
کچھ "تو" سمجھے خدا کرے کوئی !!

ابھی زیادہ عرصہ بھی نہیں گذرا اس بات کو ——— میں ایک طویل بیماری کے بعد اٹھا تھا۔ اور بہت "چڑچڑا" ہو رہا تھا۔ ہر ایک چیز بدلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے یہ میرا دیس نہیں۔ یہاں کی زمین میرے دیس کی زمین نہیں۔ یہاں کا آسمان میرے دیس کا آسمان نہیں۔ میں راستہ بھول کر ادھر آگیا ہوں۔ نہ یہاں کی بولی سمجھتا ہوں۔ نہ یہاں کے لوگوں کو پہچانتا ہوں ——— میں ایک درد، ایک کرب کے ساتھ اپنے کمرہ میں ٹہلا کرتا۔ اور جو کوئی بھی ملنے آتا۔ اس کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگتا۔ جیسے کیا تم مجھ سے ملنے آئے ہو۔ مجھ سے باتیں کر رہے ہو۔ ان کی مسکراہٹ عجیب پھیکی پھیکی لگتی۔ عجیب بے رنگ سی بے راگ سی ——— اسی دوران میں میرا ایک بہت "پیارا" دوست ملنے آیا۔ اور میرا دل بہلانے کی باتیں کرنے لگا ———

"دیکھو موسم کتنا حسین ہے۔ جیسے نغمے رقص کر رہے ہوں ———

"وہ دیکھو ——— وہ ادھر۔ نیلی موٹر، نیلا آسمان اور نیلے کپڑوں میں ملبوس دوشیزہ جیسے نیلا ہٹیں منجمد ہو کر موٹر، آسمان اور عورت بن گئی ہوں ———"

میں ایک عرصہ کے بعد اس کو دیکھ کر خوش تو ہوا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ اپنا "ہم مشرب" کوئی تو ہے یہاں۔ مگر اس کی یہ شاعرانہ باتیں مجھے عجیب "بے وقت" کی "راگنی" معلوم ہو رہی تھیں ——— موسم میں حسن کہاں سے آیا، نغمے کہاں سے آئے — وہ تو ایسا "ڈل"، "ایسا "بو" ہو رہا ہے کہ طبیعت اکتائی جاتی ہے۔ موٹر کا رنگ کتنا بھدا ہے۔ اور دوشیزہ کے کپڑوں کا رنگ بھی اچھا نہیں۔ بھلا نیلا رنگ بھی کوئی رنگ ہے ——— مجھے بے حس دیکھ کر کہنے لگا۔

"تم کو کیا ہو گیا ہے ؟"

مجھ کو اس کا یہ جملہ ابتک یاد ہے ——— مجھ کو کیا ہو گیا تھا ؟ — میں موسم کی رنگینیوں اور بہاروں کو کیوں نہیں قبول کر رہا تھا۔ مجھے اس دوشیزہ کے کپڑے، اور اس کی موٹر کیوں بھدی اور ناگوار سی معلوم ہو رہی تھی۔

آج میں اسی سرزمین پر ہوں۔ یہاں کی ہر چیز مجھے پیاری ہو گئی ہے ——— یہاں کے در و دیوار سے محبت ہو گئی ہے — جیسے یہ سب کے سب میری اپنی ہستی کے اہم جزو بن گئے ہیں۔ یہاں کا موسم بھی وہی ہے ——— وہی سمندری ہد صورت حسین موسم۔ وہی کڑکڑاتی دھوپ ——— مگر میں بدل گیا ہوں۔

اگر ہم کسی چیز میں حسن اور رنگ دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں تو کیا واقعی وہ چیز حسن اور رنگ سے محروم ہے — یا ہم میں کچھ کمی ہے۔
آپ کے دوست کو ایک شعر بہت پسند ہے ——— وہ اٹھتے، بیٹھتے، شیو کرتے اسے گنگنایا کرتے ہیں۔ آپ کو سناتے

ہیں۔ آپ کو وہ پسند نہیں آتا۔ کیا آپ اپنے دوست کی پسند کا مضحکہ اڑائیں گے ــــــــــ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ شعر آپ کے دوست کے کسی جذبہ کو چھیڑتا ہو۔ ــــــــــ تحت شعور میں چھپے ہوئے کسی خیال کو ــــــــــ۔ آپ میں وہ جذبہ نہ ہو۔ وہ خواہش نہ ہو ــــــــــ آپ اس کا مضحکہ اڑانے میں کہاں تک حق بجانب ہیں۔

ابھی دو تین ہفتے ہوئے۔ کراچی کے ایک سینما ہال میں "کلپنا" لگا ہوا تھا۔ میں اس کو پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ اور ہر بار ایک نیا حسن، ایک نیا نغمہ مجھ میں بیدار ہو جاتا ــــــــــ میں اپنے چند احباب کے ساتھ اسے دیکھنے گیا۔

ایک دوست انٹرول سے پہلے ہی باہر چلے گئے۔

ایک دوست نے انٹرول میں کہا ــــــــــ "کیا" لغو "تماشا ہے"

ایک ساتھی نے کہا ــــــــــ "مارولس ــــــــــ مغربی فلم بھی ایسی انوکھی پیش کش نہ پیش کر سکے" دونوں میں بحث ہونے لگی۔ نتیجہ میں ہم تینوں بقیہ تماشا نہ دیکھ سکے۔ اور باہر آ گئے ــــــــــ جب سے ان دونوں میں ایک عجیب سا کھنچاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ سڑک پر ملتے ہیں تو ایک سوچتا ہے ــــ کیا "بدمذاق" آدمی ہے ــــ دوسرا سوچتا ہے "ان حضرت کو کسی چیز میں حسن دکھائی ہی نہیں دیتا" ــــــــــ میں ایسے موقعوں پر اپنی رائے "محفوظ" رکھتا ہوں ـ اور دونوں کو اپنی اپنی جگہ "حق بجانب" سمجھتا ہوں۔

ایک اور مثال لیجئے۔

آپ کی بیوی نے ہلکے نیلے رنگ کی ساری لانے کی خواہش کی تھی۔

آپ اپنی پسند کی گلابی لے آئے۔

وہ آپ کو بہت چاہتی ہے۔ چپ ہو رہی۔ مگر وہ جب ساری باندھتی ہے۔ تو اسے وہ خوشی نہیں ہوتی۔ جو شاید نیلی ساری باندھنے سے ہوتی ــــــــــ آپ اس کے کمھلائے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر کہتے ہیں ــــــــــ اب ساری بھی لا دی۔ پھر بھی ــــــــــ

ساری تو آپ نے ضرور لا دی۔ مگر گلابی لائے۔ اپنی پسند کی۔ نیلی نہیں لائے۔ اس کی پسند کی۔

اگر اب وہ کچھ عرصہ کے بعد دوسری ساری لانے کو کہے ــــــــــ "نیلی لائیے گا" ــــــــــ تو آپ کیا کریں گے۔

نیلی لائیں گے یا گلابی ؟

آپ نے نیلی ہی لا دی۔

اب اگر وہ نیلی پہن کر خوش ہوتی ہے۔ تو آپ کو پسند نہیں آتی۔ اگر گلابی پہنتی ہے تو اسے پسند نہیں آتی۔

یہ زندگی کیونکر خوشگوار بن سکتی ہے۔

اس کی پسند کو اپنا کر

یا ــــــــــ

اپنی پسند پر "ضدی" کی حد تک مصر رہنے سے

یا ــــــــــ

نیلی اور گلابی میں ایک "صلح" ہو جانے سے

اور پھر ــــــــــ

آپکو گلابی ہی کیوں پسند ہے۔ اور آپ کی بیوی کو نیلی ہی کیوں پسند ہے ــــــــــ اسی طرح اگر بعض لوگ بہت قنوطی باتیں کرتے ہیں۔ ان کو زندگی میں کوئی حسن کوئی نغمہ، کوئی رقص نظر نہیں آتا ــــ تو ــــ اس کے معنی یہ تو نہیں کہ زندگی واقعی حسن، نغمہ اور رقص سے تہی دامن ہے۔

پھر آپ اسکی باتیں سن کر اپنی امیدوں کے خون کیوں کریں! آپ بھی سوچئے ــــ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے ●

اختر ہوشیارپوری

بازگشت

رنگ پھر جم گیا ہے محفل کا

پھر تجلی فگن ہے شمع کی لَو
ساغروں میں شراب ڈھلنے لگی
نکہتیں پھیلنے لگیں ہر سو
آرزو کے سنورتے ہیں گیسو
زندگی کروٹیں بدلنے لگی
پھوٹ نکلی ہے رنگ و کیف کی رَو

کارواں پھر رواں ہوا دل کا

رنگ پھر جم گیا ہے محفل کا

پھر کھنکنے لگے بھرے ساغر
کوئی لیکن یہ کہتا ہے مجھ سے
ایک بار اور بھی یہ بزمِ نشاط
اپنے ہی خون میں نہائے گی
پھر کبھی یاد ہی نہ آئے گی
یوں اُلٹ جائے گی وفا کی بساط
شیشۂ و جام ٹوٹ جائیں گے
اور غمِ زندگی سے گھبرا کر

لَوٹ آئیگا کارواں دِل کا

رفیق خاور

کہیں دُور

سورج سے بہت دُور — بہت دُور — بہت دُور
فطرت کے خلا میں
اس خاک کی گہرائی سے نیچے کہیں نیچے
گم تحت ثریٰ میں
اک خواب بنے گا!
بننے کو ہے
یہ بن بھی چکا ہے!!
مریخ کے برجوں کے کلس اوج ہوا میں
برجیس کے کھیتوں میں لہکتی ہوئی بالیں
زہرہ کے شبستاں سے لپکتی ہوئی تانیں
اک خواب بنے گا!
بننے کو ہے
یہ بن بھی چکا ہے!!

غزل

جمیل نقوی

وہ جانِ میکدہ بادہ بجام ہو تو سہی — حریفِ حسرتِ شربِ مدام ہو تو سہی
بہر نگاہ تقاضا بہر قدم لغزش — مرے قریب بایں اہتمام رہو تو سہی
سمٹ ہی آئیگی قدموں میں آپ منزلِ شوق — شریکِ راہ کوئی خوش خرام ہو تو سہی
مرے جنوں کی یہی حد آخری تو نہیں — شگفتِ گل کو عطا اذنِ عام ہو تو سہی
یہ ضد، یہ جبر، یہ خودداریاں بجا لیکن
شریکِ راہ کوئی خوش خرام ہو تو سہی

چٹان اور چشمہ

(عابدی جعفر)

ہر لمحہ تغیّر کی خواہش کسی ابدی سکون کی تلاش ہے۔ پہاڑوں کے پیچ و خم سے گذرتا ہوا دریا سمندر کی ہموار سطح میں جا ملتا ہے۔ جہاں نہ گھماؤ ہیں۔ نہ رکاوٹیں ہیں اور نہ راہوں کی تنگی ——— مثال کے لئے آپ کے سامنے پرکاش موجود ہے۔ جس کی زندگی میں یک لمحے سے دوسرے لمحہ تک تغیرات ہی تغیرات ہیں اور جو اپنے دوستوں میں "وعدہ شکن" کے نام سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ جو گذری ہوئی زندگی کا خیال تک نہیں لاتا۔ جو پچھلی رات کی جوان آغوش، بھینچے بھینچے بوسوں اور گنگناتے ہوئے قہقہوں کو یاد کرتے ہوئے اپنے ناشتہ کی چائے کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیتا۔ اور جو عورت کو کمہلائے ہوئے پھول کی طرح اپنے کوٹ کے کالر سے نوچ کر روند ڈالتا ہے۔

پرکاش کے لئے محبت کا کوئی ایک مرکز نہیں۔ محبت قایم رہتی ہے۔ عورت بدلتی رہتی ہے۔ کسی سے نفرت نہ کرو۔ یہی محبت ہے کسی عورت کو اپنے لئے مخصوص کرکے دوسروں کو اس عورت سے محروم نہ کرو۔ یہی محبت کی زینت ہے۔ تمہاری نفرت اسی لمحہ شروع ہو جاتی ہے۔ جب تم محبت کی طغیانیوں کو ایک کوزہ میں بند کر دینے کے خواہشمند ہو جاتے ہو ——— اسی لئے پرکاش کی کوئی بیوی نہیں۔ ——— بیوی وہ ہے جو چند گھنٹوں کے لئے تمہاری ہم نفس ہو جائے۔ بیوی کا خیال قایم رہتا ہے۔ ہم نفس کی شکلیں، کپڑے اور طبیعتیں بدلتی رہتی ہیں ——— پرکاش کی آغوش جب ایک کلی سے سجی ہوتی ہے۔ تو وہ باغ کی اور کلیوں کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا اور جب وہ دوسری کلی کو توڑنے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے۔ تو کمہلائی ہوئی کلی کی بے کسی اور بکھرتے ہوئے شیرازے کے خیال سے اپنی خواہش کا دم نہیں توڑتا۔ اسی لئے بیشتر عورتیں اس کی زندگی میں قہقہے لگاتے ہوئے آتی ہیں اور مسکراتے ہوئے رخصت ہو جاتی ہیں۔ کوئی عورت ایسی نہیں ملتی جو الوداع کہتے ہوئے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ آواز میں "نہ جاؤ۔ نہ جاؤ" کی پکار مچا دے۔ کیونکہ پرکاش اسی وقت عورت کا آرزومند ہوتا ہے جبکہ اس کی جیب گرم ہوتی ہے۔ اور اس وقت اکتاتا ہے جبکہ اس کا بجٹ عورت کا بار اٹھانے سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ تمہارا کرایہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس روپیہ نہیں۔ اور جھوٹوں بھی یہ نہیں کہتا کہ روپیہ مہیا کے بعد تم ہی کو کرائے پر لوں گا ——— جیسا کہ بازاری مٹھائی کھانے والوں کا معمول ہے ——— اور اگر کوئی عورت اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر پھر کسی دن اپنے جسم کو بیچنے کی آرزومند ہوتی ہے تو پرکاش نہایت سنجیدگی سے کہہ دیتا ہے کہ مجھ سے وعدہ لینے کی کوشش نہ کرو۔ کیونکہ میں وہی کرتا ہوں جس کا میں وعدہ نہیں کرتا۔

وہ مختلف عورتوں سے مختلف قسم کی باتیں کرتا ہے ——— کسی سے کہتا ہے ——— تمہارے کمرے کی روشنی نے جوانی کو چھپا رکھا ہے۔ اس کو بجھا دو۔ تاکہ کچھ دیر کے لئے یہاں جوانی ہی جوانی رہ جائے۔ ——— جوانی جو چھوئی جا سکتی ہے ——— اور کبھی کہتا ہے ——— حسن ——— میں حسن کا شیدا ہوں۔ حسن ہے تو جوانی بھی ہے ——— تم کتنی حسین ہو مجھے حسن کی پوجا کر لینے دو ——— مجھے اس کی پنہائیوں میں کھو جانے دو ——— کبھی گھنٹوں خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ اور کبھی خاموشی سے اکتا کر کچھ نہیں تو ہنسنے ہی لگتا ہے۔ ——— اپنی ہم نفس سے بھی ہنسنے کو کہتا ہے ——— اور ہنسو ——— اور، اور ——— اُف۔ میں کتنا تھکا ہوا ہوں ——— مجھے سکون چاہیئے۔ مجھے اپنی آغوش میں بھینچ لو ——— اور اس کی ہم نفس شرما کر ——— ایک ادائے تجاہل بن کر ——— خود اس کی آغوش میں بکھر جاتی ہے ——— سگرٹ

کے دھنویں گرد ابوں کی طرح فضا میں ناچنے لگتے ہیں اور پھر ہوا کی آغوش میں بکھر جاتی ہیں کبھی کبھی جوانی اور حسن کے آسمان پر شراب کے تارے بھی چمکتے ہیں اور اس وقت ایسا سا لگتا ہے کہ پرکاش نے اپنی ہم نفس کا آنچل ابد ابد تک کے لئے تھام لیا ہے ——— لیکن بہت جلد ہی الوداع کی گھڑیاں آجاتی ہیں اور وہ مسکراتے ہوئے یہ رشتہ اس آسانی سے توڑ دیتا ہے جیسے کوئی اپنے میلے کپڑے لانڈری میں دے آئے۔

جب کوئی دوسری عورت اس کی ہم نفس بن جاتی ہے تو پہلی عورت کا سایہ بھی اس کے ذہن میں نہیں ہوتا اور وہ دبی دبی آہوں بھنچے بھنچے ہونٹوں کے ساتھ کہتا ہے ———

"مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ میں زندگی کا آخری لمحہ بھی تمہاری آغوش میں گذاروں گا ———"

اس محبت کی شدت بڑھتی رہتی ہے اور اس کا اظہار بھی مختلف طریقوں سے ہوتا رہتا ہے ——— کبھی تحفے تحائف سے ——— کبھی رپوں سے ——— اور کبھی بوس و کنار سے ——— لیکن الوداع بہت ہی سرد ہوتی ہے

"آؤ گے نا ——— ؟"

"نہیں ———"

اور وہ عورت کچھ حیرانی سے، کچھ مسکراہٹوں سے اس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ جاتی ہے ———

پرکاش صرف عورت اور مرکز محبت ہی کے بارے میں تغیر پسند نہیں ہے۔ بلکہ ہر کام میں تبدیلیاں چاہتا ہے ——— آدمی چونکہ شکیل ہے۔ ایم۔ کام ہے۔ ہندی، اردو، انگریزی شارٹ ہینڈ جانتا ہے ——— اس لئے اسے اسی آسانی سے نوکری مل جاتی ہے جس آسانی سے وہ نوکری چھوڑ دیتا ہے۔ کسی بھی شہر میں دو تین مہینے سے زیادہ نہیں رہتا ——— ہوٹل میں رہتا ہے۔ ہوٹل کا کھانا کھاتا ہے۔ اس لئے نہ گھر کی ضرورت ہے۔ نہ نوکر چاکر کی۔ بیوی تو خیر ہر جگہ مل ہی جاتی ہے۔ جب نوکری سے تنگ آجاتا ہے تو کوئی چھوٹی موٹی تجارت کر لیتا ہے۔ جس زمانہ میں اس کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہوتا کہ کسی عورت کی ہم نفسی خرید سکے تو بارہ۔ ایک۔ ایک بجے رات تک سنسان سڑکوں کے چکر لگایا کرتا ہے۔ سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر آنے جانے والوں کو گھورا کرتا ہے ——— کافی ہاؤس میں بیٹھ کر سامنے لٹکی ہوئی اس تصویر کو گھورا کرتا ہے جس میں ایک عورت بڑی دلربائی کے ساتھ کافی کی چھوٹی سی بوری سر پر لادے ادھر آتی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے وہ تصویر سے نکل کر اس کے سامنے بیٹھ جائے گی۔ مسکرائے گی۔ خود کافی بنا کر پیالی اس کی طرف بڑھائے گی اور جب وہ اس کی مسکراہٹوں کو خریدنے کے لئے جیب میں مضبوطی سے مٹھیاں کسے گا تو وہ اٹھلاتی ہوئی تصویر میں واپس چلی جائے گی اور اس عورت سے شکایت کر دے گی جو اسی ناز سے جھکی ہوئی کافی کی پتیوں کو ایک ٹوکری میں رکھ رہی ہے ——— ایسے وقت میں اگر کسی ساری کی لطیف سرسراہٹیں کمرہ کی فضا میں اپنی آمد کا اعلان کر دیتیں تو پرکاش تصویروں سے نکل کر ساری کی سلوٹوں میں گم ہو جاتا

لیکن پرکاش ایسا کیوں ہے ——— کس نے اس کی زندگی میں تغیر کے یہ بگولے اڑائے۔ کس نے ——— کب ——— اور کیوں؟

پانچ سال بھی نہ گذرے ہوں گے اس حادثہ کو۔ جبکہ ہماری آپ کی طرح پرکاش نے کسی کو دیکھ کر دل میں آرزوؤں کے دیئے جلائے تھے ——— بہت سادگی اور معصومیت کے ساتھ کسی کو اپنی زندگی کے ہر موڑ کا ساتھی بنانے کی خواہش دل میں پیدا کر لی تھی ——— جیسا کہ اکثر ہم کرتے ہیں۔ لیکن ہم میں اور پرکاش میں صرف ایک فرق ہے ——— ہم دل میں کئی کئی مرتبہ مختلف لڑکیوں کے آرزو مند ہو جاتے ہیں۔ جیسے کسی لڑکی کو چاہنے لگنا اتنا ہی آسان ہے۔ جتنا کسی کپڑے کو پسند کر لینا اور چار گز خرید کر ذاتی بنا لینا ——— تو ہاں۔ اس حادثہ کو پانچ سال بھی پورے نہیں ہوئے جبکہ پرکاش نے کانتا کو دیکھ کر ایک عہد کر لیا تھا کہ وہ اسی کو جیون ساتھی بنائے گا۔

کانتا اس کی بہن آشا کی عزیز دوست اور بے حد چنچل اور شوخ اور زندہ دل تھی۔ جب کبھی وہ اس کے گھر آجاتی تھی۔ ایک ہلچل مچ جایا کرتی تھی۔ کچھ نہیں تو صرف گانے کی آوازیں ہی گونجا کرتی تھیں۔ چھنا چھن چھنا چھن گھونگرو ہی بجا کرتے تھے۔ [illegible] کے غبارے ہی پھوٹا

کرتے تھے ۔

جس دن پہلی مرتبہ کانتا اس کے سامنے آئی تو اس کو ایسا سا لگا کہ خود اس کا تخیل جیتا جاگتا اس کے سامنے چل پھر رہا ہے ۔ ہنس رہا ہے، رقص کر رہا ہے ۔ گا رہا ہے ۔ لیکن کانتا میں ایک یزدانی بے نیازی تھی ۔ جیسے وہ دنیا کی ہر چیز پر چھا جانے کا احساس رکھتی ہو ۔ اور جب کانتا چلی جاتی تھی تو وہ چونک سا پڑتا تھا ۔ جیسے کسی رنگین خواب کی تعبیر بہت ہی تلخ اور چبھتی سی ثابت ہو ۔

آشا کو بھی اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ پرکاش کانتا سے بہت قریب ہونے کی کوشش کر رہا ہے ۔ حالانکہ وہ کبھی بھی کانتا سے باتیں کرتا نہ پایا گیا تھا ۔ مگر نظریں پہچان ہی لیتی ہیں ۔ اور اس احساس کے بعد ہی آشا نے شاید کانتا کا روز روز کا آنا روک دیا ۔ نہ معلوم کیوں ۔ اور جب ایک دن پرکاش نے ایک لمبی تمہید کے بعد کانتا کو پوچھا تو آشا سنجیدگی سے بولی

"آج کل اس کا پتی آیا ہوا ہے ———"

پتی ——— ایک چٹان ——— ایک دیوار ——— ایک سونے چاندی کی زنجیر ——— اور اس کی آرزو اس طرح کچل گئی جیسے کوئی کسی نوزائیدہ بچے کا گلا گھونٹ دے ——— اور وہ صرف مسکرا کر رہ گیا ۔ صرف مرجھا سا گیا ۔ جیسے وہ کسی بلند عمارت کی آخری منزل تک چڑھتے چڑھتے ایک دم سے محسوس کرے کہ زینہ ٹوٹ رہا ہے اور وہ بہت نیچے تاریکیوں میں گرتا چلا جا رہا ہے ۔

اور اس کے کچھ دن بعد جب اس نے کانتا کو دیکھا تو وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ کیا وہ واقعی اس دنیا کی عورت ہے ۔ جہاں ہر چیز کو محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ چھوا جا سکتا ہے ۔ بنایا مٹایا جا سکتا ہے ۔ اس کو تو ایسا سا لگا کہ اگر اس نے کانتا کو چھونے کی کوشش کی تو اس کے ہاتھ خلاؤں میں بھٹک کر رہ جائیں گے ۔ اور کچھ کہنے کی کوشش کی تو اس کی آواز صدا بصحرا ہو جائے گی ——— اور ایک دن ——— کتنا عجیب دن تھا وہ ——— جبکہ وہ کرسی پر بیٹھا ٹیگور کی ایک نظم پڑھ رہا تھا ۔ تو کانتا اس کے سامنے آگئی ——— بالکل ہی قریب ———

اور اس نے کانتا کو دیکھ کر اپنی آنکھیں بالکل بند کر لیں اور بچکچا سا گیا ۔

"کیوں پرکاش بھیا ۔ کیا ہو گیا تمہاری آنکھوں میں ؟"

اور اس نے اپنے کان بند کر لئے ۔ کانتا اس تغیر پر بہت زوروں سے ہنس دی اور وہ چیخ سا اٹھا

"میں بیمار ہوں ——— دن کی روشنی میں بھی خواب دیکھتا ہوں ——— تم ایک خواب ہو ——— میرے تصورات کا عکس ہو ———"

اور کانتا ——— ہنستی، جیتی جاگتی کانتا گھبرا گئی اور فوراً کمرے سے بھاگ گئی جیسے ایک بگولا اٹھا تھا رقص کرتا ہوا ——— اور پھر ——— فضا کی پہنائیوں میں گم ہو گیا ۔ کھو گیا ۔ غائب ہو گیا ۔

اور وہ سچ مچ بیمار پڑ گیا

"میں پاگل ہوں — میری آنکھیں ہمیشہ خوابوں کی متزلزل دنیا میں گھوما کرتی ہیں ۔ اور سائے ایک غبار کی طرح میرے چاروں طرف بنائے رہتے ہیں ———" وہ بڑبڑایا کرتا ——— "تم بھی خواب ہو آشا ——— تم بھی اب ہواؤں میں گھل جاؤ گی اور بگولوں میں پکارتی پھرو گی ——— بھیا ——— بھیا ——— اور جب میں تم کو دیکھوں گا تو تم ہر طرف ہو گی ——— یہاں ——— وہاں ——— اِدھر ——— اُدھر ۔

ڈاکٹروں نے کہا کہ وہ کسی دھچکے سے پاگل ہو گیا ہے ——— اور سننے والوں نے بھی اسے پاگل قرار دیدیا لیکن آشا جانتی تھی کہ وہ پاگل نہیں ہے ۔ صرف ایک ریت کی چیز کی آرزو کر بیٹھا ہے جو اس کو کبھی نہ ملے گی ——— اور اس کے منتشر خیالات کو ایک مرکز پر لانے کے لئے وہ اپنی ایک اور عزیز دوست کو گھر لائی جو شادی کے دوسرے ہی دن بیوہ ہو گئی تھی لیکن جس کو اپنے بیوہ ہونے کا احساس نہ تھا اور آشا سے گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی کہ وہ ایسے مرد سے شادی کرنا چاہتی ہے جو خود اس کی زندگی کے بعد بھی زندہ رہے اور جو اس آسانی سے تنہا نہ چھوڑ دے ۔

پرکاش نے اپنے چاروں طرف ایک نئی جوانی اور نئے حسن کو دیکھا اس کو اور بھی یقین ہو گیا کہ پچھلی باتیں واقعی میں خواب تھیں اور وہ پھر اس دنیا میں آ گیا ہے۔ جس کی ہر چیز کو وہ چھو سکتا ہے۔ محسوس کر سکتا ہے۔ اسی لئے اس نے ایک دن پربھا کے ہاتھوں کو چھو کے دیکھا ——— نرم نرم ——— میدے کی لوئی کی طرح نرم اور خوشگوار ——— اس نے پربھا سے باتیں کیں اور محسوس کیا کہ وہ واقعی ایک ایسے ساز کا نغمہ سن رہا ہے۔ جس کے تاروں کی جنبش بھی صاف نظر آتی ہے ——— وہ ہلتے تار ——— وہ نکلی آواز ——— وہ رکے تار ——— وہ بند ہوئی آواز — — لیکن پربھا کی حقیقت صرف ایک ایسے کھمبے کی تھی جو چوراہے پر لگا ہو اور جس پر مختلف سمت جانے والی راہوں کے نام لکھے ہوں۔ اسی لئے جب آشا نے اس سے خواہش کی کہ وہ پربھا سے شادی کرے تو وہ انکار کے بہانے ڈھونڈنے لگا ——— مثلاً وہ دولتمند گھرانے کی بہو رہ چکی ہے۔ اور یہ رشتہ کسی طرح بھی مناسب نہیں ——— یا ——— وہ بیوہ ہے اور مذہباً نہیں تو رسماً بیوہ کی دوبارہ شادی ٹھیک نہیں ——— کیونکہ یہ صدیوں سے بغاوت ہوگی اور کون فرد یک و تنہا صدیوں کی طاقت سے منحرف ہو کر ٹکرا سکتا ہے ——— اور اس نے مسلسل بیوہ کی دوبارہ شادی کے خلاف کچھ دینا شروع کر دئے۔ اور پربھا کو بری طرح احساس کرا دیا کہ وہ ہمیشہ کے لئے بیوہ ہو چکی ہے ——— — آشا نے مخالفت کی۔ کانتا نے بھی پربھا سے شادی کرنے پر زور دیا۔ مگر وہ راضی نہ ہوا۔ وہ کانتا سے کہہ دیا کرتا کہ میں تم سے باتیں کرتے ہوئے ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میری آواز کسی بھی کان میں نہ جائے گی۔ بلکہ خلاؤں میں بھٹکا کرے گی گرد ابوں کی طرح۔ جن کا کام صرف چکر لگانا ہے ——— چکر ——— چکر ——— ابدی اور ازلی چکر۔

لیکن پھر ——— کچھ ہی عرصہ کے بعد کانتا بھی بیوہ ہو گئی ——— بیاہ کر جانے سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی اور وہ اسی دن سے اسے بھی اسی دنیا کی عورت کہنے لگا اور اس کی آواز کو حقیقی اور نغمہ ریز سی محسوس کرنے لگا۔ لیکن ایک سال گذرنے پر بھی آشا نے یہ نہ کہا کہ وہ کانتا سے شادی کر کے اس کی آیندہ کی زندگی کو سنوار دے اور اس کو تباہیوں، ناامیدیوں اور تاریکیوں سے بچالے۔ کیونکہ کانتا بھی پربھا کی طرح بیوہ تھی اور ایک فرد کے لئے صدیوں کی طاقتوں سے ٹکرانا اور منحرف ہونا ممکن نہ تھا۔

لیکن پرکاش کے لئے کانتا پربھا نہ تھی ——— وہ کانتا تھی۔ اس کے تصورات کی جیتی جاگتی تصویر ——— اور ایک دن ——— — اسی دن وہ بنیاد رکھی گئی تھی جس کی بلند عمارت اب پرکاش میں موجود ہے ——— اس کا تغیر اور زندگی کے نئے موڑ ——— وہ گھر میں اکیلا تھا۔ آشا پربھا کی نئی سسرال گئی ہوئی تھی کہ کانتا آ گئی ———

"کانتا ——— تم"

کانتا گھبرا گئی — کیونکہ وہ اب کانتا نہ تھی۔ ایک بیوہ تھی۔

"اچھا ہوا کہ تم آ گئیں۔ میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں"

"کیا بات پرکاش بھیا ———"

"تم جانتی ہو کانتا کہ ہمارے سماج میں بہت سی باتیں ہیں جو انسانیت کو کھلتی اور اس کے ضمیر پر تھوکتی ہیں ——— مثلاً ودھواکی دوبارہ شادی کی مخالفت ——— ایک وقت تو وہ تھا جبکہ عورت کو زندہ مرد کی لاش کے ساتھ جلا دیا جاتا تھا ——— ——— موت و زندگی تو بھگوان کے ہاتھوں میں ہے۔ اس میں ہمارا تمہارا کیا قصور ——— میں سوچتا ہوں کہ ہم کو اپنی آیندہ نسلوں کے لئے بغاوت کرنا ہی ہوگی اور اس فرسودہ نظام کو بدلنا ہی ہوگا ———"

"لیکن پرکاش بھیا ———"

"سنو تو کانتا ——— اب اپنے ہی کو لے لو۔ سترہ برس کی عمر اور یہ پہاڑ جیسا بوجھ ——— میں ——— میں بغاوت ضرور کروں گا ——— اور عمل بھی کروں گا۔ جب مرد دوبارہ شادی کر لیتے ہیں تو تم ———"

لیکن کانتا نے آگے کچھ نہ سنا۔ وہ رونے لگی۔ صرف آنسوؤں آنسو بہنے لگے۔ آہیں ——— (باقی صفحہ ۳۰۳ پر ملاحظہ ہو)

مسلا پیما

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے

بھائی میرے ۔ ۔ ۔ کب تک لکھو گے حال دل ۔۔ غالب کے نقش قدم پر چلو اور "انھیں" جاکر انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں "اپنا" دکھا آؤ لیکن یہ سمجھ کر جانا کہ تم "پریشانی خاطر" کہتے جا رہے ہو کب کے رہنا ۔ دوبارہ نہ پلٹے آنا ۔ ابروؤں پر بل پڑیں گے "وفا" کے نام پر لعنت ملامت کی جائے گی اور بہت ممکن ہے کہ وہ تم ہی سے پوچھیں کہ تم کون ہو ۔۔۔ کیا تم بتا سکو گے؟

عجیب بات پوچھی ہے آپ نے ۔۔۔ "انسان تو مخلوق ہے حقیر کیڑا ذلیل خاندان" کی بات تو آپ ہی جانیں ۔ میں تو انسان کی "پرستش" کرتا ہوں ۔ خدا تک "رسائی" کے لئے اسی انسان کو سمجھنا ضروری ہے ۔ آپ انسان کے مستقبل سے محروم کیوں ہوتی ہیں؟

جی ہاں ۔ کرشن چندر کا ہیرو ۔۔۔ پاس گیا ۔ تو بعد میں جو کچھ بھی ہوا لیکن کم از کم بت بنے تو نہ گیا ۔ مگر آپ کا ہیرو تو زندہ احساسات بیتی جاگتی زندگیوں کے پاس جاتا ہے ۔ تو بت ہوتی جاتی ہیں ۔ وہ زندگیاں وہ احساسات، وہ قوتیں ۔۔۔ در بت بنتے گئے ۔۔۔ میرا مشورہ اور کیا کہوں ۔۔۔ آذر بھی بنئے، ابن آذر بھی ۔ بت بناتے رہیئے ۔ بت توڑتے رہیئے ۔۔۔ بس اس کا خیال رکھئے کہ آپ کے بت ایسے نہ ہوں ۔ بیجا سا کر پھر سو جائیں!

مجھے آپ کے "غصہ" پر "پیار" آرہا ہے ۔۔۔ قبلہ ۔ وہ شعر میں نے بھی سنا ہے ۔ جی ہاں ۔ وہی ساحر کا ۔۔ ابھی حیات کا ماحول خوش گوار نہیں ۔۔۔ والا مگر اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے ماحول کی تاریکیاں تو دور ہونے سے رہیں ۔ صرف "غصہ" سے کام نہیں چلے گا، کچھ کیجئے ۔ کچھ کہئے ۔ دوسروں کی پیش قدمی کے منتظر کیوں ہیں ۔

میرے پسندیدہ اشعار

ٹوٹ گئے سیال نگینے، پھوٹ بہے رخساروں پر — دیکھو میرا ساتھ نہ دینا بات ہے یہ رسوائی کی (قتیل شفائی)

نفس کے لوچ میں رم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے — حیات، ساغر سم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے (ساحر لدھیانوی)

عالم یاس میں کیا چیز ہے اک ساغر ہے — دشت ظلمات میں جس طرح خضر کی قندیل (مجاز)

فضا سے ساز کر کے بند کرتے ہو زباں میری — خدا چاہے تو خود کہتے پھرو گے داستاں میری (جگر)

(آنسہ ثریا - بی - اے - بھوپال)

(بقیہ از صفحہ ۲۴ بات چیت)

"حسن"، "احساس حسن" اور "حسن پسندی" پر اسباق دینے بیٹھ جائیں۔

آپ نے شاید سوال اس لئے کیا تھا کہ میں "اخلاقیات" کو چھیڑ دونگا۔ یہ یاد رکھئے کہ "عریاں تصویریں" بچوں کو نہیں۔ "جوانوں" کے جنسی جذبے کو ابھارتی ہیں اور ان کو "مائل گناہ" کرتی ہیں۔ بچے تو بڑھ رہے ہیں ان کے لئے ابھی "اخلاق" کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جب ان کو سمجھ آنے لگے گی تب وہ خود ان پابندیوں کو محسوس کریں گے لیکن ابھی سے ان پابندیوں پر سے ان کے "احساس حسن" کو قربان نہ کیجئے اگر آپ منع کریں گے تو ان کا تجسس بڑھے گا۔ وہ کھلم کھلا نہیں تو چھپ کر ان کو دیکھیں گے۔ اس طرح ان میں صحیح ذوق نہ پیدا ہو سکے گا۔

(بقیہ از صفحہ ۲۶)

کو زیادہ کامیاب بنانے کے سامان مہیا کرائیں۔ تقدیر کے ہاتھوں کا کھلونا نہ بنئے۔ ماضی کا مقابلہ کیجئے۔ زیادہ ہمت، زیادہ خود اعتمادی سے اس کی گرفت سے آزاد ہوئیے۔ اگر آپ یہ محسوس کریں کہ آپ اکیلے ہیں۔ تو خدا سے مدد مانگئے۔

آئیے۔ ہم عہد کریں کہ ہم اپنے ان دوستوں سے جو ان ہی بھوتوں کا شکار ہیں۔ یہ کہہ کر ان کو جھوٹی تسلی نہ دیں گے کہ

"پریشان کیوں ہوتے ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا"

بلکہ یہ کہہ کر ان کی ہمت افزائی کریں کہ

"پریشان نہ ہو۔ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ تم سب کچھ کر سکتے ہو"

اور یہ ہرگز نہ کہیں کہ ماضی گذر گیا۔ اس میں جو تلخیاں بھری پڑی ہیں۔ وہ کبھی دور نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ خود بھی یہ یقین رکھیں اور اپنے دوستوں کو یقین دلائیں کہ ہر زخم پر مرہم رکھا جا سکتا ہے۔ ہر ناکامی کو کامیابی میں بدلا جا سکتا ہے۔ اپنے پر اعتماد رکھئے۔ اس اعتماد ہی میں زندگی کے نغمے پوشیدہ ہیں ٭

(ترجمہ عابد جعفری)

(بقیہ از صفحہ ۳۶ چٹان اور چشمہ)

سسکیاں اور انکار ——————

"پرکاش بھیا — میں دوبارہ شادی نہ کروں گی —— میں دودھوا ہوں ——" اور پرکاش نے اپنے چاروں طرف انکار دیکھا — مہیب و تاریک انکار —— خونیں قہقہے —— اور اسی دن سے آج کے دن تک سے دنیا کی ہر چیز کو ٹھکرا دینا پڑتا ہے —— خواہ وہ ملازمت ہو —— خواہ عورت —— اور جس کی زندگی کے سلسلے میں تغیر ہی تغیر ہیں —— تغیر اور تغیر کی خواہش جو لاشعوری طور سے کسی ابدی سکون کی تلاش ہے —— کسی کائنات کی — جو اس کو ٹھکرا نہ دے بلکہ اس کو اپنی پرسکون آغوش میں پناہ دیدے اور جو خود اس کے ٹھکرا لینے پر مسکرا نہ دے بلکہ رو دے اور اس کا دامن تھام لے ——————

ایک طویل مسلسل افسانہ

فرار

(حسن محمود عروج)

گذشتہ سے پیوستہ

تیسرے درجہ کا غریب مدرس اپنی آگ میں جلتا رہا اور چمپئی رنگ کی دوشیزہ رائل پرچھوٹی سی سیاہ موٹر میں سیر کرتی رہی ————

وہ سوچتا کرما نے اس سے بے وفائی کی ہے اسے ایسا معلوم ہونے لگتا کہ چمپئی رنگ ایک بھنور ہے ورا سی جلد نہ جانے کس رنگ کی ہے لیکن جذبات پرستش ہر خیال و شک کو اپنے آغوش میں چھپا لیتے اور وہ اپنی کرما کی طرف کوئی برائی نہ منسوب کر پاتا اُسے کرما اسی طرح مقدس معلوم ہونے لگتی اور وہ اپنی قسمت کو کوسنے دینے لگتا

اس کا دماغی توازن جیسے بگڑا جا رہا تھا کسی کام میں جی نہ لگتا۔ مدرسہ میں دن بھر سوچتا رہتا جب کچھ لکھنے بیٹھتا تو سر میں درد ہونے لگتا اور ایسا معلوم ہونے لگتا کہ جیسے دماغ کی ساری رگیں سمٹ کر رہ گئی ہیں اور قوت فکر سلب ہوگئی ہے۔ ہر طرف چمپئی رنگ کی دوشیزہ کھڑی مسکراتی نظر آتی اور ایسا محسوس ہوتا کہ ساری دنیا اس کی محبت کی ہنسی اڑا رہی ہے وہ بے تابی سے اٹھ کر ٹہلنے لگتا ———— اور جب غم کسی طرح دل میں نہ سما سکا تو اس نے انتہائی کرب و اذیت کے عالم میں کرما کو ایک خط اس کے اسکول کے پتہ پر لکھا جس میں اس نے وہ ساری تلخی صرف کر دی جو اس کے جسم کی ہر ہر رگ میں لبس بنی ہوئی تیر رہی تھی۔

اُسے صرف ایک سطر کا جواب ملا:

"تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو اور میری مجبوریوں سے لاعلم ہو"

"کیا واقعی کرما مجبور ہے؟" وہ اپنے دل سے سوال کرتا لیکن اسے کوئی جواب نہ ملتا تھا اسے کرما کے حسین وعدے یاد آتے وہ ان الفاظ کو دہرانے لگتا جنھیں سن کر جھوم اٹھا تھا:-

"عورت صرف ایک مرتبہ محبت کرتی ہے عورت کا صرف ایک ہی شوہر ہوتا ہے ————

———— میری شادی ہو چکی ہے اور تمہیں میرے سب کچھ ہو"

وہ سوچتا کیا یہ لفظ بغیر کسی قلبی جذبے کے کوئی زبان ادا کر سکتی ہے ———— لیکن پھر کرما کو دل سے بھلانے کے لئے اس کی برائیاں ڈھونڈھنے لگتا اور سوچتا کہ کرما اس سے بے وفائی کر رہی ہے ورنہ یہ سکوت کیوں؟ لیکن اپنے اس خیال پر قایم نہ رہ سکتا اور سوچنے لگتا کہ واقعی کرما مجبور ہے۔ مشرق کی ہر لڑکی مجبور ہوتی ہے یہاں لڑکی شوہر نہیں پسند کرتی بلکہ ماں باپ داماد پسند کرتے ہیں۔

پھر خیال آتا کہ برما کی لڑکیاں اتنی مجبور تو نہیں۔

اس طرح وہ ایک عجیب خلجان میں مبتلا ہو گیا کبھی اسے چمپئی رنگ کی زیرباد ی لڑکی سے نفرت ہو جاتی جو اس سے بے وفائی کر رہی تھی کبھی اپنی معصوم کرما پر رحم آنے لگتا جو ماں کی مرضی پر قربان ہو رہی تھی وہ جذبات کے گرم انگاروں پر تڑپتا رہا۔ اور چمپئی رنگ کی دوشیزہ کی شادی کے دن قریب آتے رہے ایک دن وہ کرما کے محبت بھرے خطوط پڑھ رہا تھا کہ خیال آیا کرما کے یہ محبت بھرے خطوط شموجی سیٹھ کو پہنچا دے لیکن اس کی شرافت اسے گوارا نہ کر سکی کہ کسی لڑکی کو اس طرح نقصان پہنچائے اور پھر اپنی کرما کو ———— ؟ اپنے اس خیال پر خود ہی شرمندہ ہو کر رہ گیا اور کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح اپنی محبت کو بھول جائے لیکن دل پر اسے بس نہیں تھا اور ہر وہ کوشش جو وہ محبت کو بھولنے کے لئے کرتا تھا محبت کو اور زیادہ استوار اور اسے بے قرار کرتی جا رہی تھی ہر طرف چمپئی رنگ بکھرا ہوا نظر آتا اور ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ جیسے محبت کے علاوہ اس دنیا میں کچھ

باقی نہیں ہر چیز جیسے محبت میں تبدیل ہو کر رہ گئی تھی - اسکول جاتا لیکن بچوں کو پڑھانے کے بجائے اپنے تصورات میں چمپئی رخساروں کو جاتے محبت کی تلاش کرتا رہتا - اخبار کے لئے کچھ لکھنے بیٹھتا تو محسوس کرتا کہ عنوان محبت کے سوا کوئی موضوع لکھنے کے لئے موجود نہیں اور سارے سیاسی و معاشی مسائل ایک لفظ محبت میں قید ہو کر رہ گئے ہیں - پھر جھنجلا کر قلم میز پر پٹک دیتا اور دریائے رنگون کے ساحلی چمن میں جا بیٹھتا اس کی قوت ارادی ننھی سی ہو کر رہ گئی اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگتا کہ اس کا دل اتنا کمزور کیوں ہو گیا ہے پھر آنکھوں میں آنسو آجاتے دل جیسے آنسوؤں میں تحلیل ہو کر رہ گیا تھا - وہ بغیر کسی تحریک کے آنکھوں کی راہ بہنے لگتا تھا وہ اپنے آنسو رومال، آستینوں اور دامن میں جذب کر لیتا اور جب اس کی بے کسی بہت بڑھ گئی تو ایک دن ساحل کے ایک چینی رستوران میں غرق ہو گیا -

---

حکومت تخلیۂ رنگون کے منصوبوں پر غور و خوض کر رہی تھی عام و خاص ہر طبقہ رنگون سے بھاگنے کی سوچ رہا تھا لیکن چینی رستوران شہر میں پھیلتے جا رہے تھے اور ان کی آبادی بڑھتی جا رہی تھی - حسین نوخیز چینی لڑکیاں نجانے کہاں سے اُبل پڑی تھیں اور امریکی فوجیوں، گورے ملنگوں - برمیوں اور ہندوستانیوں کے گرم گرم تنگ آغوش میں سمائی جا رہی تھیں اسے ان رستورانوں اور چینی دوشیزاؤں سے بڑی نفرت تھی جنہوں نے اب پچھلے کئی مہینوں سے رنگون میں ہر طرف شہوت بکھیر دی تھی اور صاف ستھری سڑکوں پر شراب برسا رہی تھیں ——— یہ چینی گڑیاں ہر دل میں سما گئی تھیں اور ہر حلق میں آسامی بیر کے تیز و تند گھونٹ انڈیلے دے رہی تھیں ——— صاف ستھرا سنہرے پگوڈوں والا رنگون بدمعاشیٹ لاٹری کی اسٹالوں، چینی اسٹالوں اور چینی رستورانوں سے ایک گھناؤنا قحبہ خانہ بن کر رہ گیا تھا - جب کسی رستوران پر اس کی نظر پڑتی تو اس کا جی چاہتا کہ ان میں آگ لگا دے کہ رنگون پھر ایک مرتبہ پاک ہو جائے لیکن اس کی نفرت و غصہ کے باوجود جاپانی مظالم سے بھاگ بھاگ کر چینی پناہ گزیں آتے رہے - بھوکی چینی لڑکیاں پہنچتی رہیں نئے نئے رستوران کھلتے رہے شہوتیں پھیلتی رہیں شرابیں برستی رہیں اور چینی بھوکوں کو روٹیاں ملتی رہیں -

رنگون جٹی پر سپاہیوں سے بھرے ہوئے جہاز آتے، سپاہی لفٹ رائٹ کرتے ہوئے سڑکوں پر سے گذرتے اور غائب ہو جاتے پھر چینی رستورانوں میں چینی دوشیزاؤں کے آغوش میں نظر آتے ——— - — - خاکی پوش سپاہی اور سرخ و سفید دوشیزائیں دونوں اپنے دامن آسامی بیر میں ڈبو دیتے پھر اپنے اپنے تر بہ تر دامن ایک دوسرے پر نچوڑ دیتے ——— - ——— وہ سوچتا کسبیاں اور فوجی دونوں آپس میں بڑا گہرا رشتہ رکھتے ہیں دونوں ایک ساتھ جنم لیتے ہیں دونوں بھوک کی پیداوار ہیں جب بھوک پھیلتی ہے تو مرد فوجوں میں بھرتی ہو جاتے ہیں اور عورتیں چینی رستورانوں میں پہنچ جاتی ہیں -

بھوک ——— ؟

لیکن بھوک کون پھیلاتا ہے ؟

خدا ؟ ——— حکومت ؟

حکومت ؟ ——— خدا ؟

یا شاید دونوں ؟

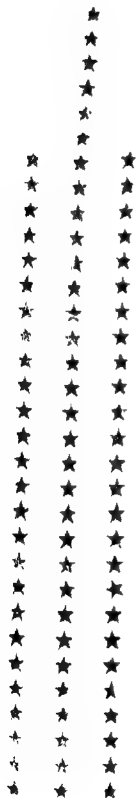
اور جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تو اس کے دل میں ایک ایسا جذبۂ نفرت پیدا ہو جاتا کہ وہ ہر چیز سے نفرت کرنے لگتا اسے اپنے آپ سے نفرت ہو جاتی چمپئی رنگ کی برمی مسلم دوشیزہ کرما سے نفرت ہونے لگتی اور وہ ہر اس چیز سے متنفر ہو جاتا جو اس کے اردگرد موجود ہوتی تھی ——— وہ سوچتا اگر یہ نظام حیات نہیں تبدیل ہو سکتا تو انسانوں کو ختم ہو جانا چاہیئے - انسانیت بھوک کے نام پر کب تک بکتی رہے گی ؟ ——— اور اس وقت اسے اپنا چھوٹا سا گاؤں یاد آجاتا جہاں آسامی بیر نہیں تھی سیاسی خم و پیچ نہیں تھے دفاجفا کی چپقلش نہیں تھی ——— سیدھے سادے دیہاتی تھے جو مقدمات لڑتے تھے کھیتیاں کرتے تھے فاقے بھگتتے اور مطمئن رہتے تھے - ہر طرف خلوص و پیار کے پھول کھلے ہوئے تھے

(باقی آئندہ)

منشی عبدالغفار سے سلطانی پریس کراچی سے چھپوا کر دفتر سائیکولوجی ۱۴۰ م - میریٹ روڈ سے شائع کیا


ایکسپریس بلاک
آپکی تجارت کی کامیابی ترقی یافتہ
اصولِ اشتہار پر منحصر ہے جس کیلئے
ایکسپریس بلاک کی خدمات حاصل کیجیے
جو بلاک سازی تجارتی مصوری و فوٹوگرافی
کیلئے مشرق کا سب سے بڑا اور پرانا کارخانہ ہے
ایکسپریس بلاک، ہارون بلڈنگ
ساؤتھ نیپیئر روڈ کراچی

PSYCHOLOGY







جنسیت عمل تو عابلن

ادارہ کی پُرخلوص دُعاؤں کے ساتھ

آپ کے اپنے

سائیکولوجی کا پہلا

سالگرہ نمبر

دوسری منزل کی طرف ہمارا پہلا قدم

ادارۂ تحریر

شاہدہ سلطانہ ایم اے

بیگم رئیس جہاں نیر انصاری

عابدی جعفر بی اے

مدیر عمومی

اعظم اللہ خاں [illegible]

معتمد عمومی

علاء الدین خالد

ہمارے ایجنٹ

پاکستان

- احمد پور شرقیہ — فردوس بک ڈپو
- اوکاڑہ — فردوسی پبلشرز
- ایبٹ آباد — اسکیوزٹ بک ڈپو
- " — اسٹوڈنٹ بک اسٹال
- بنوں — گل نصیب صاحب نیوز ایجنٹ اخبار
- پشاور — اخبار گھر [illegible]
- حیدرآباد سندھ — محمد ایوب صاحب [illegible]
- ڈیرہ غازی خاں — راجہ برادرز
- راولپنڈی — قومی کتب خانہ
- اسلامی کتب خانہ
- مکتبہ اخوت
- رحیم یار خان — چودھری امانت علی
- سکھر — گیانی بک ڈپو
- سید بک ڈپو
- سیالکوٹ — ملک اینڈ سنز
- " — [illegible]
- گوجرانوالہ — ورائٹی بک ڈپو
- کوئٹہ — علیگڑھ بک اسٹال
- " — نیو بک اسٹال
- گھوٹکی — انور نیوز ایجنسی
- لاہور — اردو مرکز گنپت روڈ
- " — مکتبہ جدید چوک انارکلی
- " — فیروز سنز [illegible]
- " — مسز فتح محمد چھاؤنی
- مردان — پاکستان بک ڈپو

- ملتان — نیا مکتبہ حسین آگاہی
- " — عزیز بک اسٹال حرم گیٹ
- " — پاک پرچہ بک ڈپو [illegible] بازار
- [illegible] — اللہ رکھا صاحب ایجنٹ اخبارات
- " — ایشیا بک ڈپو
- ہزارہ — اخبار گھر ہری پور

مشرقی پاکستان

- [illegible] — حافظ محمود صاحب اسلامیہ لائبریری
- چٹاگانگ — اورینٹ اسٹور ۔ جوبلی روڈ
- ڈھاکہ — مشتاق بک اسٹال [illegible]
- [illegible] — سید مسعود احمد صاحب
- سید پور — پاکستان نیوز ایجنسی

رنگون

منشی فتح محمد [illegible] ایجنٹ اخبارات
۲۹ ۔ [illegible] اسٹریٹ

بحرین (پرشین گلف)

عبدالہادی صاحب ہاشمی ۔ منامہ ۔ بحرین

ہندوستان

- آسنسول — علمی خزانہ
- اعظم گڑھ — انور خاں صاحب ۔ کوٹ
- امراوتی — رحمان نیوز ایجنسی
- [illegible] — شاہ محمد صاحب
- ایلچ پور — ادبی مرکز
- برہان پور — محبوب الحق ارمان
- بمبئی — محمدی کتب خانہ متصل [illegible]
- بنگلور — آزاد نیوز ایجنسی چاندنی چوک
- " — عبدالتواب صاحب انجمن ترقی اردو
- بھوپال — قدرت اللہ صدیقی ۔ نور محل
- بھاگلپور — حافظ محمد حمایت اسلام صاحب
- پٹنہ — ناولٹی کمپنی مراد پور بانکی پور
- پونا — شیخ چاند یوسف وٹھل پیٹ
- [illegible] نگر — امیر امر سنگھ
- حیدرآباد دکن — محمد عباس علی خاں
- جالندھر — اجنتا پبلشرز
- دہلی — منشی عبدالحمید صاحب گلی [illegible]
- رائے چور — ماڈرن نیوز ایجنسی
- سورت — ادب بک ڈپو
- شولاپور — ایم ۔ ڈی ۔ شیخ
- کلکتہ — عثمانیہ بک ڈپو ۔ لوئر چت پور
- کھنڈوا — حنفی نیوز پیپر ایجنٹ
- گیا — محمد حبیب صاحب
- لکھنؤ — کتابی دنیا ۔ نظیر آباد
- " — سید ناصر علی صاحب رسی بٹان

(بقیہ ہندوستان)

- لدھیانہ — [illegible]
- " — اسٹیشنری مارٹ گھنٹہ گھر
- مدراس — [illegible] نیوز ایجنسی والاجاہ اسٹریٹ
- مظفر پور — محمد کریم بخش صاحب کمپنی باغ
- ناگپور — [illegible] نیوز ایجنسی [illegible] منڈی [illegible]

ترتیب

پہلی نظر

تاریکیاں —— نفسیاتی روشنی میں

کس سے لڑ رہے ہیں —— زندگی سے؟

منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

تربیت نفسی

تاریکی سے روشنی کی طرف

آپ اور میں —— نفسیاتی آئینے میں

اپنا چہرہ اپنے آئینے میں

ایک بندر —— جو گرتا تھا

احساس برتری

صنعتی نفسیات اور اس کے مسائل

بڑے انسان بنے بیٹھے ہیں

سانچے

قوت مقابلہ کی اہمیت

زندگی یاد رکھے

جنسیات

ہمارے جنسی رجحانات

عورتوں کی جنسی تشنگی

شادی کا جنسی پہلو

آج کے بچے —— کل کے معمار

بچوں کی تربیت

بچوں کی حسین خواہشات

نسیاں نواز ——

بھلاؤں کیسے ؟

آپ کی کہانی

دماغ کی دو

دانستہ

فرار

آگ اور لگاؤ کے بغیر

تبصرے

تلخ ترش اور شیریں نغمے

جوش ملیح آبادی

احمد ندیم قاسمی

ضیا جعفری

اختر ہوشیارپوری

فراق گورکھپوری

ادا بدایونی

اختر انصاری اکبرآبادی

پہلی نظر

ہم میں سے بہت کم لوگ اپنی سالگرہ مناتے ہیں۔ رسماً بھی یہ عام نہیں ہے اور پھر ـــــ ہم کو زندگی میں کون سی خوشیاں نصیب ہوتی ہیں کہ ہم اپنی پیدائش کے دن اپنے عزیز اور احباب کو جمع کر کے کہیں ـــــ لوگو! رفیقو! ساتھیو! میں فلاں فلاں سن میں آج کی تاریخ کو پیدا ہوا تھا ـــــ پیدا ہوئی تھی ـــــ اور ہمارے عزیز اور دوست ہم کو ہماری بڑھتی ہوئی عمر کو مبارکباد دیں اور آگے آنے والے سالوں کے لئے اپنی بہترین دعاؤں کی پیشکش پیش کریں۔

زندگی کی تکلیفوں کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم دو ہیں ـــــ ایک ہمارے اقتصادی مسائل ہماری غربت، ہماری بیماری ـــــ اور دوسری ـــــ زندگی سے مایوسی ـــــ یہ دونوں وجوہ ہماری اپنی جدوجہد سے دور ہو جاتی ہیں بشرطیکہ کوشش جبکہ بظاہر ہر طرف بھیڑیوں کے خونی دانت ہیں۔

نیز ـــ فی الحال سماج کے ایسے لوگوں کو کچھ دیر کے لیے درگزر کریں اور ایسے لوگوں کو لیجئے جو اپنی سالگرہ مناتے ہیں ـــ جی ہاں ہماری مراد اس طبقہ سے ہے جو خوش حال ہے اور جو زندگی کی تھوڑی بہت نعمتوں کو پا سکا ہے۔

ایسے لوگوں میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک وہ جو سال بھر اپنی سالگرہ کے دن کا بے چینی سے انتظار کیا کرتے ہیں یا دوسروں کی سالگرہ کے منتظر رہتے ہیں ـــــ ان کے لیے سالگرہ کا دن تحفوں تحفوں ۔۔۔ کا دن ہوتا ہے ـــ دوسرے وہ لوگ جو اپنی گذرتی ہوئی عمر کے خیال ہی سے کانپتے ہیں اور ہر سالگرہ کے دن سوچتے ہیں کہ ـــــ افسوس ہم اپنی زندگی کی منزلوں میں سے ایک اور کو پیچھے چھوڑ آئے اور موت کے قریب تر پہنچ گئے۔ حالانکہ جو جو عمر گذرتی جاتی ہے وہ اپنے ماحول سے اپنی دنیا کے زمین و آسمان سے زیادہ مانوس ہوتے جاتے ہیں ان کو یہ معلوم ہوتا کہ کہاں زندگی کے دل کی دھڑکن ہے اور کہاں کہاں موت کی دستک۔

ہم جس وقت بیٹھے ہوئے آپ کے لیے یہ سطریں لکھ رہے ہیں ہمارے سامنے خود اپنی "سالگرہ" نہیں ہے بلکہ "سائیکولوجی" کی پہلی سالگرہ ہے۔ ہماری آپ کی باہم رفاقت کی پہلی سالگرہ ہے۔ اس ایک سال میں ـــــ ہم کو امید ہے ـــــ کہ آپ ہم سے ہماری خدمت سے ہماری آواز سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔ آپ ہم کو پہچانتے ہیں ـــــ حالانکہ ہم جس جذبہ کے ساتھ آپ کے سامنے آنا چاہتے ہیں اس کو ابھی تک اپنے اصلی رنگوں میں نہیں پیش کر سکے ہیں ہماری خواہش ضرور ہے اور ارادے بھی آہنی دیواروں کی طرح مستحکم ہیں اور ہم پُرامید نگاہوں سے مستقبل کی طرف دیکھ رہے ہیں جبکہ ہم کو خود اپنی خدمت پر ناز ہوگا اور ہم سربلند کر کے آپ اور اپنے سے کہہ سکیں گے ـــــ ہمارا مقصد پورا ہو رہا ہے، انسان انسان کو پہچانتا جا رہا ہے، انسان اپنے کو جانتا جا رہا ہے ـــــ آپ اپنے کو سمجھنے لگے ہیں۔

اب بھی ـــــ ہزاروں مجبوریوں کے باوجود جس خدمت کی ایک جھلک ہم آپ کو ایک سال میں دکھا سکے ہیں اس کے اعتراف میں وہ خطوط ہیں جو ہم کو روزانہ درجنوں کی تعداد ملتے ہیں ـــــ ممکن ہے کہ آپ ہی میں سے کسی نے یہ الفاظ لکھے ہوں ـــــ "سائیکولوجی جس تندہی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے وہ قابل ستائش ہے وہ اپنے پیغام میں وہ نغمگی چھپائے ہے جو ہم کو تاریکیوں سے کھینچ کر روشنی کی طرف لا رہی ہے ـــــ" یہی نغمگی "یہی "تاریکی سے روشنی کی طرف" لانے کی جدوجہد ہمارا پیغام ہے سائیکولوجی کا مقصد ہے ـــ جن دلوں میں تاریکی تھی نفرت تھی غم تھے نا ۔۔۔ رہتے وہاں اب روشنی کی ننھی ننھی البیلی سی کرن پہنچ رہی ہے محبت دلوں میں ناچ رہی ہے گا رہی ہے امید اپنے رنگ کی افشاں چھڑک رہی ہے بہار کے نغموں نے گل کھلا رہی ہے ـ ـ ـ دلوں میں گنگناتا ہوا یہ نغمہ تمام سچائیوں کا راز نغمہ ابھی ہزاروں لاکھوں کے دلوں تک نہیں پہنچا ہے کاش کہ ـ یہ ان دلوں تک بھی جلد سے جلد پہنچ جائے جن کو اس نغمہ کی سب سے زیادہ ضرورت ہے تلاش ہے اور

ان کی خوابیدہ طاقتیں اپنی غفلت سے جاگ کر اپنے آسمان اپنے زمین سے ایک غرور ایک ناز سے مسکرا کر کہیں — ہم انسان ہیں — لے آسمانو! لے پہاڑو! لے دنیاؤ — اور وہ تباہی کے غاروں میں گرتے گرتے سنبھل جائیں اور زندگی کو گلے لگالیں۔

یہ نغمہ تو بیدار ہو گیا اور ہو رہا ہے لیکن ابھی سائیکولوجی کے سامنے بہت سی ایسی دشواریاں ہیں جن کا حل ضروری ہے، بہت سے کانٹے ایسے ہیں جن کو گلوں میں بدلنا لازمی ہے۔ بہت سی گرہیں ایسی ہیں جن کو سلجھانا، جن کو کھولنا اس کا فرض ہے — آپ نے خود اپنے چاروں طرف ناکامیوں کی فلک بوس دیواریں بلند کر لی ہیں۔ خود اپنے لیے خندقیں کھود لی ہیں۔ خود اپنے ہاتھوں پیروں میں زنجیریں ڈال لی ہیں — اور چلاتے پھر رہے ہیں، روتے پھر رہے ہیں کہ ہم محصور ہیں، ہم مجبور ہیں، ہم ناکام ہیں۔ ہمارے چاروں طرف بھوتوں کی بستی ہے جو قدم قدم پر ہم کو دبوچ لیتے ہیں — سائیکولوجی اس عزم کے ساتھ اپنی دوسری منزل میں قدم رکھ رہا ہے کہ یہ دیواریں گر کر رہیں گی، یہ کانٹے دور ہو کر رہیں گے، یہ بے رنگی قوس قزح کے رنگوں میں بدل کر رہے گی۔

کتنی مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ آپ خود اپنے سب سے بڑے دشمن ہیں، آپ خود ہی دنیا کو ایک خارزار بنائے ہوئے ہیں کہ قدم اٹھانا تک مشکل ہے، آپ خود ہی یہ سوچتے ہوئے ہیں کہ یہ حالات تو بدلنے سے رہے، دنیا میں امن تو قائم ہونے سے رہا، بیچارگی دور ہونے سے رہی۔ امن، خوشی سب خواب ہیں جو ہم مدتوں سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔

یہ خواب صرف خواب نہیں، ان کو جیتی جاگتی زندگی دی جا سکتی ہے، ان کو حقیقت کے سانچوں میں ڈھالا جا سکتا ہے اور تاریکی میں صبح درخشاں پیدا کی جا سکتی ہے — اگر اس امید اور یقین کے ساتھ ہم اپنے مستقبل کی طرف دیکھیں اور اس کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنے کے لیے سانچے تیار کریں خاکے بنائیں — اور یہ کام "سالگرہ کے دن" جس خوش اسلوبی سے انجام دیا جا سکتا ہے اور دنوں میں نہیں دیا جا سکتا — لیکن کیا ہم بغیر اپنے ماضی کو یاد کیے ہوئے اور اپنے حال کے تجربوں کو کام میں لاتے ہوئے اپنے مستقبل کے لیے کسی پروگرام کی بنیادیں رکھ سکتے ہیں؟ — نہیں ماضی کو دیکھ کر ہی، اس کی یاد کے چراغوں کو روشن کر کے ہی ایسا ممکن ہے — یہ یاد ہی ہم کو ماضی کے ان لمحات سے گذارتی ہے جبکہ ہیں رنج بھی اٹھانا پڑے تھے اور ناکام بھی ہونا پڑا تھا۔ ان لمحات سے گذر کر وہ اس جگہ پہنچا کر ٹھہراتی ہے جبکہ ہم نے مسرتوں کو گلے لگایا تھا جن کے پیغام سنے تھے۔

ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے چند ماضی کو یاد کرتے وقت صرف ان لمحوں ہی تک محدود ہو جائیں جن میں رنج زیادہ ہیں اور مسرتیں کم۔ ایسے لوگوں کے لیے ماضی ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے اور وہ سوچتے ہیں کہ ماضی کی طرح مستقبل بھی تاریک اور زہر آلود ہوگا اور وہ جس سے بھی ملتے ہیں ان میں قنوطی خیالات کے زہریلے بیج بو دیتے ہیں۔

اس کے برعکس جیسا کہ بعض اخلاقی فلسفیوں نے کہا ہے کہ زندگی کا ہمیشہ روشن رخ دیکھو — ماضی کے ساتھ یہی بہترین سلوک ہو سکتا ہے، اس کے کانٹے بھرے حصے کو یاد کرنے سے کیا فائدہ۔ اس کے پھولوں اور نغموں ہی سے ہم میں وہ امید پیدا ہو سکتی ہے جو ہمارے مستقبل کو بھی روشن اور نغمہ ریز بنا سکتی ہے۔

ماضی سے ہم بہت کچھ سبق سیکھ سکتے ہیں وہ ہمارے بہت سے زخموں پر نمک پاشی کر سکتا ہے۔

ہم "وقت" کو بھی غلط سمجھتے ہیں۔ اس کو ایسا دشمن سمجھتے ہیں جو ہر لحہ ہم سے ہماری طاقتیں ہماری جوانی چھین کر ماضی کے دھندلکے میں پھینکتا جاتا ہے — لیکن یہی "دشمن" آپ کا رفیق اور دوست بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے دوستانہ رویہ قائم کرنے کی کوشش کر دیکھیے اور اپنی زندگی کے لحہ لحہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کیجیے، اس کو یونہی نہ گذار دیجیے — "وقت" گھڑی کی گھومتی ہوئی سوئیاں تو نہیں بدلتے موسم تو نہیں گذرتے ماہ و سال تو نہیں — وقت ہمارا "ہمدم" ہے "روح رواں" ہے۔

یہیں سے غیر فانی زندگی کا سوال اٹھتا ہے — ہم میں سے کچھ سوچتے ہیں کہ کیا غیر فانی زندگی ممکن ہے — کچھ یقین کرتے ہیں اور کچھ اس قسم کے خیال تک کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ ہم میں سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو یقین و شک کے درمیان ہیرے پھیرے کرتے رہتے ہیں۔

غیر فانی زندگی ممکن ہے۔ زندگی آگے بڑھتی رہتی ہے اور زندگی کو حسن اور نغمے بخشنے والے اپنے "عمل" سے ہمیشہ زندگی کے ساتھ زندہ رہتے ہیں — غیر فانی زندگی تو ہمارے مستقبل ہی سے وابستہ ہے۔ ماضی کچھ نہ کچھ غمگین ہوتا ہی ہے اور حال اس غم میں گذر جاتا ہے کہ لحہ بہ لحہ یہ ختم ہو رہا ہے اور ماضی کا دھندلکا ایک ایک پل بڑھ رہا ہے۔ ماضی بن چکا ہے اور مستقبل کو بننا ہے۔ اسی لیے ہماری غیر فانی زندگی کی ساری امیدیں مستقبل ہی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہتی ہیں اسی میں ان تمام خوابوں کی تعبیر بھی پوشیدہ ہے جو انسان ازل سے دیکھتا آیا ہے — اپنی دنیا کی بہتری کے خواب انسانیت کے تکمیل کے خواب اور اسی طرح ہم زندہ رہتے چلے جاتے ہیں مستقبل کی امید میں اس کے سہارے پر — اور اگر یہ امید ہمارے دل سے مٹ جائے تو ہم زندہ رہنا تک گوارا نہ کریں۔

گندمی باتوں پر گندمی ہوتی مسرتوں پر آٹھ آٹھ آنسو بہانا بے سود ہے کیونکہ امید زندہ و باقی ہے، سوچ ہے اور بڑھ رہی ہے ---- اگر حسن کو موت واقع ہوتی ہے، پھولوں پر خزاں آتی ہے، بہاریں بھی داغ ہو جاتی ہیں تو غم نہ کھائیے حسن ابدی ہے، سچائی غیر فانی ہے، بہار پھر آئے گی ضرور آئے گی، ستم میں آپ کو چھوڑ کر جائیں گی کہاں جبکہ ابھی کل باقی ہے۔ ابھی مستقبل سامنے ہے - - - - اور مستقبل ہمیشہ سامنے رہے گا۔

سالگرہ نمبر کے متعلق

ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ ہم نے اپنے پورے خلوص سے اس کو پیش کیا ہے اور شاید ایک سال کی رفاقت کے بعد اب آپ کو ہمارے خلوص پر بھروسہ ہو چکا ہوگا ---- ہمارا یہ خلوص ہی اس کی افادیت کا ضامن ہے۔

- - ہم اسی سال کچھ مہینوں کے بعد ایک اور خاص نمبر پیش کریں گے جو اور بھی کچھ ہوگا اپنی بات بات ہیں۔

ہمارے مستقل عنوانات

ہم اس نمبر میں اپنے مستقل عنوانات - بات چیت، آپ بھی سوچئے، پیام و سلام شامل کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ انشاءاللہ آئندہ شمارے سے یہ سلسلہ جاری رہے گا ---- اچھا ---- اب امر -

---

رباعیات

(محمد نعیم قاسمی)

(۱)

آؤ وقت بغضوں کو ابھاریں ساتھی
آگیسوئے گیتی کو سنواریں ساتھی
خاشاک کے انبار جلانے کے لئے
آمشعل مہ پہ ہاتھ ماریں ساتھی

(۲)

مانا کہ بدل رہی ہیں قدریں پیہم
مہتاب پہ پڑ رہا ہے آدم کا قدم
لیکن ابھی انقلاب کب آیا ہے
انساں ہے جب انسان کا محتاج کرم

(ضیاء جعفری)

(۱)

ہنستا ہے وہ صبح کا تارا ساقی
کرتا ہے یہ پینے کا اشارا ساقی
تو جام اٹھا نشے میں میں اڑتا ہوں
چھو آؤں گا گردوں کا کنارا ساقی

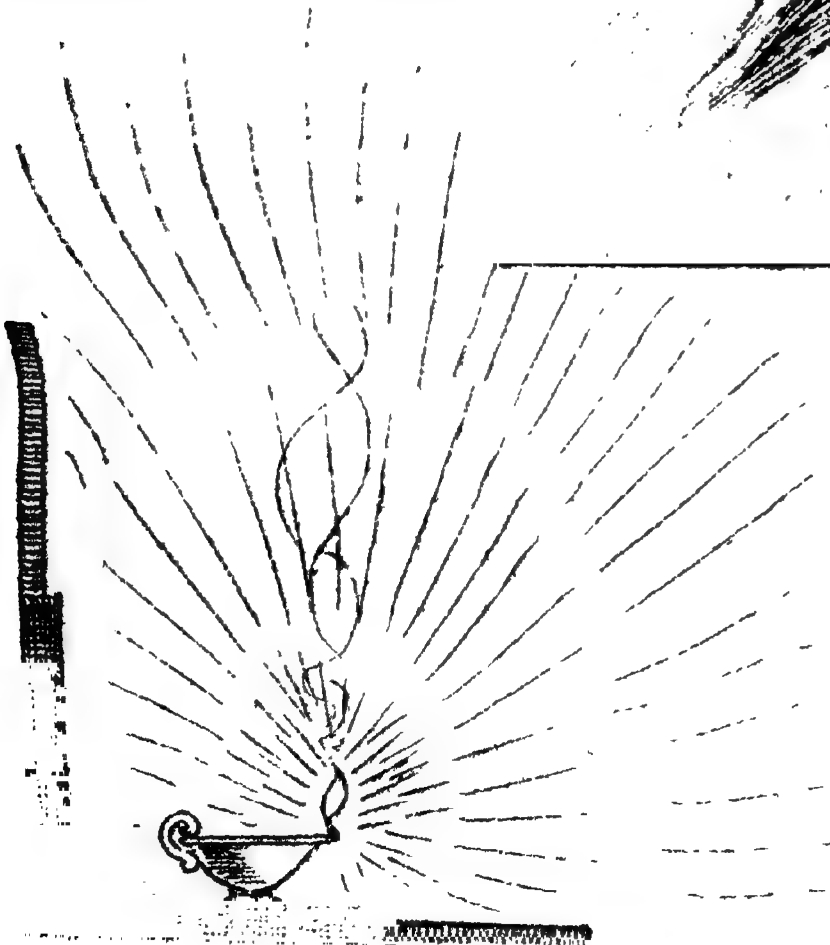
(۲)

بیدار کہ ہے عہد بہاراں ساقی
طالع ہوئی وہ صبح غزلخواں ساقی
سلطانی جمہور کا دور آیا ہے
ہر قید سے آزاد ہے انساں ساقی

تاریکیاں

نفسیاتی روشنی میں!





لکھنے والے

والدر سلون
رابرٹ ہیپ
مولانا عبدالقدوس ہاشمی
گیتہ مین
پروفیسر علی ناصر زیدی
شہاب ناصر
مولانا عبدالماجد دریا بادی
ڈاکٹر ہنری نائٹ
بیگم رئیس جہاں نیر انصاری
عبدالحمید عظمی
عابدی بیعت
پال آسٹر
گلبرٹ اوکلے
محمد مجیب خاں

کس سے لڑ رہے ہیں؟

زندگی سے؟

والد رسلون

لڑائی جھگڑا تو ہوا ہی کرتا ہے۔

دو کتوں کے آگے ایک ہڈی ڈال دیجئے۔ پھر دیکھئے کیسا کیسا وہ ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو لہولہان کرتے ہیں۔

خیر۔ وہ تو کتے ٹھیرے۔

بھلا ہو انسان کے "وحشی" جذبوں کا۔ وہ بھی اپنے جیسے "وحشیوں" کو جمع کر کے ہمسایہ ملکوں پر چڑھ دوڑتا ہے۔ اور بڑے غرور اور ناز سے یہ کہتا ہے

میں "سکندر" ہوں

میں "چنگیز" ہوں

میں "ہٹلر" ہوں

اور خدا بچے ان سورماؤں سے۔ انسانی تاریخ میں جس شان سے ان خونخوار درندوں کا ذکر ہے اتنا بڑے بڑے حکماء کا تذکرہ نہیں

مگر میں تو اور ہی جھگڑوں کا حال بیان کروں گا۔ جو اور بھی خونیں ہیں اور بھی خطرناک، اور ان ہی کی وجہ سے ہماری آپ کی زندگی موت سے بدتر بنی رہتی ہے۔

ان جھگڑوں میں ایک طرف ہم ہوتے ہیں

دوسری طرف ہماری زندگی

ہم خود اپنی زندگی سے جھگڑ بیٹھتے ہیں۔

حالانکہ ———— ہم کو زندگی کے ساتھ زیادہ گھل مل کر رہنا چاہیئے ———— کیونکہ زندگی سے فرار تو ممکن ہی نہیں ہے۔

وہ تو ایسی "ہمدم" ہے۔ کہ جب تک ہم ہیں۔ اس وقت تک یہ ہمارے ساتھ ہے۔ اب چاہے اس پر ناراض ہوں، ہر وقت آزردہ رہیں اور اپنی مسرتوں کو برباد کرتے رہیں۔ اس رفاقت میں ذرا بھی فرق نہیں پڑے گا۔

یا ــــــــ آں ــــــــ اگر زندگی سے جھگڑتے پر آئے دن کے جھگڑے ختم ہی ہو جائیں — تو بہت شوق سے لڑیں۔ لیکن ہر وقت کی کوفت، بے چینی، اور بغاوت تو اور بھی تکلیف، اور بھی کانٹوں کا باعث بنے گی۔

ہو سکتا ہے کہ اس جھگڑے میں ہم بھی خطاوار ہوں اور زندگی بھی۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہم دونوں میں غلط فہمی کی زہرناکی کام کر رہی ہو۔ غلط فہمیوں کو دور کر دیجیے۔ جھگڑا ابھی ختم ہو جائے گا۔ مگر ہم تو دل ہی دل میں غبار رکھتے ہیں۔ اور زخموں کو پالتے ہیں۔ اور اپنے آنے والے دنوں پر بھی ان کا تاریک سایہ پڑنے دیتے ہیں۔ نہ تو خود کبھی جھگڑے کی بنا کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ زندگی ہی کو صفائی پیش کرنے کا موقعہ دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لمحات جو ہنسی خوشی، گیتوں قہقہوں میں بسر ہونا چاہیں۔ وہ آنسو بہانے، آہیں بھرنے میں گذرتے ہیں۔ اگر غلط فہمیاں دور ہو جائیں تو — اوہ، کیسی خوشی، کتنی مسرت، کتنی آسودگی سی محسوس ہوگی۔

سارا دارومدار ہم پر ہے

"ہم یہ بھولے ہوئے ہیں کہ زندگی ہمارے لئے تمام تر نغموں سے بھری ہوئی ہے" یہ ان لوگوں کا کہنا ہے جنہوں نے اپنی زندگی بیشتر کانٹوں پر بسر کئے ہیں۔

رابرٹ اسٹیونس نے تمام عمر تکلیفوں میں گذاری مگر آخر دم تک وہ یہی کہتا رہا کہ دنیا میں پھولوں اور نغموں کی کمی نہیں حالانکہ میں نے خود کو اپنے چاروں طرف کانٹے اور آہیں اور ناسور دیکھے —۔

اگر آپ رابرٹ سٹیونس کی ادبی خدمات سے واقف ہیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ انگریزی زبان کی بہترین کتابوں میں اسٹیونس کی کتابوں کا بھی شمار ہے۔ حالانکہ یہ سب کی سب کتابیں انتہائی تکلیف کے لمحات میں لکھی گئیں۔ لیکن اس نے اپنی زندگی سے کبھی جھگڑا مول نہیں لیا۔ کیونکہ زندگی سے متعلق اس نے کسی برائی کو اپنے دل میں جگہ نہ دی اور ایک امید، ایک آس میں جیتا رہا۔ وہ حالات کا مقابلہ کرتا رہا۔

ہمیں اس یقین کے ساتھ زندگی کی "ہمدمی" گذارنا چاہیے کہ وہ ہماری بہتری کے لئے ہے ــــــــــ ہم میں سے بعض لوگ تصورات ہی تصورات میں ایک دنیا بساتے ہیں۔ اور زندگی کو اپنی خواہش، اپنی تمنا کے رنگوں میں رنگ کر دیکھنا ہی اخذ کرتے ہیں۔ مگر معاف کیجئے گا۔ اس سے بڑھ کر "حماقت" ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم موجود اور ٹھوس چیزوں سے فرار حاصل کر کے خوابوں کے دھندلکوں میں سایوں کے پیچھے بھاگتے رہیں ــــــــ ایسے لوگ ــــــــ کم از کم ان میں سے کچھ لوگ ــــــــ کسی نہ کسی وقت اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہیں اور کف افسوس ملتے ہیں۔ مگر عموماً یہ ایسے وقت ہوتا ہے جب کہ درمیانی خلیج بڑھتے بڑھتے سمندر بن جاتی ہے جس کے ساحل ایک دوسرے کی نظروں سے دور ہوتے۔ اس لئے ہم کو زندگی کی موجودہ حالت ہی میں اسے گلے لگانا چاہیئے۔ اور پھر اُسے اپنی خواہشوں، اپنی تمناؤں کے مطابق ڈھالنا چاہیئے۔

خود زندگی کا بھی یہی تقاضہ ہے۔ اس کا اپنا نہ کوئی رنگ ہے۔ نہ شکل۔ اپنی آرزوؤں کے رنگوں میں رنگنا، اپنے خوابوں کے سانچے میں ڈھالنا تو ہمارا کام ہے۔ زندگی کا یہ تقاضا ہماری تخلیقی قوتوں کے لئے للکار سے کم نہیں اور بہت ممکن ہے کہ ہم طرح طرح کی دشواریوں میں پڑ جائیں لیکن اس للکار کو قبول کرنے کے بعد ہی اپنے کو اس دنیا میں رہنے کا اہل بناتے ہیں۔ جو ہم کو بنانا ہے اس کی پرواہ تو نہیں ہے زندگی ہمارے ہاتھوں پڑ کر کیا شکل اختیار کرتی ہے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ ہم زندگی کے ہاتھوں پڑ کر کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم ہی شکست قبول کر لیتے ہیں اور باقی دن اس شکست پر آنسو بہانے میں صرف کر دیتے ہیں تو زندگی ہم کو بنانے میں ناکام رہتی ہے۔ لیکن اگر ہم زندگی کی ساتھ نباہنے لگیں، ناکامیوں کے پیچھے نہ پڑیں اور ہمت کا دامن تھامے رہیں تب جیت ہماری ہوتی ہے اور زندگی ہم کو نقصان پہنچانے سے قاصر رہتی ہے۔

اگر زندگی ہم کو چھیڑتی ہے اور طرح طرح سے تکلیف پہنچاتی نظر آتی ہے تب ہم بہت آسانی سے، بڑے پیار سے اس کی توہین کو درگذر کر سکتے ہیں اور اگر ہم ذرا بھی غور کریں تو ہم فوراً معلوم کر لیں گے کہ زندگی ہماری دل شکنی اور توہین نہیں چاہتی اور اسی طرح اس کی اس نازیبا حرکت کی اصلی وجہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ پھر توہین، توہین نہ رہے گی، وہ ایسی بات بن جائے گی جس پر زندگی ہماری توجہ مبذول کرانا چاہتی ہے ——— زندگی کے پاس بھی ہم کو پرکھنے کے کچھ اصول ہیں۔ مثلاً جسمانی صحت، دماغی توازن کو قایم رکھنے کے کچھ طریقے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ اپنی من مانی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ من مانی کرنے میں اس کا خدشہ ہے کہ ہم جسمانی لذت یا دماغی عیاشی کا شکار ہو جائیں گے، اور زندگی اپنی وہ "نگرانی" کھو بیٹھے گی جو ہماری بھلائی کے لئے ہے نہ کہ برائی کے لئے ——— ظاہر ہے کہ ہم اپنی کسی ایک خواہش، ایک لذت کے پیچھے دوسری خواہشوں [illegible] ہی کریں گے، دوسرے تقاضوں کو نظر انداز ہی کریں گے۔ تو زندگی تو یہ برداشت نہ کر سکے گی ——— کیونکہ زندگی توازن [illegible] ایک توازن ہے ——— اس کی نگرانی کی بہتری اور مقصد کے راز ہم پر اسی وقت افشا ہو سکتے ہیں۔ جبکہ ہم [illegible] ——— پھر نہ یہ بے چینی رہے گی اور نہ توہین کی زہرناکی۔

رواداری برتئے

لیکن صاحب۔ ہم یہ کہتے کہتے تھک گئے کہ زندگی میں اتنی حماقتیں ہیں ——— بے وقوفیاں [illegible] ——— [illegible] ہم بے وقوفوں کے ہاتھوں خوشی خوشی اپنے دن نہیں گذار سکتے۔ کون اندھوں کے آگے روئے اور اپنے نین کھوئے ——— شاید [illegible] ہم میں سے بیشتر خود اپنے سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ یہ سچ بھی ہے کہ زندگی سے کیسا ہی تنازع کیوں نہ ہو، [illegible] سب زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔ مگر خود اپنے آپ سے مول لیا ہوا جھگڑا [illegible] نہیں ہوتا۔ سب سے بڑے جھگڑالو اور [illegible] ہم خود ہی ہیں۔ خود اپنی کمزوریوں کے انکشاف کے بعد تو ہم کو دوسرے انسانوں سے رواداری برتنا چاہیئے۔ کوئی ایسا انسان [illegible] جس میں کوئی نہ کوئی عیب نہ ہو۔ جو کامل ہو۔ معصوم ہو۔ اور ایسے لوگوں کو تلاش کرنا بھی بیکار رہے یا ان کا انتظار کرنا بھی بے سود بفرض محال اگر ایسے کامل انسان موجود بھی ہوتے تو ہم ان کی صحبت کا کوئی حظ نہ اٹھا سکتے۔ وہ ٹھیرے [illegible] ——— فرشتے ——— اور ہم بیچارے عیبوں میں پلے ہوئے ——— انسان۔

پھر ——— اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے کہ جیسے بھی لوگ ہیں ان کو غنیمت سمجھا جائے ——— اور ان سے زیادہ سے زیادہ دلبستگی کے سامان مہیا کئے جائیں۔ اگر ہم کامل انسانوں کے منتظر رہیں گے اور اپنے چاروں طرف ہنستے ہوئے، چلتے پھرتے ہوئے قہقہے لگاتے ہوئے انسانوں سے احتراز کریں گے۔ تو یقین جانئے۔ ہماری شام کی کبھی سحر نہ ہوگی۔ کیونکہ ایسے "انسان" ہماری دنیا میں موجود ہی نہیں ہیں۔ ہم ہی اچھے سے اچھے ہیں اور برے سے برے ——— ——— جی ہاں آپ ایسے لوگوں کو خوابوں میں ضرور دیکھ سکتے ہیں۔

اور کیا یہ ممکن نہیں کہ ایسے انسانوں کی یہ دوری ہی ان کو "کامل" بنائے ہو، دور کے ڈھول کس کو سہانے نہیں لگتے۔ اگر ہم ان کے قریب ہوتے تو ضرور دیکھتے کہ ان میں بھی ہماری ہی ایسی خامیاں ہیں۔ اس لئے اگر ہم اپنے کسی دوست، کسی ساتھی، کسی رفیق کی گفتگو میں اس کی مسکراہٹ، اس کی قربت میں کسی قسم کی فرحت، کسی قسم کی گرمی اور خوشی محسوس کرتے ہیں تو ایسے رفیق، ایسے ساتھی کو ان خیالی خاکوں پر سے کیوں قربان کریں۔ اگر کوئی ہم سے پیار کرتا ہے۔ ہماری خامیوں کے باوجود ہماری رفاقت کا دم بھرتا ہے تو ہمیں تو اسے ہاتھ سے کھونا ہی نہیں چاہیئے ——— ہو سکتا ہے کہ ان ہی پر ہم اپنی پسند، اپنے خوابوں کی جھلکیاں دیکھ لیں۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہوا۔ تو بھی کیا ہوا۔ ہم

ایسے کہاں کے فرشتے ہیں -

زندگی کے چھن چھن چھنا چھن - رقص

زندگی روزانہ ہی ہمارے سامنے مسرتوں کے پھول برسایا کرتی ہے - یہ اور بات ہے کہ ہم ان کو چن نہ سکیں - جس وقت قوس قزح رنگ برنگی تانیں اڑاتی رقصاں ہو - اس وقت ہم سونے چاندی کو اکٹھا کرنے کی دھن میں اندر ہی اندر جلے بھنے جا رہے ہوں تو کس کا خطا ؟

بہار نے رنگ و بو کو ہر طرف بکھیر دیا ہو اور ہم ایک عالیشان عمارت بنانے کے لئے اپنی فاقہ مستی پر آنسو بہا رہے ہوں تو کس کا قصور ؟

لیکن ہم تو " اے کاش یہ ہوتا — اے کاش ایسا ہوتا " کے گردابوں میں پھنسے رہتے ہیں اور اس وقت کے منتظر رہتے ہیں کہ جب یوں سے یوں ہوگا تو ہم ہنسیں گے - جب ہم اس عہدہ پر فائز ہو جائیں گے - تب ہی مسکرائیں گے ——— ——— - ہم اپنے کام سے، اپنے ماحول سے، اپنے گھر والوں سے آزردہ رہتے ہیں - اور خود سے الجھتے رہتے ہیں - نتیجہ ظاہر ہے کہ کیا ہوتا ہے - دنیا ہم سے بیزار - ہماری راہیں جدا ہو جاتی ہیں اور دور ہوتی جاتی ہیں - اور ہم یہاں رہتے ہوئے بھی یہاں سے دور رہتے ہیں اور طرفہ یہ ہے کہ دور رہ نہیں سکتے - جب آنکھ کھلی - وہی در و دیوار سامنے، وہی آوازیں کانوں میں آ رہی ہیں وہی ہوائیں چل رہی ہیں -

اور یہ سب صرف اس لئے ہوتا ہے کہ ہم برابر کشمکش میں رہتے ہیں - خود ہماری زندگی ہمارے خلاف لڑنے کو کھڑی ہو جاتی ہے اور ہم اس کو برباد کرنے پر تل جاتے ہیں -

دیکھئے - کہیں یہ لڑائی اب بھی جاری تو نہیں ہے ؟

تلخیص و ترجمہ - ادارہ

• اگر غلبہ و اقتدار اور حکم و قوت کی آرزو ہے - تو اپنی خودی (انا) کو زیادہ سے زیادہ مضبوط و توانا بناؤ کیونکہ قدرت کی نظر میں ضعیفی ایک فوری موت کا پیغام ہے ؎

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

(اقبال)

• ہم نے اپنی امانت آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی - مگر انہوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اتنی بڑی ذمہ داری سے ڈر گئے - با ایں ہمہ انسان نے اس امانت کو جلدی سے اٹھا لیا -

(قرآن پاک)

• اللہ تعالیٰ کی رضا بھی مرد مومن کی رضا میں گم ہو جاتی ہے - خواہ بظاہر یہ بات لوگوں کے لئے قابل یقین نہ ہو -

در رضایش مرضی حق گم شود
ایں سخن کے باور مردم شود

(اقبال)

منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

(سرابیرٹ ھیپ)

آخر ہم کہاں جارہے ہیں؟ ——— کوئی منزل بھی ہے؟ یا ہم یوں ہی زندگی کی شارع عام پر اس امید میں بھٹکتے پھر رہے ہیں کہ یہیں کہیں ایک ایسی موڑ پیدا ہوگی جو ہم کو پھولوں کی وادی میں، رنگ و بو کی منزل میں پہنچا دے گی؟

یہ سوال "خود مجسم بن کر ہم سے ——— فرد، فرد سے ——— اور پوری قوم سے جواب کے طالب ہیں ———

کیا ہم جواب دے سکتے ہیں؟ ——— کیا ہم میں اتنی ہمت ہے کہ ہم جواب دیں؟ — کیونکہ ہمارے جواب ہی میں ہماری انفرادی مسرتیں، کامیابیاں اور پوری نوع انسان کی بہبودی اور نغمے پنہاں ہیں!

زندگی کی راہ میں قدم رکھنے آگے بڑھنے سے قبل ہی ہم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آخر ہم کو جانا کہاں ہے۔ جب تک منزل کا تعین نہ ہوگا ہماری مثال ان بھولے بھٹکے مسافروں کی ہوکر رہ جائے گی۔ جو کسی ریگ زار میں اپنی سمت کھو بیٹھے ہیں اور اب وہ ہیں اور تپتی ہوئی ریت ہے۔ ان کے پیروں کے چھالے ہیں اور شکستہ ہمت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں تحمل ہو۔ لیکن اس تحمل سے فائدہ؟ بھٹکے مسافر تو گرداب کی طرح چکر لگاتے رہتے ہیں اور ہر پھر کر اسی جگہ آجاتے ہیں جہاں سے چلے تھے۔

بالکل یہی زندگی کا حال ہے۔ ہم اس کی کس راہ پر گامزن ہیں؟ کیا ہم کو معلوم ہے کہ ہم کہاں جارہے ہیں؟ اگر ہمارا کوئی مقصد نہیں ہے تو ہم سراب کی شعبدہ بازی میں پھنسے رہیں گے۔ ہماری ہمت، ہمارا استقلال کچھ بھی سودمند نہ ہوگا۔ کیونکہ ہم تو چکروں میں چلتے رہیں گے بڑھتے رہیں گے اور کبھی بھی کامران زندگی کے نخلستان میں نہیں پہنچ سکیں گے۔

بڑی سے بڑی ہمت والے بھی تھک کر راہ ہی میں رہ جاتے ہیں اگر ان کی منزل نہیں ہوتی۔ آخر کہاں تک چلتے رہیں۔ کدھر بڑھتے رہیں انسان کے لئے منزل کا تعین اتنا ہی ضروری ہے جتنا زندگی کے لئے ہوا۔

آخر ہم کہاں جارہے ہیں؟ ——— کوئی منزل بھی ہے ——— اگر نہیں تو ہم زندگی کی رحمتوں سے، اس کے نغموں اس کے حسن سے ہمیشہ محروم رہیں گے — پیاسے رہیں گے۔

بے مقصد زندگی

ہم نے طرح طرح سے مقصد کو کھو دیا ہے۔ اور بس "یونہی" زندگی کے دن گذار رہے ہیں۔ "اچھے" اور "برے" کی تمیز کھو بیٹھے ہیں صرف سراب کے دھندلکے ہیں۔ اور ان میں ہر چیز سایوں کی طرح غیر واضح ہوکر رہ گئی ہے زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے بھاگنا اپنا اپنا شعار بنا لیا ہے

[illegible] ہیں۔ اس فریب میں مبتلا ہیں کہ کامیابی سرے ہی سے غیر موجود ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کی راہیں تنگ ہیں۔

پر خار ہیں بے رنگ ہیں اور سوچتے ہیں کہ اس تنگی، پر خاری اور بے رنگی کے علاوہ زندگی اور ہو بھی کیا سکتی ہے ــــــــــ ایسے لوگ نیم زندہ ہیں - نیم مردہ ہیں - وہ جینے سے ڈرتے ہیں - کیونکہ انھیں یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ ان کی نااہلی کہیں روشن نہ ہو جائے - وہ اپنی زندگی کو کسوٹی پر پرکھنے سے خوفزدہ ہیں ــــــــــ یہیں پر تمام خرابیاں پائی جاتی ہیں ــــــــــ کتنی ہی غلطیاں افراد اور قوموں سے کیوں نہ سرزد ہو چکی ہوں، کتنی ہی چٹانیں ان کی راہ میں کیوں نہ حائل ہو چکی ہوں - ان سب کا ازالہ ہو سکتا تھا اگر ایسے مردوں اور ایسی عورتوں میں خود اپنی کمیوں، کمزوریوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہوتی -

زندگی میں معنی اور مقصد پیدا کئے جا سکتے ہیں مگر یہ تو معلوم ہو کہ ہم کہاں جا رہے ہیں - اور چاہتے کیا ہیں ــــــــــ ہماری کوئی منزل اور اس تک پہنچنے کی کوئی راہ تو ہونا چاہیئے - کیونکہ مقصد ہی میں وہ کشش ہے جو ہماری چھپی ہوئی طاقتوں کو دن کی روشنی میں میدان عمل میں لاتی ہے - یہی وہ "جادو" ہے جو غربت اور بے بسی کو دور کر کے ہم کو پر مسرت اور کامراں بناتا ہے -

ہم کو "یہ سبق" ابھی سے سیکھ لینا چاہیئے - کہ ہم کو کسی مقصد کے لئے جینا ہے - کسی کو پانے کے لئے جدوجہد کرنا ہے - کہیں پہنچنے کے لئے آگے بڑھنا ہے - کیونکہ بے مقصد زندگی تو خودکشی ہے -

یہ ایک وباسی پھیلی ہوئی ہے کہ زندگی کے انگور "کھٹے" ہیں - اور ہم بھی بہت حد تک اس غلط بیانی، خود فریبی کے شکار رہیں ــــــ آئیے ہم دوبارہ اپنے کو یہ یقین دلائیں کہ ایسی زندگی ممکن ہے جس پر فرشتے رشک کریں جب تک ــــــــــ ہم اندھیرے میں رہے جائیں گے روشنی کی مسکراہٹوں اور اس کی رنگا رنگی سے بے خبر رہیں گے -

ایک مقصد، ایک منزل

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہم بے مقصد زندگی بھی اُتنی ہی کامیابی سے گذار سکتے ہیں - جتنی با مقصد زندگی - اور اچھی زندگی وہ ہے جو وقت کی لہروں کے ساتھ بہتی رہے - جیسا دیس ہو - ویسا بھیس بدلتی رہے

زندگی کا یہ فلسفہ دیکھنے میں تو بہت "خوشگوار" معلوم ہوتا ہے - لیکن عمل میں ــــــــــ اس کی پیروی زندہ رہنے تک کو دشوار بنا دیتی ہے - کیونکہ یہ فلسفہ خود زندگی کے اصولوں کے منافی ہے - ہم اپنے اندر جلتی ہوئی ایک روشن لو کو بجھا دیا کرتے ہیں -

ہماری ہی کیا، ہر جاندار کی زندگی کی ایک منزل ہوتی ہے - پہلا تو زندگی کا مقصد صرف زندگی کو برقرار رکھنا ہے ــــ زندگی کی شمع جلتی رہے - ایک کے بعد ایک، ایک سے دوسری، دوسری سے تیسری - لیکن انسان ــــ جو اشرف المخلوقات ہے ــ وہ محض زندگی کے سلسلہ میں کڑیاں پہنانے کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتا ہے - کھانا پینا، چلنا پھرنا تو زندگی نہیں - اصل زندگی اور اس قسم کی زندہ موت میں فرق ہی کیا رہے گا -

انسان کو محض جینے سے زیادہ بھی کچھ کرنا ہے ــــــــ کچھ کرنا چاہیئے ــــــــ لیکن ہم ــــــــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اسی مقصد کو بھلا بیٹھے ہیں - اور ہماری مثال ایک ایسے جہاز کی ہے جو ہواؤں اور موجوں کے رحم و کرم پر سمندر میں بھٹکتا پھرتا ہو - ساحل تک پہنچنے کی کوئی امید نہ ہو -

اب ــــــــ ال - زندگی کے دو مقصد ہوتے ہیں ــ ایک شعوری، ایک لاشعوری ــــــ لاشعوری مقصد محض تن آسانی پر مبنی ہے - ہم کو زندہ رہنے کے لئے کھانا کپڑا، گھر کی ضرورت ہے ــ یہ مقصد ہم کو تمام دوسرے جانوروں کی سطح

ہی پر مقید رکھتا ہے ۔ لیکن جب ہم سمجھ بوجھ کر اپنی کسی منزل کا تعین کرتے ہیں ۔ اسی وقت ہم صحیح معنوں میں دائرہ انسانیت میں داخل ہوتے ہیں اس لئے ہم کو پھر اپنے سے یہ سوال کرنا چاہیئے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں ۔ ؟ ہماری کیا منزل ہے ؟ کیونکہ ان ہی سوالات میں ہماری بہتر زندگی کے راز مضمر ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارا شعوری مقصد ایک حد تک محدود ہو مثلاً ہم نوکری میں کسی خاص عہدہ پر پہنچنا چاہتے ہیں بینک میں انبار روپیہ جمع کرنا چاہتے ہیں ۔ ایک مکان بنا کر آسودگی کی زندگی گذارنا چاہتے ہیں ——— لیکن زندگی کو ان ہی حدود میں بند کر دینا ظلم ہے ۔

زندگی کو محض اپنے آرام ہی تک محدود کر دینا عین انسانیت تو نہیں ——— عین انسانیت تو اپنے ماحول، اپنے ملک اپنی دنیا کی تمام تاریکیوں کو دور کرنے کی جدوجہد ہے ۔

"کامیاب" زندگی تو اسی وقت شروع ہوتی ہے جبکہ ہم اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی زندگی میں زندگی محسوس کرنے لگتے ہیں اور اس کی معراج پر پہنچنا ہی ہماری "مکمل" جیت" ہے ۔ اگر ہم صحیح مفہوم سے واقف ہیں تو ہم کو یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ "مسرت" دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے! اور ہماری کامرانی کی راہ میں "بدقسمتی" کی چٹانیں حائل نہیں بلکہ خود ہماری کمزوریاں سد راہ بنتی ہیں ہم کو صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے کو پہچانیں ۔

اور یہی وہ راز ہے جس کو بار بار دہرانے کی ضرورت ہے ۔ کیونکہ آج کل انسانی حقوق کا بہت چرچا ہے ۔ یہ سچ ہے کہ انسان کے پیدائشی کچھ حقوق ہیں ۔ مثلاً یہ ہم کو حق حاصل ہے کہ ہم جس طرح چاہیں ۔ اپنی زندگی کو گذاریں ۔ لیکن ہم ایک بالغ شخصیت کو اپنا "حق" نہیں گردان سکتے ۔

ہم یہ تو ضرور حق رکھتے ہیں کہ اپنی خوشی کو تلاش کریں ۔ لیکن اس خوشی کو پا لینا خود ہماری اپنی ذمہ داری ہے ——— ہم اس کے بھی حق دار ہیں کہ ہم کو کامیاب ہونے کا موقع ملے ۔ لیکن کامیابی ——— ہماری اپنی قوتوں پر مبنی ہے ۔ ہم اسی وقت اچھے مرد اور اچھی عورتیں بن سکتے ہیں جبکہ ہم ایسا بننا چاہیں — اور اس کے لئے کوشش کریں ۔

ہم دنیا کی مادی نعمتوں میں تو برابر کے شریک ہونے کا حق رکھتے ہیں زندگی کے رقص اور نغموں کو ہم دوسروں کی زندگی کے حصے سے نہیں لے سکتے ۔ بلکہ خود اپنی انفرادی کوششوں سے حاصل کر سکتے ہیں ۔

ہم کس راہ پر گامزن ہیں ؟

کیا اس راہ پر جو ہم کو تپتی ہوئی ریت کی آندھیوں کے سپرد کر دیتی ہیں ۔ یا اس راہ پر جو ہم کو پھولوں کی وادی میں رنگ و بو کی منزل تک پہنچاتی ہے ؟

آئیے ۔ ہم آج سے ایک با مقصد زندگی شروع کریں اور سایوں کی دنیا سے نکل کر خود اعتمادی کی طرف بڑھیں ۔ وہ خود اعتمادی جو ہم کو موجودہ پریشان کن ناکامیوں سے نکال کر مسکراہٹوں اور نغموں کے ساحل سے جا لگائے گی ۔

وہی ساحل ہماری منزل ہے اور انسانیت کی معراج ہے

خدا ذرے ذرے کا حساب لیتا ہے ۔ دنیا میں معمولی سے معمولی گناہ کی قیمت بھی دینا پڑتی ہے ۔ اللہ کے یہاں انصاف کی چکی چلتی ہے آہستہ مگر پیستی ہے مہین + ——— (وکٹر ھیوگو)

کامیابی کا محل ناکامی کی اینٹوں سے تیار ہوتا ہے ۔ + ——— (بائرن)

خاص سالگرہ نمبر کے لئے!

تربیتِ نفسی

:خانقاہی نظام:

(از مولانا عبدالقدوس ہاشمی)

نفسِ انسانی کی تربیت اگرچہ کچھ بہت زیادہ مشکل کام نہیں، لیکن اس قدر آسان بھی نہیں کہ آپ جب اور جس وقت چاہیں اپنے آپ کو یا کسی دوسرے شخص کو مطمئن، جفاکش، خداترس اور ہمدرد بنا دیں۔ اس کام کے لئے بڑی مہارت اور مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ اس سعی و محنت کے بعد جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ اکثر و بیشتر حسب مرام ہوتے ہیں۔ اگر تربیت کے دوران میں شدید اور اصولی قسم کی غلطیاں نہ ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کامیاب نہ ہوں۔

ہر بچہ صحیح فطرت پر اور اچھا ہی پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کی ابتدائی زندگی میں مختلف اثرات سے اس کے عقائد، عادات اور اخلاق کی تعمیر ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ وہ ایک خاص قسم کا شخص بن کر تیار ہوتا ہے۔ عقائد، خیالات اور عادات میں سے بعض کو وہ بری طرح ناپسند بھی کرتا ہے لیکن اس کے باوجود اپنی آئندہ ساری عمر میں وہ ان سے اپنی گلوخلاصی کرانے پر قادر نہیں ہوتا، کیوں؟ اس لئے کہ وہ خود اپنے آپ کو تربیت دینے کی باقاعدہ سعی نہیں کرتا یا نہیں کر سکتا۔ ورنہ بالکل اسی طرح جیسے ایک کم عمر بچے میں صحیح تربیت کے ذریعہ جرأت، دلیری، ہمدردی، سچائی اور دوسری خوبیاں پیدا کی جا سکتی ہیں ایک چالیس نہ بلکہ پچاس سالہ بوڑھے میں بھی یہ تمام خوبیاں اچھے ماحول اور صحیح تربیت کے ذریعہ پیدا کی جا سکتی ہیں بلکہ پیدا کی جاتی ہیں۔

ہماری خانقاہی زندگی جو حالیہ زمانوں میں کاہلی، کم ظرفی اور خود بینی و خود فریبی کے لئے بدنام ہو گئی ہے۔ ایک زمانہ میں نفسِ انسانی کے لئے بہترین ذریعۂ تربیت ثابت ہوتی رہی ہے۔ یہ افسانے نہیں بلکہ واقعات اور سچے واقعات ہیں کہ بعض بزرگوں کے فیضِ صحبت سے بگڑے ہوئے لوگوں کی کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ بدقسمتی سے اکثر تذکرہ نگاروں نے اولیاء کرام کے حالات میں خوارق عادات اور کرامات کے ذکر کو ایسی اولیت دے دی کہ لوگوں کی نظر سے خانقاہوں کی افادی حیثیت چھپ گئی اور لوگ صرف یہ سمجھنے لگے کہ پیری مریدی کا یہ عظیم الشان نظام محض خوش عقیدہ اور وہمی مریدوں کا کھیل ہے۔ حالانکہ یہ ایک عظیم الشان تحریک تھی، تحریک، اسی معنی میں تحریک جس معنی میں آج کسی سیاسی و غیر سیاسی تحریک کو تحریک کہا جاتا ہے۔

تیسری صدی ہجری میں جب اہلِ علم و بصیرت نے دیکھا کہ تمام ذرائع دولت، اور مقاماتِ عزت پر اہلِ ہوا و ہوس نے قبضہ کر لیا ہے اور سونے چاندی کی چمک نے آنکھوں کو اس طرح خیرہ کر دیا ہے کہ کسی برتر مقصد کے لئے جان و مال کی قربانی، یا عیش و راحت کو تیاگ دینا آسان کام نہیں رہا ہے تو انھوں نے اس صورتِ حال پر غور کیا اور درد دل کے ساتھ غور کیا، انھیں نظر آیا کہ باپ اپنے بیٹوں کو دولت کمانے اور عیش کرنے کے لئے تیار کر رہا ہے۔ مکاتب میں اساتذہ اپنے شاگردوں کو دفاتر حکومت کے لئے اور خلفائے بنی عباس کی خدمت کے لئے تیار کر رہے ہیں، غرض یہ کہ مسلمانوں میں نماز و روزہ کے پابند انسانوں میں حکمت کلیمی کے بجائے حکمتِ فرعونی کا دور دورہ ہے، اور بقول اقبال ؎

شیخِ ملت با حدیثِ دل نشیں ٭ بر مرادِ او کند تجدیدِ دیں

مکتب از تدبیرِ او گیرد نظام ٭ تا بہ کام خواجہ اندیشد غلام

اس وقت چند دانشمند اور خدا ترس بزرگوں نے ایک تحریک شروع کی یہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ایک عالمگیر برادری کا پیام لے کر اور رحمۃ للعالمین بن کر آئے تھے اور اس حکومت کا جو حضورؐ کے متبعین نے قائم کی تھی یہ ہرگز مقصد نہیں تھا کہ انسان اتنا حریص، عیش کوش اور لذت چشم وگوش کا ایسا شدید دیوانہ ہو کر رہ جائے۔

ظاہر ہے کہ جب سارے اقتدار پر ایسے ہی لوگوں کا قبضہ ہو جو تحریک اسلام کے مقاصد سے بے خبر ہوں، اور نہیں چاہتے ہوں کہ اس تحریک کے ذریعہ ان کی عیش وعافیت کی زندگی میں کوئی انقلاب آئے، تو ان بزرگوں کے لئے اس کے سوا کوئی اور راہ نہ تھی کہ وہ اپنی تحریک کو خفیہ رکھتے اور صرف ان ہی لوگوں پہ ظاہر کرتے جن کی پوری طرح تربیت کر چکنے کے بعد اُن سے اقرار وفاداری (بیعت) لے لیا جاتا، چنانچہ یہی طریقہ رائج کیا گیا اور آج تک یہ طریقہ حضرات صوفیہ میں رائج ہے کہ بعض اسرار تصوف بیعت سے پہلے طالب پر ظاہر نہیں کئے جاتے، اگرچہ اب یہ سب محض رسمی صورتیں رہ گئی ہیں اور اصل تحریک مدت سے مُردہ ہے لیکن رسنا اور واجاب بھی بہت سی باتیں ان میں دکھائی دیتی ہیں۔

خانقاہی نظام کی ترتیب یہ تھی۔

(۱) شیخ، کسی تربیت گاہ کا افسر اعلیٰ، اس کے ذمہ یہ فرایض تھے کہ وہ افراد کی تربیت کرے اور ان میں اعلیٰ کردار، اعلیٰ اخلاق اور جفاکشی وخود شکنی کی عادت پیدا کرے تاکہ کسی صالح نظام کے چلانے کے لئے جب ان کی ضرورت ہو تو یہ کام آسکیں۔ کہیں کہیں یہ شیوخ دعاۃ بھی مقرر کرتے تھے تاکہ لوگوں کو تربیت حاصل کرنے کی طرف راغب کریں۔

(۲) اوتاد، سب ڈویژن افسران، اس کے ماتحت چند شیوخ ہوتے تھے اور یہ ان سب کی تربیت گاہوں کی نگرانی کرتا تھا۔

(۳) اعماد، ضلع کے افسران

(۴) اقطاب، چند اضلاع یا صوبہ جات کے افسران،

(۵) ابدال، یعنی انسپکٹرس، ان بزرگوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ اکثر اوقات سفر میں رہیں اور اپنے اپنے مقررہ حلقوں سے تربیت گاہوں کے حالات کا معائنہ کر کے ان کے متعلق اپنی رپورٹیں اقطاب کو اور بشرط ضرورت فرد کو بھیجا کریں۔

(۶) فرد، پوری تحریک کو چلانے والا شخص، اور تمام عہدہ داران خانقاہ کا افسر اعلیٰ بشیوخ، اوتاد، اعماد، اقطاب اور ابدال، سب کا تقرر فرد کیا کرتا تھا۔

(۷) غوث، وہ شخص جو خانقاہ اور اس کے عہدہ داروں کے مابین پیدا ہونے والے مقدمات کے فیصلے کرتا۔ گویا نظام عدالت کا افسر اعلیٰ یا چیف جسٹس۔

اگرچہ کسی غوث کا تقرر فرد کا اختیاری امر تھا لیکن خود فرد بھی اس کے عدالتی احکام کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تھا اور چونکہ یہ لوگ تربیت کی بڑی کٹھن منزلوں سے گذر کر اتنے ذمہ دارانہ عہدوں پر سرفراز ہوتے تھے۔ اس لئے ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا جس میں غوث اور فرد کے مابین اختلاف آرا نے کوئی نازک صورت اختیار کر لی ہو۔

مقصد اس عظیم الشان تحریک کا یہ تھا کہ افراد انسانی کی صحیح تربیت کر کے انھیں اتنا بلند نظر بنا دیا جائے کہ وہ انفرادی منافع اور مفادات کو جماعتی اور خالص انسانی منافع ومفادات کے مقابلہ میں آسانی اور خوشی کے ساتھ قربان کر سکیں۔

افراد کی تربیت سے ایک صالح اور بہتر معاشرہ پیدا ہو جائے گا جس میں یہ طاقت پیدا ہو جائے گی کہ کسی وقت وسعت وتنظیم کے بعد حکومت واقتدار کو [illegible] اور کم نظر افراد سے چھین لے۔ اس طرح یہ دینی وسیاسی تحریک تھی جو مدتوں چلتی رہی۔

شاید آپ یہ خیال کریں کہ یہ تحریک ناکام ہی رہی، یہ صحیح ہے کہ پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی لیکن یہ واقعہ ہے بالکلیہ ناکام بھی نہیں، تیسری صدی اور اس کے

بعد سے ہر زمانہ میں اور ہر ملک میں ہمیں ایک کش مکش دکھائی دیتی ہے دربار اور خانقاہ کے مابین ایک شدید قسم کی کش مکش ہر جگہ نمایاں ہے۔ یہ کش مکش ارباب اقتدار کو اعتدال پر قائم رکھنے میں بڑی مدد و معاون ثابت ہوئی ہے۔ جہاں کہیں ارباب اقتدار نے خانقاہوں کو دبانے میں کامیابی حاصل کرلی، وہاں آپ کو درباری پیر اور شاہی درویش قسم کے لوگ دکھائی دیتے ہیں اور جہاں اہل خانقاہ نے اہل دربار کو دبالیا۔ وہاں ناصر الدین قباچہ، محی الدین عالمگیر اور شمس الدین التمش نظر آتے ہیں۔ باقی ساری مدت کش مکش میں بسر ہوتی رہی۔ کبھی محی الدین سید عبد القادر الجیلانی دربار بغداد سے برسرپیکار اور کبھی شیخ ولی الدین اسکندرانی دربار مصر سے اُلجھے ہوئے،

کسی خانقاہ میں تربیت کا جو طریقہ اختیار کیا جاتا تھا اسے اگر خالص فنی نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اپنے وقت کا بڑا ہی ماہر نفس اور کامل و اکمل شخص ہوتا تھا جو اپنے شاگردوں کی تربیت سے پہلے عمیق غور و فکر کے ساتھ ان کے نفسی امراض کی تشخیص کرتا تھا۔ اس کے بعد ان امراض کے علاج کی طرف متوجہ ہوتا اور ہمہ وقت مریض پر نگرانی رکھتا، پھر جب اس شخص سے امراض نفسی کا ازالہ ہوجاتا تو غور سے اسے دیکھتا کہ وہ کوئی عظیم تر ذمہ داری قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرسکتا ہے یا نہیں، اگر وہ اس قابل پایا جاتا ہے کہ کسی بڑے اور عظیم مقصد کے لئے اس کی تربیت کی جائے تو تربیت کرتا، ورنہ اسے کوئی معمولی سا غیر اہم کام مثلاً اہل خانقاہ کی خدمت، لنگر خانے کا انتظام، درس تدریس وغیرہ سپرد کردیا جاتا۔

ایک شیخ ان سارے مراحل تربیت یعنی تشخیص، معالجہ، تربیت، تصفیہ وغیرہ میں جہاں کہیں ضروری سمجھتا اپنے بالادست افسروں کی امداد طلب کرتا، کبھی اوتاد، اعماد، اقطاب سے اور کبھی ان سے بھی بالا افسروں سے امداد طلب کرتا، بعض مرتبہ یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک شخص اپنے مُرید کو مزید اعلیٰ تربیت کے لئے اقطاب یا افراد کی خدمت روانہ کردیتا۔ آپ کو تذکروں میں ہزاروں ہی واقعات اس قسم کے مل جائیں گے کہ کسی شخص نے تربیت یا معالجہ کی ایک خاص منزل پر مُرید کو اپنی خانقاہ سے کسی دوسرے بزرگ کی خانقاہ کو بھیجدیا۔

بعض مرتبہ اہم انسانی خدمات کے لئے خانقاہوں سے کام لیا جاتا تھا لیکن اس پروگرام کا مقرر کرنا غالباً فرد کے علاوہ کسی دوسرے کے اختیار میں نہ ہوتا تھا اور جب فرد کوئی ایسا فیصلہ کردیتا تو اس کے متعلق احکام تمام اقطاب، اوتاد، اعماد و ابدال کو دے دیئے جاتے اور اسی کے بموجب عمل ہوتا۔ چنانچہ شہاب الدین محمد غوری کی امداد کے لئے بھی ایسے ہی احکام دئے گئے تھے۔ حضرت سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللّٰہ علیہ کو اس خاص مقصد کے لئے دیار ہند کی قطبیت اور افسران اسپشل ڈیوٹی کی حیثیت دی گئی تھی اور ان کو اس سلسلہ میں آخری اختیارات حاصل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب شہاب الدین غوری براہ سندھ اجمیر کی طرف روانہ ہوا تو راستہ کی ہر خانقاہ سے مجاہدین مع اسلحہ و رسد اُس کے ساتھ ہوتے گئے اور میدان جنگ میں غوری کے لشکریوں کی تعداد اس تعداد سے کئی گنی دکھائی دیتی ہے جو ابتداءً تخت گاہ سے روانگی کے وقت اس کے ساتھ تھی۔

طریقہ تربیت

خانقاہوں میں تربیت کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی شخص تربیت کی غرض سے خانقاہ میں داخل ہوتا تو اسے ابتداءً خانقاہ کے مہمان خانۂ عام میں رکھا جاتا۔ یہاں کا ماحول، ڈسپلن، خدا ترسی، دینداری سے وہ آہستہ آہستہ اثر پذیر ہوتا۔ اس اثناء میں شیخ اس شخص کا مطالعہ کرتا رہتا اور چونکہ انسان کانوں سے نہیں بلکہ آنکھوں سے متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے طالب پر جو اثرات اس ماحول سے اور خصوصاً شیخ کی شخصیت سے مرتب ہوتے، اس کا عمیق مطالعہ کیا جاتا۔ اس کے بعد خود طالب میں آگے کچھ معلوم کرنے اور سیکھنے کی تمنا کو بیدار کیا جاتا اور اس کی طلب پر بار بار ٹال دیا جاتا تاکہ طالب میں تمنا قوی سے قوی تر ہوجائے۔ اس کے بعد اس کے دو جذبات کی اصلاح کی جاتی، ایک جذبۂ خوف، اور دوسرا جذبۂ محبت۔ انسان کے نفسی اعمال میں خوف کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ سارے جذبات اس کے مقابلہ میں دب جاتے ہیں، اسی خوف کی زیادتی انسان کو وہمی، بُزدل، پست ہمت اور کاہل بنادیتی ہے اور اس کی کمی، سنگدل، بے رحم، درندہ، لاابالی اور ناکارہ کردیتی ہے۔ اس لئے سب سے پہلے شیخ اپنے طالب کے قلب سے ماسوا اللّٰہ کا خوف (یعنی وہ خوف جو مضر ہے) نکالتا اور اس احتیاط کے ساتھ نکالتا

کہ خدا کا خوف اور خدا سے محبت توازن کے ساتھ اس کے قلب میں جاگزین ہو جائے۔ اسی لئے کہ اگر خوف بالکلیہ ختم ہو جائے تو انسان ایسا نڈر اور اس قدر بے رحم ہو جائے گا کہ کسی کام کا نہ رہ سکے گا۔

یہ بڑا مشکل کام ہوتا جب کوئی شخص خانقاہ میں داخل ہوتا تو اس کا قلب مختلف قسم کے خوف سے دبا ہوتا۔ کہیں بادشاہ کا خوف، کہیں دولت و عظمت کا خوف، کہیں اپنی عزت و شان کے ضیاع کا خوف، کہیں بیوی بچوں کی ناراضی کا خوف وغیرہ وغیرہ

اب شیخ کے لئے کس قدر مشکل کام ہوتا کہ اسے خدا کے سوا باقی سب سے بے نیاز بنائے اور اس نزاکت و کمال کے ساتھ بے نیاز بنائے کہ خدا کا خوف مع جذبۂ محبت کے اس کے قلب میں جاگزین ہو جائے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک شخص اس لئے آہستہ پیر رکھتا ہے کہ قریب میں سویا ہوا شیر نہ جاگ اُٹھے۔ دوسری جگہ پر وہی شخص اس لئے آہستہ چلتا ہے کہ بیمار باپ کی نیند نہ خراب ہو۔

ایک حاضر و ناظر خدا، ایک سمیع و بصیر مالک کا اس یقین پیدا کر دینا کہ آدمی اس کی محبت کی وجہ سے اس کی ناراضی سے خوف کھا رہا ہو کتنا مشکل کام ہے لیکن شیوخ خود اپنی ذات کو نمونہ بنا کر پیش کرتے اور رحمت و رافت کے ساتھ طالب کی تربیت کرتے۔ یہاں تک کہ اس میں یہ کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اس کو اصطلاح خانقاہ میں "السیر الی اللہ" کہتے ہیں۔ اس کیفیت کی شدت اگر صحیح طور پر تربیت نہ ہو تو آدمی کو ناکارہ بنا دیتی ہے۔ اس لئے شیخ اسے سنبھالتا۔ اور اس کے جذباتِ محبت کو اعتدال میں رکھتا۔

اس مقام پر انسان کو جان و مال کے ضیاع کا خوف کسی برتر مقصد کے لئے عمل کرنے سے نہیں روک سکتا۔ اور ایک ایسا شخص تربیت پا کر تیار ہو جاتا جس کا وجود تمدن کے لئے رحمت ثابت ہو سکے۔ اب اس کے بعد اس سے باقاعدہ اقرارِ وفاداری (بیعت) لیا جاتا۔ سوال ہوتا کس سے وفاداری؟ جواب تھا، اللہ سے وفاداری، اللہ کے رسول سے وفاداری، اُس مقصد سے وفاداری جو شجرِ رضوان کے نیچے بیعت لیتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر تھا اور سب جانتے ہیں کہ بیعتِ رضوان بیعتِ ایمان نہ تھی۔ بیعتِ ایقان نہ تھی، بلکہ بیعتِ جہاد او مر مٹنے کی بیعت تھی اور اس بات کو ثابت کرنے کے لئے شیخ براہِ راست نیابتِ رسول کے فرائض انجام دے رہا ہے، اسے ایک شجرۂ شیوخ دیا جاتا جس میں شیخ اپنے سلسلہ کی کڑی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا دیتا تاکہ مرید کے قلب میں شیخ کے مستند معلّم یا افسر تربیت گاہ ہونے کا یقین پیدا ہو جائے۔ خانقاہوں میں بیعت کے بعد بھی مدتوں بلکہ بعضوں کو ساری عمر قطب، اوتاد، فرد وغیرہ کے ناموں کی خبر نہ ہوتی۔ البتہ غوث کے نام کی اطلاع سے دی جاتی تاکہ وہ مساوی حقوقِ عدالت سے بہرہ اندوز ہو سکے۔ بعض ایسے لوگوں نے جن کے مقاصد اعلیٰ نہ تھے، اس طریقہ تنظیم کی نقل کر کے اپنی اپنی جماعتیں بنا لیں اور بڑے بڑے فتنے پیدا کر دئیے۔ لیکن چونکہ ان کا مقصد طلبِ جاہ اور اقتدار پرستی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لئے فوراً ہی ان کی تنظیم ایک خونیں اور جبروتی حکومت بن گئی جو مختصر اور محدود بھی تھی اور نامسعود و نامحمود بھی۔

اس کے برخلاف اصل خانقاہی تنظیم شاخ در شاخ ہو کر منتشر ہو جانے کے بعد بھی مدتوں اسلامی نظریہ حیات کے پھیلانے میں امید سے بہت ہی کم سہی۔ لیکن کسی نہ کسی قدر کارآمد ثابت ہوتی رہی۔ تا آنکہ اہلِ خانقاہ خود ان ہی امراض کے شکار نہ ہو گئے جن کے ازالہ کے لئے یہ تحریک شروع کی گئی تھی۔

تاریکی سے روشنی کی طرف

گیتھ مین

آیئے۔ آج ہم بڑی سچائی، بڑے خلوص سے یہ سوچیں۔ کہ ہماری کتنی مصیبتیں ہماری اپنی لائی ہوئی مصیبتیں ہیں اور ان کا ہماری قسمت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

شکست کے بعد تو سب ہی بدبختی کے سر الزام تھوپ دیتے ہیں اور احساس شکست کو "خدا کی مرضی" کہہ کہہ کر تسکین پہنچاتے ہیں۔ یقین مانئے یہ اشرف المخلوقات کے شایان شان نہیں

کیا ہم میں اتنی ہمت ہے کہ ہم قسمت یا "خدا کی مرضی" کو مورد الزام ٹھیرانے کی بجائے خود اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کریں، زندگی کو کامیاب بنانے کی... نو آتی تو ہمت پیدا ہی کرنا ہوگی کہ خود اپنا جائزہ لیا جا سکے۔

خیر۔ اگر اب تک ہم ایسا نہیں کر سکے ہیں۔ تو آیئے۔ آج سے شروع کریں۔ اور شروع کرنے کی خاطر سے اپنی گذشتہ ناکامیوں میں سے کچھ کے متعلق سوچیں ——————— اگر ہم نے واقعی میں کوشش کی ہوتی تو کیا وہ کام پورا نہ ہوا ہوتا ——————— کیا اس اوھورے کام کی اور ہی شکل نہ ہوتی اگر اس کے متعلق خوب سمجھ بوجھ لیا جاتا؟ ——————— کیا ہم کو اس بات کا اعتراف نہیں ہے کہ اگر ہم اپنی اندرونی طاقتوں کو کام میں لاتے تو آج صورتِ حال بدلی ہوئی ہوتی؟ ——————— کیا ہم اس سے بھی متفق ہیں کہ اگر ہمارے انداز مختلف ہوتے تو نتائج بھی مختلف ہوتے؟

یہ اشارے تو محض تجزیہ نفسی کو بیدار کرنے میں مدد دیں گے۔ کام کا پورا ہونا نہ ہونا تو ہم پر ہے۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اگر ہم خود اپنے کو اچھی طرح سمجھے ہوتے، اپنی دماغی طاقتوں کو زنگ آلود نہ ہونے دیتے تو ہماری موجودہ زندگی کے کچھ اور ہی طور، ہمارے ماحول کی بے رنگی میں کچھ اور ہی رنگ ہوتے؟

عذر لنگ

لیکن جب ہم سے اپنی ناکامیوں کی وجہ پوچھی جاتی ہے تو اکثر اس قسم کے عذر لنگ ہماری زبانوں سے ادا ہونے لگتے ہیں

"مجھ کو کامیاب زندگی گذارنے کا موقعہ ہی کب ملا ———————

ماں باپ نے تعلیم ہی اتنی نہیں دلائی تھی کہ کسی عہدہ پر فائز ہوتا۔ لامحالا مجھے جو بھی کام۔ جو بھی نوکری ملی۔ اسی کو غنیمت جان کر قانع ہو گیا ——— اور چارہ ہی کیا تھا۔ اور اب اس دلدل سے نکلنے کی صورت ہی کیا ہے؟"

ان وجوہ میں کتنی ہی سچائی کیوں نہ ہو لیکن رونا تو اس بات کا ہے کہ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ بالکل ہی اتنی تعلیم یافتہ اور ایسے ہی اقتصادی الجھنوں میں پھنسے ہوئے ہزاروں افراد موجود ہیں جو آج ہم سے بہتر زندگی گذار رہے ہیں۔

اہمیت ان مواقع کی نہیں ہے جو ہم کو ملتے ہیں۔ بلکہ سارا دارومدار تو ان مواقع پر ہے جو ہم خود پیدا کرتے ہیں۔ دیکھنے کی بات یہ نہیں ہے کہ ہم نے زندگی کیسے شروع کی بلکہ دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ ہم کہاں سے کہاں پہنچے ہیں

کہاں ہیں ہماری وہ "خیالی" ناکامیاں ذرا وہ اپنے کو کسوٹی پر پرکھنے تو دیں۔ مانا کہ تعلیم کم تھی۔ اقتصادی دشواریاں گلے پڑی ہوئی تھیں لیکن وہ وقت جو ہم نے اپنی قسمت پر آنسو بہاتے میں گنوایا ہے۔ وہ وقت مزید تعلیم حاصل کرتے، اپنے کاروبار میں زیادہ معلومات بہم پہنچانے میں کیوں نہ صرف کیا گیا؟ ——— وہ یہ بھی تو دیکھیں کہ انہوں نے کبھی اپنے کام میں ——— خواہ وہ کتنا ہی ذلیل کیوں نہ معلوم ہوتا ہو، پوری دلچسپی نہیں لی۔ اور مضحکہ خیز بات تو یہ ہے کہ انہوں نے کبھی اس دلدل سے نکلنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

طاقتوں کا اجتماع

کسی کام کے وقت ہم میں دو قسم کے خیالات ابھرتے ہیں۔

میں یہ کام کر سکتا ہوں

میں یہ کام نہیں کر سکتا

وہ لوگ جو کام کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ وہ بڑی سے بڑی دشواریوں کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

ہو سکتا ہے کہ کوئی یہ کہے کہ "میں ایجابی بننا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ ممکن ہی کب ہے" اور میرا خیال ہے کہ ہم سب کبھی نہ کبھی ایسا محسوس کرتے ہیں حالات میں آتی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ ان کو سلجھا کر کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ لیکن یہی "ناممکنات" ——— اگر آپ ان کو ممکن بنانے کے لئے اپنی تمام قوتوں کو اس مرکز پر مجتمع کر لیں۔ تو "ممکنات" بن جاتی ہیں۔

اور یہی زندگی کا حال ہے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ہمارے بیشتر شکوک ہم کو کامیابی سے محروم کر دیتے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنے شکوک کو ہوا نہیں لگنے دیتے اور ناممکن کو ممکن بنانے کی مہم میں جم کر مقابلہ کرنے لگتے ہیں۔ وہ کامیاب ہو کر رہتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ

- ہم اپنی تمام دماغی قوتوں کو کام میں لائیں
- اپنے جذبات پر قابو پالیں
- اپنی خواہشات، اپنے خوابوں کو حقیقی بنانے کی جدوجہد کریں

اور

- اثباتی شخصیت کو اپنائیں۔

یہ تمام اقدام ایک دوسرے پر مبنی ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ ان چاروں میں سے کسی ایک پر عمل کریں۔ اور باقی کو چھوڑ دیں ——— جی نہیں

ایک شخصیت، مختلف شخصیتیں

ممکن ہے کہ آپ نے محسوس کیا ہو کہ آپ کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں۔ مثال کے طور پر ——— ایک صبح کو آپ بہت قنوطی ہوں۔ اور دنیا آپ کو تاریک، تمام دوستوں کو غدار، تمام رنگوں کو بے رنگ پا رہے ہوں ——— دس گیارہ بجے ڈاکیہ آپ کو ایک ایسا خط لا کر دیتا ہے جس میں کوئی اچھا پیغام ہے۔ کوئی خوش خبری ہے۔ بس۔ آپ فوراً بدل جاتے ہیں۔ اور رجائی بن جاتے ہیں۔ ——— دن میں کوئی ایسی

بات ہوجاتی ہے ۔جس سے آپ کی تمام مسرتیں خاک بسر ہوجاتی ہیں ۔ اور آپ غصے سے کانپنے لگتے ہیں ۔ وغیرہ، وغیرہ۔

اس سے آپ کو یہ اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا کہ ہماری شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں ۔ لیکن اگر ہم ان تمام اجزا کو باری باری اپنے پاؤں دیں گے ۔ تو کامیابی ممکن نہیں ہے ۔

اس خطرے سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہماری زندگی کا کوئی ایک مقصد ہو ۔

شخصیت کی مثال آپ گھوڑا گاڑی سے دے سکتے ہیں ـــــــــــ ایک گاڑی میں کئی گھوڑے جتے ہیں ۔ اگر ہر ایک گھوڑے کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیجئے گا کہ جدھر وہ چاہے جائے ۔ تو گاڑی کا حشر کیا ہوگا ۔یہی نا کہ وہ ختم ہوجائے ـــــــــــ اسی طرح اگر آپ کی زندگی کا کوئی ایک ـــــــــــ واضح مقصد نہیں ہے ۔ تو آپ کا بھی وہی حشر ہوگا ۔

مقصد کی قوت

مقصد کی اپنی ایک قوت ہے ۔

آپ اپنی زندگی کے ان ہی خواہشات کو یاد کریں جن کو تکمیل تک پہنچانے میں آپ اپنی زندگی سے بھی کھیلنے کو تیار ہوگئے تھے ۔ تو آپ کو اس سے اتفاق ہوگا کہ ہم اکثر ان خواہشات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں ۔

اس امر سے تو انکار نہیں ہوسکتا کہ ہم شعوری یا لاشعوری طور سے، اپنی زندگی کا مقصد بنا ہی لیتے ہیں ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہم اگر شعوری طور پر اپنی زندگی کا کوئی خاص مقصد نہ بھی بنائیں تو " بس یونہی " زندگی کے دن پورے کرنا، تھوڑا بہت کھانا پینا کرنا، دوستوں میں بیٹھ کر ہنسی مذاق کرلینا، رات آئی ۔ سولینا، تکلیف ہوئی ۔ رو لینا " مقصد حیات " بن جاتا ہے ۔ لیکن یہ میری مراد اس " مقصد " سے نہیں ہے ۔ نفسیاتی نقطہ نظر سے " مقصد " وہ ایک " مرکزی آرزو " ہے ۔جس کو آپ تمام دوسری آرزوؤں پر ترجیح دے سکیں ۔ اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں دینے کے لئے تیار ہوں ۔ اس کو اپنانے کے لئے چٹانوں سے ٹکرانے، مخالف موجوں سے مقابلہ کرنے کی کوشش کریں ۔

تو ـــــــــــ

ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے ـــــــــــ آئیے ۔ ہم اس کی زیادہ سے زیادہ وضاحت کریں ۔ اس کے متعلق ہر پہلو سے سوچیں ۔

شروع شروع میں " ممکن " اور " ناممکن " کے چکر میں نہ پڑیں ۔ ان میں تصحیح، ان میں ترمیم تو بعد کو ہوتی رہے گی ۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ اس کے بعض پہلو ایک دوسرے کی ضد ہوں ۔

یہ تو بالکل فطری امر ہے کہ فرد فرد کے مقصد ایک دوسرے سے جدا ہوں ۔ کچھ دولت کے خواہاں ہوں گے ۔ کچھ شہرت کے ۔ کچھ پرسکون زندگی ہی میں مگن رہیں گے ۔ لیکن یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ زندگی کی ہر خواہش مسرت بداماں نہ ہوگی ۔ مثلاً آج کل کوئی شخص چاہے کہ وہ ساری دنیا پر حکومت کرے، آسمان سے چاند تاروں کو توڑ کر اپنے کمرے کی زینت بنائے ۔ ایسے آدمیوں کا حشر ظاہر کیا ہوگا ۔

تو پھر ـــــــــــ اس کی بھی ضرورت ہے کہ خواہشات کے چاروں طرف ایک دائرہ بنایا جائے جس کے آگے وہ اپنے پیر نہ پھیلا سکیں ۔

بہترین صورت تو یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ " زندگی " خود کیا چاہتی ہے ۔ وہ ہم انسانوں سے کیا کیا توقع رکھتی ہے ۔

میرے خیال میں زندگی کے تین تقاضے ہیں

- کام
- محبت

• سماجی رشتے

زندگی کا یہ تقاضا ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق کام کرے ۔ اور بہتر زندگی کی حالتوں کو پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ لہذا ہماری زندگی کا مقصد کچھ بھی ہو ۔ اس میں "کام" کو ضرور شامل کرنا چاہیئے ۔ ایسے کام جو سماج کی بہتری، اس کی ترقی، اس کی بہبودی کے لئے ہوں۔

زندگی کا دوسرا تقاضا ہے محبت ۔ اس سے مراد ہے زندگی کی شمع کو جلتے رکھنا ۔ ایک سے ایک، ایک سے دوسری ۔

زندگی کا تیسرا تقاضا ہے سماجی رشتے قایم رکھنا ۔ اس سے مراد ہے اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو اپنی طرح زندہ رہنے اور خوش رہنے کا حق دینا ۔ انسان یوں بھی سماجی جانور ہے ۔ وہ بغیر سماج کے زندہ نہیں رہ سکتا ۔ اس کے علاوہ سماجی رشتہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہماری تمام صلاحیتیں سماج ہی میں اپنی تکمیل پہنچا سکتی ہیں ۔

آیئے آج ہم عہد کرلیں کہ ہم تاریکیوں میں دم توڑنے کی بجائے روشنی میں سانس لیں گے اور بہتر سے بہتر حالات پیدا کریں گے ۔

تلخیص و ترجمہ ۔ ادارہ

البیلی صُبح

حضرت جوش ملیح آبادی

نظر جھکائے عروسِ فطرت، جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں، افق کی لَو تھرتھرا رہی ہے

روش روش نغمۂ طرب ہے، چمن چمن جشنِ رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزلخواں، کلی کلی گنگنا رہی ہے

ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگارِ مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے

طیور بزمِ سحر کے مطرب، لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں
نسیمِ فردوس کی سہیلی، گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے

کلی پہ بیلے کی کس ادا سے، پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں، یہ ہیرے کی کیل پہنے کوئی پری مسکرا رہی ہے

سحر کے مدِ نظر ہیں کتنی رعایتیں چشمِ خوں فشاں کی
ہوا بیاباں سے آنے والی، لہو میں سرخی بڑھا رہی ہے

شلوکا پہنے ہوئے گلابی، ہر اک سبک پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا، ہوا میں پلّو ہلا رہی ہے

فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں، ہلال کے گرد و پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی، جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے

کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر، چٹکتی کلیو! ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم رَو میں، یہ کس کی آواز آ رہی ہے

آپ اور میں — نفسیاتی آئینہ میں

پروفیسر علی ناصر زیدی۔ پشاور

انگریزی کی ایک مشہور ضرب المثل ہے "کسی مرد سے اُس کی آمدنی اور کسی خاتون سے اُس کی عمر کبھی دریافت نہ کیجئے"۔ مرد بیچارے کو تو خیر چھوڑیئے۔ وہ تو شاید اپنی آمدنی کا صحیح اندازہ آپکو بتا بھی دے لیکن خواتین ایسے سوالات سے چڑ جاتی ہیں۔ موجودہ زمانہ کا ایک ماہر شخصیت ہر اس عورت سے جو اس سے مشورہ کرنے آتی ہے یہ سوال کرتا ہے "کیا آپ یہ خیال کرتی ہیں کہ آپ حسین ہیں؟" اور اسی طرح مردوں سے وہ یہ سوال کرتا ہے۔ "کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ قبول صورت ہیں؟"

یہ سوال حقیقتاً بڑا ہی پُر فریب ہے اگرچہ بادی النظر میں نہایت سادہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ یہ خیال کرینگے کہ حسین مرد اور عورتیں اس سوال کا جواب اثبات میں دینگے اور بدصورت انسان اس سے انکار کردیں گے لیکن واقعی ایسا نہیں ہوتا ہے۔ قبول صورت مردوں اور عورتوں کی ایک کثیر تعداد یا تو اس کا یقین ہی نہیں کرتی کہ قدرت نے ان کو دولتِ حُسن سے سرفراز کیا ہے۔ اگر آپ اُن کو یقین دلانیکی کوشش بھی کریں تب بھی وہ آپ کی پیشکش کو قبول نہیں کرتے ہیں اور اکثر اوقات وہی لوگ خود بین و خود پسند ثابت ہوتے ہیں جن کے خدوخال معمولی اور غیر متوجہ کن ہوتے ہیں۔

امریکہ کی اوہیو اسٹیٹ یونیورسٹی کے ڈاکٹر ڈکٹر ہیمی نے شخصیت سے متعلق بہت سے مسائل کا تجربہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک شخص اپنی ذاتی وجاہت کے متعلق نہایت غیر معمولی خیال قایم کئے رہتا ہے۔ ماہرین نفسیات اور معالجہ ذہنی کے محققین نے اس حقیقت کا نام بوڈی ایمج (BODY IMAGE) یا جسمانی عکس رکھا ہے۔ ارچہ ہم سب اپنا چہرہ آئینہ میں اکثر او ار دیکھتے ہیں تاہم جو رائے ہم اپنے چہرہ مہرہ کے متعلق قائم کرتے ہیں وہ کبھی بھی اس خیال کا متماثل نہیں ہوتا ہے جو دوسرے آدمی ہمارے متعلق قائم کرتے ہیں۔

حال ہی میں ڈاکٹر ہیمی نے بتایا ہے کہ "جسمانی عکس" انسانی زندگی کے اوّلیں دور میں آہستہ آہستہ جگہ پکڑتا ہے۔ ہم مستقل طور سے اس کوشش میں مصروف رہتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو اسی طرح دیکھ سکیں جس طرح دوسرے لوگ ہم کو دیکھتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہو پاتا ہے۔ اپنی وجاہت کے متعلق ہم جو رائے قائم کرلیتے ہیں اسکی حدود سے باہر نکلنا ممکن ہی نہیں ہے۔" ڈاکٹر موصوف نے اپنے مخاطب کے سامنے ہی ایک فائل نکالا اور اسے کھول کر کہا "اس کو دیکھئے۔ یہ کیس آپ کو میرے نظریات کی زیادہ درخشاں تصویر پیش کرے گا۔"

یہ کیس ایک انیس (۱۹) سالہ لڑکے کا تھا جو لفظ "گردن" کے ذکر پر ہمیشہ تکلیف محسوس کرتا تھا۔ اس کو یہ یقین دلایا جاچکا تھا کہ اس کی گردن طول اور دبازت میں معمول سے کم ہے۔ جب کبھی وہ کسی آئینہ کے سامنے سے گذرتا تھا وہ رُک جاتا تھا اور اپنے عکس کو بغور دیکھتا تھا اور ہمیشہ یہ خواہش کرتا تھا کہ کسی صورت اس کی گردن کچھ زیادہ لمبی اور موٹی ہوجائے۔

اس لڑکے کو یہ یقین ہوچکا تھا کہ جب کبھی کوئی شخص اس کے جسم پر نظر ڈالتا ہے تو اُس کی دُبلی پتلی گردن کا مذاق اُڑاتا ہے۔ اپنی گردن کے متعلق اس کا احساس ناپسندیدگی اس حد تک پہنچا کہ اس نے اپنے لئے ایک خاص ورزش دریافت کی اور اس پر عمل کرنا شروع کیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخرکار وہ لڑکا اتنا پریشان ہوا کہ اس نے اپنا حلقوم کاٹ کر خودکشی کرڈالی۔ یہ منحوس واقعہ جسم کے ایک حصّہ کے متعلق حد درجہ ناپسندیدگی کے بالنتیجہ ظہور میں آیا۔ ہم میں سے بہت سے آدمی اپنے جسم کے بعض حصّوں کے متعلق اسی قسم کے احساسات رکھتے ہیں لیکن ہم اس حد تک نہیں پہنچتے ہیں۔ ہم اکثر ایسے آدمیوں سے ملتے ہیں جنکی ناک بہت بڑی ہوتی ہے یا ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں یا وہ معمول سے زیادہ لمبے ہوتے ہیں اور وہ ہمیشہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اُن کا مخاطب اُن کے جسم کے ایسے ہی حصّوں کو دیکھ رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جسم کے ایسے حصّے بہت کم دوسرے آدمیوں کے مشاہدہ میں آتے ہیں۔ بعض اوقات بہت سے آدمی اپنے جسم کے بعض حصّوں کے متعلق ضرورت سے زیادہ احساسِ ناپسندیدگی رکھتے ہیں۔ ایک نوجوان عورت اپنے شانوں کو اس درجہ

پسند کرتی تھی کہ وہ اُن کی نمائش کے لئے موقعہ کی تلاش میں رہتی تھی۔ وہ ایسے گاؤن یا جُبّے پہنا کرتی تھی جو فیتوں سے پاک ہوں اور جس قدر زیادہ ممکن ہوتا تھا سبک رفتاری کے ساتھ خوش خرام رہتی تھی۔ اپنے شانوں کے متعلق اس کا یہ احساس پسندیدگی زیادہ سنجیدہ مسائل سے بچنے کا ایک طریقہ تھا۔ گھریلو حالات سے ناسازگاری اور خانہ داری میں غیر دلچسپی اس کا بدیہی نتیجہ تھے۔

معالجہ دماغ کے محققین کے مشاہدہ میں اس قسم کے بہت سے واقعات آتے رہتے ہیں اور ہر مرتبہ بجز چند معاملات کے جہاں جسم کے بعض حصے واقعی بدنما ہوتے ہیں، تمام حالات میں قوت تخیل کا پرواز نظر آتی ہے۔ ذاتی وجاہت کے متعلق یہ غلط فہمی صرف جسم تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ اس کا حلقہ ان کپڑوں تک پہنچتا ہے جو آپ پہنتے ہیں، وہ مکان جس میں آپ رہتے ہیں اور وہ کار جس میں آپ سفر کرتے ہیں ——— ہر وہ شے جو نفسیاتی نقطۂ نظر سے آپ سے قریب ہے۔ آپ کی آواز بھی ان چند چیزوں میں سے ایک ہے۔ بہت سے آدمی جب اپنی آواز کا ریکارڈ پہلی مرتبہ سنتے ہیں تو ان کو اچھا خاصا صدمہ پہنچتا ہے۔ بول چال کے وقت ہم جس طرح اپنی آواز کو خود سنتے ہیں دوسرے آدمی اسکو بالکل مختلف طور پر سنتے ہیں۔ ایک نوجوان شخص کو یہ شوق ہوا کہ وہ ریڈیو پر اعلان کرنے کی ملازمت اختیار کرے۔ اس کے دوستوں نے اس کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کی آواز ناخوشگوار ہے لیکن نوجوان اصرار کرتا رہا اور اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے اپنی آواز کا ریکارڈ سنا۔ اس نے برافروختہ ہو کر کہا "میری آواز ایسی نہیں ہے۔" ہدایت کار نے جواب دیا، "آپ کے نزدیک ایسا نہیں ہے لیکن حقیقتاً یہ آپ ہی کی آواز ہے اور آپ اسی لہجہ میں ہزاروں آدمیوں سے مخاطب ہوں گے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو اس جگہ کے لئے منتخب نہیں کر سکتا۔" اپنی آواز کے متعلق غلط رائے قائم کر لینے کی وجہ سے اس شخص کو اس شوق پر پانچ سال تباہ کرنا پڑے۔

نیویارک کے بلیوو ہسپتال میں معالجۂ دماغ کے پروفیسر ڈاکٹر پال شلڈر نے یہ دریافت کیا ہے کہ مختلف قسم کے واقعات ہمارے اس وہم و گمان پر اثر انداز ہوتے ہیں جو ہم اپنے متعلق قائم کئے رہتے ہیں مثلاً ڈاکٹر موصوف کی رائے میں سخت قسم کے جھگڑے جسمانی وزن پر نمایاں طور سے اثر انداز ہوتے ہیں کیونکہ ہمارے خیالات و احساسات کا اثر ہمارے قویٰ پر براہ راست پڑتا ہے۔ ہماری قائم کردہ غلط فہمیاں ہمارے جسمانی اعصاب سے براہ راست متعلق ہوتی ہیں۔

جسمانی غلط فہمی میں بہت سی غیر معمولی تبدیلیاں اُن لوگوں میں دیکھی گئی ہیں جو اکثر بیمار رہتے ہیں۔ نیویارک کے ایک ممتاز محقق اور معالج نے یہ اعلان کیا ہے کہ "بہت سے آدمی جنکی شخصیت میں کوئی نقص ہوتا ہے اکثر اوقات "جسمانی غلط فہمی" کا شکار ہوتے ہیں اور میں ایسے مواقع پر ہمیشہ دماغی بیماری کی تشخیص کرتا ہوں۔" دماغی ہسپتال ایسے مریضوں سے بھرے پڑے ہیں جو اپنے جسم کے متعلق قطعی رائے قائم کئے ہوئے ہیں۔ ایک مریض کی تو یہ کیفیت دیکھی گئی ہے کہ وہ یہ یقین کرتا تھا کہ اس کے تین بازو اور تین ٹانگیں ہیں۔ ڈاکٹروں نے اس کو ہر ممکن طریقہ سے یہ سمجھایا کہ اس کا جسم بالکل معمول پر ہے لیکن ان کی کوششیں رائیگاں گئیں۔

ایک دوسرے مریض کا یہ خیال تھا "میں اتنا بڑا ہوں کہ مشکل سے ہی کسی کمرے میں سما سکتا ہوں یا کسی دروازہ سے آسانی سے نکل سکتا ہوں۔" وہ اکثر ہسپتال کے کمروں کے سامنے کے راستے سے گذرتا تھا، جب کبھی وہ کسی دروازے سے گذرتا تھا، ہمیشہ ضرورت سے زیادہ جھکتا تھا۔ وہ دلیرانہ طور سے سیدھا ہو کر صرف اس وقت چلتا تھا جب وہ کمروں سے باہر کھلے آسمان کے نیچے ہوتا تھا۔ وہ سنجیدگی کے ساتھ کہا کرتا تھا "میں اپنے چلنے کے لئے اسی وقت کافی سمجھتا ہوں جبکہ زیر سایۂ فلک ہوتا ہوں۔" اور ہسپتال کے ریکارڈ کے مطابق اس کا طول صرف پانچ فٹ تین انچ تھا۔

جسمانی غلط فہمی نے علمِ طب اور نفسیات میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس سے کوئی عملی کام نکالنا آسان نہیں تھا۔ ماہرینِ نفسیات کو سب سے پہلے ایک طریقہ دریافت کرنا پڑا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ لوگ اپنے جسم کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ ہر شخص سے اُسکے جسم کے متعلق ایک خاکہ تیار کرایا جاتا ہے۔ آپ اپنے جسم کی کیسی ہی تصویر بنائیں، خواہ وہ کتنی ہی بھدی کیوں نہ ہو، وہ آپ کی شخصیت سے متعلقہ چند پیچیدہ اور پوشیدہ پہلوؤں کو روشن کر دیتی ہے۔ آپ کی ڈرائنگ سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ آپ کس قسم کے آدمی ہیں بلکہ وہ یہ بتا دیتی ہیں کہ آپ اپنے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔

ماہرِ نفسیات آپ کو ایک پنسل اور کاغذ کا ایک تختہ دیدیتا ہے اور آپ سے اپنی تصویر کھینچنے کے لئے کہتا ہے۔ جب یہ تصویر پوری ہو جاتی ہے تو وہ آپ کو کاغذ کا ایک اور تختہ دیدیتا ہے اور آپ سے کہتا ہے کہ آپ اپنی ایسی تصویر بنائیں جیسا کہ آپ خود بننا چاہتے ہیں۔ جہاں تک آپ کی ذات کا تعلق ہے آپ سے صرف یہ دو تصویریں حاصل کی جاتی ہیں اور باقی کام ماہرِ نفسیات خود انجام دیتا ہے۔ آپ اچھی ڈرائنگ بنانا جانتے ہیں یا نہیں، اسکا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر آپ پنسل پکڑنا جانتے ہیں تو آپ ضرور ایک ڈرائنگ تیار کر سکتے ہیں۔ خواہ وہ کیسی ہی ہو، ماہرِ نفسیات کا منشا اس سے حاصل ہو سکتا ہے۔

لوگ جب اپنی تصویریں بناتے ہیں تو صحیح العقل انسان ایسی تصویریں پیش کرتے ہیں جو واقعی حقیقت نگار ہوتی ہیں۔ ایک ماہر نفسیات نے بتایا: "جب ہم مختلف آدمیوں کی بنائی ہوئی تصویروں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم بہت سی باتوں کو ملحوظ رکھتے ہیں حتّٰی کہ وہ لکیریں بھی کافی اہم ہوتی ہیں جن سے ڈرائنگ مکمل کی جاتی ہے۔ جو لوگ ٹیڑھی ترچھی غیر مسلسل یا ہلکی لکیریں کھینچتے ہیں غالباً شرمیلے اور ڈرپوک ہوتے ہیں یا اسکا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ لوگ خوفزدہ رہتے ہیں اور اپنے تئیں غیر محفوظ محسوس کرتے ہیں۔ جھگڑالو اور فسادی لوگ موٹی موٹی لکیریں کھینچتے ہیں اور یہی حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو عضلاتی بے چینی محسوس کرتے ہیں۔"

بہت سے آدمی اپنی تصویر بنانے میں پانچ سے دس منٹ تک کا وقفہ لیتے ہیں لیکن بعض آدمی ایک منٹ سے کم وقفہ میں ہی اپنا خاکہ تیار کر دیتے ہیں۔ یہ رفتار کسی شخصیت کے متعلق، منفرد اور کیفیت کا پتہ دیتی ہے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شخص اس امتحان کو کچھ زیادہ اہم نہیں سمجھتا ہے۔ اسکے برخلاف اگر آپکو تصویر مکمل کرنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ وقت لگ جائے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ایک مدعیٔ کمال انسان ہیں اور ہر کام کو ٹھیک طریقہ سے انجام دینے کی عادت رکھتے ہیں یا آپ حد سے زیادہ با اصول واقع ہوئے ہیں۔

بہت سے انسان اپنے متعلق قطعی غلط رائے قائم کئے رہتے ہیں اور اپنے تئیں غیر دانستہ طور پر دھوکہ دیتے رہتے ہیں۔ ٹوم جینکنس ایک دیہاتی کریانہ کی دوکان پہ کلرک تھا۔ وہ اس قدر بدصورت تھا کہ کسی انجمن میں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ جو آدمی اس کو ایک دفعہ دیکھ لیتا تھا دوبارہ اس پر نظر ڈالنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اسکے باوجود جب ٹوم نے اپنی تصویر بنائی تو وہ ایک رنگین تصویر کا ایک شاہکار تھی۔ وہ اس نفسی کیفیت میں مبتلا تھا جس میں انسان اپنی ذات کو کامل سمجھتا ہے اور جس کو جائز طور پہ خود پرستی کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ایک بدصورت لڑکی نے اپنی تصویر ایسی بنائی گویا وہ ایک قبول صورت دوشیزہ ہے۔ باوجودیکہ وہ اکثر آئینہ دیکھتی تھی اور اپنے متعلق حقیقتِ حال سے آگاہ تھی۔ اس نے اپنی آمدنی میں سے ایک ایک پائی اس کورس پر خرچ کر ڈالی جو عورتوں کو حسین بننے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس عورت کی غلط فہمی اس کو ایک غلط منزل کی طرف لے جارہی تھی۔

جب آدمی ایسی تصویریں بناتے ہیں جیسا کہ وہ بننا چاہتے ہیں تو وہ خواب کی دنیا میں پرواز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پست قامت آدمی اپنے تئیں دراز قد ظاہر کرتے ہیں۔ جو عورتیں فربہ اور بھدی ہوتی ہیں وہ اپنی تصویروں میں اپنے آپ کو دبلا پتلا ظاہر کرتی ہیں۔ گنجے آدمی اپنے سروں پر بال دکھاتے ہیں۔ تنگ پیشانیاں کشادہ پیشانیوں میں بدل جاتی ہیں۔ لمبی ناک کی جگہ چھوٹی ناک آجاتی ہے یہاں تک کہ تصویروں میں ان خواہشات کا اظہار بھی کر دیا جاتا ہے جن کی وجہ مصوّر کو خود معلوم نہیں ہوتی ہے۔ اس قسم کی تصویروں سے انسان کی ذہانت کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ تصویر جس قدر جامع ہوگی مصوّر کی ذہانت کا معیار اتنا ہی بلند ہوگا۔ پست ذہانت کی ایک نشانی یہ ہے کہ تصویر بنانے والا ایک دائرہ بنائے اور اس میں آنکھیں، ناک اور منہ دکھلائے اور پھر اسی دائرے میں سے ہاتھ اور پیر نکال دے۔ چھوٹے چھوٹے بچّے اسی قسم کی تصویریں بناتے ہیں اور ہسپتالوں کے ایسے مریض جنکے دماغ کمزور ہو جاتے ہیں، اسی عمل کے مرتکب ہوتے ہیں۔

کنیڈا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ہر حصہ میں ہسپتالوں میں اس قسم کے امتحانات عام ہیں۔ جیل خانوں میں قیدیوں کی دماغی کیفیت کا اندازہ لگانے کے لئے یہی طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ سکولوں میں جو لڑکے بدتمیزی کرتے ہیں ان کی اندرونی کیفیات کا اندازہ کرنے کے لئے بھی اسی حربہ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے کارخانوں میں تکلیف دہ مزدوروں کو بھی اسی معیار پر پرکھا جاتا ہے۔ یتیم خانوں میں سے جو بچّے گود لئے جاتے ہیں اُن سب کو اس امتحان سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ ایک اور جگہ جہاں یہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے سان فرانسسکو کا ایک ایسا ادارہ ہے جہاں شوہر اور بیوی کے درمیان جھگڑوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ ایسے شوہروں اور بیویوں کی مشکلات کے متعلق پہلا اندازہ قائم کرنے کے لئے ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی اپنی تصویریں بنائیں۔

آپ کی خود ساختہ تصویروں پر آپ کے پیشہ کا بھی نمایاں اثر پڑتا ہے۔ مصنفین، مقرر اور مغنی اپنی اپنی تصویروں میں لبوں پر زیادہ زور صرف کرتے ہیں۔ ایک مشہور پیانو بجانے والے نے اپنی تصویر بناتے ہوئے وقت کا زیادہ حصہ اپنے ہاتھ بنانے پر صرف کر دیا۔ ورزش کرنے والے عام طور پر بازوؤں اور ٹانگوں پر ضرورت سے زیادہ زور قلم کا اظہار کرتے ہیں۔ سائنسدان اور دیگر دماغی کام کرنے والے آدمی سر کی طرف سب سے زیادہ توجہ دیتے ہیں۔

معالجۂ دماغی کے ایک محقق نے تصویر کا مطالعہ کیا اور مریضہ سے کہا "تم خود اپنی روح کیوں تعفن کرنا چاہتی ہو؟" مریضہ ششدر رہ گئی۔ اپنی بھوت نما تصویر بناتے وقت اس نے مطلق یہ محسوس نہ کیا کہ اُس کا غیر شعوری دماغ اس کو دھوکہ دے رہا ہے کیونکہ وہ اپنا قصیدہ خودکشی تصویر بناتے وقت نہ چھپا سکی۔

تصویر کشی کے ان امتحانات میں دماغی اور جذباتی کیفیات کے متعلق ابتدائی سراغ آسانی سے مل جاتا ہے۔ ایک بڑی کارپوریشن میں ایک عہدہ کے لئے کچھ آدمیوں نے

درخواستیں دیں۔ ان میں ایک نوجوان بھی شامل تھا جب اس امتحان کا وقت آیا تو اس نے بڑی ہی حقیقت نگار تصویر بنائی لیکن تصویر کے پس منظر میں بہت سی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بنی ہوئی تھیں۔ ماہر شخصیت نے فوراً سمجھ لیا کہ اس کے زیرِ امتحان ایک ایسا شخص ہے جو اپنی بڑائی کے مالیخولیا میں مبتلا ہے اور اپنے تئیں مشکوک بھی سمجھتا ہے۔ پس منظر میں بنی ہوئی بہت سی آنکھوں کا مطلب یہ تھا کہ ہر شخص اس پر جاسوسانہ نظر ڈال رہا ہے۔ اس سلسلہ میں مزید امتحانات ہوئے اور چند ہی روز بعد وہ شخص دماغی ہسپتال میں بھیج دیا گیا۔

مغربی ممالک میں قید خانوں میں ایسے امتحانات اکثر اوقات ہوتے رہتے ہیں۔ ماہر شخصیت اتفاقیہ اور عادی مجرموں کے درمیان آسانی سے امتیاز قائم کر لیتا ہے۔ ایسے ملزم جو زندگی کے طویل حصہ میں صرف ایک ہی مرتبہ کسی جرم کا ارتکاب کرتے ہیں ایسی تصویریں بناتے ہیں جنہیں عام جسمانی خدوخال کی جھلک ملتی ہے لیکن ایسے مجرم جنکی عادت ثانیہ جرم کرنا داخل ہو چکا ہے اپنے تئیں بندوقوں، چاقو، استروں اور دیگر ہتھیاروں سے مزین ظاہر کرتے ہیں یہاں تک کہ جو چہرے وہ ظاہر کرتے ہیں وہ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے خدوخال سے ہیجان اور شدت ظاہر ہوتی ہے۔ دانت صاف ظاہر ہوتے ہیں۔ ترش روئی نمایاں ہوتی ہے الغرض پوری تصویر نفرت اور تشدد کا ایک مرقع ہوتی ہے۔

ان تصویروں کا تجزیہ واقعی مشکل ہے اور کافی تجربہ کار ماہرین ہی یہ فرض بخیر و خوبی ادا کر سکتے ہیں۔

● اختر ہوشیارپوری

جب بہاروں کی بات بنتی ہے
بے سہاروں کی بات بنتی ہے

مسکرا دو ذرا کہ گلشن میں
بادہ خواروں کی بات بنتی ہے

ہم جو افسانۂ جنوں کہہ دیں
غم گساروں کی بات بنتی ہے

جب اندھیرا جہاں میں چھاتا ہے
چاند تاروں کی بات بنتی ہے

موت اور زیست کے دوراہے پر
غم کے ماروں کی بات بنتی ہے

تم اگر میرے ساتھ ساتھ چلو
رہ گزاروں کی بات بنتی ہے

شمعِ اختر کی لَو کچھ اور بڑھاؤ
بے قراروں کی بات بنتی ہے

● فراق گورکھپوری

نغمۂ سرمدی کا مخزن ہے　　پیکرِ ناز، رُوح یا تن ہے
ہر نظر میں لطیف سا ابہام　　حُسن کی بات بات میں کَن ہے
روئے رنگیں سے پھوٹتی ہی کرن　　یا شفق میں چراغ روشن ہے
پٹیں دیتا ہی گیسوئے شب تاب　　مہکا مہکا ہرا بھرا بن ہے
پُورے جوبن پر حُسن کی مستی　　اُمڈا اُمڈا اُبھرا اُبھرا اگھن ہے
معرکے عشق کے ہیں آج اسکے　　ہر ادا جس کی بو تسارن ہے
کیا کریں ہم بھی کیا کرو تم بھی　　آدمی، آدمی کا دشمن ہے
موت بیچاری مفت ہی بدنام　　زندگی، زندگی کی دشمن ہے
کیا محبت کی ہے یہی تصویر　　میرے آنسو ہیں تیرا دامن ہے
حرمِ سینۂ ازل میں بھی　　زندگی کا چراغ روشن ہے

اور عالم ہے اب تو دل کا فراقؔ
سوزِ صحرا نہ سازِ گلشن ہے

خاص طور پر اپنے سائیکولوجی کیلئے

شباب ناصر بی اے (آنرز)

دوستی کی نفسیات

اکثر مشاہدہ سے گذرا ہے کہ نوجوانوں کا معیار دوستی ظاہر میں تو بڑا اچھوتا اور بلند ہوتا ہے مگر حقیقت میں بالکل لچر ہوتا ہے۔ وہ دوست جو ایک دوسرے سے دور ہوتے ہوئے بھی، مثلاً خط و کتابت ہی کے وسیلہ سے قریب تر آجاتے ہیں اکثر و بیشتر ایک رہائش و اقامت اور حد درجہ بے تکلفی کے باوجود قریب ترین ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دور اور دور تر ہوتے چلے جاتے ہیں — یہ ایک عجیب نفسیاتی معمہ ہے اور اس کو سلجھانے اور سمجھنے کی غرض سے میں اس مضمون کو خط کی صورت میں لکھ رہا ہوں تاکہ حقیقت ایک دلچسپ پیرایہ میں آپ کے سامنے آئے۔ ———— (شباب ناصر)

اخلاق منزل - جمشید روڈ
کراچی
۴ نومبر ۴۹ء

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو!!

عزیز بھائی اخلاق میاں! تمہارے دونوں ہی نوازش نامے ملے۔ یہ معلوم کر کے دلی مسرت ہوئی کہ لاہور میں تمہارا حلقۂ احباب بہت وسیع ہو گیا ہے اور تمہاری ایسی سنجیدہ طبیعت اور پاکیزہ مذاق کے نوجوان تم سے مل کر متأثر ہو رہے ہیں ———— خدا کرے کہ تم بھی اپنے نئے دوستوں سے ہر بہ لحاظ مطمئن ہو سکو ———— !

تمہارے دونوں ہی خطوط اس بات کے غماز ہیں کہ تمہارے دل میں تمہارے "عزیز ترین اور مخلص" دوست محمود کی روٹھی ہوئی یاد چٹکیاں لے رہی ہے! شاید تم آزردہ خاطر نہ ہو گے، اگر ڈرتے ڈرتے میں تمہارے بڑے بھائی کی حیثیت سے نہیں بلکہ تمہارے اپنے دوستانہ تعلقات کے پیش نظر یہ کہہ دوں کہ "اخلاق گزیدہ محمود" کا جادو اب اخلاق کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے!!

تمہاری دبی دبی سی یہ خواہش کہ میں تم دونوں کے درمیان صفائی کرادوں اور دو بچھڑے ہوئے دیرینہ دوستوں کو گلے ملا دوں قابلِ تحسین ہے، مگر جب کہ تم خود اپنے "غیر ذمہ دارانہ رویہ" پر شرمندہ ہو رہے ہو تو کیا اس سے کہیں زیادہ احسن اور مؤثر طریقہ یہ نہیں ہے کہ تکلف برطرف، جب بھی کبھی تمہارا کراچی کسی موقع سے آنا ہو تو خود محمود کو گلے لگا لیتا ——— اور ——— !

رہی یہ بات کہ تم سمجھنا چاہتے ہو کہ کن وجوہ کی بنا پر تمہارے اور محمود کے درمیان علیحدگی ہوئی؟ کیوں تم ایک دوسرے سے علیحدہ رہائش و اقامت کے باوجود علیگڈھ یونیورسٹی کی ۶ سالہ زندگی میں ایک دوسرے کے بقول شخصے رفیق و جانثار رہے، بلکہ ایک جان دو قالب کے مصداق تھے؟ اور کیوں تم دونوں کراچی میں ۶ ماہ کی یکجائی اور ایک ہی رہائش کے ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے؟؟ ان وجوہ کو دوستی کی نفسیات اور زندگی کے بارے میں جو تم دونوں کا نقطۂ نظر ہے، اس کے پس منظر میں دیکھنے ہی سے بخوبی ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔

میرے پیارے بھائی! تم خود سنجیدہ اور سمجھدار ہو اور علم نفسیات سے بھی بہرحال روشناس ہو۔ میں نہ کوئی ناصح مشفق ہوں، نہ ہی کوئی واعظ خشک کہ تمہارے ایسے تعلیمیافتہ اور بالغ نظر نوجوان کو پند و نصائح کروں ——— مگر چونکہ تم نے اپنی ذہنی دشواریاں میرے سامنے بے نقاب کی ہیں اور مجھ سے کچھ سننے سمجھنے کے متمنی ہو، تو حق گسترانہ طور پر تمہیں اپنا مخلص دوست ہی سمجھ کر عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں ——— !

سُنو! ہوتا یہ ہے کہ ہم نوجوان بہر طور کسی نہ کسی ذہنی خود فریبی اور احساس برتری و کمتری کے مریض ہوتے ہیں، جن کی جڑیں ہمارے لاشعور میں دھنسی ہوتی ہیں۔ لاشعور تو کیا، ہم اپنے شعور سے بھی عموماً بے خبر ہی رہتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں کھوٹے، کھرے، اچھے برے، میں امتیاز مشکل ہی سے کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جوں ہی دو دوستوں کی "پہلی نظر" کا باہمی ربط پیدا ہوتا ہے، دونوں ایک دوسرے کے ظاہری خد و خال، حرکات و سکنات، عادات و اطوار اور رفتار و گفتار پر بس دل ہی تو دے بیٹھتے ہیں ——— لیکن اس کے آگے بڑھ کر بہت کم بلکہ شاید ہی کوئی ایک دوسرے کی نفسیات اور شخصیت کی گہرائیوں میں اتر کر جھانکنے کی کوشش کرتا ہو۔ سب سے بڑی رکاوٹ اس معاملہ میں جو تم نے بھی غالباً محسوس کی ہوگی، وہ دوستوں کی علیحدہ علیحدہ رہائش و اقامت ہوتی ہے جو بجائے خود دونوں کے درمیان ایک موٹی نقاب کی طرح حائل رہتی ہے۔ اور حقیقت میں ایک لحاظ سے یہ نقاب یا رکاوٹ ایک نعمت غیر مترقبہ متصور کی جا سکتی ہے، کیونکہ زیادہ تر بلکہ اپنی روزانہ کی زندگی میں یہی تجربہ کیا جاتا ہے کہ جوں ہی دو دوستوں کی ایک رہائش، ایک ساتھ کا کھانا پینا، اور اٹھنا بیٹھنا ہوا کہ ایک دوسرے کی شخصیت اپنے اصلی خد و خال، محاسن و معائب اور تمام گہرائیوں کے ساتھ ابھر کر بہت جلد ہی ایک دوسرے کے شعور و لاشعور پر اثر انداز ہونے لگتی ہے۔ اور شاید یہی وہ نازک مقام ہے، جہاں ہم ان ظاہری خد و خال اور عادات و اطوار وغیرہ کو یکسر کھوکھلا دیکھ کر مایوس ہو جاتے ہیں اور شعوری خلا میں جا گرتے ہیں اور آپس میں ہر چیز کو متصادم ہوتے دیکھ کر بجائے قریب تر ہونے کے ——— دور بہت دور جا کر ٹے ہوتے ہیں۔ !

طُرفہ غضب یہ ہے کہ ہم نوجوانوں میں احساس ذمہ داری بھی مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو اس کی تہ میں وہی جذبہ احساس کمتری یا احساس برتری ہی کارفرما نظر آئے گی۔ چونکہ اس ضمن میں اس موضوع پر بحث یہاں دور از کار سی ہے اس لئے میں صرف اس قدر کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ احساس ذمہ داری سے میرا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ ہم لوگ اپنی چال ڈھال، رفتار و گفتار نیز افعال و کردار کے اعتبار سے کچھ عجیب مجنون صفت، بیگانہ و بے نیاز سے، یا سادہ لفظوں میں کچھ بے سر پیر کے واقع ہوئے ہیں۔ یعنی چاہے عزیز سے عزیز دوست سے، یا اپنے والدین یا کسی محترم بزرگ یا اپنے چھوٹوں ہی سے مخاطب ہوں ——— لیکن ہمارا انداز تخاطب اور لب و لہجہ کچھ ناشائستہ اور کھلا ہوا کرتا ہے اور پھر غیر شعوری طور پر کبھی اختلاف تو کیا، سنگ باری ہی کرتے نظر آتے ہیں ——— اب یہ اور بات ہے کہ دل ہی دل میں کبھی ندامت بھی محسوس ہو ——— اگرچہ وہ بھی بعد از خرابیٔ بسیار کا مصداق ہوگی!

اور ہاں اخلاق! سنتا: ایک بات تو رہی جا رہی تھی۔ وہ یہ ہے کہ کبھی حسن اتفاق سے ایک "خلوص" کی "سونے کی چڑیا" بھی تو ہم لوگوں کے ہاتھ آگئی ہے جس کے پرو بال نوچ ناچ کر اپنے دل کے سنہری قفس کے حوالے کر دیا ہے، اور اس پر طرہ یہ کہ کمبخت کو اس حفاظت سے قید و بند میں رکھا ہے کہ اسے باہر کی تازہ ہوا اور کھلی فضا میسر ہی نہ آسکے — — — : ہم زبان سے کسی کو کچھ کہدیں کوئی "طنز" کریں، کسی اپنے دوست سے محبت سے پیش آئیں یا نہ آئیں، کسی کا احترام کریں یا نہ کریں، کسی سے پیار کی باتیں کریں یا نہ کریں — — مگر بہرطور خلوص تو دل میں پھر بھی موجود ہے، اور لطف یہ ہے کہ توقع ہی نہیں بلکہ یقین کامل رکھتے ہیں کہ ہمارا دوست ہم سے ہر حال میں خوش رہے گا، ہر ڈھنگ ہم پر شفقت کی نظر رکھے گا، اور ہر بچہ ہم سے مانوس ہی رہے گا — — اور صاحب! اگر وہ مہربان، وہ شفیق، اور وہ نیک نہیں ہے، تو اسے ہونا چاہیئے، اور نہیں تو ہونا پڑے گا!! — — ورنہ وہ آدمی نہیں "صحرا کا جانور ہے" جی! وہ تنگ مزاج ہے، وہ غضبناک — اور وہ بڑا ضدی ہے! دوسرے لفظوں میں وہ جذباتی اور قنوطیت پسند ہے، وہ بدخو ونکلا ہے، اور وہ روتا دھوتا ہے!!

سبحان اللہ بھائی سبحان اللہ! بریں عقل و دانش بباید گریست!

بھائی اخلاق میاں! معاف کرنا۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، اور میرا خط کافی طولانی ہوگیا! بہرحال تم نے ہم لوگوں کے بارے میں اس قدر تو سمجھ ہی لیا ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ جو کچھ بھی میں نے عرض کیا ہے، اب اسی کو پس منظر کے طور پر سامنے رکھ کر تم غالباً اپنے اور محمود کے ناخوشگوار تعلقات کے وجوہ کو سمجھ سکو گے ———————— تمہاری مزید تشفی و اطمینانِ خاطر کے لئے میں اپنی ہی ۱۹۴۸ء کی ایک ڈائری سے چند مخصوص تاثرات بھی نقل کر دوں جو تمہیں کم و بیش کچھ اسی قسم کے شاخسانوں کا جو میرے اور میرے چند مخلص دوستوں کے درمیان اکثر غلط فہمیوں اور بدمزگیوں کا باعث ہو چکے ہیں —

(۱)

"حیرت ہے کہ ہم تعلیم یافتہ نوجوان بعض اوقات غیر شعوری طور پر جانے کیا کچھ کہہ جایا کرتے ہیں کہ اگر نہ کہیں تو بزم احباب میں کوئی کمی محسوس نہیں کی جاسکتی ہے، مگر کہہ کر وہ کسی نہ کسی کے دل پر وہ ضرب کاری لگاتے ہیں کہ شیشۂ دل چکنا چور ہوجاتا ہے اور شاید زندگی بھر اس درد کی کسک اس کے دل سے نہیں جاتی

میر انیس نے کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے ؎

کسی کو کیا ہو، دلوں کی شکستگی کی خبر!
کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں کرتے!!

نسیم کے بارے میں ہم سب دوستوں کو بخوبی علم تھا کہ اس کے والد کا سایہ اس کے سر سے اٹھ چکا تھا اور اس حادثۂ جانکاہ کے صدمے نیز خانگی ذمہ داریوں کے بار نے اس کے ذہنی توازن کو یکلخت برہم کر دیا تھا۔ آشفتہ خاطری اور خستہ حالی کے عالم میں رنگین مزاجیوں اور جنونی سامانیوں کا محل کہاں، اور ہو بھی تو ہوش کسے رہتا ہے کہ نسیم ہی جانِ طرب اور روحِ نغمہ بن کر بزم احباب پر چھا جاتا!

ایک روز کا واقعہ ہے کہ میں اپنے دو دوستوں کے ہمراہ نسیم کے گھر پہنچا۔ ہمارے حلقہ میں ایک صاحب بڑے منچلے بنتے تھے، انہوں نے اپنے ایک نئے دوست کا نسیم سے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ بھائی! یہ ہیں ہم لوگوں کے نسیم صاحب، افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را، کی سراپا تصویر!

نسیم نے زہر خند کرتے ہوئے کہا کہ جی ہاں بجا ہے!

جوش ملیح آبادی نے بھی کیا نفسیاتی بات کہی ہے ؟ -

قطعہ

افسردہ نہ بن ، لوگ بُرا مانتے ہیں　　منہ اُترے تو دوست بھی جلتے ہیں

چہروں کی شناخت اہلِ دنیا کو نہیں　　چہروں کی فقط یہ آب پہچانتے ہیں ! "

(۲)

" اخلاقی حیثیت سے کیا، نفسیاتی اعتبار سے بھی یہ کتنا اہم نکتہ ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری بات بغور سنی جائے تو پہلے ہلا اپنا یہ فرض ہے کہ ہم بھی اپنے ہم نشینوں کی باتوں کو بغور سنیں ، بلکہ ماہرینِ نفسیات نے تو اس بات پر زور دیا ہے کہ متکلم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی طرف مخاطب رہنا چاہیئے تاکہ اسے آپ کے خلوص پر اعتماد رہے ـــــ میرے اپنے دوستوں میں میرا رویہ اس بارے میں سب سے زیادہ برعکس ہے ورنہ آج ہی میں اپنے دوست انور کی سلجھی ہوئی گفتگو کے دوران میں اُسے لقمہ پر لقمہ نہ دیتے رہتا ـ احساسِ کمتری پر پردہ ڈالنے کے لئے ہم لوگوں سے واقعی عجیب عجیب حرکتیں غیر شعوری طور پر سرزد ہو اکرتی ہیں جن کی ندامت عرصۂ دراز تک ـــــــــــــ محسوس ہوتی رہتی ہے -

ایک تو میں انور کی متواتر غیر مانوس اور اجنبی سی نگاہوں سے دیکھتا رہا ، پھر کئی بار لقمے دیئے ، اور جب اس کا سلسلۂ کلام جاری رہا تو کچھ نہ بن پڑنے پر کئی بار پہلو بدلے ، کرسیاں بدلیں ، کہیں کوئی کتاب اٹھائی ، تو کہیں کوئی اخبار ـــ نتیجہ کیا ہوا ؟ انور بیچارہ آخر تنگ آکر دفعتاً خاموش ہو گیا ـــــــــــ اور ایک ذہنی علیحدگی سی اختیار کی ـــــــــــ اور پھر ایک عجیب قسم کا مضمحل سکوت ہم سب لوگوں پر طاری ہو گیا ـــ

وہ دن ہے اور آج کا دن ، میری نگاہیں انور کے سامنے اکثر اس بات کے یاد آنے پر جھک جایا کرتی ہیں ڈیل کارنیگی کی پُرخلوص ہدایات کہاں تک دلیل راہ بن سکتی ہیں ، جب ہم خود اپنی روز کی زندگی میں ، اٹھتے بیٹھتے ، ہر قدم پر نفسیاتی تجربات اور مشاہدات سے چشم پوشی کرتے رہتے ہیں ـــ "

(۳)

اخلاق میاں ! یہ تیسرا واقعہ تو سن کر شاید تم ہنس پڑو اور باور نہ کرو ـــ کیونکہ دیکھنے میں تو واقعی حد درجہ معمولی بات ہے اور محض بچوں کی سی تکرار اور جھڑپ معلوم ہوتی ہے ، مگر پھر بھی کسی نفسیاتی حقیقت ہی کی غماز ہے -

" ہم چار دوست علیگڑھ یونیورسٹی کے سرسید ہال میں ایک ہی کمرہ میں رہا کرتے تھے ہم میں سے ایک صاحب وہ تھے کہ جس روز ہماری ان سے ملاقات ہوئی ، تو وہ اپنے صاف ستھرے لباس میں اور خوبرو زبان ، نیز مخصوص دل لبھانے والی اداؤں کے ساتھ بڑے شریف اور سنجیدہ نوجوان نظر آئے ـ اور تقریباً ہر کوئی ان کا گرویدہ ہو کر رہ گیا - ہم تین دوستوں نے ان کو بہ اصرار اپنے ہی کمرے میں شامل کر لیا - چند روز بعد ہی ان کی شخصیت بالکل بے نقاب ہو گئی ـ ان کی کچھ اداؤں میں ، ایک تو یہ تھی کہ ان کا غسل بلا لحاظ موسم ہر تیسرے مہینے ہوا کرتا تھا - صبح ان کے یہاں ۹ بجے سے قبل شاید کبھی نہ ہوتی تھی ـ اٹھتے تو منہ دھونے کے لئے کسی کا صابن ، کسی کا تولیہ - ایک کا کنگھا تو دوسرے کی تیل کی شیشی [illegible] ـ تولیہ اور کنگھا جس کا بھی ان کے ہاتھ پڑ گیا ، بس سمجھئے اس کی تو شامت ہی آگئی کیونکہ منہ دھو کر وہ تولیہ سے منہ اور گرد دن کو رگڑ کر [illegible] اور اسی طرح کنگھے کو بھی ناقابلِ استعمال کر دیتے تھے ـ قصہ مختصر یہ کہ ہم تینوں نے تنگ آکر تمام چیزیں اپنے اپنے سوٹ کیسوں میں رکھنا شروع کر دیں ـ آخر میں نہ جانے کن وجوہ کی بنا پر انھوں نے اپنا ناتہ خدا سے جوڑ لیا ـ عرفانِ محبت کی یہ ادا تو بڑی والہانہ تھی مگر وضو کر کے

جب وہ کمرے میں داخل ہوتے تو ایک عجیب وحشیانہ حرکت فرمایا کرتے تھے۔ قبل اس کے کہ ہاتھ اور منہ کسی چیز سے خشک کرتے (تولیہ تو ان کے پاس تھا نہیں) اپنے دونوں ہاتھوں کو اس طرح جھٹکتے کہ پانی کے قطرے ہر ایک شخص کے منہ پر پڑتے۔ کئی روز تک تو ہم لوگ ان کی اس حرکت نازیبا پر خاموش ہی رہے ـــــ مگر ایک دن ہمارے ایک دوست قاضی صاحب سے نہ رہا گیا اور انہوں نے ان کو خوب ہی سنائی، جس کے جواب میں انہوں نے یہ فرمایا کہ اس میں برائی اور بے تمیزی کیا تھی بلکہ وضو کا پانی جس کے چہرے پر پڑ جائے وہ نورانی ہو جاتا ہے "

(۴)

" تعجب ہوتا ہے کہ ہم اپنی باتوں میں اکثر اوقات بڑے دعوے سے کہا کرتے ہیں کہ فلاں میرا بڑا گہرا دوست ہے، اور فلاں جگری دوست ہے۔ مگر حقیقت میں ہماری دوستی بالکل سطحی ہوتی ہے، کیونکہ وہ لوازم جو جگری دوست بنانے کے لئے لازمی ہیں، ان کو کبھی بھی ہم ملحوظِ خاطر نہیں رکھتے اور دوستی اور محبت کو ایک بازیٔ طفلانہ ہی سمجھتے ہیں :

" انور ارشاد کو وقتاً فوقتاً، بر سبیل تذکرہ آگاہ کر چکا تھا کہ امجد اس کا (انور کا) عزیز قریب تھا، مگر بعض وجوہ کی بنا پر امجد اور ارشاد کے گھرانے کے عزیزانہ تعلقات منقطع ہو چکے تھے ـــ ارشاد میاں نے ایک کان سُنا، دوسرے کان اڑا دیا ـــ ایک عرصہ کے بعد ارشاد سے کسی وسیلے کے ذریعہ امجد کی ملاقات ہو گئی ـــ انور کو علم ہوا مگر اس نے کوئی اثر نہیں لیا۔ وقت گذرنے پر ارشاد انور کے سر ہو گئے اور اکثر یہ ضد ہونے لگے کہ انور کو امجد سے ملنا چاہئے کیونکہ وہ برابر خیریت دریافت کیا کرتا ہے ـــ سر سے پانی اونچا ہو جانے پر ایک روز انور نے بڑے ترش لہجہ میں ارشاد کو جھڑک دیا " ارشاد بھائی! مہربانی کر کے آیندہ سے آپ امجد کا نام میرے سامنے نہ لیں۔ آپ کو کئی بار سمجھا چکا ہوں، مگر بجائے اس کے کہ آپ امجد کے سفلہ پن پر نفرین کرتے اور اس سے کوئی رسم و راہ نہ پیدا کئے ہوتے، اور الٹے مجھ سے متمنی ہیں کہ آپ کے مثل میں بھی امجد کا دم بھروں " ارشاد نے جواب دیا۔ " کیا خبر تھی کہ آپ امجد کے نام ہی سے آگ بگولہ ہو جائیں گے؟" انور نے فوراً ہی دو ٹوک جواب دیتے ہوئے یہ کہا " ارشاد صاحب امجد سے رسم و راہ پیدا کرنا تو آسان ہے۔ مگر انور کے دل سے کیلئے رہنا آسان نہیں! ــــــــــــ اور شاید آپ یہ بھول چکے ہیں کہ آپ کے اشاروں پر میں نے آج تک بھولے سے بھی آپ کے کینے عزیزوں اور سفلہ حریفوں کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا، جن کے نام ہی سے نہیں سایہ سے بھی آپ کو نفرت رہی ہے "

ارشاد کا چہرہ زرد پڑ گیا ــــــــــــــ اور کسی سوچ میں کھو گیا "!!

(۵)

" ہم بڑی بڑی اسناد تو حاصل کر لیا کرتے ہیں، لیکن شاید چند ہی ان اسناد کے اہل ہوتے ہیں۔ شاید ہم کو درسگاہوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں یہ تعلیم بھی دی جاتی ہے کہ ہمیں اپنے دوستوں اور عزیزوں کے خطوط چوری چھپے ضرور پڑھنے چاہئیں اور تا وقتیکہ ہم اس کارِ ثواب سے بہرہ اندوز ہوں، ہماری اسناد، ہمارا علم اور ہم لوگ " چارپائے، بر وکتابے چند " کا مصداق ہوں گے "

" یہی ارشاد اور انور ہی کی بات ہے۔ علیگڑھ میں میاں انور ارشاد کے گھر رہا کرتے تھے۔ متواتر انور کے خطوط اس کی میز سے اور اس کے کوٹ کی جیبوں سے گم ہوتے رہتے۔ اکثر خطوط دو تین روز کے وقفہ کے بعد چھپے چھپائے ادھر کے ادھر برآمد بھی ہو جاتے تھے۔ خیال یہ ہوتا رہا اور وہ بھی ارشاد صاحب پیش پیش فرمایا کرتے تھے کہ انور صاحب خود کہیں کے کہیں رکھ کر بھول جایا کرتے ہیں۔

ایک روز عجیب اتفاق ہوا کہ ہم کئی دوست ارشاد کے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ حامد صاحب ہم لوگوں کے ایک دوست کرسی چھوڑ کر ارشاد کے بستر پر ان کے تکیہ کو دیوار سے لگا کر نیم دراز ہو گئے۔ تکیہ اٹھاتے ہی دو لفافے انہیں نظر آئے کہ فطرت انسانی کے مطابق انہوں نے بھی دیکھنا چاہا کہ کس کے ہیں میاں ارشاد بے تابانہ بول اٹھے کہ " بھائی! مجھے دیدو" حامد تو ایک ہی تھے۔ فرمانے لگے کہ میں تمہیں اس بنا پر دیدوں کہ تمہارے لکھے کے

تھے اور تمہارے لبستر پر تھے —————— قاعدہ سے تو دونوں خلوط (لفافے) انور کے نام تھا —————— اور انور میاں کہتے ہیں تو خود دیکھ کر اطمینان کرلو! —————— یہ لو دیکھو اور بڑے شوق سے!

انور کی خاموش گویائی اور ارشاد کی دہشت نگاہی نے ہم لوگوں کے دلوں پر ایک جادو سا کر دیا۔

(۶)

یہ چیز بھی مشاہدہ اور تجربہ کی ہے کہ زیادہ بے تکلفی اور دوستی میں حقارت آمیز فقرے اور طنزیہ الفاظ تیر و نشتر بن کر دوستوں کے درمیان اکثر بدمزگی کا باعث ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے لب و لہجہ اور الفاظ کا جا و بیجا استعمال خصوصیت سے موقع و محل کے اعتبار سے بڑی حد تک اور بھی اہمیت رکھتا ہے۔

کسی دوست کے کسی تکلیف کے عالم میں کراہنے پر، اگر بغیر کچھ سوچے سمجھے ایک دم سے اور پھر غریب لہجہ میں اسے "میر پھدیا" کہا جائے یا "نئی جوانی، مانجھا ڈھیلا" کا نیز نشتر اس کی رگ جاں میں پیوست کر دیا جائے، تو ظاہر ہے اس کا اثر دہشت اثر ہوگا۔ اکثر ہم لوگ اپنی شان میں خود ہی قصیدے پڑھا کرتے ہیں اور شعوری طور پر اس آہنگ سے نغمہ بار ہوتے ہیں، دوسرے دوست کے زخم پر نمک پاشی ہو، یا اپنے جذبۂ احساس برتری کو اس کے ذہن پر مسلط کر دیں، اور ہماری یہی غیر نفسیاتی، اور انسان ناشناس ادائیں مخلص سے مخلص دوست کی آزردہ خاطری کا سبب ہوتی ہیں"

تو اخلاق میاں! یہ تھے میری پتی ڈائری سے چند اہم تاثرات —————— جن کی روشنی میں آج تم ان غلط فہمیوں اور بدمزگیوں کا تجزیہ کر سکتے ہو جو تمہارے اور محمود کے درمیان بدقسمتی سے رونما ہوئیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ واقعات کی معمولی سی معمولی تفصیل بھی اب تمہاری نگاہوں سے غالباً پوشیدہ نہ رہے گی۔ وہ باتیں جنھیں ہم معمولی اور "ہنسنے ہنسانے والی" باتیں سمجھ کر نظر انداز کر دیا کرتے ہیں، وہی دو دوستوں کے ذہنی پس منظر میں رفتہ رفتہ جاگزیں ہو کر صدہا غلط فہمیوں اور جراحتوں کا باعث ہوتی ہیں —————— اور بالآخر ہمارے دلوں پر نفرت کے بھاری اور دبیز پردے ڈال دیا کرتی ہیں —————— ! تو کیا یہی چھوٹی چھوٹی باتیں کہ ہم لوگوں کی نفسیات اور ذہنی کشمکشوں اور بہت سی ایسی ہی نامعلوم الجھنوں کے سمجھنے اور سلجھانے میں معاون نہیں ہو سکتی ہیں

؟؟ ——————

میرے بھائی! زندگی کو درحقیقت ہم لوگوں نے دردِ سر اور دردِ جگر سمجھ لیا ہے —————— حالانکہ اگر ہم اسی اپنی سادہ و پرسوز زندگی کو دلچسپی اور خلوص سے بحیثیت ایک فن کے سمجھنے اور دیکھنے کی کوشش کریں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری بہت سی ذہنی دشواریاں رونما ہی نہ ہوں —————— اور اس مقصد کے پیش نظر تو ہم اور بہ آسانی اپنے دوستوں اور ہم نشینوں کی نفسیات کو ملحوظ خاطر رکھ سکتے ہیں۔ بلکہ بشرطیکہ ہم خود غرض نہ ہوں اور ایک صالح شخصیت کے مالک ہوں —————— ہماری اپنی سی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہم اپنے دوست کو بھی اپنا ہی ایسا انسان سمجھیں اور اپنے آپس کے تعلقات و مراسم کو ایک دوسرے کے حقوق و فرائض سے ہم آہنگ بھی کر سکیں۔

انسان انسان سے اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس کی ذہنی آزادی، خوشی اور راحت اور اس کے لازمی حقوق خود غرضی اور جذبۂ برتری کے دستبرد سے محفوظ نہ کر دئے جائیں —————— اور پھر ایک دوست تو دوست سے بہت کچھ توقعات رکھتا ہے اور خود غرضی اور انسان ناشناسی کا ذرا سا شائبہ بھی دوستی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔

جب تک ہم اپنی خلوص دوستی کی بنیاد زندگی کے اساسی نظریوں پر نہ رکھیں گے، ہم دوستی کا فریب اور محض فریب ہی کھاتے رہیں گے!

علم النفسیات کا جہاں تک تعلق ہے، وہ کوئی پریشان کن اصطلاحات یا انہیں ہے، اور نہ ہی کوئی دیوانے کا خواب ہے۔ نفسیات کامیاب زندگی کا دوسرا نام ہے، اور وہ کامیاب زندگی ہماری اپنی دسترس سے باہر نہیں ہے بشرطیکہ ہم اپنے عزیزوں، ہم نشینوں، دوستوں اور رفقائے کار کی زندگی، ان کے دکھ درد خوشی اور راحت، ان کی زندگی کے نشیب و فراز کو دلچسپی سے کریں خلوص دل سے سمجھنے کی کوشش کریں اور نہ صرف سمجھنے کی کوشش ہی کریں بلکہ ان کی زندگی میں برابر کا حصہ بھی لیں۔

یہی ہے ہمدردی، سچی ہمدردی، محبت، خلوص، ــ ــ ــ ــ ــ اور انسان شناسی!ــــــ اور یہی زندگی کامیاب زندگی کا راز ہے! بقول داناے راز کے ؎

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

شہر احمد... شباب

سہارا

ادا بدایونی

اِدھر دیکھ یہ ریشمیں، مرمریں، نرم باہیں
یہ کلیوں کے گجرے، یہ حسن شبستاں
لچیلی، رسیلی حسیں مسکراتی ہوئی شوخ کلیوں کے گجرے
یہ حسن فروغ جمال شبستاں!
یہ مرکز تری آرزوئے جواں کا
یہ حاصل تری زحمت جاوداں کا
تری سینہ کوبی پیہم کا، درد نہاں کا
"یہ قوس قزح کی چرائی ہوئی شوخ رنگت"
"یہ پھولوں کی نرمی، یہ کلیوں کی نزہت"
"ستاروں کی شوخی، بہاروں کی فطرت"
یہ جاتی ہوئی کہکشاں کو سبک گام راہیں!
یہ بے چین ہیں امتحاں کو
یہی ریشمیں، نرم باہیں
فروغ شبستاں سے اب بھی ہیں بے نگاہیں
یہ مانا کہ چشم فلک نے نہ اب تک جھلک دیکھ پائی
مبادا پڑے بال ان آئنوں کو

نہ زخم نگہ آنے پاتے!
مگر اب ذرا آزما ان کی ہمت
یہ مدت سے بے چین ہیں امتحاں کو
تری تیرہ بختی، تری بے نوائی
ترے اشک پیہم، تری آہ سوزاں
ترے درد کا اب بھی ممکن ہے درماں
تجھے جس سہارے کی ہے جستجو مدتوں سے
ز فیض تمنا ابھی مل بھی جاتے
بہت ہے کہ اب تک جواں ہیں ارادے
ذرا حوصلے دیکھ ان کے
یہی ریشمیں، مخملیں، مرمریں باہیں
جو چاہیں
اٹھا کر پٹک دیں زمین و زماں کو
ترے آسماں کو
ترے آسمانوں کے راز نہاں کو
یہ حسن فروغِ جمال شبستاں!

اپنا چہرہ اپنے آئینے میں

مولانا عبدالماجد دریابادی

ہم راستے میں جا رہے ہیں کہ پیر میں ایک پتھر کی ٹھوکر لگی، چوٹ آئی۔ اور "درد" و "اذیت" محسوس ہوئی۔ پتھر بدستور اپنی جگہ جوں کا توں رہا۔ وہ نہ کراہا، نہ اس نے آہ کی ——— ہو نہ ہو، پتھر اور ہماری بناوٹ میں کچھ فرق ضرور ہے!

آپ نے سنا کہ آپ کے فلاں دوست پاس ہو گئے، آپ "خوش" ہو گئے۔ پھر خبر ملی کہ فلاں عزیز سخت بیمار ہو گئے ہیں۔ اس سے بہت دل "کڑھا"۔ آپ پر دن رات یہ گذرتی ہی رہتی ہے۔ لیکن آپ کے کمرے کی میز، کرسیاں، در و دیوار، یہ عجب بے حس مخلوق ہیں۔ ان کا نہ کوئی دوست نہ کوئی عزیز۔ نہ انھیں کوئی خوشی، نہ کبھی کوئی رنج ——— بڑا فرق آپ میں اور ان موجودات میں نکلا ———!

اچھا یہ صاحب جو ملنے چلے آ رہے ہیں، کون ہیں، کہاں کے ہیں؟ صورت "آشنا" تو معلوم ہوتے ہیں۔ کہیں انھیں دیکھا ضرور ہے۔ ہاں، خوب "یاد" آیا۔ وہی تو ہیں جن سے ابھی اس دن اسٹیشن پر ملاقات ہوئی تھی۔ اب "پہچان" لیا ——— یہ بات کیا ہے، کہ یہ درخت اور پودے ہماری آپ کی طرح کیوں کسی کو "جان پہچان" نہیں لیتے؟ یہ "حافظہ" پر زور دے کر کوئی بات کیوں نہیں "یاد" کر لیا کرتے!

صبح ہوئی، اور ہم نے اپنے "ارادہ" سے کام لینا شروع کیا جب جی "چاہا" اٹھ بیٹھے۔ جب اور جہاں "چاہا" چلے پھرے اٹھے بیٹھے۔ "بھوک" لگی تو کھایا۔ پانی کی "خواہش" ہوئی تو پانی پیا۔ ارادہ "بازار" جانے کا کیا۔ پھر "ارادہ" بدل دیا۔ پارک چلے گئے۔ اور ایک ہم کیا، آپ بھی تو دن رات یہی کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح اپنے 'ارادوں' اور اپنی 'خواہشوں' کو پورا کیا کرتے ہیں، اور ہم اور آپ کیا معنی، زید، عمرو، بکر، جان، جیمس، کرشن، لچھمن، سارے انسان کہلانے والے یہی کرتے رہتے ——— کتنی مختلف ہیں انسان سے کتابیں اور الماریاں، تصویریں اور کٹہرے، پھول اور پتے، دریا اور پہاڑ! سب اپنی جگہ جوں کی توں، کسی میں نہ کوئی ارادہ اور نہ کوئی خواہش!

ان مشاہدوں نے بتا دیا، صاف طور پر جتا دیا، کہ انسان اپنے گرد و پیش کی جامد اور بے جان فضا سے ایک بالکل ہی مختلف قسم کا مخلوق ہے۔ وہ دیکھتا ہے۔ سنتا ہے، سمجھتا ہے، سوچتا ہے، پہچانتا ہے، یاد کرتا ہے، ہنستا ہے، روتا ہے، خواہش اور ارادہ رکھتا ہے۔ جمادات یہ کچھ بھی نہیں کر پاتے۔ انسان بھی یہ سب کچھ اسی وقت تک کرتا دھرتا ہے جب تک جسم میں جان ہے۔ جب جان نہ رہی تو انسان اور مٹی برابر۔ انسان اور انسان کی لاش کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے ——— جو شے انسان کو جمادات سے ممتاز کرنے والی ہوئی اس کا نام مطلق حیات ہے۔ حیات مطلق میں حیوانات بھی انسان کے شریک ہیں۔ چلتا پھرتا یہ بھی ہے، چلتے پھرتے وہ بھی ہیں۔ کھاتا پیتا یہ بھی ہے، کھاتے پیتے وہ بھی ہیں۔ [illegible] حیات مادی کے پہلو بہ پہلو ایک دوسری قسم کی حیات بھی انسان میں پائی جاتی ہے۔ او [illegible] اثرات،

اسی صفت حیات کے ترجمان ہیں۔ اسی زندگی کو حیات نفسی کہتے ہیں۔ اور جو علم اس زندگی کے قانون اور قاعدے، اصول اور ضابطے بیان کرتا ہے اس کا نام اصطلاح میں علم النفس یا نفسیات ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی صاف ہو گئی کہ اس قسم کے سوالات، کہ انسان پیدا کیونکر ہوتا ہے؟ وفات کس طرح پاتا ہے؟ اس کا سلسلۂ نسل کیسے چلتا ہے، نشو و نما کیسے پاتا ہے؟ خون کیسے بنتا ہے؟ سانس کا انتظام کیا رہتا ہے؟ غرض مادی و جسمانی زندگی سے متعلق جتنے بھی سوال ہو سکیں، یہ سب نفسیات کے دائرے سے خارج ہیں۔ ان کے لئے الگ علوم فعلیات و حیاتیات کے نام سے ہیں۔ نفسیات کے حصے میں تو اس قسم کے مسائل پڑتے ہیں، کہ عقل و فکر کیا چیز ہے؟ جذبات سے کیا مراد ہوتی ہے، خواب کس طرح دکھائی دیتے ہیں؟ عقل کا خواہش سے کیا رشتہ ہے؟ عادت کو ارادے میں کتنا دخل ہے؟ یکسوئی کی راہ میں موانع کیا کیا پیش آتے ہیں؟ اشتہارات سے انسان کیوں متاثر ہو جاتا ہے؟ اسی طرح کے مسائل کی گرہیں جس علم میں آکر کھلتی ہیں۔ یا کھلنے کے قریب آجاتی ہیں۔ اسی کا نام نفسیات ہے۔

فعلیات کے اندر جڑے ہوئے سینکڑوں چھوٹے بڑے مسئلے ہیں۔ سب کا آخری سلسلہ جا کر جسم پر ختم ہوتا ہے ——— نفسیات کے اندر جڑے ہوئے سیکڑوں مسئلے رہتے ہیں، سب کا آخری تعلق جس شے سے ہے اس کا نام نفس ہے۔ دائرے کے اندر خطوط کتنے ہی ہوں، مرکزی نقطہ ایک ہی ہوتا ہے۔ نفسیات کو اگر دائرہ فرض کیا جائے، تو نفس اس کا مرکز کہلائے گا۔ سارے سوالات گردش اسی محور پر کریں گے ——— حیات نفسی کی روح کا نام نفس ہے

اور اسی نفس کی عقلیت کا اصطلاحی نام شعور ہے۔ ہم نے کچھ سنا، کچھ دیکھا، کچھ یاد کیا، کچھ خیال کیا۔ کسی چیز کو ناپسند کیا، کسی بات پر خوش ہوئے، کسی پر ناخوش ہوئے، کسی عمل کا ارادہ کیا، کسی ارادے سے باز رہے۔ اسی قسم کے سارے افعال و کیفیات کا مجموعی نام شعور ہے۔ کسی مسئلے کو ہم سمجھے، یہ ایک شعوری کیفیت ہوئی۔ کسی بات پر ہمیں غصہ آیا۔ یہ دوسری شعوری کیفیت ہوئی۔ کسی چیز کو ہم نے چاہا کہ کسی سے چھین لیں۔ یہ تیسری شعوری کیفیت ہوئی۔ تینوں کیفیتیں باہم بالکل مختلف، تاہم تینوں شعور ہی کی جلوہ آرائیاں۔ جزئی کیفیتیں شعور کے ماتحت بیشمار سہی، لیکن نوعی حیثیت سے ان کی حد بندی کی جا سکتی ہے۔ جس طرح خواص مادہ کو چند مخصوص و متعین علوم کے اندر محدود و تقسیم کر لیا گیا ہے۔

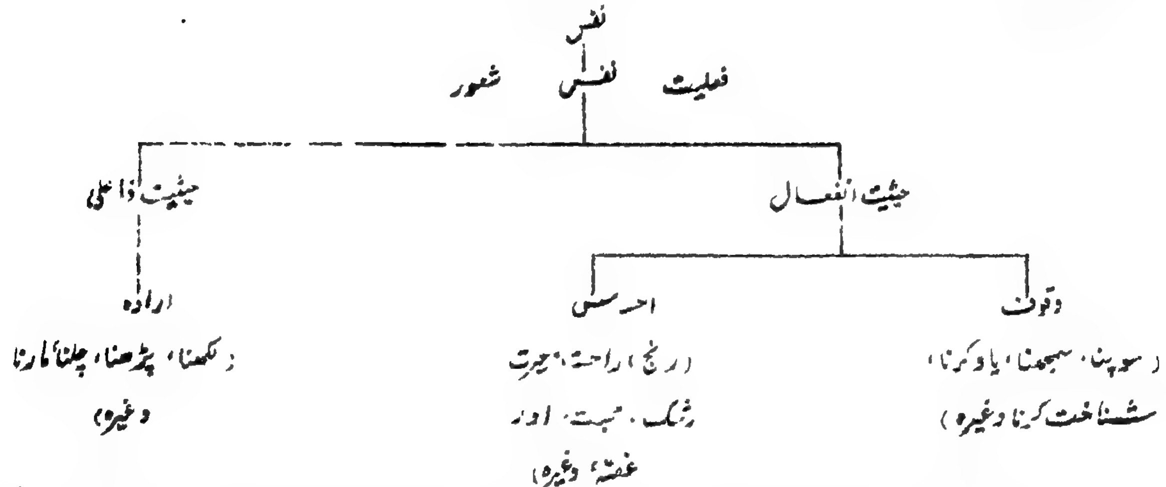
ہم نے کوئی آواز "سنی"، کوئی چیز "دیکھی"، کسی بات کو "سوچا"۔ کسی مسئلے کو "سمجھا"، کسی واقعہ کو "یاد" کیا۔ کسی بحث سے کوئی نتیجہ نکالا، کسی کو "پہچانا"، ان سارے متفرق واقعات میں ایک چیز مشترک نکلی۔ یعنی ان اعمال اور کیفیات سے صرف علم یا اطلاع، یا واقفیت میں اضافہ ہوا، کوئی مسرت یا ناگواری براہ راست ان افعال سے نہ پیدا ہوئی۔ ہو سکتا ہے، اور ہوتا رہتا ہے کہ ان اعمال کے نتیجے ہمارے لئے درد انگیز یا مسرت خیز ہوں، لیکن براہ راست ان افعال سے کوئی خوشی یا رنج ہمیں نہیں پہنچا، صرف واقفیت یا علم ہی میں اضافہ ہوا ——— ریاضی کا فلاں سوال ہم آج تک یہ سمجھے ہوئے ہیں، کہ یوں نکلے گا، آج استاد نے بتایا کہ نہیں، بلکہ دوں نکلے گا، اس سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوا، اور کچھ نہ ہوا۔ تاریخ آج ہمارے خیال میں پہلی تھی، ابھی خیال آیا کہ پہلی تو کل ہو گئی، آج تو دوسری ہے۔ یہاں بھی ایک بات محض یاد پڑ گئی، اس سے زائد کچھ نہیں ہوا۔ ہمارے سامنے دو چیزیں آئیں، ہم نے دیکھ کر بتایا کہ یہ سرخ رنگ کی ہے۔ یہ سبز رنگ کی۔ اس میں بجز اس کے کچھ نہ ہوا کہ ہم نے تیز شناخت سے کام لیا۔ اس نوعیت کے سارے افعال کا مجموعی نام وقوف ہے۔

ہم راستے میں جا رہے تھے، کہ ٹھوکر لگی اس سے فی الفور اور بلا واسطہ "تکلیف" محسوس ہوئی۔ اپنی کامیابی کی خبر سننے میں تو خوشی ہوتی ہے۔ ناکامی سننے میں تو "رنج" ہوتا ہے۔ کوئی توہین کرتا ہے تو "غصہ" آجاتا ہے۔ کسی ڈراؤنی چیز سے سابقہ پڑتا ہے تو "ڈر" لگنے لگتا ہے ——— غرض اس طرح رنج و راحت، درد و حسرت، الم و لذت، خوف و ہیبت، محبت و الفت، غیظ و غضب، نفرت و عداوت، رشک و حسد کی بیشمار کیفیتیں پیش آتی رہتی ہیں۔ ان سب میں رشتۂ اتحاد یہ ہے کہ وقوفی کیفیتوں کے برعکس، ان سے براہ راست، بالذات

ناگواری یا خوش گواری پیدا ہوتی رہتی ہے، ان کے لئے اصطلاح میں نوعی نام احساس ہے۔

بات چیت کرنے کو ہمارا جی "چاہا" اور ہم بولے۔ مٹھائی کھانے کی "خواہش" ہوئی اور یہ خواہش پوری کی۔ کہیں جانے کی ضرورت محسوس ہوئی، اور اس "قصد" سے ہم اٹھے ——————— وقوفی اور احساسی دونوں قسم کے تجربوں میں ہم محض متاثر رہتے ہیں۔ مؤثر نہیں ہوتے۔ نفس کی حالت انفعالی رہتی ہے۔ فاعلی نہیں ہوتی۔ اب جن تجربوں کی مثالیں سامنے آئیں، ان سب میں نفس کی حالت فاعلی نکلی۔ ہم مؤثر ثابت ہوئے۔ شعور کی اس تیسری نوعی فعلیت کے لئے جامع اصطلاح ارادہ کی ہے۔

وقوف، احساس اور ارادے کی انھیں تینوں کیفیات کا مجموعہ شعور ہے۔ اس کے عنصر اصلی یہی تین ہیں۔ شعوری کیفیت جو بھی ہوگی انھیں تین عنوانوں میں سے کسی کے تحت میں رکھی جا سکتی ہے۔ ذیل کا نقشہ بھی اسی کی توضیح کے لئے ہے:۔



زندگی کی تعریف ماہرین جسمیات وعضویات نے یہ کی ہے کہ زندگی اس خاص تناسب و توازن کا نام ہے جو جسم اور اس کے ماحول کے درمیان پایا جاتا ہے۔ جسم کی گرمی اور فضا کی گرمی کے درمیان جب تک تناسب و تطابق قایم ہے، انسان زندہ ہے۔ جسم کی ضرورتوں اور کائناتی عنصروں کے درمیان جب تک توازن قایم ہے، زندگی بھی قایم ہے ——————— شعور کی تعریف اسی انداز پر یہ کی جا سکتی ہے کہ شعور اس خاص تناسب و توازن کا نام ہے جو نفس اور اس کے ماحول کے درمیان پایا جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ نفس اور ماحول کے درمیان تاثیر، تاثر، فعل و انفعال کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا ہے اور اس کا نام جب تک انسان اس پر مطلع و باخبر رہے، شعور ہے۔

اسی سے اس حقیقت کو بھی ضم کر لیجئے کہ اس تطابق و توازن کی ممکن صورتیں دو ہیں:۔

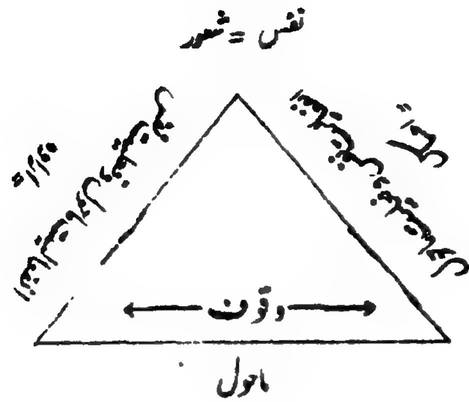
(۱) ایک یہ کہ نفس، ماحول سے اثر قبول کرے۔ خود متاثر و معمول ہو۔

(۲) دوسری یہ کہ نفس، ماحول پر اثر ڈالے۔ خود مؤثر و عامل ہو۔

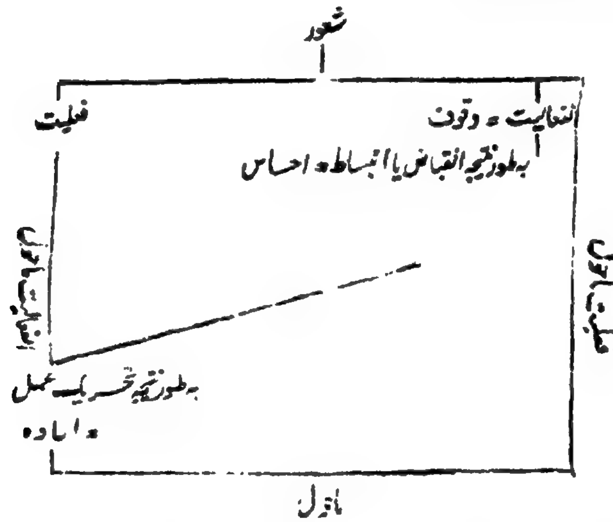
نفسیاتی ترتیب میں پہلا جزو دوسرے پر مقدم ہے۔ ذہن کی بالکل ابتدائی حالت انفعالی ہی ہوتی ہے۔ اس میں وہ ماحول سے صرف خوشگواری یا ناگواری کا اثر قبول کرتا ہے۔ اس منزل کا نام احساس ہے۔ اس کیفیت سے متاثر ہو کر نفس خود کچھ عمل کرنا چاہتا ہے۔ اس کیفیت فاعلی کا نام ارادہ ہے۔ لیکن ارادے کو وجود میں لانے اور شکل دینے کے لئے محض احساس کافی نہیں۔ بلکہ ماحول کا ادراک اور مختلف اشیاء کے درمیان امتیاز بھی ضروری ہے۔ شعور کی اس تیسری اور رابطہ پیدا کرنے کی درمیانی کیفیت کا نام وقوف ہے۔ یہ رابطہ، نفس کی انفعالیت اور فاعلیت کے درمیان واسطہ ہوگا۔

اب نقشہ ذیل ملاحظہ ہو :-

ماہرین فن کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ وقوف، احساس پر موقوف و مشروط نہیں۔ بلکہ خود اس کی شرط ہے اور اس پر مقدم ہے - یہ گروہ کہتا ہے کہ ماحول کی فعلیت کا سب سے پہلا اثر انسان پر یہ پڑتا ہے کہ اس کو کسی قسم کا علم یا ادراک حاصل ہوتا ہے - یہ وقوف ہوا - اس سے اس پر خوشگواری یا ناگواری کا اثر مرتب ہوتا ہے - یہ منزل حساس کی ہوئی - اب وہ اس احساس کو قایم رکھنا یا اسے دفع کرنا چاہتا ہے، اس کا نام ارادہ پڑا!



اس نظریے کو اس شکل کی مدد سے سمجھئے :-



اوپر جو تحلیل و تجزی عبارتوں اور نقشوں کے ذریعہ سے کی گئی - یہ صرف فنی ضروریات سے ہے - یہ مراد نہیں کہ وقوف سے احساس اور ارادہ واقعتاً بھی ایک دوسرے سے بالکل الگ تجربے میں آتے رہتے ہیں - عملاً ایسا ہونا ممکن نہیں - کوئی ارادہ ایسا ہو نہیں سکتا جس میں وقوف و احساس کی خفیف آمیزش بھی نہ ہو - کوئی وقوف ایسا تجربے میں آ نہیں سکتا جس میں احساس و ارادہ کی جھلکیاں موجود ہوں - کوئی احساس ایسا پایا نہیں جاتا، جو وقوف و ارادہ کے عنصروں سے یکسر پاک ہو ——————— شعور کی ہر نوعی کیفیت میں شعور کی دوسری نوعی کیفیتوں کا شمول کسی حد تک ضروری ہے - ہاں یہ ہے کہ اس میں ان دو کا جزو اتنا خفیف ہوتا ہے کہ فنی ضروریات کے لئے اسے نظرانداز کیا جا سکتا ہے اور جس کیفیت کا جزو نمایاں ہوتا ہے، اسی سے اس صنف شعور کو موسوم کرنے لگتے ہیں - جس کیفیت میں جزو غالب ارادہ کا ہوتا ہے، اس کا نام ارادہ پڑ گیا - جس میں پلہ وقوف کا بھاری رہا، اسے وقوف سے تعبیر کر دیا - جس میں حصہ قوی احساس کا ہوا اسے احساس کہنے لگے

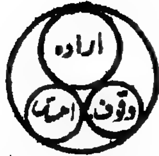
نفس واقعہ کے اعتبار سے ہر شعوری کیفیت کی تصویر ذیل کی کسی نہ کسی شکل میں ہوتی ہے -



اس کل کا نام وقوف



اس مجموعہ کا نام احساس



پورے دائرہ پر ارادہ کا اطلاق

نفس و شعور کے یہ تینوں عنصر عملاً اور واقعتاً کبھی ایک دوسرے سے بالکل خالی الگ موجود نہ ہوں، نہ ہی، نفسیات میں ان کا مستقل وجود فنی ضروریات اور سہولت تقسیم کے لئے تسلیم کیا گیا ہے۔ اور یہ صحیح معنی میں اجزائے نفس نہیں، مفردات نفس ہیں ——— رنگ کا وجود رنگین اشیاء سے خارج کسی نے دیکھا ہے؟ خوشبو، خوشبودار چیزوں سے الگ کس کے تجربے میں آئی ہے؟ تاہم رنگ و خوشبو، دونوں کا مستقل وجود سب ہی کو تسلیم ہے۔

بچہ آپ کے سامنے گرتا ہے۔ پیر میں چوٹ آئی اور وہ چلاتا ہے ——— چوٹ سے درد محسوس کرنا کھلی ہوئی مثال (احساس) کی ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ درد ہے۔ یہ بھی جانتا ہے کہ درد پیر میں ہے، ہاتھ یا سر میں نہیں۔ پیر پکڑ لیتا ہے یا سہلانے لگتا ہے، یا ادھر اشارے کرتا ہے ——— یہ جان لینا، سمجھ لینا، پہچان لینا، سب وقوف کی فعلیت ہوئی۔ پھر یہ پیر کا پکڑ لینا یا سہلانے لگنا اور جسمانی حرکتیں کرنا ارادہ ہی کی ماتحتی میں اس سے سرزد ہوتی ہیں۔ اسی طرح شعور کی ہر مفرد کیفیت میں کچھ نہ کچھ اور کسی نہ کسی حد تک دوسری کیفیتیں بھی ضرور شامل رہتی ہیں۔

شعوری کیفیتوں کی مثالیں بہت سی اوپر گذر چکیں۔ کچھ ضمناً اور کچھ مستقل۔ ان پر غور کیا جائے تو ہر شعوری حالت میں صفات ذیل بھی نظر آئیں گی :-

(۱) پہلی چیز توجہ ہے۔ کسی شے کے شعور میں آنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم ادھر کسی حد تک متوجہ و مخاطب ہیں۔ جو شے سرے سے توجہ میں نہیں آئی، وہ شعور میں بھی نہیں آسکتی۔

(۲) پھر تمیز ہے۔ اگر دنیا کی ہر شے بالکل یکساں ہو۔ تو شعور سرے سے پیدا ہی نہ ہو۔ کائنات خارجی میں جو تبدیلیاں ہوئیں اور ہر لمحہ ہوتی رہتی ہیں، شعوری کیفیات بھی انہیں کے مطابق و ماتحت پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ کسی شے کے زیر شعور آنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم نے اسے دوسری موجودات سے معنی میں اور کسی حد تک ضرور ممتاز اور علیحدہ کر لیا۔ تفریق و امتیاز کے بغیر شعور، شعور نہیں۔ دنیا میں اگر نور ہی نور ہوتا تو تاریکی کا کوئی مفہوم ہی ذہن میں نہ آتا۔

(۳) شعوریت کا تیسرا عنصر تشابہ ہے۔ جو شے ذخیرۂ شعوری سے قطعاً بیگانہ و غیر متعلق ہے وہ شعور میں آ ہی نہیں سکتی۔ ضروری ہے کہ جو جدید شے ہمارے تجربے میں آئے اسے شعور کی سابق حالتوں سے کچھ نہ کچھ ربط و تعلق ہو۔ جس شے کو شعور سے کسی قسم کا تشابہ نہ ہوگا، اس کا وجود شعور کے لئے عدم کے مساوی ہے ——— یہ قانون ظاہر ہے کہ بالکل ابتدائی اور اولین تجربوں کے بعد کے لئے ہے۔

• جوانی کے قیمتی وقت کو گذشتہ افسوس اور مستقبل کی خواہشات میں ضائع نہ کرو۔ کیونکہ جوانی تمام عمر میں ایک مرتبہ آتی ہے۔

(لانگ فیلو)

ایک بندر، جو لنجا تھا

ڈاکٹر دوتری ناتھ اسلر

اگر میں آپ کو پریوں کی کہانی سنانے بیٹھتا تو یقیناً اپنی کہانی کو اس جملے سے شروع کرتا کہ کسی زمانہ کا ذکر ہے ـــــــ ـ ـ ـ ـــ مگر میں تو ایک لنجے بندر کی کہانی سنانے بیٹھا ہوں ـ اور اصولاً اپنی کہانی کو اس جملے سے شروع کرنے میں ہچکچا رہا ہوں ـ مگر کیا کروں یہ کہانی اتنے پرانے زمانے سے تعلق رکھتی ہے کہ اسے بھی اسی جملے سے شروع کرنے پر مجبور ہوں ـ کیونکہ میری کہانی کا ہیرو "لنجا بندر" ، ایک دو ہزار برس پہلے نہیں بلکہ کم از کم تیس ہزار برس پہلے!

اور تھا بیچارا ایک پیر سے لنجا ـ

خیر ـ جب تک ماں کا دودھ پیتا رہا اور اس کی پیٹھ سے چمٹے چمٹے درختوں درختوں کی سیر کرتا رہا ـ اس وقت تک تو اسے اپنے لنجے پن کا احساس نہ ہوا ـ مگر جب ذرا ہوش سنبھالا تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ چلنے پھرنے، دوڑنے کودنے میں تو کوئی دقت محسوس نہیں کرتا مگر جب اس کے ساتھی خوشی کے ترانے گاتے ہوئے، ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے درختوں پر چڑھ جاتے ہیں اور ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر اچھلتے کودتے ہوئے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں ـ تو وہ اپنی جگہ بے بس و مجبور رہ کر رہ جاتا ہے ـــــــ آہ ـ کتنی مسرت ہوتی ہے ٹہنیوں میں جھولنے سے، سرسراتی ہوئی پتیاں، لچکتی ہوئی ٹہنیاں ـــــــ اس کی بے حس انگلیاں ٹہنیوں کو پکڑ ہی نہیں سکتیں ـــــــ اور اس کے ساتھی ہیں کہ اونچی اونچی پھنگوں پر بیٹھ کر مزے سے پھل کھا رہے ہیں ـ اگر کسی نے از راہ ہمدردی پھل توڑ کر زمین پر پھینک دئے ـ تو ایک لذیذ رس بھرے پھل کھانے کو بھی مل گئے ـ نہیں تو بور اور زمین پر بکھرے پڑے ترسا کرو ـ

چار و ناچار بچپن بھی گذر گیا ـ لیکن جب جوانی آئی تو اسے یہ لنجا پن اور بھی کھلنے لگا ـ اور دو قسم کے خیالات اس کے ذہن میں چکر لگانے لگے ـ

پہلا خیال یہ تھا کہ کیوں نہ وہ کسی درخت کے کھوہ میں آرام سے بیٹھ جائے ـ اور تارک الدنیا کی زندگی اختیار کر لے ـ

اس نے تصور ہی تصور میں اپنی اس زندگی کے نقشے بنا لئے ـــــــ جیسے وہ دو زانو بیٹھا ہوا ہے ـــ آنکھیں بند کئے ـــ اور عقیدتمند بندروں کا ایک گروہ بڑے اعتقاد اور خلوص سے اس کی باتیں سن رہا ہے ـ اور وہ کہہ رہا ہے ـ

قدرت، قدرت

تم قدرت کے بہت معتقد ہو

مجھ کو دیکھو ـ میرے ساتھ قدرت نے کتنا ظلم کیا ـ اس نے مجھ کو کتنی راحت سے محروم کر دیا ـ

اگر بندروں کا کوئی خدا ہے ـ تو یہ خدا ظلم اور نفرت کا خدا ہے ـ کیونکہ بھائیو عزیزو رفیقو رحمت اور محبت کا خدا مجھ جیسے کو نہیں کسی بھی بندر کو ایک پیر سے لنجا نہیں کرتا ـ

وہ سوچتا رہا کہ روز بروز عقیدتمند بندروں میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا ـــ اور وہ ہر روز نئی نئی دلیلوں سے بندروں کے خدا کے خلاف

زہر اگل کر اپنی بے بسی کو تسکین پہنچائے گا ۔ دلیلوں کے ساتھ ہی ساتھ اپنا لنجا پیر دکھا کر وہ اپنی باتوں کی صداقت پر زور دے سکے گا ۔

دوسرا خیال یہ تھا کہ کیوں نہ وہ اپنی قوم سے بغاوت کر دے ۔ اور بندروں ہی کو نیست و نابود کر دے ۔ روتے، منہ بسورتے بندروں کے گروہ کو جمع کرنے سے بہتر تو یہی ہے کہ وہ ایک طاقتور گروہ کا سردار بن جائے ۔ اور اپنے سے زیادہ خوش نصیب بھائی بندوں کو تباہ و برباد کر دے۔ اس کے لنجے پن نے یوں بھی اسے تنہائی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا ہے ۔ وہ محفلوں میں جائے تو کون اس کا خیر مقدم کرے گا ۔ نہ وہ دوسروں کے ساتھ شکار پر جا سکتا ہے اور نہ قبائلی رقص ہی میں حصہ لے سکتا ہے ——— ہاں ۔ یہی ٹھیک ہے ۔ وہ سماج سے باغی ہی ہو جائے گا اور ایسے بندروں کی قیادت کرے گا جو اپنے ماحول سے، اپنے بزرگوں، اپنے ہم عمروں سے نالاں ہیں وہ سب کے سب اپنے ہاتھوں کو ہمہ وقت دوسرے بندروں کے خلاف جنگ میں مصروف رکھیں گے ——— یہ سچ ہی سہی کہ وہ لنجا ہے اور درختوں کی ٹہنیوں میں ——— لچکتی اور لٹکتی ٹہنیوں میں ——— جھولنے سے محروم ہے ۔ مگر اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت تو آ ہی سکتی ہے ۔ جس سے اس کے ساتھی ——— ٹہنیوں میں جھولا جھولتے اور ایک سے دوسری پر چھلانگیں مارتے ساتھی ——— محروم رہیں گے ۔

بس ——— یہی وہ خیال تھا جو اس لنجے بندر کی تسکین کا باعث بن سکا ۔ اور اسی خیال نے اسے تارک الدنیا اور باغی ہونے سے بچا لیا ——— اس نے اپنی منطق میں یہ خیال کیا کہ شاید اس کا لنجا پن اس کی دوسری قوتوں کی زیادتی اور بہتری کا ضامن ہے ——— وہ یہ تو معلوم ہی کر چکا تھا کہ اس کا لنجا پن سوچنے سمجھنے میں حائل نہیں ہوتا اور پھر تعجب خیز تو یہ انکشاف تھا کہ وہ اوروں سے زیادہ تیزی سے بھاگ سکتا ہے ۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ اسی طرح اپنے دوسرے ساتھیوں سے زیادہ اپنے دماغ کو کام میں لا سکے اور تارک الدنیا اور باغی ہونے کی بجائے ایک ایسے سماج کی بنا ڈالے جو درختوں کے باسیوں سے الگ راہ اختیار کرے ——— ایک اچھی اور بہتر سوسائٹی بنائے ؟

اس طرح یہ تنہا بندر اپنے لنگڑے پیر کی وجہ ہی سے زمین کے قریب تر آیا ۔ وہ اپنے ساتھیوں سے زیادہ سیدھا کھڑا ہونے لگا اور اس نے کھڑے ہو کر بندروں کی طرح درختوں کی ٹہنیوں سے لٹکنے کے بجائے ہاتھوں سے زیادہ کام لینا شروع کیا ۔ اب کیا تھا ——— گویا کہ معجزے ہونے لگے ۔ ہاتھوں کے کثرت استعمال سے ہتھیلی کے پہلو سے ایک انگوٹھا نکلا ۔ جس سے انگلیوں کی گرفت میں اور بھی آسانی پیدا ہو گئی ۔ وہ وزنی سے وزنی چیزوں کو اٹھانے لگا اور پیروں پر بالکل آدمیوں کی طرح چلنے لگا ۔

اہم ترین تغیر تو یہ تھا کہ اس بیچارے لنجے بندر کو اپنے درختوں والے بندروں کے مقابلہ میں اپنے دماغ پر زیادہ زور دینا پڑا ۔ دماغ بھی اس نے بوجھ کو سنبھالتا نظر آیا اور اس کی چھپی ہوئی قوتیں رونما ہونے لگیں

پھر اس لنجے بندر ہی سے ——— جس نے تنہائی کی زندگی اور بغاوت کے خلاف جد و جہد کی، ایک نئی نسل شروع ہوئی ۔ جو زیادہ "انسان نما" کہلائی جا سکتی ہے اور بہت حد تک اس کو "انسان" ہی کہنا چاہیے کیونکہ جوں جوں وقت گذرتا گیا ۔ اس نسل سے اور بچے پیدا ہوئے تو وہ ——— جانتے ہیں کون تھے ——— ہمارے اجداد ——— وہ پہلے انسان جو دوسرے جانوروں کے مقابلہ میں اشرف المخلوقات کہلانے کے مستحق تھے ۔ ان بندروں ہی سے کروڑوں سالوں کے ارتقا میں انسان نے اپنی موجودہ شکل، ذہانت ورثہ میں پائی ہے ۔ اس لنجے بندر سے شروع ہوئی یہی نسل جس نے اپنے احساس خودی کا مقابلہ کیا اور اپنی زندگی کی حفاظت کے لئے نئے طریقے نکالے ——— تاریخ ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے ۔ وہ لوگ دوسرے کے مددگار رہے، ایک دوسرے کی حفاظت کی ۔ لامحالہ ان کو ایک دوسرے پر اظہار خیال کے لئے زبان کو لکھنے لکھانے کی ضرورت محسوس ہوئی ——— ہماری موجودہ تہذیب اس کی سائنسی ایجادات، جوہری کارنامے سب اسی بندر کے مرہون احسان ہیں جس نے تیس ہزار برس پہلے کے دھندلکے میں نامساعد حالات کا مقابلہ کیا ۔

کیا ہوا اگر یہ کہانی جھوٹی سہی ۔ مگر یہ ایک نفسیاتی اصول ——— اصول تلافی ——— کو کہانی کی صورت میں پیش کرنے میں

بہت کامیاب ہے۔ ——— اب ذرا اس تلافیاتی اصول کو سمجھئے۔ اس اصول کے بموجب اگر کسی انسان یا جانور میں کوئی جسمانی کمزوری پیدا ہو جائے۔ تو دوسری قوتیں ——— دوسرے اعضا اس کی تلافی کر دیتے ہیں۔ ان میں زیادہ تقویت پیدا ہو جاتی ہے، وہ زیادہ تیزی کے ساتھ اپنی تکمیل کر لیتے ہیں ———

قدرت نے کچھ ایسا انتظام رکھا ہے کہ خود ہم میں ہی ایسی طاقتیں پوشیدہ ہیں۔ جو کسی کمی کی تلافی کرنے میں حیرت انگیز اثر رکھتی ہیں۔ ہماری کوئی بھی کمزوری چاہے جسمانی ہو ——— مثلاً لولا پن، لنگڑا پن ——— چاہے دماغی ——— وہ کسی نہ کسی طرح سے سوسائٹی کے مفاد میں کام لائی جا سکتی ہیں۔ جانوروں کے نوع سے انسانیت کا طلوع اسی اصول تلافی کی وجہ سے ہوا۔ بلکہ یہ کہنا بھی بجا ہے کہ نوع انسان کی تاریخ اسی مکافات کے اصول کی تاریخ ہے۔ جو نسلاً بعد نسلاً ہم تک پہنچی ہے۔ ہماری موجودہ تہذیب کی بنیادیں در اصل ابتدائی انسان کے جذبہ خوف پر رکھی ہوئی ہیں۔ جبکہ ہر طرف اس کو چٹ کر جانے کے لئے خونخوار درندے تھے، اس کے کھیتوں کو برباد کرنے کے لئے آندھیاں تھیں وغیرہ وغیرہ لیکن وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہا۔ اس نے اپنی مجبوریوں کی دیواریں ڈھائیں اور ——— قدرت نے بھی اسی اصول تلافی کی پابندی میں اس کی پوری مدد کی ——————

وہ جانور جن کی بصارت تیز ہوتی ہے۔ ان کو عینک یا دوربین کی ضرورت نہیں ہوتی ——— شیر اور چیتے اپنے شکار کے گوشت کو پکا کر، گلا کر نہیں کھاتے ——— برفستان کے بھالو اپنے کو گرم رکھنے کے لئے کمبل نہیں اوڑھتے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ انسان اور تمام جانوروں سے بہت کمزور واقع ہوا ہے۔ اس کے بچپن کا عرصہ، ماں باپ کی نگرانی کا زمانہ طویل ہوتا ہے ——— اسی لئے جتنی سماج کی، سماجی سہولتوں کی اسے ضرورت ہے ——— اور کسی جانور کو نہیں ——— اس کی ساری تہذیب، ساری ترقی صرف اسی اصول تلافی کی ممنون احسان ہے۔

وہ زیادہ دور تک نہیں دیکھ سکتا

اس نے دوربین بنائی۔ ٹیلیفون بنائے

وہ اپنی آواز کو بہت دور تک نہیں پہنچا سکتا

اس نے ریڈیو، ٹیلیفون کی مدد لی

وہ ہواؤں میں پرواز نہیں کر سکتا

اس نے ہوائی جہاز بنائے۔

——— وغیرہم ———

نسل کی یہ تواریخ انسانی زندگی پر بھی صادق آتی ہے۔ جو کچھ سب انسانوں نے کیا۔ وہی آپ اپنی زندگی میں بھی کر سکتے ہیں ——— اور کرنا چاہیئے۔ انسانوں نے سماج کی بنیادیں ڈال کر ایک دوسرے کی حفاظت کی۔ کیونکہ کوئی بھی انسان دوسرے انسانوں سے دور ——— کسی اکیلے جزیرے میں، خوش نہیں رہ سکتا۔ وہ دوسرے انسانوں تک پہنچنے کے لئے جتنے زیادہ سے زیادہ پل بنائے گا۔ راہیں پیدا کرے گا۔ اتنا ہی مسرت کے نغموں اور اس کے رقص سے لطف اندوز ہو گا ——— انسان کے لئے اصول تلافی میں صرف ایک حد مقرر ہے ——— اس کا ہر کام دوسرے انسانوں کے مفاد میں ہونا چاہیئے ——— دوسرے لفظوں میں ——— ہمارے لئے حقیقی خوشی یہی ہے کہ ہم سماجی بھلائی کے راہوں پر گامزن ہوں۔ ہمارے موجودہ دور کی سب سے بڑی ناکامی، اس کے کانٹے اور اس کے زخم صرف اس لئے ہیں کہ کچھ لوگ اپنی کسی کمی، کسی کمزوری کی تلافی میں ــ غیر سماجی، غیر انسانی طریقوں میں لگ جاتے ہیں۔ وہ اسی بندر کی طرح اپنے گرد روتے بسورتے لوگوں کو جمع کر کے انسانی مسرتوں کی اس لئے مذمت کرتے ہیں کہ خود رنجیدہ ہیں۔ وہ انسانیت کو بھی خوشی سے محروم کر دینا چاہتے ہیں یا پھر ایسے لوگوں کا ایک گروہ بناتے ہیں جو ہمہ وقت سماج کے خلاف زہر اگلتے ہیں، اسی کی راہوں میں کانٹے بچھانے میں مصروف رہے ——— وجہ یہ ہے کہ غلط قسم کی تلافی

جرم، تاریکی اور پاگل پن کے غار میں ڈھکیل دیتی ہے۔

یہ تحقیق[1] ڈاکٹر الفرڈ اڈلر کی ہے۔ انہوں نے اپنی مشہور و معروف کتاب میں بہت سی مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ انسانی تواریخ میں اکثر و بیشتر ایسے مرد، ایسی عورتیں ملتی ہیں جنہوں نے اپنی ذاتی کمزوریوں کو سماج کے مفاد میں صرف کیا۔ ان کے اجسام کی بیکاریاں ہی ان کی زندگی کے طرز کی باعث بنیں۔ اسی کتاب سے اشارے لے کر سائنس والوں نے گہری چھان بین کے بعد چار طریقے بتائے ہیں جن سے حقیقی یا فرضی کمزوریاں دور ہو سکتی ہیں ——

اس عضو کو اگر استعمال کرنے کی کوشش کی جائے۔ تو اس میں غیر معمولی کامیابی ممکن ہے

اس خراب عضو کے بجائے جسم کے کسی دوسرے عضو کو استعمال کریں۔ اور اس طرح استعمال کریں کہ وہ قائم مقام عضو، کمزور عضو کا بھی کام انجام دے۔

ایسے مواقع پیدا کئے جائیں کہ اس عضو کی کمزوری ہی سود مند ہو

پوری شخصیت ہی اس قسم کی بنائی جائے کہ اس کمزوری کی اہمیت نہ رہے

پہلے طریقے کو استعمال کرنے والے

ہومر — جو اندھا تھا لیکن دنیا کی شاعری اس کی کمزوری کی تلافی ہے — وہ آج تک ہزاروں دلوں کو پیغام محبت پہنچاتا ہے۔

بریلے — [illegible] اندھوں کے پڑھنے کے طریقے بنا کر ہزاروں کو آنکھیں دیدیں

دوسرے طریقے کو استعمال کرنے والے

[illegible] روز[illegible] وغیرہ

تیسرے طریقے کو استعمال کرنے والوں میں ——— گونگے آرٹسٹ، پستہ قد مجذوب مقرر [illegible] ہیں۔

اور چوتھے طریقے کو استعمال کرنے والے تو بہت ہیں۔ ان میں سب سے مشہور لیونارڈو ڈاونچی اور فرانسیسی ڈاکٹر ٹروڈیو کے ہیں۔ لیونارڈو عموماً اپنے بائیں ہاتھ سے داہنے ہاتھ کے سارے کام کیا کرتا تھا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جبکہ یہ بہت بڑی کمزوری سمجھی جاتی تھی لیکن لیونارڈو نے اپنے دونوں ہاتھوں کا استعمال کیا اور آج دنیا کا عظیم ترین سنگ تراش مانا جاتا ہے۔ اور ٹروڈیو جو خود تپ دق کا بیمار تھا اس نے تمام عمر اس بیماری کے علاج کی تحقیق میں گذار کر اپنے کو بھی اس بیماری کے چنگلوں سے آزاد کیا اور دوسرے ہزاروں، لاکھوں کو بھی۔

لیکن اصول تلافی کے سلسلے میں ایک خطرہ کا بھی امکان ہے۔ اکثر لوگ ان ہی کمزوریوں کو احساس برتری میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً آپ روزمرہ ایسے آدمیوں سے ملتے ہونگے جو بات بات میں اپنی اہمیت، اپنی شخصیت، اپنے کارناموں کا ذکر کیا کرتے ہیں—— ——— یہ لوگ اس دھونس دھاندلی کے پردے میں اپنی کمزوریوں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو واقعی میں کردار اور سماجی اقتدار کی وجہ سے اہم ہیں ان کو اس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ بات بات میں اپنے ہر ملنے والے کا بھیجا چاٹا کریں

ہر شخص کبھی نہ کبھی احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کو دور کرنے کے دو طریقے ہیں

---

[1] ORGAN INFERIORITY AND ITS PSYCHIC COMPENSATION

دوسروں کے ساتھ ہنسی خوشی رہنا سیکھیئے

خود اپنے ساتھ کامیابی سے نباہیئے۔

اگر ہم نے دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنا نہ سیکھا تو ہماری تخلیقی قوتیں جو اپنے اظہار کے لئے اندر ہی اندر مچل رہی ہیں۔ وہ خود بھی ڈوب جائیں گی اور ہم کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں گی۔ ان کے اظہار کے بہترین مواقع سوسائٹی ہی میں ملتے ہیں۔

اور جہاں تک "اپنے ساتھ" رہنے کا سوال ہے۔ اس پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ ہزاروں مرد، ہزاروں عورتیں خود اپنے کو سمجھنے اور اپنے سے صلح کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ وہ خود کو فریب دیتے ہیں اور اپنی سچی تصویر کو دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ بالکل ہی خیالی دنیا بناتے ہیں اور اپنے کو اس میں محصور کر لیتے ہیں اور اسی لئے وہ خوش نہیں رہتے۔ ——— اپنے میں اتنی ہمت پیدا کیجئے کہ آپ خود ان خود فریبیوں اور خوش فہمیوں کے پردوں کو چاک کر کے اپنی اصلی حالت کو دیکھ لیں۔ خود اپنا تعارف اپنے سے کرائیں اور تب ہی آپ اس راز کو پالیں گے کہ آپ میں بھی قدرت نے کتنی رنگینیاں، کتنی دلکشی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے اور آپ واقعی "دلچسپ" ہیں۔

اگر آپ احساس کمتری میں مبتلا ہیں تو اس میں آزردہ ہونے کی کیا بات ہے۔ جس کمزوری پر آپ رنجیدہ ہیں اور دل ہی دل میں جلے بھنے جا رہے ہیں۔ اسی کمزوری کی مدد سے ہزاروں مرد، ہزاروں عورتیں آج عدیم المثال ہستیاں بنی بیٹھی ہیں۔ جن کی تمام ہی سے ہمارا ادب "زندہ ادب" کہلاتا ہے جن کی تخلیقات سے ہماری تہذیب اپنی شادابی پاتی ہے۔ آپ بھی ان ہی کی طرح ستاروں کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے چاندی سی آن قیمت حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن ——— یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ آپ مایوس رہنا چھوڑ دیں اور اپنی کمزوریوں کو نوع انسان کے مفاد میں صرف کرنے کی کوشش کریں۔

اس کہانی کے بندر کو نہ بھولئے

بیس ہزار برس پہلے کے اس بندر کو جو لنجا تھا لیکن جس کا نیجا بن

اور پھر آپ تو انسان ہیں

تلخیص و ترجمہ　ادارہ

خاص سالگرہ نمبر کے لئے

احساسِ برتری

(بیگم رئیس جہاں نیر انصاری)

انسان انسان پر فضیلت چاہتا ہے۔ ایک شہر دوسرے سے خوب صورت ہو کر گونا سبقت لے جانے کی فکر میں ہے۔ صوبہ غیر صوبہ پر حاوی ہونے کے راستے ڈھونڈھ رہا ہے۔ ہندوستان پاکستان کے پچھاڑنے کا متمنی ہے۔ یورپ ایشیا پر ڈورے ڈال کر اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے پیچ و تاب کھا رہا ہے اور دنیا کا ہر انسان اپنی اپنی جگہ پر پریشان ہے۔ عرصۂ حیات تنگ اور راہِ فرار مسدود ——— خودکشی ہر مذہب میں حرام ——— نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن ——— ایٹم بم بن رہے ہیں ان کی ایجاد میں تیزو تیز ترقیاں ہو رہی ہیں۔ فضا میں پُراسرار طشتریاں اُڑتی دکھائی دیتی ہیں اور انسان انسان کا گلا گھونٹ کر ——— اُس کو موت کے گھاٹ اُتار کر ——— اس کی لاش پر اپنی عالی شان عمارت کھڑی کرنا چاہتا ہے ——— آپ کہیں گے چھوٹی مچھلیاں پیدا ہی اسی لئے ہوتی ہیں کہ بڑی مچھلیوں کی خوراک بنیں۔ غریب کی تخلیق اسی لئے ہوئی ہے کہ امیر اس کی ہڈیوں تک کو پیس کر اپنے محلوں کی بنیاد قائم کریں ——— حکومت کا مقصد یہی ہے کہ محکوم سڑکوں پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں ——— یہ انسانیت نہیں ——— نہ ترقی کی منازل ایک ملک کی دوسرے ملک کو نقصان پہونچانے میں مضمر ہیں ——— زمانہ متقاضی ہے وہ بہتر اور وہ بہترین وایجاد کے فوراً بعد وہ پرانے ہو جاتے ہیں ——— لیکن یہ کون کہتا ہے کہ وہ بہتر اور بہترین وہ نئے صرف اپنے سے پہلی ایجادات کو فنا ہی کر کے رہ سکتے ہیں۔

ذرا وہ زمانہ تو یاد کیجئے جب چیچک میں ہر سال ہزاروں انسان ختم ہو جاتے تھے۔ طبیب بے بس تھا۔ بیماری کی تشخیص تک نہ ہو پاتی تھی۔ علاج تو کہاں سے تجویز ہوتا۔ حکیم، ڈاکٹر، مُلّا سبھی تو حیران تھے۔ لیکن مرض ہوا اور مریض غائب۔ پھر اللہ کے اُن بندوں کا تصوّر کیجئے۔ جنھوں نے علاج کی دریافت میں رات دن ایک کر دیا۔ جڑی بوٹی کی تلاش میں پہاڑ، ندی، جنگل سبھی تو چھان مارے ——— اُن بندوں نے جو معالج تھے۔ جن کے مطب میں بوتلیں دواؤں کی جگہ پانی سے نہیں بھری رہتی تھیں۔ جن کی موٹریں اُمراء کے لئے وقف نہیں تھیں۔ جن کے کپڑے مریض کے پاس کھڑے ہونے سے میلے نہیں ہو جاتے تھے ——— یہ وہ لوگ تھے جن کے دل میں بنی نوع انسان کی بہبودی کا درد تھا ——— یہ وہ لوگ تھے جن کے دل میں خدمتِ خلق کے جذبے بھرے ہوئے تھے ——— یہ وہ لوگ تھے جو چیچک کے علاج کو دریافت کرنے کے لئے خود اپنے جسم پر چیچک نکال کر تجربے کر رہے تھے ——— یہ وہ طبیب تھے جو طرح طرح کے مہلک زہر پہلے اپنے اوپر آزماتے تھے۔ اُن کے اثرات سے تجربے کرتے تھے۔ بعض اوقات خود اپنی جان اِن تجربوں کی نذر کر کے اپنے ساتھی طبیبوں کے لئے ایک ٹھوس نتیجہ پیدا کر جاتے تھے ——— اور آخر ایک دن ——— ڈاکٹر جینر ——— اُس دوا کے موجد ہو گئے جو آج تک چیچک کے لئے آخری نہیں تو اہم ضرور ہے۔

زرد اور گرم توڑ بخار کے ابتدائی دن تو آپ کو یاد ہوں گے۔ کیا آپ یہ بھول گئے کہ ان کے علاج دریافت کرنے کے لئے اطبّاء نے کیا کیا مصائب برداشت کیں۔ کیا آپ کو یہ بھی یاد نہیں کہ کتنے ڈاکٹر اِن تجربوں کی نذر ہو گئے تھے اور آخر اُن کا علاج معلوم کر ہی لیا گیا ——— انسان کی تخلیق کا مطلب کیا ہے ——— ترقی ——— لیکن کیسے ——— ترقی کے لئے کیا یہ بھی ضروری ہے کہ دو فٹ کی دیوار کو گرا کر دس فٹ اونچی دیوار کھڑی کر کے کہا جائے کہ ایک فٹ

آگے بڑھ گئے ہیں ؟ ——— جلتے ہوئے چراغوں کو بجھا کر ہی گیس کی لالٹین ایجاد کرنے کی فکر کرنا ہرگز ترقی نہیں ——— انسان اشرف المخلوقات ہے لیکن اس لئے تو نہیں کہ انسان ہی کا گلا کاٹ کر مخلوق پر شرف بزرگی و عظمت حاصل کرے۔ اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت ہیروشیما کو آنِ واحد میں تباہ و برباد کر دینے ہی میں تو پوشیدہ نہیں ——— ملک گیری کی طمع ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ لیکن کیا نظامِ حکومت ایسا نہیں بنایا جا سکتا جو ملکوں کو خود بخود اپنی طرف کھینچ لے ——— کیا ہندوپاکستان مسئلہ کشمیر کو ایمانداری سے سلجھا کر مزید گتھیاں نہیں سلجھا سکتے ——— لیکن ——— لیکن ——— دونوں کے "وقار" کو صدمہ پہنچیگا۔ ——— ایمانداری کی معرفت فیصلہ کر کے ——— انسان اپنے "مفروضہ وقار" کو برقرار رکھنے کے لئے پیدا نہیں ہوا ——— یہ ضروری نہیں کہ اسس "وقار" کی خاطر لاکھوں عورتوں کو بیوہ اور کروڑوں بچوں کو یتیم کر دیا جائے ——— انسان کی ترقی کا راز انسان کی "غمگساری" میں ہے۔ ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلا کر دنیا کو روشن کیا جا سکتا ہے ایک کارخانہ سے بڑا دوسرا کارخانہ بنا کر مسئلہ بے کاری کو حل کیا جا سکتا ہے ——— مشینوں کے زیادہ کام کرنے کی وجہ سے جو آدمی بیکار ہوں گے اُن کو دیگر ضروریات کی فراہمی میں برسرِ روزگار کیا جا سکتا ہے ——— اگر انسان کے دل میں انسان کے لئے "درد" ہو۔ تو رستے ہوئے ناسور بند ہو سکتے ہیں ——— اگر ایک آدمی اپنے اعمالِ قبیحہ کا ردِ عمل دوسرے آدمی کے ذہن پر دیکھ سکے تو اس کو معلوم ہوگا کہ اس کا "احساس برتری" نہ صرف دوسرے انسان ہی کو بلکہ اس کے لواحقین تک کو ہلاک اور برباد کر رہا ہے اور اس طرح ایک "با اختیار حاکم" اپنے قلم اور الفاظ کے زعم میں انسانیت کو ختم کر رہا ہے۔ ہم صرف تقریروں اور قراردادوں کے بل پر ہی "انسانیت" کو زندہ نہیں رکھ سکتے ——— "عمل" اپنا "ردِ عمل" رکھتا ہے ——— اگر ایک چالاک سیاست داں آج دوسرے ماہرِ فن پر "ترپ" لگا سکتا ہے ——— اور اس طرح اپنا اُلو سیدھا کر سکتا ہے تو وہ یقیناً غلط راستہ پر گامزن ہے۔ انفرادی یا ذاتی فائدے کے پیش نظر کیا ہوا ہر عمل آج پھل تو ضرور دے گا لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسے خوفناک بیج بو جائے گا جن کے پھل کچھ عرصہ بعد سخت نقصان دہ ثابت ہوں گے۔

"ترقی" اور "تہذیب" کا راستہ "تباہ کن پگڈنڈیوں" میں سے نکالئے یہ "بٹیا" مختصر تو ضرور ہو گی لیکن کچھ زیادہ دیرپا اور قابلِ رشک "ترقی" کی منزل تک نہ پہنچ سکے گی۔ انسان ——— "عمل" اور "مستقل مزاجی" ——— کے لئے پیدا ہوا ہے لیکن اس کی تخلیق کا اصلی مقصد ——— "دردِ دل" بھی ہے۔ اگر آپ کے دل میں دوسرے کی قدر نہیں ——— اگر آپ اپنے سے کمتر درجے کے انسان کو بس اسی لئے "انسان" کہتے ہیں کہ اس کے کم درجہ ہونے سے فائدہ اٹھا کر اس پر حکومت ہی کریں تو آپ کا "بلند درجہ" قابلِ صد نفریں ہے ——— اگر آپ اس کی صلاحیتوں کا اندازہ لگائے بغیر اس کی مجبوریوں کو یکسر نظر انداز کر کے ——— اس پر بس حاوی ہو جانا چاہتے ہیں ——— اس پر اپنے "اعلیٰ درجہ" ہونے کی دھاک بٹھانا چاہتے ہیں ——— اگر آپ کا مطمحِ نظر صرف یہ ہے کہ وہ "محکوم" ہے اور آپ "حاکم" ہو کر اس پر ہر زیادتی کو واجب کر سکتے ہیں تو آپ یقیناً "شاہراہِ انسانیت" سے کوسوں دور کسی خوفناک ڈگر پر آنکھیں بند کئے سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑے چلے جا رہے ہیں ——— ایک ایسی ڈگر پر ——— جو کسی عمیق غار میں آپ کو منہ کے بل پھینک کر آپ کا چہرہ لہولہان کر دے گی۔ اپنے اونچے درجہ کے نشہ میں انسانیت اور شرافت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑئیے۔ انسانیت نے آپ کو یہ درجہ بخشا ہے تو انسانیت کے حقوق کو پامال نہ کیجئے۔ ہر آدمی آپ کی طرح انسان ہے ہر انسان کے ذہن پر آپ کے جابرانہ رویہ کا ردِ عمل اُسی طرح ہوتا ہے جس طرح آپ کے "اپنے" ذہن پر ہو سکتا ہے۔ اگر اپنے اختیارات کے زعم میں آج آپ آپے سے باہر ہو گئے تو کل آپ کو برہنہ دیکھ کر لوگ خوش ہوں گے اور کوئی آپ کے حال پر رحم کھانے والا نہ ہوگا۔ یہ عین فطرت ہے ——— ذرا اپنے حافظہ پر زور تو ڈال کر دیکھئے۔ وہ یاد ہے آپ کو ——— ابو بن ادہم کا خواب ——— اور ہاں اتنا دور جانے کی کیا ضرورت ہے ——— چینی فلاسفر کنفیوشس کے الفاظ تو یاد کیجئے ——— اور قریب آجاتے ——— خود اپنے زمانہ میں اقبال سے تو رائے لے کر دیکھئے انسان کا درجہ وہ کیا بتاتے ہیں۔

ترقی کرنے کا آپ کو پورا حق حاصل ہے۔ آپ زندہ رہنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں لیکن اپنے ہمراہی انسانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر کے زندہ رہنے کے لئے نہیں۔ ترقی کے لئے حقوق دوسروں کے بھی اتنے ہی ہیں جتنے آپ کے لئے، اور اسی طرح قوم ترقی کر سکتی ہے اسی شاہراہ سے گذر کر دنیا مہذب بن سکتی ہے۔ اسی اصول پر چل کر دوامی امن قائم ہو سکتا ہے اگر انسان ——— فرداً فرداً ہر انسان ——— اپنی اپنی جگہ حیوان ہو جائے تو لیگ آف نیشنز کچھ کر سکی ہے نہ اقوامِ متحدہ کچھ کر سکتی ہے۔ اس قسم کے ادارے تو صرف راہبری کر سکتے ہیں، صحیح یا غلط جانبداری یا غیر جانبداری سے رائے دے سکتے ہیں "عمل" اُن کے بس کی بات

نہیں اور پھر وہ بھی تو آپ کی طرح انسان ہی ہیں۔ جبلت تو اُن کے بھی آپ ہی ایسے ہیں۔ اگر آپ اپنی کشتیوں کو جلا کر اُن پر تکیہ کرکے بیٹھے ہیں تو وہ آپ کی کیا راہبری کریں گے بالکل ممکن ہے کہ وہ آپ کی جلتی ہوئی کشتیوں کے شعلوں پر ہاتھ ہی تاپ رہے ہوں۔ یہ بھی ایک انسانی طرز ہے۔ اگر آپ اپنی جگہ پر اپنے فرائض کو پہچان کر ان پر عمل کریں تو اللہ پر بھروسہ کرنے کی تو کیا اُن کی امداد کی بھی آپ کو ضرورت ہی نہ رہے گی آخر وہ آپ کی مدد کیوں نہ مانگیں۔ آپ ہی کیوں ان کے ہونٹوں سے اپنے کان لگائے رکھیں اور اس کا ایک واحد طریقہ یہی ہے کہ آپ اپنے اندر ——— دوسرے انسان کے لئے " ——— ایک " درد " محسوس کریں۔ ایک ایسی چبھن جو آپ کو اس وقت تک چین نہ لینے دے جب تک کہ اس کی آہیں خوش آہنگ نغموں میں نہ تبدیل ہو جائیں اور پھر آپ دیکھیں گے کہ دنیا آپ کے قدموں پر نثار ہو کر آپ کی چشم کرشمہ ساز کے اشارہ کی منتظر ہو گی۔ آپ اپنے اندر ایک ایسی تڑپ محسوس کریں گے جو اس وقت تک آپ کو چین نہ لینے دے گی۔ جب تک دوسرے تڑپتے ہوئے دل مطمئن نہ ہو جائیں گے۔ ایسی دنیا میں آخر اکثریت کیسے دلوں کی ہے ——— ڈانواڈول دل زیادہ ہیں اور مطمئن معدودے چند ——— کیوں نہ آپ ہی ان ڈانواڈول تڑپتے ہوئے دلوں پر مرہم رکھ کر سرخرو ہو جائیں۔ مریض کا دل موہ لینا تیماردار کے لئے کیا بڑی بات ہے۔ آپ ہمت کریں تو سب کچھ ہو سکتا ہے پہلے یہ دیکھئے کہ آپ خود کس مرض کے شکار ہیں ——— ارے صاحب! ایسی بات ہے ناکہ آپ ذرا ——— کچھ ایسے ہی ——— تیز مزاج واقع ہوئے ہیں۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے اسی لئے تو آپ کے گرد و پیش والے آپ کے خوف سے لرزہ براندام رہتے ہیں اور آپ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ آپ کا رعب در و دیوار پر طاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ دوسروں کے لئے اپنے دل میں کوئی جگہ نہیں پاتے۔ ان کے لئے آپ کے دل میں کوئی " درد " نہیں۔ اگر آپ کا خون ذرا سی بات میں اُبلنے لگے۔ تو آپ یقیناً ان کی شکایت کا اندازہ لگا سکتے تھے، کوئی وجہ نہیں کہ آپ ——— ایک انسان ہوتے ہوئے ——— دوسرے انسانوں کے دکھ درد کو نہ سمجھ سکیں ——— بس آپ ذرا جلدی غصہ میں آجاتے ہیں ——— طے کر لیجئے کہ بات بات پر ناراض نہ ہوں گے، یہ سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ آپ کا یہ جلد بھڑک جانے والا غصہ آپ سے کم درجہ رکھنے والوں کے ہاتھ پاؤں پھلا دیتا ہے۔ وہ غلطی کرتے ہیں، آپ ناراض ہو جاتے ہیں، اس کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ وہ ذرا زیادہ حساس ہونے کی وجہ سے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتے ہیں اور دنوں بلکہ ہفتوں کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں اور آپ سمجھ بیٹھے ہیں کہ " لاپرواہ " ہیں۔ کم درجہ اور پھر اس پر احساس کمتری ——— کڑوا کریلا اوپر سے نیم چڑھا ——— جاتا ہے زیادہ حساس ہو کر، اتنی سی بات تھی جس سے آپ بھی اپنے حواس کھو کر جامہ میں نہ رہ سکے اور رائی کا پہاڑ بنا کر رکھ دیا۔ تیز مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ غلط فہمی بھی آپ کی عادت میں داخل ہے اور یہ غلط فہمی ہی سب جھگڑوں کی جڑ ہوتی ہے یہ بھی کبھی خیال کیا ہے آپ نے ؟

یاد ہے آپ کو، شیطان ——— خداوند کریم سے قریب ترین فرشتہ ——— جس پر خود خداوند کریم کو ناز تھا ——— کیوں معتوب ہوا ——— صرف اس لئے کہ اس نے انسان کی توہین کی خداوند قدوسی ممکن تھا کہ اپنی حکم عدولی درگذر کر دیتے لیکن اس نے اس ہستی کے سامنے سر نیاز خم نہیں کیا جس کو خدا نے بزرگ و برتر زمین پر اپنا جانشین قرار دے چکے تھے۔ بابا آدم کی وہ خصوصیت صرف آپ ہی میں نہیں ہر انسان میں موجود ہے اور بالکل یکساں طور سے ہے۔ پھر جب مقرب ترین فرشتہ کا حشر یہ ہوا تو آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ آپ صرف اپنے احساس برتری کو قائم رکھنے کے لئے بالکل اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کی توہین کریں۔ اپنی برتری کے لئے اس کو تباہ و برباد کر دیں یا اپنی طاقت کے زعم میں اس کے وجود کو فراموش کر دیں اور پھر یہ تو سوچئے کہ انسان کی تخلیق آخر کیوں کی گئی ——— اگر خدائے تعالیٰ کو محض اپنی عبادت کرانی ہی مقصود تھی ——— ان کو صرف حمد و ثنا ہی مرغوب تھی تو کیا ایک لاکھ ۲۴ ہزار انبیاء اور لاتعداد فرشتے کم تھے۔ اسی غرض کی تکمیل کے لئے ؟ ——— وہ " انسان کے دل میں " انسان " کا درد دیکھنا چاہتا تھا۔ فرشتے حواس خمسہ سے عاری تھے اور انسان کو نفس بخش کر اس کا امتحان لینا مقصود تھا۔ اگر آپ اس امتحان میں پورے نہیں اُترتے تو آپ کچھ ہی ہونے کا دعویٰ کریں۔ کم از کم انسان تو نہیں، انسانیت کی پہلی شرط انسان کے لئے دل میں " درد " محسوس کرنا ہے۔ جانتے ہیں آپ ایک دل صد ہزار کعبوں سے بہتر ہے اور کسی کی دلشکنی کا کفارہ حج اکبر سے بھی نہیں دیا جا سکتا۔ خدا تمام گناہ معاف کر سکتا ہے لیکن انسان کی انسان کے خلاف حرکات کو معاف نہیں کر سکتا اور اس کی تلافی کے لئے مظلوم ہی کی معافی حاصل کرنی پڑے گی۔ اب سوچئے تو ذرا آپ کتنی آسانی سے ہزاروں گناہ ایسے روزانہ کر دیتے ہیں ——— جن کو خدا بھی معاف نہیں کر سکتا اور آپ کو خیال تک نہیں آتا کہ آپ اپنے ہم مشرب انسان کے گناہگار ہیں، اس انسان کے جس کے سامنے آج نہیں تو قیامت کے روز ضرور شرمسار ہوں گے۔ لیکن ——— اوہ، آپ کا یہ احساس برتری ! (-)

خاص سالگرہ نمبر کے لئے

صنعتی نفسیات اور اس کے مسائل

عبدالحمید اعظمی ایم اے لکھنؤ

صنعتی نفسیات علم النفس کی جدید ترین شاخ ہے۔ ابھی پورے پچاس سال بھی نہیں گذرے جب پہلے پہل جرمن ماہر نفسیات منسٹر برگ نے اس پہلو پر روشنی ڈالی۔ اس دور میں کارخانہ دار کو اپنی مشینوں کی حفاظت اور پیداوار بڑھانے کے لئے نئی نئی مشینوں کی ایجادات سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اسے اس مزدور کی بہبود کی ذرا بھی فکر نہ تھی جو ان مشینوں کو چلانے میں اپنی آنکھوں کی روشنی اور جسم و دماغ کی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں صاف کر ڈالتا تھا۔ منسٹر برگ نے اپنی تصنیف "علم نفس اور صنعتی اہلیت" میں "بہترین مزدور، بہترین طریق کار اور بہترین طریق فروخت" کا نعرہ بلند کیا۔ اس وقت مزدور اور کارخانہ دار کی جدوجہد کی ابتدا تھی۔ سرمایہ دار مزدور تحریکوں سے خائف تھے۔ اس آواز نے انھیں ڈھارس بندھی اور اس بظاہر لاینحل عقدہ کا حل پہلی بار دنیا کے سامنے آیا۔ اس مشعل کی روشنی میں متعدد عالموں اور ماہروں نے نئے نئے تجربات و نظریات کی بنیاد ڈالی۔

منسٹر برگ اور اس کے بعد کے مصنفوں اور مفکروں کے نزدیک اس تحریک کا اصل مقصد پیداوار کا بڑھانا تھا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھا گیا کہ پیداوار کے بڑھنے سے جو منافع کارخانہ کو ملے اس میں سے کچھ حصہ مزدور کو بھی مل جائے۔ کام کے اوقات میں بھی تخفیف کر دی گئی تاکہ مزدور تھکان کا شکار نہ ہو جائے۔ امریکن انجینئر ٹیلر نے طریق کار کی اصلاح میں بڑی ہی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اس نے کچا لوہا بار کرنے والے قلیوں کے طریق کار کا غائر مشاہدہ کر کے ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈالی جس سے نہ صرف یہ کہ قلیوں نے پہلے سے چوگنا کام کیا بلکہ وہ کم تھکے اور زیادہ ہشاش بشاش رہے۔ اپنی اس کامیابی سے متاثر ہو کر اس نے متعدد تجربات و مشاہدات کے بعد کارخانوں کے لئے ایک نئے نظام کار کی ابتدا کی جو ٹیلرازم کے نام سے کافی مقبول ہوا۔ انھیں اصولوں پر بعد میں اور کئی نظام قائم ہوئے حتیٰ کہ امریکہ میں تو ہر بڑے کارخانے نے اپنا ایک علیحدہ طریق کار متعین کر لیا۔

ان مختلف نظاموں کی تخلیق میں نفسیات دانوں نے علم النفس کے مسلمہ اصولوں کو کارخانوں میں استعمال کیا جس کے نتیجے میں وقت، حرکت، روشنی، حرارت، فضا کی نمی، خشکی، طبعی رجحانات و میلانات، اور اشتہار بازی کے پیچیدہ مسائل ابھرنے لگے۔ ماہرین نفسیات کو ضرورت پیش آئی کہ وہ کام کے وقت مزدور کی حرکات کا مشاہدہ کر کے غیر ضروری اور تھکا دینے والی حرکتوں کو ختم کر دیں۔ ان حرکتوں کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کم سے کم وقت میں اس طرح انجام پا جائیں کہ پیداوار پر اس کا کوئی برا اثر نہ ہو بلکہ تھکان کی کمی کے ساتھ ساتھ کام کی رفتار اور خوبی بڑھتی ہی چلی جائے۔

دوسرا اہم مسئلہ "روشنی" کا ہے اگرچہ کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں آفتاب کی روشنی ہے لیکن یہ ہر موسم میں اور ہر جگہ حسب منشا نہیں میسر آ سکتی۔ فی زمانہ اس کمی کو بجلی کے قمقمے پورا کرتے ہیں مگر یہ قمقمے کس طاقت کے ہوں اگر روشنی زیادہ ہے تو آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور کام کم ہوتا ہے اگر کم روشنی ہے تو آنکھوں پر زور پڑتا ہے اور کام کی رفتار بھی سست پڑ جاتی ہے اسی کے ساتھ اس بات کا بھی لحاظ رکھنا ہے کہ روشنی برداشت کرنے میں شخصی اختلافات ہوتے ہیں علاوہ ازیں کچھ ایسے کام ہوتے ہیں جنہیں زیادہ روشنی درکار ہے اور کچھ میں کم۔ گرچہ تجربات سے مغربی ممالک نے اپنے یہاں کے حالات کے مطابق معیاری روشنی مقرر کر دی ہے مگر اس برکوچک میں ابھی تک اس مسئلہ پر کوئی خاص کام نہیں ہوا ہے۔

کام کی رفتار اور صحت کا گہرا تعلق ہے اچھی صحت کے لئے کارخانوں میں مناسب حرارت اور ہوا مناسب نمی کی ضرورت ہوتی ہے بعض کارخانوں میں کام کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ وہاں کا درجہ حرارت اور نمی مزدوروں کی صحت کے لئے مضر ہوتی ہے۔ صنعتی نفسیات کے ماہر کا فرض ہے کہ وہ ایک ایسا درجۂ حرارت مقرر کر دے جو نہ مزدور کے لئے مضرت رساں ہو اور نہ پیداوار کی خوبی پر کوئی برا اثر ڈالے۔

MUNSTERBERG — PSYCHOLOGY AND INDUSTRIAL EFFICENCY　　ط

خستگی کا مسئلہ صنعتی نفسیات کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ نفسیات کارخانوں میں اسی لئے داخل ہوئی کہ وہ مشین اور انسان کے تعلقات اور اہمیت کو واضح کرے۔ اس سلسلہ میں اس تحریک کا خاص مقصد مزدور کو زیادہ کام اور اس طرح زیادہ تھکان سے بچانا ہے۔ خستگی کا اثر نہ صرف کام کی خوبی پر پڑتا ہے بلکہ یہ مزدور کی زندگی اور اس کی حفاظت کے اہم سوال سے بھی متعلق ہے۔ اسی کی ایک شاخ حادثات کی چھان بین بھی ہے۔ حادثات کیوں ہوتے ہیں انھیں کس طرح روکا یا کم کیا جا سکتا ہے۔ مشینوں کی رفتار کتنی ہے کہ مزدور خستگی سے بچ کر زیادہ کام کر سکے۔ یہ تمام سوالات ماہرین نفسیات کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند۔ آہنگر سے میناکاری نہیں ہو سکتی۔ سپاہی مصنف نہیں بن سکتا۔ ماہر نفسیات طبعیات کے مسائل نہیں حل کر سکتا۔ اسی طرح اگر مزدور میں اپنے پیشے کی رعایت سے دماغی و جسمانی صلاحیتیں موجود ہیں تو وہ اسی مقام پر ہے جس کے لئے فطرت نے اسے تخلیق کیا ہے۔ لیکن ماہر نفسیات کے سامنے ایک اہم مسئلہ اس قسم کے امتحانات کا تیار کرنا ہے جس سے انسانی فطرت اپنی تمام صلاحیتیں علیحدہ علیحدہ ظاہر کر دے تاکہ ہر شخص کو اس کی پسند اور فطری رجحان کے مطابق کام مل جائے اور ہر کام پر اس کا اہل پہونچ جائے۔

صنعتی نفسیات کا موضوع کم سے کم سرمایہ اور محنت سے زیادہ پیداوار حاصل کرنا ہے۔ لیکن یہ پیداوار جب تک فروخت نہ ہو اس وقت تک کارخانوں کے لئے اسکا بڑھانا ہی بے سود ہے۔ اسی لئے صنعتی نفسیات میں اشتہار بازی کی بھی ایک موقر جگہ ہے وہ کون سی تدابیر ہیں جن کے ذریعے عوام میں اس پیداوار کے خریدنے کا شوق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اشتہارات اگر رنگین ہیں تو اس سے اشتہار باز کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ چھوٹے اشتہار کی جانب ناظرین کی توجہ کیوں کر مبذول کرائی جائے۔ اخبارات و رسائل کے کون کون سے صفحات اشتہارات کے لئے موزوں ہیں۔

اگرچہ صنعتی نفسیات کا جنم پہلی جنگ عظیم سے چند ہی سال قبل ہوا مگر جنگ شروع ہوتے ہوتے ان گوناگوں مسائل پر کافی کام ہوا۔ اور اس کم عمری کے باوجود صنعتی نفسیات دوسری سائنسوں کی طرح جنگ میں برابر کی شریک رہی۔ نظری حیثیت سے اس زمانے کے تجربات نے اس تحریک پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا۔ اور جیسا کہ VITELES کا خیال ہے زیادہ پیداوار ہی صنعتی نفسیات کا خاص موضوع رہا۔ مگر موجودہ جنگ کے زمانے میں ہاتھورن کے تجربات و مشاہدات نے اس کی کایا پلٹ کر دی۔ اب جدید (بعد از جنگ) صنعتی نفسیات کا موضوع پیداوار کا بڑھانا نہیں بلکہ اس کا پہلا اور آخری مقصد مزدور کی خوشدلی اور اسکا اطمینان قلبی ہے۔ موجودہ نفسیات کے تمام مسائل پر "کلیت" (GESTALT [1]) کا نقطۂ نظر چھایا ہوا ہے۔ اب صنعتی میدان میں بھی سارے سوالات اسی زاویۂ نگاہ سے حل کئے جا رہے ہیں۔ تجربوں سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مزدور کارخانے میں ایک بے تعلق فرد نہیں ہوتا۔ بلکہ اسکا بھی ایک صنعتی سماج ہوتا ہے۔ جس طرح ہر شخص کچھ نہ کچھ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح مزدور بھی اپنی یونین اور کارخانے کے ساتھیوں کا اثر قبول کرتا ہے۔ علاوہ بریں وہ ہمارے سماج کا بھی ایک رکن ہے۔ ان دو سماجوں کے رکن کی حیثیت سے وہ مختلف ذہنی تاثرات و ہیجانات کا شکار رہتا ہے اسکے اعتقادات تعصبات۔ میلانات اور جذبات کا پاس لازمی ہے اسی لئے آجکل کے موقر نفسیاتی جرائد میں اس "انسانی پہلو" پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ اس جدید نقطۂ نظر سے ابھی تک بہت کم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ "بلوم [2]" کی "صنعتی نفسیات اور اس کی سماجی بنیاد" اور "میئر [3]" کی "نفسیات صنعت میں" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اب کارخانوں میں رفتہ رفتہ مشینوں کی غیر ضروری اہمیت ختم ہو رہی ہے اس کی جگہ انسانی پہلو توجہ کا مرکز بن رہا ہے جو اب تک نظر انداز ہوتا چلا آیا تھا۔ اسی لئے علامہ اقبال کو کہنا پڑا تھا ؎

ہے دل کیلئے موت مشینوں کی حکومت　　　　احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

تجربات و مشاہدات نے ثابت کر دیا ہے کہ مزدور بھی انسان ہوتا ہے۔ اسکے بھی جذبات ہوتے ہیں۔ اس کے احساسات اتنے ہی نازک اور لطیف ہوتے ہیں جتنے کسی

---

[1] GESTALT نقطۂ نظر۔ نفسیات میں ان مدارس خیال کے خلاف اعلان بغاوت ہے جن میں حقیقت تک پہونچنے کے لئے مختلف اجزا کو علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ GESTALT نفسیات داں اجزا کے بجائے ان کی ترتیب و ترکیب پر زور دیتے ہیں۔ ورداٸمر۔ کوئیلر اور کوفکا اس تحریک میں قائد ہیں۔

[2] BLUME — INDUSTRIAL PSYCHOLOGY AND ITS SOCIAL FOUNDATION ——

[3] MAIRE — PSYCHOLOGY IN INDUSTRY. ——

اور انسان کے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اسے محض کام کرنے کا آلہ سمجھیں۔ ماہر نفسیات تجربات کی روشنی میں بلاخوف تردید یہ کہہ سکتا ہے کہ مزدور کے لئے اُجرت اتنی خوش آئند نہیں ہے جتنا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے جس طرح اس وقت دنیا کے لئے جمہوریت ہی بہترین طرز حکومت ہے اسی طرح کارخانوں میں جمہوریت کی افادیت مسلم ہے۔ مزدور کو ذمہ دار سمجھئے افسوں کے بیجا دباؤ کو کم کیجیئے۔ اسے اپنی تخلیق کے سنوارنے اور اس پر فخر و مباہات کا موقع دیجئے پھر دیکھیئے کس طرح سعدیؒ کا یہ قول صادق آتا ہے ؎

کہ مزدور خوش دل کند کار بیش

اس جدید نقطۂ نظر نے مزدور حلقے میں کافی وقار حاصل کر لیا ہے۔ ابتداء میں مزدور اس تحریک سے خائف اور بدظن تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ یہ طریق کار بدلنے کے تجربات فطری میلانات کے امتحانات اوقات کار کی تخفیف کہیں محض "پرویزی حیلے" نہ ہوں مگر رفتہ رفتہ نفسیات دانوں نے ثابت کر دیا کہ یہ سارے تجربات دمثنا ہدات مزدور کے لئے اتنے ہی مفید ہیں جتنے کہ کارخانہ دار کے واسطے سب سے پہلے انگلستان نے اس تحریک سے فائدہ اٹھایا وہاں ایک ایسے سرکاری ادارے کی بنیاد ڈالی گئی جس سے وہاں کے گولہ بارود کے کارخانوں کے مزدوروں پر اپنے تجربات کئے۔ اور ان کی صحتی، مالی و سماجی بہبود کی جانب ٹھوس قدم اٹھائے عوام اس کی کارگذاریوں سے اس قدر مطمئن ہوئے کہ جب حکومت نے مالی وجوہات کی بنا پر اسے ختم کر دینا چاہا تو انھوں نے اسکے خلاف سخت احتجاج کیا اور آج وہاں اس ادارے کے علاوہ ایک نیم سرکاری عوامی ادارہ ملک کے دوسرے کارخانوں کے مسائل حل کرنے میں ہاتھ بٹا رہا ہے اس تحریک کو اسی قسم کی نمایاں کامیابی تمام صنعتی ممالک میں حاصل ہوئی یورپ اور امریکہ میں متعدد سرکاری اور عوامی ادارے کام کر رہے ہیں روس نے بھی جو عموماً یورپی تحریکوں سے الگ تھلگ رہتا ہے اسے اپنا لیا ہے۔ ایشیا کے بھی چند ملکوں میں اس میدان میں تھوڑا بہت کام ہو رہا ہے بعد از جنگ کے صنعتی پروگراموں کی روشنی میں مشرقی ممالک میں صنعتی نفسیات کا شاندار مستقبل ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح صنعتی ایجادات و انقلابات نے ہماری تہذیب و تمدن کو اتنا پیچیدہ بنا دیا ہے کہ سماجی تعلقات کے پرانے حربے کند ہو چکے ہیں۔ ہمارے اجداد نہ صرف ہیبتناک مشینوں ہی سے ناواقف تھے بلکہ ان کے لئے "آقا و ملازم" کے ان پیچ در پیچ رشتوں اور آئے دن کی ناچاقیوں کا تصور بھی ناممکن تھا۔ ماہرین اقتصادیات اور علمائے سیاسیات کی محکم دلیلوں کے باوجود مغربی مفکرین کے نزدیک موجودہ بے چینی و اضطراب کا حل مالی خوش حالی یا سماجی و سیاسی مساوات نہیں ہے۔ ان ممالک میں جنہیں سماجی مساوات سیاسی آزادی اور مالی خوشحالی یہ سب حاصل ہے آقا و مزدور کے تعلقات کی خلیج اسی طرح ناقابلِ عبور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عبوری دور کی سراسیمگی اور پریشانی صرف نفسیاتی وجوہات پر مبنی ہے۔ کارخانوں میں بڑھتی ہوئی کشمکش بھی اس بحر تلاطم خیز کی ایک موج ہے ایسی صورت میں صنعتی نفسیات ہماری تہذیب کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

ذرا دیکھئے تو ——————

- پہلے صفحہ پر آپ سے متعلق کوئی اطلاع تو نہیں ہے۔ شاید آپ کا زر سالانہ ختم ہو چکا ہو۔
- خریداری قبول کرتے وقت روپیہ ہمیشہ منی آرڈر سے روانہ کیجئے۔ وی۔پی سے ہم کو زحمت ہوتی ہے اور آپ کو انتظار۔
- خط و کتابت میں ہمیشہ اپنا نمبر خریداری ضرور تحریر کیجئے۔ یہ آپ کے پتہ کی چٹ پر دائیں طرف لکھا ہوتا ہے۔
- پرچہ ہر ماہ کی ۲۸ تاریخ کو ہم ضرور ڈاک خانہ کے سپرد کر دیتے ہیں تاکہ وہ آپ کو یکم تک پہنچ جاوے۔ پھر بھی دو چار روز مزید انتظار کر لیجئے۔ اور اگر اتنے پر بھی نہ ملے تو سمجھ لیجئے کہ کسی "ڈاک چور" کی نذر ہو گیا۔ اپنے ڈاک خانہ کو لکھیئے اور ہم کو بھی اطلاع دیجئے۔ یہ ہمیشہ ذہن میں رکھیئے کہ ۱۵ تاریخ تک دفتر میں جملہ پرچے ختم ہو جاتے ہیں اور اس تاریخ کے بعد شکایت ملنے پر ہم کوئی تلافی نہیں کر سکتے۔
- منیجر اور ایڈیٹر کو ہمیشہ علیحدہ علیحدہ خط لکھیئے خواہ وہ ایک ہی لفافہ میں روانہ ہوں —— ایک ہی خط میں دونوں کے متعلقہ امور لکھنے سے صرف ایک ہی شعبہ میں تعمیل ہو گی۔
- پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ہم کو ۲۵ تاریخ تک مل جانی چاہیئے
- جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا چاہیئں۔

جنگ کا نفسیاتی تجزیہ: ——

بڑے انسان بنے بیٹھے ہیں!

عابدی جعفر

مجھے اس وقت بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ ایسے انسانوں کی باتیں جو دوسروں کو اذیت پہنچانے میں ایک ایسی خوشی محسوس کرتے تھے جن کا انھیں خود اعتراف نہیں تھا۔

ظاہر ہے کہ دوسروں کو اذیت پہنچا کر خوشی محسوس کرنا ایسا ہی "غیر انسانی" جذبہ ہے۔ جسے کم از کم کوئی انسان شعوری طور پر تو ماننے کو تیار نہیں ہوگا۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ہم میں سے اکثر اسی "غیر انسانی" جذبہ کے مریض ہیں ہم ہی کیا اس " درندگی" کی زد میں ایسے بھی لوگ آگئے ہیں جن کی (اگر پرستش جائز سمجھی جائے) آج پرستش ہوتی ہے۔ جو ہمارے بڑے بڑے مذہبی اور انقلابی رہنما رہ چکے ہیں۔ جو ایک طوفان کی طرح اٹھے اپنے ساتھ اپنے ملک والوں کو بھی لائے اور ہر جگہ اپنی شجاعت کے پرچم لہراتے تو اریخ کے اوراق میں "فاتح" بنے بیٹھے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ موجودہ زمانہ کی بیشتر تہذیب ان ہی لوگوں کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہے —— جہاں یہ پہنچے۔ وہاں کی زمین، وہاں کے آسمان ہی بدل گئے اور تھے بھی یہ بہت بہادر، مگر دل کی گہرائیوں میں ایک درندہ صفت جذبہ تھا۔ دوسروں کو اذیت پہنچانے میں خوشی حاصل کرنے کا جذبہ۔ دوسروں کو برباد کرنے کا جذبہ۔ جسے نفسیات میں " سادیت" کہتے ہیں۔

تو ہاں۔ مجھے اس وقت بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ اور اس یاد کا محرک کل رات کا ایک حادثہ ہے۔ یہ حادثہ میرے ایک عزیز دوست کی صورت میں مجسم بنا ہوا میرے سامنے موجود ہے —— میرے دوست کی آنکھیں اپنا رنگ بدل رہی ہیں۔ کبھی وہ گہری ہو جاتی ہیں کبھی بہت ہی مدھم —— وہ دل ہی دل میں اپنے سے اُلجھ رہے ہیں۔ اور مسرت اور غم کی لہروں میں ایک ساتھ ہچکولے کھا رہے ہیں

میرے یہ رفیق، میرے دوست، اپنی بہت پیاری رفیقہ سے جھگڑ کر آئے ہیں۔ اور جھگڑے کی صرف اتنی وجہ بتاتے ہیں —— کہ دل چاہا۔ آفاق کو چھیڑوں، اتنا چھیڑوں کہ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور موٹے موٹے آنسو سیپیاں نگینوں کی طرح اس کے گالوں پر بہنے لگیں۔ کیا چمک ہوتی ہے ان آنسوؤں میں، اور کیا پیار ہوتا ہے اس کی سسکیوں میں ——"

"یہ کیوں" کی نظروں سے جب میں نے دیکھا تو کہنے لگے

"اکثر دل چاہتا ہے کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے اور میں قہقہے لگا کر ہنسوں۔

یہ نہ سمجھو کہ میں اسے چاہتا نہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں اس کو بہت عزیز رکھتا ہوں اور شاید اس کے بغیر زندگی کو زندگی نہیں کہہ سکتا مگر بیٹھے بیٹھے دل میں ایک خواہش سی بیدار ہو جاتی ہے کہ کاش کہ وہ بھوک سے، پیاس سے کسی تکلیف سے تڑپتی ہوتی —— جب کوئی بھی تڑپتا ہے روتا ہے۔ آہیں بھرتا ہے تو جانے کیوں مجھے خوشی سی محسوس ہوتی ہے اور ایک عجیب لطف آتا ہے۔

میرے دوست کا یہی "عجیب لطف" میرے اس مضمون کا موضوع ہے - جیسا میں نے کہا کہ نفسیات میں اس جذبے کو "سادیت" کہتے ہیں اس میں انسان کو دوسروں پر ظلم کرتے میں، دوسروں کو اذیت پہنچانے میں ایک ایسی مسرت محسوس ہوتی ہے جس کا کوئی بدل نہیں ———— آپ تعجب تو نہ کریں گے اگر میں یہ کہوں کہ "پیشہ ور" قاتل صرف اس لئے قتل کرتے ہیں کہ ان کو قتل میں یہی عجیب لطف آتا ہے - کسی کو مقتول کے خون کے فواروں میں توس قزح کی رنگینی کا لطف آتا ہے - کسی کو اس کی بے بس آوازوں میں نغموں کا، رقص کا - آپ کہیں گے کہ "پیشہ ور" قاتل بھی ہوتے ہیں ؟ -

جی ہاں - ہمارے ملک میں تو کم لیکن یورپ میں "پیشہ ور" قاتل ہوتے ہیں - وہ "اُجرت" پر کسی کو بھی قتل کر دیتے ہیں - کبھی کبھی یہ "اجرت" بہت کم ہوتی ہے - مثلاً ایک سگریٹ کی ڈبیہ، ایک شراب کی بوتل ——— اجرت تو محض اجرت کی خاطر لیتے ہیں - ورنہ در اصل ان کو خود قتل کرنے میں لطف آتا ہے - ان کو چسکا پڑ جاتا ہے - جب تک وہ پولیس سے بچتے رہتے ہیں - کسی کو قتل کر دینا معمولی بات سمجھتے ہیں ———— ہمارے ملک میں بھی (جب ہندوستان کی تقسیم نہیں ہوئی تھی) ایسے قاتل موجود تھے - جو براہ راست چاقو، تلوار یا خنجر وغیرہ سے قتل تو نہیں کرتے تھے - مگر اپنے صوبہ میں قحط ڈلوا دیتے تھے - اناج خرید کر دوسرے ملکوں کو بھیج دیتے تھے یا کال کوٹھریوں میں جمع کر لیتے تھے — اور جب ہر طرف بھوک کی حکومت ہوتی تھی - سڑکوں کے کنارے انسانی ڈھانچے آخری سانسیں لینے کے لئے بھی چاول کے دانے کے منتظر پڑے رہتے تھے تو یہ بڑے بڑے لوگ، بہت بڑے بڑے لوگ رقص کی چھن چھن چھنا چھن میں، قہقہوں کی وادیوں میں اور شراب کی نغمگی میں کھوئے کھوئے قہقہے لگاتے تھے - ان کو ایک ایسی خوشی حاصل ہوتی تھی - جس کی نعم البدل نہ تو انسانی خدمت میں ملتی تھی نہ مذہبی آسودگی میں -

"سادیت" صرف قاتلوں اور ان سرمایہ داروں ہی کے دلوں میں نہیں، محبت کرنے والوں کے دلوں میں بھی عجیب طرح سے گھر کر لیتی ہے وہ محبوب جس کے حصول میں اُسے ایک زمانہ سے بغاوت کرنا پڑتی ہے - اسی محبوب کو جسمانی تکلیف پہنچانے میں دل میں یہی مسرت کی لہریں موجزن ہو جاتی ہیں - وہ کبھی اپنے محبوب سے بدگمانی کا اظہار کر کے اُسے تکلیف پہنچا کر خوش ہوتا ہے - کبھی اس کے جسم پر برتن ڈال کر اس کے آنسوؤں سے لطف اندوز ہوتا ہے -

اور ہمارے مدرسوں اور اسکولوں کے ماسٹر صاحبان تو اپنے شاگردوں کی خوب خبر لیتے ہیں - خوب خوب قمچیوں سے خاطر کرتے ہیں - ان کو بچوں کے جسم کو ایذا پہنچانے میں لطف آتا ہے - بچہ چیخ رہا ہے، اور رو رہا ہے اور دُہائی مچا رہا ہے مگر وہ ہیں کہ سڑاپ سڑاپ بیت برسائے جاتے ہیں - اسکول کے دوسرے بچے بھی اس منظر سے اتنے ہی لطف اندوز ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی خوشی کے پیغام پہنچاتے ہیں ———— میں نے حال ہی میں امریکہ کے کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے طلباء کی سزا کا باقاعدہ نشر کا انتظام کیا تھا - اپنے کمرے میں مائیکروفون لگائے تھے - تاکہ جب وہ لڑکے کے ہاتھوں پر بیت برسائیں تو اس کی صدا اسکول بھر میں گونج سکے دوسرے لڑکوں کو بھی تو معلوم ہو سکے کہ بری عادتوں کا کیا حشر ہوتا ہے -

اسی جذبہ سے ملتا جلتا ایک اور جذبہ ہے - جسے MASOCHISM کہتے ہیں - اس میں انسان دوسروں کو اذیت پہنچانے کی بجائے اپنے کو اذیت پہنچا کر ایسے ہی لطف سے سرشار ہوتا ہے وہ ایسے مواقع پیدا کرتا ہے کہ اس پر ظلم ہو، اس کے جسم کو اذیت دی جائے ——— اسی اذیت میں ساری لذتیں چھپی ہوتی ہیں ———— مثال کے طور پر آپ ان عورتوں کو لے لیں جو اپنے شوہروں کے ہاتھوں مار کھانے میں مسرت محسوس کرتی ہیں - وہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرتی ہیں کہ شوہر کا پیمانہ صبر چھلک جائے اور وہ ان کو ہاتھوں اور لکڑیوں سے دھنک کر [illegible] ———— ایسی عورتیں زیادہ تر "چھوٹے طبقے" سے تعلق رکھتی ہیں - میں طبقاتی افتراق کا حامی نہیں ہوں - چھوٹے طبقے سے میری مراد وہ طبقہ ہے جس کے سپرد چھوٹے کام دیئے گئے ہیں - کام بھی "چھوٹے" نہیں ہوتے مگر یہ تو ہماری تشریح ہے جو انہیں چھوٹا بنائے

ہے ——— اس کی وجہ یہ ہے کہ ان عورتوں کی تمام تر جنسی آسودگی ان کے جسم ہی سے تعلق رکھتی ہے — ان کو "ذہنی عیاشی" سے آسودہ ہونے کا موقعہ نہیں ملتا — ان کا تمام تر مرکز ان کا شوہر ہی ہوتا ہے۔ جو انھیں گالیاں دیتا ہے اور جسم کی خبر لیتا ہے۔

اب مردوں پر آئیے۔

ہم میں سے اکثر لوگ اپنے خاندان کی پرورش کے بہانے اپنے جسم کو تکلیف پہنچاتے ہیں — جاڑا آیا — بچوں اور بیوی کے لئے تو گرم کپڑے بنا دیئے۔ اپنے لئے نہیں بنا سکے۔ روپیہ ہی نہیں ہوتا ——— میرے ایک دوست تو "حق تلفی" کے اتنے دلدادہ تھے کہ وہ اپنے جوتے میں ایسی کیلیں ٹھکواتے تھے جو ان کے پیروں میں چبھیں — ان کو چلنے میں تکلیف ہو ——— بہت سے لوگ تو اپنے زخموں پر مرہم بھی نہیں لگاتے — کہتے ہیں یوں ہی اچھے ہو جائیں گے زخم ——— یا آپریشن کراتے وقت بے ہوشی کے قائل نہیں ہوتے ——— وجہ بہادری اور دلیری نہیں۔ محض اپنے جسم کو تکلیف پہنچنے کی لذت ہے۔

ایک ماہر نفسیات نے تو ان مذہبی پیشواؤں کو بھی اس "لذت" کا شکار کہا ہے — جو جان بوجھ کر ایسے لوگوں میں مذہب کی تبلیغ کے سلسلے میں جاتے تھے جو ان کو بھوکوں ماریں — کال کوٹھریوں میں بند کر دیں — کانٹوں کے بستر پر سلائیں۔ تکلیف دے دے کر قتل کر دیں — اس کا کہنا ہے گو کہ دینیات کے عالموں نے ان قربانیوں کو "حق پرستی" کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی ہے — مگر

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

یہ جذبہ ان میں موجود تھا وہ چاہتے تھے کہ انھیں تختوں پر جڑ دیا جائے۔ پھانسی دی جائے۔ زندہ دفن کر دیا جائے۔

آج بھی دنیا میں ایسے مذاہب موجود ہیں جن میں تارک الدنیا ہو کر غربت اور تکلیف کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کی گئی ہے ——— جاؤ — جنگلوں میں رہو ——— اپنی خواہشوں کو کچلو، کانٹوں کے بستروں پر سوؤ ——— کڑوی پتیاں کھاؤ ——— اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ ان مذاہب کے کرتا دھرتا تکلیف میں جو مسرت محسوس کرتے تھے وہ آسودگی میں نہیں ملتی تھی انہوں نے اس جسمانی تکلیف کو جزو مذہب قرار دے کر اپنی "لذت" کو مذہبی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر الفرڈ اڈلر اور اس کے پیروؤں نے تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ یہ دونوں عجوبہ قسم کی لذتیں ہمارے جنسی جذبہ سے تعلق رکھتی ہیں — وہ لوگ جو دوسروں کو اذیت دے کر خوشی محسوس کرتے ہیں — وہ دراصل اپنی جنس کو آسودہ کرتے ہیں — وہ جنسی عمل کے ایک جزو کو پورے عمل سے علیحدہ کر لیتے ہیں اور اسی میں پوری آسودگی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں — رفتہ رفتہ یہ جزوی عمل خود ایک کلی عمل ہو جاتا ہے اور اس میں وہی دل کشی آ جاتی ہے جو ایک مرد کے لئے عورت میں اور ایک عورت کے لئے مرد میں چھپی ہوئی ہے۔

دوسروں کو اذیت پہنچانے کی مسرت خود اپنے کو تکلیف پہنچانے کی مسرت میں بدل جاتی ہے — ظالم — مظلوم بن جاتا ہے — لیکن یہ مظلومیت اتنی ہی دل کش ہوتی ہے جتنی دوسروں کی اذیت۔

ہیولاک ایلس نے اڈلر کی اس تحقیق کو تو مانا ہے کہ ظلم پسندی کی تحریک جنسی جذبے ہی کرتے ہیں مگر اس کا کہنا ہے کہ یہ جذبے جنس سے علیحدہ ہو کر اپنی دنیا الگ بناتے ہیں — جس میں اذیت پہنچانے کی خواہش اسی تڑپ کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ جتنی جنسی تسکین کی ——— اذیت پہنچانے والا اس لئے اذیت دے کر خوش نہیں ہوتا کہ وہ اپنی جنس سے مغلوب ہے۔ بلکہ وہ صرف اس لئے یہ خوشی محسوس کرتا ہے کہ صدیاں کے ارتقا نے بھی اس کے دل کی گہرائیوں سے درندگی کو دور نہیں کیا۔

مجھے اس موقع پر کچھ قاتلوں کے آخری بیانات یاد آ رہے ہیں جو انہوں نے پھانسی



پیشہ ور قاتل تھے۔

جانے کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ میں بچے کی ٹانگیں چیر کر پھینک دوں ــــ خود اپنے بچے کی ۔ ایک دن جب یہ خواہش دبائے نہ دبی اور میں نے بچے کو پکڑ کر ایک ٹانگ اپنے پیروں میں دبائی اور ایک ہاتھوں میں لے کر ایک جھٹکا دیا ۔ وہ چیخا اور مجھے ایسا مزا آیا کہ میں اور بچوں کی جستجو میں رہنے لگا کہ پھر وہ آواز سُن سکوں ۔ ــــــــ میں نے تین سو سے زائد بچوں کو قتل کیا ہے

میں نے پہلا قتل اپنی محبوبہ کا کیا جو دوسرے سے محبت کرنے لگی تھی ۔ جب بلیڈ سے میں اس کا گلا کاٹ رہا تھا تو وہ عجیب عجیب آوازیں نکال رہی تھی ۔ ایسے نغمے نہ تو مجھے اپنے ملک کی سب سے بڑی موسیقہ کے گانوں میں ملے نہ کسی ساز میں ــــــــ میں ایسی آوازیں کئی مرتبہ سن چکا ہوں ۔ ان قاتلوں کو چھوڑ دیجئے ۔ اور خود اپنے ملک کے اس خونی دَور کو یاد کیجئے ۔ جب کہ خون کا "چھٹا دریا" بہہ رہا تھا بچوں کو تلواروں اور برچھیوں کی نوکوں پر اچھالا گیا تھا ۔ ماں کے سامنے بیٹوں کو قتل کیا گیا تھا ــــــــ ان قاتلوں کو انسان کہنا ہی غلطی ہے ۔ دراصل وہ وحشی درندے بن گئے تھے ــــــــ صدیوں سے خون کرنے کی تمنا دلوں میں پرورش پا رہی تھی لیکن ملک کے قوانین اور اخلاقی قدریں ان کو ابھرنے نہ دیتی تھیں ۔ موقع ملتے ہی درندوں نے کہا ــــــــ ہم وحشی ہیں ہم درندے ہیں ۔

لیکن

یہ درندگی اور وحشت دُور ہوسکتی ہے ۔

بچوں میں یہ جذبہ پیدائشی ہوتا ہے ۔ اگر شروع ہی میں اس کی روک تھام کر دی جائے ۔ تو تخریب کا یہی جذبہ تعمیری کاموں میں صرف کیا جا سکتا ہے ۔

ہٹلر نے اس جذبہ کو تخریبی کاموں میں صرف کیا ۔ اس نے بچوں کی تعلیم کے طریقے ہی بدل دیئے ۔ ان کو ذہنی اور جسمانی دونوں طریقوں سے سنگدل بنا دیا ۔ جب یہ بچے بڑے ہوئے تو اس جذبہ کے اظہار کے مواقع ڈھونڈنے لگے ۔ کوئی تو ہو جس سے نفرت کی جائے جس کے جسم کو تکلیف پہنچائی جائے ۔ جس کی لاش سے کھیلا جائے ــــــــ اور جنگ ہوئی ۔ انسانی خون کی ندیاں بہیں ۔ یکے بعد دیگرے ممالک فتح ہونے لگے ۔ کون مقابلہ کرتا ان درندوں کا ۔ جنہوں نے ماں کی آغوش ہی سے نفرت کرنا اور دوسروں کی اذیت میں خوشی محسوس کرنا سیکھا تھا ۔

مگر ــــــــ نتیجہ ؟

اپنی تباہی ۔ دوسروں کی تباہی ۔ سب کی تباہی

انسانیت کی شکست

اور اگر اسی تخریبی جذبہ کو تعمیری کاموں میں لایا جائے ۔ بچوں کے ذہنوں میں ظلم کے خلاف بیج بوئے جائیں تو وہ بڑھ کر دوسروں کی اذیت میں کبھی مسرت محسوس نہیں کر سکتے ــــــــ لیکن یہ کام ان ماں باپ سے سرانجام نہیں پا سکتا جو بچوں کو وبال جان سمجھتے ہیں ۔ اور ایسے معلموں کے سپرد کر دیتے ہیں جو " سادیت " کے شکار ہوتے ہیں ــــــــ جب معمار ہی تخریب کا حامی ہوگا تو اس کی عمارت بھی ناقص ہوگی ۔

دوسرے اس بات کی ضرورت ہے کہ جنگ کو اخلاقی طور سے نہیں ، ذہنی طور سے مٹانے کی کوشش کی جائے ۔ جنگ میں انسان کے تمام وحشی جذبے اپنے اپنے مظاہرے کرتے ہیں عام حالت میں جس بات کو درندگی کہا جاتا ہے ــ جنگ میں

سے شجاعت اور بہادری کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ——— امن میں قتل کرنے کی سزا پھانسی کا تختہ ہے اور جنگ میں جتنے زیادہ قتل کئے جائیں اتنے ہی تمغے سینہ پر بڑی شان، بڑی دل ربائی سے مسکرائیں گے ——— جنگ ہے بھی ہی بہیمانہ جذبہ (سادیت) کی پیداوار۔

لیکن جنگ کو مٹانے کے لئے ہو کیا رہا ہے ——— جنگ کے سامان تیار کئے جا رہے ہیں۔ ایٹم بموں کے راز معلوم کئے جا رہے ہیں۔ اور "مہذب" ملکوں میں بچوں کو شروع ہی سے جنگ کی تعلیم دی جا رہی ہے ——— "امن" کے لئے "جنگ" صدہا بار ہو چکی ہے۔ مگر جنگ ہے کہ ہر قوم کی "تمنا" بنی جا رہی ہے ...

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر بچہ بڑھ کر دوسروں کو اذیت پہنچا کر خوشی حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ جائے ... ؟

کیا یہ ضروری ہے کہ زندہ قوم کا ہر فرد دوسروں کی جان لینے ہی میں اپنی زندگی سمجھے ؟

کیا یہ ضروری ہے درندگی کو شجاعت کہا جائے ؟ ——— نہیں ——— ہرگز نہیں ---- - - - .
میں تو ایسی دنیا کا منتظر ہوں جبکہ ایک انسان دوسرے انسان کے لئے قبریں نہیں بنائے گا۔ اس کو ڈھکیلنے کے لئے غار نہیں کھودے گا اور اس کا دماغ تخریبی ہتھیاروں ——— ایٹم بموں، مشین گنوں ——— کے اختراع کے بجائے ایسی چیزیں ایجاد کرے گا۔ جس سے انسانیت دوستی بڑھے گی اور انسان انسان کے گلے لگ کر کہے گا ——— آؤ میں تمہارا بھائی ہوں ——— تمہارا ہمدم ہوں -- ——— تمہارا دوست ہوں ٭

پال ٹائینر

سانچے

(مترجمہ ناصر جہاں بی اے)

ماحول کے مطابق زندگی کو ڈھال لینا ہی رازِ حیات ہے۔ زندگی مسلسل ان ہی تربیتوں کا مجموعہ ہے۔ دنیا اور اس کی ہر شے مستقل ردو بدل کی حامل رہی ہے۔ ان کی شکلیں ضرور بدلتی رہیں مگر ان کی حقیقت میں فرق نہیں آیا۔ قدامت میں وہ پہاڑوں کی طرح استوار اور ندرت میں صبح کی طرح بدلتی رہیں۔ اس کلیہ کی صداقت انسانی گوشت و پوست کی زندگی پر جس طرح صادق آتی ہے اسی طرح کائنات کا ہر ذی روح متاثر ہے چمن کی لہلہاتی ہوئی گھاس ہو یا جنگلوں کے تناور درخت، فضا کے نغمہ بار پرند ہوں جن کی پرواز سورج کی روشنی میں ہیروں کی طرح جگمگاتی ہے یا جسیم "وہیل" جو سمندر کی گہرائیوں میں متحرک ہوتی ہے سب اسی اصول سے بندھے ہیں۔

ابتدائی صورتوں میں کانٹ چھانٹ یا آمیزش ہی سے تدریجی صورتیں پیدا ہوتی ہیں (HERBERT SPENCER) کی رائے میں "زندگی" کا انحصار ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت پر ہے۔ قدرت کے تمام افراد و اقسام میں ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت ہی زندگی کے استقلال کی ضامن ہے۔ کمزوری بیماری۔ انحطاط اور موت ماحول سے مطابقت نہ پیدا کرنے کا نتیجہ ہیں۔

اس سلسلہ میں ہماری روزمرہ کی تشبیہ "ماہیٔ بے آب" سے اس مفہوم کی تشریحی وضاحت ہوجاتی ہے۔ دماغ اپنے ارتقائی دور میں جب مچھلی کی خاصیت کا حامل تھا تب اس کا فطری ماحول پانی تھا۔ مچھلی پانی کے علاوہ کچھ اور نہیں چاہتی۔ لیکن اگر اس کو دفعتاً اس عنصر سے الگ کر لیا جائے تو وہ عرف عام میں موت سے ہمکنار ہونے لگتی ہے۔

مثال کے طور پر مچھلی اپنی ارتقائی منزل میں ایک ایسے مقام پر پہونچتی ہے۔ جب وہ اپنی تمام دماغی خصوصیات جو پانی میں رہنے کے معاون ہوتی ہیں ختم کردیتی ہے اور فضا میں پرند کی طرح بلند ہونے کی اہلیت اپناتی ہے یا دو عنصری زندگی کی خصوصیات اپنا کر بیک وقت پانی کے اندر اور باہر کی زندگی گذارنے کی اہل بن جاتی ہے۔ اس طرح قدیم اور جدید ذہنیتوں میں مستقل کش مکش شروع ہوتی ہے اور بالآخر نئی ذہنیت پرانی ذہنیت پر حاوی ہوتی جاتی ہے۔

دوران جنگ میں سپاہی کے لئے گھر کی یاد کسی زخم یا میعادی بخار کی تکلیف سے زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ اس کی تمام تر وجہ ماحول سے مطابقت نہ پیدا کر پانے کا نتیجہ ہے ——————— مختلف صورتوں میں اپنی مناسبت پیدا کر لینے والا شخص ہمیشہ صحت، مسرت اور قوت کا حامل ہوگا۔ زندگی کے دور میں آنے والی ہر شے اس میں استقامت کی معاون یا ضامن ہو سکتی ہے۔

کسی پرانے لباس کو نئی شکل دینے سے قبل اس کے تمام اجزا کا از سر نو علیحدہ کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح زندگی کے لامتناہی جوڑوں کی بھی تشکیل ممکن ہے لیکن اس کے برعکس اگر ہم صرف اضافی صورت پر عمل پیرا ہے اور نئے تجربات۔ نئی دولتیں۔ نئی معلومات کو پرانے نظام پر لادتے گئے اور اپنے اصولوں کی بنیاد اسی کہنہ نظام پر رکھی تو نتیجتاً ہمارا حصول ایک "پیوند زدہ شے" یا مختلف "چیتھڑوں کا ایک مجموعہ" ہو کر رہ جائے گا۔ کسی نئی چیز کے حصول کی تمنا میں ہمیں تہہ دل سے فرسودہ [illegible] ذہنیتوں کو خیر باد کہنا پڑیگا۔

بیک وقت روٹی کو بچا رکھنا اور کھانے کی خواہش کو بھی پوری کر لینا ممکن نہیں۔ بیشتر افراد ایسے ملیں گے جو بچا رکھنے کے اصول کو کھانے پر ترجیح دیتے ہیں

اور اس طرح وہ ان ہی چیزوں کو ترستے رہتے ہیں جن کے حامل یا مالک ہیں۔ زر کا اضافہ اس کو صرف میں لاکر ہی ممکن ہے۔ تجوری میں بند رکھ کر نہیں!

فطرت جمود اور قدامت سے اسی طرح متنفر ہے جس طرح خلا سے۔ جمود کا دوسرا نام موت ہے۔ متحرک ہوا زمین خالی کردو یہ ایک کھلا فرمان ہے۔ جس کی ہمہ گیری سب کو ماننا چاہیئے۔

ماحول سے مطابقت پیدا کرنا ایک دماغی طریقہ کار ہے۔ ہم آہنگی کے نتیجہ کو ہمیشہ حاصل کیا جاسکتا ہے جصول مسرّت منشاء حیات اور صحیح ترین نصب العین ہے۔ لیکن ہر زندگی اپنی جگہ خود ایک اصول ہے۔ اس لئے فرداً فرداً انسان خود اپنی فہم و فراست کے استعمال پہ اپنے لئے مسرت و شادمانی حاصل کرتا ہے۔

مذہبی عقائد کے موافق انسان کو اپنے ماحول سے مطمئن رہنا چاہیئے۔ اس کی جگہ قدرت کی مرضی سے بنی ہے۔ یہ ایک حد تک درست ہے جن حالات میں آپ مطمئن ہوں وہی آپ کی صحیح جگہ ہے اور آپ کو اس سے مطابقت رکھنا چاہیئے۔ لیکن دوسری صورت میں آپ کی زندگی کا ایک لمحہ بھی ان حالات میں نہ گذرنا چاہیئے۔

ہم اپنی خام خیالی سے مسرت کو ماحول کی سازگاری کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مسرت کا وجود ان طریقوں میں پنہاں ہے یا ان صلاحیتوں کا پرتو ہے۔ جن سے آپ ماحول کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یہ ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے۔ اس لئے ہر ذی شعور کے قبضہ میں ہے۔ آپ کی مسرت کا انحصار زن و شوہر، والدین یا اولاد، احباب، کاروبار پیشہ، دولت و منصب وغیرہ وغیرہ جہاں آپ مطمئن یا خوش ہیں) نہیں ہے۔ مسرت رہم آہنگی) جس کا اطلاق آپ ماحول، جگہ یا حالات پر کرتے ہیں۔ وہ در اصل آپ کے اس طریقہ کار کا انجام ہے جس سے آپ اپنے میں ماحول سے مناسبت پیدا کرتے ہیں۔ یہ طریقے، اور کسی کے رہین منت نہیں۔ ان کے وضع کرنے میں صرف آپ کی شخصیت اور مرضی درکار ہوتی ہے۔

ماحول میں خود کو ڈھال لینے کی صفت، انسان کو اپنے حسب ضرورت ماحول بنا لینے کا بھی اہل بنا دیتا ہے اور اس طرح وہ بیماری اور دکھ کی حالت میں بھی اپنے ضبط و تحمل سے فتح پاتا ہے اور ان سے دور رہ پاتا ہے۔

ناکامی و یاس، ہم دولت کے تلف ہونے، دوست کی جدائی اور منصب و عزت کی عدم موجودگی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن جو کچھ ہمارا ہے اس کا تلف ہونا ممکن نہیں، اور ان میں سے کسی کی بھی عدم موجودگی ہماری طمانیت اور مسرت نہیں چھین سکتی۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ انسانی طبیعت بھی بدلتی ہے۔ جو کچھ آپ کا ہے وہ آپ کو مل کر رہے گا۔ یا آپ خود اس تک پہنچیں گے، اگر کاروان حیات سے آپ علیحدہ نہیں ہوتے۔

نظام کہنہ بدلتا ہے اور اپنی جگہ نئے نظام کے لئے خالی کر دیتا ہے۔ حالات گذشتہ کو ان کے حال پر چھوڑتے اور اپنے خدا کو زندوں کا خدا بنائیے۔ جب ہم سنجیدگی سے اس لامحدود اور ہمہ گیر طاقت کا تجزیہ شروع کرتے ہیں اس وقت دماغ کو اپنی عملی سرگرمیاں کرنا پڑتی ہیں۔ نتیجۃً ہم کائنات کی ہر چیز میں ایک مناسبت، ایک مطابقت کی خو پاتے ہیں۔ صرف پتیوں کی وضع ہی ہم نہیں پاتے کے خوب صورت پردوں میں رنگوں کی ہم آہنگی نہیں ہے بلکہ نظام شمسی میں بھی ایک ضبط و نظم ہے۔ جو ان سب کے وجود کا ضامن ہے۔

کائنات میں انسانی زندگی کو فروغ دینے کا ذخیرہ کثیر التعداد ہے اور پھر ہم میں یہ صلاحیتیں بھی موجود ہیں کہ وہ ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاسکے۔ اپنی نشو و نما کو فروغ دیئے اور انفرادی زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنائیے۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ مادہ اپنی مقدار استوار رکھتا ہے۔ شکل کا فنا ہوجانا تبدیلی کا دوسرا نام ہے۔ وہ ایک شکل سے مٹ کر دوسرے میں ظاہر ہوتا ہے ہیئیت کو ہم قائم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس کا لب لباب ایک پوچ ہے۔ جس میں تبدیلی کے عنصر چھپے ہیں اور جب ایک تبدیلی کا امکان پیدا ہوسکتا ہے تو دوسری کے لئے بھی راہ کھلی ہے۔

جب ہم مطابقت پیدا کرنے کے امکانات کے سلسلہ میں انسانی زندگی کو لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس میں امکانات کی تمام راہیں کھلی ہوئی ہیں ہم میں مطابقت پیدا کرنے کی ذہانت سموئی ہوئی ہے ــــ صرف کولمبس ہی واحد متنفس نہیں گذرا جس نے انڈے کو سر سے کھڑا کر دیا تھا۔ دور حاضرہ اس قسم کی صدہا مثالوں سے پُر ہے۔ مثال کے طور پر ایسے متعدد آلے ایجاد ہوگئے ہیں، جن کی مدد سے آپ ایک انچ میں ۱۰۰۰ سطریں کھینچ سکتے ہیں۔ آپ ان

چیزوں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں جن کا آنکھ سے دیکھنا وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا۔ ایسے آلے موجود ہیں جن سے آپ ایک بال یا ایک ذرہ کا وزن معلوم کر سکتے ہیں۔

لیکن اس سلسلہ میں انسانی بدن میں توازن کا جتنا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس کے امکانات انسان کے بنائے ہوئے کسی آلہ سے ممکن نہیں۔ انسانی دماغ ایک ایک خیال کا وزن اندراج کرتا ہے اور بعض چیزوں کا اندازہ تو صرف ایک دماغ سے دوسرے دماغ ہی کے لئے ممکن ہے۔ ایک بال ہی حق وباطل کی تفریق کے لئے کافی ہے۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ بالوں میں سفیدی کا آنا آہستہ آہستہ ہوتا ہے اور اسی طرح انسانی قویٰ میں کمزوریوں، چہروں پر جھریوں کی بھی ابتدا ہوتی ہے مختلف درد اور ٹھوکوں کی ابتدا سے آنکھوں کی بینائی میں کمزوری، لہجہ کا خفیف ہونا۔ ہاضمہ میں فتور وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان تمام صورتوں کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ ہم کو مطابقت پیدا کرنے کے لئے حق وباطل میں سے کس کا دامن پکڑنا چاہیئے؟ قوت سے یا کمزوری سے؟ صحت سے یا بیماری سے؟

اس کا تمام تر انحصار ہمارے زندہ رہنے یا مر جانے کی خواہش پر ہے۔ عمر یا سن کے اندازہ کے لئے بالوں کی سفیدی یا قویٰ کی کمزوری، صحیح اندازے نہیں۔ اس سے خواہشات۔ جذبات اور حوصلہ کا اظہار ہوتا ہے۔ عمر کا اندازہ تو اس کے علاوہ اور ذرائع سے ممکن ہے۔

البتہ ان سے غیر ثباتی خیال کا اندازہ ہوتا ہے۔ خیالات کی روانی میں اضمحلال کی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔ توازن کی عدم موجودگی کا اظہار ہوتا ہے۔ توازن کے لئے تعمیری دونوں کی ضرورت ہے۔ کچھ لوگ خیالات کی اس ترتیب کی تمنا اور کوشش اپنے بدن کے ساتھ استوار رکھنا چاہتے ہیں اور بعض لاپرواہی برتتے ہیں۔ بالوں کی سفیدی پیش کرنا بدلنے والی چیز نہیں بلکہ ایک سنجیدہ نظر غور کی محتاج ہے۔ ہمارا یہ توازن سنار کی سونے والی تول سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ کیا ہم کو اس سے کچھ کم اس سلسلہ میں پرواہ رکھنا چاہیئے یا اس میں کوتاہی برتنا چاہیئے کہ یہ جنبش اور تبدیلی کس چیز کا تقاضہ ہے؟

تصحیح کر لینے کا وقت کبھی بھی مناسب ہے اور جب ایک مرتبہ بھی توازن قائم رکھنے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ تب حالات انتہائی نازک دور میں بھی سنبھالے جا سکتے ہیں۔ لیکن کیا شروع ہی سے توازن کا صحیح اندازہ قائم کر کے اس میں استوار رہنے کی سعی بہتر نہیں ہے؟ بجائے اس کے کہ حالات کی بدنظمی میں ترتیب کی جائے۔ اگر اس کو شروع ہی سے سدھار لیا جائے تو بہتر ہے! +

گلبرٹ اوکلے

قوتِ مقابلہ کی اہمیت

(مترجمہ ایس۔ اے۔ آر ہاشمی ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی)

علم نفسیات ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ انسانی فطرت میں جو جذباتی قوت ہائے محرکہ موجود ہیں۔ انھیں حقارت کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ مثال کے طور پر لڑنے بھڑنے یا مقابلہ کرنے کے جذبہ کو لیجئے۔ یہ نہایت اہم ترین جذبہ ہے جو ہمیں حاصل ہے جس کو شاید ہم نے اکثر غلط طور پر استعمال کیا ہے۔ اس جذبہ کے بغیر انسانی جدوجہد کے کسی شعبے میں امتیازی کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر اس جذبہ کا صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو اس سے ہمیں وہ توانائی حاصل ہوتی ہے جس کی بدولت ہم مخالفت پر غلبہ پا سکتے ہیں۔ بصورت اثبات یہ جذبہ ایک صحت بخش قوتِ محرکہ ہے۔ برخلاف اس کے بصورتِ منفی اس کے نتائج مضرت رساں ہو سکتے ہیں۔

مقابلہ کرنے کا جذبہ ایک موثر جذباتی قوتِ محرکہ ہے جس کا اخراج کسی نہ کسی شکل میں ضروری ہے۔ ہماری تہذیب نے اس جذبہ کے زیادہ استعمال میں بہت کچھ اعتدال پیدا کر دیا ہے کیونکہ تہذیب کا یہ تقاضہ ہے کہ ہم اس جذبے کو قابو میں رکھیں۔ تاہم آپ اس کا تصور کر سکتے ہیں کہ اگر مقابلہ کے جذبہ کو ہماری زندگی سے بالکل خارج کر دیا جائے تو اس کے کیا نتائج وقوع پذیر ہوں گے۔ اگر یہ جذبہ کارفرما نہ ہو تو ایجادات۔ انکشافات اور سائنٹفک تحقیقات اور امراض کے ازالہ و علاج کے کام میں بالکل جمود پیدا ہو جائے گا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ مقابلہ کرنے کا جذبہ ہماری ترقی کے لئے بالکل لازمی و لابدی ہے۔ علاوہ ازیں دنیا میں بہت سی برائیاں موجود ہیں۔ جن کے ارتفاع کے لئے پختہ عزم اور مستقل مزاجی سے مقابلہ کرنا ضروری ہے۔

انسان کی فطرت بالکل سطحی اور بزدل واقع ہوئی ہے۔ بنجامن فرانکلن نے ایک مرتبہ کہا "انسان کسی کام کو شروع کرتے ہیں۔ لیکن جب انھیں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے تو اس کام سے پست ہمت ہو کر گریز کرتے ہیں" دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ ان میں مقابلہ کرنے کا جذبہ مفقود ہے۔

یہ محسوس کرنا بہت اہمیت رکھتا ہے کہ مقابلہ کے جذبہ کے بغیر ہم اس دنیا میں کوئی قابل فخر و مباہات کارنامہ انجام نہیں دے سکتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مقابلہ کرنے کا جذبہ کامیابی کے لئے مقدم ضرورت اور شرطِ اولین ہے۔ اگر مفید معاشرتی اصولوں پر اس اصلی جذبہ سے صحیح طور پر کام لیا جائے تو ایک متوسط درجہ کے شخص کی زندگی ایک درخشاں و تاباں کامیابی میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

بنی نوع انسان کی سوانح حیات میں قوتِ مقابلہ کے تعمیری استعمال کی نسبت بہت کچھ ثبوت ملتا ہے جن میں ہم ایسے بیشمار مردوں اور عورتوں کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جنھوں نے جسمانی نقائص و اسقام پر غلبہ حاصل کیا اور انسانی ارتقا میں نہایت اہم بالشان اضافہ کیا۔ ہومر اندھا تھا۔ بیتھوون بہرا تھا چاپن کو بدہضمی کی شکایت تھی۔ ڈیماستھنس کی زبان میں لکنت تھی۔ اس کے باوجود وہ دنیا میں اعظم المرتبت خطیب بن گیا۔ یہ صاحب ہمت اور صاحب جرأت افراد نے محض مقابلہ کرنے کے جذبہ کی بدولت اپنی مشکلات اور نقائص پر قابو پایا۔ ایک نوجوان عورت جو فالج میں مبتلا تھی۔ اس کے ایک ہمدرد دوست نے اس سے کہا کہ "دکھ ہماری زندگی کا رنگ اس طرح تبدیل کر دیتے ہیں" اس نوجوان عورت نے جواب دیا کہ "ہاں مجھے اب مرض کا رنگ تبدیل کرنا ہے" اس سے یہ ظاہر ہو گا کہ جذبۂ مقابلہ کی یہ بہترین مثال ہے۔

برخلاف اس کے زندگی کے ہر شعبہ میں مقابلہ کرنے کے جذبہ کا غلط استعمال ہمیں نظر آتا ہے۔ تمثیلاً اس کی ایک المناک مثال ہے اگر اس جذبہ کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو یہ خود بخود تنگ مزاجی۔ غصہ۔ نفرت اور دیگر بری صورتوں میں ظاہر ہونے لگتا ہے۔ لیکن شاید اس کی بدترین صورت وہ ہے جس سے انتقام کا جذبہ کسی انسان

میں پیدا ہو جائے۔ اس سے انسان انتقام لینے کی خواہش سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ اس قسم کی شدید ترین منافرت کا جذبہ شخصیت پر تباہ کن طریقہ سے اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے بلاشبہ بہت کافی ثبوت موجود ہے کہ کسی مرض کی پیدائش میں جس طرح جراثیم موثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح شدید غم و غصہ سے شخصیت متاثر ہوتی ہے۔

جب کسی شخص کا بدقسمتی سے کوئی دشمن پیدا ہو جائے۔ تو وہ شخص اپنے لئے ممکنہ بدترین چیز یہی کر سکتا ہے کہ وہ شدید غم و غصہ کے جذبہ کو اپنی شخصیت میں جذب کرے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ یہ عمل اس شخص کو دشمن سے زیادہ مضرت پہونچاتا ہے۔

صحت کے نقطۂ نظر سے دشمن سے نپٹنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ وہ خود کو ایسے تمام جذبات سے بالاتر رکھے۔ بیشک یہ بہت مشکل کام ہے لیکن یہ امر ذہن نشین رہے کہ اس عمل سے خیر سگالی کے احساسات کا پیدا ہونا قطعی اور باہمی منافرت کا علاج یقینی ہے۔ برخلاف اس کے غم و غصہ کا ناروا احساس شخصیت کو ایسا متاثر کرتا ہے کہ وہ پاش پاش ہو جائے اور یہی وجہ بیماری کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔ بہرحال اس طریقہ کار سے لازماً یہ مفہوم ظاہر نہیں ہوتا کہ کوئی شخص اپنے دشمنوں کو اس حد تک بڑھنے دے کہ وہ اس کو روند کر خاک میں ملا ڈالیں بلکہ اس کا مفہوم اس سے یہ ہے کہ ایک شخص کو اپنے دشمنوں سے خیر سگالی کے جذبات کے ساتھ پیش آنا چاہئے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی اس نصیحت میں کہ دشمنوں سے محبت کرو۔ بہت معقول اور عملی نفسیاتی پہلو مضمر ہے۔ اگرچہ اس کو عموماً ایک ناممکن الحصول نصب العین تصور کیا جاتا ہے۔

جب کوئی شخص بہت زیادہ تھکا ماندہ ہوتا ہے تو اکثر بیٹھے بٹھائے لڑنے بھڑنے کا جذبہ ابھرنے لگتا ہے۔ جب شخص لڑائی جھگڑا کرنے کے خیالات کا شکار ہوتا ہے۔ اس میں اس دنیا کی تمام چیزوں کو خلاف حقیقت غیر متناسب اہمیت دینے کا میلان پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ یہی خیالی دنیا میں دوسروں سے ایسے خیالی مباحث میں مستغرق رہتا ہے جن کا حقیقت میں کوئی وجود یا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ وہ تھوڑے سے اشتعال پر غصہ سے مشتعل اور برہم ہو کر مقابلہ کے لئے جھپٹ پڑتا ہے اور خواہ مخواہ لوگوں سے جھگڑا مول لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے شخص کے لئے لڑنے بھڑنے کی کوئی وجہ مقرر نہیں ہے۔ اس کی وجہ کم و بیش صرف یہی ہے کہ ایک تھکا ماندہ جسم ایک محرک چیز کا خواہشمند ہوتا ہے اور یہ شخص کے لڑنے بھڑنے یا مقابلہ کرنے کے جذبہ کو غالباً دوا سے تحریک حاصل کرنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ تھکاوٹ یا پژمردگی کے باعث جب طاقت و جذباتی تحریک حرکت میں آ جاتی ہے۔ اس وقت جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو سمجھنے میں اگر ناکامی ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شخصی، باہمی اور معاشرتی تعلقات یہ ہمہ اقسام کے تلف اور زائل ہونے ہیں۔

چند روز قبل ایک نوجوان باپ نے یہ شکایت کی کہ میں اپنے بچے سے کس طرح پیش آؤں کہ وہ ہمیشہ مدرسہ میں بچوں کے ساتھ لڑتا جھگڑتا ہے اور مجھے اس سے یہ عادت چھڑانی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عادت کا چھڑانا باعث مضرت ہوگا۔ اس لئے یہ لڑکا جس میں لڑنے بھڑنے کا جذبہ نہ ہو وہ ایک ناتواں بودا ہوگا اور زندگی میں ترقی کرنا اس کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ ایک لڑکے کو اس طاقت ور جذبہ کے اظہار کی پاداش میں جو اس کی سرشت میں موجود ہے سزا دینا گویا تمام الفاظ میں یہ کوتاہ بینی ہے۔ معقول بات تو یہی ہے کہ اس لڑکے کو یہ سمجھایا جائے کہ وہ اس طاقتور جذبہ کو صحیح اصولوں کے تحت کس طور پر دیگر راہوں میں قوت محرکہ کی طرح استعمال کرے۔ مثلاً اسپورٹس کے مقابلہ میں وہ اس جذبہ کو اپنے حریفوں کو شکست دینے کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

مقابلہ کا جذبہ بذات خود ایک مخفی طاقت ہے۔ اس سے جو توانائی اجاگر ہوتی ہے اگر ہم اس سے استفادہ نہ کریں تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ جسم کا تمام میکانکی نظام درہم برہم ہو جائیگا۔ جیسا کہ ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ غصہ کی حالت خون میں (A D R A L I N) کی مقدار میں مزید اضافہ کرتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورا عضوی نظام ایک طاقتور عمل کے لئے تیار ہو جاتا ہے اگر کوئی عمل ظاہر نہ ہو تو اس غیر خارج شدہ کھنچاؤ سے اعصاب پر غیر ضروری بار رونما ہوتا ہے۔ جب یہ جذبہ کسی دشواری کا باعث ہو جائے تو ہمیں اس امر کی کوشش کرنی چاہئے کہ اولاً اس کا سبب معلوم کریں اور پھر اس کی ابتدا ہی میں اس پر قابو پانے کی کوشش کریں۔ جب ایک مرتبہ جذبہ ابھر جائے تو اس کو دبانے سے اس پر یقیناً قابو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ زیادہ بہتر صورت یہی ہے کہ اس جذبہ کے اخراج کے لئے کوئی تعمیری مقصد دریافت کیا جائے۔ کیونکہ مقابلہ [illegible] ایک طاقتور جذبہ ہے جس کو تعمیری راہوں پر لگایا جا سکتا ہے اور اس جذبہ سے ان رکاوٹوں پر غلبہ پانے میں مدد مل سکتی ہے جو زندگی میں ہماری ترقی کی راہ میں [illegible]

زندگی یا دھکا

شاہد مجید

زندگی کیا ہے ؟ ایک کہانی :

حیوانات کی کہانی ..... نباتات کی کہانی ..... جمادات کی کہانی ..... کائنات کی کہانی ..... نہ ختم ہونے والی کہانی !

ایک لامتناہی ارادے کی عمل و کوشش سے مسلسل و باقاعدہ پیدا شدہ "کن" کے دھکے سے جس کہانی کی ابتداء ہوئی۔ جو اب تک متواتر و باقاعدہ جاری ہے۔ جاری رہے گی۔ اور اللہ ہی جانے کب تک یہ کہانی جاری رہے گی۔ یہ ہماری حدِ فہم و خیال سے بہت دور ہے۔ اس دھکے نے ایک چیز کو دوسری سے اور دوسری چیز کو تیسری سے اور تیسری کو چوتھی سے ٹکرایا ..... علیٰ ہذا القیاس .... پھر دھکا بازی شروع ہو گئی۔ جس کے نتیجے کے طور پر حرکت۔ حرارت و روشنی پیدا ہوئی۔

جوں جوں دھکا بازی کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ ڈھکے چھپے پُراسرار اجزائے موجودات ظاہر ہوتے گئے۔ تاریکیٔ لاعلمی کے پردے چاک ہوتے گئے۔ اجزائے حیات روز بروز دل آویز و ترقی آمیز صورتوں میں سامنے آنے لگے۔ رات کی عجیب خاموشی ...... دن کی ہماہمی، سردی کے پُرکیف ترنم خیز ترانے اور گرمی کی رنگین بہاریں ...... دُکھ کے تڑپا دینے والے نظارے اور سکھ کے بھا دینے والے اشارے ...... حسد کی بسمل بنا دینے والی جھلکیاں اور محبت کی مخمور کر دینے والی چشمک زنیاں ..... یہ خوف کا مہیب دیو اور جرأت کا فلک شگاف دیوتا .... اللہ ..... اللہ یہ سارے کا سارا دیکھا بھالا اور جو کچھ بھی آئندہ دیکھنے کو ملے گا .... اور جس قدر بھی مستقبل میں .... کا خیال ہے۔ سبھی کو بھی صرف باقاعدہ اور مسلسل "کن" (ہو جا) کے دھکے کا کرشمہ ہے۔ جسے ہم اور تم زندگی کہتے ہیں ..... زندگی !

تنگ نظر اور کمزور دل عوام انتخاب طبعی و تنازع للبقاء فی الحیات کے بکھیڑے سے گھبرا کر سکتہ میں پڑ گئے۔ بے چین ہو گئے۔ بے عمل بن گئے۔ زندگی سے نا آشنا ہو کر ۔۔ ع ۔۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم، نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے ۔۔ اور کئی بیباک و سفاک بھڑک کر حدِ اعتدال سے بڑھ گئے۔ اپنے ہاتھوں آپ ہی دھڑام سے قعرِ مذمت کے شکار ہو گئے۔ صرف اسرارِ زندگی کے محرم خواص اپنے شعور کا زندگی سے مل کر باقاعدہ اور مسلسل دھکے کھانے اور دھکے دینے میں شامل ہو گئے ..... اس طرح کہ کھیلا کھالی کے نتائج کی کوئی پروا نہیں۔ نہ ان سے متاثر ہوئے ہیں۔ بلکہ اپنے سوا اور کائنات کی ہر شے کو اپنے دیوانہ وار عمل و حرکت سے متاثر کرتے ہیں۔ یہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے زندگی حاصل کر لی۔ جو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

زندگی ہے ہی کیا ؟ مسلسل اور باقاعدہ دھکا دار کا نتیجہ :

ادارہ اشاعت اردو کی بہترین مطبوعات

اسلامیات

- تاریخ اسلام طبری (علامہ عبداللہ العمادی)
- اسلامی معاشیات (علامہ مناظر احسن گیلانی)
- اسلامی تہذیب کیا ہے؟ (غلام دستگیر رشید ایم اے)
- قصص و مسائل (مولانا عبدالماجد دریابادی)
- حضرت ابوذر غفاریؓ (علامہ مناظر احسن گیلانی)
- الدین القیم 〃 〃
- مکالمات ابوالکلام (عقیل احمد جعفری)

اقبالیات

- روح اقبال (ڈاکٹر یوسف حسین خاں)
- آثار اقبال (غلام دستگیر رشید ایم اے)
- مقام اقبال (سید اشفاق حسین ایم اے)

سیاسیات

- فیصلہ ہندوستان (مترجمہ عبدالقدوس ہاشمی)
- جناح کی تقریریں (مترجمہ عثمان صحرائی)
- اقبال کے خطوط جناح کے نام (مترجمہ سعید صدیقی)
- مقالات محمد علی حصہ اول و دوم (رئیس احمد جعفری)
- افادات محمد علی 〃 〃
- نگارشات محمد علی 〃 〃
- مطائبات محمد علی 〃 〃

ادب و تنقید

- تاریخ ادب اردو (سید اعجاز حسین ایم اے)
- تدریسی طریقے (سید عبدالحکیم ایم اے)
- ان پڑھ ہندوستان (ملا فخر الحسن ایم اے)
- سہیل کی سرگذشت (رشید احمد صدیقی ایم اے)
- روایت اور بغاوت (سید احتشام حسین ایم اے)
- تنقیدی حاشیے (مجنوں گورکھپوری ایم اے)
- اردو غزل (ڈاکٹر یوسف حسین خاں)
- ترقی پسند ادب (عزیز احمد بی اے)
- داستان اردو (نصیر حسین خاں خیال)
- میخانۂ ریاض (اسمٰعیل احمد تسنیم مینائی ایم اے)
- فن افسانہ نگاری (وقار عظیم ایم اے)
- یقین و عمل (عبدالقدوس ہاشمی)
- تاریخ سادات امروہہ (جمیل احمد نقوی)

نظمیں

- نغمات ماہر (ماہر القادری)
- محسوسات ماہر 〃
- اسرار (علی اختر)
- فغان آرزو (علامہ آرزو لکھنوی)

ناول، افسانے

- لال کوٹھی (تبسم نظامی)
- دھوپ (رئیس رام پوری)
- سراب (مجنوں گورکھپوری)
- صید زبوں (〃 〃)
- وسوسے (فضل حق قریشی)
- آجکل کے افسانے 〃 〃
- دبولے (قدوس صہبائی)
- زلزلے (〃 〃)
- کروٹیں (〃 〃)
- لہریں (شفیق الرحمن)
- نگینے (مظفر حسین شمیم)
- گرداب (احمد ندیم قاسمی)
- جلوۂ رنگین (ڈاکٹر مظہر نصیر الدین)
- مسکراہٹیں (کوثر چاندپوری)
- رنگین سپنے (〃 〃)
- تعبیریں (محمد امین شرقپوری)
- مختار دولھن (مرزا محمد دہلوی)

نفسیات

تعمیر حیات: زندگی ایک فن ہے مشہور امریکی ماہر نفسیات ڈیل کارنیگی اپنی مشہور کتاب ہاؤ ٹو ون فرینڈز اینڈ انفلوئنس پیپل میں اس فن پر بحث کرتا ہے۔ تعمیر حیات اس کا اردو ترجمہ ہے۔ آپ ایک برتر انسان بن سکتے ہیں۔ اگر آپ اس کو پڑھیں اور اس کی ہدایات پر عمل کریں۔

قیمت چار روپے

شخصیت و کردار: آپ ایک نمایاں مؤثر شخصیت اور مضبوط کردار کس طرح پیدا کر سکتے ہیں؟ شیر محمد اختر کی یہ کتاب آپ کو تمام راہیں بتاتی ہے۔ قیمت دو روپیہ

نفسیات زندگی: فیاض فطرت نے آپ کو وہ سب کچھ دیا ہے جو ایک کامیاب ترین انسان کو — وہی دنیا وہی زندگی وہی توانائی وہی دل و دماغ، ضرورت صرف اس سے کام لینے کی ہے یہ کتاب اس کش مکش حیات میں آپ کو پوری پوری مدد کرے گی۔

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

- بچوں کی نفسیات
- تقدیریں

مکتبہ رزاقی بنیئر روڈ کراچی

جنسیات



لکھنے والے

راہی بلگرامی
ڈاکٹر آر خانم
عابدی جعفر

ہمارے جنسی رجحانات

(راہی بلگرامی)

عام طور سے ہماری سوسائٹی میں جنسی موضوع پر گفتگو کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے اور جو شخص اس قسم کی گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ اس پر حرف زنی کی جاتی ہے مگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اب یہ موضوع زیادہ عرصہ تک سوسائٹی سے باہر نہیں رکھا جا سکتا اور ہمیں اس کو موضوع بحث بنانا ہی پڑے گا۔ ہمارے ادیب گرچہ اس موضوع پر لکھ رہے ہیں۔ مگر نفسیاتی نقطۂ نظر سے تشنہ ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پر ایک مبسوط مقالہ لکھا جائے۔ نیاز فتحپوری کی کتاب ترغیبات جنسی وشاید ہماری سوسائٹی کی پہلی کتاب ہے جس میں فطری حسیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یورپ کے اکثر مفکروں نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ان میں اپنے تجربات کی بناء پر نتیجہ بھی اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جنسی لٹریچر میں انسائکلوپیڈیا آف سیکسول نالج ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ مگر اس کے تجربات صرف یورپ کے ماحول کے مطابق ہیں اور وہ کلیہ کے طور سے دنیا کے بیشتر حصوں میں لاگو نہیں ہو سکتے۔ اگر ہمارے یہاں جنسی آزادی میسّر بھی ہو۔ تو بھی طرز رہائش اور آب وہوا ان میلانات کو ابھرنے نہ دے گی۔ اگلی بحث میں آپ پر واضح ہو جائے گا کہ فطرت نے ہماری تعمیر میں کن عناصر کو فوقیت دی ہے۔ اور بعض اوقات ہم فطری دباؤ سے ان گھناؤنے افعال کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جن کا انسداد ذرا سی روک تھام سے ہو سکتا ہے۔ جنسی بے راہ روی عام طور سے سترہ سال سے بائیس سال کے نوجوانوں میں پائی جاتی ہے اور ان کے اسباب صرف ان کی لاعلمی کا نتیجہ ہیں۔

اخلاقی موضوع پر بحث کرنے والے ماں باپ بچوں کے وجود کو صفر سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ وہ وقت بچوں کا معلم ہے اور وہ ان کی جنسی حسیات کو تسکین پہونچانے میں بہترین ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ قدرت نے عناصر اربعہ میں جنسی کشش کو افزائش نسل کی خاطر فوقیت دے رکھی ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ ننھے ننھے بچے جب آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے ہیں تو ان کا رجحان لڑکوں سے زیادہ اس ننھی منی گڑیا کی طرف ہوتا ہے۔ جس میں اس وقت صرف بناوٹ کے لحاظ سے تھوڑی سی تبدیلی ہوتی ہے مگر ان کی آنسنگت ایک فطری جذبے کے تحت اس نقطہ پر دونوں کو سمیٹ کر لے آتی ہے۔ جس کو ہم محبت کہتے ہیں چھوٹے بچوں میں نسیان کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ جب تک ان کے سامنے چیز موجود ہوتی ہے وہ اس کے دل دادہ رہتے ہیں اور جہاں نظروں سے اوجھل ہوئی پھر اس کا سودا بھی جاتا رہا۔ لیکن اس سے ہم یہ نتیجہ نہیں اخذ کر سکتے کہ وقتی کشش کا نام جنسی تقاضہ ہے بلکہ یہ اس کشش کا نتیجہ ہے جس کو قدرت نے حیوان و انسان میں برابر سے تقسیم کیا ہے کہیں نہیں دیکھا گیا کہ دو ہم جنس بانو ایک دوسرے سے اختلاط کرتے ہوں۔ ہماری سوسائٹی میں جو اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں وہ غیر ذمہ دارانہ دباؤ کا نتیجہ ہیں۔ اگر صنفی آزادی ہمارے یہاں بھی میسّر ہوتی تو غیر فطری افعال کا شائبہ بھی نہ ہوتا۔ صحت و تندرستی کے لیے جس طرح خوراک لازمی ہے۔ اسی طرح جنسی تسکین کے لئے اس کے اسباب مہیا ہونے ضروری ہیں۔ ورنہ یہ ہیجانات بعض اوقات بڑے سے بڑے بردبار اور نیک نفس لوگوں کو ڈبو دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسکول کے لڑکوں میں یہ وبا عام پائی جاتی ہے کہ وہ فطری رجحان کی بنا پر ایک دوسرے سے خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے جنسی شعور کو سنوارا نہیں جاتا ہے اور ماں باپ ان کو ان خطرات [illegible] کی جنگیوں میں گم لگا دیتے ہیں اور قدرت کے اس عطیّہ سے محروم کر دیتے ہیں۔ جوان کی خلوتوں کے لئے خاص طور سے [illegible]

[illegible] جنسی شعور کو ابھارنے کے لئے ہنگامہ خیز جوانیاں سر راہ جلوہ ریز بھی ہیں

ــــــــ لیکن اس طرف توجہ نہیں دی گئی کہ اس اَزدواجیت کا نتیجہ کیا ہوگا اور نفسیاتی اعتبار سے انسانی دل و دماغ پر اس کا کیا اثر پڑیگا۔ بلوغیت کی حدود میں داخل ہوتی ہوئی جوانی جب فطری تسکین کے اسباب کو اس قدر نزدیک تر دیکھتی ہے تو کیا اس کی خفیہ خواہش انگڑائی لے کر بیدار نہ ہوجاتی ہوگی۔ ہر دو جانب جب برابر کی جائز آگ لگ جائے تو پھر اس کا بجھانا آسان نہیں اور ہم اس فطری تقاضہ کو سماجی بندھنوں میں جکڑ نہیں سکتے۔ ناجائز اور غیر ذمہ دارانہ دباؤ کا نتیجہ ہے کہ آجکل جنسی بیماریاں عام طور سے گھروں میں زبردستی داخل ہوگئی ہیں۔ اب ہم اس اسٹیج پر پہونچ گئے جہاں سے واپس جانا ہمارے لئے محال ہے۔ ہمیں راہِ فرار اختیار کرنے کی بجائے ماحول کو قریب سے دیکھنا ہوگا۔ اور ان اسباب کا پتہ لگانا ہوگا جن کی وجہ سے قوم کی صحت روز بروز گرتی جارہی ہے اور آج کا جوان پچاس سال قبل کا کڑیل جوان نہیں۔

«رمضانی رحیمن کے ساتھ پکڑا گیا» مجھے اس جملہ پر بیحد ہنسی آئی۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ عورت اور مرد کا اتصال ضروری ہے خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی ــــ ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ رمضانی نے آخر کونسا گناہ کیا یا رحیمن نے قدرت کے کس حکم سے سرتابی کی۔ اس کا جواب یقیناً نفی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بدگمان نہ ہوجئے میں جنسیات کی تبلیغ نہیں کررہا بلکہ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جنسی رجحانات دبانے سے نہیں دبتے۔ جسطرح مادّہ فاسد اپنا مقام خود ڈھونڈھ لیتا ہے اسی طرح دونوں اجناس اپنا مقام اتصال خود تلاش کرلیتی ہیں۔ صحیح طور سے ان کا اتصال اس وقت ممکن ہوسکتا ہے جب ہم ان کے ذہنوں کو صحیح راستہ دکھائیں اور اپنے بچوں کو یہ بتائیں کہ قدرت نے جو جذبہ تم کو ودیعت کیا ہے اگر اس کا صحیح استعمال نہ ہوا تو تمہارا وجود تمہارے لئے خود تباہ کُن ثابت ہوگا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ جنسی موضوع پر ہر پیرایہ سے گفتگو کی جائے اور ایک ایسی راہ منتخب کی جائے جس سے ہمارے نوجوانوں کا اخلاق اندر و باہر و ہر جگہ قابلِ ستایش ہو۔

● "جنسیات اور اس سے متعلق مختلف حالات و کیفیات کے بیان ہی کے ساتھ عُریانی کا تصور وابستہ ہے۔ جہاں کہیں بھی جنسی پہلو نمایاں ہوتا ہے یا اس کے متعلق کوئی بات کہی جاتی ہے تو لوگ اس کو عریانی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ دنیا میں ہمیشہ یہ خیالات یکساں نہیں رہے یعنی جنسیات کے متعلق تصوّرات قریب قریب ہر دور میں بدلا کئے ہیں۔ ایک زمانے میں اگر اس کی مختلف کیفیات کو معیوب مانا گیا ہے۔ تو دوسرے دور میں وہ کھلم کھلا بغیر کسی جھجک کے پیش کئے گئے ہیں ــــ صدیاں گزریں جب انسان اس دنیا میں بالکل وارد تھا۔ تو جنسی تعلقات کو وہ ایسا گناہ خیال نہیں کرتا تھا۔ جیسا کہ ہم آج خیال کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے جنسی فعل اس کے نزدیک ایک بڑی مقدّس اور اہم بات تھی۔"

(پروفیسر عبادت بریلوی)

● " میں چاہتا ہوں کہ جنسیات کے متعلق ہر مرد اور عورت پوری ایمانداری اور صفائی کے ساتھ غور کرے۔ اگر ہم جنسی حیثیت سے وہ بات نہیں کرسکتے جو ہماری تسکین کا باعث ہے تو کم از کم جنسی طور پر سوچ تو سکتے ہیں۔ نوجوان لڑکیوں اور دوشیزگی کی یہ ساری باتیں اس کاغذ کی طرح ہیں جس پر کچھ لکھا ہوا نہ ہو۔ جو سب کی سب حماقت آمیز ہیں۔ ایک نوجوان لڑکی اور ایک نوجوان لڑکا ایک گتھی ہے جنسی جذبات اور خیالات کی۔ برسوں کے بعد صحیح خیال آرائی اور جنس کے معاملہ میں نبرد آزمائی ہمیں وہاں لے جائے گی جہاں ہم جانا چاہتے ہیں ــــ یعنی عفت و عصمت کے صحیح نظریوں تک۔ جہاں ہمارے جنسی خیالات اور جنسی اعمال ہم آہنگ ہوجائینگے ــــ"

(لارنس)

● " جنسی جذبہ ایک ایسی آگ کا شعلہ ہے جس کو کوئی بُجھا نہیں سکتا ــــ ابھی زیادہ دن نہیں گذرے جب عشق و محبت کو ایک فن کے لحاظ سے بیان کرتے ہوئے ہر شخص کے چہرہ پر شرم و حیا کے رنگ دوڑنے لگتے تھے۔ لیکن اب ہمیں اس کو ایک مقدّس فریضہ سمجھنا چاہیئے۔"

(ہیولاک ایلس)

عورتوں کی جنسی تشنگی

ڈاکٹر مسز آر۔ خانم ۔ ایم۔ بی ۔ بی۔ ایس۔

بمبئی - ۱۵ - دسمبر سنہ [illegible]

عابدی بھیا [illegible] خط [illegible]، "سالگرہ نمبر" کے لئے کیا لکھوں، فرصت ہی کس کو ہے، لیکن میں جانتی ہوں کہ تم مانو گے نہیں — [illegible] لئے میں کچھ تجربے بیان کر رہی ہوں - جو مجھ سے میری مریض عورتوں نے بیان کئے۔ —— یہ تمام [illegible] جنسی بیماریوں —— کیوں نہ جنسی تشنگی کہوں —— میں مبتلا تھیں - وہ یا تو اپنا علاج چاہتی تھیں - یا اپنے شوہروں کا - یا پھر —— طلاق -

دیکھو تو — میں عورت ہو کر اس بیباکی سے یہ سب کچھ بیان کر رہی ہوں - کیوں؟

مجھے لوگ بے شرم کہیں، مگر میری ہزاروں بہنیں، جو آج دوزخ میں زندگی بسر کر رہی ہیں، وہ تو بچ جائیں۔

پہلے تو ایک دشواری سن لو، یہ تمام کی تمام عورتیں یہ تو سمجھ کر آتی ہیں کہ اپنا علاج کرانا ہے، مگر اکثر حالتوں میں غلط بیانی اور شرم سے کام لیتی ہیں۔ ان کی بیماری کی اصلی وجہ معلوم کرنے میں کبھی کبھی ہفتے کے ہفتے صرف ہو جاتے ہیں، وجہ کچھ بھی ہو ہماری تعلیم یا تہذیب کی آہنی دیواریں، مجھے بارہا یہ دہرانا پڑتا ہے کہ اگر انھوں نے جھجھک سے کام لیا، تو علاج تو بڑی چیز ہے ان کی تکلیفوں میں ذرہ برابر بھی کمی نہ آئے گی۔ خیر۔ تمھیں یا پڑھنے والوں کو ان ابتدائی دشواریوں سے کیا مطلب!

اب میں کچھ مریض عورتوں کا تعارف کراتی ہوں:-

آپ ہیں "ن - ب - صاحبہ" —— ان کے شوہر ایک مقامی اسکول میں دینیات کے معلم ہیں۔ ان کے گھر بھر میں ہر وقت ایک مذہبی ماحول مسلط رہتا ہے —— یہ خود بھی بہت مذہبی ہیں - ان کی بیماری کی وجہ صرف اتنی ہے کہ ان کے شوہر محترم کا خیال ہے، کہ جنسی جذبے "حیوانی" زیادہ ہیں "انسانی" کم۔ جتنا ان کو دبایا گیا، اتنا ہی انسان "انسانیت" سے زیادہ قریب آتا ہے لیکن "مزے" کی بات تو یہ ہے کہ وہ بالکل حیوانوں کا سا سلوک کرتے ہیں۔ ان بیچاری کے ذہن میں یہ تو بیٹھا ہی ہوا ہے کہ جنسی جذبے "حیوانی" ہیں، اس لئے یہ خود بھی ان کو دبانے کی کوشش کرتی رہیں۔ میاں کی خوشنودی بھی یہی تھی، اور "انسانیت" سے قربت کی کوشش بھی۔

مگر یہ کب تک!

چنانچہ ایسے حالات پیدا ہوتے گئے کہ اندر ہی اندر ایک بغاوت سی کھولتی رہی - تہذیب کے بتوں کو ٹھکرانے کی فکر رہنے لگی، اور اب اس بات پر بضد ہیں کہ یا تو یہ جذبے ہی ختم ہو جائیں (جو ناممکن ہے) یا طلاق ہو جائے۔

ان بیچاری کی مثال ان تمام عورتوں پر صادق آتی ہے، جو کسی نہ کسی وجہ سے مذہبی روایات، تہذیب وغیرہ کے

بیچاریوں کی شریک زندگی، رفیقہ اور جانے کیا کیا بنی بیٹھی ہیں۔ ان کے شوہر جنسی جذبوں کو "پنج" جذبے سمجھتے ہیں۔ وہ خود کس طرح زندہ رہتے ہیں، یہ تو مجھے معلوم نہیں، مگر ان عورتوں کی تو مصیبت آجاتی ہے۔ وہ کبھی بھی محبت اور سچی زندگی کی خوشیوں سے لطف اندوز نہیں ہو پاتیں ـــــ ہمارے یہاں صدیوں سے "دستور زباں بندی" ہے۔ چنانچہ عورت گھٹتی رہتی ہے۔ اگر ان کے بچے بھی پیدا ہوتے ہیں (اور اکثر مذہبی قسم کے لوگوں کے یہاں بچے زیادہ پیدا ہوتے ہیں) تو یہ بچے خود ان کی پیدا کی ہوئی "حیوانیت" کا نتیجہ ہوتے ہیں، نہ کہ محبت کا۔ اسی لئے یہ بچے عموماً بدچلن ہوا کرتے ہیں۔

تم کو یاد ہے نا، لکھنؤ میں ہمارے محلے ہی میں دو تین "کٹ ملا" قسم کے لوگ تھے، ان کے بچوں سے محلے والے تنگ آ گئے تھے۔ گالم گلوچ اور گندگی میں تو ان کی زبانیں ایسی قینچی کی طرح چلتی تھیں، کہ سننے والے نفرت سے منہ پھیر لیتے تھے ـــــ یہ تو زیادتی ہوگی، اگر میں ان بچوں کی تمام خرابیوں کو ماں باپ کی اس "سمجھ" پر تھوپ دوں۔ نہیں۔ دوسرے اقتصادی مسائل بھی ہوں گے، صحیح تربیت نہ ملتی ہوگی، وغیرہ وغیرہ۔ مگر میرا کہنا تو یہ ہے کہ اگر یہ بچے "محبت" کی پیداوار ہوتے۔ تو ان کی یہ حالت کبھی بھی نہ ہوتی۔

تو یہ تھیں میری پہلی مریضہ۔ اب دوسری کا سنو۔

"یہ ہیں مسز ر۔ج۔ بمبئی والا" ـــــ یہ ہسٹریا کی مریض ہیں، صورت کمھلائی ہوئی ہے، آنکھیں پھٹی پھٹی سی لگتی ہیں۔ ان کے شوہر جب علاج کرانے آئے تو میں نے اُن سے کہا کہ وہ اپنی مسز کو شام کو گھر پر بھیج دیں۔ وہ سمجھے نہیں اور ایسے دیکھنے لگے جیسے میں "مذاق" کر رہی ہوں، میں نے کہا کہ میں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ وہ علاج کرانے آئے تھے، اور میں باتیں کرنا چاہتی تھی، کچھ سمجھے کچھ نہیں سمجھے۔ اور شام کو اپنی مسز کو چھوڑ گئے۔ میں نے ان کے "راز" معلوم کرنا چاہے۔ مگر وہ ایسی [illegible] کہ اللہ کی پناہ۔ دو تین دن کی متواتر سر مغزنی کے بعد اُس نفرت کا اظہار کیا جو شوہر کے خلاف ان کے دل میں [illegible] تھی۔

یہ نفرت تقریباً ان تمام عورتوں کے دلوں میں موجود رہتی ہے۔ جو شادی کے بعد بھی جنسی تشنگی کی [illegible] میں جلتی رہتی ہیں ـــــ ہوتا یہ ہے کہ مرد تو اپنی تسکین کے بعد عورت کو بالکل ہی بھول جاتا ہے ـــــ اور عورت سے علیحدگی اختیار کر کے سو جاتا ہے۔ اور عورت بیچاری رات رات بھر جاگتی رہتی ہے۔ اور کبھی کبھی تو [illegible] ہو کر خود اپنی تسکین پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔

جنسی تعلیم نہ ہونے سے مرد عورت کی جنسی خواہش سے بے خبر رہتا ہے اور عموماً اس کی جنسی خواہش کو مانتا ہی نہیں ـــ حالانکہ عورت مرد سے کئی گنا جنسی شدت رکھتی ہے۔ مرد جب چاہتا ہے۔ بغیر اُس کو تیار کئے ہوئے اس کو "استعمال کی شے" سمجھتے ہوئے اپنے مصرف میں لاتا ہے۔ وہ بے حس رہتی ہے۔ اور اگر چھیڑ چھاڑ میں اُس کی جنس بیدار بھی ہو جاتی ہے، تو وہ پوری تسکین کے لئے زیادہ "وقت" کی خواہش مند ہوتی ہے۔ مگر مرد کو اتنی "فرصت" کہاں۔ میں نے سنا ہے کہ صحبت کے بعد ایک غنودگی سی طاری ہونے لگتی ہے، اور عموماً نیند سی آجاتی ہے۔ مگر اکثر حالتوں میں عورت اس منزل تک پہنچتی ہی نہیں، وہ تشنہ رہتی ہے، اور رات رات بھر جاگ کر، دل میں نفرت کے بگولے اُڑاتی ہوئی، کروٹیں بدلتے گذار دیتی ہے، مسلسل جاگنے سے وہ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

اسی زمرے میں وہ عورتیں بھی آتی ہیں، جن کو لوگ بانجھ سمجھتے ہیں، اور دوبارہ شادی کر لیتے ہیں۔

انگریزی زبان میں جنس پر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کے مطالعہ اور ذاتی مشاہدے سے میں یہ وثوق کے ساتھ

کہہ سکتی ہوں کہ جن عورتوں کو بہت آسانی سے بانجھ کہہ دیا جاتا ہے، وہ بانجھ نہیں ہوتیں۔ بلکہ ساری خرابیاں ان کے شوہروں میں موجود ہوتی ہیں۔ ایک "کمزوری" یہی کیا کم ہے کہ وہ اپنی بیویوں کی جنس کو بیدار کرنے سے قاصر رہتے ہیں"۔

اب لو۔ تیسری مریضہ کی سنو:

"ان کا نام ہے" ا۔ک۔ صاحبہ"۔ یہ بیچاری بہت دُبلی ہیں، بخار بھی رہتا ہے، یہ مجھ سے پہلے کئی اور ڈاکٹرنیوں سے علاج کرا چکی ہیں۔

تم کہو گے، اگر یہ دُبلی ہیں اور بخار میں مبتلا ہیں، تو اس کو جنسی تشنگی سے کیا تعلق۔ لیکن میں کہوں گی کہ جنسی تشنگی ہی سے تعلق ہے۔ کیونکہ یہ ایسے شوہر کی بیوی ہیں، جن کا زیادہ تر وقت" باہر کی عورتوں" کے ساتھ گذرتا ہے، جو خوب خوب گلچھرے اُڑاتے رہتے ہیں۔ رات رات بھر غائب رہتے ہیں۔ یہ بیچاری اندر ہی اندر گھلتی رہتی ہیں، اور شوہر کی" محبت" کی منتظر رہتی ہیں۔ جو ان کو نصیب نہیں ہوتی۔

یہ بہت سے" شوہروں" کی" عادت" ہے۔ کہ وہ بیوی کی ہر خواہش کا تو خیال رکھتے ہیں۔ اس کے لئے اچھے سے اچھے کپڑے بنا دیتے ہیں، زیور بنا دیتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ اُسے اور کچھ نہیں چاہیئے۔

—— اُسے اور کچھ ضرور چاہیئے۔ شوہر کی محبت چاہیئے، اُس کی قربت چاہیئے۔ اپنی جنسی تشنگی کی تسکین چاہیئے۔

—— مرد تو باہر رہتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح، بازاری عورتوں سے اپنی تسکین پہنچا لیتے ہیں۔ مگر گھر کی" عورت" کو" اپنا مال" سمجھ کر (کہ جس وقت چاہیں گے مصرف میں لے آئیں گے) بھول جاتے ہیں۔ وہ بیچاری بیمار نہ پڑے تو اور کیا کرے۔ اور ہاں، اُس کی بیماریاں بھی انہی شوہروں کی مہربانی ہوتی ہے۔

اب میں عورت کی" جنسی خواہش" پر روشنی ڈالنا چاہتی ہوں، جو مردوں کے مقابلہ میں بہت دیر میں بیدار ہوتی ہے۔ اُس میں" موڈ" پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ مرد تو ذرا ذرا سی بات پر بغیر کسی تمہید کے اپنے جنسی جذبوں کے اظہار پر تیار ہو جاتے ہیں، لیکن عورت اس" ڈگری" پر پہنچنے سے پہلے کئی منزلوں سے گذرتی ہے۔ مردوں کو اُس کو بھی" ذی حس" سمجھنا چاہیئے، اور اُس کی تسکین کا بھی پُورا پُورا خیال کرنا چاہیئے۔

میں جنسی تعلیم کی معلمہ تو ہوں نہیں کہ یہاں پر یہ بتانے بیٹھ جاؤں کہ عورتوں کی جنسی خواہش کب اور کیسے بیدار ہوتی ہے، مگر پھر بھی بحیثیت معالج کے یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ پیار و محبت کی باتوں سے اور جسمانی چھیڑ چھاڑ سے وہ بھی اُسی شدت کے ساتھ تیار ہو جاتی ہے۔ بعض عورتیں اس شدت پر پہنچنے میں بہت دیر لگاتی ہیں، اور بعض بہت جلد ہی پہنچ جاتی ہیں۔ کچھ تو محض پیار کی باتوں ہی سے تیار ہو جاتی ہیں، اور کچھ جسمانی چھیڑ چھاڑ سے۔ بعض کے لئے دونوں عمل ضروری ہو جاتے ہیں، اس لئے وہ مرد جو اپنی بیویوں کو بانجھ سمجھتے ہیں، ان کو لازم ہے کہ وہ محض اپنی تسکین ہی کا خیال نہ رکھیں۔ اپنی بیوی کو بھی جنسی آسودگی کا حق دیں۔ جب ہی اُن کی زندگی بہاراں بہاماں بن سکتی ہے۔

بعض بعض مرد تو بچپن میں پڑی ہوئی قبیح عادتوں کے شکار ہوتے ہیں، وہ اپنی بیویوں سے" لڑکوں" کا کام لیتے ہیں۔ عورت کو اس" غیر فطری" عمل میں بے حد تکلیف ہوتی ہے۔ اور وہ سوائے نفرت کے محبت کے قریب تک نہیں پھٹکتی۔

ممکن ہے کہ تم نے مشہور و معروف انگریزی ڈرامہ نگار آسکر وائلڈ کے مقدمہ کا حال سنا ہو۔ اُس کی بیوی نے کورٹ میں جس صاف گوئی اور نفرت سے اپنے شوہر کی اس غیر فطری عادت کا بیان دیا کہ سُننے والے تک کانپ گئے۔

وہ کیوں نہ بیان دیتی۔ اُس کو اپنے شوہر سے نفرت تھی، بے انتہا نفرت۔
عورت محبت کی بھوکی ہوتی ہے۔ اور جنسی خواہش محبت ہی سے آسودہ ہو سکتی ہے۔ وہ عورتیں جو اپنے شوہروں کی "محبت" حاصل نہیں کر پاتیں۔ وہ دوسرے مردوں کی محض باتوں سے وہ آسودگی محسوس کرتی ہیں، جو ان کو شوہر کی انتہائی قربت میں بھی نہیں ملتی۔

میں عورتوں کی بیماریوں کی معالج ہوں۔
ان کی بیماریوں کا طبی علاج تو خیر میرا کام ہے۔ مگر ان کا صحیح علاج ان کے شوہروں کا ہی حصہ ہے۔ مردوں کو عورتوں کے جسمانی ساخت کی معلومات ہونا ضروری ہے۔ ان اعضاء کی پہچان ضروری ہے، جو جنسی تحریک سے بہت زیادہ قریب رہتے ہیں۔
بعض لوگ کہیں گے کہ میں جنسی تعلیم کی ترغیب دے رہی ہوں۔ ہاں ضرور دے رہی ہوں، کیونکہ میرے نزدیک یہ تعلیم مسرتوں بھری زندگی گذارنے کے لئے ضروری ہے۔ میری مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ ایسے اسکول کھولے جائیں جہاں جنسی تعلیم "تھیوری" اور "عملی" دونوں طریقوں سے دی جائے ـــــ نہیں۔ "عملی تعلیم" تو نہیں، مگر "تھیوری" میں اس تعلیم کا حاصل کرنا مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ضروری ہے۔ جہاں بچوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا کے نقشے میں فلاں دریا کہاں ہے؟ یا انسانی جسم میں دماغ کہاں ہے، دل کہاں ہے؟ وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ یہ بھی بتایا جائے کہ جسم کے کون کون حصے جنسی تحریک کو ظاہر کرتے ہیں، کیونکہ ان بچوں کو بڑھ کر فلاں فلاں دریا کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مرد کو عورت، عورت کو مرد سے سابقہ پڑے گا۔
میں جانتی ہوں کہ (اگر یہ خط شایع ہو رہا ہے) زیادہ تر لوگ ـــــ مرد اور عورتیں دونوں دانت کٹکٹا رہے ہوں گے، اور میری اس تحریر کو کوسنے دے رہے ہوں گے، مگر مجھے پرواہ نہیں ہے۔ کیونکہ مجھے یہ بھروسہ ہے کہ میں "گالیاں" نہیں لکھ رہی ہوں، بلکہ انسانی مسرتوں کے راز بتا رہی ہوں،
ہاں، تو میں جنسی تعلیم کی ضرورت کے متعلق لکھ رہی تھی ـــــ شادی سے قبل ہی ہر مرد کو عورت کے متعلق سب کچھ معلوم ہونا چاہیئے۔ اگر وہ انجان ہے، تو یہ محض اُس کی ذمہ داری ہے کہ اُس کی رفیقہ صحیح معنوں میں "رفیقہ" اور "ہمدم" نہیں بن سکتی۔ ـــــ عورت کی جنسی خواہشوں کے اعتراف کے بعد ہی وہ خود اپنی اور اپنی رفیقہ کی مسرت کے سامان مہیا کر سکتا ہے۔ اور یہی عورت کے لئے بھی لازم ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہماری تعلیم اور جھوٹی تہذیب کی بدولت وہ خود اپنی جسمانی ساخت سے بے خبر ہوتی ہے۔
میرا تخاطب تم سے نہیں ہے۔
بلکہ میں اُن لوگوں سے مخاطب ہو رہی ہوں جو جنسی خواہش کو "غیر مہذب" "غیر انسانی" سمجھتے ہیں، اور "اخلاق" کے معلم بنے بیٹھے ہیں۔
اور ان والدین سے بھی مخاطب ہو رہی ہوں، جو اپنے بچوں کو صحیح راہوں سے ہٹا کر تاریک راستوں اور "گناہ آلود" لذتوں میں ڈھکیل دیتے ہیں
کیا یہ دونوں سن رہے ہیں، پڑھ رہے ہیں؟
خدا کرے میری پکار صدا بہ صحرا ثابت نہ ہو

شادی کا جنسی پہلو

(عابدی جعفر)

ہر روز کسی نہ کسی گھر میں کسی نہ کسی کی شادی ہوتی ہے۔ دس بیس عورتیں، دس بیس مرد جمع ہوتے ہیں۔ ہنستے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں اور کچھ ضروری کچھ غیر ضروری رسومات کے بعد ایک عورت کو ایک مرد سے وابستہ کر دیتے ہیں ـــ تم اس عورت کے شوہر ہو، تم اس مرد کی رفیقہ۔ دیکھو۔ دونوں ایک دوسرے کا خیال رکھنا۔ اور عمر بھر ساتھ رہنا۔

دیکھنے میں تو کچھ بھی نہ ہوا۔ بہت عام بات ہوئی۔ مگر دراصل اس عورت، اُس مرد کے سامنے زندگی نے ایسی نئی موڑیں پیش کر دیں۔ اب تک تنہا تھے اب ساتھی بن گئے۔ اور اکثر ان دونوں کے لئے بھی یہ موڑیں ـــ انجان موڑیں۔ اچانک آ جاتی ہیں۔ نہ مرد عورت سے واقف ہوتا ہے نہ عورت مرد سے ـــ اور رہنا ہے دونوں کو ایک ساتھ۔

جاڑا آتا ہے۔ آپ اُس کی برفیلی ہواؤں سے بچنے کے لئے گرم کپڑوں کا انتظام کرتے ہیں۔ اگر نہیں کرتے تو جاڑا کسی نہ کسی طرح گذر جاتا ہے۔ مگر جو کچھ بیتتی ہے اس کو آپ کا دل ہی اچھی طرح جانتا ہے۔

اسی طرح شادی ہوتی ہے۔ اگر آپ اس نئی زندگی کے لئے تیار ہیں۔ تو زندگی بھر ہنستے کھیلتے گذار دیتے ہیں۔ ورنہ روتے اور منہ بسورتے گذر ہی جاتی ہو یہ زندگی۔ لطف تو یہ ہے کہ آپ کو موسم کی گرم و سرد کیلئے تو تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور شادی کے لئے ـــ کیا جنسی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی؟

ہمارے والدین، ان کے والدین، اور صدیوں ادھر کے والدین کا خیال تھا کہ جنسی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی لئے انہوں نے زندگی کے اور پہلوؤں غیر اہم پہلوؤں ـــ پر تو روشنی ڈالی ہم کو ان کے لئے تیار کیا۔ مگر جنسی پہلو سے بالکل بے بہرہ رکھا۔ سوچتے تھے۔ خود سمجھ جائیں گے۔ اور ہم خود سمجھ بھی لیتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے ہم میں سے بیشتروں کو بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ ازدواجی زندگی وبال جان ہو جاتی ہے۔ عورت رفیقہ حیات کے بجائے ایک مصیبت بن جاتی ہے۔ مرد رفیق زندگی کی بجائے درندہ بن جاتا ہے۔ اگر بچے پیدا ہوتے ہیں تو وہ ملک و قوم کیلئے ایک بوجھ بن جاتے ہیں کیونکہ یہ بچے محبت کی پیداوار نہیں ہوتے۔ وہ اپنے والدین کی محبت سے محروم رہتے ہیں اور صحیح قسم کی تربیت نہیں پاتے۔

جنسیت کو گالی نہ سمجھئے۔ گالی تو جنسیت کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

پھر جنسیت ہے کیا؟

میں جواب دینے کے بجائے خود سوال کروں گا کہ جنسیت ہے کیا نہیں؟

زندگی کی کڑیوں کا سلسلہ ـــ جو ازل سے اب تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جنسیت کی وجہ ہی سے قائم ہیں۔ خود قدرت نے زندگی کو برقرار رکھنے کا ذریعہ صنفی جذبوں کی تکمیل کو بنایا ہے۔ اسی لئے عورت مرد کے یہ رشتے دنیا کے وجود کے پہلے لمحے ہی سے موجود ہیں۔

پہلے مرد کسی بھی عورت، اور عورت کسی بھی مرد کے ذریعہ نسل کو برقرار رکھتی تھی

پھر ایک مرد، کئی عورتیں

کئی مرد، ایک عورت ـــ کا رواج رہا۔ اور دنیا کے بعض حصوں میں اب بھی ہے۔

مگر زیادہ قوموں میں ایک مرد کے لئے ایک عورت، ایک عورت کے لئے ایک مرد مخصوص کر دیا جاتا ہے

تم شوہر ہو

تم بیوی۔

اور تم دونوں کے سامنے ایک نئی زندگی ہے۔ تم ایک پوری نسل کے مخزن ہو۔

یہ تو ہوئی شادی۔

اب شادی پر آیئے

آج کل زیادہ تر لڑکیاں شادی کرنے سے انکار کرتی ہیں ـــــ کہتی ہیں شادی ایک جھنجھٹ ہے، کون پالے۔ ایک مصیبت ہے، کون پڑے۔
اور لڑکے بھی اکثر شادی کے خیال سے دُور بھاگتے ہیں ـــــ کیسے گزرے گی زندگی، ممکن ہے وہ کچھ چاہے، میں کچھ چاہوں۔ وہ کہے دن، میں کہوں رات
کیونکہ زیادہ تر شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں۔ آج شادی ہوئی۔ کل سے لڑائی جھگڑا شروع ہو گیا۔ ـــــ دونوں دو مختلف دنیاؤں کے رہنے والے ـــــ
طلاق ہو گئی۔ یا عمر بھر روتے دھوتے گزار دی۔

ایسے لڑکوں اور ایسی لڑکیوں سے کون کہے کہ کامیاب شادیوں کی مثالیں موجود ہیں۔ میاں ۷۰ برس کے مگر وہ اپنی ساٹھ سالہ بیوی کے اتنے دلدادہ کہ اُس کے بغیر ایک منٹ کے لئے بھی قرار نہیں آتا۔ مگر ایسی شادیاں عموماً چھپی رہتی ہیں۔ ناکام شادیوں کے متعلق تو ہمارے ادب میں افسانوں، ناولوں کا ذخیرہ موجود ہے ـــــ ان افسانوں اور ناولوں کے علاوہ بھی جہاں چار عورتیں جمع ہو گئیں۔ لڑکیوں، نواسوں، بھتیجیوں کی "بیچاری" زندگی کے قصے چھڑ گئے۔ بن بیاہی لڑکیاں ان قصوں کو سُن کر لامحالہ شادی سے نالاں ہو جاتی ہیں اور ازدواجی زندگی کو ایک جھنجھٹ، ایک مصیبت سمجھنے لگتی ہیں۔ اگر بس چلتا ہے تو اپنی جنسی خواہش کو دبا کر تنہائی کی زندگی گزار دیتی ہیں۔ یا آپس ہی میں تسکین کے سامان پیدا کرتی ہیں۔ یا جنسی محبت کو اپنی بہنوں کے بچوں، پالتو جانوروں کی طرف موڑ دیتی ہیں۔

جنسی خواہش تو اتنی فطری خواہش ہے کہ اس سے مفر ممکن نہیں۔ اسلئے صدیوں پہلے ہی سماج نے اور مذہب نے اس کی تکمیل کے لئے "شادی" کی بنا ڈالی۔

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ یہ دونوں اپنے اپنے رفیق خود پسند کرتے۔ مگر بُرا ہو اس رسم کا کہ شادی تو ہو لڑکے اور لڑکی کی۔ اور پسند کریں والدین وہ اس پسند میں اپنی اپنی اولاد کی بھلائی کا کتنا ہی خیال رکھیں۔ مگر عموماً ایسی شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں۔

ممکن ہے کہ آپ کہیں کہ یہ سراسر بہتان ہے۔ ان کے ٹھہرائے ہوئے رشتے کامیاب بھی ہوتے ہیں۔

مانا کہ کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ مگر بہت کم

"کامیاب شادی" ایک کارنمایاں ہے۔ وہ میاں بیوی جو عمر بھر ایک ساتھ رہیں کئی بچوں کے والدین ہیں۔ اکثر وہ بھی شادی میں کامیاب نہیں تھے ـــــ ان کی مسرتوں میں خلوص نہیں ہوتا۔ وہ رقص نہیں ہوتا۔ اور ان کے بچے اکثر حالتوں میں عورت و مرد کی یکجائی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ نہ کے ان کی محبت کا۔
قانونی طور سے ایک مرد کو ایک عورت، ایک عورت کو ایک مرد سے وابستہ کر دینا شادی نہیں اور نہ ہی مذہبی طریقہ پر نکاح کر دینا ہی شادی ہے۔

نکاح اور قانونی ضابطہ دراصل دونوں کو ایک ساتھ زندگی میں قدم رکھنے کا موقعہ دیتا ہے۔

کچھ کامیاب ہوتے ہیں۔ کچھ عمر بھر ساتھ رہنے کے باوجود بھی کامیاب نہیں ہوتے۔

خیر یہ بحث بہت طویل ہے۔

آیئے۔ یہ دیکھیں کہ کس لڑکی کو کس لڑکے سے منسوب کرنا چاہیئے۔ اگر ہمارے ملک میں فی الحال لڑکے اور لڑکی کی اپنی پسند ممکن نہیں ہے تو والدین کو انتخاب کے وقت کن کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔

انتخاب

جن ملکوں میں لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے رفیقوں کو خود منتخب کرتے ہیں، وہ بعض اوقات انتخاب کرنے میں بہک جاتی ہیں، کیونکہ جب وہ اس خیال سے ایک دوسرے کو دیکھتی ہیں کہ انہیں آپس میں شادی کرنا ہے۔ تو ان کی ملاقاتیں بہت جذباتی قسم کی بن جاتی ہیں جس میں صرف اچھائیوں پر نظر ٹکتی ہے۔ جسمانی خوبصورتی زیادہ کشش کے اسباب پیدا کر دیتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے میلانات نہیں معلوم کر پاتے اور فوراً ہی فیصلہ دے دیتے ہیں۔

ہمارے ملک میں اکثر حالتوں میں شادی سے پہلے ملاقات ممکن نہیں ہوتی۔ اس لئے والدین کو چاہیئے کہ وہ دونوں کے میلانات کا خاص خیال رکھیں۔ لڑکی کے والدین ہمہ وقت لڑکی کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کو معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کن کن چیزوں کو پسند کرتی ہے۔ اسی طرح لڑکے کے والدین جانتے ہیں کہ لڑکا کیا چاہتا ہے — اگر دونوں کے میلانات میں ذرا بھی فرق ہے تو اس کا امکان زیادہ ہے کہ وہ کبھی بھی خوش نہیں رہ سکیں گے

ایک لڑکی جو بچپن ہی سے رنگین کپڑوں اور ظاہری خوبصورتی اور کشش کی دلدادہ ہے۔ اس کو اگر ایسے لڑکے کے ساتھ بیاہ دیا گیا جو سادگی پسند کرتا ہے۔ تو نتیجہ اکثر خراب ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اگر یہ دونوں محبت اور خلوص سے ایک دوسرے کی پسند کو اپنا لیں۔ تو زندگی خوشگوار ہو سکتی ہے میلانات کی طرح صحت کا خیال بھی ضروری ہے

صحت

اگر ایک آئے دن بیمار رہنے والی لڑکی کو ایک تندرست لڑکے سے بیاہ دیا گیا، تو وہ بیچارا کب تک اس کا علاج کرے گا۔ یہ بیماری تمام خوشیوں کو برباد کر دیتی ہے۔ نہ تو وہ محنت کر سکتی ہے اور نہ اپنی اور اپنے شوہر کی جنسی خواہش کی تکمیل۔

اس لئے شادی سے پہلے ہی دیکھئے کہ دونوں صحت مند ہیں۔ کوئی کسی خاندانی بیماری میں تو مبتلا نہیں ہے۔

افتادِ طبع

اور یہ دیکھئے کہ دونوں کی طبیعت کا افتاد کیا ہے۔ مثلاً دونوں کو بارش پسند ہے یا خشک موسم۔ دونوں آندھی سے لطف اندوز ہوتے ہیں یا ڈرتے ہیں۔ یا دونوں کی عادتیں کیا کیا ہیں۔ بچپن سے پڑی ہوئی عادتیں خواہ دوستی ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ بہت بڑا رخنہ بنتی ہیں۔

میرے ایک دوست کو گرم گرم چپاتیاں کھانے کی عادت تھی۔ جب ان کی والدہ کھانا پکاتی تھیں تو وہ چولہے کے پاس ہی بیٹھ کر توے سے اترتی ہوئی چپاتیاں کھاتے تھے۔ ان کی شادی کی ہوئی بیوی میں تمام اچھائیاں موجود۔ مگر وہ اس عادت سے تنگ آ گئی اور پریشان ہو گئی کہ لڑائیاں ہونے لگیں۔ وہ دونوں اب بھی ساتھ رہتے ہیں۔ مگر ایک دوسرے سے نالاں ہیں۔ اس لئے ان عادتوں کا خاص اثر پڑتا ہے

ذوق

دونوں میں ایک ہی قسم کا ذوق ہونا چاہیئے۔ یعنی دونوں کو ادب کا ذوق ہے۔ وہ کتابیں لاتے ہیں اور ان کو پڑھنا چاہتے ہیں اور بیوی کو گانے کا شوق۔ وہ پڑھنا چاہتے ہیں اور وہ گانا چاہتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے دور رہ کر اپنے ذوق کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں اور ان کا بقیہ وقت ساتھ نہیں گزرتا جس سے محبت نہیں بڑھتی اور آخر کار علیحدگی کی صورت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے

آرزو:

دونوں کی آرزوؤں میں بھی موافقت ہونا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میاں دولت مند بننے کے خواب دیکھیں اور بیوی قناعت پسند ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔
ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں لڑکے اور لڑکیاں آپس میں مفصل گفتگو کر کے معلوم کر سکتی ہیں۔ اگر ان کو اس بات کی اجازت نہیں دی جاتی تو کم از کم دونوں شادی سے کچھ عرصہ قبل خط و کتابت سے ایک دوسرے کے رجحانات کو معلوم کر سکتے ہیں۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو یہ کام صرف والدین کا ہے کہ وہ رشتہ ٹھہراتے وقت ان تمام باتوں کی اچھی طرح معلومات کر لیں اور پھر فیصلہ کریں۔

آپ یہ نہ سوچئے کہ مندرجہ بالا باتوں میں اگر کہیں بھی لغزش ہوئی۔ تو بس جھونک دیئے گئے جہنم میں ——— نہیں اکثر حالتوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ میاں بیوی شادی کے بعد آپس میں اس طرح گھل مل جاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کا اتنا خیال کرنے ہیں کہ مختلف طبیعتوں کے باوجود بھی ایک جان دو قالب معلوم ہوتے ہیں ——— یہ ہے بھی ٹھیک۔ کچھ میاں اپنی "پسند" کو بیوی کی "پسند" میں ملائے اور کچھ "بیوی" "میاں کی" "پسند" کا خیال رکھے۔ تو زندگی بڑی اچھی طرح گذر سکتی ہے۔

مثال کے طور پر ———

بیوی اگر موسیقی کی دلدادہ ہے اور شوہر کتب بینی کا۔ تو یہ دونوں بھی ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ بیوی بازار جائے اور اپنے شوہر کے لئے ایک کتاب لیتی آئے۔ اور میاں کوئی ساز، کوئی گرامفون رکارڈ وغیرہ۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کے ذوق کا احترام کریں۔

یا ——— شوہر کو لال ساری پسند ہے، بیوی کو ہری۔ شوہر بازار گئے۔ اور اپنی پسند کی "لال" لانے کے بجائے ہری لے آئے جب بیوی اس ساری کو پہنے تو محض خوشنودی کی خاطر ہی "آپ تو بڑی اچھی معلوم ہو رہی ہیں" کے قسم کا کوئی جملہ کہہ دے۔ اور بیوی بھی کسی خاص موقعہ پر جبکہ شوہر کی خوشیاں اس موقعہ سے زیادہ وابستہ ہوں۔ لال ہی ساری پہنے ———

غرضکہ دونوں کا ایک دوسرے کو خوش رکھنے کا پر خلوص ارادہ بگڑتی ہوئی زندگی کو سنوار سکتا ہے۔

اور پھر ——— شادی کے بعد ایک اور خیال رکھنا ضروری ہے ——— شادی سے پہلے ہر مرد، ہر عورت کی زندگی میں کچھ "راز" ہوتے ہیں۔ کچھ عیوب۔ عیوب کو چھوڑ دیں اور ایک سیدھی سی مثال لیں ——— مثلاً مرد شادی سے پہلے کسی اور لڑکی کو پسند کرتا تھا اور اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ ایسا ہوا کہ اُس کے ساتھ شادی نہ ہو سکی ——— اگر بیوی اس معاملہ میں شوہر پر طنز کرے گی، تو رفتہ رفتہ شوہر کے دل میں نفرت پیدا ہوتی جائے گی۔ بیوی کو چاہئے کہ جب بھی اس لڑکی کا ذکر کرے۔ بہت احترام کے ساتھ۔ اس کی اچھائیوں کا خاص ذکر کرے۔ یہی شوہر کو بھی لازم ہے۔ کہ وہ بیوی کی دکھتی رگوں کو نہ چھیڑے۔ اور دونوں ایک دوسرے کی کمزوریوں پر پردہ پوشی کریں۔

ان کے علاوہ سب سے زیادہ اہم چیز ہے جنسی معلومات یا تعلیم۔ اور افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اسی میں ہمارے ملک کے لڑکے اور لڑکیاں سب سے کم معلومات رکھتے ہیں ——— والدین باقی سب باتوں کی تو تعلیم دیتے ہیں کہ یوں کھانا کھاؤ، یوں پانی پیو۔ ایسے چلو، ویسے سوؤ۔ مگر جنسی تعلیم کے معاملہ میں زبانیں بند رکھتے ہیں۔

لیکن فطرت کو دبایا ہی کب جا سکتا ہے۔
بچپن ختم ہوتے ہی ایسے جسمانی تغیرات شروع ہو جاتے ہیں کہ لڑکے لڑکیاں خود ایک دوسرے کو دیکھ کر، آپس میں چھپ چھپ کر باتیں کر کے اس میں لذت کو وابستہ کر دیتی ہیں۔ اور غلط قسم کی راہوں پر پڑ جاتی ہیں۔
تفصیلات سے گریز مقصود ہے۔
شادی ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی صحیح ساخت اور خواہشوں سے بے خبر ہوتے ہیں اس لئے اکثر حالتوں میں ایک دوسرے کی تسکین

کا باعث نہیں بنتے اور محبت پیدا ہوتے ہوتے نفرت اپنا بیج بو دیتی ہے۔

اُس کے لئے ضروری ہے

کہ مرد کو عورت

اور عورت کو مرد کی ـــــ جسمانی ساخت کی پوری پوری معلومات ہو۔ خاص کر ان اعضا کی جو جنسی جذبوں سے براہ راست متاثر ہوتے ہیں۔

اور

دونوں ایک دوسرے کے جذبات کا صحیح احترام کریں۔ اور ایک دوسرے کی تسکین کا ارادہ کریں۔

جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ نکاح تو زندگی کے دروازے کھولدیتا ہے۔ اس میں ساتھ ساتھ داخل ہونے کے لئے دونوں کی باہمی محبت اور خلوص اور جنسی آسودگی ضروری ہے ـــــ جنسی جذبہ کو خاص اہمیت ہے کیونکہ صرف یہی فطرت کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اور زندگی کے سلسلہ کو قائم رکھتا ہے۔

یورپ میں جہاں کی عورتیں زیادہ بیباک ہیں۔ انہوں نے ججوں اور ڈاکٹروں کو جو بیانات دیئے ہیں ان سے ہر ملک کی عورت کی صحیح فطرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹروں نے گہری تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ عورت بھی اپنی جنسی خواہش میں ویسی شدت رکھتی ہے جیسا کہ مرد۔ وہ بھی اپنی پوری تسکین چاہتی ہے۔ اگر شوہر یہ تسکین پہنچانے سے قاصر رہتا ہے تو وہ بددل ہو جاتی ہے۔

عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ مرد اپنی تسکین ہی کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کو اپنی رفیقہ کی تسکین کا احترام نہیں ہوتا ـــــ اور یہی وہ مرد ہوتے ہیں جو اپنی رفیقہ کے دل میں محبت کے بجائے نفرت کو بیدار کر دیتے ہیں

عورت کی جنسی خواہش ذرا دیر میں بیدار ہوتی ہے۔ اس کیلئے مرد کو انتظار کرنا چاہیئے پیار و محبت کی باتوں سے، اُس کے جسم کے بعض حصوں کو چھونے سے یہ خواہش بیدار ہونے لگتی ہے جب تک وہ خود بھی اُسی شدومد کے ساتھ تیار نہ ہو۔ اُس سے اپنی تسکین پہنچانا سراسر غلطی ہے ـــ

ایک خاص ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ خاموشی ہو۔ مداخلت کا اندیشہ نہ ہو۔ ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی ہو۔ اور موسم خوشگوار ہو۔

بعض عورتوں نے ڈاکٹروں سے شکایت کی ہے کہ شادی کی پہلی رات ہی کو جبکہ وہ کئی دن کی تھکی ہوئی تھیں۔ ان کے شوہروں نے محض اپنی تسکین کا خیال رکھا۔ اور ہمیں اس بات کا خیال پیدا کرا دیا کہ جیسے وہ ہم کو اغوا کر کے لائے ہیں۔ اور زبردستی درندانہ انداز میں زنا کر رہے ہیں۔

یہی عموماً ہمارے یہاں بھی رواج سا بن گیا ہے ـــــ پہلی رات کوئی ہرج تو نہیں لیکن ماحول کا پیدا ہونا اور بیوی کا پوری طرح تیار ہونا ضروری ہے اور ـــــ خود عمل بہت جمالیاتی طریقوں پر ہونا چاہیئے۔ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کو تسکین پہنچانے کا ارادہ ہونا چاہیئے۔ اور اس فعل کو یہی درندگی کا مظاہرہ نہیں، بلکہ محبت کا اظہار سمجھنا چاہیئے جس میں دونوں کا برابر کا حصہ بننا ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ مرد تو بہت حیثیتی کا ثبوت دے اور بیوی بستر کی طرح بچھی رہے۔

"اگلے زمانہ میں جہالت کو معصومیت سمجھا جاتا تھا۔ اور جنسی معلومات میں خاموشی بہتر خیال کی جاتی تھی لیکن اُس وقت سے بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ چنانچہ آج ہمیں اس کا پورا احساس ہے کہ جنسیات کے معاملہ میں خاموشی بہتر نہیں ہے۔ اور یہ ہمارا مقدس فرض ہے کہ ہم اس خاموشی کو جلد سے جلد ختم کریں۔"

(میگنس ہرشفیلڈ)

زندگی کا دار و مدار آنکھوں کی بینائی پر منحصر ہے

اگر آپ کی نظر ذرا بھی کمزور ہے

تو

آپ کے چاروں طرف گنگناتی ہوئی رنگینیاں آپ کے لئے بیکار ہیں

اس لئے

اپنی ضرورت پر

بہترین چشموں ۔ لیٹسٹ فیشن کے خوبصورت فریموں اور آنکھوں کے
سائنٹفک معائنہ کے لئے ہمارے پاس

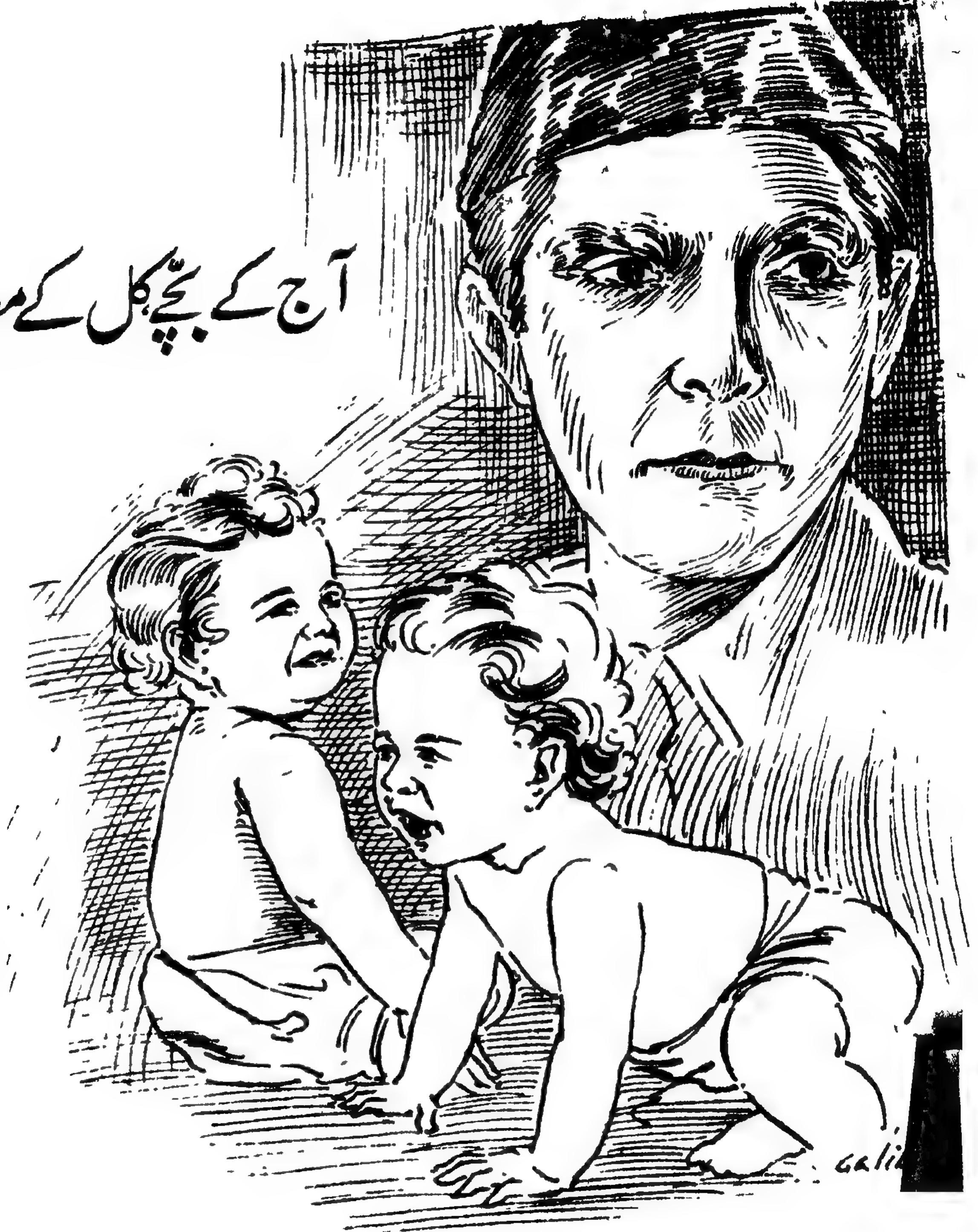
تشریف لائیے

وزیر آپٹیکل ہال سائنٹفک آپٹیشین

نزد میجسٹک سینما ۔ بندر روڈ

کراچی

آج کے بچے کل کے معمار



از:

ماہ مبین

مسرور فاطمہ خانم

خاص سائیکولوجی اُردو کے لئے

بچوں کی تربیت

(ماہ مبین)

بچوں کی تربیت کے سلسلے میں کیا آپ کچھ معلوم کرنا چاہتی ہیں؟ آپ ادارہ "سائیکولوجی" کو لکھئے۔ میں اس صفحہ میں جواب دینے کی کوشش کروں گی۔　　"ماہ مبین"

ماحول کس حد تک بچوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں سائیکولوجی کے ذریعہ اس سے پہلے کئی بار اظہار خیال کر چکی ہوں۔ آج میں اس سلسلے میں ذرا اور تفصیل سے غور کرنا چاہتی ہوں۔ ماحول کی اثر فرمائی کے متعلق علماء نفسیات کافی تحقیقات کر چکے ہیں۔ اور اب بھی تحقیقات کا یہ سلسلہ جاری ہے اس لئے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے یا لکھا جا رہا ہے وہ حرف آخر نہیں ہے۔ تاہم یہ چیز طے شدہ ہے کہ بچوں پر ماحول ہی ہر طرح اثر انداز ہوتا ہے اور یہ خیال کرنا کہ توارث ان کی کوئی امداد کرے گا صحیح نہیں۔ توارث کی اثر آفرینی سے انکار مشکل ہے۔ لیکن جو چیز ہمارے اختیار کے باہر ہو اس کے متعلق سوچنا بیکار ہے۔ ہمیں تو صرف اس پر غور کرنا ہے کہ ہم خود کیا کر سکتے ہیں۔ اپنے بچوں کے اخلاق و عادات کو کیسے بلند کر سکتے ہیں۔ اور قوم کو ہونہار افراد دے کر ملک کی کیا خدمت بجا لا سکتے ہیں۔

اب جب کہ توارث کی بحث آن ہی پڑی ہے تو چند لفظ اس کے متعلق بھی سن لیجئے۔

بعض علمائے نفسیات کا خیال ہے کہ انسان کے بچے بھی ان تمام خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں جو ان کے مورثوں میں موجود تھیں۔ ایمرسن نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "ہم ان تمام اشخاص کے کہ جن سے ہمارا کچھ بھی نسبی تعلق رہا ہے ایک جزو ہیں۔" ہمارے ہر ایک مورث نے خواہ وہ قریبی ہو یا دور کا ہماری جسمانی ترکیب و ساخت میں کچھ نہ کچھ اپنا حصہ چھوڑا ہے۔

چنانچہ آج کے انسان میں بھی ایسے بہت سے رجحانات موجود ہیں جو صدیوں پہلے ہمارے مورثوں میں ہوا کرتے تھے۔

مثال کے طور پر ایک ایسا خاندان دیکھا گیا ہے جس کے تمام افراد کی آنکھیں نیلی اور مونچھیں بھوری ہوتی آئی ہیں۔

۱۹۰۴ء میں پیرسن نے چار ہزار بچوں کا جن میں دس سے لے کر ۱۴ سال تک کے بہن بھائی شریک تھے ایک نقشہ مرتب کیا اور اندازہ لگایا تھا کہ ان بھائی بہنوں کی جسمانی خصوصیات میں ۵۰ فیصدی اور ذہنی خصوصیات میں ۴۵ فیصدی مطابقت اور یکسانیت تھی۔ مطابقت توام بچوں میں اور زیادہ پائی گئی۔

مسٹر ڈیل نے امریکہ کے ایک خاندان کے متعلق تحقیقات کی۔ وہ اس کا نتیجہ یوں بیان کرتے ہیں کہ "جیوکس" جو اس خاندان کا اعلیٰ تھا ایک نالائق اور ناکارہ شخص تھا اس نے بالکل اپنے جیسی ایک نالائق عورت سے شادی کی۔ ڈیڑھ سو سال میں اس نالائق جوڑے کی پشتوں میں بارہ سو افراد کا پتہ چل سکا۔ ان ۱۲۰۰ افراد میں سے سات قاتل۔ ۶۰ چور۔ ۱۳۰ دیگر جرائم میں سزا یافتہ ۵۰ بدکار ۲۴۰ اوباش سے اپاہج اور ۳۱۰ بھکاری تھے۔ صرف ۲۰ افراد ایسے تھے جن کو سوسائٹی میں جگہ مل سکتی تھی۔

اسی طرح ڈاکٹر ونشپ جو توارث کے حامیوں میں ہیں ایک اور خاندان کے متعلق تحقیقات کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ۱۹۰۰ء تک اس خاندان کے ۱۳۹۴ افراد کا پتہ چل سکا۔ ان میں ۲۹۵ گریجویٹ۔ ۱۳۰ پرنسپل۔ ۱۶۰ ڈاکٹر۔ ۱۰۰ پادری۔ ۶۰ مصنف۔ ۱۰۰ وکیل، ۳۰ جج۔ ۸۰ اعلیٰ عہدیدار، ایک حکومت امریکہ کا نائب صدر کچھ پارلیمنٹ کے ممبر اور سفیر تھے۔

"توارث" کے ان حامیوں نے ان اعداد و شمار سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ہر بچہ جو اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے وہ اپنے مورثوں کے مخصوص رجحانات کا حامل ہوتا ہے۔

مگر مجھے ان کے دلائل اور نتائج سے اختلاف ہے۔ ان علمائے نفسیات نے جو مثالیں ہمارے سامنے پیش کی ہیں وہ خود اپنی آپ تردید ہیں۔ "جوکس" نے ۱۲۰۰ اولاد پیدا کیں وہ سب کی سب نالائق نکلیں۔ کیوں؟ کیا اس لئے کہ جوکس اور اس کی بیوی خود نالائق تھے؟ ہرگز نہیں! بلکہ صرف اس لئے کہ ان بارہ سو افراد کی پرورش و تربیت کرنے والے نالائق تھے! دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ ان اشخاص کی پرورش جس ماحول میں ہوئی وہ ماحول ہی ایسا تھا کہ ان بچوں کو ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اسی مثال میں آپ نے دیکھا کہ ۲۰ افراد ایسے بھی تھے جو جرائم پیشہ نہ بن سکے بلکہ انہوں نے کاروباری ذہنیت پائی "عمل توارث" کے تحت ان پر بھی وہی اثر ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن چونکہ ان کا ماحول ان سے مختلف تھا اس لئے ان کی زندگی بھی ان سے مختلف ہوئی۔

"ایڈورسن" کا خاندان جس کی مثال ڈاکٹر ونشپ نے دی ہے اب بھی یہی چیز نمایاں ہے۔ خاندان کا ہر فرد اچھا کیوں بنا؟ اس لئے کہ اس کا ماحول اچھا تھا۔ نہ اس لئے کہ ایڈورسن کی خصوصیات ورثہ میں تقسیم ہوتی تھیں۔

پھر — جیوکس کا باپ تو کوئی جرائم پیشہ نہیں تھا۔ جیوس کیوں نالائق نکلا؟ اور ایڈورسن کا باپ کوئی نمایاں ہستی نہیں تھا پھر ایڈورسن کیوں ایک بڑی شخصیت کا مالک بنا؟ — نیلی آنکھوں اور بھوری مونچھوں کی مثال بھی ناکافی ہے۔ اول تو اس مثال کا کردار سے کوئی تعلق نہیں خود میرے باپ کی اولاد میں اس وقت ستائیس بچے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکے کی آنکھیں نیلی ہیں۔ حالانکہ اس کے والدین یا اس کے مورثوں میں سے کسی کی آنکھ نیلی نہیں تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری بحث غلط فہمی کا شاخسانہ ہے۔ ہم شخصیت اور کردار کا فرق محسوس نہیں کرتے ہیں جسمانی ساخت اور ذہنی ترقی کو ہم نے ایک ہی چیز سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ جسمانی خصوصیات میں توارث کا اثر پذیر ہونا جائز ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ ارتقاء کی ایک ممکنہ بحث ہے۔ لیکن میرا موضوع صرف "ذہنی خصوصیات" ہیں اور علمائے نفسیات کی ایک بھاری تعداد اسی کے حق میں ہے کہ بچہ بیدار ہونے کے بعد "ماحول" ہی کا اثر قبول کرتا ہے۔ "یہ ماحول" ہی ہے خواہ وہ بچے کو "گداگر" بنادے "یا ملک التجار" آپ ایک نالائق سے نالائق شخص کے بچے کو لے کر پرورش کریں۔ آپ دیکھیں گی کہ آپ کی آغوش میں جس بچے نے پرورش پائی ہے وہ بچہ اپنے اُن حقیقی بھائی بہنوں سے کہیں مختلف ہے جنھوں نے اپنے والدین کی آغوش میں پرورش پائی ہے

آپ کو کسی بڑے سے بڑے آدمی کا نام یاد ہے۔ ذرا اس کی پچھلی پشت پر تو نظر ڈالیئے۔ آپ دیکھیں گی وہ کیسے غیر معروف لوگ تھے قائد اعظم۔ مہاتما گاندھی۔ علامہ اقبال۔ مصطفےٰ کمال دنیا میں آفتاب کی طرح روشن ہیں مگر ان کے باپ دادا کا نام کسی کو معلوم نہیں۔ ہمیں ڈاکٹر ہیورڈ کے یہ الفاظ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ "نفسیاتی توارث" ایک خیالی بھوت ہے جو زندگی پر حقیقت کی روشنی پڑتے ہی فرار ہو جاتا ہے اس لئے ہمیں توارث کی بحث میں اُلجھے بغیر صرف ماحول کو دیکھنا اور سمجھنا ہے۔

میں نے جیسا کہ پہلے بھی کہا ہے۔ بچے کی پرورش میں سب سے زیادہ خیال یہ رکھنا چاہیئے ہمارا بچہ جن لوگوں کی صحبت میں ہے وہ اچھے کردار کے مالک ہیں؟ آپ کا بچہ — آپ یاد رکھیں — وہ نہیں سیکھے گا جو آپ اس کو سمجھا بجھا رہی ہیں — بلکہ وہ سب کچھ سیکھے گا۔

جو آپ کر رہی ہیں، وہ لوگ کر رہے ہیں جو بچے کے ارد گرد ہیں۔ بچہ آپ کا ہر فعل گہری نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کا لاشعور آپ کی افعالی زندگی کا ایک مسلسل فلم لے رہا ہے۔ آپ سچ بولا کرتی ہیں یا آپ میں جھوٹ بولنے کی عادت ہے۔ آپ بہادر، نڈر اور دلیر ہیں یا بزدل اور خوفزدہ۔ آپ کی طبیعت میں سخاوت ہے یا بخل۔ آپ کا اپنے آپ پر اعتماد ہے یا شک و شبہ۔ کس طبقہ اور کن اشخاص سے آپ محبت کرتی ہیں اور کن سے نفرت۔ غرضکہ وہ تمام باتیں جن کا تعلق کردار سے ہے بچہ۔ ان تمام چیزوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیئے کہ آپ کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ وہ بہت سی باتوں کو جان یا سمجھ نہیں سکتا۔ مانا کہ چھوٹے بچے شعوری طور پر بہت سی چیزوں کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ مگر آپ یاد رکھیں کہ خدا نے ان کو بھی وہ تمام اندرونی اور بیرونی اعضاء دیئے ہیں جو ہم کو ملے ہیں جس طرح آنکھ کی پتلی پر ہر سامنے کی چیز منقش ہو جایا کرتی ہے اور لاشعور اس کو محفوظ کرتا ہے اسطرح بچے بھی جو کچھ دیکھتے ہیں وہ اُن کے لاشعور میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ آپ آج ایک چیز دیکھتے ہیں یا ایک واقعہ سے دوچار ہوتے ہیں اور پھر بعد میں بھول جاتے ہیں مگر جب کبھی بھی اسی کے مثل دوسرا واقعہ یا اس کے سلسلہ کی کوئی دوسری چیز دیکھتے ہیں تو پہلی چیز بے ساختہ آپ کو یاد آ جاتی ہے مثلاً آپ کا کوئی عزیز انتقال کر گیا ہے ظاہر ہے کہ ہر وقت اس عزیز کی موت آپ کے خیال میں نہیں ہوتی ہے مگر جیسے ہی کہیں آپ اس کا نام سنتے ہیں یا اس کی کوئی چیز دیکھتے ہیں معاً وہ آپ کو یاد آ جاتا ہے اس کی صورت آپ کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے آپ کے تعلقات یاد آ جاتے ہیں، اسی طرح بچہ بھی جو کچھ دیکھ یا سُن رہا ہے وہ اس کے لاشعور میں محفوظ ہے۔ وہ جب وہ اس قابل ہو جائے گا کہ وہ اس کو سمجھ سکے لاشعور بچپن تمام تصویریں اس کے سامنے پیش کر دے گا۔ مثال کے طور پر آپ کے گھر میں سانپ نکلا۔ آپ نے دیکھا اور بچہ نے بھی۔ بچہ ظاہر ہے کہ اس کو شعوری طور پر کچھ نہ سمجھ سکا۔ اور اگر بہت سمجھا تو ایک رسی یا ایک کھلونا۔ لیکن آپ تو اس کو رسی یا کھلونا نہیں سمجھ سکتیں، پھر اگر آپ جری ہیں تو آپ بڑی کوشش کرینگی اور دوچار لکڑیوں میں اس کی کمر توڑ دیں گی۔ اور اگر آپ بزدل ہیں تو شور و غل کریں گی۔ اس عرصہ میں یا تو وہ سانپ بھاگ جائے گا یا باہر سے کوئی دوسرا شخص آپ کی مدد کے لئے آ کر اس کو ہلاک کر دے گا۔ بچہ کے لئے یہ بھی تماشہ ہے۔ مگر یاد رکھئے کہ یہ تمام واقعہ ایک فلم کی طرح بچے کے لاشعور میں محفوظ رہے گا۔ اور پھر جب کبھی بچہ — بچہ نہیں رہے گا۔ بلکہ سیانا ہو جائے گا۔ اگر اس نے کبھی سانپ دیکھا۔ آپ جانتی ہیں وہ کیا کریگا؟ یا تو وہ چلانے لگے گا اور بھاگنے کی کوشش کریگا یا سانپ کو مارنے اور ہلاک کرنے کی کوشش کریگا۔ وہ وہی کریگا جو بچپن میں اسکے سامنے آپ نے کیا تھا۔ اتنے دنوں کے بعد لاشعور اس واقعہ کو اس طور پر اس کے سامنے پیش کرے گا کہ اس کو بچپنے کا یہ واقعہ یاد بھی نہ ہو گا اس سلسلہ میں ایک چیز اور بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ بچہ جن افراد سے زیادہ محبت کرتا ہے انہی کے کردار اور عادات کی زیادہ نقل کرتا ہے اور جن سے نفرت کرتا ہے اس کے عادات و کردار بچے پر گہرے نقوش نہیں چھوڑتے۔ وجہ صاف ظاہر ہے بچہ جن سے محبت کرتا ہے ان کے افعال میں وہ دلچسپی لیتا ہے، ان کے کردار (خواہ وہ کیسے ہی ہوں) اسے بھلے لگتے ہیں اور چونکہ وہ ان کو گہری دلچسپی اور شوق سے دیکھتا ہے اس کے لاشعور پر ان کا اثر گہرا ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے بچہ جن سے مانوس نہیں ہے یا جن سے اسے نفرت ہے وہ ان کی طرف گہری نظر سے دیکھتا ہی نہیں تو اس کا ننھا سا لاشعور۔ ان کی چیزیں کیا اپنائے گا۔ اس چیز کو اگر آپ ایک اصول مان لیں تو آپ پر یہ واضح ہو جائے گا کہ بہ حیثیت ماں کے آپ کی ذمہ داری کتنی بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ بچہ فطری طور پر ماں سے زیادہ کسی ہستی سے محبت نہیں کرتا ہے ہستی عالم میں پہلی آنکھ کھول کر وہ ماں کو دیکھتا ہے۔ دو برس تک ماں کے خون سے سیری حاصل کرتا ہے۔ ماں کی آغوش اس کو ہمدردی دیتی ہے پھر ماں سے زیادہ وہ کس سے محبت کرے؟ پھر جب ماں ہی اس کی محبوب ترین ہستی ٹھہری تو ظاہر ہے کہ بچہ کا کردار ماں کی زندگی کا ایک پرتو ہو گا۔ بچے کے لاشعور میں جو کچھ ہے اس میں ۸۰ فیصدی ماں کا حصہ ہے۔ اس لئے ماں اپنے بچے کی تربیت کے سلسلے میں سب سے زیادہ آپ کو اپنے کردار کا جائزہ لینا ہے۔ یہ کہ آپ کیا اور کیسا بنانا چاہتی ہیں؟ جو کچھ بھی اس کے مستقبل کے واسطے آپ سوچ رہی ہیں اس پر آپ خود عمل درآمد شروع کر دیجئے۔ بچے کو اگر آپ بہادر، جری، نڈر، دلیر بنانا چاہتی ہیں تو اپنے دل سے آپ

خوف اور بزدلی کو دور کر دیجئے۔ یاد رکھیئے کسی بزدل ماں کا بیٹا دلیر نہیں ہو سکتا۔ ہم پچھلے چند برس پہلے غلام تھے۔ غیر ملکی حکومت کا جوا ہمارے گلے میں پڑا ہوا تھا۔ اس وقت ہمارے واسطے یہی بہتر تھا کہ ہم اور ہمارے بچے "قانع" ہوں۔ بغاوت و قانون شکنی کا مادہ ان کے سرشت میں پیدا ہو۔ مگر اب حال مختلف ہے۔ ہمارا ملک آزاد ہے۔ ہم خود ایک قوم ہیں اور اپنی آزادی ہمیں ہر قیمت پر برقرار رکھنا ہے۔ اب بھی بہت سے لوگ ہیں جو ہم کو ایک علیحدہ قوم ماننے پر تیار نہیں ہیں۔ وہ ہم کو اپنے میں مدغم کرنے کے لئے ہر ممکن چال چل رہے ہیں۔ اس موقع پر ہمارا بھی ایک فرض ہے۔ ایک اجتماعی فرض ہے اور ایک انفرادی فرض ہے۔ اجتماعی فرض تو یہ ہے کہ ہم اپنی حکومت کی تائید کریں۔ آخر وہ حکومت کسی نے ہمارے سر منڈھ تو نہیں دی ہے۔ ہم ہی نے وہ حکومت بنائی ہے۔ پھر جب تک وہ حکومت ہے ہمیں اسکی تائید کرنا فرض ہے۔ حکومت کو ہم تبدیل کر سکتے ہیں مگر حکومت سے بغاوت نہیں کر سکتے ہیں حکومت کے قوانین سے انحراف نہیں کر سکتے ہیں اور اسی طرح ہمارا ایک انفرادی فرض ہے۔ ہم نے ہر طور اپنی زندگی بہت کچھ گزار لی ہے۔ مگر آئندہ ہماری قوم جن افراد پر مشتمل ہوگی ان میں ہمارا ایک "ننھا" بھی ہوگا۔ پھر اس ننھے کو اچھا بنانا۔ حکومت کا کام نہیں ہے۔ سوسائٹی کا فرض نہیں ہے۔ دوسرے اعزا و رشتہ دار، خاندان والے بھی کوئی امداد نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ کام صرف آپ کو کرنا ہے۔ بہ حیثیت "ماں" کے یہ صرف آپ کا فرض ہے۔ کچھ دیر اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانکیے۔ کیا آپ نے یہ فرض کچھ ادا کیا ہے۔ کیا آپ اپنے ننھے سے امید کرتی ہیں کہ وہ ایک جری، بہادر، نڈر بیٹا ہوگا؟ اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ آپ آج ہی سے بلکہ ابھی سے اس بات کا عہد کر لیں کہ آپ کو بہ حیثیت ماں کے یہ فرض ادا کرنا ہے۔ اور یہ کام کوئی مشکل نہیں ہے۔ آپ بچے کو "ہو ہو" اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں سے ڈرانا چھوڑ دیجئے۔ آپ بچے کو اندھیرے کمروں میں جانے سے منع مت کیجئے۔ اندھیرے کا وہم اپنے دل سے آپ خود نکال دیجئے۔ آخر وہی تو کمرہ ہے جس میں دن میں آپ کا بچہ کھیلتا رہتا ہے۔ پھر رات میں آخر کیا ہو گیا کوئی بچہ اگر آپ نے خود اس کو ڈرایا نہیں ہے اندھیرے سے نہیں ڈرتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اگر آپ کا بچہ ڈرنے لگا ہے تو اس کا علاج اب بھی ممکن ہے۔ آپ بچے کو کمرے میں سلایئے۔ اور روشنی کر دیجئے کچھ دیر کے بعد روشنی تھوڑی کم کر دیجئے۔ پھر دوسرے دن تھوڑی روشنی کے کمرے میں بچے کو سلایئے جب دیکھئے وہ اس کا عادی ہو گیا ہے روشنی اور مدھم کر دیجئے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد مدھم روشنی کے کمرے میں اس کو لٹایئے اور بعد میں روشنی گل کر دیجئے۔ چند دنوں کے بعد اس تاریک کمرے میں اس کو تھوڑی دیر کے واسطے تنہا چھوڑ دیجئے۔ کچھ ہی دنوں میں اندھیرے کمرے میں آنے جانے میں جو اس کی جھجک تھی جاتی رہے گی۔ اسی طرح آپ ہر بات میں خیال رکھیں جس چیز سے بھی بچہ خائف ہے اس چیز کی اصلیت اس کے سامنے بے نقاب کر دیں اور اس کے خوف اور ڈر کو اس کے دل سے دور کر دیں۔ اسی طرح اپنے بچے میں جھوٹ بولنے کی عادت نہ پڑنے دیجئے۔ یاد رکھیئے کیا بچہ اور کیا بوڑھا انسان اسی وقت جھوٹ بولتا ہے جب سچ بولنے میں کوئی نقصان محسوس کرتا ہے۔ پھر بچے کا معاملہ تو بہت آسان ہے۔ آخر وہ آپ ہی کا بچہ ہے۔ آج جو کچھ آپ کر رہی ہیں بنا رہی ہیں۔ جمع کر رہی ہیں وہ سب بچے ہی کے لئے تو ہے۔ پھر آخر آپ اسکے ساتھ کیوں ایسا برتاؤ کرتی ہیں کہ بچے کو جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ بچے کے جھوٹ کی ساری ذمہ داری آپ کے سر ہے۔ اگر بچے کو یہ باور ہو جائے کہ وہ سچ بول کر نقصان نہیں اٹھائیگا تو وہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔ آپ کی لاعلمی میں اس سے کوئی نقصان ہو گیا ہے۔ آپ دریافت کرتی ہیں کہ یہ نقصان کیسے ہوا۔ منے! کیا تم نے یہ چیز توڑی ہے؟ منے میاں جانتے ہیں کہ اگر وہ اقرار کرینگے تو آپ انکی ہڈی پسلی کو دھنک کر رکھ دینگی پھر وہ جھوٹ نہ بولیں گے تو کیا سچ بولیں گے؟ لیکن سمجھدار مائیں بچے کے نقصان پر کسی بچہ کو سرزنش نہیں کرتیں۔ نقصان تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ دیکھئے کیا آپ کے ہاتھ سے چینی کی پلیٹ شیشے کا گلاس اور اس قسم کی چیزیں ٹوٹ چکی ہیں۔ پھر بچہ تو آخر بچہ ہے۔ اگر اسکے ہاتھ سے ٹوٹ گیا تو کیا غلطی تو آپ کی ہے [illegible] آسان ہے ٹوٹ جانے والی چیز ایسی جگہ رکھی کیوں جہاں بچہ اس سے کھیل سکتا تھا۔ ایسے نقصانات پر آپ بچے پر خفا نہ ہوں۔ ایک [illegible] دوسرے آپ اس پر غصہ کر کے اس کے ننھے سے دل کو دکھاتی ہیں۔ اور بچے کو بتاتی ہیں کہ ایسے نقصانات کا نتیجہ ملامت اور سرزنش ہے [illegible] کام یہ ہے کہ بچہ ایسے نقصانات کر کے ان کو چھپانے لگتا ہے۔ جھوٹ بولنے لگتا ہے۔ مختصر یہ کہ بچے کے کردار بنانے میں جتنا ہاتھ آپ کا ہے اتنا کسی دوسرے کا نہیں اور حقیقی ذمہ داری آپ پر ہے دوسروں پر نہیں۔ آپ بچے کے واسطے زیادہ دولت جمع کرنے کی فکر نہ کریں۔ مگر اس کے اخلاق اور عادات کو بلند کرنے کی زیادہ کوشش کریں۔ اگر آپ کا بچہ بہادر ہے۔ نڈر ہے۔ مردم شناس ہے تو دولت اس کے قدموں میں ہے اور اگر خدانخواستہ آپ کا پیارا بچہ بزدل ہے۔ کم ہمت مردم آزار ہے تو آپ کی جمع کی ہوئی دولت بھی اسکے کسی کام نہیں آسکے گی۔ چار دن کی چاندنی اور پھر وہی اندھیری رات ہے!

بچوں کی جنسی خواہشات

مسعود [illegible]

انسان کو زندگی کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کرنا ہوتا ہے۔ ان ضروریات کو حاصل کرنا ہی انسان کا نصب العین ہے۔ اسی کے بعد ہمیں سچی خوشیاں حاصل ہوتی ہیں ——— ضروریات زندگی کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے؟ ایک اہم سوال ہے۔ جو کہ خاندان۔ قبیلہ اور سوسائٹی سے بھی اسی قدر اہمیت رکھتا ہے جتنا کہ [illegible] انسان کی زندگی سے۔ سوسائٹی بھی اسی منزل [illegible] ترقی [illegible]۔

بچوں [illegible] تعلیم [illegible] کو مد نظر رکھ کر کرنی چاہیئے۔ بچے اپنے تجربے، اپنے ماحول اور دیگر افراد سے مل جل کر بہت [illegible] زندگی میں دلیر اور ہوشیار بنا لیتے ہیں۔ والدین کی ہمہ وقت یہی کوشش رہتی ہے کہ ان کے بچے [illegible] بچے [illegible] سمجھو [illegible] بڑی باتیں سیکھ جاتے ہیں جن کا علم ان کے والدین کو نہیں ہوتا۔ زندگی کا ایک [illegible] بچے دوسرے بچوں کو دیکھ کر اپنے جسم کی بناوٹ دوسرے کی بناوٹ سے ملاتے ہیں۔ اور مخالف جنس کی [illegible] اس قدر حیران کہ [illegible] بچے اپنے ننھے دماغوں [illegible] پر غور کر [illegible] اور آخر کار [illegible] سمجھتے ہیں۔ — [illegible] والدین بچوں کو ڈانٹ بتاتے ہیں کہ وہ بچارے سہم کر رہ جاتے ہیں۔ ذرا خاموش رہتے ہیں۔ [illegible] میں کھیلنا، بات چیت کرنا، بچے اپنے جسموں کا مقابلہ کرنا۔ اس کا نفع و نقصان بتانا۔ ان کو اور زیادہ ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیتا ہے اور بچہ افسوس کرتا ہے کہیں کیوں نہ مخالف جنس کا [illegible] والدین کی ٹال مٹول اور سوال [illegible] کا معقول جواب نہ دینا ہی بچوں کو [illegible] میں مبتلا کر دیتا ہے۔

والدین کو سمجھنا چاہیئے جو آج بچہ ہے کل وہ بھی ان کی طرح ماں باپ بنے گا، ماں باپ بننے سے پہلے وہ بھی جوان ہوگا۔ ——— لڑکی اور لڑکے کی جوانی دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے اور نادان والدین بچوں کو [illegible] ہیں۔ انہیں بے جا [illegible] بن جاتی ہیں۔ ایسے لڑکے لڑکیاں [illegible] سے تنگ آ کر راہوں میں پڑ جاتے ہیں، جنسی [illegible] سیدھی سادھی راہ پر موڑنے کی بجائے [illegible] کی طرف موڑ دی جاتی ہے۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ ہمارے [illegible] کا نتیجہ لڑکے اور لڑکیوں کو عمر بھر [illegible] ڈاکٹروں اور وکیلوں کے [illegible] آتے [illegible] اور مردوں کی زندگیاں تباہ ہو چکی ہیں۔ [illegible] جذبہ کے متعلق کچھ جانتے ہی نہیں [illegible] ناواقفی کی وجہ سے جہنم بن چکی ہیں۔ [illegible] چودہ برس کی لڑکی جبکہ وہ اپنی جوانی میں پہلی بار قدم رکھتی ہے وہ اپنے جسم کی تبدیلیوں سے بے خبر ہوتی ہے۔ اور [illegible] بے پرواہی سے کھیلتی پھرتی ہے اور سینکڑوں رہزن تاک میں رہتے ہیں۔ اور ان کو لالچ دے کر ہمیشہ کے لئے زندگی برباد کر دیتے ہیں۔ والدین کی ناک کٹ جاتی ہے۔ سماج میں ایسی لڑکی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ خاندان اور قبیلے والے تھو تھو کرتے ہیں۔ اور لڑکی اپنی زندگی سے عاجز آ کر خودکشی کر لیتی ہے۔ [illegible] شہر کے [illegible] آباد کرتی [illegible]

اگر ہمت والی ہے تو سماج کے ٹھیکے داروں کے سینہ پر مونگ دلتی ہے۔ اسی طرح لڑکے بھی اپنی زندگی ناعاقبت والدین کی وجہ سے برباد کر لیتے ہیں اوائل جوانی میں لڑکے اپنے جسمانی تبدیلیوں سے حیران ہو جاتے ہیں اور پھر اپنے ہاتھوں سے اس جذبہ کو دباتے ہیں۔ یا پھر والدین کی چوری چوری بازاری عورتوں کے پاس جاتے ہیں اس طرح وہ بھی اپنی زندگیاں تباہ کرتے ہیں۔ سینکڑوں مہلک بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جن کا خمیازہ اُن کی پشت در پشت بھگتی رہتی ہے۔

زندگی کی بقا افزائش نسل ہی سے ہے۔ ہر جاندار کی جبلی خواہش ہے کہ اس کی نسل بڑھے اور اسی خواہش کے تحت انسان زندگی کی تگ ودو میں لگا رہتا ہے۔ انسانی زندگی کی بقا اور صحت کا راز جنسی خواہشات ہیں۔ افزائش نسل بھی ان ہی خواہشات کی بدولت ہے۔ جنسیات زندگی کا ایک بندھن ہے۔ یہ ایک مقناطیس ہے۔

جنسی خواہشات کا حد اعتدال پر ہونا نہایت ضروری ہے۔ ان میں زیادتی پریشانیوں اور بربادیوں کا موجب ہے اور کمی مزید بیماریوں کی پیش کش ہے۔

جنسیات، زندگی کی ایک کشش مانی گئی ہے۔ تمام تر زندگی کا دارومدار ان ہی خواہشات پر مبنی ہے۔ انسان تو انسان کیڑے مکوڑے، چرند، پرند ہر ذی روح شے میں جنسی خواہشات پائی جاتی ہیں۔ ان کی زندگی بھی جنسی خواہشات کے محور پر گھومتی ہے۔ اور اپنی نسل کو بڑھانے کی جستجو میں شب روز گذارتے ہیں۔ اس جبلی خواہش سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے۔ جنسیات قدرت کا بیش بہا عطیہ ہے جس کی وجہ سے زندگی میں دلکشی، خوبصورتی، چہل پہل اور ہنگامے پائے جاتے ہیں۔ تمام تر خوشیاں ان ہی خواہشات کے دم سے ہیں۔ تمام ولولے ان ہی کی وجہ سے ہیں۔

اس خواہش کی تکمیل کے لئے جنس مخالف کا ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔ جب ہی اوائل جوانی میں لڑکوں کی شادی کر دی جاتی ہے۔ عقد الفت میں رہ کر اپنی اس خواہش کو پورا کرنا صحت اور زندگی کو بحال کرنا ہے۔ جنسیات انسانی زندگی کو متوازن اور استوار رکھتی ہے۔ تمام تر دنیا کی رونق موسیقی، شاعری، فنون لطیفہ اور بڑی بڑی کارگزاریاں ان ہی خواہشات کی وجہ سے ہیں۔ چرندوں اور پرندوں اور انسانوں کا چہچہانا۔ ان کے پروں کی رنگینیاں۔ جانوروں کے خوبصورت بال ان ہی خواہشات کی بدولت ہیں۔ جانوروں اور انسانوں میں جذبۂ وفاداری، اطاعت شعاری، محبت ایثار، قربانی یہ خوبیاں اسی خواہشات کی وجہ سے ہیں۔

بچپن میں یہ خواہش سوئی ہوئی ہوتی ہے۔ مشاہدے میں یہ چیز آئی ہے کہ لڑکا اپنی ماں پر فدا رہتا ہے اور لڑکی باپ پر جان فدا کرتی ہے۔ جنس مخالف کی کشش کے وجوہات ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ بڑے ہو کر لڑکے لڑکیوں میں زیادہ دلچسپیاں لیتے ہیں اور لڑکیاں لڑکوں میں رہنا پسند کرتی ہیں۔ اگر بچوں کو شروع ہی سے جنسی تعلیم ملے۔ ان خواہشات کی تکمیل کے غلط طریقے اور ان کے نتائج بچوں کو بتائے جائیں تو کوئی بچہ بری راہ اور گمراہی کی طرف جا ہی نہیں سکتا۔ اُن کے جسموں کی بناوٹ اور ان کا استعمال بتانا ہے۔ والدین کیوں شرماتے ہیں۔ بچوں کے ذہن میں شروع سے غلط کاریوں کے نتیجے ڈال دینے چاہئیں۔ خواہشات کی صحیح تکمیل پر اگر روشنی ڈالی جائے تو لاکھوں زندگیاں تباہی سے بچ سکتی ہیں اور بربادی سے روکی جاسکتی ہیں۔ والدین بچوں کو کھلاتے ہیں۔ اچھے سے اچھے کپڑے پہناتے ہیں۔ دکھ اور تکلیف کے وقت کھڑے رہتے ہیں جان فدا کرتے ہیں۔ خود تکلیفیں برداشت کرتے ہیں اور اپنے بچوں کو دکھ نہیں دیتے۔ مگر جب یہ بچہ بری راہ اختیار کرتا ہے۔ جنسی خواہشات کے پھیر میں پڑتا ہے تو اپنے والدین کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اُس کا صرف ایک مشغلہ ہوتا ہے جو چیز اس سے دور رکھی گئی تھی اور جس کے متعلق وہ قطعی بے خبر تھا اب رات دن اسی کے پھیر میں رہتا ہے۔ والدین کو بھولتا ہے اور زندگی تباہ کر بیٹھتا ہے اور پھر جا کر آنکھیں کھلتی ہیں۔ اسے والدین کی غلط تربیت کا نتیجہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ والدین سب کچھ کرتے ہیں مگر ایک چیز سے نابلد رکھتے ہیں۔

پرانے زمانے کے جاہل لوگ بھی ان جنسی خواہشات کی کارفرمائیوں کو مانتے تھے۔ وہ لڑکے لڑکیوں کی جوانی سے بے خبر نہیں رہتے تھے مگر نئے زمانے کے والدین بچوں کی تعلیم۔ اُن کے اچھے کپڑے اور کھانے وغیرہ کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی جوانی کی طرف سے بالکل بے خبر

رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شروع ہی جوانی میں بچے اپنی جوانی غارت کر لیتے ہیں اور پھر عمر بھر سر پکڑے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان جاہلوں کے یہاں یہ جنسی جذبہ ان کے مذہب میں رچ گیا تھا۔ اس جذبہ کو سب سے زیادہ احترام دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی پرستش کی جاتی تھی۔ پرانے زمانہ کے ننگے بت اور ننگی تصویریں ہمیں اب تک ملتی ہیں۔

نئے زمانہ میں یہ باتیں معیوب خیال کی جانے لگیں۔ تعلیم و تہذیب نے جوں جوں ترقی کی والدین نے بچوں کی جنسیات کی طرف سے مغائرت برتنی شروع کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچے اپنی جنسی خواہش کی بیداری پر نئی نئی راہیں اختیار کرنے لگے۔ بعض کے اوپر سے بزرگوں کا جب دست شفقت اٹھ گیا تو وہ اپنی من مانی کرنے لگے۔ بعض اس جذبہ کی بیداری کو دبانے لگے اور یہاں تک دبایا کہ زندگی کی تمام تر خوشیوں سے محروم ہو گئے۔ جنسیاتی پیچیدگیاں سلجھائے نہیں سلجھتی ہیں۔ ایسے انسانوں کی زندگی جہنم زار بن جاتی ہے۔ عورتیں اس خواہش کو دبانے میں بڑی قدرت رکھتی ہیں اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سچی خوشیوں سے محروم رہ جاتی ہیں۔ لہذا جنسیات کی صحیح تعلیم اور اس کی صحیح تکمیل ہی سچی خوشیوں اور روحانی مسرتوں کی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔ ✦

عزائم

اختر انصاری اکبر آبادی

عجیب شان سے میں انجمن میں آؤں گا — ہر ایک فتنۂ جاں کاہ کو دباؤں گا
کبھی سجاؤں گا دل کے لہو سے بزم خزاں — حجاب گل میں کبھی بجلیاں چھپاؤں گا
کبھی تلاش کروں گا میں اضطراب سکوں — کبھی بغیر تجسس سکون پاؤں گا
بتاؤں گا کبھی گمراہیوں کو راہ نما — کبھی قفس کو نئے زاویے بتاؤں گا
کبھی کروں گا تمنا جگر کے زخموں کی! — کبھی نقوش تمنا کو خود مٹاؤں گا
اگر سنوں گا میں مزدور کی کراہ کبھی — برا نہ ماننا تم کو بھی بھول جاؤں گا
کبھی کروں گا بغاوت جو زر پرستوں سے — تمہاری انجمن ناز تک نہ جاؤں گا
کبھی جو آبلے پھوٹیں گے میرے پاؤں کے — وطن کے خار بھی اس خون سے سجاؤں گا
کبھی جو ہونگا غریبوں کے ساتھ محو جہاد — اگر مناؤ گی تم بھی تو روٹھ جاؤں گا
مرے لبوں پہ بغاوت کے زمزمے ہونگے — کہو گی شاعر باغی تو مسکراؤں گا

نہ پوچھو میرے عزائم کی رفعتیں انجم
میں ایک روز ستاروں میں جگمگاؤں گا

میں اکثر گنگناتی ہوں

اب تو دعائے نیم شبی بھی ہے بے اثر
باتوں میں تھا اثر وہ زمانہ گزر گیا
(رفیع احمد صبا)

●

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کار آشیاں بندی
(علامہ اقبال)

●

موت یہ میری نہیں میرے اجل کی موت ہے
کیوں ڈروں اس سے کہ مر کر بھی مجھے مرنا نہیں
(علامہ اقبال)

●

اہل ساحل سے توقع لوں ناخدا جلدی نہ کر
پھر خدا جانے میسر ہو نہ ہو ساحل مجھے
(شنکر لال وفا)

مرسلہ: رضیہ کے۔ شاہ





بھولوں کیسے

لکھنے والے

حافظ انوار حسین ایڈوکیٹ

ع ۔ ع ۔ بلگرامی

مومن دہلوی



نیا عنوان

بھولوں کیسے ؟

لیجئے ہم اپنے اعلان کے مطابق یہ نیا عنوان پیش کر رہے ہیں۔ ان صفحات میں آپ اپنے رفیقوں کی زندگی کے ناقابل فراموش واقعات پڑھیں گے اور اپنی زندگی کے عجوبہ واقعات سنا سکیں گے۔ اس [illegible] باہمی تعلق پیدا ہوگا جس کا آج کل فقدان ہے آپ جانتے ہی نہیں کہ آپ کے پڑوس میں [illegible] اس کا مانی [illegible] اور اس کا سال ایسا یوں ہے ——
کوشش [illegible] اور ایسے پیرایہ میں لکھیں جو دوسروں کو آپ کے قریب تر [illegible]

ادارہ [illegible] آپ کی [illegible] کا منتظر ہے　　(ادارہ)

حافظ انوار حسین، ایڈووکیٹ!

نومبر ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتہ میں بذریعہ ریل تن تنہا بمبئی پہنچا تھا۔ دہلی قتل و غارت گری کے بعد لاکھوں مہاجرین اس غرض سے بمبئی پہنچے ہوئے تھے کہ یہاں سے بذریعہ سٹیمر عازم پاکستان ہوں۔ دہلی اور دوسرے فساد زدہ علاقوں سے ہر شخص کے لئے یہ ممکن العمل نہیں تھا کہ وہ پاکستان پہنچنے کے لئے ہوائی جہاز کا سفر اختیار کرے۔ ہوائی جہاز سے سفر لوگوں کو اس لئے بھی پسندیدہ نہ تھا کہ اس میں مسافر کو نہایت ہی قلیل اور مختصر سامان لانے کی اجازت تھی چنانچہ میں نے بھی اپنا باقی ماندہ سامان سمیٹ کر جمع کیا اور صد ہا خطرات اور دشواریوں کے باوجود دوسرے شہری ساتھیوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھ کر دہلی سے بمبئی آیا۔ دہلی اور مشرقی پنجاب کے مقابلہ میں یہاں کی فضا کچھ پر سکون معلوم ہوئی۔ لیکن شہر بمبئی بھی اس وقت تک دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ بن بازار اور بھنڈی بازار سے شروع ہو کر محمد علی روڈ سے گذرتا ہوا کرافرڈ مارکیٹ تک تمام کا تمام حصہ شہر پاکستان کے نام سے مشہور تھا اور شہر کا باقی حصہ ہندوستان کہلاتا تھا۔ میری قیام گاہ شہر کے پاکستانی حصہ میں تھی۔

مسلسل تین ماہ تک دہلی میں قتل و غارت گری اور خون ریزی کے واقعات دیکھتے دیکھتے دل [illegible] ہو چکا تھا اور میرا دل پر سکون فضاؤں میں سانس لینے کے لئے ترس رہا تھا اسی کیفیت میں میں نے بمبئی کے بیس روزہ قیام میں بدرجہ اتم موجود پائی۔ بمبئی کی کوئی تفریح گاہ اور قابل دید مقام ایسا نہ تھا جو میں نے بلا خوف و خطر اور بغیر کسی روک ٹوک نہ دیکھا ہو۔

ان دنوں بمبئی شہر میں پناہ گزینوں کے لئے کیمپ، مقامی مسافر خانوں میں قائم کر دیئے گئے تھے جن میں کئی لاکھ مہاجرین سٹیمروں اور جہازوں کے انتظار میں مہینوں سے ٹھہرے ہوئے تھے۔ کراچی جانے کے لئے مسافروں کے اوسطاً دو جہاز ہر ہفتہ یہاں سے روانہ ہوتے تھے اور ان جہازوں کے لئے ٹکٹ کا ملنا اسی قدر دشوار تھا جس طرح بلیک مارکیٹ کے بغیر لٹھا، ململ یا دیگر اشیائے خوردنی کا ملنا محال تھا۔ بعد جستجو اور تلاش کے بعد [illegible] جہاز سے سیکنڈ کلاس کا ایک ٹکٹ عام شرح سے پچیس روپے زیادہ ادا کرنے کے بعد دستیاب ہوا۔ [illegible] دسمبر جہاز کی روانگی کی تاریخ تھی۔ تاریخ مقررہ پر صبح دس بجے دوست احباب سے رخصت ہو کر مع سامان و اسباب جہاز میں سوار ہونے کی غرض سے بندرگاہ پہنچا۔ خلقت کا بے پناہ ہجوم تھا۔ بہ ہزار دقت [illegible] گھنٹوں کی کش مکش کے بعد جہاز پر سوار ہوا۔ تین قلیوں نے میرے ۲ ٹرنک

ایک سوٹ کیس، بستر اور دیگر متفرق اشیاء سیکنڈ کلاس کے ایک کیبن کے باہر عرشۂ جہاز پر رکھ دئے۔ عین اس وقت مجھے یاد آیا کہ میں بمبئی کی قیام گاہ پر اپنا حمائل شریف بھول آیا ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس حمائل شریف کو مجھے فوراً لانا چاہئے۔ چنانچہ سامان کو عرشۂ جہاز پر چھوڑ قلیوں کو سامان کی حفاظت کے لئے متعین کر کے اسی وقت جہاز سے نیچے اترا۔ جہاز کے ایک ملازم سے پوچھا کہ وقت روانگی کیا ہے۔ کہنے لگا "چار بجے"۔ میں نے سوچا کہ پھر تو میں بڑے مزے میں اپنا حمائل شریف لا سکتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے جہاز پر رکھے ہوئے سامان کا بھی خیال تھا۔ خیر، ایک تیز رفتار وکٹوریہ گاڑی میں سوار ہو کر بھنڈی بازار پہنچے اور اپنی قیام گاہ سے حمائل شریف لے کر الٹے پاؤں اسی وکٹوریہ گاڑی میں واپس بندرگاہ پہنچا۔ میری پریشانی کی کوئی حد اور انتہا نہ تھی جب میں نے دیکھا کہ جہاز کا لنگر اٹھ چکا ہے، اور جہاز ساحل سمندر سے تقریباً دو سو گز دور کشاں کشاں جانب کراچی چلا جا رہا ہے۔ مجھ پر یہ خیال دل میں پیدا ہوا کہ چھلانگ مار دوں اور جہاز کو پکڑ لوں لیکن فوراً ہی ہوش آ گیا اور ایسا کرنے سے باز رہا۔ ——— ساحل پر کھڑے ہوئے لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ میری آمد سے صرف ۵ منٹ قبل ہی جہاز روانہ ہوا ہے۔

پہنچتے ہی اور پہ باندھ کے اس منظر کو دیکھ کر میری عجیب حالت تھی۔ جہاز اور سامانی کے عالم میں سب سمندر پر جا رہی ہے۔ میں کس طرح گھنٹوں تڑپتا پھرتا رہا اور اپنی قسمت پر افسوس کرتا رہا کہ سوائے تن کے کپڑوں کے سب کچھ اس انتظار جہاز کی نذر ہو چکا ہے۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجا لاتا ہوں کہ اس قدر پریشانی کی حالت میں بھی میرے ہوش و حواس قائم رہے اور میں سمجھتا ہوں یہ برکت بغل میں دبے ہوئے حمائل شریف کی تھی۔ بغیر مزید وقت ضائع کئے میں جہاز ران کمپنی کے دفتر پہنچا اور اپنی تباہی کی مفصل داستان کمپنی کے انگریز افسران کے سامنے پیش کی۔ کمپنی کے جواں سال منیجر نے کمال ہمدردی کے ساتھ تمام ماجرا سنا اور مجھے تسلی و تشفی دی۔ فوراً ہی انھوں نے ایک مفصل تار کمپنی کی　　کے نام روانہ کر دیا۔ کہ

"بامورا جہاز کے کراچی پہنچنے پر میرا سامان اپنے قبضہ میں لے لیں۔ اور میرے کراچی پہنچنے پر مجھے دیدیں۔ اس تار میں میرے تمام سامان کی تفصیل اور اس کا محل وقوع بھی لکھوا دیا تاکہ سامان کو شناخت کرنے میں دشواری نہ ہو۔ منیجر صاحب کی اس امداد کو کافی سمجھ کر اپنی قیام گاہ پر نہایت غمگین حالت میں واپس چلا آیا۔

شب کو تنہائی میں جا بغیر بستر کے پلنگ پر لیٹے لیٹے جب دن بھر کے گذرے ہوئے واقعات پر غور کیا تو اس خیال نے الجھن میں ڈال دیا کہ "بامورا" جہاز کے کراچی پہنچنے سے پہلے ہی اگر کسی ذات شریف نے عرشۂ جہاز پر رکھے ہوئے تمام سامان کو غائب کر دیا تو پھر کیا ہوگا۔ جہاز کے کراچی پہنچنے پر کمپنی کے ملازمین تلاش کریں گے اور سامان نہ ملنے پر اس کی اطلاع بمبئی کے دفتر کو دے دیں گے۔ غرضیکہ تمام رات اسی قسم کی پریشانیوں میں گذر گئی اور اس خطرے کا کوئی حل سمجھ میں نہ آیا۔ صبح ہوتے ہی ایک مرتبہ پھر اسی جنرل منیجر کے پاس پہنچا اور ان کو اس خطرہ سے آگاہ کیا اور ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اگر کمپنی کی جانب سے ریڈیو کے ذریعہ ایک پیغام، (RADIO - GRAM) سمندر میں چلتے ہوئے "بامورا" جہاز کے کپتان کو بھیجا جائے کہ فلاں جگہ پر رکھے ہوئے سامان کو محفوظ کرا لو تو بہت مناسب ہوگا۔ چنانچہ میری پریشانی کو دیکھتے ہوئے منیجر صاحب نے ایک برقیہ ریڈیو کے ذریعہ جہاز کے کپتان کے نام ارسال کر دیا۔ اس تار کے چلے جانے کے بعد کچھ اطمینان نصیب ہوا۔ دل میں سوچا کہ مکمل اطمینان تو اسی وقت نصیب ہوگا جب کراچی پہنچ کر تمام سامان درست حالت میں مل جائے۔ بہرحال اسی وقت ایک مرتبہ پھر سیکنڈ کلاس کا ایک ٹکٹ "شیر الا" جہاز سے جانے کے لئے بلیک مارکیٹ سے خرید لیا۔ پہلا ٹکٹ واپس کرنے گیا تو پتہ چلا کہ کم از کم ایک ہفتہ ٹھہرنے کے بعد واپس ہو سکے گا۔ چنانچہ ٹکٹ کو بغیر واپس کئے اگلے روز تین بجے سہ پہر "شیر الا" جہاز پر سوار ہوا۔ بغیر بستر کے اور بغیر پہننے کے کپڑوں کے یہ سفر تمام عمر یاد رہے گا۔ جہاز کا تین روز کا سفر نہایت پریشانی کی حالت میں گذرا۔ تیسرے روز شام کو چار بجے جہاز کراچی کے قریب پہنچا۔ جہاز کے تمام مسافر کراچی کی فلک بوس عمارات کو دیکھ دیکھ کر فرطِ مسرت سے "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ ایک میں تھا کہ اپنی بے سر و سامانی اور خستہ حالی پر خون کے آنسو بہا رہا تھا۔ میں اپنے سامان کی طرف سے قطعی مایوس ہو چکا تھا اور مجھے یقین تھا کہ تمام کا تمام سامان یا تو راستہ میں جہاز کے مسافروں کی نذر ہو چکا ہے اور یا جہاز کے ملازمین اس سامان سے مستفید ہو رہے ہونگے۔ خدا کی شان دیکھئے۔ جہاز کنارہ پر لگا اور رنج و غم کے تمام بادل میرے سر سے کافور ہو گئے۔ چونکہ میں نے جہاز ران کمپنی کے ایک انگریز افسر کو "شیر الا" جہاز

کے کیپٹن سے یہ کہتے سنا کہ میرا سارا سامان معہ پھلوں کے ٹھیلے کے کمپنی کے گودام میں محفوظ ہے۔

ر۔ ع۔ بلگرامی!

یہ واقعہ میرے بچپن کا ہے اور مجھے آج بھی اس طرح یاد ہے گویا ابھی یہ واقعہ گذرا ہے۔ اس واقعہ کا تعلق میرے سابقہ وطن ہندوستان کے صوبہ بہار کے ایک قصبہ سے ہے۔

اس قصبہ میں مختلف قومیں آباد ہیں اور اثر و اقتدار کے لحاظ سے اوّل نمبر مسلمان اور دوم ہندو راجپوت ہیں۔ راجپوت قوم اپنی کینہ پروری میں نہایت شہرت یافتہ ہے ان کی کینہ پروری کا یہ عالم ہے کہ اپنے جذبۂ بغض میں یہ اپنوں کو بھی نہیں بخشتے جس طرح یہ دوسروں سے انتقام اور بدلا لیتے ہیں اسی طرح اپنے خاندان اور کنبے سے بھی انتقام لیتے ہیں اور اس جذبے کے تحت بعض اوقات ایسی حرکات مذبوحی کے مرتکب ہوتے ہیں کہ سن کر اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

قصبہ کے ایک معزز راجپوت بابو ٹھاکر سنگھ جو برخلاف اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں کے نہایت حلیم الطبع اور شریف ذہنیت کے انسان تھے۔ انھوں نے اپنے محلّے اور اپنے آبائی مکان کو چھوڑ کر قصبہ کے سرے پر ایک نیا مکان بنا کر سکونت اختیار کی اس حصّہ آبادی میں ہندوؤں کی ایک پست قوم آباد ہے۔ چونکہ بابو ٹھاکر سنگھ نہایت باخلوص انسان تھے لہٰذا وہ اس محلہ میں بہت بااثر ہوگئے اور ان کے گھر کا تمام کاروبار اسی قوم کے افراد کے ذمے تھا۔ تمام کھیتی باڑی اور دوسرے کام وہی لوگ انجام دیا کرتے تھے۔

بابو ٹھاکر سنگھ لاولد تھے اس لئے انھوں نے ایک اپنے رشتہ دار کے بچے کو گود لے لیا تھا۔ چنانچہ جب وہ سورگباش ہوتے تو اس بچہ کو اپنا جانشین قرار دیکر اپنی پوری زمینداری کا مالک کر دیا۔ جب تک بابو ٹھاکر سنگھ زندہ تھے۔ ان کے خاندان کے کسی دوسرے فرد کا چراغ ان کے سامنے نہ جل سکا اور ان کے اس اقتدار کی وجہ سے ان کے اور ان کے رشتہ داروں کے درمیان خاصی اچھی اعصابی جنگ رہا کرتی تھی۔ اب جب کہ وہ زندہ نہیں رہے تھے تو دوسرے فریقین کو اپنے پر پرزے نکالنے کا موقعہ ملا اور سب نے مل کر بابو ٹھاکر سنگھ کی بیوہ پر دھاوا بول دیا۔

بابو ٹھاکر سنگھ کے چچازاد بھائیوں نے جائداد کے بٹوارے کا مقدمہ دائر کر دیا۔ بیوہ اور اس کے پالک بچہ بابو بچو سنگھ کو جائداد سے بے دخل کرنے کی تگ و تاز شروع کی مگر سوء اتفاق سے وہ تمام اپنی کوششوں میں ناکام رہے جس کے نتیجہ میں دشمنی نے نفرت انگیز صورت اختیار کر لی اور شر پسند عناصر نے آتش بغض و حسد کو ہوا دے کر خوب بھڑکایا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ اوچھی حرکات پر اتر آئے اور آئے دن یہ خبریں سنی جانے لگیں کہ آج بابو ٹھاکر سنگھ کے دھان کٹ گئے۔ آج باغ میں سے ایک درخت لاپتہ ہے آج کھلیان میں سے کسی نے غلہ غائب کر دیا۔

یہاں تک کہ ایک روز رات کو شور و غل سے آنکھ کھلی۔ تو معلوم ہوا کہ بابو ٹھاکر سنگھ کے کھلیان کو کسی نے آگ لگا دی اس وقت کھلیان میں اندازاً ایک ہزار من دھان ہوگا۔ اس واقعہ سے قصبہ میں کافی سنسنی پھیلی۔ ہمارے بزرگوں کے پاس بیوہ کی طرف سے فریاد پہنچی معززین اکٹھے کئے گئے اور مشکوک لوگوں پر مجموعی جرمانہ کیا گیا۔ مگر ایسی ایسی تنبیہیں بھلا ایسے مجرم سرشت افراد کی کب اصلاح کرتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک صبح کو خبر آئی کہ بابو ٹھاکر سنگھ کے اصطبل میں سے دو بیل غائب کر دیئے گئے۔

چونکہ تمام واقعات ایک ترتیب سے وقوع پذیر ہو رہے تھے اور نقصان کا زیادہ اندیشہ ہوتا جا رہا تھا لہٰذا اس واقعہ کی اطلاع بیوہ کی طرف سے سب ڈویژنل آفیسر کو کی گئی۔ چنانچہ ایس۔ ڈی۔ او کی طرف سے اس مقدمہ کی تحقیقات کے لئے ایک ٹریبونل مقرر کیا گیا۔ اس ٹریبونل کے خان بہادر رفوف بلگرامی مرحوم اور راجہ تربھون پرشاد دو ممبر تھے۔ چنانچہ ٹریبونل علاقے کے پولیس انسپکٹر کی معیت میں ایک روز جائے وقوع کے معائنہ اور گواہوں کے بیانات لینے کے لئے قصبہ میں پہنچا۔

اس قصبہ سے باہر ایک میل کے فصل پر پنڈت نند کمار دوبے کا بہت نفیس باغ ہے۔ چنانچہ خان بہادر صاحب نے اسی باغ میں قیام کیا اور پولیس کے آدمیوں کو قصبہ میں بھیجکر اطلاع کرائی کہ حاضر ہوں۔

غالباً فروری کے مہینہ میں یہ واقعہ ہوا۔ اس دن موسم نہایت خوشگوار تھا ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ آفتاب مغرب کی طرف جھک رہا تھا

درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا اس شام کے لئے کچھ خاص اہتمام کئے گئے ہیں۔ ہم سب چھوٹے چھوٹے بچے مولوی محمد جان صاحب کے پاس پڑھ رہے تھے اور مولوی صاحب ہم سے تقاضہ کر رہے تھے کہ سبق جلدی یاد کر لو تو ہم سب بھی تماشہ دیکھنے چلیں گے۔ ہمارے یہاں کے بزرگ پہلے جا چکے تھے اور بستی کے لوگ جوق در جوق دوبے کے باغ کی طرف چلے جا رہے تھے۔

اسی اثنا میں صاف و شفاف آسمان پر یکایک ایک ٹکڑا ابر نمودار ہوا۔ اس ابر کے ٹکڑے کی رنگت عجیب و غریب تھی۔ ہمارے مولوی صاحب نجوم کے بڑے ماہر تھے۔ انھوں نے جب بادل کو بڑھتے ہوئے دیکھا تو فوراً کہا خدا خیر کرے اس بادل کا رنگ ٹھیک نہیں ہے۔ بادل کا یہ ٹکڑا بہت تیزی کے ساتھ دوبے کے باغ کی طرف جا رہا تھا۔ مولوی صاحب اور ہم سب ایک محویت کے عالم میں اس کو دیکھ رہے تھے۔

یکایک فضا میں ایک مہیب گرج اور دہشت ناک چمک پیدا ہوئی۔ یہ ایسی گرج اور تڑپ تھی کہ ہم سب ہیبت کی وجہ سے اپنے بستوں پر اوندھے گر گئے اور کئی منٹ تک ہمیں پتہ نہیں چلا کہ کیا ہو رہا ہے اور جب کچھ وقفہ کے بعد آنکھ کھولی تو فضا میں تیز بارود کی بدبو پھیلی ہوئی تھی اور مطلع سخت غبار آلود ہو رہا تھا۔ بستی کے لوگ بھاگے جا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ دوبے کے باغ میں بجلی گری ہے۔

مولوی صاحب نے ہم سب کو چھٹی دے دی اور وہ بھی باغ کی طرف تیزی سے روانہ ہو گئے ——— باغ میں کیا ہوا اس کی تفصیل مولوی صاحب نے ہم کو بتائی۔

باغ کے باہر ایک بہت بڑا برگد کا درخت ہے اس درخت کے نیچے ہی چارپائیاں ڈال دی گئیں جن پر ٹریبونل کے ممبران پولیس کا عملہ اور دوسرے معززین بیٹھ گئے اور باقی لوگ زمین پر بیٹھ گئے۔ درخت کے ایک طرف کئی ٹمٹمیں کھڑی تھیں اور ان کے گھوڑے کھونٹے سے باندھ دئے گئے تھے جو دانہ وغیرہ کھا رہے تھے۔

جب سب لوگ آ گئے تو خان بہادر صاحب نے جو اس ٹریبونل کے چیف تھے، گواہوں کے بیانات شروع کرائے۔ ابھی کارروائی کی ابتدا ہی ہوئی تھی کہ ابر نمودار ہوا اور کچھ ترشح ہونے لگا۔ یہ دیکھ کر خان بہادر صاحب نے فرمایا کہ بارش آ رہی ہے۔ ہم لوگ باغ میں چلے چلیں۔ چنانچہ صرف ٹریبونل کے ممبران اور افسرانِ پولیس اور دو ایک معززین قصبہ باغ میں مالی کے مکان کے اندر چلے گئے۔ باقی تمام لوگ اسی درخت کے نیچے رہے اور چونکہ افسران چلے گئے تھے اس لئے ان لوگوں کو آپس میں تبادلۂ خیال کرنے کا موقعہ مل گیا۔ چنانچہ وہ لوگ جو اس مقدمہ کے رُکن رواں اور اصل مجرم تھے انھوں نے اپنے گواہان کو سبق پڑھانا شروع کیا۔

مگر یہ حالت بہت دیر تک قائم نہیں رہ سکی۔ بس اتنا ہی ہوا کہ افسرانِ مالی کے مکان میں داخل ہو گئے۔ شاید پانچ یا چھ منٹ کا ہی توقف ہوا ہوگا کہ اس ابر میں سے ایک کڑکا پیدا ہوا۔ اس کڑاکے کی دہشت سے گھوڑوں نے کھونٹے اکھاڑ لئے اور ٹمٹمیں اُلٹ گئیں اور جو لوگ کھڑے ہوئے تھے وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ پھر بجلی کی لپک ظاہر ہوئی اور اس نے بڑے مجمع کو جو تقریباً ڈھائی تین ہزار کا ہوگا اپنے گھیرے میں لے لیا۔

جو حضرات کے مالی کے مکان میں تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ بجلی ہمارے مجمع پر کئی مرتبہ پھری کئی چکر کاٹے اور اس کے بعد فضا میں بلند ہوئی اور بس بڑ کے درخت سے کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے سے ایک مہوے کے درخت پر گری اور اس کے تنے کو دو حصوں میں چیرتی ہوئی زمین کے اندر غائب ہو گئی وہ۔ بجلی درخت آج بھی موجود ہے جو لوگ درخت کے نیچے نہیں تھے۔ وہ بھی بہت دیر تک بالکل محوِ حیرت بنے رہے اور یا اُن کے حواس مختل ہو گئے تھے اور جب ان لوگوں کے حواس مجتمع ہوئے تو تمام کے تمام اُس بیہوش مجمع کی طرف دوڑے۔ وہاں پہنچ کر ان لوگوں نے دیکھا کہ اس تمام مجمع میں سے کل سات آدمی ایسے ہیں جن پر بجلی کا اثر ہوا ہے اُن سات آدمیوں سے دو آدمی جو بابو ٹھاکر سنگھ کے چچا زاد بھائی تھے ان کو تو بجلی نے قطعی جلا کر ختم کر دیا تھا۔ ان کی صورتیں ہیبت ناک حد تک مسخ ہو گئی تھیں اور ایک قریبی رشتہ دار قدرے سسک رہا تھا جو گھر تک آتے آتے ختم ہو گیا اور بقیہ چار آدمی ایسے تھے جن کے بعض عضو جسم جھلسے ہوئے تھے ان چار زخمیوں میں سے آج بھی ایک زندہ ہے۔

ان چار زخمیوں کی یہ حالت رہی کہ مہینوں بیمار رہے اور ان کے جسم میں بارود کی بو اس قدر سرایت کر گئی تھی کہ وہ اچھے ہونے پر بھی کسی کے پاس بیٹھ نہیں سکتے تھے اور ان کی اس حالت سے لوگ ان سے نفرت کرنے لگے تھے،

الغرض جب آفیسران نے یہ سب حالتیں دیکھیں تو خان بہادر سید اولاد حیدر فوق بلگرامی نے فرمایا کہ ہم جس کام کو آئے تھے وہ ہوگیا۔ منتقم حقیقی نے اپنا فیصلہ صادر فرما دیا۔ اب مزید کسی تحقیق کی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنی رپورٹ میں بھی یہی لکھا اور مجرمین کی تفصیل میں یہ ثابت کیا کہ جس درجہ سے بجلی نے مجرموں کے ساتھ سلوک کیا وہ اتنے ہی کم یا زیادہ اس مقدمہ سے متعلق تھے۔ جتنا جس کا جرم ہلکا تھا اتنی ہی ہلکی اس کو سزا بھگتنی پڑی۔

اس حیرتناک واقعہ کا اثر بہت دیر پا ہوا اور بڑے بڑے عادی مجرموں نے کچھ عرصہ کے لئے توبہ کر لی اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بابو ٹھاکر سنگھ کی بیوہ آرام و چین سے رہ لگیں۔ دوسرے ہی دن اُن کے بیل مل گئے اور لوگوں پر حق باطل کا اظہار ہوگیا۔

یہ ہے وہ واقعہ جسے باوجود ایک طویل عرصہ گذر جانے کے آج میں نہیں بھول سکا ہوں آپ ہی کہیں کہ میں اسے کیسے بھولوں!

●

مومن دہلوی

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشارتوں ہی میں گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم
گلۂ ملامت اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا ایک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو



لکھنے والے

ظفر قریشی

ممتاز مفتی

حسن محمود عروج

دماغ کی دوا

ظفر قریشی، بی اے

—— یہ سن کر [illegible] کی [illegible] آنکھوں میں ایک برقی بلب کی تیز روشنی جھلکنے لگی۔ [illegible] صاحب کوئی وجہ نہیں ہے کہ انسان دوا کی مدد [illegible]

—— [illegible] میرا مطلب ہے اعلیٰ ذہانت۔ —— یہ کیسے ہو سکتا ہے [illegible] نہیں کر سکتے۔

[illegible] انسان کی دماغی صلاحیتیں [illegible] ایک مسئلہ تھا [illegible] دماغ کسی طرح حل نہ کر سکتا تھا۔ مگر پھر بھی اس نے [illegible]

[illegible] مطلب [illegible] کوئی [illegible] یا اعلیٰ ذہنی [illegible] آپ کی دوا [illegible] میں ایک [illegible] کہ وہ بارہ [illegible] میری [illegible] (GENIUS) تو بنایا جا سکتا [illegible]

—— تو کیا آپ کی دماغ ساز دوا مجھے [illegible] سکتی ہے؟

[illegible] نے مسکرا کر کہا۔ میرا خیال صحیح نکلا۔ مجھے [illegible] خیال آیا تھا کہ آپ [illegible] ہوں گے [illegible] جواب عرض کرتا ہوں۔ مجھے کبھی اس نظریہ کے ماننے [illegible] میں [illegible] کا جسم [illegible] ہے۔ اسے مضبوط اور قوی [illegible] ہے [illegible] انسان کے دماغ کو بھی توانا بنایا جا سکتا ہے۔ جس طرح انسان [illegible] جسم [illegible] پیدا [illegible] کے خانوں میں [illegible] ہے۔ اسے بھی بڑھایا اور طاقتور بنایا جا سکتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے [illegible] تک [illegible] مناسب علاج [illegible] سے مضبوط اور [illegible] بنایا جا سکتا ہے تو اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ انسان کی [illegible] وہ لڑکی [illegible] میری لڑکی کو [illegible] دیکھ لیجئے [illegible] سے سولہ سال پہلے جب اس کی عمر ایک سال کی تھی اور [illegible] جواب دے دیا تھا [illegible] کوئی امید [illegible] ڈاکٹر [illegible] اس کا علاج خود [illegible] لیا۔ وہ اب وہ ایک صحیح الاعضاء [illegible] اور ذہین لڑکی ہے [illegible] نہیں؟

[illegible] نے پروفیسر کی لڑکی کی طرف ایک مرتبہ [illegible] سے قبل اس نے اس لڑکی کو پروفیسر کے ساتھ کلفٹن کے ساحل پر سیر کرتے دیکھا تھا اور [illegible] گفتگو شروع ہو گئی تھی [illegible] ملاقات [illegible] ہو گئی۔ بعد وہ رخصت ہو گئے [illegible] پروفیسر [illegible] پتہ کے مطابق اس سے یہاں ملنے آیا تھا۔ اسے [illegible] معلوم تھا کہ وہ فلسفی اور کیمیادان تھا۔ شہر کے لوگ [illegible] دماغ کی [illegible] کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں بیان کرتے ہیں مثلاً یہ کہ بعض [illegible] ذہن [illegible] ہو جاتی ہے کہ لوگ اسے احمق اور خبطی [illegible] سمجھتے ہیں۔ مگر خود پروفیسر کا یہ خیال ہے کہ خبط [illegible] اور فطانت میں فاصلہ بہت ہی کم ہوتا ہے۔ وہ [illegible] ایک یونیورسٹی میں پروفیسر تھا مگر اسے [illegible] ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا کیونکہ وہ طلبہ کے ذہنوں سے کھیلا کرتا تھا اور خوفناک تجربات کیا کرتا تھا۔ اس لئے کوئی [illegible] استاد کو اپنے طلبہ پر تجربے کرنے کی اجازت نہ دے سکتی تھی۔ آج کل وہ کراچی میں گمنام زندگی بسر کر رہا تھا۔

[illegible] صاحب کا مقصد پروفیسر کے پاس آنے کا خواہ تحت الشعوری طور پر پروفیسر کی لڑکی [illegible] کو دوبارہ دیکھنا ہو یا [illegible] کہ وہ اپنے آپ کو [illegible] کی کوشش کر رہا تھا) [illegible] مسئلہ پر گفتگو کرنا۔ مگر واقعہ یہ ہے وہ اس وقت بالکل خالی الذہن تھا۔ یہاں پہنچ کر اسے محسوس ہوا کہ [illegible] رہے ہیں۔

دکھائی دیتا ہے۔ یہ [illegible] کا کام ہے بلکہ صرف آئینہ ہے ایک بوڑھا پروفیسر ہے جس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ہلکے ہرے رنگ کی شیشی ہے اور یہ پروفیسر [illegible] کہ اس دوا کی مدد سے انسان خواہ وہ کتنا ہی غبی اور کوڑھ مغز ہو اعلیٰ درجہ کا ذہنی جن بنایا جا سکتا ہے۔ سردار حق نواز خاں جیسے ذہین ہونے کے لئے [illegible] عجیب معمہ بن گیا تھا۔

مگر دلچسپی باقی تھی۔ کہنے لگا: پروفیسر صاحب آپ نے جو بات اس وقت کہی ہے میرے دل کو لگ گئی ہے۔ میں خود ایسے طریقوں کی تلاش میں تھا جو دنیا میں مجھے ایک ایسا آدمی بنا دے۔ میں ایک معمولی دماغ کا آدمی ہوں۔ [illegible] ایک کھوپڑی ہے اور اس میں کوئی [illegible] میں نے کئی بار سوچا کہ اس دنیا میں بڑا آدمی بن جاؤں۔ ایک نام تاریخ عالم کے کسی صفحہ پر چھوڑ جاؤں۔ اگر میرا وطن دنیا میں مشہور ہو جائے ——— آپ کو معلوم ہے کہ میرا وطن [illegible] سرحد میں اس قصبہ کو اون کی تجارت کی وجہ سے جو نام [illegible] ——— [illegible] آپ [illegible] مجھے بھی کچھ دلچسپی ہو گئی ہے۔ آغا پور ایک معمولی سا قصبہ ہے۔ وہاں کے لوگوں کو علم، ادب یا سیاست وغیرہ سے کوئی شغف نہیں ہے زیادہ تر [illegible] کے لوگ بھیڑیں پالتے ہیں اور اون کی تجارت کرتے ہیں۔ میں خود بھی یہ کاروبار کرتا ہوں [illegible] اون کا ٹھیکیدار [illegible] ——— مگر صرف اتنا ہی [illegible] دوست [illegible] حاصل کروں [illegible] وطن آغا پور کا نام چار دانگ عالم میں مشہور کر دوں۔

پروفیسر نے [illegible] صندوقچی میں سے شربت کا ایک [illegible] سردار صاحب [illegible] پیش کیا۔ دونوں نے [illegible] باتیں [illegible] ہو گئیں۔

سردار صاحب [illegible] آپ [illegible] قائد اعظم [illegible] نام [illegible] نکال دیجئے [illegible] قسم کا کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتی [illegible] اس طرح [illegible] جڑی بوٹیوں وغیرہ سے تانبے کو سونا بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح [illegible] نہیں ہوں کہ کوئی دماغی دوا [illegible] اقبال [illegible] کر سکتی ہے [illegible] میری دوا [illegible] کر سکتی ہے کہ [illegible] دماغی صلاحیتوں کو [illegible] حالات [illegible] آپ کی خود [illegible] ہر [illegible] آپ کا یہ کام [illegible] کام [illegible] آپ دنیا میں مشہور ہونا چاہتے ہیں [illegible] کے طالب ہیں فرض کیجئے کہ [illegible] سیاسی [illegible] ——— ———

[illegible] جی بالکل [illegible] میرا ہمیشہ یہ خیال [illegible] اگر خدا مجھے [illegible] تو دوسرا قائد اعظم بن جاتا

آپ کا خیال کسی حد تک صحیح ہے مگر ہر شخص محض دماغی صلاحیتوں کی وجہ سے قائد اعظم نہیں بن سکتا اس کے لئے [illegible] ہر شخص [illegible] قائد اعظم بننے کی کوشش کرے [illegible] ضرور ہے کہ [illegible] ہو تو بڑا [illegible] لیڈر بن سکتا ہے [illegible] تکلم کی شستگی [illegible] ضروری اجزا ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایک دو [illegible] بڑے مدبر اور سیاست دان [illegible] مثلاً قائد اعظم کی سی صفات [illegible] کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نہیں۔ اگر کوئی ایسا کہے تو [illegible] وہ جھوٹا ہے [illegible] کا احمق ہے ——— میری دوا کی صفات [illegible] یہ ضرور ہے کہ یہ دوا [illegible] پیدا کر سکتی ہے [illegible] مدد دوں کو [illegible] پردوں میں پوشیدہ ہوتا ہے [illegible] جب تک چھیڑا نہ جائے آہنگ پیدا نہیں ہوتا۔ یہ دوا یہ کام کر سکتی ہے اور آپ [illegible] ———

——— جی بالکل صحیح ہے [illegible] ——— [illegible] سردار حق نواز خاں کی بے صبری [illegible] کا انتظار نہ کر سکتی تھی۔

[illegible] سردار صاحب اصل مقصد یہ ہے کہ دوا استعمال کرنا بالکل معمولی بات ہے۔ مگر [illegible] ایک قسم کا ذہنی جوش کون چاہیئے۔ اس کا سنبھالنا ایک کام ہے۔ دوا دینے کے بعد جس طرح نرس یا ڈاکٹر [illegible] ہونا اچھا ہوتا ہے۔ اسی طرح [illegible] اپنے مریض کے پاس رہوں تو اس ذہنی تحریک کو سنبھال سکتا ہوں۔ اگر آپ دنیا میں ایک [illegible] سیاست دان بننا چاہتے ہیں تو اپنی دماغی صلاحیتوں [illegible] اپنے ساتھ [illegible]

میرے سپرد کر دیجئے۔ میں سایہ کی طرح آپ کی نگرانی کروں گا اور دنیا میں وہی بنا دوں گا جو آپ اب تک محض ایک دھندلی اور چھپی ہوئی خواہش سمجھتے رہے ہیں۔ مگر آپ کو ٹھیک اسی طرح چلنا پڑے گا جس طرح میں کہوں گا ورنہ کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوگا۔"

یہ کہہ کر پروفیسر نے لیمپ کی روشنی میں بیٹھ کر ذہنی دیو بنانے والی دوا کی ایک جھلک سردار صاحب کو دکھائی۔

شیشی کا رنگ ہرا اور دوا کا رنگ ہلکا سنہری تھا۔ بالکل ویسا ہی جیسا بعض بھیڑوں کے اون کا ہوتا ہے۔

(۲)

سردار حق نواز خاں صاحب جب دارو ئے دماغ کی شیشی کوٹ کی اندر کی جیب میں رکھ کر کمرے سے باہر چلے گئے تو پروفیسر نے اپنی لڑکی انیسہ کی طرف دیکھا۔ پروفیسر سوچ رہا تھا انیسہ کو اس سیدھے سادے نوجوان سے دلچسپی ضرور پیدا ہوگئی ہے اور اس کے سمجھنے کے لئے کسی لمبی چوڑی دلیل کی ضرورت نہیں تھی۔ سردار ایک صاف گو سیدھا سادا نوجوان ہے۔ اس سادہ مزاجی اور خلوص طبیعت سے زیادہ جس چیز نے انیسہ کے شیشۂ دل پر چوٹ ماری ہے وہ اس شخص کی جسمانی توانائی، سرخ و سپید چہرہ، مضبوط جثہ، خوبصورت چوڑے چوڑے کندھے اور توانا سینہ ——— اس سے قبل انیسہ کو جن چند لڑکوں سے خصوصیت کے ساتھ ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ سب پروفیسر کے شاگرد، تعلیم یافتہ لڑکے جن میں سے بہت کم جسمانی کشش کا ایسا نمونہ تھے جیسا سردار حق نواز خاں ——— مقابلۃً اس چیز نے کمزور جسم والے انسان پر زیادہ اثر ۔۔۔ پروفیسر کو ملتفت کیا۔ بالواسطہ سردار کے جسمانی مطالعہ کا مسئلہ عضویات کے ماہرین کا کام ہے نہ کہ نفسی ماہر کا ——— ان کا بس ایک ہی خیال تھا اور وہ اسے سردار حق نواز خاں کو ایک نمونہ بنانا تھا، وہ اعلیٰ ذہن کردار کی صورت میں تبدیل کر دے ——— اگر انیسہ کو موقعہ دیا جائے تو وہ سردار کے ساتھ شادی ظاہر کر سکتی ہے۔"

"بتاؤ انیسہ! ... کی تائید حاصل کرنے کے لئے پروفیسر نے انیسہ کی طرف دیکھا اور پھر پوچھا، تمہارے خیال میں یہ لڑکا کیسا ہے؟"

انیسہ کے چہرے پر تیرگی سی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سوال نے شمع کی لو تیز کر دی ہے اور سارا کمرہ ایک دم نور ہی نور ہو گیا ہے۔

سوال کے جواب کا کس قدر بے چینی کے ساتھ انتظار تھا۔

"... پتہ نہیں ——— سنا ہے سرحد کے لوگ بہت ہی غصیلے اور چڑچڑے اور شکی ہوتے ہیں۔"

"سنا تو میں نے بھی ایسا ہے مگر سب پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس بات کی تائید اگر کی جائے تو اس کے ساتھ یہ بھی پس منظر ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اس خطہ کے باتیاتی اور جغرافیائی عوامل ——— ۔"

باتوں کو انیسہ کے ریشمی دماغ نے ایک خلاف معمول حمد کا آغاز کچھ کر بات کاٹنے کے لئے کہا۔

"... صاحب کے بارے میں تو ہمیں ... متعلق کچھ علم نہیں۔ مجھے ویسے تو ———"

"——— ویسے تو بالکل ٹھیک، میرا مطلب ہے نارمل قسم کا کم استعداد آدمی معلوم ہوتا ہے۔ دولت مند بھی ہے۔ میں ایسے آدمیوں کو ... کہتا ہوں۔ محض تفریحاً نہیں بلکہ واقعتاً۔ لوگ ان دونوں صنعتوں کا مظہر ہوتے ہیں۔ میں نے ابتک اس شخص کا جو مطالعہ کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سردار ایک معمولی منشی کی دماغی صلاحیت سے زیادہ کا مالک نہیں ہے۔ ثروت اور جسمانی برتری کے علاوہ اس کی شخصیت کا کوئی قابل ذکر نکتہ نہیں ہے ... ہے۔ اس کے خواب میں بھیڑوں کے گلے، چراگاہیں اور اون کے ڈھیر ہی ڈھیر نظر آتے ہوں گے۔ ہمیں اب کرنا یہ ہے کہ اس کے ذہنی کینوس پر جو تصویریں کھنچی ہیں انھیں مٹا کر نئے نقوش اجاگر کئے جائیں۔ یہ بات تو میں تمہیں پہلے بتا ہی چکا ہوں کہ دماغ ایک آلہ اخذ و نفاذ ہے۔ اس پر روشنی اور آواز کی لہریں ایک عمل کے ساتھ اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ نہ صرف روشنی اور آواز بلکہ دوسرے انسان یا انسانوں کی قوت ارادی بھی دوسرے انسان کے دماغ سے آنکھ مچولی کھیل سکتی ہے ——— اسے ہی لوگ تعلیم کا نام دیتے ہیں ——— انسان کا دماغ ایک سلیٹ کی مانند ہے اور جو جانتا ہے وہ اپنی قوت ارادی کے نوک قلم سے اس پر نقش و نگار بناتا چلا جاتا ہے مثلاً اگر میں چاہوں تو یہ آپ کے سردار صاحب ابھی ابھی تصورات کے گہوارے میں جھکنا شروع کر دیں۔ ابھی اس کے سامنے ایسے ایسے دروازے کھلنے شروع ہو جائیں کہ اس سے قبل کبھی نہ کھلے ہوں۔ نئی نئی دنیاؤں کے دروازے، ایسے ایسے الفاظ اس کے دماغ میں گونجنے شروع ہو جائیں کہ کبھی اس کے نطق نے ادا نہ کئے ہوں۔ جو شخص کبھی ش، ق کے صحیح تلفظ سے آشنا نہ ہو۔ وہ تحت الشعور، ماورا النفسی، انتقادات عالیہ اور تقابل متجانس جیسے الفاظ بے تکان بولنے لگے گا اور پھر نظریۂ اضافیت ...

اور قدم اور تہذیب معنوی کا مطلب بھی لوگوں کو بولنے لگے گا۔ ان باتوں کو دیکھ کر اور حق نواز کو لوگ کہیں گے کہ یہ شخص تو بالکل ہی بدل گیا ہے۔ کیا یہ وہی حق نواز خان ہے جو اونٹ کے سوا کسی اور چیز کو جانتا تک نہ تھا ـــــــ ہو سکتا ہے کہ کچھ دنوں میں وہ اونٹوں اور بھیڑوں کو بھول کر کسی اور ہی دنیا کی باتیں کرنے لگے ـــــــ
بہر حال یہ شخص میرے اور تمہارے لئے ایک دل چسپ کیس ضرور ہے اور میں چاہتا ہوں اس کے دماغ کی دوشیزہ زمین پر کچھ نئے بیج بکھیر دوں اور پھر دیکھوں کہ کیسے کیسے لالہ و گل نمودار ہوتے ہیں ـــــــ میں چاہتا ہوں کہ میری پیاری بیٹی ان گلابوں کے سایہ میں کچھ سکھ اٹھائے ـــــــ کیوں کیا خیال ہے؟"

انیسہ کی دل چسپی بڑھ چکی تھی اور اس نے اپنی ذہانت کے نور سے چمکتا ہوا چہرہ پروفیسر کی سنہری داڑھی کی طرف پھیرتے ہوئے کہا ـــــــ "ابا جان آپ نے اس بات کا مجھ سے کئی بار ذکر کیا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو لوگوں کی ذہنی کایا کلپ کر سکتے ہیں۔ انھیں دانشور و طباع بنا سکتے ہیں۔ مگر کیا آپ کو خود بھی اپنے الفاظ پر بھروسہ ہے یا یہ محض ایک تصور ہی تصور ہے؟"

اس تیکھے سوال نے پروفیسر کے اپّا کو ذرا چھیڑ دیا اور وہ جھلّا کر بولا "کیوں نہیں؟" مگر کوئی اور آدمی اس وقت موجود ہوتا تو اسے پروفیسر کے چہرہ سے معلوم ہو جاتا کہ الفاظ کے اس دھماکہ میں یقین کی کمی کا مدھم سُر بھی شامل تھا۔ ایک چھپا ہوا تذبذب جسے انیسہ نہیں بھانپ سکتی تھی۔

"انیسہ بات یہ ہے کہ دنیا میں بعض دوائیں اس قسم کی ضرور موجود ہیں جو انسان کو دماغی ساحر بنا سکتی ہیں۔ مثلاً افیون کو ہی لے لو۔ جو شخص افیون کھا لیتا ہے وہ اپنے آپ کو بادشاہ وقت سمجھنے لگتا ہے اور اس نے اپنے ذہن میں جو سلطنت بنالی ہے اُسے بالکل حقیقت سمجھتا ہے۔ سوتے وقت وہ ایسی ایسی باتوں کو حقیقی سمجھتا ہے کہ بیداری میں اس کو کبھی بھی باور نہیں کر سکتا۔"

"اب ہمارا کام یہ ہے کہ اس فریب تصور کو دائم و قائم کر دیں یعنی مستقل اور پکا بنا دیں۔ اگر یہ ممکن ہو جائے تو وہ شخص فطین GENIUS ہو سکتا ہے۔ مثلاً انسان نے شیشہ پر اپنا عکس دیکھا۔ یہ عارضی جھلک تھی جب اُسے دواؤں اور بعض طریقوں سے مکمل و مستقل کر لیا گیا تو عکاسی کا فن ایجاد میں آ گیا۔ ناپائیدار مرئی جھلک مستقل نقش بن گئی۔ جو پتھر کی لکیر کی ہی طرح پائیدار ہے ـــــــ ہماری دوا بھی انسان کے دماغ میں طرح طرح کی ناپائیدار تصویریں اُبھار سکتی ہے۔ دماغ میں نئے نئے جزیرے تیرنے لگتے ہیں۔ اب ہمارا یعنی محقق و منقش کا کام یہ ہے کہ اس عارضی کیفیت کو دائمی اور پائیدار نقوش میں منتقل کر دیں۔ انسان کی قوت اس حد تک آگے بڑھ گئی تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اگر ایسا کرنا بڑے پیمانہ پر ممکن ہو گیا تو انسانیت بلکہ سارے موجودات کی نوعیت ہی بدل جائے گی۔ تمام ہی پلٹ جائے گا۔ بچپن کے بعد سے تو میں بالخصوص اس بات پر غور کر رہا ہوں اور میں نے ایک کالج میں اپنے تجربے بھی شروع کئے تھے۔ مگر یہاں بھی نااہل، کم حوصلہ لوگوں نے میرے تجربوں کا مذاق اڑایا اور یہاں تک کہا کہ یہ تعلیم دینے کے فن سے نابلد ہے ـــــــ خیر ـــــــ یہ قصہ تو دوسرا ہے۔ میں تو اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ اگر دنیا میں انسان کے تصوروں کی دنیا کو پائیدار کر دیا جائے تو بہت سے اعلیٰ درجہ کے فطین و ذہین انسان اس نامکمل دنیا کو میسر آ سکتے ہیں اور اس دکھی دنیا کے مسائل کو حل کرنے میں دوسرے اور تیسرے درجہ ذہنی کے جو لوگ لگے ہوئے ہیں ان سے نجات مل جائے گی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم جسم بنانے کے لئے اکھاڑے، دنگل اور جمناسٹک کلب قائم کرتے ہیں۔ مگر ذہن کی و رزش اور دماغی نشو و نما کے مراکز قائم نہیں کرتے۔ جس طرح پٹھیاں، خون اور گوشت بدن میں پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح تصور، وجدان اور تہیج نفسی کو بھی مستقل و پائیدار، ہمہ گیر اور دائمی بنایا جا سکتا ہے۔ میری بیٹی! واقعہ یہ ہے کہ لوگ ابھی تک اس انقلاب آفریں بات کی طرف پوری سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہی نہیں ہوئے ہیں۔ میں تو ساری عمر اس خواب کو دیکھتا رہا ہوں۔"

"ابا جان آپ کا خیال ہے کہ یہ خواب تعبیر صحیح ہے؟"

"مجھے اس کے منطقی اور صحیح ہونے میں تو کبھی شبہ ہی نہیں ہوا تھا۔ البتہ تجربہ ہمیشہ اُدھورا رہ گیا۔ مگر اس دفعہ میں اپنی کوشش کو بالکل مکمل نتیجہ پر پہونچا کر ہی دم لوں گا۔"

"یعنی کیا؟"

"یعنی یہ کہ آپ کے سردار حق نواز خاں جو ہیں نا، میرے تجربہ کے لئے نہایت ہی موزوں واقع ہیں۔ چنانچہ میں اب اس کے حواس پر سوار ہو چکا ہوں اور میں اپنی قوت ارادی سے اس پر اثر انداز ہی شروع کر رہا ہوں۔ اب اسے یہ خواب دکھائی دیں گے کہ وہ یہ ہو گیا ہے اور وہ ہو گیا ہے۔ وہ سوچنے لگے گا کہ میں ہمیشہ ہی ایک گمنام تاجر

نہیں رہ سکتا۔ آغا پور کی بستی سے کبھی دنیا کی تاریخ میں کوئی شخص پیدا نہ ہوا۔ نہیں ہوا اس لئے میں وہ پہلا شخص بننا چاہتا ہوں۔ اسے سیاسی لیڈر بننے کا شوق ہے۔ میں اسے [illegible] کچھ نہیں تو اس ملک کی وزارت کا رکن تو بنوا ہی دوں گا۔

انیس نے ایک ہلکی سی سرد آہ کھینچی جس سے سوائے شک کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا تھا۔

(۳)

پیٹ بھرے کو دور کی سوجھتی ہے۔ بھرا ہوا پیٹ اور وہ بھی تیتر کے کباب اور مچھلی کا قورمہ۔ شاہی فیرنی کے نیم سیال لقموں سے اٹا ہوا معدہ۔ اگر ابخرات نہ پیدا کرتا تو کیا کرتا۔ یہ ابخرات معدہ سے دماغ کی طرف صعود کرنے لگے۔ وہ دماغ جسے قدرت نے آغا پور کے تاجر پیشہ سردار حق نواز خاں کی کھوپڑی میں رکھ دیا تھا۔ گرانڈ ہوٹل کا صاف شفاف کمرہ جس کے دریچہ میں سے سمندر کی ترنگ جھک جھک اندر گھسی چلی آ رہی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر سردار صاحب نے ایک موٹا سا نشہ انگیز سگار سلگایا اور آرام کرسی پر دراز ہو کر موجوں کی بے ثباتی اور پروفیسر کی لڑکی کے حسن پر غور کرنے لگے۔ تصورات نے ہجوم کرنا شروع کیا۔ دل ہی دل میں سوچا۔ یہ بڈھا ہے بڑا مذاقیہ۔ کیسے لطف کی باتیں کرتا ہے اور ہمیں بناتا ہے۔ ارے میاں بیسے، تو تو ہم بھی نہیں ہیں کہ دوا کے زور سے قائد اعظم بن جانے کو سچ مان لیں۔ قائد اعظم تو کجا، کوئی چھوٹا موٹا لیڈر تک دوا کے زور سے نہیں بن سکتا۔ یہ سب سوچ کر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ مگر یکایک دل میں خیال آیا کہ چلو نہ بھی بن سکے اصلی سیاسی لیڈر۔ مگر اس دوا کے آزمانے میں ویسے ہرج بھی کیا ہے کوئی زہر تو نہیں ہے۔ خود پروفیسر نے بڑی شیشی میں سے دوا انڈیلتے وقت گرتے ہوئے کئی قطروں کو میرے سامنے چاٹا تھا۔

یہ سوچ کر اس نے کوٹ کی جیب میں سے وہ ہلکے سبز رنگ کی شیشی نکالی اور بتائی ہوئی خوراک کے مطابق پندرہ قطرے پانی میں آمیز کر کے حلق میں انڈیل لئے۔

ستارے اس نے اس سے قبل بھی دیکھے تھے۔ مگر یہ بات اسے آج رات ہی محسوس ہوئی کہ یہ ستارے کچھ کہتے ہیں کچھ گنگناتے ہیں۔ ان کی دمک میں ایک اشارہ ہے۔ سمندر کی لہروں کو اس نے بارہا دیکھا تھا مگر آج رات اسے معلوم ہوا کہ یہ پردۂ ساز کی طرح نغموں سے لبریز ہیں۔ قدرت کا زخمہ جب انہیں چھیڑتا ہے تو سامعہ پر بارش شروع ہو جاتی ہے۔

یکایک اس نے دیکھا کہ سامنے ساحل پر ریت کے بے شمار ذرے نہیں ہیں بلکہ مُنڈیوں کا انبوہ جمع ہے۔ بے تحاشہ مخلوق بتوں کی طرح خاموشی کے ساتھ اس کی تقریر سن رہی ہے اور وہ بے تکان بولے جا رہا ہے۔ تقریر نہایت مرصع اور زوردار ہے۔ قائد اعظم کے اقوال۔ غالب کے شعر۔ صدر ولسن کے ۱۴ نکات کا حوالہ اور دوسرے امور بار بار زبان پر آ رہے ہیں۔

دس منٹ گزرے۔ دیر میں اسے اب معلوم ہوا کہ لوگوں کا اژدہام ہے اور وہ اسے وزیر اعظم کی کوٹھی تک لے جا رہا ہے۔ وہ اس مجمع کا لیڈر ہے۔ عوام اسے ہاتھوں ہاتھ لئے جا رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ حکومت اب تک ان عوام کے لئے مفت طبی امداد کا بندوبست کیوں نہیں کر سکی ہے۔ وزیر اعظم صاحب نے شرف ملاقات بخشا اور اس نے عوام کی آواز ہر عالی تک پہنچا دی۔ پھر دونوں کی مفاہمانہ گفتگو ہوتی رہی۔ عوام کے مطالبات پر حکومت نے ہمدردانہ غور کرنے کا حتمی وعدہ کر لیا اور وہ کامیاب و کامران واپس آیا۔ لوگ اس کا جلوس نکال رہے ہیں۔

یہ تصویریں اس قدر جلدی جلدی اس کے دماغی کینوس پر آنی شروع ہوئیں کہ اس کی کنپٹیاں پھٹنے لگیں۔ جسمانی تکلیف نے ذہنی مسرت کا یہ طلسم لپیٹ کر رکھ دیا۔ سردار صاحب کو محسوس ہوا کہ ان کا سر جل رہا ہے۔ رات کے ۲ بجے ہیں۔

وہ گھبرا کر بستر پر لیٹ گیا۔

بستر پر لیٹ کر اسے خیال آیا کہ کتنے بڑے ہجوم اور انسانوں کے جم غفیر کی رہنمائی کرتے کرتے وہ نہیں تھکا۔ مگر ان کروڑوں انسانوں میں سے آنسہ بنت پروفیسر علی احسن کا چہرہ تو یہاں نہیں دکھائی دیا ——— یہ آخر کیا راز ہے۔ اس کے بغیر وہ کسی تصور کو کس طرح حسین و دلنواز کہہ سکتا تھا۔

(۴)

اس کے بعد آغا پور کو سردار حق نواز خاں کے دل چسپ انقلاب ذہنی کے مطالعہ کا بہت قریبی موقع ملتا رہا۔ مثلاً اب یہ بات سارے قصبہ کو معلوم ہو چکی تھی کہ سردار صاحب نے [illegible] بالکل ترک کر دی ہے۔ اب ان کا دماغ کچھ اور ہی ہو گیا ہے۔ قصبہ کے بعض سمجھدار لوگوں کا خیال تھا کہ وہ قریب قریب خبطی ہو چکا ہے۔

سردار صاحب نے کراچی میں ایک بہت عمدہ مکان لیڈر بننے کے لئے بنایا تھا۔ اسے تاج محل کا خطاب دیا گیا۔ سب سے پہلے اس میں ایک عظیم الشان مشاعرہ

منعقد ہوا جس میں پاکستان و ہندوستان کے چوٹی کے شعراء اور ادباء نے شرکت کی۔ ہر چند کہ وہ اس سے قبل پورا ایک مصرعہ بھی زبان سے ادا کرتے وقت کئی غلطیاں تلفظ کی کیا کرتا تھا اور شاعری کے اقدار کے باوجود طبع موزوں سے بہت دور تھا۔ مگر اب اس میں غضب کی سخن فہمی کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ وہ داد نہایت موزوں دیتا تھا۔ مشاعرہ کے بعد جلسہ مقالات ہوا۔ اور اس نے دو کی متصوفانہ شاعری کے اجزائے ترکیبی پر ایک سیر حاصل مضمون پڑھا اور جو شعراء و ادیب اس سے متفق نہ تھے ان سے بڑی دیر تک علمی مباحثہ کرتا رہا۔ مشاعرہ و ادبی جلسہ کے بعد ایک دفعہ ترنگ محل میں بزم موسیقی بھی منعقد ہوئی جس میں بڑے بڑے استادان کامل نے شرکت کی۔ پہلے وہ موسیقی کی ابجد سے بھی واقف نہ تھا مگر اب لحن و آہنگ، نغمہ اور لے کی تعریف کر سکتا تھا اور یہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہ سخن سُرا ضرور ہے۔ کراچی کے سب سے بڑے پبلک ہال میں ایک دن اس کی تقریر ہوئی جس میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس پر تبصرہ کیا گیا تھا۔ لوگ اس کی سیاسی بصیرت اور قوت گویائی کے مداح تھے۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جوشِ تکلم میں وہ کبھی کبھی فارسی کا کوئی شعر فرانسیسی اور جرمن زبانوں کے بعض الفاظ اور فقرے کے فقرے بول جاتا تھا۔ حالانکہ وہ ان زبانوں سے بالکل نابلد تھا ———— شدہ شدہ یہ خبریں آغا پور کے لوگوں تک پہنچیں۔ اور انھوں نے سنتے ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ لڑکے کا دماغ بالکل خراب ہو چکا ہے۔ یا وہ جو ایک شائستہ بیگم اور اس کی لڑکی ہر وقت اس کے ساتھ رہتی ہے انھوں نے مل کر کوئی جادو وادو کر دیا ہے :

نجی محفلوں اور پبلک جلسوں میں اس کی سحر گفتاری اور انداز خطابت کا بڑا چرچا تھا خود اسے بھی حیرت تھی اور وہ یہ بتلانے سے قاصر تھا کہ اس غیر معمولی ذہنی جوار بھاٹے کا راز کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ جب کوئی مجلس یا پبلک جلسہ ہوتا تو پروفیسر اور اس کی سترہ سالہ خوب صورت لڑکی اول صف میں بالکل سامنے کی نشست پر نظر آتے اور جب وہ بولتا ہوتا تو پروفیسر کی نظروں کے گھیرے سے وہ کسی طرح بھی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

اور یہ تو اُسے بارہا محسوس ہوا کہ جب وہ بولتا ہے اور علم و دانش کے موتی بکھیرتا ہے تو وہ اصلاً کچھ بھی نہیں ہوتا بلکہ پروفیسر کا عمل ہوتا ہے۔ مفکر کے پردے میں جس طرح خدا بولتا تھا۔ اسی طرح پروفیسر سردار حق نواز خاں کے دماغ اور لب و لسان کے ذریعہ ظہور اور وجود حاصل کر لیتا تھا۔ اس تجربہ کے رونما ہونے میں دو چیزیں مدد دیتی تھیں ایک تو وہی پیالی جو ہلکے سبز رنگ کی شیشی میں بند رہتا تھا اور وہ مجمع احباب و عوام کے سامنے آنے سے قبل اس میں سے چند قطرے پی جاتا تھا اور دوسری چیز آنسہ کا حُسن تھا جو اُسے ہر جگہ سہارا دیتا چلا جا رہا تھا۔

ایک دن وہ بندر روڈ پر سے گزر رہا تھا کہ آغا پور کا ایک پرانا یار مل گیا۔ کہنے لگا بھئی اب تو تم بالکل بدل چکے ہو۔ کیا انقلاب آیا ہے۔ ہمیں تو معلوم ہی نہ تھا کہ تم میں اتنے گُن چھپے پڑے ہیں۔ مگر اب قصبہ کے لوگ تم پر فخر کرتے ہیں تمہاری جگہ تو پاکستان کے کابینہ میں ہے۔ وزیر بنتا چاہئے تھیں؟

سردار چند الفاظ معذرت اور تشکر کے نہایت مشکل سے ادا کر کے اس شخص سے پیچھا چھڑا کر بھاگا۔ آج کراچی کے سب سے بڑے پبلک ہال میں دنیا کی بہترین تصاویر کی نمائش تھی۔

بغیر سوچے سمجھے وہ اس نمائش میں گھس گیا۔ تصویریں دیکھتے دیکھتے وہ لینن کی ایک روغنی تصویر کے سامنے آ کر رک گیا وہ اسے اچھی طرح دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کے نتھنوں میں نسوانی جسم اور عطر کی ملی جلی خوشبو گھسنے لگی۔ پلٹ کر دیکھا تو قریب ہی آنسہ کھڑی تھی اور پیچھے پروفیسر ایک دیو کی طرح کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"کہئے آپ بھی نمائش دیکھنے آ گئے" پروفیسر نے جانتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں ———— جی ———— میں بھی یونہی ادھر نکل آیا۔ لینن کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ خوب بنائی ہے۔ پرسوں رات ہی تو آپ نے کھانے کے وقت لینن اور اس کے تصور معاشیات پر کچھ روشنی ڈالی تھی"

"ہاں ہاں ———— " پروفیسر نے کہا اور اس کے بازو میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ رات میں اس نے سمجھایا کہ لینن نے کیا کہا ہے اور امریکن سرمایہ داروں کی نفسیات کو مریض کیا ہے۔ اسلام کے نظام معیشت کے تقاضے کیا ہیں اور پاکستان کے اقتصادی اور زرعی نظام میں ابھی اور کیا اصلاحات ہونی چاہئیں وغیرہ وغیرہ اس واقعہ کے بعد جلدیں ایک مضمون کی افادیت اور طرز انشاء کا بڑا چرچا ہوا۔ یہ مضمون سردار حق نواز خاں صاحب کا لکھا ہوا تھا۔ عنوان تھا "کافر پیغمبر" اور اس میں لینن کے اعمال و اقوال اور فلسفۂ معاشی پر پُر حاصل تبصرے کے بعد اس کا مقابلہ اسلامی سوشلزم سے کیا گیا تھا۔

———— (۵) ————

دل ہی دل میں اب سردار حق نواز خاں کو محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ اصل میں ہی قابل ہے۔ مینار لیاقت ہے، بقراطِ پاکستان ہے! دماغ کی دوا تو خیر ایک مذاق ہے۔ اور

پروفیسر علی احمد نیر انیسہ کی موجودگی بھی محض حُسنِ اتفاق ہی ہے۔

سیاست کے باب میں تو اسے بہت پہلے یہ شبہ ہو چکا تھا کہ شاید کوئی بھی ہمسر نہیں ہے۔ خطابت کا جہاں تک تعلق ہے۔ مرحوم یار جنگ بہادر انتقال فرما گئے ورنہ وہ بھی اس کی تقریریں سنتے تو جھوم اٹھتے۔ ورنہ اس کے مناسب وقت کا منتظر تھا جب لوگ اسے کشاں کشاں کرسیٔ وزارت پر لے جا کر بٹھا دیں گے اگر ابھی تک لوگوں کو اس کا خیال نہیں آیا ہے تو وہ عوام کی بدنصیبی پر تاسف کرنے کے سوا اور کیا کر سکتا ہے!

وہ سوچا کرتا تھا: مجھے معلوم نہیں کہ اس وہم میں واقعی کوئی طلسمی بات ہے یا نہیں۔ ممکن ہے ہو۔ خیر! کچھ بھی نہیں تو اسے ایک عام ٹانک سمجھنے میں تو کسی کو تامل ہو ہی نہیں سکتا میں خود اس کو مانتا ہوں کہ اس کے پینے سے میرے دماغ کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ مگر میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ جب پروفیسر موجود نہ ہو۔ تو میری قوتِ گویائی کیوں سلب ہو جاتی ہے اصل میں تو قابلیت کے جوہر مجھ میں پہلے ہی موجود تھے۔ پروفیسر کے ہونے سے اسے ذرا ترقی ملتی ہے بس اور کیا بات ہے۔ اجی یہ بھی بات نہیں ہے۔ فی الحقیقت یہ انیسہ کا حُسن ہے جو میرے دماغ میں ہنگامہ دیتا ہے جسم میں حرارت دوڑنے لگتی ہے۔ انیسہ اگر مجھے ہمیشہ کے لئے مل جائے تو پھر پروفیسر اور دوا کا بہانہ لایعنی ہو جائے گا ——————— لو بھئی اب سمجھ میں آئی بات ——————— میری لیاقت سو رہی تھی حُسن کی کرنوں نے مجھے اس طرح جگا دیا جیسے صبح کے سورج کی کرن انسان کے پردۂ چشم پر پڑ کر اسے جھنجھوڑ دیتی ہے۔

—————(۶)—————

ان ہی دنوں کا ذکر ہے کہ عالمی مسلم کانگریس کا غلغلہ ملک میں بلند ہوا۔ افتتاحی اجلاس میں وزیر اعظم کا خطبہ ہونے والا تھا۔ ان کی تقریر کے بعد سب سے اہم مقرر جس کے نام کا خصوصی اعلان کیا گیا وہ آغا پور کے سردار حق نواز خاں تھے۔ جن کی سحر بیانی اور لطافتِ گفتار کے جوہر ابھی تک صرف عوام اور چند خواص پر کھلے تھے۔ مگر عمائدِ حکومت اور اکابرِ عالمِ اسلامی کے سامنے انھیں لب کشائی کا موقع ابھی نہیں ملا تھا۔

پروفیسر نے پاکستان اور سیادتِ عالمِ اسلامی کے موضوع پر سردار حق نواز خاں کو اتنے عمدہ نکات نوٹ کرا دئے تھے کہ اگر کانگریس میں صرف یہی ایک تقریر ہوتی تو اپنی ہمہ گیری اور جوشِ خطابت کے باب میں حرفِ آخر کا حکم رکھتی۔ پروفیسر نے کہا کہ تقریر کے نکات خوب اچھی طرح ذہن میں محفوظ کر لیجئے اور تقریر کی تیاری بھی اس وقت پندرہ روز میں خوب اچھی طرح کر لیجئے ابھی کافی وقت ہے۔ اس نے دل میں سوچا کہ پروفیسر کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ایک معمولی سی تقریر کے لئے اتنی لمبی چوڑی حکمتیں بیان کر رہا ہے میں اس سے بڑی بڑی تقریریں اس سے بھی اہم موضوعات پر کر چکا ہوں اور پھر مجھے اس کی دوا دنے دماغ وغیرہ کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پروفیسر بھلا ہے کیا چیز —— اصل میں تو خود میں ہی ہوں میں سردار حق نواز خاں شیخ آغا پور جو وزیر اعظم کے سامنے ایک ایسی تقریر کرے گا کہ خود انھیں بھی حیرت ہو گی کہ ہمارے ملک میں ایسے ایسے جوہرِ قابل پڑے ہوئے ہیں اور افسوس کہ وہ اُن کی الجھنوں میں گرفتار رہا۔ اسے تو میرا دستِ و بازو ہونا چاہئے تھا!

جوں جوں جلسہ کی تاریخ قریب آتی گئی۔ سردار صاحب کے اعصاب میں ویسی ہی ہل چل پیدا ہوتی چلی گئی۔ وہ اپنے آپ کو سمجھانے لگا کہ پروفیسر صفِ اوّل کی نشست پر بیٹھا ہو یا نہ بیٹھا ہو۔ اس دفعہ اس کا خطبہ ایک معرکہ کی چیز ہوگی۔

جلسہ سے دو تین روز قبل اسے معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب کو اچانک بُخار آ گیا ہے۔ وہ اس کی عیادت کے لئے گیا۔ انیسہ رو رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ پروفیسر کو نمونیہ ہو گیا ہے اسے تسلّی دی اور پروفیسر سے کہنے لگا: اُستاد آپ گھبرائیے نہیں۔ میرا خیال ہے کہ بہترین ڈاکٹر جو نمونیہ کا اس وقت اختصاصی معالج مانا جاتا ہے یعنی کرنل شاہ، میں اُسے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ خرچ وغیرہ کا بھی مطلق خیال نہ کریں۔

تسلّی کی باتیں کر کے وہ اپنے رنگ محل میں واپس آ گیا اور ڈاکٹر وغیرہ کا بھی انتظام کر دیا۔ ہرچند کہ وہ اس خیال کو دل سے نکال دینا چاہتا تھا مگر بار بار یہی خیال بندر کی بدوایتی شکل کی طرح اس کے متصورہ میں آ رہا جاتا تھا کہ اگر صفِ اوّل میں بالکل سامنے کی نشست پر پروفیسر موجود نہ ہوا تو مسلم کانگریس کی اس تقریر کا کیا حشر ہوگا۔ اسے یہ خیال ضرور تھا کہ اگر پروفیسر کی دیو پیکر ذہانت کا مجسمہ سامنے نظر آ جائے تو اس کی ہمت بندھ جاتی ہے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ آخر تقریر تو اُسے خود ہی کو کرنی ہے۔ لیاقت کا صندوقچہ خود اس کا دماغ ہے نہ کہ پروفیسر کا وجود —— اگر وہ وہمی ہوتا تو شاید یہ بھی سمجھ لیتا کہ بیلک جسوں وغیرہ میں وہ نہیں بلکہ پروفیسر اس کی زبان سے بولا کرتا ہے اور وہ اس کے جادو کا شکار ہے مگر بیسویں صدی عیسوی میں وہ بھلا ان فسانوں کو کہاں مان سکتا تھا۔

خواہ کچھ بھی تھا مگر واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر کی علالت سے اسے ایک فکر ضرور لاحق ہو گیا تھا اور مسلم کانگریس کے شروع ہونے سے ایک رات قبل جب اسے اچانک یہ

معلوم ہوا کہ پروفیسر کا انتقال ہو گیا ہے تو اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک خالی پنجرہ رہ گیا ہے۔ پرندہ اُڑ گیا ہے۔ جیسے ہی اُسے یہ خبر ملی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ سائنس کی دُنیا اُن کا ایک بہت بڑا تار ہے اور وہ اس میں اُلجھتا چلا جا رہا ہے۔

خوف و دہشت کے اس عالم میں اسے پروفیسر کی دی ہوئی دوا کا خیال آ گیا۔ ہر چند کہ وہ اب اس دوا کے بغیر بھی وہی عجائبات ذہنی دکھا سکتا تھا۔ مگر دل میں یہی خیال تھا کہ مقوّی دوائیں بھی دُنیا میں کوئی معنی رکھتی ہیں۔ بس اسی خیال سے اس نے دوا کی شیشی نکالی اور اُسے روشنی میں دیکھنے لگا۔

افسوس کہ اب چند ہی قطرے باقی رہ گئے تھے خیر چند قطرے بھی کچھ تو طاقت بخش سکتے ہیں مگر تعجب کی بات یہ تھی کہ اب اس دوا میں نہ خوشبو باقی تھی نہ وہ اس کا سنہری رنگ گیا اس دوا کا طلسم اس کے موجد کی روح کے ساتھ ختم ہو گیا تھا۔ کیا واقعی وہ اب تک جادو کا شکار رہا تھا۔

یکایک اس کی خودی نے ایک جھرجھری لی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ سیاسی و علمی زندگی کے اس اہم ترین مرحلہ پر وہ اپنے وقار و شہرت کو صدمہ نہیں پہونچنے دیگا۔ اور اس موقع سے پورا فائدہ اٹھائے گا تاکہ وزارت کی کرسی اس کے بغیر زیادہ عرصہ تک سوگوار نہ رہے ——— دوا ——— دوا تو خیر ایک بہانہ تھی خود پروفیسر ہی جو ایک افسانہ تھا رہ گئی انیسہ، تو وہ اب بے یار و مددگار تھی اور اس سے شادی کرنے کے علاوہ اس کے سامنے اور کونسا نعم البدل رہ گیا تھا ——— وہ بھی اس سارے ذہنی خلفشار کا بس یہی ایک جواب ہے۔ اُسے عروسِ کامیابی سامنے مسکراتی دکھائی دے رہی تھی۔

(۷)

آغاپور کے ہو سکنے والے ایک عظیم المرتبت سیاست داں سردار حق نواز خاں کا سیاست کے میدان سے فرار اور علمی و ادبی مشاغل سے ان کا اچانک غائب ہو جانا ایک ایسی کہانی ہے جسے سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں۔

خود اسے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ عالمی مسلم کانگریس کے جلسہ میں گیا تھا۔ وزیر اعظم کی افتتاحی تقریر کے بعد وہ تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہوا۔ اس تقریر کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ تاریخ میں اپنا ایک مستقل اور امٹ نشان چھوڑ جائے گی۔ مگر اسے اتفاق کی بات کہئے یا جو کچھ بھی، واقعہ یہ ہوا کہ دس منٹ تک وہ چند بے ربط، بے معنی، مہمل فقرے زبان سے لڑھکانے کے بعد درد سر کا بہانہ کر کے سٹیج سے اُتر کر بھاگ نکلا۔ ذی علم اور سمجھدار لوگوں کے مجمع نے آپس میں یہ پوچھنا شروع کیا کہ ایسے کندۂ ناتراش کو تقریر کرنے کی دعوت کن لوگوں نے دی تھی اور آخر اس مذاق کا یہ کونسا موقع تلاش کیا گیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اس کی سیاسی و عملی زندگی کا آغاز بڑا شاندار رہا تھا مگر عروج کے اس بام ثریا پر چڑھ کر ذلت و گمنامی کے تحت الثریٰ میں گرنے کا المیہ بھی کچھ کم عبرت انگیز نہ تھا۔ اس جلسہ میں وہ چاروں طرف تکمیں بچانہ بچا کر دیکھ رہا تھا۔ کاش پروفیسر کا چہرہ کہیں نظر آ جائے۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ پروفیسر عالم ارواح سے ہی اس وقت اس کی دست گیری کرنا شروع کر دے۔ مگر ہوا یہ کہ مردہ تو کیا مدد کرنے آتا۔ زندوں نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ قصبہ کے چند لوگ اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ آئے تھے اور آگے بیٹھے تھے۔ چپکے چپکے کہنے لگے۔ بولتا کیوں نہیں؟ زبان کیا کٹ کر گر گئی ہے؟ مگر زبان واقعی کٹ کر گر گئی تھی۔ قصبہ کے لوگوں کا خیال تھا کہ اس شخص نے ہمارے قصبہ کی لٹیا ڈبو دی۔ ان لوگوں نے یہ بات فی۔ وہ پوچھتے تھے کہ اس قصبہ کی لٹیا تیری کب تھی؟ بہرکیف اخباروں نے اس واقعہ کا کچھ تذکرہ نہ کرنا ہی مناسب سمجھا۔ انجام یہ ہوا کہ اُن کی تجارت کو پھر اس کے وجود سے کچھ ترقی ملنی شروع ہو گئی۔ وہ پھر اسی دُنیا میں پہونچ گیا۔ جسے وہ خوب جانتا تھا۔

(۸)

ایک دن وہ پروفیسر کے مکان پر پہونچا۔ انیسہ نے اسے بتایا کہ پروفیسر نے ایک بہت بڑی دولت چھوڑی ہے۔ سوگ کے دن گذر جانے کے بعد اس کی نیت شادی کرنے کی ہے۔ دماغی طاقت کی دوا بنانے کا راز اگر کوئی تھا تو وہ پروفیسر اپنے ساتھ قبر میں لے گیا۔ کیونکہ یہ راز اس نے اپنی بیٹی تک کو نہیں بتایا تھا یہ طلسم اُسی کی اپنی کھوپڑی میں تھا جو دوسروں کی کھوپڑیوں کو برباد کرتا پھرتا تھا۔ بہرحال انیسہ کو اس سے زیادہ اور کوئی بات معلوم نہ تھی۔ نہ اسے کبھی اس کا کامل یقین ہوا تھا کہ کوئی دوا احمق اور کندۂ ناتراش لوگوں کو بقراط بنا سکتی ہے۔ رہ گئی شادی تو اس کے بارے میں انیسہ یہ بات بہت پہلے طے کر چکی تھی کہ وہ کسی ایسے نوجوان سے شادی کرے گی جو علم و دانش میں یکتا ہو۔ بہترین خلیب، وادیب ہو۔ دولت مند ہو تو بہت اچھا، ورنہ کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے پاس جو دولت ہے وہی کیا کم ہے!

آغاپور کا رہنے والا دُون فروش سردار حق نواز خاں اپنی یہ کہانی بیان کرتے کرتے جب اس موقعہ پر پہونچتا ہے تو اس کے پاس کی غمازی کرنے والی آواز کے سوا ہلکے سبز رنگ کی ایک خالی شیشی بھی ہوتی ہے۔ جو وہ قصہ بیان کرتے وقت اپنی انگلیوں میں نچاتا رہتا ہے!!!

شائستہ

(ممتاز مفتی)

"کمرہ نہ سہی، کوئی کونا ہی ہو جس میں ایک چارپائی بچھائی جا سکے" میں نے اُمید بھری نظر سے ہوٹل والے کی طرف دیکھا "جی نہیں" وہ لاپروائی سے بولا "ذرہ بھر جگہ نہیں ہے یہاں۔ شاید کل تک ہو جائے" یہ چھوٹا ہوٹل تھا۔

مینجر کی بات سن کر میرا دل ڈوب گیا کسی اور ہوٹل تک جانے کی ہمت نہ رہی۔ شکر ہے میں اپنا سامان اسٹیشن پر کلوک روم میں رکھوا آیا تھا ورنہ کس قدر مشکل ہوتی ہوٹل سے باہر نکل کر کچھ دیر تو میں حیران کھڑا رہا کدھر جاؤں۔ مجھے تو کراچی کے رستوں سے بھی واقفیت نہ تھی۔ پہلی مرتبہ تو وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ کچھ دیر تک تو میں گھبراہٹ میں ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر دفعتاً مجھے ہنسی آگئی۔ جیسے تمام مشکلات یکلخت دور ہو گئی ہوں۔ شاید اس لئے کہ میری پریشانی اور بے بسی حد سے گذر چکی تھی۔ تو صاحب نتیجہ یہ ہوا کہ میں بازار اور کوچوں میں یوں ٹہلنے لگا۔ گویا کوئی بے فکرا سیر کو نکلا ہو۔ اُف! کیا خوب صورت کوچہ ہے۔ میں نے اس گلی کی طرف دیکھ کر کہا جس کی ایک جانب فلیٹ بنے تھے اور دوسری طرف پارک تھا جس میں بچے کھیل رہے تھے "کبیر ـــــــــــ!"

دفعتاً میرے کان میں آواز پڑی۔ میں نے مڑ کر دیکھا گلی خالی پڑی تھی۔ یہاں میرا جان پہچان والا کون ہوگا؟ میں نے سوچا آخر اس نام کے لوگ بھی تو ہوں گے "کبیر ـــــــ" پھر آواز آئی۔ میں نے اوپر دیکھا۔ فلیٹ کے چھجے پر وہ کھڑی مسکرا رہی تھی ـــــــ میرا دل اُچھل کر جیسے حلق میں آگیا۔ جسم میں سنسنی دوڑ گئی "یہ سامنے" وہ بولی "اس طرف دروازے میں داخل ہو کر بائیں طرف پہلا ـــــــ میں نوکر کو بھیجتی ہوں"

شائستہ میرے چچازاد بھائی سکندر کی بیوی تھی میں جانتا تھا کہ وہ کراچی میں رہتے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ سکندر مجھ سے مل کر بہت خوش ہوں گے لیکن کراچی کو روانہ ہوتے وقت اماں نے مجھے تاکید کی تھی کہ سکندر سے نہ ملوں۔ اگر اتفاقاً ملاقات ہو جائے اور وہ میرے وہاں ٹھہرنے پر اصرار کریں تو کسی بہانے ٹال دوں مجھے سکندر کے ہاں ٹھہرنے کی قطعی ممانعت تھی۔ جبھی تو آتے ہوئے میں نے یہ جاننے کی بھی کوشش نہ کی تھی کہ وہ کس محلہ میں رہتے ہیں۔

محلے میں ایک نہیں تین لڑکے ایسے تھے جنہیں کراچی میں سکندر کے گھر رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اسلم تو وہاں صرف دو دن ٹھہرا ہوگا۔ پھر کسی بات پر وہ سکندر سے ناراض ہو کر ہوٹل میں جا ٹھہرا۔ یہ خبر جب محلے میں پہونچی تو بڑی باتیں ہوئیں۔ عزیز کو سکندر نے وہاں ملازمت دلوا دی تھی۔ اس نے صرف ایک مہینہ ملازمت کی ہوگی۔ پھر وہ انہیں بتائے بغیر وہاں سے بھاگ آیا۔ محلے میں آکر اماں سے کہنے لگا "میں ان کے یہاں نہ رہوں گا"

"کیوں اس کے یہاں رہنے میں کیا تکلیف تھی؟" اس کی ماں بولی۔

"نہیں اماں تکلیف تو نہیں تھی۔ لیکن میرا ان کے پاس رہنا ناممکن ہے" عزیز نے کہا۔

"چاہے ان کے پاس نہ رہتا" ماں نے کہا "پر نوکری چھوڑ کر نہ آتا!"

"تو رہتا کہاں؟" اس نے چڑ کر جواب دیا۔ نہال واپس آکر کانوں پر ہاتھ رکھتا اور کہتا کہ ان کے گھر رہنا تو قیامت ہے قیامت، صبح و شام لڑائی لگی رہتی ہے مہمان کی شامت آجاتی ہے شامت!

اسلم، عزیز اور سعید کا خیال تھا کہ سکندر کی طبیعت شکی ہے۔ بات بات پر شک کی نظر سے دیکھتے ہیں حتیٰ کہ جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے

ہوتیں سمجھتی تھیں۔ سارا افسانہ شائستہ کا ہے۔ کیسی قدر بن ٹھن کے رہتی ہے۔ ماشاء اللہ بارادہ کریم اور ہر بل مسکرا مسکرا کر رہتی ہے۔ نوجوان لڑکوں کا کیا ہے۔ انھیں تو اللہ دے یہ بات۔ ایسی عورت کے قریب میں پھنستے ہوئے دیر لگتی ہے کیا۔ پھر خاوند نے ملنا ہی ہوا۔ کیسے نہ ہو شگی اس کی طبیعت۔ نوجوان جہاں سکندر کے مزاج میں نقص نکالتے وہاں شائستہ کی محبت۔ اخلاق اور مہمان نوازی کی تعریفیں بھی کیا کرتے۔ یہ سن کر عورتیں زیر لب مسکراتیں اور آپس میں اشارے کرتیں۔ پھر جب وہ اکیلی بیٹھی ہوتیں تو کوئی نہ کوئی کہتی

۔بس باہر کی کوئی آجائے سبھی اس کے سبھاؤ کی دھوم مچا دیتے ہیں۔

۔نہ جانے باہر والیاں کیا جادو کرتی ہیں۔

۔آنکھیں مٹکانا جو جانتی ہیں وہ۔

۔ہمیں تو نہ آیا آنکھیں مٹکانا۔ کوئی آہ بھر کر کہتی۔

۔اللہ نہ کرے ——— ہم اس کے بغیر ہی اچھے ہیں۔ دوسری حسرت بھری مسکراہٹ سے جواب دیتی۔ محلے کے بزرگ شائستہ یا سکندر کی بات سن کر کھلکھلا کر ہنس دیتے اور کہتے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ میاں بیوی دونوں نے جو رشک کا ڈھونگ رچا رکھا ہے تاکہ مہمانوں سے جان بچی رہے۔ بھئی خوب طریقہ ہے۔

نہ جانے کونسی بات سچی تھی۔ آیا لڑکوں کا خیال درست تھا یا عورتوں کا یا بزرگوں کا۔ مگر یہ ایک حقیقت تھی کہ اب کوئی محلے دار سکندر کے پاس ٹھہرنے کو تیار نہ تھا۔ اگر کسی کو کراچی جانا ہوتا تو سبھی یک زبان ہو کر نصیحتیں کرتا۔ سچ کہہ دیتے۔ ناکہ وہ اپنے ہیں مگر ان کے گھر نہ ٹھہرنا جبھی ہیں تو تمہیں یہ مشورہ نہ دوں گی۔

آخر ہوٹل بھی تو ہیں وہاں؟

کیا نہیں وہاں ——— ہوٹل ہیں، سرائیں ہیں۔ سنا ہے بڑا اچھا سا شہر ہے

تو تو آپ میاں بیوی کیسے رہا دو ہفتے کیسے۔ سنتے سنتے ہوئے میاں بیوی کی خوشی حرام کر دیا۔ کیا یہ اچھی بات ہے۔ آپ سے کہہ دینے میں کیا ہرج ہے کہ ان کی نصیحتوں کے باوجود نہیں بلکہ انہی کی وجہ سے سفر کے دوران میں بار بار میرے دل میں سکندر سے ملنے کی خواہش خوف کی صورت میں پیدا ہوتی۔ اگر وہ مجھے مل گیا تو؟ ——— میں گھبرا کر کسی اور بات کے متعلق سوچنے کی کوشش کرتا۔ لیکن خواہ مخواہ مجھے شائستہ کا خیال آجاتا۔ بدن میں سنسنی دوڑ جاتی اور پھر میرے لئے کسی اور بات کے متعلق سوچنا بھی ناممکن ہو جاتا۔ خوب صورت تو وہ تھی ہی لیکن اس کا حسن آنے کے بجائے مبہوت کر دینے والا تھا۔ اس کے انداز میں خوشی کی جگہ وقار جھلکتا تھا، وقار خلوص اور سنجیدگی ——— یہ تینوں وصف میرے لئے چنداں دلفریب نہ تھے۔ پھر نہ جانے کیوں محلے والیوں کی باتیں سن سن کر دل میں ایک ان جانا عزم پیدا ہو چکا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ مجھے ان کے یہاں رہنے کا اتفاق ہو۔ یہ دبی دبی خواہش کسی وقت شدت سے مجھ پر حاوی ہو جاتی۔ پھر میں پوری کوشش سے اس کو اور بھی دبا دیتا۔

شاید اسی لئے ہوٹلوں میں جگہ نہ پا کر میرے دل میں اطمینان پیدا ہو گیا تھا۔ شائستہ کے یہاں رہنے کا جواز تو مل چکا تھا۔ اب صرف ان سے اچانک ملاقات ہو جانے کی کسر باقی تھی۔ اب مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے کبھی برسبیل تذکرہ سن پایا تھا کہ وہ ایک انگریزی وضع کے فلیٹ میں رہتے ہیں۔ جس کے مقابل بچوں کے کھیلنے کا پارک بنا ہے۔

کراچی میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک صاف ستھرا شہر ہے اور آخری ہوٹل والے کا انکار سن کر پھرتے پھراتے دفعتہً وہ کوچہ میری نظر پڑا جس کے مقابل پارک بنا تھا۔ اس کی بناوٹ مجھے اس قدر پسند آئی کہ میں بازار کو چھوڑ کر کوچوں میں گھومنے لگا حتیٰ کہ اس کی آواز میرے کان میں پڑی۔ حیرت سے بھونچکا رہ گیا۔ دل خوف یا شوق کی شدت سے تڑپ کر جیسے گلے میں آگیا۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو جیسے کوئی لبالب پیالہ چھلکنے لگا ہو۔

شائستہ مجھ سے بڑے تپاک سے ملی۔ بار بار میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ ماما کو میری تواضع کے متعلق ہدایت دیتی پھر مجھ سے باتیں کرنے لگتی۔ کس قدر خوشی کہ تم آئے ہو۔ بڑی مہربانی ہے تمہاری۔ اتنی دیر ہو چکی ہے۔ کوئی ہمارے یہاں نہیں آیا۔ کوئی نہیں آتا ہمارے پاس۔ جیسے محلے والوں نے ہمارے یہاں آنے کی

قسم کھا لگی ہو۔ مدتوں سے صفدا اور محبوب کراچی آئے تھے۔ ہمیں صورت تک نہیں دکھائی۔ نہ جانے کیا قصور ہو گیا ہم سے کہ محلے والوں نے ہم سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے رفیع تو گویا کب۔ ان سے لکھوایا لیکن وہ بھی نہ آیا۔ ہفتہ دو ہفتہ کو سیر کے لئے آجاتا تو کیا حرج تھا۔ نہ جانے بات کیا ہے کوئی بھی نہیں آتا۔" وہ آہ بھر کر چپ ہو گئی۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرا دی: "شکر ہے تم آئے ہو بڑی مہربانی ہے تمہاری۔" اس کی آنکھیں پُرنم تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی آنسوؤں کا تار بندھ جائے گا۔ لیکن مجھے دیکھ کر ان پرنم آنکھوں میں مسکراہٹ جھلکتی اور ان کی نمی جذب ہو جاتی "شکر ہے تم آگئے۔ تمہارے بھائی تو ہر وقت مطالعہ میں کھوئے رہتے ہیں۔ آدھی آدھی رات تک لائبریری میں رہتے ہیں۔ مجھے تو اس تنہائی نے مار ڈالا کبیر!" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "کتنا ویران ہے یہ شہر، کوئی ملنے ملانے والا نہیں۔ اگر اپنے ہی نہ آئیں تو بیگانوں کو کوئی کیا کہے اور ان کا آنا بھی کس کام کا، آتے بھی تو دو گھڑی بیٹھ کر چلے گئے۔ گھر میں اپنے کے سوا کون آسکتا ہے۔ خیر اب تو تم آہی گئے ہو۔" وہ مسکرائی۔ میری طرف دیکھ کر اس کی اداسی اور مایوسی کافور ہو جاتی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی ڈوبتی ناؤ کو پتوار مل گئے ہوں اور وہ چل نکلی ہو۔

شائستہ کی باتیں سن کر وہ امیدیں اور بھی استوار ہو گئیں جو محلہ والیوں کی باتیں سن سن کر خواہ مخواہ میرے دل میں پیدا ہو چکی تھیں۔ لیکن اس کی آنکھوں کی اداسی، ہونٹوں کی سنجیدگی، اور انداز و وقار مجھے پریشان کئے دیتے تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کسی جھجک کے بغیر ایسی باتیں کیوں کئے جا رہی تھی کیا اپنی ملازمہ شمو کا بھی ڈر نہ تھا؟ اگر سکندر آجاتا تو؟ باہر کا دروازہ بھی تو کھلا تھا۔ لیکن وہ ان باتوں سے قطعی بے نیاز تھی۔ اس بے نیازی کی وجہ سے مجھ پر خواہ مخواہ رعب چھائے جا رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اس سے ہنس ہنس کے باتیں کروں۔ مذاق کروں، چھیڑوں۔ لیکن میں زبان ہلاتے ہوئے جھجک محسوس کرتا۔ میرے بدن میں چیونٹیاں رینگتیں ــ اور خاموشی کے ساتھ اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہتا۔ اس وقت میری یہ آرزو تھی کہ اس کی خاطر دنیا کو ٹھکرا دوں تاکہ وہ میری ہو جائے۔ اس کے قریب تر ہو جاؤں۔ اس سے متعلق بے نام امیدیں میرے دل میں بھیڑوں کے چھتے کی طرح بھنا رہی تھی اور میں اس کے ایک اشارے کا منتظر تھا۔ صرف ایک اشارہ ــــ نوکرانی کے آنے پر دفعتاً چپ ہو جاتا یا دروازہ کی طرف دیکھ کر کہتا وہ۔ یہ دروازہ تو کھلا پڑا ہے۔ "شمو اسے بند کر دو" یا میرے کچھ کہنے پر ہونٹوں سے خاموش چپ کہتا اور مجھے پیار سے گھورتا یا کراچی آتے ہوئے گاڑی میں کئی مرتبہ میں اس کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ اس وقت میں یوں چپ چاپ نہ تھا۔ میں نے کئی ایک دل چسپ باتیں کی تھیں اور باتوں ہی باتوں میں اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ شائستہ ــــــ اس وقت ایسا محسوس ہوا تھا مجھے، جیسے کسی ہوائی کو آگ دکھا دی ہو۔ لیکن اب میرا ہاتھ آگے بڑھنے کے بجائے کوٹ کی جیب میں گھسا ہوا تھا اور میری زبان کچھ کہنے کے بجائے منہ میں ٹنگی ہوئی تھی۔

"اوہ کبیر آیا ہے، سکندر اندر داخل ہو کر چلائے" خوب کیا تم نے؟" وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دیر تک مجھ سے محلے والوں کے متعلق پوچھتے رہے اس دوران میں شائستہ اِدھر اُدھر چاروں طرف گھومتی رہی: "شمو تم نے کبیر کے کمرے میں بلب نہیں لگایا۔" شمو میں نے کہا۔ ایک میز رکھ دینا ــــ شاید کبیر سونے سے پہلے مطالعہ کرنے کا عادی ہو، وہ ان انتظامات کے دوران میں دوڑی دوڑی میرے پاس آتی اور کوئی نہ کوئی بات پوچھتی۔ سکندر کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھ کر مسکراتی۔ اس کا سکندر کی موجودگی میں ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کرنا میرے لئے بے حد پریشان کن تھا۔ میں خواہ مخواہ جھینپ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ شائستہ کو اپنی طرف متوجہ کر کے ایسا اشارہ کروں کہ اسے اس بات کا احساس ہو جائے کہ سکندر ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ لیکن مجھ میں ہمت نہ تھی اور وہ بار بار کہے جا رہی تھی۔ "شکر ہے تم آئے ہو کبیر۔ بڑی مہربانی ہے تمہاری اور میں محسوس کر رہا تھا کہ ایک پرائیویٹ بات عام کی جا رہی تھی سکندر کے سامنے اس کے وہ دلنواز اور رنگین فقرے اپنا مفہوم اور رنگینی کھوتے جا رہے تھے۔ اس بات سے تنگ آکر میں نے تھکاوٹ کا بہانہ کیا اور اپنے کمرہ میں جا کر لیٹ رہا۔

اگلے دن جب سکندر دفتر سے آئے تو ہم دونوں بالکونی میں کرسیاں جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ شائستہ بیٹھی ہوئی کچھ بُن رہی تھی۔ بُنتے ہوئے وہ مجھ سے مسلسل باتیں کئے جا رہی تھی۔ جس کے دوران میں اکثر کنکھیوں سے میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی۔ اس وقت میں سُر کئے ہوئے ساز کی طرح تاروں سے بھرا بیٹھا تھا اور محض ایک ہلکی سی چھیڑ کا منتظر تھا۔ شائستہ کی پتلی پتلی رنگین انگلیاں بڑھتے بڑھتے مجھ تک پہنچ جائیں گی اور فضا میں دلنواز نغمے گونجنے لگیں گے۔ وہ نغمے جو مجھ میں تڑپ رہے تھے جنہیں سننے کی مجھے توقع تھی۔ امید تھی۔ لیکن وہ انگلیاں اپنی ہی جگہ پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔ جیسے بھنور میں پھنسی ہوئی تھیں۔ میرا ہاتھ اٹھتا کہ ان مضطرب انگلیوں کو اس بھنور سے چھڑا لے۔ لیکن نہ جانے کیوں رک جاتا اور پھر خفت کے مارے جیب کے کونے کریدنے لگتا۔

سکندر نے ہمیں یوں بیٹھے دیکھا تو ٹھٹھک گئے۔ کچھ دیر کے لئے تو وہ چپ۔ ۔ پھر کچھ کہنے کی خاطر بولے "تم سیر کو نہیں گئے کبیر؟" "بس ابھی جانے کو تھا" میں نے گھبرا کر کہا۔

"میں نے روک رکھا تھا اسے" شائستہ بولی "میں نے کہا وہ آئیں گے تو تمہیں سانے سے باتیں کریں گے۔ اکیلا کہاں مارا مارا پھرتا۔"

"کبیر کوئی بچہ ہے کیا" ان کی ہنسی طنز آلود تھی۔ "جو کھو جائے گا" اس بات پر شائستہ کھسیانی سی ہو گئی۔ کمبخت کی بجائے وہ بھی چہکنے لگی۔ سکندر کمرے میں چلے گئے اور چپ چاپ کرسی پر بیٹھ کر نہ جانے کیا سوچنے لگے۔ شائستہ پہلے مجھ سے تو چہک چہک کر باتیں کرتی رہی۔ پھر اس قدر زور سے باتیں کرنے لگی۔ جیسے سکندر کو سنا رہی ہو "تمہارے آنے سے ہمارے گھر میں کس قدر رونق بڑھ گئی ہے کبیر۔ گھر بھرا بھرا نظر آتا ہے اور آج کا دن آنکھ جھپکتے ہی بیت گیا" پھر وہ دوڑی دوڑی سکندر کے کمرے کے دروازہ میں جا کر کھڑی ہوتی اور مسکرا مسکرا کر ان سے کچھ پوچھتی اور پھر وہیں سے "کبیر کبیر" چلاتی ہوئی میرے پاس آجاتی۔ "نہ کبیر آج یہ باہر جانے سے بھی منکر ہیں تم بھی نہ جاؤ باہر۔ جب یہ جائیں گے تبھی جانا کیوں" پھر بھاگی بھاگی سکندر کی طرف جاتی "سنا آپ نے کبیر کیا کہتا ہے۔ کہتا ہے میں موٹی ہو گئی ہوں۔ کیا میں واقعی موٹی ہو گئی ہوں۔ میری طرف دیکھئے نا" وہ یہی توجہ انکی طرف منعطف کرنے کے لئے بچے کی طرح چہکتی اور منہ بسورتی۔ "دیکھئے ہم، نا" پھر چلا کر کہتی۔ "ان کی بات سنی تم نے۔ کبیر کہتے ہیں۔ کسی کے منہ سے تعریف کی بات سن کر تمہاری باچھیں کھلنے لگتی ہیں" پھر ان سے مخاطب ہو کر مسکراتی "آپ بھی کیجئے نا میری تعریف" اور متوقع مخمور نگاہوں سے انھیں دیکھتی۔ اس وقت انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ دو زمینوں کے درمیان ایک متوازن پنڈول ہو۔ شائستہ کا یہ رویہ دیکھ کر میرا دل بجھا جا رہا تھا۔ امیدیں خاک میں مل رہی تھیں۔ "اف!" میں اٹھ بیٹھا "میں ذرا باہر آؤں۔" مجھے جاتے پا کر دیکھ کر وہ بھاگی بھاگی میرے پاس آئی۔

"باہر ہو آؤں ______" وہ زیر لب گھورنے لگی۔ "دوسرا شہرو نا" پہلی مرتبہ اس نے مجھ سے خفیہ لہجہ میں بات کی تھی۔ میرا دل اندر ہی اندر خوشی سے دھڑکنے لگا اور آنکھیں امید کی روشنی سے چمکنے لگیں۔ "میرا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں" میں نے رازدارانہ انداز سے کہا اور سکندر کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے سکندر کی طرف دیکھ کر منہ بنا دیا اور لاپرواہی سے زیر لب بولی "ان کی تو عادت ہی ایسی ہے۔ برا مان گئے کیا؟"

بازار میں گھومتے ہوئے بار بار مجھے وہ باتیں یاد آتیں جو شائستہ نے زیر لب مجھ سے کی تھیں۔ نہ جانے ان باتوں میں کیا تھا کس قدر مفہوم سے لبریز تھیں وہ ______ وہ زیر لب باتیں ہر لحظہ زیر لب ہوتی جاتیں یہاں تک کہ وہ سرگوشیاں بن گئیں اور ان پر وعدوں کے رنگین پھول پھوٹ نکلے۔ ان کی مہک سے مسحور ہو کر میں لڑکھڑاتا ہوا لوٹ آیا۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہوئے مجھے شدید احساس ہوا کہ آج کچھ ہونے والا ہے۔ رنگین انگلیاں میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ آنکھیں میری طرف دیکھ کر ڈولتیں۔ ہونٹ بولے بغیر کچھ کہتے۔

اندر وہ دونوں بیٹھے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولی "تو سنو کبیر مجھ سے کہہ رہے ہیں یہ فیروزی سوئٹر مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ کیوں کبیر کیا یہ رنگ مجھے جچتا بھی نا ______" کبیر پھر وہ ان سے باتوں میں مشغول ہو گئی اور وہ دیر تک ایک دوسرے کی باتوں میں کھوئے رہے۔ کبھی کبھار وہ مجھے وہیں سے آواز دیتی اور میرے جواب سنے بغیر پھر سے ان سے باتوں میں لگ جاتی۔ ادھر میں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنے کی توقع میں بیٹھا تھا۔ منتظر تھا کہ وہ آئے اور دھیمی آواز میں مجھ سے کچھ کہے ان جیسی ہے یا کچھ اور۔ لیکن وہ نہ آئی حتیٰ کہ میں مایوس ہو کر لیٹ گیا۔

اس کے بعد ہمارا یہ معمول ہو گیا کہ سکندر کی غیر حاضری میں وہ میری کرسی سے کرسی جوڑ کر بیٹھ جاتی۔ باتیں کرتے ہوئے بار بار میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی "میں سیر کر آؤں" وہ پیار سے مجھے گھورتی۔ "نہ بیٹھو شام کو چلے جانا ______ بس کوئی نہیں جانا وانا ______ چاء پی لو جب آجائیں گے تو چلے جانا ______ میرے پاس بیٹھ کر ڈر لگتا ہے کیا؟ ______" ہر بار میں مجبور ہو کر بیٹھ جاتا۔ اسی طرح شام ہو جاتی اور سکندر آ جاتے۔ وہ ہمیں یوں بیٹھے دیکھ کر بار بار دیوار کی طرف گھورتے اور پھر اپنے کمرے میں جا داخل ہوتے۔ ان کی بے بسی اور خشمگینی دیکھ کر شائستہ مسکراتی۔ پھر ان کے پاس جا بیٹھتی۔ ہنس ہنس کر ان سے باتیں کرتی ... کبھی جھکتا ہی نہیں ... ہماری بے تکلفی پہ آواز کستے۔ ان کی باتیں سن کر شائستہ کی خوشی کی انتہا نہ رہتی ______ پھر کسی ... ہنس کر کہتی۔ "تم چپ ہو گئے کبیر ناراض تو نہیں ہو گئے ______ خدا کے لئے برا نہ ماننا ______ ان کی تو عادت ہے

ایسی باتیں کئے بغیر نہیں رہ سکتے ہو کی باتیں اس قدر دلآزار نہ ہوتیں کہ میری سینوں کے خشک دئیے میں تیل پڑ جاتا۔ سکندر بُرا مانتا ہے تو بُرا مانے۔ میں لاپرواہ ہو جاتا۔ مگر وہ اس کی باتوں کے جواب میں بس صرف یہ کہا کرتا: "اچھا تمہاری مرضی" اور پھر سیر کو نکل جاتا۔

جب میں سیر سے لوٹتا تو دیکھتا کہ سکندر رفتہ رفتہ کے بجائے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے اور شائستہ سے بزمار ہی ہے۔ صبح سویرے وہ اٹھتے ہی پیار و محبت کی باتیں شروع کر دیتے۔ پھر سکندر دفتر چلا جاتا۔ اس کے چلے جانے کے بعد دفعتہً شائستہ کو احساس ہوتا کہ میں ابھی وہیں ہوں اور وہ بھاگی بھاگی میرے پاس آتی اور اس گرم جوشی سے مجھ سے ملتی۔ گویا اپنی گذشتہ لاپرواہی کی تلافی کر رہی ہو۔ اپنی کرسی میرے پاس رکھوا دیتی اور اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگتی۔ وہی ترچھی نگاہیں۔ وہی مسکراہٹ اور وہی بے تکلفی۔ اُف! وہ مسکراہٹ ہر بار میں محسوس کرتا کہ منزل آپ میری جانب چلی آ رہی ہے۔ شام کو جب میں سیر کو نکلتا تو دن بھر کے واقعات میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتے۔ خواہ مخواہ مجھے احساس ہونے لگتا کہ بام پر پہنچنے کے لئے صرف ایک سیڑھی رہ گئی ہے۔ ایک قدم اور ——— بس۔ لیکن واپسی میں جب دیکھتا کہ ہمارے درمیان ایک دیو ہے سائل ہے تو میں یکلخت تڑپ جاتا۔ ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی۔

آخر میرا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے کہا "آج میں واپس جا رہا ہوں" "جا رہے ہو؟" اس نے تڑپ کر میری طرف دیکھا "نہیں نہیں" وہ چلائی "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی تو تمہیں یہاں آئے دو دن ہوئے ہیں" "آج پانچواں دن ہے" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "تو پھر کیا ہوا" وہ بولی۔ "نہیں آج مجھے جانا ہوگا" میں نے جواب دیا۔ اس نے سوئٹر کو علیحدہ پھینک دیا "نہیں تم مذاق کر رہے ہو تم ابھی نہیں جاؤ گے" "میں نے فیصلہ کر لیا ہے" میں نے لاپرواہی سے کہا "فیصلہ کر لیا ہے؟" وہ چلائی "کبیر" اس نے میرے ہاتھ پکڑ لئے۔ جونہی وہ گرم اور روغنی انگلیاں مجھ سے مس ہوئیں "ذِز!!" کسی بوتل کا کاگ اڑ گیا۔ سرخ شراب کے چھینٹے چاروں طرف اُڑنے لگے۔

عین اس وقت سکندر داخل ہوئے۔ ہمیں دیکھ کر آنکھیں انگارہ ہو گئیں۔ شائستہ نے انہیں دیکھا لیکن وہ جوں کی توں کھڑی رہی۔ وہ تو شکر ہے کہ میں نے اپنے ہاتھ چھڑا لئے تھے۔ ورنہ شاید وہ میرے ہاتھوں کو پکڑے رہتی۔ شائستہ کی آنکھوں میں گھبراہٹ کی جگہ فتح مندی کی جھلک لہرا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے شکاری پرندے کو اپنے آپ دام میں پھنستے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہا ہو۔

"جلانا وانا کوئی نہیں۔" وہ مجھ سے آنکھیں ملا کر آہستہ سے بولی اور پھر سکندر کے کمرہ میں جا داخل ہوئی: "اُسے گود میں لے کر بیٹھ رہتی ہو شرم نہیں آتی۔ تمہیں سکندر مقرر آیا ہے کیا کہیں گھر جا کر، یہاں سیر کے لئے آیا ہے یا تمہارے جادو میں پھنسنے کے لئے" میں نے سُنا اور میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ سچ کہتی تھیں خالہ۔ ایسا میں نے کس قدر بھول کی جو یہاں آ ٹھہرا۔ مگر میں نے اپنے کپڑے اکٹھے کئے اور شام تک میں لے کر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے عجیب سا محسوس ہوا کہ صبح گیارہ بجے سے پہلے کوئی گاڑی نہ چھوٹتی تھی۔ لاچار میں چارپائی پر پڑ گیا۔ اندر نہ جانے وہ ایک دوسرے سے کیا کیا کہہ رہے تھے۔ ان کی باتیں سننے سے اب مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اگلے دن صبح سویرے وہ میرے پاس آئی۔ سرہانے کھڑے ہو کر ہاتھوں سے میری آنکھیں بند کر دیں: "بوجھو کون ہے" میں نے فوراً اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ مجھے غصہ میں دیکھ کر وہ گھبرائی۔ "اُف وہ یہاں غصے سے بھوت بنے بیٹھے ہیں" پھر وہ منت سے کہنے لگی: "خدا کے لئے آج نہ جانا۔ صرف آج اور کل کا دن اور ٹھہر جاؤ۔ پھر میں تمہیں نہ روکوں گی" اس نے میرے ہاتھ پکڑ لئے۔ میں نے بہتیری کوشش کی کہ ان رنگین شکنجوں کے چنگل سے نکل جاؤں۔ لیکن میری کوشش ناکام رہ گئی۔ میرے دائیں بائیں آگے پیچھے چاروں طرف وہ روغنی انگلیاں چل رہی تھیں۔ میری طرف بڑھ رہی تھیں حتیٰ کہ میں ان کی گرفت میں آ گیا ——— "ذز!!" کسی بوتل کا کاگ اڑا۔ کھولتا ہوا سرخ پانی چھلکا۔ میری آنکھوں تلے سبھی کچھ سرخ دکھائی دینے لگا۔ میرا سرخ کا ہونٹ ان انگلیوں پر چسپاں ہو گئے۔ شائستہ! مجھے تو بال بال گئی۔ دفعتہً اس نے اپنے ہاتھ کھینچ لئے۔ سرخ ابلتی ہوئی بوتلیں ریت بن کر۔ آئینہ میں ٹھٹھک کر بیٹھ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور گھبرا کر قریب آ بیٹھی۔ ہنسنے لگی وہ بڑی بہن سے مذاق کرتے ہو: ہنستے ہنستے اس کے گال پر دو آنسو ڈھلک آئے: "بڑے مسخرے ہو تم کبیر!!"

پہلے تو میں شرم سے پانی پانی ہو بیٹھا تھا۔ لیکن جب وہ میرے پاس بیٹھی اور معصومیت اور محبت سے بولی "صرف ایک دن اور رک جاؤ۔ تمہیں تکلیف تو ہوگی۔ لیکن میری خاطر اُسے سہہ لینا" تو کل بے شک چلے جانا: اس کی معصومیت خلوص اور بے بسی کو دیکھ کر میری شرمندگی [illegible] ہو گئی۔ میں اس کی [illegible]

[illegible] لگا۔ جیسے اس روز میں نے اُسے پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ میں نے ہنس کر کہا اور پھر پیار سے اس کا سر تھپکنے لگا۔

دوپہر کو اس کے پاس بیٹھے ہوئے میں محسوس کر رہا تھا گویا ہمارے درمیان آخری پردہ اٹھ چکا ہے۔ اس سے ایک پُراسرار قرب محسوس کر رہا تھا۔ جیسے میں منزل تک پہنچ چکا تھا۔ میرا دل دھڑک نہیں رہا تھا۔ زبان بند نہ تھی۔ ہاتھ جیب کے کونے میں چھپنے کے بجائے بے تکلف چل رہا تھا۔ اس کی رنگین انگلیاں رنگین تو تھیں مگر مکڑی کی ٹانگوں کی طرح چاروں طرف سے میری طرف بڑھنے کے بجائے (یونہی) اردگرد رینگ رہی تھیں۔ یوں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے میں کسی بے نام قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس روز میری گپیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ مجھے نئی نئی سوجھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ شائستہ سکندر کی کیا طبیعت ہے؟ ہے نا؟ وہ مسکرائی وہ بڑی شگفتہ طبیعت ہے چلتے کیوں؟ تمہارا دل نہیں کرتا۔ میں نے پوچھا۔ اس نے آہ بھری۔ ان دنوں بھی ایسے ہی تھے۔ ابھی تک اپنی عادت کا احساس نہیں۔ انھیں، کن دنوں؟ میں نے جان بوجھ کر بات کو لمبا کرنے کے لئے کہا۔

جب ہماری شادی ہوئی تھی۔ اُن دنوں کی یاد آتی ہے تو بیساختہ میں ہنس دیتی ہوں۔ وہ ہنس کر بولی۔ تم سے کیا چھپانا ہے۔ یہ میری اپنی [illegible] کہ میری ان سے شادی ہو جائے۔ سچ؟ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ہاں وہ جھینپ کر بولی۔ ان دنوں سکندر صاحب اور میرے پھوپھی زاد بھائی کرامت، دونوں [illegible] ٹھہرے ہوئے تھے۔ رہنے کو اچھے مکان نہ ملتے تھے۔ اس لئے مجبور تھے ——— میرے بھائی صاحب سے بڑی دوستی تھی۔ اس لئے ہم سب ان کو [illegible] تھے۔ ان سے پردہ بھی اٹھا رکھا تھا۔

تمھیں سکندر سے محبت تھی؟ میں نے شرارت سے پوچھا۔

وہ شرما کر چپ ہو گئی۔ پھر اپنے آپ کو سنبھال کر بولی۔ تم جانتے ہو مجھے ادب سے عشق تھا عشق ——— اور یہ پورے ادیب تھے۔ مجھے پڑھایا کرتے تھے۔ اُن دنوں بس ہم تو ان سے پڑھنے ہی میں لٹ گئے۔ اُن کس قدر قابل ہیں یہ۔ میں تمھیں کیا بتاؤں۔ مجھ پر تو پہلے دن ہی ان کا رعب پڑ گیا تھا۔ چوری چوری انھیں دیکھا کرتی تھی۔ یہ پڑھانے میں مشغول ہوتے اور میں ان کے منہ کی طرف دیکھا کرتی۔ ان کی عادت تھی کہ پڑھاتے ہوئے میری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے۔ پھر؟ میں نے بامعنی انداز سے پوچھا۔ پھر کیا ہوا؟

وہ مسکرائی۔ ان کی بلا سے۔ یہ تو ہر وقت اپنی کتابوں اور مطالعہ میں کھوئے رہتے تھے۔ ان کی مصروفیت انتہا کی تھی۔ اس بات پر میرا دل جلتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کسی طریقے سے ان کی کتاب چھین لوں۔ لیکن میں کر ہی کیا سکتی تھی۔ خیر جتن تو میں نے بھی بہت کئے۔ وہ مسکرائی۔ لیکن کوئی بات نہ بنی اور یہ اپنے شغل میں منہمک رہے ——— پھر اتفاق سے ایک ذریعہ نکل آیا۔

”وہ کیا؟“ میں نے شوق سے پوچھا۔

میری عادت تھی کہ کرامت بھائی سے روز کھیلتی۔ گپیں مارتی اور لڑتی جھگڑتی رہتی۔ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا تھا۔ چھ ایک ماہ چھوٹا ہوگا۔ ہم دونوں بہت بے تکلف تھے۔ جب ایک روز ہم دونوں حسب معمول بیٹھے ایک دوسرے سے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ سکندر صاحب آ گئے۔ ہمیں اکٹھے دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا لیکن سنبھل کر جلدی واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔ شام کو جب میں سبق پڑھنے کے لئے ان کے پاس گئی تو دیکھتی ہوں کہ آپ کا منہ سوجا ہوا ہے۔ پھر انھوں نے پڑھانا شروع کر دیا لیکن ایسی بے دلی سے پڑھا رہے تھے کہ میں پہلی ہی نظر میں تاڑ گئی۔ پھر میں سوچ میں پڑ گئی۔ نہ جانے کیا بات ہے آج، پڑھاتے ہوئے انھوں نے مجھے بے توجہ پایا تو تنک کر بولے۔ بس جی میں نہیں پڑھا سکتا تمھیں۔ اب اسی سے پڑھا کرو۔ اپنے کرامت سے جس سے سارا سارا دن خوش گپیاں لگتی ہو۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ بس جی پھر کیا تھا۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس روز پہلی مرتبہ صرف ایک جوش دینے کی ضرورت تھی۔ کس قدر چوکھا رنگ آئے گا چائے کا، میں نے سوچا۔ اس کے بعد میں نے کرامت سے اور بھی بے تکلفی شروع کر دی یہاں تک کہ اماں مجھے گھورنے لگیں۔ بھائی جان بھی گرم ہو گئے۔ اماں بولیں: بیٹی چاہے وہ اپنا ہے لیکن کرامت سے یہ دھینگا مشتی کرنا تمھیں زیب نہیں دیتا۔ میں نے ان کے اشارے سمجھے۔ بھائی کی نصیحتیں سنیں اور انھیں پی گئی۔ پھر میں نے بڑی مشکل سے وہ کمرہ لے لیا۔ جس کی ایک دیوار سکندر صاحب کے کمرے سے ملحق تھی

میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ ہماری آوازیں دیوار کے پار پہنچتی تھیں۔ یہ لاٹیں آگ بگولہ ہو گئے۔ کئی دن مجھے پڑھانے نہ آئے۔ مجھ سے بول چال ترک کر دی۔

ایک دن میں ان کے کمرے میں جا نکلی اور چھیڑنے کے لئے بولی "بھائی صاحب آپ چپ چاپ کیوں رہتے ہیں؟" میں انھیں بھائی صاحب کہا کرتی تھی۔ مجھیں "تم سے کیا غرض؟" یہ تلملا تے۔ "چاہے میں کیسا بھی ہوں۔" "آپ سے پڑھتی جو ہوں۔" "نہیں میں نہیں پڑھاؤں گا تمہیں۔" یہ تڑ لئے۔ "اچھا نہ سہی۔ لیکن آپ میرے بھائی صاحب تو ہیں۔" "نہیں ہی بناؤ بھائی صاحب۔" آپ جل کر بولے۔ "ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے۔ تمہیں کیا چاہے مروں یا جیوں۔" انھوں نے اپنی کتاب اٹھا کے دیوار سے مار دی۔ "بڑا اچھا کیا آپ نے۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔ "یہ کتابیں تو آپ کی جان کھا گئی ہیں۔" "یہ کتابیں جان کھا گئی ہیں یا ——— یا ———" دفعتہ آپ خاموش ہو گئے۔ "یہ پنسل بھی پھینک دیجئے نا ———" میں نے ان کی انگلیوں سے پنسل چھیننے کی کوشش کی۔ میری انگلیاں ان کے ہاتھوں سے مس ہو گئیں۔ انھوں نے میرا ہاتھ دبا۔ اب جو دیکھتی ہوں تو گالوں پر آنسو۔ "شائستہ۔" آپ نے مشکل سے کہا۔ "مجھے اس قدر عاجز نہ کرو۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

... وہیں نے اُسے یاد دلایا۔

... ہنسی۔ "مصیبت یہ تھی کہ کرامت بھائی کو اکثر دورے پر جانا پڑتا تھا۔ ایک بار جو وہ پندرہ دن کے لئے دورے پر چلے گئے۔ تو سکندر ... رہ گئے۔ اُف! کس قدر اُداسی میں کٹے وہ دن ——— میں بیٹھی کرامت کا انتظار کیا کرتی۔ کب وہ آئیں اور ——— ... کے لئے، اور پھر جب جانے لگتے تو میں ان کی خوشامدیں کیا کرتی۔ کرامت بھائی نہ جاؤ۔ خدا کے لئے آج نہ ———

... وہ اٹھ ... اپ ...۔" وہ چلائی۔ "دیکھو" اس نے سونٹا میرے سامنے رکھ دیا۔ "سارا اُلٹا بُن گئی ہوں۔ میں بھی پاگل ہوں۔ باتوں ہی باتوں میں کھو گئی۔ نہ جانے کیا کیا بکتی رہی ... ... پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اتنا ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ عین اُس وقت باہر سے سکندر کی آواز آئی۔ وہ چونکی۔ "وہ آ گئے۔" اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولی۔ "کبیر بھائی! جاؤ تم ———" وہ دفعتہ رُک گئی اور جھینپ کر بات بدلنے لگی ——— "پرسوں ہیں نہ دکوں کی شادی، پرسوں ——— ۔"

نہ جانے اس وقت کیا ہوا مجھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں پھیل رہا ہوں۔ پھیلے جا رہا ہوں۔ تمام فضاؤں پر چھائے جا رہا ہوں۔ ارد گرد کی چیزیں سمٹ رہی تھیں۔ وہ صحن، دیواریں گڑیا کے گھر کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ گڑیا میرے سامنے کٹ پتلی کی طرح بیٹھی تھی۔ سامنے دروازے میں ایک گڈا دیوار، صحن اور زمین کو گھور رہا تھا۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا مجھے، جیسے وہ ایک تماشا گاہ ہو جہاں کٹ پتلیاں ناچ رہی تھیں۔

"پرسوں چلے جانا" گڑیا نے ما تھا ٹیک کر کہا۔

"پرسوں؟" میں ہنسا۔ "نہیں پرسوں نہیں۔"

"تو کیا؟" وہ گھبرا کر بولی۔

"میں تو یہاں ایک مہینہ ٹھہروں گا تمہارے پاس۔" یہ کہہ کر میں باہر سیر کے لئے نکل گیا۔ گڈا اندر بیٹھا غصے میں بڑبڑا رہا تھا۔

" جنسیات کا موضوع چونکہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے ہر انسان اس میں دلچسپی لیتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض سماجی بندھنوں کے باعث، وہ اُس کے متعلق زیادہ کہنے سُننے پر آمادہ نہ ہو۔ لیکن ایسے سماج کے افراد بھی تنہائی میں اس قسم کی کتابیں پڑھ کر لطف لیتے ہیں جن میں جنسی باتوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ چونکہ انسانی دل و دماغ پر یہ جذبہ سب سے زیادہ حکومت کرتا ہے۔ اس لئے اُس کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنی ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔ وہ لوگ جو اس کے متعلق کچھ کہنے یا سُننے کو معیوب سمجھتے ہیں۔ دوسروں کو ایک فریب دینا چاہتے ہیں اور خود تنہائی میں اُس سے لطف لیتے ہیں۔" (ڈاکٹر عبادت بریلوی)

ایک طویل اور مسلسل افسانہ

فرار

حسن محمود عروج

گذشتہ سے پیوستہ

لیکن اس منزل پر بھی یقین نہ ہو رہا تھا۔ دل کی ہر دھڑکن ایک شک پیدا کر دیتی تھی اور دماغ کی ہر کروٹ کچھ نئے اوہام سامنے لا رہی تھی ــــــــ شک و وہم کے عالم میں مفلوج ہو کر رہ گیا تھا اور زندگی کی حرکت جیسے رک گئی تھی۔

کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتا تو ایک خواب کا سا عالم طاری ہو جاتا۔ دور تک ایک گھنگھور پگڈنڈی نظر آتی۔ سوچتا شاید وہ اسی راہ سے ہو کر آیا ہے۔ سامنے نظر اٹھتی تو ایک بے آب و گیاہ بیابان نظر آتا جہاں سے ہو کر اسے گزرنا تھا ــــــــ اپنے پاؤں کے چھالوں پر نظر ڈالتا اور سوچتا یہ سفر کیسے طے ہوگا؟

وہ تنہائی پسند ہو چلا تھا لیکن سب مست اسے مکان پر ٹکنے دیتا اور نہ التوا وقات میں اپنے ساتھ کھینچے پھرتا تھا۔

بارہا اس کا جی چاہا کہ برما سے واپس چلا جائے لیکن ہندوستان میں گیہوں مہنگا ہوتا جا رہا تھا اور وہ فوج میں ملازمت نہ کر پا رہا تھا ــــــــ اسے حکومت کی ملازمت سے شروع ہی سے نفرت تھی۔ وہ ایک ایسی حکومت کی کسی بھی درجہ کی معاونت ایک غداری سمجھتا تھا جس نے ہندوستان کا سب کچھ چھین کر ہر طرف بھوک اور فاقہ پھیلا دیا تھا۔ جب گھر جانے کی امنگ اٹھتی۔ سوچنے لگتا اگر گھر میں کھانے کو مل سکتا تو برما کیوں آتا ــــــــ؟ اور اگر یہاں سے بے جانے کے لئے ندوزر دستا ہوتا تو چینی رنگ کی دوشیزہ کیوں چھین لی جاتی ــــــــ پھر وہ حکومت اور سندا دونوں کو مجرم سمجھنے لگتا اور دونوں کے خلاف اپنے دل میں ایک اشتعال سا محسوس کرتا۔ لیکن اس کی قنوطیت اس کے ان گرم گرم جذبات کو فوراً ٹھنڈا کر دیتی تھی اور بجائے نفرت و انتقام کے آنسو بہانے لگتا۔

اس کے دل میں نہ جانے کہاں کی سردی آسمائی تھی کہ تنکرو خیال تک ٹھٹھر کر رہ گئے تھے اور اسے اپنی آنکھوں سے آنسو بہانے کے لئے بھی آتشیں اساہی کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ جب تک اساہی کے تیز و تند گھونٹ حلق سے اتر کر سینے میں ایک ہلکی سی حرارت نہ پیدا کر دیتے۔ وہ اپنے قنوطیت نواز اشعار اور رجعت پسند افسانے بھی نہ لکھ پاتا تھا ــــــــ اور اس کو یوں ٹھٹھرتا ہوا دیکھ کر سرمست کو اتنا رنج ہوتا تھا کہ جیسے اس کی کوئی متاع عزیز لٹی جا رہی ہے۔ وہ اپنے دوست کو آسمان کی لامحدود فضاؤں میں دبالکشا دیکھ چکا تھا اور اب اسے زمین کی پستیوں میں لوٹتا ہوا دیکھ کر تڑپ جاتا تھا اور اپنی پنج وقتہ نمازوں میں پھر اپنے دوست کو اسی عروج و بلندی پر دیکھنے کی دعائیں مانگا کرتا تھا۔

اور شاید اس کی دعائیں قبول ہو گئیں ــــــــ!

آخر ایک دن جاپانی آتش فشاں پھٹ گیا اور گرم گرم لاوا ابلنے لگا ــــــــ زلزلے کے جھٹکوں نے سارے رنگون کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ــــــــ سارا رنگون بھاگ پڑا جیٹی پر میلہ لگ گیا اور اسٹیشن پر بھیڑ جمع ہو گئی۔ جیسے رنگون کا ہر آدمی رنگون سے بھاگ جانا چاہتا تھا ــــــــ عورتیں، مرد، بوڑھے، بچے اور جوان لڑکیاں ــــــــ اور ان جوان لڑکیوں کو دیکھ کر اسے چینی دوشیزائیں یاد آ گئیں۔ جو چین کی سرحدوں سے ابلتی چلی جا رہی تھیں اور رستورانوں میں سماتی چلی جا رہی تھیں۔ نہ جانے کیوں اسے خیال آنے لگا کہ یہ دوشیزائیں جہازوں سے اتر اتر کر اجنبی مردوں، امریکی فوجیوں اور گورے تنگوں کے تنگ آغوشوں میں سما جائیں گی اس کی روح جیسے مجروح ہو کر تڑپنے لگی۔ اس کی قومی غیرت جاگ اٹھی اور وہ تنکر پرواز کرنے لگی ــــــــ "عرلمزادے ہم غلاموں کو ستا کر کیا پائیں گے؟" ــــــــ

اس نے جاپانیوں کے متعلق سوچا۔ پھر اس نے جو نظم لکھی اس میں عزم و جرأت کی بجلیاں تڑپ رہی تھیں ــــــــ لیکن عوام میں بدحواسی پھیل گئی تھی

سیاسی سرگرمیوں کا دل سینے میں بیٹھ کر رہ گیا۔ اسٹیج کی گرمیاں سرد ہو کر رہ گئیں۔ قائدین اپنا سر چھپانے لگے اور ہزاروں کے مجمع میں چہکنے والے بلبلیان شکر قال و قیل بند یا ہوا ______ نامعلوم اور لامحدود فضاؤں میں نہ جانے کہاں پرواز کر رہے تھے، رنگون سے کہیں بہت دور ______ شمالی برما کی بلندیوں پر یا شاید ہندوستان کے پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں پر!

ہزاروں کو آرام، طوطا رام قطار در قطار نظر آ رہے تھے جس فضا میں بمبار طیارے لہرا رہے ہوں۔ وہاں کو آرام طوطا رام بال افشانی نہیں کر سکتے برما شمال میں اونچا اور جنوب میں نیچا ہے۔ برما کا ہر دریا شمال سے جنوب کو بہتا ہے۔ مگر جاپانی آتشیں دھارے جنوب سے شمال کی طرف دوڑتے آ رہے تھے۔ آتشیں لاوا تحتانی برما سے فوقانی برما کی طرف امنڈتا آ رہا تھا اور ہر شے خاکستر ہوتی جا رہی تھی، تباہی کے دیوتا نے اپنا منہ کھولا اور جو کچھ تھا اسے نگلنا شروع کر دیا۔ لیکن حکومت مسلسل اعلان کئے جا رہی تھی "سب خیریت ہے" "تخلیہ رنگون کے منصوبے" نہ جانے کہاں منہ چھپائے پڑے تھے، محکمہ مدافعت شہری کی میزوں کی دراز میں یا شاید سرپرائز کی جیب میں! مسٹر ہیچنگ شاندار سگار پی رہے تھے۔ دھوئیں کے مرغولے ناچ رہے تھے اور ہندوستانیوں کو بھاگنے کی راہیں نہ مل رہی تھیں ______ ہر طرف جیسے پانچواں کالم پھیل گیا تھا۔ طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ہر طرف افراتفری اور سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے میں اس کے جذبات بھڑک اٹھے گئے اور اس کی قنوطیت ختم ہو گئی۔ وہ حکومت سے پوچھ رہا تھا "حکومت ہماری حفاظت کے لئے کیا کر رہی ہے؟" عوام سے کہہ رہا تھا "جنگ لڑنے کے لئے ہوتی ہے۔ ڈرنے کے لئے نہیں" لیکن نہ حکومت نے کوئی جواب دیا نہ عوام نے توجہ کی۔

مدرسہ لامحدود مدت کے لئے بند کر دیا گیا تھا۔ وہ سوچتا اسے اس طرح کب تک تنخواہ ملے گی لیکن کچھ لگتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اسے کوئی فکر نہیں ہے اور اعلان جنگ سے ذرا بھی ہراساں نہیں ہوا۔

جیٹی پر ہزاروں کا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا اور جب ۲۳ دسمبر کو پہلی مرتبہ جاپانی طیارے رنگون پر منڈلا کر چلے گئے تو ایسا معلوم ہونے لگا کہ رنگون کا ہر آدمی سمندر میں کود پڑنا چاہتا ہے۔ ٹکٹ کا چور بازار شروع ہو گیا پھر صرف وہ لوگ ٹکٹ خرید سکے جنھوں نے آنکھیں میچ میچ کر روپے دیئے ______ رنگون ہی نہیں بلکہ پورے برما میں بسنے والے دس لاکھ ہندیاں مقیم برما اس وقت بدحواس و سراسیمہ تھے۔ لیکن مسٹر ہیچنگ ایجنٹ حکومت ہند غالباً عیسائیوں اور بدھ سے دل بہلاتے رہے اور دھواں سگار کے دھوئیں فضا میں بکھیرتے رہے۔ ہندوستانی سمجھ رہے تھے کہ مسٹر ہیچنگ ان کے لئے کچھ کریں گے لیکن جب ہندوستانیوں کی ایک جماعت ان سے ملی تو انھوں نے خندہ پیشانی سے سگار کا کش لیا۔ دھوئیں کے چھلّے فضاؤں میں بکھیرتے ہوئے کہا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں؟" ______

اور واقعی مسٹر ہیچنگ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جاپانی طیاروں کو حملہ کرنے سے کیسے روک سکتے تھے وہ تو جو سے کس طرح کہہ سکتے تھے کہ ______

"بھائی! ذرا سنبھال کر یہاں غلام ہندوستانی بھی بستے ہیں" اور برمی حکومت ______ ؟

مسٹر ہیچنگ اس سے بھی کیا کہہ سکتے تھے۔ جہاز برمی حکومت کے نہیں تھے بلکہ بی آئی کمپنی کے تھے ______ لہٰذا مسٹر ہیچنگ کچھ نہیں کر سکتے تھے اور انھوں نے کچھ نہیں کیا ______ ہندوستانیوں کا سرمایہ دار طبقہ وہاں سے مایوس ہو کر منہ لٹکائے جیبوں میں ہاتھ ڈالے جیٹی پر دربانوں سے سرگوشیاں کرتا نظر آیا۔

مسٹر ہیچنگ واقعی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جیٹی کا دربان انھیں ایک چھوڑ چار ٹکٹ دلا سکتا تھا مگر غریب اور بے مایہ لوگوں کے لئے وہ بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ٹکٹ کے لئے ٹکٹ گھر پر صبح سے شام تک لائینیں لگی رہتیں اور شام کو ہر آدمی خالی ہاتھ واپس آ جاتا۔

"ٹکٹ نہیں مل سکتا!" ______

"ٹکٹ ختم ہو گیا!!" ______

"ٹکٹ نہیں ہے!!!" ______

"ٹکٹ کہاں ہے؟"——————

ٹکٹ وہاں کہاں تھا، ٹکٹ کسٹم آفیسروں، جہاز کمپنی کے کلرکوں اور دربانوں کی جیبوں میں تھا اور وہاں سے شہر کے سرمایہ دار ہاتھوں میں پہنچ جاتا تھا۔ جہاز کا ٹکٹ ملیا، آگیا —— بدھوا کلوا —— اور کریم عظیم کے لئے نہیں تھا۔ ٹکٹ تھا بدھو داس، ا تو داس اینڈ کمپنی کے پروپرائٹر کے لئے ——ٹکٹ تھا کوارام طوطارام کے لئے، جن کی جیبوں میں زرد زرد سونا بھرا ہوا تھا —— جنھوں نے برما میں زمینیں خریدی تھیں۔ ہندوستان کے کم اجرت مزدوروں کو بلاکر دھان اگایا تھا۔ پھر سارا دھان جلاکر سونا بنالیا تھا اور اب ان مفلس مزدوروں کو چھوڑکر جیبوں میں سونا اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے جہاز پر بیٹھے ہوئے تھے۔

کوارام طوطارام دو روپے سے کر برما آئے تھے۔ پندرہ لاکھ نقد لے کر جہاز پر بیٹھے۔ دس ہزار روپے کی املاک منتقل نہیں ہوسکتی تھی۔ جان ہے تو جہان ہے کتنا بڑا نقصان ہو رہا تھا بے چاروں کا —— کوارام طوطارام کا دل سینے میں ٹوٹ گیا اور جہاز ہندوستان کی طرف چل پڑا —— ملیا آگیا، بدھوا کلوا اور کریم عظیم اپنے بیوی بچوں کا ہاتھ تھامے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے اور جہاز سمندر کے سینے پر مچلتے ہوئے نگاہوں سے اوجھل ہوتے چلے گئے۔

——————:(۱۰):——————

اس کا ذہنی جمود اور قلبی تعطل ان چوٹوں کی تاب نہ لاسکا۔ ان ضربوں نے دل کی چوٹیں پھر ابھار دیں۔ غم و آلام کی عمومیت نے اسے زندہ کردیا —— روح جو مایوسیوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی کراہ رہی تھی پھر چیخنے لگی دل جو شاید تھک کر بے دم سا پڑ گیا تھا پھر تڑپنے لگا اور اس میں سوتا ہوا جذبِ محبت پھر انگڑائی لیکر جاگ اٹھا چمپئی رنگ کی دوشیزہ کرما جو ایک بھولے ہوئے سے مبہم خواب کی طرح خیالوں کے نہ جانے کس کونے میں موہوم سی نظر آرہی تھی: دماغ کے پردوں پر پھر اُجاگر ہونے لگی۔ کرب و اذیت کی لذتیں جو کچلی ہوئی حیات مجبور کی طرح بے حس ہوگئی تھیں انھیں نئی قوت ملی اور جیسے کچھ تازہ اذیتوں نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا —— اور وہ اپنی قنوطیت کی سرحدیں پھاند گیا۔

چمپئی رنگ ہر طرف ابھر آیا تھا اور کرما آنکھوں میں رقص کرنے لگی تھی، دماغ بیتی ہوئی باتیں یاد کرتا اور دل تڑپنے لگتا —— وہ اگریکلچر گارڈن چلا جاتا اور گھنٹوں اس گھنیرے کنج میں لیٹا رہتا، جہاں اس نے محبت کی نہ جانے کتنی حسین ساعتیں گزاری تھیں اور مسرتوں کے لاتعداد لمحے بسر کئے تھے۔ ہری ہری گھاس پر لیٹ جاتا اور تصورات میں کھویا ہوا اپنی کرما سے باتیں کرتا رہتا۔ اُسے کرما کا ایک ایک لفظ یاد آتا اور ہونٹوں کی ایک ایک حرکت آنکھوں میں سما جاتی اور جب وہاں سے اٹھتا تو محسوس کرتا کہ جیسے اپنی کرما سے باتیں کرکے آرہا ہے۔

ایک دن بستر پر لیٹا ہوا اپنے تصورات میں کھویا ہوا تھا کہ آسمان پر ابر آگئے۔ چمکتا ہوا سورج بادلوں میں چھپ گیا اور ننھی ننھی پھوار پڑنے لگی۔ اُسے ایک ایسا ہی نشیلا دن یاد آگیا۔

—— تخیل نے زمانہ کی رفتار پلٹ دی اور وقت اُسے اپنے بازوؤں پر لے اڑا، اور تیز بہت ہی تیز اڑ رہا تھا۔ بہتے ہوئے دنوں کے اندر سہانی گھڑیاں اس کا استقبال کرتی رہیں اور ماضی کے نشے نے بیہوش کردیا۔ وہ ماضی کے گیارہ مہینوں کا فاصلہ انھیں تمام کیفیات کے ساتھ چند لمحوں میں طے کر گیا۔

—— کنج چاروں طرف سے گھنی جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا —— اس کی کرما اس کے گلے میں باہیں ڈالے جھول رہی تھی۔

"ایک جھولا ڈالا میں نے سیّاں کی گود میں —— سیّاں کی گود میں"

اور کرما نے پہلی ہی پینگ لی تھی کہ اپنے سیّاں کے ساتھ زمین پر آرہی۔ دونوں مسکرانے لگے اور کرما مدھر کومل سُروں میں اس کے گلے میں اپنے بازو لپیٹے گنگناتی رہی —— (باقی آیندہ)

لاگ اور لگاؤ کے بغیر

ہماری نظر میں

تبصرے

انتخاب مومن ——————— مرتبہ جناب وقار عظیم صاحب، ایم اے،

مطبوعہ اردو مرکز، گنپت روڈ لاہور، کتابت وطباعت نفیس، قیمت مجلد مع گردپوش دو روپے

غدر سے پیشتر دلی میں تین بڑے شاعر تھے۔ مومن، غالب اور ذوق۔ ان میں سے آخری دو شاعر دربار مغلیہ سے وابستہ تھے اور غالباً اسی وجہ سے ہمارے بعض ممتاز اہل قلم نے شاعر کی حیثیت سے ان دونوں کو مدمقابل سمجھ لیا اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کوشش میں بیجا مبالغہ سے کام لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں شاعروں میں باہم کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا اس لئے کہ تینوں اپنے اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔ اس بیجا تقابل کا ایک خراب نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اک سرے سے مومن کو بھول ہی گئے اور ان کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ پبلک کو جناب وقار عظیم کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ انھوں نے "انتخاب مومن" شائع کر کے پبلک کو صحیح مقام سے آشنا کیا اور بتایا کہ اردو علم ادب میں ان کی حیثیت کیا ہے ——— "انتخاب مومن" کے شروع میں جناب وقار عظیم صاحب نے ۸۰ صفحات کا فاضلانہ تبصرہ تحریر فرمایا ہے جس میں انھوں نے مومن کی زندگی اور شاعری پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس کے جملہ پہلوؤں کو نہایت واضح طریقہ پر اُجاگر کیا ہے۔ انھوں نے اپنے طرز بیان کے ثبوت میں مومن کے جستہ جستہ اشعار بھی دیئے ہیں تاکہ پڑھنے والے کے دل پر ان کے استدلال کی صداقت واضح ہو جائے۔ اس تبصرہ کے پڑھ لینے کے بعد مومن کی شاعری کے جملہ بنیادی پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں ہمارے مصنف نے ان کی شاعری پر بحث کرتے وقت جانبداری یا افراط و تفریط سے کام نہیں لیا بلکہ ان کی تمام تر کوشش صرف یہ رہی ہے کہ بلا رعایت وہ مومن کے ساتھ انصاف کریں۔ مومن کے ساتھ انصاف کرتے وقت انھوں نے کسی دوسرے شاعر کو اس کے رتبہ سے گرانے کی کوشش نہیں کی اور یہی ان کے تبصرہ کے خلوص کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ یقین واثق ہے کہ وقار عظیم صاحب کی یہ ادبی کوشش ان تمام غلط بیانیوں کو دور کر دے گی جو بعض ناقدین نے مومن کی شاعری کے متعلق پھیلا رکھی ہیں۔ وقار عظیم صاحب نے یہ کتاب لکھکر ادب کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے اُردو کے ہر شیدائی کا فرض ہے کہ وہ اس کی سرپرستی کرنے سے دریغ نہ کرے۔

اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ———————

سلطنت مغلیہ کے تمام بادشاہوں میں سب سے بدنام اورنگ زیب عالمگیر ہی کی ذات ہے۔ اس کے پنجاہ سالہ عہد حکومت کو نہ صرف ہندوؤں نے بلکہ انگریزوں نے بھی دنیا کے سامنے مسخ کر کے پیش کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اب آہستہ آہستہ ان تمام غلط بیانیوں کا پردہ چاک ہو رہا ہے اور ضرورت ہے کہ ہم اپنے بادشاہوں کے کیرکٹر سے ان تمام بدنامیوں کو دھو ڈالیں جو مختلف مورخین نے تعصب و جانبداری کے جذبات سے سرشار ہو کر ان کی سیرت پر منڈھنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضرورت کا سب سے پہلے مولانا شبلی مرحوم کو احساس ہوا اور انھوں نے "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" لکھکر نہ صرف مختلف الزامات کی صفائی پیش کر دی بلکہ بتا دیا کہ مورخین نے کہاں کہاں دیدہ و دانستہ غلط بیانیوں سے کام لیا ہے۔ یہ کتاب تاریخی و علمی اعتبار سے بیحد وقیع ہے اور اس وجہ سے وہ تاریخ کے ہر طالب علم کے لئے نعمت غیر مترقبہ کا حکم رکھتی ہے۔ مدت سے اس کا صحیح نسخہ میسّر نہ تھا۔ اب اس کو پورا کر کے طالب علموں کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ خدا کرے کہ ان کی یہ سعی ہر طرح سے مشکور ہو۔

سفید کاغذ، طباعت کتابت عمدہ، خوبصورت ڈسٹ کور، تین تصاویر بھی شامل ہیں قیمت مجلد عہ

شائع کردہ:- اردو مرکز، گنپت روڈ، لاہور



• معارفِ اقبال ـــــــــــــــ مؤلفہ عبدالرحمٰن طارق. بی اے

صفحات ۲۹۰ — قیمت تین روپیہ — شائع کردہ۔ اشاعت منزل۔ لاہور

غالب کے بعد سب سے زیادہ جس شاعر کے کلام کی چھان بین کی گئی ہے وہ اقبال ہیں۔ اقبال نے ہم کو اسلامی فلسفہ کی روح عطا کی ہے۔ اس کتاب میں قرآن پاک کے بہت سے اقتباسات ہیں۔ جو کلامِ اقبال کی روحانی۔ مذہبی اور تعمیری و افادی خصوصیات کو واضح کرتے ہیں۔ اقبال کو اس مقدس ترین کتاب سے گہرا عشق تھا۔ اسی لئے وہ آیۂ قرآنی کا کہیں پر ایک جزو لاکر کہیں مختلف قرآنی قصوں کی طرف لطیف اشارے کرکے، کہیں انبیائے کرام کے معجزات کا حوالہ دے کر، کہیں اخلاق قرآنی کی وساطت سے اور کہیں اقدامِ قرآن کے عبرتناک مآل کی جانب توجہ دلاکر صراطِ مستقیم کی انقلاب انگیز معنوی خوبیاں بتاتے ہیں۔

عبدالرحمٰن طارق نے اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے میں بہت محنت کی ہے۔ ان کی اقبال پر اور بھی کتابیں ہیں۔ ان میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے کاغذ بھی برا نہیں۔

• اسلام کے مشہور سپہ سالار ـــــــــــــــ (حصہ اول۔ حصہ دوم) از مولانا عبدالواحد سندھی

قیمت حصہ اول۔ دو روپے آٹھ آنے۔ قیمت حصہ دوم۔ دو روپے آٹھ آنے۔ ناشران۔ فاران لمیٹڈ۔ میرٹ روڈ۔ کراچی

حصہ اول میں مولانا عبدالواحد سندھی نے اسلام کی پہلی فوج کی کہانی سنائی ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکردگی میں میدانِ بدر میں لڑی اور دنیا کے کونے کونے میں اسلامی روایات، اُس کے عدل، اُس کے انصاف کا ڈنکا بجایا اور ان بہادروں کا مفصل ذکر کیا ہے۔ جنھوں نے اپنی زندگی اسلام اور بانیٔ اسلام کے لئے وقف کردی تھی۔ یہ کہانی محض کہانی کے لئے نہیں بلکہ ایک راستہ پر روشنی ڈالنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ ان مشہور سپہ سالاروں کے وہ واقعات دکھلائے ہیں۔ جن کے پڑھنے کے بعد یقینِ محکم۔ عملِ پیہم کا سبق حاصل ہوتا ہے۔

دوسرا حصہ ۹ عنوانات پر منقسم ہے۔ جن میں سے چند یہ ہیں ـــــــــــــــ اسلامی فوج کیسے بنی۔ قتیبہ بن مسلم باہلی۔ فاتح وسط ایشیا محمد بن قاسم۔ فاتح سندھ طارق بن زیاد وغیرہ

یہ بڑے بڑے فاتح ایسے ہیں جو ہمارے لئے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔ لیکن افسوس ہم اپنی روایات کو بھولے ہوئے ذلت کی زندگی گذار رہے ہیں۔

مولانا کا اندازِ تحریر بہت دلکش و مؤثر ہے۔ سامنے تصویریں کھنچ جاتی ہیں اور اپنی موجودہ حالت کا احساس ہوتا جاتا ہے۔ دونوں کتابیں کلامِ پاک کی روشنی میں لکھی گئی ہیں اور ناشرین نے بھی ان کو شائع کرنے میں بہت محنت کی ہے۔ ہم اپنے قارئین کو ان کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔

• اسلام کے مشہور امیر البحر ـــــــــــــــ مؤلفہ عبدالواحد سندھی

صفحات ۳۹۲ — قیمت دو روپیہ بارہ آنے — ناشران۔ فاران لمیٹڈ میرٹ روڈ۔ کراچی

یہ بھی مولانا عبدالواحد سندھی کی بہترین طرزِ نگارش کی آئینہ دار ہے۔ اس میں انھوں نے صرف اسلام کے مشہور امرائے بحر کا حال آسان اور عام فہم زبان میں نہیں لکھا ہے بلکہ اور بہت سے ابواب کا اضافہ کیا ہے۔ مثلاً قرآن پاک میں سمندروں اور جہازوں کا بیان۔ دنیا میں جہاز سازی جہاز رانی کی ابتدا کیسے ہوئی۔ مسلمانوں نے جہاز سازی میں کیا کچھ کیا۔ اسلامی جنگی جہازوں کے کارخانے۔ مشہور اسلامی بندرگاہیں۔ مسلمانوں کے روشنی کے مینارے۔ مسلمانوں کا سمندر پر اقتدار وغیرہ جو صرف بچوں کے لئے کارآمد اور مفید ہیں بلکہ بڑوں کے لئے بھی کارآمد معلومات کا ذخیرہ ہیں۔ جن سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔

کتاب سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ طباعت اور کتابت دیدہ زیب ہے۔ قارئین اپنے بچوں کو اس کا مطالعہ ضرور کرائیں۔

• پیکراں ـــــــــــــــ جگن ناتھ آزاد

صفحات ۱۹۰ — قیمت دو روپیہ آٹھ آنے — شائع کردہ۔ مکتبہ قصرِ اردو۔ اردو بازار دلی

آزاد سے اردو کی اور ہماری بہت سی امیدیں وابستہ ہیں اور وہ دن بدن ہوتے بھی جا رہے ہیں ویسے ہی!

"بیکراں" وان کی نظموں، رباعیوں، غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جیسا کہ فراق نے لکھا ہے کہ ان کی شاعری کتابی شاعری نہیں ہے بلکہ زندگی کی آواز ہے۔ ایک چوٹ کھائے ہوئے مگر سوچنے والے دل کی پکار ہے ـــــ اسی لئے طباعت و کتابت کی متعدد کمزوریوں کے باوجود یہ شعریت ساری کتاب پر چھائی ہوئی ہے اور پھر ـــــ دیکھنے والی نظریں دیکھ ہی لیتی ہیں کہ کہاں شاعر نے لغزش کی ہے اور کہاں ناشر نے ـــــ اس میں شاعر کی لغزش بہرے ہی سے موجود نہیں ـــــ

آزاد ایسا شاعر ہے جس کی آواز کو، جس کے خیالات کو ہر فرد تک پہنچنا چاہئے اور اس کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ یہ کتاب گھر گھر پہنچ جائے۔ ہم اپنے قارئین سے متمنی ہیں کہ وہ اس کتاب کو ضرور خریدیں۔ لیکن ناشر سے شکوہ ہے کہ انھوں نے کتاب چھاپنے میں زیادہ توجہ نہیں دی۔

* **ازدواجی الجھنیں** ـــــ مؤلفہ جی۔ ایم۔ آزاد

صفحات ۲۳۸   قیمت پانچ روپے   ناشرین۔ ادارہ نفسیات کراچی

اس کتاب کا نفس موضوع بہت اہمیت رکھتا ہے۔ خصوصاً ہمارے سماج میں شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں۔ ان کے ناکامی کے اور وجوہ بھی ہوتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ اہم وجہ جنسی معلومات کی کمی ہے۔ مرد عورت کے متعلق کچھ نہیں جانتا اور عورت مرد کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ صرف یہی نہیں۔ خود عورت اپنی جسمانی ساخت سے بے خبر ہوتی ہے اور مرد اپنی جسمانی بناوٹ سے!

آزاد صاحب نے شادیوں کی ناکامی کا جنسی پہلو دکھایا ہے اور جنسی تعلیم کے نہ ہونے سے جو جو قبیح عادتیں مردوں اور عورتوں کی زندگیاں برباد کر دیتی ہیں ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ انداز تحریر ایسا ہے کہ پڑھنے سے یہ صاف صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ انگریزی کتابوں سے لئے ہوئے نکات جمع کر دیئے گئے ہیں۔ گو کہ موصوف نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ اپنے ذاتی تجربوں کا رنگ دیا جائے۔

انگریزی میں جنسی پہلو پر ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ بڑے بڑے ماہرین نفسیات ـــــ ہیولاک ایلس، وڈکسن وغیرہ وغیرہ ـــــ نے سال ہا سال کے تجربوں کے بعد جنسی جذبوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اردو میں بھی چند اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں سے ایک نیاز فتحپوری کی "ترغیبات جنسی" ہے۔ کچھ انگریزی مصنف جنسیت کا شکار ہو گئے ہیں۔ اسی لذت میں آزاد صاحب بھی بہہ گئے ہیں اور نفس موضوع پر محققانہ روشنی ڈالنے کے بجائے چٹخارے بھرنے لگے ہیں۔ مثلاً انھوں نے ان اشتہاروں کا ذکر کیا ہے جو گھٹیا قسم کے پرچوں اور اخباروں میں "اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا" کے عنوان سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

اور پھر ـــــ آزاد صاحب نے ساری ذمہ داری مردوں ہی پر تھوپ دی ہے۔ عورتوں کو بالکل معصوم بتایا ہے۔

قیمت بھی بہت زیادہ ہے۔ جس سے یہ خیال قائم کرنا بجا ہوگا کہ یہ صرف سرمایہ داروں کے لئے لکھی گئی ہے۔ جو اپنی عیاشی پر جہاں ہزاروں روپیہ خرچ کرتے ہیں وہاں پانچ روپیہ اور سہی ـــــ غریب عوام اس کو خریدنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

ہم آزاد صاحب سے اتنا کہنے کے تو حقدار ہیں ہی کہ اگر پھر کبھی اس موضوع پر قلم اٹھائیں تو اپنا انداز تحریر بدل لیں۔ اس میں "گناہ کی لذت" نہ شامل کریں اور ادارہ نفسیات سے بھی کہیں گے کہ آئندہ اتنے کم صفحات کی کتاب کی اتنی زیادہ قیمت رکھنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

* **سرد شعلے** ـــــ مصنفہ جی۔ ایم۔ آزاد

صفحات ۱۶۲   قیمت دو روپیہ   ناشرین: ادارہ نفسیات کراچی

جی۔ ایم۔ آزاد کے "نفسیاتی" افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ہم نے شروع کے چند افسانے پڑھے۔ یوں تو ہر افسانہ نفسیاتی ہوتا ہے۔ مگر ان افسانوں میں کوئی خاص نفسیاتی پس منظر موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے ان کو نفسیاتی افسانوں کا مجموعہ کہا جائے۔

افسانہ کی "تکنیک" بھی اکثر افسانوں میں نہیں پائی جاتی۔ کہیں پر ڈرامائی انداز ہے کہیں پر بیانیہ انداز!

موضوع کے لحاظ سے بھی یہ افسانے اہمیت نہیں رکھتے ـــــ اور پھر سب سے زیادہ حیران کن اختر انصاری اکبر آبادی کا پیش لفظ ہے۔ انھوں نے

نازؔ صاحب کو بڑے بڑے افسانہ نگاروں کی صف ہی میں کھڑا نہیں کیا بلکہ ان سے بھی بڑھا چڑھا دیا ہے۔ ہمارے نزدیک نازؔ صاحب افسانہ نگاری میں نبتدی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اختر انصاری صاحب سے ہم صرف اتنا شکایت ہے کہ وہ اپنی "دوستی" کو خوش فہمی اور غلط فہمی کا ذریعہ بنائیں۔

سب سے زیادہ تعجب تو شاہد احمد دہلوی کی ان چند سطروں پر ہوتا ہے جو انھوں نے نازؔ صاحب کے افسانوں کے متعلق لکھی ہیں۔ ہم شاہد احمد صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ واقعی میں اتنے "عام" ہو گئے ہیں؟

• ہفتہ وار "پیام مشرق" کراچی ——— سائز ۲۰×۳۰/۴ ۱۲ صفحات

ابھی حال ہی سے یہ ہفتہ وار پرچہ فصیح الدین احمد اور جمیل جالبی صاحبان کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ فصیح الدین احمد صاحب حیدرآباد سے "پرچم" نکالتے تھے۔ وہ پرچہ کی ترتیب سے اچھی طرح واقف ہیں اور اچھے اچھے لکھنے والوں کا تعاون حاصل کر چکے ہیں۔

کراچی میں ماہوار پرچوں کی تو بھرمار ہے۔ لیکن ہفتہ وار پرچوں کی کمی ہے۔ ایک دو جو نکلتے ہیں۔ وہ عوام کی تشنگی دور کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اسی لئے پیام مشرق کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں اور متمنی ہیں کہ پیام مشرق صالح خیالات کی اشاعت میں اور دوسرے مخلص پرچوں کا ہاتھ بٹائے گا۔

پہلے قیمت سات آنے تھی۔ اب ساڑھے سات آنے ہے۔ یہ قیمت کراچی نیز پاکستان کی غریب عوام کے لئے زیادہ ہے اور ہم کو عوام ہی کے ذہنوں میں صحیح "پیام" پہونچانا ہے۔ کیا امید کریں کہ فصیح الدین احمد صاحب توجہ کریں گے۔

مقام اشاعت: کوئنز روڈ، کراچی

• ماہنامہ "بربط" کراچی کا "سال نو" نمبر ———

بربط کراچی کے ان چند ماہناموں میں سے ہے۔ جن کو ممتاز اہل قلم کا تعاون حاصل ہے۔ ابھی پچھلے دنوں انھوں نے ایک ضخیم "خاتون نمبر" پیش کیا تھا اور اب "سال نو" کے پیغامات لئے سامنے موجود ہے۔

لکھنے والوں میں شاہد احمد دہلوی۔ ممتاز شیریں۔ ل۔ احمد قابل ذکر ہیں۔ مگر "سال نو" کے پیغامات بہت کم ہی نظر آتے ہیں۔ جن کا نہ تو شاہد احمد نے ذکر کیا ہے نہ ممتاز شیریں اور ل۔ احمد نے، جو بربط کے مایۂ ناز لکھنے والے ہیں۔ سال کے شروع میں افسانوں۔ نظموں اور مقالوں کو جمع کر کے اس کا نام "سال نو نمبر" رکھ دینا تو کچھ نہ ہوا۔

اس کا ایک حصہ "نفسیات" بھی ہے۔ جو جی۔ ایم۔ نازؔ صاحب کی نگرانی میں ترتیب پاتا ہے۔ یہ حصہ خصوصاً مزید توجہ کا محتاج ہے۔ نظموں کا حصہ کافی بلند ہے۔ خصوصاً ابو الفضل فیضی کو ایسے موقعہ پر یاد کرنا جدت ہے۔ بہ حیثیت مجموعی پرچہ بہت کامیاب ہے۔ اختر انصاری اکبرآبادی صاحب اور غالب صاحب آرٹسٹ کی تعریف کرنا ہی پڑتی ہے۔ کاغذ۔ کتابت اور طباعت پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

قیمت بارہ آنے — مقام اشاعت: بیرتھ داس روڈ۔ کراچی

• ماہنامہ "کائنات" لاہور ———

اس کے ایڈیٹر غلام محمد صاحب ہمت شکن حالات میں بھی جس جد و جہد سے "کائنات" نکال رہے ہیں۔ وہ قابل تحسین ہے۔ کائنات تقریباً بارہ سال سے نکل رہا ہے اور تمام ممتاز اہل قلم حضرات کا تعاون حاصل کر چکا ہے۔ مگر پھر بھی وہ بازاروں میں کم نظر آتا ہے۔ اس کی ایک ہی وجہ ہے۔ پاکستان کے عوام آسودہ حال نہیں ہیں۔ ان کو اطمینان سے سانس لینے کی مہلت نہیں ملتی اور پرچوں پر بھی اس غیر اطمینانی کیفیت کا اثر ہے۔ لیکن "کائنات" پر سب سے زیادہ معلوم ہوتا ہے

ہم غلام محمد صاحب کو مشورہ دیں گے کہ وہ ہمت نہ ہاریں اور ناسازگار حالات کا مقابلہ کرتے رہیں۔ پرچہ میں اہل قلم حضرات کے حالات زندگی اور تصویریں کے شائع کرنے کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ افسانے وقت کے دھڑکنوں کے ہمنوا ہوتے ہیں اور نظمیں امیدوں کے چراغوں کو جلاتی ہیں ——— قارئین سے درخواست ہے کہ وہ ایک اچھے پرچے کو ختم نہ ہونے دیں۔

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے — مقام اشاعت: ۲۲۱۹/E سوتر منڈی بازار، لاہور

• دو ماہی "شاہراہ" دہلی کا نمبر ۵ شمارہ ——— صفحات دو سو، قیمت دو روپیہ

"شاہراہ" ترقی پسند مصنفین کا نمائندہ پرچہ ہے جس نے اس قلیل مدت میں کافی مقبولیت حاصل کر لی ہے جس خوبی سے یہ عوامی زندگی کے ہر پہلو کو نمایاں کر رہا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ شمارہ نمبر ۵ ہمارے سامنے ہے۔ دو سو صفحات کا دلکش مجموعہ، نو ادب کے معماروں میں سے ایک ——— ڈان وسٹ ——— پر ڈاکٹر سلامت اللہ کا قلم جس جگہ کو اچھالتا ہوا بڑھا ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ مقالوں میں ——— سری نواس لاہوٹی اور ادارہ "ڈسلیشنٹ" فلسفہ اور زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ نظموں کے حصہ میں سب ہی چوٹی کے شاعر نظر آتے ہیں جیسے جوش۔ جاں نثار اختر۔ عدم۔ فکر۔ غلام ربانی تاباں۔ اختر ہوشیارپوری۔ فارغ بخاری۔ مسعود حسین وغیرہ وغیرہ اور افسانوی حصہ میں عصمت چغتائی۔ مہندر ناتھ۔ پریم ناتھ در۔ سرلا دیوی وغیرہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بین الاقوامی تہذیبی خبریں اور ادبی انتخابات کا حصہ بھی ہے جو ہم کو ہندستان کی محدود فضا سے نکال کر دوسرے ملکوں کی سیر کرتا ہے اور اس میں شامل کی ہوئی ایک درجن تصویریں جس انداز میں پیش کی گئی ہیں وہ "ترقی پسندی" کا آئینہ دار ہے۔

جہاں ہم یہ چند سطریں لکھتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں وہاں افسوس کے ساتھ یہ بھی لکھنا پڑ رہا ہے کہ افسانوں میں چند حصے ایسے بھی ہیں جن سے فرقہ وارانہ ذہنیت کی بو آتی ہے اور جو ہندوستان و پاکستان کے درمیان تنازع کی خلیج کو اور وسیع کرنے پر مصر ہے۔ ادیبوں کو اس تاریکی سے احتراز کرنا چاہئے۔

کراچی میں ملنے کا پتہ :- کتاب گھر نزد مسافر خانہ بندر روڈ، کراچی نمبر ۱

• ماہنامہ "عارف" لاہور ———

یہ "اشاعت منزل" لاہور کا نمائندہ پرچہ ہے جس کی ادارت عبد الرحمٰن شوق۔ حمید انور۔ عبد الرحمٰن طارق صاحبان کے ذمہ ہے۔ یہ پرچہ شروع سے آخر تک مذہبی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اسلام کے صحیح تصور واضح کئے گئے ہیں۔ یہ پرچہ ہماری سماجی زندگی کے ایک اہم پہلو کو تقویت پہنچاتا ہے۔

قیمت ۳ سالانہ تین روپے — مقام اشاعت: بل روڈ۔ لاہور

• ماہنامہ "حقیقتِ اسلام" لاہور ———

اسلامی ادب کے ناشر "پیکو لمیٹڈ" کا نمائندہ پرچہ ہے۔ جو ۳ سال سے برابر شائع ہو رہا ہے جس میں ہمارے اخلاقی، معاشی اور اقتصادی مسائل قرآن پاک کی روشنی میں دیکھے جاتے ہیں۔ یہ پرچہ اپنے مقصد میں بہت کامیاب ہے۔

قیمت ۶ سالانہ چھ روپے — مقام اشاعت: پیکو لمیٹڈ۔ سرکلر روڈ، لاہور

• ماہنامہ "فاران" کراچی ———

مولانا ماہر القادری شاعری کی دنیا میں کافی مشہور ہیں۔ انھیں کی ادارت میں یہ پرچہ پچھلے آٹھ، نو ماہ سے نکل رہا ہے۔ ہم نے اس کے سب ہی شمارے دیکھے ہیں۔ طباعت و کتابت اچھی خاصی ہوتی ہے۔ مگر اس میں ایک کمی سی محسوس ہوتی ہے ——— یہ کمی محسوس ہونا بھی چاہئے۔ کیونکہ یہ پرچہ ایک خاص حلقے اور خاص خیالات کا ترجمان ہے۔ ماہر صاحب نئے ادبی رجحانات کے سخت مخالف ہیں اور اپنے اداریہ میں، مضمونوں میں [illegible] ہیں اور اس حد تک مخالف نظر آتے ہیں کہ اس تحریک سے اچھائیوں کو چن کر اپنانے کے بھی قائل نہیں۔ ممکن ہو کہ ماہر صاحب کے نزدیک اس تحریک میں کوئی اچھائی ہی نہ ہو۔

ماہر صاحب ایک اچھے شاعر ہیں اور عوام و خواص میں کافی مقبول ہیں۔ شاعری میں الفاظ کی رنگینی اور جذباتی اثر سے تو وہ دلوں کو مسخر کر لیتے ہیں لیکن جب افسانہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو الفاظ سے زیادہ خیالات کی ضرورت پڑتی ہے اور ان کے خیالات، زمانے کی بڑھتی ہوئی قدروں کے ساتھ نہیں ہیں۔ اس لئے افسانہ نگاری میں وہ اتنے کامیاب نہیں ہوتے۔ لیکن ماہر صاحب کے نزدیک گویا اردو میں کوئی اچھا افسانہ نگار ہی نہیں ہے اسی لئے وہ اپنے پرچہ میں افسانے شائع کرتے ہیں۔ "فاران" روز بروز ایک مخصوص طبقہ کا پرچہ بنتا جا رہا ہے۔ جو اس کی افادیت کو ٹھیس پہنچا رہا ہے۔ اگر یہ کمی دور ہو جائے تو یہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

قیمت ۵ سالانہ پانچ روپے — مقام اشاعت: کیمبل اسٹریٹ، کراچی

سائیکالوجی

نگلستان کے مشہور نفسیاتی ماہنامہ کا اردو ایڈیشن







AHBAB

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سائیکولوجی

جلد ۲ — مارچ سنہ ۱۹۵۰ء — نمبر ۲

ادارہ تحریر

شاہدہ سلطانہ ایم اے
بیگم رئیس جہاں نیر انصاری
عابدی جعفر — بی اے

مدیر عمومی

انعام اللہ خان ڈی بی ایل

معتمد عمومی

علاء الدین خالد

سالانہ چندہ
پاکستانی سکہ چھ روپے
ہندوستانی سکہ ساڑھے سات روپے

فی پرچہ
پاکستانی سکہ آٹھ آنے
ہندوستانی سکہ دس آنے

دفتر

سائیکولوجی اردو، پوسٹ بکس ۵۶۶ کراچی ۲

مندرجات

پہلی نظر

آخر یہی کیا ضروری ہے کہ
ہم خوش ہی ہوں

جھوٹ اور جھوٹے

ماحول کی اہمیت

بات چیت

سلام و پیام

خود فریبی

جوہر اور جوہری توانائی

بھولوں کیسے

غزلیات

اشک و لہو

؟

فرار

پہلی نظر

اور یہ لیجئے "سالگرہ نمبر" کے بعد کا شمارہ، دوسری منزل کی طرف ہمارا دوسرا قدم ——— اب ہم کو خود اپنے خدمات پر اطمینان ہو چلا ہے۔ اور ہم یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ہم آپ کی صحیح معنوں کی خدمت کے قابل ہوتے جا رہے ہیں — ہم یہ جاننے لگے ہیں کہ آپ کی زندگی کے کون کون سے ایسے تاریک گوشے ہیں، جن پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ کون کون سے ایسے پہلو ہیں۔ جن سے آپ بے خبر ہیں۔ جو آپ کی زندگی کی مسرتوں کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔ جب ہی تو ہم ہر ماہ ان مضامین کا انتخاب کر کے ترجمہ کرتے ہیں اور آپ کے ... انکو ... کی زینت بناتے ہیں۔ جن کو پڑھنے کے بعد ——— ممکن ہے کہ آپ کو اس وقت یہ احساس ہوتا ہو کہ ہم نے تو کچھ نہیں کہا۔ آپ کو کوئی نیا راستہ نہیں دکھایا، آپ کے زخموں پر مرہم نہیں رکھا، مگر ——— ——— اثر اس طرح ہوتا ہے کہ آپ کو آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں اس بات کا ——— خود اپنے سے سہی ——— اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ کہ آپ بدل گئے ہیں۔ زمین وہی ہے آسمان وہی ہے۔ لیکن ——— زمین وہ کہاں رہی، آسمان وہ کہاں رہا۔ آپ کیا بدلے کہ زمانہ ہی بدل گیا۔ اور درحقیقت بدلتا بھی ہے زمانہ آپ کے ساتھ ہی ساتھ، پہلے آسمان کا رنگ اتنا خوشگوار نظر نہ آتا تھا، اب تو ایسا ہو گیا کہ بس دیکھا ہی کرو۔ پہلے آوازوں میں کتنی بے ترتیبی تھی۔ اب اس میں ترتیب پیدا ہو گئی ہے۔ وہ نغمے کی سے معلوم ہوتی ہیں، اور نغمہ ہے کیا، آوازوں کی ترتیب ہی تو ہے۔

تو ——— ——— ہمیں پورا یقین ہے کہ آپ بدل رہے ہیں۔ اور آپ اپنے ماحول کو "نئی آنکھوں" سے دیکھنے لگے ہیں۔ اب آپ کو یہ فکر رہنے لگی ہے کہ ماحول میں کانٹے ہیں۔ ان کو دور کئے بغیر کیسے زندگی سکون سے گذرے گی، یہاں تو انسان مجبور ہیں۔ بے بس ہیں ... ان بے بس اور مجبور انسانوں کو کون بتائے کہ یہ مجبوری، یہ بے بسی اگر خیالی نہیں سہی، حقیقی سہی، پھر بھی وہ دور تو کی جا سکتی ہے ——— ——— ہر زخم کا علاج موجود ہے، ہر غلطی کا مداوا ممکن ہے۔ ... کہ

کیوں میں مجبور رہوں

کیوں تم مجبور رہو

آؤ۔ انسانو، عزیزو، بھائیو۔ ہم سب مل کر اپنی بے بسی کا مقابلہ کریں اور اس وقت تک جم کر میدان عمل میں ڈٹے رہیں جب تک ہم میں وہ خوبیاں نہ پیدا ہو جائیں جو ہم کو صحیح انسان بناتی ہیں۔ جو ہم کو فرشتوں کا ہم رتبہ بناتی ہیں ——— نہیں، نہیں بلکہ فرشتہ بننا تو آسان ہے۔ اور انسان بننا بہت مشکل۔ ہم فرشتے بننے کے خواب نہ دیکھیں — انسان ہی رہیں ——— اور ساری دنیا کے انسانوں کو اپنا بھائی سمجھیں ——— چاہے وہ گورے ہوں، چاہے کالے ——— "انسانیت" کی منزل میں قدم رکھنے کے لئے مذہب، رنگ اور نسل کا فرق کیسا۔ اور یہ فرق کیوں اور کب تک ؟

ایک سال کی رفاقت کے باوجود بھی آپ کے سائیکولوجی میں ایک "کمی" رہی۔ اس کمی کا "احساس" تو ہم کو بہت شدت سے تھا

مگر ہم آپ کا رنگ دیکھ رہے تھے ۔ اور اس بات کے منتظر تھے کہ آپ ——— جن کی کمزوریوں کو دور کرنے کا ہم "دعویٰ" کرتے ہیں۔ ——— ہم کو لکھیں کہ سائیکولوجی میں یہ "کمی" ہے ——— آپ شاید ہچکچاتے رہے۔ لیکن بات بہت دن تک دل میں نہ رہ سکی چنانچہ ہم کو رفتہ رفتہ ایسے خط موصول ہونے لگے جن میں اس بات کی خواہش کی جانے لگی کہ ہم زندگی کے ایک اور پہلو ——— بہت اہم پہلو کا بھی خیال رکھیں ۔

آپ جان گئے ناکہ یہ پہلو کون سا ہے۔

ہماری زندگی کا جنسی پہلو !

جی ہاں ——— تو ہم نے "سالگرہ نمبر" میں بہت محققانہ انداز میں جنسی مضمون پیش کئے ——— ہمارا خیال تھا کہ ممکن ہے ہمارا یہ اقدام چند لوگوں کی نظروں میں احسن نہ ہو اور وہ ہم پر "عریانی فحش نگاری" وغیرہ کا الزام رکھیں ۔ اسی لئے ہم نے آپس میں مشورہ کیا ہے کہ ہم اس شمارہ میں جنسی مضمون نہ دیں ——— ذرا دیکھیں تو کیا ردعمل ہوتا ہے ——— "سالگرہ نمبر" کے متعلق اب وقت تک جتنے بھی خطوط موصول ہو چکے ہیں ۔ ان میں ہمارے اس اقدام کی ستائش کی گئی ہے ۔ اور ہماری ہمت بڑھائی گئی ہے ۔ پھر بھی ہم تھوڑے دن اور انتظار کرنا چاہتے ہیں ——— اس لئے ——— آپ بھی اپنے مشوروں سے آگاہ کیجئے تاکہ ہم "سائیکولوجی" کو زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکیں

ماہنامہ "نفسیات" لاہور کے متعلق چند سطریں

نفسیات ، فروری کے شمارہ میں پہلے ہی صفحہ پر ایک نوٹ شائع ہوا ہے ۔ جس میں محترم اختر رضی نے جناب ضمیر محمد اختر کی ادارہ نفسیات سے علیحدگی اور "نفسیات" کے موجودہ رنگ کو ختم کرنے کی اطلاع دی ہے ۔

کچھ لوگوں نے ہم کو "نفسیات" کا رقیب کہا تھا ۔ ہم پہلے ہی اس پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتے تھے ۔ مگر کوئی مناسب موقع نہیں ملا ۔ اب بھی یہ "مناسب" موقع تو نہیں ہے ۔ مگر اظہار ضروری ہے ۔ اس لئے یہ چند سطریں لکھنا پڑ رہی ہیں ۔

پہلے تو یہ سن لیں کہ ہم کو "نفسیات" کے اس طرح ختم ہونے کا بہت افسوس ہے ۔ یہ پرچہ "محض نفسیاتی" ہونے کی وجہ سے ایک مخصوص طبقہ میں مقبول تھا ۔ ہم بھی اس کی بہت قدر کرتے تھے ۔ مگر وہ "عوامی" نہیں تھا ——— سچ تو یہ ہے ——— کہ ہم نے اسی سے متاثر ہو کر سائیکولوجی میں نفسیات کو عوامی انداز میں پیش کیا تاکہ گہرے اثر ڈالنے کے انداز میں پیش کریں ۔

ضمیر محمد اختر صاحب سے کون واقف نہیں ، انہوں نے ہندوستان میں سب سے پہلے نفسیاتی تعلیم کی ضرورت کو محسوس کیا اور نفسیاتی روشنی پھیلانے میں ہر طرح سے جدوجہد کی ۔ نفسیاتی کتابوں کا ایک گرانقیمت سلسلہ جاری کیا ۔ اور زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر بہت عالمانہ اور ناقدانہ روشنی ڈالی ۔ ممکن ہے کہ اس تحریک میں ان کو مالی نقصان بھی ہوا ہو ——— کیونکہ ہم پاکستان نیز بھارت کے عوام کی علمی ناقدری اور "فاقہ مستی" سے واقف ہیں ——— مگر وہ بڑھتے ہی رہے ——— موصوف اچھے افسانہ نگار ہونے کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا خوب جانتے ہیں ۔ اس لئے وہ بہت جلد "دل کی بات" کو پا گئے ۔ اور آج وہ اچھے اچھے لوگوں کے دلوں میں چراغ بنے روشن ہیں ۔

ادارہ نفسیات سے ان کی علیحدگی قابل افسوس ہے ۔ لیکن وہ دوسرے پرچے کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں ۔ وہ اس کو بنا تو ضرور دیں گے مگر "نفسیات" سے علیحدہ ہو کر ——— وہ تعمیر ——— ! — تعمیر ۔ میں واقعات کی صحیح اطلاع تو ہے نہیں کیا کہیں ۔ خدا کرے نفسیات کو تقدیر کیا ہو گئے ——— ——— کہئے سالگرہ نمبر پسند آیا ؟ — اچھا اب پھر ! — ادارہ

آخر یہی کیا ضروری ہے کہ ہم خوش ہی ہوں؟

کے۔ ایم۔ سویزی

بولئے۔ ہم آپ کر ہی کیا سکتے ہیں جبکہ عموماً ہم ہی آپ ان چیزوں کے خواہش مند رہتے ہیں جو ہم کو مل نہیں سکتیں۔ لیکن ہم ہیں کہ ان ہی کے لئے آٹھوں پہر آنسو بہایا کرتے ہیں ——— ہمارے یہ آنسو، ہمارے یہ خونیں آنسو اس سے نہیں ہیں کہ واقعی ہم کو ان چیزوں کی ضرورت ہے (حالانکہ ہم یہ سوچتے ضرور ہیں کہ اگر وہ چیزیں مہیا ہو سکتیں تو پھر ہماری زندگی خوشی سے پھولی نہ سماتی) بلکہ وجہ صرف اتنی ہے کہ ہماری ذہنی تربیت ہی میں کچھ کمی رہ گئی ہے

ذہنی تربیت میں یہ کمی کیونکر نہ ہو جبکہ پوری نوع انسان ہی اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ ہم سچی خوشی صرف "چیزوں" سے حاصل کر سکتے ہیں۔ یا خوشی کسی خاص مقام، کسی خاص ملک، شہر، جگہ ہی پر مل سکتی ہے۔ وہ روپیہ کی جھنکار میں چھپی ہے۔ روپیہ ہو تو بڑی سے بڑی خوشی، چھوٹی بڑی ہر خوشی ہمارے قدم چومنے لگے — وغیرہ وغیرہ

اوہ ——— اس غلط تصور میں کتنا بچپنا ہے۔

خوشی کو کون خرید سکتا ہے۔ کیونکہ وہ تو محض ایک ذہنی کیفیت ہے — یہی کیفیت جو ہمارے ذہن کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب کہ وہ خارجی اشیاء کو ایک مخصوص نقطہ نگاہ سے دیکھتا ہے ——— یہ کیفیت کہیں بھی، کسی وقت بھی، اور کسی حالت میں بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اگر ہم سمجھنے کے ارادے سے ہر چیز کو دیکھیں — کیونکہ "سمجھنے" کے ساتھ ہی ساتھ پیار کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اور جہاں پیار ہو۔ وہاں "خوشی" کا موجود ہونا تو ضروری ہے نا!

اب ———

اچھا یہ تو بتائیے کہ آپ کی خوشی کن کن چیزوں سے وابستہ ہے؟
آج آپ خوش ہیں کیونکہ آپ جو کچھ بھی چاہتے تھے۔ وہ آپ کو حاصل ہے۔
کل آپ ہی کچھ اور چاہیں گے۔ "کچھ اور" کی غیر موجودگی آپ کو رنجیدہ بنا دے گی۔
پرسوں آپ پھر خوش ہو جائیں گے۔ کیونکہ آپ کی خواہشیں پایۂ تکمیل تک پہنچنے والی ہیں اور نرسوں پھر غمگین — کیونکہ آپ کسی وجہ سے ان کو نہ پا سکے۔

کیونکہ کچے دھاگے میں بندھی ہوئی یہ مادی خواہشیں تو ایک دم سے اور ایک ساتھ تو پوری ہونے سے رہیں۔ ایک چیز موجود، تو دوسری غائب۔ دوسری موجود، تیسری غائب ——— ایسی خوشی تو ایک سراب ہے، سورج کی ایک کرن جو ریت کو چمکا رہی ہے اور آپ کو فریب دے رہی ہے۔ یا — ایک سایہ ہے۔ جو آپ کا ہر حالت میں ساتھ نہیں دے سکتا۔

یہ مانا کہ اچھی چیزوں کی خواہش، تمنا اور امید ہمارے معاشرے کی ترقی کے لئے بہت ضروری ہیں اور اگر ان کو صحیح روشنی میں دیکھا جائے

تو وہ نوع انسان کے دامن کو خوشیوں سے بھر دیتی ہیں۔ لیکن یہ صحیح روشنی، یہ توضیح ہی حقیقت میں اہم ہے۔ اگر ہم کسی ایسی چیز کی خواہش کرتے ہیں جو واقعی مسرت بخشنے والی ہے ——— اور جو کسی نہ کسی طرح سے حاصل ہو سکتی ہے۔ تو اس کی امید کرنا اور انتظار کرنا بھی چاہیئے —

——— لیکن ہم کو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ ان خارجی اشیاء ہی سے ہماری تمام مسرتیں وابستہ نہیں ہیں۔ اگر ان کی غیر موجودگی سے ہم کو ٹھیس پہنچتی ہے اور ہماری خوشی بھی ختم ہوتی نظر آتی ہے۔ تو ایسی خواہش کو ٹھکرانا ہی اچھا ہے۔

دم دار ستاروں اور قوس و قزح کے پیچھے ہمیشہ نہ بھاگئے۔ رنگ پھر رنگ ٹھیرے۔ ظاہری رنگ محض آنکھوں کو خیرہ کرنے والے کیونکہ ——— مقناطیس اس وقت تک لوہے کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتا۔ جب تک اُس سے کشش کی لہر پیدا نہ ہو۔ اسی طرح کوئی بھی فرد خوشی کو حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کے دل سے مسرت کی کرنیں نہ پھوٹیں۔ بڑھیں اور ماحول کو پیار کرتے ہوئے، اس کو گلے لگاتے ہوئے وہ تسکین نہ محسوس کریں۔ جو اصل خوشی ہے

کچھ لوگ آپ کو پسند کر سکتے ہیں۔ آپ کو پیار کر سکتے ہیں۔ اور کچھ لوگ آپ کو ناپسند کر سکتے ہیں اور آپ سے نفرت کر سکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے نا کہ پیار کرنے والا اپنی مخصوص نظر سے دیکھے گا اور نفرت کرنے والا اپنی مخصوص نظر سے۔ ایک کے معیار پر آپ پورے نہیں اترتے ——— وہ ناپسند کرتا ہے۔

اور ہو سکتا ہے کہ درحقیقت آپ ایسے ہوں جس کو نہ چاہا جا سکتا ہے نہ نفرت کی جا سکتی ہے۔ یا آپ ایسے ہو سکتے ہیں کہ سب کا پیار حاصل کر لیں۔ مگر یہ اپنی اپنی پسند ہے۔ کچھ آپ کو ناپسند کرتے ہیں۔ تو کرنے دیجئے

اور یہی زندگی کا حال ہے۔ اور یہی ہمارا آپ کا زندگی کے ساتھ سلوک ہے۔ ہمارا ذہن زندگی کے بعض پہلوؤں کو پسند کرتا ہے اور بعض سے بچنا چاہتا ہے۔ زندگی پوری کی پوری ہم کو نظر نہیں آ پاتی۔ جس سے اس کے بہت سے رقص روپوش رہتے ہیں۔ اور اندر ہی اندر گھٹ کر دم توڑ دیتے ہیں یا فنا ہو جاتے ہیں

فرض کیجئے کہ آپ کو کسی ایک بات میں خوشی محسوس ہوتی ہے۔ تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ مجھ کو بھی، ہم سب کو اس میں خوشی محسوس ہو ——— کیوں نہیں ہوتی ہے ——— یہ فرق ہمارے ذہنوں میں ہوتا ہے اور پھر ——— آپ کسی بات میں، کسی چیز میں صرف اسی لئے تو خوشی محسوس کرتے ہیں کہ وہ بات، وہ چیز آپ کو پسند ہوتی ہے۔ اور پسند و ناپسند تو ایک اندرونی جذبہ ہے، ایک وابستگی ———

آپ جہاں کہیں بھی ہوں، جہاں کہیں بھی ہوں ——— اگر آپ کا دل روشن ہے، اس میں قبول کرنے کی اہلیت ہے۔ تو قدم قدم پر ذرہ ذرہ میں آپ کو یہی دلبستگی محسوس ہوگی۔ لیکن اگر آپ یہ سوچنے لگیں کہ لوگوں کا آپ سے برا سلوک ہے۔ آپ کو ذرا ذرا سی چیز سے محروم رکھا جاتا ہے۔ موسم بھی بہت ہی ساتھ نہیں دیتا۔ ہوائیں بھی وحشی ہیں۔ آوازیں بھی خوشگوار نہیں۔ ماحول میں تلخیاں ہیں تو خوشی تو بڑی بات ہے۔ آپ کو سوائے رنج کے سوائے مایوسی کے، سوائے ناامیدی کے اور کچھ نہیں ملے گا۔

جب تاریک بادل، ڈراؤنے بادل آسمان پر چھا جاتے ہیں۔ اور پانی برسے جاتا ہے تو ہم میں سے بعض رنجیدہ دلی سے کہتے ہیں۔ "سورج کہاں ہے، اس کی روشنی، اس کی گرمی، اس کی شفقت کہاں ہے۔ اوہ، کتنا تاریک، کتنا ناگوار دن ہے"

لیکن ہم ہی میں سے کچھ لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان بادلوں کی اوٹ میں، اس طوفانی پانی کے پردوں کے پیچھے سورج موجود ہے۔ اور چمک رہا ہے۔

کیا وہ لوگ نادان نہیں ہیں جو ان وقتی دشواریوں، دیواروں سے تنگ آ کر روشنی اور خوشی کی امید بھی چھوڑ دیتے ہیں ——— ؟ ———

خوشی اور رنج کا درمیانی پردہ تو ایسا پردہ ہے جو ایک ہی وقت میں شفاف بھی ہے اور غیر شفاف بھی ——— جو لوگ پردوں کے پیچھے جھانک [illegible] سکتے ہیں ۔ وہی لوگ ہیں جو ہر حالت میں خوش رہتے ہیں ۔

اگر کسی فرد کا پیار آپ کو تسکین پہنچا سکتا ہے ۔ تو اس کے پیار سے کوئی توقع نہ رکھئے ۔ بس ۔ پورے خلوص سے اس فرد کو چاہتے رہیے اس سے کہیئے نہیں کہ مجھ کو بھی چاہو ۔ مجھ سے بھی پیار کرو ——————— اور اگر آپ ایسا کرنے سے قاصر رہیں تو بجائے اس پر زور دینے کے کسی اور کو اپنا محبوب بنا لیجئے ۔ جو آپ کو بھی چاہ سکتا ہو ۔

محبت ہے کیا ؟

سیدھی سادی اور حقیقی تشریح تو یہ ہے کہ وہ آپ کی " توجہ " ہے جس سے آپ محبت نہ کرنا چاہیں ۔ اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا لیجئے محبت بھی ختم ، محبت نہ پانے کی کوفت بھی ختم ——————— دنیا میں لاکھوں ایسی ہستیاں ہیں جن کو محبوب بنایا جا سکتا ہے ۔ لیکن سب کو تو آپ محبوب بنانے سے رہے ——————— کیوں صاحب ؟ ——————— وجہ صرف یہ ہے کہ آپ ان سینکڑوں ، لاکھوں ہستیوں کی طرف اپنی توجہ مرکوز نہیں کر سکتے ۔ آپ کی ان سے جان پہچان نہیں ، پھر قربت کہاں سے ہو اور قربت کے بغیر کیسے ان کو سمجھ سکیں گے ——————— ہاں ——————— آپ اپنی ذہنی قوتوں کے دباؤ سے کسی کو بھی مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ بھی آپ کو چاہنے لگے ——————— مگر پہلے اپنے دل کا خوب اچھی طرح جائزہ لے لیجئے کہ کیا واقعی آپ اپنے کو " خوش نصیب " سمجھیں گے اگر اس کی محبت آپ کو حاصل ہو گئی ؟

اب ——————— جب کبھی آپ افسردگی سی ، خفگی سی محسوس کریں تو بہت اطمینان سے بیٹھ جائیے اور گتھیوں پر غور و فکر [illegible] کیجئے

———————

آپ اپنے ساتھ صداقت سے کام لیجئے ۔ یہ جتنا مشکل ہے ۔ اتنا ہی ضروری ہے ۔ اور اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کی کوشش کیجئے کہ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے ۔ جو آپ کو نقصان پہنچا سکتی ہے یا رنج کا موجب بن سکتی ہے ——————— آپ کو نقصان اور تکلیف اسی وقت پہنچ سکتی ہے یا پہنچی ہے ۔ جب کہ آپ اپنے دل و دماغ کی نگرانی کو نظر انداز کر رہے ہیں ۔

اور یہ سب کچھ ذہن نشین کرنے کے بعد ——————— ان وجوہ پر غور کیجیے جو آپ کے نزدیک آپ کی تکلیف اور رنج کے باعث ہیں ——————— ارے ، وہ تو اب موجود نہیں رہے ——————— کہاں گئے وہ ، ——————— [illegible] تو وہ محض اندرونی کیفیت ہے ——————— دنیا کی بدصورت ترین چیزیں بھی کچھ نہ کچھ خوبیاں رکھتی ہیں جن کو [illegible] جانا چاہیئے ۔ اور ——————— حسین ترین چیزیں بھی تاریک پہلو رکھتی ہیں ———

تو

جانتے ہیں آپ

کہ ——————— اگر آپ رنجیدہ ہیں ۔ اور خوشی سے کوسوں دور ہو چکے ہیں تو خوشی اور آپ کے درمیان [illegible] دیوار نہیں ہے تو نفرت کی دیوار ہے ۔ غلط فہمیوں کی دیوار ہے ۔ جس کو گرانے کا ایک ہی راستہ ہے ۔

آپ اپنے دل کو روشن بنائیے ۔ اپنے خیالات کی تاریکیوں کو دور کیجئے اور ہر چیز سے ایک مسرت ، ایک نغمہ ، ایک رقص حاصل کرنے کی خواہش مند ہو جائیے ۔

پھر دیکھئے ——————— آپ کو دنیا بدلی ہوئی نظر آئے گی ، دوستوں کی محبت بے لوث نظر آئے گی ——————— دشمن ، دشمن نہ رہیں گے ۔ [illegible] ۔ کہاں یہ ضروری ہے کہ ہم خوش رہیں اور دوسروں کو خوش رکھنے کا [illegible] ۔

تلخیص و ترجمہ ۔ ادارہ

جب ہم نے جون ۴۹ء میں عورت نمبر شائع کیا تھا

تو

عورتیں چیخ اٹھی تھیں

اور پھر

فروری ۵۰ء میں

جب ہم نے سالگرہ نمبر شائع کیا

تو مردوں نے بھی، عورتوں نے بھی، ہماری خدمات کو سراہا

اب ہم

"مرد نمبر" پیش کرنے کا اعلان کر رہے ہیں

ہماری کوشش ہے کہ اس نمبر میں مرد نہیں، عورتیں لکھیں۔ تاکہ ——— یہ

مرد، جو عورتوں کے ناخدا بنے بیٹھے ہیں چیخ اٹھیں۔

اس زرّین پیش کش کا

ابھی سے انتظار کیجئے۔ اور ہمارے مستقل خریدار بن کر ہماری

ہمت بڑھائیے

یہ نمبر بھی سالگرہ نمبر کی طرح ضخیم ہوگا

سالانہ خریداروں کی خدمت میں تحفتاً

خاص سائیکولوجی اردو
کے لیے

جھوٹ اور جھوٹے

پروفیسر زین العابدین صدر شعبۂ نفسیات پٹنہ

سوسائٹی میں جھوٹ بھی ہے اور جھوٹ بولنے والے بھی ہیں۔ جھوٹ بولنے والے زندگی کے ہر شعبے اور سوسائٹی کے ہر طبقے میں پائے جاتے ہیں۔ چند سال ہوئے کہ ایک صاحب جن کو ڈینگ مارنے کا مرض تھا۔ اپنے دوستوں سے کہا کہ میں نے کل وزیر تعلیم کے ساتھ کھانا کھایا تھا اور جو گفتگو ان سے ہوئی تھی اس کو بھی تفصیل کے ساتھ دہرایا۔ اس پر لوگوں کو بہت حیرت ہوئی کیونکہ جن وزیر تعلیم کے ساتھ ان کی گفتگو ہوئی تھی وہ کئی سال قبل مر چکے تھے۔ یہ ایک تنہا مثال نہ تھی کیونکہ یہ حضرت اکثر اس طرح زندہ اور مردہ معزز لوگوں کے ساتھ گفتگو اور دعوتوں کا من گھڑت قصے بیان کیا کرتے تھے۔

جھوٹ بولنا ایک نفسیاتی مرض ہے۔ اور اس کے مریض جھوٹ اس لئے بولتے ہیں کہ اس سے ان کو ایک قسم کی تشفی ملتی ہے۔ یا دروغ گوئی کی خواہش پوری ہوتی ہے

جھوٹ کی کئی قسمیں ہیں

دل لگی کا جھوٹ اس قسم کے جھوٹ خیالی واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ جن کا مقصد صرف تفریح اور مذاق ہوتا ہے۔

توجہ حاصل کرنے والا جھوٹ اس قسم کے جھوٹ میں بیان کرنے والا خود کسی ذہنی یا خیالی واقعہ کا ہیرو بن جاتا ہے۔

مدافعانہ جھوٹ یہ پہلے سے سوچا سمجھا جھوٹ ہوتا ہے۔ جس کا مقصد مدافعت یا ناخوشگوار نتیجوں سے بچنا ہوتا ہے

بدنیتی کا جھوٹ اس قسم کا جھوٹ کسی نفرت کے سبب یا بدلہ لینے کی خاطر یا کسی پر الزام رکھنے کے لئے بولا جاتا ہے۔

خود غرضی کا جھوٹ ایسے جھوٹ کا مقصد کسی کو دھوکا دیکر اس سے کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے۔

معاشی جھوٹ (SOCIAL LIES) یہ وہ جھوٹ ہے جس کو سوسائٹی کی اجازت حاصل ہے۔

مثال کے طور پر جب نوکر اپنے مالک کے ہدایت کے مطابق جو صاحب ملنے آتے ہیں ان سے کہتا ہے۔ مالک گھر پر موجود نہیں ہیں۔ گرچہ مالک گھر پر موجود ہیں۔ یا کسی جلسہ یا تقریب میں شریک نہ ہونے کے لئے جو بہانہ بنایا جاتا ہے۔ وہ بھی اکثر اسی طرح کے سوشل جھوٹ کی مثال ہے

جھوٹ کی طرح جھوٹ بولنے والوں کی بھی کئی قسمیں ہیں

جھوٹ بولنے کی ایک قسم وہ ہے جو دوسروں پر یا خود اپنے پر الزام لگاتے ہیں۔

ایک بڑھئی جس کو جھوٹ بولنے کی عادت تھی ایک دن اس نے ایک جج کے اجلاس میں حاضر ہو کر یہ بیان کیا کہ حسد کے جذبے سے مجبور ہو کر میں نے فلاں شخص کو مار ڈالا۔ اس نے اس واقعہ کو پوری تفصیل سے بیان کیا۔ پولیس نے اس کو گرفتار کر لیا۔ لیکن جب پولیس نے اس واقعہ کی تحقیقات کی تو یہ واقعہ بالکل جھوٹ ثابت ہوا۔ اور جب بڑھئی کو یہ بات بتائی گئی کہ جس شخص کو اس نے مار ڈالنے کا دعویٰ کیا ہے وہ زندہ ہے۔ تو اس نے نہایت تعجب کا اظہار کیا۔ مزید تحقیقات سے معلوم ہوا کہ جس آدمی کو مار ڈالنے کا اس بڑھئی نے دعویٰ کیا تھا اس سے کبھی اس کی ملاقات تک

نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ شخص ایک مشہور سیاست داں تھا۔

دوسری غرض جھوٹ کی اپنی بدنامی مول لینا ہے۔ کچھ جھوٹ بولنے والے اپنے اوپر الزام سے کر عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسے جھوٹے واقعی عوام کی توجہ کے مرکز بھی بن جاتے ہیں۔

ایک عورت کا قصہ مثال کے طور پر قابل ذکر ہے۔ اس عورت نے ایک ویران مکان میں خود اپنے بدن کے چاروں طرف رسی باندھ کر ہنگامہ کیا کہ ایک انجان مرد نے اس کے ساتھ زبردستی یہ حرکت کی ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ چند دن قبل اس کی بہن کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا تھا جس کی خبر اخباروں میں شائع ہوئی تھی۔ ———— اس عورت نے رشک اور حسد کے مارے ایسی حرکت کی تاکہ لوگ اس کی طرف بھی توجہ کریں۔ بعض مرتبہ اس طرح کے جھوٹے لوگ اس قسم کے خیالی الزام تراشتے ہیں کہ فلاں شخص نے کلور فارم میں بھگوئے ہوئے رومال یا کسی خواب آور دوا کے ذریعہ عصمت پر حملہ کیا ہے۔

کچھ جھوٹ بولنے والے مشہور اور باعزت لوگوں پر تہمت رگاتے ہیں اور ان کے بارے میں شرمناک واقعات گڑھ کر انہیں ذلیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح کے جھوٹے کبھی اپنے دوستوں کے متعلق بھی شرمناک باتیں مشہور کرتے ہیں۔ اس حرکت سے دوہرا مقصد پورا ہوتا ہے ایک تو یہ کہ دوسروں کی نجی زندگی کے بارے میں شرمناک واقعات بیان کر کے ان کی کامیابی اور عزت کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے افسانوں کے ذریعہ حسدی لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بن جاتے ہیں

جھوٹ بولنے والوں کی خصوصیات یہ ہیں ۔ وہ بڑے چرب زبان ہوتے ہیں۔ رازدارانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں اور بظاہر ان کی شخصیتیں جاذب ہوتی ہیں۔ اور ان سے لوگ جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔

جھوٹ بولنے کی عادت اس شخصیت کا اظہار ہے جو نفسی طور پر بیمار ہے۔

ماحول کی اہمیت

بیگم رئیس جہاں نیّر انصاری

فلسفے کے کچھ ماہرین کا قول ہے کہ انسان نیک پیدا ہوتا ہے اور اپنی آیندہ عمر کی تمام تر خصوصیات، وہ نیک ہوں یا بد، اپنے گرد و پیش سے حاصل کرتا ہے اور اس کی زندگی اس کے گرد و پیش ہی کی آئینہ دار ہوتی ہے کچھ ماہرین جو قدرے مختلف الخیال ہیں کہتے ہیں کہ بچہ پیدائش کے وقت ہی کچھ خصوصیات لے کر پیدا ہوتا ہے اور بڑھتی عمر کے ساتھ وہ اپنے ماحول سے اپنے فطری مزاج کے مطابق خصوصیات اخذ کرتا رہتا ہے اور اس کا کردار زیادہ تر اپنی فطری خصوصیات کے ڈھانچے پر بنتا ہے۔ بہرصورت ہر دو خیالات اس بات پر متفق ہیں کہ ماحول اور گرد و پیش کا بچہ کی آیندہ ذہنیت پر بہت کافی اثر پڑتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک ہی انسان جو کسی خاص خوبی کی وجہ سے مشہور ہو گیا ہو بعض اوقات اس خوبی کے برعکس بھی حرکت کر بیٹھتا ہے اور وہ اس درجہ متضاد ہوتی ہے کہ لوگ حیران ہو کر اس کو بسا اوقات "غلطی" سے بھی تعبیر کر دیتے ہیں اس کی معمولی سی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ ایک آدمی کو عام طور سے بیر پسند نہیں ہیں اور اس کی یہ ناپسندیدگی نفرت تک کا درجہ لئے ہوئے ہے۔ لیکن کوئی موقعہ ایسا آتا ہے کہ وہ بیر کھا لیتا ہے اور ایک آدمی آم کا دلدادہ ہے لیکن زندگی کے کسی حادثہ نے اس کو آم سے متنفر کر دیا ہے دیکھنے والے اس کی دماغی ساخت یا اس کی موجودہ حالت سے واقف نہیں ان کو اس متضاد تبدیلی پر تعجب بلکہ حیرت ہوگی۔ دراصل وجہ یہ ہوئی کہ تبدیلی پسندی کے دوران میں ایک طرف تو اس کا ذہن ایک چیز کی طرف سے قطعی طور سے منتقل ہو گیا دوسری طرف اسی دوران میں کسی حادثہ کی وجہ سے وہی چیز اس کے سامنے نہیں آئی اب جب ذہن کچھ اپنی اصلی حالت پر آنے لگا تو وہ چیز اس کے لئے کوئی جاذبیت پیش نہ کر سکی لیکن رفتہ رفتہ یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ وہی چیز پھر اسی کو اتنی ہی مرغوب ہو جائے جتنی پہلے تھی۔ یہ مثالیں بھی دراصل ماحول اور گرد و پیش کی عملی تصاویر میں تبدیلی ماحول تبدیلی پسندی کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے لیکن اس کے لئے طویل عرصہ اور محنت شاقہ کی ضرورت ہے۔ غیر ارادی طور سے یہ تبدیلی ممکن ہو سکتی ہے لیکن اگر ارادتاً کسی مزاج کو تبدیل کرنا چاہیں تو اکثر ناکامی ہوتی ہے۔ اور خصوصاً پختہ عمر میں تو تقریباً یہ خیال خیالِ خام ہوتا ہے اور ہر کوشش بیکار ہوتی ہے اس لئے کہ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ ان تجربوں پر صرف کر سکیں اور اس مشین کے زمانے میں صبر ہے کہ مدتوں خاموش تماشائی کی حیثیت سے تبدیلی مزاج کی گرتی چڑھتی سوئی کو دیکھتے رہیں۔

بچہ کا ماحول اس کے ماں باپ اور ان کی حرکات و سکنات ہوتی ہیں اور بچہ کا آئینہ دکردار ان ہی حرکات و سکنات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ شیرخوار بچہ کچھ ایسی حرکتیں کرتا ہے جو اس کے ماں باپ میں بھی موجود ہوتی ہیں ایک بچہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سوتا ہے اور ماں حیرت سے دیکھتی رہتی ہے اور آس پاس والوں کو دکھاتی ہے کہ یہ بالکل اپنے باپ کی طرح سو رہا ہے دوسرا بچہ شیرخواری ہی کے عالم میں بار بار اپنا ننھا سا ہاتھ سر پر لے جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کی یہ حرکت بال درست کرنے کی عادت اختیار کر لیتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح اس کا باپ بالوں کی ماتھے پر آ پڑنے والی ...... لٹ کو ٹھیک کرتا ہے اس کو یہ سب کچھ کسی نے نہیں سکھایا .. وہ خود بخود سیکھتا جا رہا ہے یہ سب کچھ غیر ارادی طور سے عمل میں آتا ہے۔ دو سال کی عمر سے بچے میں تبدیلی مزاج کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے اور آیندہ چار سال اس کی عمر کے بیش قیمت ترین سال ہوتے ہیں چھ سال کی عمر تک بچہ معصوم کہلاتا ہے لیکن اس زمانے میں وہ وہ سب کچھ سیکھ جاتا ہے جس کا پندرہ سال کی عمر تک "بچپنا" مظاہرہ کرتا ہے آگے چل کر اس کی حرکات فطرت بن جاتی ہیں۔

وہ بہتر کار انسان ہو جاتا ہے۔ چھوٹے گھروں کے بچے توتلی زبان میں گالیاں دیکر اپنے ماں باپ کی مسرت کو دوبالا کرتے ہیں جاہل ماں بار بار ایسے الفاظ دہرواکر خوش ہوتی ہے اس عمر میں گالیاں دینا چھ سال کے بعد فطرت بن جاتا ہے اور بچہ آوارہ لفنگا اور بدمعاش بن جاتا ہے اچھے گھروں کے بچے اس عمر میں وہ باتیں حاصل کرتے ہیں جو آیندہ زندگی میں ان کے لئے شہرت اور نیکنامی کا باعث ہوتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ دو سال سے چھ سال کی عمر تک کے چار سال انسان کی عمر کا اہم ترین حصہ ہیں اسی میں بچہ آدمی بنتا ہے اور اسی لئے بچے کو آدمی کا باپ کہا جاتا ہے۔

غلام قومیں اس عمر میں بچوں کو غلامی کی تعلیم دیتی ہیں اور وہ تعلیم کچھ ایسی گہری ہوتی ہے کہ اس کا اثر ماحول تبدیل ہو چکنے کے بعد بھی نہیں ہوتا دنیا بھر کی قوموں میں بچوں کو صحیح تربیت بہت کم ملتی ہے اور اسی لئے دنیا میں نیک بہادر قوم پرست اور محبان وطن کا فقدان ہے اس کے باوجود دنیا میں مصطفےٰ کمال، ہٹلر، نپولین، بابر اور جناح تہلکہ مچا دیتے ہیں ایک ایک شخص دنیا بھر سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیتا ہے لیکن صدیف ان لوگوں پر جو ان محبان وطن کی قربانیوں اور خلوص خدمات پر اراوتاً پانی پھیرنا چاہتے ہیں اور بعض اوقات اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں عام طور سے ان کی اس حرکت کی وجہ ذاتی مفاد اور خوشنودی حکومت وقت ہوتی ہے، حکومت ان SHORT-CUT METHODS پر بسا اوقات خوش بھی نہیں ہوتی البتہ کچھ ذاتی مفاد ضرور ہو جاتا ہے اس وجہ کا پس منظر وہی چھوٹے گھر اور کم ظرف ماحول کی تربیت ہے۔ مثل مشہور ہے کہ پوتوں کے پاؤں پالنے میں نظر آجاتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہیئے کے اندھوں کو نظر نہیں آتے اور وہ غلط تربیت دیئے چلے جاتے ہیں۔ بچہ انسان بنتا ہے۔ انسان ایک فرد ہے اور افراد قوم بناتے ہیں اور بچہ کو صحیح فرد بنانا ماں باپ بلکہ زیادہ تر ماں کا کام ہے قدرت نے یہ شرف ماں ہی کو عطا کیا ہے کہ اس کا آج کا نونہال کل کا جناح اور نپولین بھی بن سکتا ہے اگر وہ بنانا چاہے اور بنانا جانے بھی۔ ورنہ گلیوں میں ہزاروں بچے گلی ڈنڈا کھیلتے اور پتنگ اڑاتے اڑاتے پورے آدمی بن جاتے ہیں لیکن انسان نہیں بن سکتے کہ موت آجاتی ہے اور وہ بے نیل مرام اس دار فانی سے عالم جاودانی کو سدھار جاتے ہیں ایک شہر میں روزانہ سینکڑوں مرتے اور پیدا ہوتے ہیں اور کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ کون مر گیا۔

اب جب کہ پاکستان آزاد ملک ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یہاں کے باشندوں کی ذہنیت بھی آزاد باشندوں کی سی ہونی چاہیئے ہمارے آج کے شیرخوار کل پاکستان کے محافظ ہوں گے لیکن اگر ان میں حفاظت کا مادہ پیدا نہ کیا گیا تو آزاد قوم کی خصوصیات کبھی پیدا نہ ہو سکیں گی قائداعظم نے جو کچھ دکھایا اس کو برقرار رکھنا دوسروں کا کام ہے اگر پاکستان اپنی موجودہ خویش پروری، صوبجاتی عصبیت، رشوت کی عادت، عدم انسانیت اور ذاتی مفاد کی روش پر اپنی موجودہ رفتار پر گامزن رہا تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو تباہی و بربادی و خواری سے نہ بچا سکے گی قائداعظم کی قربانیاں صرف مینا بازاروں اور لباس کی نمائشوں ہی میں استعمال نہیں ہونی چاہئیں ہر مرد اور ہر عورت پر ایک فرض عاید ہوتا ہے اور اس فرض سے کنارہ کشی غداری ہے ہمیں یہ مان لینا چاہیئے کہ حکومت کے لاتعداد افسر اور قوم کا بیشتر حصہ حصول پاکستان سے آج تک غداری، مکاری اور عیاری ہی کا مظاہرہ کر رہا ہے یہ تو صرف اللہ کا فضل قائداعظم کی ذاتی خوبیاں اور پاکستان کا پاک نام ہے جو اس ملک کو لئے کھڑا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اعمال اس قابل نہیں کہ ہم آزادی کی نعمت کو برقرار رکھ سکیں۔ قوم کو ضرورت نیک کردار کی ہے۔ نہ کہ مینا بازار کی اگر ہم مینا بازار کو نیک کردار کا منبع سمجھ لیں تو یقیناً تباہی کے غار میں کھڑے ہیں ہمارے اوپر ایک اتنا بڑا فرض عائد ہو گیا ہے جس سے کنارہ کشی کی بدولت آنے والی نسلیں اور تاریخ ہم پر رہتی دنیا تک لعنتیں بھیجا کرتی رہیں گی ہمیں اپنی قوم کے ہر فرد کو جناح بنانا ہے قائداعظم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میرا خون بہانے سے میرے خون کے بہے ہوئے ہر قطرہ سے سینکڑوں جناح پیدا ہوں گے دراصل ان کو اپنی قوم سے کچھ توقعات تھیں اگر ہم ان توقعات کو پورا نہ کر سکے تو ہماری شخصیت اس پتھر کی سی ہے جس کو پوجا کی جگہ غلطی سے مسجد کی محراب میں لگا دیا گیا۔

اور ہم ان کی توقعات اسی طرح پوری کر سکتی ہیں کہ اپنے شیرخواروں کو صحیح تربیت دیں ان میں دینداری، بہادری، خلوص، اخوت، [illegible] اور حب الوطنی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دیں۔ بچہ ہماری گود میں [illegible] کی طرف سے امانت

پیدا کیا جاتا ہے جبکہ وہ یہ سب کچھ بننا چاہتا ہے اور ہم اس کو یہ سب کچھ بنا سکتے ہیں اگر ہم دانستہ یا نادانستہ طور سے اپنے فرائض سے غفلت کریں تو یہ قوم ملک اور انسانیت کے ساتھ سب سے بڑی غداری ہوگی جس کو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ دولت اور دولت سے پیدا ہونے والی عیش و عشرت قوم کی تباہی کی دلیل ہے ہم دولت مند نہیں ہمارے لئے خوبیاں پیدا کرنا نسبت بُرائیاں پیدا کرنے کے آسان ہے دولت سے کورے ہونے کے باوجود اگر ہم دولت پرستی کرتے رہے تو ہماری تباہی و بربادی کچھ زیادہ دُور نہیں۔ اور اپنی تباہی کے ذمہ دار ہم ان لوگوں کو نہ ٹھہرا سکیں گے جن کے زمانہ میں تباہ ہوں یہ ممکن ہے کہ دو نسلوں کے بعد ہمارا زوال ہو جائے لیکن یہ غلط ہوگا کہ ہم تیسری نسل کو باعث زوال بتائیں دراصل اس کی وجہ ہم ہوں گے اس وقت حالات ایسے ہیں کہ ہم خراب ماحول کے باوجود اپنے بچوں کو آنے والی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھ سکیں لیکن دو نسلوں کے بعد حالات ایسے نہ رہیں گے کہ ہماری کی ہوئی برائیاں ٹھیک کی جا سکیں" +

میں اکثر گنگناتی ہوں

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب — ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

ساحر

•

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں — اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگذر بھی نہیں

فیض

•

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے — کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

غالب

•

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن

•

زمانے بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی — سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے راز داں تک ہے

اقبال

مرسلہ آنسہ فردوس ۔ لاہور

بات چیت

فرد، فرد کی "بات چیت" سے لاشعوری طور پر متأثر ہوتا ہے ——
کچھ کہیئے، کچھ سنیئے —— کہنے سننے سے جی کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے ——
بات چیت کا یہی مقصد ہے اور بس —— دیکھیئے کیا ہم آپ کے لئے
مفید ہیں ؟

لیکن سوالات کرتے وقت اس بات کا خیال رکھئے کہ آپ کے سوالات مبہم نہ ہونے پائیں۔ اگر سوالات خود آپ کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں تو اپنی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ بھی لکھیئے۔ تاکہ ہم آپ کا صحیح مفہوم سمجھ سکیں۔ اور آپ کے مسائل کا صحیح نفسیاتی تجزیہ کر سکیں۔ آپ کی یہ مختصر سوانح صیغۂ راز میں رہے گی۔ محض سوالات شائع کئے جائیں گے۔

ہے آپ کی خاطر ہمیں منظور بہر طور

ادارہ

منظور طارق۔ جام پوری۔ مقیم کوئٹہ

۱۔ کیا ایک ہی چیز کے متعلق بار بار سوچنا، ہر ایک سے مشورہ لینا دریں وہی کچھ کرنا جو جی چاہے۔ دماغی مرض تو نہیں۔ ماہرین نفسیات اس "مہلک" مرض کا کیا علاج تجویز کرتے ہیں ؟

۲۔ اپنے راز کسی پر افشا کر کے اُسے تاکید کرنا کہ اسے افشا نہ کرے اور اسی خیال میں گھلتے رہنا —— کہ اب اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو —— کیا سوال نمبر ۱ کی ذیل میں آتا ہے۔

جواب —— پہلے تو آپ یہ جان لیجئے کہ یہ کوئی دماغی بیماری نہیں ہے۔ بہتوں کو اس قسم کے مسئلوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ جب آپ کے سامنے کوئی ایسا مسئلہ آتا ہے جو آپ کو ایک کشمکش میں الجھا دے۔ تو آپ قدرتی طور پر اس کشمکش سے آزاد ہونے کی کوشش —— کرتے ہیں۔ اور حل کی تلاش غور و فکر میں مبتلا کر دیتی ہے۔ جب تک اس مسئلے کا حل نہ نکل آئے اور آپ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ جائیں آپ اس کشمکش سے نجات حاصل نہیں کر سکتے —— اب سوال یہ ہے کہ آخر غور و فکر کے باوجود کیوں آپ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ پاتے ؟ —— سنیئے جب دو متضاد تحریکیں ایک ہی شدت کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ تب ہی کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کبھی آپ کی نفسانی خواہشات اور

اخلاقی قدروں میں تصادم پیدا ہو جائے۔ ذاتی خواہشات تو کسی چیز کو حاصل کرنے پر مجبور کریں اور دوسری طرف اخلاقی قدریں دیوار بن کر کھڑی ہو جائیں تو کشمکش شروع ہو گئی۔ اب جب تک کسی نتیجہ پر نہ پہنچ جائیے اس غور و فکر سے آزادی ممکن نہیں اور چونکہ آپ کو اکسانے اور روکنے والی طاقتیں تقریباً برابر قوت سے آپ پر حملہ آور ہیں۔ اس لئے کسی نتیجے پر پہنچنا چاہئے تو کیسے پہنچیں ؟ ——————— اس منتہا تک پہنچنے کے بعد آپ کو یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ آپ کی اس کشمکش کو کوئی بٹائے۔ اسی لئے آپ دوسروں سے مشورہ لیتے ہیں (یہاں پر "مشورہ" اصل مقصد نہیں بلکہ مقصد تو صرف اپنے جی کا بوجھ ہلکا کرنا ہے) ظاہر ہے کہ یہ مشورے آپ کے کس کام کے ؟ ——————— اب دو متصادم قوتوں میں جو طاقت آپ پر غالب آتی ہے۔ وہ آپ سے جو چاہتی ہے کروا لیتی ہے۔ اور آپ سمجھتے ہیں کہ " میں نے جو چاہا۔ وہ کیا "۔

آپ کے دوسرے سوال کا تعلق بالکل پہلے سوال سے ہے۔ آپ اپنے راز دوسرے پر ہرگز اس لئے افشا نہیں کرتے کہ آپ کا رازدار آپ کو کوئی مفید مشورہ دے گا۔ بلکہ صرف اس لئے کہ آپ راز کے بوجھ کو اکیلے نہیں سنبھال سکتے اور خاص طور پر جب راز " رومانی " ہو رازدار بنانے کے بعد بڑی تسکین سی ملتی ہے لیکن بعد میں یہ خوف بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں یہ راز اور دوسروں پر بھی افشا نہ ہو جائے اس کا " علاج " یہ ہے کہ آپ مسائل کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھیں۔ اور ان کو حل کرنے کے لئے جذبات سے زیادہ عقل اور استدلال سے کام لیں۔

احمد سرور۔ حیدرآباد (سندھ)

۱۔ مصیبت کے وقت انسان کو کیا کرنا چاہیئے۔

۲۔ میں ایسا انسان بننا چاہتا ہوں جس پر اگر کوئی مصیبت ٹوٹ پڑے تو بجائے رنج اور غم میں ڈوبنے کے اس کے چہرے پر ایک دل فریب مسکراہٹ کھیل جائے مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟

آپ کے دونوں سوالات مختلف نہیں ہیں۔ مصیبت کے وقت انسان کو کیا کرنا چاہئے — اس کا سیدھا سادا جواب اگر یہ دیا جائے کہ واقعات کا دلیری اور مردانگی سے مقابلہ کرنا چاہیئے۔ تو جواب تشنہ رہ جاتا ہے ——————— ہمارا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ زندگی کا مقصد خود زندگی ہے۔ زندہ رہنا اور زندگی کی تلخیوں کو برداشت کرنا سب سے بڑی بہادری ہے۔ جو لوگ زندگی کی راہ میں پیش آنے والے مصائب سے تنگ آ کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر بزدل کوئی نہیں ——————— اس سوال کا جواب بہت تفصیل طلب ہے۔ جس کی ان صفحات میں گنجائش نہیں۔ پھر بھی ہم یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ

(۱) قوت ارادی کو مضبوط بنانے کے لئے مخصوص تربیت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جب تک ارادے میں آہنی استحکام نہ ہو زندگی کے گرم و سرد کو آسانی سے برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ان کا جم کر مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

(۲) نفسیاتی اصولوں پر احساس کمتری پر قابو پانے کی ضرورت ہے۔ ہماری زندگی میں غالباً سب سے بڑی رکاوٹ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم خود اپنی ذات کو کمتر محسوس کرتے ہیں اور دوسروں کو اپنی زندگی کے قدم قدم میں قائد ماننے لگتے ہیں۔ ہم کچھ نہیں رہتے دوسرے سب کچھ بن جاتے ہیں۔

(۳) اور سب سے ضروری بات تو یہ ہے کہ واقعات کو حقیقت پسندانہ روشنی میں دیکھئے اور ان کو سمجھنے کی کوشش کیجیئے۔ اگر آپ کسی رومانی تحریک میں پھنسنے بغیر اپنی مشکلات اور رکاوٹوں پر کڑی تنقیدی نظر ڈالیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ راہیں خود بخود پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن جب آپ " رومانی ذرائع " سے کام لیں گے اور واقعات کا مقابلہ کرنے کی بجائے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں گے اور مشکلات سے پیدا ہونے والے تکلیف دہ احساسات میں کھو جائیں گے اور اپنے دل کے زخم دکھا دکھا کر لوگوں سے ہمدردی کی توقع کریں گے اور اسی میں تسکین پائیں گے تو ——————— آپ کچھ نہیں کر سکتے۔

گو کہ آپ نے اس بات کا اظہار نہیں کیا ہے مگر آپ کا دوسرا سوال واضح طور پر بتا رہا ہے کہ آپ میں جذبۂ ایذا کشی ا—— (MASOCHISM)

موجود ہے۔ آپ میں ایک طرف تو یہ خواہش پائی جاتی ہے کہ آپ کو تکلیف پہنچے۔ آپ مصیبتیں سہیں تاکہ لوگ آپ کے ساتھ ہمدردی کریں اور خاص کر وہ لوگ جو آپ کو بہت محبوب ہیں۔ اور دوسری جانب ان خود ساختہ مصیبتوں پر آپ خود قہقہے لگا کے "جذبۂ ایذا کشی" میں اور بھی الجھن، اور بھی تکلیف، اور بھی لطف پیدا کرنا چاہتے ہیں —————— لہٰذا ہماری پُرخلوص رائے یہ ہے کہ آپ ان مصائب پر جو سے قہقہے لگانے کے بجائے ان کا صحیح طور پر تدارک کریں۔

۳۔ کیا آپ سچی اور بے لوث محبت کے قائل ہیں

"بے لوث اور سچی محبت" سے آپ کی مراد "افلاطونی محبت" تو نہیں —————— یعنی "محبت برائے محبت" ——————
"محبت کا مقصد خود محبت کرنے میں نہاں ہے" —————— وغیرہ وغیرہ۔

جب ہم محض "فلسفیانہ الجھنوں" سے الگ ہٹ کر نفسیاتی روشنی میں اس سوال پر غور کرتے ہیں۔ تو بھائی ہم کو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی "سچی اور بے لوث محبت" نہ صرف یہ کہ مفقود ہے بلکہ "ناممکن" بھی ہے۔ عام طور پر عشق و محبت کا جو مفہوم لیا جاتا ہے وہ یہی ہے نا کہ عورت و مرد کے درمیان ایک کشش پیدا ہو جائے؟ —— ظاہر ہے جہاں بھی اس قسم کی کشش ہوگی۔ وہاں "جنسی پہلو" یقیناً نمایاں نمایاں رہے گا۔ یہ اور بات ہے کہ اس جنسی پہلو کی شکل کو مختلف فلسفیانہ اور شاعرانہ بلند خیالیوں کی مدد سے اس حد تک بدل دیا جائے کہ اس کا پہچاننا دشوار ہو۔ لیکن نفسیات کی کڑی اور حقیقت کو ش نگاہوں سے وہ اپنے آپ کو چھپا نہیں سکتا۔ محبت میں "بے لوثی" کا تخیل تو محض ایک لطیف مغالطہ ہے۔ لیکن ہاں۔ سچائی کا ایک مفہوم ضرور ہے۔ ایک طرف تو سچی محبت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس کو مغالطہ آمیز "محبت برائے محبت" سے بچایا جائے اور اس کے مقاصد کو صرف شاعرانہ اور افسانوی بلند پروازیوں کا موضوع نہ تصور کیا جائے۔ اور دوسری طرف اس کو جنسی —— بے راہ روی (SAXUAL PERVERSION) سے محفوظ رکھا جائے۔

کیا خیال ہے آپ کا؟

یامین چودھری۔ لاہور

انسان کو ہر دلعزیز بننے کے لئے کونسا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے؟

ہر دلعزیز ہونے سے آپ کی مراد یہی تو ہے نا کہ جس سے بھی آپ ایک بار ملیں وہ آپ کا گرویدہ ہو جائے اور جس حلقے میں آپ [illegible] ہوں وہاں عام طور پر آپ کو پسند کیا جائے؟ —————— اس سلسلہ میں کچھ تو آپ کو اپنے گردوپیش کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ کچھ خود اپنا اندرونی جائزہ لینا پڑے گا۔ اور کچھ نفسیات کے موٹے موٹے اصولوں کو مدنظر رکھنا ہوگا۔

اب ذرا تفصیل سے سنیئے:-

(۱) آپ خود اپنے گردوپیش کا بغور مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ عام طور پر جو لوگ ہر دلعزیز ہیں ان میں کیا کیا خصوصیات ہیں۔ اور ان خصوصیات کو آپ اپنے میں پیدا کرنے کی کوشش کیجئے۔ لیکن اس میں بڑی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے کیونکہ اس میں خطرہ یہ ہے کہ کہیں آپ نقالی کے چکر میں پڑ کے بے ڈھنگی اور ناگوار خاطر حرکتیں نہ کرنے لگیں۔

(۲) آپ خود اپنے نفس کا جائزہ لیجئے۔ اور اندازہ لگائیے کہ آپ میں کونسی خصوصیات ایسی ہیں جن کو لوگ عام طور پر ناپسند کرتے ہیں —————— اور پھر ان کو دور کرنے کی کوشش کیجئے۔ اس میں بڑے خلوص کی ضرورت ہے۔

(۳) متذکرہ بالا دو طریقوں سے آپ بڑی حد تک دلعزیز ہو جائیں گے۔ لیکن انفرادی اختلافات کی وجہ سے آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جو پھر بھی آپ کو پسند نہ کریں۔ اس کے لئے نفسیات کے چند موٹے موٹے اصولوں کو ذہن نشین کر لینا بھی ضروری ہے۔ ان میں سب سے اہم تو یہ ہے کہ آپ کو اپنے جذبات پر پورا قابو ہونا چاہیئے۔ بحث سے حتی الامکان گریز کیجئے اور اگر آپ بحث میں پھنس بھی جائیں تو دوران بحث میں اپنے فریق کو یہ نہ محسوس ہونے دیجئے۔ کہ وہ کم علم ہے۔ جاہل ہے۔ یا کسی طرح بھی کمتر ہے۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ آپ اپنے سے زیادہ دوسروں میں دلچسپی لیں۔ دوران گفتگو میں خاص طور پر اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ جہاں تک ہو سکے

"انانیت" ـــــــــــــ یعنی "میں نے" ـ "میرا" "مجھ کو" وغیرہ کے گردان کیجیئے۔ ان الفاظ سے آپ اپنی شخصیت کو زبردستی حاوی کرنا چاہتے ہیں۔ جس کو کوئی بھی پسند نہیں کرسکتا۔

کے۔ بی۔ بجارانی ـ مری

جب کبھی افسانہ، مضمون یا خط لکھنے بیٹھتا ہوں۔ ابتدا ہمیشہ شاندار ہوتی ہے۔ وسط میں آکر بے پناہ خیالات کے ہجوم کا شکار ہو کر مضمون تشنۂ تکمیل رہ جاتا ہے جس کی شکایت عموماً میرے پروفیسر بھی کرتے ہیں۔ صرف اس سے نجات کا "راستہ"؟

آپ کی توجہ کسی خاص نقطہ پر مرکوز نہیں ہو پاتی۔ ابتدا شاندار اس لئے ہوتی ہے کہ مضمون، خط، یا افسانے کے شروع میں آپ کی توجہ صرف موضوع کے تعین پر مرکوز رہتی ہے۔ لیکن اس تعین کے بعد خیالات کا ہجوم سیلاب کی طرح امنڈتا ہے۔ آپ کا دماغ ان بکھرے ہوئے شیرازے کو ایک ترتیب کے ساتھ پیش کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس کا بہترین "راستہ" تو یہ ہے کہ لکھنے سے پہلے آپ ایک خاکہ تیار کر لیا کیجئے۔ اور پھر اس خاکہ کی بنیاد پر آپ اپنے مضمون کی تکمیل کر لیا کیجئے۔ دیکھئے۔ کیا اب بھی تشنہ رہتا ہے۔ اور اگر آپ کو اس میں بھی دقت پیش آئے اور یہ محسوس ہو کہ سوچتے اور غور کرتے وقت بھی آپ کا دماغ بھٹک جاتا ہے تو اس کا "راستہ" (ہمارا مشورہ) یہ ہے کہ آپ یا تو تقریباً ریاضی کے سوالات حل کیا کیجئے یا پھر منطق کی دو ایک کتابیں پڑھ ڈالئے۔ اگر یہ دونوں ممکن ہوں تو اور بھی اچھا ہے۔ اس سے آپ کے دماغ میں یکسوئی کے ساتھ سوچنے کی عادت پڑ جائے گی۔

ایچ۔ محمد یار بٹالوی۔ حیدر آباد (سندھ)

دنیا میں انسان کس عمر میں خوش رہتا ہے؟

انسان ہر عمر میں خوش رہ سکتا ہے۔ لیکن عام طور پر سب سے زیادہ خوشی کے لمحات بچپن کے ہوتے ہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ دماغی اور دنیاوی الجھنیں بڑھتی جاتی ہیں اور اس طرح بتدریج خوشی کی قدریں بدلتی جاتی ہیں۔ بچپن میں نا سمجھی کی وجہ سے جن باتوں میں خوشی محسوس نہیں ہو پاتی۔ ان ہی باتوں میں جوانی میں مزا آتا ہے۔ اطمینان اور رنگ برنگ معلوم ہوتی ہیں۔ یہی ضعیفی کا حال ہے۔

۲۔ اصلاحی یا تعلیمی فلم دیکھنا کیسا ہے۔ اور فلم دیکھنے سے آپ کے نزدیک فائدہ ہے۔ یا نقصان۔؟

اصلاحی اور تعلیمی فلم دیکھنا تو بہت ہی مفید ہے۔ ضرور دیکھئے۔ فلم دیکھنا یوں بھی بری بات نہیں۔ بس اس کا خیال رکھئے کہ بری فلمیں دیکھنے کی لت نہ پڑ جائے۔

غیور بدایونی۔ حیدر آباد سندھ

(۱) اکثر انسانوں میں یہ کمزوری دیکھی گئی ہے کہ وہ کسی سے بھی بات کرنے میں شرماتے ہیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ یہ غلط تربیت کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس کا کوئی علاج بھی ہے؟

سن شعور کی پہلی منزل جس کو PUBERTY کہتے ہیں زندگی کی وہ منزل ہوتی ہے جہاں سے انسان بچپن کو خیر باد کہہ کر سن بلوغ کی آمد آمد کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ یہ عمر لڑکیوں میں تقریباً گیارہ برس اور لڑکوں میں تیرہ برس کے بعد سے شروع ہو جاتی ہے PUBERTY کا زمانہ تقریباً تین چار سال تک رہتا ہے۔ اس عمر میں لڑکی یا لڑکا اکیلے رہنا پسند کرتے ہیں لوگوں کے درمیان بیٹھنے سے جھینپتے ہیں۔ لوگوں سے بات کرتے شرماتے ہیں لیکن یہ کوئی تشویشناک بات نہیں ہے PUBERTY کا زمانہ گذر جانے کے بعد یہ لڑکے یا لڑکیاں پھر معمول پر آجاتی ہیں۔ لیکن بعض لوگوں کو زندگی بھر کے لئے یہ عادت پڑ جاتی ہے۔ لوگوں سے بات کرتے یہ لوگ شرماتے ہیں ہر شخص آسانی سے ایسے لوگوں کو مرعوب کر لیتا ہے۔ ـــــــــ

اس کی خاص وجہ احساس کمتری ہے۔ احساس کمتری بچپن کے ماحول ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ پھر یہ ایک مستقل عادت کی صورت میں عمر کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہتا ہے اور انسان کی زندگی کے ہر پہلو

کو متاثر کرتا ہے۔ وہ اسے بے حد حساس بنا دیتا ہے اور خاص طور پر اپنی ذات کا احساس مریضانہ حد تک بڑھ جاتا ہے۔ ایسا آدمی جب کسی سے بات کرتا ہے تو اس کو ہر وقت یہ "خوف" رہتا ہے کہ وہ ٹھیک طرح سے کھڑا ہے کہ نہیں۔ اسی لئے وہ کھڑے رہنے کے انداز "بے چینی" سے بدلتا رہتا ہے۔ اسی طرح بات کرنے میں وہ بے حد "پریشان" ہوجاتا ہے ——— اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ ایسے شخص کو بات کرتے وقت یہ سوچنا چاہیئے کہ جس سے میں بات کر رہا ہوں۔ وہ بھی میری ہی طرح کا انسان ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی فکر میں گرفتار رہتا ہے۔ اس کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ ہر ایک کے کھڑے ہونے، ہنسنے، بات کرنے کے انداز دیکھا کرے۔ بہت ممکن ہے کہ جس سے بات کی جا رہی ہو۔ وہ خود اسی طرح کی "بے چینی" میں مبتلا ہو۔ بات کرتے وقت بجائے اس کے کہ میں اپنے کھڑے ہونے بیٹھنے یا بات کرنے کے انداز پر غور کروں۔ مجھے یہ چاہیئے کہ میں مخاطب کے ہنسنے، بات کرنے، ہاتھ ہلانے، کھڑے ہونے، بیٹھنے کے انداز کا مطالعہ کروں اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھوں ——— مجھ میں بات کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس لئے پورے اعتماد کے ساتھ مجھ کو بات کرنا چاہیئے ———

اگر وہ اس طرح سوچنے لگے گا تو اپنی ذات کا مریضانہ حد تک بڑھا ہوا احساس (SELF CONSCIOUSNESS) سے بری ہو سکتا ہے

کیا آپ اس پر عمل کر رہے ہیں؟

(۲) میں جب کسی معاملہ کے متعلق سوچتا ہوں تو سوچے چلا جاتا ہوں۔ بجائے اس کے کہ میں اس کے متعلق کوئی فیصلہ کروں۔ ایک نئی الجھن میں گرفتار ہو جاتا ہوں اگرچہ میں جلد کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر کامیاب نہیں ہوتا۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

منظور طارق صاحب کو جو جواب دیا گیا ہے وہی پڑھ لیں۔ دونوں کے سوالات تقریباً ایک ہی نوعیت کے ہیں۔

سلام و پیام

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

آپ کا "خیال" ٹھیک ہی ہے ——— میں "صنف نازک" میں اتنی نزاکت نہیں پاتا کہ اسے محض غازہ و لپسٹک ہی سے "الجھنے" دوں ——— "چوڑیوں" کے "بوجھ" میں دبنے دوں۔ اگر آپ نے اپنی دنیا میں چند رنگوں کے نیلے پیلے بت ہی رکھ چھوڑے ہیں۔ اور ان ہی کی "عبادت" میں "بے رنگ و بے کیف" بندوں کو بھولی ہوئی ہیں۔ تو آپ کو پوری پوری "آزادی" ہے۔ مگر خدارا مجھ سے یہ توقع نہ رکھئے۔ کہ میں اپنی بے رنگی اور بے کیفی کو چھوڑ کر آپ کی دنیا میں آ جاؤں اور جھوٹی بلندیوں کے آگے سربسجود ہو جاؤں اور ایک دن آپ ہی مجھے اٹھا کر طاق پر رکھ دیں۔ اور از راہ خلوص ایک پھولوں کا ہار گلے میں ڈال دیں۔ اور کہیں "میں تمہاری دیوتاؤں کی طرح عـــزت کیا کرتی ہوں"

تو "سلام و پیام" کو بہت غور سے پڑھتی ہیں آپ کہ شاید کوئی پیغام آپ کے نام بھی ہو اور پھر مایوس ہو کر یہ کوشش دیتی ہیں کہ 'ذرا کچھ تو ادھر بھی' مگر ——— بھولی سی، ننھی سی "محترمہ"۔ آپ کی یہ "خواہش" خطرناک حد تک بڑھتی نہ جائے کہیں آپ شارع عام پر کھڑی ہو کر ہر ایک سے یہ کہنے لگیں "ایک نظر مجھ پر بھی ڈال لو، ایک بات مجھ سے بھی کر لو" ——— میرا کیا میں قلم کی زبانی کچھ 'کھوکھلے' پیغام پہنچا دوں گا۔ اور آپ کچھ کا کچھ سمجھتے ہوئے 'سلام' کی بھی منتظر رہیں گی۔ مگر ——— مجھے افسوس ہے کہ میرا گلہ آپ کی "گلیوں" سے ممکن نہیں ہے ——— آپ ٹھہریں آزاد پرند۔ اور میں ———

خط و کتابت

کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے

کیا آپ نے "سالگرہ نمبر" پسند کیا ہے؟ ——— کچھ تو اپنے تاثرات لکھئے ......

خاص سائیکولوجی اردو کے لئے

خود فریبی

ماہ مبین

یہ لفظ تو بارہا آپ نے سُنا ہوگا ۔ مگر کبھی اس کے معنی پر بھی آپ نے غور کیا ہے ۔

وہ معنی نہیں جو عام طور پر آپ کو ہر لغت میں مل سکتے ہیں ؛ بلکہ میری مراد ———— ان معنوں سے ہے جو سچ مچ اس لفظ کے معنی ہیں ۔

" جھوٹ " ۔ " فریب " " ریاکاری " ———— اخلاقی دنیا کے یہ بدترین جرائم ہیں ۔ ہر وہ شخص جو اپنے کو شریف سمجھتا ہے ۔ ان میں سے ہر جرم سے پناہ مانگتا ہے ۔

دوسروں کو فریب دینا جرم ہے ۔ دوسروں سے جھوٹ بولنا گناہ ہے ۔ اخلاقاً بھی ۔ مذہباً بھی اور قانوناً بھی ———— مگر جب انسان خود اپنی ذات کو فریب دے رہا ہو ۔ تو کیا دنیا میں کوئی شخص ایسا ہے جو اس کو کہے کہ تم ایک جرم کا ارتکاب کر رہے ہو ۔ بدقسمتی سے تعزیرات میں اس کے لئے کوئی دفعہ موجود نہیں اور لوگ بھی ایسے شخص کو مجرم نہیں سمجھتے بلکہ اس سے اُلٹی ہمدردی کرتے ہیں ۔

لیکن یہ خود فریبی ہے کیا ؟

خود فریبی کے معنی ———— لغت کے معنی نہیں ———— بلکہ وہ معنی جو صحیح معنوں میں ہو سکتے ہیں ———— ہیں ۔ غصہ — رنج ۔ افسوس ۔ شکایت ۔ انتقام وغیرہ وغیرہ ۔

آپ کو یہ معنی کسی لغت میں نہیں ملیں گے ۔ لیکن آپ یقین کیجئے کہ " خود فریبی " کے اس کے علاوہ اور کوئی معنی ہو ہی نہیں سکتے ۔

افسوس ۔ شکایت — غصہ اور انتقام ایک ہی جذبے کے چار نام ہیں ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان مختلف لفظوں سے آپ کے ہر جذبے کی کمی و بیشی اور آپ کی طاقت و کمزوری کا صحیح اندازہ ہوتا ہے —

ہر نقصان کے بعد آپ کا یہ جذبہ ابھرتا ہے ۔ اور آپ پر رنج اور افسوس کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے — اگر آپ اپنے نقصان پہنچانے والے سے کمزور ہیں تو آپ کے لب پر " شکایت " آتی ہے ۔ اگر آپ طاقت ور ہیں تو آپ " غصہ " کرتے ہیں اور اگر آپ بہت زیادہ طاقتور ہیں تو — آپ " انتقام " یا " بدلہ " لیتے ہیں ۔

لیکن ذرا ———— آپ اپنی اس عادت کا ———— خواہ وہ فطری ہی سہی ———— تجزیہ تو کیجئے ۔

خدانخواستہ ———— آپ کے گھر میں چوری ہو گئی ————

[illegible] ———— آپ کی دوکان میں آگ لگ گئی ————

آپ کو [illegible] لگ گئے ———

کوئی شخص دھوکا دیکر آپ کو نقصان پہنچا گیا۔

غرضیکہ ان میں سے کوئی صورت ہوئی ———— نتیجہ اس کا ہوا نقصان۔ مالی نقصان۔

اور ہر نقصان کے بعد ———— گو لاشعوری طور پر ———— آپ کا وہ جذبہ ابھر آتا ہے۔ جس کے نام آپ نے رکھے ہیں غصہ افسوس۔ شکایت ———— مگر سوال تو یہ ہے کہ ہر نقصان کے بعد آپ کا یہ جذبہ بیدار کیوں ہوتا ہے

آپ کے ہاتھ سے شیشہ کا ایک گلاس گر کر ٹوٹ گیا۔

یہ ایک اتفاقی امر تھا۔

اب آپ رنج کیوں کرتے ہیں۔ کیا آپ کے رنج کرنے سے گلاس کے ٹکڑے پھر جڑ جائیں گے

آپ کے بچے نے چینی کی ایک پلیٹ پر ٹھوکر مار دی ———— اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ آپ اس پر غصہ کرتے ہیں —— کیوں؟ —— کیا وہ اس کو جوڑ سکتا ہے۔

آپ کے مکان میں ———— خدانخواستہ ———— آگ لگ گئی ———— اور سب اثاثہ جل کر راکھ ہو گیا

آپ رنج و غم سے بدحواس ہو رہے ہیں —— کھانا پینا بھی چھوٹ گیا ہے

لیکن آپ نے ذرا یہ غور بھی کیا کہ اس رنج و غم سے حاصل؟

وہ لوگ بھی جو اس حادثہ میں آپ کے ساتھ ہمدردی کر رہے ہیں، کیا آپ کے نقصان کی تلافی کر دیں گے۔ حقیقت یہ ہے ہر نقصان کے بعد رنج پیدا ہو ہی جاتا ہے ———— بلکہ یوں کہیئے کہ ہم پیدا کر ہی لیتے ہیں ———— صرف اس لئے کہ ہم ضمیر کی حساب سے ڈرتے ہیں۔

ہر نقصان کے بعد ہمارا ضمیر ہم سے پوچھتا ہے کہ آخر یہ نقصان کیوں ہوا؟

کیا ہم پہلے سے اس کا بندوبست نہیں کر سکتے تھے کہ یہ نقصان نہ ہوتا؟

آپ کے ہاتھ سے شیشے کا گلاس گر کر ٹوٹ گیا ———— اگر آپ احتیاط برتتے تو وہ ہرگز نہ ٹوٹتا۔

بچے نے چینی کی پلیٹ توڑ دی ———— اگر آپ ایسی نازک چیزوں کو بچے کی دسترس سے باہر رکھتے تو کیوں کر وہ نقصان کرتا ————

آپ کے مکان میں آگ لگ گئی ———— ظاہر ہے کہ آگ خود بخود تو نہیں لگا کرتی ———— کوئی نہ کوئی بے احتیاطی ہوئی ہوگی ———— پھر اگر احتیاط برتی جاتی تو کیوں آگ لگتی۔

گھر میں چوری ہو گئی ———— آپ نے رات کو دروازے اچھی طرح بند نہیں کئے تھے۔

دوکان کا قفل ٹوٹ گیا ———— آپ نے کسی پہریدار کا بندوبست نہیں کیا تھا

غرضیکہ ———— ہر نقصان کے بعد آپ کا ضمیر آپ سے جواب طلب کرتا ہے۔ اور آپ کی اندرونی آواز کہتی ہے کہ یہ نقصان آپ کی اور صرف آپ کی غلطی سے ہوا ہے —— اگر آپ میں پیش بینی کا مادہ ہوتا ———— اگر آپ کی طبیعت احتیاط پسند ہوتی ———— تو ہرگز یہ نقصان نہیں ہو سکتا تھا۔

آپ اپنے اندر کی اس آواز کو سنتے ہیں ———— لیکن آپ نہیں چاہتے کہ کوئی دوسرا بھی اس کو سن سکے آپ کے اندر اتنی جرأت نہیں کہ آپ اپنی غلطی کا اعتراف کر سکیں۔ آپ اپنی نگاہ میں ذلیل ہونے لگتے ہیں —— یہی وقت ہوتا ہے جب آپ اپنی ذات کو فریب دیتے ہیں

آپ اپنے ضمیر سے جھوٹ بولتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ میں بے قصور ہوں ۔ قصور کسی دوسرے کا ہے ۔

یہ آپ کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے قصور ۔ اپنی غلطی کا الزام کسی دوسرے کے سر تھوپ دیں ۔ آپ کہتے ہیں کہ فلاں نے مجھے باتوں میں لگایا اس وجہ سے میرے ہاتھ کا گلاس گر کر ٹوٹا ۔

بچے نے ٹھوکر ماری اس لئے چینی کی پلیٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی

یہ دوسرے کی غلطی تھی جس سے مکان میں آگ لگی

یہ حکومت کی کمزوری ہے ۔ یا پولیس کی حرام خوری جو میرے گھر میں یا دوکان میں چوری ہوئی

اور پھر اپنی اندرونی ندامت کو مٹانے اور اپنے الزام کو سچ ثابت کرنے کے واسطے ـــــ غصہ ۔ رنج اور افسوس کا ڈھونگ رچاتے ہیں ۔

مگر ان باتوں کا حاصل ـــــــــــــــــ ؟

آپ ہی کی طرح دوسرے لوگ بھی ہیں ۔ مگر وہ آپ کی طرح کمزور نہیں ہیں کہ اپنے ضمیر کو مطمئن نہ کر سکیں یا اپنی غلطی کا اعتراف نہ کر سکیں ـــــــ وہ نقصان کی پرواہ نہیں کرتے ہیں ـــــ وہ جانتے ہیں کہ اس سے کچھ حاصل نہیں !

ایک نقصان ہونا تھا ـــــ وہ ہو گیا ـــــ اب اپنا وقت ۔ کسی کی شکایت کر کے ۔ کسی پر غصہ کر کے ۔ کسی سے بدلہ لینے کی اسکیم بنا کر ـــــــــ کیوں ضائع کریں ۔

وہ تو صرف یہ سوچتے ہیں کہ نقصان ہونا نہ چاہیئے تھا ـــــــــــــ آخر ہماری کیا غلطی تھی یا ہماری کیا کمزوری تھی جس سے یہ نقصان ہوا ـــــ اور آئندہ اب نہیں ہوگا ۔ [illegible]

مگر جو لوگ بھی آپ کی طرح رنج ـــ اور غصہ کے جذبات سے مغلوب ہو جاویں تو وہ کبھی صحیح طور پر نہیں سوچ سکتے ـــــ اور جب تک مرض کی تشخیص نہ ہو ـــــ علاج کبھی نہیں ہو سکتا ـــــــــــ اگر آپ کا آج ایک نقصان ہوا ہے ۔ اور فکر و غصہ کے جذبات سے آپ مجبور کیے گئے ہیں ـــــــــــــ تو یقین کیجئے کہ ـــــــــــ ابھی ایک نقصان آپ کا اور ہوگا ـــــــــــ اور پھر ایک اور ـــــــــــ اور پھر ایک کے بعد ایک اور ـــــــــــ ۔ اور یہ سزا ہے اس جھوٹ کی جو آپ نے اپنے نفس کے ساتھ بولا کیونکہ دنیا کا قانون تو اس ریاکاری کی سزا آپ کو نہیں دے سکتا مگر ـــــــــــ قدرت کا قانون ـــــــــــ تو ہر جگہ آپ کا گریبان پکڑنے کو موجود ہے ـــــ

یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی چیز کیا ہے ؟

چاندی ۔ سونا ۔ ہیرا ـــــ ان میں سے کوئی بھی چیز اتنی قیمتی نہیں ہے جتنا قیمتی "وقت" ہے کیونکہ ـــــــــــــ یہی وقت تو ہے ، جس کی قیمت کسی کے ہاں اگر تانبے کے چند سکے ہیں تو کسی کے ہاں یورینیم کی کانیں ۔

یہ تو اپنا اپنا ظرف ہے کوئی اپنے وقت کے بدلے میں چاندی کے سکے قبول کر لیتا ہے ۔ اور کوئی اپنے وقت کی اتنی قیمت لیتا ہے جس کے گننے کے واسطے اسے پھر کسی دوسرے کے وقت کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے ۔ اور جی ہاں ـــــ اسی قیمتی حرمت کی قیمت آپ کے نزدیک کیا ہے

آنکھوں کے آنسو ؟

چند ہوائی ہوائیاں ؟ !

یہ سر درد کی بے چینی ؟ ! !

واہ حضرت واہ — خوب قیمت وصول کی آپ نے اپنے وقت کی۔

پندرہ روپوں کے نقصان کی خاطر ———— مانا کہ وہ آپ کا کل اثاثہ ہی تھا — آپ ایک ایسا فعل کر رہے ہیں جس کا کوئی حاصل نہیں آپ رنج کیوں کرتے ہیں ———— زیادہ نہیں صرف دو چار منٹ ———— جی ———— صرف دو چار منٹ ہی سہی —— آپ کے نزدیک تو ان دو چار منٹوں کی کوئی قیمت نہیں مگر بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو ان دو چار منٹ میں کئی اکائیاں۔ کئی دہائیاں۔ کئی سینکڑے بلکہ کئی ہزار اور کئی لاکھ حاصل کر لیتے ہیں — اگر وہ اپنے وقت کی اتنی زبردست قیمت وصول کرتے ہیں۔ تو آپ بھی ان سے کچھ پیچھے نہیں ہیں۔

چھوڑیئے ان باتوں کو ———— نقصان ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہر نقصان کے بعد آپ یہ نہ سوچئے کہ کس نے ہمارا یہ نقصان کیا بلکہ یہ سوچئے کہ یہ نقصان کیوں ہوا۔ اس میں کس حد تک آپ کی اپنی غلطی تھی۔ دوسروں نے جو بھی غلطی کی آپ ان کو روک نہیں سکتے — آپ ایک کو روکیں گے تو دوسرا وہی غلطی کرے گا۔ دوسرے کو بند کیجئے گا تو تیسرا آپ کو زک پہنچائے گا۔ اس وسیع و عریض دنیا میں آپ کس کس کو روکیں گے۔ یہاں تو ایک شخص سے دوسرے کو نقصان پہنچتا ہی رہتا ہے۔ انسانوں کو چھوڑیئے۔ جانور تک آپ کا نقصان کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

آپ نے غلہ بھرا تھا کہ سال بھر اناج سے بے فکری ہوگی ———— وہ گھنوں نے کھا ڈالا

اچھی اچھی کتابیں آپ نے جمع کی تھیں ———— انہیں جھینگروں نے کاٹ ڈالا

فرنیچر کس محنت سے بنوایا تھا آپ نے ———— اس کو دیمک چاٹ گئی۔

شیشے کے آلات و برتن سے الماری سجائی تھی ———— چوہوں نے گرا کر توڑ دیئے۔

دودھ رکھا تھا۔ اپنے پینے کے واسطے ———— بلی اس کو چٹ کر گئی

گوشت بھونا تھا کہ کھانا ایک روٹی زیادہ کھائی جائے گی ———— مگر وہ کتے کے نصیب کا تھا۔

پھر اگر ہر نقصان پر آپ آنسو بہاتے رہیں گے اور دوسروں ہی کی شکایت کرتے رہیں گے تو جناب من ———— کبھی بھی آپ کے یہ نقصان بند نہ ہوں گے۔

آپ تو ہر نقصان پر یہ سوچئے کہ یہ نقصان کیوں ہوا ———— اور پھر احتیاط کیجئے ———— دیکھئے آئندہ کبھی نقصان نہ ہوگا —

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو خدا نے کچھ نہ دیا ہے ———— اور جن کے پاس کچھ ہوتا ہے ان ہی کا کبھی کبھی نقصان بھی ہوتا ہے اگر آپ کی صراحی بھری ہوئی ہے تو جب بھی آپ انڈیلیں گے پانی کی کئی بوندیں ضرور گریں گی۔ مگر جن کی صراحی خالی ہے وہ اگر سو دفعہ بھی صراحی کو اُلٹ پلٹ کریں۔ پانی کی ایک بوند بھی نہیں گر سکتی۔ اسی طرح جو نقصانات سے بہت خوفزدہ رہتے ہیں ان کو چاہیئے کہ وہ گوشہ نشینی اختیار کر لیں نہ کچھ موجود ہوگا اور نہ کچھ نقصان ہوگا۔

دیکھئے نا ———— چچا غالب کیا کہہ گئے ہیں ؎

نہ لٹتا دن کو تو کب یوں رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

اب غالباً آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ دنیا جسے رنج و غم —— فکر و افسوس۔ غصہ و انتقام کہتی ہے اس کا نام ہے خود فریبی — اگر دنیا کے قانون میں اس ریاکاری کی کوئی ممانعت نہ ہو — مگر خدا کے قانون میں تو اس کی ممانعت کا ایک پورا باب ہے۔ کتنی ہی جگہ تو کہا گیا ہے کہ تم پر کوئی مشقت مصیبت آئے تو ہراساں نہ ہو — صبر کرو — اور کہو کہ انا للہ وانا الیہ راجعون خدا ہی نے یہ چیز دی تھی۔ خدا ہی نے لے لی۔ اور اگر ہم کوشش کریں تو خدا

ATOM AND ATOMIC ENERGY پر تفصیل سے کچھ

بات چیت کا ایک سوال

جوہر اور جوہری توانائی

مسعود جاوید بی ایس سی (عثمانیہ)

بے کراں کائنات کے بے شمار اداکار ــ ــــــــ زمین، چاند، سورج، ستارے، کہکشاں، اور نہ جانے خلاء میں رقص کرنے والے کتنے وجود ہیں! ــــــ برسوں سے انسانی فکر کے موضوع بنے ہوئے ہیں۔ متقدمین کا خیال تھا کہ تمام مادی اشیاء ــــ فضا گھیر لے اور مزاحمت پیش کرنے والی چیزیں ــــ چار بنیادی سادہ اشیاء، آب و آتش اور باد و خاک، کی کم و بیش ترکیب سے وجود پذیر ہوئی ہیں۔ اور ان کی تحلیل سے بالآخر یہی چار اشیاء حاصل ہو سکتی ہیں مگر انسان کی مستقل دماغ سوزی کی بدولت اب ان عناصر اربعہ کا تصور افسانوی ہو کر رہ گیا ہے۔ ان چار اشیاء میں سے ایک بھی بنیادی اور سادہ نہیں۔ سب کی سب دیگر سادہ اشیاء کے پیچیدہ مرکب یا آمیزے ہیں۔ جدید تحقیقات میں کوئی بیانوے (۹۲) سادہ اشیاء ــــ عناصر ــــ معلوم ہوئی ہیں۔ سادہ، اس مفہوم میں کہ ان کی تحلیل سے کوئی اور مختلف الخواص شے حاصل نہیں ہو سکتی۔ لوہے سے، لاکھ تحلیل کیجئے، لوہا ہی حاصل ہوگا۔

یہ عناصر تقسیم پذیر ہیں۔ اگر ان کی تقسیم مسلسل جاری رکھی جائے تو ایک مقام ایسا آتا ہے کہ اس کے آگے تقسیم، محال تو نہیں، کسی قدر دشوار ہو جاتی ہے۔ اس منزل پر جو ذرہ حاصل ہوتا ہے، اسے سادہ میکانکی طریقوں سے مزید اجزاء میں تقسیم کرنا ممکن نہیں رہتا اور اگر اسے کسی طریقہ سے تقسیم بھی کر دیا جائے تو اس سے حاصل ہونے والے اجزاء میں ابتدائی مادہ کے خواص باقی نہیں رہتے ـ لوہا، لوہا نہیں رہتا، بلکہ کچھ اور ہو جاتا ہے۔ اسی مخصوص ننھے ذرہ کو جس میں ابتدائی مادہ کے خواص باقی رہتے ہیں، جوہر (ATOM) کہتے ہیں۔ مختلف عناصر کے جواہر باعتبار خواص مختلف اور متعلقہ عناصر کے صحیح نمائندے ہوتے ہیں۔ یہ جواہر اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ انہیں خالی آنکھ سے دیکھنا تو ایک طرف تصور بھی ممکن نہیں۔ دس کروڑ جواہر کو خط مستقیم میں بازو بازو رکھنے سے ایک انچ طول پر ہوتا ہے! یہ کروی ہوتے ہیں۔ ان کا اوسط قطر (DIAMETER) ایک انچ کے دس کروڑویں حصہ کے برابر ہوتا ہے۔ ہائیڈروجن کا جوہر سب سے ہلکا ہوتا ہے۔ اس قدر ہلکا کہ ایک گرام ہائیڈروجن میں کوئی (۶×۱۰^{۲۳}) جواہر ہوتے ہیں۔ سب سے بھاری جوہر یورینیم کا ہوتا ہے جو ہائیڈروجن جوہر سے ۲۳۸ گنا وزنی ہوتا ہے۔

اس قدر حقیر ہونے کے باوصف، یہی ناچیز ذرّے کائنات کی تشکیل کے ذمہ دار ہیں اور سارے قدرتی نظارے انہیں کے کرشمے ہیں۔ معمولی کیمیائی تعاملات میں یہی حصہ لیتے ہیں مگر اس دوران میں ہمیشہ اپنی وحدت اور سالمیت کو برقرار رکھتے ہیں ــــــ جب کلورین کا ایک جوہر سوڈیم کے ایک جوہر سے متحد ہوتا ہے تو نمک طعام کا ایک سالمہ حاصل ہوتا ہے۔ مگر اس اتحاد سے ان کی انفرادیت متاثر نہیں ہوتی۔ ان کے داخلی نظام میں، جن پر بعد میں گفتگو ہوگی ــــــ کوئی تبدیلی ظاہر نہیں ہوتی۔ البتہ مرکب کے خواص، اجزائے ترکیبی کے خواص سے بالکل مختلف ہوتے ہیں ــــــ یہ ایسا ہی ہے جیسے گذشتہ جنگ میں، اختلافات کے باوجود، روس اور برطانیہ متحد ہو گئے تھے۔ اس اتحاد سے نہ تو ان کی انفرادیت متاثر ہوئی اور نہ داخلی نظام میں کوئی تغیر رونما ہوا، البتہ خارجی حکمت عملی کچھ ہم آہنگ سی ہو گئی تھی۔

فطرت شناس سائنسداں، جوہر کے اندر جھانکے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے جوہر کے اندر پائی جانے والی ننھی مگر انتہائی پیچیدہ دنیا کا خوب

مطالعہ کیا اور اپنے ذہن رسا کے نتائج سے دنیا کو مبہوت بنا کر دیا۔ جوہر کے اندر ایک مرکزی ذرہ ——— مرکزہ ——— ہوتا ہے۔ مرکزہ کے گرد مختلف سطحوں (PLANES) میں واقع، مختلف چھوٹے بڑے دائری اور ناقصی (CIRCULAR AND ELLIPTIC) مداروں پر ذرات ——— ایک مدار پر صرف ایک ذرہ ——— گردش کرتے رہتے ہیں۔ مرکز کی کشش اور مرکز گریز قوت، سیاروں کی طرح ان کی بھی گردش کا باعث ہوتی ہیں۔ منفی برق کی انتہائی قلیل مقدار، اس قدر قلیل کہ اس سے کم مقدار میں برق، کائنات میں کہیں موجود نہیں ——— ان سے وابستہ ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ برقیے (ELECTRONS) کہلاتے ہیں۔ خاص حالات میں یہ برقیے ایک مدار سے دوسرے مدار پر چھلانگ لگا کر پہنچ جاتے ہیں۔ کیمیائی تعاملات کا دارومدار انہیں مداری ذروں پر ہوتا ہے۔ مگر یہ بے چارے، جوہر کے مرکزہ میں پائے جانے والے ذروں کے تابع متغیر ہوتے ہیں۔ مرکزہ ——— سوائے ہائیڈروجن جوہر کے مرکزہ کے جس میں صرف ایک ذرہ ہوتا ہے ——— متعدد ذروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں برقیوں کے علاوہ مثبت برق کے حامل ذرے بھی پائے جاتے ہیں، جنہیں (PROTON) پروٹان کہا جاتا ہے۔ پروٹانس پر مثبت برق کی ٹھیک اسی قدر مقدار ہوتی ہے، جتنی برقیے پر منفی برق کی۔ لیکن ان کی کمیت (MASS) برقیہ کی کمیت سے کوئی (۱۸۵۰) گنا زیادہ ہوتی ہے۔ مرکزہ میں ہمیشہ پروٹانس کی تعداد، برقیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ برقیے اپنی تعداد کے برابر پروٹانس سے مل کر متعدد تعدیلی ذرے، تعدیلیے (NEUTERON) بناتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی مرکزہ میں کچھ آزاد پروٹانس باقی رہ جاتے ہیں۔ اب جس قدر پروٹانس مرکزہ میں غیر تعدیل شدہ رہ جاتے ہیں ٹھیک اسی قدر برقیے، مرکزہ سے باہر، مرکزہ کے گرد، مداروں پر چکر کاٹتے ہیں۔ چونکہ ہائیڈروجن جوہر کے مرکزہ میں صرف ایک ہی پروٹان ہوتا ہے، برقیہ نہیں ہوتا، اس لئے مرکزہ کے گرد ایک ہی برقیہ گھومتا ہے۔ سب سے بھاری جوہر، یورینیم کے مرکزہ میں ۲۳۸ پروٹانس اور ۱۴۶ برقیے ہوتے ہیں اس لئے مرکزہ کے گرد گردش کرنے والے برقیوں کی تعداد (۲۳۸ - ۱۴۶ = ۹۲) ہوتی ہے۔ تمام جواہر میں اسی قسم کی ترتیب پائی جاتی ہے۔ اور تمام جواہر کے برقیے اور پروٹانس ہر لحاظ سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مادہ کے اساسی ذرے برقیے اور پروٹانس ہیں۔

کسی جوہر کے کیمیائی خواص کا انحصار بیرونی برقیوں کی تعداد پر ہوتا ہے۔ ایسے بھی جواہر پائے جاتے ہیں جن میں گردشی برقیوں کی تعداد تو، اسی عنصر کے کسی اور جوہر کے برابر ہوتی ہے مگر مرکزہ میں پروٹانس کی تعداد مختلف ——— ہائیڈروجن جوہر میں عام طور پر، مرکزہ میں ایک ہی پروٹان ہوتا ہے اس لئے مرکزہ کے گرد ایک برقیہ گھومتا ہے۔ مگر ہائیڈروجن کے ایسے جواہر پائے جاتے ہیں جن کے مرکزہ میں ایک پروٹان کی بجائے ۲ پروٹانس اور ایک برقیہ ہوتا ہے اور مرکزہ کے گرد گھومنے والا برقیہ وہی ایک۔ اسی طرح یورینیم کے دو مختلف جوہر ہوتے ہیں جن کے گردشی برقیوں کی تعداد تو (۹۲) ہی ہوتی ہے مگر مرکزہ میں پروٹانس کی تعداد (۲۳۸) اور (۲۳۵) پائی جاتی ہے۔ اس قسم کے جوہر جن کے گردشی برقیوں کی تعداد تو ایک ہی مگر پروٹانس کی تعداد مختلف ہوتی ہے، کسی عنصر کے ہمجا (ISOTOPE) کہلاتے ہیں۔

جوہر کی ساخت کے مطالعہ سے، ایک عنصر کے جوہر کو دوسرے عنصر کے جوہر میں تبدیل کرنے کے امکانات دکھائی دینے لگے کیونکہ مرکزہ میں پروٹانس اور برقیوں کی تعداد کا اختلاف، عناصر کے اختلاف کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اگر کسی طرح ایک عنصر کے جوہر میں پائی جانے والی تعداد کو تبدیل کر دیا جائے تو وہ عنصر کسی دوسرے عنصر میں تبدیل ہو جائے گا۔ تعداد میں تغیر کا طریقہ کیا ہو؟ عرصہ دراز تک زیر غور رہا اور بالآخر قدرت نے ہی اس سلسلہ میں رہنمائی کی۔ قدرت اشاروں کنایوں میں گفتگو کیا کرتی ہے "سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کرنا" ہر شخص کے بس کی بات نہیں، اس کے پرستار ہی ایسا کر سکتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے آخری سالوں میں بی کیورل (BECQUEREL) اور اس کے بعد [illegible] کیوری (P. CURIE) اور مادام کیوری (MAE. J. CURIE) نے ایک دلچسپ قدرتی مظہر کا پتہ [illegible] (RADIO ACTIVITY) [illegible] گیا۔ ان محققین نے دیکھا کہ [illegible]

[illegible]

میں سے بعض تو "عہ" ذرات (ALPHA PARTICLES) پر اور بعض "بہ" ذرات (BETA PARTICLES) پر اور بعض اشعاع پر مشتمل ہوتی ہیں۔ "عہ" ذرات دراصل ۲ پروٹانس اور ۲ برقیوں کا ایک اتحاد ہوتا ہے۔ "بہ" ذرہ، برقیہ کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں۔ اشعاع، جنہیں "جہ" شعاعیں (GAMA RAYS) کہتے ہیں، توانائی کی ایک قسم ہوتی ہے۔ جب مرکزہ سے "عہ" ذرہ یا "بہ" ذرہ خارج ہوتا ہے تو جوہر کی نوعیت کچھ اور ہو جاتی ہے کیونکہ اب مرکزہ میں ذروں کی تعداد ابتدائی نہیں رہی۔ اس طرح قدرت میں عناصر کی قلب ماہیت کا عمل جاری ہے۔ لیکن یہ عمل صرف بھاری عناصر تک محدود ہے۔ ہلکے جواہر میں تابکاری نہیں پائی جاتی۔ لیکن قدرت کا اس قدر اشارہ ہی کافی تھا۔ اس قدرتی طریقہ کی اتباع کرتے ہوئے ۱۹۱۹ء میں رتھرفورڈ نے ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں تبدیل کر دیا۔ اس نے قدرتی تابکاری میں خارج ہونے والے "عہ" ذرات کی نائٹروجن پر بمباری سے نائٹروجن کو آکسیجن میں بدل دیا۔ ہوا یہ کہ "عہ" ذرہ مرکزہ میں داخل ہو کر وہاں جم گیا، خارج نہ ہو سکا جس کی وجہ سے مرکزہ میں ذروں کی تعداد بدل گئی اس لئے عنصر کی نوعیت میں تبدیلی ہو گئی۔ اس تجربہ کی وجہ سے صدیوں کی انسانی آرزو کہ ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں بدلا جائے، پوری ہو گئی۔ مگر تابکاری کی دریافت اور رتھرفورڈ کے تجربہ کی وجہ سے انسان ایک ایسی قیمتی شے کو پا گیا جس کے آگے گراں سے گراں دھات بھی ہیچ ہے۔ قدیم کیمیاگر تو معمولی دھاتوں سے سونا چاندی بنانا چاہتے تھے مگر جدید سائنس دان اس سنہری روپہلی منزل پر پہنچتی ہوئی نگاہ ڈال کر ایک ایسی منزل پر پہنچ گئے کہ اسے پچھلی ساری منزلیں گرد راہ معلوم ہونے لگیں!

تابکاری کی دریافت کے بعد یہ معلوم ہوا کہ عناصر کی قلب ماہیت کے دوران میں جو توانائی اشعاع کی صورت میں خارج ہوتی ہے، وہ معمولی کیمیائی تعاملات میں خارج ہونے والی توانائی سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ ایک گرام کوئلہ جب فضا کی آکسیجن میں جلتا ہے تو ۸ ہزار حرارے خارج ہوتے ہیں ——— اگر توانائی کی پیمائش حراروں (CALARIES) کی صورت میں کی جائے ——— برخلاف اس کے ایک گرام یورینیم کے کسی اور عنصر میں تبدیل ہونے سے ۱۹ - ارب حرارے خارج ہوتے ہیں!! توانائی کی اس قدر عظیم مقدار ایک ننھے سے مرکزہ میں کیونکر مقید ہے اور اس کی ماہیت کیا ہے؟ جدید طبیعیات کا ایک اہم باب ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ مرکزہ میں پروٹانس اور برقیے ہوتے ہیں اور برقیے اپنی تعداد کے برابر پروٹانس کے ساتھ مل کر تعدیلیئے بناتے ہیں۔ اس طرح مرکزہ میں برقیوں کا آزادانہ وجود نہیں ہوتا، صرف تعدیلیئے اور پروٹانس ہوتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ [illegible] ہے کہ مشابہ برق کے حامل اجسام ایک دوسرے کو دفع کرتے ہیں اور متضاد برق رکھنے والے ایک دوسرے کو جذب کرتے ہیں۔ اب چونکہ مرکزہ میں پروٹانس، مثبت برق کے حامل ذرات ہیں اور بغیر کسی برق کے ذرات تعدیلیئے ہوتے ہیں اس لئے ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ مرکزہ دفع کے تحت پاش پاش ہو جاتا، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اور قوت ایسی ہے جو پروٹانس کی قوت دفع کے خلاف عمل کر کے مرکزہ کی ہیئت کو باقی رکھتی ہے اور یہی حقیقت بھی ہے۔ مرکزہ میں سطحی تناؤ کی قوت پائی جاتی ہے ——— جیسے پانی کے قطرہ میں پائی جاتی ہے ——— یہ قوت مرکزہ کی سطح پر عمل کرتی ہے اور سطح کے رقبہ کی کمی و بیشی کے ساتھ گھٹتی اور بڑھتی ہے۔ معمولی حالات میں سطحی تناؤ کی قوت اور پروٹانس کی مجموعی برقی توانائی اس طرح متوازن رہتے ہیں کہ مرکزہ کے مختلف ذرات باہم مربوط رہتے ہیں۔ اگر کسی صورت سے برقی توانائی اور سطحی تناؤ کے اس توازن قوت کو بگاڑ دیا جائے تو مرکزہ کے ذرات منتشر ہو جائیں گے۔ یہ ایک تجربہ کی بات ہے کہ اگر برق کے حامل کسی جسم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ان حصوں کی مجموعی برقی توانائی، ابتدائی جسم واحد کی توانائی سے کم ہوگی۔ اور اگر کسی ایسے دو اجسام کو جس میں سطحی تناؤ ہے، ملا دیا جائے تو مرکب کی سطحی توانائی ابتدائی اجسام کی مجموعی سطحی تناؤ کی قوت سے کم ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں جو نقصان توانائی واقع ہوتا ہے وہ حرارت ہو جاتا ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر مرکزہ سے وابستہ توانائی کو آزاد کرنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں یا تو کسی جوہر کے مرکزہ کو دو حصوں میں بانٹ دیا جائے یا پھر دو مرکزوں کو ملاپ کا موقع دیا جائے۔ پہلی صورت میں برقی توانائی اور دوسری صورت میں سطحی تناؤ کی توانائی خارج ہوگی۔ مرکزہ کی تقسیم یا دو مرکزوں کی ترکیب کے لئے بیرونی قوت کا عائد کرنا ناگزیر ہے۔ عملی اغراض کے لئے وہی صورت مفید ہے جس میں بیرونی قوت کم سے کم درکار ہو۔ تحقیقات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ [illegible] کے جواہر اس مقصد کے لئے مفید ہیں۔ بقیہ تمام جواہر اس قدر بیرونی قوت چاہتے ہیں کہ انسان فی الوقت اتنی قوت بہم نہیں پہنچا سکتا۔ کتنا مفید

مطلب دو جواہر میں سے ایک تو سب سے ہلکے عنصر ہائیڈروجن کا بھاری ہمجا ڈیوٹیریم (DEUTERIUM) یا $_1^2D$ ہے اور دوسرا سب سے بھاری عنصر یورینیم کا ہلکا ہمجا ($^{235}U_{92}$) ہے لیکن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے یہ دونوں جواہر ہماری زمین پر نہایت ہی قلیل مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ اس منزل پر پہنچ کر جوہری توانائی کو مرکزہ سے آزاد کرانے کا مسئلہ دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ پہلا یہ کہ یورینیم کے ہلکے ہمجا کو کس طرح توڑا جائے یا پھر ڈیوٹیریم (DUETERIUM) کے دو مرکزوں کو کس طرح ملایا جائے اور دوسرا یہ کہ یورینیم کے ہلکے ہمجا یا ڈیوٹیریم کو جو کمیاب ہیں کس طرح حاصل کیا جائے، بعض فنی دقتوں کے پیش نظر ابتداءً ڈیوٹیریم پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ امریکی سائنس دانوں کی توجہ کا مرکز یورینیم جوہر ہی رہا۔ اور اسی جوہر سے انہوں نے توانائی آزاد بھی کی۔ گذشتہ چند دنوں سے اخبارات میں روس سے متعلق خبریں شائع ہو رہی ہیں کہ روسی سائنسدانوں نے بھی جوہری توانائی پر قابو حاصل کر لیا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ انہوں نے اس مقصد کے لئے یورینیم کو استعمال نہیں کیا بلکہ ہائیڈروجن کے بھاری ہمجا کو استعمال کیا ہے۔ لیکن یہاں یورینیم کے ہلکے ہمجا سے توانائی کے اخراج کے مسئلہ پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ رتھرفورڈ نے نائٹروجن کو 'ع' ذرات کا ہدف بنایا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ 'ع' ذرہ نائٹروجن کے جوہر کے مرکزہ میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ لیکن یہی عمل بھاری جواہر کے ساتھ کیا جائے تو 'ع' ذرہ مرکزہ میں ٹھہر نہیں سکتا بلکہ خارج ہو جاتا ہے اور خارج ہوتے ہوتے مرکزہ کو تقریباً دو مساوی حصوں میں توڑ دیتا ہے۔ چنانچہ پہلے پہل یورینیم کے ہلکے ہمجا ($^{235}U_{92}$) کو 'ع' ذرات کا ہدف بنایا گیا مگر خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے جس کے مختلف وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ 'ع' ذرہ بحیثیت مجموعی دو مثبت برقی بار کا حامل ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ اس کی رفتار متناسب نہیں ہوتی۔ اس لئے 'ع' ذرہ کے بعد پروٹان کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا گیا، گو نتائج 'ع' ذرہ سے اچھے رہے مگر اعلیٰ پیمانہ پر استعمال کے لئے یہ بھی مفید ثابت نہیں ہوا۔ بالآخر تعدیلیوں (NEUTR ONS) کی باری آئی چونکہ یہ برقی لحاظ سے بے بار ہوتے ہیں اور ان کی رفتار بھی خاطر خواہ ہوتی ہے اس لئے ان سے تشفی بخش نتائج برآمد ہوئے مگر مشکل یہ ہے کہ ان کا کہیں آزادانہ وجود نہیں پایا جاتا۔ یہ تابکاری میں بھی خارج نہیں ہوتے اس لئے ان کے حصول کے لئے تابکاری سے خارج ہونے والے 'ع' ذرات سے کسی اور عنصر پر بمباری کرنی پڑتی ہے۔ اور اس طرح حاصل ہونے والے تعدیلیوں سے $^{235}U_{92}$ پر بمباری کی جاتی ہے۔ گو یہ طریقہ طویل ہے مگر اس سے بہتر کوئی متبادل صورت بھی نہیں اس لئے اسی طریقہ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ جب $^{235}U_{92}$ پر تعدیلیئے سے بمباری کی جاتی ہے تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ تعدیلیئے ٹھیک مرکزہ ہی پر جا کر لگے۔ بعض اوقات خطا بھی ہو جاتا ہے اور جوہر کو مس کرتے ہوئے گذر جاتا ہے جس سے مقصد حاصل نہیں ہو سکتا اور پھر $^{235}U_{92}$ کے صرف ایک جوہر کو استعمال کرنا نہ تو آسان ہے اور نہ فائدہ مند، کیونکہ ایک جوہر سے جو توانائی خارج ہوگی وہ عمل اخراج کے طویل اور وقت طلب طریقے کے لحاظ سے بہت کم ہوگی۔ وہی طریقہ بہتر ہوگا جس میں زیادہ سے زیادہ توانائی حاصل کی جا سکے۔ اس لئے یورینیم کا ایک ہمجا استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ ان کی معتدبہ تعداد — سائنس کے الفاظ میں معتدبہ — استعمال کی جاتی ہے۔ اس سے ہوتا یہ ہے کہ جب اس مقدار پر تعدیلیوں کی بمباری کی جاتی ہے تو ان کے مرکزوں سے ٹکرانے کے امکانات، جواہر کی کثرت کی وجہ سے، بڑھ جاتے ہیں اور پھر جب ایسا مرکزہ منقسم ہوتا ہے تو اس سے تعدیلیئے بھی خارج ہوتے ہیں۔ یہ تعدیلیئے مزید دوسرے جواہر سے متصادم ہوتے ہیں اس طرح باہم تصادم کا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے اور ساری مستعمہ مقدار سے جوہری توانائی آزاد ہونے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں، جو ظاہر ہے، ایک جوہر سے خارج ہونے والی توانائی سے کئی گنا زیادہ ہوگی۔

جوہری توانائی کے حصول میں دوسرا اہم غور طلب مسئلہ یورینیم کے ہلکے ہمجا $^{235}U_{92}$ کا حصول ہے۔ اس کی فنی تفصیلات تو ایک راز سربستہ ہے۔ یہاں صرف اس کے عام اصولوں سے بحث کی جا سکتی ہے۔ یورینیم دھات خود زمین پر کمیاب ہے اور پھر اس کا ہلکا ہمجا تو اور بھی کمیاب کیونکہ یورینیم میں صرف ۷ء۰ فیصدی ہلکا ہمجا ($^{235}U_{92}$) اور ۳ء۹۹ فیصدی بھاری ہمجا ($^{238}U_{92}$) پایا جاتا ہے۔ اس پر مزید طرفہ یہ کہ ہلکا ہمجا آزادانہ حالت میں بھی نہیں پایا جاتا بلکہ ہمیشہ اپنے بھاری ہمجا کے ساتھ ملتا ہے۔ ہلکے ہمجا کو بھاری سے علیحدہ کرنے کا مسئلہ نہایت ٹیڑھا ہے۔

انتھک مساعی سے سائنسدانوں نے آخر اس پر قابو پا ہی لیا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں سب سے پہلے (A.O. NIER) نے ایک آلہ (MASS SPECTROGRAPH) ماس اسپیکٹروگراف ایجاد کیا جس کی مدد سے وہ 0.00000001 گرام ہلکا ہجا حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ۱۹۴۱ء میں E.O. LAWRENCE نے ایک اور آلہ CALUTRON (کیلوٹران) بنایا جس کی مدد سے فی ساعت 0.000001 گرام ہلکا ہجا علیحدہ کیا جا سکتا تھا۔ اسی آلہ کو حکومت ممالک متحدہ امریکہ نے سرکاری حیثیت دی، حالانکہ اس کے ذریعہ ایک کیلوگرام (= ایک پونڈ) ہلکا ہجا حاصل کرنے کے لئے ایک لاکھ سال درکار ہوتے ہیں!! لارنس کی مشین سے (U^{235}_{92}) حاصل کرنے کیلئے CLINTON ENGINEERING WORKS کے نام سے TANNESSEE VALLEY میں حکومت امریکہ نے ایک وسیع کارخانہ قائم کیا۔ پہلی مرتبہ جوہری بم کی تیاری میں اسی کارخانہ کی مہیا کردہ (U^{235}_{92}) استعمال کی گئی۔

چونکہ (U^{235}_{92}) کی علیحدگی کا عمل انتہائی سست رفتار اور طویل ہے اس لئے کوشش اس بات پر مرتکز کی گئی کہ اسے (U^{238}_{92}) سے علیحدہ کرنے کی بجائے، آمیزہ میں سے کسی طرح (U^{235}_{92}) کے اثر کو زائل کر دیا جائے اور اسے غیر جانب بنا کر اس کے وجود کو عدم کے برابر کر دیا جائے۔ FERMI کو اس میں کامیابی ہوئی اور ۲ دسمبر ۱۹۴۲ء کو پہلی مرتبہ اس طریقہ سے توانائی کی معتدبہ مقدار آزاد کی گئی۔ FERMI اس طریقہ سے ایک اور دلچسپ اور مفید صورت برآمد ہوئی۔ جب FERMI کے طریقے سے حاصل شدہ یورینیم کے آمیزہ کو جس میں (U^{235}_{92}) کے اثر کو زائل کر دیا جاتا ہے تعدیلیوں کا ہدف بنایا جاتا ہے تو (U^{238}_{92}) ایک اور عنصر پلوٹونیم (Pu) میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کا زمین پر کہیں وجود نہیں، یہ صرف بنایا جا سکتا ہے۔ یہ مصنوعی عنصر جوہری توانائی کے حصول میں (U^{235}_{92}) سے بھی زیادہ مفید ہے کیونکہ باسانی منقسم ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۴۳ء میں حکومت امریکہ نے CLINTON, TANNESSEE میں پلوٹونیم سازی کا ایک عظیم کارخانہ قائم کیا۔ اس کارخانے نے ۱۹۴۳ء کے اختتام تک کئی گرام پلوٹونیم بنایا مگر حکومت امریکہ جنگ کے دباؤ کے تحت، اس کارخانہ کی رفتار سے مطمئن نہ تھی اس لئے اس نے ایک اور وسیع کارخانہ امریکہ کی ریاست واشنگٹن میں دریائے کولمبیا کے کنارے جس کا سرد پانی اس صنعت کے لئے مفید ہے HANDFORD PLANT کے نام سے ایک ہزار مربع میل کے رقبہ پر قائم کیا۔ یہ باتیں آج سے کوئی تین چار سال پہلے کی ہیں، نہ جانے یہ صنعت اب کس منزل پر ہے۔ اس کا اندازہ تو اسی وقت ہوگا جبکہ جوہری توانائی کا طریقہ استعمال، برقی توانائی کی طرح، عام ہو جائے کسی ایک حکومت کا اجارہ نہ ہو۔

جوہری توانائی کے اخراج کے بعد اس کے استعمال کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے دو ممکنہ طریقے ہو سکتے ہیں یا تو اسے آنِ واحد میں خارج کر کے میلوں دور دور تک تباہی برپا کی جا سکتی ہے یا پھر مستقل اور آہستہ رفتار سے آزاد کر کے مشینوں کے چلانے میں استعمال کی جا سکتی ہے۔ بدقسمتی سے انسان جوہری توانائی کے راز کو جنگ کے دوران میں پا گیا اس لئے اس نے اسے اول الذکر صورت میں استعمال کرنے کو ترجیح دی۔ اس مقصد کے لئے حکومت امریکہ نے LOS ALMOS, NEW MAXICO میں بم سازی کا کارخانہ قائم کیا۔ اس کارخانہ نے جو پہلا بم بنایا اس کی آزمائش نیومیکسیکو کے صحرا میں ۱۶ جولائی ۱۹۴۵ء کو کی گئی جو ہر لحاظ سے کامیاب رہا۔ اس کی تخریبی قوتیں توقع سے زیادہ نکلیں۔ اس بم کے پھٹنے سے انتہائی بلند تپش پیدا ہوتی ہے جو ایک وسیع رقبہ میں پائی جانے والی اشیاء کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ دھماکہ کے ساتھ ہی انتہائی تباہ کن آندھی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ خارج ہونے والی اشعاع کے مہلک اثرات دور دور تک پھیلتے ہیں اور بعض ایسے تابکار عناصر وجود پذیر ہوتے ہیں جن کے مضر صحت اثرات فضا میں مدتوں باقی رہتے ہیں۔ اسی آزمائش کے بعد ان انسانیت سوز بموں کو جاپانی شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرا کر نہ صرف جاپان کو شکست دی گئی بلکہ چنگیز اور ہلاکو کو بھی نیچا دکھایا گیا حالانکہ انہیں بموں کو شہری آبادی کی بجائے فوجی اہمیت کے مقامات پر گرایا جا سکتا تھا!

جو توانائی جہنم کی کیفیت پیدا کر سکتی ہے۔ اگر انسان چاہے تو جنت کی تخلیق کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔ اسے مشینی حرکت پیدا کرنے، کارخانوں کو چلانے، ذرائع آمد و رفت کی رفتار تیز کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسے راکٹ میں استعمال کر کے سیاروں کی سیاحت کی جا سکتی ہے۔ جوہری توانائی پر انسان کے قابو حاصل کر لینے کی وجہ ترقی کے ان گنت باب وا ہو گئے ہیں۔ مگر دیکھیں انسان اسے کس انداز سے استعمال کرتا ہے، موت کیلئے یا زندگی کیلئے — مستقبل ہی کچھ اس کے متعلق کہہ سکے گا +

مستقل عنوان

بھولوں کیسے؟

ہم نے سالگرہ نمبر سے یہ نیا عنوان شروع کیا ہے ——— آپ بھی اپنی زندگی کے ایسے واقعات لکھ بھیجئے جن کو آپ بھول نہ سکتے ہوں ——— دوسروں کو سنانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے اور باہمی رفاقت بڑھتی ہے ——— (ادارہ)

آنسہ رشید فاطمہ۔ بی اے کراچی

اگر آپ ہنسئے نہیں، تو میں بھی اپنی زندگی کا ایک ناقابل فراموش واقعہ سناؤں۔ بات یہ ہے کہ آج کل کے ترقی یافتہ زمانہ میں "بھوتوں پریتوں" کو وہم سمجھا ہی جانا چاہیئے۔ اور شعوری طور پر میں بھی سمجھتی ہوں۔ مگر خود میری زندگی میں چند ایسے واقعے پیش آئے ہیں۔ کہ بار بار یقین دلانے کے باوجود بھی کہ وہ واہمہ کی کرشمہ سازیاں تھیں، ان کو بھول نہیں سکتی۔ بات کرتے کرتے اکثر خاموش ہو جاتی ہوں۔ اور کچھ نہ سوچتے ہوئے بھی کچھ سوچنے لگتی ہوں۔ کیا؟ یہ ابھی نہیں بتاؤں گی۔

سنئے۔ میرے گاؤں میں ایک عورت تھی۔ بہت بدنام۔ اس کو لوگ بہت کم دیکھتے تھے۔ اور بچے تو اتنا ڈرتے تھے کہ کیا بتاؤں۔ وہ اگر کبھی دکھائی بھی دیتی تھی تو ٹھیک دوپہر یا میں۔ لال بھبوکا سے کپڑے پہنتی تھی۔ مجھے تو یاد نہیں کہ اس کی صورت دیکھنے میں کیسی تھی۔ مگر ابا جان کہتے تھے کہ بڑی حسین تھی وہ۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ لمبے لمبے بال، چندا سی صورت۔ صبح سی، چاندنی سی ——— آپ کو معلوم ہی ہے کہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کے درمیان عموماً سڑکیں تو ہوتی نہیں، پگڈنڈیاں ہوتی ہیں۔ وہ عورت، جس کو سب لوگ "دوپہر کی بھتنی" کہا کرتے تھے۔ ٹھیک بارہ بجے پگڈنڈیوں کے کنارے بیٹھ جاتی تھی۔ اور بس۔ لیکن سننے میں یہ آتا تھا کہ وہ روز دوپہر کو اپنے "جادو" کے زور سے کسی مسافر کو بلاتی تھی۔ اور پھر وہ مسافر اسی گاؤں کا ہو کر رہ جاتا تھا ——— "روز" تو نیر شاعری تھی۔ لیکن ہاں، ہفتہ میں ہمارے گاؤں میں دو تین آدمیوں کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ اموات بھی اسی رفتار سے ہوتی تھیں۔ عموماً نوجوان ہی مرتے تھے۔ خیر

وہ ناقابل فراموش واقعہ گرمیوں کی تعطیل کا ہے۔ جبکہ میرے بھائی جان شہر سے آئے تھے۔ ہم سب بہنیں خوب خوب شیطانیاں کرتی تھیں اور گھر بھر میں ایک اودھم مچ جاتا تھا۔ بھائی جان ہم سب کو بہت چاہتے تھے اور اکثر ہم سب کے سب تالاب میں شکار کھیلتے تھے۔ مچھلیاں تو کیا خاک پھنستی تھیں۔ مگر تفریح اچھی خاصی ہو جاتی تھی۔

ہاں۔ تو گرمیوں کی تعطیل میں بھائی جان آئے ہوئے تھے۔ اور ان کے ساتھ دلچسپ زندگی بڑی تیزی سے گذر رہی تھی کہ وہ دوپہر کے وقت غائب رہنے لگے۔ ایک دو دن تک تو کسی کو خاص خیال نہ پیدا ہوا۔ مگر پھر ان کی خاموشی بڑھتی گئی، وہ پریشان رہنے لگے اور روز آنہ ہی دوپہر کو غائب رہنے لگے ———

ایک دن جب کہ وہ دوپہر کو غائب تھے اور ہم سب لوگ تلملائے ہوئے تھے کہ کسی طرح ابا جان کو معلوم ہو گیا کہ بھائی جان اکثر غائب رہتے ہیں۔ وہ آئے اور ہم لوگوں سے پوچھ گچھ کر چلے گئے اور جا کر دو تین نوکروں کو ساتھ لیا۔ اور گھر سے یہ جا وہ جا۔ ہم سب لوگ پریشان کہ

کہا ماجرا ہے۔ مگر ابا جان کے ساتھ جانے یا ان کی ٹوہ لینے کی ہمت کہاں۔

دو گھنٹے کے بعد وہ واپس آئے۔ پریشان پریشان، اور امی سے کہنے لگے "امی جنّتی کے چکر میں پڑ گیا"

"وہ جنّتی ہم لوگوں کے لئے نئی تو تھی نہیں۔ روزمرہ ہی دہشتناک قصّے سنائی دیتے تھے۔ ہم لوگ بہت پریشان ہوئے۔

امی نے گھبرا کر پوچھا

"پھر وہ ہے کہاں"

"باہر ——— ——— ملّاجی کو بلوایا ہے"

ہم لوگ باہر کی طرف بھاگے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ بھائی جان چپکے سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ اور آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے پھوٹے ہوئے ہیں۔ گھر کے اور سب نوکر جاکر دُور کھڑے کھڑے آپس میں کانا پھوسی کر رہے ہیں۔ کسی کی ان کے قریب جانے کی ہمت نہیں ہوتی ——— ——— میں بے اختیار ان کی طرف بڑھنے لگی تو ایک نے کہا

"بڑی بٹیا — الگ رہیئے — اس جنّتی کا سایہ ہے ان پر"

بھائی جان نے میری طرف دیکھا اور آنکھیں جھکا لیں۔ ان کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ میں ٹھٹھک کر رہ گئی۔ اتنے میں ابا جان بھی آ گئے۔ اور امی بھی۔ ابا جان نے ایک نوکر کو بھیج کر ملّاجی سے جاکر کہہ دیجئے کہ ——— ——— نوکر بھاگا۔

ملّاجی آئے اور بھائی جان سے ——— جیسے وہ ان سے ڈرتے ہوں ——— اور لگے کچھ بُدبُدانے ——— بس نہ پوچھیئے بھائی جان کا کیا عالم ہونے لگا۔ وہ جھومنے لگے۔ ——— اور چپاڑیں کھانے لگے۔ جو جو ان کی حالت ایسی ہوتی جاتی تھی۔ ملّاجی کی باچھیں کِھلتی جاتی تھیں اور وہ لہک لہک کر کچھ پڑھتے جاتے تھے ——— ——— تھوڑی دیر میں بھائی جان پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوتی گئی۔ اور پھر وہ بے دم ہو کر لیٹ گئے۔ ملّاجی بھی ——— سب نے بھائی جان کو اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا اور پنکھا جھلنے لگے ——— ——— شام تک وہ اچھے تھے۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہی دن اور یہی واقعہ ناقابلِ فراموش ہے بلکہ اصل واقعہ تو دوسرے دن ——— ہم لوگ بھائی جان کو گھیرے ہوئے بیٹھے تھے کہ بھائی جان نے میری ایک چھوٹی بہن سے کہا

"چھٹی ——— جا دیکھ تو ابا جان کیا کر رہے ہیں"

چھٹی نے واپس آکر کہا

"سو رہے ہیں"

بھائی جان اٹھ بیٹھے۔ اور باہر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ہم لوگ ڈرے کہ پھر ——— جنّتی نے اپنا ——— کا ——— ہے۔ میں نے پوچھا، کہاں چلے، کہنے لگے۔ کہیں نہیں۔ اور باہر بڑھنے لگے۔ ہم سب ٹوٹ پڑے، چمٹ گئے۔ کہ آپ کو نہیں جانے دیں گے۔ انھوں نے پہلے تو بھاگنے کی کوشش کی۔ پھر کہنے لگے — اچھا میں نہیں جاؤں گا۔ تم لوگ چھوڑ دو تو ———

ہم لوگ علیحدہ ہو گئے۔ وہ چپکے بیٹھ گئے۔ آنکھیں بند کر کے اور پھر دروازہ کی طرف دیکھنے لگے۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور وہی لال بھبوکا سا کپڑے پہنے، وہی دوپہر والی جنّتی داخل ہوئی۔ ہم لوگ چیخیں مار کر بھاگے۔ بھائی جان قہقہہ لگانے لگے ——— ہم لوگ دوڑے دوڑے ابا جان کے پاس گئے اور ان کو جگا کر ساتھ لائے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ بھائی جان پلنگ پر پڑے گہری نیند سو رہے ہیں۔ جس دروازہ سے وہ جنّتی آئی تھی۔ وہ دروازہ بھی بند ہے اور وہاں کوئی موجود ہی نہیں ——— ——— ہم لوگوں نے بھائی جان کو جگایا۔ وہ اٹھے۔

ایسی باتیں کرنے لگے جیسے یہاں کوئی آیا ہی نہ تھا۔
آج تک بھائی جان نے شادی نہیں کی ہے۔ ہم لوگ کراچی میں آ گئے ہیں۔ لیکن دوپہر کے وقت ان کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔ جیسے وہ کسی کو پکارنا چاہتے ہوں۔ بلانا چاہتے ہوں۔ اور کچھ کرنے سے قاصر رہتے ہوں۔ ٭

... فریاد سن کر کوئی زیرِ لب مسکرانے لگا ہے

... نوازی بھی ہے تو ہوش اپنے دل کو بھی آنے لگا ہے

... جورِ اغیار بہتر کہ اس میں کوئی مصلحت تو نہ ہوگی

... ہے کہ تُو ہم سے آنکھیں ملاتے ہی دامن بچانے لگا ہے

... جنوں کے رسیلے چھناکے سلاسل کی جھنکار کم نہیں تھے

کوئی حادثہ زندگی کا سماعت سے پردے اٹھانے لگا ہے

... پنے حنا بار جلووں میں اب بھی مری حسرتوں کو نہ شامل کروگے؟

... کے بھی میرا ایک ایک آنسو تمہیں دیکھ کر جگمگانے لگا ہے

... نی کے بے کیف لمحوں نے اکثر انوکھے انوکھے سہارے دیئے ہیں

... یوں بھی ... اٹھی ہیں کہ جیسے کوئی چھم سے آنے لگا ہے

... آج بھی دوستی کے بھرم میں کچھ اس ڈھب کے انساں تراشے ہیں میں نے

... کی مروت کا ایک ایک صدمہ رگِ جاں میں ٹیسیں اٹھانے لگا ہے

ساغر لدھیانوی

●

چند کلیاں نشاط کی چن کر

مُدتوں محوِ یاس رہتا ہوں

تیرا ملنا خوشی کی بات سہی

... اداس رہتا ہوں

... چاندنی ... سے رقص کرتا ہے

جب ستاروں کی تھکی ہاری ہوئی نیند سے بوجھل پلکیں

تیرہ و تار خلاؤں میں سما جاتی ہیں

جب تھرکتی ہوئی بے تاب شمیم

ناچتے ناچتے تھک جاتی ہے

اور خاموش فضا

چند لمحوں کے لئے کیف میں کھو جاتی ہے

کوئی تاروں کے دریچوں سے اتر کے اُس دم

میری آغوش میں چپکے سے چلا آتا ہے —

آتے ہی مرمریں بانہیں مری گردن میں حمائل کرکے

میری بے چین جوانی پہ ہنسا کرتا ہے

میری بے تاب امنگوں کو پیاسا پا کے

اپنے ہونٹوں سے کئی جرعے پلا دیتا ہے -

اور میں اس طرح محسوس کیا کرتا ہوں

جیسے جنت مرے نزدیک چلی آئی ہے —

اور میں کوثر و تسنیم کی موجوں میں کہیں

اک لچکتی ہوئی کشتی پہ بہا جاتا ہوں -

آخرش ٹوٹنے لگتا ہے درخشندہ فضاؤں کا طلسم زریں

ڈوبنے لگتے ہیں ہنستے ہوئے سیمیں تارے

رات یوں کیف و مسرت میں گذر جاتی ہے

اور وہ —

الوداع کہتے ہوئے —

تازہ ... انگڑائی

صبح ہوتے مرے پہلو سے چلا جاتا ہے -

پھر اسی نور کی دنیا میں سما جاتا ہے

اور میں سوچتا رہ جاتا ہوں

میری تنہائی کا احساس کسے ہوتا ہے؟

سائیکولوجی کراچی

ڈرامہ

اشک و لہو

(جاوید اقبال)

منظر

کسی مغرور جوڑے نے سرائے کے ایک غلیظ کمرے میں پناہ لی ہے۔ چارپائی پر ایک نوجوان کمبل اوڑھے گہری نیند سو رہا ہے اور سامنے کھڑکی میں اس کی ہمنوا لڑکی کھڑی، عجیب انداز میں آسمان کو تک رہی ہے ———— رات کا ایک حصہ گذر چکا ہے۔ گاؤں کے سب چراغ بجھا دئے گئے ہیں کمرے میں ہر طرف اندھیرا ہے۔ صرف چاند اور ستاروں کی مدہم شعاعیں کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہو رہی ہیں باقی چہار اطراف قبرستان ایسی خاموشی مسلط ہے ———— جب پردہ اٹھتا ہے تو کچھ لمحوں کے لئے وقفہ رہتا ہے۔ پھر کھڑکی میں کھڑی لڑکی اچانک مڑتی ہے اور اس کے منہ سے دہشت ناک چیخ نکلتی ہے ————

نوجوان (ایک دم چونکتے ہوئے) کون ——؟! یہ کس کی چیخ تھی؟!

لڑکی (ایک عجیب بے بسی کے عالم میں) میں نہیں جانتی۔

نوجوان تمھارا چہرہ کیوں اُتر گیا ہے؟!

لڑکی مجھے اپنے ماں باپ یاد آ رہے ہیں

نوجوان تمھیں اس کھڑکی سے تو یہ جاننا چاہئے تھا کیا تم آسمان کو دیکھ رہی تھیں؟!

لڑکی ہاں ... ۔

نوجوان میں نے تمھیں کہا تھا آسمان ابر آلود ہے۔ تم کچھ نہ دیکھ سکوگی۔

لڑکی تم نے جھوٹ کہا تھا۔

نوجوان کیا مطلب؟!

لڑکی مطلع صاف ہے اور میں نے کچھ دیکھ لیا ہے۔

نوجوان کیا دیکھا تم نے؟!

لڑکی میں نہیں کہہ سکتی۔

نوجوان مگر تم اس قدر آہستہ کیوں بول رہی ہو؟!

لڑکی کوئی سن رہا ہے۔

نوجوان آخر تم انھیں کب؟!

لڑکی نہ جانے کب میں تمہاری آغوش سے نکلی ــــ لیکن میں نے محسوس کیا۔ جیسے میں آسمان کی اُن لاتعداد آنکھوں کے درمیان جا کھڑی ہوئی ہوں اور دور قوس نما ماہ نو زرد بادلوں کے پیچھے چھپ کر مجھے اشاروں سے بُلا رہا ہے۔ ہوائیں مدہوش سو رہی ہیں۔ مگر میں انھیں خوابوں میں کبھی کبھار بڑبڑاتے سُن رہی ہوں ــــ ستارے میرے اس قدر قریب تھے کہ میرا دل چاہا کہ ان دمکتے جواہرات کے خوشوں کو توڑ کر اپنی جھولی میں ڈال لوں۔

نوجوان ہاں، پھر ـــــــــــ

لڑکی پھر ــــ جب میں نے انھیں توڑنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ تو کوئی گرم سی شے میری انگلیوں سے چھو گئی۔ یہ ــــ یہ ایک قطرہ تھا۔ ایک آنسو ــــ جو کسی ستارہ کی آنکھ سے گرا تھا۔ میں نے ٹھنڈی آہ بھری اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا ــــ پھر معاً ہی میری نگاہیں اُس چاند پر پڑیں ــــ اُس چاند پر جو کسی دیو کے میلے سے خمیدہ دانت کے مانند کسی یخ بستہ نعش کی مُڑی ہوئی انگلی کی طرح مجھے گھور رہا تھا ـــــــــــ وہ ایک دم نیچے اُترا اور میں خوف سے سمٹ گئی۔ وہ مرمریں خنجر کی طرح میری طرف بڑھا اور لحظہ بہ لحظہ میرے نزدیک ہوتا گیا حتیٰ کہ میرے سینے میں پیوست ہو گیا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں درد و کرب سے چیخوں۔ وہ پلٹا ــــ اور اپنے پیچھے خون کی ایک طویل لکیر چھوڑتا ہوا اپنی اصلی جگہ پر جا معلق ہوا۔

نوجوان میرا خیال ہے تم چاند کو لگاتار تکتی رہی ہو۔

لڑکی تم خود دیکھ کر اپنی تسلی کر لو ــــ اُس صنوبر کے ٹنڈ منڈ درخت سے ذرا اوپر وہ لٹک رہا ہے۔ کیا تمہیں اس پر میرے خون کے دھبے نظر نہیں آتے؟

نوجوان شاید اسے گہن لگا ہو۔

لڑکی تم پھر جھوٹ کہہ رہے ہو۔

نوجوان میرے قریب آؤ۔ مجھے اپنا ہاتھ دو۔

لڑکی کاش میں تمہارے ساتھ نہ آتی۔ کاش میں ــــ اپنے ماں باپ کو نہ چھوڑتی۔ آخر تم میرے کون ہوتے ہو؟

نوجوان تم نے ضرور کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ خدارا لیٹ جاؤ۔ تھوڑا سا آرام کر لو۔ تم بہت تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ میں تمہارے سرہانے بیٹھوں گا اور تمہیں ایک ایسی لڑکی کی داستان سناؤں گا۔ جو کسی شاہزادہ کے ساتھ بھاگ نکلی تھی، اور پھر کبھی واپس نہ آئی تھی ـــــــــــ (پردہ)



(عبدالشکیب۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)

موتی محل سینما کی آتش زدگی کے ڈیڑھ دو ماہ بعد پروفیسر گل حامد مشہور مسمرسٹ و ماہر روحانیات کی بلدہ میں آمد کا جب ایک اشتہار اخبار میں شائع ہوا، تو سب سے پہلے نسیمہ کی ماں نے ان کے ذریعہ نسیمہ کی تلاش کا خیال کیا۔ کیونکہ اس زمانہ میں ایسی افواہیں اُڑ رہی تھیں کہ دو ایک عورتیں جن کے جل مرجانے کا یقین کر لیا گیا تھا گھر صحیح وسلامت واپس ہوئی ہیں۔ لیکن میں اس خیال کا حامی نہیں تھا۔ نسیمہ کی زیست کے متعلق محض سوءظنی تھی۔ اس کی ہڈیاں جل کر خاک ہوگئی تھیں۔ اس کے جل مرنے کا سرکاری طور پر اعلان ہوچکا تھا اور اس کا اس دُنیا میں پتہ چلنا محال تھا۔ لیکن بوڑھی ماں کو سمجھائے کون؟ بیٹی کے غم میں اسے ہذیان ہو گیا تھا۔ مرحومہ کے شوہر میاں صفدر، نیم پاگل قسم کے انسان تھے اور نسیمہ کی موت نے انھیں پورا پاگل بنا دیا تھا۔ خوش دامن اور داماد کے ہم خیال ہونے کے بعد کیا مجال تھی۔ کہ کوئی مخالفت کرتا۔ پروفیسر صاحب کو بلانے کے لئے میاں صفدر کے زور دینے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہر جگہ ان ہی کو نسیمہ کی موت کا ذمہ دار قرار دیا جاتا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے ساتھ سینما جائے اور لاکھوں فساد پڑے۔ اس کے ساتھ واپس نہ آئے۔ لیکن اس میں میاں صفدر کا قصور ہی کیا تھا۔ ان کو تو اپنی جان کے لالے پڑے تھے۔ جوں ہی آگ کے شعلے بلند ہوتے۔ میاں صفدر بدحواس ہو کر اپنی موٹر کی طرف لپکے اور وہاں اپنی بیوی کا انتظار کرنے لگے۔ اُس وقت سینما قیامتِ صغریٰ کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ ایک ہلڑ مچی ہوئی تھی۔ کچھ لوگ ایثار سے کام لے کر عورتوں کو آگ سے بچانے میں مصروف تھے۔ لیکن بیشتر تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو تماش بینوں کی طرح کھڑے عورتوں کی بے کسی، ان کی بے پردہ حُسن اور ان کی زیبایش کا تمسخر اُڑا رہے تھے۔ میاں صفدر کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ انھیں ایسی سخت آزمائش سے سابقہ پڑا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی بے بسی پر نادم تھے اور نادم نہ ہوتے تو کیا کرتے۔ انا کی گود سے وہ موٹر کی گدّی پر پہنچے تھے۔ انھیں ایسے جوکھم سے کیا سروکار۔ اتنے ناز و نعم سے پلے تھے کہ پچیس چھبیس سال کی عمر ہی میں اپنی جگہ حمزہ کی طرح ٹھٹھر کر رہ گئے تھے۔ لیکن یہ چیزیں ان کی ملازمت میں مزاحم نہ ہوئیں۔ ان کا تعلق ایک بڑے خاندان سے تھا اور اسی لئے وہ ایک اعلیٰ خدمت پر مامور تھے اور اسی وجہ سے نسیمہ کو اپنی زوجیت میں لئے ہوئے تھے۔ ورنہ نسیمہ کو ان سے کیا نسبت تھی۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی نہیں تو کیا تھی کہ نسیمہ جیسی حسین و پری وش لڑکی میاں صفدر جیسے بدصورت اور کڑیل نوجوان کے پالے پڑی۔ اس معاملہ میں خود نسیمہ کے لوگ مجبور تھے۔ نسیمہ دنیا میں بے وسیلہ تھی اس کے والد کا جو کلکٹر تھے انتقال ہوچکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نسیمہ بیس یا بائیس سال کی عمر تک بیٹھی رہی اور اس کو کسی نے نہیں پوچھا اور پوچھتا کون — جب کہ اس کے کوئی سرپرست کسی ذی اثر خدمت پر مامور ہی نہیں تھے۔ میاں صفدر کا یہ حال تھا کہ ان کے سامنے کوئی مستقبل ہی نہ تھا۔ ان کی موجودہ خدمت ان کیلئے معراج تھی جس کا سنبھالنا ہی ان کے لئے مشکل تھا۔ انھوں نے نسیمہ سے شادی کیا کی اس کے پورے خاندان پر احسان کیا ورنہ آج کل لڑکیوں کے لئے گزیٹڈ عہدے داروں کا ملنا آسمان سے تارے توڑ کر لانے کے برابر ہے۔ لیکن نسیمہ کے دل کا حال خدا ہی بہتر جانتا تھا۔ بعض وقت جب کبھی میں نسیمہ کی ماں سے ملنے جاتا اور وہاں اتفاق سے نسیمہ سے ملاقات ہو جاتی تو اس کے چہرے کی پژمردگی سے میں اس کے دلی جذبات بھانپ لیا کرتا تھا۔ جتنا میں اس کی اُفتادِ طبیعت سے واقف تھا۔ شاید ہی کوئی ہو۔ اس کی تعلیم و تربیت میں آٹھ دس سال بحیثیت اتالیق میں نے حصہ لیا تھا۔ یہ پودا میرے ہی ہاتھوں پروان چڑھا تھا۔ بعض وقت مجھے خیال ہوتا تھا کہ اپنی ازدواجی زندگی کی تلخیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے نسیمہ نے کہیں اس طرح جل مرجانے کو ترجیح نہ دی ہو۔

پروفیسر گل عام ایک وجیہ قسم کے چالیس پینتالیس برس کے آدمی ہیں۔ گندمی رنگ۔ بڑی بڑی چمکیلی آنکھیں۔ چڑھی ہوئی گھنی مونچھیں ان کے چہرے کے خاص علامات تھے۔ ان کی آنکھوں کی پتلیاں بہت سیاہ تھیں اور ان سے آنکھیں ملاتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ دل کی گہرائیوں کو ٹٹول رہے ہیں۔ ان میں ایک خاص مقناطیسیت تھی۔ ان کی باتوں میں جادو تھا وہ غیر محسوس طور پر انسان کو اپنی طرف کھینچتے تھے۔ دنیا اور اہلِ دنیا کا انھیں بڑا وسیع تجربہ تھا اور دنیا کے پیچ پیچ کی منزلیں دیکھ چکے تھے۔ نسیمہ کی تلاش کے متعلق ایک ہزار روپیوں پر ان سے معاملہ طے ہوا اور رقم انھیں نقد ادا کی گئی۔

جس وقت پروفیسر صاحب اپنے عمل کے لئے تشریف لائے تو ان کے سامنے یہ سوال تھا۔ معمول کا درپیش تھا ہر شخص معمول بننے سے رہا۔ اس کے لئے خاص قسم کے لوگوں کی ضرورت ہے۔ نازک مزاج۔ ذکی الحس خوب صورت۔ کم سن۔ کم زور اور عجیب بے بس لوگ اچھے معمول بن سکتے ہیں۔ ہم پانچ سات، جتنے بھی لوگ وہاں جمع تھے۔ ان میں سے کسی میں معمول بننے کی صلاحیت نظر نہیں آتی تھی اور پروفیسر صاحب نے بھی ہم لوگوں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر یہی رائے قائم کی۔ بالآخر جب ان کی نظر گھر کے ملازم لڑکے پر پڑی تو اس پر عمل کرنے کی پروفیسر صاحب نے آمادگی ظاہر کی۔

ہم لوگ جس کمرے میں تھے وہ ہر قسم کے شور و شغب سے دور تھا پروفیسر صاحب نے سب سے پہلے معمول کو فرش پر شمال اور جنوب کے رخ پر لٹا دیا اور کہا کہ وہ اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دینے کا خیال کرے اور ان کی آنکھوں کو غور سے دیکھتا رہے۔ معمول ہکا بکا ان کی صورت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بوکھلا سا گیا تھا لیکن ہم لوگوں کے دلاسے پر سنبھل گیا۔ جس وقت پروفیسر صاحب نے اپنا عمل شروع کیا ہر شخص اپنی جگہ خاموش بیٹھا تھا پہلے پروفیسر صاحب نے اپنے معمول کو گھورنا شروع کیا۔ اس کے بعد اپنے دونوں ہاتھ وہ اس کے سر سے پاؤں تک اس طرح پھیرنے لگے کہ ان کے ہاتھ معمول کے جسم کو مس ہونے نہ پاتے تھے۔ تھوڑی دیر میں معمول پر غنودگی سی چھانے لگی۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور اس پر نیند کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نوبت پر پروفیسر صاحب نے اپنا عمل چھوڑ دیا اور معمول سے مختلف سوالات کرنے لگے

"کیا تم سو رہے ہو؟"

"نہیں!"

"کیا تم کو یہ طریقہ پسند ہے اور کیا تم سے جو پوچھا جائے بتلا سکتے ہو؟"

"ہاں! ہاں۔ کوشش کروں گا!"

اس قسم کے سوالات کے بعد جب پروفیسر صاحب کو اطمینان ہو گیا کہ اب معمول بالکل ان کے بس میں ہے۔ تو انھوں نے اصل موضوع کی طرف رخ کیا۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جس لڑکے پر عمل کیا گیا تھا وہ نرا جاہل تھا۔ جیسے عام طور پر معمولی درجے کے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ وہ بے علم تھا اور بمشکل اردو میں گفتگو کر سکتا تھا۔ اس نے شاید ہی اپنی عمر میں دو یا چار مرتبہ سینما دیکھا ہو۔ اس کو نہ سینما گھر کے نام معلوم تھے اور نہ ان کے مقام۔ اس کی زندگی کا مقصد کسی طرح کام کر کے اپنا پیٹ پالنا تھا اس کے سوا وہ دنیا سے قطعاً ناواقف تھا لیکن معمول بننے کے بعد جب وہ سینما کی آتش زدگی کے واقعات بیان کر رہا تھا تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کوئی واقف کار تعلیم یافتہ مہذب اور سنجیدہ شخص ہے جس نے واقعاتِ سینما کو اپنی آنکھوں کے سامنے جلتا دیکھا ہے۔ ہم سب مبہوت ہو کر اس کی باتوں کو ایسا سن رہے تھے۔ جیسے کوئی آسمانی فرشتہ ہمارے سامنے زمین و آسمان کے حقائق کو ایک ایک کر کے پیش کر رہا ہے۔ جس وقت پروفیسر صاحب نے اسے سینما کے زنانہ حصے میں نسیمہ کو ڈھونڈھنے کے لئے کہا تھا۔ تو اس نے فوراً جواب دیا کہ بی بی ایک کونے میں کھڑی ہیں۔ آگ کے بڑھتے ہوئے شعلوں کو دیکھ کر وہ انتہائی سراسیمہ ہیں اور دھوئیں سے ان کا دم گھٹ رہا ہے۔ ان کے سامنے دو ایک عورتیں بے ہوش پڑی ہیں۔ یہ مدد کے لئے چلا رہی ہیں۔ لیکن ان کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی ہے۔ وہ غش کھا کر گرنے ہی کو تھیں کہ ایک آدمی نے دوڑ کر ان کو اٹھا لیا اور آگ کے شعلوں میں سے کودتا پھاندتا باہر نکل آیا۔ بی بی بے ہوش ہیں جب اس آدمی کا نام دریافت کیا گیا۔ تو معمول نے گلاب خاں، بتایا۔ معمول کے اس انکشاف سے ہم لوگوں کی جان میں جان آگئی ہم لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ سب سے زیادہ ندامت

تو میں محسوس کر رہا تھا، کیونکہ میں نے سب سے زیادہ اس عمل کی مخالفت کی تھی۔ میاں صفدر بار بار میری طرف دیکھ کر ایک فاتحانہ انداز میں تبسم فرما رہے تھے۔ [illegible] چھولے نہیں سما رہی تھی۔ نسیمہ کی موت کے بعد آج پہلا دن تھا کہ آج ان کے چہرے پر بشاشت تھی۔

نسیمہ کے متعلق مزید دریافت کرنے پر معمول نے کہا کہ سینما سے گلاب خاں ایک تانگہ میں بی بی کو اپنے مکان لے گیا جو بیگم بازار میں ہے۔ یہاں بی بی کو وہ ہوش میں لایا۔ بی بی اپنے نئے ماحول سے بہت پریشان ہیں۔ گلاب خاں ان کے گھر کے حالات دریافت کر رہا ہے۔ ان کے شوہر کا نام سن کر اور یہ معلوم کر کے کہ وہ بھی ساتھ تھے وہ ان کا مضحکہ اڑا رہا ہے۔ بی بی اس کو اپنے گھر لے چلنے کے لئے کہتی ہیں تو وہ جواب دیتا ہے کہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر اس نے انہیں موت کے چنگل سے بچایا ہے اور اب بی بی پر کسی دوسرے شخص کو کوئی حق نہیں۔ اس نے بی بی کے جسم سے سارے زیورات اتار لئے ہیں اور ان سے محبت کی باتیں کر رہا ہے۔ بی بی رو رہی ہیں۔ [illegible] پہلا ہے۔ جب پروفیسر صاحب نے اس کے مکان کا نمبر دریافت کیا تو معمول نے کہا کہ مکان بہت بوسیدہ ہے اور گلیوں میں واقع ہے اور [illegible] نمبر مٹ گیا ہے۔ یہاں پر دو روز تک اس نے بی بی پر سخت نگرانی رکھی اور تیسرے روز اپنے ساتھ بمبئی لے کر چلا گیا۔ بمبئی کا پتہ دریافت کرنے پر معمول نے کہا کہ بی بی اور گلاب خاں دونوں اسٹیشن کے قریب [illegible] کے کمرہ نمبر [illegible] میں مقیم ہیں۔ بی بی اس وقت کیا کر رہی ہیں تو اس کا جواب معمول نے یہ دیا کہ وہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی ایک کتاب دیکھ رہی ہیں۔ ان کا چہرہ بہت اترا ہوا ہے۔ وہ بے حد مغموم ہیں۔ رات دن انھیں گھر کی یاد لگی ہے لیکن ان پر اتنی سخت نگرانی ہے کہ وہ کمرے کے باہر قدم نہیں نکال سکتیں۔ وہ اپنی زندگی سے بیزار ہیں اور خودکشی کر لینا چاہتی ہیں، کیونکہ وہ سمجھتی ہیں کہ اب وہ دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں، لیکن وہ خودکشی بھی نہیں کر سکتیں۔ اپنی ماں کی یاد میں وہ کرتی ہیں اور [illegible] بے چین ہو جاتی ہیں۔ ایک مرتبہ بی بی نے بھاگنے کی کوشش کی تھی تو گلاب خاں نے انھیں اتنا مارا تھا کہ وہ دس روز تک بستر سے نہ اٹھ سکیں۔

جس وقت معمول نسیمہ کی ان تکالیف اور پریشانیوں کو بیان کر رہا تھا تو نسیمہ کی اماں کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو جاری تھے اور وہ دھاڑیں مار کر رو رہی تھیں، چیخیں اور چلاتیں۔ لیکن پروفیسر صاحب نے پہلے ہی سے تاکید فرما دی تھی کہ اگر عمل کے دوران میں کسی قسم کا شور وغل ہوا تو اس سے نہ صرف معمول کی بیداری کا خطرہ ہے، بلکہ اس سے عمل بھی زائل ہو جائے گا۔ نسیمہ کے ماں کے علاوہ ہم جتنے بھی مرد وہاں جمع تھے، تصویر بنے اس طرح ایک دوسرے کی صورتوں کو تکتے بیٹھے تھے۔ معمول کی ان حیرت انگیز باتوں پر دل ہی دل میں مجھے تعجب ہو رہا تھا اور میں یہ سمجھنے پر مائل ہو رہا تھا کہ کہیں پروفیسر صاحب اپنے خیالات کو معمول کے ذریعے ظاہر تو نہیں کر رہے ہیں، کیونکہ یہ بات تو یقینی تھی کہ معمول جیسا ان پڑھ اور نیم وحشی لڑکے سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اتنے مربوط سنجیدہ اور سلجھے ہوئے خیالات اپنے طور پر پیش کرے۔ اس کے تلفظ میں کوئی غلطی نہیں تھی۔ وہ انگریزی نام یا الفاظ اپنی زبان سے ایسا ادا کرتا تھا جیسے کہ وہ ایک انگریزی داں ہے۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب نے گلاب خاں کے متعلق دریافت کیا تو معمول نے کہا کہ وہ اس وقت پنجاب کے بدمعاشوں کا ایک [illegible] ہے جو لڑکیوں کو بھگا کر بمبئی میں فروخت کرنے کا معاملہ کر رہا ہے اور آج شام یہ بدمعاش بی بی کو اپنے ساتھ امرتسر لے جانے والا ہے۔

جس وقت معمول کی زبان سے آخری جملہ ادا ہوا نسیمہ کی ماں کے منہ سے بیساختہ ایک چیخ نکل گئی اور وہ بیہوش ہو گئیں۔ انھیں فوراً دوسرے کمرے میں منتقل کیا گیا۔ پروفیسر صاحب برہم ہو گئے۔ بڑی مشکل سے انھوں نے معمول کو اصلی حالت میں لایا اور غصہ میں بغیر کچھ کہے وہ چلے گئے۔

نسیمہ کے حالات سن کر ہر شخص متاثر تھا۔ اس کے زندہ ہونے کا یقین آ گیا تھا، لیکن اب [illegible] بمبئی پہنچ کر بدمعاشوں کے پنجے سے چھڑانا ناممکن نظر آتا تھا۔

پروفیسر صاحب کے رخصت ہونے کی دیر تھی کہ میاں صفدر نے بمبئی، دہلی، امرتسر، لاہور نسیمہ کی تلاش کے لئے تار روانہ کر دئے اور شام کی ٹرین سے خود بمبئی روانہ ہو گئے۔ انھیں ہوٹل تو ملا لیکن بیوی نہ ملی۔ جب پولیس سے سارے واقعات بیان کر کے انھوں نے امداد طلب کی تو ان کی خام خیالی پر وہاں خوب مضحکہ اڑایا گیا۔ وہ ناکام واپس آئے اور اپنی کوفت مٹانے کے لئے سیدھے پروفیسر صاحب کے ہوٹل پہنچے جو اس وقت شامپین سے شغل کرنے بیٹھے تھے۔ جب ان سے میاں صفدر نے ترش روئی سے بمبئی میں اپنی ناکامی کا ذکر کیا تو پروفیسر صاحب نے زور سے ایک قہقہہ بلند کیا —— "افسوس! غالباً آپ بمبئی ایسے وقت پہنچے جب وہ لوگ وہاں سے نکل چکے تھے۔ صرف ایک صورت ہے اور وہ یہی عمل ہے۔ میں حاضر ہوں میری فیس آپ کو معلوم ہی ہے" پروفیسر صاحب نے مسکراتے ہوئے ایک ہمدردانہ لہجہ میں کہا —— میاں صفدر ان کا منہ تکنے لگے۔

ایک طویل مسلسل افسانہ

فرار

(حسن محمود عروج)

(گذشتہ سے پیوستہ)

"ایک جھولا ڈالا میں نے بیّاں کی گود میں۔ ——— بیّاں کی گود میں !"

نشیلی مخمور ساعتیں، ہلکی ہلکی بوندیں، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ غنچے کی ساری کلیاں مسکرا کر پھول بنی جا رہی ہیں اور فضائیں گنگنا رہی ہیں۔

"ایک جھولا ڈالا میں نے بیّاں کی گود میں" ———

پاس زولاجیکل گارڈن میں کوئی مور بول رہا تھا ——— جیسے اس سہانے موسم پر مست ہو گیا ہے۔ کرما اٹھ بیٹھی "چلو چڑیا خانے چلیں"

"میں تو تمہاری جگہ یہاں سمجھتا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ تم وہاں کی چیز ہو"

"میری جگہ تو یہاں ہے" کرما نے اس کے دل کے قریب اپنی انگلی رکھ دی۔ لیکن تمہارے خیال سے کہہ رہی تھی۔ پھر اس کی ناک پکڑ کر ہلائی اور زور میں غنچوں کی طرح مسکرانے لگی۔

"اور میری جگہ صرف یہاں ہے" اس نے کرما کے سینے پر اپنی انگلی چھوتے ہوئے کہا۔

"اوئی ———" کرما چیخ سی پڑی۔ پھر اُسے کھینچتے ہوئے چڑیا خانے پہنچ گئی۔ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھومتے رہے۔ ابر سے ننھے ننھے موتی برستے رہے، مور رقص کرتے رہے اور ان کی دُم میں لگی ہوئی اندر کی ہزار آنکھیں اس کی مسرتوں پر مسکراتی رہیں ——— !

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر اس طرح لپیٹ لئے۔ جیسے اپنی کرما کو بھینچے ہوئے ہے ——— پھر چل پڑا۔ جیسے کرما اسے کھینچے لئے جا رہی ہے۔ اندر چڑیا خانے میں اپنی کرما کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھومتا رہا۔ بجو، دستار ——— تخیل نے ماضی کی حدود میں پہونچا دیا۔ یہاں فضائیں گنگنا رہی تھیں اور بیتی ہوئی گھڑیاں یاد کر رہی تھیں۔ ذہن کرما کے ساتھ سہانی فضاؤں میں پرواز کر رہا تھا اور جب ٹہلتا ہوا دھاری دار زیبرے کے کٹہرے کے قریب پہنچا۔ تو ٹھٹھک کر رہ گیا۔ آنکھوں نے کچھ دیکھا ——— ماضی کے خواب حال سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئے۔

اس سے تھوڑی دور پر کرما کٹہرے سے لگی اپنی سہیلی کے ساتھ کھڑی تھی اور اپنے ہاتھوں میں ہری ہری گھاس لئے ——— چمکار رہی تھی۔ وہ کچھ دیر سکتے کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا۔ اور پھر زود کے تمام مخالف شوروں کے باوجود کرما کے قریب پہنچ گیا۔ کرما حیران سی اُسے دیکھنے لگی۔ کرما کے چہرے پر پژمردگی سی دوڑ گئی اور اس نے اپنی نگاہیں نیچی کرلیں جیسے اُسے دیکھنا نہ چاہتی تھی۔ وہ کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن زبان جیسے بھول چکا تھا اور الفاظ بہہ رہے تھے۔ عجیب طرح کے جذبات میں حسرت بھری نگاہوں سے کرما کی طرف دیکھتا رہا۔ کرما نے اس پر ایک نظر ڈالنا بھی شاید گوارہ نہ کیا اور سہیلی کا ہاتھ پکڑے ہوئے دوسری طرف چلی گئی اور اسے اس وقت وہ واقعہ یاد آ گیا جب کرما ڈلہوزی اسٹریٹ پر کھڑی اس سے باتیں کر رہی تھی اور نیلی آنکھوں والے کلرک کو دیکھ کر اُسے آگے کھینچ لے گئی ———

اُسے کرما کے وہ الفاظ یاد آگئے جو اس نے کلرک کو دیکھ کر کہے تھے۔

"مراری! میں اس سے نفرت کرنے لگی ہوں" ـــــــ ـــــــ ـــــــ

اسے ایسا معلوم ہوا کہ کرما اس کے قدموں میں بھی دبی جملہ دُہرا رہی ہے "مراری، میں اس سے نفرت کرنے لگی ہوں" کوئی اس کے کانوں میں یہ جملہ بار بار دُہرانے جا رہا تھا اور اُسے سب کچھ ناچتا ہوا نظر آنے لگا۔ اس کا دماغ مختل ہونے لگا اور خون کھولنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر کرما کو پکڑ لے اور اس کا گلا گھونٹ دے۔ اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ کرما اس سے نفرت کرنے لگے گی۔ سر چکرانے لگا اور وہ لڑکھڑا نہ سکا اور اس نے اپنے سیدھے ہاتھ سے کھمبا تھام لیا ـــــــ

اس نے سوچا یہ اس کی کرما نہیں ہے۔ اس کی کرما ایسی نہیں ہو سکتی۔ یہ شموجی سیٹھ کی منسوبہ ہے۔

کرما اس سے نفرت نہیں کر رہی ہے۔ بلکہ سرمایہ افلاس کو گالیاں دے رہا ہے۔ پھر اس کا ذہن افلاس و دولت کی گتھیوں میں اُلجھ گیا۔ سرمایہ نے اس کی کرما کو اس سے چھین لیا۔ افلاس ملیا آگیا کو جہاز کی سیٹ سے محروم کئے ہوئے تھا۔ دولت نے کو آرام طوطا رام کو پورا جہاز بخش دیا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ انسانیت سرمایہ کے نیچے دبی ہوئی کراہ رہی ہے۔ آدمیت سر برہنہ لُٹ رہی ہے ـــــــ زرد سونے نے آدمی کے سرخ لہو کو ارزاں کر دیا ہے۔

چوٹ کھایا ہوا تخیل بے لگام بھاگ رہا تھا اور اُسے سب کچھ گھومتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے مجروح دماغ نے کچھ خونیں تصویریں کھینچ کر اس کے سامنے رکھ دیں۔

تیرہ روپے کے لئے ہندوستانی جوان اپنی نوجوان بیوی کی چوڑیاں توڑ رہا تھا۔ اپنے بچوں کو یتیم بنا رہا تھا۔ پانچ روپے کے لئے کتنی مائیں اپنے بچوں کو گھر میں سسکتا چھوڑ کر چینی رستورانوں میں ننگی ہوئی جا رہی تھیں۔ ظالم سونا کتنی ماؤں کا تقدس اور کتنی بہنوں کی جوانی لوٹے لے رہا تھا۔ محبت بازار میں بک رہی تھی ـــــــ

چمپئی رنگ کی بر بی مسلم دوشیزہ اس کی کرما نیلام پر چڑھ رہی تھی اور شموجی سیٹھ نے اُسے خرید لیا ـــــ اس کے جسم میں سونے کا زہر پھیل گیا اور اب وہ اس سے نفرت کرنے لگی تھی۔ "مراری! میں اس سے نفرت کرتی ہوں" سونے سے ڈسی ہوئی کرما کہہ رہی تھی اس نے سوچا۔ اس کی کرما نے کہا تھا

"مجھ پر بھروسہ رکھو ـــــــ عورت صرف ایک مرتبہ محبت کرتی ہے۔

عورت کا صرف ایک شوہر ہوتا ہے۔ میری شادی ہو چکی ہے اور تم میرے سب کچھ ہو"

وہ سوچتا رہا، عورت صرف ایک مرتبہ محبت کرتی ہے۔ لیکن جب اُسے سونا ڈس لیتا ہے تو وہ اپنی محبت سے بھی نفرت کرنے لگتی ہے۔ عورت شاید اس وقت تک محبت کرتی ہے۔ جب تک سونا اُسے نہ ڈسے۔ اس کی کرما کو سونے نے ڈس لیا اور وہ اس سے نفرت کرنے لگی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ زرد رنگ کا ایک اژدہا منہ پھاڑے کھڑا ہے اور سب کچھ نگلے جا رہا ہے اس کی سانسوں سے ہر شے میں زہر پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کے دل میں ایک آرزو مچلنے لگی ـــــ کاش اس سونے کے سانپ کا سر کچلا جا سکتا! ـــــــ

اس کے جسم میں شرارے پھیلتے گئے۔ نہ جانے کب تک کھمبے سے لگا کھڑا احساس کے شعلوں میں جلتا رہا اور پھر انہیں شعلوں میں جلتا ہوا واپس ہوا اور ایک چینی رستوران میں سما گیا۔

(باقی آئندہ)

منشی عبدالغفار نے عثمانی پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر سائیکولوجی اردو - ۲۱ میریٹ روڈ سے شائع کیا


اپنے دانتوں کی
صفائی اور حفاظت
کیلئے
مسواک ٹوتھ برش
ہمیشہ استعمال کیجیے
Gue antend
NO ANIMAL
BRISTLES
مسواک
ہر بڑی دوکان پر ملتا ہے

PSYCHOLOGY

HEALTH · HAPPINESS · SUCCESS



عزم و استقلال

ان کے مشہور سائنسی ماہنامہ کا اردو ایڈیشن





بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انگلستان کے مشہور ماہنامہ "سائیکولوجی" کے جملہ حقوق ترجمہ و اشاعت برائے پاکستان و بھارت محفوظ ہیں

سائیکولوجی اردو

جلد-۲ اپریل سنہ ۱۹۵۰ء نمبر ۳

ادارۂ تحریر
آنسہ شاہدہ سلطانہ ایم۔اے
بیگم رئیس جہاں نیّر انصاری
عابدی جعفری بی۔اے

مدیر عمومی
انعام اللہ خاں بی۔ٹی۔بی۔ایل

معتمد عمومی
علاء الدین خالد

سالانہ چندہ
پاکستانی سکہ چھ روپے
بھارتی سکہ ساڑھے ستارو پے

قیمت فی پرچہ
پاکستانی سکہ آٹھ آنے
بھارتی سکہ دس آنے

دفتر
سائیکولوجی اردو پوسٹ بکس ۵۶۶ کراچی ۲

مندرجات

پہلی نظر
نئے انسان نئی دنیا
خود فریبی وخود نمائی
میرا یقین کیجئے کہ آپ کامیاب ہو سکتے ہیں
آنکھ والا ترے جوبن کا تماشہ دیکھے
ہمیں یاد ہے سب ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
دیکھئے کلیاں بھی کچھ سکھا رہی ہیں آپ کو
بات چیت
بھولوں کیسے
سلام و پیام
کہو تو ہے جس کی پردہ داری ہے
فرار

خط وکتابت

کرتے وقت صرف پوسٹ بکس ۵۶۶ لکھیں

پہلی نظر

کچھ لوگ طبیعتاً ایسے ہوتے ہیں کہ خود بھی ہر وقت ہنستے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنی باتوں سے، اپنے قہقہوں سے، اپنے لطیفوں سے ہنسایا کرتے ہیں۔ کمرہ میں داخل ہوتے ہی زندگی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ لوگ اپنی تلخیاں بھول جاتے ہیں۔

اس کے برخلاف ——— ہم میں، آپ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو ہر وقت منہ لٹکائے، چپ چاپ، اداس اداس، تنہا تنہا نظر آتے ہیں کسی سے بات ہی نہیں کرتے، کسی سے ملتے جلتے ہی نہیں۔ اگر زبردستی کسی محفل میں آ جاتے ہیں۔ تو ہنستے لوگ، چہچہاتے لوگ خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور ایک اکتاہٹ سی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ خود بھی خوش نہیں رہتے اور اپنے وجود سے دوسروں کی خوشیاں بھی برباد کرتے رہتے ہیں۔

کبھی آپ نے سوچا ہے کہ انسانی برادری میں اتنا تضاد کیوں ہے۔ ایک انسان اتنا بہاراں بہاراں کیوں نظر آتا ہے۔ اور دوسرا انسان اتنا خزاں خزاں کیوں بن جاتا ہے ——— ایک کی زندگی دوسروں کے غموں کے لئے مرہم کا کام کرتی ہے اور دوسرے کی زندگی دوسروں کی خوشیوں کیلئے سم قاتل

آپ کسی ایسے شخص سے ملیں جو ہر وقت اداس اداس رہتا ہو اور اس سے پوچھیں کہ اس اداسی، اس تنہائی کی وجہ کیا ہے۔ تو عموماً آپ دیکھیں گے کہ ان کو اپنی کیفیت کی وجہ خود بھی معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن باتوں باتوں میں آپ یہ ضرور معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ یا تو احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں — یا احساسِ برتری کا۔ "احساس کمتری" کے شکار خود اپنی ذات میں ہزاروں خرابیاں ڈھونڈ لیتے ہیں یا سوچتے ہیں کہ مجھ میں کوئی اچھائی نہیں۔ دوسرے لوگ اس لئے قہقہے لگاتے ہیں کہ وہ قہقہے لگا سکتے ہیں۔ ان کی آواز نغمہ ریز ہے۔ ان کی ہنسی دلکش ہے۔ اور جب میں ہنستا ہوں تو ایسی بھونڈی، ایسی بھدی آواز نکلتی ہے۔ کہ سننے والا کان بند کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور نفرت سے مجھے دیکھنے لگتا ہے، دوسروں کے پاس دولت ہے۔ دوسروں کے پاس تعلیم ہے، دوسروں کی سماج میں عزت ہے اور میرے پاس ——— میرے پاس کچھ نہیں، پھر میرا اور ان کا کیا ساتھ۔ میں تنہا ہی رہوں تو اچھا ہے ——— اور وہ طرح طرح سے اپنے سے انتقام لینے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اپنے کو خوشی کا حقدار نہیں سمجھتے۔

"احساس برتری" کا شکار دوسروں کو ذلیل سمجھتا ہے۔ وہ ساری اچھائیاں اپنی ذات سے وابستہ کر لیتا ہے۔ دوسرے لوگوں کے قہقہے اس کو جھوٹے اور خلوص سے عاری نظر آتے ہیں۔ وہ ہر ایک سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اس کا کوئی ساتھی ترقی کرتے کرتے کسی بڑے عہدہ پر پہنچ گیا تو وہ اسے دنیا کی ستم ظریفی اور ناقدر شناسی سمجھتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ اپنے ساتھیوں سے، اپنے رفیقوں سے دور ہوتا جاتا ہے۔ اور اپنی دنیا الگ تعمیر کرتا جاتا ہے۔ جس جس وجہ سے اور اس کی تنہائی، اس کی اداسی، اس کے آنسو۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں وجوہ سوائے تباہی کے اور کیا دے سکتی ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی زندگی بیکار ہوتی ہے۔ خود ان کے لئے بھی، اور دوسرے لوگوں کے لئے بھی۔ زندگی کے لمحات اگر دوسروں سے نفرت کرنے میں گذارے جائیں گے تو خوشی کہاں سے ملے گی۔ محبت کیسے گلے لگائے گی اور اس کائنات میں خوبصورتی کیا نظر آئے گی۔

ایسے ہی لوگوں تک ہم اپنی آواز پہنچانا چاہتے ہیں۔ "احساس کمتری" کی آگ میں جلنے والوں سے ہم کو یہ کہنا ہے کہ آپ اتنے برے نہیں۔ جتنا کہ آپ سمجھتے ہیں۔ آپ ہنسیں تو، آپ کی آواز میں بھی دلکشی ہے۔ وہ دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر سکتی ہے۔ آپ ان میں اپنائیت محسوس کر سکتے ہیں اور ذرا غور سے دیکھیں۔ جن لوگوں کو آپ تمام عیبوں سے خالی سمجھتے ہیں۔ ان میں بھی بحیثیت انسان کے کچھ کمزوریاں موجود ہیں۔ وہ رفتہ رفتہ ایسی کمزوریوں پر تو حاوی ہو گئے ہیں۔ جن کو آپ ابھی تک فتح نہیں کر پائے۔ لیکن جن کو آپ بھی فتح کر سکتے ہیں ——— اور "احساس برتری" کے طوفان میں بہنے والوں سے ہمارا یہ کہنا ہے کہ دوسرے لوگ اتنے برے نہیں۔ جتنا آپ

سمجھتے ہیں - ان میں بھی خلوص ہے، پیار ہے - محبت - اگر آپ کا ساتھی ترقی کرتے کرتے ایک اچھی منزل پر پہنچ گیا ہے۔ تو یہ اسی کی انتھک کوششوں، صلاحیتوں کا ثمرہ ہے - لوگ کسی کو یوں ہی آنکھوں پر چڑھا نہیں لیتے۔ اس میں وہ سب کچھ موجود ہے - جو اس عہدہ کے لئے ضروری تھا — آپکے ساتھی، آپکے رفیق آپ سے زیادہ عقلمند ہیں کہ جو کچھ بھی وقت ملتا ہے اس میں ہنس تو لیتے ہیں، آپس میں گفتگو تو کر لیتے ہیں - پھر یہ لمحے واپس نہیں آئیں گے آپ نے تو یہی لمحے آنسو بہانے میں گذار دئے - اپنی خود ساختہ تنہائیوں سے باہر آیئے - اور دیکھئے کہ باہر کتنی روشنی ہے - کتنی تازگی ہے - کتنی نغمگی ہے -

یہ دونوں دریا کے بہاؤ کے مخالف سمت بڑھنا چاہتے ہیں —

نتیجہ تباہی — اس تباہی سے اپنے کو بچایئے

کچھ "سالگرہ نمبر" اور "مرد نمبر" کے متعلق

"سالگرہ نمبر" آپ کے پاس پہنچ چکا ہے - اور جس خلوص سے آپ نے اس کا خیر مقدم کیا ہے - ہم اسی خلوص کے متمنی بھی تھے - خصوصاً جنسیات کے حصہ کی تعریف میں کئی خطوط وصول ہو چکے ہیں - اور ہم کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ ہم اس سلسلہ کو جاری رکھیں - ہماری ہمت افزائی کا شکریہ - سالگرہ نمبر کی کچھ کاپیاں اب بھی دفتر میں رہ گئی ہیں - آپ حاصل کر سکتے ہیں - اور جن مستقل خریداروں کو سالگرہ نمبر نہیں ملا ہے وہ ۵/ کے ٹکٹ روانہ کر کے دوبارہ بذریعہ رجسٹری منگالیں - ورنہ پھر ڈاک چوروں کی نذر ہو جائے گا

اب ہم عنقریب ہی "مرد نمبر" پیش کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں - ہماری کوشش تو ہے کہ اس میں زیادہ تر عورتیں ہی لکھیں - آپ بھی ہماری مدد کیجئے - ہر مرد کے لئے ہر عورت کے دل میں کچھ خار ہوتے ہیں - ان ہی کا نقطہ کا اظہار ہمارا مقصد ہے - تاکہ مرد بھی تو جانیں کہ عورتیں کیا چاہتی ہیں - تاکہ دونوں ایک دوسرے کی صحیح رفاقت حاصل کر سکیں ——— (اگر آپ عورت ہیں تو آپ بھی مرد نمبر کے لئے لکھئے - کچھ تو آپ کے دل میں ہوگا ہی)

مارچ ۵۰ کے شمارہ کا سرورق ———

——— پر جو "آنسو" کے عنوان سے تصویر شائع کی ہے - وہ ہمارے ایک مخلص دوست عزیز احمد، مدیر "اسٹوڈیو" کراچی کی عنایت کی ہوئی ہے ہم اس پرچہ میں اپنے مخلص رفیق کا شکریہ ادا کرنا بھولے تو نہیں تھے - پھر بھی وقت کی تنگی سے مجبور تھے - خیر - اب کی سہی

اگر آپ کو بھی مصوری یا فوٹوگرافی سے شوق ہے - تو ہم کو قلمی اور عکسی تصویریں بھیجئے - اگر وہ سائیکولوجی کے سرورق کے لئے موزوں ہونگی تو ہم ضرور شائع کریں گے - اگر قیمت کے خواہاں ہوں گے تو اپنی حتی التدور قیمت بھی ادا کریں گے - اور تصویر کے نیچے آپ کا نام بھی دیدیں گے ——— کچھ بھیجئے - آپ کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مصور ہیں !

کچھ "فرار" کے متعلق

دو تین مہینے سے "فرار" کے متعلق خطوط موصول ہو رہے ہیں کہ اس کے دو تین صفحے شامل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں - نئے پڑھنے والے کے لئے یہ سلسلہ بے ربط و بیکار ہے - اس کو ختم کر دیا جائے ——— آپ بھی ہم کو اپنی رائے سے مطلع فرمایئے - یہ سلسلہ جاری بھی رکھا جا سکتا ہے اور ختم کر کے کوئی دوسرا دلچسپ عنوان بھی شروع کیا جا سکتا ہے -

اچھا اب پھر (ادارہ)

نئے انسان ـــــــ نئی دنیا

جے سی - انڈرووڈ

ظلمتیں دم توڑ رہی ہیں، تاریکیاں سسک رہی ہیں، زنجیریں کٹ رہی ہیں اور ہم سب "نئی دنیا" کو سانسیں لیتے، آنکھ کھولتے اور مسکراتے دیکھ رہے ہیں -

جی نہیں، میں نے غلط کہا، ہم سب بھی اسی کے ساتھ سانس لے رہے ہیں، آنکھ کھول رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں - بات یہ ہے کہ ظلمتوں کا گلا گھونٹنے اور زنجیریں کاٹنے میں ہم ہی نے مصیبتیں جھیلی ہیں، جانیں دی ہیں، قربانیاں پیش کی ہیں اور اب ہم خود ہی اس دنیا کے لئے انسانوں کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں - یہ وہی ہاتھ ہیں جنہوں نے زنجیروں کو توڑا ہے، غلامی کی تاریکیوں کو دُور کیا ہے - اور اب یہی ہاتھ نئے انسان کے لئے نئے سانچے ڈھالنے میں لگے ہوئے ہیں -

یہ تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا ـــــــ پارک میں، اسکول اور کالج میں ـــــــ کہ سولہ سترہ برس کے لڑکے اور لڑکیاں پانچ پانچ، چھ چھ کی ٹولیوں میں جمع ہو جاتے ہیں ـــــــ لڑکیاں الگ، لڑکے الگ ـــــــ اور آپس میں ہنستے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں - لڑتے ہیں، دھکے دیتے ہیں، گاتے ہیں اور ایک دوسرے کو زور زور سے پکارتے ہیں -

جی ہاں، یہی ہیں وہ "خام" انسان - جن کو نئے سانچوں میں ڈھالنا ہے - اور آنے والی کل کے لئے تیار کرنا ہے -

ہاں ہاں آپ کا خیال ٹھیک ہے کہ ان کے لئے تعلیم کی اشد ضرورت ہے، اور ـــــــ اخلاقی تربیت کی بھی - یہ تو آپ ان کو دیکھ ہی کر معلوم کر سکتے ہیں کہ ان کو کس کس چیز کی ضرورت ہے - وہ کیا چاہتے ہیں - اور ہم کیا چاہتے ہیں - ہم، جنہوں نے ان کے لئے مصیبتیں جھیلی ہیں - راستے ہموار کئے ہیں - ہم کیا حالات پیدا کریں - ان کے لئے کیا کیا سہولتیں مہیا کریں - کہ وہ بھی اپنی امیدوں کی منزل پر پہنچ جائیں اور ہم بھی اپنے خوابوں کی سرحدوں کو چھو لیں -

کیا ان کو دیکھنے ہی سے ہم کو پتہ نہیں چلتا کہ وہ بہت ملنسار ہیں - وہ ایک دوسرے سے ملنا چاہتے ہیں - وہ کچھ کرنا چاہتے ہیں - وہ سن شعور کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں - اب تک ان کی آوازوں میں بچپنا تھا - مگر اب اس میں ایک "ٹھہراؤ"، ایک بھاری پن، ایک "بڑا پن" آنے لگا ہے اور وہ اس ٹھہراؤ، اس بھاری اور بڑے پن کو پسند کرتے ہیں - جب ہی تو وہ زور زور قہقہے لگاتے ہیں ایک دوسرے کو پکارتے ہیں اور جب وہ اپنی ہی آوازیں سنتے ہیں - تو بڑا ہی مزا آتا ہے ان کو -

اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم ان کے لئے ایسے مواقع پیدا کریں - ایسی جماعتیں بنائیں، ایسی SOCIETIES قائم کریں جہاں وہ اپنی نت نئی پیدا ہوتی ہوئی اور بڑھتی ہوئی قوتوں کو استعمال کر سکیں - جہاں ان کو اپنی آواز کو سُنانے کا موقعہ ملے - جہاں جسمانی طاقت اور دماغی قوت کا اظہار ہو سکے - جہاں وہ نئے نئے دوست پیدا کر سکیں -

یعنی ـــــــ لڑکے اور لڑکیوں کے لئے تفریحی اور ادبی کلب گھروں کی ضرورت ہے - جہاں ان خواہشوں کی تکمیل اچھی طرح

ہو سکتی ہے ۔ لیکن یہ خیال رہے کہ ان کلب گھروں کے منتظم مرد اور عورتیں ایسی ہوں جو "حکم دینے" سے زیادہ "خود ساتھ ساتھ" چلیں۔ ایسے مرد اور ایسی عورتیں جو یہ نہ بھولی ہوں کہ کبھی وہ لڑکے اور لڑکیاں تھیں ———— اور یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے انکو کہ یہی تو عمر ہے جب کہ دماغی قوتیں تیزی سے بڑھنے لگتی ہیں ۔ اور اسی لئے یہ عمر اعلیٰ تعلیم کے لئے بہت موزوں ہے ۔ جب وہ کسی ایک موضوع کا مطالعہ کرتے ہیں ۔ تو بات بات پر عالیہ نظریے بن جاتے ہیں — غور کرتے ہیں ———— اور ان کو بحث کرنے میں لطف بھی آتا ہے ۔

یہ ایک غلط ہی بات مشہور رہے کہ اس عمر میں لڑکے اور لڑکیاں کسی کی بات سننا اور ماننا پسند نہیں کرتے ———— جی نہیں حقیقت تو کچھ اور ہی ہے ۔ وہ ایسے لوگوں کی وجہ خو کو تو بہت ہی پسند کرتے ہیں جن کو ان کا اعتماد حاصل ہو چکا ہو اور جو اُن کے ساتھ صحیح قسم کی ہمدردی اور خلوص رکھتے ہوں ۔ اس لئے وہ لوگ جو اُن کا بھروسہ حاصل کر سکیں ان کی تو بے حد قدر کرتے ہیں

اور آج کل کی ترقی یافتہ دنیا میں جبکہ سائنس نے ایسی ایسی ایجادات کر دکھائی ہیں ۔ ان نئے انسانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ برقیات، حیاتیات، طبعیات کے متعلق کچھ نہ کچھ معلومات رکھیں جب ہی وہ زندگی کے رنگا رنگ پہلوؤں کو سمجھ سکیں گے

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ بچہ کی زندگی کے شروع کے سات سال ایسے ہوتے ہیں جبکہ وہ اپنے رجحانات پیدا کرتا ہے ۔ اسی طرح یہ الھڑپن کا زمانہ وہ ہوتا ہے جبکہ وہ اپنا کردار بناتا ہے ۔ وہ انسانی عادتوں کو سیکھتا ہے ۔ وہ عمر تو گذر چکی ہوتی ہے جبکہ ہر وقت ماں باپ کی نگرانی رہتی تھی ۔ اُن کی پُر شفقت دیکھ بھال رہتی تھی ۔ اور دل میں امنگیں ہیں کہ نئے تجربات کی طرف لے جا رہی ہیں ۔ وہ اپنی جسمانی اور دماغی قوتوں کو استعمال کرنے کے لیے بے قرار ہیں ۔ وہ اپنے گھر میں، اپنے محلہ میں ایک اہم جگہ حاصل کرنے کے لئے بے چین ہیں ۔ اگر صحیح قسم کی راہبری نہ ہوگی تو یہ کعبہ کے مسافر ۔ دیر نہ پہنچیں تو اور کیا ہو !

ہاں ایک اور بات ہے

جوانی کی طرف بڑھتے ہوئے یہ لڑکے اور لڑکیاں جب اپنے ماحول کو دیکھتے ہیں ۔ اپنے چاروں طرف بسے ہوئے انسانوں سے ملتے ہیں اور اوباش طبع مردوں اور عورتوں کے منہ سے فحش فحش گالیاں سنتے ہیں تو ان کو یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ انسان کے دل میں بُرائیاں بھری پڑی ہیں اس سے ان پر جتنا بھی بُرا اثر پڑے ۔ وہ کم ہے ۔ ان کے اپنے اعمال بھی ویسے ہی ہو جاتے ہیں وہ اپنا کردار بگاڑ لیتے ہیں ———— جنسی جذبوں کا احساس تو شروع ہی ہو چکا ہوتا ہے ۔ اس لئے یہی وہ وقت ہے جبکہ کچھ نہ کچھ جنسی تعلیم بھی دی جائے

جنسی معلومات کا فقدان اچھے لڑکے اور لڑکیوں پر بھی گہرا اثر کرتا ہے اور بُرے لڑکے لڑکیوں پر بھی ۔ اچھے لڑکے لڑکیاں جنسی تحریک کو غلط سمجھ کر احساس گناہ کا شکار ہو جاتی ہیں ۔ ان میں ایک تخریبی شرم پیدا ہو جاتی ہے اور جو فطرتاً بُرے ہیں ۔ ان کے لئے تو یہ فقدان برائیوں کے راستے ہی کھول دیتا ہے ۔

پھر کرنا کیا چاہیئے ۔

ان کو یہ تعلیم کون دے ؟

اور کس طرح ؟

کچھ کا خیال ہے کہ اسکول کے کورس میں یہ تعلیم شامل کر لی جائے ۔ لیکن شاید ان لوگوں کو اس بات کا احساس نہیں ہے کہ یہ موضوع کتنا نازک اور کتنا لطیف ہے ———— اور کیا ہر استاد اور استانی اس موضوع کی تعلیم کے لئے مناسب گہرائی نظر، سنجیدگی رکھتی ہے ———— یا ———— کیا یہ موضوع اسکول کے درجوں میں پڑھایا جا سکتا ہے ؟ ———— کیا یہ ممکن نہیں کہ اس کو ہر لڑکے اور لڑکی کو انفرادی طور سے بتایا جائے ۔

میرے خیال میں جنسی تعلیم کا بہترین طریقہ تو یہ ہونا چاہیئے کہ کوئی ڈاکٹر ایک کتاب لکھے ۔ اس کو شائع کرنے سے قبل ایک کمیٹی کو پیش کرے ۔ اس کمیٹی میں ایک مرد ڈاکٹر ہو ۔ ایک لیڈی ڈاکٹر، ایک استاد ہو، ایک استانی، اور دو باپ، دو مائیں ۔ یہ سب آپس میں مشورہ کر کے ضروری نکات کا فیصلہ کریں اور پھر یہ کتاب شائع کی جائے ۔ اور ہر لڑکے اور لڑکی کو ایک خاص عمر میں پڑھنے کو دی جائے ——— ایسی کتاب کے مطالعہ سے فائدہ یہ ہوگا کہ اس عمر میں پیدا ہونے والے سوالات کا تسلی بخش جواب مل جائے گا ۔ اور لڑکے اور لڑکیاں دماغی عیاشی میں پھنسنے نہ پائیں گی ۔

جس "نئی دنیا" کو ہم سانسیں لیتے، آنکھیں کھول کر مسکراتے دیکھ رہے ہیں ۔ یہی دنیا کل ان ہی نئے انسانوں کی دنیا ہوگی ۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ وہ آزادی کی روشنی میں سانس لیں، محبت کے گیتوں کو سنیں اور انسانیت کا دم بھریں ۔ تو ہم کو کچھ اور شمعیں جلانا ہوں گی، کچھ اندھیاروں کو دور کرنا ہوگا ۔

دیکھئے ۔ کہیں آپ شمعیں جلانے کی بجائے بجھا تو نہیں رہے ہیں

تلخیص و ترجمہ ادارہ

اثر لکھنوی

عشق کی گرمئ بازار کہاں سے لاؤں — یوسفِ دل کا خریدار کہاں سے لاؤں

جن سے میں اپنی محبت کا چمن سمجھتا تھا — آہ وہ پھول سے رخسار کہاں سے لاؤں

سنتے ہی نغموں کی اک لہر رگوں میں دوڑے — میں تری شوخئ گفتار کہاں سے لاؤں

وہی شوریدہ سری ہو وہی ایذا طلبی، — عشق میں جادۂ ہموار کہاں سے لاؤں

دلِ بیتاب خدا را تری تسکیں کے لئے — جلوہ حسن بت کرار کہاں سے لاؤں

تو ہی بتلا دے اگر تجھ کو ہو معلوم کوئی — تجھ سا اک اور سبب آزار کہاں سے لاؤں

تیرے انوار تجلی کی جھلک تھی جس میں — وہ دل آئینہ اسرار کہاں سے لاؤں

ہو گئیں آنکھوں سے وہ مست نگاہیں اوجھل — عشرتِ خانہ خمار کہاں سے لاؤں

دل کی دھڑکن میں سنا کرتا تھا پیغام ترا — اب وہ ہنگامۂ بسیار کہاں سے لاؤں

اس پہ آئینہ ہو کس طرح تمنا دل کی — شوق منت کش اظہار کہاں سے لاؤں

مجھ کو اب دعوت گل چینئ نظارہ نہ دے — دل حریف گل و گلزار کہاں سے لاؤں

وہی ہے، وہی شانیں، وہی جلوے ترے — پہلی سی طاقت دیدار کہاں سے لاؤں

مر وہی، جوش وہی، جوش وہی سجدوں کا — کوچہ و سنگِ دریار کہاں سے لاؤں

بند دل میں پرستار محبت ہوں اثر — روشِ کافر و دیندار کہاں سے لاؤں

قطعات ——— اختر انصاری اکبر آبادی

اب دہر کا قانون ہے ترمیم کے قابل !
اب جی میں ہے رسم و رہ منزل کو بدل دوں
فرسودہ و پامال سی راہوں سے نہ گذروں
دنیا کے ہر اک جادۂ باطل کو بدل دوں

بہار تو آ گئی ہے مگر خیال رہے
کہ اہتمام جفا ہو نہ ہر خیاباں میں
سنبھل سنبھل کے اٹھانا نگاہ اے گلچیں
گلوں کا رنگ نہ اڑنے لگے گلستاں میں

یہ باغباں کا ستم یہ جفائے دور بہار
کہ قلب غنچہ میں اک خار سا کھٹکتا ہے
ہے ایک منظر خونیں یہ انقلاب چمن
ہر ایک رگ سے گلوں کی لہو چھلکتا ہے

ابھی تو صحن گلستاں میں آ سکی ہے بہار
ابھی تو دشت کے اشجار کو نکھرنا ہے
ابھی تو اور چمکنا ہے آبشاروں کو
ابھی تو وادئ کہسار کو نکھرنا ہے

خود بینی و خود نمائی

مولانا عبدالماجد دریابادی

مکھی یا شہد کی مکھی جب اکیلی یا پھٹیل ہوتی ہے، اور اپنا گھر بنانا چاہتی ہے تو جاننے والوں کا بیان ہے کہ ہمیشہ بیلن کی شکل کا یا نیم بیضوی بناتی ہے۔ لیکن وہی مکھیاں جب بہت سی اکھٹی ہو جاتی ہیں اور اب جو چھتا بننے لگتا ہے، تو وہی جاننے والے کہتے ہیں کہ اب اس کی شکل و ہیئت ہی دوسری ہوتی ہے۔ اب طرز تعمیر ایسا نہیں رہتا جو ایک دوسرے سے ٹکرائے، بلکہ اب خانوں خانوں کے درمیان ایک اوٹ یا پردے کی دیوار سی چوڑی چوڑی حائل رہتی ہے۔ کہ نہ ایک کو تکلیف ہو نہ دوسرے کو ——————— دوسرے کا خیال کر کے اپنی آزادی پر حد بندی عائد کرنی پڑی اور بجائے پھیلنے کے کچھ سکڑنا، کچھ دبنا پڑا۔ لیکن ساتھ ہی دوسروں کی ہمدردی و ہم عملی بھی حاصل ہوگئی۔ تعمیر میں جو وقت اور قوت ایک ایک کو صرف کرنا پڑتی اس میں سب کو بچت ہوگئی، اور ایک ایک کو اپنی حفاظت کے لئے ہمدردوں کی ایک پوری فوج مل گئی

لوہار جب لوہے کی سلاخ کاٹنا چاہتا ہے، تو پہلے اُسے آگ میں تپاتا ہے۔ گرمی پاکر ایک دوسرے چمٹے ہوئے ذرات الگ الگ ہونے لگتے ہیں۔ اور اس انتشار سے ان کی تفریق تجزی آسان ہو جاتی ہے ——————— ہر انفرادی ذرے کو آزادی پوری حاصل ہوگئی اور اجتماع کی قوت ضعیف ہوگئی۔

ڈیری میں جب گھی، مکھن، دہی جمانا ہوتا ہے تو انھیں ٹھنڈک میں رکھدیا جاتا ہے۔ ٹھنڈک پاکر ان کے منتشر ذرات جڑنے اور جمنے لگتے ہیں۔ اور جو چیز پہلے رقیق یا سیال تھی وہ اب جم جاتی ہے ——————— ذرات کی آزادی محدود ہوگئی۔ لیکن مجموعے میں ٹھوس پن اور صلابت پیدا ہوگئی۔

بھیڑ بکری کے گلے، گائے بھینس کے جھنڈ پر، گلے اور جھنڈ کا اطلاق اسی وقت تک ہوگا جب تک کہ ساری فردیں ایک ہی راہ پر چل رہی ہیں۔ اور اپنی انفرادی حیثیت کو جماعت کے تابع کئے ہوئے ہیں۔ لیکن ہر فرد اگر اپنی اپنی راہ چلنے لگے تو ظاہر ہے کہ گلے یا جھنڈ کا اطلاق ذرا دیر بھی نہ رہ سکے گا۔ اور اجتماع معاً شکست ہو جائے گا۔

جاندار و بے جان، حیوان، انسان، ساری مثالوں پر نظر کرنے سے قانون یہ ہاتھ آیا کہ جماعت کا پہلا اثر افراد پر ان کی آزادی کی حد بندی ہے اور جماعت چونکہ خود افراد ہی سے مرکب ہوتی ہے۔ تو گویا اسی قانون کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر فرد پر دوسرے افراد کا اثر اس فرد کی آزادی پر حد بندی ہوتا ہے۔

اس اصل اصول سے جو اصول ثانوی نکلتے ہیں، تجربے، مشاہدے کی روشنی میں اب ان پر ایک نظر کرتے چلئے۔

(۱) دوسروں کا محض وجود ہی فرد کی آزادی کی تحدید کر دیتا ہے اور اس کے اوپر ایک امتناعی اثر رکھتا ہے۔

بچوں کو دیکھئے یوں کیسی شوخیاں کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ذرا کوئی غیر آدمی آگیا، تو کیسا شرما جاتے ہیں۔ لجا جاتے ہیں۔ اب نہ وہ شوخی ہے۔ نہ تیزی۔ سر جھکائے ہیں۔ آنکھیں نیچی کئے ہیں معمولی سوال کا جواب بھی نہیں دیتے ——— ۔ بچوں سے گذر کر بڑوں اور بوڑھوں پر آئیے ہم آپ، سب کیا کرتے ہیں یہی کہ جو آزادی عمل تنہائی میں حاصل رہتی ہے۔ دوسروں کے سامنے اس کی آدھی بھی باقی نہیں رہ جاتی۔ اکیلے میں جس طرح چاہیں لیٹیں، بیٹھیں۔ اُچکیں، پھاندیں، دوڑیں لگائیں، گائیں گنگنائیں۔ لیکن ادھر کوئی ملنے ملانے آگیا، ادھر ہر آزادی پر قید لگ گئی۔ اور سامنے آجانے والا اگر کوئی اجنبی ہے جب تو بڑی سخت قیدیں آزادی پر لگ گئیں۔ غیروں کے سامنے ادب قاعدے سے بیٹھ جانا پڑا نہ جی بھر کر ہنس کھیل سکتے ہیں۔ نہ آزادی سے کھا، پی سکتے ہیں۔ نہ سو سکتے، نہ لیٹ سکتے ہیں۔

بہتوں کو دیکھا ہوگا کہ لکھنے والے بہت اچھے ہیں۔ تحریر میں ہر طرح کے اظہار مطالب پر قادر، انشا پرداز اور صحیح معنی میں قادر الکلام، لیکن بولنے کو کہئے تو چھوٹے سے مجمع کے سامنے بھی زبان کھولنے پر قادر نہیں، مجمع کا سوال بھی چھوڑ دیئے۔ اپنے مخالف پر آپ کو اس کے پیچھے غصہ آجاتا ہے کہ وہ کہیں مل جائے تو آپ اس کی خوب خبر لیں۔ اسے دندان شکن جواب دیں لیکن جب سامنا ہوجاتا ہے۔ تو آپ کی زبان نہیں چل پاتی۔ دل میں بہت کچھ غبار بھرا ہے۔ لیکن گویائی ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ اسی کو آپ خط لکھ بھیجتے ہیں تو اس میں خوب دل کے حوصلے نکال لیتے ہیں۔ ایک اور مثال لیجئے۔ محبوب سے ملنے کی آپ کو بڑی تمنا ہے۔ اور دل میں خوب خوب ارمان اور ولولے ہیں کہ ملاقات کے وقت خوب قصۂ دل کہہ سکیں گے۔ ملاقات ہوتی ہے، لیکن اب وہ زبان کی ساری طراری غائب۔ مشکل ہی سے کوئی بات نکل پائی۔ اور معاملہ خط پر اٹھا رہتا ہے! ——— ان سب مثالوں میں چاہے "رعب" سے تعبیر کیجئے، چاہے "مروت" کہیئے بہرحال دوسرے یا دوسروں کا سامنا بھی آزادی گفتار میں حائل ہوجاتا ہے۔ خطوط میں اور اپنے روزنامچوں میں لوگ کیسی کیسی باتیں لکھ جاتے ہیں۔ بے تکلف اور گہرے دوستوں کے سامنے بھی اپنی زبان سے ادا کرتے حیا آتی ہے۔ یہ سب مثالیں بھی اسی کلیہ کی ہیں۔

اور تو اور، بعض مجنونوں اور مخبوط الحواسوں کے لئے یہ بارہا پیش آیا ہے، کہ اپنے عزیزوں، قریبوں، دوستوں کے سامنے تو وہ برابر اپنے خبط وجنون کا ثبوت دیتے رہے، لیکن ادھر مجسٹریٹ یا کسی اجنبی ڈاکٹر کے سامنے معائنے کے لئے پیش ہوئے اور ادھر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ گویا آپ مجنون ہی نہیں۔ اور سنجیدگی کی باتیں کرنے لگے ——— یہاں بھی کارفرما وہی قانون ہے۔ کہ فرد کی ذہنیت تنہائی میں یا اپنوں کے سامنے کچھ ہوتی ہے اور بیگانوں کے سامنے کچھ اور یہاں تک کہ خبطی اور جنونی فرد کی بھی۔

(۲) یہ اثر جب دوسروں کے محض وجود کا پڑ جاتا ہے تو دوسروں کی توجہ کا اثر تو ظاہر ہے کہ قوت میں کئی گنا زاید ہوگا۔ اگرچہ یہ لازمی نہیں کہ نوعیت میں بھی ہمیشہ وہی ہو۔

سنسان سڑک کی ایک پٹری سے دوسری پٹری پر کسی کو جانا ہے یا اپنے لمبے برآمدے یا دالان ہی میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچنا ہے، تو اس سے بڑھ کر آسان امر اور ہے ہی کیا؟ نہ کچھ سوچنے کی ضرورت، نہ کسی خاص اہتمام کی۔ بس ایک دفعہ ارادہ کیا اور ادھر سے ادھر پہنچ گئے۔ کھٹ سے آر پار ہوگئے۔ بلکہ ایسے موقع پر سوچ سوچ کر ایک ایک قدم اٹھایا تو اور دیر لگ جائے گی اور کچھ تھکن ہی سی پیدا ہونے لگے گی۔ لیکن اب فرض کیجئے کہ اسی قدر فاصلہ چند فٹ یا چند گز کا سنسان سڑک یا دالان نہیں بلکہ کسی تماشاگاہ کا ہے جو تماشاگر کو طے کرنا ہے تماشاگاہ تماشائیوں سے لبریز ہے۔ سب کی نگاہیں تماشہ گر پر لگی ہوئی ہیں۔ تماشاگر اگر خوب منجھا ہوا نہیں ہے تو بس یہ معلوم ہوگا چند قدم چلنا نہیں، بلکہ قلعہ کو سر کرنا ہے ایک ایک قدم پر لوہے لگ جائیں گے۔ اور ایسا محسوس ہونے لگے گا جیسے اپنی ٹانگیں اپنے کہے میں نہیں۔ گوشت پوست کی نہیں، پتھر و فولاد کی ہیں۔

ایک شعر آپ کو یوں بخوبی یاد ہے۔ بارہا آپ اسے گنگنا چکے ہیں۔ لیکن ذرا اسے پہلے پہل کسی مجمع میں تو پڑھ کر سنائیے۔ یاد ہی نہ رہے گا کچھ لفظ معلوم ہوتا ہے حلق میں اٹکے رہ گئے۔ قرآن کی جو سورتیں، ایک نمازی کو حفظ ہیں، اور تنہا نماز میں برابر انھیں پڑھتا رہتا ہے۔ وہی سورتیں

کہیئے جہری نماز میں امام بن کر تو پڑھئے قادر نہ ہوسکے گا بار بار متشابہ لگے گا ۔ دست کار یا کاریگر ایک کام تنہائی میں کرنا خوب سیکھ لیتا ہے ۔لیکن اسی کو کرتے ہوئے اگر دوسرے لوگ تماشہ بناکر دیکھنے لگیں تو خواہ مخواہ گڑبڑا جاتا ہے ۔ آئی ہوئی عقل گم ہو جاتی ہے اور ہاتھ پیر جیسے بھول جاتے ہیں ایک صاحب اپنے عزیزوں اور بے تکلف دوستوں کے سامنے خوب آزادی سے چہک لیتے ہیں لیکن انہیں سے کہیئے کہ وہی الفاظ کھڑے ہو کر ایک مجمع کے سامنے دہرادیں تو ہیبت طاری ہو جائے گی ۔زبان لڑکھڑانے لگے گی ۔چہرے پر پسینہ آجائے گا ۔ اور دل کی بات دل ہی میں رہ جائے گی ۔ یہ روزمرہ کی ساری مثالیں اسی قانون کی ہیں ۔ کہ دوسروں کی توجہ کا احساس فرد کی ذہنیت کو اچھا خاصا بدل دیتا ہے ۔

ایسے موقعوں پر ہوتا کیا ہے ۔ ہوتا یہ ہے کہ نفس کی خود شعوری بڑھ جاتی ہے ۔ جو افعال وحرکات اضطراری میں از خود صادر ہوتے رہتے ہیں ۔ ان پر وہ دھیان دینے لگتا ہے ۔ اور قصد و اہتمام کے ساتھ کرنا چاہتا ہے ۔ بس اسی سے اعصاب میں تناؤ پیدا ہو جاتا ہے ۔ ایک ہنگامی فالج یا استرخا کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔ اور ان اعمال کی سادگی اور بے تکلفی غائب ہو جاتی ہے ۔

(۳) کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کی خواہش داد جو طبعی ہے مگر سے مُنی رہنا چاہیئے ایسے موقع پر اُبھر آتی ہے ۔ اور دوسروں پر نمایاں ہو جاتی ہے کہ یہ حضرت اپنے عمل کی داد ہی چاہ رہے ہیں ———— یہ ابھری ہوئی داد طلبی بنے ہوئے کام کو بگاڑ دیتی ہے اور نہ اتو بہرحال ہو جاتا ہے کہ اپنے عمل میں قدرتی سادگی، بے تکلفی، آمد باقی نہیں رہتی ، بلکہ تصنع و آورد کی جھلک کسی درجے میں تو ضرور ہی آجایا کرتی ہے ۔

(۴) مشق و مہارت شرم و جھجک کے اثرات کو دور کر دیتی ہے، جس طرح افیون کھاتے کھاتے پھر اس مقدار میں وہ نشہ آوری باقی نہیں رہتی لیکن یہ نہیں ہوتا کہ دوسروں کی توجہ اپنا اثر دکھانا چھوڑ دے ۔ یہ ہرگز نہیں ہوتا بلکہ وہی اثر اب دوسری صورت میں ظاہر ہونے لگتا ہے سابق صورت کے برعکس، دوسروں کی توجہ پہلے اگر زبان بندی کا کام دیتی تھی، تو اب زبان کشائی کا کام دینے لگتی ہے ۔ پہلے جھجک پیدا کرتی تھی، اب وہی ہمت دلاتی ہے ۔ پہلے وہ حجاب اور مانع کے مرادف تھی ۔ اب مہمیز اور تازیانے کا کام کرنے لگتی ہے ———— مشاق خطیبوں اور خوش بیان مقرروں کو دیکھا ہوگا ۔ کہ حاضرین و سامعین کی کثرت سے نہیں بلکہ کمی سے گھبراتے ہیں خواہش اس کی نہیں رہ جاتی کہ لوگ ادھر نہ مخاطب ہوں بلکہ اس کی پیدا ہو جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مخاطب ہوں ۔ حاضرین اگر اونگھنے لگے یا دوسری طرف مخاطب ہوگئے تو خطیب خوش بیان کی زبان چلتے چلتے رک سی جاتی ہے ———— یہ سارے شواہد اسی قانون کے ہیں ۔ وہی محرک یعنی دوسروں کی توجہ جو مشق سے قبل کام نفی اور سلب کا دیتا تھا پختہ مشقی کے بعد کام ایجاب و اثبات کا دینے لگتا ہے ۔

(۵) شرمیلا پن بعض افراد میں حد اعتدال سے بڑھا ہوتا ہے، جو ایک قسم مرض کی ہے ——— یہ لوگ جماعت کے نظر سے بالکل غائب ہو کر گوشہ نشین ہو جانا چاہتے ہیں ۔ اور کسی کے سامنے آنا انھیں گوارا نہیں ہوتا ۔بعض اوقات ایسے لوگ اپنی جھیپ مٹانے کے لئے، اور محض یہ جتانے کے لئے کہ یہ جھیپتے نہیں ہیں، کوئی ایسی بے محل بات کہہ اٹھتے یا کر گذرتے ہیں ۔ کہ لوگوں کے اور زیادہ مرکز توجہ اور انگشت نما بن جاتے ہیں ۔

بعضوں میں اس کے ٹھیک برعکس، شرمیلا پن حد اعتدال سے کم ہوتا ہے ۔ اور اسی کا نام ڈھٹائی ہے ۔ وہ بالقصد ایسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں اور ان میں ذرا جھجک نہیں محسوس نہیں کرتے ۔ کہ لوگوں کی نظریں ان پر زیادہ سے زیادہ پڑیں اور ہر محفل میں انہیں کے چرچے ہوا کریں ۔ اپنی نام آوری کی دھن میں انھیں اس کی بھی فکر نہیں رہتی کہ نیک نامی حاصل ہو رہی ہے یا بدنامی ———— بدنامی کو بھی یہ عین اپنی ناموری سمجھتے ہیں ——— مشہور مصرع ———

"بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا"

اسی ذہنیت کا ترجمان ہے ۔

(۶) اب تک گفتگو اس لحاظ سے تھی کہ دوسروں کی توجہ کا فرد پر کیا اثر پڑتا رہتا ہے۔ لیکن توجہ خالص اور بے آب و رنگ زیادہ عرصے تک رہ نہیں سکتی۔ لازمی ہے کہ جلد ہی اس میں کوئی رنگ پیدا ہو جائے۔ خواہ موافقت کا خواہ مخالفت کا، خواہ دوستی کا خواہ دشمنی کا، داد کا یا اعتراض کا، آفریں کا یا نفریں کا اور یہیں سے بنیاد پڑ جاتی ہے ایک طرف، عزت، محبوبیت، شہرت اور نیک نامی کی۔ دوسری طرف، ذلت، رسوائی، مبغوضیت اور بدنامی کی۔

انسان کے دل میں یہ خواہش کوئی معمولی خواہش اور فرد کے لئے یہ جماعت میں ہر دلعزیزی و مقبولیت کا محرک کوئی ادنیٰ محرک نہیں۔ سوسائٹی کا نظام کہنا چاہیئے کہ ایک بڑی حد تک اسی طبعی تقاضے کے سہارے قایم ہے۔ اخلاق کی اصطلاح میں اسی کا نام جاہ طلبی ہے۔ لیکن یہ ایک ذمیمے کی حیثیت جب ہی رکھتی ہے۔ جب حد اعتدال سے بڑھ جائے۔ ورنہ اپنی حدود کے اندر تو جاہ پسندی بالکل طبعی ہے اور بطور رعیت کے شمار ہونے کے قابل نہیں۔ یہ خواہش اگر صدود کے اندر ہے تو یہی تو دنیا کی اکثریت کو سنبھالے ہوئے اور نظم و نظام اخلاق کی شیرازہ بندی کئے ہوئے ہے ———— چوری سے، بدچلنی سے، جعلسازی سے، ہر جرم و قصور سے آج خوف خدا کی بنا پر رکنے والے کتنے ہیں؟ ظاہر ہے کہ بہت کم، اور ایسی بدنامی اور فضیحتے کے ڈر سے رکنے والے کتنے؟ ظاہر ہے بہت زیادہ اور جس نسبت سے جماعت کا اخلاقی دباؤ کم ہوتا جاتا ہے اسی نسبت سے افراد میں بے باکی بڑھتی جاتی ہے۔ اور صالحین کی تعداد سے کہیں بڑھ کر تعداد بدکرداروں کی ہو جاتی ہے۔

(۷) شہرت و نیک نامی حاصل کرنے کے طریقے بہت سے ہیں۔ کوئی سا بھی بڑا کام علمی، عملی، دماغی و جسمانی کسی بھی شعبۂ زندگی سے متعلق ہو جسے عام لوگ نہ کر سکیں، یا جو اکثریت کی نظر میں غیر معمولی ہو، ایسے کر ڈالنا، کھلا ہوا راستہ شہرت و ناموری کا ہے۔ شجاعت، ذہانت، مشقت، حاضر جوابی کی راہ سے اس منزل تک رسائی بہ آسانی ہو جاتی ہے۔ البتہ جس چیز کا نام محبت و عزت ہے، اس کے حاصل کرنے کے لئے کام کا صرف غیر معمولی ہونا ناکافی ہے۔ اس کے لئے خدمت، اخلاص اور ایثار بھی ضروری ہے۔ بغیر اس کے لوگوں کے دلوں میں جگہ نہیں پیدا ہوتی۔ صرف زبان واہ واہ کہہ دیتی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ دماغ عش عش کرنے لگتا ہے۔

یہ ہر دلعزیزی اور مقبولیت ہی کی خواہش تو ہے۔ جس کی بنا پر ہم اپنی کمزوریوں اور عیبوں کو خلقت کی نظر سے چھپاتے ہیں۔ اور اپنی واقعی یا غیر واقعی خوبیوں کا خوب اشتہار دیتے پھرتے ہیں لیکن دوسروں سے داد حاصل کرنے سے کامیابی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ

(۱) اول تو ہم خود اپنی زبان سے اپنی داد نہ دیتے پھریں، ورنہ چھچھورے اور خود ستا مشہور ہو جائیں گے۔ اور بجائے نیک نامی کے اُلٹی بدنامی ہاتھ لگے گی۔ انسان میں اگر واقعۃً فروتنی نہ ہو، تو بھی اسے ظاہر تو تواضع و فروتنی ہی کرنا چاہیئے۔ بغیر اس کے خلق کی نظر میں نیک نامی حاصل ہی نہیں ہو سکتی ———— نیک نامی کو جماعت اپنا عطیہ و انعام سمجھتی ہے۔ وہ فرد کی اس جسارت کو معاف نہیں کر سکتی کہ اس نے جماعت سے بے نیاز ہو کر، یا اس کے فیصلے کا انتظار کئے بغیر، اس انعام کو اپنے لئے مخصوص کر لیا اور سوسائٹی ایسے فرد کو سزا یہ دیتی ہے کہ اس کا نام خود بین خود نما، خود پرست رکھ دیتی ہے۔

(۲) دوسری شرط اسی سے ملتی ہوئی، بلکہ اسی کی جلی شکل یہ ہے کہ داد کی خواہش فرد کے اندر کیسی ہی قوی کیوں نہ ہو، لیکن لازم ہے کہ وہ مخفی ہی رہے۔ اگر کہیں فرد نے داد علانیہ مانگنی شروع کر دی۔ اور اس کی داد طلبی دوسروں پر کھل گئی تو سوسائٹی پھر اس معاملہ میں سخت بخل کرنے لگے گی۔ وہ تو اسے اپنی طرف سے عطیہ و انعام سمجھتی ہے۔ اور انعام کہیں مطالبہ کرنے سے ملتا ہے؟ انعام کے معنی ہی یہ ہیں کہ بطور لطف و بخشش عطا ہو۔

یہیں پہر آ کر نفسیات کے دائرے حکمائے اخلاق کی تعلیمات سے مل جاتے ہیں انھوں نے بھی تو یہی کہا ہے کہ خلق کی نظر میں بڑے بننا چاہتے ہو، تو خود اپنی نظر میں چھوٹے بنو ———— تواضع، انکسار میں عجب اثر ہے۔ دوسروں کی نظر میں یہی عادت مغرور و مکرم بناتی ہے۔ یہاں تک کہ جو تواضع محض تصنع سے کی جاتی ہے اس تک میں اثر موجود ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ خود یہ تصنع ایسا نہ ہو جو کھل جائے۔

میرا یقین کیجئے کہ
آپ کامیاب ہو سکتے ہیں!

ایچ - جوزف گرین

نہیں

میں یہ تو کہنے سے رہا کہ جو بھی اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے - اس کے لئے قدرت نے یکساں مواقع کامیابی کے مہیا کر رکھے ہیں - اور ہر انسان خدا داد قوتوں میں دوسرے انسان کا برابر کا شریک ہے -

جی نہیں -

یہ تو ممکن ہی نہیں ہے

بلکہ ـــ اس کے برعکس، بہت سی ایسی باتیں ہیں - جن پر ہم کو اختیار نہیں ہے - اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم تو محض چوسر کے مہرے ہیں - کھیلنے والا کوئی اور ہے - ہم اس کی انگلیوں کے اشارے چل پھر رہے ہیں - نہ تو ہم کو اپنی قسمت کے لکھے کی خبر ہے - نہ ہماری جدوجہد اس میں شائبہ بھر بھی تبدیلی کر سکتی ہے -

موجوں کا ایک طوفان آتا ہے - اٹھتی موجوں کا، بڑھتی موجوں کا - وہ لوگ جو اٹھتی موجوں کے ساتھ بڑھتے رہتے ہیں - وہ کہتے ہیں کہ زندگی میں کتنی مسکراہٹیں ہیں - کتنی خوشیاں ہیں ـــــــ اس کا ایک ایک قدم پُر معنی ہے - مقصد سے بھرا ہوا ہے ـــــــ اور وہ، جو اس کی بڑھتی موجوں کا ساتھ نہیں دے پاتے - کہتے ہیں کہ اوہ، زندگی میں کتنے تضاد ہیں - جھوٹی باتوں کا ڈھیر ہے زندگی -

اور ہم میں سے اکثر لوگ ان ہی دو تضاد نظریوں کے درمیان میں ہیرے پھیرے لگایا کرتے ہیں - زندگی سے کسی نہ کسی طرح نباہ کرنا ہی پڑتا ہے - ناکام سہی، مجبور سہی، لیکن قدم ہیں کہ اٹھتے ہی جاتے ہیں - بڑھتے ہی جاتے ہیں -

جی ہاں - یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ ماحول کے سانچوں میں ڈھل کر ہم اپنی زندگی کے انداز پیدا کرتے ہیں - مگر اس کو کیا کروں کہ میرے مشاہدے میں ایسے لوگ بھی آئے ہیں جو اپنی صلاحیتوں سے گر کر زندہ رہ رہے ہیں - ہم میں سے ایسے کتنے ہی اشخاص موجود ہیں جو اگر چاہیں تو بہتر سے بہتر زندگی گذار سکتے ہیں - لیکن نہ تو وہ کوشش کرتے ہیں اپنی قوتوں کو سمجھنے کی اور نہ ہی ایسے مواقع پیدا کرتے ہیں - جن میں ان کے چھپے ہوئے جوہر کھل سکیں ـــ کہتے ہیں ہمیں کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا ـــــــ قسمت ہی خراب ہے صاحب - ازل ہی سے لکھی ہے بربادی قسمت میں ـــ کیا کرو تم، کیا کروں میں بھی -

بفرض محال ـــــــ اگر ایسی گتھیاں پیدا بھی ہو گئی ہیں ـــــــ تو بھی کیا ہوا - وہ صلاحیتوں کو بالکل ہی ڈبو دینے سے تو رہیں ـــ ہاں اگر ایک منحنی سا، کمزور سا انسان یہ چاہے کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے پہلوانوں کو زیر کر دے، یا ایک کند ذہن اسی کا متمنی ہو کہ وہ آپ کی یونیورسٹی میں پروفیسر بن جائے تو معاف کیجئے گا، ایسے خواب تو شرمندہ تعبیر ہونے سے رہے!

یا

اگر ہم یہ چاہنے لگیں کہ چاند کو، اس ٹھنڈی سی روشن قندیل کو آسمان کے جھلملاتے تاروں کی بزم سے توڑ کر اپنے کمرے کی زینت بنائیں تو ــ ناکامی ناگزیر ہے ـ چنانچہ وہ لوگ جو اس قسم کی حماقتوں کا شکار ہو جاتے ہیں ـ وہ ناکام رہتے ہیں ـ اور کیا کامیاب ہوں گے ایسے لوگ جو اپنی خواہش کو بھی نہ سمجھ سکیں!

لوگ کامیاب بھی ہوتے ہیں ـ

وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اپنی خواہشوں، اپنی آرزوؤں کی خوب اچھی طرح جانچ پڑتال کرتے ہیں ـ جو اپنی منزل کا پورے ہوش مندی سے انتخاب کرتے ہیں اور پھر ــــــ بڑے اعتماد کے ساتھ، بڑی ثابت قدمی کے ساتھ اس کو حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں ـ اب چاہے کچھ بھی ہو ـ قدم قدم پر دشواریاں حائل ہوتی ہیں ـ دیواریں بلند ہوتی ہیں خلیجیں پیدا ہوتی ہیں ـ مگر وہ گرتے پڑتے، اٹھتے سنبھلتے، ڈوبتے ابھرتے آگے بڑھتے رہتے ہیں ـ وہ ایک دم سے سیڑھیوں کو چھلانگ مارتے ہوئے اوپر نہیں پہنچ جاتے ـ ان کے دامن میں بھی خار الجھتے ہیں ـ اور وہ بھی ہماری آپ کی طرح گردابوں میں پھنستے ہیں ـ لیکن وہ آس نہیں چھوڑتے، ایک سیڑھی سے گر کر وہ دو سیڑھیوں پر چڑھ جاتے ہیں اور آخر کار ــــــ وہ ہوتے ہیں اور ان کی منزل، کامیاب، نغمہ ریز، درخشاں منزل ـ

اس میں شک نہیں کہ دنیا جھکتی ہے ـ جھکانے والا چاہئے

جھکانے والا طاقتور ہی ہوگا ـ لیکن طاقت کو کوئی انہائی شے سمجھنا غلطی ہے ـ طاقت تو محض کمزوریوں کی دوری کا نام ہے ـ اس لئے اگر آپ بھی کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو اپنے نفس کا اچھی طرح جائزہ لیجئے ـ اپنی کمزوریوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بے نقاب کیجئے اور اپنے ساتھیوں سے اپنا مقابلہ کر دیکھئے کہ وہ کون سی کمزوریاں ہیں جن پر وہ غلبہ پا چکے ہیں لیکن جو اب تک آپ میں موجود ہیں اور دوسروں کی طاقت کو مہربان قسمت کا عطیہ نہ تصور کیجئے ـ بلکہ یہ یقین کیجئے کہ انہوں نے سالہا سال کی جدوجہد، تکلیف اور ریاضت کے بعد اپنی کمزوریوں کو دور کیا ہے ـ وہ اپنی زندگی کو منجدھار سے بچا بچا کر کامیابی کے ساحل تک لائے ہیں ـ

مثال کے طور پر

آپ ایک مصور کو لیں ـ اس کا موقلم رنگوں سے کھیلتے کھیلتے کیسی کیسی تصویریں بنا دیتا ہے ـ ایسی ایسی تصویریں کہ آپ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اب بولی یہ عورت، چہچہائیں یہ چڑیاں ـ

آپ سمجھتے ہیں کہ یہ تو خداداد طاقت ہے ـ

مگر

اگر کچھ بھی غور و فکر سے کام لیں تو آپ کو یہ اعتراف کرنا ہی ہوگا کہ اس مصور نے رات دن ایک کر کے ان رنگوں کو اپنا خون بنا بنا کر یہ صلاحیت حاصل کی ہے ـ ہم کو خبر نہیں کہ کتنے ہی خاکے وہ ایسے بنا چکا ہے ـ جن میں زندگی کی حرکت نہ آسکی، کتنے ہی رنگ وہ ایسے برباد کر چکا ہے جو کوئی بھی کیفیت نہ پیدا کر سکے

ہم تو اس کو سامنے بیٹھے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور اس کا موقلم ہے کہ ایک کے بعد ایک تصویر پر تصویریں بنائے جا رہا ہے ـ رنگ پر رنگ چڑھ رہے ہیں ـ وہ اپنا رنگ چھوڑ کر نیا رنگ اختیار کرتے جا رہے ہیں ـ

اور

وہ لوگ جو ناکام رہتے ہیں ـ وہ کبھی بھی اپنی کوتاہیوں کو ماننے پر تیار نہیں ہوتے ـ وہ تو سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو کچھ وہ کر سکتے تھے ـ کر چکے ـ کامیابی نہیں ہوئی تو کس کا قصور؟ ــ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگ ناکامی کو زندگی "گزارنے" کا بہترین ذریعہ سمجھتے ہیں ـ کیونکہ اگر وہ اپنی

حالت کو زبوں حال، اپنے چہرہ کو پریشان اور مضمحل، اپنی طبیعت کو رنجیدہ بنائے لیتے ہیں تو کون ان سے کہے گا کہ وہ بارہ کوشش کرو۔ اس طرح ان کی زندگی "گزر" ہی جائے گی۔

اچھا۔

کیا آپ کو یہ محسوس ہوا کہ میں اپنے اس مضمون میں خود ہی متضاد قسم کی باتیں کر رہا ہوں ؟

جی ہاں۔ اسی قسم کا تضاد لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو بنانے کے ذمہ دار بھی ہیں اور غیر ذمہ داری کے الزام سے بری بھی۔ تنگ نظری تو یہ ہے کہ ہم کسی بات کے ذمہ دار ہی نہیں ہیں لیکن اگر ایک بار بھی ہم یہ محسوس کر لیں کہ کتنی بے مقصد اور بے منزل رہی ہماری زندگی۔ اگر ہم کو ایک مرتبہ بھی یہ سچ معلوم ہونے لگے کہ ہماری تمام کی تمام پریشانیاں ہماری ذہنی بے راہ روی کا نتیجہ ہیں تو ساری ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے

یہ تو اپنی اپنی پسند ہے

چاہیں۔ ہم اپنی زندگی کو کامیابی اور مسرت کے گیت سنائیں

چاہیں۔ یوں ہی صبح کے بعد شام، شام کے بعد صبح کے چکر میں پڑ کر زندگی کے دن پورے کر دیں۔

وہ تمام کے تمام لوگ

جو اس دنیا کی تاریکیوں سے لڑ کر اجالے کے پرچم لہرا سکتے ہیں

جو ایک بہتر دنیا کے خوابوں کی تعبیر پا سکتے ہیں

جو کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن جو ناکام رہنے ہی پر قناعت کئے ہوئے ہیں

ان سے میرا تخاطب ہے۔

کیونکہ انسانیت کے دامن میں جتنے بھی کانٹے ہیں وہ ان ہی لوگوں کی کوتاہیوں کی وجہ سے روز بروز نزناک ہوتے جا رہے ہیں۔

آپ کہیں گے۔

پھر ہم کو کیا کرنا چاہیئے

کامیابی کیسے ممکن ہے

جواباً عرض ہے کہ ان اصولوں پر چلئے اور چلتے رہیے۔

- دوسروں کے کاندھوں کا بوجھ نہ بنئے ——— خود اپنے بھروسہ پر زندہ رہنا، فیصلہ کرنا، تاریکیوں سے مقابلہ کرنا سیکھئے
- بہت زیادہ تن آسانی نہ چاہیئے۔ اپنی ہر خواہش کو پورا کرنے میں ضدی نہ بنیئے۔
- حد سے زیادہ محتاط بننے کی کوشش نہ کیجیئے
- کبھی یہ نہ سوچئے کہ زندگی بیکار ہے۔ جیسے آپ کو اس میں کوئی امید نظر نہ آتی ہو۔ کیونکہ یہ عادت آپ کو ذرا ذرا سی رکاوٹ پر ہراساں کر دے گی۔
- دوسروں کی تنقیدی نظروں سے نہ ڈریئے۔ اگر ان کے اعتراض بجا ہیں تو اپنی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کیجیئے۔ اگر وہ بیجا ہیں تو ہنس کر ٹال جائیے۔ کیونکہ ایسے رشتے تو پیدا ہی کرتے ہیں۔
- جس سے بھی آپ ملیں۔ اس کی اچھائیوں کا اعتراف کریئے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی اچھائیوں کو بھی فراموش نہ کیجئے اور کوشش کیجئے کہ وہ بھی

آپ کی صلاحیتوں کا معترف بن جائے۔

- اپنی اچھائیوں کے اظہار کے بیجا مواقع نہ تلاش کیجیے۔ یہ نہ بھولیے کہ وہ خود بخود ظاہر ہوتی رہیں گی۔
- یاد رکھیے کہ دنیا ان ہی لوگوں کو پسند کرتی ہے جو اپنی راہیں آپ پیدا کرتے ہیں ——— یعنی ——— دوسروں کی تقلید نہ کیجیے۔
- خود رحمی کی لذت کا شکار نہ بنیئے اور نہ اس کی کوشش کیجیے کہ دوسرے آپ پر ترس کھائیں۔
- خود اپنے آپ سے کبھی جھوٹ نہ بولیے۔ اور نہ اپنے کو جھوٹی تسلیاں دیجیے۔

(تلخیص و ترجمہ ۔ ادارہ)

عورت کہتی ہے کہ

مرد

- مطلب پرست ہے
- خود غرض ہے
- ناقدر شناس ہے
- ظالم ہے
- مرد ہی نے سماج کے آئین بنائے اور عورت کو ان شکنجوں میں اس فریب کاری سے جکڑ لیا ہے کہ بیچاری عورت سمجھتی ہے کہ وہ آزاد ہے اور مرد کی ہمسر ہے۔

سائیکولوجی عنقریب

"مرد نمبر" ——— پیش کر رہا ہے

اس نمبر میں زیادہ تر عورتیں لکھ رہی ہیں،
اس زرّین پیش کش کا ابھی سے انتظار کیجیے۔ اور ہمارے مستقل خریدار بن کر ہماری ہمت بڑھائیے

یہ نمبر بھی سالگرہ نمبر کی طرح ضخیم ہوگا

سالانہ خریداروں کی خدمت میں تحفتاً

خاص سائیکولوجی اردو کے لئے

آنکھ والا تیرے جوبن کا تماشہ دیکھے

ماہ مبین

سڑک کے کنارے ایک مداری بیٹھا ہوا اپنی ڈگڈگی بجا رہا ہے۔
لڑکے اس کو گھیرے کھڑے ہیں۔
وہ اپنی ڈگڈگی بجاتا ہے
ڈگ۔ ڈگ۔ ڈگ۔ ڈگ
بچہ لوگ بجاؤ تالی

"بچہ لوگ" تو تالی بجاتا ہی ہے۔ مگر آپ بھی اس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں ——— کیا اس کی ڈگڈگی کی آواز میں کوئی جادو ہے جو ہر ایک کو اپنی طرف کھینچے لے رہی ہے

وہ دیکھئے ——— ایک جیب سے اس نے انڈا نکالا۔ اور دوسرے سے ایک رومال ——— زمین پر رومال بچھا دیا اور اس کے بیچ وہ انڈا رکھ دیا۔ رومال کو کونوں سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ دو چار دفعہ ادھر ادھر ہلایا ——— پھر رومال کھول دیا ——— انڈا غائب۔ اور آپ پر ایک حیرت طاری ہو گئی۔

مداری آپ کو یقین دلا رہا ہے کہ اس میں نہ کوئی جادو ہے نہ نظر بندی ——— یہ تو صرف ہاتھ کی صفائی ہے۔
آپ دیکھا ہی کئے اور انڈا اس نے اپنی آستین میں چھپا لیا۔ مگر آپ دیکھ نہ سکے۔
کبھی آپ نے غور کیا ہے۔
ذرا ایک آئینہ اٹھا لیجئے ——— اور اس میں اپنا چہرہ دیکھئے۔ ماتھا۔ ناک۔ کان اور آنکھیں بھی۔
دیکھئے کہیں آپ کی آنکھیں کم تو کھلی ہوئی نہیں ہیں۔

ایک ذرا آنکھ کو اور کھولئے ——— پورے طور پر کھولئے۔ دیکھا آپ نے ——— پہلے آپ کی آنکھ اس سے کم کھلی ہوئی تھی جتنا اس کو کھلنا چاہیئے تھا۔ یہ کم کھلی ہوئی آنکھیں تو آپ کی عادت میں داخل ہو چکی ہیں۔ آپ کی آنکھیں ہر وقت کچھ کم کم ہی کھلی رہتی ہیں۔

اب میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔
یہ نیم وا آنکھیں ——— ایک بیماری ہیں۔
یہ انسان کی بدقسمتی کا باعث ہیں
جو جاگتا ہے وہی پاتا ہے۔

جن کی آنکھیں پورے طور پر کھلی رہتی ہیں ———— وہ دین اور دنیا کی ہر چیز کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں ۔ ان سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہتی — لیکن یہ نیم بند آنکھیں — جب آنکھ ہی بند ہے تو نظر کیا خاک آئے گا ۔

جب آپ سو جاتے ہیں تو آپ کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں ۔

جب آنکھ بند ہوتی ہے تو شعور اپنا کام کرنا چھوڑ دیتا ہے ———— اور دماغ پر لاشعور کی حکومت ہوتی ہے اور

جب آنکھ پورے طور پر کھلی نہ ہوں — تو اسی تناسب سے شعور اپنا کام کم کرتا ہے ۔

اکثر آپ نے دیکھا ہوگا ———— ایک چیز آپ تلاش کر رہے ہیں ———— وہ چیز آپ کے سامنے موجود ہے — مگر نظر نہیں آتی —

ڈھنڈورا شہر میں ۔ لڑکا بغل میں ———— یہ مثل سنی ہے آپ نے ؟

یہ سب ہماری نیم وا آنکھوں کی مہربانی ہے !

آپ اپنی آنکھیں ہمیشہ پورے طور پر کھولئے ۔

جن کی آنکھیں جتنی کھلی ہوتی ہیں ———— اتنا ہی ان کا دل بھی بیدار ہوتا ہے ۔

اور جن کا دل بیدار ہوتا ہے ———— ان کی قسمت بھی بیدار رہتی ہے ۔

آنکھیں کن کی بند ہوتی ہیں ؟

وہ جو سو رہے ہیں !

وہ جو نشے میں مدہوش ہیں !!

لیکن نہ آپ سو رہے ہیں اور نہ آپ پر نشہ طاری ہے ۔

مریض کی آنکھیں بھی پورے طور پر کھلی ہوئی نہیں رہتیں ———— پھر آپ بیمار تو نہیں ہیں ۔

ایک مجرم اور گنہگار کی آنکھیں بھی نیم وا ہوتی ہیں ———— وہ کبھی آنکھ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتا ۔

یہ سب چیزیں آپ کی روزمرہ کی دیکھی بھالی ہیں ———— سمجھی بوجھی ہیں ———— اور اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ نیم وا آنکھیں ایک بیماری ہیں ۔

آپ ذرا آنکھیں تو کھولئے — اپنے گرد و پیش پر ایک نظر تو ڈالئے ۔

یہ بہار کا موسم — نازک نازک کلیوں کا چٹکنا ۔ خوشبو سے لدی ہوئی یہ ہوائیں ۔ دل میں چھید کرنے والی یہ کوئل کی کوک ۔ جگر کو ہلانے والی یہ پپیہے کی "پی کہاں" ۔ یہ بھنوروں کی مستی ۔ سمندر کی یہ مرطوب ہوائیں ۔ اور فضائے بسیط میں پھیلی ہوئی چاندی کی رو پہلی کرنیں ۔

کیا کوئی دلچسپی ہے آپ کے واسطے ان میں ۔

مصور — دیکھئے ان کی کیسی پیاری پیاری تصویریں بنا رہا ہے ۔

شاعر — دیکھئے کیسے دلکش لفظوں میں ان کا نغمہ الاپ رہا ہے

مگر آپ — آپ نے تو کبھی اس کو نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں ۔

اگر آپ کی آنکھیں پوری کھلی ہوتیں ۔ آپ نظر بھر کر ان چیزوں کو دیکھتے ۔ تو آپ کو بھی ان میں وہی لطافت ۔ وہی ملاحت نظر آتی جس کا مصور شیدا ہے اور جس پر شاعر مست ہو رہا ہے ۔

سنا ہوگا آپ نے ——— بابا آنکھیں بڑی نعمت ہیں ——— مگر اس بڑی نعمت سے آپ کام کیوں اتنا کم لیتے ہیں ——— آپ کی آنکھیں ——— تو وہ آنکھیں ہیں جن سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں۔ بڑے بڑے پتھر دلوں کو رام کیا جا سکتا ہے

آنکھ والے تو آپ کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر آپ کے دل کی گہرائیوں میں جھانک لیتے ہیں۔

پوری آنکھ کھلی رکھنے والے — آپ کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر آپ کے عادات و خصلات کا پورا جائزہ لے لیتے ہیں۔

پھر — خدا نے وہی دو آنکھیں آپ کو بھی دی ہیں۔ آپ ان سے پورا کام کیوں نہیں لیتے —

آپ اپنی آنکھیں کم کھلا رکھ کے اپنے جسم اور دماغ دونوں کا ستیاناس کیوں کر رہے ہیں۔

آپ کا حافظہ کمزور ہے ——— آج کل پڑھے لکھوں میں ——— پچاس فیصدی سے زیادہ لوگ اس بیماری کا شکار ہیں۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ان بیماروں میں ۹۰ فیصدی ایسے لوگ ہیں جو "نیم وا" آنکھوں کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ جب وہ نظر بھر کر کسی چیز کو دیکھتے ہی نہیں ہیں تو یہ امید کیوں۔ کہ شعور پر اس کے گہرے نقش مترتب ہوں گے۔ آج آپ اپنی عادت بدل ڈالئے — آنکھیں پوری کھولئے۔ پوری کھلی رکھئے — دیکھئے آپ کے حافظہ کی کمزوری غائب ہو جاتی ہے یا نہیں۔

آیئے آخر میں میں آپ کو ایک تجربہ کراؤں جس سے آپ کو اپنی آنکھوں کی قوت کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔ اور شاید آپ کی زندگی بھر ہمیشہ یادگار رہے۔

دو گملے لیجئے۔ دونوں میں پھولوں کے یا کسی ترکاری کے بیج بو دیجئے — ان میں پانی دیجئے۔ چند دنوں کے بعد دونوں گملوں میں چھوٹے چھوٹے اکھوے نظر آئیں گے۔

اب آپ دونوں کو یکساں پانی دیجئے۔ ایک ہی جگہ رکھئے جہاں یکساں طور پر ہوا اور روشنی ان کو ملتی رہے مگر کسی فرصت کے وقت دونوں میں سے صرف ایک گملے کے سامنے بیٹھ کر۔ بہت دیر نہیں صرف دس منٹ۔ پودے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہیئے — اور دل میں خیال کیجئے کہ یہ پودا بہ نسبت دوسرے کے زیادہ بڑھ رہا ہے۔ آپ پندرہ روز یہ عمل کیجئے۔ پندرہ دن کے بعد آپ دیکھیں گے کہ وہ پودا جس کو آپ نے اس طور پر روزانہ گھورا ہے بہ نسبت دوسرے — زیادہ بڑھ گیا ہے۔

آپ کا یہ تجربہ دوسرے تجربوں کی بنیاد ہو سکتا ہے۔ اگر آپ مسلسل نئی چیزوں پر ایسا تجربہ کر لیں گے تو جاندار تو کیا بے جان چیزوں سے کام لینے لگیں گے۔

دنیا ترقی کا نام ہے۔ ہر چیز لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی ہے۔ پھر آخر آپ کیوں آج اسی جگہ ہیں جہاں بہت عرصہ پہلے تھے۔

وجہ یہ ہے کہ آپ کی زندگی میں بھی بہت سے ایسے موقع آئے تھے کہ اگر آپ فوراً اس کو بھانپ لیتے تو آج آپ کی زندگی کا رخ کسی دوسرے ہی طرف ہوتا۔ مگر آپ کی کوتاہ بینی نے وہ موقع کھو دے۔ وقت گذرنے کے بعد پچھتانا ہمیشہ بیکار ہوا کرتا ہے ——— مگر اب بھی وقت باقی ہے۔ اپنی "کوتاہ بینی" ختم کر دیجئے اپنی آنکھیں پورے طور پر کھولئے — اس کی عادت ڈالئے — پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ کا دل کتنا بیدار ہو جاتا ہے دماغ میں کتنی سوجھ بوجھ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور کچھ ہی دنوں میں آپ کی زندگی بدل جاتی ہے :

کیا آپ اس پر عمل کریں گے — آج ہی سے — بلکہ ابھی سے ✦

ہم کو خط روانہ کرنے سے پہلے ذرا ایک نظر پھر ڈال لیجئے۔ دیکھئے اس میں آپ نے اپنا نام و پتہ بھی لکھ دیا ہے۔ ہمارے پاس کتنے ہی خطوط ایسے رکھے ہیں جس میں خط بھیجنے والوں کے نہ نام ہیں نہ پتے — ان کی تعمیل کیسے کی جائے ؟

مومن کا ایک مشہور مصرعہ ہے

ہمیں یاد ہے سب ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

انور سدید

آپ کا حافظہ کمزور ہے ——— ؟

آپ باتیں جلدی بھول جاتے ہیں ——— ؟

کل شام اکاڈمی کے جلسے میں "آرٹ اور ادب" کے موضوع پر پروفیسر دانیال نے معرکۃ الآرا تقریر کی تھی ۔ اور آپ نے اس کا ایک ایک لفظ بڑے غور سے سُنا تھا ——— آج اس کا ایک لفظ بھی آپ کے ذہن میں نہیں رہا ——— کیوں ؟

اس رات "یوم اقبال" کے سلسلہ میں "ادب کدہ" میں ایک شاندار مشاعرہ منعقد ہوا تھا ۔ اپنی پسند کے شعروں پر آپ نے لہک لہک کر داد دی تھی ——— وہ شعر آج آپ کو یاد ہیں ——— ؟ نہیں ——— !! کیا وجہ ؟ ——— سب نہیں صرف ایک شعر ہی سُنا دیجئے ——— بغلیں نہ جھانکیئے" دیکھئے ——— ۔

"پیراڈائز" میں اس دن ایک انگریزی رومانی فلم دیکھی تھی ——— اس کی کہانی ——— ؟ بھول گئی ——— !! اوہ ——— مگر کیوں ؟

اپنے ایک دوست ——— جگری دوست سے "باغ جناح" میں ملنے کا وعدہ کیا تھا اور وقت کا تعین بھی تو کر کے آئے تھے ——— مقررہ وقت پر اس سے ملنے کے لئے نہیں گئے آپ ——— وعدہ وفا نہیں کر سکے !! ——— کیوں؟ [illegible] ——— بھول گیا تھا بھئی ——— چلئے قصہ ختم ہوا

صبح دفتر جاتے ہوئے بیگم نے آویزے لانے کے لئے کہا تھا ——— شام کو محترمہ کے چہرے کے کنول مرجھائے ہوئے تھے ——— وجہ ——— ؟ انارکلی سے ہی تو گذر کر آئے تھے آپ ——— محبت کے گمبھیر سمندر میں صرف ایک کنکری گر جانے سے طوفان آ گیا ——— کیوں ——— ؟ "بھول ہوگئی بیگم" ——— "چلو مان جاؤ" ——— لیکن بیگم ——— ؟؟

رات آپ سوتے سوتے چونک پڑے ——— اوہ مجھے جغرافیہ یاد کرنا ہے ——— نصف شب تک آپ بڑی مستعدی سے جاگتے رہے ——— جاگتے رہے اور کرسی پر بیٹھے کتاب پر سر جھکائے جغرافیہ یاد کرتے رہے ——— صبح جغرافیہ کے پروفیسر نے پہلا سوال آپ سے ہی کیا ——— اور آپ ——— ؟ ——— گم سم ——— خاموش !!!

امتحان کے لئے الجبرے کے تمام فارمولے حفظ کر لئے تھے ——— لیکن پرچہ دیکھ کر آپ کے حواس کیوں باختہ ہو گئے ——— یہ سب فارمولے ابھی کل آپ کو یاد تھے اور اب ——— "بھول گئے" ——— آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ———

کیوں ؟ ناکامی کا تصور ——— !! مجھے آپ سے ہمدردی ہے ——— دلی ہمدردی ——— !

آپ کُند ذہن نہیں ——— آپ محنت بھی کرتے ہیں ——— آپ کا دماغ بھی درست ہے لیکن پھر یہ ناکامیاں پیہم ——— آخر آپ کے لئے ہی کیوں ہیں ——— قسمت ——— !! ——— میں نہیں مانتا بھئی ——— حافظ بدبخت ——— میں یہ بھی تسلیم نہ کروں گا ——— صرف اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ آپ کے حافظے پر تھوڑا سا زنگ ضرور لگ گیا ہے ۔ لیکن اس زنگ کو کھرچنے کی کوشش کبھی کی ہے آپ نے ؟ سچ سچ بتائیے ——— دیکھئے جھجکئے نہیں ——— "نہیں" ——— کیوں؟ ——— کس کا قصور ہے پھر !!

پروفیسر دانیال کی معرآرا تقریر ۔ مشاعرے میں سنے ہوئے آپ کی پسند کے شعر ۔ پیراڈائز میں دیکھی ہوئی فلم کی کہانی ۔ الجبرے کے فارمولے اور جغرافیہ کے اسباق ——— سب کچھ آپ کے دماغ کے اس حصے میں موجود ہے جسے آپ کا فلسفی دوست "تحت الشعور" کا عنوان دیتا ہے ۔ ——— لیکن آپ تو اس فلسفی دوست کو پاگل ——— اور فاطر العقل کہتے ہیں ۔ اور آپ نے اس سے عجیب و غریب داستانیں بھی متعلق کر رکھی ہیں ——— ابھی اُس روز ایک بھری محفل میں اس بکھرے ہوئے بالوں والے دیوانے کے متعلق آپ نے ہی تو کہا تھا ——— کہ یہ ذات عجیب اپنی چھڑی کو کرسی پر رکھ کر آپ کونے میں جا کھڑے ہوتے ہیں ——— اور منڈیر پر پڑے ہوئے اپلوں کو دیکھ کر سوچتے رہتے ہیں کہ گائے دیوار پر کیسے چڑھ گئی ———

"تحت الشعور" ——— کا نام سُن کر آپ چونک پڑے ——— "لیجئے ان کے دماغ کا یہ نیا شوشہ" ——— اپنے پہلو میں کھڑے دوست کے کان کے پاس منہ لے جاکر بے شک آہستگی سے کہئے ——— لیکن میں آپ کی باتوں کا اندازہ سو فیصدی درست لگا سکتا ہوں ——— آپ کی باتیں سُن نہیں رہا ہوں ——— اندازہ ہے یہ ——— صرف اندازہ ——— کیا ——— سچ یہی کہا تھا آپ نے ——— اعتراف کر لیا نا ——— معاف کیجئے گا میں جوتشی نہیں ——— اور ستاروں کا علم بھی نہیں جانتا ——— اور ہاتھ کی ریکھاؤں کو پڑھنا بھی مجھے نہیں آتا ——— اور عامل و معمول کے ڈھونگ رچا کر من کی باتیں معلوم کرنیکا سلیقہ بھی مجھے نہیں معلوم ——— ———

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ تمام واقعات جو آپ بھول چکے ہیں آپ کے تحت الشعور میں موجود ہیں ۔ صرف آپ کی وہ قوتیں زائل ہو چکی ہیں جن سے یہ واقعات تحت الشعور سے نکل کر شعور کے کینوس پر ظاہر ہو جاتے ہیں ——— ان سلب شدہ قوتوں کو آپ پھر سے حاصل کرنا چاہتے ہیں ——— "نہیں کر سکتے" ——— یہ آپ کا خیال ہے ۔ میں ایسا نہ کہہ سکوں گا ——— "یقین" اور "اعتماد" پیدا کیجئے ——— یہی اس سلسلے کی پہلی کڑیاں ہیں ———

لیجئے یہ کتاب پڑھیئے ——— اس میں نفسیات کی مبادیات پر بحث کی گئی ہے ——— پہلے ہی صفحے پر ڈاکٹر ملر کا ایک نظریہ ہے ۔

"بدمزاجی دماغ کے غیر متوازن تحرک کا نام ہے !"

ملر سچ کہتا ہے آپ کو اعتراف ہے ——— اسے پھر پڑھیئے ——— ایک بار پھر ——— ملر کا مقولہ آپ کے تحت الشعور یا دوسرے لفظوں میں دماغ کے سٹور روم میں محفوظ ہو گیا ——— جی نہیں ——— ابھی نہیں ——— پانچ بار پڑھیئے ——— دس بار دوہرائیے ——— اپنے دوستوں کے سامنے یہ نظریہ پیش کیجئے ——— اس پر تنقید و تبصرہ کیجئے ——— اس کے متعلق سوچئے ——— دس دن کے بعد ذہن پر زور ڈالئے ——— دماغ کو ٹٹولئے ———

مثر کا نظریہ ——— ؟ کیا تھا بھلا ——— بدمزاجی کے متعلق ——— جی ہاں بدمزاجی کے متعلق ——— آپ کو یاد آ گیا ——— خوف ——— دماغ کا زنگ تھوڑا سا اتر گیا ہے

آپ اپنے دوستوں کو جلدی بھول جاتے ہیں ——— ان کے چہرے آپ کو یاد نہیں رہتے ——— یہ سامنے جو شخص آ رہا ہے آپ اسے جانتے ہیں ——— ؟ نہیں ——— لیجئے وہ آپ کی طرف ہی آ گئے ——— تعارف ہوا ——— ان کا نام دوہرائیے ——— ایک بار ——— دو بار ——— دس بار ——— انہوں نے ایک لطیفہ کہا ——— آپ کھلکھلا کر ہنس پڑے ——— آپ کا اجنبی دوست رخصت ہوا۔ لیکن یہ لطیفہ آپ کے ذہن میں ابھی تک گونج رہا ہے ——— اور ان کا نام ——— وہ بھی تو یاد ہے آپ کو ——— تصور کے کینوس پر ان کی تصویر لائیے ——— ان کا نام دوہرائیے ——— بار بار ——— جارج واشنگٹن اپنی فوج کے ادنیٰ سپاہیوں کے نام بھی جانتا تھا ——— اور واجد علی شاہ تو اپنے کبوتروں کے نام تک نہیں بھولتے تھے ——— آپ کیونکر بھول سکتے ہیں پھر

ریلوے اسٹیشن پر آپ کو وہی دوست کئی مہینوں کے بعد ملے ——— تحت الشعور میں چھپی ہوئی تصویر اُبھر آئی ——— ان کا نام آپ کے دماغ کی سطح پر رینگا ——— آپ بڑھ کر ان سے بغلگیر ——— اور وہ لطیفہ ——— ہاں ابھی وہ لطیفہ آپ کو آج تک یاد ہے ——— کتنا قہقہہ انگیز لطیفہ تھا ———

آج آپ کو فرصت ہے ——— بیکار وقت گذارنے کو جی نہیں چاہتا ——— ماضی کی دھندلاہٹوں کو پھیکا نہ پڑنے دیجئے انہیں اجاگر کرنے کے لئے سوچئے ——— دماغ پر زور ڈالئے ——— اپنے بچپن کے دوست ——— یہ غضنفر ہیں ——— یہ اسد ——— یہ جارج، وہ عزیز، ادھر اشوک ——— اوہ آپ موہن ——— سب آپ کو یاد آ رہے ہیں اور پندرہ برس پہلے کی باتیں بھی ——— شوکت کو سائنس کے ماسٹر "عالمگیر" نے کس زور سے قینچی ماری تھی ——— "اسد" سے سکول کمپاؤنڈ میں اسی دن لڑائی ہوئی تھی ——— بڑا سخت مقابلہ تھا "عزیز" کے ساتھ ——— عمومی طور پر وہ جیت ہی نہ سکا ——— موہن کو تواریخ میں اوّل آنے پر انعام ملا تھا ——— اور وہ تقریروں کا مقابلہ ———

بڑے مزے میں وقت گذرا ——— کتنی بھولی ہوئی باتیں یاد آ گئیں ——— کتنے بچھڑے ساتھیوں سے ملاقات ہو گئی ——— اور اب آپ روز ایسا ہی کرتے ہیں ——— تحت الشعور پر چھایا ہوا زنگ اتر رہا ہے۔ آپ کے دماغ کو پھر جلا مل رہی ہے ——— اب آپ کو شعر جلدی یاد ہو جاتے ہیں ——— اور تقریروں کے حوالے بھی تو خوب دیتے ہیں آپ ——— دوستوں کے وعدے حساب کے فارمولے ——— اور بیگم کی فرمائشیں ——— اور ——— اور

جی ہاں ——— جی ہاں ——— آپ کا ذہن رسا ہے اور آپ کا دماغ ——— معاف کیجئے میں ابھی نفسیات کی مبادیات کا طالب علم ہوں ——— اور آپ ———

آپ کو معلوم ہے ناکہ آپ کی زندگی میں تاریک گوشے بھی ہیں جو آپ کو قدم قدم پر تنگ کرتے ہیں ——— لیکن یہ کونسے تاریک گوشے ہیں ———

لیجئے ۔ کلیاں بھی کچھ سکھارہی ہیں آپکو

زریتہ عذرا جعفر

بہار پھولوں سے کھیل رہی تھی، اور کلیاں تھیں کہ پھول بنی جا رہی تھیں ۔

ادہر سے کہیں آپ کا گذر ہوا

کلیوں نے پکارا، آپ ٹھہر گئے ۔ بولیں

آؤ ——— میں تمہیں اپنے راز بتاؤں، اپنے روپ، اپنے رنگ، اپنی خوشبو کے راز!

آپ کو یہ للکار عجیب معلوم ہوئی ۔

آپ نے ان کے راز سنے

——— سوچنے لگے

کسی کی امیدوں کی کلیاں بھی تو پھول بن سکتی ہیں ۔ اگر آپ کی سوئی ہوئی قوتیں کوئی زندگی پھونک دے ۔ ؟

آپ اور بھی بہتر زندگی نہیں گذار سکتے اگر واقعی آپ جدوجہد کریں اور اپنے راستے ہموار کریں ؟

آپ کلی کے اور بھی قریب گئے ۔ اور ان کو اور بھی غور سے دیکھنے لگے ۔

وہ خیال آپ کے دل میں گھر کرتا گیا، اور بھی گہرا، اور گہرا ۔

فطرت کی لامتناہی قوتیں ازل سے آپ پر بھی تو اثر کر رہی ہیں ——— قوتیں، جو بیج سے پودا اگاتی ہیں ۔ کلیاں نکالتی ہیں اور ان کو پھول بناتی ہیں

لیکن آپ نے ان کے متعلق غور بھی کیا ہے کبھی ؟

آپ تو یہ سوچتے رہتے ہیں کہ فطرت آپ کو ڈھال چکی، آپ اپنی تکمیل پا چکے، اب اور کچھ باقی نہیں ہے ۔ کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں

یہ خیال حقیقت سے کوسوں دور ہے ۔

قدرت بڑھتی رہتی ہے، آپ کو بدلتی رہتی ہے ۔ آپ کو ڈھالتی رہتی ہے ۔ آپ کو کچھ اور ہی بناتی رہتی ہے ۔

اوہ، تب تو آپ اپنی تکمیل کی حدود تک نہیں پہنچے، آپ کو ابھی کچھ اور سیکھنا ہے، کچھ اور کرنا ہے ۔

اور آپ، جو اپنے کو "حرف آخر" سمجھتے تھے، ہنس دیے ۔ ایک تلخ ہنسی !

دیکھا، کلیوں نے آپ کو حیرت زدہ کر دیا نا، اور ان کے خاموش پیغام نے آپ کے ذہن کو الجھا لیا اپنے میں ؟ اور آپ سوچنے لگے کہ

واقعی میں آپ اپنے ساتھ اور زندگی کے ساتھ، دونوں کے ساتھ ظلم کر رہے تھے۔ آپ کا نہ اپنے ساتھ رویہ ٹھیک تھا نہ زندگی کے ساتھ۔ اور یہی وہ دیواریں تھیں جو آپ کی ترقی کی راہ میں حائل ہو رہی تھیں۔

آپ زندگی کو محدود سمجھتے تھے۔ کبھی غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہے۔ بدلتی ہے۔ اور نئے روپ، نئے رنگ اختیار کرتی ہے۔

اور آپ کو حق ہی کیا تھا کہ آپ اپنی موجودہ منزل کو اپنی آخری منزل سمجھ لیں

اسی لئے تو آپ ہر وقت بے چین رہتے تھے۔ اور آپ کی اندرونی قوتیں اندر ہی اندر تڑپتی تھیں اور اپنے اظہار کے مواقع ڈھونڈتی تھیں۔

ان کلیوں نے تو ایک "نئی صبح" کی پیشن گوئی کر دی۔

اب جب آپ کا رویہ ہی بدل جائے گا تو آپ کی زندگی بھی رنگا رنگ رنگوں میں بدلے گی۔

نئے نئے خیالات پیدا ہوں گے اور آپ کی قوتیں جو ابتک زنجیروں میں گرفتار تھیں۔ وہ خود آپ کو حیران کر دیں گی۔

اور جیسے آپ کو کچھ ہو جائے گا۔

اور آپ یہ محسوس کریں گے کہ آپ جدوجہد کرنے اور نئی نئی راہیں پیدا کرنے سے اپنے کو روک ہی نہیں سکتے۔ چاہے آپ کو اپنے راستہ نہ کرنے کی عادت ہی کیوں نہ پڑ گئی ہو۔

کیونکہ

قدرت کے یہ طریقے تو ازل سے یوں ہی چلے آ رہے ہیں۔

اور پھر ——— آپ کی اندرونی قوتیں تو آپ کو نقصان پہنچانے سے رہیں، پھر ان کو زنجیر بپا کرنے سے فائدہ؟ اتنے عرصہ تک غیر موجود امکانات سے ڈرنے کا نتیجہ ——— شرمندگی ہوئی نا؟

اور آپ نے ایک گہری، ایک لمبی سانس لی

اور آپ پر ایک جذبہ طاری ہونے لگا جیسے فطرت کی قوت نمو نے آپ پر سحر کر دیا ہو۔

آپ سوچنے لگے کہ ابھی تو ایک کلی آپ کو اشارہ کر رہی تھی

اونہہ، کرنے دیجئے، ہو سکتا ہے کہ آپ اب تک شک و شبہ کے دھندلکوں میں رہے ہوں۔

بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ بہت اچھا ہوا۔ جو آپ تاریکیوں سے نکل کر روشنی میں آ گئے، اور اب فطرت اپنے کرشمے دکھائے گی۔ اور یہ کلیاں جو یوں اٹھکیلیاں کر کے آپ کو کچھ سکھا رہی ہیں۔ آپ سے کہیں گی

اے بھیا انسان ——— ہماری بہار تو صرف بہار تک ہے، لیکن تمہاری بہار

بتاؤ نا، کیا راز ہے؟

مستقل عنوان

بات چیت

فرد، فرد کی "بات چیت" سے لاشعوری طور پر متاثر ہوتا ہے ——

'کچھ کہئے کچھ سنیئے ——— کہنے سننے سے جی کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے

بات چیت کا یہی مقصد ہے اور بس ۔ دیکھئے ۔ کیا ہم آپ کے لئے مفید

ہیں ———

لیکن سوالات کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیئے ۔ کہ آپ کے سوالات مبہم نہ ہونے پائیں ۔ اگر سوالات خود آپ کی ذات تعلق رکھتے ہوں ۔ تو اپنی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ بھی لکھیئے ۔ تاکہ ہم آپ کا صحیح مفہوم سمجھ سکیں ۔ اور آپ کے مسائل کا صحیح نفسیاتی تجزیہ بھی کر سکیں ۔ (آپ کی یہ مختصر سوانح صیغۂ راز میں رہے گی ۔۔ محض سوالات شائع کئے جائیں گے)

ہے آپ کی خاطر ہمیں منظور بہر طور ادارہ

ن صدیق ۔ راولپنڈی

احساس کمتری کو کیونکر دور کیا جا سکتا ہے جبکہ ایک انسان کسی خاص قابلیت یا بہتر اہلیتوں کا حامل نہ ہو؟

آپ کے سوال کا دوسرا حصہ ہم پہلے لیتے ہیں ۔ سوال پیدا یہ ہوتا ہے کہ ایک انسان کسی خاص قابلیت یا بہتر اہلیتوں کا حامل کیوں نہیں ہے ———؟ اس کے تین وجوہات ہو سکتے ہیں ! ۔

(ا) ہر معقول انسان میں تمام وہ اہلیتیں اور قابلیت ہوتی ہے جو دوسرے معقول انسانوں میں ہوتی ہے جس کو کام میں لا کر دوسرے لوگ ترقی کے مدارج طے کرتے ہیں ۔ صرف ظلم یہ ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو ایسے مواقع ملتے رہتے ہیں کہ وہ اپنی ان اہلیتوں سے فائدہ اٹھا کر زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھ جاتے ہیں برخلاف اس کے دوسرے لوگ جو انہیں اہلیتوں کے حامل ہوتے ہیں مگر ان کو یہ مواقع نہیں مل پاتے جس کی وجہ سے وہ بد دل ہو جاتے ہیں اور ایک ناکامی کا احساس خود میں پیدا کر لیتے ہیں ۔ ماحول کو موافق کرنے کی بجائے وہ کوتاہیاں اپنے میں ڈھونڈھ لیتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ اہلیت ان میں نہیں ہے ۔ حالانکہ اصل وجہ خارجی ماحول کا موافق نہ ہونا اور صحیح موقعوں کا نہ ملنا ہے ۔

(ب) بعض انسان فطرتاً تخلیقی قوتوں کے حامل ذہین اور کسی خاص وصف کے حامل ہوتے ہیں ۔ جس کی مدد سے وہ اپنے مخصوص شعبے میں دوسروں پر سبقت لے جاتے ہیں ۔۔ مثلاً ایک شخص گانے میں بہت ماہر ہے اسکی وجہ اس کا گانے سے فطری لگاؤ ہے ۔۔ ایک شخص بہت اچھا مصور ہے یہ بھی پیدائشی امر ہے ۔ گانے والا اچھا مصور نہیں ۔ مصور اچھا گانے والا نہیں اس کی وجہ اس کی پیدائشی فطرت ہے نہ کہ اکتسابی کامیابی

یا ماحولی موافقت۔

(ج) بعض لوگ چند علامتوں کو دیکھ کر اپنی شخصیت کا غلط اندازہ لگاتے ہیں اور محض چند کوتاہیوں کے باعث اپنے تئیں "اخلاقی اچھوت" سمجھنے لگتے ہیں۔ اس احساس کمتری کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم صرف اعتقاداً یا عقیدتاً بہت سی باتیں اور خوبیاں دوسروں کو بخش دیتے ہیں اور فیصلہ ہمیشہ ان کے حق میں کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ خوبیاں ان میں موجود نہیں ہوتیں ۔۔ ہم اپنی صلاحیتوں کو کم کر کے اپنی تحقیر کا جرم کرتے اور دوسروں کو خواہ مخواہ بلند مقام دیدیتے ہیں اور پھر ان کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں یوں ہم اپنے اندر وہ برائیاں اور کمیاں دیکھنے لگتے ہیں جنھیں ہم نے دوسروں میں بڑائی بنا کر دیکھا ہے۔

اب ہم سوال کا پہلا حصہ لیتے ہیں کہ احساس کمتری کو کیونکر دور کیا جا سکتا ہے۔

اگر احساس کمتری کی وجہ (ا) ہے تو ہم کو چاہیئے کہ خارجی ماحول کو موافق کرنے کی کوشش کریں تاکہ ہم کو بھی صحیح موقعے اپنی صلاحیتوں کو کام میں لانے کیلئے ملیں۔

اگر وجہ (ب) ہے تو اس کا حل صرف یہی ہے کہ کوشش اور مشق سے ہم بہت کچھ ایک وصف اپنے میں پیدا کر سکتے ہیں ۔۔ حالانکہ ہم اس درجہ پر نہیں آسکتے جہاں ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو فطرتاً ایک وصف لے کر پیدا ہوتا ہے۔

اور اگر احساس کمتری کی وجہ (ج) ہے تو ہم کو چاہیئے کہ محض عقیدتاً یا معمولی بات سے متأثر ہو کر دوسروں کے اوصاف کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر نہ دیکھیں اور اپنی تحقیر خود نہ کریں ۔۔ ہم کو خود پر اعتماد کرنا چاہیئے محض چند کوتاہیوں کی بنا پر اپنی تذلیل خود کرنا بڑی غلطی ہے۔ یہ ہماری غلطی ہے بھول ہے۔ ہمیں اس گمراہ کن عینک کو ہٹا دینا چاہیئے تاکہ ہم اپنی ذات میں تاریکی کی بجائے روشنی دیکھنے لگیں اور اپنی تخلیقی قوتوں کو جان سکیں۔

۲۔ خواب کی حقیقت کیا ہے ؟ ۔ میرے خیال میں علم النفس خواب کو لاشعور میں جاگزین خیالات یا اعتقادات کا پرتو تصور کرتا ہے مگر مشاہدہ کی رو سے خوابوں میں بسا اوقات مستقبل کے متعلق گہرے اشارے موجود ہوتے ہیں جو وقت آنے پر صحیح ثابت ہوتے ہیں ۔ ان خیالات میں کیا تطابق ہے ؟ نیز یہ بھی تحریر فرمایئے علم التعبیر کیا چیز ہے ؟ ۔

ہمارے خیالات و تصوّرات کی طرح خواب بھی ہمارے ذہن کی پیداوار ہیں، باہر سے نہیں آتے ۔۔ خیالات اور خواب میں فرق اتنا ہے کہ جاگتے میں خیالات چھاتے ہیں اور سوتے میں یہی تصورات اور خیالات خواب بن جاتے ہیں ۔ جو خیالات جاگتے میں باہر نہیں آپاتے اور جن کو شعور لاشعور میں دبائے رکھتا ہے سوتے میں باہر آنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایک حد تک کامیاب ہوتے ہیں کیونکہ سونے کی حالت میں لاشعور کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے ۔۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ آیا خواب مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کرتے ہیں یا نہیں ؟ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ خواب آنے والے واقعات کی قبل از وقت خبر دیتے ہیں مگر اس پر تعجب اور حیرت کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ یہ اشارے یا پیشین گوئی بھی خود ہمارے خیالات کا نتیجہ ہوتی ہے اور جب ہوتا وہی ہے جو ہم پہلے ہی خواب میں دیکھ چکے ہوتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے ۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم سوچتے ہیں خواب اس کا الٹا نظر آتا ہے مگر اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو ہم سوچتے ہیں ویسا ہی خواب دیکھتے ہیں ۔۔ فرض کیجیئے کچھ لڑکوں کا امتحان ہوا ۔ کچھ لڑکوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ کامیاب نہیں اور کچھ نے دیکھا وہ کامیاب ہو گئے ۔ آخر کچھ دن بعد نتیجہ نکلنے پر سب کامیاب ہوتے ہیں تو اب وہ لڑکے جنہوں نے خواب میں خود کو ناکام دیکھا تھا یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ خواب سچے نہیں ہوتے ۔ مگر وہ لڑکے جنہوں نے خواب کو اپنے نتیجے کے موافق پایا خواب کی پیشین گوئی پر یقین کرنے لگتے ہیں حالانکہ دونوں نے خواب اپنے اپنے خیالات کے ماتحت دیکھے تھے ۔ ایسا خواب جو بعد کو صحیح ثابت ہوتا ہے اصل میں ہمارے اس واقعے کے پہلے علم کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ایک شخص نے خواب میں خواجہ اجمیر شریف کی درگاہ کو دیکھا کافی عرصہ کے بعد جب وہ واقعی اجمیر گیا تو اس کو بڑا تعجب ہوا کہ وہ درگاہ واقعی ویسی تھی جیسی کہ وہ بہت سے خوابوں میں دیکھ چکا تھا ...

(باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ ہو)

جنسیات

مرد جب شادی کرتا ہے

مسز محمودہ نسرین ایم اے

شادی سب ہی کرتے ہیں، مرد بھی، عورتیں بھی۔ اور شادی زیادہ تر مردوں اور عورتوں کے نزدیک "فرض" ہے۔ زیادہ اہمیت نہیں
رکھتی۔ چونکہ مذہب نے شادی کرنے کو کہا ہے — اور سماج نے شادی کا رواج قایم کر دیا ہے — چونکہ سب ہی شادی کرتے ہیں۔
پھر مجھے بھی کرنا چاہیئے۔ اور بس، اسی لئے شادی کے لئے اور تمام اہتمام تو کئے جاتے ہیں۔ کپڑے بنتے ہیں، گہنے خریدے جاتے ہیں، جہیز مہیا کیا
جاتا ہے۔ مگر جنسی تعلیم کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی کم از کم مرد تو بالکل نہیں سمجھتا۔ وہ جانتا ہے کہ مفت میں ایک "جسم" قبضہ میں آ رہا ہے۔ مز.
کریں گے۔ دن بھر دوڑنے دھوپنے میں گذرتا ہے شام کو ہاتھ پیروں میں درد ہونے لگتا ہے۔ اس لئے اُس "جسم" سے اپنی تھکاوٹ دور
کریں گے۔ کبھی دل چاہتا ہے کہ کوئی ایسا ہو جس پر ہم حکومت کریں۔ تو اس "جسم" پر حکومت کریں گے، جس طرح چاہیں گے اور جب چاہیں گے۔
چھوئیں گے، چومیں گے، چاٹیں گے ———— شادی ہو جاتی ہے۔ اب خوب خوب ہاتھ پیروں کی تھکاوٹ دور کی جا رہی ہے
حکومت جتائی جا رہی ہے چوما چاٹا جا رہا ہے۔ کچھ مہینوں کے بعد "بچہ" پیدا ہو گیا۔ اور مصیبت آ گئی۔ بیوی بچہ میں لگی رہتی ہے۔ بچہ بیمار رہتا ہے
جو روپیہ سگرٹ چائے پر خرچ ہوتا تھا، وہ ادھر برباد ہوا جا رہا ہے۔ بیکار شادی کی، بیکار شادی کی ———— کچھ کی شادی
کے کئی سال گذرنے پر بھی "بچہ" پیدا نہیں ہوتا، دل میں جو ایک ہی جسم سے اکتاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنی بھڑاس اس طرح نکالتی ہے۔ کہ عورت
بیچاری بانجھ سمجھی جاتی ہے۔ کلموہی اور منحوس کہی جاتی ہے۔ میاں کو اگر نہیں تو ساس کو دوسری بہو کی فکر پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری بہو بھی
آ گئی۔ اور بیٹا غائب، پوتا غائب۔

وجہ یہ ہے کہ جنسی تعلیم کے فقدان سے کبھی کبھی بچوں کا ایک طوفان چل پڑتا ہے، آمدنی ہے کم، اور خرچ ہے زیادہ، بچے ہیں۔ اچھے بھی
رہتے ہیں۔ بیمار بھی پڑتے ہیں۔ بیماری معمولی بھی ہوتی ہے خطرناک بھی۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو تعلیم کی ضرورت ہے۔ اور تعلیم کے لئے
ہمارے ملک میں روپے کی ضرورت ہے۔ اور روپیہ ہر ایک کے ہاتھ لگتا نہیں، وہ تو چند اِنے گنے سیٹھوں کی میراث بن گیا ہے، اور دوسری
طرف یہ حالت ہے کہ بال سفید ہوئے جاتے ہیں۔ بچہ پیدا نہیں ہوتا، کوئی بھی ایسا نہیں جو بڑھاپے کا سہارا بنے۔ غرضکہ عجیب بے کیفی، عجیب
کھلبلی، عجیب گڑبڑ مچی رہتی ہے ———— ممکن ہے کہ کچھ لوگ کہیں کہ اولاد تو خدا کی دین ہے، میں کہوں گی خدا کی دین کیا
چیز نہیں ہے۔ سب ہی کچھ ہے۔ لیکن آپ کو بھی تو ہاتھ پیر ہلانے کو کہا گیا ہے صحیح اقدامات اٹھانا آپ کا کام ہے نہ کہ معاذ اللہ خدا کا۔

ہاں — تو مرد جب شادی کرتا ہے۔ تو اس کو بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ جو جسم اس کو سونپا جا رہا ہے اور جو زندگی اس سے وابستہ
کی جا رہی ہے۔ وہ اس کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھے۔ کہ دونوں کی زندگی آرام سے گذرے۔ وہ اس جسم کے ساتھ ایسے ہی کھیلنے لگتا ہے جیسے
بچہ کھلونوں سے کھیلتا ہے۔ کھلونے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس لئے زیادہ تر عورت کا جسم بھی "ٹوٹ" جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کا دل بھی،
اس کی امیدیں بھی، اس کی تمنائیں بھی۔ عورت بیچاری تو ایسے شکنجوں میں گرفتار رہتی ہے۔ کہ اسے کہاں موقعہ کہ وہ کتابیں پڑھے۔ لیکن مرد ——

وہ تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ نہیں کرتا۔ وہ سوچتا ہے۔ کہ جب شادی ہوگی۔ ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ، اور جب تک شادی نہیں ہوتی ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے۔ ٹھیک ہی ہو رہا ہے شادی کے بعد اگر سب کچھ ٹھیک نہ بھی ہوا تو اس کا کیا۔ آنسو بہائے گی، تو عورت۔ اپنی جان دے گی تو عورت۔ سب الزام رکھیں گے تو عورت پر۔

"کیوں میاں۔ اتنے دن ہو گئے۔ بچہ نہیں ہوا؟"

"کیا کروں چچا، جورو ایسی ہے کہ ——— اب آپ سے کیا کہوں ———"

چچا چپ

"سنا تم نے، فلاں کی بیوی بانجھ ہے بانجھ"

اور سننے والے گردن ہلا رہے ہیں ——— ہوگی، ہاں ہوگی، تم کہتی ہو تو ضرور ہوگی، ہمیں کیا معلوم۔

اور ہوتا یہ ہے کہ مرد بانجھ واقع کچھ بھی نہیں۔ اور لگاتا ہے الزام عورت پر، قسمت پر، شادی ٹھہرانے والوں پر، اور کبھی کبھی خود اس عورت پر کہ اس نے اس سے کیوں شادی کی، جبکہ وہ ایسی ہی تھی۔ وہ کہتا ہے۔ میری بیوی سنگلاخ زمین ہے۔ بیج بوتے رہو، کوئی فصل نہ اُگے گی۔ میں اُسے پیار کرتا رہتا ہوں۔ اور وہ یوں ہی بے حس رہتی ہے۔ اور مزا یہ ہے کہ جب میں پیار ختم کر چکا ہوتا ہوں تو وہ پیار کرنا چاہتی ہے۔

اگر مرد چاہتا ہے کہ وہ ازدواجی زندگی آرام سے گذارے۔ اپنی حسب خواہش اولادیں پیدا کرے اور ہر وقت بیوی کا چہرہ کنول کی طرح مسکراتا رہے۔ تو اسے عورت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کی جنسی شدت، اس کی جنسی تحریک کو جاننے کی ضرورت ہے۔ اور وہ تمام کی تمام باتیں بہت آسانی سے جان سکتا ہے۔ اگر وہ عورت کو محض اپنی "لذت" کا ذریعہ نہ سمجھے۔ اور جنسی فعل کو "وحشت" دُور کرنے کے لئے وقف نہ کر دے۔

بازار میں کتابیں موجود ہیں۔ اچھی بھی ہیں۔ بُری بھی۔ کتابوں کو پڑھئے۔ جن دوستوں کی شادی ہوگئی ہے۔ اور جو شادی کے بعد بہت خوشگوار زندگی گذار رہے ہیں۔ جو اپنی بیوی کو اچھی طرح سمجھ چکے ہوتے ہیں کہ وہ کیا کیا چاہتی ہے۔ اور اس کی خواہشوں کی کس طرح تکمیل ممکن ہے۔ ایسے لوگ بڑی خوشی سے اپنے تجربات کی روشنی میں مشورہ دے سکتے ہیں۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو۔ اور یوں ہی انجان پن میں شادی ہوگئی ہے۔ تو بیوی کو رازدار بنانے میں بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ حالانکہ عورت تو اور بھی تاریکی میں رہتی ہے۔ اس کو "باعصمت" رکھنے کے لئے اس کے ماں باپ، اس کے کانوں کو بند کئے رہے ہیں۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھے رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی دونوں کی باہمی محبت دشواریوں کا حل نکال سکتی ہے۔ پھر دونوں شادی کے بعد کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں کے لئے جاننا اور سمجھنا ضروری ہے کہ قدرت نے جنسی رشتے ہی کو نسل کی بقا کا ذریعہ بنایا ہے۔ اگر جنسی فعل کی منزل "اولاد" نہیں ہے اور محض پیاس کی آسودگی ہے۔ تو اس کے لئے کچھ احتیاطی اشیاء استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اگر منزل مقصود "اولاد" ہے تو عورت کو بھی پوری طرح آمادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ڈاکٹر مسز آر خانم اپنے مضمون میں لکھ چکی ہیں کہ عورت کی جنسی تحریک ذرا دیر میں بیدار ہوتی ہے۔ اور بیدار ہونے کے بعد اگر وہ تشنہ رہ جاتی ہے۔ تو عورت ہسٹریا، اور دوسری جنسی بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

لیکن مرد کو کیا، وہ تو شادی کر کے سمجھتا ہے کہ وہ عورت پر احسان کر رہا ہے، بہت بڑا احسان ❊

(**بقیہ ص ۲۵**) اس کے تجزیہ کے بعد یہ پتہ چلا کہ درگاہ کی صحیح شکل خواب میں نظر آنے کی ذمہ داری بہت کچھ اس کی پہلی معلومات پر مبنی تھی۔ آپ اس نتیجہ پر ضرور پہنچے ہوں گے کہ خواب آنے والے واقعات کی طرف اشارے ضرور کرتے ہیں مگر یہ اشارے خود ہمارے ذہن ساختہ ہوتے ہیں نہ کہ معجزہ یا روحانیت کا اثر جیسا کہ عام طور پر لوگ خیال کرتے ہیں۔ علم تعبیر کے معنی وہ علم ہے جس کی مدد سے ہم یہ معلوم کر سکیں کہ خواب نظر آنے کی اصل وجہ کیا ہے یا وہ کونسی خواہش ہے جسکی اکساہٹ کی وجہ سے خواب نظر آیا ہے اور وہ کس طرح بھیس بدل کر شعور پر آتی ہے۔ یہ ایک وسیع علم ہے اور زیادہ معلومات کے لئے خواب اور تعبیر خواب پر کوئی کتاب پڑھنے سے وضاحت ہو سکتی ہے ❊

مستقل عنوان

بھولوں کیسے

لیجئے ــ اپنے ساتھیوں کی زندگی کے ناقابل فراموش واقعات پڑھیئے ــــ آپ بھی اپنی زندگی کے ایسے حادثے لکھ کر بھیجئے ــ جن کو آپ بھول نہ سکتے ہوں ـــــــ دوسروں کو سنانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے ـــ اور باہمی رفاقت بڑھتی ہے ـــــــــــــ ادارہ

صابر ۔ بی اے

متعلقہ افراد سے معذرت کے ساتھ

آج بھی جب کبھی اس کی شکل سے ملتا جلتا کوئی آدمی نظر آتا ہے تو تمام دبی ہوئی حقارت پھر ابل پڑتی ہے اور ہر طرف تعفن محسوس ہونے لگتا ہے ۔ اس کے پچکے پچکے گال ـ پوپلا منہ، سر، ابرو اور چہرے پر سفید بال، سب مل کر کچھ ایسا مجموعی تاثر پیدا کرتے ہیں کہ فضا میں گندے انڈوں کی بساندسی محسوس ہونے لگتی ہے اور طبیعت مالش کرنے لگتی ہے ۔ اس کے علاوہ جب کوئی بچہ کسی کو "نانا" کہتا ہے تو بھی یہی کیفیت طاری ہوتی ہے اور تمام پچھلی کریہہ یادیں رینگ رینگ کر شعور پر آجاتی ہیں اور پھر وہی حقارت کا جذبہ جاگ جاتا ہے

تعلیم کے سلسلے میں جب مجھے لکھنؤ جانا پڑا تو اپنی مالی حالت کی کمزوری کی وجہ سے ہاسٹل میں نہ رہ سکا بلکہ ایک کوارٹر کرائے پر لے لیا جو یونیورسٹی سے قریب تھا ۔ ہمارے کوارٹر کے بالکل مقابل کوارٹر میں ایک خاندان رہتا تھا جس میں ایک "بزرگ" تھے جن کی عمر تقریباً ۶۰ سال ہوگی ـ ایک ان کی لڑکی جس کی عمر کوئی ۴۵ سال ہوگی ـ ان محترمہ کے ۹ بچے تھے جو ایک دوسرے سے دو دو سال چھوٹے تھے ـــــــــ لڑکیوں میں سب سے بڑی کی عمر قریب گیارہ سال تھی اور دوسری کی عمر ۹ سال ـ کچھ دنوں کے بعد ان کے خاندان سے ربط پیدا ہوگیا اور وہ لڑکیاں میرے پاس اکثر آتی رہتیں ـ فرصت کے اوقات میں میں ان سے بچوں جیسی باتیں کیا کرتا ان کو طرح طرح ہنساتا ان کے ساتھ کھیلتا جس کی وجہ سے وہ مجھ سے بہت مانوس ہوگئی تھیں ـ وہ بھی اکثر فلمی گانوں کی نقل کر کے مجھے سنایا کرتیں ـ کبھی کبھار وہ شرماتے شرماتے مجھ سے کسی چیز کی فرمائش بھی کیا کرتیں ـ کبھی ربن ـ تو کبھی کوئی اور معمولی چیز ـ

لڑکیاں قطعی نابالغ تھیں اور دنیا کے نشیب و فراز سے ظاہراً ناواقف معلوم ہوتی تھیں ـــ ان کی ماں دن بھر نوکری پر رہتی ـ بڑے بھائی بھی کاروبار میں لگے رہتے ـ گھر پر یہ بچیاں صرف اپنے 'نانا' کی سرپرستی میں رہتیں یہ بات میں اکثر محسوس کرتا کہ وہ بچیاں گھر کے اندر بہت کم رہتی ہیں اور عموماً یا تو اپنی سہیلیوں میں کھیلا کرتیں یا میرے پاس آجایا کرتیں ـ ان کے 'نانا' ان کو گھر پر رہنے کی تاکید کیا کرتے مگر وہ ایک نہ سنتیں

کبھی کبھی میں ان سے پوچھتا کہ تم دونوں گھر سے اتنا باہر کیوں رہتی ہو؟ تمہارے 'نانا' تم دونوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں مگر تم ان کا کہنا نہیں سنتیں ـ ؟ آخر کیوں ؟ وہ جواب دیتیں " بھائی جان ہمیں گھر میں اچھا نہیں لگتا ہے ـ ہمیں 'نانا' سے بہت ڈر لگتا ہے ۔ ہمارے نانا بہت برے ہیں " میں یہ سمجھتا کہ چونکہ ان کے 'نانا' ان پر تنبیہ کرتے ہیں اس لئے یہ بچیاں ان سے بدگماں ہیں ـ

ایک دفعہ بڑے دن کی چھٹیوں میں میں گھر جانے لگا تو اپنی

بہن کے لئے بازار سے ایک جوڑ ٹوپس لے آیا - ان بچیوں نے جب ٹوپس دیکھے تو بہت پسند کئے اور اپنے لئے بھی فرمائش کی - میں نے ایک ایک جوڑا ان کو بھی لا دیئے - اپنی پسندیدہ چیز پا کر وہ بہت خوش تھیں - مگر ساتھ ہی متفکر بھی - آپس میں چپکے چپکے --- باتیں کرنے لگیں کہ "نانا" پوچھیں گے تو کیا بتائیں گے کہ یہ ٹوپس کہاں سے ملے - اور پھر لپٹے نانا کو کوسنے لگیں -
مجھے بہت غصہ آیا اور ترشی سے کہا " تم لوگ بہت بدتہذیب ہو بزرگوں کو کیوں گالیاں دیتی ہو ؟ میں تم سے نہیں بولا کروں گا - کیونکہ ممکن ہے تم مجھے بھی برا بھلا کہتی ہو " اس پر وہ روہانسی سی ہوگئیں اور کہنے لگیں کہ " بھائی جان بہت بری بات ہے جس کے کہنے سے ہمیں شرم آتی ہے ہمارے نانا اسی لائق ہیں " میں نے کہا آخر بات کیا ہے - اس پر وہ چپ ہو گئیں جب ان کی بہت ہمت بڑھائی کہ ہم کسی سے کچھ نہ کہیں گے تو بڑی لڑکی نے شرماتے ہوئے رک رک کر کہا -

" بات یہ ہے کہ ہمارے 'نانا' بہت برے ہیں - ہمیں ان سے بہت نفرت ہے - ہم دن رات دعا مانگتے ہیں کہ یہ جلد مر جائیں - جب کبھی ہم اچھے کپڑے پہنتے ہیں یا جب ان کا جی چاہتا ہے وہ ہمیں اکیلے کمرے میں دروازہ بند کر کے خوب پیار کرتے ہیں —— ہمیں اپنے سینے سے لگا کر زور سے دباتے ہیں . . . .
ہمیں ننگا کر کے بری بری باتیں کرتے ہیں " اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکیں اور اپنے ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ لیا - اس سے آگے سننے کے لئے میں بھی تیار نہ تھا -

زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ جب کہ میں اتنی کمسن لڑکیوں سے ایسے تلخ تجربے سن رہا تھا - ' نانا ' - ۶ سالہ نواسیاں نابالغ —— بری بری باتیں' نانا نواسیاں —— بری بری باتیں —— نانا —— نواسیاں ' بری بری باتیں -

——————— ؟ ؟ ؟

سوچا کرتا ہوں میں کیا شہوانی جذبات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ انسان تمام لطیف احساسات سے بے حس ہو کر مقدس رشتے بھی توڑ دیتا ہے - ؟ کیا اس جذبے سے مغلوب ہو کر نانا نواسی پر دست درازی تک کر سکتا ہے —— ؟ کیا انسان محض اس جذبے کی سرکشی کی وجہ سے پھر جانوروں کی سماج بنانا چاہتا ہے - جہاں لطیف رشتوں کا کوئی وجود ہی نہ ہو —— ؟

سلام و پیام

دیکھنا گفتار کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

آپ کی روداد پڑھ کر مجھے وہ لڑکیاں یاد آ رہی ہیں - جو منہ میں زبان رکھتے ہوئے بھی بے زبان ہیں - جن کے ارادے ' جن کے خیالات جن کے عزائم کچھ کر نکلنے کے لئے بے تاب ہیں - مگر تمام قوتیں سلب کر لی گئی ہیں - جن کو ہزارہا سال ادھر کی درندہ صفت فضا اور ماحول میں ڈھکیلنے کے لئے یہ ارضی دیوتا اپنی تمام تر شر پسندیوں پر " بزرگی " کا لیبل لگا کر ٹوٹ پڑے ہیں - جو اپنی بیٹیوں کو بازار کا سودا بنا رہے ہیں - جو زیادہ قیمت دے - لیجائے —————— زمانہ آگے بڑھ رہا ہے - یہ پیچھے جا رہے ہیں - اس دور میں جا کر دم لینا چاہتے ہیں جبکہ عورت کا ایسے سودا ہوتا تھا - جیسے گاجر مولیوں کا قیمت دو - لیجاؤ - پسند آئے رکھنا' نہ پسند آئے —— واپس کر جانا —— ہر طرف نیلام ہو رہا ہے' جانوروں کا بھی - عورتوں کا بھی - یہ سولہ سال کی جوان و توانا لڑکی - جو تمہارے بستر کا تکیہ بھی بن سکتی ہے - تمہارے بچوں کی ماں بھی' اس کی قیمت کیا دو گے ——————
دو بھینسیں - دو گائیں - دو گائیں' ایک بھینس —— دو بھینسیں' ایک گائے' ایک خچر —————— مال اس کے نام چھوٹتا ہے جو زیادہ قیمت لگاتا ہے -

---

کیا آپ بغاوت نہیں کر سکتیں ؟
یہ کیوں لکھتی ہیں کہ میرے گیتوں میں کبھی رقص تھا — اور اب میرے نغمے موت کا پیغام بن چکے ہیں - اپنے لئے اور ان کانوں کے لئے جو زندگی کو پیار کرتے ہیں !

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

عابدی جعفر

رکشہ والے کی کالی کالی پنڈلیوں میں رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ اور جب وہ اور بھی زور دیتا تھا تو مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب رگیں پھٹ جائیں گی اور کالا کالا خون بہہ نکلے گا۔ اور ساتھ ہی ساتھ مجھے ہنسی بھی آرہی تھی کہ میں کالے کالے خون کا کیوں تصور کر بیٹھا ہوں۔ خون تو لال ہوتا ہے۔ اور ہوا کے تیز جھونکے میرے منہ سے تھپیڑے کھا کر بالوں کو بکھیرے دے رہے تھے ——— کالے کالے بالوں کو کیا یہ جھونکے خون کے قطروں کو بھی اڑا لے جائیں گے۔

میں چونکا، رکشہ ایک دم سے رک گیا تھا۔ کیونکہ دو تین ننھے ننھے بچے سڑک کو پار کر رہے تھے۔

رکشہ والے نے کہا

"خیریت ہوئی بابو جی ———"

اور وہ پھر بچوں کو ننگی ننگی گالیاں دینے لگا۔ ان گالیوں میں بچوں سے زیادہ ان کی ماؤں کو ملامت تھی جو اس طرح ان کو پیدا کر کے چھوڑ دیتی ہیں جیسے وہ مفت کے ہوں۔ ان کے پیدا کرنے اور پرورش کرنے میں کوئی تکلیف نہ اٹھانا پڑی ہو۔

میں نے ننگے ننگے بچوں کو دیکھا۔ ان کے مٹیالے مٹیالے جسم، سوکھی سوکھی ہڈیاں اور گندے گندے چہرے — میں سوچنے لگا کہ یہی بچے کل بڑھ کر مزدور بنیں گے، مکانوں کی تعمیر کریں گے۔ سڑکیں بنائیں گے۔ اور ہم لوگ، پیسے والے لوگ، ان مکانوں میں رہیں گے — ان سڑکوں پر چلیں گے۔ اپنی موٹریں دوڑائیں گے — کم از کم رکشہ ہی پر بیٹھا کریں گے اور ان ہی بچوں میں سے کوئی رکشہ کو چلائے گا، اس کی کالی کالی پنڈلیوں میں رگیں ابھر آئیں گی، اور ایک دن وہ پھٹ جائیں گی، اور کالے کالے خون کو یہ تیز تیز ہوا کے جھونکے منتشر کر دیں گے ——— سوچتے سوچتے میری نگاہوں میں ایک تلخ سا ہنسی پیدا ہو گئی۔ جس کو کوئی دیکھ تو نہ سکا۔ مگر اگر کوئی پاس ہوتا تو دیکھ ضرور لیتا ——— تلخیوں کو بھی کوئی چھپا سکا ہے۔

میں اپنے خیالات میں مگن اور وہ اپنی گالیوں میں مگن ——— اور ہوا اسی طرح چلتی رہی — کہ اس نے کہا

"اس گلی میں چلنا ہے بابو جی"

میں نے گلی کی طرف دیکھا، تاریک سی، گنجان سی گلی کی طرف، جو تین سال ادھر ہی کشادہ کشادہ تھی، کم از کم اس میں اتنی آبادی نہ تھی، اتنی گندگی نہ تھی،

میں نے کہا

"ہاں جگہ تو یہی ہے۔ مگر اب تو اس کا حلیہ ہی بدلا ہوا نظر آرہا ہے"

رکشہ والا کچھ سمجھا، کچھ نہیں سمجھا۔ اور وہ رکشہ گلی میں موڑ لے گیا۔ اب اس کی رفتار کم ہو چکی تھی۔ اور اسے لمحہ بہ لمحہ گھنٹی بجانا پڑ رہی تھی۔ کبھی

کوئی بچہ سامنے آجاتا تھا — کبھی کوئی عورت، کبھی کوئی بکری

میں نے کہا

یہیں روک دو — میں پیدل ہی چلا جاؤں گا —

اس نے مشکوک نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ جیسے وہ ان تنگ بھری گلی سے تنگ آگیا تھا — اورکرایہ لے کر چلا گیا۔ میں کچھ دیر تک تو حیران کھڑا ادھر ادھر دیوار کو دیکھا کیا۔ پھر گندگی کے احساس سے ناک پر رومال رکھ کر آگے بڑھنے لگا۔ اور سوچنے لگا کہ تین ہی سال میں اس محلے کی عورتوں نے آبادی میں کتنا اضافہ کردیا ہے۔ پھر خیال آیا کہ سلیم بھی کم از کم دو ننھی ننھی اولادوں کا باپ ہو گیا ہوگا۔

سلیم کا گھر سامنے تھا، میں گھبرا رہا تھا کہ ان بچوں کے گھر میں کیسے ایک ہفتہ تک رہ سکوں گا۔ میرا دماغ کہاں کہ ان کی بلکتی ہوئی آوازوں کو سنوں ———— مگر اس شہر میں میرا کوئی اور جاننے والا موجود نہ تھا جہاں قیام کرتا۔

دروازہ پر پہنچ کر میں نے پکارا۔ اور بند کواڑوں کو دیکھنے لگا کہ اب کوئی بچہ نکلتا ہے۔ اور اب نکلتا ہے۔ مگر کچھ دیر کے بعد ایک ملازم لڑکا نکلا۔ میں نے سلیم کو پوچھا تو معلوم ہوا کہ نہانے جارہے ہیں۔ میں نے کہلوایا کہ میں آیا ہوں۔ وہ اندر چلا گیا اور کچھ ہی دیر میں سلیم خود باہر آگیا اور لگا باتیں بنانے۔ اور میرے ہاتھ سے چھوٹا سا اٹیچی کیس لے کر لڑکے کو دیدیا اور گھسیٹ کر اندر لے گیا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی کہ شاید کسی کواڑ کی آڑ سے، کسی کونے سے کوئی بچہ پریشان ہوا نکل آئے۔ مگر کسی بچہ کی بجائے ایک موٹی سی جھبڑی جھبڑی بلّی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بلی بمشکل سے چلا جارہا تھا۔

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ میں سوچنے لگا کہ چاہے عورت ہو، چاہے کُتیا چاہے بلّی — آج کل سب پر بچّے دینے کا جنون طاری ہے —

سلیم نے کہا

"کیا بات ہے، کیوں ہنس دئے"

"کچھ نہیں، کچھ نہیں — کچھ خیال آگیا تھا"

میری ہنسی کی آواز سُن کر ———— جس کمرے میں بلی گئی تھی، اس سے بھابی نکل آئیں۔ اور مجھے دیکھتے ہی کھِل سی گئیں۔ ان کی آنکھوں میں خوشی ناچنے لگی — بولیں

"بہت دن کے بعد آئے ہو، اور آنے کی اطلاع بھی نہیں کی"

میں نے کہا

"آپ تو جانتی ہیں کہ میں کیسا ہوں — بے قاعدہ کام کرنے میں مجھے مزا آتا ہے۔ — خیر — چھوڑیئے — ذرا جلدی سے کچھ کھلا پلا دیجئے رات بھر کا بھوکا ہوں"

سلیم تو نہانے چلا گیا اور میں بھابی کے ساتھ ان کے کمرے میں جاکر بڑے آرام سے پیر پھیلا کر بیٹھ رہا — میرے پاس ہی بلّی ٹانگیں پھیلائے ہوئے سو رہی تھی۔ اس کا پھولا ہوا پیٹ گہری گہری سانس سے اُبھر رہا تھا۔

میں یوں ہی اس کے پیٹ کو سہلانے لگا۔ اُس نے اور بھی ٹانگیں پھیلا دیں اور دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گئی۔ ایک مرتبہ آنکھیں کھول کر مجھ کو دیکھا، پھر زبان سے اپنے پیٹ کو چاٹا۔ اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔

میں نے کہا

"آج کل تو بہار آئی ہوئی ہے جیسے"۔

بھابی نعمت خانے سے کچھ حلوا وغیرہ نکال رہی تھیں - اور کنکھیوں سے مجھ کو دیکھتی جاتی تھیں - میرے جلد پر مسکرادیں - اور پھر طشتری لیکر سامنے آبیٹھیں — مجھے بھوک بڑے زور کی لگی تھی - میں جلدی جلدی حلوہ کھانے لگا - کہنے لگیں

"اتنی جلدی کیا ہے"

میں نے ہنستے ہوئے کہا

"جلدی اس لئے کر رہا ہوں کہ آپ اور لاکر دیدیں"

وہ ہنس دیں - اور اٹھ کر کچھ اور حلوا لے آئیں - اور پھر بلی کو اپنی گود میں بٹھاکر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگیں - بلی کے پیٹ میں جیسے سانس سماتی ہی نہ تھی - جب ہی وہ خرخر کر رہی تھی -

جب ذرا بھوک مٹی - اور پانی نے پیٹ میں ٹھنڈک کی لہریں جاری کردیں تو میں نے کہا -

"اب بتائیے — کیسے گذر رہی ہے، یہ زندگی ؟"

"اچھی گذر رہی ہے -"

انہوں نے کچھ سوچ کر، کچھ ٹھہر کر، کچھ آہستہ سے کہا - جیسے انھیں خود اپنے جملہ پر اعتماد نہ ہو - اور وہ خود بھی اپنے سے سوال کر رہی ہوں کہ کیسے گذر رہی ہے یہ زندگی -

میں سلیم کو اچھی طرح جانتا تھا - اور جانے کیوں یہ سوچتا رہتا تھا کہ جس کے ساتھ بھی اس کی شادی ہوگی - اس لڑکی کی زندگی برباد ہو جائیگی یہی وجہ تھی کہ بھابی کے منہ سے یہ جملہ سن کر مجھے یقین نہ آیا کہ وہ سچ کہہ رہی ہیں - وہ ضرور رنجیدہ ہونگی -- اسی یقین کے ساتھ میں نے ان کی طرف دیکھا، اب ان کے چہرہ میں اور ہی باتیں نظر آنے لگیں - گالوں کا پوڈر کئی جگہ سے کم ہوگیا تھا - اور پچھلی چھلی کھال جھانکنے لگی تھی، آنکھوں میں بھی حلقے پڑگئے تھے - اور ان میں ایک مایوسی سی کروٹیں لے رہی تھی -

بھابی مجھ کو اپنی طرف دیکھتا ہوا پاکر گھبرا گئیں - اور اٹھ کر کمرے سے جاتے جاتے کہنے لگیں

"تم سو رہو، تھکے ہوئے ہوگے -"

ان کے جانے کے بعد ہی بلی بھی اپنی جگہ سے اٹھی - اور میری پیٹھ سے اپنی دم کو رگڑتی ہوئی پلنگ سے اتر گئی - اور باہر چلی گئی - جیسے وہ بھی کہتی ہوئی جا رہی ہو کہ تم سو رہو تھکے ہوئے ہوگے -

---

شام کو میں سلیم کے ساتھ ہوا خوری کے لئے نکلا - بھابی اصرار کے باوجود بھی ساتھ نہ ہوئیں - اور کھانے کے انتظام کا بہانہ کرکے گھر ہی میں رہ گئیں —————— جب گھر بہت پیچھے رہ گیا اور سامنے دور دور تک ایک رومانٹک سی سڑک بل کھاتی ہوئی نظر آنے لگی - تو میں نے دونوں کے تعلقات پر کرید شروع کی اور ایک ساتھ ہی سلیم سے تابڑ توڑ سوالات کر ڈالے -

سلیم سنتا رہا اور ٹالتا رہا - پھر وہ بھی بھابی کے خلاف زہر اگلنے لگا کہ پچھلے دو سال سے وہ ایسا بدل گئی ہیں - اور ایسی اکتائی اکتائی رہنے لگی ہیں اور عزیز و اقارب سب نالاں ہو چکے ہیں - محلے میں کسی عورت سے میل جول نہیں - مہینوں آپس میں بات نہیں ہوتی ....

"میں نے تنگ آکر کئی مرتبہ کہا کہ اپنے میکے چلی جاؤ - میری جان چھوڑو - مگر وہاں بھی جانے کا نام نہیں لیتیں - اب کچھ مہینوں سے بلیوں کا شوق ہو گیا ہے — بلی پالتی ہیں - اور جب اس کے ہاں بچے ہوتے ہیں تو بچوں کو سڑک پر پھینک دیتی ہیں - اور بلی کو باندھے رہتی ہیں کہ وہ بھاگ نہ جائے - بچے سڑک پر پڑے پڑے مرجاتے ہیں کتے نوچ ڈالتے ہیں - گاڑی سے کچل جاتے ہیں - مگر ذرا بھی رحم نہیں آتا -"

سلیم کے یہ جملے سن کر میرے تعجب کی حد نہ رہی اور بھابی کا کردار اور بھی رنگا رنگ معلوم ہونے لگا۔ اور ایک گہری دلچسپی سی پیدا ہو گئی۔ سلیم نے سگرٹ جلاتے ہوئے کہا

"دو تین ہی دن میں بلی کے بچے ہونے والے ہیں۔ ابھی اس سے بہت پیار ہے ان کو دودھ بھی پلاتی ہیں۔ گوشت بھی کھلاتی ہیں۔ اور ہر وقت اپنے پاس رکھتی ہیں۔ مگر جہاں بچے ہوئے ان پر بھوت سوار ہوا۔"

اور پھر وہ ایسا خاموش ہوا کہ میرے ایک بھی سوال کا جواب نہ دیا۔ اور خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔ اور سگرٹ کے گہرے گہرے کش کھینچتا رہا

جب ہم ٹہل کر واپس ہوئے۔ تو بھابی کھانا تیار کر چکی تھیں۔ اور بیٹھی ہوئی بلی کو سالن میں ملے ہوئے نوالے کھلا رہی تھیں۔ اُن کی آنکھوں میں پیار تھا اور ایک عجیب سی شفقت۔ جیسے بلی نہ ہوئی۔ خود ان کی اولاد ہوئی۔ مجھے اب ان میں اور بھی باتیں نظر آنے لگیں۔ وہ بلی کی پیٹھ پر اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایسا لطف محسوس کر رہی تھیں جیسے کوئی خود ان کی پیٹھ کو سہلا رہا ہو۔ اور لمس کی نرمی سے آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہوں۔

سلیم نے ٹہوکہ دیتے ہوئے مجھے اپنی باتوں کا یقین دلایا۔ اور کچھ روٹھ کر دُور جا بیٹھا۔ بھابی نے ہم دونوں کا کھانا نکالا۔ اور جب میں نے ان کو بھی شریک کرنا چاہا تو کہنے لگیں

"بھوک نہیں ہے"

میں نے کہا

"دیکھئے بھابی۔ آپ کو کھانا کھانا ہے"

"کہہ تو دیا۔ بھوک نہیں ہے۔ تمہارے جانے کے بعد میں نے تھوڑا سا دودھ پی لیا تھا۔ اور جو حلوا تم نے چھوڑ دیا تھا نا ــ وہ کھا لیا تھا۔"

لیکن یہاں سب سننے والا ہوں کسی کی۔ ان کو شریک ہونا ہی پڑا۔ وہ ہر تیسرے چوتھے نوالے کے بعد بلی کو بھی ایک نوالہ دیتی جاتی تھیں کھانے کے بعد ہم دونوں تو باتیں کرنے لگے۔ لیکن بھابی اپنے پلنگ پر لیٹ رہیں۔ بلی بھی ان ہی کے پیروں کے پاس لیٹی تھی اور وہ تلووں سے اس کے پیٹ کو سہلا رہی تھیں۔

پھر چار پانچ دن تک میں اپنے کام میں مصروف رہا۔ صبح ہوتے ہی گھر سے نکل جاتا اور رات کو گیارہ بجے واپس آتا ــ وہ اٹھتیں مجھے کھانا کھلاتیں اور پھر لیٹ کر سو جاتیں۔ بلی بھی ان ہی کے ساتھ رہتی۔ اور ٹانگیں پھیلا پھیلا کر کروٹیں لے لے کر سوتی رہتی۔ اس کے گلے سے آہستہ آہستہ خر خر، خر خر کی آوازیں نکلتی رہتی

ایک رات کو کھانا کھاتے ہوئے میں نے کہا

"کب بچے ہوں گے بھابی؟"

[illegible]

"کل نہیں تو پرسوں ضرور ہوں گے"

میں نے کہا

"اور اگر نہ ہوئے ــــــــــــ"
"ضرور ہوں گے پرسوں تک"
میں نے چھیڑتے ہوئے کہا
"آپ کو اتنا یقین کیوں ہے"
کہنے لگیں
"میں جانتی ہوں"
اور پھر ـــ کھانے کے بعد ـــ جب وہ دوبارہ جاکر لیٹیں تو بلی کو ہاتھ سے سہلاتے ہوئے کہہ رہی تھیں
"دیکھ ری پھوسی، پرسوں بچے ضرور دیدینا۔ ورنہ بڑی شرمندگی ہوگی"
میں یہ سن کر ہنس دیا۔ اور ہنستے ہنستے، سوچتے سوچتے، ہنستے ہنستے سو گیا۔

دوسرے دن تو بچے ہوئے نہیں حالانکہ بھابی کو ۹۵ فی صدی امید تھی۔ اور اس کے دوسرے دن بھی کچھ آثار نظر نہ آتے تھے بلی اسی طرح ٹانگیں پھیلائے لیٹی تھی، اور خر خر سانس لے رہی تھی۔
میں نے کہا
"صبح تو مجھے جانا ہے اور آپ کی بلی بیگم ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتیں۔"
کہنے لگیں
"آج بارہ ایک بجے تک ہو جائیں گے"
میں نے کہا
"نہیں ہوں گے، کچھ شرط بدتی ہیں"
کہنے لگیں
"ہاں ـــــــــ اگر ہو گئے۔ تو ایک ہفتہ تک نہ جانا"
میں نے کہا
"ایک ہفتہ تو بہت ہے، ہاں، کل نہیں جاؤں گا ـــــــــــــ مگر، اگر نہیں ہوئے تو؟"
کہنے لگیں
"میں تم کو جو بھی مانگوگے، دیدوں گی"
میں نے کہا
"جو کچھ بھی مانگوں"
"ہاں ـ جو کچھ بھی"
وہ یہ کہتے ہوئے ایسی بھولی، ایسی معصوم، ایسی اچھی معلوم ہو رہی تھیں ـ کہ مجھے جانے کیوں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ سلیم غلط کہتا ہے۔ ان میں کوئی خرابی نہیں۔ وہ تو ایسی اچھی ہیں ـ وہ خود خراب ہے اور ان کی زندگی برباد کر رہا ہے ـــــــــــــــــ اور پھر

ایک لمحے کے لئے میرے دل میں یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ اگر میں سلیم کے بجائے ہوتا

بھابی میرے چہرے کے ادلتے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہی تھیں - پھر جانے کیوں وہ شرما گئیں اور بولیں

"تم مانگو کے کیا، میرے پاس کچھ ہو بھی جو مانگو -"

میں اپنے خیالات کی روانی میں بہتے بہتے رک گیا - اور سنبھل گیا - اور فوراً ہی بولا -

"مجھے بلی کے بچے دیدیجئے۔"

وہ حیرانی سے مجھے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں - اور پھر اٹھ کر اپنے پلنگ پر چلی گئیں - میں لیٹا رہا - اور آسمان کے بدلتے رنگوں کو دیکھتا رہا تارے نکلتے گئے - جھلملاتے گئے اور تاریکیوں میں ایک روشنی سی ملاتے گئے - سلیم کے خراٹوں کی آواز آتی رہی - اور گلی میں اونگھتے ہوئے کتوں کی کچھ کچھ دیر کے بعد بھونکنے کی آوازیں آتی رہیں - میں نے تکیہ کے نیچے سے گھڑی نکال کر وقت دیکھا، ایک بج گیا تھا - بھابی کچھ دور پلنگ پر خاموش لیٹی تھیں ——— پھر شاید مجھ کو نیند آنے لگی، میں نے آنکھیں بند کرلیں اور ہوا کے لطیف جھونکوں میں بہتا ہوا دوسری دنیا میں پہنچ گیا - جہاں خوابوں کے ... ہوتے ہیں - جہاں دھندلاہٹوں کے سائے ہوتے ہیں - جہاں شعور سوتا ہے - تحت الشعور جاگتا ہے - جہاں خواہشیں اپنے ... سنوارتی ہیں - اپنے رنگ نکھارتی ہیں ——— میں نے دیکھا کہ بھابی بیٹھی ہیں - اور ہنس رہی ہیں اور ان کے چاروں طرف بچے کھیل رہے ہیں - ایک بچے کو گود میں اٹھا کر میرے پاس لاتی ہیں اور کہتی ہیں ——— تم چاہتے ہو - میں اپنے بچوں کو تمہیں دیدوں

مجھے کسی نے جھنجھوڑا - میں گھبرا کر اٹھا - بھابی سامنے کھڑی تھیں

"تم ہار گئے - بلی دو بچے دے چکی ہے - اور تیسرے کی تیاری کر رہی ہے"

"کہاں ہے وہ"

"میرے پلنگ کے نیچے"

میں اٹھا - اور ان کے ساتھ ان کے پلنگ کے پاس پہنچ کر جھکا اور جھانکنے لگا - بھابی نے بلی کے لئے روئی بچھادی تھی - بلی اس پر بیٹھی اپنے دونوں ننھے ننھے بچوں کو ... رہی تھی اور اپنی دم کو صاف کر رہی تھی - بچے اس سے چمٹے جا رہے تھے اور آہستہ آہستہ چلا رہے تھے پھر وہ اٹھی - اور اپنی جگہ پر ... بیٹھ گئی -

بھابی نے آہستہ سے ... ہوئے کہا

"اب تیسرا بچہ پیدا ہونے والا ہے"

میں نے دیا سلائی جلائی اور پلنگ کے نیچے ... دیکھنے لگا - تیسرا بچہ بھی پیدا ہو گیا تھا - اور بلی اسے چاٹ رہی تھی -

بھابی نے کہا

"ابھی دو بچے اور ہوں گے"

میں نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا - دیا سلائی کی بجھتی ہوئی روشنی میں ان کی دھندلی دھندلی آنکھیں نظر آئیں - ان کا چہرہ بھرایا ہوا تھا - اور ایسا معلوم ہوتا تھا - جیسے انھیں رونا آ رہا ہو - جیسے انھیں تکلیف ہو رہی ہے ——— دیا سلائی بجھ گئی اور ایک دو منٹ تک وہ دکھائی نہ دیں - مگر پھر میری آنکھیں اس اندھیرے میں تاریکی میں بھی ان کا چہرہ دیکھنے لگیں -

بھابی نے کہا

"دیکھو — چوتھا بچہ ہوگیا ؟"

میں نے دیا سلائی جلا کر دیکھا - چوتھا بچہ بھی ہوگیا تھا — میں حیران رہ گیا - آخر ان کو کیسے معلوم ہوگیا تھا — وہ کیسے جان گئی تھیں کہ آج بچے پیدا ہوں گے اور اتنی اتنی دیر کے بعد پیدا ہوں گے ۔

پھر وہ اٹھ کر پلنگ پر لیٹ رہیں - میں وہیں بیٹھا رہا - اور دیا سلائی جلا جلا کر بچوں کو دیکھتا رہا - پانچواں بچہ بھی پیدا ہوا — میں آہستہ سے اٹھ کر بھابی کے پاس گیا ۔

"پانچواں بھی پیدا ہوگیا ہے"

وہ خاموش رہیں — میں نے ان کے چہرہ کو دیکھنا شروع کیا - ان کے گال بھیگے ہوئے تھے — آنکھیں بند تھیں ———— اور وہ رو رہی تھیں ۔

میں نے شانہ ہلا کر کہا

"آپ رو رہی ہیں بھابی"

کہنے لگیں

میں بہت خوش ہوں ———— یہ خوشی کے آنسو ہیں"

میں سوچنے لگا کہ کہیں یہ آنسو ان بچوں کے لئے تو نہیں ہیں - جو آج تک پیدا نہیں ہوئے اور — شاید — جو کبھی بھی پیدا نہ ہوں۔

میں اکثر گنگناتی ہوں !

مرسلہ:- آنسہ رشید فاطمہ بی اے

زیست ہے نکتہ چیں، کدھر جائیں　　　موت پر بس نہیں کدھر جائیں

———— (عدم)

اے دوست تری یاد نے بخشا وہ سہارا　　　ہر تلخیٔ دوراں کو کیا ہم نے گوارا

———— (جگن ناتھ آزاد)

حقیقتوں سے فرار کب تک یہ خواب غفلت ہے مجرمانہ

وہ قوم مٹ کر رہی ہے جس نے حقیقتوں کو اٹل نہ جانا

———— (فارغ بخاری)

ڈر ہے کہ کہیں راز نہ کھل جائیں جنوں کے　　　پوچھو نہ فسانہ مری آشفتہ سری کا

———— (اختر ہوشیارپوری)

برے افسانۂ محبت میں = میری آوارگی کا قصہ ہے　　　پھول ہی زیب گلستاں تو نہیں = باغ میں خار کا بھی حصہ ہے

ایک طویل مسلسل افسانہ

فرار

(گذشتہ پیوستہ)

حسن محمود عروج

(۱۱)

دوسرے دن اس نے جو اداریہ لکھا تو اپنے سارے انتقامی جذبات اگل دئے جیسے دنیا کی ہر اس طاقت کو ہی جلا دینا چاہتا ہوں جس کا نام اقتدار ہے۔ اخبار کے کالموں میں الفاظ کی بجائے شعلے اور شرارے بکھرے ہوئے تھے۔ اور اس نے جیسے اپنے دل کی ساری آگ لفظوں اور جملوں کے روپ میں ان کالموں میں پھیلا دی تھی اور وہ اس آگ سے سب کچھ پھونک دینا چاہتا ہے۔ پرچہ ہاتھوں ہاتھ بکا۔ ہر طرف اس کا لکھا ہوا اداریہ پڑھا جا رہا تھا۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ ————عوام اس کی جرأت کی داد دے رہے تھے۔ اور دوپہر سے پہلے پہلے حکومت نے اخبار سے دو ہزار کی ضمانت طلب کر لی۔

اخبار کا پروپرائٹر فوراً دو ہزار کی رقم نہ داخل کر سکا اور اخبار کی اشاعت روک دی گئی۔ دوسرے دن پرچہ نہ شائع ہوا———— اور اسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس کا ایک پرخلوص ہمدرد اور ہمراز دوست اس سے چھین لیا گیا ہے اور اس کے جسم سے روح نکال لی گئی———— اخبار میں نکلس اور اداریے لکھ کر اپنے جذبات کو تسکین دے لیا کرتا تھا۔ جو اس کے دل میں طوفان کی طرح مچلتے رہتے تھے۔ اور اسے سیماب کی طرح بے قرار رکھتے تھے———— کبھی محسوس کرتا کہ اس نے اپنا پیام اپنی کرما تک پہنچا دیا۔ کبھی سوچتا کہ وہ مظلوم انسانیت کچلی ہوئی روحوں اور بیمار دنیا کی خدمت کر رہا ہے اور اس کا ضمیر ایک مسرت محسوس کرتا اور دھڑکتے ہوئے بیتاب دل کو پیام اطمینان مل جاتا۔

مدرسہ بند ہو گیا تھا۔ کرما چھین لی گئی———— اخبار روک دیا گیا، اس کی زندگی کے تینوں زاویے جیسے مٹتے جا رہے تھے———— اسے رنگوں کی گلیاں سنسان اور سڑکیں ویران دکھائی دینے لگیں ہر طرف اداسی برستی نظر آئی۔ اور جب زندگی اس طرح بے کیف ہو گئی تو اس کا جی چاہا کہ گھر چلا جائے۔ لیکن وہ ایک ہندوستانی مزدور سے زیادہ کمانے کے باوجود ہنوز آرام طوطا رام نہ بن سکا اسے جہاز کا ٹکٹ میں مل سکتا تھا۔ اور اب تو وہ "ٹکٹ چوروں" کے حلقہ میں کافی بدنام ہو گیا تھا۔ چور بازار ٹکٹ فروش اس کے قریب بھی نہ آ رہے تھے———— اسے اپنے سینے میں مچلتی ہوئی اس آرزو کا گلا بھی خود ہی گھونٹ دینا پڑا۔ اس نے محسوس کیا کہ اب وہ خلاؤں میں بے سہارا غوطے کھا رہا ہے۔

بیتی ہوئی سہانی گھڑیاں یاد آتیں آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے پھر چمپئی رنگ کی دوشیزہ کرما کے طرز عمل پر غور کرتا جس کی زنگوں میں شاید ہونے

کا زہر پھیل گیا تھا۔ اور جو اب اس سے نفرت کرنے لگی تھی ——— لیکن نہ جانے دل میں بیٹھا ہوا کون پکارتا۔

"نہیں کرنا ایسی نہیں ہے ——— وہ تجھ سے نفرت نہیں کرتی ———

وہ بے وفا نہیں ہے، مجبور ہے، جبر اسے سونے کے عوض بیچے دے رہا ہے ——— لڑکیاں ہزاروں اختیارات کے باوجود بھی مجبور ہوتی ہیں ——— "

وہ دل ہی دل میں سوچتا ——— کرنا اسے نہیں مل سکتی تو نہ سہی۔ لیکن اگر وہ اس سے نفرت نہ کرے تو شاید وہ مسرور رہ سکے ——— اور کُل سے ناامید ہو کر جزو کو غنیمت سمجھنے لگا۔ پھر اس نے کرنا کو ایک خط لکھا۔ اور تیسرے ہی دن اس کا جواب پا کر اس کا دل مسرت سے کھل گیا۔ اس کا جی چاہا کہ خوب رقص کرے اور ایک مرتبہ پھر غم و الم کا منہ چڑھائے

"قسمت جو کچھ بھی کرے تم ہمیشہ یاد رہو گے ——— خدا کے لئے
اور محبت کا واسطہ مجھ سے ملنے کی کوشش کر کے یا خط لکھ کر مجھے بدنام
نہ کرو ——— ممکن ہو تو میرے خطوط واپس کر دو ———
مجھے بھول جاؤ ——— خدا تمہیں صبر دے"

خط میں "میرے ساجن" نہیں لکھا گیا تھا۔ آخر میں کوئی نام نہیں تھا۔ ہینڈ رائٹنگ بگاڑا ہوا سا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ مسرتوں میں جھوم رہا تھا۔ اس نے سوچا جو کچھ ہو رہا ہے۔ کرنا کی مرضی کے خلاف ہو رہا ہے۔ وہ اسی طرح معصوم ہے ——— اس نے اپنے دل سے ہر وہ شک نکال پھینکا جو اس کی روح کو تڑپا رہا تھا ——— اور اس طرح اسے کچھ سکون سا محسوس ہوا وہ پھر ایک مرتبہ والہانہ عقیدت اور اپنے پرستارانہ جذبات کے ساتھ چمپئی رنگ کی برمی مسلم دوشیزہ کے حضور میں جھک گیا۔

(۱۲)

تو پوں، سرگوشی، مولمین کی اطلاعات بڑی پریشان کن تھیں وہاں سے لوگ بھاگ کر رنگون آ رہے تھے۔ برما میں بسنے والے ہندوستانی مقیم برما کی نگاہیں رنگون کے ساحل پر لگی ہوئی تھیں۔ ہر شخص کسی نہ کسی طرح رنگون سے بھاگنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ البتہ جن لوگوں کا کوئی ٹھکانہ تھا اپنی ملازمتیں پیاری تھیں اور سرکاری ملازمین مجبوراً رنگون میں پڑے ہوئے تھے۔ بہت سے لوگوں نے اپنے بال بچوں کو مضافات میں منتقل کر دیا تھا۔

سرمست نے اپنے بیوی بچوں کو تنگانچوں بھیج دیا تھا۔ اور روزانہ شام کو چلا جاتا تھا ——— جب سرمست رنگون میں تھا دونوں بارہ ایک بجے تک کہیں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ وہ اپنے دل کے زخموں اور روح کی جراحتوں کو سرمست کے سامنے نمایاں کرتا اور سرمست اپنی صبر آموز باتوں سے ان پر مرہم رکھتا تھا۔ لیکن اب اس کی راتیں تڑپتے ہوئے گذر رہی تھیں۔ اور کوئی مرہم نہ مل رہا تھا۔

وہ اپنے دل میں مچلتی ہوئی محبت کی تمناؤں اور گھر جانے کی آرزؤں کو بہلانے کی کوشش کرتا۔ اور خود کو فریب دیتا کہ اُسے کوئی غم نہیں ہے۔ روح کی جراحتوں اور دل کے زخموں سے آنکھیں پھیر کر انھیں ایک واہمہ سے تعبیر کرتا۔ لیکن غم بڑھ جاتا۔ اور زخم گہرے ہو جاتے۔ اور جب کوئی مداوا نہ ہوتا تو چینی رستورانوں میں ڈوب جانا چاہتا ——— لیکن اسے اب ان رستورانوں میں جاتے ہوئے اپنی آمدنی کا خیال آجاتا ——— مدرسہ بند ہو گیا تھا۔ اور اخبار رک گیا۔ وہ اپنی تنخواہ کی طرف سے بھی مایوس سا ہونے لگا تھا۔ منت تنخواہیں کون دے سکتا ہے۔ سوچتا اس نے جتنا روپیہ بیر کے گلاسوں میں ڈبو دیا اور جو رقم چینی دوشیزاؤں پر چڑھادی۔ اگر اتنی رقم جٹی کے دربانوں کے جیب میں ڈال دیتا تو آسانی سے گھر پہنچ جاتا ——— لیکن اسے یہ رقم اکٹھی کب ملی تھی۔ (باقی)

... پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر سائیکولوجی اردو۔ ایڈیٹر ... نے شائع کیا





معصومیت

Photo WASIM UDDIN

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو

سائیکولوجی

جلد-۲ نمبر ۴

مئی سنہ ۱۹۵۰ء

ادارۂ تحریر

آنسہ شاہدہ سلطانہ ایم اے

بیگم رئیس جہاں نیّر انصاری

عابدی جعفر بی اے

مدیر عمومی انعام اللہ خاں ایل ایل بی

معتمد عمومی علاء الدین خالد

سالانہ چندہ

پاکستانی سکہ چھ روپے

بھارتی سکہ ساڑھے سات روپے

قیمت پرچہ

پاکستانی سکہ آٹھ آنے

بھارتی سکہ دس آنے

دفتر

سائیکولوجی اردو پوسٹ بکس ۵۶۶ کراچی

مندرجات

پہلی نظر
آپ کی محبت کے بغیر
واقعہ اور واہمہ
خوف
ساس بہو کی کشمکش
بچوں میں ابتدائی لغزشوں کی ابتدا
اور ہماری یہ خیالی جنت
بچوں کو جنسی تعلیم کیسے دی جائے
بھولوں کیسے
بات چیت
راہب خانہ

جگہ کی تنگی کی
وجہ سے ہم اپنا دفتر کسی
دوسری جگہ منتقل کر رہے
اس لئے آپ خط و کتابت کرتے
وقت " سائیکولوجی ۔ پوسٹ بکس ۵۰۶
کراچی " ہی لکھیں

ایک عورت نے لکھا
"میں مرد نمبر کے لئے لکھنا اپنی ذلت سمجھتی ہوں"
اور ـــــــ دوسری نے لکھا
"میں مرد کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لئے بے چین ہوں"

ادارہ سائیکولوجی "مرد نمبر"

پیش کر کے عورت اور مرد کی باہمی زندگی سے ان کانٹوں کو دور کرنا چاہتا ہے جو اس دنیا کو جہنم بنائے ہوئے ہیں ۔
اس نمبر میں ایسی عورتیں لکھ رہی ہیں جن کو مردوں سے نفرت ہے، اور ایسی بھی عورتیں لکھ رہی ہیں جو مرد سے بے انتہا عقیدت رکھتی ہیں
عورت کی نگاہ میں ـــــــ مرد ـــــــ شیطان ہے یا فرشتہ ؟
ہم ہر بہن سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ اس نمبر کے متعلق ضرور لکھے
اور ـــــــ بہت جلد

پہلی نظر

زندگی کے "دوراہہ" پر

ہماری آپ کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا "دوراہہ" ضرور آتا ہے جب کہ حالات اور وقت کے تقاضے کسی ایک راہ کے انتخاب کرنے پر مجبور کرتے ہیں اگر ہم پچھلا راستہ اچھی طرح سمجھ بوجھ کر طے کر آئے ہیں تو ہم جانتے ہیں کہ ہم کو کدھر جانا ہے۔ اور کدھر سے اپنے کو بچانا ہے۔ کدھر جاتے ہیں ہماری کامیابی کی منزل ملے گی۔ اور کدھر تباہی کی

مگر ہم میں سے اکثر اس دوراہے پر آکر رک جاتے ہیں۔ غلط فیصلہ کر لیتے ہیں اور غلط راہ پر چل پڑتے ہیں۔ آگے جاکر ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو ہم کانٹوں میں الجھ گئے۔ واپسی کا امکان نہیں رہتا۔ چنانچہ اسی راہ پر دم توڑ دیتے ہیں۔ فنا ہو جاتے ہیں

اور ——— کچھ لوگ فیصلہ کرنے میں "وقت" کو ہاتھ سے کھو دیتے ہیں۔ اب سامنے ایک ہی راستہ نظر آتا ہے اور یہ اکثر "ناکامی" ہی کا راستہ ہوتا ہے ——— تباہ ہونا لازمی ہے

بہت کم لوگ صحیح فیصلہ کر پاتے ہیں۔ اور دوسرے راستہ کی رنگا رنگی کے باوجود بھی اسے ٹھکرا کر بظاہر بے رنگ راستہ پر ہو لیتے ہیں۔ مگر آگے جاکر بے رنگی دور ہونے لگتی ہے۔ فضائیں مسکرانے لگتی ہیں۔ ہوائیں قہقہہ لگانے لگتی ہیں۔ اور سامنے کامیابی کی منزل اپنی آغوش پھیلائے پکارتی بلاتی نظر آتی ہے۔

کبھی آپ نے سوچا ہے کہ محض چند لوگ صحیح فیصلہ کیوں کر پاتے ہیں؟ ۔ کیا ان کی "قسمت" میں کامیابی لکھی تھی۔ اور آپ کی قسمت میں تباہی؟ ——— کیا ان کے لئے آپ سے زیادہ آسانیاں مہیا تھیں، ان کی راہ میں پھول بچھے تھے، اور آپ کی راہ میں کانٹے ؟

جی نہیں

محض فرق یہ ہے کہ وہ حالات کا صحیح اندازہ کر لے گئے۔ اور آپ جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ آپ کو جو چیز بھی رنگین نظر آئی۔ آپ اسی کو بہتر و دلکش سمجھ بیٹھے۔ اس کے امکان پر غور نہیں کیا آپ نے کہ وہ آپ کی نظر کا دھوکہ بھی ہو سکتا ہے، در اصل وہ چیز رنگین اور دلکش نہ ہو اور آپ کے وقتی جذبات نے یہ رنگ چڑھایا ہو ——— وہ یہ جانتے تھے کہ اگر راہ میں دشواریاں حائل ہیں تو ان کے آگے بہار بھی ہے۔ ان کی یہ بہار ابدی ہے۔ ازلی ہے۔ وہ زینہ بہ زینہ چڑھتے ہی جائیں گے۔ اور اوپر، اور بلند۔ آپ نے شروع ہی میں کامیابی کو کھو دیا۔ اس کی ساری کی ساری ذمہ داری آپ پر ہے۔

اور آپ ہی ——— محض آپ ہی ——— اپنی موجودہ الجھنوں کو دور کر سکتے ہیں۔ دشواریاں حائل ہوں تو پرواہ نہ کیجئے۔ کانٹوں میں دامن الجھیں تو ہمت نہ ہاریے اور بڑھتے رہیے۔ اور کوشش کیجئے کہ آپ کی زندگی میں ایک بار پھر ایسا "دوراہہ" پیدا ہو جائے۔ جہاں آپ کو فیصلہ کرنے کی ضرورت پڑے اور آپ صحیح فیصلہ کر پائیں

صحیح فیصلہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ حالات کا خوب اچھی طرح جائزہ لیں۔ ہر پہلو پر روشنی ڈالیں اور دور رس بنیں۔ یہ نہ دیکھئے کہ راستہ شروع کیسے ہوتا ہے۔ بلکہ یہ دیکھئے کہ وہ آپ کو لے کہاں جائے گا۔

"مرد نمبر" کی تیاریاں

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو کہ ہم بہت جلد "مرد نمبر" نکال رہے ہیں اس نمبر کے اعلان کے بعد ہی سے ہمارے اقدام کا پُرزور الفاظ میں خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ مرد اور عورتوں نے ہماری ہمت افزائی کی ہے کئی عورتوں نے تو اپنے مضامین بھی بھجوادئے ہیں اور روز ہی ڈاک میں ایک دو مضمون آبھی جاتے ہیں۔

ہم بھی بڑے خلوص سے اس نمبر کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ لکھنے والی عورتوں کے علاوہ ہم نے سائیکولوجی کی ہر پڑھنے والی عورت کو مدعو کیا ہے کہ وہ اس نمبر کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لکھیں۔ جن کے پاس ہمارے دعوت نامے نہیں پہنچے ہیں۔ ان کو ہم ان سطور سے مدعو کر رہے ہیں۔

"مرد نمبر" نکالنے کی ایک وجہ ہے۔ عورت کے متعلق تو بڑے بڑے فیلسوف نے نظریات قائم کئے، شعرا نے اس کی ہستی پر روشنی ڈالی۔ مگر عورت بقول شاعر کے معمّہ "سمجھنے کا نہ سمجھانے کا" اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ ہم نے خود عورت سے نہیں پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ کیا چاہتی ہے اور ہم کو کیا سمجھتی ہے۔ عورت جو کچھ مرد کے متعلق کہے گی اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم خود اس کو سمجھ سکیں گے۔ اور مرد اور عورت کے درمیان جو ایک وسیع خلیج ہے۔ وہ بہت حد تک کم ہو جائے گی۔ اور اس خلیج کی وجہ سے ہماری زندگیوں میں جو خلا سا موجود ہے اس میں رفاقت صحیح رفاقت سانس لے گی اور ہم ایک دوسرے کے سچے ساتھی، ہمدم بن سکیں گے۔

اس سلسلہ میں ہم کو بہت سے دلچسپ خطوط موصول ہوئے ہیں۔ سائیکولوجی کے ایک کرم فرما "مرزا غوث" کے خط کا ایک حصہ ہم نقل کر رہے ہیں جو ہمارے خیالات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔

> "ہماری دلی خواہش ہے کہ عورتیں جو ہمارے لئے ابھی تک معمّہ ہیں۔ خود زندگی کا کیا نظریہ رکھتی ہیں جب تک بیان نہ کریں۔ ہم ان کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اس سلسلے میں مضمون نگار خواتین سے درخواست کی جائے کہ بجائے الزامات تھوپنے گھناؤنے واقعات پیش کرنے کے یہ بتائیں کہ ان کا نظریہ زندگی کیا ہے۔ وہ اپنے متعلق کیا چاہتی ہیں اور مردوں کے متعلق کیا خیالات ہیں۔ بہتر رہے گا اگر لکھنے والی محترمہ بہنیں جب مرد پر بحیثیت "بچّے" کے کچھ لکھیں تو راقمہ کم از کم ایک درجن بچوں کی ماں ہو اور جب بحیثیت "بھائی" کے لکھے تو راقمہ بھائی ضرور رکھتی ہو۔ اس طرح جب مرد پر بحیثیت خاوند کے روشنی ڈالی جائے تو وہ ازدواجی زندگی کا دس سالہ تجربہ رکھتی ہو۔ اور اگر ہمّت کر کے کوئی بہن شادی کے بعد جنسی تعلقات پر رائے زنی کرے تو مرد نمبر کا کوئی بھی پہلو تشنہ نہیں رہے گا۔

عورت کے لئے مرد کے کئی پہلو ہیں۔ مثلاً مرد بحیثیت باپ، بھائی، اولاد، شوہر، دوست ———— وغیرہ وغیرہ

ہم سائیکولوجی کا مطالعہ کرنے والی ہر بہن سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ مرد کے کسی ایک پہلو پر ضرور کچھ نہ کچھ لکھیں۔ اور مرد نمبر کو کامیاب بنانے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں —

یہ ضروری نہیں ہے کہ وہی لکھیں جن کو مضمون نگاری سے شوق ہو۔ جو اکثر لکھتی رہتی ہوں بلکہ ہم ہر ایک کو دعوت دیتے ہیں۔ خواہ مرد نمبر کے لئے لکھا ہوا مضمون ان کا پہلا ہی مضمون کیوں نہ ہو۔ مضمون جلد ہی پہنچ جانا چاہیئے۔

کچھ فرار کے متعلق

پچھلے شمارہ میں ہم نے فرار کے متعلق آپ کی رائے پوچھی تھی۔ جو خطوط اس سلسلہ میں ہم کو ملے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہم نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ اس سلسلہ کو منقطع کر دیا جائے۔ چنانچہ اس شمارہ میں فرار موجود نہیں ہے۔ اس کے بجائے ہم نے محترمہ زرّین عذرا کا بچوں [illegible] کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ جو امید ہے آپ کو پسند آئے گا۔ اچھا اب پھر

(ادارہ)

آپ کی محبّت کے بغیر

یہ "بچّے" نہیں، اچّھی خاصی مصیبت ہیں

(ڈاکٹر ایلین الوو)

چند سال ادھر جب ہمارے سماج کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا اور فضا میں نفرت اور جنگ کے بھوت ناچ رہے تھے، ناروے کے دور
دراز ملک میں ابسن IBSEN دل ہی دل میں اُلجھ رہا تھا کہ ایسا کیوں؟

ابسن، جی ہاں، وہی ڈرامہ نگار ابسن
"ایسا کیوں" کا جواب تو اس نے نہیں دیا مگر تمام دنیا کے سوچنے والے دماغوں کے سامنے چند سوالیہ نشان، چند "کیوں" کے
سوالیہ نشان رکھ گیا، کہ لوگو سوچو ایسا کیوں ہے۔

آخر اس عورت کا کیا حشر ہوتا ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے گھر کو خیرباد کہہ دیتی ہے، ان لوگوں کا کیا ہوتا ہے جن کو وہ چھوڑ جاتی ہے۔ ان بچّوں کا کیا ہوتا ہے جنہوں نے اس کے بطن میں زندگی کی اوّلیں سانسیں لی ہیں؟

میں اس وقت صرف بچوں پر روشنی ڈالنا چاہتی ہوں
یہ بچّے، جو ایک "مصیبت" بن جاتے ہیں۔ ایک "معمہ" جن کو حل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی

آیئے دیکھیں کہ ان بچوں میں کیا کیا باتیں پائی جاتی ہیں۔
یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ ہر بچہ اپنی اپنی ماں کے لئے علیحدہ علیحدہ "معمے" پیش کرتا ہے۔ جس کو حل کرنے میں وہ بیچاری کبھی کبھی پریشان ہو کر ہمت ہار بیٹھتی ہے۔ بچے ایک جیسے تو ہوتے نہیں، خود ایک ہی خاندان میں وہ ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہوتے ہیں کہ کبھی کبھی تو یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ آپس میں بھائی بھائی، بھائی بہن نہیں۔ بلکہ غیر ہیں، مگر ٹھہریئے۔ میں اپنے تجربوں کی بنا پر ایسے بچوں پر روشنی ڈالنا چاہتی ہوں۔

آپ انسان کے تمام حرکات و سکنات اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جبکہ آپ اُس شعور اور لاشعور کا مطالعہ کریں۔ اور ہاں۔ اس کو بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ کہ دماغ کا $\frac{1}{4}$ حصہ شعوری ہوتا ہے اور $\frac{3}{4}$ حصہ لاشعوری۔

لاشعور میں زندگی کے ایک ایک لمحہ کے حادثات محفوظ ہو جاتے ہیں۔ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں، جو کچھ سنتے ہیں جو کچھ بھی ہم پر اثر انداز ہوتا ہے وہ سب کا سب اس ذخیرہ میں بند رہتا ہے۔ ہماری یادداشت یہیں سے اپنے تانے بانے بنتی ہے۔ اور یہی وہ حصہ ہے جو بہت ہی خطرناک ہے۔
اور شعور ——— اس کے سامنے تو ہر وہ چیز موجود رہتی ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں، سن رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ تمام باتیں بھی موجود رہتی ہیں جو کسی خاص وقت میں یاد نہیں آتیں۔ جن پر اس کی نظر نہیں پڑتی ——— ہم لاشعور سے حسب خواہش سلسلہ قایم کر سکتے ہیں۔ اپنے بچپن کے واقعات یاد کر سکتے ہیں، اپنے احباب کی شکلیں، ان کے خدوخال کو تصور میں لا سکتے ہیں۔ لیکن بہت سی ایسی باتیں ہیں، ایسے واقعات ہیں جو ماضی کے دھندلکوں میں اس طرح روپوش ہو گئے ہیں کہ ہمارا شعور ان تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے

اگر ایسی ہی کوشش کی جائے تو شاید ان تک شعور کا گذر ہو۔ ورنہ ——— اول ہونہ ——— اور اسی دفینہ میں ——— زہرناکیاں پنپتی ہیں۔ پرورش پاتی ہیں اور کسی دن، کسی وقت لاوے کی طرح پھوٹ نکلتی ہیں۔

اب بچوں پر آئیے۔

بچے کی تربیت اسی وقت شروع ہوجاتی ہے جب کہ وہ پہلی سانس لیتا ہے۔ اسی لمحہ سے لاشعور میں تمام نقوش محفوظ ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ اگر تربیت، تعلیم میں ذرا بھی خامی ہے۔ تو بچہ صحیح راہ چھوڑ کر غلط راہوں پر گامزن ہوجاتا ہے۔

میرے تجربے میں جتنے بھی مریض ——— مرد اور عورتیں دونوں ——— آئے ہیں ان کی تحلیل نفسی کے بعد معلوم ہوا ہے کہ سب کی بیماریوں کی جڑیں ان کے بچپن کے گذرے ہوئے زمانہ میں ملتی ہیں۔ وہ سب کے سب اپنے بچپن میں ایسے ہی بچے تھے جن کو بچے نہیں، اچھی خاصی "مصیبت" کہنا چاہیئے۔ ان کے گھر کے ماحول میں "مصیبت" تھی۔ خاص کر ان کی مائیں "عجیب" واقع ہوئی تھیں۔ ان کے خاندان میں مندرجہ ذیل باتوں میں سے ایک نہ ایک بات ضرور موجود ہوتی تھی۔

(الف) ۱۔ ان کے ماں باپ آپس کی محبت کو کھو چکے تھے۔

۲۔ ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے تھے۔

۳۔ ماں۔ ماں بننا نہ چاہتی تھی۔ اُسے بچوں سے کوئی رغبت نہیں تھی۔

اور یہ تو اب جاکے کہیں معلوم ہوتا جا رہا ہے کہ ہر عورت ماں بننے کے قابل نہیں ہوتی۔ اور ہر عورت بچہ کی پرورش کے اہل نہیں ہوتی یاد رکھئے کہ وہ عورت جو بچوں کو پسند نہیں کرتی۔ اُسے ماں بننے کا حق نہیں ہے۔ اُسے ماں بننا ہی نہیں چاہیئے۔ کیونکہ یہ پیار ہی ہے جو اسے تمام مصیبتوں اور تکلیفوں کو برداشت کرنے پر مائل کرتا ہے جو پرورش اور تربیت میں پیش پیش رہتی ہیں۔

بچوں کو ماں کی محبت کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنا پھولوں کو سورج کی شعاعوں کی، نہ کم، نہ زیادہ۔ دھوپ تیز ہوگی تو پھول جھلس جائیں گے کم ہوگی تو مرجھا جائیں گے۔ اسی طرح اگر محبت حد سے بڑھی ہوئی ہوگی تو بچے لاڈ پیار میں بگڑ جائیں گے اور اگر کم ہوگی تو وہ اپنے دل سے محبت کے چراغ بجھا بیٹھیں گے۔ یہ ضروری ناہی کہ عورت کو اپنی زندگی کے مقصد کو تسلی دینے کے لئے بچوں کی ضرورت ہے۔ لیکن پھر بھی یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ اسے اس حالت میں کبھی ماں بننا نہیں چاہیے جبکہ اس کے دل میں اپنے شوہر کی طرف سے نفرت کروٹیں لے رہی ہو۔ اپنے گھر سے بیزاری پھن پھیلائے پھنکار رہی ہو۔

وہ تمام افراد جو بیکاری اور کاہلی میں زندگی بسر کر رہے ہوں۔ وہ بھی ماں یا باپ بننے کے قابل نہیں ہوتے ——— اور ——— کچھ والدین اپنے بچوں سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ کر بیٹھتے ہیں۔ کیونکہ ہوتا یہ ہے کہ جب بچہ کی راہ میں دشواریاں حائل ہوتی ہیں اور وہ اپنے ماں باپ کی مقرر کی ہوئی منزل مقصود پر پہنچنے سے قاصر رہتا ہے تو اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ اور وہ ناامیدی کے غاروں میں تھک ہار کر گر رہتا ہے۔ مر رہتا ہے، فنا ہو جاتا ہے۔ یا وہ پاگل ہو جاتا ہے۔ پاگلوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور ——— جانتے ہیں۔ ان کا کفارہ کس کو دینا پڑ رہا ہے ——— ہم کو آپ کو ——— پورے سماج کو۔

(۲) اس کے علاوہ بچے کی زندگی میں ایک اور بات کا فقدان ہوتا ہے اس کے دماغ میں ہزاروں سوالات اٹھتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو جاننا چاہتا ہے ——— یہ کیوں ہوا ——— یہ کیسے ہوا ——— یہ کیوں ہوا ——— یہ کیسے ہوا ——— مگر بچوں کو بہت کم سمجھایا جاتا ہے۔ اسے محض بچہ اور ناسمجھ سمجھ کر جھڑک دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیئے کہ اسے ہر بات بتائی جائے۔ اس کے ساتھ بڑوں کا سا سلوک کرنا چاہیئے۔ اس کے سامنے ایسے ہی محتاط رہنا چاہیئے جیسے بڑوں کے سامنے، جیسے عزیزوں کے سامنے۔

اور پھر ——————— جو بچے جسمانی کمزوری لئے ہوئے پیدا ہوتے ہیں - ان کو پڑھنے، پنپنے کی تمام سہولتیں مہیا نہیں ہوتیں - وہ پانچ چھ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اپنی زندگی کے "قواص" پیدا کر لیتا ہے - بڑھتی عمر کے ساتھ یہ عادتیں بڑھتی رہتی ہیں - اور تمام عمر ویسا ہی رہتا ہے - جیسا وہ اس ننھی عمر میں بنتا ہے - اور چونکہ اس عمر میں بچہ کو سب سے زیادہ جس ہستی کی قربت نصیب رہتی ہے - وہ اس کی ماں ہے - یا وہ عورت ہے جو اس کی پرورش کرتی ہے - اس لئے یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ ماں اس کی زندگی کی راہیں مقرر کرنے میں ایک اہم کردار ہے - وہ اس پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے -

اُس کے بعد استادوں اور معلموں کی باری آتی ہے - ماں کے بعد وہی سب سے زیادہ بچہ کی زندگی بنانے میں حصہ لیتے ہیں - اگر سماج استادوں اور معلموں سے کچھ امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہے - تو وہ حق بجانب ہے - بچہ جیسے ہی اسکول میں داخل ہوتا ہے - وہ اپنے گھر کے باہر کی دنیا میں قدم رکھتا ہے - وہ دنیا جہاں کے افراد کے ساتھ اس کو مل کر رہنا ہے - کام کرنا ہے - زندہ رہنا ہے - مرنا ہے - اسکول ہی میں اسے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر رہنے کی تعلیم ملتی ہے - اخلاق و آداب محفل کے اوراق کھلتے ہیں اور یہیں اس کی زندگی میں "لمحہ فکریہ" شروع ہوتا ہے اسے کیا کیا کرنا ہے - کیا کیا کرنا چاہیئے - اور کیسے کرنا چاہیئے - یہ ضروری ہے کہ وہ اسکول میں دوسرے بچوں کے ساتھ رہنا سیکھے، ان کے ساتھ مل کر کھیلنا اور پڑھنا سیکھے اور سماج کے معین کردہ اخلاق کو مانے -

یہ بچے ——————— جو آج "مصیبت" بنے ہوئے ہیں - ان کی ذمہ داری کسی ایک فرد پر نہیں رکھی جا سکتی - وہ گھر میں اپنی ماں کے سانچوں میں ڈھلتے ہیں، اسکول میں ان کی جلا ہوتی ہے - اور سماج کا ایک حصہ بنتے ہیں، اُن کی ذمہ داری ہم سب پر ہے - آپ پر، مجھ پر، ہم عورتوں، مردوں پر، جو سماج کے خمیر کو گوندھتے ہیں - اور اس زمین پر رہتے ہیں - اور آسمانوں کی بلندیوں کو چھوا کرتے ہیں ٭　　　(ترجمہ ادارہ)

واقعہ اور واہمہ

ڈاکٹر سید محمد محسن ایم اے پی ایچ ڈی (اڈنبرا) پٹنہ

ارتقاء ذہن و شعور کے اولین دور میں واقعہ اور واہمہ کے امتیاز کی صلاحیت شرمندۂ وجود نہیں ہوئی تھی۔ مشاہدہ اور متخیلہ کی کارفرمائی اور اثر اندازی میں کوئی فرق نہ تھا۔ بلکہ متخیلہ کا اثر اکثر و بیشتر مشاہدہ پر حاوی رہتا اور لوگ ایسی باتوں پر بھی یقین کر لیا کرتے جن کی صداقت کا ثبوت مشاہدہ میں بہم نہ ہو سکتا اور جو بسا اوقات مشاہدہ کے خلاف بھی ہوا کرتیں۔ اس دور میں گمان و یقین کی بنیاد واقعات سے زیادہ جذبات و خواہشات پر ہوا کرتی۔ بلکہ بعض صورتوں میں قوت مشاہدہ کی باگ بھی جذبات و خواہشات کے بس میں ہوئی۔ اور واقعات جذبات و خواہشات کی رنگ آمیزی سے اپنی اصلی شکل و صورت کو کھو بیٹھتے۔ ہمارا موجودہ ذہن واقعہ اور واہمہ کے فرق سے کماحقہٗ آگاہ ہوتے ہوئے بھی اکثر حالات میں اس کا استعمال کھو بیٹھتا ہے۔ اور واہمہ اور متخیلہ کی ایجاد سے اسی طرح متأثر ہونے لگتا ہے۔ جیسے واقعات کے مشاہدہ سے جادو کا اثر بعض قوموں اور بعض افراد کے اعمال و افعال پر ہنوز قایم ہے۔ واہمہ پرستی اب تک بعض جماعتوں کا طرۂ امتیاز بنا ہوا ہے۔ یہ اپنے متخیلہ کو واقعات کی جانچ پڑتال سے شرمندہ نہیں کرتیں۔ ان کے ذہن پر بھوت پریت ڈائن اور چڑیل کی حکومت کا سکہ اب تک بیٹھا ہوا ہے۔ وہ اپنے تصور کی فریب کاری، اور اپنے تخیل کی کرشمہ سازی کی اب تک شکار ہیں۔ وہ کسی بیان کی صداقت مشاہدہ میں تلاش کرنے کے بجائے اسے اپنے متخیلہ میں ہو لیتی ہیں۔ اور اپنے اعمال و افعال پر اسے کامل دسترس دیدیتی ہیں۔ ان کا ذہن اب تک بچپن کی سرحد سے آگے نہیں بڑھا ہے۔ ان کے اندر جانچ پڑتال کی صلاحیت اپنی اولین منزل میں ہے۔ بے تک باتیں، بے بنیاد افواہیں، بے پر کی خبریں ان کے اعمال و افعال کو اسی طرح متحرک کر دیتی ہیں۔ ان کے اندر ویسے ہی طربناک یا خوف آور جذبات کو ابھار دیتی ہیں۔ جیسے کسی کے دیرینہ آرزو کی واقعاتی تکمیل یا کسی دہشتناک حادثہ کا حقیقی مقابلہ۔ وہ اپنی تمناؤں کی تسکین، اپنی امانتوں کا حصول خارجی حالات سے مستغنی اور ٹھوس واقعات و مشاہدات سے بے نیاز ہو کر کر لیتی ہیں۔ ان کا تخیل اپنی وسیع اور بے پایاں قوت ایجاد کے ذریعہ ان کے سامنے دلکش واقعات اور سنہرے حالات کا جامع و مکمل نقش پیش کر کے انہیں فریب یقینی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور اس طرح ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کو واقعات کے تیز نشتر، حقیقت کی بے درد تنقید، اصلیت کی بے لوث جانچ سے امن و سلامتی کا پیغام سنا دیتا ہے۔ ان کی تمنائیں، ان کے ارمان، ان کی ترغیبات، اور ان کے محرکات، حقیقت اور واقعات سے مستغنی ہو کر تصور کی کارفرمائی، واہمہ کی نظر فریبی، تخیل کی جدت طرازی کے رہین بن جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی تسکین و کامرانی کے لئے اپنے اعضا کو حرکت دینے کے بجائے تخیل کی باگ ڈھیلی کر دیتے ہیں اور ان پر ایک خواب کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ان کے اعضا شل ہوتے ہوئے بھی انھیں سرگرم عمل محسوس ہوتے ہیں۔ ان کا جسم ساکت ہوتے ہوئے بھی انھیں متحرک معلوم ہوتا ہے۔ ایسے جاگتے خواب کی مُسکرا دیر کیفیت کا تجربہ ہم آپ سبھی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ جب ذوق عمل کی سرگرمی جسم و اعضا کی حرکت کی رہین نہیں ہوتی تو ہم شیخ چلی کی طرح خیالی پلاؤ پکا کر اپنے کام و دہن کی دعوت کا سامان کرنے لگتے ہیں۔ اس جاگتے خواب اور سوتے خواب میں فرق اتنا ہی ہے کہ سوتے میں ہمارے حواس معطل ہو کر ہمیں خارجی دنیا سے بے واسطہ کر دیتے ہیں۔ مشاہدہ کی ناقدانہ کارفرمائی کا عمل بند ہو جاتا ہے۔ اور تخیل کی بے روک کارکردگی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ بھانت بھانت کی صورتیں، طرح طرح کے مناظر بے ربط حالات، بے تک سانحات کی ایجاد کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور

واقعہ کا امتیاز یکسر غائب ہو جاتا ہے اور جو کچھ خواب میں دیکھا یا سُنا جاتا ہے ۔ ٹھوس حقیقت اور بے لاگ واقعہ کی اثر اندازی کا حامل ہوتا ہے ۔ خوف، رنج، غصّہ، محبت، نفرت، خوشی، کامرانی، نامرادی کے جذبات بالکل اسی طرح پیدا ہوتے اور اثر کرتے ہیں ۔ جیسے بیداری کی حالت میں ۔ پامال آرزوئیں، حسرت زدہ تمنائیں، تشنۂ تکمیل تقاضے، رکی ہوئی خواہشیں، اور دبائے ہوئے محرکات، تخیل کی قوت ایجاد، اور واہمہ کی نظر فریبی کے ذریعہ اپنی تسکین حاصل کرنے لگتے ہیں ۔ جاگتے خواب میں بھی یہ فریب کاری، یہ ساری جدت طرازیاں اسی رنگ میں کارفرما ہوتی ہیں ۔ فرق یہ ہے کہ سوتے خواب میں ماحول سے کنارہ کشی عمداً ظہور پذیر ہوتی ہے ۔ حواس کا فعل ارادتاً روک دیا جاتا ہے ۔ اور خارجی ماحول کا مشاہدہ جان بوجھ کر التوا میں ڈال دیا جاتا ہے ۔ اس کے برخلاف جاگتے خواب میں فرار کا انداز ہوتا ہے ۔ خارجی ماحول سے بے وابستگی لاشعوری طور پر پیدا ہو جاتی ہے ۔ حواس کام کرتے ہوئے بھی اٹل واقعات اور ٹھوس حقیقت کے مشاہدہ سے قاصر ہو جاتے ہیں ۔ بلکہ بعض وقت تو تخیل کی ایجاد واقعہ کے روپ میں آنکھوں کے آگے دکھائی اور کان سے سنائی دینے لگتی ہے ۔

حالات سے بے نیازی، واقعات سے بے تعلقی، واہمہ کی جلوہ فرمائی، تخیل کی کارکردگی مغالطہ کا عمل، اور یقین کا فریب، یہ ساری صورتیں ایک خاص قسم کی ذہنی مرض کی کیفیتوں میں رونما ہوتی ہیں اسے PARANOIA (فریب یقین) کہتے ہیں ۔ مریض پر کسی خاص جذبہ کا تسلط ہوتا ہے ۔ اور اس کی فکر اس کی حسیات، اس کے اعمال و افعال، اس کے تأثرات، ان سبھوں کی تحریک و ترتیب میں یہ جذبہ ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے ان سبھوں کی رہنمائی اسی جذبہ کی روشنی میں ہوتی ہے ۔ مثلاً جذبۂ تفوق و برتری، مریض اپنی ذات کو کسی عظیم الشان شخصیت کے تصور میں ضم کر لیتا ہے اور اسے اپنے وہی شخص ہونے کا یقین کامل ہو جاتا ہے ۔ ایک ایسا ہی مریض اپنے کو ملکہ وکٹوریہ سمجھنے لگا تھا ۔ حالانکہ وہ ایک ادنیٰ حیثیت کا انسان تھا ۔ اور مرض کا شکار ہونے سے پہلے بڑی دشواریوں کا مقابلہ کر کے اپنی روزی کا سامان کرتا تھا اس مغالطہ میں مبتلا ہونے کے بعد اس نے سارے کام دھندے چھوڑ دیئے ۔ اور شاہانہ تمکنت اور جلال کے انداز میں دوسروں پر حکومتیں کرنے لگا ۔ اس نے رنگین ریشمی دھجیوں کا تاج بنا کر اپنے سر کی رونق اور اسی طرح گدڑوں کی شاہی عبائے اپنے جسم کی تزئین کا سامان کیا ۔ اس کی چال ڈھال میں شاہانہ وضع قطع کی جھلک پیدا ہو گئی ۔ ہر دوسرا شخص اسے اپنا مطیع اور خدمت گذار معلوم ہونے لگا ۔ وہ ماحول کی ہر شے کو اپنی ملک سمجھنے لگا اور اس کے تصرف کی کوشش کرنے لگا ۔ دوسروں کی عدول حکمی، ان کی مزاحمت اُسے برانگیختہ کر دیتی ۔ اور وہ انہیں نشانۂ تادیب بنانے کی سعی کرتا ۔ ظاہر ہے کہ اسے اس کیفیت میں آزادانہ چھوڑ دینا سوسائٹی کے لئے مضر ہوتا اس لئے اسے پاگل خانہ میں مقید کر دیا گیا ۔ لیکن وہاں بھی اس کے مغالطہ کی اصلاح نہ ہو سکی ۔ مجھے ذاتی طور پر اس قسم کے پاگلوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے ۔ وہ آپ سے ایسی سلجھی ہوئی گفتگو کریں گے کہ آپ انہیں صحیح الدماغ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے ۔ ایک اینگلو انڈین پاگل کی داستان سنیئے ۔ میں اس کے قریب گیا ۔ تو اس نے کمال گرم جوشی کے ساتھ مجھے سلام کیا ۔ مزاج پرسی کی ۔ میری آمد کی وجہ دریافت کی ۔ چند دوسرے پاگلوں کی حرکات پر تبصرہ اور رائے زنی کی ۔ انتظام کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی ۔ اور جب میں نے پاگل خانہ میں اس کے قیام کے متعلق سوال کیا تو اس نے اپنی داستان شروع کر دی ایک طویل قصہ تھا جو اس جوش عقیدت اور واقعاتی رنگ میں پیش کیا گیا تھا کہ اسے محض فرضی داستان سمجھنے کی گنجائش نہ ہو سکتی تھی ۔ وہ آسٹریلیا کا رہنے والا تھا اور حکومت میں ایک معزز عہدہ پر فائز تھا اس کی راہ و رسم ایک معزز خاندان کی جمیل و شائستہ دوشیزہ سے ہو گئی تھی اور دونوں نے شادی کا عزم کر لیا تھا ۔ حکومت کا ایک دوسرا عہدہ دار بھی اس لڑکی کی محبت کا شکار تھا ۔ اس کے دل میں رقابت کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ اس کی آزار و حزیمت کے پیچھے لگ گیا چنانچہ اسی نے حکومت میں اس کی شکایت کر کے اسے معزول کرا دیا ۔ لیکن یہ مقربین بارکنان حکومت رہ چکا تھا اور حکومت کے بعض ایسے راز سے واقف تھا جن کا اشتہار حکومت کے اقتدار کو خطرہ میں ڈال دیتا ۔ اس نے اپنے رقیب کو ان کے افشاء کی دھمکی دی ۔ وہ غایت متنبہ ہوا اور حکومت کے اذن سے اس نے اسے فوراً حراست میں ڈلوا دیا اور اس کے پاگل ہونے کا فیصلہ کرا کے ہندوستان میں پاگل خانہ کے اندر مقید کرا دیا ۔" داستان نہایت مکمل اور سلجھی ہوئی تھی ۔ ساری باتوں میں ایک مستقل ربط اور ہم آہنگی تھی ۔ جی چاہتا تھا کہ ان پر صداقت کی مہر ثبت کر دی جائے کہ اس "معقول —"

انسان نے میری موجودگی میں پتلون کے بٹن کھول کر کھڑے کھڑے موتنا شروع کر دیا اور دانت کھول کر بچوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ میں نے پاگل خانے کے ڈاکٹر کی وساطت سے اس کی پچھلی زندگی کے متعلق دریافت کیا تو یہ ساری باتیں منگھڑت معلوم ہوئیں۔ نہ وہ آسٹریلیا کا رہنے والا تھا نہ اسے وہاں کوئی عہدہ حاصل تھا۔ حقیقت میں وہ اینگلو انڈین نسل کا ہندوستانی تھا اور پاگل ہونے سے پہلے اس کی ای۔ بی ریلوے میں ملازمت تھی۔ اس کی بیوی بچے ہندوستان میں ہی رہتے تھے اور حال ہی میں اس کی بیوی اسے دیکھنے آئی تھی۔

مغالطہ کے ایسے شکار آپ کو اکثر صحیح الدماغ انسانوں میں بھی ملیں گے لاف زنی اور مبالغہ آمیزی ان شخصیتوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ اپنی ذات کے متعلق اتنے بلند تصورات رکھتے ہیں، انھیں اپنی صلاحیتوں کی بے پایاں وسعت کا اتنا غالب احساس اور یقین ہوتا ہے کہ اپنی حقیقی، ہیچ میرزی، اپنی اصلی کم مائگی، اپنے واقعاتی نقائص پر ان کی نگاہ نہیں پڑتی۔ وہ کمال راست بازی اور خلوص کے ساتھ اپنے آپ کو فردوسیٔ عصر، ارسطوئے زماں، اقبالِ وقت باور کرتے ہیں۔ اور اپنی حیرت انگیز دقت نظر، اپنی معرکۃ الآرا پرواز فکر، اپنی انوکھی سوجھ کی مسلسل داستانوں سے آپ کو مسحور کرنے کی سعی لاحاصل میں آپ کی سمع خراشی اور دل برداشتگی کے موجب بنتے ہیں۔ اگر کہیں ان کے دماغ میں اپنی مذہبی برتری اور روحانی تفوق کا فریب سما جاتا ہے تو پھر وہ اپنے پیغمبر عہد، مجتہد عصر اور امام وقت ہونے کے یقین میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کامل جوش عقیدت اور خلوص کے ساتھ اپنی غیب دانی اور الوہیت کا سکہ عوام پر جمانے کی کوشش میں سرگرم عمل ہوتے ہیں۔

مبالغہ آمیز گفتگو اور غلط بیانی بھی اکثر واہمہ کی فریب کاری اور تخیل کی جدت طرازی کی پیداوار ہوا کرتی ہے۔ یہ بھی واقعیت سے بے وابستگی اور اصلیت سے بے دلی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مبالغہ گو بھی دوسروں کی طرح واقعہ کا مشاہدہ کرتا ہے لیکن اس کا حافظہ مشاہدہ سے زیادہ خواہشات و جذبات محرکات و ترغیبات کا مطیع ہوتا ہے چنانچہ اس کا تخیل واقعات کی کتر بیونت کر کے اور ان میں خیالی باتیں اور وہمی حالات جوڑ کر انھیں ایک نئے روپ میں وضع کر دیتا ہے۔ اس کا حافظہ تخیل اور واہمہ کی اس ایجاد کو فریب یقین کے زیر اثر اصل واقعہ سمجھ کر دوسروں کے سامنے بھی اس واقعہ اور اصلیت کی صورت میں پیش کرنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیانی واقعہ کو اصل واقعہ سے صرف دُور کا لگاؤ رہ جاتا ہے۔ حافظہ پر جذبات و ترغیبات کے اثر کو نیٹشے نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ کہتا ہے "میرا حافظہ کہتا ہے۔ مجھ سے یہ فعل سرزد ہوا ہے میرا پندار کہتا ہے میں نے ہرگز ایسا نہیں کیا اور میرے حافظہ پر مسلط ہو جاتا ہے۔ میرا حافظہ ہار مان لیتا ہے۔"

ہماری سوسائٹی میں کتنے ایسے "معصوم" دروغ گو ہیں جنہیں غلط بیانی کی لت ہو گئی ہے۔ ان کا جھوٹ کسی مادی منفعت کا ذریعہ بننے کی بجائے اکثر و بیشتر انھیں پشیمانی اور ذلت و خواری کا شکار بنا دیتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی عادت سے باز نہیں آتے۔ ایسی شخصیتوں پر واہمہ اور تخیل کی حکومت ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنی خواہشوں اور رجحان کو اپنی ترغیبوں اور جذبات کو واقعات کے مقابلہ میں یا یہ تکمیل تک پہنچانے سے قاصر ہیں اور اس لئے ان کی تشکیل کے لئے وہ واہمہ اور تخیل کی فریب کاری کے منت کش ہیں۔ ان کے اندر واہمہ اور واقعہ حقیقت اور تصور مشاہدہ اور مبالغہ یقین اور مغالطہ کی تمیز پوری طرح نشو و نما نہ پا سکی ہے۔ ان کی ناقدانہ صلاحیتیں پوری بالیدگی اور پختگی نہ حاصل کر سکی ہیں۔ ایک صاحب نے اپنی غلط بیانی کی عادت کے متعلق ایک دلچسپ بیان دیا ہے۔ وہ بعض واقعات محض خوش گپی کی خاطر یا اپنی واقفیت کا اثر ڈالنے کی غرض سے گڑھ کر دوستوں میں بیان کرتے ہیں کچھ عرصہ کے بعد اگر کوئی ان کے اس بیان کا حوالہ دیتا ہے تو انھیں یاد نہیں رہتا کہ وہ ان کی قوت تخیل کا کرشمہ تھا بلکہ وہ خود بھی کامل یقین کے ساتھ اسے واقعہ ہی سمجھتے ہیں اور آئندہ کمال دیانتداری کے ساتھ واقعہ کہہ کر پیش کرنے لگتے ہیں۔

روزمرہ زندگی میں ہمیں متخیلہ کی سحر طرازی اور واہمہ کی فریب کاری کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ کسی شخص کا ناروا سلوک آپ کے اندر نفرت اور انتقام کے جذبات ابھار دیتا ہے تو آپ اس کا اظہار کسی ایسے اقدام عمل کے ذریعہ کرتے ہیں جس سے اسے کوئی حقیقی گزند یا نقصان پہنچ جائے۔ اگر آپ کے انتقام کی آگ غیر معمولی طور پر تیز ہو جاتی ہے تو اکثر آپ اسے مالی نقصانات یا جسمانی اذیتوں میں مبتلا کر کے اور کبھی کبھی اس کی زندگی کا چراغ بجھا کر دم لیتے ہیں

بعض حالتوں میں اگر دشمن آپ کی زد سے بچ نکلتا ہے تو آپ اس کی بے گناہ بیوی اور معصوم بچوں سے اس کا انتقام لینے پر تل جاتے ہیں۔ لیکن نفرت اور انتقام کے اظہار کی صرف یہی ایک واقعاتی صورت نہیں ہوتی۔ اگر آپ کسی وجہ سے ان جذبات کی تسکین واقعیت اور اصلیت کے ذریعہ نہیں حاصل کر سکتے تو یہ مجبور و بے بس نہیں بن جاتے۔ بلکہ اپنی تسکین کے لئے دوسرے اسلحات بھی رکھتے ہیں جو قدیم آلہ نکیبی ہونے کی بنا پر وقتی مدافعت کے لئے کافی کارآمد اور مفید ہیں۔ یہ آلات متخیلہ اور واہمہ کی کارکردگی کے نمونے ہیں۔ غنیم اگر ہلاکت کی زد سے بچ نکلتا ہے تو اس کا پتلا بنا کر آتش نذر ہلاکت کیا جاتا ہے۔ اس کی گردن پر چھری چلائی جاتی ہے۔ یا اس کا تن نازک باریک سوئیوں سے گھائل کیا جاتا ہے اور اس طرح تصویر و تصور تسکین کی لذت، فتح و کامرانی کی مسرت، کا سرچشمہ بن جاتے ہیں۔ گنوار قوموں میں اس طرح کے ٹوٹکوں کا استعمال بکثرت پایا جاتا ہے۔ غنیم کے بال یا ناخن اس جذبۂ انتقام کی تسکین کے لئے بیش بہا مقبوضات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھیں نذر آتش کر کے غنیم کو مورد ہلاکت بنایا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ عورتیں اپنے سر کے ٹوٹے ہوئے بال بے پروائی سے پھینک دینے کے عوض یا تو انھیں کمال احتیاط سے کہیں چھپا کر رکھ دیتی ہیں۔ چوندی کے بہتے دھارے کی امان میں ڈال دیتی ہیں۔ آپ کو بچپن کی یہ ہدایتیں اب تک یاد ہوں گی کہ "ناخن کے ٹکڑوں کو ضائع نہ ہونے دو۔ انھیں چُن کر اور ایک پڑیہ میں ڈال کر کسی محفوظ کونہ میں رکھ دو" یا "دودھ کے دانت ٹوٹ جائیں تو انھیں زمین میں دفن کر کے چھپا دو" یہ ہدایتیں انھیں ٹوٹکوں کے اثرات کی مدافعت کا سامان کرتی ہیں۔

بعض حالات میں غنیم کی تصویر یا اس کے کسی دوسرے قایم مقام کی منت کشی سے بھی بے اعتنائی کی جاتی ہے۔ اور اسے زبان کے نشتر کوسنوں کے ذریعہ گھائل کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح اس کی بربادی اور ہلاکت کی تصویریں ذہن میں کھینچ کر تسکین حاصل کی جاتی ہے۔ عین شباب میں اس کا جنازہ اٹھایا جاتا ہے۔ اس کی اولاد کی قبل از وقت ہلاکت کا نقشہ کھینچا جاتا ہے۔ اس کے جسم میں کوڑھ پھوٹنے کا منظر تیار کیا جاتا ہے۔ آپ اگر گالیوں اور کوسنے کے استعمال اور ان کی اثر اندازی پر غور کریں تو ان کے اندر آپ کو تخیل اور واہمہ کی کارگذاری کا صاف عکس نظر آئے گا۔ ظاہر ہے کہ گالیاں کسی کو چپک نہیں جاتیں نہ گالیاں کسی کی حقیقی تشہیر و رسوائی، ذلت و خواری کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ جو الزامات اور جو تہمتیں گالیوں میں پیش کی جاتی ہیں یکسر لایعنی و مہمل ہوا کرتی ہیں۔ انھیں واقعہ اور اصلیت سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہوتا۔ پھر بھی عام طور پر ہمیں گالیوں کی برداشت نہیں ہوتی۔ ہم گالیوں سے اسی حد تک متاثر ہوتے ہیں جیسے کسی اس واقعہ کے بیان سے جس سے ہماری خاندانی عزت اور شرافت میں بٹہ آتا ہو۔ اگر کوئی ہمیں گالیاں دیتا ہے تو ہم اپنے آپ کو ویسی ہی اہانت و ذلت، بدنامی و رسوائی کا شکار محسوس کرتے ہیں۔ اور کچھ اسی طرح جز بز اور از خود رفتہ ہو جاتے ہیں۔ جیسے اپنی کسی حقیقی لغزش کے ناگہانی احساس یا اپنے گھر یا خاندان والوں کے کسی اخلاق سوز عمل کی ناگہانی واقفیت سے۔ آپ نے ایسے کتنے واقعات سنے ہوں گے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو ماں یا بہن کی گالی دی۔ اور آخر الذکر اس کی تاب نہ لا سکا۔ اس کی گردن پر خون سوار ہو گیا اور محض گالی بنائے قتل بن گئی۔ جیسے گالی دینے والے نے اس کی ماں یا بہن کی کسی حقیقی لغزش کا اظہار کر کے اسے ابھار دیا ہو، یا واقعی میں اس کی ماں یا بہن کی عصمت پر حملہ آور ہو کر مستوجب ہلاکت بن گیا ہو۔ یہی حال کوسنوں کا ہے۔ کوسنے دینے والا اور کوسنوں سے متاثر ہونے والا دونوں ہی ٹھوس واقعات اور محسوس حقیقت کی قلمرو سے باہر نکل آتے ہیں۔ اور دونوں ہی پر تخیل کی فریب کاری اور تصور کا جادو عمل فرما ہوتا ہے۔ کوسنے دینے والا اسی انہماک کی گرمی اور انھیں جذبات کی فراوانی کے ساتھ کوسنے دیتا ہے۔ جن کا وہ اپنے ہر واقعاتی عمل اور حقیقی فعل میں اظہار کرتا ہے۔ کوسنوں کی بارش اس کے نفرت اور انتقام کی آگ کو اسی طرح سرد کر دیتی ہے۔ جیسے اس کے عمل انتقام کی حقیقی کامیابی۔ کوسنے سننے والا بھی ان سے اسی طرح متأثر ہوتا ہے جیسے کسی حقیقی گزند یا کسی مادی تکلیف و محرومی کا نشانہ بنایا جا رہا ہو۔ اگر ان کوسنوں کو واقعات کی روشنی میں جانچا جائے تو یہ محض لایعنی بکواس، بے تُک باتوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ لیکن پھر بھی ان کی اثر اندازی بعض صورتوں میں واقعات و مشاہدات پر بازی لے جاتی ہے۔ اگر کسی عورت سے اس کی کوئی بدخواہ یہ کہے کہ "تیرا جوان لڑکا مر جائے" تو اول الذکر کو اس پر چیں بجبیں ہونے کے عوض اسے خموشی سے سن لینا چاہیئے۔ ایسی باتیں دشمن ہی کے منہ سے سنی جاتی ہیں۔ اور دشمن کے دل میں ایسی تمناؤں کا پیدا ہونا کوئی غیر متوقع بات نہیں۔ جب

تک اس کا لڑکا صحیح و سلامت ہے تو اس سے کیا مطلب کہ دوسرا اس کی زندگی کی آرزو رکھتا ہے۔ یا اس کی موت کی تمنا۔ عقلی طور پر نہ کسی کی تمناؤں کا زہر کسی کو نشانہ ہلاکت بنا سکتا ہے۔ نہ کسی آرزو کا امرت کسی کو پروان چڑھا سکتا ہے۔ لیکن کوسنے سن کر نہ اس کے دماغ میں یہ سنجیدہ خیالات پیدا ہوتے ہیں نہ اس کے اندر عدم توجہی کا انداز نمودار ہوتا ہے۔ بلکہ وہ کوسنوں سے اسی طرح متاثر ہوتی ہے جیسے کسی معتبر ذریعہ سے اس لڑکے کی موت کی خبر پہنچائی گئی ہو اور موت کا باعث کوسنے دینے والی عورت ہو۔ چنانچہ وہ صرف الٹے کوسنے دینے کی حماقت میں اپنے آپ کو مبتلا نہیں کرتی بلکہ نوحہ و ماتم کی ہر وہ صورت پیش کرنے لگتی ہے جو کسی عزیز خاص کی موت پر ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا گریہ و بکا اس کی سینہ کوبی، اس کی از خود رفتگی راہ چلتوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔

میرا پسندیدہ قطعہ

(اظہر)

حسن کا عطر، جسم کا صندل

عارضوں کے گلاب، زلف کا عود

بعض اوقات سوچتا ہوں میں

ایک خوشبو ہے صرف تیرا وجود

جان نثار اختر

تیرا چاند سا چہرہ پہ شفق سے عارض

جیسے فردوس کے پھولوں نے سنوارا ہو انھیں

چاندنی رات کے ہونٹوں کا تبسم لے کر

مسکراتی ہوئی کرنوں نے تراشا ہے تمہیں

صہبا اختر (علیگ)

تیرے جمال، تری مسکراہٹوں کے چراغ

بجھا کے خاک بہاروں کو کر گئے ہوتے

جو تیرے چاند سے ماتھے پہ برف کے موتی

بشکل موجۂ شبنم بکھر گئے ہوتے

صہبا اختر (علیگ)

قطعات

ع کے نام

تیرے چہرے کی نظر سوز شعاعوں کی قسم

تیرے چہرے سے سحر نور لیا کرتی ہے

تیری آنکھوں میں مچلتا ہے ستاروں کا غرور

تیرے ہونٹوں پہ شفق رقص کیا کرتی ہے

صہبا اختر

(علیگ)

خاص سائیکولوجی کے لئے

خوف

فطرتِ انسانی کے ایک اہم پہلو کا مطالعہ

پروفیسر علی ناصر زیدی

ایک اتوار کی صبح کو نائی کی دوکان پر ایک شخص حجامت بنوا رہا تھا ۔ حجامت پوری بنی بھی نہیں تھی ، ٹھوڑی پر صابن لگا ہوا تھا کہ وہ ایکا ایکی کرسی سے باہر کودا تولیہ ایک طرف پھینکا اور اپنے چہرہ سے صابن صاف کرتا ہوا تیزی سے دوکان سے باہر نکل گیا ۔ دوکان میں جو لوگ اس وقت موجود تھے اس کی اس حرکت پر انگشت بدنداں رہ گئے ۔ کسی کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آسکا ۔ ایک نے سوال کیا " اس انسان کو آخر ہوا کیا ؟ اس نے بھاگتے وقت اپنا کوٹ اور اپنی ٹوپی بھی نہ اٹھائی !" نائی نے فوراً جواب دیا " تقریباً ہر مرتبہ ایسا ہی ہوتا ہے ۔ جب کبھی وہ آتا ہے حجامت ختم ہونے سے قبل ہی بھاگ کھڑا ہوتا ہے ۔ اس کے دماغ میں یہ خیال جم چکا ہے کہ وہ کسی چھوٹی جگہ میں نہیں سما سکتا ۔ ایک دو گھنٹے کے بعد وہ پھر آجائے گا اور تب کہیں کام پورا ہوگا "۔ سب آدمی اس کے اس جواب پر ہنس پڑے ۔

لیکن یہ کوئی عجیب اور مضحکہ خیز بات نہیں ہے ۔ بادی النظر میں خواہ کچھ بھی ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں ہزاروں انسان اس قسم کے خوف کا شکار ہیں ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ کمرہ جیسی محدود جگہ میں سما نہیں سکتے ہیں ۔ وہ لفٹ میں بھی نہیں بیٹھ سکتے ۔ کسی سرنگ میں نہیں گھس سکتے ۔ ٹرین میں سونے سے خوف کھاتے ہیں ۔ ہوائی جہاز میں سفر کرنے سے ان کی روح کانپتی ہے اور حد یہ کہ بعض بعض تو بند کمرہ میں بستر کے اندر مقید ہو کر سو نہیں سکتے ۔

کچھ آدمی تو احساسِ بندش کو اس درجہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ کسی سینما ہال ، کسی تھیٹر ، کسی بھی بند جگہ میں نہیں بیٹھ سکتے ۔ خواہ تفریحی پروگرام کتنا ہی دل خوش کن کیوں نہ ہو ۔ اگر آپ ان کو مجبور کر کے اپنے ساتھ لے بھی جائیں تو وہ دروازہ کے قریب ہی کسی کھلی نشست پر بیٹھنا پسند کریں گے ۔ اندر گھس کر ان سے نہیں بیٹھا جائے گا اور اگر بیٹھ جانے کے بعد آپ دروازہ کھلا چھوڑ دیں تو اور بھی اچھا ہے ۔ بند مقامات سے ڈرنے کا یہ خوف آخر کیا ہے ؟ یہ کس طرح پیدا ہوتا ہے ؟ اور اس کا علاج کیا ہے ؟ یہ ہیں وہ سوالات جو سالہا سال سے ماہرینِ نفسیات کے زیرِ غور ہیں اور وہ ان کا جواب تلاش کرنے کے لئے مسلسل طور سے کوشش کر رہے ہیں ۔ تمام سوالات کے جوابات تو ابھی تک معلوم نہیں کئے جا سکے ہیں ۔ لیکن اتنی کامیابی ضرور ہو گئی ہے کہ مریض کو اس کی عجیب و غریب تکلیف کا سبب بتا دیا جائے اور اس کے چنگل سے آزاد ہونے کے لئے کوئی صحیح راستہ بھی !

اس قسم کے خوف کے لئے انگریزی میں ایک تکنیکی لفظ استعمال کیا جاتا ہے کلوسٹروفوبیا CLAUSTROFHOBIA یہ دو یونانی الفاظ سے مل کر بنا ہے ۔ کلاسٹرم CLAUSTRUM بمعنی بند محدود جگہ اور فوبیا PHOBIA بمعنی خوف ۔ ڈاکٹر البرٹ سی ۔ بکلے ۔ جو مینسوٹا یونیورسٹی (امریکہ) میں نفسیات کے پروفیسر ہیں ۔ بیان کرتے ہیں " ہر مرد ، عورت اور بچہ میں اس خوف کی جھلک

ملتی ہے ۔ ہم میں سے بہت سے آدمی اس پر قابو پاتے رہتے ہیں اور اس کے ہاتھوں تنگ نہیں ہوتے لیکن کچھ انسان ایسے بھی ہیں جن کی زندگی اسی خوف کے ہاتھوں جہنم بن کر رہ گئی ہے۔"

خوف خواہ کسی بھی شکل میں آئے ہمیشہ تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے ۔ خوف کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک تو عام خوف مثلاً کوئی لاری مخالف سمت سے آپ کی کار کی طرف ہی چلی آرہی ہو تو آپ فوری طور پر ایک خوف محسوس کریں گے لیکن جیسے ہی لاری بچ بچا کر نکل جاتی ہے ۔ آپ کا وہ خوف بھی فوراً ختم ہو جاتا ہے ۔ خوف کی دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق براہ راست انسان کے قویٰ سے ہے اور جس سے صحت، تندرستی ہر چیز تباہ ہو جاتی ہے ۔ آدمی کی وجاہت شکل و شباہت بگڑ جاتی ہے اور بعض اوقات تو دماغی و جسمانی عوارض آموجود ہوتے ہیں ۔ کلوسٹرو فوبیا اسی قسم کا خوف ہے ۔

کلوسٹرو فوبیا اس بنا پر خطرناک سمجھا جاتا ہے کہ یہ سالہا سال تک مریض کا پیچھا نہیں چھوڑتا جب تک کہ مریض اس سے نجات پانے کے لئے خود ہی کوئی مؤثر تدبیر اختیار نہ کرے ۔ اس کی شدت اور طوالت مدت رفتہ رفتہ انسان کی صحت کو چاٹ جاتے ہیں اگرچہ وہ غریب اپنی جگہ یہی سمجھتا رہتا ہے کہ وہ بیمار نہیں ہے ۔ خوف کی یہ قسم قلبی عوارض، ہضم کی خرابیوں، درد سر اور شدید تکان کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے ۔ قلب کی بیماریوں سے تو اس کا انتہا گہرا اور قریبی تعلق ہے ۔ کراس نجنبیر کے قلبی عوارض کے ایک ماہر معالج نے اعلان کیا ہے کہ " میرے ایسے پرانے مریضوں میں جو دل کی پیچیدہ بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہی خوف تمام عوارض کی جڑ پایا گیا ہے "

ماہرین نفسیات اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کلوسٹرو فوبیا میں مبتلا رہنے والے تقریباً تمام مریض اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کا دل صحت مند نہیں ہے ۔ وہ مستقل طور سے خوفزدہ رہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ موت کسی بھی وقت آسکتی ہے ۔ بظاہر یہ بات کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی کہ خوف میں مبتلا رہنے والے انسان قلبی عوارض میں بھی مبتلا ہوں تاہم ایک منطقی تعلق ضرور ہے ۔ کوئی بھی ایسا شخص جو کسی قلبی عارضہ کا شکار ہو جب کسی بند محدود جگہ میں پہنچتا ہے تو خواہ مخواہ گھبرا اٹھتا ہے اور اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے ۔ رفتہ رفتہ زندگی کے دیگر پہلوؤں پر بھی اثر پڑتا ہے اور جا بے جا مریض خوف محسوس کرنے لگتا ہے ۔

کلوسٹرو فوبیا کے مریضوں میں ہضم کی خرابیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں ۔ دھڑکتے ہوئے دل کا براہ راست اثر ان رگوں پر پڑتا ہے جو معدہ اور انتڑیوں سے متعلق ہوتی ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہضم خراب ہو جاتا ہے ۔ انتڑیاں متاثر ہوتی ہیں تو بدہضمی، قبض، دست کوئی بھی عارضہ لاحق ہو سکتا ہے ۔ ایک مرتبہ یہ سلسلہ شروع ہو جائے پھر تسلسل قایم ہو جاتا ہے اور پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے ۔ نیویارک کی ایک کارپوریشن کے دفاتر ایک سربفلک عمارت کی اسّی ویں منزل میں تھے ۔ کارپوریشن کے ایک افسر کو دس سال سے زیادہ عرصہ سے بدہضمی اور شکمی عوارض کی شکایت تھی ۔ اس نے بہت سے ماہر معالجین سے مشورہ بھی کیا لیکن کسی کی سمجھ میں اس کا مرض نہ آیا ۔ آخر کار تنگ آکر اس نے اپنا حال ایک ماہر نفسیات سے بیان کیا جو اس کو ایک ہوٹل میں اتفاقیہ طور پر مل گیا ۔ کھانے سے فراغت پانے پر دونوں باہر آکھڑے ہوئے اور لفٹ کا انتظار کرنے لگے ۔ مریض افسر نے دفعتاً کہا " اگر ہم بیسویں منزل پر نہ ہوتے تو میں تو پیدل اتر جانا زیادہ پسند کرتا کیونکہ لفٹ میں بیٹھنے سے میرے حواس پر برا اثر پڑتا ہے " ۔ اتنے میں لفٹ بھی آگئی اور نیچے اترتے ہوئے ماہر نفسیات نے دیکھا کہ اس کے ہم سفر کے چہرہ پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں تھے ۔ منہ زرد پڑ چکا تھا اور وہ اپنے دانت پیس رہا تھا ۔ اس وقت ماہر علم نے سمجھ لیا کہ اس کے شکمی عوارض کا سبب کیا ہے ۔

اس نے مریض کو بتایا کہ روزانہ اس عمارت کی اتنی بلند منزل تک آنے جانے اور خوف کا شکار ہونے کی وجہ سے اس کا معدہ خراب ہو گیا تھا کیونکہ نظام اعصاب پر برا اثر پڑ رہا تھا ۔ اس نے ہدایت کی کہ اپنے دفاتر کو زیریں ترین منزل میں منتقل کر دیجئے ۔ مریض نے ایسا ہی کیا اور اس کا معدہ درست ہو گیا ۔

کلوسٹرو فوبیا سے ایک اور مرض کا بھی نزدیکی تعلق ہے اور وہ ہے دمہ ۔ اس گھبراہٹ کے ساتھ ہی سانس میں بھی دقت ہونے لگتی ہے بہت

سے مریضوں میں دیکھا گیا ہے کہ سانس لینے میں یہ ابتدائی دشواری اس قدر بڑھتی ہے کہ دمہ کی پیچیدہ علامات ظاہر ہو جاتی ہیں ۔

کلوسٹرو فوبیا کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ مریض ہر وقت بے انتہا تکان اور ماندگی محسوس کرتا رہتا ہے ۔ اس کا سبب وہ بھیانک خواب ہیں جو مریض اکثر دیکھتا ہے ۔ ان خوابوں میں وہ بری طرح ڈرتا ہے ۔ اس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور صبح کو جب وہ بستر سے نکلتا ہے تو تھکا ہارا حواس باختہ ہوتا ہے ۔ اس عجیب وغریب قسم کے خوف کے ہاتھوں انسان ایسا عاجز ہوتا ہے کہ اس سے ایسے جرائم سرزد ہو جاتے ہیں جو قید خانہ تک پہنچا دیتے ہیں اور اکثر حالات میں دیکھا گیا ہے کہ وہ جیل خانہ کے شفاخانہ میں پہنچ کر مرجاتے ہیں ۔ کچھ قیدی تو اس درجہ وحشت زدہ ہو جاتے ہیں کہ ان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے ۔ باقی ماندہ میں سے قلبی عوارض اور شکمی تکالیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔ اعداد و شمار شاہد ہیں کہ دمہ کے مریضوں کی جتنی تعداد قید خانوں میں ملتی ہے اور کہیں نہیں ملتی ۔

کلوسٹرو فوبیا کے مریض کے لئے سفر کرنا بھی نہایت دشوار کام ہے کیونکہ ہوائی جہاز ، ریل گاڑیاں ، بسیں اور پرائیویٹ کاریں ، جتنے بھی ذرائع نقل وحمل ہیں سب ہی جگہ کے اعتبار سے چاروں طرف سے بند اور محدود ہوتے ہیں ۔ ایسے مریض راستے میں کئی جگہ اترتے چڑھتے چلتے ہیں ۔ ایک انسان اس خوف کا شکار رہتا تھا لیکن وہ اپنی کار نہایت اطمینان سے چلاتا تھا اور کافی فاصلہ بغیر کسی گھبراہٹ کے طے کر جاتا تھا ۔ اس سے وجہ دریافت کی گئی تو اس نے بتایا " میری اپنی گاڑی میرے قابو میں رہتی ہے ۔ جب میں اس کو چلاتا ہوں تو اپنے تئیں محفوظ محسوس کرتا ہوں لیکن اگر کوئی دوسرا شخص ہی کو چلا رہا ہو تو میں دس پانچ منٹ سے زیادہ وقفہ تک اس میں نہیں بیٹھ سکتا" روزمرہ زندگی میں اس قسم کی اور بھی مثالیں ملتی ہیں ۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض آدمی سائیکل پر کسی دوسرے انسان کو بٹھا کر چلنے سے بے حد گھبراتے ہیں اگر ضرورت پیش آجائے تو بہ نسبت خود بیٹھنے کے وہ دوسرے کو ساتھ بٹھانا اور اس کو کھینچنا زیادہ پسند کرتے ہیں خواہ ان کا ساتھی سائیکل چلانے میں کتنا ہی مشاق ہو وہ اس پر اعتبار نہیں کرتے اور ہینڈل کو اپنے ہی ہاتھوں میں رکھنا چاہتے ہیں اسی طرح بعض آدمی ڈرائیور کے برابر بیٹھنے سے گھبراتے ہیں ۔ لاری یا بس میں بعض مسافر ڈرائیور کو تیز چلانے سے منع کرتے رہتے ہیں ۔ یہ تمام مثالیں اسی خوف سے بالواسطہ متعلق ہیں ۔

محدود جگہ میں بیٹھنے سے ان لوگوں کو خوف کیوں آتا ہے ؟ اس سوال کا سادہ ترین جواب یہ ہے کہ اس خوف کی بنیاد انسان کے بچپن میں پڑتی ہے ۔ بچپن کے وہ چند تلخ تجربات اور خوفناک واقعات جن سے بچہ کا دل لرز چکا ہے اس خوف کا سبب بنتے ہیں ۔ بڑا ہو کر انسان ان تمام باتوں کو بھول جاتا ہے لیکن وہ خوف اس کے لاشعور میں زندہ رہتا ہے ۔ اس کو آپ ایک دبی ہوئی چنگاری کہہ سکتے ہیں ۔

برطانیہ کے مشہور ماہر شخصیت ڈاکٹر ڈبلو ۔ ایچ ۔ ریورس نے ایک نوجوان طبیب کا ذکر کیا ہے کہ جب کبھی وہ کسی تنگ جگہ میں بند ہو جاتا تھا تو گھبرا اٹھتا تھا ۔ جنگ کے زمانہ میں کسی خندق میں سونا اس کے لئے محال تھا اور خطرہ کا مقابلہ کرتے ہوئے باہر سوتا تھا ۔ آخر کار اس کی حالت اتنی ابتر ہوئی کہ اس کو ہسپتال بھیج دیا گیا ۔

آخر کار ماہرین شخصیت نے اس معمہ کو حل کیا ۔ انہوں نے اس نوجوان کے بچپن کے حالات معلوم کئے تو معلوم ہوا کہ جب وہ بچہ تھا تو ایک تاجر کے گھر گیا جو کاغذ کی تجارت کرتا تھا ۔ پرانے اخبار لئے ہوئے یہ بچہ ایک لمبے تنگ راستے سے گذرا ۔ تنگ وتاریک راستہ طے کرنے کے بعد وہ اخبار اس نے تاجر کے حوالہ کئے اور اسی راستے سے واپس ہوا لیکن دروازہ بند پایا تو گھبرایا ۔ الٹے پاؤں واپس ہوا تو دوسرے سرے پر ایک کتا غرا رہا تھا بچہ گھبرا گیا اور بچپن کا یہ خوف اس کے تحت الشعور میں تقریباً پچیس سال تک محفوظ رہا جیسے ہی مریض کو یہ تمام واقعات یاد دلائے گئے اور خوف کا سبب بیان کیا گیا اس کا مرض غائب ہو گیا ۔

بعض اوقات کلوسٹرو فوبیا زیادہ عمر کے انسانوں میں بھی شروع ہو جاتا ہے جس کا سبب کوئی جذباتی صدمہ ہوتا ہے ۔ ایک مرتبہ جزائر غرب الہند میں مقیم ایک برطانوی بحری افسر کی بیوی نے ایک الماری کا دروازہ کھولا تو ایک زہریلا سیاہ سانپ کنڈلی مارے ہوئے پڑا تھا ۔ اس کو دیکھتے ہی اس نے

چیخ ماری اور بیہوش ہوگئی۔ اس کے شوہر نے سانپ کو مار دیا لیکن اس کی بیوی کلوسٹرو فوبیا کی مریض بن کر رہ گئی۔

ڈاکٹر ڈونالڈ گریگ جو دماغی معالجین میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، ان کا بیان ہے کہ اکثر اوقات بچوں میں کلوسٹرو فوبیا اور اسی متعلقہ خوف پیدا کرنے کے لئے ان کے والدین ہی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ والدین اپنے بچے کے ساتھ اور کوئی استاد اپنے شاگرد کے ساتھ سب سے بڑا ظلم یہ کر سکتے ہیں کہ ان کو سزا دینے کے لئے کسی تنگ کمرہ میں بند کر دیں۔ چند ماہرین شخصیت و نفسیات تو اس خوف کے سبب کا سلسلہ بچہ کی پیدائش تک پہنچاتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ محدود جگہ میں بند ہونے کا خوف بچے کو ماں کے شکم سے ملتا ہے جہاں وہ چند ماہ بند رہتا ہے۔ ڈاکٹر فوڈر کا بیان ہے "جتنے بھی مریض میرے مشاہدہ میں آئے تقریباً سب ہی پیدائشی طور پر اس خوف کا شکار تھے۔ چند ماہ کی قید و بند نے ان کے دل و دماغ پر عجیب و غریب خوف کا نقش چھوڑ دیا تھا" لیکن بہت سے ماہرین علم اس نظریہ سے اتفاق نہیں کرتے۔

اس خوف کا سبب کچھ بھی ہو اس کا علاج نہایت ضروری ہے اور کافی پیچیدہ۔ سب سے پہلے تو اُن دبی گھٹی باتوں اور واقعات کو معلوم کرنا چاہیئے جو اس خوف کا سبب بنے جوَن رین ڈولف ایک تاجر تھا ایک مرتبہ چھوٹے کمرہ میں بند ہو گیا اور ایک عجیب قسم کے خوف کا مریض بن کر رہ گیا۔ تقریباً پندرہ ماہ تک ہر ہفتہ میں چار مرتبہ وہ ایک ماہر شخصیت سے مشورہ کرتا رہا تب کہیں وہ بھولے بسرے واقعات روشنی میں آئے جو بچپن میں وقوع پذیر ہوئے تھے اور اس خوف کا سبب بنے تھے۔

آخر کار اس کو یاد آیا کہ اس کے بچپن میں ایک مرتبہ اس کو ایک ویران عمارت کے تہہ خانہ میں بند کر دیا گیا تھا۔ چھ سات گھنٹے تک وہ وہاں بند پڑا رہا تب اس کے والدین آئے اور انہوں نے اس کو باہر نکالا جیسے ہی یہ واقعہ یاد آیا مسٹر جوَن رین ڈولف کا خوف غائب ہو گیا اور وہ تندرست ہو گئے۔

نفسیاتی علاج میں وقت زیادہ لگتا ہے اور دولت بھی کافی صرف ہوتی ہے لیکن حال ہی میں جو ادویات اور طریق علاج ایجاد ہوئے ہیں ان سے جلد ہی صحت حاصل ہو جاتی ہے۔ مریض کو ایک دوا دی جاتی ہے۔ جس کے اثر سے وہ کچھ اونگھ جاتا ہے اور ماہر شخصیت اس سے اولین تجربات و واقعات کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ اس موقع پر مریض کی کیفیت عجیب ہوتی ہے لیکن وہ گفتگو کرنے کا متمنی ہوتا ہے اور سب سے زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ اس کو وہ تمام واقعات یاد آجاتے ہیں جو عالم ہوش میں فراموش رہتے ہیں۔ بھولی بسری باتوں کو یاد کرنے کے لئے عام طور پر اس قسم کے چار پانچ کورس کرنا پڑتے ہیں۔

بوّب اونز اسی قسم کا ایک مریض تھا۔ وہ کسی بس میں سفر نہیں کر سکتا تھا، لفٹ میں نہیں بیٹھ سکتا تھا، زیر زمین راستوں میں سے نہیں گذر سکتا تھا، سُرنگوں میں نہیں گھس سکتا تھا۔ پُل پر سے نہیں گذر سکتا تھا۔ ایک مکان کی پہلی منزل پر رہتا تھا اور صرف اپنی کار میں ہی اِدھر اُدھر گھوم سکتا تھا۔ وہ چار پائی پر نہیں سو سکتا تھا بلکہ ہمیشہ فرش پر سوتا تھا جب اس کو متذکرہ بالا دوا دی گئی تو اس نے بتانا شروع کیا کہ جب وہ ایک چھوٹا لڑکا تھا وہ ایک چوڑی لیکن بند نالی میں گھس گیا اور وہاں پھنس کر رہ گیا۔ اس نے مدد کے لئے چلانا شروع کیا لیکن کسی نے اس کی فریاد نہ سنی اور وہ کئی گھنٹے تک وہاں پھنسا رہا۔ ماہر شخصیت نے اسے سنایا کہ وہ سرنگ میں گھستا ہوا یا چار پائی پر لیٹتا ہوا اتنا گھبراتا ہے اس کو بچپن کا وہ خوف یاد آجاتا ہے اگرچہ وہ اس واقعہ کو بالکل بھول چکا ہے۔ صحیح وجہ معلوم ہو جانے پر بوّب کا خوف کم ہوتا چلا گیا اور چند ماہ بعد ہی اس کو کلوسٹرو فوبیا سے مکمل نجات مل گئی۔

اس منحوس خوف کے ابتدائی دور میں مریض پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا اور وہ اطمینان سے مختلف امور انجام دیتا ہے صرف تھوڑی سی گھبراہٹ ساتھ رہتی ہے۔ اگر آپ کو خوفزدہ رہنے کی وجہ معلوم ہو جائے تو آپ خود اس کا علاج کر سکتے ہیں۔ بادی النظر میں آپ کو اس قسم کی باتیں اور یہ عجیب خوف مذاق معلوم ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے بہت سے انسان اس کے ہاتھوں عاجز ہیں۔ اس پر خاموشی سے صبر کر لینا اور اس کا علاج نہ کرنا تباہی کی طرف ایک اور قدم اٹھانے کے مترادف ہے۔ اس کا علاج اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ گھبراہٹ کی بنیادی وجہ معلوم کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ کتنا معمولی واقعہ آپکی پریشانی کی وجہ بنا ہوا ہے اور پھر صحت، خوشی، آسودگی سب آپ کے سامنے ہوگی ◆

خاص سائیکولوجی کے لئے

ساس بہو کی کشمکش

صابر۔ بی۔ اے

شادی ہماری زندگی کی جنسی الجھن کا ایک حل ہے۔ یہ ایک ایسا رشتہ ہے جو دو مختلف جنس کو یکجا کرتا ہے تاکہ وہ اپنے آدرش کے مطابق ایک جنت ارضی کی تشکیل کر سکیں۔ اس مقدس بندھن میں بندھ کر میاں بیوی ایک دوسرے میں جذب ہو کر دنیا کی رنگینیوں میں تمتع حاصل کرتے ہیں۔ دو افراد کا یہ ملاپ اپنے گردوپیش کے ماحول پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ خاندان کی زندگی میں شادی کی شہنائیاں ایک سحر آفریں اثر پھونک دیتی ہیں، دولہا دلہن کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو فضا کو معطر کر کے خاندان کے ہر فرد پر ایک وجدانی کیفیت طاری کرتی ہے۔ خاندان میں ایک نو وارد (بہو) کی آمد کا سب سے زیادہ اثر ساس پر ہوتا ہے۔ چاند سی دلہن کا وجود ساس کے لئے مسرور کن ضرور ہوتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ شک، بدگمانی اور خوف بھی جنم لے لیتے ہیں۔ یہی حال بہو کا بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی کنکھیوں اور آنچل کی اوٹ سے سب سے پہلے ساس ہی کو معنی خیز نظروں سے دیکھتی ہے اور اس طرح آنے والی کشمکشوں کا سنگ بنیاد رکھا جاتا ہے

شادی کی رنگینیوں کی کیفیت ابھی ہلکی ہی ہونے پاتی ہے کہ تصویر کا دوسرا رخ سامنے آنے لگتا ہے۔ تمام دبی ہوئی بیزاری اور بدگمانی اجاگر ہو کر خاندان کی متوازن زندگی میں ہچکولے پیدا کرنے لگتی ہے۔ ساس اور بہو کی کشمکش اپنے اصل رنگ میں نمایاں ہونے لگتی ہے۔ اخلاقی اور اقتصادی حیثیت سے خاندان چاہے کسی مرتبے کا ہو مگر ساس بہو کی یہ رسہ کشی ہر خاندان میں موجود نظر آتی ہے۔ بعض جگہ تو یہ کشیدگی اور زبانی نوک جھونک شدت اختیار کر کے نفاق و طلاق میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مگر عموماً ہوتا یہ ہے کہ خاندان کے دو اہم افراد کی یہ چشمک تمام دیگر افراد خاندان کی ذہنی زندگی پر مستقل اپنا برا اثر ڈالتی رہتی ہے۔ دونوں افراد کے خیالات جذبات اور فیصلے بار بار آپس میں ٹکراتے ہیں اور اس ٹکر کی جھنکار سے تمام اندرونی سکون کو پاش پاش کرتے رہتے ہیں اس ذہنی ہیجان اور خاندانی ہنگاموں کا سب سے تباہ کن اثر ان حساس دماغوں پر پڑتا ہے جو کل کے معمار ہیں اور آنے والی سماجی ساخت کے ستون ——یعنی بچے۔ بچوں کے سادہ اور حساس ذہن پر خاندان کے یہ ہنگامے اپنے نقوش مرتسم کر دیتے ہیں اور ان کی جسمانی نشوونما کے ساتھ ساتھ یہ مدہم نقوش بھی بڑھ کر ذہنی سطح پر دھبوں کی شکل میں بدل جاتے ہیں۔ اور جب یہ داغدار ذہنیتیں خارجی ماحول سے ربط پیدا کرتی ہیں تو سماج میں جگہ جگہ بغض، حسد، نفرت اور انتقام کا زنگ لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ جو جھگڑالو خاندانوں میں پرورش پا کر پلتے بڑھتے ہیں ایک عجیب الجھی ہوئی ذہنیت لے کر سماج میں داخل ہوتے ہیں دوسروں سے عدم تعاون اور جھگڑا ان کی فطرت کا ایک جزو ہو جاتا ہے۔ وہ کسی سماجی تحریک سے تعاون نہیں کرتے بلکہ اور الجھنیں پیدا کرنے میں مدد دیتے ہیں ان کی حالت بالکل اس چوکھٹی لوہے کی سلاخ کی طرح ہوتی ہے جس کو گول سوراخ میں پیوست کر دینے کی ناکام کوشش کی جائے۔ یہ تو ہوا بچوں کی زندگی پر خاندانی کشمکش کا اثر جس کے سبب ہمارے سماج میں طرح طرح کے گھناؤنے گھاؤ پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ہماری صحت مندانہ سماجی زندگی میں رکاوٹیں پیدا کرتے رہتے ہیں۔

بچوں کے علاوہ بالغ لوگوں پر بھی ہماری اس خاندانی تلخی کا کافی اثر پڑتا ہے۔ اس خانگی تنازعہ کی زد میں خاندان کا سرپرست مرد براہ راست آتا ہے۔ اپنے گھریلو ماحول سے اکتا کر مرد عموماً مختلف اقدام کرتے ہیں۔ ایسے مرد جو ماں سے زیادہ لگاؤ محسوس کرتے ہیں ان جھگڑوں میں ہمیشہ

بیوی کو قابل تقصیر گردانتے ہیں۔ وقت آنے پر فیصلہ ہمیشہ ماں کی جانبداری میں کرتے ہیں اور بیوی سے منحرف ہو کر نوبت طلاق تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس طرح لاشعوری طور پر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ماں کی پرسکون آغوش میں پناہ لیتے ہیں اور بیوی کا بدل ماں میں پا لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنی ماؤں سے مریضانہ محبت ہوتی ہے ـــ مگر وہ مرد جو بیوی کو اپنے جذبات کا مرکز بنا لیتے ہیں ماں کو اپنی راہ میں حائل پا کر ماں کی نظر سے دور جا کر اپنی اور اپنی شریک زندگی کی آرزوؤں کی تکمیل کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک ایسے خاندان کی داغ بیل ڈالتے ہیں جہاں ماں کی جگہ ان کی بیوی لے لیتی ہے۔ ایسے مرد اپنی بیوی میں ماں کا روپ بھی دیکھنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خاندان کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں ـــــــ ان دو صورتوں کے علاوہ ایک تیسری صورت بھی ہے ـ وہ لوگ جن کا جذباتی رجحان ماں اور بیوی کی طرف یکساں ہوتا ہے خود کو اس کشیدگی کے موقعوں پر بالکل مجبور پاتے ہیں۔ ان کا جذباتی دھارا دو شاخہ ہو کر ماں اور بیوی پر یکساں شدت کے ساتھ گرنے لگتا ہے۔ وہ نہ تو ماں کے حق میں فیصلہ کر سکتے ہیں اور نہ بیوی کی موافقت میں۔ نہ وہ ماں پر دباؤ ڈال سکتے ہیں اور نہ بیوی پر اور اس روحانی اذیت سے نجات کا راستہ اس ماحول سے فرار میں ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ خانگی جھگڑوں کا حل نہ پا کر آخر گھریلو ماحول سے اکتا جاتے ہیں اور مجبوراً وہ خاندان ہی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ بعض بعض لوگ تو خانگی ہنگاموں سے بھاگ کر خود کو اس قدر گمنامی میں ڈھکیل دیتے ہیں کہ ان کا سراغ لگانا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور اگر سراغ لگ بھی جائے تو وہ اس قدر بدل چکے ہوتے ہیں کہ ان کا اصل روپ بالکل چھپ جاتا ہے۔ اس طرح ہزاروں افراد اپنے گھریلو جھگڑوں سے بھاگ کر خود کو گمنامی اور تنہائی کی دبیز تہوں میں دفن کر کے اپنی ذہانت، استعداد اور صلاحیتوں کا خون کر کے ذہنی خودکشی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

لوگوں کا خیال ہے کہ اقتصادی اور خاندانی سرفرازی حاصل کرنے کی جدوجہد ہی اصل میں ساس بہو کی کشمکش کی بنیادی وجہ ہے۔ یعنی ساس بدستور گھر کو اپنے زیر اقتدار دیکھنے کی متمنی رہتی ہے اور بہو گھر کے نظم و نسق کو اپنے تحت میں لانے کی کوشاں ہوتی ہے۔ ایک ہی جگہ دو لیڈروں کا اقتدار حاصل کرنے کی کوشش میں کشیدگی قرین قیاس ضرور ہے مگر بنیادی وجہ نہیں۔ مشاہدہ اور واقعات اس کے برعکس شہادت دیتے ہیں۔ ایسے خاندانوں میں بھی جہاں ساس اور بہو دونوں اقتصادی حیثیت سے آزاد اور خودمختار ہوں آپس کی یہ کشیدگی ضرور پائی جاتی ہے۔ عموماً یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بہو کسی اور رشتے کی عورت کے ساتھ رہ کر تعاون اور یکجانیت پیدا کر لیتی ہے چاہے وہاں زبردستی ہی رہنا پڑے۔ مگر ساس کے ساتھ رہنا ہزاروں الجھنوں کا بیدار ہو جانا ہوتا ہے۔ اجنبی ماحول و اجنبی لوگوں سے موافقت پیدا ہونا اور پرانے لوگوں اور پرانے ماحول سے بیزاری معنی خیز ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر ساس اور بہو میں شدید اشتعال کسی پوشیدہ رقابت کی غمازی کرتا ہے۔

آئیے اب ہم اس مسئلے پر نفسیاتی روشنی ڈالنے کی کوشش کریں۔ ہم اس وقت دانستہ ان تمام اقتصادی اور شخصی وجوہات سے اجتناب کر رہے ہیں جو اس کشمکش میں اضافہ پیدا کرتے ہیں۔ ہم اب صرف اس بنیادی وجہ کی جستجو کریں گے جو اصل میں اس تمام تلخی اور کشیدگی کی اساس ہے۔ جب ہم اس مسئلے کی طرف غور سے دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ساس اور بہو کی یہ ابدی کشمکش جنسی نوعیت کی ہوتی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ "محبوب مشترک" جو وجہ مخاصمت ہوتا ہے فریقین میں ایک کا شوہر اور دوسرے کا بیٹا ہوتا ہے۔ اس طرح ساس بہو میں ایک رقیبانہ رشتہ پیدا ہو جاتا ہے جو آپس کے جھگڑوں کو بھی اسی رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ واضح ہوگا کہ ساس اور بہو کی کشمکش قریب قریب اسی نوعیت کی ہوتی ہے۔ جو دو سوکنوں کی۔ جس طرح دو سوکنوں کے جذبات ایک مرد پر مرکوز ہو کر آپس میں ٹکراتے ہیں یہی حالت ساس اور بہو کی ہے۔ ماں کو بیٹے سے جنسی لگاؤ ہوتا ہے اور بہو کو میاں سے اس لئے لامحالہ ساس اور بہو کا درمیانی رشتہ جنسی رنگ کا ہوتا ہے۔

ہر عورت جسمانی اور ذہنی حیثیت سے ایک ماں ہوتی ہے۔ تہذیب خواہ ترقی کے کتنے ہی مراحل طے کر لے مگر وہ عورت سے اس کی

ماتا اور رحم دلی کو نہیں چھین سکتی وہ بدستور اپنے بچوں پر جان فدا کرتی رہے گی۔ ماں بچے کو تھپکتی ہے، منہ چومتی ہے، اپنے سینے سے چمٹاتی ہے کیونکہ ماں
کے لئے بچہ خود ایک جنسی مقصود ہوتا ہے۔ اگر یہ بات کسی ماں کو بتا دی جائے کہ اس کے پیار اور ان حرکات سے بچے میں شہوانی تحریکات پیدا ہوتی
ہیں تو شاید وہ اس خیال سے ڈر کر کانپ اٹھے۔ ماں تو اپنی ان حرکات کو صرف پاک محبت اور ماتا کی محبت سمجھتی ہے۔ ماں بچے کے اعضائے تناسل کو
اس حد تک چھوتی ہے جتنی پرورش کے دوران میں ضروری ہوتا ہے لیکن تحلیل نفسی سے ہمیں جو معلومات ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ جنسی جبلت
محض اعضا کے ہیجان ہی سے بیدار نہیں ہوتی بلکہ نرمی، پیار اور تھپکنے کا بھی اثر اعضائے خاص پر ہوتا ہے۔ خواہ یہ دیکھنے میں [illegible]
جنسی جبلت اور اس کے اثر کو جو نفسیاتی اور اخلاقی زندگی پر ہوتا ہے اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو پھر اسے ان کی [illegible] اور عجیب کشمکش [illegible] سے چنداں [illegible]
ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ عورت کی زندگی میں اولاد کی وجہ سے ایک حسن آجاتا ہے اس کے دل میں محبت کے سمندر [illegible] لگتے ہیں۔ ان کو
محض جذبات کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاتا بلکہ انہیں ذہانت کی روشنی میں دیکھنا چاہیے تاکہ ان کے اندر جو نور ہے وہ نمایاں ہو سکے۔ یہ عین فطری ہے
کہ وہ ہستی جو ماں کی زندگی کے حسن اور نور میں شریک ہو جائے خود اس کی اذیت کا باعث ہوگی۔ بہو ساس کے لئے ایک قیمتی سرمائے کی [illegible]
کی حیثیت رکھتی ہے جس کو بے دخل کرنے کی خواہش ہمیشہ اس کے لاشعوری تہوں میں کلبلاتی رہتی ہے۔ وہی لڑکا جو صرف ماں کے لئے مخصوص
تھا اور جو صرف ماں کے اشارہ چشم پر اپنی جان دے سکتا تھا دوسری عورت کے زیر اثر دیکھ کر ماں کو دکھ ہوتا ہے۔ ماں دراصل [illegible]
ہونے لگتی ہے جو اس کی اولاد کو اس سے دھیرے دھیرے چھین کر [illegible] اور خوشبوؤں میں حصہ دار بننا چاہتی ہو۔ بہو اور بیٹے میں
محبت اور لگاؤ دیکھ کر ماں میں ایک احساس شکست پیدا ہو جاتا ہے اور وہ محسوس کرنے لگتی ہے گویا اس نے کوئی بہت قیمتی شے کھو دی ہے
[illegible] سب امیدوں اور کاوشوں کا صلہ ایک گمنام ذہنی اذیت میں پا کر ماں کے ذہن میں ایک ناکامی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس عورت سے [illegible]
مقابلے کو تیار ہو جاتی ہے جو اس کے اور اس کی اولاد کے درمیان آتی ہے اور اس رقیب کی حیثیت پیدا کر لیتی ہے جو ماں کے جذباتی مرکز کو اپنی طرف
مائل کرنے کی کوشش کرے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بہت سی مائیں اپنے بیٹوں کی صرف اس لئے شادی کرنے سے ہچکچاتی ہیں کہ ان کا بیٹا بیوی میں دلچسپی لینے کے
بعد ان کی طرف خاطر خواہ متوجہ نہ ہوگا۔ انہیں یہ تصور کھائے جاتا ہے کہ کوئی دوسری عورت ان کے بیٹے کے جذبات کی مرکز بنے گی۔ یہی حال بہت
سے لڑکوں کا بھی ہے وہ بھی یہی سوچتے ہیں کہ ممکن ہے بیوی ان کے اور ماں کے رشتے میں حائل ہو۔ اس بات سے ایک نکتہ پر روشنی پڑتی ہے اور
وہ یہ کہ ماں کا بیٹے سے لاشعوری وہی رشتہ ہوتا ہے جو بیوی کا ہوتا ہے کیونکہ کبھی تو ماں کو بہو سے خوف محسوس ہوتا ہے کہ وہ اگر کہیں اس کے
رشتے میں مخل نہ ہو۔

خون کے رشتے دار جن سے جنسی تعلقات ناجائز ہیں محرمات کہلاتے ہیں بچپن میں تو بچہ ان سے ایسے تعلقات رکھتا ہے۔ مگر جب
اسے اخلاقی پابندیوں کا علم ہوتا ہے تو یہ حالت نہیں رہتی بلکہ وہ کوشش کرتا ہے کہ ایسے خیالات ذہن سے نکال دے۔ ان خیالات کے نکال دینے
کے بعد بھی ان کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور باقی رہتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب لڑکیاں سنجیدگی کے ساتھ محبت کرنے لگتی ہیں تو عام طور پر ان کا محبوب مرد ہوتا ہے
اور وہ بھی ایسا جو بااقتدار ہو۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اپنے باپ کے نقوش اپنے محبوب میں پھر سے زندہ کر سکیں۔ ماں بھی چونکہ بچی سے بڑھ کر [illegible]
بنتی ہے اس لئے اسی ذہنیت کا شکار ہوتی ہے۔ اس خیال کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اگر خود ماں زندہ ہو تو بیٹے کی محبت میں حائل ہوتی
ہے اور اسے اپنائے رکھنا چاہتی ہے۔ ساس بہو کی ابدی کشمکش اسی کا نتیجہ ہے۔ علاوہ ازیں باپ اور دوسرے مردوں کا پیار اسے بلوغت
میں جنسی مقصود کے انتخاب میں مدد دیتا ہے۔ بچپن میں لڑکی کی ماں سے کافی کشمکش رہتی ہے اس لئے وہ جوان ہو کر بھی اپنی صنف سے دور رہنا چاہتی
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں لڑکے سے زیادہ مانوس اور بہو سے کشیدہ خاطر رہتی ہے۔

ابھی تک ہمارے خاندانوں میں عورت کا کام صرف بچے پیدا کرنا ہے اور بس۔ اس کا نتیجہ ذہنی غلامی ہے کیونکہ عورت کبھی نہیں چاہتی

کہ بچے اس کی نگہداشت سے باہر رہیں۔ اس کی ساری توجہ صرف بچوں پر مرکوز ہوتی ہے۔ اس کے لئے یہی سب سے بڑا کام ہے کہ وہ بچوں کو اپنے زیر سایہ رکھے۔ کاروبار کے سلسلے میں بیٹے کو پردیس جانے سے روکنا۔ گھر میں وقت پر آنے کی تاکید سب اسی وجہ سے ہوتی ہے۔ ماں کی ماتا یہی چاہتی ہے کہ اس کی اولاد ہمیشہ ہمیشہ بچہ رہے۔ جب بچے ذہنی طور پر بالغ ہونے لگتے ہیں تو اسے صدمہ ہوتا ہے جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچوں نے جوان ہوکر دنیا کی ذمہ داری، کام کاج اور جنسی تعلقات پیدا کر لئے ہیں تو ایسی ماں کی بری حالت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں بہو سے لاشعوری طور پر بیزار رہتی ہے کیونکہ بہو نے اس کے بچے کو سیانا پن اور دنیا کی ذمہ داریوں کا احساس دلا کر اس کی زبردستی سے آزاد کرا دیا اور خود اس کے احساسات کا محور بن بیٹھی۔

ابھی تک ہم نے صرف ان اسباب پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ جن کی وجہ سے ایک ماں اپنے بیٹے کے جنسی مقصود سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے کیونکہ خود اس کے مفاد پر چوٹ پڑتی ہے۔ اب ہم ان مسئلوں کو بھی ذہنی گرفت میں لانے کی کوشش کریں گے جن کے سبب بیوی میاں کے احساسات میں جذب ہو کر اسے اپنا معبود سمجھنے لگتی ہے۔ اور جب کوئی دوسری عورت اس کی راہ میں آتی ہے تو وہ بڑی سختی کے ساتھ اس سے ٹکراتی ہے چاہے وہ عورت اس کے جنسی مقصود کی ماں ہی کیوں نہ ہو۔ اس سلسلے میں ہم شمشاد عثمانی صاحب کی تحریر کا ایک حصہ پیش کرتے ہیں جو ہمارے نقطہ نظر کی وضاحت کرتا ہے۔

"——— سماج کی بندشیں عورت کے جذبات کا خون کرتی ہیں اور ہر لمحہ اس کی محبت بھری امنگوں کا گلا گھونٹنے پر تلی رہتی ہیں۔ ماحول اس کے نزدیک ایک مسلسل بوجھ کی صورت اختیار کر لیتا ہے ایک ایسا بوجھ جس سے فرار اس کے نزدیک ناممکن سا ہو کر رہ جاتا ہے لیکن جب کوئی مرد اس کو جرأت اقدام کی دعوت دیتا ہے تو اس کے سینے میں ابلتا ہوا لاوا اگرچہ پیش کی بے پناہ بندشوں کے باوجود پھوٹ نکلتا ہے اور اس طرح بعرتبہ مرد سب سے پہلے اس کو ایک ابدی بوجھ سے فرار میں سہارا دے کر اس کے جذبات کو تسکین بداماں کرتا ہے۔ عورت اسے اپنے تمام احساسات کا معبود بنا کر اس کی پرستش شروع کر دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو کر رہ جاتی ہے یہاں تک کہ پھر کوئی خارجی عنصر اس کے جذبات پر بہت کم غالب آتا ہے"

کرافٹ ایبنگ CRAAT EBBING نے انسان پر طاری ہو جانے والے اس عالم کو جس میں وہ خود کو انتہائی بے خودی کے ساتھ کسی ایسے انسان کے حوالے کر دیتا ہے جس کے ساتھ وہ جنسی طور پر وابستہ رہ چکا ہو عالم سپردگی SEXUAL THRALDOM کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ عالم سپردگی اکثر مرتبہ انسان کی قوت ارادی کو بالکل سلب کر کے اسے اپنی ذات کو قابل تعجب حد تک قربان کر دینے پر مجبور کر دیتا ہے اور موجودہ دور میں شادی کے بعد اسی عالم سے مغلوب ہو جانا ہماری ازدواجی زندگی کی کامیابی کا راز بن جاتا ہے کرافٹ ایبنگ کا خیال ہے کہ اس عالم سپردگی کی بنیاد کسی شخصیت کی کمزوری کے ساتھ محبت کی غیر معمولی شدت کے دورے انسان کی بے پناہ خود پرستی سے تصادم پر رکھی جاتی ہے۔

ڈاکٹر فرائیڈ کے نزدیک کرافٹ ایبنگ کا یہ خیال بجائے خود محتاج تشریح معلوم ہوتا ہے۔ فرائیڈ کے خیال میں اس عالم سپردگی کو سمجھنے کے لئے ہمیں یقیناً ان تمام شعوری بندشوں کو زیر غور لانا ہوگا جن کی زنجیروں کو پہلا جنسی اختلاط ایک پر کیف جھٹکے کے ساتھ توڑ کر رکھ دیتا ہے اور جس کے بعد رسومات کے بتوں کو توڑنے والا "بت شکن" ان تمام جنسی جذبات کا مرکز بن جاتا ہے جو اس وقت تک خود اپنی موت مر جانے کے لئے مجبور ہوتے ہیں تھے اسی وجہ سے عالم سپردگی مرد کی نسبت عورت میں بہت زیادہ نمایاں ہوتی ہے اگرچہ دور حاضر میں اس کا شکار مرد بھی نظر آتے ہیں مرد کی صورت میں عالم سپردگی اس کی اپنی خیالی کمزوری پر (جو اکثر اس کے ‌ ‌ ‌ کے ایک خاص عورت (ماں) کے ساتھ وابستہ ہو جانے سے پیدا ہوتی ہے) اس نمایاں فتح یابی سے پیدا ہوتا ہے۔ جس کے حصول کا احساس اسے شب عروسی کے بعد پہلی بار ہوتا ہے

اوراس طرح مرد عورت کے لئے اور بعض مرتبہ عورت مرد کے لئے اس ابدی پوجے [illegible] جاتی ہے
چونکہ ہمارے سماج میں عورت کی عصمت پر کافی زور دیا جاتا ہے اس لئے [illegible] بیوی کے لئے [illegible] اور "نجات دہندہ" کا کام کرتا ہے اس لئے بیوی کا میاں سے لگاؤ اصل میں عالم سپردگی کی ایک کیفیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی عورت اس کیفیت میں دخل انداز ہوتی ہے تو بیوی کے ذہن پر نفرت اور خوف کے نقوش ابھرنے لگتے ہیں اور [illegible] مخل [illegible] ہستی کو [illegible] راستے سے ہٹانے کی سخت کوشش کرتی ہے تاکہ اس کی بیدمعی اور عالم سپردگی میں کاوٹ واقع نہ ہو۔ جنسی اختلاط کے دوران عورت مرد کو اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے کر نہایت سختی سے دباتی ہے، انتہائی جذبات سے مجبور ہو کر اس کے سینے سے نیم مدہوشی کے عالم میں چمٹ جاتی ہے ایسی حالت میں عورت احساس سپردگی سے لذت اندوز ہوتی ہے۔ لیکن احساس سپردگی کے ساتھ مرد کے اس کو اپنے بازوؤں میں ہمیشہ تھامے رکھنے کی شدید خواہش کی تسکین بھی جو اسے مرد کو اس کو اپنے بازوؤں میں محصور کر لینے سے ہوتی ہے۔ اس کی اس مدت میں ایک سحر آگیں رنگ بھر دیتی ہے۔ اور جب کوئی عورت اس کے احساس سپردگی کو مجروح کرتی ہے اور مرد کو اس کی گرفت سے چھڑانا چاہتی ہے تو وہ جھپٹتی ہے اور مقابلے کے لئے پوری توانائی کے ساتھ تیار ہو جاتی ہے چاہے مدمقابل اس کے جنسی مقصود کی ماں ہی کیوں نہ ہو۔

بچّوں میں اخلاقی لغزشوں کی ابتداء

(از قیصر مدنی - متعلم ام اے (نفسیات)

قریب قریب تمام اخلاقی لغزشیں دو جذبات کے تصادم (CONFLICT) اور مقابلہ کی کشمکش کا نتیجہ ہیں جن کی ابتدا بچپن میں ہوتی ہے والدین یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حرکت روزمرہ کی ہے اور اسی لیے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتے۔ لیکن اصلیت میں کردار کی بنیاد اسی زمانے میں پڑتی ہے اور ذرا سی غفلت سے بچے کے ... بیماریوں کا شکار ہو سکتا ہے۔ جذبات کے تصادم اور مقابلے کی کشمکش کو سمجھنے کے لئے پہلے بچہ کی فطرت کو سمجھنا ضروری ہے

یہ نہم اور طبعی بچہ میں ایک رجحان URGE ہوتا ہے جو اس کو اپنے ماحول کی طرف رغبت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ بیرونی حرکت سرد اور بے اعتنائی کی طرح کی کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ ایک گہری محبت ہوتی ہے یا ایک ذہنی کشش ہوتی ہے جس کا مقابلہ بھوک سے کیا جا سکتا ہے جس طرح ایک بھوکا آدمی غذا کی تلاش کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ اسی طرح فطری و بانی بچہ کو اس کے گرد و پیش کی طرف لے جاتا ہے اور وہ ان اشیاء کی جستجو کرتا ہے جو اس کی روح کا تغذیہ کر سکیں اور عمل کے ذریعہ طاقتور بنا سکیں۔ ماحول سے شغف بچے کے لئے روحانی غذا ہے اور ہم کو بھی اس روحانی غذا سے محبت کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس میلان پر ہی انسانی خصائص کی بنا ہے ۔ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ بچے میں ماحول کی محبت کا جذبہ کار فرما ہے کیونکہ اس جذبہ کا مفہوم فانی اور وقتی ہے۔ بلکہ بچہ میں ایک دیرپا جذبہ ہے جو ماحول سے محبت کی بنا پر پیدا ہوتا ہے اور وہ بچے کے مسلسل عمل کے لئے محرک ثابت ہوتا ہے۔ ایک چونچال بچہ ان وسائل کی مدد سے زندہ رہتا ہے جو اس کو حاصل ہیں وہ وسائل جن کے بغیر وہ اپنے آپ کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ اگر بچے کو نفسیاتی زندگی کے اس ماحول سے علیحدہ کر دیا جائے تو اس کی ذہنی نشو و نما بند ہو جاتی ہے۔ اور اس کی تعمیر کمزور اور سرگرداں ہو کر رہ جاتی ہے ۔ اور بچہ بالکل نکما۔ شریر اور بیزار بن کر رہ جاتا ہے۔

اب اگر بچہ کے سلئے وجوہات عمل جو اس کی تعمیر کا باعث ہیں۔ ناممکن بنا دی جائیں تو وہ اشیاء کو دیکھنے اور ان کے حصول کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ جہاں ذہنی زندگی اور محبت بیکار ہو وہاں کسی چیز کا حصول اور قبضہ ہی آسان سی چیز ہوتی ہے۔ پس جوش عمل ENERGY دوسری سمت میں پھوٹ بہتا ہے۔ اور بچہ سونے کی گھڑی دیکھ کر جس سے وہ وقت دریافت نہیں کر سکتا کہتا ہے کہ "مجھے دیدو" ۔ دوسرا چیختا ہے کہ "نہیں مجھے" گو ان کا مقصد حصول گھڑی کو توڑ کر پھینک دینا ہی ہو مگر ہر ایک اس کے حصول کے لئے بیتاب ضرور ہوتا ہے۔ اس طرح مقابلہ اور تباہ کن کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اب محبت اور حصول کے درمیان جو قدم بھی فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے اور جو بچہ کو ان دو راستوں میں سے کسی ایک پر ڈال کر جوش زندگی کے ساتھ گامزن کر دیتا ہے وہی قدم ذہنی کجی PSYCHIC - DEVIATION کا باعث ہوتا ہے۔

ملکیت کا احساس بچہ میں اشیاء سے گہرا تعلق پیدا کر دیتا ہے۔ اور ان کے تحفظ کے لئے وہ ایسا ہی آمادہ ہو جاتا ہے جتنا کہ وہ خود اپنی حفاظت کے لئے۔ توانا تر اور چست بچے اپنی چیزوں کی حفاظت کے سلئے دوسرے بچوں سے لڑتے ہیں۔ وہ برابر جھگڑتے رہتے ہیں کیونکہ یا تو وہ اسی ایک چیز کے خواہشمند ہوتے ہیں یا کسی دوسری چیز کے جو کسی دوسرے کے پاس ہوتی ہے یہاں ایسا رد عمل ہوتا ہے جس میں محبت کا کوئی شائبہ

نہیں ہوتا کہ کشمکش اور جنگ کا دروازہ کھل جاتا ہے جس کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی - لیکن حقیقت یہ غیر اہم نہیں ہوتی - اس کے معنی ہوتے ہیں کہ کوئی چیز اپنے اصلی مرکز سے ہٹ گئی ہے یا کسی قوت نے اپنا راستہ بدل دیا ہے - یہ ایک اندرونی خرابی ہے جو جذبۂ حصول ——— POSSESSIVENESS ——— کا سبب بنتی ہے — اب والدین پند و نصائح کے ذریعہ بچہ کو اخلاقی تربیت دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ بچہ بیرونی اشیاء سے لگاؤ پیدا نہ کرے اور دوسروں کی چیزوں کا احترام کرے - لیکن بچہ کو اس کی اندرونی زندگی سے پہلے ہی بیگانہ کیا جا چکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ بیرونی چیزوں کی خواہش کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے - یہ جرثومہ بچے کی روح میں اس طرح جاگزیں ہو جاتا ہے کہ ایسے خصائص فطرت انسان کے لئے موزوں اور مناسب تصور کئے جانے لگتے ہیں - کمزور خصلت بچے بھی اپنی دلچسپیوں کو بیرونی اور مادی چیزوں کی طرف پھیر دیتے ہیں - ان کا رجحان چیزوں کو جمع کرنا اور ان کو چھپا کر رکھنا ہوتا ہے - لوگ ان کو فطری ذخیرہ اندوز سمجھنے لگتے ہیں لیکن یہ ایک قسم کا جنون ہوتا ہے جو نفسیاتی تضاد کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے - اسی بنا پر بعض بچے ایسی مختلف چیزیں جمع کرتے ہیں جن کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا اور جو اپنی ذات میں کوئی جاذبیت نہیں رکھتیں - کمزور اور اطاعت کیش بچوں کے کردار میں اور بیکار اور بے تکی چیزیں جمع کرنے میں ایک مماثلت ہوتی ہے جس کو طبعی سمجھا جاتا ہے - اگر کوئی ان کے جمع کردہ ذخیرہ کو لے لے تو ایسے بچے جہاں تک ہو سکتا ہے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں - ایڈلر (ADLER) ماہر نفسیات بچوں کے اس جذبہ کا مقابلہ حرص سے کرتا ہے جو بڑی عمر والوں میں پائی جاتی ہے - اس کے آثار کی شناخت صغر سنی ہی میں ہو سکتی ہے - اس عجیب و غریب فطرت کے ذریعہ بچہ ایسی چیزوں سے لگاؤ پیدا کر لیتا ہے جو اس کے کسی کام کی نہیں ہوتیں لیکن وہ انھیں کسی کو دینا بھی نہیں چاہتا -

یہ ہوتا ہے بچوں میں جذبۂ حصول جو ماحول سے محبت کے فقدان کی بنا پر پیدا ہوتا ہے اور بنیادی توازن میں کمی کے نتیجہ کے طور پر بڑھتا ہے - جب بچے اپنی مملوکہ چیزوں کی حفاظت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو والدین خوش ہوتے ہیں اور اس میں ان کو انسانی فطرت کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سماجی زندگی سے وابستگی کا مظہر ہے - لیکن والدین کو اس جذبہ کی دریافت ملحوظ رکھنی چاہیئے - ان کو معلوم کرنا چاہیئے کہ آیا یہ انسانی فطرت ہے یا جذبات کے تصادم کا نتیجہ ہے جس نے ایک غیر فطری صورت اختیار کر لی ہے — بچے کی فطرت اور ماحول کی اہمیت کو سمجھنے کے بعد والدین کو لازم ہے کہ وہ بچوں کی زندگی میں ایسے مواقع کم سے کم رونما ہونے دیں جہاں تصادم کا احتمال ہو اور اگر غلط ماحول کی بنا پر بچے میں کوئی کج روی پیدا ہو گئی ہے تو بہت سوچ بوجھ اور عقل کے ساتھ اس کا تدارک کرنا چاہیئے اور جس قوت نے اپنا راستہ بدل دیا ہے اس کو اس کے مرکز اصلی پر لانا چاہیئے تاکہ جوشِ زندگی صحیح رخ میں بہے اور بچہ عمدہ سے عمدہ انسانی صفات کا حامل ہو سکے ●

اور ہماری یہ خیالی جنت

(ماہ مبارک)

یہ آج کی تاریخ کے دو اہم واقعے ہیں۔

ہندوستان کی آزادی ——— اور پاکستان کی تخلیق

بھلا کبھی تاریخ میں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک حکمران ——— اور ایسا حکمران جس کی سلطنت کی وسعت کا یہ عالم ہو کہ اس کی قلمرو میں کبھی آفتاب غروب نہ ہوتا ہو ——— ایک ملک ——— جی ہاں ایک ایسا ملک جو ایک چھوٹے براعظم کی حیثیت رکھتا ہو ——— جو اس کے زیر دست ممالک میں ریڑھ کی ہڈی کے سماں ہو ——— اور جسے دنیا سونے کی چڑیا کہتی ہو ——— وہ بغیر لڑے بھڑے سلطنت چھوڑ دے۔ ملکی باشندوں کو آزادی تفویض کر دے۔

یا کبھی آپ نے سُنا ہے کہ ایک قوم ——— جو دو سو برس تک غلام رہ چکی ہو ——— اپنے حاکموں اور اپنے جارحانہ ہمسایوں کی مخالفت کے باوجود ——— توپ و تلوار سے نہیں ——— بلکہ صرف اپنی ذہنی کاوش سے دنیا کے نقشے پر ——— ایک آزاد ——— اور ——— دنیا کی سب سے بڑی اسلامی حکومت ——— کے طور پر ——— پاکستان ——— کا اضافہ کر دے ...

یہ دونوں واقعے دو جداگانہ حیثیتیں رکھتے ہیں ——— مگر ان کے پس منظر میں ایک چیز مشترک بھی ہے ——— اور وہ ہے "تخیل"

ہندوستان کے جس لیڈر نے ہندوستان کو جو آزادی دلوائی ہے ——— اس آزادی کا نقشہ ——— کاغذ پر نہیں۔ بلکہ سب سے پہلے اس نے اپنے دماغ میں تیار کیا تھا۔

اور پاکستان کے خالق ——— ملت اسلامیہ کے قائد اعظم ——— نے پاکستان کا نقشہ سب سے پہلے اپنے دماغ میں مرتب کیا تھا۔

تخیل یا سوچنا ——— ایک فطری امر ہے - - - ——— اور دنیا کا کوئی کام اس وقت تک اچھی طرح انجام نہیں پاسکتا جب تک ہم اس کے متعلق سوچ نہ لیں۔

فطرت کے دوسرے جذبات کی طرح انسان مجبور ہے کہ وہ سوچے ——— لیکن اپنی دوسری اہلیتوں کی طرح ہم اس قوت کو بھی کبھی اپنے نفع کے لئے استعمال کرتے ہیں اور کبھی خود مضرت کے لئے استعمال کرنے لگتے ہیں۔

دماغ کا کام ہی ہے کہ وہ سوچا کرے ——— اور تمام اشخاص سوچا کرتے ہی ہیں ——— مگر ان میں سے

کتنے ایسے ہیں جو خدا کی دی ہوئی اس نعمت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

جی ہاں ——— سوچ بچار کی طاقت ——— ایک نعمت ہی ہے ——— جو خدا نے صرف انسان کو ہی عطا فرمائی ہے۔ ورنہ اس میں اور دوسرے جانوروں میں کیا فرق تھا۔

آج بھی ہم انسانوں میں وہی ممتاز ہیں جو اپنی اس طاقت سے کام لے رہے ہیں۔ اور کامیابی نے صرف ان ہی کے قدم چومے ہیں ——— جن کی کھوپڑی میں ایک تندرست اور کام کرنے والا دماغ تھا۔

دیکھئے نا! جب ہمارے لیڈروں نے آزادی حاصل کرنے کے لئے سوچا ——— تب ہی ہم آزاد ہوئے!

"اقبال" کے دماغ میں جب "ایک الگ اسلامی خطہ" کا نظریہ پرورش پایا ——— تب ہی آج پاکستان کا نقشۂ عالم پر اضافہ ہوا۔

کولمبس کے دماغ میں جب ایک نئی دنیا کو ڈھونڈنے کا جذبہ پیدا ہوا ——— تب ہی دنیا آج امریکہ کو ایک طاقتور حکومت کے طور پر جان رہی ہے۔

درخت سے ایک سیب کو گرتے ہوئے دیکھ کر جب نیوٹن نے اپنے تخیل کا استعمال کیا تب ہی تو آج کششِ ارضی کا نظریہ دنیا کو معلوم ہے۔

یہ بھاپ کی طاقت ——— یہ بجلی کی کارفرمائیاں ——— یہ ریڈیو۔ ٹیلیفون۔ ٹیلیویژن ——— اور یہ ایٹمی طاقت ——— اور اس قبیل کی تمام چیزیں سب سے پہلے تخیل ہی کے پردہ پر نمودار ہوئی ہیں۔

سوچئے ——— ذرا آپ بھی سوچئے ——— کیا میں ٹھیک نہیں کہہ رہی ہوں ——— دیکھئے مروت نہ کیجئے گا۔

ہاں! ——— تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ دنیا میں دماغ کو کام میں لائے بغیر آپ کبھی ترقی نہیں کر سکتے ہیں۔ اب تخیل کے اعتبار سے میں آپ کو تین حصوں میں تقسیم کرتی ہوں۔

(الف) وہ جو بہت کم سوچتے ہیں وہ مثل سنی ہے نا آپ نے ——— کاتا اور لے دوڑی۔ بالکل اسی کے مصداق۔

(ب) وہ جو رات دن سوچا ہی کرتے ہیں۔ اور ان کی فکروں کا کوئی مرکز نہیں ہوتا

(ج) وہ جو ضرورت پڑنے پر سوچتے ہیں۔ اور صرف کسی خاص چیز کے متعلق سوچتے ہیں۔

آیئے میں اب آپ کو بتاؤں کہ اس تخیل کی طاقت کو آپ کس طرح صحیح طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔

جن لوگوں میں تخیل کا مادہ بالکل نہیں ہوتا ——— وہ ایک معنے میں تو ان لوگوں سے بہت اچھے ثابت ہوتے ہیں۔ جو رات دن ——— بس خیالات ہی میں کھوئے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ شگفتہ مزاج ہوتے ہیں۔ مگر میں آپ کو ایک گر کی بات بتاؤں ——— ایسے آدمی دنیا میں کبھی ترقی نہیں کرتے۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے ——— ایک لوہار ہے اور ایک انجینیر۔ دونوں کا کام تقریباً مساوی ہے۔ دونوں ہی دن بھر لوہے اور آگ سے لڑتے ہیں ——— مگر لوہار آج بھی اسی جگہ ہے۔ جہاں آج سے پچاس برس پہلے اس کے باپ یا استاد نے چھوڑا تھا۔ آج بھی لوہے کی وہ ——— وہی چیزیں اور ان ہی نمونوں کی بنا رہا ہے۔ جو آج سے ۱۰۰ برس پہلے رائج تھیں ——— مگر انجینیر؟

فرق صرف اس قدر ہے کہ لوہار کے جب ہاتھ چلتے ہیں تب اس کا دماغ کام نہیں کرتا ——— اس کے ہاتھ غیر ارادی طور پر وہی نمونے

بناتے چلے جا رہے ہیں جو انہوں نے اس وقت دیکھے تھے جب وہ پہلے پہل لوہے کو پکڑنا سیکھ رہے تھے ——— مگر انجینئر ہر وقت سوچتا رہتا ہے - اور اس وقت بھی وہ سوچ رہا ہے - جو نمونہ اس کے سامنے ہے وہ اس کو ترقی دینا چاہتا ہے ——— اس کی شکل تبدیل کرنا چاہتا ہے - آج جو چیزیں ہمارے پاس ہیں مصرف کے اعتبار سے وہ وہی ہیں جو پہلے کبھی تھیں ——— مگر پچھلی چیزوں کے مقابلہ میں وہ خوبصورت بھی ہیں - ہلکی بھی ہیں - تیز رفتار بھی ہیں کم قیمت بھی ہیں اور زیادہ فائدہ مند بھی ہیں - کیوں ؟ صرف اس لئے کہ ان کی تخلیق میں انجینئر کی دماغی کاوش بھی شامل ہے -

شاید کبھی آپ یہ خیال کرنے لگیں کہ ہم سوچنے میں اپنے قیمتی وقت کا ایک حصہ برباد کر دیتے ہیں ——— مگر آپ تجربہ کرکے دیکھ لیں ——— کام کی حالت میں کئی گنا وقت آپ بچا بھی لیتے ہیں -

جن لوگوں میں تخیل کا مادہ نہیں ہے ——— ان سے میرا کہنا یہی ہے کہ وہ خیالات پیدا کرنے کی مشق کریں سوچیں ——— ہر چیز کے بارے میں سوچیں ——— جو کچھ دیکھیں اور جو کچھ سنیں اس میں سے ہر چیز کے بارے میں وہ اپنے دل سے سوال کریں ——— کیوں ——— اور پھر اپنے دل سے جواب طلب کریں

چند ہی دنوں میں ان کے اندر سوچنے کی عادت پیدا ہو جائے گی -

یہ کوئی مشکل کام تو نہیں ہے -

ایک قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو رات دن سوچا ہی کرتے ہیں -

ایسے لوگ کبھی تو اپنے متعلق سوچتے ہیں اور کبھی دوسروں کے متعلق سوچتے ہیں -

تیرا درد دردِ تنہا - مرا غم غمِ زمانہ

اس کے تخیل میں یا تو ماضی کی خوشگوار یادیں ہوتی ہیں یا مستقبل کا بھیانک تصور - اس میں حال کا بہت کم حصہ ہوتا ہے - وہ یہ سوچتے ہیں کہ ایسا ہوا تھا یا ایسا ہوگا - مگر وہ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کس حد تک درست یا اس کو کس طور پہ درست کیا جا سکتا ہے یہی ان کی کمزوری ہے -

انسان اگر ماضی و مستقبل کو چھوڑ دے اور صرف حال پر اپنی توجہ منعطف رکھے تو یاد رکھیئے وہ کبھی ناکام نہیں ہو سکتا -

ہر چند کہ ماضی اپنے بہت کچھ اثرات چھوڑ جاتا ہے اور بلاشبہ "کل" بھی "آج" بننے والی ہے -

مگر ماضی کیا چھوڑ گیا ہے اس کا تو ہم جائزہ لے سکتے ہیں مگر "کیوں" چھوڑ گیا ہے اس پر غور کرنا ہمارے واسطے بیکار رہے - کل ہمارے گھر میں آگ لگ گئی تھی سب اثاثہ جل کر راکھ ہو گیا تھا - آج ہم "جھاڑی" زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں - یہ ایک واقعہ ہے - اب اگر ہم یہ سوچنے لگتے ہیں کہ آگ کیوں لگی - اے کاش نہ لگتی - اے کاش لگنے سے پہلے ہم اپنے قیمتی سامان کا کوئی حصہ نکال سکتے یہ سب ایسے خیالات ہیں جن کا ہمارے "حال" پر کوئی اثر نہیں پڑتا - اور یوں اسی واقعہ کو مختلف زاویوں سے سوچ سوچ کر ہم اپنے دماغ کو مفلوج کر رہے ہیں - ہونا تو یہ چاہیئے کہ ہم اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں کہ اب جلنے سے باقی کیا بچ گیا ہے - اور اس سے اب ہم کیا کام لے سکتے ہیں الخ جو چیزیں برباد ہو گئی ہیں ان کے بغیر موجودہ وقت میں ہم کس طور پر کام چلا سکتے ہیں اور جن کا حصول قطعی طور پر ضروری ہے وہ کیسے حاصل ہو سکتی ہیں اور ان کے واسطے ہم اپنے جسم یا دماغ کی کونسی "قوت" فروخت کر سکتے ہیں -

اسی طرح مستقبل سے بھی خوفزدہ ہونا ہماری ایک کمزوری ہے

ہم ایک دکان کھولنا چاہتے ہیں ——— لیکن خیال یہ ہے کہ نہ چلی تو

ہم نوکری حاصل کرنے کے واسطے جا رہے ہیں —— مگر ذہن میں کشمکش یہ ہے کہ نہ ملی تو
بیٹی کا بیاہ کر رہے ہیں —— مگر جی اندر ہی اندر لرز رہا ہے کہ نہ نبھی تو
یہ کیا خرافات ہے — آپ دوکان کھول رہے ہیں۔ اپنی جیب کا اندازہ کیجئے کہ کتنا سرمایہ لگا سکتے ہیں۔ جگہ کی موزونیت پر غور کیجئے کہ جو مال بیچنا چاہتے ہیں کہ اس کی وہاں واقعی ضرورت ہے —— اور پھر خدا کا نام لے کر دوکان پر بیٹھ جائیے —— آپ کے پاس مال ہے۔ دوسروں کو مال کی ضرورت ہے —— "کم نفع اور زیادہ بکری" یہ آپ کی دوکانداری کا اصول ہو پھر نہ چلنا کیا معنے۔
آج نہ چلی تو کل چلے گی — آج دو آدمیوں نے آپ کی دوکان دیکھی ہے۔ کل چار دیکھیں گے پرسوں سولہ [illegible] پھر بعد آپ کی دوکان کی شہرت پر لگا کر اڑتی رہے گی۔
آپ بیٹی کا بیاہ کر رہے ہیں —— آپ اس کے مستقبل سے فکرمند کیوں ہیں — آپ تو حال کو دیکھئے آپ کی بیٹی کی صورت کیسی ہے۔ پھر اس کو ایسی ساس نندوں میں مت دیجئے جو اس سے صورت میں افضل ہوں آپ کی بیٹی خانہ داری میں کس حد تک ماہر ہے اس کا آپ آج شادی سے پہلے جائزہ لیں — اگر وہ خانہ داری سے واقف ہے۔ تو آپ اس کے مستقبل سے قطعی طور پر ہراساں نہ ہوں اگر نہیں ہے تو دو چار مہینہ شادی ملتوی کر دیجئے اور اس کو خانہ داری سکھلائیے۔
اسی طرح تخیل کے اعتبار سے ایک اور قسم کے لوگ ہیں۔
اُن کی فکر میں نہ ماضی ہے نہ مستقبل۔ بلکہ صرف حال ہی حال ہے۔ اور حال بھی کیسا جس کو سن کر حال آنے لگتا ہے۔
یہ آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھے ہیں انہوں نے اپنے کو کبھی ایک بادشاہ یا رانی تصور کر لیا ہے کبھی ایک لیڈر فرض کر لیا ہے یا اور کسی طور پر ہیرو یا ہیروئن بن گئے ہیں۔ اب دنیا ہے کہ ان ہی کے گرد رقص کر رہی ہے۔ وہ لمحہ بہ لمحہ ترقی کرتے چلے جا رہے ہیں۔
ایسے لوگوں کی حالت قابل رحم ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اکثر مصیبتیں اٹھا چکے ہوتے ہیں یا اکثر ناکامی کا منہ دیکھ چکے ہوتے ہیں لہٰذا ان کا دماغ ایک تسلی کا محتاج ہوتا ہے اسی لئے لاشعور ان کے آگے خیالی طور پہ ایک ڈرامہ کھیلتا ہے جس میں وہ خود بھی ایک ممتاز پارٹ ادا کرتے ہیں۔
ایسے لوگ بہت کم سخی ہوتے ہیں۔ وہ آدمیوں سے بہت کم ملتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی ناکامیاں اور مایوسیاں روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔ کیونکہ زندگی کا جو مسئلہ ان کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ وہ اس سے خود گھبرا جاتے ہیں۔ اور اس پر غور کرنا نہیں چاہتے اور یہی وقت ہوتا ہے جب وہ موجودہ مسئلہ کو چھوڑ کر اپنی خیالی دنیا میں کھو جاتے ہیں
پھر اگر وہ اس مسئلہ کو خود حل نہیں کر سکتے ہیں تو وہ دوسروں سے بھی اس کے بارے میں رائے لینا پسند نہیں کرتے ہیں — کیونکہ ان کے اندر ایک ایسا "احساس برتری" کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں سے کسی مسئلہ پہ رائے لینے میں اپنی ہتک خیال کرتے ہیں۔
ایسے لوگوں کو میرا صرف ایک ہی مشورہ ہے۔ وہ یہ کہ وہ اپنا وقت تنہائی میں کم سے کم گذاریں اگر سردست وہ غیروں سے ملنے میں ایک قسم کی جھجک محسوس کرتے ہیں —— تو کم از کم اپنی بیوی اور بچوں میں زیادہ دلچسپی لیں۔ اپنی مشکلات کو اپنی بیوی سے بیان کریں —— وہ تو بہرصورت رازدار ہے ہی —— دیکھئے شاید یہ "ناقص العقل" کبھی آپ کو کوئی کام کا مشورہ دے ہی دے۔
اب میں ان تیسرے قسم کے لوگوں کے متعلق کچھ کہتی ہوں۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا یہ وہ لوگ ہیں جن کے دماغ بلا وجہ نہیں سوچتے ہیں لیکن جب ضرورت پڑتی ہے تب ضرور سوچتے ہیں اور اپنا ہر کام سوچ سمجھ کر ہی انجام دیتے ہیں —— ارے یہ کیا ہوا۔ دوات ہی الٹ گئی۔ اب کیا لکھوں —— اچھا پھر کبھی۔

جنسیات

بچّوں کو جنسی تعلیم کیسے دی جائے

ڈاکٹر بیلی۔ ایس۔ مولی
کی کتاب

HOW SHALL I TELL MY CHILD ——— کی روشنی میں ——————— زرّین عذرا

(یہ فرض کرنے کے بعد کہ آپ بچوں کو جنسی تعلیم دینے کے حق میں ہیں)

زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے والے والدین اپنے بچّوں کو ہر قسم کی تربیت دینے کو تیار تو ہیں۔ مگر کثر حالتوں میں وہ خود بھی نہیں جانتے کہ انھیں کیا اور کیسے سکھانا چاہیئے۔ جنسیات کے متعلق تو یہ عام شکایت ہے۔ والدین خود جنسی اعضاء اور ان کے مناسب طریقۂ عمل سے ناواقف ہوتے ہیں۔ مناسب طریقۂ عمل تو ایک طرف رہا۔ وہ جنسی اعضاء کا نام تک نہیں جانتے۔

پھر یہ تعلیم کیونکر ممکن ہے؟

سوچنے اور غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس دشواری کا بہت آسان حل موجود ہے۔ بچے اپنی بیشتر معلومات آپ کو دیکھ کر، آپ کی باتیں سن کر حاصل کرتے ہیں۔ ان کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ "گلاس" کسے کہتے ہیں۔ کیونکہ گھر کا کوئی فرد گلاس مانگتا ہے تو کوئی دوسرا فرد ایک چمنی نما چیز اٹھا کر دیدیتا ہے۔ مانگنے والا یہ نہیں کہتا کہ اسے کیا دیدیا گیا۔ بچّہ سمجھ جاتا ہے۔ کہ گلاس کسے کہتے ہیں۔ اس کی کیا شکل ہوتی ہے۔ اسی طرح جنسی تعلیم کے لئے آپ کو الفاظ کی مدد لینے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو آپ کو دیکھ کر بہت سی باتیں سیکھ لیتا ہے۔ ہاں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ والدین خود صحیح راہوں پر گامزن ہوں۔ پھر گتھیاں گتھیاں نہیں رہیں گی اور یہ ضروری فرض بہت خوش اسلوبی سے انجام پا جائے گا۔

والدین کا صحیح راہوں پر گامزن ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ روائتی اخلاق پرستی سے چھٹکارا حاصل کرلیں۔ روائتی اخلاق پرستی کی بموجب انسان کا جسم ایک مکروہ شئے ہے۔ جس کی بناوٹ پر شرم آتی ہے۔ اسے چھپائے رہنا چاہیئے۔ اسے ذلیل سمجھنا چاہیئے۔ اگر وہ کسی کے سامنے سہواً کھل جائے تو شرم سے پانی پانی ہو جانا چاہیئے۔ اس مفروضہ سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بچہ اپنے وجود کے کسی جزو کو ——— وہ جسم ہی ——— ذلیل اور قابل شرم نہ سمجھے گا۔

یہ ایک بہت عام خیال ہے کہ جنسی خواہش اس قدر ذلیل خواہش ہے۔ اس قدر وحشی خواہش ہے کہ اس کا اظہار ہی دوسروں کی لعنت ملامت مول لینے کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے جنسی خواہش کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لاوا پھوٹ پڑتا ہے۔ اور اب جو اس خواہش کا اظہار ہوتا ہے وہ اس قدر مکروہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی تہذیب اس کو روا رکھنے کی حامی نہیں ہے۔ والدین کو یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ جنسی جذبے اگر وحشی جذبے ہیں تو کیا قدرت انھیں جذبوں کو انسان کی بقاء کا ذریعہ بناتی ——— وہ ہرگز ہرگز وحشی اور ذلیل نہیں ہیں۔ اور ان کو تسکین دینے کے لئے جو جسمانی تعلق پیدا ہوتا ہے۔ وہ بھی وحشی اور ذلیل نہیں وہ فطرت کی خواہش کے عین مطابق ہیں۔ اگر ان سے پرہیز کیا جائے تو یہ زمین ایک ہی صدی میں انسانوں سے خالی ہو جائے۔ اور زمین پر کوئی خدا کا پیامبر نہ رہ جائے ——— اگر آپ کو یہ خیال ہو کہ بچے کو کیسے سمجھایا جائے

جبکہ ہم خود ہی الفاظ سے ناواقف ہیں۔ ایسے الفاظ سے جن سے مطلب کی ادائیگی بغیر شرم کے احساس اور گناہ کی لذت کے ہوسکے۔ تو میرا یقین کیجیے کہ آپ کی زبان میں اتنی وسعت موجود ہے کہ آپ ہر جذبہ کا اظہار کر سکتے ہیں۔

روز مرہ کی بات چیت کی زبان ہی کافی ہے۔ مگر زبان سے زیادہ خود آپ کی اپنی زندگی بچوں پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ بچے جتنا آپ کی اپنی زندگی سے سیکھ سکتے ہیں اتنا آپ کے الفاظ سے نہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ بچے کے دل میں یہ خیال بھی پیدا نہ ہونے پائے کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ ذلیل ہے۔ اس کی بہترین صورت یہ ہوگی کہ اگر بچے کے سامنے آپ کے جسم کا کوئی حصہ کھل جائے تو اس کو ڈھانکنے میں گھبرا نہ جائیے۔ اور اپنے چہرہ پر شرم کی لکیریں نہ ڈال لیجیے۔ بچے کو یہ احساس نہ دلائیے کہ آپ اپنی اس اتفاقیہ حرکت پر شرمندہ ہیں۔ اگر وہ آپ سے جسم کے متعلق کوئی سوال کر بیٹھے۔ تو بغیر کسی جھجک کے صحیح صحیح جواب دیدیجیے اور بات بات میں یہ بھی بتادیجیے کہ کپڑے اس لئے پہنتے ہیں کہ ہم سردی سے بچیں۔ یا ہوا میں اڑتی ہوئی خاک سے محفوظ رکھیں۔ اگر آپ اس کے سامنے اپنے جسم کی اس اتفاقی عریانی پر شرمندہ ہوں گے تو اُسے اپنے جسم کی عریانی پر بھی شرم آئے گی اور رفتہ رفتہ اس کے ذہن میں یہ بیٹھتا جائے گا کہ جسم کے بعض حصے برے ہیں۔ گندے ہیں۔ ہم انسانوں کے قابل نہیں۔ جب ہی انہیں دوسروں سے چھپایا جاتا ہے۔ بعض حصے ہی ایسے ہیں ورنہ پاپا یا ممی اپنے ہاتھوں کو نہیں چھپاتے۔ اور ان کی عریانی پر شرمندہ نہیں ہوتے۔

اگر بچہ کسی جنسی قسم کا سوال کر بیٹھے تو آپ بات بناتے ہوئے دوسروں کی طرف آنکھ نہ جھپکائیں۔ اور دوسروں کو اس طرح اس کی طرف متوجہ نہ کریں۔ ورنہ بچوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو جائے گا کہ آپ اپنی باتوں میں کچھ چھپا رہے ہیں۔ ایسا کچھ جو آپ اسے بتانا نہیں چاہتے۔ وہاں میں جہاں یہ خیال پیدا ہوا۔ وہ فوراً ہی ان کو جاننے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے۔ اور غلط طریقوں پر غلط باتیں سیکھ جاتا ہے۔

اور پھر ———— سمجھ میں نہیں آتا کہ جنسی اعضاء کا نام سن کر آپ کو ہنسی کیوں آجاتی ہے۔ اس کا بچے پر اثر یہ پڑتا ہے کہ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ جسم کے بعض حصے ایسے ہیں جن کے متعلق کھل کر گفتگو نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر ان کا ذکر آئے گا تو یہ بڑی بڑی عمروں والے لوگ کھسیانی ہنسی ہنس دیں گے۔ ٹال دیں گے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں بچے کو دوسری طرف لگانے کی کوشش کرنے لگیں گے۔

یا جب آپ کسی غیر کے اچانک آجانے سے بچہ کا یا اپنا کہیں سے کھلا ہوا جسم ڈھانکتے ہیں تو آپ کا یہ عمل اس کو بہت کچھ سکھا دیتا ہے آپکے الفاظ تو وہ بھول سکتا ہے۔ مگر آپ کا عمل ———— جی نہیں۔ ان کو فراموش کرنا دشوار ہے۔

جب آپ بچے کو اس کے جنسی اعضاء کو چھونے پر سزا دیتے ہیں تو آپ اس کی توجہ ان اعضاء کی طرف اور بھی مبذول کرا دیتے ہیں اور اس کو یہ ذہن نشین کرا دیتے ہیں کہ جنسی اعضاء کو چھونے کے لئے بھی تنہائی کی ضرورت ہے ———— اگر آپ اس کا ہاتھ گھسیٹ لیں گے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کی "بُری عادتیں" ٹھیک ہو رہی ہیں۔ جی نہیں۔ اس پر اور بھی قبیح عادتوں کے دروازے کھول دیتے ہیں آپ۔ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اُسے آپ کے سامنے اپنے جنسی اعضاء نہیں چھونا چاہیئے۔ ان کے چھونے کے لئے تنہائی سب سے بہتر جگہ ہے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ ان کو محض اس لئے چھو رہا ہو کہ ان میں کسی قسم کی خلش ہو رہی ہو۔ پجامہ پہننے سے کپڑے کی رگڑ آگئی ہو۔ کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہو۔ یا کچھ چبھ گیا ہو۔

دراصل وجہ یہ ہے کہ بچہ اپنی پیدائش کے اوّلین چند مہینے بعد ہی سے مختلف آوازوں کو الگ الگ پہچاننے لگتا ہے۔ وہ اپنی ماں کو دوسری عورتوں سے مختلف سمجھتا ہے۔ مچھلی کے تیل کو دودھ کے دھوکے میں پینے کو تیار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ساتھ "شرم" لے کر پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی اپنے جسم کے مختلف اعضاء میں فرق کرتا ہے۔ اس کا جب جی چاہے وہ کسی عضو کو چھو لیتا ہے۔ مگر آپ کے عمل سے وہ جلد ہی معلوم کر لیتا ہے کہ جب وہ اپنے کسی جنسی عضو کو چھوتا ہے تو آپ اس کی طرف زیادہ متوجہ ہو جاتے ہیں۔ بس۔ جب بھی اُسے بھوک لگتی ہے۔ یا کسی اور چیز کی خواہش محسوس ہوتی

ہے۔ وہ اسی آسان ترکیب کو استعمال میں لاتا ہے۔ بغیر کسی شرم کے اور ہو بھی جاتا ہے کامیاب آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ــــ اکثر والدین جنسی اعضاء کا نام نہیں جانتے اور وہ کیونکر جانیں جبکہ انھیں کسی نے بتایا نہیں۔ ان کے متعلق وہ کتابی معلومات بھی اخلاقی بندشوں کی وجہ سے حاصل نہ کر سکے۔ مگر بچوں کو جنسی اعضاء کے نام بتانے کی ضرورت ہے اور اس طرح بتانے کی ضرورت ہے کہ بتانے والا کسی قسم کے گناہ کا مرتکب ہوتا ہوا محسوس نہ کرے۔ بچے نام معلوم کرنے کے بعد ان کے مناسب طریقہ عمل سے بھی واقف ہو جاتے ہیں۔ اتنی ہی غیر جذباتی طریقہ پر، جتنی دوسرے اعضاء کے طریقہ عمل سے ہوتے ہیں۔

بچوں کو تربیت کی ضرورت ـــــــــ اور یہ تربیت نہایت آسانی سے والدین دے سکتے ہیں۔ مگر ہوتا کیا ہے کہ والدین بجائے صحیح راہبری کے بچے کی جنسی خواہشوں کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کو تاریکی میں رکھتے ہیں اور جب یہ بچے بڑے ہوتے ہیں تو وہ زندگی کے سب سے بڑے مقصد میں کامیاب ہونے کے بجائے گمراہ ہو جاتے ہیں

آپ ان کو جنسی مریض نہ بنایئے ــــــــ

(اگلے شمارہ میں ــــ "اگر بچہ پوچھے ؟")

میں اکثر گنگناتی ہوں

اگرچہ تلخ ملا جام عمر فانی کا — مگر محل نہیں ساقی سے بدگمانی کا

(اکبرؔ)

نہ ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش — دیکھو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

(ذوقؔ)

حسرت پہ اس مسافرِ بیکس کی رویئے! — جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

(مصحفیؔ)

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب — موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

(چکبستؔ)

ہمت ہے تو پیدا کر فردوس حیات اپنا — بخشی ہوئی لذت سے دوزخ کا عذاب اچھا

(اقبالؔ)

کیف امادہ ہستی دل رنجور نہیں — اب تو غم ہو کہ خوشی کچھ بھی منظور نہیں

(ناطقؔ)

جو آگ لگائی تھی تم نے، اس کو تو بجھایا اشکوں نے — جو اشکوں نے بھڑکائی ہے، اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

(جذبیؔ)

(محمودہ مہربانو)

مستقل عنوان

بھولوں کیسے

لیجئے ——— اپنے ساتھیوں کی زندگی کے ناقابل فراموش واقعات پڑھیئے ———
آپ بھی اپنی زندگی کے ایسے حادثے لکھ کر بھیجئے جن کو آپ بھول نہ سکتے ہوں۔
——— دوسروں کو سنانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے ———
اور باہمی رفاقت بڑھتی ہے

(ادارہ)

رئیس جہاں نیر انصاری ———

پچھلے دنوں اپنے لاہور کے قیام میں مجھے اپنے ایک عزیز کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا ویسے تو وہ بھی دہلی سے آئے ہوئے مہاجرین میں سے ہیں، لیکن اللہ کے فضل سے بارو زگار ہیں۔ رہنے کو اچھا خاصہ گھر بھی ملا ہوا ہے اُن کی بیوی بھی کچھ قابل نفرت نہ تھیں، ماشاءاللہ دو تین پیارے پیارے بچے بھی ہیں، پہلی نظر میں ہی دیکھنے والا یہی رائے قایم کرے گا کہ اس مختصر سے گھرانے کو عنایات خداوندی کی بدولت خوش و خرم ہونا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے بھی یہی اندازہ لگایا۔

ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پان کے بعد چائے کا دور چلا اور پھر خاتمے کے طور پر پان کی باری آئی، چند روز بعد مجھے کراچی واپس آنا تھا میرے عزیز نے روانگی کی تاریخ دریافت کی جو میں نے بلا تکلف بتادی اور پھر انہوں نے درخواست کی کہ میں ان کی اہلیہ کو اپنے ہمراہ کراچی لاکر ان کی بہن کے ہاں پہنچادوں ساس میں بھی کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے مجھے اعتراض ہوتا لیکن غیر ارادی طور سے خیال آگیا کہ اگر اسٹیشن پر ان کو کوئی لینے نہ آیا تو میں ان کو کہاں پہنچاؤں گی۔ ان کی بہن کا پتہ مجھے معلوم نہ تھا۔ اور وہ پہلی بار کراچی آنے والی تھیں۔ میں نے اپنا اندیشہ اپنے بھائی پر ظاہر کر دیا، انہوں نے جواب میں کہا کہ " یوں تو میں ان کی بہن کو تار دے دیتا ہوں لیکن اگر کوئی نہ آئے تو تم ان کو ——— کہیں بھی "پھینک دینا" ——— لفظ "پھینک دینا" ——— ایک جیتے جاگتے انسان کے لئے ——— اور بھی کم و بیش ——— اپنی رفیقۂ حیات کے لئے ——— کانوں کو کچھ عجیب سا معلوم ہوا اور مکروہ آواز بھی۔ اور پھر میرے عزیز نے نہایت عاجزانہ انداز میں یہ کہہ کر کہ "خدا کے لئے ان سے میرا پیچھا چھڑا دو" میرے ہونٹوں پر آئے ہوئے سوال کو کچھ دیر کے لئے حلق میں واپس ڈھکیل دیا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی اہلیہ بالکل بے فکر اور مطمئن تھیں گویا کسی دوسرے ملک کا ذکر ہو رہا ہے اور اب میرے عزیز کچھ اور بھی حضور قلب سے استدعائیں کرنے لگے کہ میں ان کی بیوی کو اپنے ساتھ ہی لے جاؤں۔

اب مجھے دریافت کرنا ہی پڑا کہ آخر کیوں؟ اور جواب میں وہ برس ہی تو پڑے گویا وہ اپنا تمام غصہ مجھ پر ہی اتارنا چاہتے ہیں ایسی حالت میں اگر ان کو ٹوک دیا جائے تو یقیناً ان پر مالیخولیا کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ چنانچہ میں نے ان کو موقعہ دیا کہ وہ اپنے دل کی بھڑاس خوب خوب نکال لیں اس کے بعد ہی کچھ اندازہ لگایا جا سکتا تھا ——— "دیکھتی ہو تم چار روز سے مسلسل بارش ہو رہی ہے، یہ کرسی اسی طرح

باہر پڑی ہوئی ہے، یہ منّی کے کپڑے یوں ہی الگنی پر صحن میں لٹکے ہوئے ہیں، اور وہ دیکھو میرے جوتے پڑے بھیگ رہے ہیں، بس یوں ہی سمجھ لو کہ ننھا گھٹنوں اسی طرح پڑا اٹھتا رہتا ہے۔جس طرح اب اٹھتا رہا ہے اور اِس عورت کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی ——— انہوں نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور وہ اشارہ پاتے ہی زیر لب مسکرا دیں ——— اور ہاں دیکھو تو سہی میری اُجلی قمیص چولہے کی اینٹوں میں پڑی ہے اور ادھر تو دیکھو اس چارپائی کا جھلنگا بنا ہوا ہے دو مہینے ہو گئے لیکن اللہ نے ان کو اتنی توفیق نہیں دی کہ ذرا ادوائیں کھینچ دیں ——— " معمولی سی بات ہے ادوائیں اگر وہ نہیں کس سکتیں تو آپ خود کس لیتے بات ہی کیا ہے " ——— میں نے حالات کی نزاکت کا اندازہ لگانے کے لئے کہا ——— ارے بھئی، منّی کا منہ دھونا، اس کو کپڑے پہنانا اور اس میز کو صاف کر دینا تو ایسے کام ہیں جو یہ بہ آسانی کر سکتی ہیں، تم ہی بتاؤ میں صبح نو بجے دفتر جانے کی تیاری کر دوں یا پائینتی کسوں ؟ اور پھر شام کو سات بجے دن بھر دفتر میں جھک جھک کرنے کے بعد آ کر منّی کے کپڑے تبدیل کر دوں !!! بھئی صاف بات ہے میں ان کے تمام عزیزوں کو لکھ چکا ہوں کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی ——— خواہ مخواہ دونوں کی زندگی خراب کرنے سے حاصل ؟ کیوں نہ ہم علیحدہ علیحدہ راستہ اختیار کر لیں آج شادی کو آٹھ سال ہو گئے ہیں اور میں اسی طرح ۔ورہا ہوں ہر بات کی حد ہوتی ہے آخر کب تک چلے گا یہ سب کچھ ؟ ——— انہوں نے کہا اور واقعی حد ہوتی ہے کاہلی اور پھوہڑپن کی بھی ؟ ایک عورت جو آٹھ برس سے ایک گھر کی مالک ہے کچھ عرصہ سے دو تین بچوں کی ماں اور ایک شوہر کی بیوی بھی کہلاتی ہے ہو اس قدر بدسلیقہ سست الوجود نہیں ہونی چاہیئے ۔

آٹھ سال خانگی زندگی گذارنے کے بعد ایک عورت کا اس طرح سے کسی جگہ بھی پھینکدیا جانا باعث عبرت ہے ۔ میرے عزیز نے مجھے بتایا کہ ان کے ان آٹھ برسوں میں ایک دن بھی ایسا نہیں گذرا جس کو واقعی مسرت آمیز کہا جا سکے ۔ ممکن ہے اس میں کچھ مبالغہ ہو کیونکہ شادی کے ابتدائی دن رات تو کسی نہ کسی درجہ مسرت آگیں ہوں گے ہی لیکن ان چند دنوں کے بعد سے ان کی زندگی کچھ ایسے ہی حوادث سے دوچار ہوتی رہی کہ جن کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ آج وہ دو متضاد راستوں پر گامزن ہونے کے لئے مجبور تھے ۔ اور مجھے مجبور کر رہے تھے کہ اس تضاد کی فوری وجہ بیان قرار دی جاؤں ۔ یہ تو خیر تفصیل ہے کہ میں نے کس طرح اس موضوع سے کنارہ کش ہو کر اپنا دامن بچایا لیکن آج نہیں تو کل وہ دن مجھے اپنے عزیز کے ہونٹوں سے لڑکھتے ہوئے الفاظ میں رقصاں نظر آ رہا تھا جب کہ یہ متضاد راستے ان دونوں کو اختیار کرنا ہی پڑیں گے ۔

کہنے کو تو یہ تمام معمولی معمولی باتیں تھیں لیکن آج تک میرے کانوں میں گونج رہی ہیں اور بھلائے نہیں بھولتیں ۔ اپنے فرصت کے لمحوں میں مجھے یہ سوچنا ہی پڑتا ہے کہ آخر ان کا اور ان ایسی دیگر بہت سی خواتین کا حشر کیا ہوگا ۔ وہ خواتین جو اپنے اپنے گھروں کی مالک ہونی چاہیں لیکن لاپرواہ اور ناعاقبت اندیش ملازموں سے بھی بدتر ہیں، میاں تو خیر مصیبت سے نجات پا کر شکر کریں گے ۔ بیوی کچھ دن عزیزوں اور محلہ داروں میں شور مچا کر رو پیٹ لیں گی لیکن بچے کس مد میں ڈالے جا سکتے ہیں وہ بچے جن کو صحیح طور سے پرورش کیا جائے تو کل " قوم" بننے والے ہیں اگر دیکھا جائے تو میاں بیوی کی" شکر رنجی کا سب سے زیادہ خوفناک خمیازہ ان معصوم روحوں کو بھگتنا پڑے گا اور پھر ——— آئندہ چل کر نہ معلوم یہ کیا بنیں ۔ ہو سکتا ہے آس پاس محلہ یا شہر والوں کو بھی کچھ تاوان دینا پڑے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی بچے سوسائٹی بھر کے لئے ایک مستقل عذاب کی شکل اختیار کر لیں ۔ یہ البتہ نہیں ہو سکتا کہ میرے عزیز کی اہلیہ اپنے کردار کو نہ پہنچیں آج نہیں تو کل وہ ضرور کہیں نہ کہیں " پھینکدی " جائیں گی ۔ ہم ایک انسان کو قوت برداشت ——— بڑھانے کی تلقین کر سکتے ہیں لیکن مجسم " برداشت " نہیں بنا سکتے ۔

بات چیت

فرد، فرد کی "بات چیت" سے لاشعوری طور پر متأثر ہوتا ہے — کچھ کہئے، کچھ سنئے — کہنے سننے سے جی کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے بات چیت کا یہی مقصد ہے اور بس — دیکھئے۔ کہاں ہم آپ کے لئے مفید ہیں —

لیکن سوالات کرتے وقت اس بات کا خیال رکھئے — کہ آپ کے سوالات مبہم نہ ہونے پائیں — اگر سوالات خود آپ کی ذات سے تعلق رکھتے ہوں — تو اپنی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ بھی لکھئے — تاکہ ہم آپ کا صحیح مفہوم سمجھ سکیں — اور آپ کے مسائل کا صحیح نفسیاتی تجزیہ بھی کر سکیں — (آپ کی یہ مختصر سوانح صیغۂ راز میں رہے گی سوالات شائع کئے جائیں گے)

؎ آپ کی خاطر ہمیں منظور ہر طور

(ادارہ)

N. K. L کراچی

میں کتنا ہی خوش رہنا چاہوں مگر خوش نہیں رہ سکتی اکثر میں کسی وقت بہت خوشی کی حالت میں ہوتی ہوں تو یکلخت مجھے پتہ نہیں کیا ہوتا ہے کہ مغموم ہو جاتی ہوں - بتائیے یہ کیا وجہ ہے ؟ اور ہاں ہر وقت چڑچڑی بنی رہتی ہوں - کوئی بات کرے تو سیدھے منہ جواب نہ دینا، اس وجہ سے سب ناراض ہوتے ہیں لیکن میں مجبور ہو مجھے خود معلوم نہیں کہ کیا مجھے ہو جاتا ہے - آپ مجھے بتائیے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے - ؟

ایسے لوگ جو عموماً مغموم یا چڑچڑے رہتے ہیں دو قسم کے ہوتے ہیں — اول تو وہ جو بچپن سے ایسی ذہنیت لے کر آتے ہیں اور یہ سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ یہ کمزوری ان میں پیدائشی ہے - دوسرے وہ جو کچھ عرصے سے کسی خاص واقع کے ماتحت ایسے ہو جاتے ہیں آپ کے سوال سے یہ نہ ظاہر ہو سکا کہ آپ کس ضمن میں ہیں - بہرحال ہم دونوں قسام کو لیتے ہیں -

بچپن سے قنوطی یا چڑچڑا ہونے کی وجہ بچپن کی ذہنی ساخت ہے - مثلاً دیکھا گیا ہے کہ بچے کسی جائز بات کی خواہش کرتے ہیں مگر والدین ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اس طرح بچوں میں چڑچڑا پن اور ضد پیدا ہو جاتی ہے جو ان کی فطرت کو ایک مخصوص رنگ میں رنگ دیتی ہے اور وہ بڑے ہو کر بھی لاشعوری طور پر اسی ذہنیت کا شکار رہتے ہیں چونکہ یہ کمزوری بچپن سے پیدا ہوتی ہے - اس لئے اس کی ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے - مگر جب یہ احساس پیدا ہو جائے کہ یہ بری ہے تو پھر اس کا دور کرنا خود اس شخص کا فرض ہے - کیونکہ

دور کرنے کی یہی ترکیب ہے کہ اس بات کا احساس پیدا کیا جائے کہ یہ کمی دوسروں کے غلط رویئے کی وجہ سے آپ میں آ چکی ہے اور جس کو آپ خود دُور کر سکتی ہیں۔ اپنے اندر اعتماد اور اپنی قوتِ ارادی میں استواری پیدا کیجیئے اور اس بات کا خیال رکھئے کہ آپ کم سے کم موقعوں پر مغموم، چڑچڑی یا بدمزاج ہوں۔ ہر وقت اس پر غور کرنا چاہیئے کہ جب کبھی چڑ چڑے پن کا موقع آئے تو یا تو ایسے موقعے کو ٹال جانا چاہیئے یا دانستہ اس موقع کو بغیر مشتعل ہوئے برداشت کرنا چاہیئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ پہلا رنگ ہلکا پڑتا جائے گا۔ اور صحت مند ذہنیت غالب آتی جائے گی۔ بہرحال یہ احساس جتنا شدید اور قوت ارادی جس قدر مضبوط ہوگی مقصد میں کامیابی اسی قدر یقینی ہے۔

کچھ عرصے سے مزاج میں تبدیلی کے دو وجوہات ہیں۔ اول جسمانی اور دوم ذہنی نامعلوم وجہ۔ بیماری سے اٹھنے کے بعد یا عام تندرستی کی خرابی کی وجہ سے مزاج میں چڑچڑا پن اور طبیعت میں اداسی پیدا ہو جاتی ہے جس کا علاج ڈاکٹر کا مشورہ یا کسی ٹانک TONIC کا استعمال ہے۔

یہ سوچنا کہ بعض ذہنی الجھنیں ایسی ہیں جن کی کوئی وجہ نہیں صحیح نہیں ہے۔ ہر الجھن کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے جو ہم معلوم نہیں کر پاتے۔ ہمارے ذہن کا ایک حصہ ایسی باتوں کا ذخیرہ ہے جنہیں یا تو ہم پسند نہیں کرتے یا ہمیں ان سے تکلیف ہو چکی ہوتی ہے اور ذہن کا دوسرا حصہ ہر وقت ہمارے سامنے رہتا ہے۔ ذہن کا وہ حصہ جہاں ہماری تمام تلخ یادیں دفن رہتی ہیں۔ انھیں باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہے اور ہمارا ضمیر یا سپر ایگو اسے دبانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ ان دونوں کی باہمی کشمکش ذہنی پریشانی کا باعث ہوتی ہے جو مزاج کو چڑچڑا اور طبیعت کو مغموم بنا دیتی ہے۔ دراصل اس کا حل یہ ہے کہ اس چیز کو جو باہر آنا چاہتی ہے یا وہ خواہش جو آپ نہیں جانتیں شعوری طور پر سمجھا جائے اور اس کے دفن ہونے کی وجہ پر غور کیا جائے جب یہ دونوں باتیں صحیح طریق پر حل جائیں گی تو کشمکش اور پریشانی خود بخود دُور ہو جائے گی۔

آپ ہنسیں گی کہ اگر یہی معلوم ہو جاتا تو سوال ہی کیوں کیا جاتا۔ یہ ٹھیک ہے ــ مگر ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ ممکن ہے۔ اور وہ اس طرح کہ آپ سوچئے کہ آپ چڑچڑی کیوں ہوتی ہیں۔ سب سے پہلی چیز کیا ہے یا کسی شخص کی وہ کونسی خاص حرکت ہے جو آپ کو ناگوار ہوتی ہے۔ جس کے بعد کافی عرصے تک آپ کے مزاج میں تلخی باقی رہتی ہے۔ سوچ ہی ایک ذریعہ ہے جس کی مدد سے ہم لاشعور میں دفن تمام کریہہ اور ناگوار یادوں کو کرید کرید کر شعور پر لا سکتے ہیں اگر آپ کوشش کریں کہ وہ کون سے خیالات ہیں یا دوسروں کے وہ کون سے افعال ہیں جو آپ کو اذیت دیکر چڑ چڑا کرتے ہیں تو یقیناً کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور برآمد ہوگا اور جب اصل وجہ معلوم ہو جائیگی تو یہ الجھن خود بخود دور ہو جائے گی۔ وعدہ کیجئے آپ کوشش کریں گی۔

نوٹ:۔ آپ کا دوسرا سوال آپ کی ذات سے متعلق معلوم ہوتا ہے اس لئے ہم بغیر آپ کی زندگی کا خاکہ معلوم کئے اور بغیر متعلقہ اشخاص کا کردار جانچے جواب دینے سے قاصر ہیں۔

عبدالرحمٰن یسنی

ذہنی اُلجھنوں سے جو پریشانی ہو تو کس طرح ان سے نجات حاصل ہو۔

اول تو آپ اپنی ذہنی الجھنوں کا تجزیہ کرکے ان کو الگ الگ کیجیئے تاکہ سب یکجا ہو کر آپ کے ذہن پر بیک وقت حملہ نہ کرنے پائیں پھر ہر الجھن کی فرداً فرداً اصل وجہ معلوم کیجیئے اور اس کو دور کرنے کی کوشش کیجیئے۔ یہ کیونکہ ممکن ہے اس کے لئے۔ محترمہ N.K.L کو جو جواب دیا گیا ہے۔ وہ ملاحظہ فرمائیے۔

احمد سرور

۱۔ جب انسان بہت سے فکروں میں ایک دم سے مبتلا ہو جائے تو کیا کرنا چاہیئے۔

محترم عبدالرحمٰن پسنی اور محترمہ N.K.L کے جوابات ملاحظہ فرمائیے۔

۲۔ سکون قلب حاصل کرنے کے بہترین طریقے کیا ہیں۔

نفسیات کی اصطلاح میں سکون قلب کے کوئی معنی نہیں۔ یہ ایک پرانا اور غیر نفسیاتی تصور ہے کہ سکون اور خوشی کا مرکز دل ہے۔ صرف دماغ ہی دکھ سکھ کے احساس کا پردہ ہے۔ دماغی سکون حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ دماغ کو بے بنیاد خوفوں اور وہموں سے صاف رکھا جائے۔ ہر الجھن اور کشمکش کی اصل وجہ معلوم کر کے اس کو دور کرنے کی سنجیدہ کوشش کی جائے۔ دماغی سکون ہی اصل میں قلبی سکون ہے۔

جمیل رفعت

۱۔ میں فطرتاً ہنگامہ پسند واقع ہوا ہوں، مجھے ہمیشہ دوسروں کو طنز کرنے کی لت رہی ہے۔ ہر وقت اس سے مذاق، اس سے چھیڑ چھاڑ۔ بقول میری ایک کاھل ہٹ "میں نچلا کبھی نہیں بیٹھتا" مگر اس کے باوجود جب میں کسی بھی محفل ـــــ اپنی یا پرائی کا کوئی اعتبار نہیں ـــــ میں جا بیٹھتا ہوں۔ میں ایک دم گھنگی کیوں سادھ لیتا ہوں۔ دوسرے احباب اِدھر اُدھر کی ہزار باتیں کریں۔ میری خاموشی کیوں نہیں کھلتی؟

بھائی جان! سچ پوچھئے تو یہ احساس کمتری ہے جو آپ کو محفل میں کھلنے نہیں دیتا۔ یہ ایک شخصی کمزوری ہے جو دور کی جا سکتی ہے۔ ویسے داخلی حیثیت سے آپ چاہے کسی قدر "ہنگامہ پسند" واقع ہوئے ہوں مگر خارجی حیثیت سے آپ بالکل مختلف ہیں۔ دوسروں کے سامنے آپ کی وہی کیفیت ہوتی ہے جو کہ ایک اونٹ کی (جو اپنے کو دنیا میں سب سے جسیم جانور سمجھتا ہو) پہاڑ کے دامن میں ہوتی ہے اس وقت اس کو احساس پیدا ہوتا ہے کہ پہاڑ کے سامنے اس کی کوئی وقعت نہیں۔ آپ بھی دوسروں کے سامنے خود کو حقیر اور کمزور محسوس کرتے ہوں گے اور دوسروں میں خواہ مخواہ بڑائی دیکھتے ہوں گے۔ بہرحال یہ کمزوری کیوں کر دور کی جا سکتی ہے اس کے لئے آپ پچھلے شمارے میں "بات چیت" کے زیر عنوان ایک جواب میں احساس کمتری پر ایک مفصل معلومات ملاحظہ فرمائیے۔

۲۔ مدکد قہقہاتے ہوئے گیتوں کے مطابق مجھے وہ گیت کیوں زیادہ لبھاتے ہیں جو غمگین اور دکھ بھرے ہوں جن پر یاسیت محیط ہو ـــ حالانکہ سچ سچ غم سے مجھے ابھی پالا پڑا بھی نہیں۔

آپ کو کبھی غم سے پالا نہیں پڑا یہ آپ کا شعوری فیصلہ ہے مگر ـــ کیا لاشعور کی بھی یہی کیفیت ہے؟ [illegible] لاشعوری جذبوں کی نمو ئی کرتے ہیں اس سے آپ کو غرض ہے ـــ شعور میں کوئی نہ کوئی ضرور ایسا غم ہے جس کی تسکین غمگین گیت [illegible] ہیں۔ وہ غم کیا ہے جو لاشعور کی گہرائیوں میں دفن ہے۔ اور جس کا اظہار دکھ بھرے گیتوں کی پسندیدگی سے ہوتا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے تحلیل نفسی کی ضرورت ہے۔

منظور طارق

میں کوئی بھی فلم دیکھوں۔ ذرا سی "ٹریجڈی" یا موڈ سین سے میرے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ حتیٰ کہ "کاسٹ" دیکھتے وقت اگر موسیقار اچھی سی لے چھیڑ دے تو بھی "وفور جذبات" پر قابو نہیں پا سکتا۔ حالانکہ اپنی نجی زندگی میں میں اتنا زیادہ "رقیق القلب" واقع نہیں ہوا ہوں۔

صرف فلم پر منحصر نہیں۔ کسی عظیم ہستی کا ذکر خیر یا کسی اچھے افسانے یا ناول کا پلاٹ بھی یہی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے

آپ کا سوال جمیل رفعت صاحب کے سوال سے قریب قریب ملتا جلتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک عرض ہے اور وہ یہ کہ اپنے بارے میں اپنے فیصلوں کو قطعی اور صحیح سمجھنا اپنی شخصیت کو غلط سمجھنا ہے۔ ہمارے دماغ کا ایک بڑا حصہ لاشعور ہے جو ہمارے

شعوری کردار پر کافی اثر انداز ہوتا ہے۔ لاشعور خود ہم سے پوشیدہ رہتا ہے۔ ہم خود نہیں جان سکتے کہ ہمارے لاشعور کا اصل رنگ کیا ہے۔ اس لئے وہ فیصلے جو ہم اپنے شعور سے کرتے ہیں بالکل جزوی ہوتے ہیں۔ عملی زندگی میں رقیق القلب نہ ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہو سکتا کہ آپ کے لاشعور میں رحم یا دکھ سے متاثر ہونے کا جذبہ ہی نہیں۔ "ٹریجڈی" سے متاثر ہونا آپ کے لاشعوری دکھوں کی غمازی کرتا ہے۔ یہ دکھ کیا ہیں؟ یہ آپ کو صرف تحلیل نفسی سے معلوم ہو سکتا ہے۔

۲ میں وقتی طور پر کسی سے لڑ جھگڑ لوں یا سخت سست بھی کہہ لوں۔ مگر اس کے فوراً بعد ہی پچھتاتا ہوں کہ ایسا نہ ہونا چاہیئے تھا۔ اور دل ہی دل میں اُسے پھر سے منانے کی تجویزیں سوچتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے یہ "احساس کمتری" ہے۔ مگر ایسا کیوں ہے؟ خودداری کو کم از کم ایک ہفتہ تو برقرار رکھ سکوں۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔

آپ کا یہ سوال بہت اہم ہے۔ مگر آپ کا یہ فیصلہ کر دوسروں کو دل ہی دل میں منانے کی کوشش احساس کمتری ہے صحیح نہیں۔ یہ اصل میں شخصیتوں کا اختلاف ہے۔ بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اپنے اندر ہی اندر تمام فیصلے کرتی ہیں ان کے تمام احساسات خود پر مرکوز ہوتے ہیں۔ زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں مگر مختصر یہ ہے کہ مشہور ماہر نفسیات H. RORSCHACH نے شخصیتوں کو دو گروہ میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) INTROVERSIVE (داخلی) (۲) EXTROVERSIVE (خارجی) INTROVERSIVE وہ شخصیتیں ہوتی ہیں جو خود پر مرکوز ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ اپنے سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور بجائے خارجی دلچسپیوں کے اپنے ذہن میں تمام چیزیں ڈھونڈتے ہیں۔ ایسے لوگ اول تو خارجی عناصر سے ٹکراتے نہیں اور اگر ٹکراتے بھی ہیں بھی تو خود پشیمان ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تنہائی پسند۔ تخیلی اور رومانی ہوتے۔ اگر کسی سے انھیں کوئی رنج پہنچتا ہے یا کبھی نوبت لڑائی جھگڑے تک پہنچتی ہے تو وہ جھگڑے سے پہلو تہی کر جاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اس کی شکایت اس شخص سے بیان کریں اپنے دل ہی دل میں مشتعل اور جھگڑتے رہتے ہیں۔ تمام دن کے تلخ تجربات رات کو پلنگ پر لیٹ کر سوچتے ہیں اور اپنے مخالف سے تصور ہی تصور میں جھگڑتے ہیں اور زیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں سوچنے کی عادت زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے حساس ہو جاتے ہیں۔ بقول یونگ کے ایسے لوگوں کا LIBIDO مائل بہ داخلیت ہوتا ہے اس لئے ایسے لوگوں کے احساسات کی شعاعیں خود پر مرکوز رہتی ہیں۔

EXTROVERSIVE شخصیت INTROVERSIVE سے بالکل مخالف ہوتی ہے اس گروہ کے لوگ خارجی ماحول سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں اور اپنے خارجی ماحول کو اپنے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں ایسے لوگوں کا LIBIDO خارجیت کی طرف رجوع رہتا ہے۔ حقیقت پرست، مزاح نگار، اور خوش باش لوگ اس گروہ میں ملتے ہیں۔ وقتِ ضرورت ایسے لوگ جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کے لئے مکہ بازی تک سے نہیں چوکتے اور تمام تلخیاں اور واقعات جلد بھول بھی جاتے ہیں۔

جاوید احمد۔ کراچی

بعض اوقات مجھ پر ایک نامعلوم سا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ ہر فرد سے مجھے خوف محسوس ہوتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خوفناک حادثہ ہونے والا ہے۔ حالانکہ کوئی حادثہ پیش نہیں آتا۔ اس کی وجہ اور علاج بتائیے؟

اسی قسم کے اور بہت سے خوف اور وہم ہوتے ہیں جو افراد کو پریشان کرتے رہتے ہیں۔ اگر واقعی یہ جنون کی حد تک ہیں تو ضرور مرض میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ عموماً بچپن کے خوف اور اوہام جو ہمارے لاشعور میں مقید رہتے ہیں۔ باہر نکلنے کی کوشش میں ہماری ذہنی زندگی کا سکون برباد کرتے رہتے ہیں۔ کسی شخص سے خوف محسوس کر کے کسی خوفناک حادثہ کی توقع کرنا اصطلاحی زبان میں ANXIETY NEUROSIS ہے جس میں مریض ہمیشہ کسی ہونے والے حادثہ کا متوقع رہتا ہے۔ آپ اسی شمارہ میں "خوف" پر لکھا ہوا مضمون پڑھ لیجئے +

راہب خانہ

رئیس جہاں نیر انصاری

پہاڑی ندی کے اس پار آلوچوں کے جھنڈ میں ایک راہب خانہ نہ معلوم کب سے موجود ہے۔ اس میں جلتی ہوئی موم بتیوں کی لو کے متعلق آس پاس کے دیہاتیوں کی رائے ہے کہ خود حضرت عیسیٰؑ کی جلائی ہوئی ہیں، جل رہی ہیں، اب تک اور ابد تک جلتی رہیں گی اور وہاں کے بڑے پادری کا قول ہے کہ حضرت عیسیٰ کی روح اب بھی کبھی کبھی راہب خانہ میں دیکھی جاتی ہے اور حضرت پطرس تو اکثر دیشتر مسیح کی راہ سے بھٹکی ہوئی بھیڑوں کو راہ راست پر لگاتے دکھائی دیتے ہیں، آخر بہشت کی کنجیاں بھی تو ان ہی کی تحویل میں ہیں۔ بھٹکی ہوئی ان بھیڑوں کو راہ نجات دکھا کر بہشت میں داخل کرنے کا کام ان ہی کے ذمہ تو ہے۔ پادری شام کے وعظ میں روزانہ کہا کرتا ہے ———

——— آسمانی باپ ہم سب کا نجات دہندہ ہے یہاں کی تکلیفیں آسمان کی بادشاہت کی پیش خیمہ ہیں ———

——— اور اس کے شاگرد ایک آواز ہو کر یہ الفاظ گاتے ہیں راہب خانہ گونج اٹھتا ہے نمازی سوچتے ہیں ———

——— آسمان کی بادشاہت ——— یہاں کی تکلیفیں اٹھا کر ——— ہنستے کھیلتے سہہ کر ———

ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ راہب اور راہبہ جو تعداد میں کافی ہیں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں پھر حضرت عیسیٰ کی تصویر کی طرف اور پھر چبوترہ پر رکھے ہوئے مجسمہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھتے ہیں ——— کیا واقعی آسمان کی بادشاہت یہاں کی تکلیفیں اٹھا کر نصیب ہوگی ——— اور پھر ان کو خود بخود پطرس کے ہاتھ میں لٹکے ہوئے چابیوں کے گچھے کی کنجیاں ہلتی نظر آنے لگتی ہیں ——— راہبہ فرط مسرت سے آنکھیں بند کر کے جھومنے لگتی ہے، راہب اس کے پہلو میں اپنی باہیں ڈال کر ——— یا ہلیلویاہ ——— کا زیر لب نعرہ لگاتا ہے راہبہ اور قریب ہو جاتی ہے ——— اور قریب ——— دونوں کی دوئی غائب ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے میں پیوست نظر آتے ہیں۔

ایک نوخیز نویافتہ شاگرد راہبہ دانتوں میں انگلی دبا کر پطرس کے مجسمہ کی طرف دیکھتی ہے اس کا احساس اسے گدگداتا ہے عمر اس کے سینے میں دبے ہوئے جذبات کی چٹکی لیتی ہے اس کی آنکھیں بار بار کھلتی اور بند ہوتی ہیں راہب اور راہبہ ایک دوسرے میں مدغم ہیں پطرس کا مجسمہ مسکرا رہا ہے سامنے حضرت عیسیٰ کی تصویر ہے جس میں وہ بہت سی راہ سے بھٹکی ہوئی بھیڑوں کو ایک ڈوری میں باندھ کر راہ نجات پر لیجاتے نظر آتے ہیں.....

بالکل راہبہ، راہب اور نوخیز نویافتہ راہبہ کی طرح وہ بھی تو راستے سے بھٹکے ہوئے تھے اب ——— اب ——— پطرس کے ہاتھ کی چابیاں ان سب کے لئے آسمانی بادشاہت کے دروازے وا کیا چاہتی ہیں، وہ اپنے مستقبل کو کوسنے لگتی ہے کتنا دھوکہ دیا تھا اس کے ماں باپ نے اس کو ——— اس کی شال سینہ کے زیر و بم سے ذرا نیچے ڈھلکی اور وہ لگی اس کو صلواتیں سنانے ——— کتنا فرق ہے دنیوی زندگی میں اور دینی خدمت میں، دنیا میں ہم جو کچھ کرتے ہیں قدم قدم پر صلواتیں سننی پڑتی ہیں جس سے جی گھبرا کبھی تو جاتا ہے طرح طرح تاکہ وہ گناہوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں ——— اور یہ راہب خانہ ———

دینی خدمت کا مرکز ——— آسمان کی بادشاہت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ——— یہ راہب اور یہ راہبہ ———
لیکن آخر ایسا کیوں ہے ؟ ——— ان لوگوں کو اتنی آزادی کیوں ہے یہ ہم سے زیادہ سیاہ کار ہو کر بھی راہ نجات کے علمبردار کیونکر
ہو سکتے ہیں ——— نو یافت راہبہ کے یہ سوالات اس کے ذہن میں گونج رہے ہیں کھوپڑی کی چہار دیواری میں ٹکریں مار رہے ہیں
لیکن جواب نہیں پاتے ——— اور پھر اس کا ضمیر پکارتا ہے ——— بھولی لڑکی تو تباہی کے غار پر کھڑی ہے یہ راہب خانہ
تجھے آسمان کی بادشاہت کبھی نہ دلا سکے گا۔ تجھے دنیا ملے گی نہ دین، نکل جا، یہاں سے دور چلی جا ——— وہ جھنجھلاتی ہے۔ اس کے جذبات ضمیر
کی آواز پر قابو پا جاتے ہیں ضمیر ایک بار پھر للکارتا ہے لیکن ——— جنگل کی آواز گھن دار جھنڈوں سے ٹکراتی ہوئی بانس کے لمبے
لمبے درختوں میں نکل کر آسمان کی بادشاہت میں رم جاتی ہے ——— وہ ایک انسان ہے ——— ایک زندہ انسان
جس کے احساس اور جذبات جاگ رہے ہیں ان کو دبانے کی کوشش کی گئی لیکن وہ بڑھتے ہی رہے بالکل ربڑ کے اس گیند کی طرح جو دبانے سے اور زیادہ
اچھا [illegible] ——— گرم اور تازہ خون جس کی گرمی اس کے سینے سے نکلتی معلوم ہوتی ہے
[illegible] جوش لئے دیتی ہیں ——— — — —
——— راہب اور راہبہ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں شاگرد راہبہ کے دل پر دھکا سا لگتا معلوم ہوتا ہے، دس بارہ جوان
سال لڑکیاں ایک دوسری کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے پادری کی طرف بڑھتی ہیں شربت کا گلاس پادری کو پیش کیا جاتا ہے۔ ایک
گھونٹ وہ پیتا ہے اور اس کا جھوٹا ایک ایک گھونٹ، سب لڑکیاں پیتی ہیں۔ نو یافت راہبہ دیکھتی ہے۔ دیکھتی رہتی ہے گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں
پادری پھر گنگناتا ہے اور نمازی ان کے الفاظ ایک آواز ہو کر دہراتے ہیں۔ نماز ختم ہو جاتی ہے عورتیں مرد بچے جوان بوڑھے باہر نکلنے لگتے
ہیں یہ راہبہ پطرس کے مجسمے کی طرف بڑھتی ہے اس کے ہاتھ میں لٹکے ہوئے چابیوں کے گچھے پکڑ کر دوزانو ہو بیٹھتی ہے آنکھوں میں آنسو تیر رہے
ہیں، راہب اور راہبہ آگے بڑھ کر اس کے دائیں بائیں بیٹھ جاتے ہیں، پادری باقی رسوم سے فارغ ہو کر اس کو راہبہ بنانے کی رسم پوری کرنے
کے لئے آگے بڑھتا ہے ——— یہ دنیا ایک گورکھ دھندہ ہے بیٹی ——— وہ کہتا ہے ——— لیکن مجھے
یہاں بھی گورکھ دھندہ ہی نظر آتا ہے ——— لڑکی جواب دیتی ہے، قدرت کے دیے ہوئے جذبات کو دبانا تمہارے بس کا کام
نہیں ——— جو لوگ ان کو دبانے یا دبوانے کی کوشش کرتے ہیں وہ کبھی آسمان کی بادشاہت میں شامل نہیں ہو سکتے اور
پھر ان کا صحیح استعمال تو عین فطرت ہے بچی ——— پادری جواب دیتا ہے ——— لیکن یہ تو راہب خانہ
ہے باپ، آسمانی باپ کا گھر، برکتوں کا مرکز ——— ٹھیک ہے، لیکن آسمانی باپ نے کب کہا ہے کہ تم قدرت سے جنگ کرو
قدرت سے جنگ کرنے والے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ راہب خانہ میں آ کر انسان بے حس فرشتہ نہیں بن سکتا راہب اور راہباؤں کے
احساسات یہاں بھی وہی ہوتے ہیں جو آلوچوں کے جھنڈ کے باہر ہو سکتے ہیں راہب خانہ آدمیوں کو انسان بنانے کے لئے ہوتا ہے فرشتے
بنانے کے لئے نہیں میری بچی ——— ہر انسان اپنی عمر کے ساتھ ساتھ کچھ جذبات بھی پاتا ہے تمہاری اندھی دنیا ان جذبات کی پوش
میں نجات سمجھتی ہے ان پر قابو پانا ہی مقصد حیات جانتی ہے ان کے اظہار کو گناہ سمجھتی ان کی تکمیل کو دوزخ کا ایندھن بتاتی ہے لیکن یہ غلط ہے مذ
پیشواؤں نے تمہاری دنیا والوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان کے دل پر یہ نقش کر دیا ہے کہ راہب خانے ہی ذریعۂ نجات ہو سکتے ہیں
یہ نقش اتنا گہرا ہے کہ اس پر کسی کا اثر نہیں ہو سکتا تم دیکھتی ہو بادشاہ کی دسترس سے بھی یہ باہر ہے یہاں کلیسا کی حکومت ہے کلیسا کا قانون
یہاں کوئی جرم جرم نہیں۔ یہاں کی حرکت مقدس سمجھی جاتی ہے اور تمہاری دنیا کے اندھے یہی سمجھتے ہیں کہ یہاں سے دودھ اور شہد کی بہتی
نہریں تمہیں جنت میں پہنچا سکتی ہیں اگر تمہاری دنیا اندھی نہ ہوتی تو فن مذہب آج اس قدر کامیاب نہ ہوتا تم نے دنیوی بادشاہ کو یہاں مد

کرکے رکھدیا ہے تم نے قدرت سے جنگ کی ہے۔ تم نے اس کے اصولوں سے ٹکر لی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مذہب بدنام ہے تم نے قدرت کے اصولوں کی تکمیل کئے فرار، اغوا، اور حرام کاری جیسے گھناؤنے نام رکھ چھوڑے ہیں اگر اس تکمیل پر تم ناجائز پابندیاں عاید نہ کرتیں تو آج مذہب بدنام نہ ہوتا مجبور انسانوں کو راہب خانوں میں رنگ رلیاں منانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ عمر کو پہچانو عمر کے ساتھ ساتھ اس کے جذبات کا احترام کرو مجلسی اور مذہبی مفروضہ پابندیوں کو توڑ ڈالو ورنہ تم آسمان کی بادشاہت سے ہمیشہ محروم رہو گے ان جذبات پر رنگ مذہب اور ملت کی قیود کامیاب نہیں ہوسکتیں تمہارے سماجی درجے ان جذبات کو نہیں دبا سکتے اسی کوشش کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں جنسی افراط و تفریط بڑی ہوئی ہے ——— نو یافتہ راہبہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی نہریں جاری تھیں کلیسا سے نکلتی ہوئی دودھ اور شہد کی نہریں تھم گئی تھیں راہب خانہ میں لگے ہوئے رنگ برنگے شیشوں سے آنے والی شعاعیں ماند پڑ گئی تھیں فنکار راہب اور راہبہ پیشوا کے لکچر کا اثر نئی راہبہ کے دل پر دیکھ رہے تھے اس کا دل اچھل رہا تھا جذبات سینے کی آہنی دیواروں سے ٹکرا رہے تھے دیواریں لرز رہی تھیں اس کی آنکھیں سرخ ہوکر شعلے برسا رہی تھیں تمام جسم کا خون سمٹ کر اس کے رخساروں پر آگیا تھا اس کی شال شانوں سے گر کر قدموں پر آپڑی تھی راستے بھٹکی ہوئی راہب خانہ میں آئی تھی اور اب اس کا دل روشن تھا لیکن راہب خانہ سے متنفر اس کی آنکھوں سے نکلتے ہوئے شعلے راہب خانہ کو جلا دینا چاہتے تھے اس کے سر سے ایک بوجھ اتر چکا تھا اور اب وہ خراماں خراماں باہر نکل رہی تھی۔ آلوچوں کے جھنڈ سے باہر غروب ہوتے ہوئے سورج کی سرخ روشنی سے وہ مانوس معلوم ہوتی تھی خوبانیوں کے درختوں سے اسے محبت ہوگئی تھی اور وہ گاؤں جانے والی پگڈنڈی کو اشتیاق بھری نگاہوں سے گھورتی ہوئی چلی جارہی تھی ریت میں ننگے پاؤں چلنے والے دیہاتیوں کے قدموں کے نشان اسے بھلے معلوم ہونے لگے تھے۔ ان ہی قدموں میں سے کسی کو وہ اپنا لینا چاہتی تھی۔ علی الاعلان سب کے سامنے تمام سماجی، مذہبی اور اقتصادی بندھنوں کو ٹھکرا کر ٭

منشی عبدالغفار نے عثمانی پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر رسالہ سائیکولوجی اردو [illegible] سے شائع کیا



اپنے دانتوں کی
صفائی اور حفاظت
کیلئے
مسواک ٹوتھ برش
ہمیشہ استعمال کیجیے
Guaranteed
NO ANIMAL
BRISTLES
MISWAK
انگلینڈ میں بنا ہوا
مسواک
ر بڑی دوکان پر ملتا ہے



PSYCHOLOGY

HEALTH · HAPPINESS · SUCCES

سائیکالوجی

گلستان کے مشہور نفسیاتی ماہنامہ کا اُردو ایڈیش



سائیکولوجی اردو

جلد ۲ جولائی ۱۹۵۰ء نمبر ۶

ادارہ تحریر

آنسہ شاہدہ سلطانہ ۔ ایم اے

بیگم رئیس جہاں نیر انصاری

عابدی جعفر ــــ بی اے

مدیر عمومی

انعام اللہ خاں بی اے بی ایل

معتمد عمومی

علاءالدین خالد

سالانہ چندہ
پاکستانی سکہ چھ روپے
بھارتی سکہ ساڑھے سات روپے

قیمت
پاکستانی سکہ آٹھ آنے
بھارتی سکہ دس آنے

دفتر
سائیکولوجی اردو ۔ پوسٹ بکس ۵۶۶ کراچی

مندرجات

پہلی نظر	۳
کیا آپ ہکلاتے ہیں	۶
شرم و حیا	۹
مرقیہ رمزیہ اور تحلیل نفسی	۱۲
ان دیکھی دنیا	۱۷
خودی کر بلند اتنا	۲۳
بات چیت	۲۶
مرد جب شادی کرتا ہے	۳۱
بھولوں کیسے	۳۴
والدین پوچھتے ہیں	۳۷

پہلی نظر

آپ کا شمار ان لوگوں میں نہ سہی، مگر اپنے گرد و پیش نظریں دوڑائیے۔ آپ کو کتنے ہی لوگ ایسے ملیں گے جو زندگی کو ماہ و سال کی ترازو میں تولتے ہیں وہ اس خیال کے پیرو ہیں کہ ——— زندہ رہو۔ صبح سے شام، شام سے، دن سے ہفتے، ہفتوں سے مہینے، مہینوں سے سال، سالہا سال زندہ رہو۔ زندہ رہنے میں مزا ہے۔ خواہ یہ زندگی کیسی ہی ہو۔

مگر ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ زیادہ مدت تک سانسوں کی آمد و شد بہتر ہے۔ یا کم عرصہ کی "زندگی"۔ زندگی جو ہمارے ان لمحات کے مجموعہ کا نام ہے جو ہم نے اپنے کو، کائنات کو سمجھنے اور انسانی زندگی کے تسلسل کو جاننے اور ان گھڑیوں میں ایک ابد گھڑی کے اضافہ کرنے میں گذارے ہیں؟

زندگی اور موت کا درمیانی وقفہ اگر زیادہ ہو سکے۔ تو اچھا ہے۔ مگر انسان جو ازل سے ابد کی منزل تک مسافر ہے۔ اس کے لئے یہ وقفہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس نے اپنے لئے کچھ معیار بنا رکھے ہیں۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کے کتنے لمحے ایسے گذرے ہیں جبکہ وہ دوسروں کی خوشی کے سامان مہیا کرتا رہا ہے۔ اس نے ان لمحات میں کیا پایا ہے۔ اور کیا دوسروں کو دیا ہے ——— یہ اس لئے ضروری ہے کہ آج ہمارے چاروں طرف بیکار زندگیوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگے ہیں۔ زندگیاں جو زندگیوں کی طرح نہیں بسر کی گئیں ان زندگیوں میں الجھے ہوئے وقت کے تانے بانے ہیں۔ وقت، جو زندگی کو پیار کرنے، اس کی جد و جہد کا ساتھ دینے میں گذرنا چاہیئے۔ مگر جو زندگی سے نفرت کرنے اور اس سے فرار میں صرف ہوا ہے ——— اوہ کتنے ہی مرد، کتنی عورتیں ایسی نظر آتی ہیں جو کسی نہ کسی طرح وقت کو کاٹ دینا چاہتی ہیں۔ وہ اپنی پچھلی ناکامیوں پر آنسو بہا رہی ہیں۔ آہیں بھر رہی ہیں اور ہمت ہار چکی ہیں ایسی عورتیں اور ایسے مرد، جن کے لئے زندگی ایک ناسور ہے۔ جو سڑ رہا ہے، بہہ رہا ہے۔ وہ صدیوں سے اپنے کاندھوں پر گراں بار اٹھائے چل رہے ہیں۔ اور جب تھک جاتے ہیں۔ تو بوجھ کو گرا دیتے ہیں اور خود فنا ہو جاتے ہیں۔ یہ بوجھ دوسری نسل کے لئے سنگ راہ بنتا ہے۔ وہ ٹھوکر کھاتے ہیں گرتے ہیں اور ان منزلوں سے بے خبر رہتے ہیں جو ان کی منتظر ہیں۔

کیا یہی انسان ہیں؟

انسان!

نہیں۔ انسان نے تو زندگی کی گرانباری کو کبھی گرانبار محسوس ہی نہیں کیا۔ وہ زندہ رہا اور انسانی بلندیوں کی طرف بڑھتا رہا۔ ادب کی [illegible] کو چھوا، فنکار بنا، سائنس کی نامعلوم دنیا میں گھسا اور اپنے ساتھ اس کی نعمتیں لایا۔

نہیں ——— ان روتے، بلکتے، کراہتے جسموں کا نام تو انسان نہیں، مگر یہ ضرور ہے کہ یہ سب کے سب بھی انسانیت کے دائرہ میں آ سکتے ہیں۔ وہ بھی بہتر دنیا کے خواب ہی نہیں، بلکہ اس بہتر دنیا کو اصلیت کا جامہ پہنا سکتے ہیں۔ اگر یہی مرد، یہی عورتیں اپنی زندگی کے بیکار لمحات کو زندگی کی سنہری زلفیں سنوارنے میں گذاریں، اپنی بے ترتیب زندگی میں ایک ترتیب پیدا کریں اور اپنی قوتوں کے منتشر ہونے

[illegible] ایک وقت کے ساتھ اپنے وجود میں پستیوں سے اٹھا کر لے جاتی ہوں۔ [illegible] انسان ہو جاتی ہیں۔ [illegible] [illegible] اور وقت کے بہاؤ میں وہ تیزی اور مستی پیدا ہو جائے

اگر آپ یہ یاد رکھیں کہ کچھ جو لمحہ بیکاری میں گذر رہا ہے۔ وہ آج ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ آپ کے لئے ایک ایسا بوجھ بن جاتا ہے۔ جو آپ کو کل اپنے کاندھوں پر لاد کر آگے بڑھنا ہے۔ آپ اس بوجھ کو گرا نہیں سکتے۔ اور نہ ایسا محسوس کر سکتے ہیں گویا کہ وہ [illegible] تھوڑی نہیں۔ جو جو اس بوجھ کے وزن میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ وہ وہ آپ کے لئے اگلی منزلیں دور ہوتی جائیں گی۔ اگلی منزلیں ان [illegible] ہوں گی کہ آپ ان تک پہنچنے میں ہزار بار جھکیں گے، تھک کر بیٹھیں گے۔ وقت گذرتا جائے گا اور وزن میں اضافہ ہوتا ہی جائے گا۔ اور آپ بے بس ہو کر وقت کے دھارے میں بہنے لگیں گے

کہنے کو تو یہ بھی لوگ کہتے آئے ہیں کہ اپنے کو وقت دھاروں میں چھوڑ دو۔ زندگی کا دریا جہاں بہائے جائے۔ بہہ جاؤ مگر تجربے بتلاتے ہیں کہ اس بہہ جانے میں زندگی کا کوئی مزا نہیں۔ دھارے کے خلاف بہنے میں انسان کو اپنی قوتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ قسمت کے تھپیڑوں کو موڑنے میں اُسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وقت کا وہ مالک ہے، قسمت کا بنانے والا وہ خود ہے اور اسی [illegible] جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ آج انسان اس بلندی پر پہنچ گیا ہے۔ جبکہ فرشتے بھی آسمانوں کے ساتوں پردوں کو ہٹا کر دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور انگشت بدندان رہ جاتے ہیں۔ کہ یہ انسان، یہ خاکی بندہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ کہاں کس پستی میں تھا اور کہاں کس بلندی پر آ گیا۔ کہ بس ایک قدم اور، اور ہم اس کے محکوم ہوئے جاتے ہیں۔ بس ایک قدم اور، اور وہ زندگی کا خالق بن جاتا ہے۔ بس ایک قدم اور، کہ ساری کائنات گویا کہ اُسی کی خلقت میں آتی جاتی ہے ——————— یہیں پر اس انسان کا خالق مسکراتا ہے اور فرشتوں کی طرف دیکھ کر محظوظ ہوتا ہے۔ ہم نہ کہتے تھے کہ آدم کے آگے سر جھکاؤ۔ ہم نے بنایا ہی ہے اس [illegible] کو اس لئے کہ اشرف المخلوقات بنے، اے فرشتو، تم بھی ہماری مخلوق ہو۔ مگر انسان اشرف المخلوقات مگر یہ سب بھی وقت ممکن ہے جبکہ آپ کی زندگی کا کوئی واضح مقصد ہو۔ آپ یہ جانتے ہوں کہ آپ کو کہاں پہنچنا ہے ——————— اور کن راہوں سے پہنچنا ہے۔

منزل کا تعین اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس میں آپ کا مستقبل سانس لے رہا ہے۔ اور حال بھی امیدیں لگائے ساتھ ساتھ ہو منزل کے تعین کے بعد کب کی سوئی ہوئی اور زنگ آلود قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ اور زندگی سے کچھ امیدیں وابستہ ہو جاتی ہیں اور نیا معنی پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ہاں، میں بھی "کچھ کرنے" کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ اس کائنات میں میری بھی کوئی جگہ ہے۔

[illegible] میں زندگی کے مقصد پر کئی بار روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مگر پھر بھی بات چیت کے سلسلے میں جو سوالات آتے ہیں ان [illegible] والوں کا واحد علاج یہ ہے کہ ان کی زندگی میں کوئی مقصد پیدا کیا جائے۔ یہی ان سوالات کا جواب ہے اور [illegible] کا حل

[illegible] نمبر

آخر کار اب اس منزل پر آ چکا ہے کہ ہم اس کو آپ تک پہنچا سکیں۔ آئندہ شمارہ [illegible] ہوگا اس میں

[illegible] ہے ۔
موجود ہیں زیادہ تر خواتین کے مضامین ہیں ۔ عورت جو مرد کی سب سے بڑی رفیق ہے ۔ اس کی نظروں میں مرد کے رفیق کی کیا
حیثیت ہے ۔ اس لئے یہ نمبر ہر مرد، ہر عورت کے لئے اس پیش کش کا مطالعہ بہت ضروری ہے ۔
جن بہنوں نے ابھی تک کچھ نہیں لکھا ہے ۔ وہ اب بھی، مگر جلد ہی اپنے مضامین بھیج دیں ۔

سائیکولوجی کا دفتر

جگہ کی تنگی کی وجہ سے ہم نے اپنا دفتر ۴۱ میریٹ روڈ سے رحمت منزل گلی گدی کوچہ [illegible] دہلی
ترو مولیدرچا سازخانہ منتقل کر دیا ہے ۔ جو احباب ہم تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ اب نئے پتے پر تشریف لائیں

ماہنامہ سائیکولوجی کا نرالا ترین تحفہ

ذہنی عکس ریز

آپ کا کردار کس درجہ مکمل ہے ۔ اس کا حال سوائے آپ کے اور کوئی نہیں جان سکتا
شخصیت کے معائب اور محاسن کو جاننے کے لئے ادارہ سائیکولوجی نے یہ کورس مرتب کیا ہے ۔ جو زندگی کے تمام
اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالکر ہر شخص کو بتا دیتا ہے کہ ان میں کیا خامیاں ہیں اور ان خامیوں کو دور کرنے کے لئے انہیں کیا کرنا
چاہیئے ۔

یہ کورس آپ کا ایک سچا دوست اور بہترین رفیق ہے جو خوشامد اور چاپلوسی سے صاف دامن بچاکر آپ کو صحیح مشورہ دیتا
ہے ۔ آپ کے ہر فعل پر بہترین تنقید کرتا ہے اور اس وقت تک "پشیمان" کرتا رہتا ہے ۔ جب تک آپ "مکمل" انسان نہ بن جائیں

قیمت

انگریزی ایڈیشن کی ستائیس روپے بارہ آنہ ہے

لیکن ہم اپنے سالانہ خریداروں سے آٹھ آنے کے ٹکٹ لے کر اسے "مفت" دیتے ہیں ۔ کیوں نہ آپ بھی
زرِ سالانہ چھ روپیہ اور ۸/ "ذہنی عکس ریز" کے جملہ ۔/۶ کا منی آرڈر ارسال فرماکر یہ تحفہ حاصل کریں

آپ کو معلوم ہے نا کہ آپ کی زندگی میں تاریک گوشے بھی ہیں جو آپ کو قدم قدم پر تنگ کرتے ہیں لیکن یہ گوشے
تاریک گوشے ہیں ہمارا "سالگرہ نمبر" پڑھیے ۱۲۰ صفحات کا حسین مجموعہ قیمت ۸/
ابھی دفتر میں کچھ جلدیں موجود ہیں ۔ ضرورت مند اصحاب بذریعہ وی پی طلب کریں

کیا آپ ہکلاتے ہیں؟

ایان ہیلٹ

خدانخواستہ آپ کا شمار ان اشخاص میں تو نہیں جو خاصی جدوجہد کے بعد بھی الفاظ سے اپنا مطلب ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ گلے کی رگیں کھنچی رہیں۔ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ جسمانی توازن بگڑ جاتا ہے۔ اور پھر بھی دل کی بات دل ہی میں رہتی ہے۔ اور مفت میں شرمندگی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ چلو بھر پانی میں ڈوب مریں۔

یہیں تک اگر نوبت پہنچتی۔ تب بھی خیر تھی۔ مصیبت تو یہ ہے کہ سننے والا الگ جھنجلا جاتا ہے۔ اسے آپ پر ہنسی بھی آتی ہے۔ غصہ بھی آتا ہے۔ ترس بھی آتا ہے۔ وہ آپ سے کچھ معلوم کرنا چاہتا ہے اور آپ ہیں کہ جواب دینے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی مجبور ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ناطقہ ہی ہم انسانوں کا سب سے بڑا تحفہ ہے جس سے ہم ایک دوسرے پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

آئیے۔ دیکھیں کہ اس مجبوری کی وجوہ کیا ہیں۔ اور کیونکر ان پر عبور حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو یقین رکھیے کہ ہکلانے والے کے حلق میں کوئی خرابی نہیں ہوتی۔ وہ تمام اعضا ٹھیک ہیں جو آواز پیدا کرتے ہیں۔ بلکہ وہ کسی اعصابی بیماری کا شکار ہے۔ جو ہکلا کر اپنا اظہار کرتی ہے۔ وہ غلط سوچتا ہے۔ اپنے کو غلط روشنی میں دیکھتا ہے۔ پورے سماج سے شاکی رہتا ہے اور زندگی کو زندگی نہیں سمجھتا۔

تمام ماہرین کسی ایک وجہ پر متفق نہیں کہ بچپن میں کوئی بچہ کیوں ہکلانے لگتا ہے۔ لیکن سب اس بات پر متفق ہیں کہ بچپن میں کوئی ایک جذبہ اس پر اتنا زیادہ غالب آجاتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے بول نہیں پاتا۔ اس کو الفاظ نہیں ملتے۔ الفاظ ملتے ہیں تو وہ اتنا زیادہ مضطرب ہوتا ہے کہ الفاظ ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے —— تھوڑے دن کے بعد پھر وہی حالت طاری ہوتی ہے۔ وہ پھر الفاظ ادا کرنے میں دشواری محسوس کرتا ہے۔ جب یہ کیفیت کئی مرتبہ گذرتی ہے تو بچہ جھنجلا جاتا ہے۔ اور وہ الفاظ ادا کرنے کی کوشش میں الجھ جاتا ہے۔ جس سے اور بھی مشکل آن پڑتی ہے۔ جب یہ کئی مرتبہ ہو چکتا ہے تو بچہ اپنی قوت گویائی پر شک کرنے لگتا ہے۔ اس کا اعتماد جاتا رہتا ہے۔ اور وہ گفتگو کرتے ہوئے گھبراتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ الفاظ ادا نہ ہوں۔ اور وہ کچھ کہہ ہی نہ سکے۔ بس یہیں سے وہ ہکلانے لگتا ہے۔

شروع شروع میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ ذرا الفاظ اٹک اٹک کر نکلتے ہیں۔ یا کوئی لفظ دو تین بار دہرانا پڑتا ہے۔ اگر فوراً توجہ نہ کی جائے تو عمر کے ساتھ ہی ساتھ ہکلانے میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے ہم عمر بچے اس پر ہنستے ہیں۔ اس کے بڑے بھائی بہن اسے چڑاتے ہیں۔ وہ اپنی حالت پر شرمندہ ہوتا جاتا ہے۔ اور کوشش کرتا ہے کہ وہ الفاظ کو ٹھیک ٹھیک ادا کرے۔ لیکن ہکلاہٹ کا احساس اس پر اتنا زیادہ حاوی ہوتا ہے کہ وہ روز بروز اس میں الجھتا جاتا ہے۔ وقت گذرتا رہتا ہے۔ عمر بڑھتی رہتی ہے۔ اور جوانی تک پہنچتے پہنچتے بچپن کی ذرا سی دشواری اپنی عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ اور خطرناک نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ اب کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک لفظ بھی ادا نہیں کر پاتا۔ چہرہ کا رنگ بدلتا ہے۔ ہونٹ کھلتے ہیں۔ دانت بھنچتے ہیں۔ سر ہلتا ہے۔ ہاتھ اور کاندھے جنبش کرتے ہیں۔ مگر الفاظ ہیں کہ زبان سے باہر ہی نہیں آتے۔ رفتہ رفتہ وہ لوگوں سے ملنے سے کترانے لگتا ہے۔ محفل میں جانے سے گھبراتا ہے۔ اور اجنبی لوگوں سے تو دور بھاگتا ہے کہ ان کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ ہکلا ہے۔ [illegible]

ایسے دماغی مریض کبھی کبھی تو بہت تیزی سے بولتے ہیں۔ اور کبھی کبھی بالکل ہی قاصر رہتے ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر گفتگو کا عنوان بدل جائے یا گفتگو کرنے والے بدل جائیں تو ان کے ہکلانے میں بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ بعض اوقات اور بعض حالتوں میں ان کی زبان بالکل بند ہو جاتی ہے (مثلاً جب وہ ٹیلیفون پر گفتگو کرنے کی کوشش کرتے ہیں) ایسے ہکلوں کے مقابلے میں ایسے ہکلے بھی ہیں۔ جنہوں نے محض ہکلے پن کی وجہ سے ایسے پیشے اختیار کر لئے ہیں جن میں انھیں زیادہ بولنا نہ پڑے۔ ان کی ہکلانے کی عادت تو تمام عمر رہتی ہے۔ مگر ان کو زیادہ پریشان و پشیمان نہیں کرتی۔

خصوصاً ان ہکلوں کی زندگی پر ترس آتا ہے۔ جن میں بڑے بڑے اوصاف موجود ہوتے ہیں۔ اور جن کی زندگی سماج کے لئے بہت کارآمد ہو سکتی ہے۔ مگر جو محض اپنے ہکلے پن کی وجہ سے کچھ نہیں کر پاتے۔ کیونکہ انھیں ہر وقت یہ احساس رہتا ہے کہ وہ ہکلا رہے ہیں اگر یہ احساس ہی ختم ہو جائے تو ان کی زندگی کے طور بدل جائیں۔ مثال کے لئے آپ ڈیماستھینز کو لے لیں جو یونان کا بہت بڑا مقرر گذرا ہے۔ وہ ہکلا تھا لیکن جس نے محض اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر اس "عذاب" سے چھٹکارا حاصل کیا۔ اس نے منہ میں کنکریاں رکھ کر گفتگو کرنا شروع کی۔

پھر ———— پھر کیا کیا جائے؟ وہ کونسی صورتیں ہیں کہ ہکلے اپنے کو اس "عذاب" سے چھڑا سکیں۔ اور اپنی زندگی کو زیادہ کارآمد بنا سکیں اور وہ منزلت حاصل کر لیں جو ان کی صلاحیتوں کی وجہ سے ان کو ملنی چاہئے۔ اس عذاب کو مغلوب کرنے کے لئے دو طریقے ہیں ————

۱۔ جب دن بھر کا کام ختم ہو جائے۔ ہکلے کو چاہیئے کہ وہ بہت آرام سے بیٹھ جائے۔ اور اپنے تھکے ہارے ہاتھ پیروں اور دوسرے اعضاء کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دے۔ پھر وہ کوئی اخبار، کوئی کتاب بہت ہی ٹھیرے ہوئے لہجہ میں آہستہ آہستہ پڑھے اور اس بات کا خیال رکھے کہ اس کے ہونٹ بلا وجہ جنبش نہ کریں۔ اگر دوسروں کی موجودگی میں شرم آتی ہو۔ تو تنہائی میں اس پر عمل کرے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسے موقعوں پر وہ ہکلاتے نہیں ان کو سوچنا چاہیئے "اگر مجھے پورا پورا موقعہ اور وقفہ ملے تو میں الفاظ کو ادا کر سکتا ہوں"۔

اسے روزانہ کم از کم آدھے گھنٹے بہ آواز بلند پڑھتے رہنا چاہیئے۔ تھوڑے ہی دن بعد وہ دیکھے گا کہ روزمرہ کی زندگی میں بھی اسے یہ آزادی ملنے لگی ہے۔ وہ لوگوں سے بات کر سکتا ہے۔ سوالات کا جواب دے سکتا ہے۔ اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔

۲۔ دوسرا طریقہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اور زیادہ نفسیاتی بھی ہے۔ اس سے تحت الشعور میں جمی ہوئی جڑیں اکھڑتی ہیں۔ یہ طریقہ جتنا اہم ہے۔ اتنا ہی دشوار بھی ہے۔ کیونکہ اس میں اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے۔

اسے اپنے سے یہ سوال کرنا چاہیئے۔

"کیا میں واقعی ہکلانے کی عادت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں؟"

یہ سوال اس لئے ضروری ہے کہ بہت سے ہکلے لاشعوری طور سے ہکلے رہنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس عادت سے چھٹکارا پانے کے بعد ان پر بہت سی ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ اور وہ ان ذمہ داریوں سے بچنا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ان ہکلوں کو لے لیں جو دنیا کی تکلیفوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے سے بچتے ہیں۔ اور گھر ہی پر رہ کر اپنی زندگی پوری کر دیتے ہیں کہ کون باہر جائے۔ اور دنیا کے جھگڑوں میں پڑے اور ہزاروں ہکلے ایسے موجود ہیں جن کا ہکلا پن ان کو بہت سی ذمہ داریوں سے نجات دلا دیتا ہے۔ ایسے ہکلے اپنا علاج بہت مشکل سے کر پاتے ہیں۔ کیونکہ وہ کرنا نہیں چاہتے۔ اگر وہ واقعی میں اس "عذاب" سے بچنا چاہتے ہیں تو ان کو بہت سچائی سے سوچنا چاہیئے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ کیا چاہتے ہیں۔ کیا ان کی خواہش نہیں کہ وہ ہکلے رہیں؟ پھر یہ سوچیں کہ اگر وہ ہکلے نہ رہیں تو کیا واقعی وہ زندگی کی دوڑ میں بازی لے جائیں گے۔ وہ زیادہ کامیاب انسان بن سکیں گے؟

پھر ان کو تصور ہی تصور میں اپنے کو عام آدمیوں کی طرح گفتگو کرتے دیکھنا چاہیئے۔ وہ اپنے کو اپنے تصور میں لائیں کہ جیسے کہ وہ اس عادت سے چھٹکارا پا چکے ہیں لوگوں سے مل رہے ہیں۔ گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ سڑک پر کھڑے ہیں۔ کام کر رہے ہیں۔ کسی محفل میں ہیں دوستوں کے ساتھ ہیں۔ ہر جگہ مختلف لوگوں سے مختلف موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے ——— ان کے یہ تصوری خاکے ان کی خواہشات کے رنگ میں رنگے ہونا چاہئیں۔ مثلاً اگر وہ کسی سے محبت کرتے ہیں۔ تو وہ یہ سوچیں کہ وہ اپنی محبوبہ کے پاس گئے ہیں۔ اور اس سے گفتگو کر رہے ہیں۔ اس سے وعدے لے رہے ہیں اس کے ساتھ ہنس رہے ہیں۔ خود وعدے کر رہے ہیں۔

تصور میں لائی ہوئی ان تصویروں کا اثر بہت گہرا اور کارآمد ہوتا ہے۔ اور خصوصاً اس کے لئے رات کا وہ حصہ مناسب ہے جبکہ وہ سونے جا رہے ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ اگر وہ اپنے کو یہ یقین دلاتے رہیں "میں ہکلاتا نہیں ہوں" یا " مجھے ہکلانے کی ضرورت نہیں ہے ——— تو اور بھی سود مند ہے۔

ایک اور بات کی ضرورت ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ وہ ان باتوں میں اُلجھ جاتے ہیں اور ان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار چاہتے ہیں۔ جن پر انہوں نے پہلے سے سوچا سمجھا کچھ نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں کسی نے مخالفت کی اور ان کے ہاتھ پیر پھولے۔ زبان لڑکھڑائی اور الفاظ رکے۔ ان کو ہمیشہ اپنے خیالات پر گھمنڈ ہوتا ہے اور وہ دوسروں پر رعب جمانا چاہتے ہیں۔

تباہی کی حد تک بڑھی ہوئی یہ خود پرستی ان کی قوت گویائی سلب کرتی رہتی ہے۔ اگر وہ اپنی زندگی کے فلسفہ میں ذرا سا تغیر کر لیں۔ اور دوسروں کو اپنے سے کم تر سمجھنا چھوڑ دیں اور زندگی سے زیادہ دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کریں اور ماحول کے اور بدلتے حالات سے بجائے لڑنے اور بے جا مقابلہ کرنے کے ان کے ساتھ بدلتے رہیں۔ تو وہ یکسر بدل سکتے ہیں اور وہ دیکھیں گے کہ جس دنیا کو وہ اتنا ذلیل سمجھتے تھے اور جن لوگوں سے دُور بھاگتے تھے اور کتراتے تھے اور دور رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ان کے ساتھی ہیں ان کے بھائی ہیں۔ ان کے دوست ہیں۔ اور یہ دنیا ان کی اپنی دنیا ہے۔ اور وہ اس کے ایک جزو ہیں اور ان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ "ہکلے پن" کے بہانے اس سے نفرت کر سکیں۔ اور زندگی کو مہ و سال سمجھ کر موت آنے تک زندہ رہیں۔

(ترجمہ ادارہ)

مولانا عبدالماجد دریابادی

شرم وحیا

شرم وحجاب کے ہماری زبان میں دو معنی ہیں۔ ایک تو یہی کہ آدمی اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنے، اپنی بڑائی اپنی زبان اور حرکات وسکنات سے نہ کرے، اپنے کو بڑا ظاہر کرنے سے شرمائے۔ حجاب محسوس کرے، یہ شرم وحجاب انکسار تواضع کے معنی میں، اس خودبینی وخودنمائی کی ضد ہے۔ جس کا ذکر اپریل کے شمارہ میں آچکا ہے۔ دوسرے معنی شرم وحیا کے یہ ہیں، کہ عورت ومرد کے تعلقات و معاملات پر کھل کر بے باکی سے گفتگو نہ کی جائے اور جنسی وشہوانی تذکرے سے پرہیز کیا جائے۔ یہاں گفتگو شرم وغیرت کے اسی مفہوم پر ہوگی اور اسی جذبے کے ڈانڈے عصمت وعفت سے ملے ہوئے ہیں۔

ماہرین فن کہتے ہیں کہ فرد کے بعض اہم جذبات کی بنیاد خواہش بقائے قوم ہے، اور بعض اہم جذبات خواہش بقائے نسل سے ماخوذ ہیں لیکن یہ شعبہ کردار انسانی کا ایسا ہے جس کا ربط وتعلق دونوں سے یکساں ہے۔ جذبۂ بقائے قوم سے بھی اور جذبۂ بقائے نسل سے بھی اور اس لئے اس کی اہمیت بالکل ظاہر ہے۔

سب سے پہلے تو اصلاح اس عام اور عالمگیر غلطی کی ہونی چاہیئے کہ جماعتی زندگی کی اکائی فرد ہے۔ جماعتی زندگی کی بنیاد فرد سے نہیں خاندان سے پڑی۔ اور اس کی اکائی فرد نہیں خاندان ہے۔ خاندان کے ایک رکن کا جو دوسرے رکن سے ربط وتعلق ہوتا ہے، وہی سنگ بنیاد ہے جماعت اور افراد جماعت کے درمیان ربط وتعلق کا۔ جماعت کی جو قدیم سے قدیم تاریخ موجود ہے، اس میں اس کا پتہ خاندان ہی کی حیثیت سے چلتا ہے۔ شروع شروع جب انسان کی لڑائی ہر وقت اس کے پاس کے جنگلی جانوروں سے رہا کرتی تھی، اور رات دن اُسے موسم کی سختیوں اور ہوا، بارش، دھوپ، کی ستم رانیوں سے پناہ لینے کی ضرورت پڑتی رہتی تھی، تو ایک دوسرے کی امداد، نصرت، دستگیری، شرکت، ناگزیر تھی بلکہ امداد باہمی کے یہ سارے زینے خاندان والوں ہی کے واسطے سے طے ہوا کرتے تھے۔ باپ بیٹے کو سہارا دیتا تھا۔ بیٹا باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا، بھائی بھائی سے مل جل کر کام کرتا تھا۔ تو غرض یہ کہ، قومی ہمدردی، وطنی ہمدردی، ملکی ہمدردی، جتنی قسم کی بھی ہمدردیاں آگے چل کر قائم ہوئیں۔ ان سب سے مقدم اور ان سب کا ماخذ و مرجع یہی خاندانی ہمدردی ہے۔

خاندانی وحدت کو توڑ دینے والے، لڑائی کے گھر، ایک مشہور مثل کے مطابق یہ تین ہیں۔ "زر" "زمین" "زن"۔ "زر" تو ابتدائے تمدن میں ہوتا ہی نہیں۔ اس لئے اس پر جھگڑے کا وہاں کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ رہی "زمین" یا جائداد غیر منقولہ، تو وہ خاندان میں مشترک رہتی ہے۔ اس لئے اس سے بھی کوئی جھگڑے فساد نہیں اٹھتے۔ اب لے دے کے مسئلہ "زن" کا رہ جاتا ہے تو عورت کے معاملے میں رشک ورقابت کی روک تھام کی ممکن صورتیں دو ہیں۔ ایک یہ کہ شوہر ہر وقت مسلط رہے اور عورت کو برابر اپنی نگرانی میں لئے رہے۔ دوسری یہ کہ عورت آپ اپنی نگہبان ہو جائے۔ اور پہرہ دار اپنی عصمت کو بنالے۔ لیکن پہلی صورت میں مرد کی حیثیت افادی خاندان اور قبیلے کے لئے بہت ہی گھٹ جاتی ہے۔ اور اس کے لئے وقت اور قوت کا بڑا حصہ بجائے مفید اجتماعی مشغلوں کے اسی نگہبانی کے نذر ہو جاتا ہے۔ لامحالہ کارزار حیات میں کامیابی انھیں خاندانوں اور قبیلوں کو حاصل رہی جن کی عورتوں نے خود عصمت کی انتہائی اہمیت محسوس کرلی، اور اپنی آپ نگہبان ہو گئی تھیں۔ دوسرے قبیلے جن کی عورتیں

اس دولت سے محروم تھیں، وہاں یہ فرض مردوں کو اپنے اوپر لینا پڑا، اور وہ قبیلے قدرتاً جہد زندگی میں پچھڑ کر رفتہ رفتہ مٹ گئے ——— اسی احساسِ عصمت کا نام شرم و حیا ہے۔

عورت میں اپنی عصمت کا احساس ایک حد تک طبعی و فطری ہے۔ جیسا کہ بعض جانوروں کی ماداؤں میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس درجہ قوی نہیں کہ جماعت اس طبعی احساس کو اپنی ضرورتوں کے لئے کافی سمجھ لیتی۔ اُسے اس کو کارزارِ حیات میں اپنے لئے نہایت مفید اور ضروری پاکر اس کو خوب کسنے اور قوی کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے اس نے اسے سخت بد اخلاقی اور جماعت کی نظر میں ایک شدید و مکروہ جرم بھی قرار دیا، کہ جو عورت اس کی خلاف ورزی کی مرتکب ہو وہ سوسائٹی میں بدنامی بھی پوری طرح اٹھائے۔ ہر طرح ذلیل و رسوا بھی ہو، اور دوسری طرف اگر قبیلہ عدالت سازی کی حد تک مہذب و متمدن ہو چکا ہے۔ تو اسے سنگین قانونی جرم بھی قرار دے کر اسے سخت ترین سزاؤں (قتل تک) کا مستوجب ٹھیرایا۔ لیکن اس دُہرے، دُہرے بلکہ تہرے تہرے انتظام سے بھی جماعت کے مطالبات کی تسکین نہ ہوئی۔ اس نے مذہب کی امداد بھی لی۔ اور اسے ایک بدترین قسم کا مذہبی گناہ بھی قرار دیا ——— نسلِ انسانی کے تجربے سے معلوم ہوا کہ بقائے قوم و بقائے نسل میں اس جذبۂ عصمت کی اہمیت بہت ہی زائد ہے۔

علم الاقوام کے ماہروں نے خبر دی ہے کہ فلاں فلاں وحشی قبیلوں میں بے عصمتی صرف شادی شدہ عورتوں کے لئے جرم ہے۔ بن بیاہیوں کے لئے عیب یا جرم نہیں۔ لیکن نسلی تجربہ اس پر بھی گواہ ہے کہ یہ تفریق مدتِ دراز تک نہ چل سکی۔ یا تو بن بیاہیوں کو بھی بیاہیوں کی صف میں آجانا اور انھیں کا قانون اپنے لئے بھی عائد کرنا پڑا، اور جہاں یہ نہیں ہوا، وہاں مردوں کے باہمی رشک و رقابت سے خود ان قبیلوں ہی کی زندگی ختم ہو گئی، اور وہ کارزارِ حیات میں دوسرے قبیلوں کے مقابلے میں ناکام رہ گئے ——— یہیں سے یہ عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ دنیا کی نظر میں مرد کی بدچلنی اتنی معیوب کیوں نہیں، جتنی عورت کی، مذہب و اخلاق سے یہاں بحث نہیں، یہاں گفتگو صرف نفسیاتِ بشری کے ماتحت ہو رہی ہے۔ تو نسلی تجربہ یہ ہے کہ بقائے جماعت کے حق میں مرد کی بدچلنی اتنی زائد مضر نہیں، جتنی عورت کی ہے۔ اور اسی نے نفسیاتِ بشری پر گہرا اثر ڈال کر ایک کو دوسرے کے مقابلے میں معیوب تر، مکروہ تر، مبغوض تر بنا دیا ہے۔ مرد مرد، کی رقابت کہیں زیادہ خوں ریز اور قبیلے کی وحدت شکن ہے۔ بہ مقابلہ عورت عورت کی رقابت کے۔

احساس عصمت اپنی عملی شکل یک زوجی میں تو جانوروں کی بھی بعض قسم میں پایا جاتا ہے لیکن اس سے جو جذبہ شرم و غیرت کا وجود میں آتا ہے، وہ شاید نوعِ انسانی ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ جانوروں میں اس کا پتہ نہیں چلتا ـــ اور انسان کی ہر نسل، ہر قوم، ہر قبیلے میں اس کا وجود کسی نہ کسی حد تک پایا جاتا ہے۔

اس شرم و حیا کا لب لباب کیا ہے؟ افعالِ وظائفِ جنسیت و شہوانیت، بلکہ ان کے متعلقات پر، بعید متعلقات پر بھی پردہ ڈالے رہنا، انھیں دوسرے دوسرے ناموں سے یاد کرنا۔ ان ہی تصریح کے بجائے دور دور کے اشاروں کنایوں میں چھپانا ——— بعض ماہرین نے یہاں ایک قاعدہ بیان کیا ہے کہ اعمالِ بشری، اختیاری میں جو عمل بقائے حیات و بقائے نسل کے لئے اہم ترین و مقدم ترین ہے وہی سب سے زیادہ چھپا کر کیا جاتا ہے۔ اور اسی پر سب سے زیادہ پردے پڑے رہتے ہیں۔

عملی زندگی میں جذبۂ شرم و حیا کے تقاضے یوں یوں پورے ہوتے ہیں کہ سب سے پہلے عورت کے اعضائے جنسی کو کامل طور پر چھپا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اعضائے جنسی ثانوی کا نمبر آتا ہے۔ اور عورت کے لئے محرم (انگیا) کے نام سے کپڑا وجود میں آتا ہے۔ ہر جماعت کی تہذیب میں جوں جوں ارتقا ہوتا جاتا ہے عورت کی ناف، کمر، رانیں، شکم، پشت، دور دور کے اعضا بھی نظروں سے مخفی کر دیے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ

نوبت اس کے سارے جسم کی آجاتی ہے ۔ شرم و حیا کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا مظہر یہی جسم اور اعضائے جسم کو چھپاتا ہے ۔ اس کے بعد پھر مرتبہ، تحریر، تقریر، چال ڈھال، وضع و طریق کا آتا ہے ۔ حیاداری کے معنی یہ ہیں ۔ کہ کسی قول و فعل سے بھی اُن چھُپی ہوئی چیزوں کا اظہار یا ان کی جانب اشارہ نہ ہونے پائے ۔ اور اس احتیاط و اہتمام میں جس قدر کمی آتی جائے گی اسی مناسبت سے قدم بے حیائی بے غیرتی کی طرف بڑھتے جائیں گے ۔

حیا کوئی مخصوص نسوانی جذبہ نہیں ۔ بشری جذبہ ہے ۔ عورت و مرد دونوں جنسیں اس میں شریک ہیں ۔ البتہ عورت چونکہ عمل زوجیت میں، محض ایک انفعالی یا مفعولی حیثیت رکھتی ہے، جس پر اس کے قویٰ کی ساخت اور ترکیب گواہ ہے ۔ اس لئے اس کی طبعی حیاداری کا درجہ بھی اسی مناسبت سے بہت بڑھا ہوا ہے ۔ مرد اس کے برعکس فاعلانہ و عاملانہ حیثیت رکھتا ہے ۔ اس لئے قدرتاً اس کی حیاداری اس درجے کی نہیں ہوتی ———— البتہ جہاں کہیں تمدن کی رفتار ارتقاء اس فطری ترتیب ہی کو اُلٹ دیتی ہے ۔ اور عورت کے ذہن پر مساوات کامل کا عقیدہ تسلط جما لیتا ہے، وہاں یہ قیدیں بھی ٹوٹ جاتی ہیں ۔ اور عورت اپنے دعوئے ہمسری کو ثابت کرنے کی دھن میں، بے لباسی، عریانی، اور بے حیائی میں مرد سے پیچھے نہیں رہتی، آگے نکل جاتی ہے ۔

اختر انصاری اکبر آبادی

شبابِ رقصاں

رقص کر لے جوان رقاصہ
رقص کر کائنات رقصاں ہے

سامنے برق تاب شیشوں میں
ایک اک موج سے تمرکنی ہے
الجھتی ہوئی فضاؤں میں
زندگی کروٹیں بدلتی ہے

زندگی رقص کر رہی ہے یہاں
رقص کر اب حیات رقصاں ہے

دیکھ مست شباب رقاصہ
رقص کرتا ہوا شباب اپنا!
زندگانی بنے گا ہر نغمہ !
میرے ہاتھوں میں دے رباب اپنا

میرے ہاتھوں میں دے فروغ شباب
لا بنا لوں اپنے دل کو جواں !

اپنی نگاہوں کو اور لرزش دے
کہہ نگاہوں سے خوبصورت بات

کیف و مستی کو اور تابش دے
دیکھ بے رنگ ہو نہ جائے رات

دیکھ رنگین ہیں مرے جذبے
آسمان سے برس رہی ہے شراب

مسکرا اور مسکرائے جا
آتشیں بازوؤں کو پھیلا دے
اور سینہ ابھار ۔ ابھارے جا
کیفیات شباب سمجھا دے

کیفیات شباب کیا کہنا
رقص کرنے لگے حسین جلوے

ہاں اسی طرح پھر کمر میں لچک
ساقِ عریاں میں بجلیاں بھر کر
پھر سر بزم شعلہ بن کے چمک
رقص کر میری روح قلب و نظر

رقص کر کائنات رقصاں ہے
رقص کر لے جوان رقاصہ

سائیکولوجی کراچی

محمد ذکریا مائل

سرقہ رمزیہ اور تحلیلِ نفسی

کچھ مدت پہلے امریکہ کے ایک شہر میں راتوں کے وقت چوری کی وارداتیں اتنی بڑھ گئیں کہ سارے شہر پر خوف و دہشت طاری ہوگئی یہ جرائم تمام حالات میں ایک ہی طرز و نہج پر وقوع میں آتے تھے اور ان میں جتنی چیزیں چرائی جاتی تھیں سب میں باہمی مشابہت اور مماثلت پائی جاتی تھی۔ اِن وارداتوں نے پولیس کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ یقیناً مجرم ایک ہی شخص ہوگا اور اس کے قوائے عقلیہ میں ضرور خاصا فتور موجود ہوگا۔

مجرم کی عادت تھی کہ وہ عمارات کی پہلی منزل یا چھوٹے چھوٹے فلیٹوں میں رات کے وقت گھستا تھا اور خواتین کی خوابگاہوں کے سوا کسی اور جگہ کا رخ نہ کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مجرم بڑا شوقین طبع اور حسن پرست واقع ہوا تھا۔ اس کی چوری صرف سامان آرائش، زیورات اور ملبوسات تک محدود رہتی تھی۔ کسی اور چیز کو ہاتھ نہ لگاتا تھا۔ پھر اس کے کارناموں میں عشقیہ خطوط کی چوری کو ایک نمایاں مقام حاصل تھا۔ گویا چند تصویر بتاں اور حسینوں کے خطوط، خصوصیت کے ساتھ اس کی زندگی کا خاص موضوع بن گئے تھے۔ اور اس نے ان ہی کو سرمایہ حیات بنانے کی ٹھان رکھی تھی ——————— اس نے ایک سال سے کم مدت میں جتنے جرائم کئے تھے ان کی تعداد چار سو کے لگ بھگ تھی۔

جرائم کی کثرت اور نوعیت نے پولیس کو بیش از بیش تجسس اور تفتیش پر مجبور کر دیا اور آخرکار ملزم کو بعض جرائم کا ارتکاب کرتے وقت گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئی اس وقت ملزم بڑے انہماک کے ساتھ عشقیہ خطوط اپنے کپڑوں کے نیچے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا گویا یہ خطوط اس کے نزدیک بڑے قیمتی اور نادر الوجود تھے۔ پولیس نے جب اس کے جرائم کی اہمیت محسوس کی جن کی بدولت ایک بڑے شہر کے باشندوں کا ناطقہ بند ہوگیا تھا اور ساتھ ہی یہ دیکھا کہ محکمہ امن عامہ کو زیر و زبر کر دینے والا یہ شخص بالکل دبلا پتلا ہے اور اس پر بیماری اور کمزوری کے آثار نمایاں ہونے کے علاوہ جزئی فالج کا بھی اثر ہے تو اس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔

بہرحال انوکھے سارق نے اپنے جرائم کا اقبال کیا اور اسے سپرد عدالت کر دیا گیا۔ جب ملزم جج کے سامنے حاضر ہوا تو اس نے یہ کہتے ہوئے جرم کی صفائی پیش کی کہ "مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے معاشرہ کے آداب اور قانون کی خلاف ورزی کی ہے اور اس لئے میں سزا کا مستحق ہوں، مگر میں نے یہ چوریاں معاش کی مجبوریوں سے نہیں کی ہیں۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مجھ کو ایک ایسا خفیہ جذبہ ان جرائم پر اکساتا تھا جس پر قابو پانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ خود یہ جرائم مجھ میں رضامندی، قوت اور نفسی استعداد کا شعور پیدا کر دیتے تھے یا مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مجھ میں اس شخصیت کا احساس پیدا کرتے تھے جس سے معاشرے نے مجھے محروم کر دیا تھا"

مگر اس صفائی سے کوئی فائدہ نہ ہوا اور جج نے قید بامشقت کا حکم سُنا دیا۔ سزا بھگتنے کے لئے ملزم کو سنگ سنگ کے مشہور قید خانہ میں بھیج دیا گیا۔

حسن اتفاق کہ اس زمانے میں جیل کا سپرنٹنڈنٹ نفسیات کے ماہر اکابر میں سے تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سزا ملزم کو ارتکاب جرائم سے باز نہیں رکھ سکتی بلکہ اکثر اوقات متعدد نفسی اقتضاؤں کی بدولت دیر تک ان میں مبتلا رکھتی ہے۔ اسی لئے اس کو یقین تھا کہ تحلیل نفسی مجرم کے لئے بہت مفید ہے اور اگر ملزم کے محرکات اور جذبات کا علم ہو سکے تو اس کا علاج آسان ہو جاتا ہے اور اسے ارتکاب جرائم سے باز رکھا جا سکتا ہے۔

جب مذکورہ ملزم اس کی نگرانی میں آیا تو اس نے ملزم کو قیدخانے سے متعلق علاج نفسی کے شعبے میں داخل کر دیا اب اس کی دیکھ بھال اسی شعبے کے نگراں ڈاکٹر رالف باتاتے کے سپرد ہوئی۔ متعدد معائنوں اور نشستوں کے بعد چور نے اپنی سرگذشت اس طرح بیان کی

"بچپن میں مجھ پر فالج اطفال کا حملہ ہو گیا اور اس سے میرے جسم کا نشو و نما متأثر ہو گیا۔ تعلیم، کھیل کود اور کام کاج میں مجھے ہم چشموں کے سامنے عاجز و شرمندہ ہونا پڑتا۔ میری ایک بہن قوی الجسم اور گٹھے ہوئے بدن کی تھی۔ وہ ورزشی کھیلوں میں بہت حصہ لیتی تھی اور ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی اور میرے عجز و ضعف پر پھبتیاں کستی رہتی تھی۔ جب میں جوان ہوا تو طبعی تقاضوں سے لڑکیوں سے میل ملاقات کا جویا ہوا مگر انہوں نے مجھ سے کترانا اور میری توہین کرنا شروع کیا اس لئے میں نے اپنے اندر جو نقصان محسوس کیا تھا اس کی تلافی کے لئے عملی جد و جہد کو لازمی جانا اور اس سلسلے میں سرقے کا ارتکاب کر بیٹھا۔

پھر اسی شخص نے مزید تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا "میں جو کام بھی انجام دیتا تھا اس کا تعلق رمزی اعتبار سے محسوس شدہ نقصان کے کسی نہ کسی پہلو سے ضرور ہوتا تھا اور اس کے بعد مجھ میں تلافی یا مکافات اور مسرت کا ایک گونہ احساس پیدا ہو جاتا تھا۔ مثلاً مکانوں میں گھسنے سے مجھے اپنے اندر سپاہیانہ قوت محسوس ہونے لگتی تھی جس سے میں بے بہرہ تھا اور خواتین کی اشیاء زینت و آرائش کی چوری گویا ان کی دوستی سے محرومی کا بدل ہو جاتی تھی۔ اسی طرح عشقیہ خطوط کا سرقہ میرے اس قسم کے خطوط نہ لکھ سکنے کی تلافی کر دیا کرتا تھا۔ غرض اس نوع کے سرقے کی مجھ میں اپنی شخصیت سے متعلق اطمینان کا احساس اور ایک عجیب طرح کی خوشی کا خیال پیدا کر دیا کرتی تھی"

ڈاکٹر باتا ی نے اپنے علاج کی بنیاد اس شخص کے اسی اعتراف پر رکھی۔ سب سے پہلے اسے یقین دلایا کہ بچپن میں اسے جو مرض ہوا تھا وہی اس کے موجودہ رویے کا باعث ہو گیا۔ اگر اسے کوئی ایسا شخص ملا ہوتا جو کسی مناسب پیشے میں لگا دیتا اور نشو و نما کے تمام اطوار میں اس کی ہمیشہ دیکھ بھال کرتا رہتا تو ارتکاب سرقہ کی نوبت نہ آتی۔ اور دریافت سے اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی۔ فی الواقع ملزم کے والدین نے اس کے ساتھ بڑی غفلت اور لاپروائی برتی تھی اور ان کے طرز عمل سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس لڑکے کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

ڈاکٹر کا برتاؤ اتنا تسلی بخش تھا کہ ملزم اس سے بہت متأثر ہوا اور اس نے پورے عزم کے ساتھ وعدہ کیا کہ آئندہ جرائم سے بالکل دست کش ہو جائے گا اور کوئی شریفانہ اور باقاعدہ کام کر کے بھلے آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرے گا

اب شفیق ڈاکٹر نے اس کے لئے مناسب حال کام تجویز کیا جسے اس نے پوری توجہ کے ساتھ انجام دینا شروع کیا۔ قیدخانہ میں اس کا چال چلن بہت اچھا رہا۔ کسی کو اس کے اطوار سے کوئی شکایت نہ تھی۔ پھر جب قید کی مدت پوری کرنے کے بعد زندان سے نکلا تو اس کی زندگی بالکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے اس کی صلاحیت کے لحاظ سے ایک بڑی کمپنی میں اسے بھیج دیا جہاں اسے کمپنی کے دفتر میں ملازمت مل گئی اسے اپنا کھویا ہوا اعتبار دوبارہ حاصل ہو گیا اور شادی کر کے چین آرام سے زندگی بسر کرنے لگا۔

سرقے کے علاج پذیر مریض

بظاہر "چوری" کو بیماری کے لفظ سے یاد کرنا کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ بہت سی صورتوں میں اس قبیح حرکت کا آغاز کسی نہ کسی عقلی یا نفسی علت کی وجہ سے ہوا کرتا ہے اسی لئے اگر ایسے لوگوں پر اچھی طور پر توجہ کی جائے تو ان میں سے بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ملتی ہے جو علاج پذیر ہوتے ہیں یا یوں کہئے کہ چوری کے مرض سے نجات پا جاتے ہیں۔ امریکہ میں خصوصی ماہرین نے اس مرض

تحقیقات کیں اور اس کے اسرار دریافت کر کے علاج میں کامیابی حاصل کی۔ اس ضمن میں حسب ذیل قصہ اس قول کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

سات آٹھ برس پہلے امریکہ کے ایک شہر کی پولیس نے ایک کاہن کو گرفتار کیا جس پر موٹر چرانے کا الزام تھا۔ کاہن نے جرم کا اقبال کیا اور حاکم کے سامنے موٹر چرانے کے کئی واقعات بیان کئے۔ حاکم تفتیش نے اسے عدالت فوجداری میں منتقل کر دیا۔

وکیل ملزم نے کوشش کی کہ اس پر سے جرم سرقہ کا الزام ہٹ جائے اور بحث میں اس پر زور دیا کہ در اصل ملزم کے قوائے عقلیہ میں کوئی خرابی آگئی ہے جو اس جرم کے ارتکاب کا سبب بن گئی ہے۔ جج نے وکیل کے اس عذر کو تسلیم کرتے ہوئے ملزم کو شفاخانہ امراض عقلیہ میں بھیج دیا اور وہاں تحلیل نفسی کے ذریعے کامل ایک سال تک اس کا علاج ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے مرض سرقہ سے پوری طرح شفا پائی اور اس قابل ہو گیا کہ مذہبی خدمات انجام دینے لگے۔ اب وہ امریکہ کے بڑے مشہور لوگوں میں سے ہے اور بہت بڑی تنخواہ پر نوکر ہے۔ لوگ اس کا بڑا احترام کرتے ہیں۔

اس شخص کا علاج بھی اس کے اعترافات جرم کی مدد سے کیا گیا تھا اور علاج میں کامیابی ان ہی اعترافات کی رہین منت تھی۔

علمائے نفسیات کا قول ہے کہ سرقے کا مرض بھی جھوٹ کی بیماری کی طرح ہے۔ یہ دونوں روگ نفسی عوامل اور [illegible] اعضا میں خلل آجانے یا بھیجے کے قریب جو غدود ہیں ان کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہو جاتے ہیں اور مریض اپنا کام پوری طرح انجام دینے کے قابل نہیں رہتا۔ اسی طرح اجتماعی یا سماجی عوامل سے بھی یہ بیماریاں وجود میں آسکتی ہیں۔ مثلاً وہ جھگڑے یا لڑائیاں جو والدین کے درمیان ہوتی ہیں۔ ان کے نتیجے میں خانگی زندگی برباد ہو جاتی ہے، ایک ہی گھرانے کے افراد میں باہم عداوت پیدا ہو جاتی ہے یا طلاق تک نوبت پہنچتی ہے۔ اس قسم [illegible] اعوں سے اولاد خصوصاً لڑکیاں بہت متاثر ہوتی ہیں اور باپ یا ماں کا مسلک قبول کر لیتی ہیں، تنہائی کو میل ملاپ پر ترجیح دینے لگتی [illegible] اس کا یقین ہو تا ہے کہ مرد ان کا مذاق اڑائیں گے تو ان میں سرقہ کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی صورت اس وقت پیش آتی ہے جب لڑکی کو اپنی [illegible] میں یا ازدواجی زندگی میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا لڑکا اور لڑکی مدعا کے موافق شادی میں ناکام رہتے ہیں۔

اس طرح تجرد کی طویل زندگی گزارنے والے مرد اور عورت دونوں کے مرض سرقہ میں مبتلا ہو جانے کا امکان ہے کے ثبوت میں علمائے نفسیات نے متعدد واقعات درج کئے ہیں جن میں ایک سائیکل چور عورت بھی شامل ہے جسے اسی قسم کے حالات میں سائیکل چرانے کی لت پڑ گئی تھی۔ افسر تفتیش نے اس کے جو حالات تحقیق سے معلوم کئے ان سے ظاہر ہوا کہ یہ عورت نیت کی اچھی تھی۔ سائیکل چرا لیتی تھی پھر اس کا رنگ روغن تبدیل کر کے اسے ایسے بچوں کی ماؤں کے ہاتھ بیچ دیتی تھی جن کے باپ میدان جنگ میں سمندر پار گئے ہوئے تھے۔ اس سے جو قیمت وصول ہوتی اسے انجمن صلیب احمر میں چندے کے طور پر دے دیا کرتی تھی۔ اس عورت کی یہ عادت شوہر کے چھوڑ دینے کی وجہ سے پڑ گئی تھی۔ جب طبیب نفسیات نے اس کے شوہر پر حقیقت واضح کی تو اس نے پھر اسے اپنی زوجیت میں رکھنا گوارا کیا اور اس کی دیکھ بھال میں دلچسپی لینے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عورت کا مرض [illegible] بیماری سے پوری طرح شفا پا گئی۔

متوسط یا معمولی انسان کون ہے

ڈاکٹر سائمنڈ ورپورٹ نے جو دنیا کے مشہور طبیب النفس ہیں، متوسط یا معمولی انسان ایسے شخص کو کہا ہے جو لوگوں کے ساتھ ان کے اختلافات کے باوجود ان کے ساتھ اجتماعی تعلقات قائم رکھ سکتا ہو اس کے اعمال قانون کے دائرہ میں رہتے ہوں۔ رشتہ داروں [illegible] غیروں سے اس کے معاملات صاف رہیں اور ازدواجی زندگی میں خوش نصیب و بامراد ہو۔ مگر [illegible] ان امور میں کسی مجبوری سے یا غیر ارادی طور پر ناکام رہے یا اس کے اعضائے بدن اپنے فرائض واجبی طور پر پورے نہ کرتے ہوں اور اس لئے مذکورہ جہات میں سے کسی جہت میں

مذکورہ تعریف معیار پر پورا نہ اترتا ہو تو اس میں مرض سرقہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ اس مرض میں مبتلا ہونے والے بیشتر اشخاص وہی ہوتے ہیں جن کے افکار و میلانات میں اضطراب کی کیفیت موجود ہوتی ہے اور جو اپنے معاملات چلانے یا مشاغل میں کامیابی کے طریقوں کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس کا اولین سبب یہی ہوتا ہے کہ ان کے باپ دادا اپنی ازدواجی زندگی میں ناکام اور منزلی سعادت کی عمارت قایم کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور اسی وجہ سے اولاد کی واجبی سعادت تربیت نہیں کر سکتے۔

ان حقائق پر روشنی ڈالنے کے بعد ڈاکٹر لورانڈ کہتا ہے " سرقے کی بیماری بڑی حد تک اثنائے خواب میں چلنے کی بیماری (یا مشی فی النوم) سے مشابہ ہے۔ یہ دونوں نفسی بیماریاں ہیں۔ جو شخص سوتے میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور نیند ہی کی حالت میں مقررہ کام انجام دیتا ہے یا عمارت کے کنگرہ کے کنارے کنارے چلتا ہے وہ یہ سب کام نفسی تحریکات و جذبات کی بنا پر کرتا ہے۔ پھر جب اس کی عقل عود کر آتی ہے تو اس کو نیند میں کیا دھرا کچھ یاد نہیں آتا۔ سرقے اور مشی فی النوم (سوتے میں چلنے کی بیماری) میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ جو شخص سرقے کا مریض ہوتا ہے وہ حالت بیداری میں سرقہ کرتا ہے اور دوسری قسم کا مریض سوتے میں چلتا ہے۔ سرقے کا مریض ہمیشہ ایسی اشیا چراتا ہے جو اس کی زندگی کے کسی پہلو میں نقصان کی تلافی کی طرف اشارہ کرتی ہیں وہ سرقے کے مادی پہلو پر بہت کم نظر کرتا ہے۔ جب تحلیل نفسی کا ماہر مسروقہ چیزوں کی نوعیت سمجھ لیتا ہے تو وہ سرقہ کے اسباب بھی آسانی سے معلوم کر لیتا ہے اور علاج میں کامیاب ہوتا ہے"

تعزیری جرائم پر تحقیقات کرنے والے اور خفیہ پولیس کے ماہر اشخاص کا بیان ہے کہ بعض عورتیں زمانۂ حمل میں مرض سرقہ میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔

یہ حالت ان عورتوں کی ہوا کرتی ہے جو ایک مدت دراز تک منع حمل یا ضبط تولید کے طریقوں پر کاربند رہتی ہیں اور پھر اس سے باز آتی ہیں۔ اس طرح ان کے آلات تولید کے افعال و وظائف میں خرابی یا ایک طرح کا خلل پیدا ہوجاتا ہے جو باقی اعضائے جسم پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اور آگے بڑھ کر اس کا نتیجہ ارتکاب سرقہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ (ماخوذ از عربی)

ڈاکٹر جی - ایم - ناز

ڈاکٹر ناز ——— آسمان نفسیات کا وہ درخشندہ ستارہ ہے جو زندگی کے لئے ہلکی سی شعاع لے کر اٹھا تھا اور آج آفتاب بن کر چھا گیا ———

ازدواجی الجھنیں

ڈاکٹر ناز کی نفسیات جنسی پر وہ پہلی کتاب تھی - جس نے ازدواجی زندگی پر ایک انوکھے انداز میں روشنی ڈالی - ناز نے یہ ثابت کر دیا کہ جنسیات کو جانے اور سمجھے بغیر شادی کرنا ایک جرم ہے ——— یہ کتاب ازدواجی زندگی کی الجھی ہوئی گتھیوں کا حل پیش کرتی ہے - ناز نے بداعمالیوں کے اسباب و علل پر بہت ہی شستہ انداز میں تبصرہ کیا ہے - یہ کتاب جنسی زندگی کی ایک ایسی معلم ہے جس کے سبق سینکڑوں جوڑوں کی مایوسی کو مسرت میں تبدیل کر سکتے ہیں - قیمت پانچ روپیہ -

بن مانگے بچّے

بچے قوم کی امانت ہیں - آج کے معصوم بچے کل کے ہوشیار رہبر ہوں گے - یہ کتاب ان ہی بچوں کی نفسیات ہے ——— ہم کو یہ دعویٰ ہے کہ اس سے قبل بچوں کی نفسیات اور کثرتِ اولاد پر اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی " بن مانگے بچّے " صرف بچوں ہی سے متعلق نہیں، بلکہ یہ اُن ناعاقبت اندیش ماں، باپ کی نفسیات کی مبصر ہے جو ان بچوں کی تخلیق کا باعث ہوئے کثرتِ اولاد اور ضبطِ ولادت پر یہ کتاب ڈاکٹر ناز کے نو سالہ تجربہ کا نچوڑ ہے - ازدواجی زندگی کو آسودہ رکھنے کے حل بھی اس کتاب کا طرۂ امتیاز ہیں - آنے والی نسلیں اس کتاب کو مشعلِ راہ بنائیں گی ——— ١٦ بلاک تصاویر سے مزین - قیمت تین روپے بارہ آنے -

سرد شعلے

ڈاکٹر ناز ——— فرضی کہانیاں نہیں بلکہ آپ کی اپنی کہانیاں سناتا ہے - ناز کے یہ نفسیاتی افسانے ایک انوکھی حیثیت کے مالک ہیں - ——————— قیمت دو روپے

جام نو

اختر انصاری اکبر آبادی کی ان تضمینوں کا مجموعہ جو مشاہیر شعراء کی غزلوں پر کی گئیں اس صنعت پہ اختر کی قادر الکلامی مسلم ہے قیمت ۱۲/

ناشر ——— ادارۂ نفسیات پوسٹ بکس ۲۴۵ کراچی ۳

صابر بی اے　　　　دوسری کڑی

اَن دیکھی دُنیا

انسانی ذہن ہی کائنات کی سب سے نادر تخلیق ہے۔ یہی زندگی کا وہ سرچشمہ ہے جس کے سبب سے دنیا میں عجیب عجیب اور نئی چیزوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ دراصل انسانی ذہن ہی زندگانی کا وہ وصف حمیدہ ہے جس کی بنا پر اس کا حامل انسان دوسرے حیوانوں پر سبقت لے جاکر اشرف المخلوقات کے مرتبے پر فائز ہوتا ہے۔ ذہن ہی انسان کو حیوانِ ناطق بناتا ہے اور یہی وہ اسم اعظم ہے جس کے اثر سے تمام شجر حجر، حیوانات اور نباتات انسان کے مطیع ہو جاتے ہیں۔ دماغ کے بھورے گودے کی سلوٹوں کی تہوں میں سے وہ وہ حیرت انگیز ایجادات واختراعات برآمد ہوئی ہیں کہ تمام ذی حیات دم بخود ہیں۔ ہوائی جہاز، ریل، ٹینک، ریڈیو، ٹیلی ویژن، اور ایٹم بم وغیرہ جیسی حیران کن ایجادات اسی دماغ کی پیداوار ہیں۔ یہ جو زندگی کا تاجدار ہے اس قدر نازک اور پیچیدہ ہے کہ اس کا سمجھنا ہر آدمی کے بس میں نہیں۔ اس کا ذرا سا توازن بگڑ جانے سے انسان ہلاکو، مجنوں، اور مجذوب کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور صحیح توازن رہنے سے پیغمبر، مصلح قوم، ہیرو اور انسانیت کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا دنیا کی مشکلات کو سمجھنے کے لئے کائنات کے اس اہم پرزے کو بنظر غور دیکھنا ہوگا تاکہ ہم اس سے کام لے کر انسانیت کی بہتری کر سکیں اور زندگی سے فیض یاب ہو کر آسودگی کی بلند منازل تک پہنچ سکیں۔

سب سے پہلے ہم دماغ کو حیاتیاتی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں ایک بات ضرور ذہن نشین کر لینا چاہیئے اور وہ یہ کہ جب ہم دماغ کو حیاتیاتی شیشے کے ذریعے دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں دماغ کے ساتھ ساتھ تمام متعلقہ نظام اعصاب کو بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ نظام اعصاب میں دماغ کے علاوہ ریڑھ کی ہڈی کا گودا Spinal - Cord اور اس سے منسلک تمام اعصاب شامل ہیں۔ ہمارا عصبی نظام دو قسم کا ہے ایک تو مرکزی نظام عصبی یا Central Nervous System ———— اور دوسرا خود اختیاری نظام عصبی یعنی ———— Sympathetic Nervous System مرکزی عصبی نظام میں دماغ اور ریڑھ کی ہڈی کا گودا شامل ہے اس نظام کے اعصاب ہماری جلد، اعضائے حواس، اور تمام ان پٹھوں میں پیوست ہیں جن کو ہم اپنی مرضی کے مطابق ہلا سکتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ نظام عصبی ہماری خواہشات، مرضی اور سوچ کا تابع ہے۔ جب ہم چاہیں ہاتھ ہلا سکتے ہیں، آنکھ بند کر سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے خود اختیاری نظام عصبی میں ریڑھ کی ہڈی کے دونوں طرف متوازی عصبی رگیں ———— اور اس سے متعلقہ تمام اعصاب شامل ہیں۔ یہ اعصاب تمام ان اعضا کا نظم رکھتے ہیں جو ہمارے ارادے اور مرضی کی دسترس سے باہر ہیں مثلاً پھیپھڑے، دل، گردے وغیرہ وغیرہ ہم چاہیں بھی تو دل اپنا کام کرنا بند نہیں کر سکتا، ارادے کے باوجود گردے سرگرم عمل رہیں گے۔

ہمارے تمام احساسات، خواہشات، جذبات اور نظام عصبی کا ناظم اعلیٰ دماغ ہے۔ دماغ ہی وہ مرکزی دفتر ہے جہاں سے ہمارے جسم کے تمام افعال اور حرکات کا انتظام ہوتا ہے۔ اعصاب ٹیلیفون کے تاروں کے موافق ہیں جو اس دفتر کے ناظم اعلیٰ کو ہر لمحہ خارجی عناصر سے مطلع کرتے رہتے ہیں اور اس کا حکم مخصوص عضو تک لے جاتے ہیں۔ ایک بالغ انسان میں دماغ کا وزن عموماً ۳ پونڈ ہوتا ہے۔ رنگ میں خارجی سطح پر یہ بھورا اور اندر سفید ہوتا ہے۔ [illegible] کی سطح نہایت ناہموار اور سلوٹوں سے پُر ہوتی ہے۔ یہ ہے دماغ کی حیاتیاتی تصویر۔

آئیے اب ہم اپنی عنانِ حیاتیات کے خشک راستے سے موڑ کر نفسیات کی دلفریب شاہراہ کی طرف موڑیں۔ سب سے پہلا شہسوار جو اس راستے سے نکلا وہ فرائیڈ تھا۔ فرائیڈ انسانیت کا محسن اور علم نفسیات کا کارواں سالار ہے۔ بغیر اس کی ذات کے مستفید ہوئے نفسیات کے علم سے روشناس ہونا محال ہے۔ جس طرح جزائر ہند کی دولت سے متاثر ہو کر کولمبس نے ہند کا نیا راستہ معلوم کرنے کی ٹھانی تھی اور اتفاقیہ ان دیکھی دنیا میں پہنچ گیا تھا گو اس کے ساتھیوں نے اس سے بغاوت اور سرکشی کی مگر وہ نئی دنیا تک پہنچ کر رہا۔ اسی طرح فرائیڈ انسانی ذہن کا کولمبس ہے۔ ہسٹریا کا اصل سبب معلوم کرنے کے عزم میں فرائیڈ ایک ایسی دنیا میں آ پہنچا جس کا علم دنیا کے اور لوگوں کو اتنا واضح نہ تھا جتنا کہ اس نے اس کو پانے کے بعد پیش کیا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کو چھوڑا، لوگوں نے اس کی پست ہمتی کی، اغیار نے اس کا مذاق اڑایا مگر وہ کولمبس عزم کے ساتھ ذہن کے وسیع سمندر میں تنہا بڑھتا چلا گیا اور آخر ایک ایسی دنیا کو معلوم کیا جو ابھی تک انسان کی نظروں سے پوشیدہ تھی۔ یعنی لاشعور۔ لاشعور فرائیڈ کی ایجاد نہیں اختراع ہے۔ اس سے قبل بھی لاشعور کے آثار ملتے تھے مگر وہ اس قدر دھندلے اور معمولی تھے کہ انسان کے ذہن میں اس دفینے کا کوئی واضح تصور تھا ہی نہیں۔ فرائیڈ ہی پہلا شخص ہے جس نے نفسیات کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا جس کی سرخی اس نے "لاشعور" رکھی۔ اس نے انسانی اعمال کو خواہ وہ معمولی ہوں یا غیر معمولی لاشعور سے متعلق بتایا۔ یہی نہیں بلکہ تمام اعمال جو عقل میں نہیں آتے اور انسان ان کے اسباب معلوم کرنے سے قاصر ہے اس کی نظر میں لاشعور کی پیداوار ہیں۔ انسان کا کوئی عمل [illegible] (الشعوری) نہیں بلکہ ہر حیران کن عمل اور [illegible] لاشعور کی [illegible] ہے۔ اس کھوج کے بعد فرائیڈ ہماری ذہنی زندگی کو دو [illegible] سے بڑا عمل [illegible] ہے جس [illegible] حصوں میں تقسیم کرتا ہے یعنی شعور اور لاشعور۔ ذہن کا شعوری حصہ وہ ہے جس کی کارروائی سے ہم ہر لمحہ آگاہ رہتے ہیں اور لاشعوری حصہ وہ ہے جس کا احساس کوشش کے باوجود بھی آسانی سے شعور کا نہیں ہوتا۔ یہ دونوں حصے ذہن کی فرضی تصویر میں اس طرح پیش کئے جاتے ہیں کہ سب سے بالائی حصہ شعور کی نمائندگی کرتا ہے اور سب سے زیریں حصہ لاشعور خیال کیا جاتا ہے۔ لاشعور شعور سے نو حصے زیادہ دکھایا جاتا ہے۔ ان دونوں حصوں پر تفصیلی گفتگو سے پہلے یہ بتا دینا مفید ہوگا کہ ذہن کا یہ خاکہ بالکل فرضی اور سمجھانے کے لئے ہوتا ہے۔ چونکہ ذہن ہر قسم کی قید مکانی سے قطعی آزاد ہے اس لئے اس خاکے کا انسانی ذہن کی سطح سے کوئی تعلق نہیں یہ صرف ایک فرضی تصویر ہے

اب ہم ہر ایک کی الگ الگ تشریح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم شعور کو لیتے ہیں۔ یہ سوال اکثر لوگوں کے ذہن میں بیدار ہوتا ہوگا کہ آخر شعور کسے کہتے ہیں۔ شعور کی صحیح اور واضح تعریف آسان نہیں کیونکہ شعور ہماری زندگی کا عجیب اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد وصف ہے شعور پر مزید روشنی ڈالنے سے قبل ایک بات واضح کر دینا موزوں ہوگا یعنی یہ کہ شعور کسی جگہ کا نام نہیں جہاں ہمیں چیزوں کا احساس ہوتا ہے۔ ہم روزمرہ کی بول چال میں اکثر ایسے فقرے بولتے ہیں جن سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ گویا شعور دماغ کے کسی مخصوص حصہ سطح کا نام ہے مثلاً "یہ میرے شعور میں ہے"۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ شعور قید مکانی سے قطعی آزاد ہے اور یہ ہمارے دماغ کا صرف ایک وصف ہے جس کی وجہ سے شعور کا تعین محال ہے۔ جہاں تک نفسیات کا تعلق ہے شعور سے مطلب وہ وصف ہے جس کے سہارے ہمارے ذہن میں کسی شے یا واقعہ کا صحیح اور بامعنی احساس ہوتا ہے۔ یعنی ہم اس چیز یا واقعے سے واقف ہوتے ہیں اسے یاد کرتے ہیں اس کے معنے سمجھتے ہیں، یہ تمام مدارج شعوری ہیں ہماری چلتی جاگتی زندگی میں جو جو چیزیں ہمیں متاثر کرتی ہیں اور جن جن کا احساس ہمیں ہوتا ہے وہ سب شعور کی مرہون منت ہیں۔ شعور کی بہترین تعریف یوں ہو سکتی ہے کہ کسی واقعہ کا داخلی صحیح احساس شعور ہے۔ یعنی کسی واقعہ کی داخلی کیفیت کی صحیح تصویر شعور کے پردے پر ہی رونما ہوتی ہے چونکہ ہر فرد جداگانہ شعور کا حامل ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک شے کا شعور ہر ایک کو یکساں ہوگا۔ مختصر یہ کہ وقوف Conception احساس اور ارادے کا مجموعی نام شعور ہے۔ ماحول اور نفس کے درمیان جو ایک ربط اور توازن برقرار ہے اس سے فرد کا مطلع اور باخبر رہنا شعور ہے۔

لاشعور کا موہوم اور نامکمل تصور عرصہ دراز سے انسانوں کے ذہن میں چلا آ رہا ہے مگر یہ تصور اس قدر واضح اور مکمل نہ تھا جتنا کہ

آج ہے۔ Hudson نے اپنی کتاب The Law of Psychic Phenomena میں صاف صاف اور بے باکانہ انداز میں لکھا تھا کہ ہمارے دو ذہن ہوتے ہیں ایک Subjective اور دوسرا Objective اس نے بتایا کہ Objective دماغ کے تحت ہمارے تمام وہ احساسات آتے ہیں جن کا مفہوم ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں بالفاظ دیگر یہ ہمارے تمام شعوری احساسات کا مرکز ہے۔ برخلاف اس کے Subjective دماغ ہمارے تمام حیران کن اور غیر معمولی افعال کا سرچشمہ ہے۔ گو لاشعور کا تصور پیدا ہو جاتا تھا مگر پھر بھی ہمارے ذہنی ارتقا کے ابتدائی مدارج میں ہسٹریا اور اسی قسم کی اور بہت سی ذہنی بیماریاں جن یا بھوت کے سائے سے تعبیر کی جاتی تھیں۔ اسی نظریے کے تحت جادوگرنیاں ملزم قرار دی جاتی تھیں، ان پر مقدمے چلتے تھے، ان کو طرح طرح کی سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ آج بھی ہم جاہلوں میں اسی قسم کی اوہام پرستی، موجود پاتے ہیں۔ اگر ہم سنجیدگی سے غور کریں تو ہم محسوس کریں گے کہ ہمارا ذہن ان بیماریوں کی اس غیر فطری اور غیر حقیقی وجہ قبول کرنے سے ایک لمحہ کے لئے جھجکتا ہے۔ منطقی حیثیت سے جادوگرنیوں کے مقدمے اتنے ہی غیر منطقی اور عجیب ہیں جتنا کہ مشتبہ لوگوں کو سزائیں دے دینا ہمارے اخلاقی معیار کے منافی ہے۔ فرائیڈ ان تمام ذہنی بیماریوں کی مخرج لاشعور کو ٹھیراتا ہے اور اس کی نظر میں لاشعور ایک فطری قوت ہے جو ہمارے نفس میں موجود ہے اور جو کسی طرح بھی فوق الفطرت یا ماورائے نفس نہیں۔

فرائیڈ لاشعور کے کرید کے دوران میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ بچے کے لاشعور میں سوائے جبلتوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ بچے کا لاشعور نہایت سادہ اور سلجھا ہوتا ہے مگر جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے اور بچوں میں اخلاقی شعور پیدا ہونے لگتا ہے لاشعور کے پیچ و خم اور زیادہ گنجلک ہوتے جاتے ہیں۔ آپنے بھی اکثر دیکھا ہوگا کہ بچے کو بھوک لگی وہ رونے لگا۔ ماں نے دودھ پلا دیا بچہ غوں غوں کرنے لگا اور سو گیا۔ ماں چھوڑ کر جانے لگی بچہ خوفزدہ ہو گیا کسی نے اس کا کھلونا اس سے چھینا جھنجلا اٹھا۔ آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ ان نوزائیدہ بچوں کو دودھ چوسنا کون سکھاتا ہے۔ بھوک لگنے پر رونا اور ایسی حرکتیں کرنا جس سے غذا کی خواہش ظاہر ہو کس کی تعلیم کا نتیجہ ہیں۔ ماں سے الگ ہونے پر خوف کیوں پیدا ہوتا ہے۔ خواہشات کی عدم تکمیل پر ان ننھوں کو غصہ کیوں آتا ہے۔ ان سب کا جواب یہی ہے کہ بچہ پیدائش کے ساتھ ساتھ اپنے دماغ میں کچھ ایسی قوتیں لاتا ہے جو اسے ان تمام باتوں پر خود بخود مجبور کرتی رہتی ہیں اور اس کو بھی خود علم نہیں ہوتا کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہو رہا ہے۔ وہ قوتیں جن کو ہم جبلتیں Instincts کہتے ہیں لاشعور کی گہرائیوں میں غلطاں رہتی ہے اور آن جانے بچے کے اعمال پر اپنا اثر کرتی رہتی ہیں۔ بچپن کے ابتدائی سالوں میں جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے لاشعور بہت ہی سادہ ہوتا ہے مگر جوں جوں عمر بڑھتی ہے اس میں وسعت اور پیچیدگیاں پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ آئیے ہم دیکھیں کہ پیچیدگیاں کیسے رونما ہوتی ہیں۔ بچے کے ذہن میں چونکہ ضمیر کی ساخت کی بنیاد نہیں پڑی ہوتی ہے اور اخلاقی شعور نہیں پیدا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے بچہ تمام حرکات محض جبلتوں کی اکساہٹ پر کرتا رہتا ہے مگر جب اس کو خاندانی تعلیم، سماجی قوانین، تہذیبی بندشوں اور آئین کی سختی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ جو جو خواہش وہ ابھی تک بے دھڑک کرتا رہا تھا وہ اب اس بے باکی سے پوری نہیں کی جا سکتی جس طرح کہ ابھی تک پوری ہو رہی تھی۔ وہ سوچتا ہے کہ سماج مہذب اور قوانین اس کی جبلی اکساہٹوں پر کڑی بندشیں قائم کئے ہوئے ہیں اور ان خواہشوں کا اظہار یا تکمیل سماج، مذہب اور حکومت کی نظر میں اچھا نہیں اس لئے وہ ان جبلی خواہشوں کو دباتا ہے تاکہ اپنے ماحول کی تنقید سے بچا رہے۔ یہیں لاشعور میں ایک پیچ پیدا ہوتا ہے اور یہیں سے لاشعور کی وسعت اور پھیلاؤ کا سنگ بنیاد پڑتا ہے۔ لیجئے ہم اب ذرا تشریح کے ساتھ اسے پیش کرتے ہیں۔ آپ نے اکثر کم عمر بچوں کے منہ سے کہتے سنا ہوگا "امی آپ بہت اچھی ہیں میں آپ سے شادی کروں گا"۔ بچپن کے ان الفاظ کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا، مگر جب یہی الفاظ کسی بڑی عمر کے بچے کی زبان سے ادا ہوں تو خاندان بھر متعجب ہوتا ہے اور اس کی اس حرکت سے ایک گونہ بیزاری کا اظہار کیا جاتا ہے۔ بچہ اپنے عزیزوں کے پیار کی خاطر اور اپنی نیک نامی کے خیال سے اس خواہش کو شعور سے نکال کر لاشعور کی خلاؤں میں دھکیل دیتا ہے جسے عرف عام میں بھول جانا کہتے ہیں۔ یعنی بچہ اس خیال کو بھول گیا مگر یہ صحیح نہیں۔ ایک مثال اور لیجئے۔ شیر خوارگی کے زمانے میں بچے کو ماں کی چھاتیاں چوسنے میں

بہت لذت ملتی ہے۔ جہاں بچہ رویا اور ماں نے اپنی چھاتی اس کے منہ میں دیدی اور چاہے دودھ نکلے یا نہ نکلے ننھے میاں چپ ہوگئے اور کھیلتے کھیلتے سو گئے۔ خورد سالی میں بچے کی اس چھاتی چوسنے کی حرکت کو قطعی جائز اور فطری خیال کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بچہ جوش محبت میں ماں کو پیار کرتا ہے اس کی آغوش میں دھنس جانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی اس خواہش کو بغیر کسی رکاوٹ کے پورا ہونے دیا جاتا ہے مگر جیسے جیسے بچہ بڑا ہوتا جاتا ہے ان مراعات میں تخفیف اور بندشوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ بڑے ہوکر بچہ دیکھتا ہے کہ اب وہ اپنی ماں کی چھاتیاں نہیں چوس سکتا۔ اب وہ اپنی ماں کو پیار نہیں کر سکتا اب وہ اس کی آغوش کی گرمی سے محظوظ نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے اردگرد کے لوگ اس کی اس حرکت کو پسند نہیں کرتے۔ حد ہے خود اس کی ماں بھی اب نہیں چاہتی کہ وہ اب ان بچپنے کی حرکتوں کو دہرائے کیونکہ اب وہ بڑا ہوگیا ہے اور یہ حرکتیں اسے زیب نہیں دیتیں۔ لامحالہ بچے کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ابھی تک جو جو حرکتیں وہ کرتا رہا ہے وہ بڑی لائق قابلِ شرم تھیں جبھی تو اس کے عزیز و اقارب ان حرکتوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ اس لئے وہی بچہ جو ان خواہشات کے اظہار اور تکمیل سے نہیں شرماتا تھا فطرتاً ان خواہشات اور خیالات کو شعور پر آنے سے روکتا ہے اور لاشعور میں دفن کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنے گرد و پیش کے دوسرے لوگوں کو خوش کر کے ان کے رویے سے مطابقت پیدا کر سکے۔ بہرحال بچپن سے لے کر مرتے دم تک ہر لمحہ ہمارے شعور سے خواہشات لاشعور میں پھینکی جاتی ہے اور اس طرح لاشعور کے مواد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

اس تمام تشریح کے بعد آپ ضرور اس نتیجے پر پہنچ گئے ہوں گے کہ لاشعور ہماری ان خواہشات اور خیالات کا مسکن ہے جو اخلاقی معیار پر پوری نہ اترنے کے بعد شعور سے نکالدیئے جاتے ہیں مگر ایک غلط فہمی کی وضاحت ضرور کر لینا چاہیئے اور یہ کہ صرف اخلاقی معیار پر ہی پورے نہ اترنے والے خیالات کا مسکن لاشعور نہیں بلکہ لاشعور میں وہ خیالات بھی جاگزیں ہوتے ہیں جن سے تلخی، نفرت، یا کراہت بھی وابستہ ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ تمام وہ خیالات جن کو ہمارا ضمیر پسند نہیں کرتا لاشعور کی تہوں میں دبا دیئے جاتے ہیں تاکہ ہمارا شعور ان کی تلخی سے محفوظ رہے۔ ہزاروں خواہشیں ایسی ہوتی ہیں جن کو ہم پورا نہیں کر سکتے، بہت موقعے ایسے آتے ہیں جہاں ہم میں نفرت انگڑائیاں لیتی ہے۔ مگر ہم اس کا اظہار نہیں کر پاتے۔ لاتعداد موقعوں پر ہمیں کراہیت محسوس ہوتی ہے۔ مگر ہم ضبط کرتے ہیں۔ اس طرح ہم تمام ان ناخواستہ خیالات اور خواہشات کو شعور سے نکال کر لاشعور کے تہہ خانے میں مقفل کر دیتے ہیں تاکہ یہ تمام ناخواستہ خواہشات بار بار شعور پر آکر ہمارے ذہنی سکون میں بچکولے نہ پیدا کریں غرض لاشعور ہماری تمام ناخواستہ خیالات کا مسکن ہے۔ فرائیڈ اس جملے کو یوں کہتا ہے لاشعور ہماری تمام ناخواستہ جنسی خواہشات کا مسکن ہے۔

ایک چیز ضرور آپ کے ذہن میں سوالیہ نشان بن بن کر ابھر رہی ہوگی اور وہ یہ کہ جب ایک خیال کو ہم شعور سے لاشعور میں منتقل کر دیتے ہیں تو پھر کونسی چیز اس خیال کو وہیں لاشعور میں مقید رہنے پر مجبور کئے رہتی ہے۔ کیوں وہ خیال دوبارہ شعور پر نہیں آجاتا ؟ - اس کی تشریح یوں کی جاتی ہے۔ یہ تو ذہنی قوت سے قطعی باہر ہے کہ وہ خیال اور خواہش کی پیدائش ہی کو روک دے مگر ہاں ذہن شعور پر خیالات کی یلغار پر شدت کے ساتھ قابو رکھتا ہے۔ فرائیڈ اس قوت کو جو ہمارے لاشعور میں مقید خیالات کو شعور تک پہنچنے سے روکتی ہے سنسر Censor یا محتسب کے نام سے پکارتا ہے اس کے نظریئے کے مطابق اس سنسر کا کام ہمارے ناخوشگوار اور ناخواستہ خیالات کو شعور میں داخل ہوکر اثر انداز ہونے سے روکنا ہے۔

یہاں اس بات کا بتا دینا بے موقعہ نہ ہوگا کہ خیالات لاشعور میں پہنچ کر مردہ اور بے قوت نہیں ہو جاتے بلکہ اپنے ہم آہنگ خیالات سے اتحاد پیدا کر کے یا اکیلے ہی کسی نہ کسی شکل میں شعور پر آنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح سنسر کی حیثیت کافی ذمہ دارانہ اور نازک ہے کیونکہ ان خیالات کی یلغار کو صرف سنسر ہی روکتا ہے۔ سنسر یا محتسب بڑی مستعدی کے ساتھ خیالات کو جو شعور سے نکالدیئے گئے تھے لاشعور میں مقید کئے اور شعور پر حملہ آور ہونے سے روکتا رہتا ہے۔ اس عمل کو دباؤ Repression کہا جاتا ہے کیونکہ کسی خیال کی شعور تک پہنچنے کی [illegible]

کوشش کے ساتھ دبا دیا جاتا ہے۔ بچپن کے ابتدائی سالوں میں جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، بچے کی اندر جبلی تحریکات کو ہمارے منظم سماج کے قوانین سے شدت کے ساتھ ٹکرانا پڑتا ہے اور بچے کا ذہن فطرتاً سماج کے ان قوانین کو قبول کر کے اپنی لاقانونی خواہشات کو لاشعور میں دبا کر سنسر کے حوالے کر دیتا ہے۔ اور اس طرح دباؤ کا عمل پورا ہو جاتا ہے۔

یہ سمجھنے کے لئے کہ لاشعور ہمارے کردار اور ظاہری اعمال پر اثر انداز ہو کر ہماری دبی ہوئی خواہشات کا اظہار کس طرح کرتا ہے ہمیں کچھ واقعات دیکھنا ہوں گے۔ اگر ہم ذرا غور کر کے دیکھیں تو ہمیں لاتعداد واقعات اپنی زندگی میں ایسے مل جائیں گے جب ہم کرنا کچھ چاہتے تھے اور ہو کچھ جاتا تھا۔ وہ غلطی در اصل ہماری ہی منشا ہوتی ہے۔ ایک دفعہ میرے کچھ احباب چائے پر مدعو تھے۔ میں نے ہر ایک کی پیالیوں میں خود ہی چائے بنائی مگر ایک صاحب کی چائے میں شکر ڈالنا بھول گیا حالانکہ مجھے یقین تھا کہ میں نے سب کی پیالی میں شکر ڈالی ہے اور لطف یہ کہ وہ صاحب میرے بالکل قریب ہی بیٹھے تھے۔ مجھے اس واقعے سے بڑا ملال ہوا گو انہوں نے اس کا کوئی خیال نہیں کیا۔ جب میں نے ذرا غور کر کے سوچا تو مجھے یہ معلوم کر کے بڑا تعجب ہوا کہ یہ غلطی اصل میں میری خواہش ہی کے زیر تحت واقع ہوئی تھی۔ واقعہ یوں تھا کہ پچھلی ملاقات میں ان صاحب سے چند نظریاتی اختلاف پر مجھے کچھ بیزاری ہو گئی تھی جو میں بالکل بھول چکا تھا مگر میرے لاشعور میں یہ ناخوشگوار جذبہ برابر شعور پر آنے کی کوشش کر رہا تھا اور چائے میں شکر نہ ڈال کر میرے لاشعور نے اس دبی ہوئی نفرت کا اظہار کر دیا۔ ان کی چائے میں شکر نہ ڈال کر میں نے گویا ان کو ایک قسم کی سزا دی جو میری لاشعوری نفرت کا اظہار تھی۔ اسی طرح کے اور بہت سے واقعات ملتے ہیں جن کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ لاشعور میں دبی ہوئی خواہشیں کسی نہ کسی شکل میں شعور پر ظاہر ہو کر اپنا اظہار ضرور کرتی ہے

بعض لوگ ایک خاص موقع پر ایک مخصوص فعل کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ وہ کوشش اور ارادے کے باوجود اپنے ان جبری اعمال کو نہیں چھوڑ سکتے۔ برنارڈ ہرٹ Bernard C. Hart اپنی مشہور کتاب The Psychology of [illegible] میں ایک واقعہ لکھتا ہے۔ ایک عورت جس کو یہ عادت پڑی ہوئی تھی کہ وہ ہر نوٹ پر لکھے ہوئے ہندسوں کو ضرور پڑھتی تھی۔ چاہے کچھ ہو جب تک وہ ہندسوں کو نہ پڑھ لیتی اسے چین نہیں آتا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے تو اس نے کہا ــ " میں نہیں جانتی کہ میں ایسا کیوں کرتی ہوں مگر ہاں میں مجبور ہوں۔ جب کبھی میں کوئی نوٹ دیکھ پاتی ہوں اندر سے کوئی طاقت مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں اس پر لکھے ہوئے ہندسے ضرور پڑھوں۔ حالانکہ میں خود اپنی اس نامعقول حرکت سے پریشان رہتی ہوں مگر کیا کروں کہ اندرونی اکساہٹ اتنی شدید ہوتی ہے جس پر میں قابو نہیں پا سکتی" جب اس عورت کا تجزیہ نفس کیا گیا تو اس جبری فعل کی اصل وجہ معلوم ہو گئی۔ واقعہ یوں تھا کہ کچھ عرصے پہلے وہ عورت ایک نوجوان سے جو کہ اسے ایک ہوٹل میں ملا تھا شدید محبت کرنے لگی تھی۔ ایک دن اس نے اس نوجوان اپنا ایک سکہ بدلنے کو کہا۔ اس نوجوان نے اس کی خواہش کے مطابق اس کا سکہ لے لیا اور یہ کہتے ہوئے کہ وہ تمام حیات اس کے سکے کو اپنے سے جدا نہ ہونے دیگا، اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس واقعے سے اس عورت کے دل میں بہت سی خوشگوار امیدیں بیدار ہو گئیں کیونکہ وہ محسوس کرنے لگتی تھی کہ اس کی محبت کا جواب اسے محبت سے مل رہا ہے۔ وہ عرصے تک منتظر رہی کہ وہ جوان اپنا وعدہ نبھائے۔ مگر وہ نوجوان اس سے کچھ زیادہ مانوس نہ ہوا اور آخر وہ اسے چھوڑ کر کہیں دوسری جگہ چلا گیا۔ اس غیر متوقع ناکامی کا اثر اس عورت کے دماغ پر بہت ہوا۔ اپنی آرزؤں کی موت کی وجہ سے اس کے ذہن میں ایک کشمکش پیدا ہو گئی جس کا علاج دباؤ سے کیا گیا۔ لہذا وہ عورت اپنی محبت سے وابستہ تمام واقعات بھول گئی اور اس طرح اس نے اپنی زندگی سے ایک غمگین باب کا اخراج کر دیا۔ اس کے ذہن نے تمام ان واقعات کو جس نے ناکامی کی تلخی وابستہ تھی لاشعور کی خلاؤں میں ڈھکیل دیا کہ تاکہ وہ دیرینہ واقعات اس کے شعور پر آکر اس کی ذہنی زندگی میں ایک خم آگیں ہیجان نہ پیدا کریں۔ اس دباؤ سے اتنا فائدہ ہوا کہ اس دبی ہوئی خواہش کے اظہار کے معمولی راستے مسدود ہو گئے مگر اس کے اس قوی خیال نے اپنے اظہار کے غیر معمولی سوراخ معلوم کر لئے۔ ہر نوٹ سے دل لگی اور اس کے نمبر پڑھنا اس کے لاشعور میں مقید کشمکش کے اظہار ہی کا ایک

بالواسطہ راستہ تھا۔ ہر نوٹ کا نمبر پڑھ کر وہ لاشعوری طور پر اپنی دبی ہوئی خواہش کا اظہار کرتی تھی اور اس طرح نامعلوم طریقے پر وہ اس خوشگوار سکہ والے واقعے سے محظوظ ہونے کی کوشش کرتی تھی۔ گو وہ تمام واقعات بھول چکی تھی مگر اس کے لاشعور نے اس شدید کشمکش کے اظہار کا ایک عجیب راستہ پیدا کر لیا تھا۔

مندرجہ بالا واقعات سے یہ صاف ہو گیا کہ ہمارا لاشعور ہماری دبی ہوئی خواہشات اور خیالات کو کسی نہ کسی طرح ہمارے کردار اور اعمال کے ذریعہ ظاہر کر ہی دیتا ہے۔ ہماری خواہش جو شعور سے نکال دی جاتی ہے وہ دوبارہ شعور پر آنے کے لئے اپنا بھیس اس لئے بدل لیتی ہے تاکہ وہ سنسر کو دھوکہ دے کر شعور پر آ سکے کیونکہ اگر وہ اپنے اصلی رنگ میں شعور پر آنا چاہے تو سنسر اس کو سختی کے ساتھ لاشعور میں دبا دیتا ہے اس طرح اپنے اصلی روپ [illegible] خواہش [illegible] جیسا ہے اور یہ حرکت [illegible] ان خواہشات کا شعور پر آنا محال ہے۔

اس تمام تفصیل کے بعد بھی ایک استفسار ضرور بہت سے ذہنوں میں موجود ہوگا اور وہ یہ کہ آخر لاشعور کے وجود کو ہم کس طرح مان لیں یہ کس طرح ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے ذہن کا کوئی حصہ ایسا بھی ہے جو ہم سے پوشیدہ ہے۔ ان تمام واقعات کی روشنی میں ہم خوش اعتقادی کی بنا پر لاشعور کا تصور کر لیں تو بھلے کر لیں مگر کوئی منطقی ثبوت لاشعور کا نہیں۔ یہ تو بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ ایک ان دیکھی دنیا کے بارے میں جو کچھ وہاں سے کوئی لوٹا ہوا کوئی شخص بتا دے وہ مان لیا جائے۔ یہ تو دوسرے الفاظ میں سندباد کی داستان ہے جو اس نے اپنے سفر سے لوٹنے کے بعد بیان کی ہم اس سوال کا بھی جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

(مسلسل)

ماہ مبین

خودی کو کر بلند اتنا......

یہ ایک عجیب بات ہے۔ سائیکولوجی کے سوال و جواب کے صفحات پر جو لوگ بھی مختلف قسم کے سوال کرتے ہیں۔ ہمارے ایڈیٹر صاحب ہر مرض کی ہے دوا درود شریف ——— کے وزن پر ہر ایک کو یہی مشورہ دیتے ہیں کہ ——— اپنی قوت ارادی کو کام میں لائیے۔ اور اپنی بُری عادتوں کو چھوڑ دیجئے ——— ان خدا کے بندے سے کوئی یہ پوچھے۔ اگر ہم اپنی بُری عادتوں کو خود ہی چھوڑ سکتے تو سائیکولوجی کا دروازہ کیوں کھٹکھٹاتے۔

شعور و لاشعور کی بحث میں کون پڑے۔ یہ میں جانتی ہوں کہ ہر شخص کے اندر ایک قوت اور ہوتی ہے جس کو پُرانی اصطلاح میں ضمیر کہا جاتا ہے اور ضمیر کا کام یہی ہے کہ وہ ہر شخص کو برے کام سے روکے ——— جب رات کی تاریکی میں ایک شخص چوری کرنے کے لئے گھر سے باہر قدم نکالتا ہے تو ضمیر وہ پہلا ہوتا ہے جو اس کو چوری کرنے سے روکتا ہے۔ اس کے انجام و عواقب سمجھاتا ہے ——— جب شراب کا جام منہ تک آچکا ہوتا ہے اس وقت یہی ضمیر ہوتا ہے جو شراب کے نقصانات ایک نظر میں دکھلا دیتا ہے ——— مگر ہم میں سے جو مبتدی ہوتے ہیں ——— ضمیر کی یہ آواز سن کر لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ مگر جو منجھ چکے ہوتے ہیں ——— وہ ——— چڑھ جا بیٹا سولی پر رام بھلی کرے گا ——— کہکر اپنی جھوٹی خواہشوں میں ضمیر کی اس آواز کو دبا دیتے ہیں ——— تو معاف کیجئے گا۔ قدرت نے "دل کے ساتھ" جو "پاسبان عقل" بنایا تھا حضرت انسان نے اسی کو خدمت گذاری سے سبکدوش کر دیا۔ تو یہ قوت ارادی۔ جو ضمیر کی ہی ایک شکل ہے۔ ہمارے کس کام آسکتی ہے۔

شاید میں اپنا مفہوم پورے طور پر واضح نہیں کر سکی ہوں کہہ یہ رہی ہوں ——— مانا کہ ہم اپنی قوت ارادی کو کام میں لا کر کسی پسندیدہ کام کو اختیار کر سکتے ہیں یا ناپسندیدہ کام کو چھوڑ سکتے ہیں۔ مگر اس قوت ارادی کو کام میں لانا۔ جوئے شیر لانے سے کس طرح کم ہے ——— اگر ہم اپنی قوت ارادی کو اپنی مرضی کے مطابق کام میں لا سکتے ہیں تو آج سے دسیوں برس پہلے۔ شاعر مشرق کی فہائش پر اپنی خودی کو اتنا بلند کر لیتے کہ پاکستان کی "وزارت عظمیٰ" یا "صدارت اعلیٰ" کے الاٹ منٹ سے پہلے۔ خداوند قدوس ہماری بھی رضا پوچھ لیتا۔ اور ہم کیوں ان "اخباروں کی ملکیت" یا "عوامی لیگ کی صدارت" پر قانع ہو جاتے۔

مگر ہے یہ کسی حد تک سچ۔ اقبال کی "خودی" ہو یا سائیکولوجی کی "قوت ارادی" ——— گو یہ "ہارڈ کرنسی" کے علاقہ کی پیداوار ہیں مگر ان کا لائسنس ملنا دشوار نہیں۔ صرف تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہے ——— اور محنت۔ تو جناب من وہ کونسا کام ہے جس میں محنت کی ضرورت نہیں ہے۔ روٹی کھانا بھی ایک محنت طلب کام ہے۔ توڑنا۔ نوالے بنانا۔ چبانا اور پھر بارہ گھنٹے اس کو پیٹ میں لئے لئے پھرنا ———

اب جبکہ قوت ارادی کی بات ہی آن پڑی ہے تو اس کے متعلق چند لفظ میرے بھی سُن لیجئے۔

کیا آپ کی قوت ارادی کمزور ہے ——— اور یہ آپ پر ہی منحصر نہیں ——— اس دور کے سب ہی افراد "کمزوری" کے

شکار ہیں — آئیے میں آپ کو بتاؤں آپ اس کمزوری کو کیونکر دور کر سکتے ہیں۔

پہلے تو ایک اصول سمجھ لیجئے

دیکھئے کسی چیز کی عادت ڈالنا ذرا کم مشکل ہے بہ نسبت اس کے کہ کوئی پڑی ہوئی عادت کو چھوڑا جائے۔ مثلاً ایک شخص سگریٹ کا عادی ہے۔ اب بتلایئے کہ اس کے لئے کتنا مشکل ہے کہ وہ سگریٹ نوشی ترک کر دے۔ مگر ایک شخص جو اس کا عادی نہیں ہے وہ اگر عادت ڈالنا چاہے تو آسانی سے سگریٹ نوشی شروع کر سکتا ہے ——— اسی طرح کوئی شخص جس کو چوری کا چسکا پڑ جائے۔ اس سے یہ عادت چھڑانا کتنا مشکل کام ہے بہ نسبت اس کے کہ جو شخص پہلے سے چور نہیں ہے اس کو چوری کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔

ایک انسان جو عادت ڈال لیتا ہے۔ پھر اس کو چھڑانا یا چھوڑنا مشکل کام ہے۔ بہت ہی مشکل — جبل گردد وجبلی نہ گردد۔ مگر ایک نئی عادت بنا لینا یا ڈال لینا۔ اتنا مشکل نہیں ہے۔ دیکھئے۔ اس سے پہلے آپ ہی بہت سی عادتیں — اچھی یا بری — ڈال چکے ہیں۔ پھر ایک اور سہی۔ چند اور سہی۔

آپ کہیں گے کہ میں قوت ارادی کی کمزوری کے دفعیہ کے لئے نسخہ لکھنے بیٹھی تھی اس میں یہ عادتوں کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی بحث کا کیا دخل ——— مگر قوت ارادی کے بنانے اور بگاڑنے میں عادتوں کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ عادتوں اور قوت ارادی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لہٰذا اگر آپ میری صلاح مانیں تو ایسا کیجئے۔ کہ جب آپ کوئی عادت چھوڑنا چاہیں تو ایک نئی عادت۔ پہلے کے بالکل برعکس۔ ڈالنا شروع کر دیجئے۔ جیسے جیسے یہ دوسری عادت مضبوط ہوتی جائے گی پہلی عادت خود بخود کمزور ہونے لگے گی۔

قوت ارادی کو مضبوط بنانے کا ایک اور چٹکلہ ہے ——— وہ ہے دلچسپی

آپ بہت سے کام ایسے کرتے ہیں جن میں آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کام آپ کا اتنا کامیاب نہیں ہوتا جتنا ہونا چاہیئے۔ اور کسی کام کی ناکامی۔ آدمی کی ہمت کو اور بھی پست کر دیتی ہے۔

ہونا یہ چاہیئے کہ آپ جو کام کریں اس میں اپنی پوری توانائی صرف کر دیں۔ شروع سے آخر تک اپنی دلچسپی قایم رکھیں جو بھی کام آپ محنت اور دلچسپی سے کریں گے وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ اور ایک کامیابی آپ کے حوصلے اور ارمان کو اور بھی بلند کرے گی — اور دوسری کامیابی آپ کے خیر مقدم کے لئے چشم براہ رہے گی

قوت ارادی کا مطلب یہی ہے کہ آپ جس کام کو کرنا چاہیں وہ کر گذریں۔ طبیعت میں کوئی ہچکچاہٹ پیدا نہ ہو ——— اور یہ ہچکچاہٹ صرف دو ہی صورتوں میں پیدا ہوتی ہے۔

آپ پہلے مایوسیوں سے کئی بار دوچار ہو چکے ہیں — یا

آپ کاہل الوجود ہیں۔ محنت کے نام سے ہی آپ کو بخار چڑھتا ہے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مایوسی اور ناکامی صرف اسی وقت ہوتی ہے جب کسی کام میں ہم کو دلچسپی نہ ہو — روٹی کا مسئلہ ہی لے لیجئے فطرتاً ہمیں کس قدر دلچسپی ہے ——— پھر آپ دیکھیں روٹی کے حصول میں ہم کبھی ناکام نہیں ہوتے ——— تجارت کرتے ہیں۔ نوکری کرتے ہیں یا مزدوری کرتے ہیں — یہ تو وہ صورتیں ہیں جن کو سماج نے جائز کر رکھا ہے۔ لیکن اگر ان میں سے کسی میں کامیاب نہ ہوں تو ——— پھر بھیک مانگتے ہیں۔ چوری کرتے ہیں — چھین کرتے ہیں۔ غرض کچھ نہ کچھ کرتے ہیں ——— خدا بھوکا اٹھاتا ہے بھوکا سلاتا نہیں —

جس طرح روٹی کے ساتھ ہماری دلچسپی بڑھی ہوئی ہے — اسی طرح جس کام میں ہم دلچسپی پیدا کر لیں وہ کسی نہ کسی صورت ہو جاتا

ہوکر ہی رہتا ہے ——— جب ایک شخص نے یہ طے کرلیا کہ وہ فضا میں پرواز کرے گا ——— اس نے طیارہ کی ابتدائی شکل
بنا ہی ڈالی ——— دوسرے نے جب یہ طے کرلیا کہ وہ طیارہ کی رفتار کو دنیا کی دوسری سواریوں کے مقابلے میں تیز تر کرکے ہی دم
لے گا ——— آج آپ کے سر پر منڈلانے والے ہوائی جہاز ۴۰۰ میل سے زیادہ کی رفتار سے اڑ رہے ہیں ——— ضرورت
صرف دلچسپی کی ہے ۔ آپ اس وقت جس کام کو کر رہے ہیں ۔ طے کیجئے ——— کہ آپ اس کو ضرور کامیاب کریں گے ——— دیکھئے
وہ کام کامیاب ہوتا ہے یا نہیں ——— اور جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے آپ جب ایک بار کامیاب ہوجائیں گے تو دوبارہ کے لئے آپ کی
ہمت بڑھ جائے گی ۔

ایک شخص جو پہلی دفعہ چوری کرنے نکلتا ہے ۔ ہر قدم پر اس کے پاؤں لڑکھڑاتے ہیں ۔ ہر کھٹکے پر اس کا بدن لرزنے لگتا ہے ۔ لیکن اگر وہ کامیاب
ہوگیا تو ——— دوسری رات اس کے لئے اتنی خطرناک نہیں رہتی اور تیسری رات تو وہ خود ملہاریں گاتا ہوا منزل مقصود کی طرف
بڑھتا ہے ۔

کاہلی ——— کوئی خدا کی دین نہیں ہے ۔ یہ بھی ہم پیدا کرلیتے ہیں ۔ یہ بھی ایک عادت ہے ۔ چپ چاپ بیٹھے رہو ۔ کچھ نہ کرو ———
آپ کاہلی کو دور کرنے کی کوئی فکر نہ کریں ——— آپ، تو صرف چست و چالاک بننے کی کوشش کریں ۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے ۔ آسان
ہے ۔ بہت آسان ———

دیکھئے یہ قلم دوات ہے ۔ وہ کاغذ ہے ۔ اٹھائیے کاغذ اور اس پر لکھیئے ۔
میں کل صبح بہت سویرے اٹھوں گا ۔
اٹھتے ہی ورزش کروں گا ۔ گن کر نہیں ۔ صرف اتنی جتنی کہ میں کرسکوں گا ۔
پھر حوائج ضروریہ سے فارغ ہوں گا ۔
غسل کروں گا ۔
ناشتہ کروں گا ۔
پھر اپنے ضروری کام کی انجام دہی میں مشغول ہوجاوے گا ۔
دن میں لیٹنے کی یا خالی بیٹھنے کی کوشش نہ کروں گا ۔ بلکہ کچھ نہ کچھ کرتا رہوں گا ۔
شام کو میں آرام کروں گا ۔ اور
سونے سے پہلے میں جائزہ لوں گا کہ میں اعتصابہ پروگرام کے مطابق ہی اپنا دن گذارا ہے یا نہیں ۔ ورنہ میں اپنے نفس سے وعدہ کروں گا
کہ دوسرے دن ضرور میں اس پروگرام پر عمل کروں گا ضرور ——— ضرور ———

یہ پہلے ہفتے کا پروگرام ہے ۔ یہ تناؤ کی حالت
آپ صرف ایک ہفتہ اس زیادہ مفید نہیں بلکہ رہنے لگیں گے کہ آپ کی آنے والی ساری زندگی کے واسطے ان میں سے چند چیزیں نہایت ضروری ہیں
اور یہی آپکا خیال درست ہے کہ جب آپ اپنے ہی کمزور ہی ہوتا ہے ۔ آپ اپنے جسم کی کمزوری دور کریں دماغ بھی طاقتور ہوجائے گا ۔
جسم کو مضبوط اور دماغ کی طرف لگالیں تاکہ آپ یاد کریں ۱۔ محنت اور ورزش ۲۔ اچھی غذا ۔ اور ۳۔ گہری نیند
جو شخص لا تعداد زائل ہوجائے ۔ اس طرح آپ کی صبی کی شکایت نہیں کریگا ۔ کمزوری جسم کی ہو ۔ یا دماغ کی ۔ اور جس کا جسم و دماغ طاقتور
ہوگا ۔ اس پر کسی کام میں آپ کا دل نہ لگے تو کوئی جسمانی

مستقل عنوان

بات چیت

فرد، فرد کی "بات چیت" سے لاشعوری طور پر متاثر ہوتا ہے ——— کچھ کہیئے کچھ سنیئے ——— کہنے سننے سے جی کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے بات چیت کا یہی مقصد ہے اور بس ـ دیکھیئے ـ کیا ہم آپ کے لئے مفید ہیں ———

لیکن سوالات کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیئے ـ کہ آپ کے سوالات مبہم نہ ہونے پائیں ـ اگر سوالات خود آپ کی ذات سے تعلق رکھتے ہوں تو اپنی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ بھی لکھیئے ـ تاکہ ہم آپ کا صحیح مفہوم سمجھ سکیں ـ اور آپ کے مسئلے کا صحیح نفسیاتی تجزیہ بھی کر سکیں ـ (آپ کی یہ مختصر سوانح صیغہ راز میں رہے گی ——
محض سوالات شائع کئے جائیں گے)

ع آپ کی خاطر ہمیں منظور بہر طور

(ادارہ)

بدرالدین قادری ـ سرکلر روڈ لاہور

جب دائیں آنکھ پھڑکتی ہے تو رنج ہوتا ہے اور جب بائیں آنکھ پھڑکتی ہے تو خوشی ـ کیا یہ صحیح ہے مجھے اس پر تھوڑا بہت یقین اس وجہ سے ہے کہ والد کے انتقال کی خبر بذریعہ تار آنے سے قبل دائیں آنکھ غیر معمولی طور پر پھڑک رہی تھی گو اس سے تین چار روز قبل کے خط سے ان کی خیریت معلوم ہو چکی تھی مگر فوراً ہی حرکت قلب بند ہونے کی خبر بذریعہ تار معلوم ہوئی

۲ ـ مجھے غصہ بہت کم آتا ہے مگر جب آتا ہے تو حد سے تجاوز کر جاتا ہوں ـ مگر اب چند ماہ سے یہ حالت ہے کہ غصہ آنے پر بھی ضبط سے کام لیتا ہوں اور کامیاب ہو جاتا ہوں اگر کسی چھوٹے پر غصہ آتا ہے تو اس کی کم سنی اور نادانی پر رحم آتا ہے اور اگر اپنے سے بڑوں کی کوئی بات ناگوار گذرتی ہے تو ان کی بزرگی کا پاس ملحوظ رکھتے ہوئے غصہ ضبط کرنا پڑتا ہے ـ کیا یہ نسخہ اپنی کمزوری پر قابو پانے کے لئے مفید ہے ؟

آپ کا پہلا اور دوسرا سوال قریب قریب ایک ہی نوعیت کا ہے ـ ——— اس لئے ہم ان کو ایک ساتھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں یہ سمجھنے کے لئے کہ اوہام اور بے بنیاد یقین ہماری روز مرہ کی زندگی میں کس طرح جنم لیتے ہیں ہمیں مختلف چیزوں کو سمجھنا ہوگا آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ اکثر مائیں بچے کو پیشاب یا پاخانہ کرتے وقت سیٹی [illegible] اگر [illegible] ایسا نہ کریں تو بچہ رفع حاجت نہیں کرتا ـ کبھی آپ نے [illegible] ہوتا ہے ـ اصل سبب یہ ہے کہ ایک خاص کیفیت [illegible] اعمال ایک خاص رنگ کے ہو جاتے ہیں اور [illegible] وہی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو ہم اس سے متعلق [illegible] ہو جاتے ہیں ـ اس کو اصطلاحی زبان میں [illegible] کہتے ہیں ـ اوہام [illegible]

COMPU

آپ کے سوال سے خود ظاہر ہے کہ آپ کو دائیں آنکھ کے پھڑکنے پر نحوست کا یقین اس لئے ہے کہ آپ کے والد کی خبر انتقال اسی کیفیت میں موصول ہوئی تھی۔ آنکھ پھڑکنے میں اور موت کی خبر میں ظاہرا کوئی تعلق نہیں مگر آپ کے ذہن نے ان دونوں کے درمیان ایک تعلق پیدا کر لیا ہے۔ جو ناپسندیدہ نوعیت کا ہے۔ مختصر یہ کہ چند متأثرین واقعات سے ربط پیدا کر کے ہمارا ذہن ان چیزوں کو منحوس سمجھنے لگتا ہے جو غمگین یا ناخوشگواری سے وابستہ ہوں اور ان چیزوں کو نیک جو مسرت کن واقعات سے متعلق ہوں اس طرح وہ تلخ یا خوشگوار یادیں ہمارے لاشعور کے تانے بانے میں منسلک ہو جاتی ہیں اور جب کبھی دوبارہ ایسی چیزیں درپیش آتی ہیں جن کا تعلق کسی پچھلی یاد سے ہوتا ہے تو ہم آن جانے طور پر خوشی یا غم کی توقع کرنے لگتے ہیں۔

کسی جذبے پر قابو پانا کمزوری نہیں بلکہ ذہنی صحت مندی کی دلیل ہے اور جو تیجہ آپ نے اپنے جذبات پر قابو پانے کے لئے تجویز کیا ہے وہ بھی کافی سنجیدہ ہے مگر ایک چیز ضرور سمجھ لینا بہتر ہے۔ غصہ یا اور کسی جذباتی حالت کے دوران میں ہمارے اندرونی اعمال میں بھی کچھ تبدیلیاں ہوتی ہیں جو ہمارے ظاہرا اعمال کو بہت حقیر کر دیتی ہیں۔ غصے کی حالت میں آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ گویا آپ کے اندر ایک قسم کی قوت پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ سے آپ کافی طاقت کا ثبوت دیتے ہیں مثلاً غصے کے عالم میں بہت بھاری چیز اٹھا کر پھینک دینا اپنے سے طاقت ور حریف کو زیر کر لینا وغیرہ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ غصے کی حالت میں ہمارے جسم کے ایک غدود جس کو Thyroid کہتے ہیں اپنی رطوبت خون میں ملا دیتی ہے جس کی وجہ سے ہمارے ذہن اعضا میں ایک قسم کا تناؤ اور قوت پیدا ہو جاتی ہے اور جب تک غصہ فرو نہیں ہو جاتا ہمارے اندر وہی ہیجانی کیفیت باقی رہتی ہے۔ یہ تناؤ کی حالت صحت کے لئے مضر ہے لہذا غصے کو صرف دبا دینا زیادہ مفید نہیں بلکہ غصہ کو فرو کرنا اچھا ہے۔ یہ یوں ممکن ہو سکتا ہے کہ جب آپ اپنے غصے کو دبا لیں تو فوراً اپنی توجہ کسی دوسرے کام کی طرف لگا لیں تاکہ آپ کی وہ اندرونی ہیجانی کیفیت خود بخود زائل ہو جائے۔ اس طرح آپ کی صحت پر برا اثر نہ پڑیگا۔ اگر کسی کام میں آپ کا دل نہ لگے تو کوئی جسمانی ورزش کا کام شروع کر دیں تاکہ ورزش کی وجہ سے غدود کی رطوبت کا اثر خون سے غائب ہو جائے۔ اس سلسلے میں ٹہلنا یا زمین کھودنا مفید ہے۔

ایم صادق پرویز۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں

لوگ آرزوئیں کرتے ہیں کہ محبت کا نتیجہ ازدواج ہو اور محبت پر قائم شدہ مواصلت بہت ہی کامیاب سمجھی جاتی ہے لیکن میرے خیال میں یہ آرزو لغو ہے اور ایسی مواصلت ناکام۔ دنیا میں سوائے ازدواج کے اور کوئی بڑا ذریعہ محبتوں کے خون کرنے کا نہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔؟

کہتے ہیں کہ انسانی محبت کی ابتدا کبھی حقیقی معنی میں محبت نہیں ہوتی اور یہ حقیقت کا چولا اس وقت بدلتی ہے (یعنی یہ مادی محبت روحانیت اختیار کرتی ہے) جبکہ محبت ناکام و نامراد ہو۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟

بھائی جان آپ کا لہجہ انتہائی مایوسانہ معلوم ہوتا ہے جو آپ کی کسی خاص ذاتی ناکامی کی غمازی کرتا ہے۔ آپ کا یہ فیصلہ کہ ازدواج قاطع محبت ہے آپ کے خیال کے مطابق صحیح ہو تو ہو مگر یہ کوئی قانون نہیں کہا جا سکتا۔ پہلے تو آپ کو یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ محبت اصل میں جنس کی لطیف اکساہٹ کا دوسرا نام ہے اور جنس کا مقصد دو جسموں کا اتصال ہے اس لئے محبت بغیر شادی کے کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بلکہ محبت میں ناکامی کے بعد فریقین میں ایک قسم کی مایوسی اور ذہنی انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک ماہر جنسیات کا کہنا ہے" ——
شادی کے روپ میں محبت کی تکمیل افراد کی قلبی خلش پر مرہم کا کام کرتی ہے اور اس طرح ان کی زندگی میں ایک لطافت اور سرشاری پیدا ہو جاتی ہے۔ فریقین میں ایک دوسرے سے ہمدردی، رواداری، سپردگی اور خود فراموشی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی خامیوں اور عیوب کو نظر انداز کر کے ایک مشترک مقصد کے لئے جدوجہد کرنے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سچی محبت اسی وقت قایم ہوتی ہے جب دو محبت کرنے والے شادی کے لطیف بندھن میں بندھ کر ایک دوسرے میں جذب ہو کر ایک ہو جائیں اس کے بعد

فطرتاً دونوں میں سے خودی اور انانیت فنا ہوجاتی ہے اوران میں سے ہرایک اس اتحاد کے دوسرے نصف کی بہتری اورآرام کی کوشش کرنے لگتاہے اوراس طرح خوشیوں کی لین دین شروع ہوجایا کرتی ہے ــــ"

آپ کے سوال کا دوسرا حصہ ایک تخیل پرست نظریہ ہے تخیل پرست یا اذیت کوش مزاج کے لوگ محبت میں ناکامی کی کسک سے لذت حاصل کرتے ہیں۔ بہرحال یہ اپنی اپنی پسند ہے۔ بعض لوگ ایک مقصد کو حاصل کرنے کے بعد ہی خوشی محسوس کرتے ہیں اور برخلاف اس کے بعض اپنے مقصد میں ناکام رہنے کے بعد اس پر تاسف اور ملال میں لذت پاتے ہیں۔ محبت کی ناکامی سے لطف اندوز ہونے والا شخص وہ ہوتاہے جو یا تو محبت کے بعد شادی کی ذمہ داریوں سے ہراساں ہوتاہے یا جس میں انانیت زیادہ ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ خود کو دوسرے کے سپرد کرتے ہوئے ایک قسم کی شکست محسوس کرتاہے اس لئے وہ ناکامی سے محظوظ ہوتا رہتاہے کیونکہ جذبات کی رو میں بہہ کر وہ محبت میں گرفتار تو ہوجاتاہے مگر خود کو دوسرے کے سپرد نہیں کرپاتا۔ ایسے مسئلوں کے لئے ــــــــ کوئی اٹل قانون بنادینا محال ہے کیونکہ یہ شخصی رجحانات ہیں اور شخصیتیں ہمیشہ مختلف ہوتی ہیں۔

جی۔ ایچ۔ پی، کراچی

میرا خیال ہے اگر کوئی شخص کسی سے بھی محبت کرے تو اس کا اثر دوسرے پر کبھی نہ کبھی ہو کر رہے گا اور وہ قدرتی طور پر اس کے متعلق سوچنے کے لئے مجبور ہوگا۔ لیکن میری ایک سہیلی ہیں ان کا خیال ہے کہ ــ دوسرے شخص کو قدرتی طور پر اُنس ہوجائے تو ہوجائے مگر یہ لازمی نہیں کہ ایک کو محبت ہے تو دوسرے کو بھی ضرور ہونی چاہیئے۔ لیکن میرے خیال میں اگر کوئی سچی محبت کرے تو اس کی کشش کبھی ضرور اسے اپنی طرف کھینچ سکے گی۔ آپ واضح طور پر بیان فرما کر ہماری الجھنوں کو دور سا کیجئے۔

محترمہ آپ کا بھی خیال ٹھیک ہے اور آپ کی سہیلی کا بھی۔ آپ متعجب ضرور ہوں گی مگر حقیقت یہی ہے آپ دونوں کے نظریے ٹھیک مگر ہرایک کی کچھ شرائط ہیں۔ یہ کوئی بتانے کی بات نہیں مگر ہر باشعور انسان جانتاہے کہ مختلف جنس کی طرف کشش اور محبت ایک فطری امر جذبہ ہے۔ یہ بھی شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ محبت قربت اور ہمدردی کے اظہار سے بڑھتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کی صحبت میں اکثر اٹھتا بیٹھتاہے تو وہ فطری طور پر اس شخص کی طرف جلد مائل ہوتاہے جس کے اعمال یا گفتار سے اس کے لئے ہمدردی اور محبت ظاہر ہوتی ہو۔ مگر فرض کیجئے کہ ایک لڑکی یہاں بیٹھے بیٹھے شاہ ایران کی خیالی محبت میں گرفتار ہوجائے اور اپنے جذبۂ صادق کا جواب چاہے تو یہ اس کی خام خیالی ہوگی۔ جب تک ایک فرد اپنے اعمال گفتار اور جذبات سے دوسرے پر محبت کا ہمدردی کا اظہار نہ کرے اس کے التفات کی توقع کرنا اس پر ظلم کرناہے۔ آپ کی سہیلی اس حد تک صحیح ہیں کہ واقعی یہ تو ممکن نہیں کہ ایک جس کو چاہے منتخب کرلے۔ فرض کیجئے کوئی شخص پہلے ہی سے کسی کی طرف مائل ہے اب آپ لاکھ کوشش کریں آپ کی تمام محنت رائیگاں جائے گی بقول آپ کی سہیلی کے "دوسرے شخص کو قدرتی طور پر اُنس ہوجائے تو ہوجائے مگر یہ لازمی نہیں کہ ایک کو محبت ہے تو دوسرے کو بھی ہوجائے۔" چونکہ یہ ایک ذاتی سا سوال ہے اس لئے آپ خود ہی تمام متذکرہ بالا واقعات کی روشنی میں کوئی رائے قایم کرسکتی ہیں ہم تو صرف مسئلوں پر روشنی ڈال سکتے ہیں شاید آپ ہی کے خیال کی تائید میں جگر نے کچھ عرصے پہلے یہ شعر کہا تھا۔

محبت اثر کرتی ہے چپکے چپکے
محبت کی خاموش چنگاریاں ہیں

اے۔ اے۔ جگنا، کراچی

میری طبیعت عجیب قسم کی ہے۔ بعض اوقات میں اس قدر رنجیدہ بن جاتا ہوں یعنی حد سے زیادہ چھیڑ دیں کو بیٹھتا ہوں۔ بعد میں خود بھی برا محسوس کرتا ہوں اور

بعض اوقات اس قدر سنجیدہ ہو جایا کرتا ہوں کہ میرے دوست احباب بھی تنگ آجاتے ہیں ۔ زیادہ تر خاموش رہتا ہوں .... بہن بھائیوں کو چھوڑ کر تین دوست ہیں ۔ یہی میری دنیا ہے ۔ اسی میں خوش اور مگن ہوں ۔ ان ہی سے چھچھور پن کر بیٹھتا ہوں اور ان ہی سے سنجیدہ بن جاتا ہوں ۔ میں خود بھی نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہوا کرتا ہے ۔ برائے کرم نفسیات سے بتلایئے کہ مجھے یہ کیا بیماری ہے اور اس کا کیا علاج ہے ۔

آپ مطمئن رہیئے کہ آپ کو کوئی مرض یا بیماری نہیں ہے ۔ کیونکہ ہر انسان کی شخصیت میں دو خصلتیں بروئے کار آتی رہتی ہیں ایک Self Assertion یا خود ادعائی اور دوسری Submission یا تسلیم کی خو Submission کے زیر تحت انسان خوش مسرور اور دوسروں پر رعب جمانے کی کوشش کرتا ہے یعنی وہ اپنی شخصیت کی اہمیت کا اظہار اس طرح کرتا ہے ۔ اکثر ان باتوں میں وہی حرکتیں کر جاتا ہے جو بچوں کی طرح کی ہوتی ہیں اور جسے آپ چھچھورا پن کہتے ہیں ۔ برخلاف اس کے Submission کے دوران میں انسان مایوس خاموش انتہائی پسند اور قدرے سنجیدہ نظر آنے لگتا ہے ۔ اس میں سے چستی ختم ہو جاتی ہے اور طبیعت گراں محسوس ہونے لگتی ہے جس کی وجہ سے ایسا شخص خود کو مریض سمجھنے لگتا ہے ۔ یہ ضرور دھیان میں رکھنا چاہیئے کہ ان دونوں اوصاف کے اظہار کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے ۔ یعنی اگر بیٹھے بیٹھے مغموم ہو جاتے ہیں تو ضرور کوئی خیال ہمارے شعور پر ایسا آیا تھا جو اپنے پیچھے ہمارے ذہن پر مایوسی اور اداسی کی گرد چھوڑ گیا گو یہ ممکن ہے کہ ہم وہ خیال بھول گئے ہوں ۔ مختصر کہ مینیا Mania اور مالیخولیا ——— الا ہی دونوں خصائل کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں جو ان میں توازن بگڑ جانے سے رونما ہوتی ہیں ۔

رئیسہ خاور کراچی

میری ایک بچی کو عجیب خبط ہے ۔ دن میں لاتعداد مرتبہ اپنے ہاتھ دھوتی ہیں ، اور پھر بھی مطمئن نہیں ہوتیں کھانا کھانے سے پہلے نہ معلوم کتنی دفعہ یہی حرکت کرتی ہیں اور لطف یہ ہے کہ ہر دفعہ یہ حرکت اس اہتمام سے کی جاتی ہے گویا ان کے ہاتھوں میں بہت غلاظت لگی ہو ۔ ٹوکنے پر بھی یہی کہتی ہیں کہ بہت دیر سے ہاتھ نہیں دھوئے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو وقت کا احساس نہیں ۔ یہ خبط کیسے پیدا ہوتا ہے اور اس کا کچھ علاج بھی ہے ؟ براہ کرم جواب سے سرفراز فرمایئے ۔ مشکور رہوں گی ۔

۲ ۔ یہ کیا بات ہے کہ مجھے اپنے صاحب کے وجود سے اتنی مسرت نہیں ہوتی جتنی کہ ان کی چند چیزوں سے تسکین ہوتی ہے ۔ مثلاً اگر وہ رومال چھوڑ جائیں تو اسے بہت حفاظت سے رکھ لیتی ہوں بلکہ بعض دفعہ تو چرا لیتی ہوں ۔ مجھے ان کی چیزوں کی قربت سے بہت تسکین اور خوشی ملتی ہے ۔ حد ہے کہ بعض دفعہ تو حرکت مضحکہ خیز ہو جاتی ہے یعنی ان کی پھینکی ہوئی سگریٹ کی خالی ڈبیہ تک میں بہت حفاظت سے رکھتی ہوں اور اگر کوئی بچہ ان خالی ڈبیوں میں سے کوئی لے لیتا ہے تو مجھے بہت ملال ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا کوئی قیمتی سرمایہ مجھ سے چھین لیا گیا ہو ۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اور میں کوشش کے بعد بھی یہ عادت کیوں نہیں چھوڑ پاتی ۔

اس عجیب خبط کو نفسیاتی زبان میں Washing Mania یا طہارتی جنون کہتے ہیں ۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ایسے مریضوں میں یا تو کوئی ایسی کریہہ اور غلیظ عادت موجود ہوتی ہے جو ہمارے اخلاقی معیار سے بہت پست ہوتی ہیں ۔ یا اس کے لاشعور میں کوئی ایسا ہی واقعہ چھپا ہوتا ہے ۔ اس طرح ان کے اندر خود بخود ایک احساس نجاست اور تاسف چھایا رہتا ہے جس کے اعادے کے طور پر وہ ان کو اپنے یا تی بار بار دھوتے ہیں اور اس طرح دھونے کے اشاریتی تصور سے اپنی اخلاقی گندگی طہارت کرنا چاہتے ہیں ۔ آپ کی بچی سے بھی وابستہ کوئی ایسا ہی واقعہ ہوگا جو ان کو اس فعل پر مجبور کرتا رہتا ہے ۔ وہ کوشش کے بعد بھی اس کو نہیں چھوڑ سکیں گی ۔ اس کا علاج یہ ہے کہ وہ واقعہ ان کے لاشعور سے ٹٹول کر ان کے شعور پر لایا جائے اس کے

بعد یہ عادت خود بخود غائب ہو جائے گی۔ لاشعور کی کرید کے لئے تجزیہ نفس کی ضرورت ہے۔

خیریت ہے کہ آپ کو رومال وغیرہ سے مسرت اور تسکین ہی ملتی ہے۔ جب اس اشیاء پرستی سے جنسی حظ ملنے لگتا ہے تو یہ ایک قسم کا مرض ہو جاتا ہے جس کو FETCHISM کہتے ہیں۔ ایک حد تک ہر فرد اشیاء پرستی کا شکار ہوتا ہے کیونکہ بچپنے سے ہمیں چیزوں سے لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس مرض کی ذمہ داری بہت حد تک بچپن کی فراموش کردہ یادوں پر ہوتی ہے۔ یہ اشیاء پرستی خورد سالی کی اُن پسندیدہ چیزوں کا اظہار کرتی ہے۔ جن سے ہمیں جذباتی دلچسپی رہ چکی ہو اس لئے لاشعوری طور پر ہم مختلف الجنس کی ان ہی چیزوں کو پسند کرتے ہیں۔ جو ہمارے والدین سے منسوب رہ چکی ہوں۔ اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ وہ لڑکی جس کو بچپن میں اپنے بھائی یا والد کے رومالوں سے جذباتی لگاؤ پیدا ہوتا ہو۔ بڑی ہو کر بھی اپنے محبوب کے رومال یا اسی ضمن کی دوسری چیزوں سے مسرت حاصل کرے گی۔ یہ شاہراہ سے ہٹ کر پگڈنڈی پر آ جاتا ہے جس میں طبعی جنسی مقصود کی جگہ کوئی اور چیز لے لیتی ہے۔

عزیز احمد لاہو۔

آپ نے اپنے رسالے میں جنسیات کا جو اضافہ فرمایا ہے۔ وہ اضافہ کے باوجود ناکافی ہے۔ اور کچھ مزید اضافہ کریں گے؟

موجودہ حالت میں اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ یوں ہی ہم سے بہت سے بزرگ "خفا" ہیں ـــ اور اب ضرورت بھی کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوتی جبکہ جنسیات کے موضوع پر اور اسی نام سے مستقلاً ایک رسالہ کراچی سے نکل رہا ہے۔

خمار کے بعد

غیاث الدین قریشی

خدا نے کسی گناہِ عظیم کی پاداش میں
اے لیبیلے! میری روح کی گہرائیوں میں تیری محبت پیدا کی
جس کے ہنگامہ خیز مدوجزر میں میرا سکون بہہ گیا
کسی سہانی صبح کو جب میں کہیں سرسبز درختوں کے نیچے سے گذرتا... تو
شبنم کے قطرے ہری بھری پتیوں سے گر گر
میرے حال پر آنسو بہاتے
کائنات پر اداسی چھاتی
روز اسی طرح سورج سیاہ نقاب سے چہرہ نکالتا اور افق کی سیاہی پھر اس کو اپنی آغوش میں چھپا لیتی۔
میں گم کردہ منزل اور بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح اپنی منزل کی تلاش میں سرگرم تجسس تھا مگر میری منزل محبت ....
ایک روٹھے ہوئے غافل محبوب کی طرح .....
دور ..... اور بہت دور تھی ـــ نگاہوں کی ویرانی
مایوسیوں کا مسکن بن گئی ـــ وقت نے ٹھوکر لگائی
مجھے میرے خمار آلود تخیل کی حسین دنیا سے نکال کر کارگہِ حقیقت میں پہنچایا ـــ میں نے تیرا پُر فریب چہرہ دیکھا
مجھے اپنی گمشدگی کا احساس ہوا
منزل نظر آئی ـــ میں اسکی طرف دیوانہ وار بھاگا اور
تو نے پھر میری راہ میں ہر گام پر جال بچھائے۔ لیکن بے سود بیکار
تیرا حسین طلسم ٹوٹ چکا۔ سراب کی حقیقت عیاں ہو چکی
اب میں اپنی منزل کے قریب پہنچ چکا ہوں
میری منزل میرے خیر مقدم کے لئے۔
ایک حسین دوشیزہ کی طرح خود مضطرب ہے
دور ہو جا۔ اے حسین رہزن ہوش وحواس کی یاد دُور ہو جا
کہ اب تیرے دھوکے سے نقوش بھی ـــ میرے لئے روحانی اذیت

مِلہ ناگ دیوی

جنسیات
جواب الجواب

مَرد جَب شادی کرتاھے

مسز محمودہ نسرین (ایم اے)

جون کا "سائیکولوجی" پیش نظر ہے - غوری صاحب کے بپھرے ہوئے تیور ان کی تحریر سے جھلک رہے ہیں - اخلاقی فرض کی بنا پر جواب لکھ رہی ہوں - اپنے مضمون کے سلسلے میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ " روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُو سیاہ" —— اور نہ میرا وُ نقطۂ نگاہ تھا جو غوری صاحب سمجھ بیٹھے —— " برق چمکی تھی کدھر اور کدھر آگ لگی" ——

ناظرین نے میرا مضمون پڑھ کر بہرحال یہ اندازہ ضرور لگا لیا ہوگا کہ میں کس چیز پر زور دے رہی تھی - میرا مطلب صرف اتنا تھا کہ مرد چونکہ جنسی حیثیت سے جارحانہ صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے اس لئے وہ اپنی شریک حیات کے جنسی احساسات کا خیال کئے بغیر اپنی خواہشات کی تکمیل کرتا رہتا ہے - جس کی وجہ سے میاں بیوی کا یہ فطری رشتہ یک طرفہ کھیل کی طرح ہو کر رہ جاتا ہے - جس میں دوسری ٹیم بالکل بے دلی سے کھیل کی تکمیل کرتی ہے - مگر ہمارے غوری صاحب نہ معلوم غنودگی کے عالم میں یا اور کسی جذبہ کے ماتحت جانے کیا سمجھے حالانکہ میں نے اردو کی کوئی ثقیل قسم کی نہ لکھی تھی - وہ یہ سمجھے کہ میں مردوں پر ہوسناکی کا الزام لگا رہی ہوں جس کے ردعمل کے طور پر انہوں نے عورتوں پر بھی ہوسناک ہونے کا جرم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے - میرے وہ الفاظ جو غوری صاحب نے اپنے مضمون میں دہرائے ہیں شاید ان کو بہت برے معلوم ہوئے ہیں مگر میں کیا کروں کہ اصل حقیقت بھی یہی ہے - ان باتوں کو بے بنیاد' حیوانیت سے مشابہ اور اشرف المخلوقات کی توہین سمجھنا صرف ایک آدرشی سی چیز ہے - کاش میں تمام وہ کیس غوری صاحب کو دکھا سکتی جو میری نظر سے گذرے ہیں - یہ سُن کر شاید مخاطب کو تعجب ہوگا کہ وہ الفاظ جسے سن کر وہ پھڑک اٹھے ہیں میرے نہیں بلکہ میری ایک مریضہ کے ہیں اپنے مریضوں کے نام دیتے میں اخلاقی بندش کی وجہ سے نہیں بتا سکتی ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ کیسے کیسے پڑھے لکھے لوگ' اشرف المخلوقات ہونے پر نازاں مرد ان ہی حیوانی حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں - وہ نہیں جانتے کہ ان کی شریک حیات ان کی اس پیش قدمی کو نہیں سراہ رہی ہے مگر وہ ہیں کہ صرف اپنی اکساہٹ پر اپنی عورت کو تنگ کئے جاتے ہیں -

طلاق اور شادی کا کوئی سوال ہی میرے مضمون میں نہ تھا - میں جانتی ہوں کہ مغربی ممالک میں عورتیں مردوں سے جلد جلد طلاقیں لیتی ہیں مگر یہ بھی حقیقت پوشیدہ نہیں کہ طلاق نامے کی روشنائی خشک ہونے سے پہلے ہی مرد بھی دوسری شریک زندگی منتخب کر لیتا ہے - یہ تو ایک بالکل بے اصولی سی بحث غوری صاحب نے چھیڑ دی کیونکہ شادی طلاق انسان کے جنسی پہلو کی کڑیاں ہیں اور میں اس بات سے کبھی منکر نہیں ہوئی کہ عورت یا مرد کسی ایک میں بھی جنسی تحریک کا فقدان ہے

غوری صاحب یہ الفاظ لکھتے ہوئے " میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ لڑکیاں جو شادی سے پہلے اپنی سہیلیوں سے ایک لمحہ کے لئے الگ نہ ہوتی تھیں . . . - شادی کے بعد انہیں ایسا بھول گئیں جیسے وہ ان کی زندگی میں کبھی داخل نہ ہوئی ہوں - " پھر بہک گئے

اور دوسرے ہی سانس میں ان ہی مردود لڑکیوں کی وکالت بھی فرما گئے یعنی "جب وہ بھرپور جوانیاں (واضح رہے کہ اس میں ایک عورت بھی گی تھی ہیں) تو وہ دنیا اور مافیہا کو بھول جاتی ہیں ــــ" کیا شادی کے بعد لڑکے اپنی خارجی دلچسپیوں میں کمی نہیں کر دیتے ؟ ــ شادی کے بعد مریضانہ حد تک سینما دیکھنا، پھر فرصت پر پکنگ میں جانا ان تمام تفریحات میں تخفیف نہیں ہو جاتی کیا ؟ پھر غوری صاحب کا کیا مطلب تھا۔ شادی کے بعد یہ دونوں کا فرض ہے کہ وہ خارجی دلچسپیوں کو کم کریں تاکہ خانگی زندگی خوشگوار ہو سکے ۔

ـــــــــــ اور سنئے ۔ آپ کو سنبھالئے ۔ گویا انسان کی نشو نما کی ذمہ داری جنسی تحریک پر ہے ۔ لڑکیاں اگر جلد بالغ ہو جاتی ہیں تو اسکی وجہ غوری صاحب کی نظر میں یہ ہے کہ عورتوں میں جنسی تحریک شدید ہوتی ہے حالانکہ آغاز میں آپ خود فرما چکے ہیں کہ "مجھے اس کے اعتراف میں مطلق انکار نہیں کہ مرد میں جنسی میلان شدت سے ہوتا ہے ــــ" میں غوری صاحب سے سفارش کروں گی کہ اگر وہ عورتوں کے جلد بالغ ہونے کی وجہ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو کسی علم الاجسام کی کتاب کی ورق گردانی کریں یہ اس صدی کی بات نہیں بلکہ جب سے کائنات پیدا ہوئی ہے عورت مرد سے پہلے بالغ ہوتی رہی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً بیوی کی عمر میاں سے کم ہوتی ہے ۔ کیا غوری صاحب کسی صدی کی کوئی مثال بتا سکتے ہیں ۔ جب کہ مرد عورت سے پہلے بالغ ہوتا تھا ۔ عموماً لڑکیاں لڑکوں سے پہلے بات کرنا شروع کر دیتی ہیں ۔ عورت مرد سے پہلے اس لئے بالغ ہوتی ہے اس کا عصبی نظام Nervous System اور دوسرے نظام بہت حساس اور پیچیدہ ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ عورت کے اندر مرد سے زیادہ عضو اور مرد سے زیادہ پیچیدہ نظام ہوتے ہیں اس لئے اسے زیادہ قوت اور ذکی الحس نظام کی ضرورت ہوتی ہے ۔ مثلاً سنیہ، بچہ دانی اور اندرونی اعضا وغیرہ ۔

ـــــــــــ " عورت تنگ، باریک، اور نیم عریاں لباس کیوں زیب تن کرتی ہے "ـــــ اسی لئے جس لئے مرد بازوؤں تک آستینیں چڑھائے رکھ کر اپنے سڈول شانوں کا مظاہرہ کرتا ہے، گریبان کے بٹن کھلے رکھ کر اپنے چوڑے چکلے سینے کی نمائش کرتا ہے ۔ یہ بھی اسی لئے کہ وہ اپنی جنسی میلان کو اپنے مخصوص اعضا کی نمائش کر کے آسودگی دے" ــ یہ میں نے کبھی نہیں کہا کہ عورت میں جنس کا فقدان ہوتا ہے اگر ایسا ہو تو عورت گوشت پوست کا ایک لوتھڑا ہو کر رہ جائے ۔ رونا تو اسی بات کا ہے کہ مرد عورت کو لوتھڑے سے زیادہ خیال نہیں کرتا۔ (واضح رہے کہ یہاں میری مراد ان مردوں سے ہے جو یکطرفہ کھیل کے عادی ہیں) یہی میرا مرکزی خیال تھا جس کی تصدیق میں اپنے گذشتہ مضمون کے الفاظ سے کرتی ہوں "اگر مرد چاہتا ہے کہ وہ ازدواجی زندگی آرام سے گذارے ۔ اپنی حسب خواہش اولادیں پیدا کریں اور ہر وقت بیوی کا چہرہ کنول کی طرح مسکراتا رہے تو اسے عورت کو سمجھنے کی ضرورت ہے ۔ اس کی جنسی تحریک کو جاننے کی ضرورت ہے اور وہ تمام کی تمام باتیں بہت آسانی سے جان سکتا ہے اگر وہ عورت کو محض لوتھڑا (یہ میں اب بڑھا رہی ہوں) اور اپنی "لذت" کا ذریعہ نہ سمجھے اور جنسی فعل کو "وحشت" دور کرنے کے لئے وقف نہ کر دے ــ"

ہیولک ایلس Havelock Ellis کے مطابق عورت مفعول کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے جنسی کیفیت مرد کی گرفت میں محسوس ہوتی ہے بالفاظ دیگر وہ جنسی حیثیت سے مرد کی زیردست رہنا چاہتی ہے مگر اس کے باوجود ڈاکٹر ماری اسٹوپس Dr. Marie Stopes کے الفاظ ضرور ذہن نشین رکھنا چاہیئے "اس کی وضاحت ضروری ہے کہ مرد عورت کو اپنی ساری زندگی میں صرف ایک دفعہ مانوس نہ کرے بلکہ ہر مرتبہ جب بھی وہ جنسی تحریک محسوس کرے اسے عورت کو مانوس کرنا چاہیئے ۔ مرد نے اپنی خودداری اور عورت کی طرف سے روایتی تغافل کی وجہ سے اپنی شریک حیات کی محبت کو اکثر پامال کیا ہے اسی لئے اکثر مرد اپنی عورتوں سے تمام رعنائیوں کے اضمحلال کے ذمہ دار ہوتے ہیں جس کا تاسف انہیں بہرحال ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی شریک زندگی میں رومان، حسن، اور ایک رومانی لگاؤ کی کمی محسوس کرتے ہیں جو دونوں کے رومانی اتحاد کے لئے ضروری ہے ۔ اصل وجہ سے ناآشنا ہو کر وہ عورت پر بے حسی اور بانجھ ہونے کا الزام لگاتے ہیں حالانکہ عورت کی بے حسی

کا اصل سبب خود ان کی جنسی علم سے لاعلمی ہے

یہاں ولیم فیلڈنگ William J. Fielding کے الفاظ رقم کر دینا سودمند ہوگا یعنی " یہ ضروری ہے کہ مرد اپنے جیون ساتھی پر بغیر اس کے رضامندی کے جنسی طور پر "حملہ آور" نہ ہو کیونکہ عورت اور مرد دونوں میں جنسی میلان ہمیشہ ایک سا نہیں ہوتا۔ جیسے میں بعض دنوں میں عورت کا جنسی میلان بہت پست ہو جاتا ہے اسی وجہ سے ان ایام میں عورت کی جنسی تحریک سے بیزاری ہونے لگتی ہے اور مرد کا جارحانہ رویہ اس کے دل میں نفرت اور حقارت کو جنم دیدیتا ہے —"

ڈاکٹر گے لووے Dr. T. W. Galloway تو یہاں تک کہتا ہے کہ " صرف انسان ہی نہیں بلکہ جانور تک ہر جنسی فعل سے پہلے اپنی مادہ کو طرح طرح کی عجیب حرکتوں اور گانوں سے مانوس کرتے ہیں۔ اس کی اہمیت اس لئے ہے کہ ایسا کرنے سے فریقین جسمانی اور نفسیاتی حیثیت سے جنسی اتحاد کے طرف مائل ہو جاتے ہیں جو محبت اور آسودگی کی معراج ہے —"

بہرحال مختصر یہ کہ غوری صاحب سے استدعا کروں گی کہ وہ پہلے راقم کے نقطہ نظر کو سمجھا کریں اور اعتراض بعد میں تو بہتر ہوگا کیونکہ بحث وغیرہ میں الجھکر انسان تعمیری پہلو نظر انداز کر جاتا ہے۔ ہمارا مقصد گمراہوں کو راہ راست پہ لانا ہے نہ کہ کسی کی دلآزاری یا ہتک کرنا اور غوری صاحب کی یہ کیفیت ہے کہ " آ بیل مجھے مار " — آخر میں میں ایڈیٹر صاحب سے بھی گزارش کروں گی کہ وہ اپنے پرچے کو مباحث کا اکھاڑا نہ بنائیں۔

— جا ... — ... — بہیوٹی — ...

عزم میرٹھی

زندہ دلی (ایک نسخہ)

کتاب تحفہ دی جس پر لکھا تھا۔

To my

حکیم ہوش سے ہو کر ملاقی
کہا میں نے کہ ہوں بیمار و مضطر
سمائی رہتی ہے پیروں میں یخ سی
بنا رہتا ہے جو الم مرا
طبیعت میں مری رہتی ہے پستی
اُداسی کی گھٹا رہتی ہے
تخیل پر ہے پیہم خوف طاری
کہ تنکا دوڑتا ہے
یہ دنیا ہے مری نظروں میں سُونی
مجھے بھاتا نہیں
نراش و یاس سے ہے ہمسفیری
میں ہوں گم
اجیرن ہو رہی ہے زندگانی
معاذ اللہ
سنبھل بیٹھے یہ سن کر حضرتِ ہوش
پڑھا چہرہ
تلاشی لی مرے قلبِ حزیں کی
ٹیلا لگو
یہ فرمایا بآہِ غمگساری
مرض کچھ
سمجھ کا پھیر ہے لیکن تمہاری
لئے رہتے
یہ ہے " زندہ دلی " کا آبگینہ
غبار آلود

ہوئے ہاتھ کو نہ تھاما۔ وہ مایوس ہو گیا۔ دل ٹوٹ

آتا مجھ سے نظریں نہ ملائے ہوئے بھی مجھے دیکھ کر

میرے ابا امی ست رہے جہاں وہ پریشان تھے وہاں ہم خوش چند روز بعد

گھر نہ لوٹوں گا تمہیں ہوتے ہوئے نہ پانا میرے لئے موت سے

در گزر کرتا رہوں گا۔ کاش تم مجھے سمجھتیں مرنے سے پہلے تمہارے سامنے

رہوں میں جانتا ہوں تم مجھے یاد کرو گی مگر افسوس میں اس وقت

میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

سوٹ پہننا صرف نفاست پسندی کا نتیجہ تھا۔ میں نے تمہاری محبت

" رہو تم ہر گھڑی ہشاش و بشاش مگر افسوس تمہیں نہ بھلا سکا۔

عمل کے بعد دیکھو اس کے جوہر نزدیک والے باغ میں بیٹھا رہا اور آنسو بہاتا رہا۔ میری محبت

مستقل عنوان

بھولوں کیسے

لیجئے ــــــــ اپنے ساتھیوں کی زندگی کے ناقابل فراموش واقعات
پڑھیے آپ بھی اپنی زندگی کے ایسے حادثے لکھکر بھیجئے ــــــــ جن کو آپ
بھول نہ سکتے ہوں ــــــــ دوسروں کو سُنانے سے دل کا بوجھ
ہلکا ہوتا ہے ــــــــ اور باہمی موافقت بڑھتی ہے ــــــــ ادارہ

جمیلہ فردوس سی پی کیئر سیٹلائٹ ٹاؤن۔ کراچی

چونکہ عورت کے اندر مرد سے زیادہ عضو اور مرد سے زیادہ
ہوتی ہے ۔ مثلاً سینہ، بچہ دانی اور اندرونی اعضا وغیرہ
ــــــــ " عورت تنگ، باریک، اس
آستینیں چڑھائے رکھ کر اپنے سڈول شانوں کا مظاہرہ
اسی لئے کہ وہ اپنی جنسی میلان کو اپنے مخصوص اعضاء کی نمائش مرکز رہ جاتی ہے ۔
اگر ایسا ہو تو عورت گوشت پوست کا ایک لوتھڑا ہو کر رہ جائے ۔
روا ضح رہے کہ یہاں میری مراد ان مردوں سے ہے جو یکطرفہ کھیل کے عادی
کے الفاظ سے کرتی ہوں
اور ہر وقت بیوی کا چہرہ کنول کی طرح مسکراتا رہے تو اسے عورت کو سمجھنے کی ضرورت
تمام کی تمام باتیں بہت آسانی سے جان سکتا ہے اگر وہ عورت کو محض لوتھڑا
اور جنسی فعل کو " وحشت " دور کرنے کے لئے وقف نہ کر دے ــــ "
ہیولک ایلس Havelock Ellis کے مطابق عورت مفعول کی حیثیت
ہوتی ہے بالفاظ دیگر وہ جنسی حیثیت سے مرد کی زیردست رہنا چاہتی ہے مگر اس کے
کے الفاظ ضرور ذہن نشین رکھنا چاہیئے " اس کی وضاحت ضروری ہے کہ مرد عورت
بلکہ ہر مرتبہ جب بھی وہ جنسی تحریک محسوس کرے اسے عورت کو مانوس کرنا چاہیئے ۔
کی وجہ سے اپنی شریک حیات کی محبت کو اکثر پامال کیا ہے اسی لئے اکثر مرد اپنی عورتوں
بیں جن کا تاسف انہیں بہرحال ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی شریک زندگی میں رومانی، ...
کے رومانی اتحاد کے لئے ضروری ہے ۔ اصل وجہ سے نا آشنا ہو کر وہ عورت پر بے

ایک خاص مدت کا نام ہے ۔ ہماری اس مختصر سی زندگی میں بعض اس قسم کے واقعات بھی
سکتے اور یہی واقعات ہیں جو اکثر ہماری روح کو تڑپاتے ہیں ۔ باوجود کوشش کے ہم بھول
واقعات سے بے خبر ہو کر موجودہ دورِ زندگی میں مصروفِ عمل ہو جاتے ہیں مگر اچانک ہی ڈ
میری زندگی بھی ایسے ہی حادثات زمانہ کی تباہ شدہ ایک زندگی ہے
رہ ایک جانی پہچانی سی خلش ہے جو مجھے پہروں رُلواتی ہے ۔ میں نے عرصہ ہوا
گی ۔ نجمی ایک مرد تھا جو فطرتاً غیور ہوا کرتے ہیں ۔
" اگر مرد چاہتا ہے کہ وہ ازدواجی زندگی کے لمحات کو ختم کر دیتا ہے یا زندگی بھر کے لئے تڑپتا رہتا ہے
شانوں پر پریشان ہو جائیں وہ ہمیشہ انُ ہی کا رہتا ہے ۔ مگر
ر یہ پریشان ہونے بھی نہ پائی تھیں کہ اُس نے اپنا سب کچھ مجھے تصور
دلفریب بنگلہ میں دو خاندان آباد تھے میرا اور نجمی کا ہم کچھ پڑوسی
تھے میں بھی اس محاذ میں شریک ہی تھی ۔ نجمی مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا
مرد ساتھ ساتھ آوارہ بھی ۔ جب دیکھو کوٹ پتلون ڈاٹے
کی ٹائیوں سے چلتے تھے ۔ شوخ شوخ ٹائیاں ۔ مگر نجمی کی
سے مذاق کرنا اُسے چھیڑنا غرض ہنسنا اور ہنسانا اس کی زندگی تھی
لذتے گئے راتیں ختم ہوتی گئیں ۔ نجمی اب بہت لمبا سا ہو گیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں پیمانے ڈولنے لگے تھے بال پریشان رہنے لگے تھے۔ مگر نجمی بالکل نہ بدلا وہ ایک مرد تھا۔ غیرور مرد۔ کرکٹ کھیلتا تھا۔ مگر ہم سب کو اس سے نفرت تھی وہ قطعاً جذباتی نہ تھا۔ باتوں میں ایسے ایسے تیر چلاتا کہ کلیجہ چھلنی ہوجاتا اور خود مسکراتا رہتا۔ دن بھر وہ اپنے ابا کی موٹر گھمائے پھرتا بالکل آوارہ تھا نجمی

ایک روز وہ میرے قریب آیا اور بولا "میرے چاند: میں خاموش رہا مگر اب میں تمہیں بتائے بغیر نہ رہ سکوں گا میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" میں جھلا اٹھی اور چلی آئی۔ نجمی اور مجھ سے محبت کرے۔ آوارہ نجمی۔

مجھے بھائی جان اور دولھا بھائی کی آوازیں کان پڑنے لگیں۔ ارے بھئی اسلم وہ نجمی صاحب آج ہوٹل سے نکل رہے تھے۔ "خیر تو ہے" بھیا بولے۔ "اجی کیا جانے پیتا ویتا ہوگا۔ میرے کان پھٹ نکلے اور میں نے تہیہ کرلیا نجمی جیسے بدمعاش کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دوں گی اپنی زندگی تباہ نہ کروں گی۔

دن بیتتے گئے میں نے نجمی سے بولنا قطعاً بند کردیا بیچارہ نجمی۔ کئی بار اس نے کوشش کی کہ مجھے حالِ دل سنائے مگر میں نے موقع ہی نہ دیا۔ اس کے پرچے بغیر پڑھے پھاڑ کر چولہے میں ڈال دیتے۔ نجمی کچھ پریشان رہنے لگا۔ راتوں کو دیر گئے لوٹتا۔ اس کے شوخ گانوں کی جگہ دردبھرے نغموں نے لے لی۔ میں اکثر اپنے کئے پر کانپ اٹھتی۔

پھر جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ نجمی نے سعیدہ سے راہ و رسم پیدا کرلی تو میں اور بھی آگ بگولہ ہوگئی۔ بے وفا نجمی جھوٹا کہیں کا۔ نجمی کھویا کھویا سا رہتا اس نے سعیدہ کو بھی چھوڑ دیا نجمی نے پھر میری طرف رجوع کیا اس نے مجھے ایک کتاب تحفہ دی جس پر لکھا تھا۔

To my Jamila Firdos.

میرا نام جمیلہ بیگم تھا مگر اس نے مجھے فردوس کا لقب دیا میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نہ تھاما۔ وہ مایوس ہوگیا۔ دل ٹوٹ گیا اس کی خودداری کو ٹھیس لگی وہ مجھ سے روٹھ گیا گھر سے اکثر غائب رہنے لگا۔ جب آتا مجھ سے نظریں نہ ملاتے ہوئے بھی مجھے دیکھ دیکھ کر کڑھتا اور میں خوش ہوتی۔ آخر ایک روز نجمی چلا گیا۔ گھر میں کہرام مچ گیا اسکے ابا امی بہت روئے جہاں وہ پریشان تھے وہاں ہم خوش چند روز بعد مجھے نجمی کا خط ملا جس میں لکھا تھا۔

فردوس۔

سلامِ شوق۔

تم خوش ہوگی کہ میں اب گھر نہ لوٹوں گا تمہیں ہوتے ہوئے نہ پانا میرے لئے موت سے کم نہ تھا۔ میں نے تم سے محبت کی اور کرتا رہوں گا۔ کاش تم مجھے سمجھتیں مرنے سے پہلے تمہاری سائے اپنے جرموں کی معافی مانگ لینا چاہتا ہوں میں جانتا ہوں تم مجھے یاد کروگی مگر افسوس میں اس وقت یہ کہنے کے لئے بھی نہ ہونگا ؎

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

میرا ہوٹلوں میں گھومنا اچھے سوٹ پہننا صرف نفاست پسندی کا نتیجہ تھا۔ میں نے تمہاری محبت کا غم غلط کرنے کو سعیدہ سے پیار کیا مگر افسوس تمہیں نہ بھلا سکا۔

تمہاری یاد میں پہروں اپنے قریب والے باغ میں بیٹھا رہا اور آنسو بہاتا رہا۔ میری محبت

میں دوام ہے ناپائیداری نہیں ۔ میں اب بھی تم سے محبت کرتا ہوں تم روز میرے تخیل میں آتی ہو ۔
گر ہو سکے تو کبھی باغ میں چلی جانا ۔

آخری سلام قبول ہو

تمہارا ۔ نجمی

مجھے فرصت کہاں تھی جو باغ میں جاتی دولھا بھائی اور اسلم بھیا کی باتوں میں اُلجھاؤ محسوس کرتی رہی وہ بھی نجمی کے چلے جانے کو محسوس کرتے تھے ایک روز سعیدہ ملنے آئی وہ خلاف توقع بڑے خلوص سے ملی ۔ میں نے اس سے نجمی کے پیار کا قصہ چھیڑ دیا وہ مسکرا دی میں حیران رہ گئی کہ اللہ یہ ماجرا کیا ہے پھر بولی ؟ نجمی مجھ سے محبت نہیں کرتا تھا بلکہ میں اس سے محبت کرتی تھی کاش وہ فردوس کو بھول جاتا ۔ مجھ پہ بجلی گر گئی ۔ نجمی جس سے مجھے نفرت تھی میرے سامنے آگیا ۔ وہ اب بھی قہقہے لگا رہا تھا ۔ میرا مذاق اڑا رہا تھا ۔ میں اکثر باغ گئی وہاں جا بجا اپنا نام کھدا پایا نجمی میری رگ رگ میں بس گیا تھا ۔ مرد کس قدر جلد باز اور معمہ ہوتے ہیں

نجمی کو گئے ہوئے آج کئی برس بیت گئے اور میں اس کی راہ تک رہی ہوں اس کے وہ الفاظ مجھے آج بھی ستائے دیتے ہیں ۔ "فردوس تم میری زندگی ہو، میرا راگ ہو، میری روح ہو" میں نے سوائے نجمی کے اب کسی کی نہ ہونے کا عہد کر لیا ۔ کاش میرا نجمی مل جائے ۔ بغیر مرد کے عورت کی زندگی زندگی نہیں بلکہ زہر کا پیالہ ہے ۔ کاش میں نجمی کو سمجھ سکتی ۔ مرد کے جذبات کی قدر کر سکتی مگر اب تو نہ نجمی ہے نہ کوئی اور مرد ۔ مرد سنگدل ہوتے ہیں ۔ نجمی مجھے تڑپنے اور رُلانے کو چھوڑ گیا اور خود ہنس رہا ہوگا ۔ مگر یاد رکھو نجمی میں اب تمہاری ہوں ۔ صرف تمہاری ۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی ۔ اور بھولوں بھی تو کیسے بھولوں ۔

جنسیات
تیسری کڑی

والدین پوچھتے ہیں

ڈاکٹر بیلی ۔ ایس ۔ مونی
کی کتاب

HOW SHALL I TELL MY CHILD ــــــــــــــــــــ کی روشنی میں ــــــــــــــــــــ زرین عذرا

ہمارے سماج میں یقیناً ایسے والدین زیادہ ہیں جو بچّوں کو جنسی تعلیم دینے کے حق میں نہیں ہیں جنسی تعلیم تو بہت بڑی بات ہے ۔ وہ بچّوں کو جنسی جذبوں ہی سے ناواقف رکھنا چاہتے ہیں ۔ اور ان جذبوں کو مخرب اخلاق "گالیاں" سمجھتے ہیں ۔ ایسے والدین کے متعلق میں کیا کہوں ۔ ہاں ان والدین کے لئے یہ صفحات لکھ رہی ہوں ۔ جو جنسی جذبوں کو "گالیاں" نہیں سمجھتے ۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ بچّوں کو یہ تعلیم کیوں دی جائے ــــــــ ان کے لئے یہ صفحات ضرور کارآمد ہیں ۔ اور ــــــــ ممکن ہے کہ ہٹ دھرم والدین بھی کچھ پگھل سکیں ــــــــ چٹانوں کے سینے میں بھی نرم گوشے ہوتے ہی ہیں ۔

ذیل کے سوالات وہ ہیں جو والدین کے دلوں میں اٹھتے ہیں ۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ جوابات بھی درج کئے جا رہے ہیں ۔ یہ جوابات بہت مختصر ہیں ۔ ان کی روشنی میں والدین کو خود سوچنا چاہیئے

۱ ۔ بچوں کو اس تعلیم کی ضرورت ہی کیا ہے ۔ ہمارے خیال میں جب تک وہ بڑے نہ ہوں اور شادی کے قابل نہ ہوں ۔ ان کو " بچہ کیسے پیدا ہوتا ہے " جاننے کی ضرورت ہی نہیں ۔

بچّوں کو آپ جو کچھ بھی بتائیں گے ۔ اس کا مقصد محض اتنا ہے کہ ان کا ذہن صحیح راہوں پر تربیت پا سکے ۔ زندگی کے حقائق ان سے پوشیدہ رہیں ۔ اور جھوٹی باتوں سے وہ گمراہ نہ ہونے پائیں ۔ آپ صرف یہی نہیں بتائیے کہ بچہ کیسے پیدا ہوتا ہے ۔ بلکہ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتائیے کہ شادی کیا ہے ۔ بیوں ہوتی ہے ۔ اور جنسی جذبے اپنی تسکین کیسے پاتے ہیں ۔ اگر آپ اسے تاریکی میں رکھیں گی ۔ تو آپ اُسے خود ہی اپنے ہاتھوں گمراہ کر دیں گی ۔ میں مانتی ہوں کہ آج تک لوگ بغیر جنسی تعلیم کے زندہ رہے ہیں ۔ اور نسل کا تسلسل قایم ہے ۔ مگر اس کے معنی یہ تو نہیں کہ ان کو اس تعلیم سے محروم رکھا جائے بلکہ یہی وہ عمر ہے جبکہ ذہن آنکھیں کھولتا ہے ۔ چاروں طرف دیکھتا ہے ۔ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ایسا کیوں ہے ۔ ویسا کیوں ہے ۔ اگر اس عمر میں بچہ کو غلط باتیں بتائی گئیں ۔ تو صحیح تربیت شروع ہی سے مفقود ہو جاتی ہے ۔ بچہ جوان ہو کر جب اصلیت جانتا ہے تو والدین کی عزت جاتی رہتی ہے ۔

وہ سوچتا ہے کہ جنسی جذبوں سے انسانی زندگی کا تسلسل قایم ہے۔ اسی کے متعلق میرے والدین، خصوصاً میری ماں نے کچھ نہیں بتایا، جب ہی میں بھٹکتا پھرا۔ غلط راہوں پر جا نکلا، تکلیفیں اٹھائیں۔ رسوا ہوا۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ جنسی جذبے انسانی نسل کے قایم رکھنے کے لئے ہیں اور بس۔ تو میں ان کو محض لذت کے لئے ہوا نہ دیتا۔

۲۔ اگر بچوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ جنسی تحریک کو کیسے عمل میں لایا جاتا ہے۔ تو کیا وہ آپس میں اُسے نقل کرنے کی کوشش نہ کریں گے جبکہ بچوں میں یہ عادت ہے کہ وہ دوسروں کی نقل کرتے ہیں ۔ ؟

آپ یقین رکھیے کہ اگر آپ نہ بتائیں گی اور وہ خود چھپ چھپا کر اتفاقیہ کسی کو دیکھ لیں گے تو وہ تنہائی میں ضرور اس "آگ کے کھیل" سے کھیلیں گے۔ لیکن اگر آپ ان کو یہ ذہن نشین کرا دیں کہ مباشرت صرف بچہ پیدا کرنے کے ہے۔ اور بچہ، جوان مرد، جوان عورت کی شادی کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ تو وہ اسے کھیل نہ سمجھیں گے۔ اور اس پر عمل کرنے کی کوشش نہ کریں گے۔ ہاں۔ اگر وہ کسی کو دوسروں سے چھپ چھپا کر مباشرت کے عالم میں دیکھ لیں گے۔ تو اُن کے دل میں ضرور یہ خواہش پیدا ہوگی کہ یہ دونوں کیا کر رہے ہیں۔ آؤ ہم بھی یہ کھیل کھیلیں۔

۳۔ یہ مانا کہ بچوں کو جنسی تعلیم دینا چاہیئے۔ مگر یہی کیا ضروری ہے کہ والدین ہی یہ تعلیم دیں جبکہ بچے دوسری تعلیم اسکول میں پاتے ہیں۔ کیوں نہ اسکول میں اور باتوں کے ساتھ ہی ساتھ یہ تعلیم بھی شامل کر لی جائے ؟

یہ مانتی ہوں کہ بچوں کو تعلیم اسکول میں ملتی ہے۔ مگر یہ بھول رہی ہیں آپ کہ جو تعلیم اسکول میں دی جاتی ہے۔ وہ محض ایک حصہ ہے اس تعلیم کی۔ جس کی بچوں کو اپنی زندگی، زندگی کی طرح گذارنے کے لئے ضرورت پڑتی ہے۔ کچھ اسکولوں کے استاد سکھائیں۔ کچھ آپ سکھایئے۔ دونوں کی دی ہوئی تعلیم بچے کے لئے ضروری ہے۔ اور پھر ———— بچے کی تعلیم تو گھر سے شروع ہوتی ہے وہ اسکول میں تھوڑی دیر رہتا ہے۔ آپ کے ساتھ وہ دن و رات کا بیشتر حصہ گذارتا ہے۔ آپ کے کہنے پر چلتا ہے۔ آپ کے سکھائے ہوئے آداب پر عمل کرتا ہے۔ اگر وہ آپ سے جنسی قسم کے سوالات کر بیٹھے۔ اور آپ یہ سمجھ کر کہ یہ تو استادوں کا کام ہے۔ ان کا جواب نہ دیں ٹال جائیں۔ تو بچہ سوچنے لگتا ہے کہ ایسے سوالات آپ سے نہیں کرنا چاہئیں۔ مگر معلوم کرنے کی آگ جو اُس کے دل میں جلتی ہے۔ وہ اُسے دوسروں کی طرف رجوع کرتی ہے۔ جہاں اُسے غلط قسم کی معلومات بھی ملتی ہیں۔ غلط راہیں دکھائی دیتی ہیں۔ کیوں نہ آپ ہی اسے زندگی کے سب سے اہم پہلو پر تعلیم دیں۔ بچہ آپ کا ہے۔ آپ جس محبت اور شوق سے اُسے تربیت دے سکیں گی۔ کوئی اور اس طرح نہ دے سکے گا ۔

بہت ممکن ہے کہ آگے چل کر ایک ایسا بھی وقت آجائے جبکہ اسکولوں میں ارتھمیٹک، جغرافیہ کے ساتھ ہی ساتھ یہ تعلیم بھی شامل ہو جائے۔ یہ تو ہماری اخلاقی اور سماجی قدریں ہیں جو اسکولوں کے نصاب کو معین کرتی ہیں۔ آپ بدلیں۔ آپ کے ساتھ ہی ساتھ زمانہ بھی بدلے گا۔

۴۔ ایک پرانا خیال ہے کہ جوانی سے پہلے اگر جنسی جذبوں سے ناواقف رکھا جائے۔ تو جوانی محفوظ رہتی ہے۔ کیا خیال ہے ؟

جی نہیں ۔ یہ ناواقفیت ہی وہ آگ ہے جس میں جوانیاں جلتی رہی ہیں۔ اور ہزاروں نوجوان جنسی امراض کے شکار ہوتے رہے ہیں اور حرامی بچے قوم کے جسم پر ناسور بنتے رہے ہیں۔ اور جنسی تعلیم کی جو ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ وہ ان ہی باتوں کو دیکھتے ہوئے ہی پیدا ہوئی ہے۔ بچوں کو یہ نہیں بتایا گیا کہ جنسی فعل کس لئے ہیں۔ اسی لئے جب وہ بڑے ہوئے۔ لذت کے شکار ہو گئے، اپنی صحت کھو بیٹھے

انسانیت سے گر گئے۔ اگر ان کو جنسی جذبوں کا مقصد معلوم ہوتا۔ تو وہ ہرگز اس لذت کا شکار نہ ہوتے۔

۵۔ کیا لڑکوں کو حیض کے متعلق بتایا جائے؟

میں پوچھتی ہوں کہ کیوں نہ بتایا جائے؟ یہ تو فطرت کا تقاضا ہے۔ جس طرح بچوں کے دودھ کے دانت ٹوٹتے ہیں۔ اور بلوغت کے دانت نکلتے ہیں۔ اسی طرح لڑکی جب جوان ہوتی ہے اس کی جسمانی پرداخت کا تقاضا ہے کہ ہر مہینہ اسے حیض آئے۔ ان فطری باتوں میں لڑکوں اور لڑکیوں میں تفریق نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ لڑکوں کو حیض نہیں آتا۔ مگر یہی لڑکے جب جوان ہوتے ہیں۔ تو ایک عورت سے شادی کرتے ہیں۔ اور عورت کو ایک خاص عمر تک حیض آتا ہے۔ اس لئے ان کو شروع ہی سے معلوم ہونا چاہیئے کہ حیض کیوں آتا ہے اگر عورت کے حاملہ ہو جانے کے بعد کیوں رک جاتا ہے۔

۶۔ کیا لڑکوں کو حمل کے متعلق بتایا جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ جب تک ان کی شادی نہ ہو۔ ان کو بتانا بیکار ہے۔ اور شادی کے بعد تو ان کو معلوم ہی ہو جاتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ لڑکا خود کبھی "حاملہ" نہ ہوگا۔ لیکن صرف اتنی سی بات کے لئے اُسے حمل کے متعلق نہ بتانا تو کوئی بات نہ ہوئی اور پھر ——— عورت بغیر مرد کے حاملہ تو ہونے سے رہی۔ مرد ہی کو اگر حمل کی نوعیت اور حقیقت نہ معلوم ہوئی تو وہ اپنے اصلی فرائض کو کیسے جان سکے گا ——— لڑکا خود کبھی ماں نہ ہوگا۔ مگر وہ "اپنی عورت" کو اپنے بچے کی ماں بنانے کا محرک ضرور بنے گا۔ اس سے قطع نظر، تعلیم کے معاملہ میں، لڑکے اور لڑکی میں تفریق یوں بھی ٹھیک نہیں ہے۔ زندگی کے متعلق جتنی لڑکی کو معلومات کی ضرورت ہے۔ اتنی ہی لڑکے کو بھی ضرورت ہے۔

۷۔ بچے کو کیسے بتایا جائے کہ اس کا ایک اور بھائی، یا بہن پیدا ہونے والا ہے؟

جب بچہ پیدا ہونے کے دن قریب آجائیں تو بچے سے کہیے ——— "اگر تمہارے ساتھ کھیلنے کے لئے ایک اور بچہ اس گھر میں آجائے تو تم خوش ہوگے؟ ———" بچہ یقیناً ایک جیتے جاگتے کھلونے کو حاصل کرنے میں خوش ہوگا۔ پھر آپ اُسے بتائیں کہ فلاں مہینہ میں ——— اگست، ستمبر یا اکتوبر میں اس کے کھیلنے کے لئے ایک اور بچہ آئے گا ——— وہ ابھی سے انتظار کرے گا۔ پھر آپ اس عرصہ میں اس نئے بچے کی تیاریوں میں لگیئے۔ بچہ کو بھی اپنے ساتھ شامل رکھیئے۔ مثلاً جب آپ متوقع بچے کے لئے چھوٹے چھوٹے کپڑے سینے لگیں تو اپنے بچے سے کہیں کہ وہ بچہ ننگا ہوگا۔ اس کے لئے چھوٹے سے بستر کی ضرورت ہوگی وغیرہ وغیرہ

۸۔ بچہ کو یہ کیسے بتایا جائے کہ اس کے اور بہن بھائی کیوں نہیں پیدا ہوتے؟

اگر بچہ یہ پوچھے تو اس کو جواب دینے کے لئے جھوٹی باتیں کیوں کیجئے۔ حقیقت بتا دیجئے۔ کہ اب ہماری عمر زیادہ ہوگئی ہے۔ اور بچے ایک خاص عمر تک پیدا ہوتے ہیں — یا — بچوں کی پرورش کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے۔ اور ہماری آمدنی اتنی نہیں ہے کہ ہم اور زیادہ بچوں کی پرورش کرسکیں — وغیرہ وغیرہ

(اگلے شمارہ میں "والدین پوچھتے ہیں" مسلسل)

منشی ... نے الیکٹرک شیل پرنٹنگ سکشن، ساؤتھ نیپیر روڈ سے چھپوا کر دفتر سائیکولوجی، رحمت منزل گلدوڈ ملیکراج روڈ نزد مویدینا سے شائع کیا



کاروباری تفصیلات کے لئے پوسٹ بکس نمبر ۱۰۵ کراچی

PSYCHOLOGY

HEALTH · HAPPINESS · SUCCESS

Title printed at the Jubilee Printing Works, for Psychology, Bombay Rah Building, Bunder R



Title printed at the Jubilee Printing Works, for Psychology, Bombay-Rahmat Building, Bunder Road Karach

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پاکستان و بھارت کا مشہور نفسیاتی ماہنامہ

سائیکولوجی اردو

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

جلد ۲ نمبر ۱۲

(پاکستان میں) زرسالانہ چھ روپے
(بھارت میں) زرسالانہ ساڑھے سات روپے

قیمت فی پرچہ

پاکستان میں	آٹھ آنے
بھارت میں	دس آنے

ادارہ

شاہدہ سلطانہ
بیگم رئیس جہاں نیر انصاری
انعام اللہ خاں
علاء الدین خالد

دفتر
ماہنامہ سائیکولوجی اردو اکیڈمی اسٹریٹ نزد مولوی مسافر خانہ بندر روڈ پوسٹ بکس ۵۶۶

مندرجات

* اُٹھیے کہ اب لذتِ خواب سحر گئی ۴
* ہمیشہ جوان رہیے ۸
* جی ہاں یہ سیڑھیاں ہیں ۱۱
* عادتیں ڈالنا ۱۳
* بچے اور کہانیاں ۲۰
* آپ کی شخصیت ۲۳
* تحلیل نفسی کے پیچ و خم ۲۵
* بات چیت ۳۶
* زندگی میں انقلاب کی قوت ۴۱
* اگر آپ تھک گئی ہیں تو میری سنیئے ۴۵
* بھولوں کیسے ۴۷
* راگ بے راگ ۴۹

منشی عبدالغفار نے مطبع عثمانی بھیم پورہ میں چھپوا کر دفتر سائیکولوجی رحمت بلڈنگ بندر روڈ کراچی سے شائع کیا

سالگرہ نمبر ۲۰ فروری سنہ ۵۱ء تک آپ کی خدمت میں پہنچے گا ★

اس شمارہ کے ساتھ "سائیکولوجی" اپنی عمر کے دو سال ختم کر رہا ہے۔ ابتدائی زندگی — خواہ پرچہ کی ہو یا بچہ کی، بہت آزمائشی زندگی ہوتی ہے۔ بچے اس عمر میں سانس لینا، سنبھلنا اور نئے ماحول سے مطابقت حاصل کرنا سیکھتے ہیں۔ اگر والدین ذرا بھی غفلت کریں، تو زندگی کی موتیوں جیسی لڑی ٹوٹ جاتی ہے۔ یا موتی اپنی آب، اپنی قیمت کھو دیتے ہیں اور ایک پرچہ اس ابتدائی دور میں اپنی زندگی کی داغ بیل ڈالتا ہے۔ پڑھنے والوں کو اپنی افادیت، اپنے خلوص کا یقین دلاتا ہے۔ اور جب وہ اپنی ضرورت کا احساس دلا کر دلوں میں جگہ کر لیتا ہے، تب سر بلند کر کے اپنے ہم عصروں کے شانہ بشانہ کھڑا ہوتا ہے۔

ہمارا یہ **سالگرہ نمبر** رجسٹری ہی سے روانہ ہوگا۔ برائے مہربانی آپ ۵ ر کے ٹکٹ فوراً روانہ کریں ورنہ مجبوراً ہم وی۔پی کرینگے جس پر آپ کے ۷۰ ر خرچ ہوں گے، ★

لیکن اس انحطاطی دور میں صرف وہی پرچے زندہ رہتے ہیں، جو ایک مقصد رکھتے ہیں، اور مسلسل آزمائش میں بھی زندگی کی آس نہیں چھوڑتے۔ "سائیکولوجی" اس دور سے گذر چکا ہے۔ اس نے آپ تک زندگی کی روشنی پہنچائی ہے۔ وہ روشنی موجود تو تھی مگر ناعلمی کے اندھیرے میں گم تھی۔ "سائیکولوجی" اپنے مقصد کی انفرادیت کی طرح اپنے خاص نمبروں کی انفرادیت اور افادیت بھی آپ سے منوا چکا ہے۔

- جون سنہ ۴۹ء میں عورت نمبر
- فروری سنہ ۵۰ء میں سالگرہ نمبر
- اگست سنہ ۵۰ء میں مرد نمبر

اور اب پھر

- فروری ۵۱ء میں "**سالگرہ نمبر**" پیش کر رہا ہے۔ ادارہ یہ نمبر پیش کر کے رسائل کی دنیا کا اصول (کہ کوئی خاص نمبر شائع کرو) ہی کی پاسداری نہیں کرنا چاہتا بلکہ زندگی کے متعلق تفصیل سے پیغامات پہنچانا چاہتا ہے۔

یہ زرین تحفہ مستقل خریداروں کی خدمت میں تحفتاً اور دوکانوں پر ایک روپیہ میں مل سکے گا ★

ایڈی جیفاز

اٹھئے کہ اب لذّت خواب سحر گئی

آج کتنے انسان مایوسی اور گمراہی کی زندگی بسر کر رہے ہیں؟ یقیناً اُن کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو انگلیوں پر گن سکتے ہیں جو اپنی زندگی، اپنے ماحول سے مطمئن ہیں۔ اور زندگی کو پھولوں کا بستر سمجھتے ہیں۔

وجہ ——— ؟

وجہ صرف اتنی ہے کہ ہم سے قوّتِ متخیلہ جیسے چھن سی گئی ہے۔ یہ مانا کہ اقتصادی اور معاشی دشواریاں دیوار بنی ہمارے سامنے موجود ہیں، ہمارے قرب وجوار ممالک میں تیسری جنگ عظیم کے خطرات موجود ہیں، جنگ کو ختم کرنے کے لئے جنگ کے طبل بج رہے ہیں۔ اور منٹ منٹ میں ہر چیز تتر بتر ہونے کا اندیشہ ہے۔ مگر یہ قوّتِ متخیلہ ہی ہے، جو ہم کو پرواز کرنا سکھاتی ہے۔ اس دُنیا کے سہانے خواب دکھاتی ہے۔ جب جنگ نہ ہوگی، امن ہوگا، تاریکی نہ ہوگی، روشنی ہوگی، کانٹے نہ ہوں گے، پھول ہوں گے۔

اور جب کسی سے بھی یہ طاقت چھن جاتی ہے، تو وہ لازمی طور پر قنوطی ہو جاتا ہے۔ ہر وقت ڈرا ڈرا، سہما سہما رہنے لگتا ہے۔ ہمارا تعلق زمین سے ہے اور ضرور ہے۔ مگر جب ہمارے پیر کیچڑ میں پھنسے ہوں، تو ہمارا سر آسمان کی بلندیوں میں ہونا چاہیئے، ستاروں کے دوش بدوش۔ ہم اپنی ضروریاتِ زندگی میں مقیّد ہیں اور ہونا چاہیئے، مگر ہمارے تصور میں ایک اور ہی جہاں، ایک اور ہی دنیا بسی رہنی چاہیئے۔

کہا جاتا ہے کہ زمین پر رہ کر آسمان کے خواب دیکھنے والا انسان پاگل سے کم نہیں۔ اور کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو اپنے کو حقائق کا بندہ کہتے ہیں۔ ان سے یہ کون کہے کہ جن چیزوں کو آپ حقیقی کہتے ہیں۔ وہ محض دھوکہ ہیں، آنکھوں کا فریب، ایک سراب۔ اور پھر، یہ لوگ صرف اپنی جسمانی پرداخت کے پھندوں میں پھنسے رہتے ہیں۔ اور وہ "پاگل" اپنے تصوّر سے اپنے کو اور بلندی پر لیجاتا ہے۔ جہاں وہ صرف مشین کی طرح بھوک کو مٹانے کی فکر نہیں کرتا، بلکہ اپنی عظمت پر مُسکراتا ہے۔ ستاروں کے تاروں پر انسانیت کے نغمے الاپتا ہے۔

اور انسان ہے بھی اسی لئے اشرف المخلوقات، وہ اپنے حال کی دشواریوں کا حل ہی نہیں کرتا، بلکہ مستقبل کے لئے منزلیں متعین کرتا ہے۔ اور پھر ان منزلوں تک پہنچنے کے لئے راہیں پیدا کرتا ہے۔ بہتر اور آزاد دنیا کے خواب دیکھنا، ہوائی قلعے بنانا اس کا ایک محبوب مشغلہ ہے۔ اور اسی محبوب مشغلہ کی بدولت ہماری موجودہ ترقی، ہماری سائنسی ایجادات حقیقت بن چکی ہیں۔ انسان ہمیشہ سے ہوائی قلعے بناتا رہا ہے۔ وہ اپنے ملک میں بیٹھ کر اُفق کے پار دور دراز ملکوں کے خواب دیکھتا رہا۔ اور پھر وہ اٹھا، اُس نے نئی زمینوں کی دریافت کی، اپنی دماغی کاوشوں سے فاصلہ کو ختم کر دیا۔ اور اس دنیا کو، ایک دُنیا، ایک زمین، ایک گھر بنا دیا۔ ہمارا موجودہ لٹریچر، ہماری موسیقی سب اسی "دیوانے" کے

خواب ہیں —— پہلے بادشاہت تھی، ایک انسان ہزاروں لاکھوں انسانوں پر حکومت کرتا تھا۔ اس کے الفاظ ان کے لئے زندگی اور موت کا پیغام لاتے تھے، زندگی زندگی نہ رہی تھی۔ غلامی کی زنجیریں گئی تھی۔ قوت متخیلہ ہی نے عوام میں عوامی حکومت کا جذبہ پیدا کیا، ان کے سامنے ایک مقصد رکھا، زنجیریں ٹوٹیں اور آج بیشتر ممالک عوامی حکومت کو اپنا چکے ہیں، نہ کوئی حاکم ہے، نہ محکوم، اگر انسان میں یہ طاقت، یہ فکر نہ ہوتی تو آج یہ دُنیا کتنی غریب، کتنی مجبوروں کی بستی ہوتی، نہ یہ سائنسی ایجادات ہوتیں، نہ تہذیبی اور تمدّنی بلندیاں۔

قوت متخیلہ ہی وہ کنجی ہے، جو پریوں کی دُنیا کے دروازے کھولتی ہے۔ آج آپ جو کچھ بھی دیکھتے ہیں، ہزاروں برس پہلے یہ دُنیا ایک انسان کے لئے پریوں کی دنیا تھی۔ اور آج سے ہزاروں سال بعد جو اس دُنیا کا نقشہ ہوگا، وہ آج کے انسان کے لئے پریوں کی دنیا ہے۔ ہزاروں برس پہلے جو انسان سوچتا تھا، وہ آج حقیقت بن گیا ہے، اور آج جو ہم سوچتے ہیں، وہ آنے والی نسل کیلئے حقیقت ہوگی۔

اس لئے اگر ہم کو اپنا مستقبل شاندار بنانا ہے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس دنیا سے تمام تکلیفیں ختم ہو جائیں، آج ہم جتنے مجبور ہیں، ہماری اولاد اتنی مجبور نہ ہو، تو ہم کو شاندار خواب دیکھنا چاہئیں۔ اور اگر ہم اپنی موجودہ پریشانیوں کا صحیح جائزہ لینا چاہتے ہیں، تو ہم کو اپنے کو بلندی پہ لیجانا چاہیئے۔ ہم اتنی قربت سے پوری کیفیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یہ "دُوری" ضروری ہے، اور یہ دُوری قوت متخیلہ ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

آج ہم کو اپنی تہذیب و تمدّن کے بکھرتے شیرازے کو مجتمع کرنے کی فکر ہے۔ آج ہم کو کوئی بتانے والا موجود نہیں ہے کہ ہماری نئی تہذیب اور نیا تمدّن کیسا ہوگا۔ لیکن پھر بھی انسانی ترقی کے لئے "نئی منزلوں کی ضرورت ہے، ہماری زندگی کے سامنے ایک اونچا مقصد ہونا چاہیئے۔ اور یہ منزلیں اور یہ مقصد صرف ہماری قوت متخیلہ ہی پیش کر سکتی ہے۔ اسی کے سہارے ہم "کل" کو دیکھ سکتے ہیں، محسوس کر سکتے ہیں اور اپنی موجودہ قوتوں کو کام میں لا سکتے ہیں۔

ممکن ہے کہ آپ "تخیل" اور "خیال" کو خلط ملط کر رہے ہوں۔ ان دونوں میں ایک نفسیاتی فرق ہے "خیال" اپنے پچھلے تجربات کی روشنی میں ایک نئے "تصور"، ایک "خاکہ" کو کہتے ہیں۔ اور "تخیل" اپنے تجربات کو اور ہی شکل میں پیش کرنے کو کہتے ہیں۔ "خیال" انسانی دماغ پیدا کرتا ہے۔ اور "تخیل" دماغ کی وہ روشنی ہے۔ جو ظاہراً "غیر موجود" کو بھی موجود بنا دیتی ہے۔ وہ ہماری محسوسات کے احاطہ سے باہر کی چیزوں کو جانتی ہے۔ پہچانتی ہے۔ ایک "خیال" ایک ہی وقت میں دو انسانوں کے دماغ میں آ سکتا ہے۔ ایک اُسے محض خیال سمجھ کر تج دیتا ہے۔ اور دوسرا "تخیّل" کی روشنی شامل کر کے کچھ اور ہی دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے۔

آپ "خیال" کے ذخیرہ کو بڑھانے کے لئے مطالعہ اور مشاہدہ کیجئے۔ پُرانے ذخیرہ سے نئے خیال پیدا کیجئے۔ مگر اپنے "تخیل" کو بھی ضرور کام میں لائیے کیونکہ اسی کی مدد سے آپ اپنی مجبوریوں پر حاوی آ کر اور دنیا میں پہنچ سکتے ہیں۔

اپنا مستقبل بنائیے

ہماری دُنیا میں خیالات کی کمی نہیں۔ نئے خیالات روز بروز نئی نئی ایجادات کرتے جاتے ہیں۔ لیکن ہم میں "تخیل" کی کمی ہے ہم زمین ہی تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ ہماری مثال ان مجبور انسانوں کی ہے، جو غاروں میں رہتے ہیں۔ غاروں کے متعلق جانتے ہیں۔ غاروں کے باہر ایک وسیع دُنیا ہے۔ اس دنیا میں قدم رکھتے ہوئے ہمارے

قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔

ممکن ہے کہ آپ یہ سوچیں کہ قوّتِ تخلیہ آپ کی کیا مدد کر سکتی ہے؟ اور ممکن ہے کہ کچھ لوگ یہ بھی کہیں کہ یہ قوّت ہم انسانوں کے لئے سودمند نہیں۔ کیونکہ وہ انسان جو ہر وقت ستاروں کے خواب دیکھتا ہے اس دنیا کو فراموش کر دیتا ہے، وہ اس دنیا کے قابل نہیں ——— یہ ایک حد تک ان لوگوں کے لئے ٹھیک ہے جو تخیل کو اپنی مادّی حقیقی دنیا کے مسائل کو بھولنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ جو بے مقصد زندگی گزارتے ہیں۔ اور ہمہ وقت خواب دیکھا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ضرور اس دنیا کے قابل نہیں۔ کیونکہ اگر یہ خواب ہم کو کہیں نہیں پہنچاتے۔ تو وہ بیکار ہیں اور ضرور ضرر رساں ہیں۔ خوابوں کو حقیقی بنانے کے لئے عمل ضروری ہے۔

اپنی کائنات کا حصّہ بنیئے

کسی صاحبِ تخیل کو گاؤں کی کھلی فضا میں دیکھئے۔ وہ چڑیوں کے چہچہے سن کر مسکرا پڑتا ہے۔ پھولوں کی رنگت، گھاس کی ہریالی اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دیتی ہے۔ وہ فضا میں گھلے ہوئے نغموں اور مسکراہٹوں کو سونگھتا ہے۔ اُس کے وجود کا ذرّہ ذرّہ اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی، مسکراتی گنگناتی، مہکتی کائنات کا احساس رکھتا ہے۔

آپ ایسے انسان کو کیا کہیں گے؟ محض ایک فطرت کے نظاروں کا تماشائی؟ کبھی نہ کسی طرح وقت گذارنے کا متمنی؟ جی نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا ان نغموں سے ایک تعلق ہے، اس کائنات سے ایک رشتہ ہے۔ وہ ان کے لئے ہے، وہ سب اس کے لئے ہیں، وہی خوب صورتی، سچائی کو سمجھتا ہے۔ خواہ وہ کتابوں میں ہو، موسیقی میں ہو، تصویروں میں ہو یا پتھر کے مجسموں میں۔ اور وہی انسان ہے جس پر زندگی مہربان نظر آتی ہے۔ وہ اپنی تمام خوشیاں لئے اس کے سامنے آتی ہے۔ اسے رجائی بناتی ہے۔ وہ ہر روز ایک نئی بات دیکھتا ہے۔ ہر منٹ اپنی زندگی کو زندگی بناتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایک لمحہ بھی ایسا نہیں جو تہی دامن ہو، جو اس کے لئے کچھ لایا نہ ہو۔

ایسا ہی انسان ہر روز ایک نئی زندگی شروع کرتا ہے۔ کل کی شکست سے آزردہ خاطر نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ اسے منٹ منٹ پر ایسے مواقع ملیں گے جبکہ وہ کامیاب ہو سکے گا۔ اور ایک ایک لمحہ نئی نئی مسرتوں کو ساتھ لائے گا، اور ایک ایک گھنٹہ جو گذرے گا، زندہ دلی میں گذرے گا۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہ لیجئے کہ اس کو کسی دشواری کا سامنا کرنا ہی نہیں پڑتا۔ اسے کوئی ناکامی ہی نہیں ہوتی، ہوتی ہیں اور ضرور ہوتی ہیں لیکن وہ ان کا مقابلہ کرتا ہے اور آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اس کی آنکھیں خوبصورتی سے معمور ہوتی ہیں، وہ کسی چیز میں بدصورتی نہیں دیکھتا۔ اور جبکہ وہ جدوجہد میں مصروف ہوتا ہے، تب بھی اُسے نغمے اتنے ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں، رنگ اتنے ہی رنگا رنگ۔

نئی دنیا کے لئے

کچھ لوگ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایسا انسان صرف اپنے لئے زندہ رہتا ہے۔ اسے اپنی مسرّتوں کی پرواہ ہوتی ہے، اپنے ساتھیوں سے بے خبر ہوتا ہے، یہ غلط ہے۔ اُسے اپنے ساتھیوں سے ہمدردی ہوتی ہے۔ وہ اپنے فرائض پورا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کسی صاحبِ تخیل کو بددیانت نہ پائیں گے۔ وہ مکمل شہری ہوتا ہے۔ اور صرف وہی ایسا انسان ہوتا ہے۔ جو غلطیوں کا احساس دلاتا ہے۔ صرف احساس ہی نہیں دلاتا۔ اُن کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ اور اُس کی یہ آواز ——— خرابیوں کے خلاف ——— صدیوں تک گونجتی رہتی ہے۔ وہ خوفناک

ہوتے ہیں لیکن ان کے خیالات، اقدار بن جاتے ہیں، ایک نسل کے بعد دوسری نسل، پھر تیسری، پھر چوتھی اُن کی روشنی کی ہوئی شمع سے اندھیرے کو دُور کرتے رہتے ہیں۔

ظاہراً عورت اور مرد دو مختلف جنس ہیں۔ ایک قوم دوسری قوم سے مختلف ہوتی ہے۔ لیکن قوت تخلیہ ان تمام بندشوں کو ختم کر دیتی ہے اور انسان دوسرے انسان کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ ایک ملک کا ایک طبقہ ستایا جاتا ہے۔ اور تمام دوسرے ممالک کے لوگ تڑپ جاتے ہیں۔ دُور دراز ملکوں کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے ہم جنگ پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں ——— کیوں، محض اس لئے کہ ہم تخیل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے دوست ہیں، ہمدم ہیں، بھائی ہیں۔

یہ قوت ہم میں، آپ میں، ہر فرد میں موجود ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اس کا استعمال نہ کریں، یا غلط کریں۔ اور یہ سمجھیں کہ وہ ہم میں موجود نہیں۔ اپنے میں صحیح قسم کی قوت تخلیہ پیدا کرنا چاہیں تو خوبصورت چیزوں میں وقت گذاریئے۔ تصویریں دیکھئے۔ اشعار پڑھیئے موسیقی سُنیئے، بچوں کی مسکراہٹ دیکھئے، ان کے معصوم قہقہے سُنیئے۔

یہ ہمارے لئے ضروری ہے، بہت ضروری ہے۔ کیونکہ تخیل کے بغیر ہم صرف مٹی کے چلتے پھرتے پتلے ہیں جنکی تقدیر میں مٹ جانا ہے ——— اور ہم مٹنا تو چاہتے نہیں، مجبور و بے بسی کی زندگی گزارنے میں کیا رکھا ہے ★

"کیسینو"

(کراچی کا ایک مشہور ترین بار اور بال روم)

خون سرمایہ برنگ مئے گلریز یہاں
چھلکا کرتا ہے ہر اک جام گلابی سے یونہی
تم سمجھتی ہو بھٹک کر میں چلا آیا ہوں
زندگی کے غم و اندوہ و آلام سبھی
ایک لمحے کو فضاؤں میں بھٹک جاتے ہیں
ساز بجنے لگے
دُھنیں تیز ہوئیں
جسم لرزاں ہوئے ۔ پیروں میں گردش آئی
جوڑے ہم رقص ہوئے
رقص مبہوت کناں ۔ مست کناں ۔ وجہ نشاط

مرتعش کیوں ہوا جاتا ہے یہ اب تیرا شباب
دھڑکنیں تیز ہیں کیوں
کیوں یہ وارفتگی آخر یہ مدہوشی کیسی
تھک گئی ہو تو چلو بیٹھو ذرا دم لے لو
ایک دو گھونٹ سے تر کر لو یہ سوکھے ہوئے لب
زندگانی کے تقاضوں سے ہر اک الجھن سے
ذرا دم بھر کو تو بے گانہ بنا دو خود کو
وقت کی گردش پیہم کو سرکنے دو یونہی
ساز بجنے دو یونہی
دور چلنے دو یونہی

(عبدالقوی ضیاؔ)

سائیکولوجی کراچی

ڈاکٹر اے۔ یو۔ پیرسن

ہمیشہ جوان رہیئے

جوانی دراصل ایک "ذہنی کیفیت" کا نام ہے۔ گذرتے ہوئے سال آپ کو ضعیف ہرگز نہیں بناتے۔ آپ کی حقیقی عمر تو آپ کے "نوجوان احساس" سے ظاہر ہوتی ہے۔

آپ کے اور ہمارے مشاہدے میں ۶۵، ۷۰ سالہ ایسے لوگ آتے ہی رہتے ہیں۔ جو زندہ دل ہیں۔ اور ان میں زندگی کی اتنی ہی چاہت موجود ہے۔ جتنی ۲۰، ۲۵ سال کی عمر میں تھی۔ اور بہت سے تو ضعیف العمر لوگ نوجوانوں سے زیادہ خوش طبیعت نظر آتے ہیں۔ ان سے ملئے باتیں کیجئے، وہ ایسی دلچسپ باتیں کرینگے کہ آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے، جہاں بھی جاتے ہیں۔ زندگی کی شمع اور زیادہ فروزاں ہو جاتی ہے ——— آپ زندگی کا کس طرح ساتھ دیتے ہیں۔ اسی سے آپ کی عمر کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

اچھا بتایئے۔ آپ کی کیا عمر ہے؟ آپ صبح سو کر جب اٹھتے ہیں۔ تو دن کا کس طرح خیر مقدم کرتے ہیں۔ کیا یہ سوچتے ہیں کہ ہر دن آپ کے لئے لاتعداد تجربات لاتا ہے۔ اور آپ لمحہ لمحہ ان تجربات کو حاصل کرنے میں صرف کرینگے۔ یا آپ لاغروں اور بیماروں کی طرح بستر چھوڑتے ہیں اور آپ کو یہ کوفت کھائے جاتی ہے کہ دن کس طرح بسر ہوگا۔ اور کیا ہر وہ شخص جو آپ کے سامنے آتا ہے۔ اسے آپ اپنا دشمن سمجھتے ہیں، یا اسے اپنا ہمدم سمجھتے ہیں، اپنی ہی طرح انسان سمجھتے ہیں ——— اس سے بھی آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کی کتنی عمر ہے۔

اور اگر آپ اب بھی لاتعداد جگمگاتے ستاروں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ چاند کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتے ہیں۔ چڑیوں کو اڑتے چہچہاتے دیکھا کرتے ہیں۔ تو آپ نے اپنی جوانی کو محفوظ رکھا ہے اور گذرتا وقت آپ سے آپ کی زندگی، آپ کی زندہ دلی نہیں چھین پایا ہے۔

اور پھر "وقت" تو ہمارے خیالات کا خود ساختہ میزان ہے۔ ہم اس کے پابند نہیں، اور نہ اس کے قیدخانے میں اپنی ساعتیں گذارتے ہیں۔ ارضی لمحے، منٹ، گھنٹے، دن، ہفتے، مہینے، سال اگر زمان نامحدود کی میزان پر ناپے جائیں تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ زندگی غیر فانی ہے، جب ہم ارضی موت کے دروازوں سے جھانک کر ابدی زندگی کو دیکھتے ہیں تو یہاں کی زندگی ایک حقیر وقفہ معلوم ہوتی ہے۔ انسان فنا نہیں ہوتا، وہ اپنی ابدیت میں چاند ستاروں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

ارضی وقت ایک فریب ہے۔ ہم اپنے "کل" سے ڈرتے ہیں، کہ جانے اس کے دامن میں ہمارے لئے کیا پوشیدہ ہے۔ لیکن آنکھ جھپکتے ہی "کل" "آج" بن جاتی ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ "آنے والی کل" "گذری ہوئی کل" ہی کی طرح ہے۔ ہم ہمہ وقت تین دنیاؤں میں رہتے ہیں۔ ابھی ہماری آنکھوں میں "کل" کا خمار باقی ہے، "آج" کا ذائقہ ہے اور آنے والی کل کے متوقعہ خاکے موجود ہیں اور ہمارا شعور بہت

انسانی شعور ان تینوں دنیاؤں کی سیر کرتا رہتا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جبکہ ہم وقت "کو پیچھے چھوڑ جائیں گے ——————

وقت ہر کلاک کے لئے اضافی چیز ہے۔ دنیا بھر میں اس کے جدا جدا میزان ہیں۔ کیونکہ یہ منٹ، گھنٹے اور دن ہم نے بنائے ہیں ہمارا کرہ اپنے محور پر یا سورج کے چاروں طرف جب ایک چکر لگاتا ہے۔ اس وقفہ کو ہم نے ایک دن اور ایک سال کا نام دیدیا ہے کائنات کا کوئی اور کرہ اتنا وقفہ نہیں لیتا۔ ہم نے اپنے دن و سال کی میزان پر ان کی رفتار کو جانچا، اور کروں میں لمحے، اور منٹ کسی اور ہی وقفے کے ہوتے ہیں۔

آج ہم نے ایسے ہوائی جہاز بنائے ہیں جو ایک گھنٹے میں ایک ہزار میل کا فاصلہ طے کرتے ہیں۔ ہماری زمین بھی اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی ہے۔ اگر ہم ROCKETS بمخالف سمت میں سفر کریں۔ تو جو لمحے ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں ان میں ہم دوبارہ پہنچ سکتے ہیں۔

فضائے بسیط میں تمام کرّے سفر کر رہے ہیں۔ ہم بغیر وقت کے کسی کرہ کا جائے وقوع نہیں معلوم کر سکتے۔ چند منٹ پہلے ہم اپنی دنیا کے ساتھ کئی میل پیچھے تھے۔ اگلے ہفتہ ہم ہزاروں میل آگے ہوں گے۔ ہر مادی چیز کے چار ابعاد ہوتے ہیں۔ لمبائی، چوڑائی، گہرائی اور مدت ــ اس لئے فضائے بسیط میں کسی بھی کرے کو معلوم کرنے کے لئے وقت کی مدد لینا ضروری ہے۔ ہم ہمہ وقت آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ چاہے بیٹھے ہوں یا آرام سے محو خواب ہوں

لیکن ہمارا یہ سفر ہمیشہ دائروں میں ہوتا ہے۔ اس لئے ہم ہمیشہ اس جگہ واپس آجاتے ہیں۔ جہاں سے سفر شروع کرتے ہیں۔ اس سفر کی نہ کوئی پہلی منزل ہے۔ نہ آخری۔ ہمارے سامنے محض لامحدودیت ہے۔ کوئی چیز کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلا ہی کرتا ہے۔ ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لئے۔

لیکن زمان و مکاں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ آپ مجھ سے پوچھئے "کیا وقت ہوگا؟" میں کہوں گا "یہاں پاکستان میں یہ وقت ہے، امریکہ میں یہ اور آسٹریلیا میں یہ" اگر یہ پوچھیں کہ "آپ کہاں ہیں؟" میں کہوں گا "کس لمحہ کی بات کر رہے ہیں؟ کیونکہ ہم برابر سفر کر رہے ہیں۔"

"وقت" یا "مدت" ہر مادی چیز کا چوتھا بعد ہے۔ اگر ہر مادی چیز فانی ہے اور لمحہ لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ تو "وقت" ——— لمحے، منٹ گھنٹے، ماہ و سال سب فریب ہیں۔ (ابھی ہیں)، (ابھی نہیں ہیں)۔ اور رہے بھی بے حقیقت۔ ہم کو صرف اپنے داخلی شعور کا پتہ رہتا ہے۔ ہمارا احساس ہماری زندگی ہے۔ اس کی موت نہیں ہوتی۔ خارجی دنیا میں کیسے ہی انقلابات آئیں۔ اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور آپ کو اپنے پر اختیار ہے۔ خود آپ کو اپنی موجودگی کا احساس رہتا ہے "میں زندہ ہوں" "میں مر نہیں سکتا"

آپ روزمرہ کی زندگی میں "برقی قوت" کے کارنامے دیکھتے ہیں۔ بڑی بڑی مشینیں اس قوت سے چلتی ہیں۔ رات کی تاریکیاں اس کی روشنی سے دور بھاگتی ہیں۔ لیکن کبھی آپ نے برقی قوت کو دیکھا ہے؟ نہیں، آپ جو کچھ دیکھتے ہیں۔ اس کے اثرات دیکھتے ہیں۔ اسی طرح ہر دکھائی دینے والی شے کے پس پردہ دکھائی نہ دینے والی قوت موجود ہے۔ اس طرح آپ کا احساس ہے جو نظر نہیں آتا

مگر صرف وہی اہم "ہے" ہے اور حقیقت ہے، اور زندگی ہے۔ آپ اپنی دنیا کے ایک حصہ ہیں۔ اس دنیا سے دور نہیں جا سکتے۔ آپ کبھی فنا نہیں ہو سکتے۔ صرف اپنا مقام بدل دیتے ہیں۔

لیکن یہ سب آپ اسی حالت میں سمجھ سکتے ہیں۔ جبکہ آپ اپنی جوانی کے پوشیدہ سرچشمہ سے باخبر ہوں۔ ظاہری پہلو وقتی ہیں۔ باطنی اور نہ نظر آنے والے پہلو غیر فانی ——— اس لئے آپ غیر فانی ہیں، اگر آپ گزرتے وقت سے ڈریں گے۔ تو آپ کا جسم ضعیف و لاغر ہو جائیگا۔ ہزاروں فکریں، پریشانیاں، اس کے توازن کو بگاڑیں گی ——— اگر یہ ہوا بھی اور آپ کا جسم اپنی دلکشی کھو بیٹھا، ہاتھوں میں رعشہ، آواز میں کپکپی اور آنکھوں میں دھندلاہٹ آگئی۔ اور آپ کو اپنی جسمانی مشین پر اختیار نہ رہا، تب بھی آپ زندہ رہینگے آپ کائنات کے زمان و مکان کی طرح ابدی ہیں، ازلی ہیں،

سوچئے کہ میں جوان ہوں ——— آپ جوان ہو جائیں گے، ارادہ کیجئے کہ میں ضعیف نہ ہوں گا۔ آپ ہمیشہ کے لئے جوان رہیں گے ★

بھارت میں ہمارے دفتر کا پتہ

جناب منشی عبدالقدیر صاحب، گلی انبیاء، کوچہ چیلان دہلی

ترجمہ: زرین عالم سرا

جی ہاں یہ سیڑھیاں ہیں

اگر کوئی شخص آپ کے کسی کام پر اعتراض کرتا ہے، اس کے نقائص بتاتا ہے، تو کیا آپ چڑ جاتے ہیں ؟
اگر آپ ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں گویا آپ اُس کے اعتراضات کی پرواہ نہیں کرتے - تو آپ عام انسانوں سے مختلف ہیں۔
اور اگر آپ ان کے اعتراضات کو محسوس ہی نہیں کرتے تو آپ اور بھی عجیب ہیں۔ اور شاید اس مضمون پر سرسری نظر ڈال کر کچھ اور پڑھنے لگیں گے یا یہ سوچنے لگیں گے کہ آپ اپنی موجودہ حالت میں پہنچے کیسے ؟

آج ہزاروں ایسے انسان ہیں جو نہیں جانتے کہ اعتراضات ہونے پر کیا کریں۔ اور وہ انسان جو اعتراضات کو صحیح روشنی میں دیکھتا ہے اور اپنی خامیوں کو دُور کرتا ہے۔ وہی انسان اپنی زندگی کے ہر قدم میں کامیاب ہو پاتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اعتراضات کا ردِ عمل کیا ہے، وہ رُکتا ہے، سوچتا ہے کہ مجھ سے کیا غلطی ہوئی، کہاں غلط قدم پڑا۔ جو مجھ پر اعتراض کیا گیا۔
یہ ضرور ہے کہ کسی شخص پر ہم آپ یونہی اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ ہمارے فیصلے کہاں تک صحیح ہیں، اور کہاں تک غلط۔ یہ سوال نہیں ہے۔ بلکہ وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کے اپنے اپنے خیالات ہوتے ہیں۔ اور ان کے اظہار کا ہر ایک کو اختیار ہے۔ جس طرح ہم دوسروں کے اعتراضات پر چوٹ کھاتے ہیں، اُسی طرح ہمارے فیصلوں پر دوسرے چوٹ کھاتے ہوں گے۔

ہمارے صادر کردہ فیصلے عموماً غیر ارادی ہوتے ہیں۔ ہمارا مقصد ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ ہم کسی کے نقائص بتا کر اس کو تکلیف پہنچائیں۔ بس یونہی کوئی بات ہوئی، کسی نے کوئی کام کیا، کسی نے اپنی پسند کا اظہار کیا، ہم نے اپنے خیالات، اپنی پسند ناپسند کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا۔ اب یہ اُس پر ہے کہ وہ ہماری باتوں کو کس انداز میں لیتا ہے۔ زیادہ حساس چلا اٹھتے ہیں ــــــ "میں تمہارے اعتراض پر شاکی ہوں" ــــــ اور اعتراض کرنے والا کہہ دیتا ہے "میں تو دوستانہ رائے دے رہا تھا۔ تم بیکار بگڑ گئے" لیکن وہ نہیں سنتا، اس کی "انا" کہتی ہے کہ دوست کا مقصد اسے تکلیف پہنچانا، اس کی ذلت کرنا تھا۔
فطرت تو یہی چاہتی ہے کہ ہم تمام اعتراضات کی مخالفت کریں۔ یہ ہمارا تحفظ ہے۔ اس طرح ہم اپنی "انا" کا تحفظ کرتے ہیں۔ لیکن جب اس کا احساس بڑھ جاتا ہے تو فطرت میں کمزوری آ جاتی ہے۔ اور ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ ساری دُنیا ہماری دشمن ہے۔ ہم کو مٹانے پر تلی ہوئی ہے۔

اور جب کوئی دوست ہم پر اعتراض کرتا ہے۔ تو ہم کو اور بھی زیادہ تکلیف پہنچتی ہے۔ اگر دوسرا اجنبی، غیر ہماری تعریف میں ایک لفظ بھی کہہ دیتا ہے۔ تو اُسے پھولوں کا ہار سمجھتے ہوئے ہم خوشی سے قبول کر لیتے ہیں، لیکن دوست کے الفاظ ــــــ خواہ

ان میں کتنا ہی خلوص ہو، اور وہ ہماری بہتری کے لئے ہی ادا کئے گئے ہوں — ہماری "انا" کو صدمہ پہنچاتے ہیں۔ اور ہم سوچنے لگتے ہیں کہ دوست کی شکل میں ہمارا دشمن چھپا ہوا ہے۔ ہم یہ چاہتے ہی نہیں کہ جو ہمارے اتنا قریب ہو، وہ ہماری باتوں پر اعتراض کرے، ہمارے اوصاف کو سراہنے سے کترائے۔

حالانکہ ہم کو اپنے دوست ہی کے اعتراضات کی عزت کرنا چاہیئے۔ اور ان پر توجہ دے کر اپنا ہی دامن ٹٹولنا چاہیئے کہ کہیں واقعی کانٹے نہ بھرے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ اس کے اعتراضات غلط ہوں، اور ہم کو یقین ہو کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے۔ ٹھیک نہیں۔ پھر بھی دوست کے اعتراضات کو برا نہ سمجھنا چاہیئے۔ اُس کے اعتراضات چاہے یونہی فطرتاً کئے گئے ہوں۔ مگر اگر ان سے ہم میں بدگمانی پیدا ہوتی ہے تو اس میں ہماری اپنی کمزوری ہے۔ اور اگر ہم پر ان کا غلط اثر ہوتا ہے۔ اور ہم خود اس کے سینے پر زخم لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو قصور ہمارا ہے۔ اس نے ہماری ذلت نہیں کی، ہم نے اس کی توہین کی ہے ——— ہم کو یہی نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم میں سے بعض فطرتاً اپنے کو مظلوم سمجھتے ہیں۔ اور خود اپنے سامنے اپنے کو ایک ایسی ہستی سمجھتے ہیں، جس کی دنیا بھر دشمن ہے۔

ایسی خود رحمی کے شکار آپ کو بہت ملیں گے، یہ لوگ خود اپنے پر ترس کھانے کے عادی ہوتے ہیں۔ اپنی صحت پر، اپنے ماحول اپنے حالات پر اور جو سمجھتے ہیں کہ اگر ان کی تندرستی اچھی ہوتی، حالات سازگار ہوتے۔ تو وہ کچھ اور ہی ہوتے کچھ اور، شاید دنیا کے کامیاب ترین انسان، لیکن وہ کریں کیا، قدرت بھی ان کے ساتھ ناانصافی کرتی ہے۔ اور دنیا بھی؟ ——— جانتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے — وجہ یہ ہے کہ ان میں ہمت نہیں ہوتی، وہ اپنا صحیح مصرف نہیں کرتے۔

خود رحمی کمزوری ہے، لیکن اپنے سے تو مظلومانہ رویہ اختیار کرنے سے بڑی مدد دیتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ یہ ہماری خصلت بنتی جاتی ہے۔ اور پھر ناانصافی کی تلخی نہیں رہتی۔ ہم سوچتے ہیں "ہم تو پیدا ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ ہم پر ظلم ڈھائے جائیں، جانے قدرت نے ہمارے ساتھ یہ ناانصافی کیوں کی" اور اس طرح ہماری کمزوریوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

ہمارے بس میں ہے کہ ہم ان اعتراضات کو اپنی بہتری کے لئے سمجھیں اور ان سے اپنی خامیاں دور کریں۔ اگر ایک دوست لاپرواہی میں بھی، ہماری کسی کمزوری کی طرف اشارہ کرتا ہے، تو اس کے اس اعتراض ہی میں اُس کی قربت اُس کی ہمدردی جھلک رہی ہے۔ وہ آپ کو اپنا سمجھتا ہے، جب ہی تو چاہتا ہے کہ آپ میں فلاں فلاں کمزوری نہ رہے۔

اگر دوست، دوست ہی سے بے تکلف نہ ہو، تو ایسی دوستی کس کام کی۔ یا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے دوست بھی ہمارے ساتھ ایسا سلوک کریں گویا کہ ہم شیشے کے بنے ہوئے ہیں، ہم سے بات کرتے ہوئے ڈریں کہ کہیں کوئی لفظ ہماری شیشے کی بنی ہوئی طبیعت کو ٹھیس پہنچا کر چکنا چور نہ کر دے —— دوستوں کی محفل میں اگر ہر ایک کو یہ خیال رہے۔ تو کوئی بات ہی نہ کریگا اور کچھ دنوں میں یہ محفل اجڑ جائے گی اور آپ کا کوئی دوست ہی نہ ہوگا۔ دوست کو دوست سے تو ایسا بے تکلف ہونا چاہیئے جیسے وہ دونوں ایک ہیں، اور انسان اپنی ہی کمزوریوں کو سوچتے ہوئے نہیں ڈرتا۔ آپ اپنے پر کبھی اعتراض نہیں کیا کرتے کیا؟

اب اس روشنی میں آپ اپنے دوستوں کے اعتراضات کو دیکھیئے۔ غیر کو کیا مطلب جو وہ اپنا قیمتی وقت آپ کے مطالعہ میں صرف

(بقیہ صفحہ ۲۴ پر)

مسز ڈبلیو، ٹی، پی مچیل

عادتیں ڈالنا

اٹھارہ ماہ کا بچہ جب کھانے کی کوشش کرتا ہے تو بسا اوقات اس سے بہت سی غیر ضروری اور بے نتیجہ حرکتیں صادر ہوتی ہیں۔ وہ نہایت جھونڈے طریقے سے چمچہ پکڑتا ہے اکثر اسے جھکا دیتا ہے اور کھانا بکھیر دیتا ہے بعض اوقات وہ اسے منہ تک لے جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور بعض اوقات چمچہ رخسار یا ناک پر آ کر لگتا ہے۔ جب وہ پہلی دفعہ رکابی سے چمچہ بھرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی حرکتیں غیر متعین اور قابو سے باہر ہوتی ہیں۔ وہ چمچے کو کھانے کے اندر غیر ضروری قوت کے ساتھ گاڑ دیتا ہے وہ چمچہ کو رکابی کے کنارے میں مارتا رہتا ہے اور اس انداز سے کہ جیسے کوئی جھاڑو دے اپنے بازو کو حرکت دے کر کھانا منہ تک لے جاتا ہے جس سے اکثر اوقات کھانا زمین پر گر پڑتا ہے۔

سات برس کا بچہ بھی برف پر پھسلنا سیکھنے میں اسی قدر بھدے پن کا اظہار کرتا ہے وہ ادھر ادھر جھولتا ہوا تختے اوپر اپنا وزن قائم کرتا ہے۔ ایک پاؤں آگے بڑھا کر پھسلنے کی کوشش کرتا ہے اور گر پڑتا ہے وہ اپنے بازوؤں اپنی ٹانگوں اور اپنے دھڑ کو غیر ضروری طور پر ہلاتا ہے اپنا جسم آگے کو دیکھنا اسے دشوار نظر آتا ہے۔

سیکھنے کے ان تمام طریقوں کو اگر ہم بنظر غور دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ مشق سے عمل تک کی منازل طے کرنے میں حرکات کی صحت بتدریج ترقی پذیر ہوتی جاتی ہے۔ کھانا سیکھنے میں بچہ ابتدا میں تو غلط حرکتیں کرتا ہے لیکن آخر کار غیر ضروری حرکات کے بغیر پھرتی اور صفائی سے اپنا چمچہ بھر کر منہ تک لیجانا سیکھ لیتا ہے اور سات برس کا بچہ برف پر پھسلنے میں کبھی ادھر پاؤں ڈالتا ہے کبھی ادھر کبھی گر پڑتا ہے پھر اٹھ بیٹھتا ہے اور پھر کوئی اور ترکیب نکالتا ہے۔ حتیٰ کہ آخر کار کوئی نہ کوئی تدبیر پاؤں کو حرکت دینے کے سلسلے میں اس کی سمجھ میں ایسی آجاتی ہے جس کی مدد سے وہ برف پر چند قدم پھسل سکتا ہے۔

بچہ اور لڑکا دونوں اس خاص عضلاتی انداز کو معلوم کر لینے کے بعد جو ان کی کامیابی کا باعث ہوا ہے۔ اس کامیاب انداز کو دہرانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ اس کے قابل اطمینان نتیجہ کا احساس انہیں ذاتی طور پر ہو چکا ہے۔ جوں جوں وقت گذرتا ہے کھانا کھانے اور برف پر پھسلنے کی اس قدر مشق ہو جاتی ہے کہ یہ افعال بطور خود عمل میں آنے لگتے ہیں اور ارادی توجہ کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔

مذکورہ بالا امور کا تجزیہ کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں حرکتوں کے سیکھنے میں بعض چیزیں مشترک ہیں اور یہی بعض چیزیں جسم کے تمام دیگر عضلات کی حرکت سیکھنے میں بھی عام ہیں۔

اوّل دونوں بچوں کو ایک ایسی نئی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس کا کوئی فوری اور مناسب حل ان کے پاس نہ تھا

دوم دونوں سیکھنا چاہتے تھے یعنی دونوں کے پاس ایک داعی یا محرک عمل موجود تھا

سوم دونوں سیکھنے والوں کو چند غیر مرتب حرکات کے تجربہ کرنے اور غلطیوں کے ارتکاب کے دور سے گذرنا پڑا جن میں سے صحیح کارآمد حرکات کا انتخاب کر لیا گیا، اور غیر ضروری حرکتیں مسترد کر دی گئیں

چہارم آخر کار یہ منتخب حرکتیں از خود سرزد ہونے لگیں

پنجم کیونکہ سیکھنے والے کو ان سے حصول مقصد کا اطمینان نصیب ہوا اور

ششم چونکہ اکثر ان کا اعادہ ہوتا رہا۔ سیکھنے والا کس طرح کسی نئی وقت کا مقابلہ کرتا ہے

(۱) تجربہ اور غلطی کا عمل

سیکھنے والا کس طرح کس نئی دقت کا مقابلہ کرتا ہے ہم اس بات کو دیکھ چکے ہیں کہ غیر متعین حرکات کا ایک دور ایک کارآمد حرکت کی تحقیق کرا دیتا ہے۔ نمونہ کی دریافت کو ممکن بنا دیتا ہے۔ لہذا حرکات کی آزادی اور حقیقی تجربہ کامیاب حرکات پر قابو حاصل کرنے کے لئے بمنزلہ بنیاد کے ہیں۔

ایک بچہ جو کسی بوتل کو پکڑنا چاہتا ہے پہلی دفعہ میں بہت سی بیکار اور غیر ضروری حرکتیں کرتا ہے۔ لکھنا سیکھنے والا بچہ شروع میں پاؤں بھی ہلاتا ہے۔ سر کو بھی حرکت دیتا ہے اور اپنی زبان بھی باہر نکالتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ بے کار حرکتیں زائل ہو جاتی ہیں۔ ہاتھ اور بازوؤں کے .... باہمی ربط کی اصلاح اور تکمیل ہو جاتی ہے اور وہ بغیر کسی کاوش کے آسانی کے ساتھ لکھنے لگتا ہے

تجربہ اور غلطی کے اس دور کا مطالعہ کرنا بھی والدین کے لئے سخت دشوار ہے۔ بچوں کی ابتدائی بھدی اور بالآخر کامیاب اور باسلیقہ حرکات میں کامیابی کے انھیں بظاہر کوئی تعلق واسطہ نظر نہیں آتا وہ بچے کے پھوہڑپن اور اس کی ناکامیوں کو دیکھ کر بے صبر ہو جاتے ہیں وہ اکثر اس میں دخل دیتے ہیں اور بچے کو جو مشق خود کرنی چاہیئے وہ اپنے آپ کرانے بیٹھ جاتے ہیں۔ دو برس کا بچہ اپنے کوٹ کے بٹن اپنے آپ لگانا چاہتا ہے۔ وہ بار بار پھسل کر نکل جانے والے بٹنوں کو کاجوں میں سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے وہ مستقل مزاجی اور دلچسپی کے ساتھ اس کام کو انجام دے رہا ہوتا ہے۔ لیکن اس کی ماں بے صبر ہو جاتی ہے۔ وہ جھٹ اس کے بٹن لگا دیتی ہے۔ اس طرح کام تو بے شک جلد ہو جاتا ہے مگر بچہ کو اپنی انگلیوں پر قابو حاصل نہیں ہوتا۔

چھوٹے بچے کے لئے بٹن اور کاج۔ نل کا کھولنا اور بند کرنا۔ بچوں کی موٹر کا چلانا یا ڈھکیلنا۔ جوتوں میں تسمہ ڈالنا اور اس میں گرہ لگانا۔ گیٹسوں کو باندھنا، برتن صاف کرنا، دودھ کو برتن میں ڈالنا۔ انڈے پھینٹنے کی رئی چلانا یہ سب کے سب کام نئی نئی صورت حالات اس کے سامنے پیش کرتے ہیں جس سے اس کے عملی قویٰ میں بیداری پیدا ہوتی ہے اور اسے ان دشواریوں کا معقول حل تلاش کرنا لازمی ہو جاتا ہے والدین اگر ان عامۃ الورود محرکات عمل کو نہ سمجھ سکیں جو بچے کو مختلف کام سیکھنے میں مدد دیتے ہیں تو وہ بچے جسمانی حرکات کی مہارت حاصل کرنے کے مواقع سے اور مادی دنیا کے ساتھ وابستہ ہونے کے لئے ترقی پذیر آزادی سے محروم کر دیتے ہیں۔

چھوٹا بچہ کسی کام کو مشق سے سیکھتا ہے۔ یعنی خود کام کرنے سے بہت سے تجربوں اور غلطیوں کے بعد وہ آخر کار مؤثر اور صحیح طرز عمل معلوم کر لیتا ہے اور ان کامیاب افعال پر بار بار عمل کرتا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے اسے خوشی ہوتی ہے۔ مشق کے زمانہ میں جو غیر ضروری حرکتیں سرزد

ہوا کرتی ہیں وہ رفتہ رفتہ دور ہوجاتی ہیں اور صرف ایک کارآمد حرکت مختلف بے قاعدہ حرکات کی جگہ لے لیتی ہے

بڑوں کو چاہیئے کہ وہ تجربوں اور غلطیوں کے اس دور کو پہچانیں اور اس کا احترام کریں۔ کیونکہ یہ تجربے اور غلطیاں ہر نئے کام کے سیکھنے میں پیش آتی ہیں۔ انھیں یہ بھی چاہیئے کہ کسی کام کو سیکھنے کے لئے بچے کو کافی وقت اور مختلف النوع تجربوں کا موقع دیں اور اعتراض نکتہ چینی اور دخل در معقولات کی بجائے صبر اور ہمت افزائی سے کام لیں

(۲) مشق

بڑے سے بڑا ماہر فن شخص بھی کبھی نہ کبھی مبتدی رہ چکا ہے ہر اصلاح یافتہ جسمانی مہارت کافی مدت کی مشق کو ظاہر کرتی ہے مشق سے مراد کسی خاص کام کو بار بار کرنا ہے۔ مشق کی وجہ سے غیر ضروری حرکات باقی نہیں رہتیں اور رفتہ رفتہ خامیاں دور ہو کر مہارت حاصل ہوجاتی ہے۔ اگر بچوں کو ہم کسی کام کا عادی بنانا چاہتے ہوں تو بار بار کام کرانا ضروری ہوتا ہے کیونکہ کسی خاص حالت میں کوئی کام جتنی زیادہ مرتبہ صحیح طور سے انجام پاتا ہے اسی قدر آسانی اور بے ساختگی سے وہ خود بخود ہونے لگتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جوں جوں وقت گذرتا ہے اور کسی کام کی صحیح طریقے پر تکرار کسی خاص محرک کی وجہ سے بار بار ہوتی رہتی ہے اسی قدر اس پیچیدہ کام کی تفصیلات کی طرف شعور و توجہ کی ضرورت کم ہوتی جاتی ہے طرز عمل کے یہ نمونے کسی مناسب محرک کی وجہ سے جب شروع ہوجاتے ہیں تو پھر ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اس کی ایک عمدہ مثال ایک غور و مطالعہ میں کھوئے ہوئے پروفیسر کی ایک دلچسپ کہانی میں ملتی ہے جو اس تذبذب میں تھا کہ کپڑے پہن کر دعوت میں جائے یا گھر ہی پر ٹھیر کر مطالعہ میں مصروف رہے۔ وہ ابھی کچھ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ یکایک خود بخود اس نے اپنے کپڑے اتارنے شروع کر دیئے اور چند لمحوں کے بعد وہ کپڑے اتار کے بستر پہ دراز ہوگیا۔ اس کی عادت نے اس کے طرز عمل کے متعلق فیصلہ کر دیا

مشق کی کثرت سے کسی کام میں مہارت حاصل کرنے کے لئے بچے کو متواتر ایسے مواقع ملنے چاہئیں کہ جن امور کا عادی ہم اسے بنانا چاہتے ہیں بار بار وہ عمل کر سکے، صفائی، خوش اطواری، سلیقہ مندی، باقاعدگی اور مستعدی، مادی اشیاء کے مفید استعمال کی عادت وغیرہ ایسی باتیں ہیں جو لگاتار مشق کی محتاج ہیں۔ یہ ایسی عادتیں ہیں جن میں بچے کو بڑے ہونے پر بھی تبدیلی کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہوگی اور ایک بڑی حد تک اس کی ساری زندگی میں کام آسکیں گی۔ ان کی جتنی زیادہ مشق ہوگی اتنی ہی وہ آسان ہوتی جائے گی یہاں تک کہ یہ افعال خود بخود سرزد ہونے لگیں گے اور یوں کہنا چاہیئے کہ طبیعت ثانیہ بن جائے گی

بچے کی صحت اور سلامتی کا خیال رکھ کر تحقیق تجسس اور خود کام کرنے کی کوشش میں اس کی حوصلہ افزائی سے کام لیا جائے ہی طریقے سے وہ جسمانی حرکات سے واقفیت اور ان کا باضابطہ استعمال نیز اپنی دنیا کی تمام اشیاء پر قابو اور انھیں مفید طریقے پر استعمال کرنا سیکھ سکتا ہے

کام کی مشق یا تکرار مداومت اور باقاعدگی کی حالت ہی میں نتیجہ خیز ہوسکتی ہے۔ بچوں کے لئے ایک خاص نظام عمل بنا دینے کے بعد اس کا پابند اور عادی ہوجانے تک اس میں تبدیلی کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے۔ ابتدا میں مؤثر ترین طریقہ یہ ہے کہ کسی خاص عادت کی مشق یکساں حالات میں ہونی چاہیئے۔ مثلاً جب ہم سونے کی عادت کو پختہ کرنا چاہتے ہیں تو مناسب یہ ہے کہ بچہ کو مخصوص حالات میں واقعات کی ایک مقررہ ترتیب کا عادی بنا دیا جائے جو اس کے بستر پر پہنچ جانے پر ختم ہوں۔ سونے کا مقررہ وقت بچے کی اپنی خوابگاہ اور بستر اور سونے کے متعلق مقررہ تیاریاں جن کی ابتدا اس قسم کے گیت سے ہو کہ "سونے کو چلو، سونے کو چلو" یا چلو آگیا وقت آرام کا" اور پھر علی الترتیب کپڑے اتارنا

غسل، سنگار، شب خوابی کا لباس پہننا، سوتے وقت کا دودھ وغیرہ، مختصر سی کہانی، تسکین بخش لوری، رخصت کے وقت کا پیار، دستِ محبت کی تھپکی، روشنی کا گل کیا جانا اور پر مسرت "شب بخیر" کہنا عمل میں آئے۔ اس نظام عمل کا ہر ایک حصہ اگر پورا کیا جاتے تو آنے والے کام کی جانب بچہ کی توجہ منعطف کر دیتا ہے اور اس کی قبولیت کے لئے اس میں آمادگی پیدا کر دیتا ہے اور اس طرح بآسانی حسب مراد عادتیں اس کی طبیعت میں راسخ ہو جاتی ہیں

ننھی موزے پہن چکی اور اپنی گڑیا کو پیار کرنے چلی تو ماں نے پوچھا "اب کیا کرو گی بیٹی" اس نے جواب دیا "جوتی پہنوں گی" اور جب وہ اپنی جوتی کے پاس پہنچ گئی تو ماں نے کہا "ہاں بیٹی ٹھیک ہے"

ننھی اس طریقے پر یہ بات سیکھ رہی تھی کہ کسی خاص کپڑے کے بعد کیا پہننا چاہیئے اور کامیابی کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہونے کی ذمہ داری اختیار کر رہی تھی۔ منّے نے بنیان پہنکر کہا "امّاں اب کیا کروں" اس طرح منّا یہ بات سیکھ رہا تھا کہ کپڑے پہنتے وقت ہر بات میں ماں کی ہدایات کا منتظر رہے اور ذمہ داری اپنی ماں پر ڈالے۔

(۳) دل خوش کن اثرات کی قدر و قیمت

ایک زمانہ میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ محض مشق سے عادتیں پختہ ہو جاتی ہیں اور بسا اوقات لوگ یہ دیکھکر متعجب اور مایوس ہو جاتے تھے کہ وہ عادتیں جن کا التزام کسی بزرگ کی نگرانی میں سالہا سال تک رکھا گیا تھا وہ نگرانی ختم ہو جانے پر فوراً ترک کر دی گئیں، بچے کے مسرت و اطمینان اور اس کی عادت کی کامیاب پختگی کا آپس میں جو تعلق ہے اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں کافی عرصہ لگا ہے۔

ہم میں سے قریب قریب ہر شخص اس بات سے واقف ہے کہ بچہ جب کسی کام کے کرنے میں کامیاب ہو جائے اور وہ اس کے لئے خوش آیند اور اطمینان بخش بھی ہو تو وہ اس کو مکرر کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ خواہ بچہ ہو یا جوان وہ ان سرگرمیوں سے پہلو تہی کرنے کی کوشش کرتا ہے جن کا نتیجہ غیر اطمینان بخش یا ناخوشگوار ثابت ہو چکا ہے اس بات کے یقین کرنے کی وجہ موجود ہے کہ حرکات کی مشق میں نتیجہ ایک اہم جزو ہے۔ اس مشق سے جو پریشانی یا ناکامی کے جذبات پر مشتمل ہو ہر شخص بچے کے لئے فکر مند رہتا ہے اور ان افعال کو مکرر سہ کرر کرنے کے لئے جو کامیابی اور اطمینانِ قلب پر مشتمل ہوتی ہیں ہر شخص آمادہ رہتا ہے۔

کام کے اطمینان بخش اثرات کے یہ معنی ہیں کہ ان کاموں کی جو عادت پڑے گی وہ دائمی ہوگی اور طبیعت ثانیہ بن جائے گی کیونکہ وہ دل کو مرغوب ہے، اور بچے کی مرضی اور اس کا شوق اس کا باعث بنا ہے

اس میں شک نہیں کہ اس راہ میں کافی عملی دشواریاں ہیں۔ نمایاں کامیابی کے ساتھ جس کام کا کرنا آجائے خواہ یہ کامیابی کتنی ہی ذرا بھی ہو ایسے کام کرانے کے لئے تو ضروری ہے، لیکن اگر کامیابی نہ بھی ہو تب بھی تعریف و تحسین کے ذریعے سے، اور بعض اوقات انعامات دیکر ہمیں کوشش یہ کرنی چاہیئے کہ جس کام کی ہم بچے میں عادت ڈالنی چاہتے ہیں اس کے ساتھ خوشی اور اطمینان قلب کے جذبات شامل کر دینے چاہئیں۔

کسی آدمی کو تعلیم دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تعلیم کو مسرت و اطمینان کا ذریعہ بنا دیا جائے اور اس سلسلے میں اس حقیقت کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اگر کوئی ایسا فعل بھی جو حقیقت میں خود پر مسرت نہ ہو کسی پر مسرت فعل سے متعلق کر دیا جائے خواہ یہ تعلق مصنوعی ہی کیوں نہ ہو تو اس تعلق ہی سے وہ کچھ نہ کچھ پر مسرت ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس اگر ہماری خواہش یہ ہے کہ بعض افعال سے بچے احتراز کریں تو ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ایسے افعال بچوں کی نظر میں ناخوش گوار اور غیر اطمینان بخش معلوم ہوں۔

ایسے افعال کو جن کے ساتھ تکلیف بے اطمینانی اور بے آرامی شامل ہو انسان کو اس فعل سے اجتناب پر مائل کر دیتے ہیں۔ بچے کو جسمانی یا دماغی سزا دینے میں ایک بڑی حد تک ہم اسی اصول سے کام لیتے ہیں۔ خیال یہ ہے کہ کسی فعل کو غیر اطمینان بخش بنا کر ہم اس کی تکرار کو روکتے ہیں۔ اگر سزا خود کسی فعل ہی کے اندر مضمر ہو تو یہ تعلیمی نقطۂ نظر سے بہترین ذریعہ ممانعت ہے۔ لیکن بچہ کو یہ سمجھا دینا چاہیئے کہ یہ کسی خاص فعل کا لازمی نتیجہ ہی ہے جو پیدا ہوا۔ ورنہ یہ طریقہ مؤثر ہو گا بے ادبی کی سزا کے طور پر کسی بچے کو سونے کے لئے خواب گاہ میں بھیجدینا کسی بچے یا جوان کے لئے مشکل ہی سے معقول سزا کہلا سکتا ہے۔

اگر بعض افعال غیر مناسب ہوں اور ہماری خواہش یہ ہو کہ بچے انھیں ترک کر دیں تو فقط ترک کرانے کے خیال کو پیش نظر رکھ کر ان کے ساتھ کوئی ناخوش گوار نتیجہ شامل کرنے کی بجائے اس مسئلہ کو اس طرح حل کرنا چاہیئے کہ غیر مناسب افعال کی بجائے بعض ایسے مناسب افعال کا انتخاب کریں کہ جن کے ہمراہ خوش گوار کیفیات شامل ہوں۔

اس چھوٹے بچے کو جو اپنے منہ میں پن رکھ لیتا ہو آل پنوں کی گدی میں آلپنیں لگانا سکھایا جا سکتا ہے جو بچہ جنگجو ہو اس کے جذبہ کو منظم کھیلوں کے ذریعہ خارج کیا جا سکتا ہے یا ایسے گروہ سے کھیل کی بعض چیزیں بنوائی جا سکتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ ان کا یہ میلان دوسروں کو دق کرنے لڑنے اور سامان کو خراب کرنے میں صرف ہو۔

(۱) مسز رسل نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ اس کا دو برس کا بچہ بل جب کھیل کے بعد گھر آیا تو اس نے اپنی ٹوپی اور اپنا کوٹ فرش پر کھونٹی کے نیچے رکھدیا۔ اس کے باپ نے کہا "بل ہم تمہارے لئے کچھ کھونٹیاں لگوا دیں گے اتنی نیچی کہ تمہارا ہاتھ آسانی کے ساتھ پہنچ سکے اب باپ اور بیٹے کی باہمی رضامندی سے فیصلہ ہو گیا کہ یہ کھونٹیاں کہاں لگیں۔ بل نے کھونٹیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "اباکی کھونٹیاں" "اماں کی کھونٹیاں" "بل کی کھونٹیاں" اب بل کو اپنے کپڑے اپنی کھونٹیوں پر لٹکانے میں بڑا مزا آتا ہے بل خوشی اور اطمینان کے ساتھ "اپنی مدد آپ کرو" کے اصول سیکھ رہا ہے جنہیں عقلمندانہ باپ نے اس کے لئے کافی خوشگوار بنا دیا ہے

(۲) جارج کے باپ نے جارج کے ٹوپی اور کوٹ کو فرش پر رکھنے سے اعتراض کیا۔ اس نے کہا "تم کو اپنی چیزیں ان کھونٹیوں پر لٹکانی چاہئیں"۔ جارج نے ایک کرسی اٹھالی اور بہت کوشش اور دشواری کے بعد وہ اونچی کھونٹیوں پر اپنی چیزیں لٹکا سکا۔ اس کام کے کرنے میں اسے اتنی زحمت ہوئی کہ وہ قریب قریب رو پڑا۔ جارج کو بھی "اپنی مدد آپ کرو" کی مشق کا عادی بنایا گیا لیکن اس طرح کہ اس کے ساتھ غیر ضروری تکلیف اور بے اطمینانی شامل تھی۔

بچے میں صحیح عادت پیدا کرنے کے متعلق کاموں کے ساتھ خوش گوار اثرات کی شمولیت کو جو اہمیت حاصل ہے اگر ہمیں صحیح اندازہ ہو تو ہم بچے کی تربیت کے متعلق ہر ایک چیز کا تجزیہ کرنا ضروری خیال کریں گے ہمیں یہ سوال کرنا پڑے گا کہ بچہ کیا سیکھ رہا ہے یہ ممکن ہے کہ وہ انتہائی انہماک اور پابندی کے ساتھ کسی کام کی مشق کر رہا ہو پھر بھی ساتھ ہی ساتھ یہ ممکن ہے کہ وہ ایسے جذبات کی بھی پرورش کرنا اور عادت ڈالتا ہو جو نہ صرف اس اصل کام کی عادت پڑنے میں مزاحم ہوں، بلکہ خود بھی برے اور نامرغوب ہوں۔ کھانا کھاتے وقت بچے کو جھڑکنے اور حرف

گیری کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم جو عادتیں بچے میں پیدا کرنی چاہتے ہیں ان کے ساتھ ساتھ کچھ ناخوشگوار کیفیات بھی شامل کئے دیتے ہیں بچہ جب اپنے قصور کا اعتراف کرے تو اس کے لئے اسے ملامت کرنا اکثر یہی نتیجہ پیدا کرتا ہے کہ اس کی سچ بولنے کی عادت چھوٹ جائے بچوں سے ان کی بساط سے زیادہ کام لے کر، یا کام کا معیار بہت اونچا مقرر کر کے ہم گھر کے کاموں کو بچوں کے لئے ناخوش آیند بنا دیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کاموں میں مدد دینے کی اور ذمہ داری محسوس کرنے کی عادات کی تعمیر رک جائے گی

ایک دوکاندار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سودا خریدنے کو اپنے گاہکوں کے لئے ایک دلچسپ اور خوشگوار کام بنا دے۔ اسی طرح زیر تربیت بچے میں کچھ خاص عادتیں پیدا کرنے کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ ان عادتوں کے ساتھ یا ان کاموں کے ساتھ کچھ کیفیات یا حالات ایسے شامل کر دئے جائیں کہ بچے کو ان کاموں کے کرنے میں لطف آئے اور وہ ان سے خوش ہو۔

تربیت پذیری کا جزو اعظم شوق ہے

ایک مشہور مقولہ ہے کہ "تم گھوڑے کو زبردستی پانی تک تو لے جا سکتے ہو لیکن زبردستی پانی پلا نہیں سکتے" بچے کو کوئی بات سکھانے کے متعلق بھی یہ مقولہ اسی قدر صحیح ہے بچوں کو کچھ سکھانے کے لئے جن حالات کی ضرورت ہے وہ سب مہیا کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن تاوقتیکہ بچہ خود دلچسپی نہ لے اور سیکھنے کی خواہش اس میں پیدا نہ ہو وہ بہت ہی کم سیکھ سکتا ہے۔

ابتدائے طفلی میں سیکھنے کے متعلق بچوں کے شوق کا کام ان کی جسمانی ضروریات دیتی ہیں جب بچہ بھوکا ہوتا ہے تو وہ بوتل کو پکڑنا اور کچھ عرصہ کے بعد اس سے دودھ پینا سیکھتا ہے۔ جب وہ ذرا بڑا ہوتا ہے تو اس کے دل میں پہلے گھٹنیوں چلنے کی اور پھر کھڑا ہو کر چلنے کی تحریک ہوتی ہے۔ جب پاؤں پاؤں چلنے لگتا ہے تو اس کا ماحول وسیع تر ہو جاتا ہے اور اس کے تعلیمی تجربوں کا دائرہ غیر متعین حدود تک پھیل جاتا ہے چونکہ اسے ہر چیز سے دلچسپی ہوتی، اور ہر چیز کے پکڑنے اٹھانے، بنانے قابو میں لانے کی خواہش دل میں موجود ہوتی ہے اس لئے جسمانی عضلات کی پیچیدہ تر حرکات سیکھنے کا شوق یا محرک پیدا ہو جاتا ہے۔

جب بچہ بڑا اور زیادہ پختہ کار ہو جاتا ہے اور خاندانی حالات کے زیر اثر زندگی بسر کرتا ہے جہاں اس کے حقوق اور خواہشات کا دوسروں کے حقوق اور خواہشوں سے ہمیشہ تصادم ہوتا ہے تو تحریک عمل میں بہت سی شاخیں نکلتی چلی آتی ہیں اور گوناگوں کاموں کی تحریک ہوتی رہتی ہے

کھانا کھانے کا مقصد اب صرف پیٹ بھر لینے کی بجائے یہ ہوتا ہے کہ خوب سلیقہ سے کھانا کھایا جائے تاکہ ماں خوش ہو کسی چیز کو محض پکڑنے کی بجائے اب اس کو اس طرح پکڑنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ کوئی کارآمد صورت اختیار کرے اور چکنی مٹی سے سگار کی راکھ رکھنے کی تھالی بن جائے جو باپ کو بڑے دن پر بطور تحفہ کے پیش کی جا سکے۔ داعی یا محرک خواہ آسان ہو خواہ مشکل تر۔ خواہ براہ راست نتیجہ ہو بنیادی ضروریات اور مادی حالات کا یا ان سے پیدا شدہ غیر مادی کیفیات کا بہرحال مناسب تعلیم کے لئے اس کا وجود ضروری ہے

بچوں کو ناخواستہ کاموں سے باز رکھنے کا ایک عام اور غیر مفید طریقہ بڑوں نے یہ اختیار کر رکھا ہے کہ بچوں پر زبردستی کی جائے یعنی بچوں کو سزا الزام سے یا ناپسندیدگی کا خوف دلا کر کسی کام سے باز رکھتے ہیں۔ کچھ کرنے کے متعلق اس کے فطری رجحان کو دبایا جاتا ہے اور اس رجحان کو کسی مناسب تعمیری کام کی طرف نہیں لگایا جاتا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے کسی تیز رو موج کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی جائے

تو اسے عمل اپنے لئے راستے کئے بغیر نہ رہیں گے اور اگر اس سلسلے میں بچہ کی رہنمائی نہ کی گئی اور اس کی قوت عمل کے لئے مناسب راستے نہ نکالے گئے تو اس کا نتیجہ ہوگا کہ چشمہ ابل پڑے گا، اور سرکشی، بد لحاظی اور گھر سے فرار کی شکل اختیار کرے گا۔

مفید اور کارآمد تربیت یہ نہیں ہے کہ کوئی خاص طرز عمل بچے کے دماغ میں بھر دیا جائے بلکہ یہ کہ اس کی اندرونی طاقتوں سے جو اسے آگے بڑھاتی ہیں اس طریقے پر کام لیا جائے کہ وہ مروجہ تہذیب کے مطابق قابل اطمینان طریقے پر معرفت نفس حاصل کرے۔

بچے کی فطرت اور جسمانی ساخت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرے اس کی تعلیم پیدا ہوتے ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ بچہ کی عادتوں پر اور اس کے نشو و نما پر اس کے تجربات کا بہت اثر پڑتا ہے۔ خواہ اس کے والدین ان تجربوں کو اس کے لئے منظم اور باقاعدہ بنائیں یا نہ بنائیں۔

بچہ اپنے ہر تجربہ سے اثر پذیر ہو کر کوئی نہ کوئی عمل کرتا ہے، اور یہ عمل اسکی اندرونی خواہشات کے مطابق ہوتا ہے لیکن اس طرز عمل میں ضرورت کے مطابق ڈھل جانے کی بڑی صلاحیت موجود ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے اور پورے طور پر کسی ایسے تجربے سے اثر پذیر ہو سکتا ہے جس میں کافی قوت ہو اور جس کا بار بار اعادہ ہوتا رہے

بڑوں کا پوری توجہ کے ساتھ کوئی لائحہ عمل تیار کرنا اور ان کی دانشمندانہ رہنمائی آسانی کے ساتھ، طبعی طور پر، اور تعمیری لحاظ سے بچہ کی تعلیم میں معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے سرپرستوں کا اہم فرض یہ ہے کہ بچپن ہی سے ان کی مناسب رہنمائی کے لئے کافی غور و خوض کے بعد کوئی لائحہ عمل تیار کریں۔

- پیٹولوجی مرتبہ

سعید ملک

بچّے اور کہانیاں

آج کا بچہ کل کا باپ ہے۔ قوموں کی حیات و موت کا سارا دارومدار صرف اور صرف آج کے بچوں پر ہوتا ہے کل وہی قوم کے جوان بن کر قوم کی کشتی کے ناخدا بنیں گے۔ ہم اکثر یہی خیال کرتے ہیں کہ بچے اپنے اندر کوئی امیدوں کی دنیا نہیں رکھتے حالانکہ بچے اپنی ایک دنیا رکھتے ہیں تمنّاؤں، خواہشوں اور آرزوؤں کی دنیا جس میں وہ ہر روز کئی خیالی محل بناتے ہیں بچوں میں اگر اپنی خیالوں کی دنیا نہ ہو تو وہ بڑے ہو کر اپنی قوت متخیلہ سے حیران کر دینے والے کارنامے نہ کر سکیں۔ بچوں کی قوّت متخیلہ کو ہم بچپن ہی میں مضبوط بنا کر اس کے لئے دنیا کے شاداب راستے کھول سکتے ہیں۔

بچّہ جب اس نئی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اسے اپنے محدود ماحول سے جُدا ہونے کا بہت دکھ ہوتا ہے چونکہ بچہ اس اپنی پریشانی اور ماحول سے جدا ہونے کے غم کو بیان نہیں کر سکتا لہٰذا وہ رونا شروع کر دیتا ہے۔ بچہ اس نئی دنیا کے کسی حصّہ سے واقفیت نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ زبان سے کچھ ادا کر سکتا ہے رونے کے سوا کوئی چارہ نہیں، جیسے جیسے بچّہ اس دنیا میں زندگی بسر کرتا جاتا ہے دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے جاتے ہیں۔ بچہ اس جہاں سے مانوس ہوتا جاتا ہے ہر روز بچّہ ترقی کے منازل طے کرتا رہتا ہے۔ بچوّں کے اندر تحقیق و تجسّس کا مادہ بڑوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے چنانچہ ایک ماہ کا بچّہ بھی بڑی بڑی چیزوں کو بڑے غور سے دیکھتا ہے اور چار ماہ کا بچّہ چلتے ہوئے لوگوں کا اپنی آنکھوں سے پیچھا کرتا ہے۔ جہاں تک وہ اپنی نظروں سے ایک شخص کا پیچھا کر سکتا ہے وہاں تک وہ پورے انہماک سے اس کو دیکھتا رہتا ہے اور پھر وہاں سے اگر کوئی آ رہا ہو تو اپنی نگاہیں اس پر گاڑ دیتا ہے اس کے ساتھ ساتھ واپس آتا ہے۔ چھ ماہ کا بچہ بہت سے ارکان تہجی بھی زبان سے ادا کرتا ہے، نو ماہ کا بچّہ دادا، آبا، امی وغیرہ کے الفاظ صاف طور پر استعمال کرتا ہے۔ دو سال کا بچّہ چھوٹے چھوٹے فقرے بھی ادا کرتا ہے اور بہت سے کام کرنے کے علاوہ اس میں تحقیق کا مادہ بھی پیدا ہو جاتا ہے، وہ ہر چیز کو ایک معلوماتی انداز سے دیکھتا اور شکلوں کو پہچان لیتا ہے اپنی عمر کے بچوں کے ساتھ بیٹھنے اور کھیلنے میں اسے لطف حاصل ہوتا ہے۔ بچوّں کے جذبات سے ناواقف ماں باپ انہیں دوسرے ہم عمروں سے کھیلنے سے ہر وقت روکتے رہتے ہیں حالانکہ بچّہ اپنے ساتھی سے جُدا ہوتے ہوئے بڑا دکھ محسوس کرتا ہے ان ماں باپ کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بچّہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر کیا کیا حاصل کرتا ہے تعلیم و تربیت کے زمانے میں بچّے کو جو چیز سب سے بُری معلوم ہوتی ہے وہ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، ایسا مت کرو، وہاں نہ جاؤ، اس کے ساتھ مت کھیلو اس قسم کے احکام بچّے کی فطرت پر بُرا اثر ڈالتے ہیں، متواتر ایسے احکام اگر بچّے کو دیئے جائیں تو بچہ باغی و سرکش بن جاتا ہے۔ بچّے کو اگر کسی چیز سے منع کیا جائے تو اس میں اس کے متعلق کئی

قسم کے خیالات پیدا ہوں گے وہ اس چیز کی طرف بھاگ کر جائے گا جس سے اسے روکا جائے بچے کے اندر بے صبری زیادہ ہوتی ہے اس کی تمام ضروریات فوری ہوتی ہیں۔ اس کا ماضی تو ہوتا نہیں اور مستقبل کیوں ہونے لگا۔ وہ حال ہی حال کو جانتا ہے۔ تین سال کی عمر میں بچہ کہانیاں سننا پسند کرتا ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ بچہ گھر ہی سے پہلا سبق سیکھتا ہے اس کا پہلا مدرسہ ماں کی گود ہے اور دوسرا گھر کا ماحول۔ اگر یہ مدرسہ اور ماحول بچے کے جذبات سے اچھی طرح موافق ہو تو بچے کے مستقبل کی بنیاد مضبوط رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں ماں باپ کی کم علمی اور بچوں کی نفسیات سے جہالت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بچے کہانیاں تو سنتے ہیں لیکن ان کہانیوں میں بچے کے سن و سال کے مطابق کوئی تدریجی اصول نہیں رکھا جاتا جس پر چل کر ہم بچے کے ذہن کو اپنی آرزو کے مطابق کسی سانچے میں ڈھال سکیں۔ بچے کی فطرت میں تجسس اور تحقیق کا مادہ بڑوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے اندر کام کرنے کا جذبہ ہوتا ہے ہر وہ نیا کام جو اس کے سامنے آئے اسے خود کرنے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے اور کسی دوسرے کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔ وہ اپنا لباس پہننے اور اتارنے کی کوشش کرتا ہے، کھانا بھی خود ہی کھانا چاہتا ہے اسوقت ماں باپ کا یہ فرض ہے کہ وہ ایک رہبر کی حیثیت سے بچے کی رہنمائی دوستانہ رنگ میں کریں اس پر کوئی چیز ٹھونسنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر بچے کے ذوق میں دخل دیا جائے تو چڑ جائے گا۔ اندیشہ ہے کہ اس کے جوہر فطری جن کو وہ بروئے کار لانا چاہتا ہے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں اور اسے اپنے ذہن سے کام لینے کی عادت نہ رہے۔ جو کام ہم اپنی مرضی کے مطابق بچے سے کروانا چاہیں ضروری ہے کہ اس میں کوئی دلچسپی پیدا کر دی جائے۔ بچوں کو اگر کوئی پند و نصیحت کی بات کہنی مقصود ہو تو اسے دلچسپ کہانی کی صورت میں پیش کیا جائے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بچے تین سال کی عمر میں ٹھوس حقیقتوں کی بجائے دلچسپ کہانیاں زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے جس میں بچہ حقیقتوں کی دنیا سے بہت دور رہتا ہے اسی عمر میں بچہ حیرت انگیز کہانیوں کو بڑے ذوق و شوق سے سنتا ہے رابن ہڈ کی کہانی جب بچے سنتے ہیں تو ان میں رابن ہڈ کے جیسے کارنامے سرانجام دینے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ بچے رابن ہڈ کو اس لئے پسند نہیں کرتے کہ وہ قانون کا باغی تھا بلکہ بچے اسے اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ غریبوں اور بچوں سے محبت کرتا تھا۔ ہمارے دیہاتوں میں شام کو جب لڑکیاں لڑکے مختلف ٹولیاں بنا کر کھیلتے کودتے ہیں تو ان میں سے بعض بچے بلند آواز سے "جگا" کی تانیں لگاتے ہیں تو چھوٹی عمر کے بچے بڑی دلچسپی اور انہماک سے سنتے ہیں۔ جنوں اور پریوں کی کہانیاں بھی اس عمر میں بچہ جھوم جھوم کر سنتا ہے، کیونکہ اس کا ذہن ابھی پختہ نہیں ہوتا وہ بھی سبز پری اور لعل شہزادہ کی کہانی سن کر اپنے آپ کو بھی لعل شہزادہ تصور کرتا ہے وہ اسی کی طرح ہوا میں اُڑ کر دشمنوں سے لڑ کر اپنی منزل تک پہنچنے کی لگن لگاتا ہے۔ اس قسم کی کہانیوں سے بچے میں بلند ارادے اور دنیا میں کامیابی کے لئے جدوجہد کے جذبات پیدا ہوتے ہیں نیز بچہ اپنی قوت متخیلہ پر بھی زور دیتا ہے جس سے بلند پروازیاں پیدا ہوتی ہیں۔

جیسے جیسے بچہ اپنے سن و سال میں ترقی کرتا جاتا ہے اور شعوری دنیا میں بھی قدم رکھتا چلا جاتا ہے تو وہ جنوں اور پریوں کی کہانیوں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا اس میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ سب کارنامے جو لعل شہزادے نے سبز پری کو حاصل کرنے کیلئے

سرانجام دینے اسکے بس کا روگ نہیں، یہ سب کہانیاں ہی کہانیاں ہیں۔ یہ زمانہ چھ سال تک کی عمر کا ہوتا ہے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماں باپ چھ برس تک بچوں کو جنوں اور پریوں ہی کی کہانیاں سناتے رہتے ہیں لیکن صحت مند ذہین بچے چھ سال کی عمر سے پہلے ہی ذہنی ترقی کے منازل طے کرلیتا ہے ماں باپ کو چاہیئے کہ وہ بچے کے ذہن اور اس کی ذہنی ترقی کو مدنظر رکھ کر کہانیاں سنائیں کیونکہ بعض اوقات بچہ اس قسم کی کہانیوں سے احساس کمتری کا شکار ہوجاتا ہے۔ احساس کمتری سے بچے کو ہر حالت میں بچانا لازمی ہے۔

چھ سال اور دس سال کی درمیانی عمر میں بچے کے اندر زندگی کی ٹھوس حقیقتیں قبول کرنے کی بتدریج بہت قابلیت پیدا ہوجاتی ہے، ماں باپ کو بچے کی اس ذہنی تبدیلی اور ترقی کی طرف خاص طور پر دھیان دینا چاہیئے کیونکہ اس عمر کا بچہ حقائق کو قبول تو ضرور کرتا ہے اگر ان حقائق کو غیر دلچسپ انداز میں بچے کے سامنے پیش کیا جائے تو فائدے کی بہ نسبت نقصان کا زیادہ احتمال ہے، لہٰذا حقائق کو ایسے دلچسپ پیرائے میں پیش کرنا چاہیئے کہ بچہ اس میں غیریت محسوس نہ کرے اسے یہ محسوس نہ ہو کہ جو مزیدار کہانیاں امی جان ہمیں سنایا کرتی تھیں اب ابا جان خشک اور بے مزہ باتیں کرتے ہیں۔ والدین کو چاہیئے کہ حقیقی کہانیوں سے روشناس کراتے وقت بچے کی دلچسپی کا خیال ضرور رکھیں بچے کی ذہنی ساخت کے مطابق اسے جرارت، بہادری، نئی نئی ایجادات اختراعات کی کہانیاں اس رنگ میں سنائیں کہ بچے کے اندر بھی دنیا میں نام پیدا کرنے اور کوئی نادر چیز ایجاد کرنے کا دلی شوق پیدا ہوجائے اور بڑے ہوکر ملک و ملت کے کام آئیں۔

دس سال کی عمر کے بعد بچہ حقیقی دنیا سے اور زیادہ مانوس اور پہلے کی نسبت وہ سرگرم زمانہ سے زیادہ آشنا ہوجاتا ہے خیالی دنیا سے بہت بلند وہ اب حقیقی دنیا کی باتیں کرتا ہے۔ لیکن کہانی سننے کا شوق اب بھی اس کے اندر موجود ہوتا ہے۔ اس عمر میں بچے کو سچی، حقیقی اور تاریخی کہانیاں بڑے آسان پیرائے میں سنانا چاہئیں لیکن اس عمر میں بچوں کو ناموں کے جنجال میں نہیں ڈالنا چاہیئے اگر بچے کو نام یاد رکھنے پر مجبور کیا گیا تو کہانیوں سے نفرت کرنے لگے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ بچے کو زندگی کے گر بھی آسان لفظوں میں بیان کرنے چاہئیں لیکن ان کا طرز بیان اتنا خوبصورت اور دلچسپ ہو کہ بچہ اسے بڑی دلچسپی کے ساتھ سنے۔ اگر کسی بڑے آدمی کا قصہ اس کے سامنے بیان کیا جائے تو اس کے ذہن سے سب سے پہلے اس امر کو نکالنا ضروری ہے کہ فلاں آدمی اس لئے اتنا بڑا بن گیا کہ وہ شہزادہ یا امیرزادہ تھا بلکہ اس نے محنت اور متواتر کوشش سے یہ مقام حاصل کیا ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ تم بھی کسی وقت اس مرتبے تک پہنچ جاؤ۔ اس سے بچوں کے اندر محنت اور کوشش کے جذبات پیدا ہونگے۔

بچوں کے سامنے جب بھی کوئی کہانی بیان کی جائے تو اس امر کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ کہانی کا نتیجہ کسی وقت بھی بیان نہ کیا جائے اور نہ ہی کہانی کے اختتام پر کوئی پند و نصیحت کی بات بیان کرنی چاہیئے بلکہ یہ کام بچے پر چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ خود اس کا نتیجہ معلوم کرے یا کوئی نصیحت آموز امر کی تلاش کرے۔ ✦

عبدالشکور اختر ایم۔اے

آپ کی شخصیت

آپ نے کبھی نہ کبھی دریا کو بہتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ اس کی روانی اور زور و شور بھی دیکھا ہوگا۔ لیکن کبھی آپ نے اسی دریا کا منظر اس مقام پر بھی دیکھا ہے جہاں سے وہ نکلتا ہے؟ اگر ایسا اتفاق ہوا ہے تو آپ چند لمحوں کے لئے ضرور حیرت میں پڑ گئے ہونگے کہ یہ پانی کی پتلی سی دھار آگے چل کر کس قدر تیز و تند دریا بن جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ دریاؤں کی جغرافیہ سے واقف ہیں تو آپ کا استعجاب دیر تک قائم نہیں رہے گا کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ

(۱) پہاڑ سے نکلی ہوئی پانی کی لکیر میں چھوٹے چھوٹے نالے آکر ملتے رہتے ہیں۔

(۲) قطرہ قطرہ مل کر دریا کی شکل اختیار کر لیتا ہے

(۳) اور یہ کہ دریا کو طوفاں خیز بنانے میں پانی کے ہر قطرہ کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہے۔

اب جب کہ آپ اس مسلّمہ حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں تو ذرا یہی مثال پوری قوم اور اپنی شخصیت پر منطبق کر کے تو دیکھئے ——— کیا آپ کی شخصیت چاہے وہ قطرہ کے مانند ہی سہی آپ کے ملک یا آپ کی قوم جو دریا کے مانند ہے اس میں دریا کی سی قوت پیدا کرنے میں کچھ کم و بیش حصہ نہیں لیتی؟ یقیناً لیتی ہے ——— تو پھر آپ اس اصولی بات سے کیوں انکار کرتے ہیں۔ اگر آپ اپنی شخصیت کو ایک بڑے لیڈر کے مقابلہ میں ہیچ سمجھ کر یہ سوچتے ہیں کہ آپ کی ہستی یا ایک محدود دائرے میں آپ کی جدوجہد ملک و قوم کی اجتماعی ترقی میں نہ تو کوئی پارٹ ادا کر سکتی اور نہ کرتی ہے تو یہ آپ کی بڑی بھول ہے۔

اچھا آئیے اسی بات کو ایک اور دوسری مگر واضح مثال سے سمجھئے ——— ایک بڑی مشین سینکڑوں مختلف چھوٹے بڑے پرزوں کا مجموعہ ہوتی ہے جب تک اس مشین کا ہر پرزہ اپنی جگہ ٹھیک کام کرتا رہتا ہے تو وہ باقاعدگی کے ساتھ چلتی رہتی ہے جہاں ایک چھوٹا سا اسکرو بھی ڈھیلا پڑا تو مشین کے کام میں فرق آیا یہاں تک کہ مشین کے صحیح طور پر چلنے میں جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ بھی تبدیل ہو جاتی ہے اور جاننے والے فوراً بھانپ جاتے ہیں کہ مشین میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔

اب آپ ہی بتائیے کہ کیا مشین کے ٹھیک سے کام کرنے کا تمام تر دارومدار بڑے بڑے پرزوں ہی پر ہوتا ہے۔ سوچئے تو اگر اس مشین کے تمام چھوٹے چھوٹے اور بظاہر معمولی اسکرو ڈھیلے پڑ جائیں تو اس مشین کا کیا حشر ہو۔ کیا کوئی بھی انجینیر اس مشین کو صرف بڑے بڑے پرزوں کی مدد سے چلا سکتا ہے؟

پرزے چھوٹے بڑے ضرور ہوتے ہیں لیکن اپنی جگہ ہر ایک اہم ہے۔ آپ بھی قوم کی مشین کا ایک پرزہ ہیں جو کام بھی آپ کو سپرد

کیا گیا ہے یا یوں کہیئے کہ جو پیشہ جو فن یا جو بھی کام آپ نے اپنے لئے انتخاب کیا ہے اُسے پوری تندہی اور جاں نشانی سے انجام دیجئے۔ خود کو یا اپنے کام کو جو آپ کرتے ہیں حقیر سمجھ کر سست نہ پڑ جائیے۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے ملک کی حفاظت ایک بڑا لیڈر یا صرف محاذِ جنگ پر لڑنے والا سپاہی کرتا ہے۔ نہیں! یہ خیال صحیح نہیں۔ اچھا ذرا بتایئے کہ آپ کیا کام کرتے ہیں ——— جوتا بناتے ہیں ——— کپڑے سیتے ہیں ——— کارخانہ میں ملازم ہیں ——— کسی دفتر میں معمولی کلرک ہیں ——— یا ایسا ہی کچھ اور کام کرتے ہیں ———؟؟ تو سنیئے اگر آپ اپنے کام کو دل لگا کر زیادہ سے زیادہ محنت کر کے خوشی خوشی پایۂ تکمیل کو پہنچا رہے ہیں تو آپ تو خود اپنے ملک کی ترقی و بہبودی کے لئے کچھ کم خدمات انجام نہیں دے رہے۔ کیا آپ کا لیڈر یا آپ کی فوج کا ایک بھی سپاہی، آپ کے تیار کئے ہوئے کپڑے یا آپ کے بنائے ہوئے ہتھیاروں کے بغیر اپنا فرض ادا کر سکتا ہے؟ ——— نہیں کر سکتا تو پھر آپ اپنی شخصیت کو کیوں ایک ذرّہ بے مقدار سمجھے ہوتے ہیں۔

یاد رکھیئے کہ پوری قوم کے افراد ایک دوسرے کے دست و بازو ہوتے ہیں۔ ہر فرد کی جدوجہد کا نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے یعنی اپنے ملک و قوم کی بقا ——— فرق صرف اتنا ہے کہ ہر ایک کے کام الگ الگ بٹے ہوتے ہیں۔ ایک بیرونی ممالک میں اپنی ملک کی ساکھ اونچی کرتا ہے۔ دوسرا اپنے ملک کی ایک ایک انچ زمین کی حفاظت کے لئے جان ہتھیلی پر رکھے پھرتا ہے۔ تیسرا قوم کے لئے غلہ پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح ہر ایک کچھ نہ کچھ کرتا ہے۔ آپ اپنے کام ہی کو لے لیجئے اور دیکھیئے کہ یہی افادی پہلو اس میں بھی نکلے گا اور پھر سوچئے کہ کیا آپ کے اپنے کام کی طرف سے لاپرواہی اور تساہلی صرف اس بنا پر کہ آپ نے اسے دانستہ حقیر سمجھ رکھا ہے ملک و قوم کی ترقی کی راہ میں کاوٹ نہیں ڈالتا؟

اس موقع پر یہ بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ قوم سے الگ رہ کر آپ تنہا کچھ بھی نہیں ہیں بلکہ الگ رہ ہی نہیں سکتے ——— فرض کیجئے آپ بالکل یک و تنہا ہیں۔ کسی عزیز و اقارب کا بھی آپ پر بار نہیں اور آپ سوچتے ہیں کہ تھوڑے سے وقت کام کر کے اپنی زندگی آرام سے گزار سکتے ہیں تو یہ صحیح نہیں، صرف وقتی بہلاوا ہے۔ اس طرح آپ اپنے ہاتھوں خود پر ظلم کر رہے ہیں کیونکہ ملک کو آپ کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی ضرورت ہے اور یہ نہ بھولئے کہ آپ کے ملک و قوم پر اچھا یا بُرا جیسا بھی وقت آئے گا آپ بھی لازمی اس کا اثر پڑیگا۔ اور جب آپ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ آئندہ کسی وقت آپ معمولی سی تکلیف میں بھی مبتلا ہو جائیں تو اپنے کام میں امکانی سرگرمی دکھا کے اپنے ملک کو آگے بڑھانے میں پوری قوت صرف کر دیجئے۔ اسی میں آپ کی بقا کا راز پوشیدہ ہے۔ یہ نہ خیال کریئے کہ بڑے لیڈر ہی سب کچھ کرتے ہیں اور دُنیا ان ہی کی تعریف کرتی ہے بلکہ آپ کو بھی جو دیکھیگا وہ یہ ہی کہیگا کہ "یہ ہے زندہ قوم کا ایک فرد" ★

بقیہ صفحہ ۱۲ :۔

کر کے آپ کی خامیاں بتائے۔ اگر کوئی آپ کی بُرائی کرتا ہے۔ تو وہ آپ کا دوست ہی ہے۔ اور اُس ہمدردی کا جذبہ ہے۔ جو اُسے آپ کے قریب لایا ہے۔ جس کو آپ میں دلچسپی ہے ——— اس طرح یہ "اعتراضات" "احسانات" بن جاتے ہیں۔ الفاظ تو ایسے سادے کاغذ ہیں۔ جو کسی بھی رنگ سے رنگے جا سکتے ہیں۔ انہی اعتراضات کو اپنی بھلائی کے رنگ میں رنگیئے۔ آپ سمجھنے لگیں گے کہ دوست وہی ہے جو ہماری خرابیاں بتائے۔ اور ان اعتراضات کو ایسی سیڑھیاں متصور کریں گے، جن سے آپ بلندی اور بلندی پر پہنچ سکتے ہیں۔

کہیئے، کیا ارادے ہیں؟

ڈاکٹر سلامت اللہ

تحلیل نفسی کے پیچ و خم

جنگ اور امن کے موضوع پر احباب سے گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک صاحب نے بہت ہی متانت سے فرمایا کہ آپ لوگ خواہ مخواہ اس مسئلہ کو اقتصادیات اور سیاسیات میں الجھا رہے ہیں۔ آپ لوگوں کو تو وہم ہو گیا ہے کہ ہر معاملہ کی تہہ میں سرمایہ داری کا بھوت چھپا ہوا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ نفرت کے جذبے میں جتنی طاقت ہے اتنی پیار کے جذبے میں نہیں۔ اسی لئے آئے دن کشت و خون اور فساد ہوا کرتا ہے۔ انسان کے نفرت اور تشدد کے جذبات کو آخر کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہونا ہی ہے آپ لوگ جنگ کے مسئلہ کو اس طرح دیکھنے کی بجائے زمین اور آسمان کے قلابے ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھئے، اپنا دل ٹٹولئے۔ من کی گہرائیوں میں جھانکئے تو آپ میرے قائل ہو جائیں گے۔

ع فعل بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پہ

خدا توفیق دے تو سائیکو انالیسز کا مطالعہ کیجئے۔ تو پھر جنگ و فساد کی ذمہ داری سرمایہ داروں پر ڈالنا بھول جایئے گا اور پھر اپنی ذات کو کوسئے گا۔

دل بہکڑ والی بات سمجھ کر اسے ٹالئے گا نہیں یہ خیال بہت سے پڑھے لکھے لوگوں، ادیبوں، فنکاروں اور صحافیوں کا بھی ہے اور واقعی تحلیل نفسی یا سائیکو انالیسز کے بانی اور علم بردار بھی اس خیال کے پرزور مبلغ ہیں۔ ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ جو کہ تحلیل نفسی کے علم اور عمل دونوں کے جنم داتا ہیں، مشہور سائنسداں آئن سٹائن کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"جنگ در اصل انسان کی اس تخریبی جبلت کو بیرونی دنیا کی طرف موڑ دینے سے واقع ہوتی ہے جو انسان کے خمیر میں روز ازل سے موجود ہے اور اس وجہ سے یہ انسانی زندگی کی ایک ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ جنگی ہیجانات حقیقت میں فطرت سے زیادہ قریب ہیں بمقابلہ ان رجحانات کے جو جنگ کی مخالفت کرتے ہیں" [1]

اسی طرح ڈاکٹر گلوور جو کہ سائنٹفک ریسرچ آف دی لندن انسٹیٹیوٹ آف سائیکو انالیسز کے ڈائرکٹر تھے کہتے ہیں۔ "جنگ اور امن دونوں کی جدوجہد کے لئے جو طاقت درکار ہے اس کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ جنگ کو سیاسی یا اقتصادی مسئلہ سمجھنا سطحی بات ہے۔ اس کی بنیاد میں چند جنسی اجزا ہیں۔" گلوور کے نزدیک جنگ کے مسئلہ کا حل یہ ہے کہ "ہمیں اطمینان سے بیٹھ کر ایک ہزار سالہ پلان مرتب کرنا

---

[1] S. Freud and A. Einstein, "Why War?"

چاہیئے کہ مقصد یہ ہو کہ بغیر جنگ کا راستہ اختیار کیے غیر شعوری کش مکشوں کا علاج کیا جائے۔ [1] اس کا مشورہ ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ کارروائی کرنی چاہیئے کہ تمام ڈکٹیٹروں، محکمہ امور خارجہ کے سکریٹریوں، سفیروں اور امن کانفرنس کے نمائندوں کی شخصیت کا تجزیہ کیا جائے کہ وہ کون کون سی نفسی اور جنسی کمزوریوں اور بیماریوں کے شکار ہیں۔

بڑی مشکل سے یقین آئے گا کہ کوئی صحیح الدماغ شخص جنگ اور امن کے متعلق سنجیدگی سے ایسے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔ خاص طور پر اس دور میں جب اٹلی اور جرمنی میں فاشزم کا تسلط ہو چکا تھا اور ساری دنیا جنگ کے بادلوں کی روز افزوں سیاہی تاریک تر ہوتی جا رہی تھی۔

آج بھی دنیا میں کم و بیش اس قسم کے حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ سامراجی طاقتیں نوع انسانی کو جنگ کی بھٹی میں ایک بار پھر جھونکنے کی سازباز کر رہی ہیں اور جنگی فضا قایم کرنے میں ہر ممکن تدبیر عمل میں لا رہی ہیں۔ بعض تدابیر سیدھی سادی صاف اور واضح ہیں جن سے عام طور پر آدمی دھوکا نہیں کھا سکتا لیکن بعض تدبیریں ایسی پر پیچ اور اتنی الجھی ہیں کہ سادہ لوح آدمی ان کے پھندے میں آسانی سے پھنس سکتا ہے تحلیل نفسی بھی اس قسم کی ایک تدبیر ہے اس لئے اس کا مطالعہ ایسی صورت میں خاص طور پر بہت ضروری ہو جاتا ہے

آج تحلیل نفسی بھی دوسرے علوم کی طرح اپنی نام نہاد غیر جانب داری کا نقاب اتار چکی ہے اور اپنے اصلی رنگ و روپ میں کھلے بندوں ان قوتوں کا ساتھ دے رہی ہے جو موجودہ تباہ کن سماجی حالات کو اپنے بھلے کے لئے برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔ اس نظریہ کی اشاعت میں تمام ذرائع معلومات مثلاً اخبار اور کتابیں، ریڈیو اور سینما حصہ لے رہے ہیں۔ اس سے باخبر ہونے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔

آیئے تو پہلے ہم تحلیل نفسی کے بنیادی تصورات کا جائزہ لیں۔ اور اس کے خاص خاص خد و خال کو پرکھیں۔

ذہن کی ساخت کے بارے میں فرائیڈ کا بنیادی خیال یہ ہے کہ ہر شعوری فعل کی تہہ میں لاشعور Unconscious کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ یہ لاشعور جبلی زندگی کا سرچشمہ اور نسلی ورثہ کا گودام ہے۔ اس گودام میں تمام وہ جذباتی تجربے جمع رہتے ہیں۔ جن کا تعلق بچپن کی زندگی سے ہے اور جن کا موضوع جنسیات ہے۔ یہ بات دراصل ان ہیجانوں، تمناؤں اور خواہشوں کے مظہر ہیں جو شعوری زندگی کے معیار سے ٹکراتے ہیں اور اس ڈر کی وجہ سے کھلم کھلا ظاہر نہیں کئے جا سکتے [2] گویا لاشعور ایک کباڑ کوٹھری کی مانند ہے جس میں ہر وہ چیز پھینک دی جاتی ہے جسے بدنمائی کی وجہ سے ہم دوسروں کے سامنے نہیں لانا چاہتے۔ لیکن ہم اسے ضائع بھی نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ ہمیں اس سے ایک قسم کا جذباتی لگاؤ ہوتا ہے اور اسے ہم وقت ضرورت استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ کھلے عام نہیں مگر دوسروں کی آنکھ بچا کر

فرائڈ کے خیال کے مطابق لاشعوری زندگی جنسی لذت کے ان تجربوں سے معمور ہے جو آدمی خاص طور پر اپنے بچپن کے پہلے پانچ سال میں مختلف طریقوں سے حاصل کرتا ہے۔ "جنسیات" فرائڈ کے نزدیک بہت وسیع اور مبہم اصطلاح ہے اس سے وہ جبلی قوت مراد ہے جس کا تعلق ہر قسم کی "محبت" سے ہے۔ اس میں وہ محبت بھی شامل ہے جو بچہ کو اپنے جسم اور اپنی ذات سے ہوتی ہے اور وہ محبت بھی جو اسے اپنے ماں باپ اور دوسروں سے ہوتی ہے اس میں وہ محبت بھی شامل ہے جو آدمی کو اپنے بچوں اور نوع انسانی سے ہوتی ہے اور وہ خلوص اور لگاؤ بھی جو اسے بعض معروضی چیزوں

---

[1] Glover "War Sadism and Pacifism

[2] S. Freud "A General Introduction to Psycho-Analysis

اور مجرد تصورات سے ہوتا ہے۔ چنانچہ فرائڈ کے ہاں انگوٹھا چوسنا، نگلنا بلکہ اخراج جیسا جسمانی فعل تک جنسی لذت کا مظہر ہے [1]

فرائڈ جنسیات کو زندگی کا سنگِ بنیاد اور سب سے بڑا محرک سمجھتا ہے اس کے نزدیک جنسی نشو و نما کی تین منزلیں ہیں۔ اس دوران میں انسان چند ذہنی الجھنوں Complexes میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پہلی منزل خود فریفتگی "Narcissism" کی ہے جو پیدائش سے پانچ سال کی عمر تک رہتی ہے۔ اس وقت بچہ خود اپنی ذات پر عاشق ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں ایڈیپس کامپلیکس Oedipus Complex پیدا ہوتا ہے۔ یعنی لڑکے میں باپ کے خلاف رقابت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اس لئے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے جنسی ہیجانات کی تشفی کا ذریعہ اس کی ماں ہے لیکن اس پر اس کا باپ حاوی ہے۔ لیکن لڑکا باپ کی طاقتور شخصیت کی تاب نہ لاکر بالآخر ہتھیار ڈال دیتا ہے اور الجھن حل ہو جاتی ہے۔

لڑکی کا معاملہ ذرا اس سے مختلف ہے شروع میں اس کی جنسی قوت کا مرجع بھی ماں ہی ہوتی ہے۔ لیکن جوں ہی اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس میں اس عضوِ تناسل کی کمی ہے جو لڑکے کے جسم میں ہوتا ہے تو اسے اپنی ماں کے خلاف ایک قسم کی خفتہ بغاوت محسوس ہوتی ہے کہ وہی اس کمی کی ذمہ دار ہے۔ اس ذہنی الجھن کو فرائڈ کیسٹریشن کامپلیکس Castration Complex سے موسوم کرتا ہے لیکن یہ کمی لڑکی کو اپنے باپ کی ذات سے پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ اس لئے وہ بھی ایڈیپس کامپلیکس Oedipus Complex میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ فرائڈ کے خیال کے بموجب لڑکی اس الجھن میں بہت مدت تک مبتلا رہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عورت ہمارے سماج میں مرد کے مقابلہ میں کمتر سمجھی جاتی ہے

فرائڈ کے اس نظریئے کی مقبولیت کے بارے میں تو بعد میں بحث کی جائے گی۔ یہاں عورت کی ثانوی حیثیت کی جو تشریح کی گئی ہے وہ غور طلب ہے یعنی اس تشریح کے مطابق عورت فطری طور پر ہمارے سماج میں گھٹیا پوزیشن پر رہنے کے لئے مجبور ہے۔ یہاں جنسی عدم مساوات کے لئے صورت جواز موجود ہے اور کیسی صورت جواز! جو اٹل اور ابدی ہے۔ یعنی جب تک عورت عورت ہے وہ سماج میں مرد کی برابری کی امید نہیں کر سکتی۔ یہ نظریہ ہمیں اس طرح اس ٹھوس حقیقت کو سمجھنے سے باز رکھتا ہے کہ عورت کا درجہ بھی ہمارے سماج میں وہی پیداواری رشتے متعین کرتے ہیں جو مختلف طبقوں کی اہمیت پر حکم لگاتے ہیں۔ عورت کی موجودہ پوزیشن کوئی ابدی چیز نہیں ہے۔ یہ تو اس سماجی نظام کی دین ہے جس میں زندگی کی مادی ضروریات کی پیداوار میں مرد پیش پیش ہے ایک ایسے سماج میں جو ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ سے پاک ہوگا اور جس میں مرد اور عورت سماجی پیداوار میں شریک ہوں جنسی بنا پر امتیازات قایم رکھنے کی کوئی وجہ نہیں رہے گی اور اس میں مرد اور عورت کا درجہ برابر ہوگا

فرائڈ کے خیال کے مطابق جنسی نشو و نما کی دوسری منزل پانچ سال سے بارہ سال کی عمر تک ہے۔ اسے وہ خفیہ وقفہ —— Period of Latency کہتا ہے یعنی اس دور میں جنسی لحاظ سے کوئی غیر معمولی تبدیلی نمودار نہیں ہوتی اس کے بعد تیسری منزل بارہ سے اٹھارہ سال تک رہتی ہے۔ یہ بلوغ کا زمانہ ہے اور اس میں بچپن کے رجحانات اور ہیجانات از سرِ نو رونما ہوتے ہیں۔

آیئے۔ اب فرائڈ کے اس بنیادی خیال کا جائزہ لیں۔ فرائڈ انیسویں صدی کے وسط میں (۱۸۵۶) آسٹریا میں پیدا ہوا۔

---

[1] S. Freud " A General Introduction to Psychoanalysis

سن بلوغ پر پہنچنے کے بعد جب اس نے طب کا پیشہ اختیار کیا۔ تو یورپ میں سرمایہ داری نظام کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ یعنی سرمایہ داری نظام اس سنگت میں پھنس گیا تھا کہ جب وہ اپنے پیداواری امکانات کو استعمال کرنے کی بجائے ضائع کر کے اپنے وجود کو قایم رکھ سکتا تھا اس سے سماج میں بے روزگاری اور عام بے اطمینانی پھیل رہی تھی۔ اور اس کے ناپسندیدہ اثرات تمام لوگوں کی زندگی پر پڑ رہے تھے۔ جو طرح طرح کے جسمانی ذہنی اور جذباتی بیماریوں کی شکل میں نمایاں رہتے تھے۔ چنانچہ لوگوں کی جنسی زندگی میں بھی مختلف قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہو رہی تھیں فرائڈ کے پاس ڈاکٹر کی حیثیت سے جو مریض آئے، اسے ان کی تہ میں زیادہ تر جنسی الجھنیں نظر آئیں۔ اور وہ اپنے سماجی ماحول کے ان انکشافات کو تمام نوع انسانی سے منسوب کر بیٹھا یہ بیماریاں اس کے مخصوص سماجی نظام کی دین تھیں نہ کہ انسانی فطرت کا تقاضا۔ علم انسانیت کے مشہور عالم میلی نوسکی کی تحقیقات کے بموجب بحر پیسیفک کے بعض جزائر اور آسٹریلیا میں چند قدیم قبیلے ایسے ہیں جن کے ہاں جنسی رقابت کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ جنسی میدان میں اس کا سماج کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا اسی طرح روئے زمین کے ان حصوں میں جہاں ابھی تک سرمایہ داری اس منزل پر نہیں پہنچی ہے ذہنی اور جذباتی پیچیدگیوں کی وہ نوعیت نہیں ہے جو فرائڈ نے ایک عام انسانی خصوصیت کے طور پر پیش کی ہے۔

آیئے اب فرائڈ کے اس مفروضہ کا جائزہ لیں کہ پانچ سال کی عمر کے بعد فرد کی ذہنی نشوونما میں کوئی نئی بات پیدا نہیں ہوتی اور بعد کے ردعمل یا تجربے محض سابقہ ردعمل یا تجربوں کی ذرا بدلی ہوئی شکل ہوتے ہیں۔ گویا عمر کے پہلے پانچ برسوں میں جو کچھ ہو لیتا ہے اس کو آدمی باقی عمر دہراتا رہتا ہے اور اس پر نہ اس کی ذاتی نشوونما کا اثر ہوتا ہے اور نہ سماجی ماحول کا۔ اس طرح فرائڈ نے اپنے نظریہ کو غیر سائنسی اور پُراسرار بنا دیا ہے اس کے اکثر ضابطے نامعقول اور مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً نشوونما سے متعلق اس کا خیال ہے کہ ماں کی کوکھ سے نکلنے کا عمل بچے میں بے چینی اور تشویش پیدا کر دیتا ہے وہ تمام عمر اس کا ساتھ دیتی ہے۔ یعنی زندگی کے دوران میں جب کبھی انسان کو کوئی تشویش ہوتی ہے تو اسے اسی ابتدائی تشویش کا اعادہ سمجھنا چاہیئے!

اسی طرح فرائڈ انسانی شخصیت کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ بھی اسرار و ابہام سے پُر ہے وہ شخصیت کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے جبلی حرکت ارادی (Id)، انا یا خودی (Ego) اور ضمیر Super Ego اس کے نزدیک جبلی حرکتِ ارادی ان تجربوں اور آرزوؤں پر مشتمل ہے جو سماجی لحاظ سے ناپسندیدہ ہوتے ہیں اور انہیں وحشیانہ اور غیر مہذب سمجھنا چاہیئے۔ خودی کا تعلق مہذب سماجی زندگی ہے۔ یہ سماجی زندگی کی بظاہر ناخوش گوار حقیقتوں کو قبول کرتی ہے اور شعوری عمل کو تہذیب کے معیار پر پہنچاتی ہے۔ ضمیر شخصیت کا وہ جزو ہے جو حاکم کی حیثیت رکھتا ہے اور خودی کو جبلی حرکتِ ارادی کے وحشیانہ رجحانات کو دبانے کی ترغیب دیتا ہے۔ خودی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں جنم لیتی ہے۔ جبکہ بچے اور اس کے والدین کے درمیان ایک مضبوط جذباتی رشتہ قائم ہوتا ہے، لیکن اس وقت خودی چونکہ بہت کمزور ہوتی ہے اس لئے جبلی حرکتِ ارادی کی نامعقول شورشوں کو دبا کر رکھنے میں اُسے والدین کے اقتدار سے مدد لینی پڑتی ہے۔ والدین ایک سخت گیر آقا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور وہ بچپن کی ناجائز خواہشات کو جبر و تشدد سے دبا دیتے ہیں۔ شخصیت کا وہ حصہ جو اس طرح والدین کی طاقت اور اقتدار کو ظاہر کرتا ہے ضمیر کی بنیاد بن جاتا ہے۔ اور آگے چل کر اس میں وہ تمام سماجی قوتیں مرکوز ہو جاتی ہیں جو سماجی قوانین اور طور طریق کی ضامن ہیں۔ گویا ضمیر سماج کی نمائندگی کرتا ہے اور جبلی حرکتِ ارادی فرد کی نمائندہ ہے اور خودی پولیس مین کے فرائض انجام دیتی ہے کہ اس کا کام فرد سے سماج کے قوانین اور احکام کی تعمیل کرانا ہے۔

فرائڈ کے اس نظریہ کے مطابق جبلی حرکتِ ارادی اور خودی کے درمیان مستقل رسہ کشی ہو رہی ہے جب جبلی حرکتِ ارادی اپنی شکست تسلیم

نہیں کرتی، تو فرد مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ فرائڈ کی نفسیات میں ان کی ماہیت کو سمجھنا اور حل معلوم کرنا تحلیل نفسی یا Psycho-analysis کہلاتا ہے۔

تحلیل نفسی میں ایک اور مفروضہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ فرائڈ کا خیال ہے کہ انسان کی فطرت میں دو متضاد قسم کی جبلتیں کارفرما ہیں جبلت حیات (Eros) اور جبلت موت۔ چنانچہ جبر و تشدد ظلم ایذا رسانی (Sadism) اور خود اپنی ذات کو تکلیف دے کر لذت حاصل کرنا (Masochism) ایسے رجحانات ہیں جو جبلت موت کی تشفی کرتے ہیں اور فرائڈ کے قول کے بموجب اگر ہم اس جبلت کے نکاس کی کوئی تدبیر نہیں کر سکیں گے تو پھر ہم خود اپنی ذات کو برباد کر دینے پر مجبور ہوں گے: "ہمیں دوسرے لوگوں اور چیزوں کو برباد کرنا پڑے گا تاکہ ہم خود کو ہی نہ برباد کر ڈالیں، تاکہ ہم اپنی ذات کو خود اپنے تخریبی رجحانات سے محفوظ رکھ سکیں"[1]

یہاں فرائڈ نے ہر قسم کے ظلم و تشدد کے لئے صورت جواز فراہم کر دی ہے۔ غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ نظریہ کن قوتوں کی معاونت کرتا ہے۔

انسانی فطرت کے بارے میں فرائڈ کا جو نظریہ اوپر بیان کیا گیا ہے وہ نہ صرف سائنٹفک نقطۂ نظر سے غلط ہے بلکہ سماجی لحاظ سے لغو اور رجعت پسندانہ ہے۔ انسان جبلی رجحانات کا بنا بنایا کوئی کھلونا تو ہے نہیں کہ وہ صرف ایک بندھے ٹکے انداز میں حرکت کر سکتا ہے انسان کے بنانے میں اس کی حیاتی اور سماجی دونوں قسم کی وراثت کا ہاتھ ہے اور اس میں اثر اور تبدیلی قبول کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ لائسینکو اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے علم حیاتیات میں جو حال میں تحقیقات کی ہیں ان سے اس خیال کی مزید تصدیق ہوتی ہے[2]۔ انسان کی زندگی کی بنیادی ضرورتیں خوراک موسم سے حفاظت کا انتظام مثلاً مکان اور لباس وغیرہ اور جنسی خواہشات کی تشفی کا سامان ہیں۔ ان ضرورتوں کی بنا پر انسان میں مختلف قسم کے ہیجانات اور محرکات پیدا ہوتے ہیں۔ جن کی شکل و صورت وہ سماجی حالات متعین کرتے ہیں، جن کے تحت انسان ان ضرورتوں کو پورا کرنے کی جدوجہد کرتا ہے۔ جب کسی ضرورت کے پورا ہونے میں رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑتا تو ردعمل کے طور پر انسان میں جارحانہ رجحان پیدا ہوتا ہے اس لئے یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے کہ آدمی میں جارحانہ رجحان پیدائشی طور پر موجود ہے۔ یہ دراصل حالات کی پیداوار ہے۔ بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے حالات سازگار رہوں۔ اور کسی قسم کی بیرونی مزاحمت کا مقابلہ نہ کرنا پڑے تو جارحانہ رجحان کے لئے کوئی موقع نہیں ہوگا۔ انسانی سماج میں جارحانہ رجحان کے بجائے تعاون اور میل ملاپ کے رجحانات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی انسانی ضرورت ان کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ البتہ اگر زندگی کی بنیادی ضرورتوں کے پورا ہونے میں رکاوٹ ہوگی تو جارحانہ رجحان ضرور فروغ پائے گا۔

فرائڈ کے نظریہ میں یہ مفروضہ بھی مضمر ہے کہ فرد کی خواہشات لازمی طور پر سماج کے خلاف ہوتی ہیں۔ یہ مفروضہ ایک شرارت آمیز جھوٹ ہے جو عملی طور پر ہر اس جدوجہد کی مخالفت کرتا ہے جس کا مقصد موجودہ طبقاتی سماج کی جگہ ایک ایسے سماج کی داغ بیل ڈالنا ہے جو انفرادی مسابقت اور مقابلہ کے بجائے باہمی اشتراک عمل اور تعاون کو ابھارے گا۔

---

1. S. Freud "New Introductory Lectures
2. T. D. Lysenko "The Situation in Biological Science

سماج کی تنظیم کے بارے میں فرائڈ کا ایک اور خیال ہے جو عملی طور پر زیادہ خطرناک ہے۔ فرائڈ کے نزدیک کسی جماعت کی شیرازہ بندی صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ افراد جماعت کے لیڈر کو وہی حیثیت دیں جو گھر میں باپ کی ہوتی ہے اور اس کی ذات کے سب کلیۃً ہم رشتہ اور وابستہ ہو جائیں۔ یہ دراصل قائد مطلق کا تخیل ہے جس پر فاشزم کی بنیاد قائم ہے۔ غالباً فرائڈ کو اس وقت معلوم نہیں تھا کہ وہ جس نظریئے کی اشاعت کر رہا ہے ایک دن نہ صرف وہ خود بلکہ اس کی ساری قوم یہود اس کا شکار بنے گی۔ جب اس قسم کے "مثالی" قائد مطلق کا جرمنی میں طلوع ہوا تو فرائڈ کو دوسرے یہودیوں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا اور ساڑھے بارہ ہزار پونڈ کی رقم بطور فدیہ ادا کرنے پر ہی اس کی جان بچائی جا سکی۔ دیکھئے حالات کی ستم ظریفی!

فرائڈ کے افکار کا ایک اور تضاد ملاحظہ فرمایئے ایک طرف تو وہ سماجی تنظیم کے لئے ایک قائد مطلق کا وجود ناگزیر سمجھتا ہے اور دوسری طرف آزادی عمل کا سرچشمہ اس کے نزدیک فرد کی ذات ہے۔ اس کے خیال کے بموجب انسان صرف اسی حد تک آزاد ہے جتنا کہ وہ بے روک ٹوک اپنی خواہشات کے بموجب عمل کر سکتا ہے۔ دراصل یہ تمام سرمایہ پرست دانشوروں اور اہل علم حضرات کا نظریہ ہے جسے پہلی بار روسو نے ایک باضابطہ شکل دی اور جس کے علمبردار ہمارے زمانے میں برٹرینڈ رسل جیسے لوگ ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان اسی قدر آزاد ہوتا ہے جتنا کہ وہ انسانی تہذیب اور سماجی تنظیم کے دباؤ سے آزاد ہے۔ اسی طرح آزادی اور مطلق العنانی یا نراجیت کی حدود ایک دوسرے سے جا ملتی ہیں۔ آزادی کا یہ تصور سماجی ضرورت سے بے نیاز کر کے انسان کو "یوگ" اور "من کی دنیا" میں داخل کر دیتا ہے اور اس طرح سماجی جدوجہد کی راہ سے بھٹکا دیتا ہے اصل میں یہ نظریہ صورت حال کو برقرار رکھنے کا ایک موثر ذریعہ ہے

انسانی سماج کی نشوونما اور تاریخ کے بارے میں فرائڈ کے اور دوسرے تحلیل نفسی کے ماہروں کے خیالات دیومالا کے اندھ وشواس اور توہم پرستی پر مبنی ہیں۔ فرائڈ کو اس بات سے انکار نہیں ہے کہ سماج کی ارتقا میں کام اور محنت کا بڑا ہاتھ رہا ہے لیکن اس کا عقیدہ ہے کہ کام بجائے خود انسان کے لئے کبھی دلچسپ اور پسندیدہ نہیں رہا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق ابتدائی انسان نے کام کو یہ سمجھ کر پسندیدہ بنایا کہ یہ جنسی مشاغل کا ہم پلہ بدل ہے۔ فرائڈ کی بنیادی دشواری یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے انحطاط پذیر اور جاں بلب سرمایہ دارانہ سماج کی خصوصیات کو دائمی اور ابدی سمجھتا ہے۔ چنانچہ اس کی جھلک ہر اس تشریح میں دکھائی دیتی ہے جو وہ سماجی زندگی کے کسی پہلو کے بارے میں پیش کرتا ہے، مثال کے طور پر وہ وحشی قبیلوں کے رسم و رواج کو اعصابی امراض سے تعبیر کرتا ہے۔ یا وہ ہر زمانے کی سماجی تحریکوں اور جنگوں کو لیڈروں کے جارحانہ رجحانات کا یا دوسروں کو ایذا پہنچا کر لطف لینے کی خواہش کا مظہر سمجھتا ہے۔ اس طرح وہ انسانی تاریخ کی تشریح نفسیات کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے گو کہ صحیح بات یہ ہے کہ تاریخ کے ذریعے نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ گویا فرائڈ گھوڑے کو گاڑی کے آگے جوتنے کے بجائے اس کے پیچھے باندھ دیتا ہے!

اس خیال کے مطابق جب تاریخ کی تشریح کی جاتی ہے، تو بعض اوقات یہ بہت مضحکہ خیز صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً جیسٹرو کے نزدیک پچھلی عالمگیر جنگ کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہٹلر پالیخولیا کا شکار تھا، یعنی وہ اس اعصابی مرض میں مبتلا تھا جس میں مریض بیرونی دنیا سے اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے اور اس وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ساری دنیا اس کے خلاف سازش کر رہی ہے۔ جیسٹرو کا خیال ہے "ذہنی امراض کا دور بین ڈاکٹر یہ تسلیم کریگا کہ ایک مالیخولیا کا مریض ڈکٹیٹر انسانی تمدن کے توازن کو درہم برہم کر سکتا ہے۔ اگر کافی تعداد میں لوگ اس کے پیرو ہو جائیں"[1]

[1] Joseph Jastrow – Freud – His Dreams and Sex Theories

غالباً یہ بات بھی ستمال نہیں ہوگی کہ بھارت کے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے بھی حال ہی میں کولمبیا یونیورسٹی میں جنگ کے اسباب بیان کرتے ہوئے اس سے ملتی جلتی بات فرمائی ہے۔ انہوں نے کہا کہ جنگ انسانی جنون اور دیوانگی کا نتیجہ ہے۔ شاید پنڈت جی ذہنی امراض کے ماہروں کی صف میں خود شامل ہونے کی خواہش نہیں کریں گے۔ لیکن ہیں وہ کسی حد تک ان کے ہم خیال!

ایک اور مشہور تحلیل نفسی کے امریکی عالم وٹیلس کا خیال ہے کہ کسی قوم کی دیومالا اور پرانی کہانیوں سے قوم کی جبلی حرکت لاشعوری عبادت ہوتی ہے اور یہ چیز قوم کی تاریخ میں قوت متحرکہ کا کام کرتی ہے چنانچہ ہٹلر نے انجیل مقدس سے مدد لیکر اعلان کیا کہ جرمن قوم خدا کی مقبول قوم ہے اور اس کو احکام خداوندی کے مطابق تمام دنیا پر چھا جانا ہے۔ انجیل میں ایک جگہ خدا نے یہودیوں سے بھی یہی وعدہ کیا ہے۔ ہٹلر نے اس مذہبی قصہ کو اپنے حق میں استعمال کر لیا اور توحید کا نعرۂ جنگ یعنی ایک خدا، ایک کتاب اور ایک قوم" ہٹلر کی تحریک میں" ایک ریاست، ایک قوم اور ایک قائد" میں تبدیل ہو گیا۔ وٹیلس کے خیال کے بموجب انجیل کی تعلیمات جو جرمن قوم کے ضمیر میں ٹھیک طرح جذب نہیں ہو سکیں۔ وہ غیر شعوری طور پر ہٹلر کی تحریک کو تقویت پہنچانے کا ذریعہ بن گئیں [1]

فاشزم کی کیا ہی دلچسپ تشریح ہے اگویا اس تحریک کا تعلق سامراجی دور کے سرمایہ دارانہ تضادات سے قطعاً نہیں ہے جیسے سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کے لئے منڈیوں کی تقسیم سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس طرح ان قوتوں کی انسان دشمنی اور سامراجی چالوں پر پردہ پڑتا ہے جنہوں نے دنیا کو پچھلی عالمگیر جنگ کے ہیبت ناک عذاب سے دوچار کیا اور جو آج پھر اپنے ناپاک الارادے کو بروئے کار لانے کے لئے بین الاقوامی میدان میں جوڑ توڑ کر رہی ہیں۔

تحلیل نفسی کے ماہروں کا سوشلزم کے بارے میں جو نظریہ ہے وہ بھی اسی قدر لچر اور رجعت پسندانہ ہے، فرائڈ کا خیال ہے" (روس کے عوام بالشویکوں کے پیچھے اس وقت جس جوش و خروش کے ساتھ چل رہے ہیں وہ مستقبل کی ضمانت نہیں کرتا۔ جبکہ یہ نیا نظام جو آج بھی نامکمل ہے مضبوطی سے قائم ہو جائے گا۔ اور اسے کوئی بیرونی خطرہ نہیں ہوگا۔ بالشویزم بھی بعینہٖ مذہب کی طرح اپنے ایمان والوں کو یہ سبز باغ دکھانے پر مجبور ہے کہ موجودہ زندگی کی ساری تکلیفیں اور محرومیاں ختم ہو جائیں گی اور آئندہ زندگی میں کوئی بھی ایسی ضرورت نہیں ہوگی جو پوری نہ ہو جائے" [2]

فرائڈ کا سوشلزم کے بارے میں یہ خیال کوئی انوکھا خیال نہیں ہے یہاں وہ ان تمام حضرات کا ہمنوا ہے جو بنیادی طور پر مابعد الطبیعاتی فکر کے حامل ہیں، چاہے وہ بھلے ہی بظاہر سائنس کی چادر میں لپٹے ہوئے دکھائی دیتے ہوں۔ یہ لوگ سائنٹیفک حقیقت اور واہمہ میں تمیز نہیں کر سکتے۔ سوشلزم کی بنیاد موجودہ سماج کی ٹھوس مادی حقیقتوں پر قائم ہے۔ سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار جو مزدوروں کے ایک جگہ مل کر کام کرنے پر منحصر ہے، سوشلزم کے لئے خود زمین ہموار کرتا ہے اور آج تو سوشلزم روئے زمین کے ایک بہت بڑے حصے میں عملی جامہ بھی پہن چکا ہے۔ جہاں یہ کسی خیالی جنت کی دودھ کی نہروں یا ایمان بالغیب کی لذتوں کے وعدے پر انسان کو زندہ نہیں رکھتا بلکہ ان کے لئے اسی دنیائے آب و گل میں بھری پوری زندگی بسر کرنے کی سہولتیں فراہم کرتا ہے۔ سائنس کی خصوصیت ہے کہ اس کے ضابطے، تجربے اور مشاہدہ کی کسوٹی پر پرکھے

---

[1] Fritz Wittels "Psychoanalysis and History" – The Year Book of Psychoanalysis 1947

[2] S. Freud · New Introductory Lectures".

جاسکتے ہیں۔ اس لحاظ سے سوشلزم ایک سائنس ہے اور اعصابی قسم کے رجحان یا تعصب سے تعبیر کرنا سراسر ہٹ دھرمی یا ایک سیاسی چال ہے۔ اس وقت سوشلزم کی مخالفت اور اس سے متعلق غلط بیانی کی مہم میں امریکہ سب سے آگے ہے۔ امریکہ میں پروپیگنڈہ کے تمام ذرائع پریس، ریڈیو اور سینما وغیرہ اس منصوبہ میں تحلیل نفسی کی اصطلاحات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مثلاً انقلاب پسندوں کو اعصابی بیمار کا خطاب دیا جاتا ہے۔ یہ منحوس ٹیکنیک ہمارے ہاں بھی تہذیبی میدان میں نظر آرہی ہے ہمارے بعض ادیب، مصنف اور افسانہ نگار اپنی نگارشات میں انقلابیوں کو کچھ اس انداز میں پیش کرتے ہیں جیسے اپنی سماجی زندگی یا بالخصوص جنسی تعلقات میں شکست اور مایوسی کا منہ دیکھ چکے ہیں اور اس خفت کو مٹانے کے لئے اب وہ انقلابی صفوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ گویا "غم جاناں" کو "غم دوراں" میں تبدیل کر کے وہ اب اپنی شخصی ناکامیوں کا بدلہ اس سماج سے لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

کیا عجب ہے کہ اس قسم کے خیالات پیش کرنے والے لوگ خود اعصابی امراض میں مبتلا ہوں۔ فرائڈ کے بارے میں بعض محققین کا خیال ہے کہ وہ خود اعصابی مریض تھا۔ چنانچہ رین یارڈ ویسٹ "انسانی فطرت سے متعلق نفسیاتی نظریات" پر بحث کرتے ہوئے فرائڈ کی تصنیفات سے بہت سے ثبوت بہم پہنچاتا ہے جن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ فرائڈ خود ایک وہمی اور جارحانہ قسم کا اعصابی بیمار تھا [1]

ان دنوں امریکہ میں خاص طور پر تحلیل نفسی کے نقطہ نظر سے مختلف قسم کے سماجی مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے، وہاں نیگرو اور یہودیوں کے خلاف جو عام منافرت اور امتیازات برتے جاتے ہیں اس کے متعلق کئی ایک نام نہاد نفسیاتی تحقیقات ہو چکی ہیں۔ چنانچہ ابھی حال میں ایک تحقیق [2] کی رو سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان لوگوں کی شخصیت کی خصوصیات کیا ہیں۔ جو یہودیوں کو برا سمجھتے ہیں اور ان سے نفرت کرتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر جو انکشافات ہوئے ہیں ان میں یہ دو باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں:-

۱۔ ان لوگوں کی شخصیت میں جو یہودیوں سے نفرت کرتے ہیں یہ چیز خاص طور پر نمایاں ہے کہ والدین کی طرف ان کا رخ متضاد قسم کے جذبات سے مرکب ہے۔ یعنی یہ لوگ بظاہر تو اپنے والدین سے محبت کرتے ہیں لیکن غیر شعوری طور پر ان کے خلاف نفرت کا جذبہ رکھتے ہیں۔

۲۔ ان لوگوں میں مالیخولیا کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ وہ لوگ اس قسم کے وہم میں مبتلا ہیں کہ ہمارے چاروں طرف سازشوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ یا ہمیں ایسے لوگوں سے زیادہ ملنا پڑتا ہے جو طرح طرح کی متعدی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ لہذا ہمیں ہر وقت چوکس رہنا چاہیئے۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے اس تحقیق کے نتیجے کو صحیح مان بھی لیا جائے تو موجودہ صورت حال کو بدلنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس طرف یہ تحقیق اشارہ نہیں کرتی لیکن شاید تحلیل نفسی کے عالم فوراً کہیں گے کہ ہم سے علاج کراؤ۔ مگر یہ علاج کوئی کھیل نہیں ہے کہ ہر شخص کر گذرے۔ اس کے لئے جتنے روپے اور وقت کی ضرورت ہوتی ہے وہ بہت کم لوگوں کے بس کی بات ہے۔ پھر اگر علاج کامیاب بھی ہو جائے تو اس کی ضمانت کہاں ہے کہ اور لوگ اس مرض میں مبتلا نہیں ہوں گے۔ مرض کے روک تھام کی تدابیر علاج سے کہیں زیادہ اہم ہیں اور اس معاملے میں اس قسم کی عملی تحقیقات ہماری کوئی رہنمائی نہیں کرتیں۔ بلکہ الٹا ہمیں غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیتی ہیں

---

[1] Ranyard West "Conscience and Society"

[2] Else Frenkel-Brunswick "The Antisemitic Personality" — Year Book of Psychoanalysis 1947

اس بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہمیں ذہنی بیماریوں کے وجود سے انکار ہے۔ ذہنی بیماریاں بھی جسمانی بیماریوں کی طرح ایک سماجی حقیقت ہیں لیکن ہمیں فرائڈ اور اس کے پیروؤں کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ وہ انسانی فطرت کی دین ہیں جن سے سماج کو کبھی صحت یا نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہمیں انسان کی انفرادی اور سماجی زندگی میں جنسیات کی اہمیت سے بھی انکار نہیں ہے لیکن ہم فرائڈ کے اس خیال سے متفق نہیں ہو سکتے کہ تمام انسانی اعمال اور مظاہر کی جڑ جنسیات ہے۔ کہ اگر کوئی شخص خود بین ہے تو اس کا تعلق عشق ذات کی شہوانی قوت (Narcissistic Libido) سے ہے اگر کسی شخص میں ایک چیز کے خلاف منافرت کا جذبہ ابھرتا ہے تو اس کی وجہ تخریبی جبلت یا جبلت موت ہے، اگر کوئی روپے پیسے کی دشواری محسوس کرتا ہے تو اس کا تعلق مبرزی قوت شہوانی (Anal Libido) سے ہے اور اگر ایک شخص ذخیرہ اندوزی کی طرف مائل ہے تو یہ دہنی قوت شہوانی (Oral Libido) کا مظہر ہے یا معاشی میدان میں اتریئے تو سرمایہ داری جیسی چیز مبرزی قوت شہوانی کا شاہکار ہے اور فنون لطیفہ جیسی تہذیبی شئے قوت شہوانی کا ارتفاعی کرشمہ (Sublimation) ہے۔

ذہنی امراض کے اسباب کا پتہ لگانے کے لئے صرف یہی کافی نہ ہوگا کہ ہم فرد کے شعور کا جائزہ لیں یا اس کے لاشعور کی گہرائیوں میں سرچ لائٹ ڈال کر دیکھیں کہ وہاں کیا کچھ کثافت اور گندگی پڑی ہے ہمیں ان امراض کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے اس سماج کی ساخت اور تنظیم کا تجزیہ کرنا ہوگا جس میں یہ رونما ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں امریکہ کی تحلیل نفسی کی مشہور ماہرہ کیرن ہارنی کے خیالات اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ انہوں نے خود پندرہ سال تک متواتر فرائڈ کے نظریات پر عمل کیا ہے ان کے تجزیہ کے مطابق 'بنیادی تشویش' ! بنیادی عدم تحفظ کا احساس انسان کو حفاظت اور تسکین کی تلاش پر مجبور کرتا ہے [1] لیکن یہ بنیادی تشویش پیدا کیسے ہوتی ہے ؟ وہ کہتی ہیں کہ مقابلہ اور مسابقت کی اسپرٹ نہ صرف ہمارے اقتصادی میدان یا پیشہ وارانہ حلقوں میں پائی جاتی ہے بلکہ یہ ہمارے سماجی تعلقات پر بھی طاری و ساری ہے۔ مثلاً ہماری دوستی جنسی اور خاندانی تعلقات میں بھی اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور اس طرح یہ اسپرٹ تخریبی حسد و رقابت ڈاہ اور جلن، شک و شبہ کے جراثیم تمام انسانی تعلقات میں داخل کر دیتی ہے دوسرے عناصر جو امکانی منافرت اور دشمنی کے طوفان پیدا کرتے ہیں ان کا ثبوت موجودہ سماج کی عدم مساوات اور لوٹ کھسوٹ میں ملتا ہے۔

لیکن ذہنی امراض کی اس صحیح تشخیص کے باوجود ہارنی خود علاج اور معالجہ کے محدود دائرے میں تیلی کے بیل کی طرح چکر کاٹنے لگتی ہیں چنانچہ ان کے نزدیک تحلیل نفسی کا مقصد یہ ہے کہ فرد کی تشویشات کو اس حد تک کم کر دیا جائے کہ وہ اپنے اعصابی رجحانات سے چھٹکارا پا جائے اور اس کے آگے ایک بالکل ہی نئی منزل شروع ہوتی ہے جہاں پہنچ کر فرد خود اپنے کو پالے گا۔ اور اسے اپنی کھوئی ہوئی برجستگی مل جائے گی اور اسے اپنا مرکز ثقل خود اپنی ذات کے اندر مل جائے گا۔ اس طرح ہارنی بھی لوٹ پھر کر انفرادی تشخیص اور علاج پر اسی طرح زور دے رہی ہیں جیسا کہ ان کے دوسرے ہم پیشہ لوگ اور انہوں نے اس سماجی پس منظر کو بالائے طاق رکھ دیا ہے جس کی اوپر وضاحت کی گئی ہے۔

---

[1] Karen Horney "New Ways in Psychoanalysis

اسی طرح ایک اور تحلیل نفسی کے شعبہ کا سربراہ ایڈلر [illegible] ذہنی بیماریوں کا سبب بیان کرتے ہوئے کہتا ہے "ایک ایسے تمدن میں جہاں آدمی آدمی کا دشمن ہو۔ اور ہمارے صنعتی نظام کا لب لباب یہی ہے۔ بداطواری ختم نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ بداطواری اور جرم ہمارے صنعتی تمدن میں زندگی کی جدوجہد کا نتیجہ ہیں" [1]

لیکن ایڈلر بھی مرض کی صحیح تشخیص کرنے کے بعد اس کے مناسب علاج سے کترا گئے ہیں اور یہ مشورہ دینے پر اکتفا کرتے ہیں کہ "اس بداطواری کو ختم کرنے کے لئے یونیورسٹیوں میں ذہنی امراض کے علاج و معالجہ سے متعلق تعلیم کا بندوبست ہونا چاہیئے" [2]

بہت خوب تجویز ہے یعنی آپ اس سماجی نظام کو بدلنے کی کوشش نہ کیجئے جو خود آپ کی رائے کے مطابق انسان کو پاگل بناتا ہے۔ بلکہ آپ اس نظام کو تو دائمی چیز سمجھ کر اس کے حال پر چھوڑ دیجئے اور اسے آزادی کے ساتھ لوگوں کے ہوش و حواس، جذبات و احساسات پر ڈاکہ ڈالنے دیجئے اور جب وہ باولے ہو جائیں تو علاج کے لئے آپ کا دروازہ کھٹ کھٹائیں بشرطیکہ ان کی جیب میں آپ کی کیش فیس ادا کرنے کے لئے کافی رقم ہو۔ اور پھر آپ اپنے پیشہ وارانہ کمالات کا مظاہرہ فرمائیں!

یہ باتیں مضحکہ خیز ضرور ہیں لیکن بے سبب نہیں ہیں۔ موجودہ دور میں سرمایہ داری کی طرح سرمایہ پرست اہل فکر بھی انحطاط اور انتشار کی دلدل میں پھنس گئے ہیں اور اب وہ وہاں سے اس وقت تک نہیں نکل سکیں گے جب تک کہ وہ ان قوتوں کا سہارا نہیں لیتے جو بڑھتی ہوئی اور پھیلتی ہوئی زندگی کی طرف لپک رہی ہیں، جو سوشلزم کی ہراول ہیں جو ان حالات کی جڑ پر ضرب کاری لگاتی ہیں، جن سے انسان کچل کر پاگل، خبطی اور وہمی ہو جاتا ہے۔

اس وقت تحلیل نفسی کی جو نظری اور عملی شکل ہے اس پر سائنس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس کے نظریات، مذہبی معتقدات یا دیومالائی توہمات سے زیادہ قریب معلوم ہوتے ہیں۔ قدیم یونان کے دیوتاؤں کی طرح جو موسم اور تمام مظاہر قدرت پر حاوی سمجھے جاتے تھے تحلیل نفسی میں جبلی حرکت ارادی، خودی وغیرہ ایسے طاقتور دیو ہیں جو ہر قسم کے ذہنی عمل پر قابو رکھتے ہیں۔ اس کے بنیادی تصورات مادی حالات پر مبنی ہونے کے بجائے عینیت پرستی پر قائم ہیں۔ مثلاً تحلیل نفسی کے مطابق شعور انسان کے اندر سے پیدا ہوتا ہے جیسے بیج کے اندر سے کلا پھوٹ نکلتا ہے۔ گو کہ شعور دراصل فرد اور سماج کے باہمی ردعمل کا نتیجہ ہے۔

تحلیل نفسی کے بعض وکیل معذرت کے طور پر یہ پیش کرتے ہیں کہ تحلیل نفسی سائنس نہیں ہے بلکہ علاج و معالجہ کا ایک طریقہ ہے۔ لیکن چونکہ تحلیل نفسی سائنس نہیں ہے اس لئے وہ ایک طریقہ علاج کی حیثیت سے کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ درست ہے کہ اعصابی بیمار کی صحت یابی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے جذبات کی از سر نو تنظیم کرنی چاہیئے، لیکن کیا تحلیل نفسی کا ماہر اس دعوے کی جسارت کر سکتا ہے کہ وہ جذبات کو مناسب سمت میں موڑ دیگا جبکہ بے پناہ سماجی طاقتیں انہیں مختلف سمتوں میں کشاں کشاں لئے جا رہی ہے۔ صرف سماج ہی بحیثیت کُل یہ کام انجام دے سکتا ہے اگرچہ یہ سچ ہے کہ فرد واحد اور سماجی ماحول دونوں ایک دوسرے پر عمل اور ردعمل کے اصول کے مطابق اثر انداز ہوتے ہیں لیکن فرد جو سماج پر اثر ڈالتا ہے وہ اس اثر کے مقابلے میں بہت خفیف ہوتا ہے۔ جو اس پر سماج کا پڑتا ہے۔

---

1. Cristopher Caudwell "Studies in a dying Culture"
2. ایضاً

عجیب بات ہے کہ بعض لوگوں کو تحلیل نفسی کے اندر مارکسی اصول نظر آتے ہیں۔ مثلاً اوسبورن جو انگلستان میں مارکسسٹ سمجھے جاتے ہیں فرائڈ کی نفسیات میں جدلیات (Dialectics) کی جھلک دیکھتے ہیں۔ اس کی وضاحت میں وہ تین خاص باتیں پیش کرتے ہیں۔

(۱) جبلی حرکت ارادی، گھر اور سماج کے دباؤ اور رکاوٹوں کی وجہ سے خوئی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

(۲) دو بنیادی جبلتوں یعنی جبلت حیات اور جبلت موت میں ہر وقت تصادم ہوتا رہتا ہے۔

(۳) دباؤ (Repression) کے عمل کے ذریعہ ذہنی (Quantitative) تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں [1]

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو تحلیل نفسی کا یہ جدلی پہلو محض فریب ہے۔ اگر ایسے دو تصورات میں تصادم ہو جن کی بنیاد مادہ پر ہونے کے بجائے مابعد الطبیعاتی عقائد یا پُراسرار علامات پر قائم ہو تو بھلا اس کا حقیقی جدلیت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

اس بحث سے یہ بات صاف ظاہر ہو جانی چاہیے کہ ذہنی بیماریاں بھی اپنے آخری تجزیہ میں جسمانی بیماریوں کی طرح بڑی حد تک ہمارے سماجی نظام کا عطیہ ہیں۔ جن ملکوں میں نظام سرمایہ داری اپنے عروج پر پہنچ کر اب زوال کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے وہاں اعصابی امراض بھی زیادہ اور متنوع شکل میں نمودار ہو رہے ہیں۔ چونکہ وہاں اقتصادی اور وراثتی پیچیدگیوں کی وجہ سے جنسی تعلقات میں ایک غیر معمولی سنکٹ پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے اعصابی امراض کی تہ میں بھی اکثر جنسیات کی جھلک ملتی ہے لیکن ان کی حیثیت صرف علامات کی ہے۔ اصل روگ تو خود سرمایہ داری ہے مگر سرمایہ داری کا ایک مفید اور تخلیقی پہلو بھی ہے، وہ یہ کہ اس نے مزدوروں کی جماعت کو اور مزدور تحریک کو جنم دیا ہے۔ عدم تحفظ اور بے یقینی کی عام مایوس کن فضا میں عام محنت کشوں اور مزدوروں کی طبقاتی یکجہتی انسان کو یقین، اعتماد اور یگانگت کا پیام دیتی ہے اور دوسرے انسانوں کے ساتھ اشتراک عمل کے ذریعہ اخوت اور اپنے پن کا احساس پیدا کرتی ہے۔ طبقاتی جدوجہد کے دوران میں جو باہمی تعاون اور تنظیمی شعور پیدا ہوتا ہے وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے گریز کرنے پر مائل نہیں کرتا بلکہ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور اس طرح بہت سی نفسیاتی الجھنوں اور اعصابی بیماریوں سے بچاتا ہے۔ فرائڈ کے نزدیک بغاوت ایک علامت ہے خلل اعصاب کی، لیکن حقیقت اس سے بالکل برعکس ہے موجودہ صورتِ حال میں خلل اعصاب سے بچنے کی واحد تدبیر طبقاتی جدوجہد ہے لیکن اعصابی بیماریوں کا قطعی تدارک صرف ایک غیر طبقاتی سماج ہی میں ممکن ہے سوویت یونین اور بہت سی باتوں کی طرح اس معاملہ میں بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے تحلیل نفسی کے مشہور امریکی ماہر ولیمس کی شہادت کے بموجب روس میں ذہنی صحت سماجی نظام کے اندر ممکن ہے وہاں ہر فرد کو اس بات کا احساس ہے کہ سماج کو اس کی چاہ ہے اور اس کے لئے سماجی نظام میں موزوں جگہ موجود ہے زندگی اسے دہشت زدہ نہیں بناتی، زندگی اس کے لئے پُر لطف مشغلہ ہے وہ زندہ رہنا چاہتا ہے اور اپنی صلاحیتوں کو سماجی اور نجی زندگی کے مالا مال کرنے میں استعمال کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کا سماج اس کی ضمانت کرتا ہے [2] سائیکو انالیسیز کا صحیح جواب در اصل یہی ہے * (شاہراہ)

---

[1] R. Osborn "Freud and Marx"

[2] Frankwood Williams "Russia, Youth and Personality World".

بات چیت

فرد، فرد کی "بات چیت" سے لاشعوری طور پر متأثر ہوتا ہے ——— کچھ کہئے ——— کچھ سنئے ——— کہنے سننے سے جی کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے بات چیت کا یہی مقصد ہے اور یہی۔ دیکھئے کیا ہم آپ کے لئے مفید ہیں ——— لیکن سوالات کرتے وقت اس بات کا خیال رکھئے۔ کہ آپ کے سوالات مبہم نہ ہونے پائیں۔ اگر سوالات خود آپ کی ذات سے تعلق رکھتے ہوں تو اپنی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ بھی لکھئے تاکہ ہم۔ آپ کا صحیح مفہوم سمجھ سکیں ——— اور آپ کے مسائل کا صحیح نفسیاتی تجزیہ بھی کر سکیں ——— (آپ کی یہ مختصر سوانح صیغہ راز میں رہے گی ——— محض سوالات شائع کئے جائیں گے) ہے آپ کی خاطر ہمیں منظور ہے بہرطور ——— ادارہ

نور محمد، لاہور

(۱) میں ہکلاتا ہوں، اور مجھے ہکلے پن کا اس قدر احساس ہے۔ کہ میں کوئی بات بھی ڈھنگ سے نہیں کہہ پاتا۔ کبھی کبھی تو خود سے اتنی شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے۔ کہ ہفتوں اتفاقاً کسی سے ملتا جلتا نہیں۔ حد ہے کہ گھر والوں سے بھی دور دور رہتا ہوں اس کا کوئی علاج بتا سکیں گے؟

معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہمارے پرچے کا باقاعدہ مطالعہ نہیں فرماتے۔ ورنہ شاید اب تک آپ کی یہ عادت بہت حد تک کم ہو چکی ہوتی۔ پچھلے پانچ چھ مہینوں میں "سائیکولوجی" میں دو مضمون ہکلے پن کے علاج پر آ چکے ہیں۔ ایک مضمون ہمارے پچھلے شمارہ ہی میں ہے۔ جو بہت اچھا ہے۔ برائے مہربانی اس کا مطالعہ کر لیجئے۔ اور اگر پھر بھی کچھ افاقہ نہ محسوس کریں۔ تو ادارہ کو لکھیئے۔ ہم جلد ہی ایک مضمون اور شائع کرنے والے ہیں۔

(۲) میں شرمیلی طبیعت کا ہوں، تنہا رہتا ہوں اور تنہا رہنا پسند کرتا ہوں۔ کیا یہ اچھی عادت ہے؟

آپ تنہا رہنا پسند نہیں کرتے۔ بلکہ مجبوراً تنہائی میں اپنے اوقات ضائع کرتے ہیں۔ آپ ہی نے تو ہمیں بتلایا ہے کہ آپ ہکلاتے ہیں۔ اور یہی ہکلا پن آپ کی تنہائی کا سبب ہے۔ ہمارے بتائے ہوئے مضمون پر عمل کیجئے اور ہمت کر کے باہر کی جیتی جاگتی دنیا میں آ جائیے۔ اور لوگوں سے ملئے۔ تنہائی سب کے لئے اچھی عادت نہیں ہوتی۔ کچھ کے لئے ہوتی ہے، مثلاً شاعروں، ناول

نگاروں کے لئے غلط فہمی ہوتی ہے۔ ہم آپ ان کے محسوسات کو پا نہیں سکتے۔ درحقیقت یہ ہے کہ ہم کو ہمارے ملک کو ہماری قوم کو ایسے لوگوں کی زیادہ ضرورت ہے جو میدان میں آنے کی ہمت رکھتے ہوں، اور حقائق کا مقابلہ کرتے ہوں۔ شاعروں، ناول نگاروں اور اس قسم کے دوسرے لوگوں کی بھی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ اپنی دور رس نگاہوں سے ہمارے لئے منزلوں کا تعین کر سکیں، مگر ابھی بہت سی ایسی راہیں ہیں۔ جو سنسان پڑی ہیں۔ آپ ان راہوں پر سے گزر کر تو دیکھئے۔

عزیز جہاں ، پشاور

ہم خواب کیوں دیکھتے ہیں ؟

فرائڈ کا کہنا ہے کہ خواب ہماری دبی ہوئی خواہشات کے کرشمے ہیں۔ وہ خواہشات جو اخلاقیات کی بندشوں سے تکمیل نہیں پاسکتیں۔ ہماری زبان پر بھی آتے ڈرتی ہیں۔ اور کبھی کبھی تصور میں آکر ہم کو شرمندہ کرتی ہیں۔ وہ سوتی حالت میں، جبکہ ہم کو اپنے شعور پر اختیار نہیں رہتا، خوابوں کا لبادہ اوڑھ کر آتی ہیں۔ اور ہمارے جی کو لبھاتی ہیں۔ فرائڈ جنس کی اہمیت کا علمبردار ہے وہ خوابوں سے جنس کو متعلق کر دیتا ہے۔ لیکن آپ اس چکر میں نہ پڑیئے، کیونکہ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ سیدھے سادے الفاظ میں یہ سمجھ لیجئے کہ بھولی بسری یادیں، نامکمل خواہشیں خوابوں میں تکمیل پاتی ہیں۔ وہ یادیں جو تحت الشعور میں گم ہو گئی تھیں، ابھرتی ہیں اور نئی شکل اختیار کرتی ہیں۔

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ خواب جاگتی حالت میں بھی دیکھے جاتے ہیں۔ ان کو DAY DREAMS کہتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے آپ تصوری تصور میں اپنی کامیابی کے خواب دیکھنے لگتی ہیں۔ اور فرض کرنے لگتی ہیں کہ آپ واقعی وہ سب کچھ بن گئی ہیں جو آپ بننا چاہتی ہیں۔ صحت مند حد تک دن کے خواب ہر ایک کو دیکھنا چاہئیں۔ مگر جب وہ جنون کی حد تک پہنچ جائیں۔ تو وہ ہم کو عملی دنیا سے دور لے جاتے ہیں۔ ہم تصور میں تو اقبال، غالب بن جاتے ہیں۔ اور اصل میں ایک شعر بھی موزوں نہیں کر پاتے۔

(۲) تحلیل نفسی سے خوابوں کا کیا تعلق ہے ؟

خواب ہی دراصل تحلیل نفسی کے سب سے بڑے معاون ہیں۔ عامل اپنے معمول سے اس کے خواب پوچھتا ہے، خوابوں سے اس کی خواہشیں معلوم کرتا ہے۔ اور اس کی موجودہ زندگی کے محرک جذبے بتا دیتا ہے۔ کبھی کبھی تو معمول اپنی پریشانیوں کی وجہ معلوم کرنے ہی سے اچھا ہو جاتا ہے ———— ہم پھر کبھی تفصیل سے تحلیل نفسی اور خوابوں پر مضمون کی شکل میں لکھیں گے۔

رضی الدین ، کراچی

قانون اور نفسیات کا کیا تعلق ہے ؟

مولانا عبدالماجد دریا بادی کے الفاظ میں مختصراً جواب سنیئے :۔

قانون سے بھی نفسیات کا تعلق کچھ کم گہرا نہیں، ارتکاب جرم میں نیت کا دخل کہاں تک ہوتا ہے ؟ احمق اور پاگل پر ذمہ داری کس حد تک اپنے قول و عمل کی عائد ہوتی ہے ؟ گواہ اگر اختلال حواس میں مبتلا ہے تو اس کی گواہی کس حد تک قابل اعتبار ہو سکتی

ہے۔ مجرم کی ذہنیت کیا ہوتی ہے؟ دماغی کی نفسیت اور مقابلے کی نفسیت میں فرق کیا ہوتا ہے۔ سور اشتراک کہاں تک ... جذبات کا اظہار کرتا ہوں اور فریقین مقدمہ کے بیانات پر کیا پڑتا ہے؟ اس قسم کے بیسیوں قانون اور عدالتی سوالوں کا جواب نفسیات ہی دے سکتا ہے۔

(۲) محبت کیا ہے؟

غالباً آپ نے ہم سے محبت کی میت پوچھ کر یہ سوچا ہوگا کہ ہم کوئی جامع اور مانع تشریح دے سکیں گے، ضرور دے سکتے ہیں مگر اس میں آپ کے دل کو ٹھیس پہنچنے کا امکان ہے، مگر سنیئے، فرائڈ محبت کو کسی ایک ہستی سے جنسی وابستگی کو محبت کہتا ہے۔ وہ محبت کا معانی چیزاسی حد تک سمجھتا ہے جس حد تک جنسی جذبے سب سے فطری جذبے اور سب سے اہم جذبے ہیں۔ وہ تو بھائی بہن ماں بیٹے کی محبت کو بھی جنسی روشنی میں دیکھتا ہے۔ پھر محبوب اور محبوبہ کی محبت تو یقینی جنسی وابستگی ہوتی ——— ہم تفصیل میں جانے سے گریز کرتے ہیں۔ کیونکہ بہت سے نازک دلوں کو ٹھیس لگنے کا امکان ہے ——— اگر محبت کی تعریف سن کر خوش ہونا چاہتے ہیں۔ تو کسی شاعر سے پوچھیئے۔ ہم تو تجزیہ کرنے پر مجبور ہیں۔ اور تجزیہ کرنے سے ہم بھی فرائڈ سے متفق ہیں۔

نسیمہ شمیم۔ راولپنڈی

میں جلدی سونے کی کوشش کرتی ہوں، مگر کمبخت نیند آنکھوں سے دور بھاگتی ہے رات کو زیادہ دیر تک جاگنے سے دن بھر طبیعت میں بے چینی رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ گلے میں پھندا ڈال لوں، بتایئے میں کیا کروں؟

دیر میں نیند نہ آنے کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے، آپ سوتے وقت ہزاروں قسم کی باتیں سوچتی ہوں گی، آنے والی کل کی ذمہ داریاں، گھر کا کام، کالج کا خیال، وغیرہ وغیرہ سب ہی کچھ آپ کو گھیر لیتا ہوگا، اور آپ ان میں اتنا الجھتی ہوں گی کہ نیند غائب ہو جاتی ہوگی ——— سوتے وقت کوئی الجھی ہوئی بات نہ سوچئے۔ ذمہ داریوں کو پہاڑ نہ سمجھئے۔ اور اچھا ہے کہ کوئی کتاب پڑھتے پڑھتے سو جائیں سوتے وقت کورس کی کتابیں، ڈراونے قصے ہرگز نہ پڑھیئے۔ ایسی کتاب پڑھیئے جس میں دماغ زیادہ نہ الجھے۔

اور ہلکی غذا کا استعمال کیجئے۔ آپ دیکھیں گی کہ آپ جلد ہی سو جائیں گی۔ اور خودکشی کرنے کی نوبت نہ آئے گی ——— اور خودکشی کا خیال ہی کیوں آیا آپ کو، کیا آپ زندہ رہنے سے ڈرتی ہیں؟

(۲) کیا نیند کی کوئی دوا بھی ہے؟

جی ہاں۔ بہت سے SLEEPING DOSES شیشیوں میں بھرے دوا فروشوں کے یہاں موجود ہیں۔ مگر ان کا استعمال نقصان دہ ہے۔ کیونکہ آپ اپنی فطری نیند کھو دیں گی، اور اس دوا کی عادی ہو جائیں گی، بغیر اس کے استعمال کے نیند کو پاس پھٹکنے بھی نہ پائیں گی۔ اگر آپ ایک بری عادت ڈالنا چاہتی ہیں تو بسم اللہ، شوق سے دوائیں خریدیئے۔ مگر آپ کا صحیح علاج ہم بتا چکے ہیں۔ بے قیمت نسخہ ہے۔ لیکن بہت ہی بیش قیمت۔

محمد فخرالدین، کلکتہ ——— (۱) میں خط لکھنے سے بہت گھبراتا ہوں، دوستوں کے

خطوط آتے رہتے ہیں، ہفتوں بعد ایک دو لکھنا بڑی مشکل سے کر پاتا ہوں، سب کو شکایت ہے۔ کوئی ترکیب بتائیے۔ کہ میں ہر ایک خط کا جواب فوراً دیدوں۔

آپ کا آخری جملہ ہی آپ کی مشکلوں کا حل ہے۔ آپ میں جواب دینے کی خواہش موجود ہے۔ مگر محض خواہش سے دنیا کا کوئی کام تکمیل نہیں پا جاتا۔ کھانا بھی پکا کر کھایا جاتا ہے۔ آپ درزی سے جب کپڑے سلواتے ہیں، تب ہی پہنتے ہیں۔ اسی طرح جواب دینے کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے ہی سے آپ کے دوستوں کی شکایت دور کی جا سکتی ہے۔ جیسے ہی کوئی خط آئے، کوشش کیجئے کہ اُس کا جواب فوراً دیدیں۔ مختصراً سہی۔ جو جو خطوط کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ آپ پریشان ہوتے جاتے ہیں کہ اتنے خطوط کا جواب کیوں کر دیں گے اس طرح وہ کنکر جو آپ باسانی اٹھا کر پھینک سکتے ہیں۔ دوسروں کنکروں کے ساتھ مل کر پہاڑ بنتا جاتا ہے ——— شروع میں آپ مختصراً خط لکھیں گے۔ اور پھر خط لطیف اور طویل ہوتے جائیں گے، اور پھر آپ ان میں وہی دلچسپی لیتے جائیں گے، جو آپ کے احباب لیتے ہیں۔ ورنہ جانتے ہیں کیا ہوگا، کوئی کہاں تک خط لکھے گا، خاموش ہو جائے گا اور آپ اپنے اچھے دوستوں کو کھو دیں گے۔

(۲) میں صبح دیر میں سو کر اٹھتا ہوں۔ حالانکہ رات کو جلد ہی سو جاتا ہوں۔ اسی لئے میں ہفتہ میں ایک دن بھی ٹھیک وقت پر دفتر نہیں جا پاتا — کیا کروں؟

آپ اس عادت کو خود بھی چھوڑ سکتے ہیں۔ مگر آپ دوسروں کے بہت زیادہ محتاج نظر آتے ہیں۔ اس لئے آپ اپنے کسی قریبی عزیز سے کہہ دیجئے کہ وہ آپ کو صبح جلد ہی اٹھا دیا کرے، خواہ آپ ناراض ہی کیوں نہ ہوں۔ کچھ دن تک آپ کو ناگوار ہوگا، مگر پھر آپ خود ہی اُٹھنے لگیں گے ——— اگر آپ چاہیں تو محض اپنی قوت ارادی سے بھی اس عادت کو ختم کر سکتے ہیں۔ روز سوتے وقت ارادہ کیجئے کہ آپ صبح ۵ بجے اٹھیں گے، اور اس ارادے کو سوتے وقت تک دہراتے رہیئے ہمیں یقین ہے کہ آپ کی آنکھ کھل جائے گی، جیسے ہی آنکھ کھلے بستر چھوڑ دیجئے، کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ جس وقت آپ سوتے ہوتے ہیں۔ قدرت کتنی رنگینیاں فضا میں بکھیرتی ہے۔ چڑیوں کے نغمے، پتیوں کی تالیاں، ہواؤں کی لطافت سب بیکار جاتی ہے۔ ابھی سے ارادہ کر لیجئے، کہ اب آپ دیر میں سو کر نہ اٹھیں گے

زرین عذرا، کراچی:۔

میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتی ہوں، موجودہ زمانہ میں فلموں کی اہمیت سے آپ کو اتفاق ہوگا ہی، لیکن عام طور پر جو فلمیں "سلور" اور "گولڈن" جوبلی کی حد تک چلتی ہیں۔ وہ بہت گری ہوتی ہوتی ہیں۔ نہ کہانی میں کوئی ندرت ہوتی ہے نہ کرداروں میں دوسروں کے مشعل راہ بننے کی اہلیت، صرف گانے ہوتے ہیں، اور چند فحش ادائیں ——— مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنے پرچہ میں فلموں کے نفسیاتی پہلو پر روشنی ڈالئے۔ اس طرح آپ ایک بہت بڑی خدمت انجام دیں گے۔ اور

قلمی پیاد بھی تشنہ رہ جاتے ہیں، اکثر انگریزی سائیکولوجی میں اس قسم کے تجربے
دیکھتی ہوں۔ کہئیے۔ کیا ارادے ہیں ؟

نہیں آپ کے مشورے سے اتفاق ہے۔ پہلا ہم کو بھی ارادہ تھا۔ مگر حالات سازگار نہ ہو سکے۔ اب بھی نہیں ہیں۔ صفحات بڑھانے کی گنجائش نہیں ہے، کاغذ دن بدن نایاب ہوتا جا رہا ہے۔ پھر بھی ہم سائیکولوجی کے دوسرے قارئین سے مشورہ لے رہے ہیں، اگر سب کی یہی رائے ہوئی تو جلد ہی آپ کے مشورہ پر عمل کریں گے۔

محمد عثمان ، لاہور

" ID " کسے کہتے ہیں ؟

ہم آپ سب اپنے ساتھ چند جبلّی تقاضے لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ تقاضے ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کو بیکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے تقاضوں پر مذہب اور سماج کو کیوں اعتراض ہونے لگا، مگر کچھ تقاضے —— جنسی تقاضے —— بدنام تقاضے ہیں۔ جو ہیں تو بہت اہم، مگر جن کو رد کرنا مہذب انسانوں نے اپنا فرض بنالیا ہے ایسے بدنام تقاضے لاشعور میں ڈھکیل دیئے جاتے ہیں۔ اسی کو " ID " کا نام دیا گیا ہے ٭

زندگی میں انقلاب کی قوّت

زندگی کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہم دنیا کے کاموں میں حصّہ لیں اور مقصدِ حیات کے ڈھکے ہوئے رخ کو اجاگر کریں۔ ہم میں کے بہت سے ایسا نہیں کرتے۔ وہ مطمئن ہوتے ہیں اور لوگوں کی خدمت کرنا چنداں ضروری نہ سمجھتے ہوئے اس میں حصّہ نہیں لیتے۔ دوسرے کرتے ہیں لیکن فریضہ سمجھ کر۔ وہ انہماک سے اور خوشی خوشی نہیں کرتے۔ اس لئے وہ اپنے کو خوشی اور اطمینان کے راستے سے علیحدہ کر لیتے ہیں۔

جو مستقل آمدنی پر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، اکیلا رہنا پسند کرتا ہے، حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے اور دینے سے جان چُراتا ہے دانستہ اپنے کو خوش گوار، حسین اور دلفریب زندگی سے دور کر لیتا ہے۔ وہ سخت، مردہ اور اندھیری زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی روحانی زندگی کی تلاش میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔ کچھ لوگوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی غیر محدود آمدنی ہو۔ کسی کام کے لئے نہیں بلکہ زندگی گذارنے کے لئے اور اپنے قریبی رشتہ داروں کے لئے وہ انسان اور زندگی کے قانون سے ناواقف ہوتے ہیں۔ روپے کے علاوہ دوسری چیز پسند نہیں کرتے کیونکہ اس قسم کے لوگوں کی زندگی بہت غربت اور مصیبت کی حالت میں بسر ہوتی ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ ہر شخص زیادہ سے زیادہ روپے والا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن صرف فرق اتنا ہے کہ وہ "صرف روپے والا" بننا نہیں چاہتا، بلکہ یہ تصور ضمنی ہوتا ہے۔

کیونکہ انسان کو بہرحال زندگی کے لئے کام کرنا ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب بھی نہ لینا چاہیئے کہ وہ دنیا کے کاموں میں حصّہ نہیں لے سکتا۔ بہت سے آدمی لکھتے ہیں اور کام کرتے ہیں۔ وہ شہرت کے لئے کام نہیں کرتے اور اسی وجہ سے ان کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ وہ کبھی کامیاب لوگوں کی طرح زندگی کی خوشیوں اور لطف سے بہرہ یاب نہیں ہوتے۔ اور یہ صرف اس وجہ سے کہ جب تک آدمی کے پاس ذریعہ ہے وہ مطمئن اور خوش نفوس کی دنیا سے اپنے نفس کو کیوں الگ رکھتا ہے؟

ایسے لوگ جو خاندانی طور سے یا اپنے ذاتی کسب کی وجہ سے آمدنی کی طرف سے مطمئن ہیں ان کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ انہیں کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص کام کرنا چاہے تو اسے ہر وقت مل سکتا ہے، ہر جگہ بہت سے ایسے ادارے یا اس قسم کے دلی جذبات ہوتے ہیں کہ جن کا مقصد صرف انسانیت کی خدمت ہوتا ہے، لیکن وہ مزدوری اور روپیہ کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے ایسے ہی اداروں کی رضاکارانہ خدمت کی جا سکتی ہے لیکن اس قسم کے رضاکارانہ کاموں میں انتہائی سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ اس لئے کہ رضا و رغبت سے کیا جاتا ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی سہل انگاری کی گنجائش اس لئے نہیں کہ وہاں دباؤ یا اثر نہیں ہوتا، لیکن ایسے کاموں کے لئے خلوص نیت کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ سنجیدگی اور خلوص کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس وقت خلوص نیت

لیکن پہلو بھی تشنہ نہ رہے گا، میں اکثر انگریزی سائیکولوجی میں اس قسم کے تبصرے دیکھتی ہوں۔ کہئے۔ کیا ارادے ہیں؟

ہمیں آپ کے مشورے سے اتفاق ہے۔ ہمارا خود بھی ارادہ تھا۔ مگر حالات سازگار نہ ہوسکے۔ اب بھی نہیں ہیں، صفحات بڑھانے کی گنجائش نہیں ہے، کاغذ دن بدن نایاب ہوتا جا رہا ہے۔ پھر بھی ہم سائیکولوجی کے دوسرے قارئین سے مشورہ لے رہے ہیں، اگر سب کی یہی رائے ہوئی تو جلد ہی آپ کے مشورہ پر عمل کریں گے۔

محمد عثمان، لاہور

"ID" کسے کہتے ہیں؟

ہم آپ سب اپنے ساتھ چند جبلی تقاضے لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ تقاضے ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کو سیکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے تقاضوں پر مذہب اور سماج کو کیوں اعتراض ہونے لگا، مگر کچھ تقاضے —— جنسی تقاضے —— بدنام تقاضے ہیں۔ جو ہیں تو بہت اہم، مگر جن کو رد کرنا مہذب انسانوں نے اپنا فرض بنالیا ہے۔ ایسے بدنام تقاضے لاشعور میں دھکیل دیئے جاتے ہیں۔ اسی کو "ID" کا نام دیا گیا ہے ★

جعفر بارھوی

زندگی میں انقلاب کی قوّت

زندگی کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہم دنیا کے کاموں میں حصہ لیں اور مقصدِ حیات کے ڈھکے ہوئے رخ کو اجاگر کریں۔ ہم میں سے بہت سے ایسا نہیں کرتے۔ وہ مطمئن ہوتے ہیں اور لوگوں کی خدمت کرنا چنداں ضروری نہ سمجھتے ہوئے اس میں حصہ نہیں لیتے۔ دوسرے کرتے ہیں لیکن فریضہ سمجھ کر۔ وہ انہاک سے اور خوشی خوشی نہیں کرتے۔ اس لئے وہ اپنے کو خوشی اور اطمینان کے راستے سے علیحدہ کر لیتے ہیں۔

جو مستقل آمدنی پر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، اکیلا رہنا پسند کرتا ہے، حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے اور دینے سے جان چُراتا ہے سوا اپنے کو خوش گوار حسین اور دلفریب زندگی سے دور کر لیتا ہے۔ وہ سخت، مردہ اور اندھیری زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی روحانی زندگی کی تلاش میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔ کچھ لوگوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی غیر محدود آمدنی ہو۔ کسی کام کے لئے نہیں بلکہ زندگی گذارنے کے لئے اور اپنے قریبی رشتہ داروں کے لئے وہ انسان اور زندگی کے قانون سے ناواقف ہوتے ہیں۔ روپے کے علاوہ دوسری چیز پسند نہیں کرتے کیونکہ اس قسم کے لوگوں کی زندگی بہت غربت اور مصیبت کی حالت میں بسر ہوتی ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ ہر شخص زیادہ سے زیادہ روپے والا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن صرف فرق اتنا ہے کہ وہ "صرف روپے والا" بننا نہیں چاہتا، بلکہ یہ تصور ضمنی ہوتا ہے۔

کیونکہ انسان کو بہرحال زندگی کے لئے کام کرنا ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب بھی نہ لینا چاہیئے کہ وہ دنیا کے کاموں میں حصہ نہیں لے سکتا۔ بہت سے آدمی لکھتے ہیں اور کام کرتے ہیں۔ وہ شہرت کے لئے کام نہیں کرتے اور اسی وجہ سے ان کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ وہ کبھی کامیاب لوگوں کی طرح زندگی کی خوشیوں اور لطف سے بہرہ یاب نہیں ہوتے۔ اور یہ صرف اس وجہ سے کہ جب تک آدمی کے پاس ذریعہ ہے وہ مطمئن اور خوش نفوس کی دنیا سے اپنے نفس کو کیوں الگ رکھتا ہے ؟

ایسے لوگ جو خاندانی طور سے یا اپنے ذاتی کسب کی وجہ سے آمدنی کی طرف سے مطمئن ہیں ان کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ انہیں کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص کام کرنا چاہے تو اسے ہر وقت مل سکتا ہے، ہر جگہ بہت سے ایسے ادارے یا اس قسم کے دلی جذبات ہوتے ہیں کہ جن کا مقصد صرف انسانیت کی خدمت ہوتا ہے، لیکن وہ مزدوری اور روپیہ کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے ایسے ہی اداروں کی رضاکارانہ خدمت کی جا سکتی ہے لیکن اس قسم کے رضاکارانہ کاموں میں انتہائی سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ اس لئے کہ رضا و رغبت سے کیا جاتا ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی سہل انگاری کی گنجائش اس لئے نہیں کہ وہاں دباؤ یا اثر نہیں ہوتا، لیکن ایسے کاموں کے لئے خلوص نیت کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ سنجیدگی اور خلوص کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس وقت خلوص نیت

[illegible] سنجیدگی اور توجہ میں بھی فرق آجاتا ہے۔ شاید آپ نے محسوس کیا ہوگا لوگ شعوری یا غیر شعوری طور سے ہمیشہ کام کی [illegible] کا اندازہ اس کی پاکیزگی اور اچھوتے پن سے کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے بد دلی سے کیا ہوا کام خواہ کتنی ہی محنت کیوں نہ کی ہو کسی کام نہیں آتا۔

بہت سے نظام اسی رضاکارانہ خدمت کے فرائض ہیں اور وہ صرف اس لئے کہ لوگ اس کو بیگار سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ اپنے میں بڑائی کا احساس کرتے ہیں اور ان لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، وہ انہیں بولنے کی بھی اجازت دینا گوارا نہیں کرتے۔ اس قسم کی مدد کسی نظام کے لئے بے سود ہوا کرتی ہے۔ رضاکارانہ کام اتنی ہی تن دہی سے کرنا چاہیئے جتنا کہ اجرت پر اور اسے اتنی زیادہ پاکیزگی اور نیک نیتی سے انجام دینا چاہیئے جتنا کہ امکان میں ہو۔ کسی شخص کی نکتہ چینی یا تنقید پر اگر ایک رضاکار خیال کرے کہ وہ کسی کا ماتحت نہیں ہے۔ اسے کرنے اور نہ کرنے کا پورا پورا اختیار ہے تو یہ اس کے خلوص کی کمی ہے سنجیدگی کا نقص ہے۔

خدمت اور فرض شناسی پر زور دیتے ہوئے ۱۱ر نومبر ۱۹۴۸ء کو پاکستان نیشنل ہائی اسکول پارلیمان کی رسم افتتاح کے موقعہ پر محترمہ فاطمہ جناح نے ان طلبا کو جو اس پارلیمنٹ کے وزیر منتخب ہوئے تھے، مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

"جو لوگ محض شہرت اور نام و نمود کے لئے یہ عظیم ذمہ داری قبول کرتے ہیں وہ دراصل ان لوگوں سے غداری کرتے ہیں جنہوں نے ان پر اعتماد کیا، وزیر اور ایک رکن پارلیمنٹ کے فرائض نہایت مقدس ہوتے ہیں اور جو لوگ عیش و عشرت اور خود غرضانہ زندگی سے باز نہیں رہ سکتے وہ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

زیادہ تر جو لوگ زندگی بسر کرنے کے لئے کام کرتے ہیں ان کا کام ان کی حیثیت اور قوت کے اعتبار سے ہوتا ہے اور انہیں دھوپ کی گرمی یا دن کا بوجھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ جو لوگ رضاکارانہ کام کرتے ہیں وہ اسی طرح اپنا وقت گزارتے ہیں۔ انہیں دنیا کے کاموں کے بوجھ کا احساس ہونا چاہیئے، اور اس میں حصہ لینا چاہیئے، جب تک وہ دن کے اختتام پر اپنے میں تھکاوٹ نہ محسوس کرینگے انہیں اطمینان اور دماغی سکون میسر نہیں ہو سکتا۔ آپ نے غور کیا ہے؟ ایک پُر خلوص کارندہ جب رات کو بستر پر لیٹ کر اپنے دن بھر کے کاموں پر غور کرتا ہے تو اُسے کتنا اطمینان اور دماغی سکون میسر ہوتا ہوگا۔

دراصل زندگی ایک اتفاق ہے جو آپ کے ساتھ واقع ہوا ہے، اور پھر انسانی زندگی ——— حُسنِ اتفاق اور خوش قسمتی۔ یقیناً اس کا مقصد سوائے خدمت کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اگر آپ اس پر اہمیت نہیں دیتے تو آپ اس خوش قسمتی کو بدقسمتی یا حُسنِ اتفاق کو سوءِ اتفاق بنانا چاہتے ہیں۔

زندگی کا قانون اور اس فضائے مدرکہ و محسوسہ کا مقصد محبت ہے۔ قانونِ خدمت دراصل قانونِ محبت کا ایک ممتاز جزو ہے۔ محبت کا قانون اپنی حقیقت خود فاش کرتا ہے، تاکہ تمام دیگر قوانین کا ظہور ہو، لیکن تمام قانون پلتے اسی کی گود میں ہیں۔ محبت سے سب کچھ ملتا ہے لیکن محبت کا قانون ہر ایک سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم سب کچھ دے دیں۔ وہ ہم سے متقاضی ہے کہ اس کے زندہ قالب بن جائیں۔ سب کچھ چھوڑ دیں اور محبت سے سب کو اپنی طرف کھینچ لیں، اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو زندگی سے متفق نہیں ہوتے ہیں۔ اور اس کی ہم آہنگی قبول نہیں کر سکتے۔ ہم

اس کے افراد دل پر بہت اچھا اثر ہوتا ہے، وہ اوزار جن کا ہنر محبت ہے، اور اس ہنر کا نتیجہ خوشی، سکون، اور بحالی ....

تمام فضائے عالم محبت کی کڑیوں میں جکڑی ہے۔ محبت ہی فطری اور جبلی اصول کی ایک شکل ہے اور محبت ہی کام کی ایک "حالت" ہے یعنی وہ "خدمت"۔ جو طاقتور ہیں کمزور کی مدد کرتے ہیں۔ اور جو بلند ہیں وہ نیچے والوں کے معاون ہیں۔ ہمارے رسول اور ائمہ معصومین علیہم السلام نے "بین حقیقت (بھائی) کی تعلیم دی۔ اور اگر ہمارے مذہبی علماء بجائے اس کے کہ عقائد اور اصولوں کی "پیروی" کرتے، اُن کی تعلیم پر زیادہ توجہ دیتے تو یقیناً ہماری مذہبی فضا موجودہ حالت سے کچھ مختلف ہوتی۔ سچ پوچھئے تو اسلام زندگی کا ایک راستہ ہے کیونکہ یہ اتحاد، احساس اور معاشرت کی طرف لے جاتا ہے۔

اور اگر آپ اس اتحاد، احساس اور معاشرت کی مثال پوچھیں تو میں بے کھٹکے یہ الفاظ دُہرا دونگا۔

"جب حسنین علیہما السلام حضرت علیؑ کو نجف اشرف میں دفن کر کے واپس آ رہے تھے تو ایک خرابہ کی طرف سے گزر ہوا۔ ایک دردناک آواز کان میں آئی، جسے سن کر دونوں شہزادے تڑپ گئے۔ آگے بڑھ کر دیکھا کہ ایک اندھا مفلوج خاک پر پڑا انتہائی درد سے کراہ رہا ہے۔ حضرت امام حسنؑ اس کے سرہانے بیٹھ گئے، اور اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اس نے جیں بجبیں ہو کر اپنا سر وہاں سے ہٹا لیا اور پھر زمین پر رکھ دیا۔ امام حسینؑ نے کہا "بھائی شاید اسے سر زانو پر رکھنے سے تکلیف ہوتی ہے جو اپنا سر زانو سے اٹھا لیا ہے۔" اب جو اس نے آواز سنی تو پریشان ہو گیا اور کہنے لگا مجھے معاف کیجئے میں نے دھوکہ میں ایسا کیا ہے۔ میں اپنے محسن و مربی کو سمجھا تھا۔ حضرت امام حسینؑ نے پوچھا وہ کون؟ اس نے کہا میں اس خرابہ میں سال بھر سے پڑا ہوں، آنکھوں سے اندھا ہوں، ہاتھ پاؤں کا مفلوج ہوں۔ ایک شخص ہر روز یہاں آتا تھا۔ شفقت سے میرا سر اپنے زانو پر رکھتا تھا۔ میرا بدن دباتا تھا۔ میوے اور روٹی مجھے کھلاتا تھا۔ میں نے ہر چند اس کا نام پوچھا لیکن اس نے نہ بتایا پس تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کون تھا اور کہاں کا رہنے والا تھا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ کوئی خدا کا ولی تھا۔ کیونکہ جب بیٹھا رہتا تھا برابر ذکر خدا اس کی زبان پر جاری رہتا تھا۔ آہ تین دن ہوئے کہ وہ میرا محسن و مربی مجھ تک نہیں پہنچا خدا جانے اس پر کیا گزری۔ اس وقت جو آپ نے میرا سر اپنے زانو پر رکھا تو میں سمجھا وہی ہے۔ میں نے اپنی ناراضی کا اظہار کرنے کے لئے سر ہٹا لیا۔ یہ سن کر حسنین علیہما السلام نے ایک آہ بھری اور کہا "اے شخص وہ ہمارے پدر بزرگوار علیؑ ابن ابی طالبؑ تھے۔ آہ ایک ظالم نے ان کو شہید کر ڈالا۔ ہم ان کو دفن کر کے واپس آ رہے ہیں۔"

یہ سنتے ہی فقیر کا غم سے عجب حال ہوا کہنے لگا "آپ کا احسان ہوگا مجھے اس مقام تک لے جائیے جہاں میرا محسن دفن ہے" حسنین اسے اٹھا کر لے گئے، اس نے حضرت کی قبر پر اپنا سر رکھ کر دعا کی کہ خداوندا اب دنیا میں رہنے کا مزا نہیں۔ میں تجھے اس صاحب قبر کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ میری روح قبض کرنے کا حکم دے"۔ خدا نے اس کی دعا قبول کی۔

اس کا نام اتحاد ہے۔ اس کا نام احساس ہے۔ اسی کا نام معاشرت ہے۔ اسی کا نام انسانیت ہے اور اسی کا نام زندگی ہے۔ شاید آپ اس مثال کے تصور سے پریشان ہو گئے ہوں لیکن آپ یقین رکھیں کہ کرنے والا اس میں راحت محسوس کرتا تھا، کیونکہ زندگی میں کوفت اور پریشاں حالی نااہلی کا ثبوت ہے۔ بے حسی کی علامت ہے۔ مردہ دلی نشانی ہے۔

بہت سے لوگ لیڈر بن کر دنیا کی خدمت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن کبھی گھٹیا قسم کے کام کو اپنے ذمے لینے کا نام نہیں لیتے

لہ جو یقیناً ایک دوسرے سے مختلف نہیں (جعفر)

کچھ یہ بہانہ کرتے ہیں کہ وہ اس کے عادی نہیں ہیں اور کچھ ناتجربہ کاری بتا کر ٹال جاتے ہیں۔ اور ہاں ! کچھ خدا کے بندے صاف صاف "ڈونکر نہ" بھی کر دیتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ خدمت کے مفہوم سے ناواقف ہیں وہ ایسے کام کو خدمت کہتے اور سمجھتے ہیں جس میں کرنے والے کی تعریف ہو اور اس پر کوئی انگلی نہ اٹھائے۔ وہ وقت نظر سے کام نہیں لیتے اور یہ نہیں سوچتے کہ خدمت نیت سے ہے۔ اگر نیت میں خلوص ہے اور کسی کو صحیح فائدہ پہنچانے کی غرض سے کی گئی تو وہ خدمت ہے۔ دوسروں کی تعریف سے تو بعض اوقات انسان میں خوش فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو نیت میں فرق آنے کے بہت امکان ہیں۔ لیکن میرا اس سے یہ مقصد بھی نہیں کہ جائز تحسین و تعریف سے پرہیز کیا جائے۔ آپ خدمت سے اپنی نا اہلی بتا کر چند آدمیوں کو راضی کر سکتے ہیں۔ لیکن اپنے اوپر خدمت کے دروازے بند ہونے کی شکایت کریں، تو یہ ناممکن ہے۔ ناشکری ہے، اور اپنے نفس کی توہین ہے۔ خدمت کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا ہے۔ ہاں اس کی قسمیں مختلف ہو سکتی ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم ان کی تشریح کریں ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم چھوٹی چیزوں پر پہلے توجہ دیں اور چھوٹی چیزوں میں سب سے پہلے ہمارے حالاتِ زندگی آتے ہیں۔ ہم زندگی اور زندگی۔ سے متعلق اپنے ساتھیوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ آپ اپنی حالت کچھ بہتر بنائیے یا ترقی کیجئے تو ممکن ہے یہ آپ کو ناممکن نظر آئے لیکن اگر آپ اپنی ملازمت کے (زیادہ کام جس کے عوض آپ کو اجرت دی جائے)، فرائض ٹھیک طرح سے انجام دینے پر بھی تیار نہیں ہیں، اور ان میں کوتاہی سے کام لیتے ہیں۔ تو کامیابی کے دروازے آپ کے لئے بند ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ بدبخت ہے وہ شخص جو اپنے فرائض میں (خاص طور سے جن کی اُجرت وہ پوری لے لیتا ہے) کوتاہی کرتا ہے، ایسا انسان اگر موت کی دعا کرے تو اسے مبارکباد دینی چاہیئے کیونکہ اسے انسانوں میں رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں، قانون فطرت میں وہ شخص واجب التادیب ہے جو اپنے ضمیر کو دھوکا دیتا ہے۔ اور وہ بھی غیر شعوری حالت میں۔ اپنے ضمیر کو دھوکا دیتا ہے اور احساس نہیں انسان احساس مرکب ہے جب اس کے احساس کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے تو وہ مردہ ہو جاتا ہے۔ پھر ایسا شخص جس میں باطنی احساس فوت ہو چکا ہے کس طرح انسانوں میں زندگی بسر کرنے کا حقدار ہے؟ وہ جادو کا ایک مُردہ ڈھانچہ ہے جو لاشعوری طور سے دوسروں کو دھوکے میں ڈالتا ہے۔

ایسے شخص کو نہ احساس کا لطف ہوتا ہے نہ اتحاد کا نہ ہی معاشرت کا، وہ باطنی حیثیت سے "بانجھ" ہو جاتا ہے

آپ ہی کے فائدے کی چند باتیں

* وی پی کے بجائے منی آرڈر سے چندہ بھیجنے میں فائدہ بھی ہے اور آسانی بھی
* خریداری نمبر کا حوالہ دینے سے آپ کی خدمت جلد تر کی جا سکتی ہے
* پتہ کی تبدیلی کے لئے کم از کم دو ہفتہ پیشگی اطلاع آنی چاہیے۔

سیّدہ یاسمین سیّد

اگر آپ تھک گئی ہیں۔ تو میری سُنیئے

آپ نے پتھر پر پانی گرتے تو دیکھا ہی ہوگا، کہاں پانی۔ نرم، ہلکا پھلکا۔ اور کہاں پتّھر۔ کھُردرا، سخت۔ مگر پانی کی مسلسل دھاریں پتھر کو گھس کر رکھ دیتی ہیں! اور اس کی شکل کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔

یہی حال آپ کا تو نہیں ؟

آپ مسلسل محنت کرتی ہیں۔ آپ کی حالت معمولی مزدوروں سے بھی بدتر ہے۔ مزدوروں کو زیادہ محنت کے صلے میں روپیہ ملتا ہے، اور آپ کو، کچھ بھی نہیں۔ ان کو ہفتہ میں ایک آدھ دن کی چھٹّی مل جاتی ہے۔ اور آپ کو، ایک لحظہ کی بھی نہیں۔ اور جب گھر کے اور افراد چھٹّی سے لطف اندوز ہوتے ہیں، آپ کو جو کچھ بھی اطمینان کی سانس لینے کا وقت ملتا ہے۔ وہ بھی چھن جاتا ہے۔ ان کی فرمائشوں کے کھانے پکانے ہیں، ان کے پاس آتے ہوئے احباب کے لئے چار بنانا ہے۔ دن بھر وہ لوگ ہنگامہ مچاتے ہیں۔ گھر بھر کی چیزیں تتر بتر کر دیتے ہیں، ان سب کو قرینے سے رکھنا آپ کا کام ہے۔

واہ ری ان کی چھٹّی۔

ابھی نیا نیا ملک بنا ہے۔ پُرسکوں زندگی کا شیرازہ یُونہی بکھرا ہوا ہے۔ ہندوستان میں جمی جمائی زندگی تھی۔ زندگی اتنی دشوار گزار نہ تھی۔ دو تین سال بیت جانے کے بعد ممکن ہے، آپ میں سے کچھ بہنیں سوچنے لگی ہوں کہ آپ کی مصیبتیں ختم ہونے والی ہیں۔ اور پھر وہی زندگی نصیب ہو جائے گی ——— جی نہیں، میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔ آپ کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ آپ تھکی ہوئی ضرور ہیں، اور آپ کو کسی کی مدد کی بھی ضرورت ہے۔ مگر یہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ آپ خود ہی ہیں۔ آپ کو خود اپنے کو مضبوط بنانا ہے مصیبتیں پانی کی طرح مسلسل آپ کو دبانے، بگاڑنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ مگر کیا آپ واقعی اُس پتھر کی طرح گھس جائیں گی ؟

آپ پوچھیں گی، یہ کیونکر ممکن ہے ؟

میں بتاتی ہوں (اگر عمل کرنے کا وعدہ کریں تو)

سب سے پہلے ——— خود رحمی کا شکار مت ہوئیے۔ آپ کی حالت ایسی ضرور ہے کہ دوسروں کی ہمدردی اگر نہیں ملتی تو خود پر ترس کھائیں۔ مگر خود پر ترس کھانے کا نتیجہ جانتی ہیں آپ ، مثلاً میں بیٹھے بیٹھے آدھے گھنٹے کے اندر ہی اندر اپنے کو بیمار ڈال سکتی ہوں۔ اگر میں بیٹھ کر یہ سُوچوں کہ دُنیا نے میرے ساتھ کیا کیا ظلم کیا ہے۔ جن لوگوں کی دیکھ بھال کرتے کرتے میں اپنی راتوں کی نیند خراب کرتی ہوں، دن بھر اندھا دھند مصروف رہتی ہوں، وہ لوگ کبھی شکر گزار آنکھوں سے دیکھتے تک نہیں، یقین جانیئے۔ اگر میں یہ سوچ سوچ کر اپنے پر رحم کرنے

کرنے لگوں تو ابھی بیمار پڑ جاؤں گی۔ مگر میں ایسا نہیں کرتی۔ اور یہی آپ سے بھی چاہتی ہوں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ ہم عورتیں سب سے اہم کام انجام دے رہی ہیں۔ ملک اور قوم کو جتنی ہماری ضرورت ہے، اتنی کسی بڑے سے بڑے لیڈر کی بھی نہیں۔ کیونکہ ہمیں اپنے بچوں کی پرورش کرنا ہے، ان کو صحیح راستوں پر چلانا ہے۔ بچوں پر جس انداز سے ہم اثر کر سکتے ہیں۔ اسکولوں کے ماسٹر، مذہبی پیشوا اور قومی لیڈر نہیں کر سکتے۔ یہی بچے کل کے رہنما ہوں گے۔ ہمیں ان کی صحت کی دیکھ بھال کرنا ہے، تاکہ وہ امن کے لئے تمام تسلطائی طاقتوں کو ختم کر سکیں۔

اور یہ سب اُسی وقت ممکن ہے جبکہ ہم خود صحت مند، بلند ہمت اور زندہ دل ہوں۔

آپ ہمہ وقت دوسروں کی فکر میں رہتی ہیں، ان کے لئے کھانے کا انتظام کرتی ہیں۔ گھر کی صفائی رکھتی ہیں اور یہ سب کرنے میں آپ خود کو فراموش کر دیتی ہیں، آپ کے کپڑے میلے ہو گئے، آپ کو پرواہ نہیں، بال اُلجھے ہوئے ہیں، آپ کو فکر نہیں۔ مگر اس لاپرواہی کے نتیجہ میں آپ مُردہ دل ہو جاتی ہیں۔ خیالات میں امنگ نہیں رہتی ———— نہیں، نہیں، جہاں بچوں کے کپڑوں پر، گھر کی دوسری ضروریات پر روپیہ صرف کرتی ہیں، ساتھ ہی ساتھ اپنے اوپر بھی کچھ رقم صرف کیجئے۔ اپنے کپڑے دُرست کر ڈالئے۔ اپنے بالوں کے لئے نیا کنگھا خرید لائیے۔ اپنے چہرے کی تازگی کے لئے کریم منگا لیجئے۔ روز بال بنائیے۔ کپڑے بدلئے۔ کریم لگائیے۔ اس طرح آپ میں دلکشی بھی قائم رہے گی۔ اور طبیعت بھی بحال رہے گی۔ ہنسنے کو، زندگی اور بھی چاہنے کو دل چاہے گا۔ اپنی پسند کی چیزیں ضرور خریدئیے۔ خواہ وہ بادی النظر میں غیر ضروری معلوم ہوں۔ کیونکہ ان کو خریدنے، استعمال کرنے سے آپ خوش رہیں گی، اور آپ کی خوشی بہت ضروری ہے۔

آپ اپنی قوتوں کو بیکار نہ صرف کیجئے۔ اپنے کو بے وجہ نہ تھکائیے ڈالئے۔ فرض کیجئے کہ آپ کو دن بھر میں پچاس کام کرنا ہیں۔ اور صبح اٹھیں آپ، اور بستر چھوڑنے سے قبل ہی ان کاموں کے تصوّر ہی سے گھبرا گئیں" اوہ، یہ کام میری جان لے کر چھوڑینگے" اور اس تصور کے ساتھ آپ بے ترتیبی سے کام کرنے لگیں، کچھ یہ کیا، کچھ وہ کیا۔ اِس کو ادھورا چھوڑ دیا، اُس کو کرنے میں لگ گئیں۔ تو ایک کام بھی نہ کر سکیں گی۔ اور تھک ہار جائیں گی۔ اس کے برخلاف اگر ایک کے بعد ایک، تسلسل سے کریں گی، تو سب کام بھی پورے ہو جائینگے، رات کو آرام سے نیند بھی آئے گی۔

اور ایک کام کرتے وقت دوسرے کام کے متعلق ہرگز نہ سوچئے۔ یہ نہیں کہ چار کی پیالیاں صاف کر رہی ہیں، اور دل بچوں کے کپڑوں میں لگا ہے۔ اور یہ بھی سوچ رہی ہیں کہ بچوں کے کپڑوں کے بعد آپ کو دھوبی کو بلا کر کپڑے بھی دینا ہیں۔ اور بازار سے فلاں چیز بھی منگانی ہے۔ پیالیاں صاف کرنے میں تو آپ اپنی جسمانی قوت جا سے صرف کر رہی ہیں۔ مگر اور کاموں کو تصوری تصور میں کر کے اپنی قوت کو بیکار گنوا رہی ہیں سمجھیں آپ، دراصل آپ کام کرنے سے نہیں تھکتیں، اور کاموں کی فکر آپ کے ہاتھ پیروں کو شل کئے دیتی ہے۔ اسی لئے تو میں کہتی ہوں کہ ایک وقت میں ایک ہی کام پر توجہ دیجئے ———— اور روزمرہ اپنے کسی بھی محبوب مشغلہ میں کچھ نہ کچھ وقت ضرور صرف کیجئے، کاڑھنے کا شوق ہو تو رومال کا ایک کونا ہی کاڑھ ڈالئے، اپنی کسی محبوب کتاب کے چند اوراق ہی پڑھ ڈالئے، کسی نظم ہی کو گنگنا ڈالیے، اپنی کسی عزیز سہیلی کو خط ہی لکھ ڈالئے، کچھ بھی کیجئے۔ مگر ہو آپکی محبوب بات، یہ نہیں کہ آپ ناول اس لئے پڑھیں کہ آپکے شوہر چاہتے ہیں کہ آپ اُس کے کسی کردار سے کچھ سیکھ لیں۔ یا آپ کی کسی سہیلی نے خواہش کی ہے کہ آپ اس کی شادی کے لئے کچھ تکیے کے غلاف کاڑھ دیں ———— یہی گھنٹہ آدھا گھنٹہ آپ کی چھٹی کا کام دیگا۔ اور ان لمحات کو چھٹی کی طرح گذاریئے بھی۔ یہ نہیں کہ اس وقت بھی کام کی فکر ہو، شوہر کے کسی "حکم" کی تعمیل کرنے لگیں ★

بھولوں کیسے

جب میں بھاگلپور میں تھی تو میری ایک بہت ہی نٹ کھٹ دوست تھی۔ اس کا نام ساوتری تھا۔ وہ ایک بڑے گھر کی لڑکی تھی۔ للو ت مانتی تھی۔ اسی نے اسے ہندی لکھنا پڑھنا سکھلایا۔ بچپن میں للو فٹ بال بہت اچھا کھیلتا تھا۔ ساوتری اس کی بڑی تعریف کرتی تھی۔ للو جب رانچی آیا تو اس نے فٹ بال کھیلنا چھوڑ دیا۔ اور ناول پڑھنا شروع کیا۔ وہ اپنے نانا جان سے چھپ کر کسی کونے میں بیٹھ کر عبدالحلیم شرر اور پریم چند کے ناول پڑھا کرتا تھا۔ روزانہ شام کو اُردو لائبریری جایا کرتا تھا اور خوب اچھی اچھی کتابیں لایا کرتا۔

جب وہ اسکول میں پڑھتا تھا تو اس نے اپنے چند ادبی دوستوں کی مدد سے ایک قلمی رسالہ جاری کیا تھا۔ رسالہ کا نام "کارواں" تھا۔ کارواں کی ایک کاپی پٹنہ میڈیکل کالج میں بھی بھیجی گئی تھی، اور میڈیکل کالج کے لڑکوں نے بڑی اس کی تعریف کی تھی۔ للو ایک شاعر بننا چاہتا تھا۔ اُس نے شفیق قادری اور عبدالوہاب سے شاعری کے آرٹ سیکھے تھے۔ اس کی پہلی غزل رسالہ ندیم گیا میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں کچھ عرصے بعد اُسے شاعری سے چڑ سی ہوگئی اور اس نے شاعری کا میدان چھوڑ کر نثری ادب قبول کیا۔ وہ کہانیاں لکھنے لگا۔ اس کی پہلی کہانی بعنوان "یادگار محبت" رسالہ شمع دہلی میں چھپی تھی۔

مجھے للو سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ لیکن جب میری شادی ہوئی اور جس دن میں سسرال جا رہی تھی تو گھر پر وہ موجود نہیں تھا۔ ہمدردی نہ ہونے کے باوجود بھی میں اُسے ڈھونڈ رہی تھی۔ شادی کے بعد میں جمشید پور ہی میں رہنے لگی کیونکہ میرے میاں ٹِسلی کے بارہاؤس میں کام کرتے تھے۔ کسی وجہ سے جب ان کی نوکری ختم ہوگئی تو اُن کے ساتھ میں رانچی آگئی۔ میرے میاں رانچی میں نوکری کرنے لگے۔ ہم سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ للو کا کمرہ الگ تھا۔ جب بھی میرے میاں کام کر کے رات ۹ بجے گھر آتے تو پہلے وہ للو کے کمرے میں جاتے اور کہانیاں سُنتے۔ اور مجھ سے آ کر کہا کرتے "للو آگے چل کر خوب ترقی کرے گا۔ بہت شریف لڑکا ہے، میرا ادب کرتا ہے"۔ یہ سب کچھ سُن کر میں جل جاتی۔ للو کی خاموشی مجھے پسند نہ تھی۔ اس کی خاموشی اُکتا دینے والی خاموشی تھی۔ وہ اپنے رشتہ داروں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اور بیوقوف لڑکیوں سے بات کرنا وہ اپنی توہین سمجھتا تھا۔ وہ بے حد مغرور واقع ہوا تھا۔

میرے پڑوس میں ایک وکیل صاحب بھی رہتے تھے۔ ان کی بیوی نوشابہ افسانے لکھا کرتی تھی۔ اس لئے للو سے ان بڑی دلچسپی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو خط لکھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ نوشابہ کا ایک خط میرے ہاتھوں لگ گیا۔ خط میں اس نے لکھا تھا "تم خط نہیں لکھتے ہو جادو کرتے ہو۔ اگر کوئی غیر شادی شدہ عورت تمہارا خط پڑھ لے تو وہ ڈول جائے ––" نوشابہ نے جو کچھ لکھا تھا۔ صحیح لکھا تھا۔ بہت دنوں کی بات ہے اس نے ایک خط مجھے بھی لکھا تھا۔ پڑھتے پڑھتے میں کھو گئی تھی۔ خوابوں کی دنیا میں پہنچ گئی تھی۔

نانا جان جب جمشید پور گئے تو انہوں نے للو کو اپنے پاس بلا لیا۔ اس کے جانے کے بعد میں بہت خوش تھی۔ لیکن نوشابہ بے چین تھی۔ وہ روزانہ خط کا انتظار کرتی تھی۔ لیکن للو نے ایک خط بھی بے چاری کو نہیں لکھا۔ یہ تو میں جانتی ہی تھی کہ للو ایک نمبر بدمعاش ہے۔ وہ تو عاشقی سے کسی کو تڑپا نا جانتا تھا۔ اس کے پاس دل ہی کہاں ؟ اس کی آنکھوں میں میں نے کبھی آنسو نہیں دیکھے۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے سنا کہ وہ جمشید پور میں ایک بے وقوف لڑکی سے محبت کرنے لگا ہے۔ حالانکہ اسے بے وقوف لڑکیوں سے نفرت تھی۔ اسی دن سے میری رگ رگ میں نفرت رچ گئی۔

جب میرے سرتاج موٹر کے حادثہ میں سخت زخمی ہو کر ہسپتال میں پڑے ہوتے تھے۔ تو للو نے ان کی بہت خدمت کی تھی۔ جب میرے سرتاج مر رہے تھے تو وہ وہاں موجود تھا۔ میں بھی تھی۔ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو میں کانپ سی گئی تھی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں تھیں۔ اپنی زندگی میں میں نے اسے اسی دن روتے ہوئے پایا تھا۔ مرجانے کے بعد میرے سرتاج کی جیب سے للو کا لکھا ہوا ایک افسانہ نکلا اس دن میں نے محسوس کیا کہ میں اندھیرے میں تھی۔ اور میں للو پر ظلم کر رہی تھی۔ یہ میری بھول تھی۔ آج جب بھی میں للو کو دیکھتی ہوں تو میرے سرتاج مجھے یاد آجاتے ہیں۔ اور وہ واقعہ بھی جب للو کی آنکھیں رو رہی تھیں۔ پھر للو کو میں کیسے بھولوں ؟

آج میں بیوہ ہوں۔ میرے تین چار بچے ہیں کسی نہ کسی طرح زندگی کے باقی دن گذار رہی ہوں۔ للو کبھی کبھی میرے پاس آتا ہے آج للو ل۔م۔ شاہد ہے ★

عابدی جعفر

راگ بے راگ

چلچلاتی دھوپ میں سڑک کی چھاتی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ کولتار نرم ہوگیا تھا۔ بھاری بھاری موٹریں جب گزرتی تھیں۔ تو اپنے پیچھے اپنے نقش پا چھوڑ جاتی تھیں۔ پہیوں کے یہ نشان مجھے زنجیریں نظر آتے تھے۔ جن سے اس سڑک کو باندھ دیا گیا تھا۔ اور جو آزاد ہونے کے لئے تڑپ رہی تھی۔ مچل رہی تھی۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا۔

اس سڑک کی بےچینی کو دیکھ رہے ہو ؟"

میرے ساتھی نے اس کی بےچینی نہ دیکھی تھی، اس نے کسی سڑک کی بےچینی نہ دیکھی تھی۔ وہ مدتوں سے سڑکوں کی چھاتیوں پر کنکروں پتھروں اور پگھلتے ہوئے کولتار کے پیوند لگایا کرتا تھا۔ جب اس کی بےچینی کو کسی نے نہ دیکھا تو اس نے بھی انتقاماً سڑک کی بےچینی کو دیکھنا، محسوس کرنا چھوڑ دیا۔ اور اب وہ میکانیکی انداز میں سڑک کے اکھڑے ہوئے پیٹروں پر کنکر بچھا دیتا۔ اور پھر پانی ڈالکر کوٹنے لگتا۔ پانی سے سڑک کے زخم میں دردبھی جلن ہونے لگتی۔ اور دھواں سا اٹھنے لگتا ——— اس نے ایک لحظہ کے لئے اپنے ہاتھ روکتے ہوئے میری طرف مڑکر دیکھا۔ اور کہا۔

"تم سے مزدوری نہیں ہو سکے گی"

"کیوں"؟

اس نے اپنے ہاتھ چلانا شروع کر دیئے۔ اور اپنے کاندھوں پر اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"تم ان لوگوں میں بڑے ہوئے ہو۔ جو سڑک پر زخم لگانا جانتے ہیں۔ پیروں سے روندنا جانتے ہیں۔ مرہم نہیں لگاتے میں عمر بھر ان زخموں پر مرہم لگاتا رہا ہوں۔ پیوند لگاتا رہا ہوں"

مجھے اپنے ساتھی سے اس قسم کے جملے سننے کی توقع نہ تھی اور میں تو محض اپنی ترنگ میں وہ جملہ کہہ گیا تھا۔۔۔۔۔۔ میں اسے دیکھتا رہا وہ کام میں مشغول رہا۔ شاید وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ ماضی کے ادھورے خواب مستقبل کے تاریک خواب، اس کے ہاتھ میکانیکی انداز میں چلتے رہے۔ اور آنکھیں سڑک پر بےحسی سے جمی رہیں ——— میں بھی خیالات کی گنجان وادیوں میں گھومنے لگا۔ کچھ باتیں، کچھ یادیں۔ جو اس سڑک سے وابستہ تھیں۔ تحت شعور سے ابھرنے لگیں۔ اور مجھے گھسیٹ کر میرے گزری ہوئی کل، میری ادھوری کل میرے غمگین اور رنگین ماضی میں لے گئیں۔

یہ سڑک اس زمانہ میں نئی نئی بنی تھی اور ہم لوگوں کے لئے دوسری دنیا تک پہنچنے اور وہاں سے مسرتوں کو لانے کا ذریعہ تھی۔ پہلے شہر کی باتیں ہم سب کے لئے ایسی ہی تھیں۔ جیسے خواب کی باتیں۔ مہینہ میں ایک دو مرتبہ ہمارے گاؤں کے دو ایک آدمی تیس میل کی مسافت طے کر کے شہر جاتے تھے۔ اور وہاں سے سستے قسم کے پوڈر کے ڈبے۔ کپڑے رنگنے کے رنگ۔ ہونٹوں پر لگانے کی سرخی لاتے تھے اور گاؤں میں آٹھ گنے داموں پر بیچتے تھے۔ یہ لوگ شہر کی عجیب و غریب زندگی کی داستانیں۔ وہاں کی عالیشان عمارتوں۔ بغیر گھوڑے یا بیل کے چلنے والی گاڑیوں کے حالات چٹخارے بھر بھر کر سناتے تھے۔ اور اگر کبھی وہ سینما دیکھ لیتے تھے تو ہفتوں ان کی دکان پر گاؤں کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کا مجمع رہتا تھا۔ ہونٹوں پر لگانے والی سرخی کی شیشیوں کی قیمت اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ اور ان دنوں گاؤں کی سب سے حسین لڑکی، سب سے شوخ اور جوان لڑکی۔ گاؤں کے کسی اوباش طبع نوجوان کے ساتھ بھاگ جاتی تھی۔

سب جانتے تھے۔ کہ وہ شہر گئی ہوئی۔ عالیشان عمارتوں میں رہتی ہو گی۔ بغیر گھوڑے یا بیل کے چلنے والی گاڑیوں پر گھومتی ہو گی۔ اور روز سینما دیکھتی ہو گی ـــــــ اور جب یہ سڑک بننے لگی تو گاؤں کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے سڑک بنانے والوں کی بہت مدد کی کچھ لڑکیوں نے تو اپنے جسم کو ٹھیکیداروں کے سپرد کر دیا۔ بھلا جو لوگ ان کے گاؤں کو شہر سے ملا رہے ہوں۔ ان کو ایک لڑکی اپنا جسم بھی سپرد نہ کرے۔ تو احسان کا بدلہ کیسے ادا ہو ـــــــ اور پھر اس شہر سے یہاں تک لاریاں بھی چلنے لگیں۔ اور سڑک کو دوسرے گاؤں اور شہروں تک پھیلا دیا گیا ـــــ!

جب میں نے ہوش سنبھالا۔ تو میرے گاؤں میں شہر کی تمام نعمتیں عام ہو چکی تھیں۔ اور روزانہ درجنوں آدمی شہر آیا جایا کرتے تھے۔ میں میلوں اس کی چھاتی کو روندتا ہوا شہر کی طرف جایا کرتا تھا۔ میرے ساتھ ہوشیار چند ہوتا ـــــــ وہ آگے کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا

"ابدی بھیا۔ سنا ہے زمیندار صاحب تم کو شہر میں پڑھائیں گے؟"

میں بڑے غرور، بڑے ناز سے افق پر نظریں جماتے ہوئے کہتا ...... "ہاں چندر کاکا"

"لیکن شہر اچھی جگہ نہیں ہے"

ہوشیار کاکا کہتا۔ اس کی آواز میں مایوسیاں جھلکنے لگتیں ...... اور آنکھوں کی روشنی میں دھندلکے ابھرنے لگتے۔ میں تعجب سے کہتا۔

"کیوں کاکا"

"وہاں لوگوں میں پیار نہیں ہے۔ وہ لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہیں، وہاں بڑے بڑے دھن والوں نے ملیں کھول رکھی ہیں جہاں لوہے کی مشینیں دس آدمیوں کے دس دن کا کام ایک دو گھنٹہ میں کر دیتی ہیں۔

"یہ تو بڑی بات نہیں ہے کاکا"

"مشینوں کو چلانے کے لئے زیادہ آدمیوں کی ضرورت نہیں۔ وہاں لوگ بے کار ہیں۔ اور بھوکے مرتے ہیں۔ اور پھر وہاں لڑکیوں کی تجارت ہوتی ہے" ہوشیار کاکا نے ایک ہی سانس میں کہا۔ جیسے میری بات سنی ہی نہ ہو۔

لڑکیوں کی تجارت"؟

"ہاں بھیا، وہاں کے غنڈے بدمعاش لوگ ہمارے گاؤں آتے ہیں۔ اور لڑکیوں کو بھگا لے جاتے ہیں۔ وہ ان کو بیچ ڈالتے ہیں۔

"کاکا" میں نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا "کیا یہی لوگ سندری کو بھی بھگا لے گئے"

سندری کا نام سن کر کاکا کی سانسیں تیزی سے چلنے لگیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں ہر روز یہی سوال کرتا۔ لیکن کوئی جواب نہ پاتا ہوشیار چندر کاکا اور آگے نہ جاتا اور ہم دونوں گاؤں کی طرف واپس آجاتے ——!

اسی سڑک پر میں صفیہ کے ساتھ گھومتا رہتا تھا۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب میں کالج میں پڑھتا تھا۔ اور بڑی تعطیل پر گاؤں آتا تھا۔ صفیہ میری رشتہ دار تھی۔ اور اسکول میں پڑھتی تھی۔ اور ہم ایک دوسرے کے قریب ہی رہتے تھے کبھی کبھی وہ بھی میرے ساتھ آجاتی۔ اور ہر روز سہ پہر کو ہم گاؤں سے نکل کر اسی سڑک پر ٹہلنے لگتے۔ اور دور، دور تک بغیر تھکاوٹ کے احساس کے ہو آتے —— صفیہ کے ساتھ چلتے ہوئے ہزاروں طرح کے خیالات میرے ذہن میں چکر لگانے لگتے۔ وہ بھی دور کی طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھتی رہتی اور پھر چلتے چلتے کہتی۔

"یہ سڑک کبھی ختم تو نہیں ہو جائے گی"؟

"نہیں صفو یہ سینکڑوں میل لمبی گئی ہے"

"پھر بھی ختم ہونے کا امکان تو ہے"؟

"ہاں اگر ہم یونہی چلتے رہیں۔ آگے بڑھتے رہیں۔ تو ختم تو ہو ہی جائے گی"

"تو آؤ ہم واپس چلے چلیں"

اور وہ رک جاتی۔ اور خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگتی —" ابھی تو ہم گاؤں سے تین میل ہی آئے ہیں۔"

"جب ہی تو واپس ہونا چاہتی ہوں" وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہتی۔ اس کی وہ نظریں مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ جیسے وہ اب بھی مجھ سے کچھ پوچھ رہی ہیں، کچھ کہہ رہی ہیں "یہ سڑک کبھی ختم تو نہیں ہو جائے گی —" "تو آؤ ہم واپس چلے چلیں۔ جب ہی تو واپس ہونا چاہتی ہوں" اور وہ بہت جلد واپس ہوگئی تھی۔ کیونکہ جب اس کی شادی کے دن قریب آئے۔ تو بھی میرے دل میں اس کے لئے ایک عزت ایک اُنس۔ ایک دوستی کے سوا کوئی جذبہ پیدا نہ ہوا تھا۔ اور میں اسکو چھیڑا کرتا تھا "تمہارے شوہر کی بہت بڑی کپڑے کی مل ہے۔ اس کے پاس وو، دو موٹریں ہیں۔ کیا تم ہفتہ میں ایک بار اپنی ایک موٹر مجھے دے دیا کرو گی۔ میں اس پر گاؤں جایا کروں گا"

وہ سنتی رہتی اور روٹھی رہتی۔ میں سمجھتا وہ اپنے شوہر کا ذکر سُن کر شرما رہی ہے۔ اور دل ہی دل میں ایک غرور سا محسوس کر رہی ہے۔ شادی سے دو ہفتہ قبل جب وہ میرے ساتھ گاؤں آئی۔ اور ہم لوگ اسی سڑک پر ٹہلنے نکلے۔ تو میں نے پھر اس کے شوہر کا تذکرہ شروع کر دیا۔ وہ آگے بڑھتی رہی اور آگے کی طرف دیکھتی رہی —— افق پر ڈوبتے ہوئے سورج پر اِکّا دُکّا بادلوں کے ٹکڑوں کی لکیریں سی پڑی تھیں۔ وہ رکی۔ اور میری طرف دیکھنے لگی "کیا تھک گئی ہو —" "ہاں"

اس کی آواز میں آنسوؤں کی سیلن تھی۔ جیسے وہ اندر ہی اندر شام راہ رو رہی ہو۔ میں پیچھے کی طرف مڑ کر اپنے طے کئے ہوئے راستے کو دیکھنے لگا۔۔۔۔۔۔

گاؤں صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے کہا۔

"شاید تم آخری بار میرے ساتھ اس سڑک پر چل رہی ہو"

"صفیہ نے گرفتہ آواز میں کہا"

"کیا تم کو کبھی افسوس ہوگا شاہ" "وہ کس بات کا افسوس"

"یہی اکیلے چلنے کا ـــــ میری شادی کا"

"شادی پر افسوس تو نہیں ہے۔ ہاں تنہائی پر ضرور ہے" (ـــــــــــــــــــ)

ـــــ صفیہ مجھے بہت دور جانا ہے۔ کون جانے۔ کوئی ساتھ دے یا نہ دے۔ مجھے اکیلا جانا پڑے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ شادی کے بعد تم پہلی موٹر پر آؤگی۔ موٹر پر واپس چلی جاؤگی۔ میں اکیلا اسی سڑک پر گھومتا رہونگا۔ چلتا رہونگا"

اس کی آنکھیں کچھ دیر کے لئے جھک گئیں۔ میرے ہاتھ کو دباتے ہوئے بولی۔

"پھر تم نے یہ کوشش کیوں نہ کی۔ کہ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں"

اور میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ آج بھی سوال کر رہی ہے۔ پوچھ رہی ہے۔ اور میں سوچ رہا ہوں۔ مجھے اس وقت بھی اس سے محبت تھی۔ لیکن اپنی محبت کو محبت نہ سمجھ سکا۔ اس کی شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد وہ موٹر پر کئی بار گاؤں آئی۔ اور موٹر ہی پر واپس چلی گئی۔ مجھ سے پھر کبھی کھل مل کر بات نہ کی۔ میں شادی کے بعد سمجھا۔ کہ میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے۔ اپنے نغموں کو اپنے رقص کو۔ اپنی شعریت کو۔

رفتہ رفتہ صفیہ کی جگہ ایک مستقل مایوسی نے لے لی۔ میں نے پڑھنا ترک کر دیا۔ اور گاؤں میں رہنے لگا۔ گاؤں کے مڈل اسکول میں زیادہ تر وقت صرف کرتا اور شام کو اسی سڑک پر گھومتا رہتا۔ جانے گاؤں والے میرے متعلق کیا سوچتے تھے۔ جب کبھی میں گاؤں سے دور نکل جاتا اور اپنے گاؤں کا کوئی مل جاتا۔ تو وہ بڑے پیار سے کہتا۔

"اس سڑک پر کیا رکھا ہے بھیا" ـــــ اور میں صرف مسکرا دیتا ـــــ اور جب میں نے شادی سے انکار کر دیا تو گاؤں بھر میں طرح طرح کی باتیں پھیل گئیں۔ کوئی کہتا سڑک پر آسیب رہتے ہیں۔ انہی کا اثر ہے۔ اور پھر بھوت پریت کی جھوٹی کہانیاں سنائی جانے لگیں۔ کسی نے رات کو بارہ بجے اس سڑک پر ننگی عورتوں کو ناچتے گاتے ہوئے دیکھا تھا۔ کسی نے اس سڑک کو بولتے اور قہقہے لگاتے ہوئے سنا تھا۔ میں سب کی سنتا۔ اور دل ہی دل میں ان سیدھے سادھے لوگوں پر ہنستا۔ مسکراتا۔ غصہ کرتا۔

برسات میں ایک مرتبہ اتنی بارش ہوئی۔ کہ کئی دن تک سڑک کا ایک حصہ پانی میں ڈوبا رہا۔ جب پانی سوکھ گیا۔ تو کئی جگہ سے سڑک سے کنکر پتھر بہہ گئے تھے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ نے مرمت کرنے والے مزدور مردوں اور عورتوں کی ایک ٹولی بھیجی ان مزدوروں نے آٹھ دن تک کام کیا میں سہ پہر و گھنٹوں اسی جگہ ایک درخت کے کنارے بیٹھا رہتا۔ اور سڑک کو بنتے دیکھا کرتا۔ مزدور کبھی کبھی بیڑی جلانے کے لئے مجھ سے ماچس مانگتے

اور میرے سامنے بھی بڑھا دیتے۔ میں گنگناتا جاتا۔ اور بیڑی کے کش کھینچتا جاتا۔ ایک دن سڑک کوٹتے کوٹتے ایک نوجوان لڑکی کے پیر میں چوٹ آگئی۔ یہ لڑکی مجھے بہت پسند تھی۔ اس کو دیکھکر مجھے صفیہ کی آنکھیں یاد آجاتی تھیں۔ میں نے کہا۔

"انگوٹھے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ گاؤں لے چلو"

"مگر اب اِسے مزدوری کیسے ملے گی" ایک نے کہا۔

اور مزدوری نہیں ملیگی۔ تو کیا کھائے گی۔ کیا ماں کو کھلائے گی ـــــ "جلدی کرو۔ میرے گھر لے چلو۔ میں پٹی باندھ دوں گا" میں نے چلاکر کہا۔۔۔۔۔۔۔

ایک مزدور نے لڑکی کو کنکر کھینچنے والی گاڑی پر بٹھایا اور گاؤں کی طرف لے چلا۔ میں ساتھ ساتھ تھا۔ گاؤں والے گاڑی کے ساتھ ساتھ مجھے دیکھکر گاڑی پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو گھورنے لگے۔ کچھ نے پوچھا بھی کہ اس کو کیا ہوگیا ہے۔ میں بغیر کسی کو جواب دیئے ہوئے اس کو اپنے گھر لایا پٹی باندھی۔ درد سے کراہتی رہی۔ مزدور نے کہا۔

"اچھا بھیا۔ میں تو سڑک پر کام کرنے جاتا ہوں۔ اس کی وجہ سے آج میرے بچوں کو بھی فاقہ کرنا نہ پڑے"

"ہاں تم جاؤ۔ شام کو تمہارے پاس پہنچا دوں گا"

وہ چلا گیا۔ لڑکی لیٹی رہی۔ گھر کے اور لوگوں نے بھی اسے دیکھا اور زیادہ اہمیت نہ دی۔ سب ہی جانتے تھے۔ کہ مجھے سڑک سے کتنا پیار ہے۔ اور سڑک کی مرمت کرنے والوں سے کتنی ہمدردی ہے۔ شام کو میں نے کہا۔

"چلو۔ تم کو پہنچا دوں"

وہ اٹھی اور میرے سہارے سے سڑک تک آئی، وہاں اس کے ساتھیوں میں سے کوئی نہ تھا۔

"اب کیا ہو ۔۔۔ اب کہاں جاؤں بابو، میرا گھر دور ہے"

"میرے گھر سو رہو ۔۔۔ کل اپنے ساتھیوں سے آملنا۔ انہوں نے تمہاری ماں کو بتا ہی دیا ہوگا۔ کہ تم زمیندار کے گھر ہو، چوٹ کی وجہ سے نہیں آسکتیں"

"مگر ـــــ" "اگر مجھ سے ڈرتی ہو، تو چلو تمہارے گھر ہی پہنچا دوں" ـــــ "اچھا چلو بابوجی تمہارے ہی گھر سہی"

اور وہ میرے ساتھ گھر آگئی۔ کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ میں نے اسے ایک پلنگ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم بھوکی ہوگی۔ دودھ پلائے دیتا ہوں"

"میرے پاس چنے ہیں" اور وہ اپنی رنگین چندریا کے دامن سے چنے کھولکر کھانے لگی۔ میں نے کہا۔

"تم میری مہمان ہو۔ چنے کھاکر مجھے تکلیف نہ پہنچاؤ"

وہ مسکرا دی۔ میں نے اسے دودھ لاکر دیا اور کمرہ میں لالٹین جلاکر جانے لگا

"کہاں جا رہے ہو بابوجی"

"اپنے کمرے میں ـــــ کیا دور ہے وہ کمرہ"

"نہیں یہ دوسرا کمرہ جو ہے"

میں واپس آگیا۔ وہ لیٹ رہی۔ اور رات گزرنے لگی۔ میں لیٹا لیٹا کروٹیں لیتا رہا۔ پھر اس کے کراہنے کی آواز سن کر اٹھا اور اسکے کمرہ میں گیا۔ وہ جاگ رہی تھی۔

"کیا زخم میں تکلیف ہو رہی ہے" "نہیں"

"پھر کیوں کراہ رہی تھیں"

"تم کو بلانا چاہتی تھی بابوجی ـــــ کیوں"

میں نے لالٹین اتار کر اس کے چہرے کے قریب کرتے ہوئے کہا "کیوں"؟

"کیا یہ رات ختم ہو جائے گی بابوجی"

"ہاں دو تین گھنٹہ میں صبح ہو جائے گی"

"بابوجی" ـــــ "کیا ہے"

"میرے پاس کچھ نہیں ہے"

"کیا نہیں ہے تمہارے پاس"

میرے پاس ایسا کچھ نہیں ہے۔ جو میں تم کو دے سکوں۔ تم نے میرے انگوٹھے میں پٹی باندھی ہے" مجھے آرام پہنچایا ہے ـــــ اس کے بدلے میں تم کو کیا دوں"

ـــــــــــــ "بدلے میں"؟

"ہاں میں مزدوری کرتی ہوں۔ تو پیسے ملتے ہیں۔ جس دن کام نہیں کرتی۔ پیسے نہیں ملتے۔ اور مجھ کو اور میری ماں کو بھوکا رہنا پڑتا ہے تم بھی تو کچھ چاہتے ہوگے؟

"تم خواب تو نہیں دیکھ رہی ہو"

"کاش کہ یہ سپنا ہی ہوتا۔ تو مجھے کچھ نہ دینا پڑتا میرے پاس کل کی مزدوری کے بچے ہوئے چار پیسے ہیں۔ تم ان کو کیوں لینے لگے"

اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا۔ کہ اس کی آنکھیں اسی طرح چمک رہی ہیں۔ جیسے صفیہ کی چمک رہی تھیں۔ اور ہونٹ کپکپا رہے ہیں۔ ان آنکھوں نے، ان ہونٹوں نے ان کی کپکپاہٹ اور حسین چمک نے مجھے میرے ماحول سے بیگانہ کر دیا۔ میری مدتوں کی سوئی ہوئی تمنائیں جاگ اٹھیں

صبح کہنے لگی۔ "جا رہی ہوں۔ میری ماں انتظار کرتی ہوگی"

مزدوری پر نہیں جاؤگی؟...... نہیں "

اور وہ چلی گئی۔ اس نے ایک مرتبہ بھی میری طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ جیسے وہ رات کے سارے ننھے ساری جگمگاہٹیں بھول گئی ہو اور وہ آج تک اس گاؤں کی طرف نہیں آئی۔ سڑک کی کئی مرتبہ مرمت ہوئی۔ دو لڑکیاں آئیں لیکن میں نے صفیہ کو ان میں تلاش کرنا چھوڑ دیا۔

اور اب تو اس سڑک پر فوجیوں سے بھری ہوئی لاریاں گزرتی ہیں۔ اس کی چھاتی سے خون ٹپکتا رہتا ہے۔ کولتار نرم ہو جاتا ہے۔ اس پر پہیوں کے نشان بن جاتے ہیں۔ اور میں اس کو دیکھ کر اپنی ترنگ میں جانے کیا کیا سوچتا رہتا ہوں۔ اسی سڑک پر میں نے صفیہ کو کھو دیا تھا۔ جانے وہ اب بھی یہیں، کہیں ہو۔ اور مجھے پریشان کرنے کے لئے کسی درخت کے پیچھے چھپی کھڑی ہو۔ اگر میں اس کو پکاروں۔ آواز دوں کہوں آجاؤ، یہ سڑک کبھی ختم نہ ہوگی۔ ہم ہمیشہ چلتے ہی رہیں گے۔ تم کو واپس نہیں جانا پڑے گا۔ تو شاید وہ واپس آجائے۔ اور میں اس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بڑھتا چلا جاؤں۔ آگے اور آگے۔ وسیع کائنات کے آگے کے جہانوں میں۔

میرے ساتھی نے کہا۔

کس کو پکار رہے ہو۔ یہاں تو میرے علاوہ اور کوئی نہیں۔

نئی نئی کتابیں

انتخابِ مومن:- مومن کی غزل ان کی رومان پسند طبیعت کی شوخی اور رنگینی کا جانفزا عکس ہے — اور انتخابِ مومن اس شوخی اور رنگینی کا روح پرور عطر۔ غزل کی ساری روایت میں آپ کو تغزل کا وہ کیف نظر نہیں آئے گا جو مومن کی غزلوں میں ہے آپ اس کیف میں ڈوب کر چند گھنٹوں کے لئے غمِ عشق اور غمِ روزگار کی تلخیوں کو فراموش کر دیں گے۔ انتخاب و تبصرہ از وقار عظیم ——— قیمت مجلد دو روپے

خانہ دار بیگم:- ہر لڑکی کو جب سے وہ پیدا ہوئی زندگی کے میدان میں زندہ رہنے کا ثبوت دینا اور زندگی کا حقدار بننا چاہیئے۔ عورت کی پیدائش کا یہ مطلب نہیں کہ "پیدا ہوئی، پلی، بڑھی، جیتی رہی اور مرگئی"۔ ہر لڑکی ایک دن عورت بن جاتی ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کو ایک اچھی بیٹی، اچھی ماں اور اچھی بیوی بننے کی تعلیم نہ دی جائے۔ یہ کتاب ان کی صحیح تربیت میں معاون ثابت ہوگی۔ قیمت مجلد ڈیڑھ روپیہ۔

ہمارے افسانے:- افسانہ ہماری شخصی اور اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا آئینہ ہے اور زندگی کے نباض اور رمز شناس افسانہ نگاروں کا مشاہدہ اس آئینہ میں ہمیں زندگی کا بے نقاب عکس دکھاتا ہے اس طرح ہم زندگی کی دھڑکنیں خود اپنے کانوں سے سن سکتے ہیں۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے۔

پیامِ شباب:- قاضی نذر الاسلام اس سرزمین کے ادبی انقلاب کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ یہ کتاب ان کی بہترین بنگالی نظموں کے اردو تراجم پر مشتمل ہے جو ملک کے مشہور ادیب ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے کیا ہے اور ادب میں اسے اب مستقل مرتبہ حاصل ہو چکا ہے اور ہماری زبان میں اس شان کے تخلیقی تراجم کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ عمدہ کتابت بہترین کاغذ۔ قیمت مجلد ڈھائی روپے

مکاتیبِ حالی:- مولانا حالی مرحوم کے وہ مکاتیب جو اب تک نہ چھپ سکے ہم نے نہایت محنت و کاوش سے جمع کرائے ہیں۔ یہ کتاب ان ہی نادرات کا مجموعہ اور اردو زبان میں ایک نیا قیمتی اضافہ ہے۔ قیمت مجلد ڈھائی روپے ★

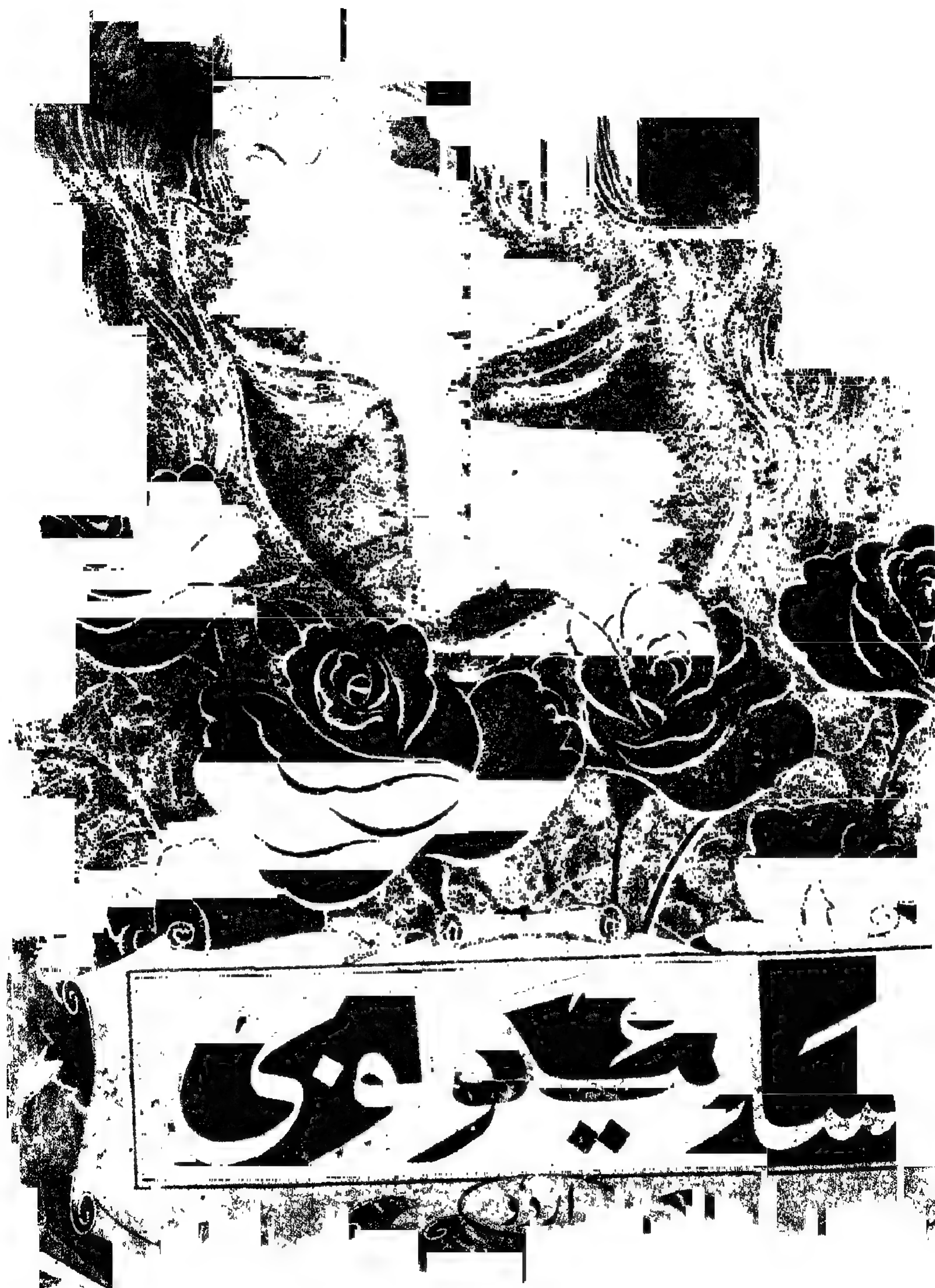
ہر قسم کی کتابیں ہم سے طلب فرمائیے

اردو مرکز، گنپت روڈ لاہور (پاکستان)

PSYCHOLOGY



TITLE PRINTED AT THE JUBILEE PRINTING WORKS KARACHI



بسم اللہ الرحمن الرحیم

پاکستان و بھارت کا مشہور نفسیاتی ماہنامہ

سائیکولوجی (اردو) کراچی

جون سنہ ۱۹۵۱ء

جلد ۳ — نمبر ۵

ادارہ

عابدی جعفری بی اے

شاہدہ سلطانہ

بیگم رئیس جہاں نثر انصاری

انعام اللہ خاں

علاؤالدین خالد

قیمت		سالانہ چندہ	
پاکستان میں	۸/	پاکستان میں	چھ روپے
بھارت میں	۱۰/	بھارت میں	۷ روپے ۸/

صدر دفتر

اکیڈمی اسٹریٹ نزد مولوی مسافر خانہ بندر روڈ پوسٹ بکس ۵۶۶ کراچی

مرد نمبر

میں عورتوں نے مردوں کی نفسیات پر روشنی ڈالی تھی۔ اس کے اندر کچھ
اتنے نیچرے ہوئے تھے کہ ہمارے قارئین اپنی ہمدم کے آئینے میں
اپنی بگڑی ہوئی شکلیں دیکھ کر چیخ اُٹھے تھے۔

اب ادارہ سائیکولوجی

عورت نمبر —— کا اعلان کر رہا ہے!

جس میں مرد عورتوں کی نفسیات پر روشنی ڈالیں گے اور اُمید یہی
ہے کہ وہ اپنی ہمدم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اس طرح
روشنی نہ ڈالیں گے کہ **عورت** بھی چیخ اُٹھے۔

عورت بہ حیثیت **بیوی**

ماں

بیٹی

کے ہماری زندگی میں قدم رکھتی ہے۔ ادارہ ان پہلوؤں کو زیادہ سے
زیادہ اُجاگر کرنے کی کوشش کریگا۔

سالانہ خریداروں کو یہ نمبر بھی سالگرہ نمبر کی طرح تحفتہً پیش کیا جائے گا۔ کون ایسا مرد ہے جس کی
زندگی میں **عورت** نہ آئی ہو۔ آپ بھی **عورت** کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

مگر جلدی!

پہلی نظر

آج کے تقاضے؟

ایک بہت اہم سوال ہمارے سامنے ہے!

وہ سوال یہ ہے کہ کیا ہم سربلندی کے ایک شاندار مستقبل کی طرف بڑھ رہے ہیں یا بہار کے دن گزر چکے، بہار کے پھول، بہار کے نغمے اور اسباب ہماری قسمت میں موت کی تاریکی، خزاں کی بربادی، ناامیدی کی جلن ہے؟

یہ سوال اس لئے اہم ہو گیا ہے کہ آج پھر جنگ سے فضائے عالم مکدر ہو چلی ہے اور اس آگ کے شعلے مختلف کونوں میں، مختلف لبادوں میں لپک رہے ہیں۔ جیسے اس کائنات کا ذرہ ذرہ انسان کے مستقبل پر فکرمند نظر آتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ کبھی وہ زمانہ آ جائے جب کہ انسانیت ترقی کرتے کرتے اتنی بلندی پر پہنچ کر رک گئی ہو آگے ترقی کی امید نہ ہو اور انسانیت نے جو کچھ بھی حاصل کیا ہو، اس کے برباد ہونے کا امکان نہ ہو۔ لیکن ہمارا زمانہ ایسا نہیں ہے کہ ہم اپنے ماضی کے شاندار کارناموں پہ بیٹھے فخر کرتے رہیں اور مستقبل کی فکر نہ کریں۔

زندگی کی بے پناہ متحرک قوت آگے، اور آگے بڑھنے کی دعوت دے رہی ہے۔ آگے نہ بڑھے تو پیچھے ہٹنا پڑے گا اور یہی وقت کا تقاضا بھی ہے کیا تو ہمیں ترقی کی سا منزل منزل طے کرنا ہوگی یا زبردست شکست اٹھانا پڑے گی۔

سوال یہ ہے کہ ہم اس وقت کہاں ہیں؟

کیا ہم کامیابی، سربلندی اور کامرانی کی شاہراہ پر ہیں یا ہم نے اپنی شکست کا نیم دلی سے اعتراف کر لیا ہے؟

کیا ہم بہ حیثیت فرد، قوم اور انسان کے زندگی، بہتر زندگی کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں یا تباہی کے غار کی طرف گر رہے ہیں؟

ان دونوں امکانات میں سے کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ؟

بہ حیثیت قوم کے غالباً ہمارا جواب، ہمارے قومی سیاسی نظریات کا محتاج ہے اور بہ حیثیت فرد کے ہماری انفرادی رجائیت یا قنوطیت پر مبنی ہے۔ آیئے اس وقت ہم قومی یا بین الاقوامی نظریات کو پس پشت ڈال کر اس سوال کا جواب بہ حیثیت فرد کے دینے کی کوشش کریں۔

کیا ہم بہ حیثیت فرد کے زندہ دلی، خود اعتمادی اور بلند عزائم کے ساتھ زندگی کی زرخیزی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یا ہم مردہ دلی، شکست خوردگی کے عالم میں وقت کے دھاروں میں بہنے ہی میں اپنی بقا سمجھتے ہیں۔

اس سوال کا جواب بہ حیثیت فرد کے دینے کے بعد آیئے۔ ہم ذرا اپنے گرد و پیش نظر دوڑائیں اور اپنے ساتھیوں، ہمدموں، رفیقوں اور پڑوسیوں کی زندگی کا جائزہ لیں۔

وہ کدھر جا رہے ہیں؟

ہماری قوم کدھر جا رہی ہے؟

یہ وہ ترقی کے منازل طے کر رہا ہے یا اس میں کچھ شکست کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔

کیا ہم بہ حیثیت فرد اور قوم کے سوچ کر دیکھتے ہیں یا ہمارے سامنے سورج غروب ہو رہا ہے انسان کی قدیم جانے والی آنسو بہاتی سرخی فضا پر چھائی ہوئی ہے۔

ہم وقت کی اس للکار کا جواب دو متضاد صورتوں میں دیتے ہیں۔ کچھ یہ محسوس کرتے ہیں کہ بہ حیثیت فرد کے وہ ترقی کے منازل طے کرتے جا رہے ہیں، لیکن بہ حیثیت قوم کے وہ تنزلی کی طرف گر رہے ہیں۔

اور کچھ یہ محسوس کرتے ہیں کہ بہ حیثیت فرد کے وہ کسی قسم کی بھی ترقی سے قاصر رہے ہیں لیکن قوم کے اور افراد کے ساتھ ساتھ وہ کشاں کشاں بہتر حالات کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان کی انفرادی ترقی کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی وہ اور پوری قوم اس وقت تاریکیوں سے پسپا ہو رہی ہے۔

اور اس قسم کے خیالات اتنے زیادہ عام ہیں کہ ہم آپ اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ وہ اشخاص، مرد اور عورت جو دوسرے حالات میں ہمارے رہنما ہوتے۔ وہ دل شکستہ ہیں اور زمانہ کی بے وفائی سے نالاں ہیں اور یہ نظریہ اختیار کرنا ہی آسان ہو گیا ہے، کیونکہ ہماری تمام تر جدوجہد بے اثر سی ہو کر رہ گئی ہے۔

آج فضائے عالم ظلم و تشدد، نفرت و انتقام سے مکدر ہو رہی ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کے درپے آزار ہے۔ ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرایا جا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ بین الاقوامی معاہدوں کی پابندی نہیں کی گئی۔ الفاظ کی جنگ شروع ہو چکی ہے۔

دور دراز مقامات کو چھوڑیے اپنے گھر کے قریب دیکھئے۔ آپ کو کافی ثبوت اس حقیقت کا مل جائے گا۔ کہ پورے سماج میں شکست خوردگی بڑھ رہی ہے۔ آنے والے خطرات کے امکانات بڑھ رہے ہیں۔ کسی بات کے قیام کا یقین نہیں آتا۔ مستقبل جانے کیا ہوگا۔

ہماری موجودہ حالت کیا ہے؟

زمانہ پوچھ رہا ہے۔ ہم پوچھ رہے ہیں کہ کیا یہ تاریکی کسی نئی صبح کی پیش خیمہ ہے یا ہمارے تمدن کی گھٹتی ہوئی سانس کا ہے؟

ہم جو کچھ بھی جواب دیں۔ ہمارے دلوں میں شکوک پیدا ہی ہوتے رہیں گے۔

ہم اس کو تمام تر سیاسی مسئلہ نہیں کہہ سکتے۔ یہ ہمارے اخلاق کی بقا کا بھی مسئلہ ہے۔ یہ کسی سیاسی پارٹی سے حل نہ ہوگا۔ کیونکہ تمام پارٹیز کا مطمح نظر قومی سربلندی اور انفرادی مسرت ہے۔

زمانہ کی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے تمام سیاسی اداروں کو نئے انسان کی ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ سماج کی نئی تشکیل کی ضرورت ہو، فرسودہ رسومات کو ختم کر کے نئی رسومات کی ضرورت ہو اور نئے تجربوں سے قوم کی ابتری دور کی جائے۔ لیکن یہ تمام باتیں ثانوی نوعیت کی ہیں۔

زمانہ کی للکار کا منہ توڑ جواب نیا آدم ہی دے سکتا ہے۔ ہم کو کوشش کرنا چاہئے کہ یہ نیا آدم پیدا ہو جائے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے۔

کیا ہم ترقی کر رہے ہیں یا تنزلی؟

کیا ہم بہتر مستقبل کی طرف بڑھ رہے ہیں یا ہمارے سامنے ہماری شکست کے دہانے ہیں؟ اس کا جواب ہم آپ نہیں دے سکتے۔ حالات تو یہ بتاتے ہیں کہ ہم شکست کھا چکے ہیں اور انسان اپنے ہی غلط اقدامات کے بوجھ میں دب چکا ہے۔ جس سے اس کی روح کچل چکی ہے۔

تکمیل

ساتھ ہی ساتھ ہمارے پاس اس بات کا بھی ثبوت کافی ہے کہ ہم وقت کے پہیے پھیر کر بہتر زندگی کے سانچے دیکھ رہے ہیں۔ ہماری نئی انکشافات نے نئے عزائم انسان کی ہمت کی بلندی کے لئے کافی ہیں۔

اس لئے ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ کل جو سورج طلوع ہوگا، وہ ہمارے لئے بہتر مواقع کے پھل لائے گا یا ہم اس نئے طلوع کی ضیا پاشی دیکھنے سے قبل ہی ختم ہو چکے ہوں گے۔

ان دونوں امکانات میں سے کسی ایک کو بھی رد نہیں کر سکتے۔ ہماری قسمت میں کامیاب یا ناکام ہونا نہیں ہے۔ اگر ہم یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ ہم کامیاب ہوں گے یا ناکام، تو قسمت کی جھولی ٹٹولنے کے بجائے ہم کو اپنے دل سے یہ سوال کرنا چاہئے۔ اپنی جدوجہد سے، اپنے اعتقاد، اپنی ہمت سے، جب ہی ہم زندگی کے نعمات کی سرحدوں کو چھو سکتے ہیں۔ لیکن ابھی شبہات ختم نہیں ہوئے۔ ابھی ہمیں فتح کا یقین نہیں ہے اور نہ ہی اپنی شکست کا یقین ہے۔ بہرحال ہم چاہیں تو ان شبہات کو یقین میں بدل سکتے ہیں۔

لیکن یہ یاد رکھئے کہ اس کا دارومدار صرف ہم پر ہے۔ ہم چاہیں تو طوفانوں کے رُخ بدل سکتے ہیں حالانکہ موجودہ دور میں یہ خیال عام ہو چکا ہے کہ ہماری جیت، ہماری ہار پہلے ہی متعین ہو چکی ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ یا تو انسان منزل بمنزل ترقی کرتا بڑھتا ہی رہے گا یا اس کی قسمت میں ہار، ناکامی، شکست ہے۔

یہ دونوں نظریات غلط ہیں۔ کیونکہ ابھی زندگی کی تفسیر لکھی نہیں گئی۔ بلکہ ہم آج لکھ رہے ہیں اور کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کتاب کے آخری ابواب میں کیا ہوگا۔

ہم کو یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ہماری آج کی محنت ہم کو کل آرام پہونچائے گی۔ آج کی قربانی کل کی کامرانی کی وجہ بنے گی۔ یہ ہماری انفرادی صحت اور قومی آسودگی کے لئے ضروری ہے۔ ہم جتنا بھی اس اصول پر یقین کرتے ہوئے اس پر عمل کریں گے، انسانیت کی بقا اور استوار ہوتی رہے گی۔

ممکن ہے کہ اب بھی آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا ہو کہ ہمارا بحیثیت ایک انسان کے کیا فرض ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟

سب سے پہلا فرض تو یہ ہے کہ ہم کو اپنی زندگی ——— موجودہ زندگی میں، اس کے طرز میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ اگر ہم اپنی قومی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ تو سب سے پہلے ہم کو ——— قوم کے افراد کو اپنی زندگی سنوارنا چاہئے۔ ہم خود اپنی ترقی کے مدارج طے کر سکتے ہیں، اپنے فرائض انجام دے سکتے ہیں اور ہر شخص کو ہمارے اصولوں پر چلنے کی طرف راغب کر سکتے ہیں۔ آجکل ہم انجمنوں اور جماعتوں کی دنیا میں رہ رہے ہیں جہاں انفرادی انسان کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ہم فرد کے نہیں جماعت کے بل بوتے پر کچھ کام کر سکتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ نہ فراموش کرنا چاہئے کہ سوسائٹی اور جماعتوں کے افراد ہی ہمیں تاریکی سے روشنی کی طرف لے جاتے ہیں کیونکہ کیونکہ جماعت کا وجود دراصل افراد ہی کی بہبودی کے لئے اور افراد ہی کے باعث ہوتا ہے۔

بعض معاشرتی انجمنوں کا وجود ناگزیر ہے۔ ان کا خاتمہ انسانیت کو تاریکی اور بربریت کی طرف لے جائے گا۔ لیکن تمام انجمنوں کو انسانی آزادی، انسانی خوشی اور انسانی ترقی کے اصولوں پر ہی قائم ہونا چاہئے۔ ہم اپنے اندر ایسی صلاحیتیں رکھتے ہیں کہ انسان کا ہر خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔ ہم اپنے اثرات اور صلاحیتوں کو آج ہی سے عملی جامہ پہنا کر اپنے محدود حلقہ کو متاثر کر سکتے ہیں۔ ہم اپنی فضاؤں کو مسرتوں سے بھر سکتے ہیں۔ اپنے ماحول کو خوشیوں کے ترانے سنا سکتے ہیں۔ ہم اپنے حلقۂ اثر کی ہر چیز کو نئی زندگی دے سکتے ہیں۔ اسے جینے کا ڈھنگ سکھا سکتے ہیں۔

کیا آپ خوش رہتے ہیں

خوشی واقعات کی نہیں دل کی مرہون منت ہے دیگر ضرب الامثال کی طرح یہ بھی جزوا صحیح ہے ہم میں سے اکثر لوگوں کی زندگی میں اکثر ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جس کے باعث خوشی سے ہم پھولے نہیں سماتے اس کے برخلاف بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کی زندگی ایک ایسے بے کیف تسلسل کا مجموعہ بن جاتی ہے جو رنج و غم کا گہوارہ ہوتی ہے کہ ان کے متعلق خوشی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا اکثر ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود قدرت انہیں کوئی ایسا جذبہ عطا کر دیتی ہے جو ان کے رنج و غم اور ان کی بے کیف زندگی کی تلافی خود بخود کر دیتا ہے ہم یہ محسوس کرتے خوش ہوتے ہیں کہ شکر ہے ایسے لوگوں کو کم از کم مالی مشکلات کا سامنا کرنا نہیں پڑتا ایسے لوگوں کے متعلق قطعیت سے کچھ کہنا ممکن نہیں کیونکہ ان کی زندگی ایک ایسا راز سربستہ ہو کر رہ جاتی ہے جس کی حقیقت کتابوں یا مضامین سے معلوم نہیں ہو سکتی۔

ہم میں سے اکثر بینائی اپنے بنائے ہوئے گھروندوں میں رہتی ہے اور وہ چاہیں تو ان سے باہر بھی نکل سکتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ خوشی حاصل کرنے کا کوئی متعین راستہ نہیں ہے اور سفر حیات میں ایسی راہیں بھی بہت ہیں جن پر چل کر انسان رنج و غم کا شکار ہو جاتا ہے اگر ہمیں ایسے راستوں کا صحیح احساس ہو جائے تو ہم انہیں ترک کر کے دوسرے راستوں میں خوشی کی تلاش کر سکتے ہیں اور ہماری الجھن سے زیادہ مشکل حل ہو جاتی ہے۔

علم نفسیات میں عام دلچسپی اور اس کی اصطلاحات کی سرسری معلومات کے باعث اکثر حقائق حیات کے سمجھنے میں لوگوں نے غلطی کی ہے مثلاً ایک مزاحم انسان کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ اور مزاحمت سے چھٹکارے کی کوشش بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتی ہیں نے اکثر لوگوں کو جہالت کے باعث یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ علم نفسیات کی تعلیم غیر اخلاقی ہوتی ہے اور جب ان سے اس کی توضیح بیان کرنے کو کہا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ ماہر نفسیات ہمیں تمام رکاوٹوں اور مزاحمتوں سے رہائی حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں ان کے خیال میں غیر مزاحم انسان ایک ایسا رند ہے [illegible] طور پر اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ ماہر نفسیات نے ہمیں ہر اس فعل کے کرنے کی آزادی دے رکھی ہے جسے ہم پسند کرتے ہیں۔ اور یہ کرائی [illegible] فعل بالفعل نقصان دہ ہوتا ہے ایسا خیال کرنا بھی حماقت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے کہ جہاں تک [illegible] علم نفس کی یہ دو اصطلاحات یعنی "مزاحم" اور "مزاحمت" صحیح طور پر استعمال نہیں ہوتے ہیں۔

ہمارے اپنے اندر بعض فطری جبلتیں [illegible] انہیں اگر دبایا نہ جائے تو معاشرہ کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں ان جبلتوں کا ہمیں احساس بھی ہوتا ہے اور انہیں دبانے کی معقول وجہ بھی ہم جانتے ہیں تربیت نفس ضروری ہے اور تربیت نفس کے باعث خوشی ہم سے کوئی قوت نہیں چھین سکتی لفس کی تربیت کرنے میں اور خوشی کے حاصل کرنے کے طریقوں میں تضاد نہیں ہے اور نہ دونوں کو ایک دوسرے کا دشمن قرار دیا جا سکتا ہے۔

مزاحمت یا رکاوٹ جس کے باعث ہمارے دل و دماغ کا اطمینان قربان کرنا پڑتا ہے ایسی مزاحمت یا حکم امتناعی ہوتا ہے جسے بغیر سوچے سمجھے ہم اپنے آپ پر صادر کر دیتے ہیں اس قسم کے امتناعی احکامات اپنی ذات کو سمجھنے یا اپنے نفس کا تجزیہ کرنے کی تمام راہوں کو مسدود کر دیتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کے اکثر امتناعی احکام معمولی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان کے باعث ایک قسم کی بے چینی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی بے چینی جس کی وجہ بھی ہم سمجھنے سے اکثر قاصر رہتے ہیں اور ان کے وجود کی وجہ اکثر وہم و دماغ کی مبالغہ آمیز کوتاہ تقلید ہوتی ہے مثلاً مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو عام قاعدہ کے خلاف لباس پہنا کرتے ہیں لیکن خود ان کے کمان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہوتی ——

لوگ کیا کہیں گے [illegible] پر فکر ترک کر دیتے ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے اس جملے میں وہ تشویش ہے، وہ فیصلے جن کے باعث اکثریت ... سامان مہیا ہو جاتا ہے کہ خواہشات انسانی اس قسم کی تمنائیں کو دبا سکتا ہے لیکن اسے ہمیشہ کے لئے فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ دل کے کسی گوشے میں رکی موجود رہتی ہے آپ نے خود اپنے دوستوں میں اس قسم کا احساس ہو گا اور انہیں کہتے ہوئے سنا ہو گا کہ "میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ میں یہ کر دوں یا ایسا کر دوں۔ اور وہ یہ کہہ کر بطور اعتراض کے مسکراتے بھی ہوں گے اور پھر کہا ہو گا ۔۔ لیکن نہ معلوم کیوں میں اپنے اس خیال کو اب تک عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

خوشی کی راہیں :۔

لہٰذا سب سے ضروری اس راستہ کا عدم استعمال ہے ۔۔ راستہ جس پر دنیا والے تمہیں گامزن دیکھنا چاہتے ہیں لیکن تمہاری خواہش اس کے برخلاف ہوتی ہے اس کے ساتھ ہی یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ آپ کی خواہش ایسے افعال پر مبنی نہ ہو جن سے معاشرہ کو نقصان پہنچ سکتا ہو یا جس کے باعث لوگوں میں بے چینی پیدا ہوتی ہو ایسی خواہش کو روکنا جس کے لئے آپ کے پاس کوئی اطمینان بخش وجہ نہ ہو یقیناً خوشی کے لئے سم قاتل ہے بطور قربانی کے یا کسی شخص کے جذبات کا خیال کر کے کسی فعل سے رکنا ایک الگ بات ہے اور ممکن ہے کہ ذہنی تسکین بطور انعام کے اس کے باعث حاصل ہو سکے الغرض مختصر طور پر اس مسئلہ کو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ ہر وہ کام کرو جسے تمہاری طبیعت چاہے اگر اس کے خلاف کوئی معقول وجہ موجود نہ ہو اور اگر وہ اخلاقی معیار پر پورا اتر رہا ہو۔

ناخوشی کا دوسرا راستہ ایسے لوگ طے کرتے ہیں جو مطالعہ باطن میں مصروف رہتے ہیں یہ کہنا بالکل صحیح ہو گا کہ مطالعہ باطنی یا اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی بجائے اندر ہی اندر پرکھنے کی عادت عالم تنہائی کی پیداوار ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تنہائی انسان کے لئے ہوتی ایسی مصنوعی چیز ہے جو اپنے ماحول اور بیرونی اثرات میں عدم دلچسپی کے باعث وجود میں آتی ہے مجھے اپنے آدمیوں سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا ہے جو اپنی تنہا پسندی اور خلوت نشینی کا ذکر فخر کے ساتھ کرتے ہیں اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بغیر کسی نفسیاتی الجھن کے ذہنی تنہائی میں مسرت محسوس کرتے ہیں لیکن اسے استثنائی درجہ عطا کیا جا سکتا ہے کیونکہ انسان فطرتی طور پر دماغی اور جذباتی اعتبار سے دوسرے لوگوں کے میل ملاپ کے باعث تازہ دم ہوتا رہتا ہے

تنہا رہنے کی خواہش جو خلوص دل کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اکثر اس کی بنیاد احساس کمتری یا بہ الفاظ دیگر احساس خودی پر ہوتی ہے مجھ سے تنہا پسند اور شرمیلے لوگوں نے کہا ہے کہ وہ اپنے آپ میں دوسروں سے دوستی پیدا کرنے کی ہمت اور اہلیت نہیں پاتے ہر وہ شخص جو علم نفسیات سے واقف ہے اس نقص کو دور کرنے میں دقت محسوس کرے گا لیکن یہ ایک ایسا نقص ہے جسے دور کرنا ہی چاہیئے آپ ہر روز ایک اجنبی انسان سے گفتگو کرنے کی کوشش کیجئے اور کسی نہ کسی بہانے سے سلسلہ گفتگو کو دراز کرنے کی کوشش کیجئے اجنبی شخصیتوں کے میل ملاپ کے موقعوں کو ہاتھ سے جانے نہ دیجئے آپ خود محسوس کریں گے کہ اکثر اجنبی انسانوں میں آپ کے پرخلوص دوست بننے کی صلاحیت موجود ہے جب بھی آپ کو اپنی اس صلاحیت کا احساس ہو جائے گا کہ آپ ان معاشرتی رکاوٹوں پر فتح پا سکتے ہیں تو آپ میں خود اعتمادی پیدا ہو جائے گی۔

اس قسم کی کوشش ہر شخص کو کرنی چاہیئے کیونکہ آپ دوسروں سے میل ملاپ رکھ کر اور دوسروں کے خیالات سے فیض یاب ہو کر ہی اپنی زندگی کو دلچسپ اور پر لطف بنا سکتے ہیں۔

تو با زمانہ بساز :۔

یہ ایک تعجب خیز حقیقت ہے کہ ایسے نوجوانوں کی اکثریت جو نفسیاتی علاج کے خواہشمند نظر آتے تھے ان میں جو نقص تھا وہ یہ تھا کہ وہ اپنے آپ میں عملی زندگی کے اندر رچ بس جانے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے اور ان کا دماغی توازن بیماری اور گھریلو ... کے باعث بگڑ چکا تھا سماجی

زندگی میں بھی اس قسم کے نفسیاتی مریض ملتے ہیں جو اپنے آپ کو حالات کے مطابق تبدیل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اگرچہ ناسازگاری ماحول
کے مریضوں کو ماہر نفسیات کی امداد کی ضرورت پڑتی ہے لیکن اس کے باوجود ایسی راہیں بھی ہیں جن پر چل کر ذہنی افسردگی کو دور کیا جا سکتا ہے۔

یہ معاملہ ذہنی ہچکچاہٹ سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ ان حالات سے بغاوت کرنے سے جو ہمارے ماحول سے بالکل مختلف ہیں۔ مثلاً ایک شہری
کو دیہات میں شہر کی ہما ہمی اور راہوں کا شور و غل حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ چاہے تو شعوری طور پر اپنے ذہن کو ان چیزوں کی کمی کا عادی بنا
سکتا ہے اور ساتھ ہی نئے اثرات کو قبول نہیں کر سکتا جس کے باعث شہری اور دیہاتی زندگی کے اس تضاد پر ہمیشہ غور کرنے کے باعث اس میں
افسردگی کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں اس کے بجائے وہ چاہے تو نئے ماحول کا تجربہ مقدم بھی کر سکتا ہے ـــــ اسے ایک نیا تجربہ تصور کر سکتا ہے
اور اپنے ذہن کو شہری اور دیہاتی زندگی کے فرق کو محسوس کرنے کی جانب منعطف کرا سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہمیں ایک اور راستہ کو ترک کرنا چاہیئے ـــــ نئے اثرات و تجربات کو قبول نہ کرنے کے راستہ کو ـــــ بعض زندگی
میں بعض تلخ مقام بھی آتے ہیں یا تو ان سے رہائی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے یا پھر انہیں ایک حقیقت تصور کر کے دل سے قبول کر لینا
چاہیئے اسے قبول کرنے کے باعث اس کی آدھی تلخی ختم ہو جائے گی اور ہم اتنا افسردہ نہ ہو سکیں گے جتنے کہ رہا کرتے تھے۔

جی ـــــ آپ بھی خوشی کی راہیں اختیار کر سکتے ہیں۔؟

کیا آپ سخت محنت کرتے ہیں

آج دنیا میں ہزاروں اموات کثرت کار کی وجہ سے واقع ہوتی ہیں جس کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ صرف امریکہ میں قلبی بیماریوں کی اموات میں خطرناک طور پر اضافہ ہو چکا ہے قلبی بیماریاں بہ نسبت عورتوں کے مردوں پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں اور خاص کر ادھیڑ عمر کے مردوں پر (ذیل میں چند سوالات دیئے جاتے ہیں اگر آپ مہلک رفتار پر کام کر رہے ہیں تو یہ آپ کے کام کی رفتار کو کم کرنے میں مدد دینگے)

سوال	ہاں	نہیں
۱۔ کیا آپ خود کو مجرم محسوس کرتے ہیں اگر آپ ہفتہ کو کام نہ کریں ؟	۰	۱۰
۲۔ کیا آپ گھر پر اس قدر تھکے ہوئے آتے ہیں کہ بھوک بھی محسوس نہیں کرتے ؟	۰	۱۰
۳۔ کیا آپ چھٹی لینے سے بھی احتراز کرتے ہیں ؟	۰	۱۰
۴۔ کیا آپ کام گھر پر بھی لاتے ہیں جبکہ وہ ضروری نہیں ؟	۰	۱۰
۵۔ کیا آپ اپنا کام کرتے ہیں کہ امور خانہ داری کو بھی بھلا چکے ہیں ؟	۰	۱۰
۶۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی زندگی یکطرفہ ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ ماسوا کام کے آپ کو اور کسی میں دلچسپی نہیں رہی ہے۔؟	۰	۱۰
۷۔ کیا آپ ملازمت کے مسائل سوچنے کی وجہ سے کم سوتے ہیں۔؟	۰	۱۰
۸۔ کیا آپ خود کو غیر مطمئن محسوس کرتے ہیں ؟	۰	۱۰
۹۔ کیا آپ اپنی ضروریات سے زیادہ روپیہ کمانے کے خواہش مند ہیں ؟	۰	۱۰
۱۰۔ کیا آپ تمام دن بھاگے بھاگے پھرتے ہیں تاکہ آپ زیادہ سے زیادہ کام اکٹھا کر سکیں جسکی آپ عام طور پر امید نہیں کر سکتے ؟	۰	۱۰
۱۱۔ کیا آپ دوسروں سے بھی اتنی ہی محنت سے کام کرنے کی توقع رکھتے ہیں جس محنت سے آپ خود کرتے ہیں ؟	۰	۱۰
۱۲۔ کیا آپ کے گھر والے اس امر کی شکایت کرتے ہیں کہ آپ کام کی مشغولیت کی وجہ سے ان سے دلچسپی نہیں لیتے ؟	۰	۱۰
۱۳۔ کیا آپ نے کام کی وجہ سے اپنے بال بچوں کو باہر سیر و تفریح کے لئے نہ لیجانے کا عذر بنا لیا ہے۔؟	۰	۱۰
۱۴۔ کیا آپ اتنی محنت سے کام کرتے ہیں کہ آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ اپنی صحت مقویات استعمال کئے بغیر برقرار نہیں رکھ سکتے ؟	۰	۱۰
۱۵۔ کیا آپ کا کام آپ کی روزمرہ کی ورزش میں جو کہ آپ کی عمر کے مطابق ہو مخل ہوتا ہے ؟	۰	۱۰
۱۶۔ کیا آپ کثرت کار کی وجہ سے کسی بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں ؟	۰	۱۰
۱۷۔ کیا آپ اپنے کام کی قابلیت پر فخر محسوس کرتے ہیں اس حد تک کہ آپ سالانہ جسمانی امتحان سے بھی نفرت کرنے لگے ہیں ؟	۰	۱۰

(نوٹ) جو صاحبان صفر حاصل کرتے ہیں اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ سخت محنت کرتے ہیں اور جن کی میزان میزان ۵۰ سے کم ہو ان کے لئے بھی خطرہ کی پیش گوئی ہے۔

ترجمہ: [illegible]

مایوسیوں پر کیسے فتح حاصل کی جا سکتی ہے

اگر آپ غیر مطمئن اشخاص سے یہ معلوم کریں کہ تمہاری خوشی کی راہ میں کیا رکاوٹ حائل ہے تو آپ ان کے جوابات کی یکسانیت کو دیکھ کر شاید متحیر ہوں گے کہ تمام کے تمام ان چیزوں کے خواہش مند ہیں جو کہ ان کے پاس نہیں ہیں کچھ روپے کی فراوانی کے خواہاں ہیں دوسرے محبت یا ہر دلعزیزی کے خواہش مند ہیں ایسے بہت کم ہوں گے جن کا رجحان تعلیم کی طرف ہو اور اکثریت ان لوگوں کی ہوگی جو اعلیٰ عہدوں کے متمنی اور خواہش مند ہیں اگر آپ اس سوال کی گہرائی میں جائیں اور غور کریں تو آخر کار آپ پر عیاں ہو تا جائے گا کہ وہ اپنی موجودہ حالات سے مطمئن نظر نہیں آتے ایسے لوگوں میں مایوسی کا احساس پرورش پاتا ہے کیونکہ وہ ایسی چیزوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جو کہ ان کی فوری استطاعت سے باہر ہوتی ہیں لفظ فوری ([illegible]) کو آپ اپنے ذہن میں رکھیں جو کہ اس سلسلے میں بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ان کی خواہشات اتنی جلدی پوری نہیں ہو سکتیں جتنی جلدی وہ چاہتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ پریشان اور خستہ حال رہتے ہیں ایک طرف تو وہ مختلف چیزوں کی خواہش رکھتے ہیں مگر دوسری طرف اس سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ان کو آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں مگر اصل میں ہوتا یہ ہے کہ ننانوے فیصدی اپنی غیر مطمئن حالت کو مطمئن کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی ہمیشہ احساس ناامیدی کا شکار رہتے ہیں اور بدقسمتی سے دوسروں کے لئے بھی وبال جان بن کر رہ جاتے ہیں۔

حقیقتاً مایوسی ایک احساس ہے جس کا ہم میں سے ہر ایک تجربہ رکھتا ہے چاہے وہ لمحہ بھر کا ہی کیوں نہ ہو یہی جذبہ احساس کمتری کا شکار کر دیتا ہے اس سے کینہ اور بغض پرورش پاتا ہے اور اسی سے ذاتی غیر اعتمادی پیدا ہوتی ہے اگر آپ ہمیشہ مایوسی سے ہمکنار رہیں گے تو یقیناً آپ کی شخصیت میں انحطاط اور تنزل پیدا ہو جائے گا تمام مرد، عورتیں اور بچے اپنی خواہشات کے اخراج کے خواہش مند ہوتے ہیں اور جب وہ ان کو پورا ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے ہیں تو وہ اپنی خواہشات کے شعور کو دبا دیتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی دلی خواہشات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہیں اسی لئے ہم میں سے کوئی بھی ناامید رہنا بھی گوارا نہیں کرتا۔

پس اگر آپ کسی وقت بھی کسی قسم کی مایوسی کرتے ہیں تو آپ کو لازم ہے کہ ان چھ بنیادی اصولوں پر کاربند ہیں جو کہ مایوسی کو روکنے اور اس کی اصلاح کیلئے نہایت مفید ہیں اگر ان اصولوں پر سختی سے کاربند رہا جائے تو وہ آپ کو منزلوں کی اس بلندی پر پہنچا دیں گے جہاں کامیابی ہی کامیابی ہوگی۔

۱۔ بھاگنے سے پہلے چلو۔

اس اصول کو "میری" کے نام منسوب کیا جا سکتا ہے "میری" پہلے نیویارک میں ایک معمولی جگہ پر ملازم تھی ایک دفعہ ایک پارٹی میں اسے اتفاقیہ چونکہ وہ ایک اچھی آواز کی مالک ہے اس کے دوستوں نے بھی اس کی آواز کی تعریف کی اس نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ اس کو کسی ناچ گھر میں ہونا چاہئے اس کے بعد اپنے کچھ دلکش طرزوں کے گانے ریکارڈ کرائے اور جب اس نے اپنی آواز ان ریکارڈوں میں سنی تو خود وہ اپنی آواز پر فریفتہ ہو گئی ایک ماہر فن کے پاس گئی جس نے بتایا کہ "میری" کو کئی سال تک سخت محنت اور جانفشانی سے کام کرنا پڑے گا اور تب ہی وہ کسی بڑی محفل میں گانے کے قابل ہو سکے گی وہ راضی ہو گئی اور استادوں کی ہدایات پر اس نے سختی سے عمل شروع کر دیا ہفتہ میں دو مرتبہ اس نے اپنی آواز کو دلکش بنانے کا سبق لیا اور سنگر یا اور تین مہینے کے اختتام پر وہ حیرت انگیز ترقی کر چکی تھی ایک اس کے استاد نے اسے بتائے

دی کہ اب وہ اس قابل ہو گئی ہے کہ وہ ایک بڑے گرجے میں ایک مغنیہ کی حیثیت سے داخل ہو سکتی ہے اور عوام میں بھی گا کر کافی روپیہ پیدا کر سکتی ہے لیکن "میری" کا جواب تھا "نہیں میں اول ہی سے اپنے آپ کو اعلیٰ درجہ کی مغنیہ کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتی ہوں۔ چاہے اس درجہ کو حاصل کرنے میں مجھے کتنا ہی عرصہ درکار ہو" گرمیوں کی تعطیل کے فوراً ہی بعد اس نے ملازمت کو ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا" تاکہ وہ آواز کے امتحان کی تیاری میں زیادہ وقت صرف کر سکے اور چونکہ اس کے استاد کی صلاح یہ تھی کہ ایسا کرنا مناسب نہیں لیکن "میری" نے بجائے اس کی صلاح ماننے کے تعلیم حاصل کرنا بند کر دی اور کسی دوسرے استاد کی خدمات حاصل کر لیں جس نے اس کے نقطہ نظر سے اتفاق کیا۔

آج اس کو تین سال گزر گئے ہیں "میری" اب تک اسی منزل پر ہے اپنے خاندان پر ایک مالی بوجھ ہونے کی وجہ سے اس نے اب اعلیٰ درجہ کی مغنیہ بننے کے خیال کو ترک کر دیا ہے اور مجبوراً ایک عام مغنیہ کی حیثیت سے گانے کے لئے تیار ہو گئی۔ "میری" پر ہی موقوف نہیں ہے جو شخص بھی ایک دم دوڑنا چاہے گا وہ کسی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکے گا، ترقی کے آسمان پر پہنچنے کے لئے آپ کو کتنے ہی زینے طے کرنا ہی پڑیں گے۔

۲- جستجوئے بدل :-

فرض کیجئے آپ باہر سیر کے لئے جاتے ہیں چلتے چلتے آپ ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں پر آگے بڑھنے میں چند مشکلات نظر آتی ہیں اس مشکلات کو آپ تین طریقوں سے حل کر سکتے ہیں یا تو آپ اس رکاوٹ کو کود کر پار کر لیں یا آپ اس رکاوٹ کے ساتھ ساتھ چل کر ایک ایسا مقام دریافت کر لیں جہاں آپ آسانی سے پار کر سکیں ورنہ پھر آپ واپس آ سکتے ہیں۔ لیکن وہ شخص جو ہمیں مایوسی کا شکار رہتا ہے ان میں سے کوئی طریقہ بھی استعمال نہیں کرے گا وہ تو صرف رکاوٹ کے ساتھ سہارا لیکر بیٹھ جائے گا اور اس مزاحمت پر بڑبڑاتا رہے گا۔

اس ضمن میں ہم ڈاکٹر جون کو بطور مثال پیش کر سکتے ہیں اوائل عمر سے ہی اس کا رجحان علم طب کی طرف تھا لیکن اس کی مالی حالت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ میڈیکل اسکول میں تعلیم جاری رکھ سکے لیکن وہ ان لوگوں میں نہیں تھا جو کسی رکاوٹ کا سہارا لے کر بیٹھ جاتے ہیں اس نے پرائمری اسکول میں بہ حیثیت ایک استاد کے ملازمت کر لی اور ساتھ ہی ساتھ اپنی تعلیم کو بھی جاری رکھا یہاں تک کہ بی اے کی ڈگری حاصل کر لی اور پھر طبی تعلیم کی تکمیل کی۔ آج وہ نیویارک کے ایک بہت بڑے اسپتال میں ایک ماہر علم روح انسانی کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہا ہے اور جو لوگ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں ان کی کیفیات کا مطالعہ کرتا ہے اور ڈاکٹروں کو ان کے علاج کے سلسلے میں مشورہ دیتا ہے وہ اپنے کام میں نہایت دلچسپی رکھتا ہے۔ یہ بہت عمدہ مثال ہے ایک ایسے شخص کی جس نے اپنے رجحانات کا بدل فوری طور پر ایک متعلقہ میدان میں ڈھونڈ لیا۔ وہ لوگ بیوقوف ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا میں صرف ایک ہی کام کے لئے پیدا ہوئے ہیں ہم میں سے ہر ایک کا رجحان ایک سے زائد پیشوں کی طرف مائل کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہم اپنے آپ کو ان چیزوں کے سمجھنے اور جاننے کا اچھی طرح موقعہ دیں۔

۳- خود بینی :-

مسز ٹرڈی کی عمر چالیس سال تھی وہ ایک کامیاب تاجر کی بیوی اور دو بچوں کی ماں تھی وہ مزید محبت اور ہمدردی کی خواہش مند تھی۔ مگر اس کی زندگی کی یہ حسرت پوری نہیں ہو رہی تھی اور اس کا شوہر اس میں زیادہ دلچسپی لینے کے بجائے اپنے تجارتی معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا جب اس کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا اور اس سے دریافت کیا گیا کہ وہ اپنی ایک ایسی عادت بتلائے جو کہ اس کے شوہر کو بجائے تجارتی کاموں کے گھر کی طرف مائل کر سکے تو اس نے بجائے اس کے اپنے شوہر کے کوتاہیوں کی ایک لمبی فہرست پیش کر دی پھر جب اس کو بتایا گیا کہ وہ اصل سوال سے دور ہے تو اس نے کہا کہ وہ کسی ایسی چیز کو نہیں سوچ سکتی جس سے اس کی کوئی کوتاہی ظاہر ہو۔ مگر جب اس سے "عیب جوئی، خود غرضی اور تنگ مزاجی" کے بارے میں اور دیگر متعلقہ ناخوشگوار حالات کے متعلق دریافت کیا گیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے شوہر کی کشیدگی [illegible] خود اس کے وجہ سے ہے اصل میں وہ اپنی کوتاہیوں کے بارے میں خود بے خبر تھی اور جس وقت اس نے محسوس کر لیا کہ وہ ایک حد

تھک تھوڑی کا اس معاملہ میں ہونا لازم ہے اسی وقت سے اس کے لئے کامیابی کا میدان کھل گیا۔ جیسے جیسے اس نے پھر ذہنی اصلاح کی ویسے ویسے اس کا شوہر بھی اس میں دلچسپی لینے لگا اور اس طرح اس کی وہ مایوسی جو کہ اس کی اپنی پیدا کردہ تھی آہستہ آہستہ غائب ہو گئی اور جیسے ہی اس نے اپنی کوتاہیوں کی مکمل اصلاح کی ویسے ہی اس نے اپنے مقصد کو حاصل کر لیا۔ خود بینی بھی ترقی کے لئے ایک نہایت ضروری اصول ہے یاد رکھئے جب تک مرض کی تشخیص نہیں ہوتی علاج بھی کامیاب نہیں ہوتا۔

۴- چاند پر چھلانگ لگانے کی کوشش مت کرو۔

بہت سے لوگوں کی خواہشیں ایسی ہوتی ہیں جیسے ہم صرف شیخ چلی کی بڑ سمجھتے ہیں ایسے لوگ وہ ہونا یا کرنا چاہتے ہیں جو کوئی دوسرا بھی نہیں کر سکتا وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کی طرح چاند تاروں کو حاصل کرنا اور چونکہ وہ شعوری طور پر جانتے ہیں کہ اس کی خواہش کبھی بھی عملی جامہ نہیں پہن سکیں گی تو وہ لوگ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے بے وقوف ہونے میں کیا شبہ ہے اور مایوسی کے گہرے غار میں گر کر سوچتے ہیں کہ اگر وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکتے تو زندگی ان کے لئے ایک مسرت کے مانند ہو جاتی۔ مگر جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے کہ زندگی تو ایک حقیقت ہے اور ایک ایسی حقیقت جس تک پہنچنے کے لئے ہر شخص کو رکاوٹیں اور مشکلات کو دور کرنا ہوتا ہے ہم کبھی ترقی حاصل نہیں کر سکتے۔ اور اگر خوش قسمتی سے ہماری زندگی میں رکاوٹیں اور مشکلات حائل نہ ہوں اور ہم اپنے ایک مقصد میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں تو ہمیں اپنے دوسرے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد شروع کر دینی چاہیئے اصل زندگی کا لطف تو بعض مشکلات اور تکالیف پر غالب آنے میں آتا ہے لیکن یہ جب ہی ممکن ہے کہ آپ کا نصب العین ممکن الحصول ہو۔ لیکن اگر چاند کو آپ اپنی پہلی رکاوٹ سمجھتے ہیں تو آپ کبھی اس قابل نہیں ہوں گے کہ اس پر کود سکیں اور جتنی مرتبہ بھی اس پر چھلانگنے کی کوشش کرو گے اتنی ہی مرتبہ منہ کے بل گرنے کا اندیشہ لاحق رہے گا لیکن اگر مقصد یا خواہش مناسب ہے تو کامیابی کے مواقع زیادہ اور روشن ہوں گے اور آخر کار کامرانی اور کامیابی قدم چومے گی۔

۵- مشغول رہو : —

تھامس ایڈیسن اپنے سینکڑوں تجربات کی ناکامی پر بھی مایوس نہ ہوا اس نے ہر تجربہ کی ناکامی کو مزید علم حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہو تو سمجھا اور آخر کار بہم سعی کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور اب وہ اس قابل ہے کہ اپنی ناکامیوں کا اچھی طرح تجزیہ کر سکے پس اس نے ان ناکامیوں پر بنیادی کام کرنا شروع کر دیا ہم میں سے ہر ایک کو قدرتیں ہے ہم عام مایوسیوں سے دوچار ہوتے رہتے ہیں کچھ لوگ روپیہ پیسہ کچھ لوگ صحت اور کچھ لوگ آسائشاں حاصل کرنے کی دھن میں لگے رہتے ہیں یہ چیزیں عام ہیں بہت سے آدمی اور عورتیں ان کو حاصل کر سکتے ہیں اور ان کو حاصل کرنے کے لئے زیادہ کوشش بھی درکار نہیں ہوتی لیکن پھر بھی ہمیں اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو کہ اپنی تجارتی اور معاشرتی زندگی میں ناکامی کو اپنے ہکلے پن سے منسوب کرتا تھا کئی سال تک وہ ایسے اسکولوں میں رہا جہاں کہ ہکلے پن کا علاج ہوتا تھا لیکن اس کا علاج نہ ہو سکا اس کے بعد یہ چیز اس کے ذہن نشین ہو گئی کہ اس کا یہ مرض لا علاج ہے یہ تعجب کی بات ہے کہ اس معمولی کمزوری کو اپنی ناکامی کا ایک بہانہ بنا لیا وہ آج کہتا ہے کہ میں اپنی زندگی میں کیا کیا نہ کر سکتا تھا اگر میں ہکلا نہ ہوتا۔ لیکن یہ اس کی غلطی تھی اگر وہ اپنے آپ کو مشغول رکھتا اور اپنے طرز بیان کی کمزوری کی اصلاح کسی ماہر کی رہبری میں کرتا تو اس کی تمام مایوسیاں رات کے سایہ کی طرح غائب ہو جاتیں۔

۶- جستجوئے اسباب : —

بعض دفعہ آپ مایوسیوں میں اس طرح گھر جاتے ہیں کہ ان کی اصل وجہ ٹھیک طرح معلوم نہیں کر سکتے آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ زندگی کے کسی نازک مرحلے سے گزر رہے ہیں اس وقت آپ کو ایک ماہر کی ضرورت ہے جو آپ کو منزل مقصود تک پہنچا دے [illegible]

محمد عبدالرزاق محب

تعلیم اور قوائے انسانی

سب سے زیادہ جس چیز سے بچہ متاثر ہوتا ہے وہ اس کا ماحول اور اس کی تعلیم و تربیت ہے۔ جو کچھ وہ اردگرد ہوتا دیکھتا ہے، اپنے آپ کو اسی کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیتا ہے اور اگر اُسے اچھا ماحول اور اچھی تعلیم و تربیت میسر نہ ہوسکے تو اس کے کردار میں بہت سی ایسی خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کی موجودگی میں وہ ایک مکمل انسان نہیں بن سکتا۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بچہ پیدائش کے وقت بہت سی طاقتوں اور قویٰ سے یکسر محروم ہوتا ہے اور جوں جوں وہ بڑھتا ہے ویسے ہی اس میں نئی نئی قوتیں بھی پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ حالانکہ یہ درست نہیں۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ بچہ کو بھی وہ تمام طاقتیں ودیعت کی جاچکی ہوتی ہیں۔ جو ہمیں بڑے آدمیوں میں نظر آتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بچپن میں اس کی یہ طاقتیں سوئی ہوئی ہوتی ہیں۔ جوں جوں وہ بڑھتا ہے اس کا ماحول طریقہ تربیت اور تعلیم اس کی ان طاقتوں کو بھی بیدار کرتے جاتے ہیں اور ایک وقت ایسا آتا ہے۔ جب کہ وہ پورے طور پر ذہنی لحاظ سے بالغ ہو جاتا ہے۔

اگر بچہ کو اچھا ماحول بھی میسر نہ آئے اور تربیت بھی اس کی اچھے طریقے سے نہ ہوئی ہو تو یقیناً اس کا کردار کافی حد تک نامکمل رہے گا۔ لیکن اگر وہ تعلیم حاصل کرے تو پھر بھی کچھ نہ کچھ اپنے اخلاق کی اصلاح کر سکتا ہے۔ کیونکہ تعلیم اس کو شعوری لحاظ سے اتنا بیدار کر دیتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو سمجھنے لگے اور جب ایک شخص اپنے آپ کو سمجھ جاتا ہے۔ تو یقیناً وہ ان باتوں اور عادتوں کو چھوڑنا شروع کر دیتا ہے۔ جو وہ سمجھتا ہے کہ اچھی نہیں۔

ماحول تو خیر کافی حد تک والدین کی نگرانی سے اچھا کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ کوشش کریں تو وہ اپنے بچوں کو بُرے لڑکوں کی صحبت سے بچا سکتے ہیں لیکن جہاں تک تعلیم و تربیت کا تعلق ہے سو اس معاملہ میں ہمیں گہری سوچ و بچار کی ضرورت ہے۔

تربیت کا سب سے زیادہ انحصار والدین پر ہے۔ اگر کسی بچے کے والدین اُسے بات بات پر جھڑکتے رہیں تو یقیناً وہ ضدی اور چڑچڑے مزاج کا ہو جائے گا یا اگر کوئی والدین اپنے بچے کو اپنا جیسا عقلمند سمجھیں اور اس لئے اس کی ہر شرارت پر اس کو سرزنش کرنی شروع کر دیں تو وہ احساس کمتری کا شکار ہو جائے گا۔ لہٰذا بچوں کی اچھی تربیت کے لئے والدین کو بچہ کی فطرت کا علم ہونا ضروری ہے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ والدین خود تعلیم یافتہ ہوں۔ تاکہ وہ اپنے بچے کی تربیت عقلمندی اور دانائی سے کریں۔

اگر ماحول اور تربیت اچھی نہ ہونے کے باعث کسی بچہ میں کچھ خراب عادات پیدا ہو گئی ہوں۔ تو تعلیم کے ذریعہ سے کافی حد تک ان کو دور کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تعلیم بچہ کے شعور کو زیادہ سے زیادہ بیدار کر دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو سمجھنے لگ جاتا ہے۔ آپ دیکھئے کہ ایک پڑھے لکھے نوجوان اور ان پڑھ نوجوان میں زمین و آسمان کا فرق ہو گا۔ آخر کیوں ؟ صرف اس لئے کہ پڑھا لکھا نوجوان تعلیم کی بدولت ان پڑھ نوجوان کی نسبت زیادہ حاضر دماغ اور سمجھدار ہوتا ہے۔

اسکول اور کالج کی تعلیم ہے وہ صرف بنیادی ہے۔ اصل تعلیم تو اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ اس عمر میں نہ صرف یہ کہ بچہ

جسمانی طور پر بھی بن بلوغت کو پہونچ چکا ہوتا ہے بلکہ ذہنی طور پر بھی اس کے خیالات کافی حد تک پختہ ہو چکے ہوتے ہیں اور اپنے اچھے برے کی پہچان اس میں بیدار ہو چکی ہوتی ہے۔ اس عمر تک اس کا ذہن اتنی ترقی کر چکا ہوتا ہے کہ وہ آسانی سے مشکل مسائل کو سمجھ سکے۔

لیکن بدقسمتی سے پاکستان میں ہزاروں نوجوان سالانہ میٹرک پاس کرتے ہی تلاش معاش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کے والدین اتنے امیر نہیں ہوتے کہ ان کے لئے کالج کی مہنگی تعلیم کا خرچ برداشت کر سکیں اور یہ آدھے ناممکن نوجوان کل کو ایک نامکمل والد ثابت ہوتے ہیں۔ کمی تعلیم کے باعث یہ اپنے بچوں کی تربیت صحیح طور پر نہیں کر سکتے اور یہ سلسلہ اسی طرح ہی چلتا رہتا ہے۔

صرف کمی تعلیم تو کسی شخص کی ناکامی کی وجہ نہیں بن سکتی۔ کیونکہ تجربے نے ہم پر یہ عیاں کر دیا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ جنہوں نے اپنی عمر میں کبھی کالج اور اسکول کی عمارت تک نہیں دیکھی ہو گی زندگی میں ایک کامیاب انسان بن جاتے ہیں۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ اپنی پریشانیوں کا ہمت سے مقابلہ کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ان کا غیر تعلیم یافتہ ہونا ان کو احساس کمتری میں مبتلا نہیں کرتا۔

یہ نوجوان حالانکہ کم تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود زندگی میں کافی ترقی کر سکتے ہیں۔ لیکن عموماً ان کی غربت ان کے دلوں کو احساس کمتری سے بھر دیتی ہے جس کی وجہ سے ان کی وہ طاقتیں بھی جن سے ان کو کچھ فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ احساس کمتری ان کو زندگی سے مایوس اور غمگین بنا دیتا ہے۔ اگر ہمارے ملک میں زیادتی اس قسم کے نوجوانوں کی نہ ہوتی تو شاید یہ امر اتنا تشویشناک نہ ہوتا۔ لیکن بدقسمتی سے اسی فی صدی ———— بلکہ اس سے بھی زیادہ ———— پاکستانی نوجوان انہی حالات کا شکار ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح شدید طور پر احساس کمتری کے شکار ہو کر ناکامی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لہٰذا ملک میں تعلیم کے عام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ تاکہ یہ نوجوان کسی طریقے سے تعلیم حاصل کر کے اپنے احساس کمتری کا علاج کر سکیں اور زندگی سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکیں۔

نئے نئے تعلیمی اداروں کا اجراء شاید ان نوجوانوں کے لئے کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہو گا۔ کیونکہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان لوگوں کے سامنے جو سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ روپے کی کمی ہے۔ اسکولوں کی کمی نہیں اور نہ ہی چند ایک سکالرشپ دے دینے سے ہزاروں نوجوانوں کو کچھ فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ ملک میں اعلیٰ تعلیم کے عام کرنے کا ایک اور صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ جیسا کہ میں اس سے پہلے بتا چکا ہوں، سستے کلاسز کے ساتھ ساتھ کالجوں میں نائٹ کلاسز کا انتظام، کیونکہ اس صورت میں وہ نوجوان جو بدقسمتی سے اس چھوٹی سی عمر میں کمانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دن کو کما کر رات کو تعلیم حاصل کر سکیں گے۔

لہٰذا ضرورت ہے کہ ہر شخص جس کے دل میں انسانیت کے لئے ذرا سا بھی درد ہے اور جو پاکستان میں آیندہ نسلوں کو بری تربیت کی وجہ سے خراب ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا کوشش کرے کہ فوری طور پر کالجوں میں نائٹ کلاسز جاری ہو جائیں۔ کیا یہ ممکن ہے؟

بقیہ صفحہ ۳۶ مایوسیوں پر کیسے فتح حاصل کی جا سکتی ہے

ہو۔ ماہر روح انسانی ہو۔ یا ماہر طب ہو۔ دنیا میں ایسے راہبروں کی کمی نہیں ہے لیکن کتنے ایسے ہیں جو ان رہبروں کی رہبری سے بھی فائدہ نہیں اٹھاتے لیکن اگر آپ عقلمند ہیں تو آپ ضرور ان کی نصیحتوں پر عمل کریں گے آپ کو جاننا چاہئیے کہ مایوسی آخری چیز ہے لیکن ایسی آخری ———— کہ جس کے قبل کتنے ہی کامیابیاں آپ کا قدم چومنے کی تمنا لئے ہوئے ہیں۔

اگر آپ مندرجہ بالا اصولوں پر سختی سے عمل پیرا ہوں تو یہ اصول آپ کی تمام مایوسیوں کو ختم کر دیں گے اور اس طرح آپ کی زندگی کا کانٹا منزل مقصود تک پہنچ کر ہی دم لے گا۔

[illegible] بی اے

دعواتِ نفسیات

یہ دُنیا عجیب جگہ ہے، اور دُنیا والے اس سے بھی عجیب۔ دنیا میں ہزاروں باتیں عجیب ہیں ان میں سے ایک یہ اس کی بے نیازی، یعنی یہ کہ مکان کو مکین کی پرواہ ہی نہیں۔ آنے کی خوشی نہ گئے کا رنج، کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

خدا جانے یہ دُنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے پھر بھی وہی رونق ہے مجلس کی

اس کے برخلاف دنیا والوں کا یہ عالم ہے کہ دنیا کے لئے مٹے جاتے ہیں، جینے کی تمنا میں مرے جاتے ہیں حالانکہ دنیا میں رہ کے انسان کا جب تک سانس چلتا ہے ذمہ داریوں اور فرائض کا لامتناہی سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا مصیبتوں کی انتہا ہی نہیں ادھر مرے اور تمام مصائب سے چھٹکارا۔ اور تمام فرائض سے سبکدوش، کیسی عجیب بات ہے کہ یہ جاننے کے باوجود پھر بھی زندگی کی آرزو موت سے خوف، اگر کوئی صاحبِ دماغ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچے تو فوراً معلوم ہو جائے کہ بہت مشکل ہے اس دنیا میں جینا۔ اور مرنا تو بہت ہی آسان ہے آج مرے کل دوسرا دن، جیتے جی لوگوں کی کتنی ہی خدمتیں کیجئے، کیسی ہی ناز برداریاں کیجئے لیکن کھلائے کا نام نہیں رلائے کا نام بُرا کہنے والے لاکھوں اچھا کہنے والے خال خال، اس میں بھی اکثر منافق منہ پر خوشامد پیٹھ پیچھے گالیاں، اس پر بھی ہم ہیں کہ جئے جانے کی آرزو بڑھنے کے علاوہ گھٹنے کا نام نہیں لیتی پھر اس پر ستم ظریفی یہ کہ جینے کا ڈھنگ تک سیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بے ڈھنگے پن سے جینے میں کیا لطف ہے۔؟

ہر کام اور ہر فن میں سلیقہ جان ڈال دیتا ہے چنانچہ جینا بھی ایک فن ہے اور سائیکولوجی جینا سکھاتی ہے اس لئے جینے کی آرزو کرنیوالوں کو سائیکولوجی سے اتنی ہی دلچسپی رکھنی چاہیئے جس قدر زندگی سے ہے۔

سائیکولوجی نہایت اہم، دلچسپ اور وسیع سائنس ہے دنیا کے ہر شعبہ میں اس کا دخل ہے اس لئے کہ دنیا کا کارخانہ ذی روح کی بدولت چل رہا ہے اور ذی روح کے دماغ اور نفسیات کا باقاعدہ مطالعہ ہی سائیکولوجی کا مقصد ہے یہ کلیہ ہے کہ زمانہ باتو نسازد تو باز مانہ بساز اس کے تحت بھی نفسیات کا سمجھنا سخت ضروری ہے جن ذی روحوں کے ماحول میں آپ کو زندگی بسر کرنی ہے اگر ان کے مزاج، عادات خصلتوں سے کما حقہٗ، واقفیت نہیں تو آپ کبھی کامیاب زندگی نہیں گذار سکتے۔

نوابوں اور راجاؤں کے چند مصاحب ہوا کرتے ہیں ان کو سوائے نبض شناسی کے اور کوئی فن نہیں آتا۔ ہاں اس کے وہ ماہر ہوتے ہیں اور اسی فن کی بدولت عمر بھر عیش و آرام سے گذار دیتے ہیں اس کا یہ مقصد نہیں کہ ہر شخص کسی راجہ یا نواب کے مصاحب بننے کی سعی کرے بلکہ کہنا یہ ہے کہ انسان کے لئے کامیاب زندگی بسر کرنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ وہ زمانہ کا نبض شناس ہو کم از کم اپنے حلقہ اور ماحول کے انسانوں کی ذہنیت سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو یہ صلاحیت جس قدر زائد ہوگی اتنی ہی کامیاب زندگی ہوگی کسی قوم، قبیلے کے لیڈر اور قائد آسمان سے نہیں اترتے بلکہ ہم میں سے بنتے ہیں ان کا یہ امتیاز دراصل اسی صلاحیت کے امتیاز کا نتیجہ ہوتا ہے میر محلہ وہی ہوگا جو محلہ کا بہترین نبض شناس ہوگا۔ اب غور یہ کرنا ہے کہ نبض شناسی کی صلاحیت کس طرح پیدا کی جائے یہ بہت اہم سوال ہے اور اس کا مکمل جواب علم نفسیات (سائیکولوجی) کی متعدد کتابیں ہیں اس کا مختصر تعارفی جواب ہی اس وقت ممکن ہے۔

انسان کو اگر ایک حکومت فرض کر لیا جائے تو دماغ (BRAIN) اس کا بادشاہ ہے اور ذہن یا نفس (MIND) اس کا وزیر

دماغ عادی حیثیت رکھتا ہے، اور نفس درجہ ثانی۔ چنانچہ کسی انسان کو سمجھنے کے لئے اس کے ذہن و دماغ کا مطالعہ [illegible] پہلے اور نفس
تجزیہ کیا جائے گا اسی قدر کامیابی ہوگی اس مطالعہ کی ابتدا خود اپنے سے کرنی مناسب ہے کیونکہ جس قدر سہولت خود اپنے مزاج و خصلت [illegible]
کے سمجھنے میں ہوتی ہے وہ دوسرے کو سمجھنے میں نہیں ہوتی یہی اس کی پہلی منزل بھی ہے جب انسان اپنے آپ کا مکمل جائزہ لے لے تو پھر اسے اپنی اصلاح
کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ اپنا جائزہ لینا بھی کافی دشوار ہے اور اس کے بعد اصلاح دشوار تر کیونکہ جائزہ تو اس لئے دشوار ہے کہ انسان فطری
طور پر خود پسند واقع ہوا ہے۔ اپنے عیوب خود نکالنے یا دوسروں سے سننے کا عادی ہی نہیں۔ اس طرف طبیعت رجوع ہی نہیں ہوتی بلکہ
قدرتی طور پر رغبت دوسروں میں عیب تلاش کرنے پر ہوتی ہے اور یہ کام انسان نہایت شوق سے کرتا ہے لیکن اگر اپنا تجزیہ کرنے کی مشق کرنے
سے قبل اوروں کا تجزیہ اور جائزہ لینا شروع کر دے تو صحیح نتائج تک پہنچنا اکثر دشوار ہو جاتا ہے مثلاً آدمی جب مختلف انسانوں کا جائزہ
لینا شروع کرے گا تو وہ ہر شخص کو خود غرض پائے گا۔ اس سے وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ انسان خود غرض ہے لیکن اگر وہ پہلے اپنا بھی صحیح جائزہ لے
چکا ہوگا تو اپنے کو بھی خود غرض پائے گا۔ اب نظر کا فرق ہو جائے گا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ بحیثیت سب انسان خود غرض ہیں چنانچہ قدرتی
طور پر وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ آیا ہم سب مساوی طور پر خود غرض ہیں یا کم و بیش۔ اسی طرح کی صدہا اور مثال ہیں یہی حال اصلاح کا ہو
جب انسان نے خود کو خود غرض جان لیا تو اب اس کی اصلاح کی طرف توجہ کرنی چاہیئے ہر ہر موقع پر اپنی خود غرضی پر قابو پانے کی کوشش کرنی
چاہیئے سہولت اس میں یہ ہے کہ اپنی نیت کا اندازہ اپنے سے بہتر کون کر سکتا ہے پھر اپنے سلسلے میں مواقع بھی اس قدر میسر آئیں گے کہ دوسروں
کے سلسلہ میں عشر عشیر بھی نہ آئیں گے۔ پھر ہر دفعہ یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ اس سعی اور اصلاح کا نتیجہ کس قدر مفید ثابت ہوا۔ یا ہوا بھی کہ نہیں۔
اگر ہوا تو کیوں ہوا؟ نہیں ہوا تو کیوں نہیں ہوا۔ اس میں سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ جب انسان دوسرے کی خود غرضی کو دور کرنے کی سعی کرے
تو اپنے تجربات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا اور اگر اصلاح کے سلسلے میں خاطر خواہ کامیابی ابتدا میں نہ ہوگی تو طبیعت نہ جھنجھلائے گی نہ مایوسی ہوگی
کیونکہ اسے اپنی داستان نظر آتی رہے گی اور وہ خیال کرے گا کہ مجھ پر بھی تو یہی گذری ہے کتنی مرتبہ اور کس کس موقع پر میں نے انتہائی کوشش کی کہ خود غرضی
سے کام نہ لوں لیکن قاصر رہا پھر یہ بھی تو آخر تو مجھ جیسا ہی انسان ہے عفو و درگذر کا مادہ پیدا ہو جائے گا۔ ناکامیاں مایوس نہ کریں گی سعی و جد و جہد
کا میدان وسیع ہو جائے گا اور نتائج تک بآسانی صحیح پہنچے گا۔

ایک بات اور غور طلب ہے وہ یہ کہ اکثر حضرات کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے فلسفی وہی ہوتا ہے جس نے فلسفہ پڑھا ہو اور علم نفسیات کا عالم
وہی ہے جس نے اس کا مطالعہ کیا ہو ایسا خیال کرنا قطعی غلط ہے ہر انسان فلسفہ اور نفسیات کا علم فطرتاً رکھتا ہے کیونکہ کوئی انسان بغیر دماغ و نفس
کے پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ ہر انسان کے دماغ و ذہن کی استعداد مختلف ہوتی ہے اور رجحان بھی مختلف ہوتے ہیں چنانچہ آپ روزمرہ مشاہدہ فرماتے رہتے
ہوں گے بعض بچے کوڑھ مغز ہوتے ہیں بعض ذہین اور بعض ایسے ذہین کہ جن کو دیکھ کر حیرت ہو جاتی ہے یہ تو ظاہر ہو گیا کہ ہر شخص فلسفے اور نفسیات
سے فطرتاً شد بد رکھتا ہے بلکہ اکثر اوقات بالکل ان پڑھ اور امی لوگ نہایت عمدہ قسم کے فلسفی بھی ہوتے ہیں اکثر تو ان طلباء پر بھی سبقت لیجاتے
ہیں جنہوں نے فلسفہ کی تحصیل پر کافی روپیہ اور وقت صرف کیا لیکن چونکہ ان میں صلاحیت نہ تھی اس لئے کچھ حاصل نہ کر سکے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر علم نفسیات کی تعلیم باضابطہ کیوں ضروری ہے اس لئے کہ باضابطہ تعلیم سے ایک تو جلا ہو جائے گی دوسرے
باقاعدگی آجائے گی، مشق سے مہارت پیدا ہو جائے گی۔ اکثر فنون کے جاننے والے دو قسم پر مشتمل ہوتے ہیں ایک عطائی دوسرے اکتسابی، عطائی
تو وہ ہوتے ہیں جنہوں نے کسی فن کا خاص رجحان فطرتاً پایا ہے اسی قسم کے ماحول میں کافی وقت گذارا اور چل نکلے ایسے لوگ اپنے کو بھی دھوکے
میں رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی۔ یہ مثل تو آپ نے بارہا سنی ہوگی۔ "نیم حکیم خطرۂ جان، نیم ملا خطرۂ ایمان" بس یہ مثل ایسے ہی لوگوں پر صادق آتی ہے
دوسرے وہ لوگ ہیں جو فطری رجحان خاص رکھتے ہیں اور اس رجحان کے مطابق باقاعدہ اس علم یا فن کا اکتساب کر کے [illegible]

عثمان غنی کردی

بنیادیں مضبوط بھی ہو سکتی ہیں کمزور بھی

اُس انجینیئر کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے جسے کسی عمارت کی تعمیر کی ذمہ داری سونپی جائے اور وہ عمارت کو بنیادوں، دیواروں اور استحکام مہیا کرنے سے پیشتر چھت کا خاکہ تیار کرنے میں مصروف ہو؟

یقیناً کوئی صحیح الدماغ شخص ایسے انجینیئر کو پسند نہیں کرے گا اور نہ ہی اُسے عمارت کے بنانے کا انچارج بنائے گا۔

تجربہ اور مشاہدہ گواہ ہے کہ ہمیشہ کسی عمارت کو اٹھانے سے قبل اس کی بنیادیں کھودی جاتی ہیں اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ بنیادیں جتنی گہری اور مضبوط ہوں اُتنا ہی بہتر ہے۔ چاہے اس میں وقت زیادہ خرچ ہو جائے اور نسبتاً اخراجات بھی زیادہ ہوں، اسی اقدام کو بہر طور خوشی سے گوارا کر لیا جاتا ہے۔

آئیے، اس جامع و ٹھوس حقیقت کی روشنی میں ہم لمحہ بھر کے لئے ان قومی انجینیئروں کا جائزہ لیں جنہیں ہم نے اپنی قومی عمارت کی تعمیر کی ذمہ داری سونپی ہے۔ خیال رہے کہ قومی انجینیئروں سے میری مراد صرف سیاسی انجینیئر ہی نہیں، بلکہ ہر وہ شخص ہے جس کے ہاتھ میں قومی امانت کا ایک حصہ بھی ہے اور جس کی ذمہ داریوں کا تعمیری یا تخریبی اثر براہ راست فرد کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ چاہے وہ ادبی میدان میں کام کرتا ہو، چاہے اقتصادی، معاشرتی، تعلیمی، مذہبی یا عمرانی شعبہ ہائے حیات میں!

فرد کی حیثیت!

یہ امر مسلّمہ ہے کہ قوم مجموعہ ہے افراد کا۔ آپ اور میں مل کر فرد کو قوم کی شکل دیتے ہیں۔ جب آپ بھی تخریبی اعمال میں مصروف ہیں اور میں بھی، تو قوم کیسے تعمیری راہ پر گامزن ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اور اس وقت تک نہیں، جب تک ہم دونوں اپنے خیالات و افکار، اقوال و اعمال میں راست معنی پیدا نہیں کرتے اور اپنے قویٰ کو تعمیری عناصر کی جانب مائل نہیں کر دیتے۔

فرد کا اثر جماعت پر!

انسان بالطبع مدنیت پسند ہے۔ کوئی شخص تنہا اس عالم رنگ و بو میں بسر نہیں کر سکتا۔ زندگی کے ہر موڑ پر آپ میرے محتاج ہیں اور میں آپ کا۔ اس احتیاج کو آپ ہر لمحہ اور ہر لحظہ محسوس کر سکتے ہیں۔ مثلاً آپ اسی بحث کو ہی لے لیجئے کہ آپ کو علم نفسیات سے دلچسپی ہے۔ آپ کی خواہش ہے کہ اس علم کو حاصل کریں اور میرے لئے شمع راہ بنا کر زندگی کی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کریں۔ تاکہ آپ کی زندگی کے تاریک گوشے روشن ہو جائیں اور آپ زندگی کو زیادہ سے زیادہ قریب سے دیکھ کر حالات و واقعات سے براہ راست دوچار ہو جائیں۔ اب آپ کی یہ خواہش جسے ہم ضرورت کہیں گے، جب ہی پوری ہو سکتی ہے کہ اس علم کے حصول کے ذرائع و وسائل کو کام میں لائیں۔ اس شعبۂ علم کے متعلق کتابیں پڑھیں۔ عمدہ

[illegible] مسائل کا مطالعہ کریں اور ہر کسی نے غور کیجئے کہ اس طرح کے اہم ترین پہلو صرف [illegible] کتابیں [illegible] سے [illegible] کیا جاتا ہے [illegible] آپ کی [illegible] ضرورت پیدا ہوتی ہے اس طرح دوسری چیزوں کا بھی [illegible] اور [illegible] کا وجود [illegible] ہے۔

انفرادی کوشش!

جماعتی تعمیر میں انفرادی کوششیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ جب فرد [illegible] اپنی روشنی جیسے اگر اندھیرے میں بھٹک رہے مسافروں کو منزل مقصود کا پتہ دیتی ہے انفرادی سعی جماعتی کشمکش میں سنگ میل کا کام دیتی ہے تاریخ کے اوراق ایسی روشن مثالوں سے مملو ہیں۔ جہاں فرد نے ہر شعبۂ حیات میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ دنیا پکار اٹھی۔ این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

دور کیوں جائیں۔ اپنے ہی گھر میں نظر ڈالئے تو آپ کو انفرادیت کی ایک ایسی تابناک مثال ملے گی کہ آپ کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔ ذرا سوچئے تو سہی۔ اگر قائد اعظم اپنی انفرادی سوجھ بوجھ، سیاسی تدبر، بے پناہ حوصلے اور عزم صمیم کے بل بوتے پر اس برصغیر میں مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ نہ کرتے اور پھر مستقل مخالفتوں، دل شکنیوں اور کمینہ توزیوں کے باوجود اپنے ارادے میں ثابت قدم نہ رہتے۔ تو کیا آج آپ اور میں آزاد پاکستان کے معزز اور آزاد شہری ہونے کی حیثیت سے اپنا سر فخر سے اٹھا کر چل سکتے۔

غلطی کہاں ہے!

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پاکستان جیسی مملکت کے حصول و قیام سے ہم اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے ہیں؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ ابھی قوم نے سیدھی شاہراہ پر چلنا شروع کیا ہے۔ اب تک تو ہم محض پگڈنڈیوں پر چل رہے تھے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ ہماری منزل کہاں ہے اب جب کہ منزل سامنے ہے اور سفر طویل ہے۔ تو لازم ہے کہ ایک سمجھدار مسافر کی طرح تمام غیر ضروریات سے ہٹ کر اپنی نگاہ صرف منزل مقصود پر مرکوز رکھیں اور ہمت و حوصلہ، جرأت و دلیری اور عزم و احتیاط سے کام کرتے ہوئے اپنی منزل کو جا لیں۔

اور یہ سب کچھ تبھی ہو سکتا ہے جب قوم کے لوگ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کا صحیح احساس کریں۔ ذاتی مفاد، خود غرضی اور غفلت شعاری کو چھوڑ کر حرکت و عمل، جد و جہد، بے غرضی اور سخت کوشی کو اپنا شعار بنا لیں۔

اگر ہم موجودہ سوسائٹی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ ہماری قوم کا ایک کثیر حصہ غلط راہ پر گامزن ہے۔ وہ ایسے مشاغل میں منہمک ہے جو عبث اور لایعنی ہیں اور جن کا نتیجہ صفر ہے۔

ذمّہ دار کون ہے؟

ہماری قوم کے سینکڑوں ہونہار نوجوان غلط تربیت کی بدولت حیات کی تیرہ و تار پگڈنڈیوں پر حیران و پریشان گھوم رہے [illegible] زندگی کے ان حسین ولولہ انگیز دنوں کا [illegible] افسوس [illegible] جنہوں نے زندگی کا سفر شروع کرتے وقت [illegible] ہے [illegible] میں [illegible] غفلت [illegible] ہے [illegible] کام کبھی [illegible] نہیں [illegible] باوجود اپنے [illegible] و سائل، علم و تجربے کے اس حقیقت کو [illegible] کے [illegible] کیا کر سکتا ہے؟

مستقل عنوان

بات چیت

فرد فرد کی بات چیت دوسرے لاشعوری طور پر قائم رہتی ہے ___ کچھ کہئے کچھ سنئے ___ کہنے سننے سے جی کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ بات چیت کا یہی مقصد ہے اور بس، دیکھئے ___ کیا ہم آپ کے لئے مفید ہیں؟

لیکن سوالات کرتے وقت اس بات کا خیال رکھئے کہ آپ کے سوالات مبہم نہ ہونے پائیں ___ اگر سوالات آپ کی ذات سے تعلق رکھتے ہوں تو اپنی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ بھی لکھئے تاکہ ہم آپ کا صحیح مفہوم سمجھ سکیں ___ اور آپ کے مسائل کا صحیح نفسیاتی تجزیہ بھی کر سکیں۔ آپ کی یہ مختصر سوانح صیغہ راز میں رہے گی۔ محض سوالات شائع کئے جائیں گے ___!

(ادارہ)

انور جہاں پردیسی لاہور

(۱) میں کسی الجھن میں پھنس کر پہلے تو خود ہی حل تلاش کرتی ہوں۔ اس سے مطمئن نہیں ہوتی۔ تو اپنی عزیز ترین دوستوں سے مشورہ لیتی ہوں۔ لیکن کرتی وہی ہوں جو خود میرا دل گواہی دیتا ہے۔ بتائیے۔ میں پہلے ہی اپنے تلاش کئے ہوئے حل پر عمل درآمد کیوں نہیں کرتی۔ کیونکہ مجھے اپنی سہیلیوں سے شرمندگی ہوتی ہے۔ جب ان کے کہنے پر چلتی نہیں تو مشورہ کیوں کرتی ہوں؟ میرا خیال ہے کہ میں کسی زبردست دماغی بیماری کا شکار ہوں!

پہلے تو آپ یہ یقین کر لیں کہ آپ کسی بیماری کا شکار نہیں ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب بھی کوئی الجھن آپ کو درپیش آتی ہے تو آپ اپنی عقل پر زور دیتی ہیں اور حل تلاش کرنے تک کشمکش میں مبتلا رہتی ہیں۔ آپ کا فیصلہ اٹل نہیں ہوتا۔ آپ ”اگر ایسا ہوا؟ اگر ویسا ہوا؟“ کے دوراہے پر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ کوئی ایک راہ اختیار کرنے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ دو متضاد قوتیں اپنے اپنے تقاضوں کی تکمیل چاہتی ہیں۔ مثلاً آپ کی دلی خواہشیں کچھ چاہتی ہیں اور اخلاقی قدریں کچھ اور۔ آپ سوچتی ضرور ہیں کہ آپ نے ایک حل تلاش کر لیا ہے مگر دل کی گہرائیوں میں کوئی کہتا ہے کہ نہیں یہ فیصلہ غلط ہے تو آپ اس کشمکش کو ہٹانے کے لئے اپنی عزیز ترین سہیلیوں سے مشورہ کرتی ہیں۔ کم از کم سوچتی ضرور ہیں کہ آپ مشورہ کر رہی ہیں۔ حالانکہ یہ مشورہ نہیں کہا جا سکتا۔ دل کی وہی آواز کہتی ہے کہ آپ ان مشوروں پر عمل نہیں کریں گی۔ یہ مشورہ ہوا بلکہ کشمکش کا بوجھ ہلکا کرنا ہوا مگر یہ تھی آزادی الجھن کا حل پیش نہیں کرتی۔ ان متضاد قوتوں میں جو آپ پر حاوی ہو جاتی ہے۔ آپ وہی کرتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ آپ نے وہی کیا ہے جو آپ کے دل نے گواہی دی اور پھر اپنی سہیلیوں سے شرمندہ ہوتی ہیں۔

ہم آپ کو مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں کہ آپ الجھنیں کے سامنے سپر نہ ڈالئے اور جذبات کی رو میں کوئی ایسا فیصلہ نہ کر لیجئے جو اٹل نہ ہو اور جس پر آپ کو خود اطمینان نہ ہو۔ حقیقت پسندی سے کام لے کر عقل کی روشنی میں سلجھائیے۔ یہی آپ کے لئے بہتر ہے۔

(۲) میرا تجربہ بتاتا ہے کہ جب دائیں آنکھ پھڑکتی ہے۔ تو کوئی مصیبت آتی ہے یا بری خبر سنتی ہوں اور جب بائیں پھڑکتی ہے

تو خوشی ہوتی ہے اور خوش خبری سنتی ہوں۔

ایسے توہمات اور بے بنیاد یقین ہماری روزمرہ زندگی میں قدم قدم پر ملتے ہیں۔ مثلاً گھر سے نکلے۔ اگر مہشتی سامنے آگیا۔ مشک بھری ہوئی تو کام بن جاتا ہے۔ ورنہ نہیں۔ یا بلی راستہ کاٹ جائے۔

سوال یہ ہے کہ ان کا ہمارے اعتقادات کے ساتھ اتنا گہرا تعلق کیوں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے لئے ایک مثال لینا ہوگی۔

ایک ماں اپنے بچہ کو دودھ پلاتے وقت گنگناتی جاتی ہے۔ وہ ایسا روزانہ کرتی ہے اور عرصہ تک ایسا کرتی رہتی ہے۔ بچے کے لئے دودھ اور اس گنگناہٹ میں ایک تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم بن جاتے ہیں۔ ماں دودھ پلانے کے علاوہ جب کسی اور وقت گنگناتی ہے تو بچہ کو دودھ یاد آجاتا ہے۔ اور بھوک لگ آتی ہے۔

یہی ان توہمات کا بھی حال ہے۔ مثلاً آپ نے اپنے خط میں آنکھ پھڑکنے اور غم انگیز واقعات کا جو تعلق بتایا ہے۔ ان کو لے لیجئے۔ جب آپ کو یقین ہو چکا کہ دائیں آنکھ پھڑکنے سے مصیبت آتی ہے تو ناساعد حالات میں آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی آنکھ پھڑک رہی ہے اس مصیبت اور آنکھ کے پھڑکنے میں کوئی تعلق نہیں۔ مگر ہے۔ آپ نے پیدا کر دی ہے۔ کیونکہ آپ کے تجربات نے ان تلخیوں اور شیرینیوں کو آپ کے لاشعور میں محفوظ کر دیا ہے۔ جب کبھی ایسی چیزیں درپیش آتی ہیں جن کا تعلق پچھلی یادوں سے ہوتا ہے۔ تو آپ انجانے طور پر غم یا خوشی کی توقع کرنے لگتی ہیں۔

حسن علی جیلانی راولپنڈی

(۱) اگر ماحول میں کانٹے بھرے ہوں اور قدم قدم پر ان کے چبھنے کا ڈر ہو تو انسان کیونکر خوش رہ سکتا ہے؟

ماحول انسان کی راہ میں کانٹے بکھیرنے اور پھول بچھانے کا ضرور ذمہ دار ہے۔ اسی لئے جن لوگوں کو کوئی خاص ماحول راس نہیں آتا۔ وہ اس کو بدل دیتے ہیں اور دوسرا ماحول اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر اسی ماحول میں رہنے بسنے پر مجبور رہتے ہیں تو ماحول پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اسی ماحول سے کانٹے نکال کر پھول بچھا دیتے ہیں۔ ایسی مثالیں موجود ہیں۔ جب کہ ماحول سے بغاوت کی گئی ہے۔ ماحول کو بہتر بنایا گیا ہے۔ ہم آپ سب ہی اپنی قوتوں کو، اُن قوتوں کو جن سے ہم بے خبر رہتے ہیں۔ کام میں لے کر اپنے لئے کانٹوں کے درمیان بھی گلشن بنا سکتے ہیں۔

آپ اپنی موجودہ پریشانیوں کی ذمہ داری ماحول پر رکھ کر بری الذمہ رہیے۔ خوشی حاصل کرنے کے لئے چند صلاحیتوں کی ضرورت ہے (جن پر ہم اکثر روشنی ڈالتے رہتے ہیں) ان صلاحیتوں کو پیدا کر کے نئی زندگی شروع کیجئے۔

(۲) سوچتا ہوں کہ کسی عزیز کی موت کی خبر سن کر لوگ رو دیتے ہیں۔ وہ سراسر حماقت کرتے ہیں۔ بھلا رونے سے جانے والا واپس آ سکتا ہے؟

یہ سچ ہے کہ رونے سے مرنے والا واپس نہیں آتا۔ مگر یہ آپ بھولے رہتے ہیں کہ ہر عزیز شے کے ٹوٹنے۔ لُٹنے۔ بچھڑنے کا غم ہوتا ہے مثلاً ایک بچہ اپنے کھلونے کے ٹوٹنے پر رو دیتا ہے۔ آپ اپنے خوابوں کی اُلٹی تعبیر پر رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ یہ غیر متوقع بات یہ جدائی دل پر ایک بوجھ بن جاتی ہے۔ رونے سے اس بوجھ میں ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ رونا اپنے دکھوں کا اظہار کرتا ہے اور سننے والوں کو رازدار بناتا ہے۔ رازداری سے ایک تسکین محسوس ہوتی ہے اور اظہار سے گرانی دل میں کمی آجاتی ہے اور رازدار بنا کر دل کے بوجھ کو ہلکا کرنا حماقت نہیں۔ عقلمندی ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ انتہائی غم کی حالت میں آنکھوں میں آنسوؤں کے سوتے تک خشک ہو جاتے ہیں اور احساس غم اتنا بڑھتا ہے کہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے۔ اُسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ کچھ سنائی نہیں دیتا۔ غم کے علاوہ ہر حقیقت بے حقیقت بن جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر ڈاکٹر مریض کو رونے پر مجبور کر دیتے ہیں تاکہ احساس غم آنسوؤں کے سہارے کم ہو جائے

غم تو غم ہے کیا آپ نے خوشی کے عالم میں آنسو بہتے نہیں دیکھے ؟

شبیر احمد لکھنو

مجھ میں کوئی خاص صلاحیت نہیں ہے۔ اس کا مجھے احساس ہے۔ اگر میں احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں تو اور کیا کروں ؟

ہم آپ کے اس فیصلہ کو کہ "مجھ میں کوئی خاص صلاحیت نہیں ہے" سے متفق نہیں ہیں۔ کوئی نہ کوئی صلاحیت اور اہلیت ہر ایک میں ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کو اس صلاحیت کے بل بوتے پر اپنے ہم جلیسوں کی سطح سے بلند ہو کر زندگی کی راہ میں ان گنت کامیابیوں کو اپنا لیتا ہے۔ وہ دوسروں کے نزدیک اور خود اپنے نزدیک "خداداد صلاحیت" کا مالک بن جاتا ہے اور جس کو موقعہ نہیں ملتا اس کی وہی صلاحیت اندر ہی اندر گھٹ کر دم توڑ دیتی ہے۔ وہ بددل ہو کر احساس ناکامی پیدا کر لیتا ہے اور سوچتا ہے کہ ماحول تو زرخیز ہے۔ مگر اس میں وہ صلاحیت موجود نہیں جو بار آور ہو سکے۔ اس کی ناکامی کی اصل وجہ خارجی ماحول کا موافق نہ ہونا اور صحیح مواقع کی عدم موجودگی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض انسان پیدائشی طور پر کسی خاص وصف کے حامل ہوتے ہیں۔ کوئی بچپن ہی سے موسیقی کی طرف راغب ہے، کوئی مصوری کی طرف رجوع۔ اگر ایسے انسان اپنے فطری میلانات سے انحراف کر کے ان منزلوں میں کامیاب ہونا چاہیں جن کے لئے ان میں فطری لگاؤ نہیں۔ تو ظاہر ہے کامیابی، خاطر خواہ کامیابی ممکن نہیں ہے۔ ایک اچھا گانے والا اچھا مصور نہیں بن سکتا۔ اس ناکامی کی وجہ اس کے پیدائشی رجحانات ہیں، اکتسابی کامیابی یا ماحولی موافقت نہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ بعض لوگ چند علامتوں کو دیکھ کر اپنی شخصیت کا غلط اندازہ لگاتے ہیں اور چند کوتاہیوں کی وجہ سے اپنے آپ کو "اخلاقی اچھوت" سمجھنے لگتے ہیں۔ اس احساس کمتری کی وجہ یہ ہے کہ ہم محض عقیدتاً بہت سی باتیں اور خوبیاں دوسروں سے وابستہ کر دیتے ہیں اور فیصلہ ہمیشہ ان کے حق میں کرتے ہیں۔ ہم اپنی صلاحیتوں کو کم کر کے خود اپنی ذلت کا باعث بنتے ہیں اور دوسروں کو خواہ مخواہ چڑھا کر بلند مقام پر بٹھا دیتے ہیں اور ان کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔

اگر آپ کی احساس کمتری کی وجہ ہماری بیان کی ہوئی وجوہ میں سے

نمبر ایک ہے تو آپ کو چاہئے کہ خارجی ماحول سے مطابقت پیدا کیجئے تاکہ آپ کو بھی وہ مواقع مل جائیں جن میں آپ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں اور دوسروں کے ساتھ اپنے آپ کو بھی یقین دلا سکیں کہ آپ بھی وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ جو دوسرے ان حالات اور اس ماحول میں کر گئے۔

اگر نمبر ۲ ہے۔ تو آپ کو چاہئے کہ اگر آپ فطرتاً کسی وصف سے محروم ہیں تو کوشش کر کے اس وصف کو اپنا لیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہے کہ ہماری یہ کوشش ہم میں وہ صلاحیت نہیں پیدا کر سکے گی جو ان لوگوں کو حاصل ہے۔ جو پیدائش کے ساتھ ہی اس میلان کو لائے ہیں۔ پھر بھی ہم بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں اور

اگر نمبر تین ہے۔ تو آپ کو چاہئے کہ محض عقیدتاً دوسروں کے اوصاف کو بڑھا چڑھا کر نہ دیکھیں اور اپنے آپ کو ذلیل نہ سمجھیں۔ یہ گمراہ کن عقیدت مندی ہماری اپنی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ اس سے تو چھٹکارا حاصل کرنا ہی ہوگا۔ تاکہ ہم اپنے آپ کو "برائیوں کا گھر" اور دوسروں کو "اچھائیوں کا فرشتہ" سمجھنا چھوڑ دیں۔

نرگس آرا کراچی

(۱) میں بچپن سے اندھیرے میں جانے سے گھبراتی ہوں۔ رات کو سوتے وقت بھی بجلی جلائے رکھتی ہوں میری یہ عادت دوسروں کی تکلیف کا باعث بنتی جا رہی ہے۔ کیا کروں ؟

اندھیرے میں جانے کا خوف فطری نہیں ہے۔ بلکہ آپ کے والدین کی غلط تربیت کا نتیجہ ہے۔ بچپن میں بچہ اندھیرے سے نہیں ڈرتا بلکہ تنہائی اور اپنی ماں کی دوری سے ڈرتا ہے۔ اندھیرے میں اُسے اپنی ماں دکھائی نہیں دیتی۔ اسی لئے اگر وہ اندھیرے میں اپنی ماں کو محسوس کرے تو اس کا یہ ڈر ختم ہو جاتا ہے جب ہی تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر آپ بچے سے باتیں کرتی رہیں اور اُسے اندھیرے میں بھیج دیا وہ آپ کی آواز کی قربت کے سہارے اندھیرے میں نہیں ڈرے گا۔ آپ کے والدین نے بچپن ہی میں آپ کی اس عادت کو نہیں چھڑایا اور اب یہ خوف آپ پر طاری ہو گیا ہے۔ آپ ذرا حقیقت پسندی سے کام لیجئے۔ جس کمرہ میں روشنی کی عدم موجودگی میں آپ جانے سے گھبراتی ہیں، اسی کمرے میں آپ ان دن کی روشنی یا رات کو روشنی کے ساتھ جانے سے نہیں گھبراتیں۔ حالانکہ جگہ وہی ہے کمرے کا سامان وہی ہے۔ شروع شروع میں آپ کا دل اندھیرے میں جانے سے دھڑکے گا۔ مگر پھر یہ خوف بتدریج کم ہوتا جائے گا۔

(۲) مجھے بیک وقت اتنی پریشانیاں گھیر لیتی ہیں کہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے رات دن کیسے گذاروں؟

آپ اپنی پریشانیوں کا تجزیہ کر کے ان کو الگ الگ کر لیجئے۔ وہ ایک دوسرے میں خلط ملط نہ ہونے پائیں۔ پھر ہر الجھن کی الگ الگ وجوہ معلوم کیجئے اور پھر فرداً فرداً ان کو حل کرنے کی کوشش کیجئے۔

ہر الجھن کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ خواہ آپ بادی النظر میں اس وجہ کو معلوم نہ کر پائیں کیونکہ کچھ باتیں ایسی ہیں جن کو ہم پسند نہیں کرتے۔ ان کی یاد میں تلخیاں بھری ہوتی ہیں۔ ایسی باتیں۔ ایسی یادیں ہمارے ذہن کے ایک مخصوص حصہ میں دفن ہو جاتی ہیں۔ ذہن کا وہ حصہ جو خوشگوار واقعات کا مدفن بنتا ہے۔ وہ تو ہمارے سامنے رہتا ہے اور اول الذکر حصہ پس پردہ۔ ہمارا ضمیر یا سپر ایگو ان کو دبانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ ان دونوں کی باہمی کش مکش ہماری پریشانی کا باعث بنتا ہے۔

جب آپ ہر پریشانی کی وجہ معلوم کر لیں گی۔ تو ان کا حل خود بخود آپ کے سامنے آ جائے گا اور اگر یونہی ان واقعات کے سمندر میں تنکا بنی رہیں تو پھر صبح ذہنی الجھنوں کے تھپیڑوں سے نکل نہ سکے گی اور آپ کے رات دن یونہی کوفت میں گذرتے رہیں گے۔

حمید صادق۔ دہلی

(۱) ہر دل عزیز بننے کے راز کیا ہیں؟

(۱) اپنے حلقہ احباب میں ان لوگوں کے طور طریق کو بہ نظر غائر دیکھئے۔ جو آپ کو پسند ہیں اور دوسروں کو پسند ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ جس محفل میں جاتے ہیں ان کا خیر مقدم ہوتا ہے۔ ان کی باتوں کی ایسی ہی قدر ہوتی ہے جیسے پھولوں کی۔ ایسے ہی طور طریق اپنی شخصیت میں بھی پیدا کیجئے۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھئے گا کہ کہیں آپ بندروں کی طرح نقالی پر نہ اُتر آئیں۔ طور طریق اپنانے کے لئے بڑی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ آپ کی ہستی کا ایک جزو بن جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کو لوگ ان طور طریق سے علیحدہ کر کے اصلی روپ میں دیکھ لیں۔

(۲) اپنی [illegible] کو بدلنے کی کوشش کیجئے۔ وہ برائیاں جو دوسروں کو ناپسند ہوں۔ یہ بہت معمولی معمولی باتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ مثلاً باتیں کرتے وقت آپ کے چہرے پر ایک مخصوص طنز یا تضحیک کے انداز، ناک سے باتیں کرنے کی عادت، دوسروں کی باتیں نہ سننے کی عادت بھی وغیرہ وغیرہ۔ ان برائیوں کو حقیقت پسندانہ روشنی میں دیکھئے اور ان کو دور کرنے کی کوشش کیجئے۔

(۳) ہر دل عزیز بننے کے یہ دو بہت بڑے اور موثر طریقے ہیں۔ مگر پھر بھی آپ کو کچھ لوگ ایسے ملیں گے جو انفرادی اختلافات کی وجہ سے آپ کو ناپسند کریں گے اس ناپسندیدگی کی شدت کو کم کرنے کے لئے

(۱) [illegible] کرنے سے بچئے اور اگر حالات بحث کے بھنور میں پھنسا دیں تو اپنے فریق کو یہ محسوس کرنے نہ دیجئے کہ آپ

اس کو جاہل، کم علم اور غیر منطقی سمجھتے ہیں۔ اپنے اختلافات کا اظہار ضرور کیجئے۔ مگر ان پر توجہ دیجئے۔ اس کے اچھے نکات کا اعتراف کیجئے۔ غلط نکات کو اس طرح رد نہ کیجئے کہ اس کی شخصیت پر کوئی آنچ آئے۔

(۲) دوستوں کی محفل میں اپنے سے زیادہ اپنے دوستوں کی باتوں میں دلچسپی لیجئے۔ ہر وقت اپنی ہی رام کہانی نہ سنانے جایئے۔ ان کی تکلیفوں پر ہمدردی ظاہر کیجئے ورنہ جیسے وہ آپ ہی پر گندے ہی ہیں اور ہر وقت ''میں تو یہ کہتا ہوں۔ میرا اپنا خیال ہے۔ میں چاہتا ہوں'' جیسے جملوں سے احتراز کیجئے۔ اس میں آپ کی انانیت بہت نمایاں ہو جاتی ہے۔ جو دوستوں کے بدلے ان کی شخصیت کو ٹھیس پہنچا سکتی ہے۔

(۳) میں غصے کے معاملہ میں بڑا جذباتی واقع ہوا تھا۔ یا تو آتا ہی نہ تھا اگر آتا تھا تو اپنی منتہا پر پہنچا ہوا۔ مگر اب میں نے ان پر قابو حاصل کرنے کے لئے یہ ترکیب اختیار کی ہے کہ اگر چھوٹوں پر غصہ آتا ہے تو ان کو نادان، نا سمجھ سمجھ کر معاف کر دیتا ہوں اور اگر بڑوں پر غصہ آتا ہے، تو بزرگی کی پاسداری میں خاموش ہو رہتا ہوں۔ اس ترکیب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

آپ نے اپنے جذبات پر قابو حاصل کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ کافی سنجیدہ اور مصلحانہ ہے۔ مگر ہم آپ کو کچھ مزید مشورے دینا چاہتے ہیں غصہ کی حالت میں یا کسی جذباتی حالت میں ہمارے جسم میں اندر ہی اندر کچھ تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً انتہائی غصہ کی حالت میں آپ میں اتنی قوت آجاتی ہے کہ آپ بھاری سی بھاری چیزوں کو اٹھا کر پھینک دیتے ہیں جو عام حالتوں میں ممکن نہ تھا۔ یا اس حالت میں آپ اپنے طاقتور حریف کو زیر کرنے کی قوت بھی محسوس کرتے ہیں۔ غصہ کی حالت میں ہمارے کچھ غدود اپنی رطوبت خون میں ملا دیتے ہیں جس سے ہمارے ذہن میں ایک تناؤ، ایک ہیجان سا پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تناؤ اور ہیجان کی حالت صحت کے لئے مضر ہے۔ اس لئے غصہ کو دبا دینا محض مفید نہیں۔ آپ کو اس ہیجان کو ختم کرنا ہے۔ اس لئے غصہ کو دباتے ہی اپنے کو کسی دوسرے کام میں لگا دیں۔ تاکہ وہ تناؤ ختم ہونے کا ایک راستہ اختیار کرے۔ اس طرح آپ غصہ کو بھی ختم کر دیں گے اور اپنی صحت بھی برباد نہ کریں گے۔

(۴) خواب اور تعبیر خواب پر کچھ روشنی ڈالیں۔ میں نے اکثر مستقبل کے ہونے والے واقعات خواب میں دیکھے ہیں۔ وہ بالکل صحیح بھی ثابت ہوئے ہیں۔

خواب ہمارے ذہن کی پیداوار ہیں۔ ان کا خارجی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ جاگتی حالت میں وہ خیالات جو سوتی حالت میں خواب بنتے ہیں، حقیقی شکلیں اختیار نہیں کرتے۔ کیونکہ شعور ان کا احتساب کرنے کے لئے موجود ہوتا ہے۔ سوتی حالت میں شعور کا اختیار ختم ہو جاتا ہے۔ لاشعور میں دبے ہوئے خیالات، شرمناک خواہشات آزاد ہو جاتی ہیں اور شکلوں کا روپ دھار کر لبھاتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ خواب کس حد تک مستقبل کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ ہم گذشتہ واقعات یا موجودہ حالات کی روشنی میں کچھ نتائج اخذ کرتے ہیں۔ یہی نتائج خواب میں ظاہر ہوتے ہیں اور جب آنے والا کل ان کی صداقت کا ثبوت دیتا ہے۔ تو ہم حیران رہ جاتے ہیں۔ حالات اور واقعات کا تجزیہ جتنا کامل ہوگا۔ اتنا ہی نتیجہ صحیح ہوگا اور خواب پیشین گوئی کر سکیں گے۔

عزیز النساء ملتان

میری الجھنیں طویل ضرور ہیں مگر ان کو بیان کئے بغیر آپ میری راہبری نہ کر سکیں گے۔ اس لئے مختصراً عرض ہے۔

(۱) میری ماں سوتیلی ہے وہ میرے حقوق کو پامال کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔

(۲) میں جس سے شادی کرنا چاہتی ہوں میری سوتیلی ماں اس سے میری سوتیلی بہن کی شادی کرنا چاہتی ہے۔

(۳) میرے والد مجھے چاہتے ضرور ہیں۔ مگر وہ میری سوتیلی ماں کو ناراض کرنا بھی نہیں چاہتے۔ اسی لئے وہ میری سوتیلی

بہن کی شادی میرے منگیتر سے کرنے پر راضی تو نہیں ہوتے، مگر میرے معاملے میں بھی خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں۔
(۳) میری سوتیلی ماں نے میرے منگیتر کو جانے کیا سمجھا دیا ہے کہ اس میں بھی پہلے جیسی التفات نہیں پاتی۔
میں کیا کروں میری زندگی اور موت کا سوال ہے؟

ادارہ کو آپ سے ہمدردی ہے مگر ہم ہمیشہ یہی تعلیم دیتے رہے ہیں کہ جذبات سے زیادہ حقیقت پسندی سے کام لیجئے۔ آپ نے شروع میں اپنی نئی ماں سے سوتیلے پن کے برتاؤ کی امید کی ہوگی۔ اس لئے آپ ہمیشہ ان سے دور رہیں۔ جب ان کی اپنی لڑکی پیدا ہو گئی تو وہ ذرا سی قربت یا لگاؤ جو وہ آپ کی طرف سے محسوس کرتی تھیں ختم ہو گئی۔ ایک ماں کے لئے اس کی اپنی بیٹی ہی سب سے بڑی حقیقت ہوتی ہے۔ وہ اپنی لڑکی کو آپ پر ترجیح دیتی ہیں۔ آپ کا منگیتر اچھا لڑکا ہوگا اور وہ آپ سے کوئی غیر معمولی لگاؤ نہ محسوس کرتا ہو گا جب ہی وہ آپ کی سوتیلی ماں کی باتوں میں آ کر آپ سے بے التفاتیاں برتنے لگا۔ اگر وہ صرف آپ ہی کو اپنی رفیقہ حیات بنانے کے لئے پوری طرح منتخب کر چکا ہوتا۔ تو کبھی اس کے قدم نہ ڈگمگاتے۔

آپ تمام باتوں کی ذمہ داری اپنی سوتیلی ماں ہی پر نہ رکھئے اور واقعات کا انتظار کیجئے۔ اگر آپ کی سوتیلی بہن کی شادی آپ کے منگیتر سے ہوتی ہے اور وہ دونوں خوش رہتے ہیں تو سمجھئے کہ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا اور اپنے لئے کسی دوسرے کو انتخاب کر لیجئے کیونکہ اُنس یک طرفہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ یہ بات تکلیف دہ ضرور ہے مگر ہے حقیقی۔

اگر آپ اتنے تلخ امکانات کا انتظار نہیں کر سکتیں۔ تو اپنے والد صاحب سے زبان بندی کی فرسودہ روایات کو ختم کر کے اپنے مستقبل کے بارے میں گفتگو کیجئے اور فیصلہ ان پر چھوڑ دیجئے اور اسے موت و زندگی کا سوال نہ سمجھئے۔ کیونکہ آپ کے خط کے دوسرے واقعات سے ہم نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ اپنے منگیتر کی بے التفاتیوں پر آزردہ کم ہیں۔ اپنی سوتیلی ماں اور سوتیلی بہن کے اقدامات پر زیادہ رنجیدہ ہیں۔ گویا آپ کی خواہش ہی ان دونوں کی ضد کے بھروسے پر پرورش پا رہی ہے۔ ہم اپنی صاف گوئی پر معذرت چاہتے ہیں۔

ایک خریدار۔ لاہور

(۱) میں اپنے ہر کام میں پوری کوشش کرنے کے باوجود بھی ناکام ہی رہتا ہوں۔

ادارہ پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ آپ پوری کوشش نہیں کرتے اور صحیح کوشش نہیں کرتے۔ فضول ہاتھ پیر مارنے سے کیا فائدہ۔ جب کہ آپ کو معلوم ہی نہ ہو کہ ڈوبتے کو کس طرح ہاتھ پیر مارنا چاہئے۔ کہ وہ تیرے اور ساحل سے جا لگے۔

آپ اپنی جدوجہد میں اعتماد پیدا کیجئے۔ کام کے ہر پہلو پر غور کیجئے۔ راہوں کا انتخاب کیجئے جو آپ کو صحیح نتائج پر لے جائیں اور اس خیال کو دل سے نکال دیجئے۔ کہ آپ کی کوششوں کے باوجود آپ کا کام نہیں ہوگا۔

(۲) داخلی اور خارجی شخصیت کی اصطلاح پر روشنی ڈالئے۔

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں، جو اپنے اندر ہی اندر تمام فیصلے کرتی ہیں اور تمام تر دلچسپی کے مرکز اپنی ہی ہستی کو بنا دیتی ہیں۔ ایسی شخصیتیں خارجی عناصر سے ٹکراتی نہیں اگر کبھی ٹکراتی ہیں تو اس کی ساری ذمہ داری اپنی ہی ذات پر رکھتی ہیں۔ یہ تنہائی پسند تخلیقی اور روحانی ہوتی ہیں۔

خارجی شخصیت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے۔ جو خارجی ماحول سے مطابقت حاصل کرنا چاہتے ہیں اپنے کو زیادہ سے زیادہ سماجی کاموں میں لگاتے ہیں، جلسوں، محفلوں میں پیش پیش رہتے ہیں۔ یہ زیادہ حقیقت پرست اور خوش باش رہتے ہیں۔ اگر کسی سے لڑتے ہیں تو جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے لئے مکا بازی سے بھی نہیں چوکتے۔ لیکن جتنی جلدی وہ مشتعل ہوتے ہیں اتنے ہی جلدی سرد پڑ جاتے ہیں اور تلخیوں کو بھی بھول جاتے ہیں۔

خلیل احمد ایم اے
سید [illegible] کراچی

تعمیری نفسیات

اس دنیا میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک نفسیات صرف ایک ایسے آئینہ سے مشابہ ہے جس میں وہ اپنا صحیح عکس دیکھ سکتے ہیں اور بس۔ ان کا خیال ہے کہ خود کو پہچان کر بہتر اور صالح زندگی کو حاصل کرنے کا یقین رکھنا محض ایک خیال خام، ایک وہم ہے!

اس قسم کے خیالات عام طور پر ایسے تکلیف دہ بیان کے مرادف ہوتے ہیں جس کے باعث علم النفس کو ایک ایسی شے قرار دی جاتی ہے جو کبھی درماں ثابت ہوتی ہے اور کبھی محض ذریعہ تسکین۔ اگر یہ حقیقت ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ موجودہ سائنس کی حیثیت بھی وہی ہوئی جو اسپرین کی گولیوں کی یا شراب کی ہو سکتی ہے۔ بالفاظ دیگر اس کے باعث درد کا درماں ہو سکتا ہے یا اس میکانکی دوا کے بے کیف تسلسل کو کچھ دیر کے لئے فراموش کیا جا سکتا ہے۔

لیکن ان تصورات کے باوجود وہی لوگ طبی، اور معاشرتی خرابیوں پر سنجیدگی سے غور کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ گو کہ یہ خرابیاں صرف علم النفس کے ذریعہ ہی دور ہو سکتی ہیں مگر اس کے باوجود وہ علم النفس کی قدر و قیمت اور اہمیت کو تسلیم کرنا نہیں چاہتے۔ وہ اس عملی اور منظم نظریہ کو نہیں سمجھتے جو انکی شخصیتوں کو بہتر سے بہتر بنانا اور ان کو اُجاگر کرنا چاہتا ہے۔ علم النفس صرف کسی بوڑھے اور کمزور کا ہی سہارا نہیں بلکہ وہ طاقتور اور بہادر کا ہتھیار بھی ہے۔ وہ ایک سہارا بھی ہے لیکن صرف اسی وقت تک کہ جب تک مریض اپنی پوری قوت حاصل نہ کر لے۔ اس کے مدّنظر تو ہمیشہ ایک بہتر، توانا اور صالح زندگی کا تصور ہوتا ہے۔ جو مردوں، عورتوں ——— بلکہ تمام بنی نوع کیلئے ضروری اور ناگزیر ہے۔ علم النفس صرف ہماری بوسیدہ زندگی پر پیوند زنی نہیں کرتا۔ بلکہ وہ ہمیں ایک نئی پوشاک عطا کرتا ہے۔ ایک نئی زندگی کے لئے جد و جہد پر اُکساتا ہے۔

ہماری رائے میں نفسیات طبی کو زیادہ اہمیت دینا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علم النفس صرف جسمانی امراض کے علاج کرنے کی حد تک فائدہ مند ہے۔ اسی طرح نفسیات کے خالص سائنسی شعبہ کو غیر معمولی اہمیت دینا بھی صحیح نہ ہوگا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس کی گزرگاہ محل گاہوں تک ہی ہے۔ حالانکہ حقیقتاً نفسیات کا سائنسی شعبہ اس وقت تک اہم متصور نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ زندگی کو بہتر بنانے کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔

اس نقطۂ خیال کے لوگوں کی آراء قابل ذکر قرار نہیں دی جا سکتی اگر وہ اپنے رویّہ سے یہ ظاہر نہ کریں۔ کہ انسانی زندگی ماحول کی پکار سے مجبور ہو کر نہ صرف ایک پیچیدہ مگر از خود چلنے والی مشین کی طرح کام کرتی ہے بلکہ وقت کے ہر تقاضہ اور ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ایک ایسی مشین کے فرائض انجام دیتی ہے جس کا ہر حصۂ جسم حرکت کرتا ہے اور جس کا ذہن اپنی قوت سے اسے چلاتا ہے

ہر وہ نقطۂ نظر جو زندگی کے اصولوں کی توڑ مروڑ کرتا ہے۔ صحیح نقطۂ نظر نہیں ہو سکتا۔ انسان ہر وقت کام کرنیوالی مشین ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایسا پودہ ہے۔ جس میں بڑھنے اور نشو و نما پانے کی غیر محدود صلاحیت ہی ہے اور ہمیشہ ایک ہی ڈگر پر چلنے والی مشین میں اور ایک پودے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ زندگی کا پودا نہ صرف بڑھتا اور نشو و نما پاتا ہے بلکہ وہ نئی شاخیں اور نئے برگ

بار بھی پیدا کرکے زندگی کے مکمل تصور کی طرف تخلیقی حیثیت میں بڑھتا ہے۔

ماہنامہ سیکولوجی انسان کی قوت تخلیق پر زیادہ اعتقاد رکھتا ہے۔ کیوں انسان ایک ایسی پیچیدہ مشین سے یا محل گاہ سے زائد کچھ اور ہے۔ جو انسان کو زندگی کیلئے صرف سرچشمۂ قوت ہی متصور کرتی ہے اور جس میں بڑھنے، بدلنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت ہے عملی طور پر علم النفس ہمیں صرف یہی نہیں بتاتا کہ ہم اپنے آپ کو کس طرح شناخت کریں اور زندگی کا کونسا راستہ اختیار کریں اور نہ وہ صرف مذہبی تصورات پر قناعت کرکے انسانوں کو قسمت کے بھروسے پر موجودہ صورت حال اختیار کرنے کی رائے دیتا ہے بلکہ وہ پورے وثوق کے ساتھ انسان کو پیغام سناتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو "آدم نو" بنا سکتا ہے، وہ خود "تقدیر یزداں" بنکر دنیا کی تمام تخلیقی قوت حاصل کر سکتا ہے

لیکن اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟ کیا صرف یہی کہ ہم اپنی موجودہ صورت حال کو قبول نہیں کرینگے۔ اپنے نقائص کو جان سکیں گے یہ سمجھیں گے کہ قدرت نے جو صلاحیتیں ہمیں دی ہیں ہم انہیں برباد کر رہے ہیں۔ یہ محسوس کرینگے کہ ماحول کے تمام نقائص ہم قبول کر چکے ہیں۔ غلط تعلیم، غلط ماحول اور کمزوری کردار پر کف افسوس ملتے رہیں گے؟ انہیں صرف اتنا ہی نہیں بلکہ علم النفس ان تمام خامیوں کو محسوس کر لینے کے بعد اپنی تمام خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کی راہیں بھی بتلا سکتا۔

علم النفس احیاء زندگی کا قائل ہے۔ وہ زندگی کے بوسیدہ خول کو اتار پھینکتا ہے اور خزانہ حیات کی منور روشنی سے مالامال کر دیتا ہے۔

اپنی ذاتی اور اندرونی قوت وصلاحیت کو جاننا ہی سب سے بڑی خامی ہے۔ ہمارے کارناموں کی کوئی حد نہیں رہ سکتی۔ ہم اپنی تخلیقی قوت کے طاقتور بازوؤں پر بیٹھکر عرش کی خبر لانے کا حوصلہ کر سکتے ہیں جس کے باعث اس دنیا کا، اس کائنات کا وجود ہوا۔

آزادیٔ انسان

کیا آپ محسوس کر رہے ہیں کہ یہ پیغام موجودہ پود کے لئے کتنا ضروری ہے؟ الجھی ہوئی، بے راہ رو اور پریشان حال انسانیت کے لئے کتنا صحیح اور ٹھوس مشورہ ہے یہ! کیونکہ ماحول قید و بند سے آزادی حاصل کرنے کی تمام سست اور تکلیف دہ کوششوں کے باوجود انسان اب تک اپنے نفس کی قید میں مبتلا ہے۔ اپنے بیرونی دشمنوں پر تو فتح حاصل کر چکا ہے۔ اب اگر انسانیت کے خاتمہ کا کوئی خطرہ ہے تو وہ بیرونی نہیں بلکہ خود اس کی اپنی ذات کے اندر موجود ہے۔

بیسویں صدی کے الم انگیز لمحات کی وجہ انسانی شخصیت کی اپنی خامیاں ہیں جس کا نتیجہ سب سے دشمن ---- جنگ ---- کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور جنگ کا خطرہ اور ماضی کی طرح معاشی بدحالی کی وجہ سے نہیں بلکہ دور حاضر کی نفسیاتی خامیوں کے باعث پیدا ہو رہا ہے۔ معاشرہ کو آجکل اتنا زیادہ خطرہ قحط سالی، وباؤں اور معاشی بدحالی کے باعث لاحق نہیں ہے۔ جتنا کہ انسان کے اندرونی طوفانی عناصر کے باعث ہے۔ اس لئے کہ ایسے انسانوں کی اکثریت جو معاشرہ بناتے ہیں۔ اب تک اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکے اور وہ غیر شعوری طور پر اس فضا کو ختم کرنے کی طرف مائل ہیں۔ جو انہیں بہتر اور توانا زندگی کیلئے میدان فراہم کر سکتی ہے

بالفاظ دیگر انسان کی ذہانت، اس کا انتظام اور خود کو سمجھنے کی اس کی اپنی صلاحیت اس کی میکانکی اور سائنسی ترقی کے ہمرکاب نہ رہ سکی۔ علم النفس ایک ایسا ذریعہ انسان کو دیتی ہے جس کے ذریعہ اس مادی ترقی اس کی روحانی ترقی کے قدم بقدم چل سکے۔ اس کے باعث مرد اور عورت اپنی آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ غیر فطری وجود میں جکڑنے والی تمام بندشوں کو توڑ سکتے ہیں۔ اور اس کے بعد مکمل اور پُر اطمینان زندگی کی شاہراہوں پر چل سکتے ہیں۔

اندرسونی ذہن

گزشتہ مضامین میں ذہنی قوت کے صحیح استعمال کے متعلق اہم ہدایات دی جا چکی ہیں۔ لیکن موجودہ مضامین میں ہم نے صرف ذہن کی میکانکی قوت پر خیال آرائی کی ہے۔ تاکہ شعوری صلاحیت کے صحیح استعمال کی راہیں معلوم ہو سکیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ذہن کے اندرونی خانہ پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جسے دوسرے لفظوں میں غیر شعوری خانہ ذہن، جذبات کا مسکن، گزشتہ واقعات کا طومار اور ہمارے بدنام عناصر کا راحت کدہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

اور اس کے بعد اب ہم زیادہ بحث طلب موضوع پر روشنی ڈالیں گے جس کا تعلق انسانی شخصیت کے سرچشمہ یعنی غیر شعوری یا تخلیقی ذہن سے ہے۔ اب تک ہم ذہن کے ان دو رخ کے متعلق بیان کر رہے تھے۔ جس پر عام طور سے غور و خوض کیا جاتا رہا ہے لیکن اب ہم اس سے زیادہ گہرے رخ کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

یہی وہ اندرونی ذہن ہے جو ہمارے بے ساختہ افعال کی مثلاً دل کی دھڑکن غیر شعوری عمل تنفس اور غذا کے کھانے اور ہضم کرنے کے نظام کی نگرانی کرتا ہے۔ یہی وہ قوت ہے جو انسانی مشین کو چالو رکھتی ہے۔ اور اس کی ترقی و نشو و نما کرتی ہے۔ عام طور پر ذہن کے متعلق اسی رائے کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اور ہمارے جسم کے اس حصہ میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہنے کا سامان پیدا کر سکے۔ یہ ذہن ایک شرارہ ہے زندگی کے اصولوں کی آگ سے نکلا ہوا۔ اور ہمارے جسم اور اذہان کا تانا ذہن کے مقصد کو لگے بڑھاتے ہیں۔ آسمانی شعلہ کو ——— ناقابل تسخیر روح انسانی کو جو مردوں اور عورتوں کو زندہ رکھتی ہے ہم ایک غیر معمولی اور عظیم شے تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ ہر ایک انسان میں موجود ہوتی ہے اور جس کے باعث ہماری زندگی کی شمع روشن رہتی ہے۔ غیر شعوری ذہن کا جہاں تک تعلق ہے ہم سب یکساں ہیں۔ اور ایک غیر معمولی ذہانت رکھنے والا اوروں سے صرف اس لئے ممیز کیا جا سکتا ہے کہ وہ ناکامیاب نہیں ہوتا۔ اور اس کی کامیابی غیر شعوری ذہن کو قابو میں کرنے کے باعث ہوا کرتی ہے اور غیر شعوری ذہن کی حیثیت ایک موجد اور معمار کی سی ہے۔ وہ تصورات و خیالات کو ٹھوس شکل میں تبدیل کرتا ہے۔ لیکن ہمارا شعوری ذہن ہی ہے جو خیالات اور تصورات کو پیدا کرتا ہے اور انہی خیالات و تصورات میں سے بعض کو غیر شعوری ذہن زندگی کے رشتہ میں پروتا ہے۔ "اپنے خیالات کی خوب نگرانی کرو۔ تمہارے خیالات جنت میں بھی سنے جاتے ہیں"۔ بلا خوف تردید علم النفس ان الفاظ کو قبول کرتا ہے۔ ہم اپنے خیالات کی بدولت جنت یا دوزخ، کامیابی یا ناکامیابی، خوشی یا الم کی دنیا بنا سکتے ہیں۔ انسان ویسا ہوتا ہے جیسا وہ سوچتا ہے۔

ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے۔ غیر شعوری ذہن کامیابی کے ساتھ ہر اس ہدایت پر عمل پیرا ہو جاتا ہے جو اسے شعوری ذہن کی طرف سے ملتی ہے اسے اسکی پرواہ نہیں ہوتی۔ کہ یہ ہدایت اچھی ہے یا بری، تعمیری ہے یا تخریبی۔ غیر شعوری کا قانون ہی ہدایات پر عمل کرنا ہے وہ ہدایات کے حسن و قبیح پر غور نہیں کرتا۔ بلکہ صرف انکو عملی جامہ پہناتا ہے۔ بالفاظ دیگر شعوری ذہن غیر شعوری ذہن کے محل کا دربان ہے۔ ہم ایسے خلل اعصاب کے مریضوں کو بھی جانتے ہیں جو بلا کسی جسمانی بیماری کے صرف خیالی مریض تھے۔ یہ ہیں غیر شعوری ذہن کے عمل کی۔ بالفاظ دیگر بیمار ہونے کے خیالات یا بیماری کے بہلانے کے باعث ذمہ داریوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی غیر شعوری تمنا کے باعث یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے اور انسان جسمانی طور پر تندرست ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مریض سمجھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم غیر شعوری طور پر بیمار رہنے کی تمنا کریں۔ یا اگر ہمیں بیماری میں مبتلا ہونے کا خیال ستاتے تو ہم جو کچھ غیر شعوری طور پر چاہتے ہیں وہی ہو کر رہے گا۔ دوسرے لفظوں میں اسے اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ کسی

شے کی تمنا کیساتھ خیالات کا سلسلہ مل کر اپنی خواہش کے مطابق نتیجہ پیدا کرتا ہے ۔

اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے ۔کہ غیر شعوری ذہن کا یہ قانون نہ صرف ہمارے مفاد کے لئے استعمال ہوتا ہے بلکہ ہمارے لئے نقصان رساں بھی بن سکتا ہے ۔

غیر شعوری ذہن کا عمل

ہپناٹزم کی وجہ سے غیر شعوری ذہن کے عمل کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے ۔مثلاً اگر ہپناٹزم سے متاثر شخص کو یہ کہا جائے کہ اس کے بازو میں تلوار کی نوک چبھوئی جانے والی ہے ۔ تو وہ درد کی تکلیف سے چلائیگا ۔اگر آپ صرف پنسل سے ہی اس کے بازو کو کیوں نہ چھوئیں ۔نیز غیر شعوری ذہن جسمانی طور پر اسے یہ محسوس کرانے لگا ۔گویا واقعی اس کے جسم میں تلوار کی نوک داخل کی گئی ۔یہی نہیں بلکہ اسے خون کے نکلنے کا احساس ہوگا ۔

اس کے برخلاف ہپناٹزم کے ذریعہ ختم کردی گئی ۔اور ان نتائج کا عدم حصول ہپناٹزم جاننے والے شخص کی عدم صلاحیت کا ثبوت ہوگا بالفاظ دیگر غیر شعوری ذہن کے باعث ہم جو کچھ حاصل کرنا چاہیں اس میں کامیابی بآسانی ہوسکتی ہے ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس غیر معمولی قوت سے جو ہمارے اندر موجود ہے ۔ہم کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔کیا اس کے لئے علم ہپناٹزم کا جاننا ضروری ہے ؟ اس سلسلہ میں اس سے قبل روشنی ڈالی جاچکی ہے ۔

فی الوقت ہم غیر شعوری ذہن کی صحیح تربیت کے بارے میں اظہار رائے کرینگے اور ایسی ورزشوں کا ذکر کرینگے جس کے باعث وہ ہمارے قابو میں آسکتا ہے

ہپناٹزم جاننے والا شخص غیر شعوری ذہن کی تمام رکاوٹوں کو عبور کرکے اپنی پوری قوت تسخیر کو شعوری ذہن پر مرکوز کرتا ہے بالفاظ دیگر وہ معمولی اور روزمرہ کے خیالات کو ذہن سے نکال پھینکتا ہے ۔گویا وہ ہماری دیگر ذہنی مصروفیات سے رہائی حاصل کرلیتا ہے ۔اور اپنا پیغام راست غیر شعوری ذہن کو پہنچاتا ہے ۔اس عمل کو کامیابی سے کرنے کیلئے چند ہدایات درج ذیل کی جاتی ہیں ۔

نمبر ۱:۔ ہم اپنے ذہن کو معمولی باتوں سے خالی کردیتے ہیں ۔اور ہم اس منزل میں پہنچ جاتے ہیں ۔جہاں ہماری حالت ایک ایسے شخص کی سی ہوجاتی ہے ۔جو نیند کے غلبہ کے باعث دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا ہے ۔اور جو دنیاوی تکالیف، پریشانیاں اور آلام سے بے تعلق ہوچکا ہے ۔اور ہم بیداری اور نیند کے درمیان معلق ہوکر رہ جاتے ہیں ۔اس حالت میں کامیابی سے آنے کیلئے ذہن کو تمام دیگر خیالات سے بری کرکے صرف ایک خیال پر مرکوز کرنا ضروری ہے ۔یہ صورت حال عام طور پر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم پر نیند کا غلبہ طاری ہوتا ہے ۔

نمبر ۲:۔ جب ہم اس حالت میں لانے کیلئے کامیابی کے ساتھ تیار ہوجائیں تو ہمیں چاہیئے ۔کہ اس خیال کو جس کی خواہش ہمارے دل میں ہے ۔شعور کی سرحدوں سے پرے غیر شعوری ذہن کے اندر جگہ دیں ۔

یہ دونوں ابتدائی منزلیں ہیں ۔غیر شعوری ذہن پر کسی خیال کو راست مرکوز کرنے کی ۔ دوسرا سوال جو ناظرین ہم سے کرسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ کونسا خیال یا کونسی خواہش کو ذہن پر مرکوز کرنا چاہیئے ؟ آئندہ شمارہ میں ہم اس سوال پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے ۔اور یہ بتائیں گے کہ ہمیں کن مختلف باتوں پر خاص طور پر توجہ دینی چاہیئے ۔یعنی کردار، حوصلہ، مستقل مزاجی اور کامیابی پر ۔

کردار کامیابی کی کنجی ہے ۔زندگی کی دوڑ میں دوسرے پر سبقت لیجانا قسمت یا تقدیر کا کام نہیں ہے ۔ابتدائی سہولتیں وقتی طور پر ایک شخص کو دوسرے پر کامیابی عطا کرسکتی ہیں ۔لیکن زندگی کی دائمی دوڑ میں ہر شخص کی انفرادیت ہی کامیابی یا ناکامی کی ضامن ہوتی ہیں ۔

لہٰذا ہمارے خیالات تمام تر کردار کے کامل نمونہ پر، طاقت ور مستقل مزاج اعلیٰ کردار پر مرکوز ہونے چاہئیں ہمیں اپنی ذات کا صحیح ذہنی تجربہ کرنے کی کوشش میں کامیابی حاصل کرنا چاہیئے۔ اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اپنے نتیجہ کو غیر شعوری ذہن میں منتقل کرنا چاہیئے بلند حوصلگی کو ہر دور میں قابل تعریف سمجھا گیا ہے اگرچہ اس کی تعریف مختلف لوگوں کے نزدیک مختلف رہی ہے۔ ہمارے نزدیک بلند حوصلگی کا صحیح مفہوم مدافعتی قوت سے ہے۔ بالفاظ دیگر اس سے مراد وہ اخلاقی جرأت ہے۔ جو غیر معمولی رکاوٹوں کی پرواہ کئے بغیر ناکامی کو ٹھکراتے ہوئے کامیابی کی طرف مستقل مزاجی کے ساتھ قدم اٹھاتی ہے۔

کامیاب زندگی کی دوڑ کو فتح کرنے کیلئے اسی قسم کی بلند حوصلگی ہماری باوفا دوست بنگئی ہے۔ اس لئے اس خواہش کو غیر شعوری ذہن میں مرکوز کیجئے۔ اس خواہش کو ـ کہ ہماری بلند حوصلگی تمام موقعوں کو اپنی گرفت میں لے لیگی ـ اس خیال کو ـ کہ ہم اپنے اندر ایسی قوت اور ایسے ذرائع رکھتے ہیں جس کے باعث ہم میدان زندگی کو فتح کر سکیں گے۔

اور اخیر میں کامیابی کی منزل آتی ہے۔ کامیابی کی تعریف ہی ہر ایک کے پاس مختلف ہے۔ لیکن اس حد تک سب متفق ہیں کہ کامیابی کا مفہوم اپنی صلاحیت کے سانچے میں زندگی کو ڈھالنا، ایک نصب العین کو قائم کرکے اسکے حصول کی جدوجہد کرنا اور اپنے مقصد کی سمت مستقل مزاجی کیساتھ قدم بڑھانا ہے۔

اور ہمیں چاہیئے کہ ہمارے ان مقاصد کی خبر غیر شعوری ذہن تک پہنچ جائے۔ اور ان مقاصد کو غلط فہمی اور وہم و دجا کے بھنور میں نہ پھنسانا چاہیئے۔ بلکہ ان کا دلیری کے ساتھ اظہار کرنا چاہیئے اور یقین محکم رکھکر ان پر عمل پیرا ہونا چاہیئے اپنی منزل مقصود کی طرف ہر روز ایک قدم بڑھانے کا تہیہ کرنا چاہیئے۔ اگر ہم نے ان باتوں کو غیر شعوری طور پر ذہن کے اندر بٹھا دیا۔ تو کوئی طاقت حصول کامیابی سے ہمیں نہیں روک سکتی۔

جذبۂ کامیابی

کیا اب آپ کو محسوس ہوا کہ ـــ علم النفس آپ کیلئے کتنی کارآمد چیز ہے، کیا آپنے اپنے تخلیقی ذہن کی قوت تسخیر کی جھلک دیکھی۔ جو آپ کے اندر ہوتے ہوئے بھی استعمال نہیں کیا گیا؟

علم النفس نہ صرف ہمیں غیر دلچسپ اور لاحاصل زندگی سے دلچسپ زندگی کی طرف لیجاتا ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا ذریعہ ہے، جو ہمارے سامنے کامیاب اور کارآمد زندگی کی راہیں وا کرتا ہے جس کے باعث ہمارے صحت بخش اور رنگین خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتے ہیں ہماری زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں۔ جب ہم اپنے اندر غیر معمولی انسان بننے کی صلاحیت محسوس کرتے ہیں۔ جب ہم ایسی قوت اپنے اندر پاتے ہیں جو ہمیں کچھ سے کچھ بنا سکتی ہے ـ جب ہم ایسی انفرادی غیر معمولی توانائی کی جھلک اپنے اندر دیکھتے ہیں جو عام انسانوں سے افضل درجہ رکھتی ہے۔ اور اگر ہم نے غیر شعوری ذہن پر قابو پالیا تو ان تمام جذبات کو عملی روپ دیا جاسکتا ہے ایسی جرأت حاصل کی جاسکتی ہے جسکے ذریعہ مشکل زندگی آسان نظر آنے لگے۔ ایسا یقین پیدا ہو سکتا ہے جو زندگی کی پرچھائیوں کو روشن کر سکے ایسی قوت وجود میں آسکتی ہے جس کے باعث بے معنی اور بے کیف زندگی معنی خیز، کارآمد اور کامیاب زندگی میں تبدیل ہو سکے۔ مدت مدید تک ہم نے میکانکی اور مادی قوتوں کا سہارا لیا ہے۔ ہم اس مادی طاقت کی پرستش کرتے رہے ہیں جس پر ہماری تہذیب کا انحصار ہے اور اس حقیقت کو فراموش کر چکے ہیں کہ سب سے بڑی قوت ذہن اور دماغ کی قوت ہے یہ غیر معمولی قوت بہتر زندگی کو جنم دے سکتی ہے۔ غیر دلچسپ اور بے کیف وجود کو کامیاب زندگی میں تبدیل کر سکتی ہے اور یہ کتنی بڑی بات ہے کہ یہ قوت خود ہم میں ـــ ہماری ذات میں موجود ہے۔ اور جسکا استعمال ہم آج ہی سے ـــ اسی وقت سے کر سکتے ہیں!

مترجم محمد یوسف شاہین
بی اے

آدمی کی قدر و قیمت کا معیار

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ تین سگے بھائیوں نے شہر میں نوکری کے ارادہ سے کاشتکاری کے پیشہ کو ترک کر دیا تینوں کو شہر میں ایک تجارتی فرم میں یکساں تنخواہ پر ملازمت مل گئی لیکن پانچ سال بعد ایک بھائی کی تنخواہ دو سو، دوسرے کی تین سو اور تیسرے کی پانچ سو ڈالر ہو گئی۔

ان کے والد نے مالک فرم سے حلکریہ معلوم کرنے کا ارادہ کیا کہ کیوں ان کی تنخواہیں اتنی کم و بیش ہیں جو بظاہر بے انصافی پر مبنی ہیں مالک فرم نے کہا کہ میں خود تمہارے لڑکوں کو یہ راز تمہیں بتلانے کی اجازت دوں گا چنانچہ اس نے گھنٹی بجا کر سب سے پہلے جم کو بلایا۔

جم سے مخاطب ہو کر مالک نے کہا: میں نے سنا ہے اوشن جہاز نے بندرگاہ میں لنگر ڈالا ہے براہ مہربانی جا کر اس پر لدے ہوئے مال کو دیکھ آؤ تین منٹ بعد جم نے واپس آکر بتایا کہ جہاز پر سیل کی کھالیں لدی ہیں۔ اور یہ بھی کہا کہ اس نے ٹیلیفون پر گفتگو کر کے یہ بات معلوم کی ہے۔

اس کے بعد مالک نے پھر گھنٹی بجائی اور اس بار اس نے تین سو پانے والے فرینک کو بلا کر کہا فرینک میں چاہتا ہوں کہ تم اوشن جہاز پر جا کر لدے ہوئے سامان کو دیکھ آؤ۔ ایک گھنٹہ پر فرینک مال کی فہرست لیکر واپس ہوا اور یہ بھی بتایا کہ وہاں منجملہ دیگر مال دو ہزار سیل کی پانسو اودبلاؤ کی اور گیارہ سو خشکی خرگوش کی کھالیں بھی

اس کے بعد مالک نے تیسری بار پھر گھنٹی بجائی اب پانسو ڈالر ماہوار پانیوالا جارج حاضر ہوا اس کو بھی وہی ہدایتیں دی گئیں۔

جارج تین گھنٹے تک واپس نہیں آیا لیکن مالک فرم اور اس کا باپ انتظار کرتے رہے جب وہ آیا تو ان سے یہ بیان دیا۔

جہاز کے مال میں دو ہزار سیل کی کھالیں ہیں مالک جہاز نے پانچ شلنگ فی کھال کی پیشکش کی ہے جسے میں نے آپ کی منظوری سے مشروط طور پر لیا ہے ساتھ ہی سینٹ لوئی کے ایک تاجر سے سات شلنگ فی کھال کی بات بھی آپ کی منظوری کی شرط کے ساتھ طے کر لی ہے میں نے کل صبح ان کو مطلع کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

اُود بلاؤ کی بھی پانسو کھالیں تھیں آپ جانتے ہیں کہ عام طور پر ہم اُن کھالوں کا کاروبار نہیں کرتے لیکن چونکہ ہمارے پاس ان کا آرڈر موجود تھا اس لئے میں نے سات سو ڈالر کے نفع پر ان کا سودا بھی کر دیا ہے وہاں گیارہ سو کھالیں خشکی خرگوش کی بھی ہیں چونکہ ان کھالوں کا معاملہ آپ کے طے کرنے کی بات ہے اس لئے میں نے ان کا کوئی معاملہ نہیں کیا۔

مالک نے کہا۔ جارج بہت خوب۔

لیکن جب جارج چلا گیا۔ تو مالک فرم مسکرایا اور لڑکوں کے باپ سے کہا۔ آپ نے تینوں لڑکوں کی روئداد پر غور کیا۔ ؟

۱۔ جو ہدایتیں جم کو دی گئی تھیں۔ جم نے سرے سے ان پر عمل ہی نہیں کیا ۲۔ فرینک نے صرف اتنا کیا جتنا اس کو کہا گیا تھا۔ ۳۔ برخلاف اس کے جارج نے اس سے کہیں زیادہ کام سرانجام دیا جتنا اس کو بتایا گیا تھا اور پھر اس شان سے کہ کمپنی کو اس کی کاروائی کی وجہ سے معقول منافع بھی ہو گیا مندرجہ بالا واقعہ بظاہر ایک معمولی قصہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں ایک نہایت مفید اور انقلاب انگیز سبق موجود ہے وہ یہ کہ کامیابی کا راز صحیح طریقے سے مکمل طور پر کام کرنے میں مضمر ہے دنیا کے تمام کامیاب آدمی محض اسی اصول پر عمل پیرا ہو کر اپنے ہمعصروں سے ممتاز نظر آتے ہیں ورنہ بظاہر ان کی صورتوں اور قابلیتوں میں اتنا فرق نہیں ہوتا

(یعنی دنیا میں جو کام کرنے کے لئے ہے وہ یقیناً اچھی طرح ہی کرنے کے لئے ہے۔

باقر رضوی

محبت اور نفرت

انسان قدرت کا ایک ذی روح اور صاحب ادراک شاہکار ہے۔ فطری تقاضے اور جبلتیں اس کے بیشتر افعال کا سرچشمہ ہیں۔ اسے بھوک معلوم ہوتی ہے۔ پیاس لگتی ہے۔ جسمانی آرام کی خواہش ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اس پر ایک اضطرابی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ کچھ بنائے کچھ بگاڑے۔ اسے دوسرے کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ وہ اپنے جنسی جذبہ کی تسکین چاہتا ہے اس کے دل میں رقابت اور مسابقت کی آگ بھڑکتی ہے اور ان تمام خواہشوں اور تقاضوں کی تسکین اور تکمیل اس کی مسرت اور ان کی عدم تسکین اور تکمیل اس کے غم کا باعث ہوتی ہے۔

پھر انسان کے ذہن میں پچھلی یادیں اور پرانی باتیں محفوظ رہتی ہیں۔ یہ یادیں وابستہ ہوتی ہیں۔ گذشتہ کامیابی اور ناکامی اور فتح و شکست سے اور اس فتح و شکست سے خوشی اور ناخوشی کا احساس الگ نہیں ہے۔ یہ پچھلی یادیں اور پرانی باتیں، امتداد زمانہ اور ماحول کے زیر اثر دوسرے جذبات سے ایسی خلط ملط ہو جاتی ہیں کہ ان کا تجزیہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔

غیر شعوری طور پر گذشتہ واقعات کی یاد چھپائے رکھنے کے ساتھ ساتھ انسان شعوری طور پر تمناؤں کے خاکے بناتا اور آرزوؤں کے جال پھیلاتا ہے کہ مقصد برآری کے بعد شادکام ہو۔ ان تمناؤں اور آرزوؤں کے ساتھ امید و بیم کا کانٹا بھی اس کے دل میں کھٹکتا رہتا ہے کہ دیکھئے مقصد برآری ہوتی ہے یا نہیں۔

ان تمام باتوں کے ساتھ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ انسان کے تمام افعال کی بنیاد بلا استثنا محبت اور نفرت پر ہے۔ محبت اور نفرت ہی کی زمین میں اس کے تمام افعال کے کلے پھوٹتے اور برگ و بار لاتے ہیں۔ اپنے ماحول، جبلت اور خواہش کے مطابق انسان جن چیزوں سے محبت یا نفرت رکھتا ہے۔ اس کے حرکات و سکنات اور قول و فعل سے ان کا اظہار ہوتا ہے۔ انسانی افعال کی تحلیل کر کے آپ معلوم کر سکتے ہیں، کہ فلاں شخص کو فلاں شے سے نفرت فلاں شے سے محبت ہے۔ فلاں موضوعات اس کو مرغوب ہیں اور فلاں فلاں مسائل سے وہ جی چراتا اور بھاگتا ہے۔

انسانی زندگی گذشتہ تجربات، غیر شعوری تقاضوں اور آرزوؤں اور محبت و نفرت کا ایک رنگا رنگ مجموعہ ہے۔ یہی جذبات اور حقیقت اس کی حیات کا تانا بانا ہیں۔ یہی تصویر حیات میں رنگ بھرتے ہیں۔ انسان شعوری طور پر اپنی کمزوریوں کو نظر انداز اور اوصاف کو ابھار کر رکھتا ہے۔

مختصر یہ کہ حیات انسانی تین اشیا سے مرکب ہے (۱) محبت (۲) نفرت (۳) وہ امور جو جذبات محبت اور نفرت کی تسکین و تکمیل میں رخنہ اندازی کرتے ہیں اور اس کے شعور پر چھاپہ مارتے ہیں۔

نفرت کی حیثیت ثانوی، منفی اور سلبی ہے۔ یعنی نفرت وہ جذبہ ہے جو محبت کی عدم تکمیل سے وجود میں آتا ہے۔ اس طرح محبت

کی جو اہمیت ہے۔ اس پر مبالغہ آرائی نہیں کی جا سکتی۔

انسان ابتداءً کسی چیز سے نفرت نہیں کرتا۔ اسے اس چیز سے نفرت ہو جاتی ہے جو اس کی محبوب و مطلوب شے کے حصول میں رخنہ ڈالتی اور اس کی محبت کی بیل کو پھلنے پھولنے نہیں دیتی۔ نفرت محبت کا ردِ عمل ہے۔

تخیل کی مدد سے انسان سابقہ تجربات کی روشنی میں مستقبل کی عمارت کی داغ بیل ڈالتا ہے۔ انسان کے اندر روحانی عنصر اس کے اخلاقی اقدار مرتب کرتا ہے اور وہ حسن، حق اور عدالت کے ذہنی تصورات قائم کرتا ہے اور ان اقدار کو قائم اور دائم سمجھتا ہے۔ وہ اپنے ذہن میں ایک ایسی دنیا کی تصویر بناتا ہے جہاں مسرت ہی مسرت ہے۔ اور جہاں انسانیت اخلاقی اقدار کے اعلیٰ ترین مدارج پر فائز ہے۔ حکومت الٰہیہ کا تصور بھی اسی کی ایک بدلی ہوئی اور ارفع شکل ہے۔ بعض لوگوں نے خدا کے تصور کو اپنے ذہن کی سرزمین سے جلاوطن کر کے انسانیت کے دیوتا کو اس میں لا بٹھایا ہے۔ وہ ایک ایسی دنیا کا تصور رکھتے ہیں۔ جہاں انسان "مختار تمام اور مطلق کل" ہوگا یعنی وہ صرف انسانی عظمت اور انسانی وحدت کے قائل ہیں۔

اس روحانی اور مابعد الطبیعاتی اور ذہنی تصور کے لئے انسان اپنی ہستی قربان کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ملک، اپنی قوم، غیرت، انصاف، حق اور انسانیت کے لئے جان دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ انسان کی پوری تاریخ تہذیب و تمدن۔ اس کا عروج و زوال مذاہب کی ترقی اور تنزل، اسی تصور کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی مختلف شکلیں ہیں۔

انسان ہمیشہ ایک بہتر دنیا کے خواب دیکھتا رہا ہے۔ دیکھئے یہ خواب کب شرمندۂ تعبیر ہوتا ہے۔ خواب دیکھنے کی یہی خواہش اس کی روحانیت پر دلالت کرتا ہے۔ مارکس شیلر نے کیا خوب کہا ہے۔

"انسان ایک مریض جانور ہے۔ جانور کی حیثیت سے اس کا یہ مرض انسانی حیثیت سے اس کی صحت کی سب سے بڑی دلیل ہے"

سید الابرار

نفسیات کیا ھے

دنیا کی ہر چیز اپنے نام سے پہچانی جاتی ہے مگر یہ ماننا پڑتا ہے کہ محض نام ہی کسی چیز کی مکمل تعریف کے لئے کافی نہیں ہوا کرتا جب آپ کا تعلق ملنے جلنے آدمی سے کرایا جاتا ہے تو آپ اس کا نام سن لینا ہی کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے مشاغل اور پیشہ کا جان لینا بھی ضروری خیال کرتے ہیں ہو نہ اگر آپ دونوں میں سے کوئی کلرک ہو تو تنخواہ اور گریڈ کا حال ضرور پوچھا جاتا ہے۔

یہی حالت علوم کی ہے کسی بھی علم کا نام اس کی پوری تعریف نہیں کرتا کیمیا پرانے زمانے میں کم قیمت کی دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنے کے علم کا نام تھا آج کل علم الادویہ کا ایک جز ہے اور اپنے علحدہ ضوابط و قواعد رکھتا ہے سائنس جس کا لفظی ترجمہ "علم" ہے آج کل مخصوص معنوں میں چیزوں کی تبدیلی پر غور کر کے نتائج اخذ کرنے سے تعلق رکھنے والے علم کا نام ہے حالانکہ سائنس میں آج اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے کبھی سائنس منطق، اور فلسفہ یکجا تھے مگر اب ان میں اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا وحدت اور تثلیث میں۔

سائیکالوجی (علم النفس) جو ایک جدید ترین علم ہے اور جسے غالباً سب علوم کے بعد تسلیم کیا گیا ہے اس حادثہ کا شکار ہوئی ہے یہ یونانی زبان کا لفظ ہے جو دو لفظوں سے مل کر بنا ہے (Psyche اور Logos) یعنی "علم الارواح" اس سے یہ دھوکہ بھی ہو سکتا ہے کہ سائیکالوجسٹ (ماہر نفسیات) اور روحانی عامل ایک ہی قسم کی مخلوق ہیں لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں عربی میں اس لفظ کا مطلب اور بھی محدود ہے۔ نفس عربی میں جذبات کو کہتے ہیں جس کی دو بڑی قسمیں بتائی جاتی ہیں "امارہ" اور "لوامہ" یا "سفلی" اور "علوی"۔ اس لحاظ سے نفسیات کا سیدھا سادہ مطلب معلوم جذبات ہوا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی تعریف بھی نفسیات کے کل میدان کا احاطہ نہیں کرتی۔ تاہم نام کے کافی یا ناکافی ہونے سے کچھ بھی فرق نہیں پڑتا۔

آج کل نفسیات کی ضرورت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے جنگ اور امن دونوں میں اس سے یکساں فائدہ اٹھایا جا رہا ہے نفسیات کی جنگی اہمیت کا احساس پہلی جنگ عظیم میں ہوا جب جرمنوں نے ملیٹری کے افسروں کی بھرتی کے لئے نفسیاتی امتحان لازمی قرار دیا۔ اور اس طرح جو لوگ نفسیاتی لحاظ سے افسر بننے اور جنگ کے میدان میں جانے کے قابل نہ تھے انھیں روک دیا گیا۔ اس کے بعد بیس سالہ دور امن میں "نفسیات" میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔ اور مغربی علماء کی ایک جماعت اس علم کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئی جب دوسری بڑی جنگ چھڑی تو "نفسیات" کو ایک زبردست ہتھیار کے طور پر کام میں لایا گیا۔

"علم انسانی" مختلف علوم کا مجموعہ ہے اس کے دو بڑے جز علم الابدان (Physiology) اور علم الاجتماع (Sociology) ہیں۔ علم الابدان صرف جسم کے اعضاء کے کام کرنے سے تعلق رکھتا ہے اور علم الاجتماع قوموں کے افعال و کردار کا مشاہدہ کرتا ہے نفسیات کا مقام ان دونوں کے بین بین ہے یہاں خود کی حرکات کا جائزہ لیا جاتا ہے پیدائش سے موت تک پھر سکنات بھی نہیں۔ صرف حرکات، کیونکہ نفسیات کے ہاں زندگی صرف حرکت کا نام ہے جہاں حرکت ختم ہوئی زندگی بھی ختم ہے جب تک دل میں دھڑکن ہے زندگی متحرک ہے۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں!

انسانی حرکات کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ میکانکی جیسے چلنا، دوڑنا، بیٹھنا، دوسرے حسیاتی جیسے غم، غصہ، خوشی، نفسیات فرد اور جماعت کے ان دونوں حرکات کا مطالعہ کر کے ان سے نتائج اخذ کرتی ہے۔

مختلف علوم زندگی کو اپنے اپنے معیاروں سے پرکھتے ہیں نفسیات کا تعلق بیشتر انسان کی ذہنی سرگرمیوں سے ہے مثلاً سیکھنا، یاد رکھنا سوچنا، چاہنا، محبت اور نفرت کرنا لیکن دماغی سرگرمی بیک وقت ذہنی و جسمانی سرگرمی کا مجموعہ ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ جسم کا تو پرزہ پرزہ بگڑ جائے اور دماغ پھر بھی ٹھیک کام کرتا رہے یہی وجہ ہے کہ جسمانی پہلو کو بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دوران خون، پٹھوں کے حرکات اور حواس خمسہ کے آلات ذہن کے معاون ہیں گو یہ فزیالوجی (علم الابدان) کی ذیل میں آتے ہیں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ذہن انسانی کا انحصار جسمانی حرکات پر ہے تو صرف علم الابدان "زندگی" کا مطالعہ کرنے کے لئے کیوں کافی نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ علم طب محض بیرونی اثرات کا جائزہ لیتی ہے اس کا تعلق انسان کے مادی جسم سے ہے مثلاً ایک شخص باغ کی سیر کر رہا ہے طبی نقطہ نظر سے اسے دیکھیں تو یہ سوچیں گے کہ اس کی صحت کیسی ہے؟ بینائی تو کمزور نہیں ہے؟ اگر اس کے چہرے پر خوشی کے آثار محسوس نہیں ہوتے تو ہم یہ سوچتے کہ وہ اس لئے ناخوش ہے کہ اسے چڑیوں کے چہچہے سنائی نہیں دیتے یا پھولوں کے رنگ نظر نہیں آتے، اس کے برعکس نفسیات والے یہ دیکھیں گے کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے، کیوں دیکھ رہا ہے۔ اور اس مشاہدے کا اس کی ذات پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔؟

فرد اور جماعت کا تعلق نفسیات کا ایک اہم موضوع ہے یہاں بعض اوقات بڑی پیچیدہ صورتیں پیش آتی ہیں، فٹ بال کی دو ٹیمیں کھیل رہی ہیں ہم افراد کا نام لئے بغیر کہہ سکتے ہیں کہ "الف ٹیم" نے "ب ٹیم" پر گول کر دیا۔ حالانکہ یہ سارا کام ٹیموں کی کھلاڑیوں کی استعداد پر موقوف ہے اور گول تو واقعتاً منفرد کھلاڑی کرتا ہے اگرچہ اسے دوسروں کی مدد حاصل ہوتی ہے اگر کوئی ماہر طب اس کھیل کا حال لکھے گا تو بڑی مشکل پیش ہوگی۔ وہ اپنا سارا زور کلام اس بات پر صرف کر دے گا کہ کھلاڑیوں کی جسمانی حالت کیا تھی۔ کھیل کے دوران میں زید کا جسم کیسے کام کرتا رہا، عمر کی ٹانگ میں موچ کیونکر آگئی۔ اور بکر کیسے ہانپنے لگ گیا ہو سکتا ہے کہ ایسی تحریر ایک بیش قیمت علمی دستاویز ہو مگر جو بیچارہ کھیل کا حال معلوم کرنے کی خاطر اسے پڑھے گا اس کے پلے کچھ بھی نہیں پڑے گا۔ اخبارات میں کھیلوں کے لئے ایک خاص صفحہ ہوتا ہے اگر ایسی چیزیں اس میں چھپنے لگ جائیں تو باقی مضامین کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہ سکے گی۔

جس طرح جماعت کی سرگرمیوں کو افراد کی کاوشوں کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے اسی طرح بسا اوقات افراد کی حرکات جماعتی افعال بھی بن سکتی ہیں ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نواب بہادر یار جنگ مرحوم کلکتہ کے ایک بازار میں سودا خرید رہے تھے ایک مزدور کو ٹوکرا دے رکھا تھا، جو چیزیں خرید کر اس میں رکھتا جاتا تھا ایک مقام پر پہنچ کر وہ ایک ہندو دوکاندار سے سودا خریدنے لگے اتنے میں وہ مزدور ٹوکرا لے کر بھاگ نکلا۔ نواب بہادر نے دوکاندار کی طرف مڑ کر کہا ادھو! مزدور تو سامان لے کر چمپت ہو گیا۔ اس پر دوکاندار فوراً بول اٹھا۔ "وہ مزدور کوئی مسلمان ہوگا" یہاں اس دکاندار نے ایک فرد کی غلطی کو پوری جماعت کی کمزوری سمجھا الغرض نفسیات، نیم شخصی، نیم جماعتی، نیم جسمانی، اور مکمل ذہنی افعال پر بحث کرتی ہے۔

اب نفسیات کی مختصر تاریخ سنیئے یوں تو دیگر علوم کی طرح مسلمانوں نے اپنے ابتدائی دور عروج میں علم النفس پر بھی تحقیقات کی تھی اور بہت سی کتابیں بھی تصنیف کی تھیں جن میں سے بعض اب تک موجود ہیں مگر مغرب میں سترھویں صدی تک لوگ نفسیات کی جداگانہ حیثیت، یا کسی دوسرے علم میں اس کی ملی جلی مگر ممتاز حیثیت سے واقف نہ تھے تاہم نفسیات کا وجود ضرور تھا۔ اور کسی نہ کسی صورت میں استعمال بھی ہوتا رہا یہ وقت تھا جب کہ مشرق اور مغرب دونوں جگہ عوام میں تعویذ، جادو، منتر، جھاڑ پھونک اور ٹونے ٹوٹکوں کا زور تھا۔ سولہویں صدی کے انگریز ادیب مثلاً شکسپیر وغیرہ فطرت انسانی کے پورے ماہر تھے یہی وجہ ہے کہ آج تک ان کے ادبیات میں کوئی نفسیاتی خامی نہیں نکالی جا سکی؛ ہے نیز جدید نفسیات نے اپنے بہت سے اصلاحات کی بنیاد "یونان" اور "روم" کی دیو مالائی د تلمیحات پر رکھی ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نفسیات کا وجود پرانے زمانے میں تھا۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں یہ علم رفتہ رفتہ ممتاز ہونے لگا اور بیسویں صدی میں اس نے بالکل جداگانہ حیثیت اختیار کر لی۔

عبدالشکور ساحر بہاری

کاش آپ ایسا نہ سوچیں

اس حقیقت سے آپ واقف ہیں کہ جس قدر انسان کی راہ میں مشکلیں حائل ہوتی ہیں اسی قدر اس کی پوشیدہ لامتناہی قوتیں میدانِ عمل میں آنے کے لئے تڑپتی ہیں، چنانچہ آج تک انسان نے جتنے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کا سہرا اصل میں ان مشکلوں اور رکاوٹوں کے سر ہے جو انسان کی سدِ راہ ہوتی ہیں اور جنہوں نے اس کی پوشیدہ قوتوں اور خوابیدہ صلاحیتوں کو جھنجھوڑ کر اور جگا کر دعوتِ عمل پر مجبور کیا ہے۔ پرندوں کی طرح فضا میں اُڑنے کی بے بسی نے اور سمندر کی گہرائی اور اس کے طوفانوں ہی نے آپ سے ہوائی جہاز اور اسٹیمر بنوائے ہیں یا نہیں؟

لیکن کیا حیرت کا مقام نہیں ہے اگر آج آپ کسی موقع پر یہ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے فلاں فلاں آسانیاں میسّر ہوتیں، یا کاش کہ مجھ سے فلاں غلطی سرزد نہ ہوئی ہوتی تو میں کچھ سے کچھ کر دکھاتا، مگر اب کیا کر سکتا ہوں، مجبور ہوں!" — آپ جانتے ہیں یہ "کاش کہ ایسا ہوتا" کیا چیز ہے؟ —— یہ ایک بلا ہے جو آپ کو اپنے جال میں پھانس رہی ہے۔ اپنے جادو کے اثر سے آپ کی قوتوں کو خود آپ کی نظروں سے اوجھل کر رہی ہے اور آپ کے دل سے عزم و ہمت کو نکال کر اس کی حرکت بند کرنے کے درپے ہے۔ آپ کیوں اس خطرناک بلا کو منہ لگا کر اسے سر پر چڑھاتے ہیں جب کہ اس سے گلوخلاصی کی ایک نہایت ہی آسان ترکیب ہے —— بہت ہی آسان! آپ صرف یہ سوچ لیں کہ اس بلا کے باوجود آپ بہت کچھ ہی نہیں "سب کچھ" کر سکتے ہیں اور آپ دیکھیں گے کہ یہ بلا اسی لمحہ ہمیشہ کے لئے راہ فرار اختیار کر جائے گی۔

اور —— رکاوٹیں کس کی راہ میں حائل نہیں ہوتیں؟ غلطیاں کس سے سرزد نہیں ہوتیں؟؟ —— آپ دیکھیے کہ غلطیاں ان سے بھی ہوتی ہیں جو آپ کو کامیاب انسان نظر آتے ہیں۔ لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ایک ٹھوکر بار بار نہیں کھاتے، تجربہ سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں اور "کاش ایسا ہوتا" کہہ کر دل برداشتہ نہیں ہو جاتے بلکہ "باوجود اس کے" آگے بڑھتے ہیں اور اپنی پچھلی غلطیوں کو جھک کر ان کا ازالہ کرتے ہوئے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

اگر خدا نخواستہ آپ کی گھریلو زندگی خوشگوار نہیں ہے، جیون ساتھی سے نہیں بنتی —— تو کیا اس کا یہ علاج ہو سکتا ہے جو آپ کہتے ہیں کہ "کاش میں نے یہ شادی نہ کی ہوتی"! یقیناً نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس صورت میں یا تو ہر وقت کی فکر آپ کو گھن کی طرح کھا جائے گی یا دوسری ممکن صورت میں اس "کاش ایسا ہوتا" کا نتیجہ ہوگا —— دائمی ناخوشگواری، نااتفاقی اور بڑھتے بڑھتے قطع تعلق! —— یاد رکھیے کہ قدرت نے دنیا میں دو چیزیں خواہ حیوانات کی قسم ہو یا نباتات و جمادات کی، ہم فطرت و ہم رنگ پیدا نہیں کیں۔ دو طبیعتوں میں اختلاف (کم یا زیادہ) لابدی امر ہے اس لئے اگر آپ "کاش ایسا ہوتا" کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں تو یقین رکھیے کہ آپ نے جیون ساتھی کے انتخاب میں اتنی غلطی نہیں کی جتنی کہ آپ نے معمولی اختلافِ طبع کو ہوا بنا کر کی ہے۔ ایک مرتبہ آپ "کاش ایسا ہوتا" سوچنے کی بجائے "باوجود اس کے" نبھانے کا ارادہ تو کیجیے آپ کا صرف یہ ارادہ ہی اختلاف کی چھوٹی چھوٹی خلیجوں کو ایسا پاٹ دے گا کہ آپ کی زندگی کی راہ آسان و خوشگوار ہو جائے گی۔

اسی "باوجود اس کے" ارادہ کے ساتھ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی بڑھیے —— کامیاب انسانوں کی مثالیں لیجیے مثلاً اس تاجر کو دیکھیے جس نے اپنا پورا سرمایہ ایک لمیٹڈ کمپنی میں لگا دیا تھا۔ جو ناسازگار حالات و واقعات کی بنا پر ڈوبی جا رہی تھی اور ہر ایک کو نقصان کا احتمال ہی نہیں بلکہ یقین کامل تھا۔ تمام دوسرے حصہ دار ہاتھ پر ہاتھ دھر کر "کاش ایسا ہوتا" کے وظیفے کا ورد کر رہے تھے لیکن اس تاجر کے ذہنی توازن اور اس کی مشکلوں سے نپٹنے کی قوت نے نہ صرف کمپنی کو نقصان سے بچا لیا بلکہ امید سے زائد نفع پہنچایا۔

یقینِ محکم کے ساتھ عمل پیہم بھی ہو تو کسی مہم کا سر ہونا چنداں مشکل نہیں اور انسان کی راہ میں مشکلوں اور رکاوٹوں کا پڑنا تو قدرت کی عین

مترجمہ ندیم عنقا

اپنی ذات کے شکنجے

خود شعوری کے لمحات میں انسان کے تمام تر تصورات میں ایک بناوٹ پیدا ہو جاتی ہے اور استدلال کی قوتیں پس پردہ پھینک دی جاتی ہیں استدلال اور تصورات کا چولی دامن کا ساتھ ہے مگر خود شعوری کے لمحات میں دونوں میں وہ رفاقت نہیں ہوتی جو ہم کو ماحول سے مطابقت [illegible] ... زمیں [illegible] ہے۔

وہ افراد جن کا یہ احساس مریضانہ حد تک بڑھا ہوا ہوتا ہے وہ جذبات و احساسات کے دھاروں میں بہتے ہیں اور استدلال کو جرائم سمجھنے لگتے ہیں ان کی فکر پرواز ختم ہو جاتی ہے اور قوت ارادی کمزور پڑ جاتی ہے صحت مند حالتوں میں ان تینوں قوتوں میں ایک توازن رہتا ہے جب یہ توازن ختم ہوتا ہے تو بچوں اور جوانوں میں خود شعوری کے لبادہ میں خوف کا جذبہ کار فرما ہوتا تھا اور اکثر انسان اپنی ہستی کی طرف سے بدگمان ہو کر زندگی کے متعلق بھی بلند خیالات نہیں قائم رکھ سکتے ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا ہو سکتا ہے کہ بچپن میں بچہ تندرست و مضبوط ہو مگر کوئی ایسا حادثہ ہو گیا ہو جس کی وجہ سے خود شعوری کا احساس مریضانہ حد تک بڑھ گیا ہو۔ اور اس کے بعد انسان اپنے کو زندگی کی بیشتر نعمتوں سے محروم رکھنے لگا۔

آپ کسی ایسے شخص سے ملئے جسے اپنی ذات کا ہمہ وقت احساس رہتا ہو آپ دیکھیں گے کہ وہ زبردست احساس کمتری کا شکار ہو گا۔ اس کی اس احساسِ کمتری کی وجہ سے اس کی اپنے خیالات کے اظہار سے مجبوری ہے اس کی قوتیں صحیح راہوں سے نکلنے سے قاصر رہتی ہیں کیونکہ ان پر اس کا اختیار نہیں رہتا۔ اور اس کمزوری کی تمام جڑیں بچپن کی غلط تربیت میں ملتی ہیں۔

ہمارے زیادہ تر والدین بچوں کی تربیت سے قابلِ افسوس حد تک بے خبر ہیں، خاندان کے لوگ بزرگ دادا، دادی، اور اپنے زمانے کے فرسودہ طریقوں کی تمام تر احتیاط کے ساتھ اپنی پوتوں کی پرورش کی ہدایات میں پیش پیش رہتی ہیں اور بہ ضد رہتے ہیں کہ ان طریقوں کے سانچوں میں ڈھل کر نکلنے والے بچے ہی اس کائنات کے شایانِ شان بن سکیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ تربیت کے رائج سائج طریقے چند بچوں کے مزاج کے موافق آ جائیں۔ مگر ہر بچہ ان کی پابندیوں کا حامل نہ ہو سکے گا اور بچہ باغی بن جائے گا لطف تو یہ ہے کہ ایسے بچوں کا یہ باغیانہ جذبہ وراثت سے متعلق کر دیا جاتا ہے حالانکہ ۹۰ فیصد وہ اس تربیت کی خرابیوں کے وجہ سے ہوتا ہے۔

جب تک والدین اس حقیقت کا اعتراف نہ کریں گے کہ بچوں کی فطرت کا گہرا مطالعہ ناگزیر ہے اور ہر بچہ کی تربیت کے لئے فرداً فرداً طریقے استعمال کرتے رہوں گے جب ہی ہر بچہ اس سماج کے رنگا رنگ تقاضوں کو پورا کر سکے گا لیکن والدین بچوں سے ان کے حقوق ان کے پیدائشی حقوق چھین لیتے ہیں وہ یہ نہیں سمجھتے کہ کچی ڈالیوں کو جھکانے سے درخت بھی جھکتا ہے والدین بچوں کے مستقبل پر پوری طرح حاوی ہوتے ہیں بچہ اپنی فطری قوتوں کو "استعمال" ہی سے برقرار رکھ سکتا ہے ماں کی اپنی زندگی میں ایسے تجربات کی بہتات ہوتی ہے جن سے ڈر کر وہ بچے کو آزادی ـــــ خاطر خواہ آزادی ـــــ دینا نہیں چاہتی۔ وہ اس حفاظت کے لئے قدم قدم پر "یہ نہ کرو" ـ "وہ نہ کرو" کے احکامات دیا کرتی ہے۔

اکثر مائیں اپنے بچوں کو چھوٹے چھوٹے "ذلیل" کام کرنے سے روکتی ہیں مثلاً وہ گھر کی صفائی میں منہمک ہونا چاہتا ہے ماں اس کو روکتی ہے کہ یہ کام نوکروں کا ہے اسے ایسے ذلیل کام نہیں کرنا چاہیے۔

اور کثیر تعداد ایسے ماؤں کی ہے جو اپنے بچوں کو چند مخصوص بچوں کی صحبت ہی میں کھیلنا، کودنا، اٹھنا، بیٹھنا پسند کرتی ہیں اور ڈرتی ہیں کہ اگر ان کا پیارا بچہ ایسے ویسے بچوں کی صحبت میں پھنس گیا تو نقصان اٹھائے گا برباد ہو جائے گا۔ اس احتیاط میں اتنی سختی برتی جاتی ہے کہ بچہ ایک محدود دائرہ میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے اور ایسی ماؤں کی بھی کمی نہیں جو چاہتی ہیں کہ ان کا بچہ کسی سے نہ لڑے کسی سے جھگڑا مول نہ لے خواہ دوسرے لڑکے اس کے جائز حقوق کو کتنا ہی کچل کر رکھ دیں۔

ایسی تربیت سے اور امید ہی کیا رکھی جا سکتی ہے۔ اگر بچہ خطرناک مواقع کا سامنا کرتے گھبراتا ہے ہمت کرنے سے گریز کرتا ہے، ناساعد حالات کا منہ توڑ جواب دینے سے احتراز کرتا ہے تو اس کو ایسی تربیت کے زیر اثر ایسا ہونا ہی چاہیئے قدم قدم پر اس کی نگہداشت کی جاتی ہے اس کی حادثے حامد کے لئے ماں اور گھر کے دوسرے افراد تیار ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ کچھ خود کچھ کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس کی اپنی فطری قوتیں زنگ کھانے لگتی ہیں اور استعمال نہ کرنے سے بیکار ہوتی جاتی ہیں بچہ صحیح تربیت سے محروم رہکر اپنا کردار برباد کر دیتا ہے۔

والدین جن بچوں کو "آوارہ"، گلی کوچوں میں پھرنے والے سمجھ کر ان کو اپنے بچے کی قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتے اکثر یہی آوارہ بچے زندگی کے بیشتر مقاصد میں کامیاب ہوتے ہیں اور وہ ان بچوں سے بہتر ہوتے ہیں جن کی صحبت گوارا کی جاتی ہے میں یہ نہیں کہتی کہ بچے کو حقیقی معنوں میں آوارہ بچوں کی صحبت میں کھیلنے کودنے کی اجازت دینا چاہیئے نہیں بلکہ ان بچوں کی تربیت کے امکانات ضرور مہیا کرنا چاہیئے۔ جو اچھے گھرانے کے ہیں لیکن من کرنا اور خواہ آزادی نصیب ہے۔

وہ بچے جو زیادہ حساس ہوتے ہیں اور ان پر یہ پابندیاں عائد کی جاتی ہیں اور ان کی حد سے زیادہ حفاظت کی جاتی ہے ایسے بچے اخلاقی مجرم، دروغ گو اور خود بین ہوتے ہیں ایسا بچہ ان بچوں کو پسند کرتا ہے جو اپنے سے چھوٹے کمزور اور احساس کمتری کے شکار ہوتے ہیں کیونکہ وہ ان بچوں کے درمیان اپنی احساس کمتری کے باوجود برتری محسوس کرتے ہیں اور سوچتا ہے کہ کم از کم ان بچوں میں تو میں ممتاز ہوں۔

اور ان بچوں کی صحبت میں وہ اپنی عادتوں کو اپنی زندگی کا فاصلہ بنا لیتا ہے جو زندگی کو بربادیوں کے سپرد کر دیتی ہیں اور یہ عادتیں اتنی گہری جاتی ہیں کہ ان کو بدلنا اس کے اختیار میں نہیں رہتا۔ وہ ان کو انہی حالتوں میں بدل سکتا ہے جبکہ اس کی ابتدائی تربیت کی وہ تمام خرابیاں دور کر دی جائیں اور ان کو یقین دلا دیا جائے کہ جن قوتوں کو وہ دوسروں میں دیکھ کر احساس کمتری محسوس کرتے ہیں وہ خود ان میں موجود ہیں اور وہ بھی ویسے ہی بن سکتے ہیں۔ جیسے کہ دوسرے۔

وہ ہر وقت ایک آگ میں جلا کرتے ہیں اور اپنی کمزوریوں کو چھپاتے ہوئے بہادری کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں اور اسی آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی سعی لاحاصل کیا کرتے ہیں جس آزادی سے دوسرے لیکن وہ خود شعوری کے تانوں بانوں میں پھنسے رہتے ہیں۔ اور دل کی بات دل ہی میں رہ جاتی ہے

اگر آپ ان کے ایسے ہمدرد بن سکیں جن پر ان کو پورا اعتماد ہے تو ان کی کہانی سنئے مجھے یقین ہے کہ ان کی داستان اتنی الم انگیز ہوگی کہ آپ کا دل پسیج جائے گا۔

اب کچھ مثالیں لیجئے۔

ایک نوجوان آرٹسٹ خود شعوری کے پھندوں میں پھنس کر اتنا لاچار ہو گیا کہ وہ کسی دوسرے فرد کے ساتھ ایک ہی کمرے میں کام نہ کر سکتا تھا۔ جب اس کی بہن کی چند سہیلیاں آ جاتی تھیں تو وہ پچھلے دروازے سے نکل جاتا تھا۔ اور اس وقت تک واپس نہ آتا تھا جب تک اسے یقین نہ ہو جاتا تھا کہ مہمان جا چکے ہیں خود اس کے اپنے دوست نہ وہ اپنے ہی حلقے تک محدود تھا ہے۔

ایک شخص میں بہت سی باتوں کی اہلیت تھی چنانچہ اس کو کئی بڑے بڑے باعزت عہدے دیئے گئے لیکن وہ ان کو سنبھال نہ سکا۔

وہ اب تنہائی کی زندگی بسر کرتا ہے اس کی صلاحیتیں اندر ہی اندر گھٹ رہی ہیں۔ اس کی خود شعوری بڑھ رہی ہے۔

• ایک سولہ سالہ لڑکا، جو بازار سے معمولی چیز بھی نہیں خرید سکتا۔ اپنی بہن کے ساتھ باہر جاتا ہے شرماتا ہوا، گھبراتا ہوا خوفزدہ، خوفزدہ سامان خرید کر بہن اس کے گھر پہنچا دیتی ہے کیونکہ اس کی خود شعوری اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ اکیلا گھر سے باہر نکلتے ہوئے وہ خوف کھاتا ہے۔

• ایک شخص ۱۵ برس تک ایک ہی فرم میں کام کرتا رہا دوسری فرموں نے اسے زیادہ باعزت جگہ دینا چاہی اور زیادہ تنخواہ کی پیشکش بھی کی۔ مگر اس نے محض اس لئے اس سنہری موقع کو ٹھکرا دیا کہ وہ نئی جگہ پر اجنبیوں کے درمیان کیسے کام کرے گا۔

وہ خود شعوری اور خود اعتمادی میں ذراسا فرق ہے صرف نظریاتی فرق۔

اول الذکر کا مریض سمجھتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر دوسروں سے مختلف ہے لیکن جسے اپنے پر اعتماد ہوتا ہے وہ یقین کرتا ہے کہ میں بھی دوسرے انسانوں کی طرح ہوں اگر میں چاہوں تو ان لوگوں کی صف میں شامل ہو سکتا ہوں جو ستاروں پر کمند لگاتے ہیں اور ان لوگوں کی پستی میں بھی گر سکتا ہوں جو اپنے کو کتوں سے زیادہ ذلیل خوار سمجھتے ہیں اگر یہ نظریاتی فرق خود شعوری کے مریض پر واضح ہو جائے تو وہ خود اعتمادی حاصل کر سکتا ہے۔

خوابوں کی دنیا سے باہر آجایئے "اے کاش" کی پُرفریب راہوں سے بچیے۔ اور اس عملی دنیا میں آیئے اگر آپ کے جسمانی قویٰ کمزور ہیں تو ان کو ورزش سے یا دوسرے محنتی کاموں سے مضبوط بنایئے اپنی کمزوریوں کا احساس ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان کا مقابلہ کرنے ہی میں نجات کی راہیں مضمر ہیں۔

وہ لوگ جو خوف سے زیادہ سے زیادہ اٹھاتے ہیں ان کے ذہن میں اپنے مستقبل کی واضح خاکے ہوتے ہیں وہ رفتہ رفتہ اپنے تصور ہی میں ان خاکوں کی پیروی کرتے ہیں اور بہت جلد وہ دن آجاتا ہے جبکہ وہ حقیقی معنوں میں ایسے بن جاتے ہیں۔

آپ اپنے میں زیادہ سے زیادہ یقین پیدا کیجئے اور بے جا خوف کو شہ دے کر اسے اپنے پر حاوی نہ ہونے دیجئے اسے اتنا طاقتور نہ بنایئے کہ آپ بالکل بے بس ہو جائیں آپ اتنے ہی قادر ہیں جتنے دوسرے لوگ لیکن صرف یقین کرنے کی ضرورت ہے آپ نے جو کچھ بھی اپنے متعلق خیالی خطرات کے محل کھڑے کر لئے ہیں ان کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

اپنی کمزوریوں کو دور کرنے میں ٹال مٹول نہ کیجئے۔ اور آج ہی سے کامیابی کی منزل کی طرف قدم اٹھا دیجئے جو جو وقت گذرے گا اتنا ہی یہ کام دشوار ہوتا جائے گا۔

اور دیوار بلند، اور بلند ہوتی جائے گی اپنی راہوں کا یقین کئے ہی بغیر مزید انتظار کے جدوجہد شروع کر دیجئے۔

دوسروں کی نکتہ چینی کی پرواہ نہ کیجئے اور نہ اس بات سے گھبرایئے کہ قدم قدم پر دوسروں کی نظریں آپ کا تعاقب کر رہی ہیں۔ اور آپ کی ایک ایک حرکت پر ہنس رہی ہیں۔

اگر آپ اپنی برتری اپنی بلندی کا مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اٹھ کر سربلندی کا دعویٰ کیجئے اور زبردستی تمام مخالفتوں کا منہ توڑ جواب دیتے ہوئے اس بلندی پر پہنچ کر ہی دم لیجئے اور یہ آپ اسی وقت کر سکتے ہیں جب کہ آپ اپنی ہی ذات کے شکنجوں سے آزاد ہوں۔

——— خود اعتمادی کسی وقت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

بقیہ صفحہ ۲۷

مہربانی ہے، اگر زندگی آسان ہی ہوتی تو کبھی آپ کو اپنی قوتوں کا اندازہ ہونا تو کجا، ان کا احساس بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے باوجود ہر مشکل ہر رکاوٹ، اور ہر کردہ غلطی کے آج ہی سے کامیاب زندگی بنانے کا تہیہ کر لیجئے کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک عمر گذرنے کے بعد آپ یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ عمر بھر جن مصیبتوں کے بوجھ تلے دبے رہے حقیقت میں وہ خیالی بوجھ تھا جو ایک ارادے کے جھٹکے سے پرے پھینکا جا سکتا تھا "کاش ایسا ہوتا"۔

س عبدالمالک ہمدم

آپ کی بدولت دوسرے کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں

کیا آپ نے کبھی سوچا ہے؟ کہ آپ کی بدولت دوسرے کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں اور وہ بھی ایسی صورت میں، جب کہ آپ کی گرہ سے کوئی پیسہ خرچ نہ ہو۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ کیونکر ممکن ہے۔ تو یقین رکھئے کہ یہ بالکل ممکن ہے۔ صرف نفسیات کے ایک زریں اصول کی بدولت!

مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں انٹرمیڈیٹ میں تھا تو میرا ایک دوست میٹرک میں پڑھتا تھا جس کا دماغ اور ذہن انتہا خراب اور پھر تھا بہر حال وہ میٹرک کے امتحان میں بیٹھا مگر ناکام ——— لیکن دوسرے سال اس کو کامیابی ہوئی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد میرے دوست کے والدین کو مشورہ دیا گیا کہ اسے مزید تعلیم ہرگز نہ دلوائی جائے۔ چونکہ اس کا ذہن ہرگز اس لائق نہیں کہ مزید بوجھ برداشت کر سکے۔ والدین کو یہ سن کر بہت صدمہ ہوا۔ چونکہ وہ بڑی بڑی آس اس سے لگائے بیٹھے تھے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ان کا اکلوتا لڑکا تھا۔ بہر صورت اس کے والدین نے ہمت نہ ہاری اور اس کا علاج کرایا۔ مگر تھوڑے عرصہ بعد ہی ڈاکٹروں نے بھی یہی رائے پیش کی کہ اس نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا یہی بہت کافی ہے اور درحقیقت یہ اس کی ہمت سے باہر تھا۔ مجبوراً اس کے والدین مایوس ہو کر بیٹھ گئے اور میرا دوست بالکل پست ہمت بنا دیا گیا۔ یہ باتیں میرے علم میں آئیں تو میں نے عہد کیا کہ ہر قیمت پر میں اپنے دوست کو کامیاب ضرور بناؤں گا اتفاق کہئے یا خوش قسمتی کہ میرے دوست کو جانوروں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس کا خیال رکھتے ہوئے میں نے اپنے دوست پر یہ انکشاف کرنا شروع کیا کہ اس کا دماغ زوالوجی کے لئے بہت موافق ہی نہیں بلکہ ایک خاص خصوصیت کا حامل ہے۔ اور وہ اس میں کافی کمال پیدا کریگا۔ شروع میں میرے دوست نے میرے ان الفاظوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ مگر رفتہ رفتہ اس نے محسوس کرنا شروع کیا کہ یہ حقیقت ہے۔ حالانکہ وہ بالکل غلط تھا اور حقیقت کا شائبہ تک بھی اس میں نہ پایا جاتا تھا۔ بہر حال میرے اس احساس نے اس میں اتنی سکت پیدا کر دی کہ اس نے کالج جائن کر لیا اور نہایت ہی انہماک سے پڑھنا شروع کیا۔ دریں اثناء میں نے سختی سے اپنے دوست کے والدین اور نجومیوں کو منع کر دیا کہ کوئی بات ایسی نہ کہی جائے۔ جو اس کو پست ہمت بنا دے۔ بلکہ اس کو یہ احساس کرایا جائے کہ وہ دنیا میں اسی خاص مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ تجربہ بہت کامیاب رہا اور یقین جانئے کہ یہی کمزور ذہن کا لڑکا ایک بہترین زوالوجسٹ ثابت ہوا آج وہ ایک ہزار سے زیادہ مشاہرہ پاتا ہے۔ کس کی بدولت، صرف نفسیات کے اصول کی بدولت!

چارلس ڈیکن مشہور انگریزی مصنف کی سوانح حیات کا مطالعہ اگر آپ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کو ایک کامیاب مصنف بنانے میں نفسیات اور صرف نفسیات کا ہاتھ تھا۔ لیجئے اس کی بھی سوانح حیات ——— چارلس ڈکن مضمون نگار بننے کا بیحد آرزومند تھا۔ مگر حالات سخت غیر موافق تھے۔ اس کی ابتدائی تعلیم صرف چار سال تک ہو سکی تھی۔ پھر بدقسمتی یہ کہ اس کا باپ جیل میں سخت سزا بھگت رہا تھا کیونکہ وہ کچھ قرض ادا نہ کر سکا تھا۔ اس نوجوان کو فاقے بھی کرنے پڑے۔ آخر کار اس کو لیبل چسپاں کرنے کی

ایک ایسے گودام میں جگہ ملی۔ جہاں چوہوں کی کثرت تھی۔ وہ شہر لندن کے خراب وخستہ ترین و تیرہ و تاریک حجرے میں دو لڑکوں کے ساتھ رات گذارتا تھا۔ اسے اپنی قابلیت پر مطلق بھروسہ نہ تھا اور ہونا بھی نہ چاہیئے تھا۔ رات کی تاریکی میں وہ خاموشی سے باہر نکل کر اپنے لکھے ہوئے مضمون کسی ڈاکخانہ میں جھونک دیتا تاکہ کوئی اس کا مذاق نہ بنا سکے۔ پے در پے اس کے کتنے ہی مضمون نامنظور ہوئے مگر آخر ایک دن اس کی مراد بر آئی۔ اس کے مضمون نے ایک رسالہ میں جگہ پائی۔ گو اس کو اس کا کوئی معاوضہ نہ ملا۔ مگر مدیر نے اس کی خوب تعریف کی اور اسے محسوس کرایا کہ اس کا دماغ مضمون نگاری کے لئے بہترین ہے۔ مدیر کی اس خلاف توقع توصیف کی بدولت وہ ساری رات سراسر مسرت بہاتا رہا تعریف و توصیف کے چند جملوں نے اس کی کایا پلٹ کر دی۔ اور آگے جا کر وہ ایک مایۂ ناز مصنف ثابت ہوا۔

اسی قسم کا ایک واقعہ اور سنئے۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں ایک لڑکا لندن کے ایک دفتر میں چپراسی کی خدمت پر مامور تھا۔ مگر دو سال کی شدید اور ناقابل برداشت مشقت سے وہ عاجز آگیا تھا۔ چونکہ اسے دن کے چودہ گھنٹے غلامی میں گذارنے پڑتے تھے۔ آخر کار ایک دن یہ غلامی رنگ لائی اور ایک صبح وہ بغیر ناشتہ کئے ہوئے پندرہ میل چل کر اپنے گھر پہنچا۔ وہ بدحواس ہوگیا تھا۔ اس نے ماں کو تمام درد بھری کہانی سنائی اور اس سے بھی آگاہ کر دیا کہ اگر اسے کام کے لئے مجبور کیا گیا۔ تو وہ خودکشی کرے گا۔ بعدازاں اس نے ایک پرانے استاد کو ایک درد انگیز خط لکھا اور یہ بھی لکھا کہ وہ زندگی سے بیزار ہوگیا ہے اور اس کا جگر چاک ہو رہا ہے۔ اس کے استاد نے جو کہ نفسیات کے اصول سے واقف تھے اس کو یقین دلایا کہ وہ ایک نہایت ہی ذہین لڑکا ہے اور بڑے کاموں کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہے۔ اس تعریف سے لڑکے کی تقدیر ہی پلٹ گئی۔ اور اس کی بدولت انگریزی ادب کے خزانہ میں گرانقدر اضافہ ہوا۔ اس لڑکے نے بعد میں کتابیں لکھیں۔ آپ یقیناً اسے جانتے ہوں گے۔ وہ تھا۔ ایچ۔ جی۔ ویلیس!

اس قسم کے واقعات سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ مگر بہت کم لوگ اس اصول سے واقف ہیں۔ دیکھا آپ نے صرف چند ہمت دلانے والے اور تعریف میں ڈوبے ہوئے الفاظوں کی کیا قیمت ہوتی ہے۔ آپ اپنے چاروں طرف نظر ڈالئے اور ایک سرسری جائزہ لیجئے کہ آپ اس اصول کو کہاں استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر آپ ان کی پوشیدہ خوبیاں ان پر واضح کر دیں۔ تو آپ نہ صرف ان کے حالات زندگی کو کامیاب بنا سکیں گے بلکہ نمایاں کام کرنے میں بھی ان کی مدد کریں گے۔ جہاں کہیں بھی آپ کو موقعہ مل سکے۔ آپ معمولی سی معمولی اصلاح کی تعریف کیجئے اور ہر ترقی کی داد دیجئے۔ اسے محسوس کرائیے کہ وہ اسی مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور مدح سرائی میں کوئی کسر باقی نہ رکھئے۔

کی کامیابی کا دارومدار اگرچہ صلاحیت، ریاض اور مشق پر ہوتا ہے لیکن باقاعدگی کے سبب نہیں ہوتی کیونکہ علم و فن کو انھوں نے باقاعدہ ماہرین فن سے یا ان کی کتب سے حاصل کیا عطائی اور اکتسابی گویے اس کی بہترین مثال ہیں گانا عطائی لوگ بھی گا لیتے ہیں بلکہ بعض تو بہت ہی عمدہ گاتے ہیں چند تو سامعین کو مسحور و بیخود کر دیتے ہیں لیکن تال سُر سے واقفیت باقاعدہ نہیں ہوتی عوام اس کا اندازہ نہ کر سکیں لیکن ماہرین فن کو فوراً اندازہ ہو جاتا ہے یہی حال علم نفسیات اور فلسفہ کا ہے جیسے کہ ہر علم و فن کا۔ چنانچہ جس قدر ضروری نفسیات کا مطالعہ ہے اسی قدر ضروری اس کی باقاعدگی ہے ماہرین نفسیات نے اپنی تمام زندگی مشق و تجربہ کا نچوڑ اور ماحصل کتب کی صورت میں ہمارے لئے اپنی یادگار چھوڑا ہے متعدد درسگاہوں میں بھی اس کی تعلیم دی جاتی ہے چنانچہ نفسیات کے مطالعہ کی مشق سے پہلے ہم پر فرض ہے کہ مطالعہ کا صحیح طریقہ سیکھیں دماغ کی ساخت، اس کے افعال کا جائزہ لیکن ذہن و نفس کا صحیح مفہوم سمجھیں۔ اس کی وسعتوں اور شعبوں پر عبور حاصل کریں ان کے اختلافات و وجوہ پر غور کریں اصلاح کے پہلوؤں پر نظر ڈالیں۔ اپنے دماغ و ذہن و نفس کا مکمل جائزہ لیں۔ اس میں زائد سے زائد اصلاح کی سعی کریں اس کے بعد نہایت ہمت اور دلیری سے میدان عمل میں بے خوف او نڈر ہو کر نکل آئیں کامیابی انشاء اللہ قدم چوم کر استقبال کرے گی میرا مخاطبہ ان حضرات سے ہے جنہوں نے ابھی تک علم نفسیات کی تعلیم باقاعدگی سے حاصل نہیں کی انہی حضرات کی خدمت میں آئندہ بھی وقتاً فوقتاً اپنی استعداد کے مطابق کچھ عرض کرتا رہوں گا ماہرین اور منتہی حضرات کے نظریات اور مقالے مبتدیوں کے فہم و ادراک سے باہر ہوتے ہیں اگرچہ اسی مبتدیوں کے گروہ سے منتہی وجود میں آتے ہیں اور ماہنامہ سائیکولوجی کے قارئین میں جہاں اکثر منتہی ہوں گے ! ہاں کچھ مبتدی بھی ضرور ہوں گے میں خود چونکہ منتہی نہیں اس لئے میری خدمات اس گروہ کے لئے شاید مفید ہو سکیں۔

لاگ لگاؤ کے بغیر!

شاہکار فطرت: مصنف خان بہادر سید اصغر عباس صاحب

مجلد، صفحات ۴۴۴ قیمت ۵ ملنے کا پتہ:۔ خان بہادر سید اصغر عباس نمبر ۲ جیکب لائن کراچی

کسی قوم کی زندگی میں جسمانی آزادی کوئی چیز نہیں ہے جب کہ ذہنی آزادی اس کو نصیب ہو۔ بدقسمتی سے ہمارا ملک باوجود آزادی کے ابھی تک ذہنی غلامی میں گرفتار ہے اور اس کے ثبوت میں وہ مضامین اور کتابیں پیش کی جا سکتی ہیں جو آزادی کے بعد سے شائع ہو رہی ہیں۔ اور جن کا پس منظر مغربی تفوق کا آئینہ دار ہے۔ نفسیات پر بھی ابھی تک جو کچھ لٹریچر شائع ہوا ہے وہ صرف فرائڈ اور اس کے حواریوں کے ارشادات پر مشتمل تھا اور ہمیں خوشی ہے کہ اس ماحول کے خلاف سب سے پہلے خان بہادر سید اصغر عباس صاحب نے آواز بلند کی اور اپنی تصنیف "شاہکار فطرت" پیش کر کے نفسیات کے تمام اعلیٰ اصولوں کا سلسلہ قرآن سے جا ملایا ہے اور جہاں کہیں اختلاف ہے وہاں اس اختلاف کا اچھا خاصا تجزیہ بھی کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ کتاب کے دو پہلو اور بھی ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اول تو یہ کہ تحریر میں مذہبی رنگ زیادہ غالب ہے۔ حالانکہ آجکل کے لوگ مذہب سے زیادہ سائنس سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اسلام کے عام نظریہ جمہوریت کے خلاف کتاب کا زیادہ حصہ خلافت اور امامت کی بحث پر صرف کر دیا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ امامت اور خلافت منجانب اللہ ہے اور عوام کو چنانے کا کوئی حق نہیں حالانکہ دنیا میں آج جس قدر جمہوریت کی ضرورت ہے۔ شاید اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی ہوگی لکھائی چھپائی اور قیمت کے لحاظ سے بھی کتاب اچھی ہے۔

ل۔م شاہد

اگر آپ کو زندگی سے محبت ہے

آپ سوچتے سوچتے بہہ جاتی ہیں۔ ہنستے ہنستے آپ کی آنکھوں میں آنسو تھم جاتے ہیں اور ان بھیگی بھیگی سی آنکھوں میں کسی کی تصویر گھومنے لگتی ہے۔ آپ کے ذہن میں بہت سے نقوش ابھرتے ہیں۔ وہ نقوش جو لطیف تھے۔ جو آپ کو بے حد مرغوب تھے۔ میں جانتا ہوں کہ آج آپ کا محبوب آپ سے بہت دور ہے۔ وہ آپ کے قریب اب آ نہیں سکتا۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ اسے یاد کرتی ہیں۔ زندگی کو گھُلا رہی ہیں۔ آپ تو ایک معمولی سی کرسی کو دیکھ کر اُداس ہو جاتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس کرسی پر کبھی آپ کا محبوب بیٹھا کرتا تھا۔ جب غیر ارادی طور پر آپ کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں تو ایکدم آپ کا ذہن گھومنے لگتا ہے اور ایسا سے آپ کرسی پر ہاتھ پھیرنے لگتی ہیں۔ جیسے کبھی آپ اپنے محبوب کے بالوں میں انگلیاں پھیرا کرتی تھیں اور آپ گھنٹوں تصورات میں ڈوبی رہتی ہیں۔ سوچتی چلی جاتی ہیں۔ اور اسی سوچ بچار میں گھر کے ضروری کام پڑے رہ جاتے ہیں۔ جب سوچتے سوچتے آپ تھکی ہو جاتی ہیں۔ تو گھر کے بہت سارے کاموں کو دیکھ کر آپ پریشان ہو جاتی ہیں۔ سوچتی ہیں کہ اتنے کام کیسے ہوں گے؟ دن کافی نکل چکا ہے اور آپ کی پریشانی بڑھتی جاتی ہے۔

کبھی کبھی خوشی میں اگر آپ ریکارڈ بجاتی ہیں تو درد بھرے گیت آپ کی اُداسی کے باعث بن جاتے ہیں۔ لیکن آپ اُداس کیوں ہوتی ہیں۔ اگر ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے آپ کے ذہن میں پرانی باتیں اُبھر آتی ہیں تو اُبھرنے دیجئے۔ انہیں اُبھرنے کا حق بھی تو ہے۔ لیکن آپ پرانی یادوں کے دباؤ میں دب کیوں جاتی ہیں۔ اُن پرانی یادوں میں سے ایک ایسی یاد کو قبول کیجئے۔ جس سے خوشی۔ زندگی اور محبت کی وابستگی آپ نے کبھی محسوس کی تھی۔ آج بھی آپ محبوب کو کھو کر زندگی سے پیار کر سکتی ہیں۔ مگر شرط ہے کہ آپ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے اپنے کو بلند سمجھیں اور محبوب کا کہنا کیا؟ وہ تو آپ کے بہت قریب ہے۔ پھر آپ اُداس ہو کر زندگی کے ساتھ بے انصافی کیوں کرتی ہیں۔ مان لیا جائے کہ آپ کا محبوب آپ سے بہت دور ہے۔ پھر اس نے ضرور اپنے لئے کوئی دلچسپی ڈھونڈ نکالی ہوگی۔ آپ بھی کوئی دلچسپی تلاش کیجئے۔ ہزاروں دلچسپیاں آپ کے اردگرد آپ کی توجہ کی منتظر ہیں۔ ان دلچسپیوں میں کھو جائیے۔ پھر آپ کی زندگی شاد رہے گی ہمیشہ خوشیوں سے آباد رہے گی۔

سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ آپ کنواری لڑکی نہیں ہیں بلکہ ایک شادی شدہ عورت ہیں اور ایک شادی شدہ عورت پر سماج کی طرف سے بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ آپ اُداس رہتی ہیں۔ کیا آپ کی یہ اُداسی آپ کے شوہر کے لئے باعث تکلیف نہیں۔ آپ کیوں اپنے شوہر کو دُکھ دیتی ہیں۔ کیا حق ہے آپ کو؟ جبکہ آپ کا شوہر ہر ضرورت کی چیز مہیا کرتا ہے۔ جبکہ وہ آپ سے پیار کرتا ہے۔ پھر آپ ایسا کیوں کرتی ہیں۔ شوہر ہی آپ کا سب کچھ ہے۔ اگر آپ اپنے شوہر کو ناراض کر دیں گی۔ تو آپ کی زندگی بھٹک جائے گی اور سماج آپ کو بُرے ناموں سے پکارے گا۔ سماج کی نظروں سے آپ بچ نہیں سکیں گی۔ آنسو بہا کے آپ سماج کو موقع دیجئے کہ وہ آپ پر انگلیاں اٹھائے۔ آج آپ شوہر کے سامنے ملکہ ہیں۔ اگر آپ کی اُداسی یہ ثابت کر دے کہ آپ کسی کی یاد میں آنسو بہاتی

ہیں تو آپ ملکہ سے لونڈی بنا دی جائیں گی۔ پھر لونڈی کی زندگی آپ کو راس نہ آسکے گی۔

ابھی ابھی آپ میری باتوں پر دھیان نہیں دے رہی ہیں۔ سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ آپ کا محبوب آجکل ایک نئی لڑکی سے عشق کر رہا ہے اور آپ خواہ مخواہ اس کی یاد میں گھلی جا رہی ہیں۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ایسا ہی ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا ——— اور اب میری بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہے۔ اسی بات پر ذرا سا مسکرا دیجئے ——— مسکرا دیجئے بھی ——— لیجئے میں بھی مسکرا رہا ہوں۔ دیکھئے میری مسکراہٹ کتنی حسین ہے ——— مسکرایئے ——— مسکرایئے ——— خوب! کتنی خوب صورت مسکراہٹ ہے آپ کی ——— اس مسکراہٹ میں زندگی ——— خوشی اور محبت سب کچھ ہے ——— ایک مدت سے آپ نے مسکرانا چھوڑ دیا تھا۔ آج جب آپ مسکرائی ہیں تو سارا جہاں مسکرا رہا ہے۔ لیجئے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ شاید آپ کا شوہر آ رہا ہے۔ جلیئے ——— مسکراہٹوں کے ساتھ شوہر کا خیر مقدم کیجئے۔ ان کی تمام دن کی تھکاوٹ آپ کی مسکراہٹ سے دور ہو جائے گی۔ مسکراہٹ زندگی کا نام ہے۔ امید ہے کہ آپ ہمیشہ مسکراتی رہیں گی۔ کیونکہ آپ کو زندگی سے محبت ہے !!!

صنعتی مزدوروں کی دیکھ بھال

یہ تو ہم سب ہی جانتے ہیں کہ انسانی جسم ایک مقررہ حد سے زیادہ کام نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اپنی طاقت سے بڑھ کر کام کرے گا۔ تو اس میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اس کے علاوہ بہت سی بیرونی عناصر مثلاً انتہا درجہ کی گرمی اور سردی بھی انسانی جسم کی طاقت پر اثر ڈالتے رہتے ہیں۔

برطانیہ بھر میں سائنٹیفک ریسرچ کرنے والے اس وقت صنعتی مزدوروں سے متعلق مسائل کو حل کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ وہ ایسے ایسے طریقے نکال رہے ہیں جن کی مدد سے صنعتی مزدور اپنی صحت کو خراب کئے بغیر زیادہ وہ بہتر کام کر سکیں۔

کیمبرج میں پروفیسر سر فریڈرک بارٹ لیٹ کی زیر نگرانی میڈیکل ریسرچ کونسل کا نفسیاتی ریسرچ کا ادارہ اپنی تجربہ گاہ میں انسانی جسم کی حرکات کا تجزیہ کر رہا ہے۔ اس ادارے کے بعض تجربات کے نتائج پہلے ہی سے صنعتی مسائل کو حل کرنے کے لئے استعمال میں لائے جا رہے ہیں۔ بہت سے مسائل جن کے متعلق تجربے کئے جا رہے ہیں۔ مزدوروں کے کام کرنے کے حالات اور ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ تحقیق کرنے والے یہ معلوم کر رہے ہیں کہ انتہا درجہ کی گرمی سردی کا صنعتی مزدور کی کارکردگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس کی بڑھتی ہوئی عمر کہاں تک اس کی ہنرمندی اور قابلیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔

اسی طرح آکسفورڈ میں یہ تحقیق کی جا رہی ہے کہ مشینوں کی ساخت کہاں تک انسانی جسم کی ضرورتوں کے مطابق ہونی چاہئے ——— دوسرے انسانی مشین پر گرمی کا کیا اثر پڑتا ہے۔ ان تمام تجربوں کے نتائج کو آلات، مشینوں اور مزدوروں کے لباس کا ڈیزائن تیار کرتے وقت پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

برمنگھم میں صنعتی پیداوار کی مشاورتی کونسل نے ایک ادارہ قائم کیا ہے جس میں ڈاکٹر، انجینئر اور دوسرے ماہرین کام کرتے ہیں۔ اس ادارے کا کام صنعتی مزدوروں کی صحت کے مسئلوں سے نپٹنا ہے۔ اور ان کو جہاں تک ممکن ہو سکے حادثوں سے بچانا ہے۔ تمام ماہرین اپنی متحدہ کوششوں سے مزدوروں کی خراب صحت اور حادثوں کی وجوہات معلوم کرتے رہتے ہیں اور بعد میں ایسے اقدامات کا مشورہ دیتے رہتے ہیں جن کی مدد سے مزدوروں کی صحت کا معیار اونچا ہو سکے اور حادثات کی روک تھام ہو سکے۔

مقبول عالم

ترازو

شاہد پیار چاہتا تھا۔ پیار نہیں ملا۔ جب رونا چاہا ہنسنا پڑا۔ زندگی کی ترازو میں اس کا کیا وزن تھا؟ ایک پلڑے میں آنسو دوسرے میں گھٹن ـــــ پھر قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے۔ وہ پہاڑوں کے پیچ و خم میں تھا۔ جہاں نہ گھماؤ تھا اور نہ راہیں ـــــ وہ غم کے ہاتھوں [illegible] ساتھ تھا۔ لمبے فضا میں کانٹے ہی کانٹے نظر آ رہے تھے۔ پھر بھی جینے کے لئے ایک نئی خلش پیدا ہو گئی۔ اب پت جھڑ اور خزاں میں لطف آ رہا تھا۔ اس کی زندگی کے پس منظر چچازاد بہن شمیم اور بڑے بھائی عابد تھے۔ تینوں سمندر کی سطح پر تیر رہے تھے۔ اندرونی تلاطم کا پتہ نہیں تھا۔ دنیاوی نظام نے غم کی چٹکیاں لیں۔ انھیں جینے کے لئے ہٹایا۔

بچپن شمیم کے ساتھ گذرا۔ معصومانہ انداز کے ساتھ شرارتوں میں اضافہ رہا۔ محبت کی رنگ آمیزی ہوئی۔ ہواؤں کو اٹکھیلیاں سوجھیں کلیاں چٹخنے لگیں۔ اب ہر چیز میں محبت و جوانی کی بہار نظر آنے لگی۔ ایک مقناطیسی کشش تھی۔ شمیم کی مسکراہٹ شاہد کے دل کی مسکراہٹ بن گئی تھی۔ شمیم روزانہ اپنی انگلیوں سے کیاری کی مٹی ہٹاتی۔ پودوں کے ارد گرد کھاد پھیلاتی۔ اتنی دیکھ بھال کرنے پر بھی وہ دھوپ سے مرجھا جاتے لیکن وہ ان کی نشو و نما چاہتی تھی۔

ایک رات تقریباً دس بجے تھے۔ شاہد کمرے میں بیٹھا اسٹڈی کر رہا تھا۔ شمیم دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں کتاب تھی۔ وہ میز کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

"آج مجھے تاریخ پڑھا دیجئے" اتفاق سے شمیم کے ہاتھ سے سرخ روشنائی گر پڑی۔

"شمیم ان خونیں قطروں کا مقصد سمجھتی ہو؟"

"میں اس کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"چھپاتی ہو؟"

وہ انگلیوں کے گرد ساڑی کا دامن لپیٹ رہی تھی۔ بار بار نظروں کے تصادم سے وہ شرما جاتی۔

دن یونہی گذرتے چلے گئے۔ سال مہینے، مختصر لمحات بن گئے۔ اچھوتے خیالات آتے۔ مگر باتوں ہی باتوں میں ٹال دیتے۔ شاہد سوچتا اگر شمیم میری شریک زندگی بن گئی۔ رنگین ساعتیں ہوں گی۔ کامرانی قدم چومے گی۔ کلیاں چٹک کر پھول کی قبا پہن رہی تھیں۔ شاہد کا میٹرک کا نتیجہ نکل آیا۔ گھر میں سب کو خوشی ہوئی۔

"میں مبارکباد دیتی ہوں"

"شکریہ" شاہد کا مختصر جواب تھا۔

"اور مٹھائی" وہ بولی۔

پھر ایک مرتبہ شمیم نے اپنی تصویر فریم میں دیکھی۔ شاہد نے شرارت سے کہا۔

"شمیم جب تم ضد ہوگی۔ تمہاری تصویر ساتھ دے گی۔"

"سراسر جھوٹ۔"

"ایک بات بتاؤ تمہیں یہ باتیں پسند ہیں؟"

"آپ کیوں پوچھتے ہیں؟"

"میری زندگی کا بڑا سوال ہے۔"

"میں کیوں بتاؤں؟"

"کیا ناراض ہو؟"

"محبت کی باتیں زبان سے نہیں بلکہ آنکھوں سے بتا دی جاتی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ بھاگ گئی۔

پھر شاہد نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ شہر سے دور ہو گیا۔ شمیم سے الوداعی ملاقات ہوئی۔ شمیم کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ جو دامن میں جذب ہو گئے۔ شاہد کالج چلا آیا۔ یہاں آکر عجیب تبدیلی ہو گئی۔ تنہا اسٹڈی کرتا۔ کبھی مستقبل کے دھندلے خاکے سامنے آتے۔ درحقیقت شمیم زندگی کا عنصر بن چکی تھی۔ اکثر خیال کرتا تعلیم حاصل کرنے کے بعد شمیم سے شادی ہو جائے گی۔ پھر زندگی مسرتوں سے مالا مال ہو جائے گی۔ اسی خیال میں کمرے کی روشنی بجھ گئی۔ روشنی تاریکی میں تبدیل ہو گئی۔ عورت بھی بدلتی رہتی ہے۔ ماں، بہن اور بیوی ہر ایک روپ میں آتی ہے۔ ادھر ایف اے کا امتحان ختم ہوا۔ شاہد گھر آیا۔ نہا دھو کر کھانا کھایا۔ پھر کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ بھلا نیند کہاں آنے والی تھی۔ دروازہ کھلا۔

"تم شمیم!"

"ہاں!"

"آپ بہت برے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"یہی کالج میں دل خوب بہلایا۔"

"ہاں اب بھی وہ تنہا باتیں یاد آتی ہیں۔ بس تم جیسی ایک تصویر تھی۔ ایسی ہی نشیلی آنکھیں، خوب صورت چہرہ، لمبے لمبے بالوں والی، یہی بناتی تم ہی تھیں۔" اس وقت شمیم کی تصویر کا خیال تھا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟" حیرت سے اس نے پوچھا۔

"کیا جھوٹ سمجھتی ہو؟"

"کاش میں کچھ بھی نہ سمجھوں۔" اس کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"ارے واہ میری باتوں سے ناراض ہو گئیں۔"

وہ کمرے سے باہر جا چکی تھی۔ شاہد حیران تھا۔ اس کے بعد شمیم ہر وقت دور ہی رہتی۔

شاہد دوبارہ کالج چلا آیا۔ اب چوتھا سال تھا۔ ابھی امتحان میں ایک مہینہ باقی تھا۔ یکایک بڑے بھائی کا خط آیا۔ پھر تار آیا۔ لکھا تھا۔ شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ تم اپنے بھائی کی شادی میں فوراً شریک ہو جاؤ۔ اس وقت شاہد مجبور تھا۔ پھر امتحان ختم ہوتے ہی گھر چل پڑا۔ ٹرین تیزی

سے گذر رہی تھی۔ پہاڑ۔ دریا۔ جنگل سب ہی دوڑتے نظر آرہے تھے۔ شاہد کے خیالات نئی فضا تیار کر رہے تھے۔ اسے خیال تھا۔ انھوں نے دو بہن نسیم سے بھائی صاحب کی شادی ہوئی ہوگی۔ جاتے ہی نسیم بھابی کو خوب چھیڑے گا۔ گھر پہونچا۔ اس کی امی جان نے سینے سے لگایا، پیار کیا۔ دوسری طرف بھابی شاہد کو دیکھتے ہی اوپر کمرے پر بھاگ گئیں۔

"ہماری بھابی کس قدر شرماتی ہیں؟"

"ہاں بیٹا! شرمیلی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں"

شاہد کی امی جان تو چلی گئیں۔ شاہد اوپر گیا۔ مگر کمرہ اندر سے بند پایا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب میں بالکل خاموشی، اتفاق سے کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔ شاہد اندر چلا گیا۔ بھابی مسہری پر منہ چھپائے پڑی تھیں۔ شاہد قریب پہونچا۔ ہچکیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"ارے یہ کیا، اچھا میں نہ چھوڑوں گا۔ دیکھو تمھارے لئے خوب صورت گھڑی لایا ہوں نسیم بھابی! ذرا اپنا ہاتھ تو لاؤ میرے پاس— میں گھڑی باندھ دوں"

"اُف———— اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ شاہد نے اس کا ہاتھ زبردستی ہٹایا۔ اس کے ساتھ ہی شاہد کے سامنے ساری کائنات لرزتی دکھائی دی۔ شاہد کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"تم———— ! میری تمناؤں کا مرکز———— میری آرزوؤں کی دنیا———— میری شمیم————!"

"ہاں میں تمھاری بدنصیب بھابی ہوں" اور آنسوؤں کا سیلاب جاری ہوگیا۔

شاہد کے رنگین تصورات درہم برہم ہوگئے۔ یہ شادی زندگی کا اہم مسئلہ تھی۔ یہی زندگی موت بن گئی۔ شادی زندگی کا سودا ہوگئی۔ والدین۔ عزیز اقارب نے لڑکے یا لڑکی کے جذبات۔ خیالات اور احساسات کو فطری قانون کی ترازو میں نہیں تولا تھا۔ اب تو شمیم کی زندگی کا سودا ہو چکا تھا۔ گاہک نے قیمت ادا کردی تھی۔ دراصل شمیم کے پاؤں میں زنجیریں پڑ چکی تھیں۔ ایک وقت وہ تھا۔ جب عورت کو زندہ مرد کی لاش کے ساتھ جلا دیا جاتا تھا۔ اب عورت خود چلتی پھرتی لاش ہے۔ کہنے کو تو شمیم کی زبان تھی۔ لیکن خاندانی خوشی نے قربانی مانگی۔ خاندانی عزت اور بزرگوں کے آگے شریف لڑکی کی زبان بند تھی۔ جوہری جب سونا تولتا ہے تو ترازو کے پلڑوں کو شیشہ کی الماری میں بند کر دیتا ہے۔ تاکہ گرد و پیش کی ہوا سے بچا رہے۔ مگر یہ دنیاوی قانون فطری قانون کو نہیں بدل سکتے۔ کون چیز کا وزن جانے۔ اب شمیم کے سامنے دو پلڑے تھے۔ ایک میں محبت پرستی دوسرے میں شوہر پرستی!

ادھر شاہد سب کچھ لٹا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ گھر میں طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کیا۔ بڑے بھائی ڈاکٹر کو لائے۔ شاہد نے ٹال دیا———— آہ میرے بھائی کو میری کس قدر ہمدردی تھی۔ لیکن شاہد کے درد کا کیا علاج تھا۔ آنسو آنکھوں سے نکلنے کے بعد دوبارہ کیسے سما سکتے ہیں؟

اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ شمیم شاہد کے لئے کھانا ساتھ لے کر آئی۔

"دروازہ کھولئے!"

"کون؟"

"میں شمیم بھابی"

شاہد نے دروازہ کھولا۔ شمیم اندر داخل ہوئی۔ میز پر کھانا رکھ دیا۔

"اب آنسو بہانے سے کیا فائدہ؟ بھول جاؤ۔ صبر کرو"

"تمھیں بھول جاؤں۔ صبر کروں۔ آہ———— میری زندگی کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا———— میری خوشیاں پامال ہوگئیں————

"الف ـــــــ کالج کی تنہا راتوں میں محض تمہاری ایک تصویر تھی۔ تنہا بیٹھا باتیں کرتا۔ دل بہلاتا۔ ان نشیلی آنکھوں میں اپنی زندگی کا عکس دیکھتا ان سب کو کیسے بھول جاؤں"؟

"الف ـــــــ میں غلط فہمی میں تھی۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی"

"اب میں نے آخری فیصلہ کر لیا" شاہد نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

"کیا؟" ـــــــ

"یہی کہ تم سے دور اور خاندان سے دور رہوں گا"

"کہاں جائیں گے آپ"؟

"جہاں منزل اور راستہ دونوں نظروں سے اوجھل ہوں گے"

شمیم نے کھانا کھلایا پھر وعدہ لیا کہ کوئی خوفناک ارادہ مت کرنا۔ دنیا محض نظارے کے لئے نہیں ہے۔ جب بن جاتی ہے تو عجیب سانحات اور حادثات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ میرے لئے نہیں بلکہ محبت کی خاطر جینا، اس میں چاہے ہر سانس کے ساتھ خون آمیزی ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ شاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ شمیم فرشتوں کی دنیا میں رہتی ہے۔ ایک طرف وہ وفا شعار بیوی تھی۔ شوہر پرستی اس کا ایمان تھا۔ دوسری طرف موت بھی محبت کے رنگ کو خاموش نہیں کر سکتی تھی۔ آنسو اور گیت کی مضراب سے تارِ حیات چھیڑ دیا۔ وہی فضا میں پھیل گیا۔ وہ منزل سے دور تھک کر بیٹھ جانا نہیں جانتی تھی۔ شاہد زیادہ وحشتناک و المناک گیت نہیں سن سکتا تھا۔ بغیر گھر والوں سے ملے وہ گھر سے نکل پڑا۔ اس نے اس زمین ہی کو چھوڑ دیا۔ جہاں لاکھوں آنکھوں کے موتی دفن کئے تھے۔ وطن سے دور نئی دنیا۔ نئے انسان، نیا ماحول نئے مناظر۔ لیکن ان میں کوئی کشش نہ تھی۔ وہ وطن کی یاد کو بھلا نہ سکا۔ سامنے ہوا کے جھونکے وطن کے بہار آفرین پیام دیتے تھے۔

آتے ہی اسے سروس مل گئی۔ پرنسپل صاحب خود بخود مہربان ہو گئے۔ مکان کا مسئلہ بہت اہم تھا۔ ان کے ذریعے آسان ہو گیا۔ ادھر پرنسپل صاحب کی لڑکی رشیدہ اس کے قریب ہوتی گئی۔ شاہد کی کتابیں درست کرتی۔ صفائی کرتی۔ بستر ٹھیک کرتی۔ ایک رات شاہد کافی دیر ہو گئی۔ رشیدہ انتظار کر رہی تھی۔ شاہد آیا۔ فوراً کھانا لے کر رشیدہ آئی۔

"اسے اتنی تکلیف کی کیا ضرورت ہے"؟ شاہد نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"پردیس ہے نا" کھانا سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"مگر اب پردیس وطن ہو گیا"

"شکریہ"

"رشیدہ ایک بات پوچھوں"!

"پوچھئے"

"میرا اس قدر کیوں خیال کرتی ہو۔ مرجھائے ہوئے پودے کبھی سرسبز نہیں ہوتے"

"مگر مالی ان پودوں کو دوبارہ تازگی دے سکتا ہے"

"تمہیں نہیں معلوم! میری زندگی کی بہاریں ختم ہو گئیں"

"آپ اس قدر مایوس ہو گئے۔ دنیا میں بڑے بڑے انقلاب آتے ہیں۔ دریا کا طوفان اگر تباہی لاتا ہے تو دوسری طرف زرخیزی بھی لاتا ہے۔ کیا زندگی کے لئے آنسو بہا کر بوسے کئے جاتے ہیں"

شاہد، رشیدہ کو کیونکر سمجھاتا۔ اس کی ہمدردی محبت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ نادان تھی۔ وہ شاہد کا سہارا چاہتی تھی جو خود ہی بے سہارا تھا۔ شاہد بیمار ہو گیا۔ پرنسپل صاحب نے پوری ہمدردی سے کام لیا۔ ڈاکٹروں کو دکھایا۔ تیمارداری میں کافی روپیہ خرچ کیا۔ لیکن حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ ایک رات شاہد کی آنکھ کھلی تو دو بجے تھے۔ سرہانے رشیدہ بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔

"تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟"

"خدا کا شکر ہے آپ کو ہوش آ گیا!"

"کاش مجھے ہوش نہ آتے!"

"آپ دل چھوٹا نہ کریں!"

تقریباً ایک سال سے شاہد گھر والوں سے بے خبر تھا۔ ایک دن یکایک بڑے بھائی اور شمیم آ گئے۔ وہ حیران رہ گیا لیکن بعد میں پتہ چلا۔ پرنسپل صاحب نے شاہد کا پتہ اور فوٹو اخبار میں شائع کرا دیا تھا۔ پرنسپل صاحب شاہد اور رشیدہ کا رشتہ چاہتے تھے۔ اسی لئے خاندان کا پتہ چلانا چاہا۔

"ارے بھائی جان آپ؟" شاہد نے تعجب سے کہا۔

"شاہد تم نے بڑی سزا دی" اس کے ساتھ آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"کتنا پیارا بچہ ہے؟" شمیم کی گود سے بچہ کو لیتے ہوئے کہا۔

"شاہد تم جانتے ہو، تمہاری شمیم کس قدر سیدھی سادی ہے۔ مجھے اپنی زندگی کا راز بنا دیا۔ عورت زیورات سے زیادہ محبت کرتی ہے لیکن اس نے تمام زیورات فروخت کر کے تمہیں خرید لیا۔ وہ ایک باوفا بیوی نہیں بلکہ تم سے بے پناہ محبت بھی کرتی ہے۔ تم دونوں کی قربانیاں میں جانتا ہوں۔

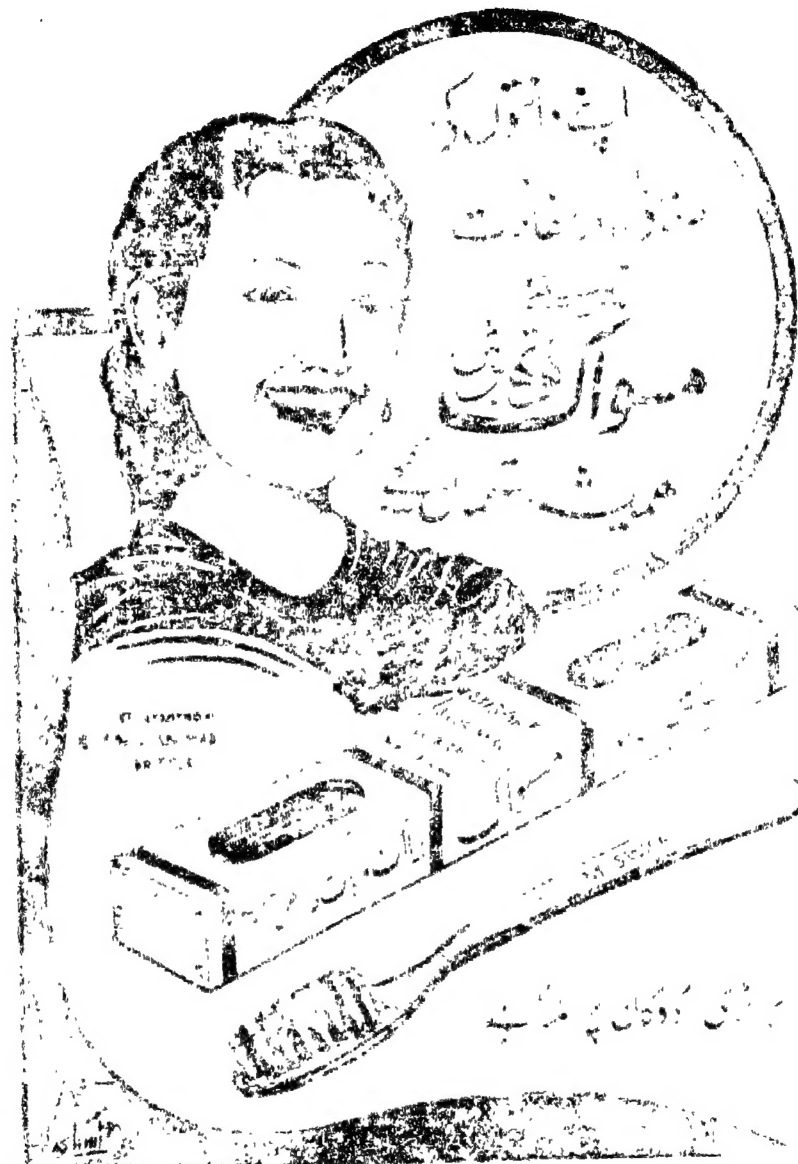
کاش! مجھے پہلے معلوم ہوتا، تم دونوں کے راستہ سے ہٹ جاتا۔ اب میں نے ارادہ کر لیا ہے، شمیم کو طلاق دے دوں گا، پھر وہ تمہاری بیوی ہو جائے گی۔

"بھائی جان! اگر ایسا ارادہ کیا تو میں خودکشی کر لوں گا۔"

دوسری طرف رشیدہ سو رہی تھی۔ وہ ایک خواب سے چونک پڑی۔ شمیم کی ذرا سی غلطی سے کئی زندگیوں میں سیلاب آ گیا۔ پرنسپل صاحب بھی آ گئے۔ انہیں سب حال معلوم ہوا۔ شاہد گھبرایا۔ کمزوری کا سہارا لیا۔ ہمت کر کے اٹھا مگر فرش پر دھڑام سے گر پڑا۔ انگیٹھی میں کوئلے سلگ رہے تھے۔ اس سے سر جا ٹکرایا۔ زخمی ہو گیا۔ ہوش آیا لیکن بیہوشی سے بدتر، اس کے سامنے اندھیرا تھا۔ اس کی بے نور آنکھوں سے اب آنسوؤں کے بجائے خونیں قطرے ٹپک رہے تھے۔ کون جانے اس کی قیمت کیا ہے؟ کون ان منتشر قطروں کو زندگی کی ترازو میں تولتا۔ وہ بکھر گئے تھے۔

ہندوستان میں ہمارے دفتر کے پتہ میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہے آپ بھی نوٹ کر لیں

عبدالقدیر صاحب نمبر ۲۲۲ گلی کلن کہنا بازار چتلی قبر دہلی



مسواک

Registered No S 12

THE

URDU PSYCHOLOGY

